شمارہ نمبر ۲ ۱۹۵۵ء

ماہنامہ

دولت نمبر

حصہ اوّل

تراجم کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

مرتب

محمد یوسف (باقی)

قیمت :- ساتھ روپیہ

دفتر

اردو بازار دہلی ۶

محمد یوسف جید برقی پریس۔ دہلی

شاہراہ

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

ہندوستانی ادب کے ناولٹ

غیر ملکی ادب کے ناولٹ

اس انجمن گل میں

اُردو ادب میں آج [illegible] باوجود کہ وہ فروغ حاصل نہیں جو ناول کو ہے — یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں ناول پر ابھی کسمپرسی کا عالم ہے۔ ناول نگاری [illegible] منزل پر ہی ہے۔ یوں تو اُردو میں معاشی، سیاسی اور تاریخی ناول کثرت سے لکھے جا رہے ہیں، لیکن ابھی تک ایک بھی ایسا ناول تخلیق [illegible] ہم دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنے فخریہ پیش کر سکیں۔ نظم و افسانے کے میدان میں اُردو اتنی آگے نکل چکی ہے کہ بعض بھی دنیا [illegible] زبانوں کی ادبیات کی تقلید ہو رہی ہے۔ اور اس میدان میں بنگالی کو چھوڑ کر اُردو ابھی تک میر کارواں ہے۔ جس زبان کی نظم اور افسانہ اتنی [illegible] ہوا اس سے ناول کے میدان میں بھی یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ کچھ ایسے جواہر لٹائے گی جن سے دوسروں کے یہاں بھی اُجالا ہوگا [illegible] تو شدید محرومی ہوتی ہے۔ اور یہ وادیِ سینا اُس حکیم کی منتظر ہے جو عالم تاب تجلیوں کو پردے سے نکلنے پر مجبور کر دے۔

اُردو ناول نگاری کے میدان میں کچھ کوششیں لائقِ تحسین تو ہیں مگر وہ محض کوششیں ہی تو ہیں، کامرانیاں نہیں۔ دنیا تو ترجمے [illegible] دکھاتا ہے۔ اُردو کو اپنے زبان' اپنی توانائی اور اپنے لچک پن کے اعتبار سے ہند کی دوسری زبانوں میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ جبھی قائم رہ سکتا ہے اگر اس کا ناول بھی ایک امتیازی تزک و احتشام کا حامل ہو۔ اُردو میں اچھے ادیبوں کا ایک بہت بڑا لشکر ہے جسے اپنی خوابیدہ قوتوں کا علم بھی ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے بہت سے اُردو ناول نگار اپنی صلاحیتوں کو بیکار اور بے سود راستوں میں صرف کر رہے ہیں۔

ایک بڑا ادیب دور بیں، منزل شناس اور ژرف نگاہ ہوتا ہے۔ لیکن وہی جب اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ سے آنکھ مچولی کھیلنے لگے تو یہ نہ صرف اس کی اپنی بلکہ اُس کی قوم کی بھی بدنصیبی ہوتی ہے۔

'شاہراہ' گرتوں کو تھامنے کا مزہ ابھی تک محسوس کر رہا ہے۔ اگرچہ متزلزل راہگیروں کو سہارا دیتے ہوئے اس کے اپنے کندھے شل ہو چکے ہیں۔ شاہراہ کا ناولٹ نمبر اُردو میں ناول کو فروغ دینے کی طرف ایک قدم ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ادب کے شہ پارے جمع کئے گئے ہیں۔ ناولٹوں کے انتخاب میں دقتِ نظر اور صلاح و مشورے سے کام لیا گیا ہے۔ شاہراہ کے ناولٹ نمبر کے دو واضح مقاصد ہیں۔ اِن دنوں اُردو میں اچھے ادب کی تخلیق کی رفتار ذرا سست پڑ چکی ہے۔ لہٰذا اس ناولٹ نمبر کے ذریعہ قارئین کے لئے ادب عالیہ کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اور ادیبوں کے لئے ایک مشعلِ راہ تلاش کی ہے۔ کہ لکھنے والے یوں لکھتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے آستانِ ادب پر ایسے ہی مہر و ماہ فروزاں کیجئے۔

روس میں حقیقت افروز ناول نگاری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ روس میں تورگنیف، گوگل، دستووسکی، ٹالسٹائی اور گورکی نے حیات آموز فنِ ناول نگاری کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ ٹالسٹائی کے سوا ہم روس کے چار عظیم ادیبوں تورگنیف، دستووسکی، گوگل اور گورکی کے ناولٹ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ روسی زبان کے یہ چاروں ناولٹ روس کی جاندار اور قابلِ تقلید روایات کے آئینہ دار ہیں۔ سومرسیٹ، پرل ایس بک اور جان اسٹین بک انگریزی کے تین ہمعصر ادیب ہیں۔ اور اپنے ناولوں کے لئے دوامی شہرت کے

مالک ہیں۔ ان کے تینوں ناولٹ جدید فنِ ناول نگاری کے حامل ہیں۔

شاہراہ کے ناولٹ نمبر کی خصوصیت بنگالی، ہندی، پنجابی، سندھی، تامل [illegible] کے ناولٹ ہیں۔ یہ سب [illegible] ناولٹ ہماری کڑی محنت، دھوپ اور مسلسل تلاش و جستجو کا نتیجہ ہیں۔ یہ ناولٹ [illegible] ہماری ملکی زبانیں ناول کے میدان میں کہاں تک ترقی کر چکی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ناولٹ نمبر ایک تاریخی د[illegible]

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان تمام مصنفوں اور مترجموں کی تصاویر [illegible]یاب ہو سکیں اُن کی تصاویر کے ساتھ اصلی آرٹ پیپر پر چودہ اوراق میں ملیں گی۔ تیرہ ورق ملکی اور غیر ملکی ناولٹ [illegible]وں کے بھی ہوں گے اور یہ پورے ۲۸ صفحات ان ۵۴۴ صفحات میں شامل نہیں ہیں یعنی کہ یہ ناولٹ نمبر کل ۲ [illegible]ت کا ہے۔ چند قارئین کے اصرار پر شاہراہ کے منیجر اور آرٹسٹ کے فوٹو بھی بطور روشناسی پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہم نے جب ناولٹ نمبر کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا تھا تو اس وقت [illegible]ی نہیں تھا کہ وہ اتنی پھیل جائے گی۔ اس عظیم کام کا اب آغاز کرنے کے بعد اُسے ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ار[illegible]ترک ناولٹ نمبر کو دو حصوں میں ختم کر دیا جائے لیکن اب یہ کام تین حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ غیر ملکی ادب[illegible]ے کچھ ناولٹ جنہیں ہم پیش نہیں کر پائے اور ہند کی باقی آئینی زبانوں کے ناولٹ تیسرے حصے میں پیش کئے جائیں گے۔

دوسرا حصہ اُردو کے طبعزاد ناولٹوں پر مشتمل ہوگا۔ ناولٹ نمبر کا دوسرا حصہ جون کے پہلے ہفتہ میں پیش کیا جائے گا۔ ناولٹ نمبر کے دوسرے حصے میں کیونکہ طبعزاد ناولٹ ہوں گے اس لئے ہم اُسے مواد و طباعت کے اعتبار سے ایک بےمثال صحیفہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کم و بیش بیس ناولٹ قارئین کی نذر کئے جائیں گے [illegible] کی ضخامت بھی موجودہ ناولٹ نمبر سے زیادہ ہوگی۔ اُردو کے سب ہی نامور ادیب تعاون کا یقین دلا چکے ہیں۔ ہم اُن سے التماس کرتے ہیں کہ [illegible] وہ اپنی تخلیقات ہمیں جلد بھجوانے کا کرم فرمائیں۔

آخر میں ہمیں اپنے قارئین سے ایک درخواست کرنی ہے۔ جو اصحاب شاہراہ کے خریدار ہیں یا اب بننا چاہیں گے اُنھیں شاہراہ کے ناولٹ نمبر کا پہلا حصہ مفت دیا جائے گا۔ اگر وہ شاہراہ کے طبعزاد ناولٹ نمبر بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ مزید چھ روپے بھجوانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

ناولٹ نمبر کا تیسرا حصہ جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوگا۔

محمد یوسف (جامعی)

عالمی ادب کے ناولٹ



کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی



دستوفسکی

مترجم: من موہن تلخ

غریب لوگ

میری پیاری واروارا۔

کل رات میں بہت خوش تھا۔ میں تصور میں بھی اتنا خوش نہ ہو سکتا تھا کیونکہ میری ننھی ہنسلی ہو، لاڈلی تم نے اپنی زندگی میں پہلی بار ویسا کیا جیسا میں نے چاہا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ (اور جان من یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ کام کے بعد ذرا سستا لینے کا مجھے بے حد شوق ہے) میں نے موم بتی جلائی، کاغذات کو ترتیب دی اور ابھی قلم کی نوک درست ہی کر رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ اٹھی۔ اور میرا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ آخر میرے دل کی بات تم نے جان ہی لی۔ یعنی جیسا میں نے کہا تھا تم نے بالکل اسی طرح پردے کا ایک کونہ مرتبان کے ساتھ باندھ رکھا تھا مجھے یہاں تک محسوس ہوا کہ تم کھڑکی میں کھڑی ہو اور تمہارا اگلڑیا ایسا چہرہ دمک رہا ہے۔ تم کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں اور تمہارے دل میں میرا خیال چٹکیاں لے رہا تھا۔ میری ننھی سی فاختہ مجھے اس بات سے دکھ ہو رہا تھا کہ مجھے تمہارا دل نشین چہرہ اچھی طرح نظر نہ آتا تھا۔ کیا دن تھے کہ جب میری بینائی کمزور نہ پڑی تھی۔ میں بھی سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میری لاڈلی ــــ بڑھاپا نعمت نہیں ہے۔ سب کچھ دھندلا پڑ جاتا ہے۔ اور شام کے اندھیرے میں ذرا سا لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کے بعد صبح کو آنکھیں اس طرح دکھنے لگتی ہیں اور ان سے پانی یوں بہنے لگتا ہے کہ لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن اے میرے ننھے سے فرشتے تمہاری اس مسکراہٹ سے میرا دل جگمگا اٹھا تھا۔ وہ مسکراہٹ کتنی نرم اور شیریں تھی۔ اور مجھے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا کہ اس دن کی طرح آج بھی میں نے تمہیں بوسہ دیا ہے ــ یاد ہے نا؟ اور جان من مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ تم اپنی ننھی ننھی پیاری انگلیوں سے میرا منہ ایک طرف ہٹا رہی ہو اور مجھے ڈانٹ بھی رہی ہو۔ سچ سچ بتانا۔ کیا تم نے واقعی ڈانٹا تھا ــ! اگلے خط میں مجھے اس واقعے کے بارے میں پوری تفصیل سے لکھنا۔

اور ہاں ــــ ہم نے پردے کی آڑ لے کر جو چالاکی دکھائی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ــ کمال کر دیا ہے ــ ہے نا؟ کام کرتے وقت یا سونے جاتے وقت میں فوراً سمجھ جاتا کہ تم ادھر بھی میرے بارے میں سوچ رہی ہو ــ تم مجھے یاد کر رہی ہو ــــ اور تم خوش ہو ــ اچھی ہو۔ پردہ گرا دینے کا مطلب ہوتا تھا ــ "ماکار ــ شب بخیر" اور پردہ اٹھانے سے مراد تھی ــ "ماکار ــ صبح بخیر ــ امید ہے کہ رات تم اچھی طرح سوئے؟" یا اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا تھا ــ "ماکار ــ مزاج کیسا ہے ــ میں تو خدا کے فضل سے اچھی ہوں۔ خوش ہوں ــ دعا ہے:"

لیکن میری جان تم یہ دیکھو کہ ہم نے کیا ترکیب ڈھونڈ نکالی ہے۔ اب تو خط بھی بے معنی نظر آتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ اور یہ سب کچھ میں نے ہی سوچا تھا ــ مجھے ایسی باتیں خوب سوجھتی ہیں۔ مانتی ہو نا!

میری ننھی واروارا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کل رات میں جی بھر سویا اور مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ اتنی اچھی نیند آئے گی۔ اور یہ بات بہت تسکین دہ ہے۔ کیونکہ عام طور پر شروع شروع میں نئی جگہوں پر اچھی طرح نیند آتی نہیں۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات ہو ہی جاتی ہے کہ آدمی کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ آج صبح میں بلبل کی طرح ہشاش بشاش اٹھا تھا۔ اور جان من صبح بھی کتنی حسین اور خوشگوار تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر سورج چمک رہا تھا۔ چرند پرند چہچہا رہے تھے۔ ہوائیں موسم بہار کی مہک سے گھلی ہوئی تھی۔ ذرے ذرے سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ ہر چیز میں ہم آہنگی تھی۔ ہر شے پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ خیالی گھوڑے بھی دوڑائے اور فقط تمہارے بارے میں سوچا۔ ــ میں نے من ہی من میں تمہیں آکاش کا وہ پرند کہا جسے خدا نے اس لئے بنایا ہے کہ وہ قدرت کو حسن اور انسان کو راحت عطا کرے۔ اور وارنیکا یہاں مجھے خیال آیا کہ پریشانی اور مصیبت میں جینے والے ہم خستہ حال

کی کاوش کے آزاد اور معصوم پرندوں سے رشک ہونا لازمی ہے۔ اور اسی ضد میں پلتے ہوئے میں نے کئی مبہم اور خوشگوار رابطے بھی قائم کئے۔ وارنیکا۔ میرے پاس ایک کتاب ہے اور تمہیں اس کتاب میں ایسی بہت سی باتیں نظر آئیں گی جیسی میں یہاں لکھ رہا ہوں۔ اگر سچی بات پوچھو تو میں نے یہ سب کچھ اسی کتاب سے پایا ہے۔ یوں نظر آتا ہے جیسے کتاب کے مصنف کو بھی بالکل میری طرح تمنائیں اور حسرتیں ہیں۔ اور ان کا اظہار اُس نے شاعری میں یوں کیا ہے۔

• کاوش میں اک پنچھی ہوتا جو شکار کے تجسس میں بلندیوں کو چیرتا جاتا۔

اور یہ نظم اسی طرح چلتی جاتی ہے۔ اس میں اور بھی بہت سی نازک خیالیاں ہیں۔ لیکن تم اسے چھوڑ دو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ آج صبح تم گئی کہاں تھیں۔ جب تم اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی نکلی تھیں تو میں ابھی کام پر جانے کو تیار نہ ہوا تھا۔ تمہیں ایک نظر دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ لیکن وارنیکا۔ دُکھی ہونے سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ آنسو کسی دُکھ کی تلافی نہیں کر سکتے۔ یقین مانو میری لاڈلی ۔۔۔ میں نے تجربات سے یہ سیکھا ہے ۔۔۔ ہاں وہ فیڈورا کیسی ہے۔ وہ بہت نیک عورت ہے۔ وارنیکا جواب دیتے وقت میری سب باتوں کا جواب لکھنا اور یہ بتانا کہ تم دونوں مل کر کیسے دن گذار رہی ہو۔ ویسے سب کچھ ٹھیک ہے نا؟ فیڈورا کو بات بات پر منہ بنا لینے کی عادت ہے لیکن تم بُرا نہ ماننا۔ وہ بہت ہی اچھی عورت ہے۔ خدا اُسے سُکھی رکھے۔

میں تھیریسیا کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ وہ بہت ایماندار اور نیک عورت ہے۔ مجھے تو بے حد فکر لگ گئی تھی کہ ہم اپنے خط ایک دوسرے تک کیسے پہنچائیں گے! اور ہماری خوش قسمتی سے خدا نے تھیریسیا کو ہمارے لئے یہاں بھیج دیا۔ وہ نیک دل ہے۔ بے حد سُلجھی ہوئی اور کام آنے والی عورت ہے۔ لیکن ہماری مکان مالکن بہت ہی بے رحم اور سنگ دل ہے۔ وہ اس بیچاری سے بہت زیادہ کام لیتی ہے اور بہت ظلم کرتی ہے۔ بڑی سخت عورت ہے۔

وارورا میں کس جگہ آگیا ہوں۔ یہ تو صریحاً گندگی ہے۔ کمرے بہت ہی گندے اور تاریک ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گوشہ نشین انسان ہوں۔ جہاں پہلے رہا کرتا تھا وہاں اتنا سکون اور سکوت ہوتا تھا کہ اگر مکھی بھی بھنبھنائے تو اس کی آواز بھی صاف سُنائی دیتی تھی۔ اور یہاں یہاں شور ہے۔ ہلڑ مچا رہتا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ یہ جگہ ہے کیسی؟

قیاس کرو کہ ایک لمبا سا برآمدہ ہے جو بہت ہی تاریک اور گندہ ہے۔ دائیں طرف دیواریں ہیں جن پہ نہ رنگ نہ روغن بلکہ صرف ننگی دیواریں۔ بائیں طرف کسی ہوٹل کی طرح قطار در قطار دروازے ہی دروازے نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کمرہ ایک ایک یا دو دو آدمی رہتے ہیں کچھ کمروں میں تو تین تین آدمی بھی رہتے ہیں۔ ایک عجیب دھما چوکڑی ہے۔ یہ جگہ واقعی حضرت نوحؑ کی حقیقی کشتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب لوگ بظاہر اچھے ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور اچھے پڑھے لکھے لوگ ہوں۔ آگے اندر کی بات خدا جانے۔ ان میں ایک صاحب کلرک ہیں (ویسے ان کا کام ادبی نوعیت کا ہے) بہت وسیع المطالعہ شخص ہے۔ اُسے ہومر برامبوز کے بارے میں بھی بہت علم ہے اور دیگر ادبی تصنیفات کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہے۔ دنیا بھر کا ادب پڑھ چکا ہے۔ اُسے ہر چیز کے بارے میں علم ہے بھی ذہین آدمی ہے۔ دو فوجی افسران ہیں۔ وہ تو ہمیشہ تاش ہی کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک بحری فوج کے افسر ہیں اور ایک صاحب انگریزی کے مدرس ہیں۔ لیکن تم میرے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ تمہاری دل لگی کے لئے میں طنزیہ پیرائے میں ایک ایک کا ذکر کروں گا۔ بالکل ویسا ہی لکھوں گا جیسے وہ ہیں اور پوری تفصیل سے لکھوں گا۔ مکان مالکن ٹھگنے قد کی، پھوہڑ، اور بوڑھی عورت ہے۔ وہ سارا دن سلیپر پہنے اور ڈریسنگ گاؤن پہنے گھومتی رہتی اور تھیریسیا کو ڈانٹتی رہتی ہے۔ میں رسوئی میں رہتا ہوں۔ بلکہ صحیح نقشہ یوں ہے کہ رسوئی کی عین دائیں نکڑ پہ ایک کمرہ ہے (اور یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری رسوئی بہت اچھی ہے۔ صاف اور ستھری ہے) لیکن وہ کمرہ کوئی خاص بڑا نہیں ہے۔ ایک چوکور غار ہے..... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ رسوئی اس سے بڑی ہے۔ اس میں تین کھڑکیاں ہیں اور درمیان میں دیوار کھڑی کر کے اسی رسوئی سے ایک اور کمرہ بھی بنا دیا گیا ہے اور اس کا علیحدہ کرایہ وصول کیا جا رہا ہے۔ ہوادار جگہ ہے اور آرام دہ کمرہ ہے۔ اُس میں ایک کھڑکی ہے۔ بس اسی میں رہتا ہوں۔ مختصراً اس جگہ سے مجھے پوری تسلی ہے۔ اب اس سے یہ مطلب نہ نکال لینا کہ ان باتوں کے پس پردہ کوئی راز بھی ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ یہ کمرہ رسوئی کا ایک حصہ ہے۔ میں اس میں رہتا ہوں اور اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہر لحاظ سے خلوت گاہ ہے۔ میں اپنی ہر بات کو اپنے تک محدود

کے سکتا ہوں اور آرام سے تنہا رہتا ہوں۔ جہاں تک سامان کا تعلق ہے تو یہ بہت کم ہے۔ ایک میز، الماری اور دو کرسیاں بھی لا کر رکھ دی ہیں۔ ایک تنہا انسان کے لئے یہ کافی ہے اور یہ کمرہ سستا بھی ہے۔ اس مکان میں سب سے اچھے کمرے کا کرایہ ۳۵ روبل ہے اور یہ میری بساط سے باہر ہے۔ اس وقت میں اس کمرے کے ۲۴ روبل دے رہا ہوں اور پھر ساتھ کھانا بھی مل جاتا ہے۔ اس سے پہلے مجھے پورے تیس روبل ادا کرنا پڑتے تھے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو کئی چیزوں سے محروم رکھنا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے چائے پینے کی سوچ تک نہ سکتا تھا اور اب چائے اور کافی کے لئے میں کچھ رقم بچانے کے قابل ہو جاتا ہوں۔ جانِ من مجھے بڑی شرم آتی ہے کہ چائے تک بھی نہ پی سکوں۔ یہاں ہر شخص صاحبِ عزّ و وقار ہے اور یہ کافی تکلیف دہ بات ہے۔ میں کھوکھلی شان کا قائل نہیں ہوں اور مجھے یہ جھمیلے اچھے ہی نہیں لگتے۔ اور پھر اگر ضروریاتِ زندگی جوتوں اور کچھ کپڑوں کے لئے پیسے علیحدہ کرنے چاہئیں تو باقی رہ ہی کیا جاتا ہے۔ اور یہیں میری ساری تنخواہ یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں شکایت کر رہا ہوں۔ بالکل نہیں۔ یہی تنخواہ برسوں سے میری ضروریات کے مطابق ہے اور کبھی کبھی مجھے بونس بھی مل جاتا ہے

اچھا۔ آرام جان ــــ خدا حافظ ــــ میں نے تمہارے لئے پھولوں کے کچھ گلدستے خریدے ہیں۔ سستے مل گئے ہیں۔ اور شاید تم خوشبودار پھولوں کی دلدادہ ہو۔ دوکاندار کے پاس ایسے پھول بھی ہیں۔ تم صرف مجھے لکھ بھیجو کہ تمہیں درکار ہیں یا نہیں لیکن خدارا ہر بات تفصیل سے لکھنا۔ اور ہاں دیکھو اس وجہ سے میرے حساب کتاب کے بارے میں کوئی شبہ یا خیال دل میں نہ لانا۔ میں اپنا گھر بسانے کے لئے روپیہ بچا رہا ہوں۔ میں اس مکھی کی مانند بھی نظر آ سکتا ہوں جو اپنے پروں پر پٹا کھا جاتی ہے لیکن اگر ذرا سا بھی غور کرو تو میں ایسا ہوں نہیں۔ میں اپنے متعلق سمجھ بھی جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں ایک مضبوط اور پاک روح کا مالک ہوں ـــ اچھا خدا حافظ۔ اپنی ننھی ننھی پیاری پیاری انگلیوں پر میرا بوسہ قبول کرو۔

تمہارا سچا اور وفادار دوست

ماکار دیووشکن

نوٹ۔۔ ہاں مجھے تم سے ایک التجا کرنی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

جانِ حیات جس قدر طویل خط لکھ سکو لکھنا۔ وارنیکا۔ میں تمہارے لئے ایک پونڈ مٹھائی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم پسند کرو گی۔ اور خدا کے لئے میرے بارے میں سوچ کر پریشان مت ہونا۔ اچھا تو خدا حافظ۔

۸ اپریل۔

میرے پیارے ماکار

مجھے اندیشہ ہے کہ آخر کار مجھے تم سے جھگڑا کرنا پڑے گا۔

یقین مانو میرے اچھے ماکار کہ تمہارے یہ تحفے قبول کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے ان پر کتنی رقم خرچ کی ہوگی۔ تم نے اپنے اوپر کتنا جبر کیا ہوگا کن نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھا ہوگا۔ اور میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بالکل کچھ نہیں چاہیئے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں اس فیاضی کا صلہ نہیں چکا سکتی۔ تم نے وہ پھول بھیجے کیوں؟ چلو گلاب کی ایک ٹہنی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن موتیا اور گیندے کے پھول کیوں بھیجے۔؟ بس ذرا سی کسی نے اپنی پسند ظاہر کی جیسے میں نے گیندے کے بارے میں ذکر کیا اور تم لپکے بازار کی طرف۔ اور وہ بہت مہنگے آئے ہوں گے۔ لیکن ہیں وہ خوبصورت۔ تمہارے خط سے مجھے جان پڑتا ہے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ضرورت سے زیادہ ہی جنت، بہار، خوشبو اور چہچہاتے ہوئے پرندوں کا ذکر ہے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ شاعری بھی ضرور ہوگی۔ ماکار تمہیں کچھ اشعار کہنے چاہئیں تھے باقی تو ہر چیز موجود تھی۔ نازک احساسات، دلربا تصورات اور نہ جانے کیا کیا کچھ! رہا پردے کا سوال تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ شاید جب میں نے پردوں کو نیچے کیا تھا تو وہ پردہ اپنے آپ ان میں اٹک گیا ہوگا۔ اور تم نے کیا کچھ نہ سمجھ لیا۔

دیکھو ماکار! تم مجھے یقین دلانے کے لئے چاہے کچھ بھی کہو کہ تمہارا سب روپیہ تمہاری اپنی ضروریات پر خرچ ہوتا ہے لیکن تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو لازمی ضروریات سے بھی محروم کر رہے ہو۔ تمہیں ایسا کر دینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جہاں تمہیں ہر وقت پریشانی رہتی ہو اور تم دکھی ہوتے رہتے ہو جہاں تمہیں آرام میسّر نہیں اور دبے رہتے ہو۔ تمہیں گوشہ نشینی پسند ہے اور یہ چیز تمہیں اس جگہ نہیں مل سکتی۔ اور اگر تمہاری آمدنی کو دیکھا جائے تو تم بہت اچھی طرح رہ سکتے ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت آرام سے رہا کرتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اپنی زندگی تنہائیوں میں گذار دی ہو۔ ساری عمر یاس اور تمنا ہی میں گنوا دی ہو۔ کبھی کسی نے تمہیں پیار بھرے لفظ سے مخاطب ہی نہ کیا ہو اور

اجنبیوں کے کمرے کرائے پہ لے کر عجیب عجیب جگہوں پر رہتے ہو۔ میرے مہربان میرا دل تمہارے لئے کتنا دکھی ہوتا ہے۔ خوش اور ٹھیک رہنے کی کوشش کرتے رہو مالکا رہا۔ تم لکھتے ہو کہ موم بتی کی روشنی میں لکھنے سے تمہاری آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تو پھر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ یقینی بات ہے کہ تمہارے افسر جانتے ہیں کہ تم کتنے محنتی انسان ہو۔

میں تمہیں ایک بار پھر تاکید کرتی ہوں کہ میرے لئے اتنی رقم نہ خرچ کیا کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن تم امیر نہیں ہو۔ آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بھی اپنے آپ کو بہت شگفتہ اور تر و تازہ محسوس کیا تھا۔ میں بے حد خوش تھی۔ فیڈورا بہت دیر سے کام پر گئی ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے بھی کام لے آئی۔ اور بس میں اس سے بے حد خوش ہوتی۔ میں تھوڑا سا ریشم خریدنے کے لئے بازار گئی تھی اور پھر واپس آکر میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ پوری صبح میں نے اپنے آپ کو بہت ہشاش بشاش محسوس کیا۔ لیکن اب میں پھر اُداس ہو گئی ہوں اور میرا دل غمگین ہے۔

آخر میرا بنے گا کیا؟ میرا مستقبل کیا ہے! اور غیر یقینی کا عالم کس قدر مایوس کن ہوتا ہے۔ آدمی کو احساس تک نہ ہو بلکہ ذرا بھی پتہ نہ چل سکے کہ اب کیا ہوگا تو مایوسیاں اُبھر آتی ہیں۔ اور پھر ماضی اس قدر اذیت ناک تھا کہ اُس کا خیال آتے ہی دل دھک سے بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں میں اُن لوگوں کی جان کو روؤں گی جنہوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔

اس وقت تاریکی بڑھ رہی ہے اور مجھے پھر اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ اور لکھوں لیکن وقت نہیں ہے۔ کام بہت ضروری ہے لہٰذا مجھے دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ خط لکھنے میں جی بہت لگتا ہے۔ آدمی اپنے آپ کو اس قدر تنہا نہیں محسوس کرتا۔ لیکن تم کبھی ہم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں چلے آتے؟ مالکا را! آخر ایسا کیوں؟ اب تمہیں زیادہ دُور بھی نہیں جانا پڑے گا اور یقیناً تم ملاقات کیلئے وقت نکال سکتے ہو۔ خدارا ضرور آؤ۔ میں حال ہی میں تمہاری تھریسیا سے ملی ہوں بیچاری بہت بیمار نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں نے اُسے بیس کوپیکس دے دیئے۔ ارے بابا۔ دیکھو میں بالکل بھول ہی چلی تھی۔ ہاں سنو تم جس طرح بھی رہ رہے ہو اس کی ایک ایک پائی کا حساب مجھے بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کون کون لوگ رہ رہے ہیں اور تمہاری اُن سے کیسی نبھ رہی ہے۔ میں یہ بات جاننا چاہتی ہوں۔ اور دھیان رہے کہ تم یہ سب کچھ لکھ بھیجو گے۔ آج رات میں خاص مقصد سے اپنے پردے کے کونے کو تمہاری خاطر ڈھیلا چھوڑ دوں گی۔ تم جلد سویا کرو۔ کل رات میں دیکھ رہی تھی کہ تمہارے کمرے میں آدھی رات تک بتی جلتی رہی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔ اس وقت میں بہت اُداس ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں اور اکیلی ہوں۔ زندگی میں کیا دن دیکھنے کو ملے ہیں۔ خدا حافظ۔

تمہاری دوست

واروارا

۸ر اپریل۔

میری پیاری وارووارا۔

ٹھیک کہتی ہو میری وارووارا۔ میری جانِ حیات۔ ہاں اپنی بدبختی کے ہاتھوں میں بھی ایسے ہی دن دیکھ رہا ہوں۔ وارووارا۔ تم نے مجھ بوڑھے آدمی کے ساتھ خوب مذاق کیا۔ لیکن یہ میرا قصور ہے سراسر میرا قصور۔ ایک بوڑھا شخص جس کے سر پر گنتی کے بال رہ گئے ہیں وہ جذبات اور تصور یا رومان سے جی بہلائے۔ ہاں جانِ من مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آدمی بعض لمحات میں عجیب حرکات کرتا ہے۔ بلکہ عجیب شخصیت بن جاتا ہے۔ وہ خیالی پلاؤ پکاتا ہوا بے مہار بہکے جائے گا۔ اور پھر کن حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا کی پناہ! اور پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! بات پہنچی کہاں ہے؟ کچھ بھی نہیں مطلقاً کچھ نہیں ہاں انسان گندگی کے اُس ڈھیر پہ جا گرتا ہے جہاں سے صرف خداوند تعالےٰ ہی ہمیں بچاتا ہے۔ لیکن میری پیاری یہ نہ سوچنا کہ میں خفتے ہوں مجھے تو یہ سوچ سوچ کر رنج ہوتا ہے کہ میں نے کس احمقانہ اور رومانی انداز میں تمہیں خط لکھا تھا۔ آج جب میں اپنے کام پر گیا تھا تو ایک شہنشاہ کی طرح خوش تھا۔ میرے دل میں خوشی موجزن تھی اور میری روح اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہی تھی۔ المختصر مجھے اپنا یہ عالم بہت ہی اچھا لگا تھا۔ لیکن آج شام گھر آتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں چل نہیں رہا تھا بلکہ بہ دقت تمام اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ علاوہ ازیں نہ جانے کیوں میرا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری مصیبت نمودار ہوتی ہی رہتی ہے۔ شاید ہوا کی وجہ سے میری پیٹھ کو سردی لگ گئی تھی۔ بہار کو دیکھ کر میں بے وقوف اس قدر آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ صرف پتلے سے کوٹ میں باہر نکل گیا تھا۔

میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے میرے جذبات کو غلط سمجھا ہے۔ تم بالکل غلط سمجھی ہو۔ وارووارا یہ تو صرف پدرانہ شفقت تھی۔ فقط ایک پدرانہ

محبت کا صرف ہاتھ تمہاری تنہائی اور یتیمی کے عالم میں میں نے تمہارے باپ کی جگہ لے لی۔ یہی وہ سبب ہے کہ تم سے محبت کر رہا ہوں۔ بالکل جیسے ایک سچے رشتہ دار کا ساتھ کار میں نزدیکی نہیں تمہارا دُور کا رشتہ دار تو ہوں۔ نہیں ہوں تو کیا بہت دور کا ناطہ ہے میرا تمہارا۔ لیکن کچھ بھی کہو رشتہ دار تو ہیں ٹھہرا۔ اور اب خدا کے فضل سے میں تمہارا سب سے قریبی رشتہ دار اور محافظ ہوں۔ کیونکہ جہاں کہیں تمہیں حفاظت اور مدد ملنی چاہیئے تھی وہیں تم سے دھوکہ کیا گیا اور تمہیں ذلت ملی۔ رہا سوال شاعری کا اور وہ بھی میری اپنی شاعری کا تو اب میری وہ عمر نہیں رہی کہ میں شعر کہتا پھروں۔ شاعری بکواس ہے۔ جانِ من میری قریبی رائے ہے۔

وارفتہ دار تم آرام، چین اور ایسی باتوں کے بارے میں کیوں لکھتی ہو؟ میں ملنگ نہیں ہوں اور میری ضروریات بہت کم ہیں۔ میں جتنا شکی اب ہوں اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ اس بڑھاپے میں مجھے اس قدر اپنا خیال رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس کھانے کو بہت ہے۔ کچھ کپڑے اور جوتے بھی ہیں پھر فضول چیزوں کے بارے میں فکر کرنے کی کیا مُصیبت پڑی ہے۔ شاہی خاندان سے تو میں تعلق رکھتا نہیں۔ اور یہ بھی بات نہیں کہ میرے ابا جان نوابوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے گزارہ اُس آمدنی میں کیا تھا جو کہ میری آمدنی سے بھی کم تھی۔ اور نہ میں بُزدل ہوں۔ لیکن اگر سچی بات پوچھی جائے تو میرا پُرانا گھر کہیں بہتر تھا۔ عزیزم وہاں مجھے گھر کا احساس ہوتا تھا۔ میرا یہ کمرہ کافی اچھا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی لحاظ سے زیادہ خوشنما ہے اور اگر تم چاہو تو اسے زیادہ دل افزا کہہ لو۔ کمرہ کیا ہے مُنہ سے بولتا ہے۔ میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اب تو وہ چیزیں بھی جو ان دنوں بہت بُری لگتی تھیں اور مجھے بے حد چڑچڑا کر دیتی تھیں اب وہ بھی اچھی لگنے لگی ہیں۔ ہم دونوں کتنے آرام سے رہا کرتے تھے۔ ہم۔ یعنی میں اور وہ بوڑھی عورت جو اب وفات پا چکی ہے۔ اس کی یاد بھی مجھے اُداس کر دیتی ہے۔ وہ بہت اچھی عورت تھی اور اپنے کمروں کا زیادہ کرایہ بھی وصول نہ کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ لمبی لمبی سوئیوں سے لحاف مرمت کرتی رہتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی موم بتی کی روشنی میں کام کرتے تھے لہٰذا دونوں ایک میز پہ کام کرتے تھے۔ اُس کی ننھی سی پوتی ماشا اب تیرہ برس کی ہو چکی ہوگی لیکن مجھے ابھی تک اس کا بچپن یاد ہے بہت شوخ تھی وہ۔ ہر وقت کسی نہ کسی شرارت پر تُلی رہتی تھی۔ اور وہ اپنی پیاری پیاری حرکتوں سے ہمیں خوب ہنسایا کرتی تھی۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ بس ان حالات میں ہم تینوں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے اور پھر کام میں مست ہو جایا کرتے تھے۔ بچی کو خوش کرنے کیلئے اور اُسے شرارت سے باز رکھنے کی غرض سے وہ بیچاری بوڑھی عورت اسے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ اور کیا کہتے ہیں اُن کہانیوں کے۔ صرف بچہ ہی کیا ایک جوان اور ذہین شخص بھی اُن کو سنتے سنتے اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی اپنا پائپ سلگا کر بیٹھا انہیں سنتا رہتا اور اتنا محو ہو جاتا کہ اپنا کام تک بھول جاتا۔ اور وہ بچی وہ شرارت کی پُتلی اپنے گلاب جیسے چہرے کو اس عورت کے ہاتھوں پر ٹیک دیتی اور اس کا معصوم اور خوبصورت سا مُنہ آدھا کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ اور اگر کہانی ڈراؤنی ہوتی تو وہ بچی سرک کر اپنی دادی سے چمٹ جاتی تھی۔ اُسے اُس عالم میں ڈرا ہوا دیکھ کر ہم دونوں کو اس پہ بے ساختہ پیار آ جاتا تھا۔ اور ہم وہاں ایک عجیب کیفیت میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے اور موم بتی کی جلتی اور مٹکتی ہوئی لو کو بھی بھول جاتے۔ ہمیں نہ صحن میں تیز ہوا کا شور سنائی دیتا نہ برف کے گرنے کی صدا۔ کتنی اچھی زندگی گزرتی تھی۔ اور یقین مانو کہ ہم اسی عالم میں بیس برس تک اکٹھے رہے تھے۔ لیکن دیکھا نا میں جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ بھلا تمہیں اس واقعے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور اُس وقت کی یاد سے میں بھی کچھ خوش نہیں ہوتا اور خاص کر اس عالم میں تو وہ یاد میرے لئے اور دُکھ کا باعث ہوگی۔ تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ تھریسا نہ جانے کس سے بک بک جھک جھک کر رہی ہے۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔ اور میری پیٹھ بھی ٹیس اُٹھا رہی ہے۔ اور میرے خیالات اتنے اُلجھے ہوئے اور بھٹکے ہوئے جیسے سوچنے سے بھی دُکھ ہوتا ہو جیسے میرے خیالات بھی آزار میں مبتلا ہوں۔ آج میں بہت اداس ہوں۔

لیکن ہاں عزیزم تم نے یہ لکھا تھا۔ میں تم سے ملنے کیسے چلا آؤں؟ لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ غلط باتیں بنائیں گے۔ نہیں میرے ننھے سے فرشتہ۔ بہتر یہی ہوگا کہ میں تمہیں کل ویسپرز پہ مل لوں۔ یہی اچھا رہے گا اور ہم دونوں کو نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ دیکھو ایسا خط لکھنے کی بنا پر مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خود اسے دوبارہ پڑھ کر دیکھا کہ بے سر و پا اور بے مہار باتیں لکھ گیا ہوں۔ میں ایک بوڑھا شخص ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ چیزوں کو بیان کرنے میں مجھے کوئی مہارت حاصل نہیں ہے۔ نہ کسی کو مجھے یہ بتلانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کو ہنسنے کی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے جب کبھی اپنے خیالات قرینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہیں میں نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ آج صبح میں نے تمہیں کھڑکی میں دیکھا تھا۔ تم کچھ ٹانک رہی تھیں۔ اچھا

خدا حافظ اور یہی کہہ سکتی ہوں کہ اللہ تمہارا نگہبان رہے۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار۔

ہاں ایک اور بات کہنی ہے کہ میں کسی سے متعلق طنزیہ پیرائے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ وارورا اب میری یہ عمر نہیں رہی کہ مذاق کروں اور پھبتیاں کسوں۔ لوگ مجھ پہ ہنسیں گے اور پرانی روسی کہاوت تازہ ہو جائے گی کہ جو اپنے پڑوسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں جا گرتا ہے۔

۹ر اپریل۔

میرے پیارے ماکار

ایسے خیالات دل میں لاتے ہوئے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم تو میرے دوست ہو اور میری بھلائی کرنے والے ہو۔ کیا میں تمہیں چوٹ پہنچا سکتی ہوں؟ میں جانتی ہوں کہ اکثر و بیشتر میں بے دھیان رہتی ہوں لیکن میں سوچ تک نہیں سکتی تھی کہ میرے اُن فقروں کا مطلب تم یہ نکالو گے کہ میں نے تمہیں تمسخر کا ہدف بنایا ہے۔ سچ میں تمہاری عمر یا چال چلن کا کبھی مذاق نہیں اُڑا سکتی۔ یہ تو فقط میں بے دھیانی میں لکھ گئی تھی اور پھر سچ بات تو یہ ہے کہ میں اُکتا چکی ہوں۔ اور انسان اُکتاہٹ کے عالم میں کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ اگر میں اپنے دل کی بات کہہ دوں تو میں سمجھی تھی کہ تم اپنے خط میں سوانگ رچا رہے ہو۔ اور جب میں نے یہ جانا کہ تم میرے خط سے اس قدر دکھی ہوئے ہو تو میرا دل بھر آیا۔ سنو میرے مخلص دوست اگر تم مجھ پہ ناشکر گذاری اور بے حسی کی تہمت دو تو تم مجھے قطعاً غلط سمجھو گے۔ میرے دشمنوں سے، اُن کی نفرت اور انتقام کے جذبے سے مجھے بچانے کے لئے تم نے جو کچھ کیا ہے میں اُسے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے دُعائیں مانگوں گی اور اگر خدا نے میری دعائیں سن لیں تو تمہیں ضرور خوشی نصیب ہو گی۔

آج میری طبیعت بہت خراب ہے۔ میں ٹھٹھر اٹھتی ہوں اور میرا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ فیڈورا بہت گھبرا رہی ہے۔ مجھ سے آکر ملنے میں اور میرا حال پوچھنے میں تمہیں شرم محسوس نہ کرنی چاہیئے۔ لوگ بکتے ہیں بکنے دو۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟ اچھا ماکار خدا حافظ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا ہے اور اب کچھ اور مجھے نہیں لکھنا اچھا دیکھو— مجھ پہ خفا مت ہونا اور میری دائمی عزت اور وابستگی پر بھروسہ رکھو۔

تمہاری مخلص اور مؤدب دوست

وارورا۔

۱۲ر اپریل

میری پیاری وارورا

کیا ہو گیا؟ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ہمیشہ مجھے ڈراتی رہتی ہو۔ میں ہر خط میں لکھتا ہوں منت کرتا ہوں کہ تم اپنا دھیان رکھا کرو۔ گرم کپڑے پہنا کرو۔ خراب موسم میں گھر پہ رہا کرو اور ہر بات سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ لیکن تم میرا کہا مانتی کب ہو۔ میرے ننھے سے فرشتے ایک بچے کی طرح تم ہمیشہ میری نصیحت کے خلاف عمل کرتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم گھاس کی پتی کی طرح نرم و نازک ہو۔ تم ذرا زور سے سانس لینے پہ زکام کا شکار ہو جاتی ہو۔ عزیزم اپنا پورا پورا خیال رکھو۔

تم میری روزمرہ زندگی اور ماحول کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔ اس سے بڑھ کر مجھے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن دیکھو میں الف سے لیکر یے تک لکھوں گا۔ گھر کے سامنے والی سیڑھیاں شاندار ہیں اور خاص کر بڑی سیڑھیاں تو لاجواب ہیں۔ سیڑھیاں صاف شفاف اور کشادہ ہیں اور جنگلہ مہاگنی کی لکڑی اور دھات کا بنا ہوا ہے۔ لیکن پچھلے زینے کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا بہتر ہے۔ اوّل تو وہ کئی چکر لگاتا ہے۔ پھر وہ ہر وقت گیلا اور میلا رہتا ہے۔ اور زینے کی جو سیڑھیاں ہیں وہ نہایت شکستہ حالت میں ہیں اور دیواریں اس قدر لیس دار ہیں کہ اگر اُن پر اُنگلی جا پڑے تو وہیں چپک جائے۔ اور زینے کے ہر موڑ پر صندوقوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔ کرسیاں پُرانی الماریاں اور صفائی کرنے والی چیزوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر کھڑکیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور جگہ جگہ گندگی سے بھرے ہوئے ٹب پڑے ہیں۔ اُن میں کوڑا کرکٹ، انڈوں کے چھلکے اور مچھلیوں کا گوشت پڑا سڑتا رہتا ہے۔ اس کی بدبو تو بس ناقابل برداشت ہے۔ المختصر یہ حصہ بالکل اچھا نہیں۔

اب کمروں کے بارے میں بھی سُن لو۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ کمروں کی ترتیب کیسی ہے۔ اچھے آرام دہ ہیں۔ لیکن - کچھ بھرے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن سے بدبو آتی رہتی ہے لیکن اُن سے ایک خاص قسم کی بو ضرور آتی ہے۔

گھر میں پو پھٹتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جاگ چکا ہوتا ہے۔ اور لوگ باگ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تو کام پر جانا ہوتا ہے اور جو اس وقت نہیں جاتے اُن کا بھی ویسا ہی عالم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو ہم سب لوگ چائے پیتے ہیں۔ اور چونکہ چائے اپنا

زیادہ تر [illegible] کی ہیں اور پھر وہ بھی ضرورت کے مطابق نہیں ہیں لہٰذا ہر شخص کو ہی [illegible] انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کیتلی لے کر [illegible] انتظار کرے تو باقی کے لوگ اس جرم پر ٹوٹ پڑتے ہیں [illegible] ساتھ [illegible] کچھ ہوا تھا لیکن وہ واقعہ بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔ میں اُن وہی سب لوگوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اور سب سے پہلا واقف وہ [illegible] کا افسر تھا۔ وہ ایک رازداں قسم کا شخص ہے۔ اُس نے مجھے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بہن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ (اُس کی بہن کی شادی ضلع تولا میں کسی افسر کے ساتھ ہوئی ہے) اُس نے مجھے گرد لیسنڈ شہر کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُس نے مجھے ہر طرح مدد کا یقین دلایا اور پھر وہیں اُسی وقت مجھے چائے پر بھی مدعو کیا تھا۔ میں نے اُسے ایک ایسے کمرے میں پایا جہاں تاش کی بازی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ چائے کے بعد اُن سب نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر تاش کھیلوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ اس معاملے میں واقعی سنجیدہ تھے یا نہیں۔ وہ ساری مدت تاش کھیلتے رہے تھے اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا تو تب بھی اسی انہماک سے کھیل رہے تھے۔ تاش پھینکی جا رہی تھی اور چاک کو پھیلا جا رہا تھا۔ کمرے میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جب میں نے جوا کھیلنے سے انکار کر دیا تو مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ فلسفہ مت بگھارو۔ اُس کے بعد مجھ سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے پروا بھی نہیں کی۔ میں اب دوبارہ کبھی وہاں جاؤں گا بھی نہیں۔ وہ لوگ جوئے باز ہی تو ہیں۔ جوئے باز ہونے کے علاوہ اور وہ ہیں کیا! ہمارے درمیان ایک ادیب بھی رہتا ہے۔ وہ بھی اپنے کمرے میں لوگوں کو مدعو کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں کی ہر چیز میں ایک معصومیت ہے، وقار ہے، نزاکت ہے اور ہر چیز بہت بلند معیار پہ کی جاتی ہے۔

وارنیکا ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہہ دوں گا کہ ہماری مالکن بڑی جابر قسم کی بوڑھی عورت ہے۔ وہ تو چڑیل ہے۔ تم تھریسیا سے ملی ہو اور جانتی ہی ہو کہ وہ کتنی دُبلی پتلی ہے۔ بالکل مرغی کی مانند ہے۔ اور یہاں نوکر صرف دو ہیں۔ تھریسیا اور فالڈونی۔ فالڈونی کا شاید کوئی اور نام ہے لیکن اُسے فالڈونی کہہ کر پکارو تو وہ جواب دیتا ہے اور اسی لئے ہر شخص اسے فالڈونی کے نام سے پکارتا ہے۔ وہ سڑی قسم کا شخص ہے اور پہلے درجے کا کمینہ ہے۔ بندر جیسی تو اس کی ناک ہے۔ وہ ہر وقت تھریسیا کے ساتھ ہاتھا پائی کرتا رہتا ہے۔ اکثر اوقات تو نوبت گھونسہ بازی تک آ پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی یہاں اتنی خوشگوار نہیں ہے۔ یہاں لوگ کبھی ایک خاص مقررہ وقت پر نہیں سوتے۔ ہمیشہ کچھ لوگ تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسی باتیں بھی ہو گذرتی ہیں۔ جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اب تو میں ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں لیکن حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک گرہستی آدمی اس گندے ماحول میں رہنا گوارا کیسے کر سکتا ہے۔ ہال سے پرے ایک کمرہ ہے اُس میں ایک غریب کنبہ رہتا ہے۔ وہ کمرہ باقی کمروں سے الگ تھلگ ایک کونے کا کمرہ ہے۔ وہ خاموش طبع کنبہ ہے۔ وہ لوگ زیادہ نظر بھی نہیں آتے اور اُس اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ دن گذار رہے ہیں۔ اُس کنبے کے باپ کا نام گرشکوف ہے۔ اور وہ بیچارہ بیکار ہے۔ سات سال پہلے اُسے کسی وجہ سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی ہے اور اُس کے سر کے بال بھورے رنگ کے ہیں۔ اور بیچارہ اس طرح گھسٹتا ہوا چلتا ہے کہ اُسے دیکھ کر دل پہ ٹیس پہنچتی ہے اُس کی واسکٹ میری واسکٹ سے بھی زیادہ خستہ حال ہے۔ وہ بدقسمت بے حد اداس رہتا ہے۔ (ہم کبھی کبھی برآمدے میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں) اُس کے گھٹنے بے جان نظر آتے ہیں اور یوں تو اُس کے ہاتھ اور سر میں لرزہ طاری رہتا ہے۔ کسی بیماری یا خدا جانے کس وجہ سے اُس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ بہت ہی ڈرپوک قسم کا شخص ہے۔ ہر شخص سے جھینپ جاتا ہے اور صرف اپنے آپ تک محدود رہتا ہے۔ کئی مرتبہ یہ میں بھی ہر شخص سے ہچکچاتا ہوا نظر آتا ہوں لیکن اُس کا حال تو مجھ سے بھی بڑا ہے۔ اُس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بالکل اپنے باپ کی مانند ہے۔ اُس کی بیوی کو ایک نظر دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ کسی وقت وہ ضرور حسین ہو گی کیونکہ اب بھی اُس میں ایک کشش ہے۔ لیکن وہ بیچاری چیتھڑوں میں لپٹی رہتی ہے۔ اُن کے سر پر کرایہ بھی بہت چڑھ گیا ہے۔ کم از کم میں نے ایسا ہی سُنا ہے۔ اور مکان مالکن اُن کے ساتھ کسی صورت بھی اچھی طرح پیش نہیں آتی۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ کسی جھگڑے کی بنا پر گرشکوف کو نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی تفتیش ہوئی تھی یا مقدمہ چلا تھا۔ لیکن خدا کی پناہ وہ تو بالکل کنگال ہیں۔ اُن کے کمرے سے کبھی کوئی آواز تک نہیں سُنائی دیتی۔ ایسا سناٹا چھایا رہتا ہے جیسے اس کمرے میں کوئی بھی نہ

رہتا ہو۔ بچوں تک کی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ میں نے کبھی اُنھیں اِدھر اُدھر نکلتے یا کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بہت بڑی بات ہے۔ ایک شام جب میں اُن کے کمرے کے سامنے سے گذرا تو اندر سے مجھے سِسکیاں لے لیکر رونے کی آواز سُنائی دی۔ اُس وقت باقی گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سِسکی کے بعد مجھے سرگوشی کی آواز سُنائی دی اور پھر کسی کے سِسکنے کی آواز۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس قدر ڈر کر اور دُکھ درد سے رو رہا تھا کہ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ میں ساری رات اُن کے بارے میں سوچتا رہا اور ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا تھا۔

اچھا میری وارنیکا — میری ننھی سی نایاب گڑیا — خدا حافظ۔ میں جس طرح خط لکھتا ہوں اس سے خفا نہ ہونا۔ میں صاحب اسلوب نہیں ہوں۔ بالکل نہیں۔ کاش میرا کوئی اسلوب ہوتا۔ تمہیں خوش کرنے کی غرض سے جو کچھ مجھے سوجھتا ہے میں وہی کچھ لکھ دیتا ہوں۔ اگر مجھے عمدہ تعلیم ملی ہوتی تو بات کچھ مختلف ہوتی۔ لیکن مجھے تعلیم ملی کیسی! ایک دمڑی کے برابر۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

تمہارا مستقل اور مخلص دوست

ماکار

۲۵۔ اپریل۔

مائی ڈیر ماکار

آج مجھ سے میری چچازاد بہن ساشا ملی تھی۔ اُس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی وہ تو برباد ہو جائے گی۔ ہاں مجھ تک افواہ پہنچی ہے کہ اینا فیوڈورانا میرے بارے میں اطلاعات حاصل کرتی رہی ہے۔ کیا وہ مجھے زندگی میں کبھی اکیلے جینے دے گی؟ — وہ مجھے معاف کر دینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ گڑے مُردے نہ اکھاڑے جائیں۔ اور کچھ ہی دنوں میں مجھ سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم میرے دُور کے بھی رشتہ دار نہیں ہو۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وُہ میرے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ تمہاری خیرات اور مدد لے کر زندہ رہتے ہوئے مجھے شرم آنی چاہیئے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے اُسکی میزبانی کے احسانات کو بھُلا دیا ہے۔ نیز اس کا دعوے ہے کہ اسی نے میری ماں کو اور مجھے بھوک کے ہاتھوں مرنے نہیں دیا تھا۔ اور وہ جو اڑھائی برس اُس نے ہمیں کھانا کھلایا تھا اس سے بیچاری کا بہت خرچ بڑھ گیا تھا۔ لیکن جو کچھ ہُوا سو ہُوا وہ سب سے بڑا احسان یہ کر رہی ہے کہ وہ ہمارے پورے گزشتہ قرضے کو بخش دے گی۔ ہائے اس نے جو میری غریب ماں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ کاش امّی جان کو یہ پتہ چل جائے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ لیکن خدا تو سب کچھ دیکھ رہا ہے نا۔ اینا فیڈورونا کا تو یہ کہنا ہے کہ یہ سب قصور میرا اپنا ہے جو میں اپنی خوشیاں کھو بیٹھی ہوں۔ وہ تو کہتی ہے کہ اس نے مجھے راستہ بتایا تھا اور یہ اُس کا قصور نہیں ہے جو میں اپنی عزت نہ بچا سکی اور نہ شاید بچا سکوں گی۔ اوہ میرے خدا پھر یہ سب قصور کس کا ہے۔ اینا کہتی ہے کہ مسٹر بائیکوف غلطی پر نہیں ہے اور پھر کسی آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس عورت سے شادی کر لے جو........ خیر یہ سب کچھ لکھنے سے کیا حاصل؟ ماکار ایسی ناانصافی برداشت کرنا بہت مشکل ہے مجھے خبر تک نہیں کہ میرے ساتھ کیا بیت رہا ہے۔ میں یہاں بیٹھی کانپتی رہتی ہوں سِسکیاں لے لیکر روتی ہوں۔ اس خط کو لکھنے میں مجھے دو گھنٹے لگے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آخر کار وہ سمجھ جائے گی اور تسلیم کرے گی کہ اُس نے مجھے کس غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ لیکن انجام سب پہ واضح ہے۔ پھر بھی تم فکر مت کرو تم میرے واحد مددگار ہو۔ فیڈورا ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بتاتی ہے مجھے بخار نہیں ہے۔ کل میں ذرا دیر کے لئے والکو چرچ تک گئی تھی اور بس اسی آنے جانے میں ذرا سردی لگ گئی۔ لیکن تم میرے ساتھ کیوں نہیں آئے؟ میں نے التجا کی تھی منت مانگی تھی گڑگڑائی تھی کہ میرے ساتھ چلنا۔ ہائے میری امّی جان — کاش آپ ایک بار قبر سے اٹھ سکیں اور دیکھ سکیں کہ لوگوں نے میرا حال کیا کر دیا ہے۔

وی۔ ڈی۔

۲۰ رمئی۔

میری فاختہ وارنیکا۔

میں تمہارے لئے کچھ انگور بھیج رہا ہوں۔ انگور صحت کے لئے اچھے ہوتے ہیں۔ پیاس بجھانے کیلئے ڈاکٹر لوگ بھی انگور کی ہدایت کرتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر میں نے انگور بھیج دئے ہیں۔ صرف پیاس کا مقابلہ کرنے کیلئے۔ کل تم نے کچھ سیب کھانے کی خواہش ظاہر کی تھی میں تمہارے لئے کچھ سیب بھیج رہا ہوں۔ عزیزم یہ بتاؤ اب تمہاری بھوک کیسی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ خوب بھوک لگنی چاہیئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بِپا کٹ گئی اور اب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہونیوالا ہے۔ ہمیں خدا کے حضور میں سجدہ کرنا چاہیئے۔ اب رہی کتابوں کی بات تو ابھی میں

انہیں حاصل نہیں کر پایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان دنوں ایک بہت ہی اچھی کتاب شائع ہوئی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ میں نے ابھی تو کتاب کو نہیں پڑھا لیکن جس سے بات کرو وہی اس کی تعریف کرتا ہے اور کچھ لوگوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ مجھے کتاب مستعار دیدیں گے کیا تم پڑھنا چاہو گی۔ تم اتنی نازک مزاج ہو کہ بڑی مشکل سے تمہیں کچھ پسند آتا ہے۔ دیکھو میں تمہارے ذوق سے بخوبی واقف ہوں۔ غالباً تمہیں ایسی چیز زیادہ پسند آتی ہے جس میں شعریت ہو جیسے آہیں بھر بھر کے داستانِ محبت بیان کی گئی ہو۔ بے فکر رہو میں تمہارے لئے ایسی کتاب بھی حاصل کرلوں گا۔ ان لوگوں کے پاس مجموعۂ شعری بھی ہے۔

رہا میرا سوال تو یہاں سب خیریت ہے۔ اور عزیزم تم میرے بارے میں فکر نہ کرنا۔ اور فیڈورا جو کچھ بھی کہتی ہے اُس پہ زیادہ دھیان نہ دیا کرو اُس سے کہہ دو کہ اِدھر اُدھر کی باتیں اُڑانا اُس کی پرانی عادت ہے۔ انہی الفاظ میں اُس سے یہ بات کہہ دو۔ میں نے اپنی نئی وردی نہیں بیچی۔ اور میں کیوں بیچنے لگا۔ آخر کس لئے؟ میں نے اُڑتی سی خبر سُنی ہے کہ مجھے تنخواہ میں مزید چالیس روبل ملنے والے ہیں۔ پھر وہ وردی مجھے بیچنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ جانِ من ایسی باتوں پہ گھبرایا نہ کرو اور تم تو جانتی ہو کہ فیڈورا بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے اور خواہ مخواہ گھبراتی رہتی ہے۔ اچھے دن بھی آنے والے ہیں۔ میرے فرشتے بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔ خدا کی محبت کے ناطے پر تندرست ہو جاؤ اور ایک بوڑھے شخص کو نا اُمید مت کرو۔ ہاں تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں دُبلا ہو گیا ہوں۔ یہ بھی محض افواہ ہے بالکل بے پر کی اُڑائی ہے کسی نے مجھے جتنا تندرست ہونا چاہیئے میں اتنا تندرست ہوں بلکہ اس قدر صحت مند ہو گیا ہوں کہ ـــــ اب کیا کہوں مجھے خود شرم آتی ہے۔ میں تو عیش کر رہا ہوں۔ بس تم اچھی ہو جاؤ۔ اچھا خدا حافظ۔ اپنی ننھی سی انگلیوں پہ میرا بوسہ قبول کرو۔

تمہارا ابدی دوست

ماکار۔

ایک بات اور جانِ من یہ تم کیا لکھتی رہتی ہو؟ کچھ سمجھ دار بنو! میں آئے گئے تم سے ملنے کیسے آسکتا ہوں۔ میں ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں۔ سوائے تاریکی کی آڑ لینے کے اور کس وقت میں تمہارے پاس آسکتا ہوں! اور اس موسم میں راتوں کو بھی نام کی تاریکی ہوتی ہے۔ اور جب تم اس قدر بیمار تھیں اور تمہارا من بھٹک گیا تھا اس وقت کیا ایک پل کیلئے بھی میں تمہارے سرہانے سے اُٹھا تھا۔ اب مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ میں وہ سب کچھ کیسے کر پایا تھا لیکن افواہیں اور لوگوں کی باتیں سن کر تھم جانا پڑا تھا۔ اور اب بھی لوگ کچھ نہ کچھ بکتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے تھیریسا پہ پورا اعتماد ہے۔ وہ باتونی نہیں ہے لیکن ذرا غور کرو کہ لوگوں کو ہمارے بارے میں زیادہ علم ہو گیا تو کیا کیا باتیں بنیں گی۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے اور کیا کچھ کہتے پھریں گے صبر کرو۔ اور صحت یاب ہونے تک انتظار کرو پھر ہماری تمہاری ملاقات انشاءاللہ رہے گی۔

ارجان۔

میرے محترم ماکار۔

میں نے بہت چاہا کہ ایسی کوئی بات کروں جو تمہیں بہت پسند آئے۔ تم نے مجھ پہ جس طرح پیار نچھاور کیا ہے میں اس کے بدلے تمہیں کسی طرح بھی خوش کرنا چاہتی ہوں۔ اور میرے دل میں یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ آخر کار میں نے اپنی میز کا ہر خانہ چھان ڈالا اور یہ پرانی کتاب میرے ہاتھ لگی ہے۔ میں یہ تمہیں بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس کتاب کو فارغ البالی کے ایام میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ اور پھر وقفے ڈال ڈال کر اسے پڑھتی رہی تھی۔ تم نے کئی بار میرے ماضی کے بارے میں پوچھا ہے۔ تم نے میری امی جان، پوکروسکی، ینا فیڈورونا کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں اور موجودہ مشکلات کے بارے میں کچھ جاننا چاہا ہے۔ یہ حالات جاننے کا تمہیں بے حد اشتیاق تھا اور میں نے اس کتاب میں خدا جانے کیوں بہت سی باتیں لکھ رکھی ہیں۔ جب کبھی مجھے وقت ملا میں نے اپنے ماضی کے بارے میں اس کتاب میں سب کچھ لکھ دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر تمہیں خوشی ہو گی۔ میں تو جب انہیں پڑھتی ہوں اور زیادہ اداس ہو جاتی ہوں۔ یوں نظر آتا ہے کہ اس کتاب کی آخری سطر لکھتے وقت میری جتنی عمر تھی اب میری عمر اُس سے دوگنی ہو گئی ہے۔ ماکار ـــ خدا حافظ! میں بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ میں تنہا ہوں اور راتوں کو جاگنے کی مریض ہو چکی ہوں۔

دی۔ ڈی۔

(۱)

جب میرے ابا جان نے وفات پائی تو میں چودہ برس کی تھی۔ میرا بچپن خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ شہزادہ پی کی جاگیر میں میرے ابا جان ناظم کی حیثیت سے ملازم تھے اور ہم لوگ وہاں خوشی سے اور آرام سے رہا کرتے

تھے۔ اور شہزادے کے ایک گاؤں میں کوئی بھی جاتا تک نہ تھا۔ وہ گاؤں یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ میں بچپن میں پگلی نہ بیٹھتی تھی اور ہمیشہ باغات، چراگاہوں اور جنگلات میں اچھلتی کودتی رہتی تھی۔ ابا جان کو جاگیر کی دیکھ بھال سے فرصت نہ ہوتی تھی اور امی جان کو گھر کے کام کاج سے فراغت نصیب ہوتی تھی۔ لہٰذا میں آزاد ہوتی تھی۔ مجھے پڑھانے لکھانے والا کوئی نہ تھا اور مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی۔ میں علی الصبح تالاب کے کنارے جا بیٹھتی تھی، گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا پہنچتی تھی وہاں سے چوکڑیاں بھرتا تو گھاس اور فصل کاٹنے والوں کے درمیان جا کھڑی ہوتی۔ میں نے اس بات کی کبھی پروا نہ کی تھی کہ دھوپ بہت تیز ہے یا میں گھر سے بہت دور نکل آئی ہوں۔ مجھے اس بات کا کبھی خیال نہ رہتا تھا کہ جھاڑیوں میں اچھلنے کودنے سے میرے ہاتھ یا منہ پر خراشیں آگئی ہیں یا میرا لباس تار تار ہو گیا ہے۔ اور پھر اگر گھر پہنچ کر ڈانٹ بھی پڑ جائے تو کیا فرق پڑتا تھا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر میری ساری عمر اس گاؤں میں کٹ جاتی تو میں بے حد خوش رہتی۔ لیکن نصیبوں میں کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ میں ابھی بارہ برس کی بچی ہی تھی کہ ہم لوگوں کی تبدیلی سینٹ پیٹرس برگ میں ہو گئی۔ اُس روانگی کی یاد سے اب بھی میرے دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ مجھے وہاں کی جو چیز عزیز تھی میں نے اُس سے رو رو کر الوداع مانگی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کیسے سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے ابا جان کی گردن سے لپٹ گئی تھی اور اُن سے بلک بلک کر التجا کی تھی کہ ذرا دیر اور رُک جائیں۔ ابا جان خفا ہو گئے تھے اور انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ امی جان نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ تیرے ابا کا کام ہی ایسا ہے بیٹی اس لئے ہمیں جانا ہی پڑے گا۔ شہزادہ پی کی وفات ہو گئی تھی۔ اور اس کے جانشینوں نے میرے ابا جان کو برخاست کر دیا تھا۔ میرے ابا جان نے سینٹ پیٹرس برگ میں کچھ تاجروں کے ساتھ حصہ داری کر لی تھی اور ان کا خیال تھا کہ دارالخلافہ میں رہنے سے ہماری حالت سُدھر جائے گی۔ یہ بات مجھے امی جان نے بعد میں بتائی تھی۔ پیٹرس برگ میں پہنچ کر ہم لوگ پیٹرس برگ سٹورونا میں ٹھہرے تھے اور ابا جان کی وفات تک وہیں رہے تھے۔

نئے ماحول سے آشنا ہونا میرے لئے کس قدر دشوار تھا یہ میں بتا نہیں سکتی۔ ہم بہار کے موسم میں پیٹرس برگ پہنچے تھے۔ لیکن جب ہم اُس گاؤں سے روانہ ہوئے تھے تو اُس دن بڑی پیاری دھوپ تھی۔ فضا میں حدت اور رونق تھی۔ کھیتوں کا کام قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ زمین پر چاروں طرف گندم بکھری پڑی تھی۔ اور اوپر آسمان میں چڑیاں چہچہاتے ہوئے اڑتے پھر رہے تھے۔ ہر شے پہ ایک حُسن سا نکھرا تھا۔ اور جب ہم شہر میں پہنچے تھے تو وہاں سوائے بادلوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میرا کسی کو خیال تک نہ رہا تھا۔ اور پہلے ہی دن کتنا دکھ ہوا تھا گھر کے سامنے تاروں کی باڑھ تھی اور نیچے گلی میں زمین کا کوئی حصہ خشک نہ تھا اور پھر بہت کم لوگ گلی سے گذرتے تھے اور جو گذرتے تھے وہ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کیلئے لمبے لمبے کوٹوں میں لپٹے رہتے تھے۔

ہمارا گھر بھی نہایت بدنما اور بے رونق تھا۔ ہمارا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ دوست۔ انیا فیڈورنا سے ابا جان کے تعلقات اچھے نہ تھے (ابا جان کو اُس کا کچھ قرض چکانا تھا) اور گھر میں اکثر و بیشتر ابا جان کے حصہ دار سوداگر آیا کرتے تھے۔ اور وہ بات بات پر جھگڑتے تھے اور بحث کرتے وقت زور زور سے چلایا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ہمیشہ ابا جان کو دُکھی کر جایا کرتے تھے اور وہ چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ابا جان لگاتار کئی پہروں فرش پہ ادھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ اُس عالم میں ان سے بات کرنے کی ہمت امی جان میں بھی نہ ہوتی تھی اور میں بھی ایک کونے میں کتاب پکڑے چوہے کی طرح دبک کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ میں آنے کے تین مہینے بعد مجھے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ اُف توبہ۔ ان اجنبی چہروں کے درمیان جا کر میرا دل بجھ کے رہ گیا تھا۔ کوئی بھی تو دوست نظر نہ آتا تھا۔ ماسٹر ہمیشہ مجھے ڈانٹتے رہتے اور لڑکیاں میرا مذاق اُڑایا کرتیں۔ اس قدر پابندی اور سختی تھی کہ بس ہر کام کے لئے مقررہ اوقات ہوتے تھے یہاں تک کہ کھانا کھانے کا وقت مقرر تھا۔ اور ہمارے سبق تو نہایت ہی صبر آزما ہوتے تھے۔ ہر چیز دل شکن اور دُکھ دینے والی تھی۔ شروع شروع میں تو میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ اور میں تمام رات بستر پر لیٹی آنسو بہاتی رہتی۔ وہاں کی ہر چیز سے میرے دِل کو دُکھ پہنچتا اور اپنے گاؤں کی معمولی سے معمولی چیز کی یاد سے بھی دل خوش ہو جاتا تھا۔ اور میں ہمیشہ یہ تمنا کیا کرتی تھی کہ کاش میں وہاں پہنچ جاؤں۔ کاش میں اُس چھوٹے سے کمرے میں جا پہنچوں جہاں آشنا چہرے نظر آئیں، ہر چیز آشنا ہو، راحت افزا ہو، جاں بخش ہو۔ کیا میں میں خوشی کے مارے والہانہ طور پر اپنی امی جان کے گلے سے لپٹ جاتی۔ میں وہاں بیٹھی یہ سب باتیں سوچا کرتی اور اتنا روتی کہ مجھے پورا سبق بھول جاتا اور تمام رات میں اپنے اُستادوں، سکول کی

… کے بارے میں خواب دیکھا کرتی تھی
… اپنے سبق اچھی طرح یاد کر لیتی ہوں لیکن مجھے سمجھ ہی … دب ہی جاتی۔ وہ مجھے سزا کے طور پر گھنٹوں … اور صرف رات کا کھانا دیا کرتے۔ میں ہمیشہ اداس … تو لڑکیاں میرا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ مجھے دق کیا کرتی تھیں … میں اپنے استاد کے کسی سوال کا جواب دیا کرتی تو … کرتی … بات کرہ یاد رکھتیں کہ مجھے سب بھول جاتا تھا کھانے کے وقت جب ہم ٹولیاں بنا کر سکول سے باہر نکلتیں تو وہ سب مجھے ستاتی تھیں اور پھر بعد میں خود ہی ہیڈ مسٹرس کے پاس میری شکایت کر دیتی تھیں۔ لیکن جب ہر سنیچر کی رات کو نینی مجھ سے ملنے کیلئے آیا کرتی تھی تو مجھے کتنا اچھا لگتا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ جاتی اور اس کا منہ چوم لیا کرتی۔ وہ مجھے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ دیا کرتی۔ اور پھر ہم دونوں گھومنے نکل جاتیں لیکن جب ہم واپسی پر گھر کی طرف چلتیں تو رخصتی چلتے میں میرا ساتھ نہ دے سکتی۔ اور میں گھر پہنچنے تک کسی نہ کسی بات پر لڑتی جھگڑتی۔ اور جب میں گھر پہنچتی تھی تو اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور بے حد خوش محسوس کیا کرتی۔ میں اس طرح گھر کے ہر شخص سے لپٹ جاتی اور انہیں چوم لیا کرتی تھی جیسے میں دس برسوں بعد گھر واپس آئی ہوں۔ اور پھر گھر میں کیا غل غپاڑہ مچ جاتا تھا۔ ہر شخص ایک دم اپنی بات شروع کر دیتا اور عجیب و غریب کہانیاں سننے میں آتیں۔ میں ہر شخص سے لپک کر ملتی تھی۔ میں زور زور سے ہنستی، شور مچاتی اور اودھم مچا دیتی تھی۔ پھر اپنی پڑھائی کے بارے میں ابا جان کے ساتھ بڑی سنجیدہ گفتگو ہوا کرتی فرانسیسی گرامر، موسیو ڈی گرانڈ اور دو استادوں کے بارے میں بات چیت ہوتی اور ہر کوئی خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اب بھی وہ باتیں یاد کر کے میں مسکرا اٹھتی ہوں۔ میں نے اپنے ابا جان کی خاطر سبق یاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میں جانتی تھی کہ میری پڑھائی پر وہ اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی کی آخری پائی تک خرچ کر رہے ہیں۔ اور خدا جانے وہ کیسے گزارہ کر رہے ہیں۔ وہ دن بدن اداس، بے چین اور چڑچڑے ہوتے گئے۔ ان کے ساتھ نباہ کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کا کاروبار دن بدن خراب ہوتا گیا۔ اور ان کے سر پر بھاری قرضہ چڑھ گیا۔ ان کا بال بال قرضے میں جکڑ گیا۔ اور قیامت یہ تھی کہ قرضہ اتارنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جب میں سکول سے واپس آیا کرتی تو گھر میں ہر شخص کو اداس پایا کرتی۔ ابا جان کو اکثر گم سم دیکھا کرتی اور امی جان کی آنکھوں سے میں صاف سمجھ گئی کہ انہوں نے کوئی اندر کا روگ لگا لیا ہے۔ گھر میں ترش اور سخت سست باتیں ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ابا جان گلہ کیا کرتے کہ میں انہیں کوئی خوشی نہیں پہنچا رہی کوئی آرام نہیں دے رہی وہ کہا کرتے کہ انہوں نے میری پڑھائی پر آخری پائی تک خرچ کر دی ہے اور میں فرانسیسی زبان بولنا تک نہیں سیکھ پائی۔ المختصر تمام ناکامیوں اور مایوسیوں کا الزام مجھ پر اور امی جان پر تھوپ دیا گیا۔ اور اف! ابا جان میری امی کو کس طرح اذیتیں دیا کرتے تھے۔ امی جان کو ایک نظر دیکھتے ہی میرا دل تھام کر رہ جاتا۔ ان کے گالوں میں گڑھے، ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن سب سے بڑی شامت تو میری تھی۔ ہمیشہ کوئی معمولی سی بات چھڑ جایا کرتی تھی اور پھر خدا جانتا ہے کہ وہ کیا شکل اختیار کر لیتی۔ اکثر بیشتر میں یہ بھول جایا کرتی کہ یہ سب فساد ہو کس لئے رہا ہے۔ میرے خلاف ہر قسم کا الزام عائد کر دیا جاتا۔ میں گرامر اور سبق یاد کرنے کی لاکھ کوشش کرتی لیکن تہمت پھر بھی مجھ پر دھر دی جاتی۔ اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ ابا جان کو مجھ سے پیار نہ تھا۔ بلکہ وہ امی جان اور مجھ پر فریفتہ تھے۔ بس یہ ان کی خوبی تھی۔

اپنی مصیبتوں اور ناکامیوں میں گھر کر اور ان سے گھبرا کر میرے ابا جان جذباتی اور شکی مزاج کے ہو گئے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ اپنی صحت کا بھی خیال نہ رکھا کرتے اور آخر کار انہیں سردی لگ گئی اور مختصر سی علالت کے بعد چل بسے۔ ان کی موت اس قدر جلد اور غیر متوقع طور پر ہوئی تھی کہ کچھ دن تک تو ہم لوگ گنگ پاگل سے بنے بیٹھے رہے۔ ہمیں یقین تک نہ آیا کہ وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں۔ امی جان کو دورے پڑنے لگے اور اب مجھے ان کی فکر لاحق ہوئی۔ میں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر کانپ اٹھتی تھی۔ ادھر ابا جان کے مرنے کی دیر تھی ادھر قرض خواہ ہم پر بھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک منظم جماعت بن کر آ دھمکے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا ہمیں سب کچھ دینا پڑا۔ پیٹرس برگ پہنچنے کے چھ مہینے بعد جو چھوٹا سا گھر ابا جان نے خریدا تھا اسے بیچنا پڑا۔ مجھے کوئی علم نہیں کہ آخر کار یہ معاملہ کیسے سلجھا تھا لیکن ہم اس کے بعد بے گھر رہے اور دو وقت پیٹ پالنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تپ دق بھی امی جان کو اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ گھر میں نام کو اناج نہ تھا، پیسہ نہ تھا اور اس پر ستم یہ تھا کہ کوئی امید نہ تھی۔ اس وقت میری عمر صرف چودہ برس کی تھی

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ اینا فیڈورنا ہم سے پہلی بار ملنے آئی تھی۔ اُس نے یہ بات بار بار جتائی کہ وہ کوئی کھیوڑ مورفی نہ میدار تھی اور ہمارے رشتہ دار بھی تھے۔ امی جان بھی کہتی تھیں کہ وہ ہمارے رشتہ دار تو ضرور ہے لیکن بہت دُور کی رشتہ دار ہے۔ ابا جان کے جیتے جی وہ ہم لوگوں سے ملنے کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ ہمدردی دکھانے کیلئے آنسو بہاتی ہمارے پاس آئی۔ اس نے ہمارے نقصان اور حالات کا حال سن کر بڑی ہمدردی کی باتیں بنائیں لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ سب قصور ابا جان کا تھا۔ وہ اپنی بساط سے باہر پیسہ خرچ کرتے رہے اور وہ ضرورت سے زیادہ شان سے رہتے تھے اور ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔

اُس نے کھلے لفظوں میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ہماری دوست بننا چاہتی ہے اور اُس نے امی جان سے کہا کہ ماضی میں جو کچھ ہوا اُسے بھول جانا ہی اچھا ہے۔ اور جب امی جان نے اُسے بتایا کہ اُن کے دِل میں کبھی کوئی رنجش یا دشمنی نہ تھی تو اینا خوب رو بھی تھی۔ وہ امی جان کو گرجے لے گئی اور وہاں اُس نے مرحوم ابا جان کی رُوح کو شانتی پہنچانے کیلئے عبادت کا انتظام کرایا۔ بس اس طرح ہم آپس میں گھل مِل گئے۔

اُس کے بعد اُس نے کئی موقعوں پر ہمارے بُرے دنوں، ہماری انتہائی بے کسی اور بے بسی کا ذکر کرکے تجویز پیش کی کہ اُس کا جو چھوٹا سا گھر ہے ہم وہیں جا بسیں۔ امی جان اس پیش کش کیلئے شکر گذار تو بہت ہوئیں لیکن ایک عرصے تک وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر پائیں۔ لیکن اور کوئی راستہ بھی نہ تھا اور ہم کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ آخر کار امی جان نے اینا کو باہزار ان عاجزی اطلاع دے دی کہ اُس کی پیش کش ہمیں قبول ہے۔ بس صبح ہم پیٹرس برگ سے ولیلسکی جزیرے میں جا پہنچے تھے مجھے وہ صبح آج بھی بخوبی یاد ہے۔ مطلع صاف تھا اور صبح خوشگوار تھی۔ امی بالی رو رہی تھیں اور میں بہت غمگین تھی مستقبل کے دھندلے تصور دِل پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کتنی مصیبت کے دِن تھے . . . .

(۲)

اینا کی جاگیر ریلوے لائن پر واقع تھی۔ اور جب تک ہی گھر کے دستور اور رواج سے آشنا نہ ہوئے تھے تب تک زندگی کا ایک ایک لمحہ پُرخوف اور عجیب انداز سے گذرتا تھا۔ گھر میں پانچ کمرے تھے۔ تین کمرے اینا اور ساشا کے پاس تھے۔ ان کے ساتھ ایک یتیم عورت بھی رہتی ہے۔ اس عورت کو اینا نے اپنایا ہوا تھا۔ چوتھا کمرہ مجھے اور امی جان کو دے دیا گیا تھا اور پانچواں کمرہ کسی غریب طالب علم نے کرائے پہ لے رکھا تھا۔ اُس کا نام مسٹر پوکروسکی تھا

اینا فیڈرونا جتنی امیر تھی اتنی دیکھنے میں نظر نہ آتی تھی بلکہ اُس کی آمدنی اتنا ہی پُراسرار تھا جتنا اس کا ہر کام۔ وہ کبھی آرام سے نہ بیٹھتی تھی ہمیشہ مصروف رہتی تھی اور کسی نہ کسی کام میں لگی ہی رہتی تھی۔ اس کے بات پوچھتی کردن میں کئی بار وہ گھر سے باہر جایا کرتی تھی۔ لیکن وہ کرتی کیا تھی یہ تو میری سوچنے کی طاقت سے باہر تھا۔ اُس کی جان پہچان کے شمار لوگ گھر میں آتے ہی رہتے تھے۔ وہ لوگ کون تھے یہ خدا ہی جانے۔ وہ ہمیشہ کسی کام کے سلسلے میں ملتے تھے اور گھر پہ بمشکل ایک منٹ کیلئے ٹھہرتے تھے۔ جب بھی باہر دروازے کی گھنٹی بجتی تو امی جان مجھے کمرے کے اندر بُلالیا کرتیں اور اینا امی جان کی اس حرکت پہ بے حد خفا ہوتی تھی۔ وہ امی جان پہ برس پڑتی کہ ہم لوگ بہت مغرور ہیں اتنے مغرور جتنی ہماری اوقات نہیں ہے اور وہ کہا کرتی تھی کہ اتنا مغرور ہونے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اور وہ پہروں ایسی باتیں کہتی رہتی جو اُس وقت اس لعن طعن کا مطلب میں نہ سمجھ سکتی تھی لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ امی جان اینا کے گھر جانے سے کیوں ہچکچاتی تھیں۔ وہ بد مزاج عورت تھی اور ہمارے لئے وہ مستقل عذاب بن گئی تھی۔ لیکن یہ بات میرے لئے اب بھی ایک راز ہے کہ اُس نے ہمیں وہاں آنے کو کہا کیوں تھا۔ پہلے پہل تو وہ کافی رحم دلی سے پیش آئی تھی اور بڑی دیر کے بعد اُس کی اصل فطرت ہم پہ کھل سکی تھی لیکن اُس کے رویئے میں فرق تب آیا تھا جب وہ جان گئی تھی کہ ہم بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہیں اور حقیقتاً ہم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ بعد ازاں میرے ساتھ اُس کا سلوک پھر اچھا ہو گیا تھا۔ اچھا کیا وہ میرے ساتھ گھل مِل بھی گئی تھی اور میری چاپلوسی بھی کیا کرتی تھی۔ لیکن میں نے اُس کے ہاتھوں امی جان سے کم اذیت برداشت نہیں کی۔ وہ بار بار اپنی سخاوت کا ذکر چھیڑ دیتی بلکہ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہ کیا کرتی تھی۔ وہ ہمیں اجنبی لوگوں سے اس طرح متعارف کرتی جیسے ہم اُس کے یتیم رشتہ دار تھے۔ جنہیں اُس نے عیسائی خیرات کے ناطے پناہ دی ہو۔ کھانا کھاتے وقت وہ حسد بھری نظروں سے ہمارا ایک ایک لقمہ دیکھا کرتی اور اگر ہم لوگ کم کھانا کھاتے تو پھر ڈانٹ پھٹکار شروع ہو جاتی۔ ہم لوگ نازک اور حساس طبیعت کے تھے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہمیں راس نہ آتا تھا۔ وہ طنز کیا کرتی کہ کیا کبھی ہم نے اس سے اچھی کوئی چیز دیکھی بھی ہے۔ ابا جان کو بُرا بھلا کہنے سے وہ کبھی باز نہ آتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ ہمارے ابا جان نے دوسرے لوگوں سے اچھی زندگی گذارنے کی کوشش کی۔ لیکن انجام کتنا بُرا ہوا؟ اپنے بال بچوں کو بھکاری بنا کر رکھ دیا ہے اور اگر وہ فراخ دِل اور نیک دل رشتہ دار نہ ہوتی تو کون جانے کہ ہم لوگ سڑکوں پہ بھوکوں مر رہے ہوتے۔ اُس نے کیا نہیں کہا۔ اُس کی باتیں

سُن سُن کر شکایت کم ہوتا تھا اصل میں بغاوت کا جذبہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ امی جان تو بیچاری اُس کی باتیں سُن سُن کر رو دیتی تھیں، اور اُن کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ وہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم صبح سے لیکر رات تک کام کرتی رہتیں اور اکثر دوسروں کے کپڑے سینے کا کام کیا کرتی تھیں۔ اینا اس پر بھی خفا ہوتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ اُس کا گھر چلانا کوئی مدد کا کام نہیں ہے۔ لیکن ہمیں تو اپنے کپڑے خریدنے اور آئے دن کے اخراجات پورے کرنے کیلئے کام کرنا تھا۔ علاوہ ازیں ہم اس کوشش میں بھی تھیں کہ کچھ پیسہ جمع کرکے کہیں اور چلے جاتے۔ لیکن اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ امی جان کی رہی سہی صحت بھی جواب دے گئی۔ بیماری اُن کی جان کو بن آئی اور جوں جوں ہفتے گذرتے گئے میں امی جان کو موت کے منہ میں جاتی دیکھتی رہی۔ ہم دونوں یہاں چپ چاپ رہا کرتی تھیں۔ بالکل جیسے دیہات میں دور ہی بھلا۔ اور جیسے جیسے اینا کو احساس ہوتا گیا کہ ہم دونوں کیسی قسمت اس کے بس میں ہیں تو وہ بھی اکڑتی گئی۔ کبھی کوئی سوچ تک نہ سکتا تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کیا جائے۔ ہمارے اور اُس کے کمرے کے درمیان ایک پردہ پڑتا تھا اور ہمارے ساتھ والا کمرہ پوکر دفسکی کا تھا۔ وہ بیچارہ ساشا کو فرانسیسی، جرمن، تواریخ، جغرافیہ وغیرہ جیسا کہ اینا نے کہا تھا۔ سائنس کی بھی کتابیں پڑھاتا تھا اور اس کے معاوضے میں اسے کمرہ اور دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ ساشا کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی اور وہ بہت حاضر جواب تھی لیکن اس میں ایک گنوار پن بھی تھا۔ ایک بار اینا نے کہا کہ ساشا کے ساتھ میں بھی پڑھ لیا کروں کیونکہ سکول میں میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی تو امی جان نے بخوشی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ میں بھی ساشا کے ساتھ پڑھنے لگی اور پوکر دفسکی نے ایک سال تک ہم دونوں کو تعلیم دی۔

پوکر دفسکی بہت ہی مُفلس نوجوان تھا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت اس کی صحت نہ دیتی تھی۔ اور اُسے محض عادت کی بنا پر طالب علم کہا جاتا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے وہاں رہتا تھا کہ ہمیں اس کے کمرے سے آواز تک نہ سنائی دیتی تھی۔ اور اُس کی شکل و صورت بھی عجیب و غریب تھی۔ اُسکے چلنے کا انداز بہت ہی بے ڈھنگا تھا۔ اُس کے آداب کرنے کا انداز بہت بھدا تھا۔ اور اُس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ پہلے دن تو میں اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکی تھی۔ ساشا اس کے ساتھ ہمیشہ اٹھکیلیاں کیا کرتی تھی اور خاص کر پڑھائی کے دوران میں تو اُسے ضرور بُدھو بنایا کرتی تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ بدمزاج تھا اور ذرا سی بات پر اُس کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ پھر وہ غصّے میں آکر چلّایا کرتا اور شرارتیں کیا کرتا اور کبھی کبھی تو سبق ادھورا چھوڑ کر ہی کمرے سے باہر نکل جاتا تھا۔ اور بس پھر وہ کئی کئی دن اکیلا کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور اپنی کتابوں میں کھو جاتا۔ اُس کے کمرے میں کئی کتابیں تھیں۔ سب کی سب نایاب۔ اور قیمتی۔ وقتاً فوقتاً وہ پیسے بھی کمایا کرتا تھا کیونکہ وہ ادھر ادھر بھی پڑھانے جاتا تھا۔ اور جونہی اُسے کہیں سے تنخواہ ملتی تھی وہ مزید کتابیں خرید لیتا تھا۔ جیسے جیسے میری اُس کی جان پہچان بڑھتی گئی تو میں محسوس کرنے لگی کہ میں نے اتنا اچھا اور نیک دل شخص کبھی نہیں دیکھا۔ امی جان اس کی بہت عزت کرتی تھیں۔ اور بعد ازاں تو بیچا کے بعد وہ میرا بہترین دوست تھا لیکن پہلے پہل میں بھی ساشا کے ساتھ مل کر اُس پر پھبتیاں کس دیتی تھی۔ ایک بار جب ہم نے اُسے اتنا ستایا کہ اُس کے آنسو نکل پڑے تو میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا تھا "کتنے ظالم بچے ہیں" اور ایک دم مجھ میں تبدیلی آگئی۔ مجھے بڑی شرم آ رہی تھی اور اپنے سلوک پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں بُری طرح شرما رہی تھی اور میری آنکھیں قریب قریب بھیگ گئی تھیں میں نے اُس سے معافی مانگی اور کہا کہ ہماری احمقانہ حرکتوں کا بُرا نہ مانے۔ لیکن اُس نے کتاب بند کر دی اور سبق ختم کرائے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں سارا دن روحانی اذیت میں مبتلا رہی اور یہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو کوستی کہ ہم نے اُس غریب کو رُلا دیا۔ کیا ہم توقع نہ کرتی تھیں کہ وہ رو دیگا؟ کیا ہم چاہتی نہ تھیں کہ وہ رو دے؟ اور بس اسی جذبے کے تحت ہم نے اُس مغموم اور مُفلس شخص کی حالت پہ طعنے دیے کہ اُسے اپنی بے بسی کا احساس دلا دیا۔ اُس رات میں ایک پل کیلئے نہ سو سکی تھی۔ میں اپنے آپ کو رہ رہ کر بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ میں بہت غمگین تھی بہت دُکھی تھی۔ کہاوت ہے کہ تأسف سے دل کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کہاوت کتنی جھوٹی ہے۔ اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ میرے رنج کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی جذبہ چھپا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے بچہ سمجھے اور میرے ساتھ بچوں جیسا سلوک کرے۔ میں پندرہ برس کی ہو چکی تھی۔

اس دن سے میرے دماغ نے ہزار ترکیبیں سوچیں کہ میرے اپنے متعلق پوکر دفسکی کا رویّہ کیسے بدلا جائے۔ اور ہر ترکیب میرے لئے اذیت دہ تھی مجھے سوچتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن میں شرمیلی تھی اور پھر ڈرپوک بھی اور مبہم خواب لینے کے سوائے کسی صحیح فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ (اور خواب بھی کتنے بے معنی تھے) میں فقط اتنا ہی کر سکی کہ اس کے ساتھ مذاق کرنے میں ساشا کا ساتھ نہ دیا کرتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے ہم سے بگڑنا چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے میرے غرور کی تسکین نہ ہوئی۔

اب یہاں میں ایک سب سے عجیب، دلچسپ اور قابلِ رحم شخص

کے بارے میں ضرور کچھ کہوں گی۔ میں اس موقع پر اس کا ذکر اس لئے کر رہی ہوں کہ اس سے پہلے میں نے اُس پر کبھی توجہ نہ کی تھی اور توجہ بھی صرف تبھی دینی شروع کی تھی جب اُس کے متعلق یہ واقعہ اہم ہوگیا۔

کبھی کبھار ایک پست قد بوڑھا شخص اس گھر میں آیا کرتا تھا۔ اُس کا لباس تار تار ہوتا، سر کے بال بھورے رنگ کے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے عجیب غریب شخصیت تھا۔ یوں جان پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ کسی چیز سے شرمایا کرتا تھا۔ اُس کو اپنے آپ سے شرم آتی تھی۔ اس جذبے کے تحت وہ اندر ہی اندر سکڑتا رہتا اور ایسی ایسی حرکات کر بیٹھتا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ گمان ہونے لگتا کہ آیا یہ شخص اپنے ہوش و حواس میں تو ہے۔ گھر تک پہنچتے ہی وہ شیشے والے دروازے کے باہر کھڑا ہو جاتا اور اندر آنے سے ڈرتا رہتا جب کوئی وہاں سے گذرتا مثلاً میں یا ساشا یا اور کوئی رحمدل نوکر تو وہ وہیں سے کھڑے کھڑے ہمیں عجیب و غریب اشاروں سے کچھ پوچھا کرتا۔ اور جب ہمارے جواب سے اُسے تسلی ہو جاتی کہ گھر میں اس وقت کوئی اجنبی نہیں ہے اور وہ بخوشی اندر آ سکتا ہے تو وہ کپکپاتا ہوا دروازے کو کھولتا اور عجیب حسرت بھرے انداز میں اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے پنجوں کے بل پوکروفسکی کے کمرے تک جا پہنچتا۔ یہ شخص پوکروفسکی کا باپ تھا۔

مجھے اُس کے بارے میں پوری کہانی بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ بہت پہلے وہ کسی جگہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ لیکن اُس نے کام میں کوئی ذہانت نہ دکھائی لہٰذا اُسے ایک واجبی سا کام دے دیا گیا تھا۔ جب اُس کی پہلی بیوی یعنی پوکروفسکی کی ماں وفات پا گئی تو اُس نے نئی شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بس اُس کی نئی بیوی آنے کی دیر تھی کہ اُس کے بُرے دن آ گئے۔ وہ جو بھی قدم اُٹھاتا وہی غلط پڑتا۔ وہ عورت کسی کو بھی اکیلا نہ رہنے دیتی تھی اور اُس نے ہر شخص کو اپنے بس میں کر لیا۔ اُس وقت پوکروفسکی کی عمر دس برس کی تھی۔ اُس کی سوتیلی ماں اس سے سخت نفرت کرنے لگی لیکن قسمت نے پوکروفسکی کا ساتھ دیا۔ بائیکوف نام کا ایک زمیندار اس کے باپ کو جانتا تھا۔ اس نے پوکروفسکی کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اُسے تعلیم حاصل کرنے کیلئے سکول میں داخل کرا دیا۔ اُس نے پوکروفسکی میں اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی دکھائی کیونکہ وہ اس کی مرحومہ والدہ سے متعارف تھا۔ اس کی والدہ اس وقت نوجوان تھی جب وہ بائیکوف سے متعارف ہوئی تھی۔ اس کا تعارف اینا فیدوروونا کی معرفت ہوا تھا۔ بعد ازاں اس کی شادی پوکروفسکی کے باپ سے ہوگئی تھی۔ بائیکوف اینا کا بہت ہی قریبی اور گہرا دوست تھا۔ اس نے پوکروفسکی کی ماں کی شادی پر اتنی سخاوت سے کام لیا تھا کہ اُس نے جہیز کے طور پر 5000 روبل دیئے تھے۔ یہ راز کسی کو معلوم نہیں کہ اُس رقم کا کیا بنا۔ اینا سے مجھے یہیں تک معلوم ہو سکا تھا۔ نوجوان پوکروفسکی شاذونادر ہی اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ سُننے میں آیا ہے کہ اُس کی ماں بہت حسین تھی اور میرے خیال میں اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُس نے پوکروفسکی کے باپ سے شادی کر لی۔ لیکن وہ نوجوانی ہی میں چل بسی۔ یعنی شادی کے صرف چار سال بعد اُس کی وفات ہو گئی تھی۔ سکول کی تعلیم مکمل کر کے پوکروفسکی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ مسٹر بائیکوف نے یونیورسٹی کے اخراجات کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لے لیا۔ مسٹر بائیکوف اکثر و بیشتر سینٹ پیٹرس برگ آتے جاتے تھے۔

جب خراب صحت کی بنا پر نوجوان پوکروفسکی کو یونیورسٹی چھوڑنی پڑی تو بائیکوف نے اینا کو سفارش کر دی کہ اُسے اپنے پاس بُلالے۔ اور اینا نے اس کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ساشا کو تعلیم دے گا اور اینا سے رہنے کی جگہ اور دو وقت کا کھانا دے گی۔ اُدھر پوکروفسکی کے باپ کو اس کی نئی بیوی نے اس قدر دکھی کر دیا کہ اُس نے شراب نوشی شروع کر کے اور رفتہ رفتہ سب بُرے سے کام کرنے شروع کر دیے۔ اُس کی بیوی اُس کو پیٹا بھی کرتی تھی۔ اُس سے رسوئی کا سارا کام کرایا کرتی تھی اور اس عورت نے اس کو ذِلت سہنے کا اس قدر عادی بنا دیا کہ اب وہ ذلیل ترین سلوک کا شاکی نہ ہوتا تھا اور مار پیٹ سے نہ اُسے جسمانی تکلیف پہنچتی تھی نہ وہ اس مار پیٹ کی شکایت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ شخص عمر کے لحاظ سے ابھی بوڑھا نہ ہوا۔ لیکن کثرت سے مے نوشی کرنے کی بنا پر اس کی صحت لمحہ بلحہ گرنے لگی۔ اب اُس شخص میں انسانی نفاست کا ایک ہی جذبہ باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا پوکروفسکی سے گہرا لگاؤ۔ اس کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ نوجوان پوکروفسکی اُس کی پہلی بیوی کی ہو بہو تصویر تھا۔ ممکن ہے کہ اُس کی پہلی بیوی کی محبت اور اُس عورت کی رحمدلی اور حقیقت اس جذبے میں کارفرما ہو کہ یہ دل شکستہ بوڑھا شخص پوکروفسکی سے اس قدر پیار کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے علاوہ دوسری کوئی اور بات سوچ سکتا تھا نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ ہفتے میں دو بار پوکروفسکی سے ملنے کے لئے آیا کرتا تھا لیکن اس سے زیادہ بار وہ نہ آ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے سے ملتے ہوئے بھی ڈرتا رہتا تھا۔ اور پھر نوجوان پوکروفسکی کو یہ دو بار کا ملنا بھی ناگوار گذرتا تھا۔ نوجوان پوکروفسکی میں جتنے بھی عیب تھے سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی مطلق عزت نہ کرتا تھا۔ لیکن جو کچھ ہو وہ بوڑھا شخص دنیا کے

ہر شخص سے شرمندگی تھی۔ اُس کے دُکھوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بوڑھا باپ اپنے بیٹے کو پیار اور لاڈ سے پینکا کہا کرتا تھا اور پینکا کی تعریف کرتے کبھی نہ تھکتا تھا۔ وہ جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا تو اُس کے چہرے پر عجیب آثار ہوتے جیسے وہ ڈرا ڈرا اور سہما ہوا کمرے میں جانا چاہتا ہو کیونکہ اس شخص کو کبھی یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کا سواگت کس انداز میں کیا جائے گا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا ہچکچاتا رہے گا اور اگر کہیں بیٹے کی طرف سے دیر ہو جائے تو پورے بیس منٹ مجھ سے سوالات کرتا رہتا۔ پینکا کیسا ہے۔ اُس کی صحت کا کیا حال ہے اور اس وقت اُس کے مزاج کیسے ہیں۔ کیا وہ کسی بہت ہی ضروری کام میں مصروف تو نہیں اور اگر کسی ضروری کام میں مصروف ہے تو وہ کیا کام ہے۔ کس نوعیت کا ہے۔ وہ کچھ لکھ رہا ہے یا صرف اپنے دھیان میں گم بیٹھا ہے؟ اور جب میں اُس بوڑھے شخص کو اچھی طرح ڈھارس بندھا دیتی اور اُسے بار بار یقین دلاتی تو وہ کہیں جا کے دروازے کو آہستہ سے کھولتا تھا لیکن دروازہ کھولتے وقت اُس کے چہرے پر عجیب کھسیانی مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ پھر وہ ذرا سا اندر جھانکتا تھا۔ جب اُس کی تسلی ہو جاتی تھی کہ اُس کا بیٹا غصے میں نہیں ہے بلکہ اُس نے سر ہلا کر اندر آنے کو بھی کہہ دیا ہے تو وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو جاتا تھا اپنا اشکریٹ اور تار تار کوٹ اُتار انہیں بڑی احتیاط سے کھونٹی پر ٹانک دیتا تھا۔ اور پھر بڑی احتیاط سے خود ایک کرسی میں دھنس جاتا تھا۔ اُس کی نظریں اپنے بیٹے کے چہرے سے ایک پل کے لئے نہ ہٹتی تھیں جیسے وہ پینکا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر رہا ہو۔ اور اگر کہیں پینکا کے چہرے پر ذرا سے بھی برہمی کے آثار پیدا ہوتے تو یہ بوڑھا شخص ایک دم بھانپ جاتا تھا۔ اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ میں تو یونہی بس ایک منٹ کے لئے آیا تھا۔ ادھر سے گذر رہا تھا اور تمہیں دیکھنے کیلئے چلا آیا ہوں۔ پھر نہایت کھسیانہ انداز میں اپنا کوٹ اور ہیٹ کھونٹی سے اُتارتا آہستہ سے دروازہ کھولتا اور پنجوں کے بل باہر نکل جاتا۔ اپنی مایوسی اور شرمندگی کو چھپانے کیلئے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر لیتا۔

لیکن جب اُس کا سواگت اچھی طرح ہوتا تو وہ بوڑھا شخص خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اُس کے چہرے کی ایک ایک جھری سے اُس کی ایک ایک حرکت سے تسلی اور مسرت جھلکتی تھی۔ اگر پینکا اُس سے کہیں بات شروع کر دیتا تو بوڑھا باپ نہایت عاجزی اور ادب سے کرسی سے کھڑا ہو کر اُس کی بات کا نہایت ہی سہمے ہوئے، مؤدب انداز میں جواب دیا کرتا۔ لیکن اُس کا ہر جواب احمقانہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کے بولنے اور کرسی سے اُٹھنے کے انداز میں ایک چھپی ہوئی دہشت صاف نمایاں تھی۔ بیچارہ کہاں اتنی گفتگو کرنے کے قابل تھا۔ وہ تو بے حد اُلجھا ہوا اور سہما ہوا کردار تھا۔ اُس کو یہی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ وہ اپنے آپ سے کیا کہے اور وہ وقت یوں بڑبڑاتا رہتا تھا جیسے اپنی ہر بات کی تصحیح کر رہا ہو لیکن کہیں اُس سے تیز جواب بن جائے تو پھر وہ اپنے کندھوں کو سیدھا کر لیتا تھا اپنی واسکٹ، ٹکٹائی اور قمیص کو از سر نو درست کرنا شروع کر دیتا تھا اس کے چہرے سے وقار جھلک اُٹھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اتنا دلیر ہو جاتا تھا کہ کرسی سے اُٹھ کر کتابوں کی میز تک چلا جاتا تھا کسی کتاب کو اُٹھا لیتا تھا۔ اور اُس کے ہر ورق پر ایک اُچٹتی سی نظر بھی ڈال لیتا تھا۔ ایسے شاذ و نادر موقعوں پر وہ اس قدر چُست اور ٹھنڈے دل و دماغ کا شخص نظر آتا تھا جیسے اپنے بیٹے کی کتابوں کی دیکھ بھال سے بخوبی واقف ہو جیسے پینکا سے اتنا اچھا سلوک تو متوقع ہی تھا۔ لیکن ایک بار جب اُس کے بیٹے نے اُسے ڈانٹ دیا تھا کہ کتابوں کو وہیں رہنے دے تو اُس وقت میں وہیں موجود تھی۔ خوف کے مارے وہ سہم کر رہ گیا تھا۔ وہ ڈانٹ سے اس قدر گھبرایا اور اتنا ڈر گیا کہ اُس نے کتاب کو اُلٹا رکھ دیا۔ پھر اُس کی گھبراہٹ اور بڑھی اور اُسے سیدھا کرکے رکھنے کی غرض سے اُس نے کتاب کو ٹیڑھا کرکے کھڑا کر دیا۔ لیکن اس دوران میں اپنی خفت کو چھپانے کیلئے وہ برابر مسکراتا رہا۔ اپنی حرکات سے اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ واقعہ نہایت ہی معمولی اور غیر اہم نظر آئے۔

اپنے باپ کی عادات بدلنے کی غرض سے پوکرونسکی اُسے کبھی کبھی کچھ رقم دیتا رہتا تھا۔ لیکن عام طور پر اُسے ۲۵ کوپیکس ہی ملتے تھے ہاں اگر وہ مسلسل تین موقعوں پر کوئی غلطی نہ کرے تو اُسے پچاس یا اُس سے بھی زیادہ کوپیکس مل جاتے تھے۔ یا پوکرونسکی اُسے جوتے خرید دیتا تھا۔ نکٹائی یا واسکٹ لے دیتا تھا۔ اور اپنے بیٹے سے یہ تحفہ پاکر بوڑھا باپ نخرے مور کی طرح تن جاتا تھا کبھی کبھار وہ ہم لوگوں سے ملنے بھی چلا آتا تھا وہ ساشا اور میرے لئے سیب اور مٹھائی لے آتا تھا اور پھر پینکا کے بارے میں جی بھر کے گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ نصیحت کرنے کے انداز میں ہم سے کہا کرتا تھا کہ سبق اچھی طرح یاد کیا کرو اور اس بات کو تو سو بار دُہرایا کرتا تھا کہ پینکا فرمانبردار بیٹا ہے بلکہ فرمانبرداری کا نمونہ ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ عالم و فاضل ہے۔ اتنا کہہ کر وہ اس طرح آنکھیں مٹکاتا تھا اور ایسی ایسی حرکات کرتا تھا کہ ہنستے ہنستے میری اور ساشا کی چیخیں نکل جاتی تھیں امی جان بھی اس بوڑھے شخص کو بہت پسند کرتی تھیں۔ لیکن اینا سے اُس کو سخت

نفرت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنا کی موجودگی میں وہ چوہے کی طرح دبک کر بیٹھا رہتا تھا۔

میری تعلیم اگرچہ قریب قریب مکمل ہونے والی تھی لیکن میتکا اب بھی مجھے ایک بچی سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ مجھے بھی ساشا جیسی الھڑ لڑکی سمجھتا تھا اُس کے اِس رویئے سے مجھے چوٹ پہنچی تھی کیونکہ میں اپنی گذشتہ حرکات کی تلافی کرنے کیلئے اپنے آپ کو بہت حد تک بدل چکی تھی۔ لیکن اِس کا اُس پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا اور اُس کی اس بات سے مجھے اور زیادہ دُکھ ہوتا تھا۔ سبق پڑھنے کے بعد میں نے شاذ و نادر ہی کبھی اُس سے گفتگو کی تھی۔ حالانکہ اگر کبھی موقع بھی ملا تو میری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا تھا۔ میں شرما جاتی تھی اور میری زبان پر تالا پڑ جاتا تھا۔ پھر میں تنہائی میں چھپ چھپ کر خوب جی بھر کے آنسو بہاتی تھی۔ اور اگر ایک خاص موقع رُونما نہ ہوتا تو کون جانے کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا۔ ایک شام امّی جان تو اپنا کے کمرے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور لوکروفسکی کے کمرے میں گھس گئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ لیکن اُس کے کمرے میں جانے کا جذبہ اور حوصلہ مجھے کیسے ہوا یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے میں اُس کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک برس سے زائد عرصے سے میرا پڑوسی تھا۔ میرا دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے تو میں نے ڈرتے ڈرتے پُورے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب اشتیاق چٹکیاں لے رہا تھا۔ کمرے کے رکھ رکھاؤ میں کوئی سلیقہ یا قرینہ نہ تھا۔ کرسیاں اور میزیں اوّل تو گنتی کی تھیں اور پھر وہ بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کتابوں کی پانچ قطاریں تھیں۔ کرسیاں اور میزیں کاغذات سے لدی پڑی تھیں۔ ہر جگہ کتابیں اور کاغذ ہی کاغذ تھے۔ اور عین اُس وقت میرے دماغ میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ اُس جذبے نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی کہ وہ شخص میری دوستی اور میرے خلوص کی کیوں پرواہ کرنے لگا۔ وہ ایک عالم شخص ہے اور میں ایک بیوقوف اور ان پڑھ لڑکی ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے کچھ نہیں پڑھا۔ ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے حسد بھری نظروں سے اُن کتابوں کے پلندے کو دیکھا۔ مجھے اس قدر دُکھ ہوا اور غصہ آیا کہ جی میں آیا میں یہ تمام کتابیں ایک ہی سانس میں پڑھ جاؤں۔ عین ممکن ہے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں بھی اُس جیسی عالم بن جاؤں تو شاید وہ میری دوستی کی قدر کرنے لگے۔ جلد جلدی میں نے ایک پُرانی لیکن ضخیم کتاب اُٹھالی۔ کتاب کی جلد پر گرد کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کتاب کو سینے سے بھینچ کے لگالیا اور ہانپتی ہوئی اُس کے کمرے سے بھاگ آئی۔ میں شدتِ ہیجان کے مارے سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ میں اس قدر شرما رہی تھی کہ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات لیمپ کی روشنی میں ساری کتاب پڑھ ڈالوں گی۔ امّی جان تو سو جائیں گی لہٰذا میرا کسی پر فاش نہ ہو گا۔ لیکن جب میں نے اپنے کمرے میں جا کر کتاب کھولی تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ اُس کتاب کے ہر صفحے کو دیمک لگی ہوئی تھی۔ ورق ورق خستہ تھا اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ کتاب لاطینی زبان میں تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور پلٹ کر واپس اُس کے کمرے میں پہنچی ابھی میں کتاب کو اصل جگہ پہ رکھنے ہی والی تھی کہ باہر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے اُس مردود کو سنبھالنے کی لاکھ کوشش کی۔ اور پھر اُدھر یہ مصیبت بھی تھی کہ میز پر کتابیں اس طرح اٹی پڑی تھیں کہ مجھے اُس کی اصل جگہ بھی نہ سمجھ میں آئی۔ میں اُس کتاب کو اُس کی اصل جگہ پہ دوبارہ نہ رکھ سکی۔ میں باقی کتابوں کو جلدی جلدی اور پوری طاقت سے اِدھر اُدھر کر رہی تھی تاکہ کسی طرح اس کے لئے جگہ بن جائے۔ میرا خیال جن کتابوں پر تھا ان کتابوں کی وہ کھونٹی ٹوٹی ہوئی تھی وہ شاید اسی لمحے کی منتظر تھیں۔ اور پورے کا پُورا کتابوں سے بھرا ہوا تختہ نیچے زمین پر آرہا۔ کیا کتابیں کیا کاغذ اور کیا باقی چیزیں زمین پر ایک انبار لگ گیا۔ اُدھر دروازہ کھلا اور پوکروفسکی کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں میں یہ لکھ دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اُس نے یہ کبھی برداشت نہ کیا تھا کہ کوئی شخص اس کی کتابوں کو ہاتھ لگائے۔ اور اگر کوئی ہاتھ لگا بیٹھے تو اُسکو خدا ہی بچائے۔ اب اس واقعے اور اس حقیقت کو جاننے کے بعد ذرا میری حالت کا اندازہ لگایئے۔ ضخیم، چھوٹے حجم کی، درمیانے حجم کی، پتلی پتلی، موٹی موٹی کتابیں چاروں طرف فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ کرسیوں اور میزوں کے نیچے جا پڑی تھیں۔ میں نے بہت چاہا کہ بھاگ نکلوں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ لیں یہ خاتمہ ہے۔ ہر چیز کا خاتمہ ہے، میری تمام عزّت ختم ہے، میرا سب کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ دس برس کی جاہل اور بے وقوف لڑکی کی طرح میں یہ حرکت کرتی ہوئی پکڑی گئی ہوں۔ کس قدر بے وقوف ہوں میں۔ پوکروفسکی غصّے کے مارے پاگل ہو اُٹھا تھا۔ اور وہ چلّایا— "لو اور کیا کرنے والی ہو؟ ایسی واہیات حرکتیں کرتے ہوئے تمہیں کیا شرم نہیں آتی۔ تم کب ہوش میں آؤگی؟ اور وہ یہ کہتے ہوئے کتابیں اُٹھانے کیلئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کی مدد کرنے کیلئے جھکی تو جھڑک کر بولا— "آپ مہربانی کریں۔ جب تمہیں کسی نے بلایا نہیں تھا تو عقلمندی اسی میں تھی کہ یہاں تشریف نہ لاتیں"۔ لیکن وہ میرا نادم لگا ہوں اور عاجزی سے بھرے ہوئے انداز سے سب کچھ سمجھ گیا اور

سی کی آنکھوں میں بھی آگئی۔ اب اس کی آواز میں بھی ویسا ہی تقدس تھا جیسے وہ
بھی پیشمان ہو۔ "آخر میں یہ پوچھتا ہوں تمہیں عقل کب آئے گی۔ خدا کے لئے
کچھ سوچو۔ تم کوئی بچی نہیں ہو، کم سن نہیں ہو۔ تم سمجھدار ہو، کوئی ہوش اور جیسے
سب کچھ سمجھتی ہو۔" اس نے نظریں اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر
بھی نہ جانے کیوں شرما کر چلی گیا۔ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ میں گھر ہی اسے کھڑا دیکھتی
رہی۔ وہ کچھ اداس سا لگ رہا تھا۔ اب وہ بوڑھا تو نظر آ رہا تھا جیسے وہ کچھ گھبرایا ہوا
ہو۔ کچھ لمحے بعد جب اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے
اسے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ نہ جانے وہ کس بات کی معافی
مانگ رہا تھا۔ شاید اسے ایک دم خیال آ گیا تھا کہ میں ایک جوان لڑکی ہوں
اور لیس میں سب کچھ ہو گئی۔ اس وقت نے کیا کیا، مجھے کچھ نہیں پتا۔ مجھے
صرف اتنا پتا ہے کہ میں اس طرح لجائی کہ سمٹ کر گٹھڑی سی ہو گئی۔ میں اپنی
شرم سے کھول گئی تھی۔ میں نے اپنا منہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور کمرے سے
بھاگ کھڑی ہوئی۔

مجھے شرمندگی کا احساس اتنا شدید ہو رہا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا
کیا کروں۔ میں بار بار سوچتی کہ مجھے اپنے کمرے میں پا کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔
اس نے اپنی غیر موجودگی میں تو تنہا مجھے وہاں پایا تھا۔ تین دن تک میری ہمت
نہ پڑتی تھی کہ اس کے سامنے آ سکوں یا اس کی آنکھ سے آنکھ ملا سکوں۔ میں اس قدر
نادم تھی کہ آخر ایک دن میرے آنسو بہہ نکلے۔ میرے دل میں عجیب غریب
اور الجھے الجھے خیالات امڈ کر چلے آتے تھے۔ اور سب سے عجیب خیال
یہ تھا کہ سیدھی اس کے پاس چلی جاؤں اور ساری بات اسے صاف صاف
بتا دوں اور اسے یقین دلا دوں کہ میں ایک جاہل اور بے وقوف لڑکی نہیں
ہوں۔ لیکن میں نے کچھ اچھی بات سوچی تھی۔ میرا ارادہ برا نہ تھا۔ میں نے اس
سے ملنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ہمت نہ پڑی۔ اور میرا خیال ہے خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ہے کہ میں اس سے ملنے نہیں چلی گئی۔ میں اچھی طرح اندازہ کر سکتی
ہوں کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں کس قدر بے وقوف نظر آتی۔ اب بھی اس
بات کا خیال میرے دل میں آتا ہے تو میں شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔

میری امی جان سخت بیمار پڑ گئیں۔ وہ اتنی سخت بیمار ہو گئیں کہ
تیسرے دن ان کا بخار بہت تیز ہو چکا تھا اور وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑا
بھی رہی تھیں۔ میں ایک منٹ کیلئے بھی امی کے بستر سے نہ ہٹی۔ میں انہیں وقت
پر دوا اور پانی دیتی رہی۔ لیکن دوسری رات میں تھکن سے چور ہو چکی تھی۔
اور اپنی نیند پر بمشکل قابو پا سکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ہرے ہرے

دھبے ہر لمحے لگے اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے ارد گرد ہر چیز جھوم
رہی ہے۔ اگر امی جان کی نحیف اور کمزور ہائے ہائے میرے دل کو چیرتی
نہ رہتی تو میں کب کی سو گئی ہوتی۔ میں بار بار سنبھل کر بیٹھتی لیکن نیند کا خمار
پھر مجھ پر غلبہ پا لیتا۔ واقعی میں ایک عذاب سہہ رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں
لیکن ایک لمحے کے بعد جب میں کچھ کچھ نیم خوابی کے عالم میں تھی تو ایک عجیب
غریب سپنے نے بلکہ ایک ایسے بھیانک منظر نے میرے منتشر دل و دماغ کو
جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صرف موم بتی
کی لو ٹمٹما رہی تھی۔ اور اس کی روشنی سے دیواروں پر کچھ دھندلی سی روشنی
پڑ رہی تھی۔ میرے احساس پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ میں نے خوفناک
سپنا دیکھا تھا اور جاگنے پر بھی اُسے اپنے دل سے جھٹک نہ سکی تھی۔ میرا
دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں ڈر گئی اور میری ہولناک چیخ نکل کر کرسی سے اچھل
پڑی۔ میری چیخ سے صاف ظاہر تھا کہ مجھ سے اور زیادہ عذاب برداشت
نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور پوکروفسکی کمرے میں داخل ہوا۔
مجھے اتنا یاد ہے کہ جب میں ہوش میں آئی تھی تو اس کی باہوں میں تھی۔
اس نے سہارا دے کر بڑے آرام سے مجھے کرسی میں بٹھا دیا۔ پھر وہ اٹھا
اور میرے لئے پانی کا گلاس لے آیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی
بوچھاڑ کر دی۔ میں نے جواب میں کچھ کہا ضرور تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں کہ
میں کیا کہہ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "تم تو بیمار ہو۔
بہت سخت بیمار ہو۔ تمہارا جسم تپ رہا ہے۔ کیوں اپنی صحت برباد کر رہی
ہو۔ لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ میں دو گھنٹے بعد پھر آ جاؤں گا۔ اچھا لیٹ جاؤ۔"
وہ میری کوئی بات سنے بغیر اپنی کہتا رہا۔ میں تھکاوٹ کے مارے گری
جا رہی تھی۔ میری آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ میں سستانے کی غرض سے کرسی
ہی میں ٹیڑھی سیدھی ہو کر لیٹ گئی لیکن میں صبح تک سوتی رہی۔ اور وہ بھی
پوکروفسکی نے آ کر مجھے جگایا کیونکہ امی جان کو دوا دینے کا وقت ہو گیا تھا۔
اگلی رات میں امی جان کے بستر پر بیٹھ گئی اور میں نے من ہی من میں تہیہ کر لیا
تھا کہ سوؤں گی نہیں۔ گیارہ بجے پوکروفسکی نے دروازے پر دستک دی۔
میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ کمرے داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "لیلا
اکیلی بیٹھی بیٹھی کیا تنہائی نہ محسوس کرو گی۔ لو یہ کتاب پڑھتی رہو۔ اس سے
وقت کٹنے میں مدد مل جائے گی۔" میں نے کتاب لے لی اور اس کا جی بھر کر
شکریہ ادا۔ میں ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتی کہ وہ کتاب کونسی تھی یا میں نے وہ
کتاب کھولی بھی تھی یا نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس رات ایک

ماں کیلئے نہ سوئی تھی ایک عجیب جذبہ نے مجھے ساری رات جگائے رکھا۔ میں بے چین ہو اٹھی۔ میرے لئے دو گھڑی کرسی پہ بیٹھنا محال ہو گیا اور میں بار بار اٹھ کر کمرے کے چکر لگاتی رہی۔ مجھے ایک عجیب مسرت اور گرمجوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی اس توجہ اور فکر پر میں خوش بھی تھی اور فخر بھی محسوس کر رہی تھی۔ میں ساری رات کچھ سوچتی رہی اور خیالات کا طومار باندھتی رہی۔ وہ دوبارہ نہیں آیا اور میں جانتی تھی کہ وہ آئے گا بھی نہیں۔ پر میں بار بار یہی سوچتی رہی کہ کیا وہ کل رات پھر آئے گا۔ :

اگلی شام جب اندھیرے بڑھ رہے تھے اور ہر شخص سونے کی تیاری کر رہا تھا تو پوکروفسکی نے اپنا دروازہ کھولا اور دہلیز پہ کھڑا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے کیا کچھ کہا تھا۔ بس مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میں شرما رہی تھی، بات کرتے وقت میرے خیالات الجھ رہے تھے اور مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اس وقت اس بات کی منتظر تھی کہ اب یہ گفتگو ختم ہونی چاہیئے حالانکہ میں نے اس کے ساتھ بات کرنے کیلئے ہزار بار دُعائیں مانگی تھیں، خواب دیکھے تھے اور دل ہی دل میں سوال و جواب کی خوب تیاری کی تھی۔ اُسی شام سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ پھر جب تک امی جان بیمار رہیں، ہم دونوں ہر رات کئی کئی گھنٹے اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی جھجک پہ قابو پا لیا۔ ہاں یہ بات اور تھی کہ جب بھی ہماری گفتگو ختم ہوتی تو میں اپنے آپ سے خفا نظر آتی۔ میں دل ہی دل میں اس بات پہ بہت خوش تھی کہ پوکروفسکی کتاب والا واقعہ بھول چکا ہے۔ لیکن ایک دن بات سے بات نکل آئی اور کتابوں کا تختہ گرانے کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں اُس وقت عجیب عالم میں تھی اور میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی تھی۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ گئی اور سب کچھ کہہ سُنایا کہ میں علم حاصل کرنا چاہتی تھی اور مجھے اس بات سے بڑا رنج ہوتا تھا کہ مجھے بچہ سمجھ لیا جائے۔ میری ہر بات میں اُس وقت ایک عجیب نرمی عود آئی تھی اور میری آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ کہ میرے دل میں اُس کے لئے دوستی کا جذبہ تھا۔ میں اس کی ہر بات کی پروا کیا کرتی تھی میں اُس کے ساتھ گھل مل جانا چاہتی تھی۔ میں اُسے آرام پہنچانا چاہتی تھی اُسے تسکین دینا چاہتی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اُن سے حیرت اور گھبراہٹ صاف نمایاں تھی لیکن اُس نے کچھ نہ کہا۔ اور بس اُس کی اس چپ سے میرے جذبات کو گہری ٹھیس لگی جیسے میرے دل پہ زخم لگ

گیا ہو۔ میں مایوس ہو گئی۔ وہ شاید میرا مطلب نہ سمجھ سکا ہو اور ممکن ہے کہ دل ہی دل میں مجھ پہ ہنس بھی رہا ہو۔ میں بچوں کی طرح بلک بلک کے رو اٹھی۔ میں اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ میرے ہاتھوں کو والہانہ طور پہ چوما۔ میرے ہاتھوں کو کھینچ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور مجھے تسلی دینے کی کوشش سے وہ کچھ کہہ رہا تھا اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کیا کہا تھا مجھے یاد نہیں۔ مجھے بس کچھ یاد ہے کہ میں کبھی روتی تھی کبھی ہنس پڑتی تھی اور پھر خوشی کے مارے میری آنکھوں کو آنسو بہہ نکلتے تھے۔ میرے رُخسار جل رہے تھے۔ تمتا رہے تھے۔ خوشی کے مارے میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ میں اتنا ہی محسوس کر سکی کہ وہ بھی کچھ بے چین تھا۔ ممکن ہے میرے اس اچانک اظہار پہ وہ ابھی تک سنبھل نہ سکا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض حیرت میں ڈوب کے رہ گیا ہو۔ لیکن اُس دن کے بعد اُس نے میرے خلوص کو قبول کیا تھا، میری گرمجوشی میرے محبت بھرے الفاظ، میرا التفات اُسے منظور تھا۔ وہ اب مجھے اپنے برابر کا سمجھ کر اُسی طرح خلوص سے پیش آتا تھا۔ وہ بھی التفات دکھاتا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نرمی اور پیار سے پیش آتا تھا جیسے وہ میرا دوست ہو بلکہ جیسے وہ میرا بھائی ہو۔

مجھے یہ سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا مجھے کتنا چین ملتا تھا۔ اب کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی اب اسے بخوبی سمجھتا تھا اور دن بدن میرے قریب آتا گیا۔

اُن دِنوں میں ایسی کونسی بات تھی جو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نہ کی ہو۔ وہ پیارے پیارے فکرمند ایام کتنے خوشگوار تھے۔ جب میرا دل بہت اُداس ہو جاتا ہے تو وہی یادیں اس طرح تازہ دم اور مسرور کن نظر آتی ہیں جیسے دوپہر کی گرمی کا مرجھایا ہوا پھول شام کو شبنم سے نکھر اُٹھتا ہے۔

امی جان کی صحت اب اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میں پھر بھی ایک منٹ کے لیئے اُنھیں چھوڑ کر نہیں جاتی تھی۔ پوکروفسکی میرے لئے اکثر و بیشتر کتابیں لایا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ کتابیں صرف اس لئے لاتا تھا کہ میں رات کو سو نہ جاؤں لیکن رفتہ رفتہ میں نے اُنہیں زیادہ توجہ اور غور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر انہیں پڑھنے کیلئے میرا اشتیاق بڑھ گیا۔ کتابیں کیا تھیں میرے لئے نئے خیالات کا ایک خزانہ تھا جس میں تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ میرے دل میں نئے نئے خیالات پیدا ہونے لگے۔ اور اُن کتابوں کو سمجھنا جتنا مشکل تھا اُتنی ہی وہ مجھے عزیز تھیں وہ مجھے جان سے بھی

پیاری تھیں۔ وہ ایک الوٹ کڑی کی طرح میرے دل میں اُتر جاتیں اور مجھے عالم حیرت میں غرق کر دیتیں۔ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ اس رُوحانی سیلاب سے میرے قدم نہیں اُکھڑے۔ میں ایسی باتوں کو سمجھنے سے ذرا قاصر رہی تھی جب اُمّی جان ٹھیک ہو گئیں تو ہمارا شاموں کو اکٹھے مِل بیٹھنا بھی ختم ہو گیا پھر تعطیلات کئے ہوئے بھی کئی کئی دن گذر جاتے تھے ہم کبھی کبھار مختصر اور معمولی لفظوں میں کچھ کہہ جاتے تھے۔ لیکن ان لفظوں میں کیا کیا جذبات پنہاں ہوتے تھے وہ ہم کیا کچھ نہ کہہ جاتے تھے۔ میں خوش تھی۔ بہت خوش اور کئی ہفتوں تک مجھ پہ خوشی کا نشہ سا چھایا رہا۔

ایک دن پوکردفسکی کا بوڑھا باپ ہم سے ملنے کیلئے آیا۔ باتونی تو خیر وہ تھا ہی لیکن اُس دن وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ خوشی کے مارے اُس سے کوئی بات مکمل نہ ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر لطیفے سُناتا رہا اور ہنستا رہا اور آخرکار اُس نے اپنی مُسرّت کی وجہ ہم سب کو بھی بتا دی کہ اگلے ہفتے پیٹیا کا جنم دن ہے۔ اور وہ اس مُبارک موقعے پر اپنے بیٹے سے ملنے آئے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس روز وہ نئی واسکٹ پہنے گا اور اُس کی بیوی نے جو نئے جوتے خرید کر دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اُن جوتوں کو بھی پہن کر آئے گا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اُس کی کوئی بات ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

پوکردفسکی کا جنم دِن! میں دن رات اس پر غور کرتی رہی۔ میں بھی دوستی کے ناطے اُسے کوئی تحفہ تو دوں گی۔ لیکن وہ تحفہ کیسا ہونا چاہیئے۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں تحفے کے طور پر کچھ کتابیں پیش کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنی لائبریری میں پُشکن کے تازہ ایڈیشن شامل کرنا چاہتا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پُشکن کی ساری کتابیں خرید کر اُسے پیش کروں گی۔ میں نے کپڑے سی سی کر کوئی تیس روبل جمع کر لئے تھے۔ لہٰذا میں نے باورچن کو بھیجا کہ پُشکن کی تمام کتابوں کی کل قیمت معلوم کر آئے۔ اور میرے خدا اس نے بتایا کہ گیارہ کتابوں کی قیمت کم از کم ساٹھ رُوبل ہو گی۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں گی۔ میں اس سوال پر جتنا غور کرتی اتنا ہی اور اُلجھ جاتی۔ امّی جان سے پیسے مانگنے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ وہ تو ضرور میری مدد کر دیتیں لیکن پھر سارے گھر میں سب کو پتہ چل جاتا اور بات بن جاتی کہ پوکردفسکی کی تعلیم کا معاوضہ چکایا جا رہا ہے۔ اور پھر میں یہ بھی چاہتی تھی کہ تحفہ صرف میرا ہو۔ اس میں کسی اور کا ہاتھ نہ ہو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا کہ اُس نے میرے لئے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں تو صاف بات ہے کہ میں ساری عمر اُس کے اس قرضے تلے دبی رہنا چاہتی تھی۔ میں اس کے بدلے صرف اپنی دوستی پیش کرنا چاہتی تھی۔ آخرکار مجھے حل سُوجھ ہی گیا۔

میں جانتی تھی کہ گوسٹنی دیور پر دوکاندار کبھی کبھی پرانی کتابیں سستی بیچتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُن سے سودا کر سکے تو وہ لوگ نصف قیمت پر کتابیں دے دیتے ہیں۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے وہاں جانے کا اگلے ہی دن موقع مل گیا ہمیں گھر کی کچھ چیزیں درکار تھیں اور چونکہ امّی جان کی طبیعت ابھی ناساز تھی اور انّا فیدوروونا پر سستی کا دورہ پڑا ہوا تھا لہٰذا اُن کی خرید و فروخت میرے ذمے آ پڑی۔

میں میٹروینا کے ہمراہ چل دی اور بہت جلد مجھے پُشکن کی کتابیں نظر آ گئیں۔ کتابیں بیچنے والا پہلے تو اُس دوکان سے بھی زیادہ دام مانگتا تھا لیکن بحث و تکرار کرنے کے بعد اور کئی بار وہاں سے چل دینے کی دھمکی سے وہ شخص چاندی کے دس رُوبل تک اُتر آیا۔ مجھے یوں سودا کرنے میں بڑا لُطف آیا۔ بیچاری میٹروینا کچھ نہ سمجھ سکی کہ میں اس قدر خوش کیوں ہوں یا مجھے اتنی کتابیں کیوں درکار ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری جیب میں فقط تیس رُوبل تھے اور وہ بھی بنک نوٹوں کی شکل میں۔ اور اب وہ شخص ایک پائی بھی کم کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے منّت کی۔ اُسے اپنی ضرورت اور مجبوری کا واسطہ دیا اور آخر جب میں کئی بار وہاں سے آگے بڑھ چکی تھی اور واپس آ چکی تھی تو وہ کچھ مان گیا اور اُس نے قیمت دو رُوبل اور کم کر دی۔ اور اُس نے خدا کی قسم اُٹھائی کہ وہ قیمت محض اس لئے کم کر رہا ہے کیونکہ میں اتنی حسین و جوان ہوں ورنہ وہ دنیا کے کسی شخص کے لئے بھی قیمت کم نہ کرتا۔ اب میرے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ میرے پاس جتنے پیسے ہیں یہ شخص اب بھی اُن سے اڑھائی رُوبل زیادہ مانگتا ہے۔ اور اسی احساس سے کہ اب فقط اڑھائی رُوبل کی کسر رہ گئی ہے میں قریب قریب رونے ہی والی تھی کہ ایک غیر متوقع بات نے مجھے مصیبت سے نکلنے میں مدد دی۔

میں نے دیکھا کہ دو قدم پرے ایک اور دوکان پر بوڑھا پوکردفسکی چار یا پانچ کتب فروشوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور وہ اُسے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی کتابیں اُس کے ہاتھوں میں تھما رہا تھا۔ اور جانے وہ کیا کتابیں تھیں لیکن بوڑھا پوکردفسکی اور زیادہ کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ تو تمام کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بیچارہ اپنی پسند کی کتابیں

نہ جن پار رہا تھا۔ جب میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس کو مجھ سے بھی بہت پیار تھا۔ شاید وہ مجھے پینکا سے کم پیار نہ کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔۔ "وارودارا میں کتابیں خرید رہا ہوں۔ پینکا کے لئے کچھ کتابیں خرید رہا ہوں اس کا جنم دن آرہا ہے اور اُسے کتابیں پسند ہیں لہذا میں کتابیں خرید رہا ہوں۔ یہ دیکھو کتنی عمدہ کتابیں ہیں۔" آخری لفظ اُس نے یوں رُک رُک کے کہا کہ مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ ابھی رو دے گا کیونکہ وہ کتابیں قیمتی تھیں۔ میں صاف دیکھ رہی تھی کہ آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کی آنکھوں سے چھلک کر اُس کے رخسار پر بہنے والے تھے۔ میں نے فوراً پوچھا کہ اُس کے پاس کُل پیسے کتنے ہیں۔ وہ میری بات سُنتے ہی زیرِ لب بولا۔ "اوہ۔ میرے پاس۔" اور یہ کہہ کر اُس غریب نے اپنی ساری پونجی مجھے دکھا دی۔ "یہ دیکھو۔ ایک تو آدھا رُوبل ہے۔ بیس کوپک ہیں اور دو تانبے کے پیسے ہیں۔" میں اُسے ایک طرف کو لے گئی اور اُسے اپنے دوکاندار کے پاس لے آئی۔ "اس کے پاس گیارہ کتابیں ہیں ساری کی قیمت ساڑھے تینتیس رُوبل ہے۔ میرے پاس تیس رُوبل ہیں۔ آپ اپنے اڑھائی رُوبل بھی مجھے دے دیجئے۔ ہم یہ کتابیں اکٹھے خرید لیں گے اور انھیں دونوں کی طرف سے پیش کردیں گے۔" وہ تو خوشی کے مارے ناچ اُٹھا۔ اُس نے اپنے پیسے دوکاندار کے ہاتھ میں تھما دئے اور دوکاندار نے کتابوں کا سارا بوجھ اُس پر لاد دیا۔ اُس نے کتابیں اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔ اپنی بغل میں داب لیں اور مجھ سے وعدہ کر گیا اگلے دن چپکے چپکے وہ کتابیں میرے پاس لے آئے گا۔ اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ اپنے بیٹے سے ملنے کیلئے آیا۔ اور حسبِ معمول ایک گھنٹہ بھر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم سے ملنے چلا آیا۔ وہ عجیب مضحکہ انگیز اور پُراسرار انداز میں کُرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے مُسکراہٹ بکھری پڑتی تھی۔ اور وہ یوں اپنے ہاتھوں کو پُراشتیاق انداز میں مل رہا تھا جیسے اُس کے ہاتھوں میں کوئی راز ہو۔ آخر اُس نے بتایا کہ کتابیں خفیہ طور پہ ہمارے کمرے میں لائی جا چکی ہیں اور میٹرینا کی زیرِ نگرانی انھیں رسوئی میں باحفاظت پہنچا دیا گیا ہے۔ پوکروفسکی کے جنم دن کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔
اور وہ ہمیں بتانے لگا کہ تحفہ کیسے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ جتنا زیادہ بول رہا تھا اتنا ہی مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ایسی بات جسے زبان پر لانے کی اُسے ہمت نہیں ہو رہی۔ جسے زبان پر لاتے ہوئے وہ ڈر رہا ہے۔ میں کچھ نہ بولی لیکن میں دیکھ رہی کہ اُس کا جوش و خروش اُس کی آنکھوں میں چمک اور اُس کے چہرے کی دمک، سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آرہا تھا۔

آخر کار وہ بول اُٹھا۔ "بار برا۔" اس کی آواز میں ایک عجیب ڈر اور گھبراہٹ تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "واروارا۔ کیا تم جانتی ہو میں کیا سوچ رہا ہوں۔" وہ اور زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ اگر دس کتابیں تم اُسے دے دو اور گیارہویں میں خود دے دوں تو کوئی ہرج ہے کیا؟ یعنی وہ دس کتابیں تمہاری طرف سے تحفہ ہوں گی گیارہویں میری طرف سے۔ تمہیں میرا مطلب ۔۔۔ یعنی تم بھی اُسے تحفہ پیش کردو گی۔ میرے پاس بھی پیش کرنے کیلئے کچھ ہوگا۔۔ دونوں اپنا اپنا تحفہ دے دیں گے۔ وہ اس قدر جذباتی ہوا کہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا جیسے میرے جواب کا منتظر ہو۔ میں نے متحمل آواز میں پوچھا۔ "لیکن آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ ہم دونوں اکٹھے تحفہ پیش کریں۔" "بات یہ ہے وار وارا۔ میرا مطلب ہے کہ دراصل۔ . . . . . . اُس کی زبان میں لکنت آچکی تھی۔ اُسے بات کرنے کے لئے لفظ نہ مل رہے تھے اور اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا لیکن اُسے جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ گیا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ میں وقتاً فوقتاً شراب نوشی کرتا ہوں وارودارا میں رُک نہیں سکتا۔ اور جیسا مجھے ہونا چاہیئے میں ویسا ہوں نہیں۔ دیکھو نا۔ مثلاً سردی ہی لگ گئی ہے یا اے اے.... کوئی جھگڑا ہی ہو جائے یا ویسے ہی جی اُداس ہو جاتے یا کچھ دل کو چوٹ پہنچے تو تم جانتی ہو کہ آدمی گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیتا ہے۔ اور پینکا اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ خفا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے ڈانٹتا ہے، لیکچر پلا دیتا ہے سو اگر میں اُسے علیحدہ تحفہ پیش کروں گا تو اُس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ میں اپنے طور طریقے ٹھیک کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا اچھا رہتا ہے۔ وہ جان جائے گا کہ میں محنت سے پیسہ جمع کر رہا تھا کیونکہ پینکا جانتا ہے کہ جب تک وہ مجھے کوئی پیسہ نہ دے تب تک میرے پاس اور کہیں سے نہیں آتا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے. . . . . اور وہ یہ جان کر بہت خوش ہوگا کہ میں نے اس مقصد کیلئے روپیہ خرچ کیا ہے یعنی میں نے فقط اُسی کیلئے اتنی دیر پیسہ بچائے رکھا۔"

سلدرا اپنی بات ختم کر کے جس طرح اُس بوڑھے شخص نے مجھے دیکھنا شروع کیا مجھے اس پر بہت ترس آیا اور میں نے من ہی من میں فوراً فیصلہ کر لیا۔

"لیکن آپ ہی تمام کتابیں کیوں نہیں پیش کر دیتے۔؟"

"تمام؟ تمہارا مطلب ہے پُوری گیارہ کی گیارہ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟"

"یعنی وہ سب کتابیں میں بطور تحفہ پیش کر دوں؟"

"ہاں۔"

"یعنی بالکل اپنی طرف سے۔"

"ہاں ہاں جیسے وہ آپ نے تحفے میں دینے کے لئے خریدی ہیں۔" بہت دیر تک وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اُس کے پلے کچھ نہ پڑا ہو، پھر وہ کچھ کھویا کھویا زیرِ لب بڑبڑایا۔ "اچھا یونہی سہی۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہو گی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن۔ میرا مطلب ہے۔ تم کیا کرو گی دارولا۔؟"

"اتنی سی بات ہے نا کہ میری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہوگا۔ سو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ خوفزدہ ہو۔ "تمہاری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ہوگا۔ یعنی تم کچھ نہ دے سکو گی۔" وہ کچھ اتنا مایوس ہو گیا کہ مجھے یوں نظر آیا گویا وہ اپنا پہلا ارادہ بھی ترک کر دے گا۔ تاکہ میں بھی اُس کے بیٹے کو تحفے میں کچھ دے سکوں۔ وہ بہت نیک دل شخص تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے بیٹے کو یہ تحفہ پیش کر کے مجھے بے حد خوشی ہوتی لیکن میں اُس کی خوشیاں ختم نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ کا بیٹا اور آپ خوش ہوں تو پھر میں اپنے آپ خوش ہو گئی۔ اور مجھے واقعی ایسی ہی خوشی ہو گی جیسے وہ تحفہ میں نے خود دیا ہو۔" اب اُسے کچھ تسلی ہوئی اور اُسے میری بات کا یقین آیا۔ اس کے بعد وہ قریب قریب دو گھنٹے ہمارے پاس بیٹھا رہا لیکن ایک پل کیلئے بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ وہ بات بات پہ اچھل پڑتا۔ زور زور سے بولتا رہا ہنستا رہا۔ ساشا کے ساتھ اچھل کود کرتا رہا۔ میرے بوسے لیتا رہا اور جب اُس کا ہاتھ پہنچ سکتا تو میرے بازو پر چٹکی بھی کاٹ لیتا اور اینا کا منہ جب کسی اور طرف کو ہوتا تو اُس کی طرف دیکھ کر منہ بھی بنا دیتا۔ اور اینا نے آخر تنگ آ کر اُسے چلے جانے کو کہہ دیا۔ اس سے پہلے وہ اتنا خوش کبھی نظر نہ آیا تھا۔

جب وہ مُبارک دن طلوع ہوا تو وہ ٹھیک گیارہ بجے چرچ سے سیدھا دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے کپڑے بڑی احتیاط سے پہنے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی واسکٹ اور اُس کے جوتے بالکل نئے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کتابوں کے بنڈل تھے ہم سب اینا کے کمرے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے (یہاں یہ اتوار کا دن تھا) اُس نے آتے ہی پہلا فیصلہ تو یہ صادر فرمایا کہ پُشکن بہت اچھا شاعر ہے لیکن دوسرے ہی لمحے گھبرا گیا اور کچھ ایسی باتیں کرتا رہا کہ آدمی کو ٹھیک ڈھنگ سے بات چیت کرنی چاہیئے اور اگر کوئی اس بات کی پروا نہیں کرے گا تو پھر وہ قدم قدم پہ غلطی کرے گا اور پھر اُس کی بُرائیاں اُس کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیں گی۔ اور یہ نکتہ تو اُس نے کئی مثالیں پیش کر کے واضح کیا اور بار بار کہا کہ گذشتہ کئی ماہ سے وہ اپنے اطوار ٹھیک کرتا چلا آ رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ اُس کے ہر کام میں ایک سلیقہ ہو۔ اُس نے اپنے بیٹے سے یہ بھی کہا کہ اُس کی کسی بات کے حق بجانب ہونے پر اُس نے کبھی شبہ نہ کیا تھا۔ اُس کی ہر بات اس نے گوشِ دل سے سُنی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ کو سیدھے راستے پہ لانا ابھی ابھی شروع کیا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں اُس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ یہ سب کتابیں قبول کر لے جو اُس نے ایک مدت کی بچائی ہوئی رقم سے خریدی ہیں۔

جب وہ مجھے یہ سب باتیں بتا رہا تھا تو میرا ایک تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا دوسرے میں جی کھول کے رونا بھی چاہتی تھی۔ کم از کم وہ یہ جانتا تھا کہ کس موقعہ پر کونسی بات کی جانی چاہیئے۔ کتابیں پُکنکا کے کمرے میں تھیں اور اُس کی میز کی زینت بن چکی تھیں۔ اب یہ بات اور تھی کہ پوکروفسکی ایک دم سچائی کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور وہ کتابوں کے بارے میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو کھانے پر مدعو کیا تھا اور کیا خوب دن گذارا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم تاش کھیلتے رہے ساشا شرارت کی پتلی بنی ہوئی تھی اور میں بھی اُس سے کچھ کم نہ تھی جب میں اکیلی ہوتی تو پوکروفسکی اپنی تمام تر توجہ کا مرکز مجھے بنا لیتا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے اُسے موقع نہ دیا۔ گذشتہ چار برسوں میں اتنا زیادہ خوش کبھی نہ ہوئی تھی۔

لیکن اب اُداس اور درد انگیز یادوں اور مصیبت کے دنوں کا

ذکر بھی لازم ہے۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ میرا قلم بہت آہستہ آہستہ لکھ رہا ہے۔ قلم شائد کچھ اور لکھنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ لیکن شائد ایک یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے اسی لمحے کے انتظار میں اپنی خوشیوں کے ایام کو پوری تفصیل میں بیان کر دیا ہے۔ میری خوشیاں اس قدر کم تھیں کہ اُن کے بعد میری زندگی پر غم کے اتنے گہرے بادل چھا گئے ہیں کہ خدا ہی جانتا ہے یہ پاپ کب کٹے گا۔

دراصل میری مصیبتوں کا آغاز پوکروفسکی کی بیماری اور موت سے ہوتا ہے۔ جو واقعہ میں ابھی ابھی اوپر لکھ چکی ہوں اس کے ٹھیک دو ماہ بعد پوکروفسکی بیمار پڑ گیا۔ کیونکہ ان دو مہینوں میں روزی کمانے کے لئے پوکروفسکی نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ کیونکہ اُس کی زندگی کی کوئی ٹھوس بنیاد تو تھی نہیں۔ ہر تپ دق کے مریض کی طرح پوکروفسکی بھی آخری لمحے تک اس اُمید کا دامن نہ چھوڑا تھا کہ ابھی اُسے بہت جینا ہے اگر وہ اس طرز کی ملازمت سے نفرت نہ کرتا تو وہ بہ آسانی سکول ماسٹر بن سکتا تھا۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق تھا تو اُس کی صحت اتنی خراب تھی کہ اُسے سرکاری ملازمت کبھی نہ مل سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اُسے اپنی پہلی تنخواہ کیلئے بہت دیر انتظار کرنا پڑتا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اُسے ہر بات میں فقط دکھ کا پہلو نظر آتا تھا آخر کار اُسکا کردار یاسیت زدہ ہو کر رہ گیا اور اُسکی صحت بھی دل بدن تباہ ہوتی گئی اور ستم یہ تھا کہ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں مطلق آگاہ نہ تھا۔ موسم بہار میں اکثر و بیشتر وہ نوکری کی تلاش کرنے کیلئے ایک پتلا کوٹ پہن کر نکل جاتا تھا اور جس جگہ جاتا تھا اپنی خستہ حالت کی بنا پر کافی ذلت اٹھاتا تھا اسی طرح وہ کئی بار بارش میں بھیگ چکا تھا اور گیلے پاؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایسا بستر پہ پڑا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ بہار اپنے پورے جوبن پر تھی کہ وہ اس دُنیائے فانی سے اُٹھ گیا۔ یہ ماہ اکتوبر کے آخری دن تھے۔

اُس کی بیماری کے دَوران میں میں شاذونادر ہی کبھی اُسکے کمرے سے باہر گئی ہوں گی۔ میں نے ہر ممکن طرح سے اُس کی دیکھ بھال کی۔

پوکروفسکی کبھی کبھی آنکھ کھولتا تھا تو مجھے پہچان لیتا تھا۔ لیکن ایسا موقع بہت کم آتا تھا۔ زیادہ تر وہ غش کھاتے رہتا تھا۔ اور تمام رات کسی بحث میں اُلجھا رہتا تھا۔ اُس کی زبان سے طویل، مبہم اور اُلجھے ہوئے فقرے سُننے میں آتے۔ اُس چھوٹے سے کمرے میں اُس کی بیٹھی ہوئی آواز عجیب طرح گونجتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے گنبد میں صدا گونجتی ہو اور میں ڈر جایا کرتی تھی۔ خاصکر آخری رات تو اُس پر شدت کی بے ہوشی طاری تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ شدید کرب میں مبتلا ہے۔ وہ رہ رہ کر کراہتا اور آہیں بھرتا۔ ہر شخص ڈر گیا تھا اینا نے خدا سے دُعا مانگی کہ اُسے جلد اپنے پاس بُلا لے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ صبح تک خاتمہ ضرور ہو جائے گا۔

اُس کے بوڑھے باپ نے وہ تمام رات دروازے کے باہر بیٹھ کر گذاری۔ وہاں اُس کے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ وہ بار بار کمرے میں آتا لیکن ایک خوف کے تحت بغیر کچھ دیکھے واپس لوٹ جاتا۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ رنج و یاس نے اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا تھا کسی خوف کے زیر اثر اُس کا سر ہلتا ہی رہا۔ بلکہ وہ سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہی کچھ کہتا رہا کبھی انکار کرنے کے انداز میں سر ہلا دیتا کبھی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ اس قدر تھک ٹوٹ چکا تھا کہ گہری نیند میں سو گیا۔

ابھی صبح کے سات بجے تھے کہ میں نے دیکھا موت اب پوکروفسکی کے سرہانے کھڑی ہے۔ میں نے اُس کے باپ کو جگا دیا۔ پوکروفسکی عین آخری لمحے پر اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھا۔ اُس نے ہم سب کو الوداع کہی اور پچھلی باتوں کی معافی مانگی حالانکہ میرا دل پاش پاش ہو چکا تھا لیکن میری آنکھوں سے ایک بُوند آنسو نہ گرا۔

پوکروفسکی کا آخری وقت پتھر کو بھی لہو رلا سکتا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز اور ڈوبتی ہوئی سانسوں میں کوئی التجا کر رہا تھا لیکن میں کچھ نہ سمجھ پائی۔ بلکہ وہ موت کا ناچ میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ تڑپتا رہا۔ اور رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ مطلب ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نحیف اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کوئی التجا کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس بار پھر کچھ نہ سمجھ سکی۔ باری باری میں نے سب کو اس کے بستر کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اُسے پانی پلایا۔ لیکن اُس نے پُریاس انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ آخر کار میں جان گئی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سامنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا جائے تاکہ آخری بار سورج کی روشنی کو دیکھ لے۔ وہ دن کے نور کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ وہ خدا کی کائنات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا دیا۔ لیکن باہر بھی فضا اُسی طرح دُھندلی اور ماتمی تھی جیسے اُس کی

دم توڑ رہی تھی زندگی۔ سورج کی روشنی کہیں بھی نہیں تھی اور آسمان دُھند اور کُہر میں چھپا ہوا تھا۔ آسمان پر اُداسی کا پیکر نظر آتا تھا اور یوں جان پڑتا تھا جیسے یہ بے ستوں عرش ابھی الٹ پڑے گا۔ کھڑکی کے تختوں پر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اداس بارش اور کُہر بھری فضا کو دیکھ کر یوں جان پڑتا جیسے ادا سیاں مجسم ہو کر رو گئی ہوں۔ اندر تیل کے دیئے کی ہلکی ہلکی کرنیں دم توڑتی ہوئی لَو کے ساتھ جدوجہد کر رہی تھیں۔ مرنے والے نے پُرحسرت نظروں سے مجھے دیکھا اور مایوسی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ یہ اُس کی زندگی کی آخری رمق تھی۔ وہ موت کی نیند سو گیا۔ وہ اس جہان سے دوسری دُنیا میں جا چکا تھا۔

انیتا نے جنازے کا انتظام کرایا تھا۔ ایک سادہ سا کفن خرید اگیا اور ایک معمولی سی بیل گاڑی کرائے پر لے لی گئی۔ اور اُن اخراجات کو پُورا کرنے کیلئے انیتا نے مرحوم کی کتابوں اور باقی ملکیت پر قبضہ کر لیا۔ مرحوم کا بوڑھا باپ اپنی پوری طاقت کے ساتھ انیتا سے زور آزما ہوا۔ جتنا اُس سے بن پڑا اتنی کتابیں اُس نے انیتا سے واپس حاصل کرلیں۔ اُن کتابوں کو اُس نے اپنی جیبوں، اپنے ہیٹ میں ٹھونس لیا۔ اُن کتابوں کو اُس نے تین روز تک اپنے سے علیحدہ نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ چرچ میں بھی اُنھیں اُٹھائے اُٹھائے پھرتا رہا۔ لیکن وہ اپنی سُدھ بُدھ بھُول چکا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک سوچنے سمجھنے اور بولنے کے ناقابل ہو چکا تھا۔ وہ تابوت کے اردگرد پاگلوں کی طرح چکر لگاتا۔ اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا اور بار بار اپنے مرحوم بیٹے کی گردن کو ٹھیک کرتا تھا۔ کبھی موم بتی جلا دیتا کبھی بجھا دیتا۔ اُس کے خیالات کسی بات پر پل بھر کے لئے نہ جم سکتے تھے۔ مرحوم کی روح کی شانتی کے لئے چرچ میں جو عبادت کی گئی تھی اُس میں نہ امّی جان نہ انیتا شامل ہو سکی تھیں۔ امّی جان کی طبیعت تو ٹھیک نہ تھی اور انیتا جانے کو تیار ہی تھی کہ پھر اُس بوڑھے شخص سے اُلجھ پڑی اور اُس نے عبادت میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا بوڑھا باپ اور صرف میں وہاں موجود تھے۔ عبادت کے دوران میں میرے دِل و دماغ پر ایک عجیب خوف طاری ہوا۔ جیسے مجھے اپنا مستقبل یاد آگیا ہو۔ میں عبادت پُوری ہونے تک کا بھی انتظار نہ کر سکتی تھی۔ آخرکار جنازہ اُٹھایا گیا اور اُس بیل گاڑی پر رکھ دیا گیا اور بیل گاڑی چل دی۔ میں گلی کے سرے تک تو اُس بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ گئی وہاں پہنچ کر کوچوان نے گھوڑے کو زور سے چابک مارا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کا بوڑھا باپ سسکیاں بھرتا ہوا ہانپتا ہوا گرتا پڑتا اُس بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کا ہیٹ گر گیا لیکن وہ اُسے اُٹھانے کیلئے نہ رُکا۔ بارش سے اُس کے بال اور اُس کا جسم بھیگ چکا تھا۔ سرد اور تند ہوا اُس کے چہرے پر چابک کی طرح آکر لگتی تھی۔ لیکن اُسے کسی بات کی پروا نہیں تھی اور وہ اُس ٹھیلے کے کبھی اِس طرف سے ہو کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا کبھی اُس طرف سے۔ اُس کے کوٹ کے سرے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ اُس کے کوٹ کی جیبوں سے پو کر دوسکی کی کتابیں لُڑھک لُڑھک کر زمین پر گر رہی تھیں۔ جو سب سے بڑی کتاب تھی اُسے اُس کے بوڑھے باپ نے اپنے سینے سے بھینچ کر لگا رکھا تھا۔ راہگیر جنازے کو دیکھتے تو اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور عبادت کرنے کے انداز میں جھک جاتے۔ کچھ لوگ اس دیوانے کو دیکھنے کیلئے بھی رُک جاتے۔ کتابیں اس کی جیب سے نکل نکل کر نیچے کیچڑ میں گرتی رہیں۔ اگر کوئی اُسے روک کر گری ہوئی کتاب دکھاتا تو وہ لپک کر کتاب اُٹھا لیتا اور پھر بیل گاڑی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا۔ گلی کے آخری موڑ پر اُس کے ہمراہ ایک پھٹے کپڑوں والی بھکارن بھی ہو لی تھی۔ جب بیل گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں گھر چلی آئی اور امّی جان کے سینے سے لپٹ گئی ہچکیاں لیتے لیتے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے کئی بار امّی جان کو چوما اُنہیں اپنی باہوں میں لپیٹ لیا۔ جیسے میں موت کے ہاتھوں سے اپنے آخری دوست کو بچانا چاہتی تھی۔ لیکن موت تو پہلے ہی اُن کے سرہانے آکھڑی ہوئی تھی۔ . . . .

. . . .

۱۱ر جون۔

اکارکلا جزیرے تک کی سیر و تفریح کے لئے میں بے حد شکر گذار ہوں۔ جزیرے کتنے حسین تھے۔ کس قدر شاداب اور ہرے بھرے نظر آتے تھے۔ میں نے ایک مُدت سے گھاس اور درخت نہیں دیکھے تھے۔ جب میں بیمار پڑ گئی تھی تو مجھے گمان گذرا تھا کہ اب میں اُنہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکونگی۔ میرے خیال میں اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکوں گی۔ لہٰذا اب تم خود اندازہ کرو کہ اس مایوسی کے بعد کل وہی کچھ دیکھنے سے میں کتنی خوش ہوں گی۔ دیکھو کل میں کیونکہ اُداس اُداس نظر آرہی تھی اس لئے خفا نہ ہو جانا۔ میں واقعی بہت خوش تھی اور میرے دل کو بہت چین تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ ہوا ہے کہ جب مجھے بہت زیادہ خوشی نصیب ہوتی تو میں ہمیشہ اُداس ہو جاتی ہوں۔ اور اگر میں رو بھی پڑی تھی تو اس سے تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اکثر و بیشتر بغیر وجہ جانے رو پڑتی ہوں۔ میرے خیال میں اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ مجھے کچھ چیزیں بہت آسانی سے چوٹ پہنچا جاتی ہیں میرے تاثرات ہمیشہ

دردانگیز ہوا کرتے ہیں۔

ماکار — تم کتنے اچھے ہو۔ جب کل تم مجھے بغور دیکھ رہے تھے تو میں جان گئی تھی کہ تم میرے دل کا حال جاننا چاہتے تھے۔ تم میری خوشیوں کی تہہ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ نظر کے سامنے کوئی جھاڑی تھی یا پھولوں کی بہار تھی یا درختوں کا جھنڈ تھا یا کوئی چشمہ تھا لیکن تم مجھے دیکھ رہے تھے اور تمہاری آنکھوں میں ایک فخر جھلک رہا تھا کچھ ایسا فخر جیسے وہ ساری جگہ تمہاری اپنی جائیداد ہو۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم رحمدل اور نیکدل انسان ہو۔ اور میرے اچھے ماکار تمہاری اس خوبی کی بنا پر مجھے تم سے محبت ہے۔ اچھا خدا حافظ میرے اچھے ماکار — آج پھر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج صبح میرے پاؤں بہت دیر تک بھیگے رہے اور مجھے سردی لگ گئی ہے۔ فیڈورا بھی بستر پر پڑ گئی ہے اور ہم دونوں بیکار سی ہو کے رہ گئی ہیں۔ ہمیں بھول نہ جانا اور جب ممکن ہو سکے تب ملنے چلے آؤ۔

تمہاری

وی۔ ڈی۔

۱۲ر جون۔

میری پیاری واروارا۔

کیا تم جانتی ہو کہ میں کیا اُمید کر رہا تھا کہ تم مجھے منظوم خط لکھو گی۔ اور اُس کی بجائے تم نے ایک چھوٹے سے صفحے کا خط لکھ بھیجا۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم نے بہت تھوڑا لکھا ہے لیکن خوب لکھا ہے اور طرزِ تحریر پر تو میں سو جان سے فدا۔ تم نے جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔ رہا مَیں تو مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے اگر میں ایک درجن صفحے بھی لکھ دوں تو ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہوگی۔ تم کہتی ہو کہ میں رحمدل اور نیک دل انسان ہوں اور خدا کا فرشتہ ہوں اور نہ جانے کن کن الفاظ میں تم نے میری تعریف کی ہے۔ جانِ من یہ سب سچ ہے میں بالکل ایسا ہوں جیسا تم نے بیان کیا ہے۔ لیکن تم نے جو کچھ لکھ دیا ہے اُسے پڑھ کر دل پگھل جاتا ہے اور دماغ میں اُداس خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سنو میری ننھی سی جان اب میں تمہیں اپنی زندگی کے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔

میں نے تیرہ برس کی عُمر میں ملازمت شروع کی تھی۔ یعنی یہ تیس سال پہلے کی بات ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن دنوں میں نے کئی سردس کوٹ پہنے ہوں گے۔ لیکن اَب عُمر کے ساتھ ساتھ میری سوجھ بوجھ بھی تو بڑھی ہے۔ اور آخر کار میں نے دنیا دیکھی ہے۔ یقین مانو میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ ثبوت چاہتی ہو! تو سُنو کہ ایک ایسا بھی وقت آیا تھا جب میری خدمات کے صلے میں مجھے تمغۂ عطا کرنے کی سفارش کر دی گئی تھی۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن خدا شاہد ہے۔ بدقسمتی سے بُرے لوگ زندگی میں ہر مقام پہ آ ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں بیوقوف اور جاہل ہوں گا لیکن میرے سینے میں بھی ویسا ہی دُھڑکتا ہوا دل ہے جیسا کسی اور انسان کے سینے میں ہو سکتا ہے۔ اور معاذ اللہ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ اس بدخواہ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا مجھے بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تم یہ نہ پوچھو اُس نے کیا کیا تھا۔ تم یہ پوچھو اُس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیونکہ میں شرمیلا شخص ہوں کیونکہ میں خاموش طبع ہوں، کیونکہ میرے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا نازک دل ہے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میں اُسے پسند نہ تھا بس ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے یہ سب فساد کھڑا ہو گیا تھا۔ "ماکار ایسا ہے ماکار ویسا ہے پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ "ماکار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے بیکار آدمی ہے جی —" اور آخر کار یہ بات بھی سُننے میں آئی —" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر خطا کس کی ہے: ظاہر ہے ماکار کا قصور ہے — سو اب تم خود جان سکتی ہو کہ ہمیشہ اور ہر بات غریب ماکار ہی کی خطا ہوتی ہے۔ بس اس شخص نے اس سے زیادہ اور کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن یہی ضرب بڑی کاری ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے وزارت کے ہر محکمے میں ماکار کو بدنام کر دیا اور سب کی نظروں سے نیچے گرا دیا۔ لیکن پھر یہ سلسلہ یہیں تک ختم نہ ہوا۔ انہیں میرے جوتوں پر اعتراض ہونے لگا۔ میرے کوٹ، میرے بال حتیٰ کہ میرے وجود تک پر اعتراض ہونے لگے۔ یہ بات غلط تھی اور اس کا کفارہ لازمی تھا۔ اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جب مجھے ذلیل نہ کیا جاتا تھا۔ اب میں اس سلوک کا عادی ہو چکا ہوں۔ پھر میں تو ہر بات کا عادی ہو سکتا ہوں۔ آخر ایک معمولی رُتبے کا انسان جس کو کسی شمار میں نہیں لایا جا سکتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہ سب کچھ کیوں برداشت کروں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ کیا میں نے کسی دوسرے شخص کی ترقی روک دی ہے؟ افسران کے سامنے میں نے کسی شخص کی چغلی کھائی ہے؟ کوئی بھی ایک ثبوت پیش کر سکتا ہے؟ یہ بھی چھوڑ دو۔ کیا میں نے کبھی خود اپنی ترقی کیلئے زبان سے ایک لفظ تک نکالا ہے؟ کیا میں نے کسی کے ساتھ کبھی کوئی ساز باز کی ہے؟ ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہئے؟ اور مجھے کیا ضرورت پڑی

تو کرو سب کچھ کرتا پھرتا؟ اور پھر اتنا تو سوچا جائے کہ کیا میں بلند مرتبہ داد اور انعام پیدا کرنے کے قابل ہوں بھی؟ لیکن خدا کی پناہ میں اس سزا کا حقدار کیسے ٹھہرایا گیا...... تمہاری نظروں میں تو میں ایک اچھا شخص ہوں۔ ہے نا؟ اور جانِ من تم دُنیا کے باقی ہر شخص سے اچھی ہو۔ اور آخر کار ایک مہذب شہری کی سب سے بڑی خوبی ہے کیا؟ آئیو نووک نے کل ایک پرائیویٹ جلسے میں کہا تھا کہ سب سے خوبی یہ ہے کہ جیبیں بھر بھر کے پیسہ کماؤ۔ (آئیو نووک ضرور مذاق کر رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آئیو نووک نے ازراہ مذاق یہ بات کہی ہوگی) لیکن اس فقرے کا اصل مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی پر بوجھ نہ بنے اور میں کسی شخص پر بوجھ نہیں بنا میں نے روکھی سوکھی یا باسی روٹی کھائی ہے لیکن وہ روٹی خون پسینے کی کمائی سے حاصل کی ہے اور شرافت سے پیسہ کمایا ہے۔ آخر ایک انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔ کاغذات کی نقل کرنے میں کوئی خاص ذہانت نہیں درکار لیکن مجھے اس کام پر بھی فخر ہے کیونکہ میں اسی کام میں اپنا پسینہ بہا دیتا ہوں۔ اور پھر نقل اُتارنے میں کیا بُرائی ہے! کیا یہ گناہ ہے؟" وہاں بیٹھا مکھی پہ مکھی مارتا رہتا ہے ــ " سالا دفتری چوہا ہٹتا ہی نہیں ــ" آخر ان فقروں کا مطلب کیا ہے۔ آخر اس کام میں بے ایمانی کہاں سے آ گئی؟ میرا دستخط بہت اچھا ہے دیکھنے میں صاف اور واضح ہے اور حضور والا ہمیشہ خوش ہوتے ہیں ــ اور حضور والا کے بہت ہی ضروری کاغذات کی دوسری کاپی تو میں ہی تیار کرتا ہوں۔ رہی اسلوب کی بات تو خواہ مخواہ مغز کھپاتا رہوں میں صاحبِ اسلوب نہیں ہوں ــ اور میں بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں ملازمت میں کبھی ترقی نہیں پا سکا۔ وارنیکا ــ میں تو تمہیں بھی خط لکھتے ہوئے بالکل اسی طرح لکھتا ہوں۔ میں فنکارانہ جذبات اور اندازِ بیاں کہاں سے لاؤں۔ بس جو کچھ دماغ میں جس پیرائے اور انداز سے آتا ہے اُسی طرح اُسے کاغذ پر اُتار دیتا ہوں۔ میں ایک سوال پوچھتا ہوں حالانکہ میں اس کا جواب بخوبی جانتا ہوں لیکن پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ اگر ہر شخص نئی بات کہنے لگ جائے تو پھر اُس بات کو دہرائے گا کون؟ تم اس سوال کا جواب خیر کیا دو گی لیکن اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن لوگوں کو میرے ساتھ ایسے ظالمانہ مذاق نہیں کرنے چاہئیں۔ وہ مجھے بعد شوق دفتری چوہا کہیں کیا وہ لوگ یہ نہیں محسوس کر سکتے کہ اسی چوہے کی اشد ضرورت ہے، یہی چوہا اُن کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ چلو میں چوہا ہی سہی لیکن میری قسمت کی جاتی ہے۔ میں وہ چوہا ہوں جو کام آتا ہے لیکن جانِ من لعنت ان سب باتوں پر۔ تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ محض جذبات کی رو میں بہہ گیا اور سب کچھ لکھ گیا۔ کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے کہ کھری کھری کہہ دی جائے۔ خدا حافظ جانِ من۔

میرے آرام جاں۔ میرے ننھے فرشتے میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گا تب تک اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرنا۔ میں اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لاؤں گا۔ اچھا۔ خدا حافظ وارنیکا۔

تمہارا مخلص اور خیر خواہ
ماکار

۳۰ جون

مائی ڈیر ماکا۔

مجھے دستکاری کا کام ختم کرنے کی بہت جلدی ہے اور اسی جلدی میں میں یہ خط لکھ رہی ہوں ــ سنو ــ تم ایک بہت اچھا سودا کر سکتی ہو۔ فیڈورا کہتی ہے کہ کوئی صاحب اپنی بالکل نئی وردی بیچنا چاہتے ہیں۔ وردی کے ساتھ پتلون، واسکٹ اور ٹوپی بھی ملے گی۔ بالکل نئی اور سستی ہے۔ خرید لو نا! اب تو تمہارے پاس پیسے بھی ہیں اور تم خود کہتے ہو کہ تمہاری مالی حالت ان دنوں اچھی ہے۔ دیکھو اب مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بہت کارآمد ہوتی ہیں۔ ایک نظر خود پر ڈال لو ــ جو کپڑے پہنے پھرتے ہو ذرا انہیں دیکھو تو سہی۔ کتنی بُری حالت میں ہے تمہارے کپڑے بڑی شرم کی بات ہے اور تمہارے پاس نئی وردی تو ہے ہی نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم لاکھ کہو کہ تمہارے پاس نئے کپڑے ہیں لیکن میں نہ مانوں گی۔ خدا جانے تمہاری نئی وردی کیا ہوئی۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ دیکھو خدا اوراس کے متعلق فیصلہ کر لو ــ میری خاطر ہی سہی لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تم یہ وردی ضرور خرید لو۔

تم نے میرے لئے کچھ ریشمی کپڑا بھیجا ہے لیکن تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ غضب خدا کا تم اپنا پیسہ خرچ کیسے کر رہے ہو۔ تم عجب فضول خرچ ہو ــ یہ چیزیں بالکل غیر ضروری ہوتی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ تحفے بھیج بھیج کر

مجھے اس محبت سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں اور خاص کر ان تحفوں کو قبول کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس پر تمہارا اکتا لیس خرچ آیا ہوگا۔ دیکھو آج کے بعد دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں پاؤں پڑتی ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم دوبارہ کبھی یوں پیسہ ضائع نہیں کرو گے۔ وعدہ کرتے ہو نا؟

مالار تم نے کہا ہے کہ میں اپنی زندگی کے باقی واقعات بھی تمہیں بتاؤں اور چاہتے ہو کہ میں اس ڈائری کو مکمل کر دوں۔ اگر سچی سچی بات جاننا چاہتے ہو تو سنو کہ مجھے خود یہ یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ کچھ بھی کیسے لکھ دیا تھا۔ میں اپنے ماضی کے بارے میں لکھنا تو درکار کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔ میں یاد ماضی سے گھبرا اٹھتی ہوں اور پھر اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی لکھنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے میری ماں جس نے اپنی بچی کو شیطانوں کے ہاتھ میں سونپ دیا اور خود جنت کو سدھار گئی۔ اس یاد سے اب بھی میرے دل کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ یاد اس قدر تازہ رہتی ہے کہ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکی چین پانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ واقعہ فی الحال ایک ہی برس تو پرانا ہے۔ لیکن تم تو اچھی طرح آشنا ہو۔

میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ اینا اب کیا کہتی پھرتی ہے۔ وہ مجھے ناشکرا اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہے اور صاف انکار کرتی ہے کہ مسٹر یانیکوف کے فیصلے میں اس کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس واپس لوٹ جاؤں اور کہہ رہی ہے کہ میں خیرات پر پل رہی ہوں اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا وہ کہتی ہے کہ اگر میں لوٹ جاؤں تو وہ کہہ سن کر مسٹر یانیکوف کو رضامند کرے گی کہ وہ اپنے پچھلی حرکتوں کی تلافی کرے اور مجھے جہیز پیش کرے۔ خدا ایسے لوگوں کو بخشے! میں یہاں پر تمہارے ساتھ رہ کر اور مہربان فیڈورا کے ساتھ رہ کر بے حد خوش ہوں۔ فیڈورا کو دیکھ کر مجھے کئی بار نینی کی یاد آ جاتی ہے۔ تم حالانکہ دور کے رشتہ دار ہو لیکن محض تمہارا نام ہی بہت تسلی پہنچاتا ہے۔ مجھے پوری حفاظت کا احساس ہوتا ہے۔ رہا ان کا سوال تو میں ان لوگوں کو جاننا تک نہیں چاہتی ہے اور اگر مجھ سے بن پڑا تو میں ان سب کو بھلا دوں گی۔ اب وہ اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ فیڈورا کہتی ہے کہ یہ سب محض افواہیں ہیں اور وہ لوگ مجھے یونہی اکیلا رہنے دیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

دی۔ ڈی

۲۱ - جون

میری جان - میری ننھی سی فاختہ

سمجھ میں نہیں آ رہا خط شروع کیسے کروں۔ جانِ من کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میری زندگی میں اتنے اچھے دن کبھی نہ آئے تھے یوں نظر آتا ہے جیسے خداوند کریم نے مجھے ایک گھر اور ایک چھوٹا سا کنبہ عطا کر رکھا ہو۔ میری پیاری بچی۔۔۔ وہ جو چار جمپر میں نے تمہیں بھیجے تھے ان پر کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہو۔ کس لئے اپنے نازک مزاج کو دکھ دیتی ہو۔ فیڈورا نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں ان کی ضرورت تھی۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں تمہیں کچھ دے پایا ہوں۔ تمہیں کیا دے پایا ہوں یہ تو میں نے خود خوشی پائی ہے۔ اپنی خوشی حاصل کی ہے۔ مجھے اس خوشی سے محروم نہ کرو عزیزم۔ مجھے کیوں دکھ پہنچاتی ہو! کس لئے مجھ سے خفا ہوتی ہے! میری زندگی کی سبھی خلائیں بھر گئی ہیں۔ میں اب دو انسانوں کے لئے زندہ ہوں۔ ایک تمہارے لئے ایک اپنے لئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب میں سماجی زندگی میں قدم رکھنے والا ہوں۔ راتازیف نے مجھے آج شام چائے پر بلایا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو مجھے ادبی محفلوں میں بلایا کرتا ہے اور سرکاری افسر ہے۔ ہمیں آج کسی ادبی موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ بھئی ہم تو اسی قسم کے لوگ ہیں۔ اچھا جانِ من خدا حافظ ہے۔ میں نے یہ چند سطریں کسی خاص مقصد کے لئے نہیں لکھیں فقط تمہیں یہی بتانا تھا کہ میں خیر و عافیت سے ہوں۔ تم نے تو اینا کے ذریعے کہلا بھیجا ہے کہ تمہیں سلائی کڑھائی کے لئے کچھ رنگین ریشمی کپڑا چاہئے۔ میں خرید دوں گا۔ جانِ من میں ضرور بھیج دوں گا۔ اور تمہاری یہ خواہش کل تک پوری ہو جائے گی۔ میں یہاں تک جانتا ہوں کہ یہ چیزیں کہاں سے مل سکتی ہیں

تمہارا مخلص دوست
ماکار

۲۴ جون۔

میری پیاری واروارا

میں بڑے دکھ سے تمہیں ایک بہت بری خبر سنا رہا ہوں۔ ہمارے مکان میں ایک بہت برا واقعہ ہو گزرا ہے۔ آج صبح بیچارے گورشکوف کا چھوٹا لڑکا مر گیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وفات کیسے ہو گئی۔ تیز بخار کی بنا پر یا کسی اور روگ کی وجہ سے لیکن یہ بہت بری بات ہوئی۔ میں ان لوگوں کو تسلی دینے گیا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ غریبی کے ہاتھوں وہ تو اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان کا کمرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا۔ اور کون جانے کہ وہ پورا کنبہ محض اسی ایک کمرے میں رہتا ہو اور صرف ضرورت کی خاطر کمرے میں چادریں لٹکا کر وقت کاٹ رہے ہوں۔ جنازہ تیار تھا۔ تابوت سیدھا سادہ تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ ان لوگوں نے بنا بنایا ہی خرید لیا تھا۔ بچے کی عمر نو برس تھی اور ان کا کہنا ہے کہ بڑا ہونہار بچہ تھا۔ وارنیکا ان لوگوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ بچے کی ماں کا یہ حال تھا کہ روئی بھی نہیں لیکن اسے ایک عجیب چپ لگ گئی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک بچے کی موت سے ان کا کچھ بوجھ ہی کم ہوا ہو۔ ایک آدمی کی روٹی کا خرچ بچا ہو۔ دو بچے اور ہیں۔ ایک نوزائیدہ اور ایک چھ یا سات برس کی لڑکی ہے۔ بچوں کو دکھی ہوتے نہیں دیکھا جا سکتا اور خاص کر جب وہ اپنے ہوں اور ان کے لئے کچھ کیا نہ جا سکے۔ ان کا باپ اپنا پرانا کوٹ پہنے ایک شکستہ کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اس کے گال سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی شاید یہ آنسو رنج کی بنا پر نہ امڈ آئے تھے شاید انہیں رونے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ خراب ضرور ہیں۔ وہ عجیب وضع کا انسان ہے۔ جب کوئی اس سے بات کرے تو شرما جاتا ہے۔ گھبرا اٹھتا ہے اور اس کی زبان ہی نہیں کھلتی۔ اس کی چھ برس کی ننھی سی بیٹی جنازے کے قریب گم سم کھڑی تھی۔ جیسے گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ وارنیکا کسی بھی بچے کو اس انداز میں گم سم دیکھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔ اس کی پرانی اور خستہ حال گڑیا فرش پر ایک طرف پڑی تھی۔ اس کی انگلیاں اس کے ہونٹوں پر پڑی تھیں اور وہ کھوئی کھوئی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ بالکل ساکت و منجمد۔۔۔ مکان کی مالکن نے اسے ٹافی کی ٹکڑی دی۔۔۔ اسی لڑکی نے وہ ٹکڑی لے تو لی لیکن اس نے کھائی نہیں۔۔۔ وارنیکا۔۔۔ یہ ہوتا ہے رنج۔۔۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟

ماکار۔

۲۵ جون

میرے پیارے ماکار۔

میں نے تمہاری کتاب واپس بھیج دی ہے۔ کیا واہیات کتاب تھی پڑھ کر سخت کوفت ہوئی۔ ایسا نایاب نسخہ تمہارے ہاتھ لگا کہاں سے؟ ماکار۔۔۔ یہ تو خیر مذاق کی بات تھی سچ سچ بتاؤ کیا واقعی تمہیں اچھی لگی ہیں۔ پرسوں تم نے وعدہ کیا تھا کہ میرے پڑھنے کے لئے کوئی چیز بھیجو گے۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ اسے پڑھ لیں گے۔ اچھا زیادہ لکھنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے خدا حافظ

وی۔۔۔ ڈی

۲۶۔ جون۔

عزیزم وارنیکا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ کتاب خود نہیں پڑھی تھی۔ میں نے یونہی صفحے ادھر ادھر سے الٹ کر دیکھا تھا کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے ذرا اچھے لطیفے درج ہیں لہٰذا میں نے سوچا کہ چلو ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ کون جانے کہ وارنیکا کو یہ کتاب پسند ہی آ جائے۔ بس یہی سوچ کر میں نے تمہیں بھیج دی تھی۔

راتازیف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے حقیقتاً کوئی اچھی تصنیف دے گا۔ غم مت کرو۔ پڑھنے کے لئے بہت مواد ملے گا۔ راتازیف ایک سچا محقق اور واقعی وسیع المطالعہ شخص ہے وہ خود بھی لکھتا ہے۔ اور ارے بابا کیسی کیسی چیزیں لکھ دیتا ہے وہ! اس کی تحریریں جان ہے اور وہ اس راز سے بخوبی

آشنا ہے کہ تحریر میں اسلوب کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ تو ایک ایک لفظ میں جان ڈال دیتا ہے۔ خالڈ دلی تمردما سے بات کرتے ہوئے میری زبان سے جو الفاظ معمولی، بے معنی اور واہیات نظر آتے ہیں وہی الفاظ جب وہ استعمال کرتا ہے تو ان میں ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ میں اسکی دعوتوں میں ہمیشہ شریک ہوا کرتا ہوں۔ وہاں ہم لوگ بیٹھے سگرٹوں کے کش لگاتے رہتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی تخیلات سناتا ہے۔ کبھی کبھی تو صبح کے پانچ بج جاتے ہیں، میں ان محفلوں کو دعوتِ ادب کہوں گا۔ لاجواب تحریر ہے اسکی، بس پھول جھڑتے ہیں۔ واقعی ہر فقرے سے پھولوں کی لڑی گوندھی جاسکتی ہے۔ موتی پروتا ہے موتی۔ اور پھر آدمی بھی نیک دل ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو سمجھتا ہے اور مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا اس کا کیا مقابلہ۔ میں اس کے سامنے ہوں کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ اُسکی عزت ہے شہرت ہے اور میں -؟ میں بالکل صفر! اُس کے سامنے میری ہستی ہی کیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود میری عزت کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے اتنی اجازت دے دیتا ہے کہ اس کے لئے نظم یا نثر کا کچھ حصہ کاپی کر دوں۔ لیکن عزیزم اس سے یہ مطلب نہ نکالنا کہ یہ فقط اس کی چالاکی ہے۔ اور نہ یہ بھی نہ سمجھنا کہ وہ میری عزت اِس لئے کرتا ہے کہ میں اُس کی نظم و نثر کی کاپی کر دیتا ہوں۔ نہیں نہیں ایسا کوئی خیال دل میں نہ لانا۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہوں کہ میں من سے یہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں میری اپنی خوشی ہے اور یہی وجہ کہ وہ بھی میری قدر کرتا ہے تاکہ مجھے خوشی میسر ہو۔ جان من جب کوئی معاملہ نازک ہو جاتا ہے تو میری آنکھوں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ اچھا اور نیک شخص ہے۔

ہاں۔ اور بے مثال ادیب ہے۔

وارنیکا ـــ یہ ادیب بھی کمال کی چیز ہے۔ واقعی خوب ہے۔ یعنی کل میں نے ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہی راز پایا ہے۔ ادب۔ بہت گہری اور ٹھوس حقیقت ہے۔ جاندار چیز ہے۔ ادب ایک تصویر ہے اور وہ ایک خاص قسم کی تصویر۔ یہ ایک آئینہ ہے۔ جس میں جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں بلند پایہ نکتہ چینی ملتی ہے۔ ہدایات ہوتی ہیں۔ اور پھر زندگی کی تفسیر ہے۔

میں نے یہ باتیں انہی لوگوں سے سیکھی ہیں۔ میں تو صاف بات کروں گا۔ میں وہاں بیٹھ کر کوئی بھی کہانی یا نظم تو سن سکتا ہوں؟ اور دوسروں کی طرح اپنا پائپ پیتا رہتا ہوں) لیکن جہاں انہوں نے بحث شروع کی اور دلائل پیش کئے تب پانی اپنے سر سے گزر جاتا ہے۔ وہ باتیں اپنی سمجھ سے باہر کی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں بھی سمجھدار نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود پر شرم آتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے۔ کاٹھ کے پتلے کی طرح تمام شام وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ اور ایک صحیح اور موزوں لفظ ادا کرنے کے لئے اپنا دماغ کریدتا رہتا ہوں۔ لیکن خدا کی ایسی مار ہے کہ ایک لفظ بھی دھیان میں نہیں آتا۔ کچھ بھی نہیں کہہ پاتا میں ـــ اور وارنیکا اگر آدمی باقی لوگوں کے معیار پر پورا نہ اترے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ کتنی سچی کہاوت ہے "بالکل کورے شخص جیسا کوئی بیوقوف نہیں ہو سکتا۔" اور پھر میں چین کے لمحات میں کرتا ہی کیا ہوں۔ بس پڑا سویا رہتا ہوں۔ اور پھر میں کر دوں بھی کیا؟ میرا خیال ہے مجھے کچھ اچھی بات کرنی چاہیئے مجھے خالی وقت میں کچھ لکھتے رہنا چاہیئے۔ یہ مشق میرے لئے بھی با ثمر مند ثابت ہو گی اور دوسرے بھی خوش ہو جائیں گے۔ اس سے میرا وقار بڑھ سکتا ہے جان من۔ اور تم کیا اندازہ کر سکتی ہو کہ وہ اس فن سے کتنی آمدنی بنا لیتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ مثلاً تو داتا زیف ہی کی مثال لے لو۔ ایک صفحہ لکھ دینا اس کے لئے بہت ہی معمولی بات ہے۔ وہ ایک روز میں پانچ صفحات لکھ سکتا ہے اور جانتی ہو کہ اس کے معاوضے میں اُسے کیا ملتا ہے؟ تین سو روبل، یہ داتا زیف ہی نے بتایا ہے مجھے۔ اور اگر وہ کوئی ایسی کہانی لکھ دے جس میں لوگ بہت زیادہ دلچسپی دکھائیں تو اُسے پانچ سو روبل بھی مل جاتے ہیں۔ وہ انکار کر کے تو دیکھیں ہم اگلی بار ایک ہزار روبل طلب کریں گے۔ وارونکا - اب اس مسئلے پر تم اپنی رائے نہ دے بیٹھنا۔ ہاں من سوچو تو ـــ فقط ایک نظم کے کچھ اشعار اور پھر اس نے تو پوری کتاب لکھ رکھی ہے۔ سات ہزار روبل اُس کی لاگت کتنا ہے۔ اندازہ تو کرو۔ یہ تو کسی جاگیر کی لاگت ہو سکتی ہے۔ کسی محل کی قیمت ہو سکتی ہے۔ داتا زیف کا کہنا ہے کہ پبلشر پانچ ہزار روبل دینے پر آمادہ ہے لیکن اُسے منظور نہیں۔ یہی

اب اس معاملے میں وہ زیادہ جانتا ہے۔ میں نے تو اُس سے بہت کہا تھا کہ خدا کے لئے پانچ ہزار روبل منظور کروا دو اُن پر لعنت بھیجو۔ بامشکل پانچ ہزار روبل نقد دیتے کو تیار ہے لیکن دلنا زیجت اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ وہ پوری خود اعتمادی سے کہتا ہے۔ "جناب۔ قدم چھڑائیے ساتھ ہزار روبل دینے گے۔" وار نیکا یہ شخص کتنی کمپری نظر رکھتا ہے۔

فضول کی باتیں بنانے سے کیا حاصل۔ میں یہاں اس کی کتاب سے کچھ ٹکڑے نقل کر رہا ہوں۔ تمہیں خود بخود اس کی قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"وینڈی میر چل پڑا۔ کیونکہ اُس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ اس کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ وہ چلا کر بولا۔

"شہزادی! کیا تم جانتی ہو کہ میری محبت کتنی دیوانی ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ میرے پاگل پن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ نہیں! میرے خواب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ مجھے تم سے والہانہ محبت، میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں میں تمہاری محبت میں پاگل ہو چکا ہوں میری رگ رگ میں جو آگ بھڑک رہی ہے۔ اُسے تمہارے۔ وجود کے خون کا آخری قطرہ بھی نہیں بجھا سکتا۔ جو شعلہ میرے سینے کو جلائے دے رہا ہے جو بھیا! ... ابھی مجھے ختم کئے جا رہا ہے، بولو! اُسے نہیں روک سکتا۔ وہ زینا تیشرا۔ میری زینا تیشرا"

"وینڈی میر۔۔۔" زینا تیشرا نے آہستہ سے کہا۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہی تھی اور وہ اس کی آغوش میں جا سمائی۔

"زینا تیشرا۔۔۔" وہ عاشق زار ایک بار پھر چلایا۔

وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ جیسے ہانپ رہا ہو۔ جذبات کے سمندر میں محبت کا چراغ چاروں طرف نور پھیلا رہا تھا اور درد و بد قسمت غمزدہ دلوں کی تسکین عطا کر رہا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر آہستہ سے کہا۔ "وینڈی میر۔"

اُس کی آواز یوں بھاری ہو گئی تھی جیسے وہ محبت کے نشے میں سرشار تھی۔ اُس کے سینے میں طوفان مچل رہا تھا۔ اُسکے رخسار تمتما اٹھے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اور ایک نئی اور خوفزدہ محبت نے وصل میں اپنی تکمیل ڈھونڈی

آدھ گھنٹے بعد بوڑھا کاؤنٹ اپنی بیوی کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اور بولا۔

"بتاؤ! جانِ من ۔۔۔ مہمانوں کے لئے شوربہ بھی تیار کرالیں کیا؟ اور اُس نے اُس کے رخسار پر ہلکی سی تھپکی دی۔

وارنیکا ۔۔ اب اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے! شاید ذرا گھٹیا بات ہے لیکن پھر بھی خوب ہے۔ کم از کم داد زلیخا جس داد کا مستحق ہے وہ تو اسے ملنی ہی چاہئیے۔ اچھا اب اُسکی ایک اور کہانی پرمک اور زلیخا کا کچھ حصہ سنو۔ تم ذرا اندازہ لگاؤ کہ سائبیریا کا ظالم اور بے رحم فاتح زلیخا کی محبت میں گرفتار ہے۔ زلیخا سائبیریا کے سار گیم کی لڑکی ہے۔ اور اس بات سے اور تم خود محسوس کرو گی کہ ظالم آئیون کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

"زلیخا تم مجھ سے پیار کرتی ہو ۔۔ ایک بار پھر کہو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو ۔ تم مجھے چاہتی ہو۔"

زلیخا نے لشیلی آواز میں کہا۔۔۔ "میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں"

"شکریہ زلیخا۔ شکریہ۔ تم نے مجھے ساری کائنات کی خوشیاں عطا کر دی ہیں۔ پیدائش کے دن سے لیکر اب تک میری پرکرب روح کو جس کی تلاش تھی آج تم نے مجھے عطا کر دی۔ اے میری تقدیر کے ستارے اس گھڑی کے لئے تو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ یہ لمحہ عطا کرنے کے لئے اُدلاس کی چٹانوں کی خوفناک کھائیوں سے گزار کر یہاں لے آیا تھا۔ اب میں ساری کائنات کو زلیخا کے قدموں پر لا کھڑا کر دوں گا۔ اور کوئی بھی انسان جہنم کے بھوت اور دیو بھی انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ کاش یہ اہلِ زندگی اس کے نازک دل کی دھڑکنوں کو سن سکیں۔ اور محسوس کر سکیں کہ ان میں کس قدر پر اسرار جذبات موجزن ہیں۔ اس کے موتیوں جیسے آنسوؤں کے قطروں میں کیا نظمیں چھپی ہوئی ہیں کاش انہیں کوئی سمجھ سکے۔ اے خداوند اے رب کریم مجھے طاقت بخش کہ میں ان آنسوؤں کے قطروں سے اپنے من کی پیاس بجھالوں۔

"برمک — زلیخا بول — برمک — دنیا بڑی ظالم ہے اور انسان نا انصاف ہے۔ وہ ہمیں اپنی دنیا سے نکال باہر کریں گے، وہ ہم پہ لعنت ملامت کریں گے۔ میرے محبوب برمک — وہ ہماری زندگی عذاب بنا دیں گے۔ تمہارے ماحول کی بے مہر مغرور اور اونچی سوسائٹی اس غریب لڑکی کا دم گھونٹ کے مار دے گی جو برف کے چٹیل میدانوں میں اپنے باپ کے خیموں میں پلی ہے — اے میری جانِ حیات — تمہارا ماحول مجھے کبھی نہ سکھے گا۔"

برمک کی آنکھوں سے شعلے برس پڑے۔ اور وہ شیر کی طرح دہاڑ کر بولا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو برمک کی تلوار موت کے نغمے سناتی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی سب کا سر کاٹ کے رکھ دے گی۔"

وارنیکا ذرا اندازہ کرو جب برمک کو یہ پتا چلا ہوگا کہ زلیخا کو قتل کر دیا گیا ہے تو اُس کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ رات کی تاریکی میں اندھا اور بوڑھا نجم برمک کے خیمے میں گھس گیا تھا اور اُس نے اپنی لڑکی کے سینے میں کئی خنجر گھونپ دیئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جس شخص نے اس کا تخت اور وقار چھین لیا ہے اس کو وہ خود بھی کس قدر ضرب کاری پہنچا رہا ہے۔

برمک غصے میں پاگل ہو اٹھا۔ اپنی تلوار کو چٹان کے چمکیلے پتھر پہ زور سے مارتا ہوا بولا — "میں پتھر پہ وار کر کے اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا اور اس بدمعاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

لیکن برمک زلیخا کی موت کا صدمہ نہ برداشت کر سکا۔ وہ آتش میں کود گیا اور یہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

اور ذرا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ کرو۔ یہ ذرا مزاحیہ انداز میں ہے۔

"کیا تم آیوون بردکوفش زلیٹو پوز کو جانتے ہو۔ یہ وہ شخص ہے جس نے بردکوفی آیونووچ کی ٹانگ کو کاٹ کھایا تھا۔ آیوون بردکوفش منکرانہ کردار کا مالک ہے لیکن اُس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ اُس کے برعکس بردکوفی آیونووچ مشہور اور عشرت کا دلدادہ ہے۔ جب پیلاگو ایبنٹونووا اُس کی دوست تھی.... کیا تم پیلاگو ایبنٹونووا کو جانتے ہو — یہ وہی عورت ہے جو ہمیشہ الٹا پیٹی کوٹ پہنتی ہے —"

وارنیکا — کیا بلند پایہ مزاح ہے۔ بلکہ یہ تو حسین مزاج ہے۔ جب داتا زیف نے ہمیں یہ کہانی پڑھ کر سنائی تھی تو مارے ہنسی کے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ وہ خود بھی ایسی ہی شخصیت ہے۔ خدا اُس کی عمر دراز کرے۔ ہو سکتا ہے کہ کہانی کا اندازِ بیاں ذرا زیادہ ہی مانگے اور ہلکے درجے کا ہو لیکن کیا سادگی ہے کیا معصومیت ہے۔ بیہودہ خیال اور غلط خیالات کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وارنیکا میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ داتا زیف اچھے چال چلن کا مالک ہے لہٰذا بلند پائے کا ادیب ہو۔ یہ بات اکثر و بیشتر ادیبوں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔

اور فرض کرو کہ — آدمی کے دماغ میں کیا کیا خیالات آتے ہیں — ہاں تو فرض کرو کہ اگر میں بھی لکھنے لگ جاؤں۔ ذرا تصور کرو کہ اگر اچانک تمہیں ایک کتاب نظر آئے جس کا عنوان ہو — "ماکار کی نظمیں" — تو پھر تم کیا سوچو گی۔ تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا؟ رہا میرا سوال تو پھر میں دوبارہ نیفکی پراسپیکٹ میں جانے کا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہر شخص مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے گا — "وہ ماکار ہے — وہی ماکار — شاعر اور نامور ادبی شخصیت"، تو میں کیا محسوس کروں گا۔ پھر میں اپنے ان شکستہ جوتوں کا کیا کروں گا۔ اب بات چل ہی پڑی ہے تو میں بھی بتا دوں کہ میرے جوتوں پر ہمیشہ ٹانکے لگے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تلوا تو بری طرح باہر کو نکل آتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے شاعر ماکار کو اس حالت میں جاتے ہوئے دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ اور اگر شہزادی مجھے وہ خستہ حال بوٹ پہنے ہوئے دیکھ لے گی تو پھر کیا ہوگا — میرا خیال نہیں کہ اُس کی نگاہ جوتوں پر ہی پڑے گی کیونکہ شہزادیاں لوگوں کے جوتے نہیں دیکھتی پھرتیں اور پھر کلرک کے جوتے کے بارے میں وہ خاص توجہ بھی دی کیا۔ لیکن میرے اپنے دوست ڈانٹ دیں گے۔ اور داتا زیف سب سے پہلا شخص ہوگا۔ داتا زیف آئے دن شہزادی سے ملنے جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہزادی اور شاہی خاندان کے باقی افراد ایک ذہین دوست کی طرح اس کا سواگت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے۔ داتا زیف کہتا ہے کہ شہزادی بہت ہی خوش

مزاج اور رحم دل عورت ہے - اس سے ملنا ہی ایک خوشی کی بات - اس کا کہنا ہے کہ شہزادی بہت زبردست ادیب اور افسانہ پرست ہے - سچ کیا کہنے راتازلیف کے - بہت ہی قابل شخص ہے -

اچھا اب کوئی اور بات کرتا ہوں - میں تو یہ سب کچھ تمہاری دلچسپی کے لئے لکھ رہا تھا - اچھا عزیزم خدا حافظ! آج میں نے چھ کوپک کرما ہی تباہی کی ہے - لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج میں بے حد خوش ہوں - ہم سب نے کل راتازلیف کے ہاں کھایا تھا - اور کچھ بدمعاشوں نے شراب بھی پی تھی - مجھے یہ سب کچھ لکھنا نہیں چاہیئے - لیکن تم مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھنا - یہ تو یہم ال جیتنے کا بہانہ ہے اور کچھ نہیں - میں کتابیں ضرور بالضرور تمہیں بھجوا دوں گا - ان دنوں پال ڈی کاک کی ایک کتاب ہمارے حلقے میں پڑی جا رہی ہے - لیکن عزیزم وہ کتاب تمہارے مطلب کی نہیں ہے - نہیں نہیں ایسی کتابیں تمہیں دور سے بھی نہیں دیکھنی چاہئیں - سننے میں آیا ہے کہ سینٹ پیٹرس برگ کے تمام نقاد اس کتاب پر برس پڑے ہیں - میں تمہارے لئے ایک پونڈ مٹھائی بھیج رہا ہوں - میں نے خاص تمہارے لئے خریدی ہے تاکہ تم مٹھائی کی لذت اٹھاتے وقت مجھے بھی یاد کرتی جاؤ - اور ہاں صرف ان کا رس چوسنا - انہیں دانتوں سے مت کاٹنا ورنہ دانت خراب ہو جانے کا خدشہ ہے - تمہیں کیا پھلوں کا مربہ اچھا لگتا ہے - اگر اچھا لگتا ہے تو مجھے لکھ بھیجو - اچھا دلارنیکا خدا حافظ - خدا تمہارا نگہبان رہے -

تمہارا بہترین دوست
ماکار

۲۷- جون -

میرے پیارے ماکار

فیڈورا کہتی ہے کہ اگر میں چاہوں تو کئی لوگ مجھے کام دینے کو تیار ہیں - اور بچوں کی دیکھ بھال کا کام اچھی اجرت پہ مل سکتا ہے - تم مجھے صلاح دو کہ میں اس پیش کش کو قبول کروں یا نہ کروں - اگر میں یہ کام شروع کر دوں تو پھر میں تم پر بوجھ نہ بنی رہوں گی - کیوں کہ اس ملازمت کے نقد پیسے بھی ملیں گے - لیکن دوسری طرف بھی ایک اور امر بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ کسی اجنبی گھر میں داخل ہونے کا تصور مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے اور جو شخص مجھے ملازمت دینے کو تیار ہے وہ کوئی جاگیردار ہے - لیکن میں ڈر رہی ہوں کہ وہ میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہے گا اور میں اسے کیا کہوں گی! علاوہ ازیں میں بالکل کسی جنگلی باشندے کی طرح ہوں - مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے - میں ان جگہوں کی عادی ہو جاتی ہوں جہاں مجھے زیادہ دیر رہنا پڑے اور پھر وہاں چاہے لاکھ مشکلات پیش آئیں میں گذارا کر ہی لیتی ہوں - یہ جگہ ایک تو یہاں سے کوسوں دور ہے اور پھر کون جانے کہ مجھے وہاں کیا کام کرنا ہوگا - ممکن ہے بچوں کی نگہبانی کرنی پڑے اور کوئی بھی کام نہ ہو لیکن بچوں کی دیکھ بھال کونسی آسان بات ہے بچے کس کے قابو میں آتے ہیں - اور پھر ان لوگوں نے گذشتہ دو برسوں میں دو استانیاں بدلی ہیں - ماکار خدا کے واسطے مجھے صلاح دو - کیا میں ہاں کر دوں یا انکار کر دوں؟ تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آتے - ان دنوں تم نظر ہی نہیں آتے - صرف اتوار کے دن ملتے ہو یا چرچ میں مل جاتے ہو - تم بھی واقعی کسی جنگلی باشندے کی طرح ہو — بالکل میری طرح ہو - اور قریب قریب میں تمہاری ہم فطرت ہوں

ماکار — تمہیں مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں ہے - میں اکیلی بیٹھی بیٹھی کتنی اداس ہو جاتی ہوں - خاص کر کبھی کبھی شام کے وقت تو میں بالکل اکیلی ہوتی ہوں - تن تنہا بیٹھی رہتی ہوں — فیڈورا کہیں گئی ہوتی ہے اور میں بیٹھی بیٹھی سوچتی رہتی ہوں - میرے دل و دماغ میں پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میں سوچتی رہتی ہوں کہ کونسا واقعہ غم انگیز تھا اور کونسا واقعہ مسرت بخش - تمام مناظر ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگتے ہیں (بالکل یہی تصویریں ہوتی ہیں) اور امی جان سے متعلق جتنے واقعات یاد آتے ہیں اتنے دیگر واقعات یاد نہیں آتے - اور نہ جانے مجھے کیسے کیسے سپنے آتے ہیں - مجھے جان پڑتا ہے کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے - میں بہت کمزور ہو چکی ہوں آج جب میری آنکھ کھلی تو اچانک بے ہوش ہو کے گر پڑی تھی - کچھ عرصے سے مجھے بری کھانسی بھی آنے لگی ہے - مجھے یقین ہے کہ

میں جلد مر جاؤں گی۔ اور میرے مرنے کی کسے پرواہ ہے۔ میرے لئے کون روئے گا اور قبر تک میرے جنازے کے ساتھ ساتھ کون جائے گا۔ اور کونسی بڑی بات ہے کہ میری موت کسی اجنبی گھر میں ہو جائے۔ بالکل اجنبی جگہ پہ میں بسوں۔ میرے خدا — زندگی کس قدر اداسیوں سے بھری ہوئی ہے

اور ماکار — تم ہر وقت مجھے مٹھائیاں اور پھل کیوں کھلاتے رہتے ہو۔ میں سوچ تک نہیں سکتی تمہارے پاس اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے۔ میرے عزیز دوست — اپنے پیسوں کو بچاؤ — میں نے ایک چٹائی کی سلائی اور کڑھائی کی تھی — فیڈورا اسے فروخت کرنے والی ہے ابھی تک ہمیں بینک نوٹ کی صورت میں پچاس روبل پیش کئے جا چکے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ اچھے بھاؤ کی — کم از کم مجھے اتنی توقع نہ تھی۔ تین روبل میں فیڈورا کو دے دوں گی۔ اپنے لئے ایک جمپر بناؤں گی۔ جمپر سیدھا سادہ ہوگا لیکن گرم کپڑے کا ہوگا۔ اور ہاں میں تمہارے لئے بھی ایک واسکٹ بناؤں گی۔ یہ واسکٹ میں اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی اور اچھے سامان سے تیار کروں گی۔

فیڈورا نے ایک کتاب خریدی ہے۔ اس کا نام ہے The Tales of Ivan Belkin میں یہ کتاب تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو اسے پڑھ لینا۔ لیکن خدا کے لئے اسے خراب یا گندا نہ کر دینا یا اسے اپنے پاس زیادہ دیر رکھے رہنا۔ دو برس پہلے کی بات ہے کہ یہی کہانیاں میں امی جان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی اور جب میں نے یہ کہانیاں اکیلے بیٹھ کر پڑھیں تو میرے دل پر گہری اداسی چھا گئی۔ اگر تمہارے پاس کچھ کتابیں ہوں تو میرے پڑھنے کے لئے بھیج دینا۔ ہاں وہ داتا زیفت کوئی کتاب دے تو وہ نہ بھیج دینا۔ وہ تو فقط اپنی ہی کتاب دے گا اور وہ بھی اگر کسی نے چھاپ دی ہو۔ ماکار تم اس کی کہانیاں پسند کیسے کر لیتے ہو۔ وہ تو بہت ہی واہیات کہانیاں ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔ میں نے بھی آج بے شمار باتیں کی ہیں۔ میں جب کبھی اداس ہوتی ہوں تو اسی طرح بے مقصد اور بے معنی باتیں کرتی ہوں۔ یہ میرے درد کی اصل دوا ہے کیونکہ اس طرح میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ اچھا میرے دوست

تمہاری

وی۔ ڈی

۲۸۔ جون۔

میری ننھی فاختہ واروارا۔

اس طرح ناامید ہونے ہوتے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ اچھا اچھا ہٹاؤ یہ اداسی — بس بس بند ہو میرے فرشتے۔ تم ایسی باتیں سوچ کیسے سکتی ہو؟ نہیں جان من تمہیں کوئی روگ نہیں ہے۔ تم بالکل بیمار نہیں ہو۔ تم تو چہک رہی ہو۔ تم تو ہشاش بشاش ہو تم اس صورت میں بھی پھول کی طرح ہو جو ذرا سا پیلا ضرور ہے لیکن چہک رہا ہے۔ اور سپنے کیا دیکھتی رہتی ہو تم۔ کیا سوچتی رہتی ہو؟ بہت بری بات ہے یہ تو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ایسے خیالات اپنے دماغ سے جھٹک کر رکھ دو۔ دیکھو میں کتنی اچھی نیند سوتا ہوں اتنی اچھی طرح سوتا ہوں کہ کوئی دکھ مجھے پریشان نہیں کرتا۔ میری طرف دیکھو ڈبلا اور اسکے دکھوں سے بے خبر ہو کے سو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خوش رہتا ہوں۔ ہنستا کھلتا ہوں اور نوجوانوں کی طرح توانا ہوں۔ واقعی — میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ وارنیکا چھوڑو یہ اداسی — اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں جانتا ہوں تمہارے سر میں کیا خبط سمایا ہوا ہے ذرا سی بھی بات تم پر اپنا اثر کر جاتی ہے اور تم ہو کہ بیٹھی پریشان ہوتی رہتی ہو اور سلیقہ وجہ سوچتی رہتی ہو۔ دیکھو تم ایسا نہ کیا کرو۔ میں اپنے پیار کا واسطہ دیتا ہوں۔ وہی اس ملازمت کی بات تو صاف انکار کر دو۔ نہیں نہیں نہیں ایسی بات بھول کر بھی دماغ میں نہ لانا۔ میں حیران ہوں تم ایسی باتیں دماغ میں لائی کیسے ہو۔ اور پھر وہ جگہ کتنی دور ہے یہ بھی تو دیکھو — تمہیں میری گڑیا تم یہ ملازمت نہیں کرو گی۔ میں یہ بات کیسے برداشت کروں گا۔ میں اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کروں گا۔ میں اپنا کوٹ تک بیچ دوں گا صرف قمیص پہنے گھومنا منظور کر لوں گا لیکن تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ کرنے دوں گا۔ نہیں وارنیکا — تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا ہے یہ صریحاً حماقت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے یہ سب قصور فیڈورا کا ہے۔ یہ اسی بیوقوف اور جاہل عورت کی حماقت ہے جس نے تمہارے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہ کرنا۔ میرا کہا مانو — اس کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کا تمہیں علم ہے۔ وہ بالکل بیوقوف عورت ہے۔ بات

ناشکر باد ہے ۔ اس کا خاوند اس کے ہاتھوں دکھی ہو کے مرا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے خاوند کو مار دیا تھا۔ شاید اس نے تمہیں خفا کر دیا ہو ۔ نہیں جان من کبھی بھی ہو جائے تم ملازمت نہیں کرو گی ۔ یہ تو سوچو میں کیا کروں گا ۔ ارے میرے پاس کون رہ جائے گا۔ نہیں وار نیکا بالکل نہیں ۔ اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال کر باہر کر دو تم مجھے اور منیزہ دونوں کو کتنی خوشیاں عطا کرتی ہو اور تم ہم دونوں کی کس قدر مشتاق ہو ۔ بس جس طرح جی رہی ہو اسی طرح جیو ۔ کھاؤ پیؤ اور سو رہو ۔ شوق پورا کرنے کے لئے پڑھا کرو یا سلائی کا کام کر لیا کرو ۔ یا اگر سلائی بھی نہ کرنا چاہو تو صرف کتابیں پڑھتی رہو ۔ لیکن ایک بات سن لو کہ تمہیں کہیں نہیں جانا ۔ تمہارا دور چلے جانا کسی کے حق میں بھی مفید ثابت نہ ہوگا ۔ تمہیں جن کتابوں کی ضرورت ہوگی میں خرید دوں گا ۔ ہم دونوں سیر کرنے جایا کریں گے ۔ لیکن عقل سے کام لو سمجھدار بنو اور ایسے پاگل پن کو دوبارہ دماغ میں مت لانا۔ میں تم سے ملنے آؤں گا ۔ شاید بہت جلد چلا آؤں ۔

صاف صاف بات کر دینے پر مجھے معاف رکھنا لیکن میں مجبور ہوں ۔ یہ تو بڑی ذلت ہے ۔ جان من بہت زیادہ توہین ہے ۔ میں پڑھا لکھا شخص نہیں ہوں ۔ اور جیسی کہاوت ہے میں نے بھی چنے دے کر تعلیم حاصل کی ہے ۔ لیکن اس وقت میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا میں فقط داتا زلیف کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ عزیزم میری خطا معاف کرنا لیکن میں اس کی طرف سے صفائی ضرور پیش کروں گا ۔ وہ میرا دوست ہے میں اس سے انکار نہیں کر سکتا ۔ اور نہ صفائی پیش کئے بغیر رہ سکتا ہوں ۔ وہ اچھا لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے ۔ درحقیقت اس معاملے میں میں تمہارے ساتھ متفق نہیں ہوں ۔ وہ انتہائی عمدہ پیرائے میں لکھتا ہے ۔ اس قدر صاف زبان اور اس کی تشبیہیں الفاظ اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ داد دینی ہی پڑتی ہے ۔ غالباً اسے پڑھتے وقت تمہارا دل کچھ میلا ہوگا ۔ ممکن ہے تم فیڈورا کے ساتھ ناراض ہوگی یا اور ناخوشگوار بات ہو گئی ہوگی ۔ اسے دوبارہ پڑھنا ۔ اچھا خاص توجہ اور صحیح جذبے کے ساتھ پڑھنا ۔ مثال کے طور پر پڑھتے وقت منہ میں مصری کی ڈلی رکھ لینا ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسے کئی ادیب ہیں جو داتا زلیف سے کہیں اچھا لکھتے ہیں ۔ مانا کہ وہ لوگ بہت اچھا لکھتے ہیں لیکن داتا زلیف بھی اچھا لکھتا ہے ۔ اگر اور لوگ اچھا لکھتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ داتا زلیف برا ادیب ہے ۔ وہ صاحب اسلوب ہے ۔ نئی بات کہتا ہے اور یہ پہلو اس کے لئے اچھا ہے ۔ خدا حافظ جان من میں اور زیادہ اس وقت کچھ نہیں لکھ سکتا ۔ آج میں بہت مصروف ہوں دیکھو مایوسی کو اپنے دل میں جگہ مت دو ۔ خدا تمہارا نگہبان ہے اور رہا میں جو بیٹھا ہوں ۔ تمہارا سچا دوست

ماکار

ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا ۔ بعض کتاب کے لئے بہت بہت شکریہ ۔ میں پنسل کر پڑھوں گا ۔ شام کے وقت میں تم سے ملنے آؤں گا ۔ پہلی جولائی ۔

میرے پیارے دوست ماکار

مجھے پورا یقین ہے کہ یہاں تمہارے درمیان رہ کر میری کوئی زندگی نہیں ۔ بار بار غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس پیش کو ٹھکرا دینا سخت غلطی ہوتی ۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ میں اپنے دو وقت کی روٹی ہی کماؤں گی ۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں ایک اجنبی خاندان کی محبت جیتنے کے لئے پورا پورا اجتہاد کروں گی ۔ ضرورت محسوس ہوگی تو میں اپنا کردار بدل ڈالوں گی ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اجنبی ماحول میں رہنا بہت مشکل ہوگا ۔ انہیں خوش کرنا ہوگا ۔ میری ذاتی زندگی بے پردہ رہے گی ۔ یہ سب ٹھیک ہے ۔ لیکن شاید خدا میری بھی مدد کرے گا ۔ میں تمام عمر اسی طرح شرمیلی بن کر گزارہ نہیں کر سکتی ۔ میری زندگی میں ایسے کئی سانحات پہلے بھی گزر چکے ہیں ۔ آخر بورڈنگ ہاؤس کے ایام میں بھول تو نہیں گئی ۔ مجھے ہر دہائی اور اچھی طرح یاد ہے جب میں گھر آکر اودھم مچایا کرتی تھی ۔ حتیٰ کہ جب امی جان مجھے ڈانٹ دیا کرتی تھیں تو بھی میرا دل پھول کی طرح کھلا اور شگفتہ رہتا تھا ۔ لیکن جونہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے میرے دل پر بھی اداسی چھا جایا کرتی تھی ۔ کیونکہ کل صبح نو بجے مجھے سکول پہنچنا ہوتا تھا ۔ وہ سکول جس کا ہر پہلو میرے لئے اجنبی تھا ۔ جس کی سرد مہری اور سختی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی ۔ اور استانی کا تصور میرے لئے

صداب جاں کی حیثیت رکھتا تھا ۔ میں کئی بار بلک بلک کے رونا چاہتی رہی لیکن آنسو پی جاتی تھی ۔ تاہم کبھی کبھار تنہا کسی گوشے میں چھپ کر جی بھر کے رو لیا کرتی تھی ۔ کیونکہ جی میں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ مجھے کاہل اور سست کہتے ہیں ۔ لیکن پڑھائی یا سبق کے ڈر سے میں کبھی نہ روئی تھی ۔ اور پھر اس کے بعد کیا رہتی ؟ جوں جوں وقت گذرتا گیا میں سکول کی ماسی نعتا سے مانوس ہوتی گئی اور جب سکول سے روانگی اور ہم جماعتوں سے رخصت لینے کا وقت آیا تھا تو میں اس وقت بھی سسکیاں لے لے کر روئی تھی ۔

اور پھر یہ بھی مناسب نہیں کہ میں تم پہ یا فیڈورا پہ بوجھ بنی رہوں ۔ اس خیال ہی سے مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے ۔ میں آج صاف صاف باتیں کر رہی ہوں کیونکہ میرے تمہارے درمیان کوئی تکلف نہیں ہے ۔ کیا میں دیکھتی نہیں کہ بیچاری فیڈورا ہر روز منہ اندھیرے اٹھ کر کام شروع کر دیتی ہے اور پھر سارا دن اتنی مصروف رہتی ہے کہ دم لینے کی بھی اسے فرصت نہیں ملتی ۔ اور پھر تم تو جانتے ہی ہو کہ بڑھاپے میں آدمی کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کیا میرے منہ پہ یہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں ہیں کہ تم اپنی ساری آمدنی مجھی پر خرچ کر دیتے ہو ! اب ذرا سوچو کہ تمہاری آمدنی کس قدر قلیل ہے اور میں تم پر کتنا بڑا ظلم کر رہی ہوں ۔ تم نے تو خط میں لکھ دیا کہ میری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تم اپنے بدن کا کوٹ تک اتار کے بیچ آؤ گے ۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایسا کر گذرو گے ۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت رحمدل ہو ۔ لیکن یہ سب کچھ تم اس وقت کہہ رہے ہو ـــــ جب تمہیں بونس ملنے کی امید بندھ چلی ہے ۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا ؟ اور کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں مستقل طور پر بیمار رہتی ہوں ۔ جس طرح جی مار کر تم کام پہ لگے رہتے ہو میں اتنی محنت نہیں کر سکتی حالانکہ اتنا کام کرنے پر مجھے دلی خوشی ہو گی ۔ اور پھر یہ بھی مصیبت ہے نا کہ ہر وقت کام بھی تو نہیں ملتا ! پھر میرے کرنے کو رہ کیا گیا ہے ؟ بس یہی کہ تم پر آس لگائے بیٹھی رہوں اور سب کچھ ضائع کرتی رہوں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تم دونوں کے کس کام آ سکتی ہوں ۔ تم لوگوں کو میری اتنی کیا ضرورت ہے ۔ میں نے آج تک تمہارے لئے کونسا اچھا کام کیا ہے ؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتی ہوں ۔ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو لیکن جب میری قسمت ہی ایسی ہے تو کسی کا کیا دوش ! میں پیار کر سکتی ہوں ۔ لیکن اس قابل نہیں کہ اس پیار کو نیکی بنا سکوں یا کوئی اچھا کام کر سکوں تاکہ تمہاری مہربانیوں کا کچھ تو صلہ دے سکوں ۔ خواہ مخواہ مجھے اپنے پاس مت رکھو ۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے ایک بار پھر غور کر لو اور اپنی آخری رائے سے مجھے آگاہ کر دو ۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں ۔

وی ۔ ڈی

پہلی جولائی ۔

وارنیکا ! آخر کیا مصیبت ہے ۔ یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے سوجھی کیا ہے ! بس تمہیں ذرا سی تنہائی ملی اور تم ادھر ادھر بے سروپا سوچنے لگیں ۔ کہ تمہیں یہ نہیں اچھا لگتا اور وہ نہیں ٹھیک لگتا اور سب کچھ بے معنی نظر آنے لگتا ہے ۔ میں ایک بار پھر کہے دیتا ہوں کہ تم بے پر کی اڑاتی ہو ! ہم سب ایک دوسرے کے مشتاق ہیں ـــ بل بیٹھتے ہیں ـــ چین ہے ـــ خوشی ہے ـــ اور کیا چاہتے ہیں ؟ اجنبی لوگوں میں جا کر کیا ملے گا ؟ عزیزم اجنبی لوگوں سے تمہارا پالا پڑا نہیں ۔ کم از کم مجھ سے پوچھ تو پتا ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہوتے کیسے ہیں ۔ میں ان کی خصلت سے واقف ہوں ۔ رگ رگ پہچانتا ہوں ۔ میں نے ان کی روٹی کا مزہ چکھا ہوا ہے ۔ وارنیکا ۔ وہ بہت برے لوگ ہیں ۔ وہ جتنے زہریلے ہوتے ہیں تم اس قدر نیک نہیں بن سکتیں ۔ کیا ان کی نظریں کیا ان کی باتیں سبھی زہر بھرے نشتر ہوتی ہیں ۔ اور یہاں ہمارے درمیان رہ کر تم اتنے آرام سے دن کاٹ رہی ہو جیسے گھونسلے میں کوئی ننھا سا پرندہ رہتا ہو ۔ اگر تم اڑ گئیں تو سوچو تم پہ کیا بیتے گی ۔ ارے غریب لوگوں کا دل چرا کے لے جاؤ گی کیا ؟ میں بوڑھا آدمی ہوں ۔ بولو میں کیسے دن گذاروں گا ؟ تم کہتی ہو کہ تم بیکار پڑی رہتی ہو ـــــ بیکار ؟ کیا کہہ رہی ہو ؟ ذرا سا سوچو کہ تم بیکار کیسے ہو ؟ تمہارا اثر کس قدر خوشگوار ہے ـــــ مثلاً یہی دیکھو کہ اب میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں اور بے حد خوش ہوں ۔ کبھی کبھی میں اپنے سارے جذبات خط میں قلمبند کر کے تمہیں لکھ بھیجتا ہوں اور پھر تمہاری طرف سے ان کا طویل جواب آتا ہے ۔ میں تمہارے پہننے کے لئے اچھے اچھے کپڑے خرید سکتا ہوں ۔ میں نے تمہیں ایک ہیٹ بھی خرید دیا ـــ اور پھر تم مجھ سے کئی اور کام کہنے

ے لگتی ہو — تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم بیکار ہو —— اور پھر مجھ سا انسان تو تنہا کیا کرے گا۔ بتاؤ میں کس کام کا رہ جاؤں گا۔ وارنیکا شاید یہ باتیں تم سوچتی ہی نہیں۔ لیکن تمہیں سوچنا چاہیے۔ اس پہلو سے سوچو کہ یہ بوڑھا آدمی میرے بغیر کیا کرے گا۔ تمہیں گھر پاکر میں جیتا ہوں اور اگر تم چلی گئیں تو پھر میرے کرنے کو ایک ہی بات رہ جائے گی اور وہ یہ کہ نیوا پر جاکر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ پھر میں یہی کر لیا کروں گا۔ وارنیکا یوں نظر آتا ہے کہ تم مجھے ٹھکانے لگانا چاہتی ہو اور پھر کچھ لوگ مجھے بھکاریوں کے قبرستان کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے اور تم وہاں کھڑی دیکھو گی کہ وہ میری قبر کو ریت سے بھر دیں گے اور پھر وہیں مجھے بھول کر تم واپس چلی آؤ گی۔ ایسا چاہنا بہت بڑا گناہ ہے — گناہ عظیم ہے۔ میں تمہاری کتاب لوٹا رہا ہوں۔ اور عزیزم اگر تم میری رائے جاننا چاہتی ہو تو میں اتنا ہی کہوں گا کہ میں نے زندگی بھر اس سے اچھی اور کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ میں نے ساری زندگی میں تین چار سے زیادہ کتابیں پڑھی ہی نہیں۔ تمہاری اس کتاب میں سٹیشن ماسٹر کہانی پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ایک عمر گذر جاتی ہے لیکن یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ پاس کوئی ایسی کتاب بھی پڑی ہے جو زندگی کی مکمل داستان کو سیدھے سادے نقشے کی صورت میں بیان کر دیتی ہے۔ پہلے جو باتیں صاف نہیں ہوتیں وہ مطالعے سے نظر آنے لگتی ہیں۔ ان کے حل سوجھتے ہیں۔ یادداشت بڑھتی ہے۔ سمجھنے اور سوچنے کی طاقت بڑھتی ہے۔ اور اس کتاب میں مجھے جو سب سے اچھا پہلو نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ باقی کتابوں میں اس قدر چالاکی اور چابکدستی سے کام لیا جاتا ہے کہ آدمی عمر بھر پڑھتا جائے لیکن اس کے پلے ایک بات نہ پڑے گی۔ میں فطرتاً ایسی موٹی عقل کا واقع ہوا ہوں کہ ایسی لطیف اور بلند پایہ کتابیں میرے لئے نہیں لکھی گئیں۔ اور اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں نے خود لکھی ہو۔ جیسے میں باتیں کر رہا ہوں۔ اپنے دل کی باتیں کہہ رہا ہوں —— کچھ بھی کہا جائے —— یہ کتاب ہر شخص کی اپنی داستان ہے۔ یہی بات میں اتنی دیر سے کہنا چاہتا ہے۔ واقعی بہت ہی سلیس اور زبان ہے۔ میں خود بھی ایسی کتاب لکھ سکتا تھا۔ اور کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ کتاب کو پڑھتے ہی مجھے یہ احساس ہوا ہے۔ بیچارے سیمن وائرن کو جن حادثات کا سامنا کرنا پڑا تھا کیا میں انہی حادثوں سے دوچار نہیں ہوا؟ خدا جانے ہم لوگوں میں کتنے وائرن سسک سسک کے جی رہے ہیں۔ کون جانے ہم تم میں کون وائرن ہے۔ ابھی تو قریب قریب رو دیا تھا کس طرح وہ غریب شراب نوشی کا شکار ہوا —— اتنی زیادہ شراب پینے لگا کہ بے ہوش ہوکر سارا سارا دن چٹائی پر سویا رہتا تھا۔ اور جب آنکھ کھلتی تو اپنی پھٹی ہوئی اور گندی آستین سے اپنے آنسو پونچھتا رہتا اپنی بیٹی کی یاد میں رو رو کر برا حال کر لیتا۔ ہاں —— زندگی اسی کا نام ہے۔ اس کتاب کو دوبارہ پڑھنا۔ یہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔ مجھ پہ یہ سب گذر چکا تھا۔ یہ تو ہمارے ماحول میں ہے۔ میں ہر شخص کے چہرے پر اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں۔ تم ہمسایہ ہی کو لے لو —— ہاں —— اس غریب کلرک کی زندگی دیکھ لو۔ کیا وہ دوسرا سیمن نہیں ہے۔ ہم سب ہی کچھ ہیں اور کوئی بڑی بات نہیں کہ ہم سے ایک ایک انجام ہو بہو ویسا ہی ہو —— اور کون جانے کہ بوکی یا محلوں میں رہنے والے شہزادوں کا انجام بھی ایسا ہی ہو۔ ہاں ان کی ٹھاٹھ باٹھ کی بنا پر اس انجام میں ہلکا سا فرق آسکتا ہے۔ لیکن صورت وہی ہوگی۔ میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ تم سمجھیں کہ نہیں۔ ہمیں چھوڑنے کے بارے میں تم سوچ کیسے سکتی ہو؟ وائرن جیسا ردِ عمل میرا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اسلئے کچھ عقل سے کام لو۔ اپنے دماغ میں ایسے واہیات خیالات کو نہ داخل ہونے دو۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دکھی مت کرو۔ اور میری چڑیا سی جان یہ تو سوچو کہ دنیا کے اوچھے ہتھیاروں اور ذلیل لوگوں سے تم اپنے آپ کو بچاؤ گی کیسے! اچھا بھول جاؤ ایسی باتیں۔ اس کہانی کو بار بار پڑھنے سے تمہیں بہت کچھ ملے گا۔ اس کو جتنا پڑھو گی تمہاری اتنی بھلائی ہو گی۔

میں نے داتا زلیف سے بھی اس کہانی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اپنی بات پہ بضد ہے کہ یہ کہانی پرانے انداز میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ زمانے کی تمام کتابوں میں تفصیلی تصاویر اور خاکے ہوتے ہیں۔ اس کی بات میری کچھ سمجھ میں آئی نہیں۔ وہ یہ تو مان گیا تھا کہ پشکن اچھا ادیب ہے اور وہ یہ بھی مان گیا تھا کہ پشکن نے روس کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ دیکھو وارنیکا یہ کتاب بہت ہی

اچھی ہے - تم اسے بار بار پڑھو - اور پوری توجہ سے پڑھو - میری نصیحت پر عمل کرو - اور ایک بوڑھے آدمی کا کہا مان کر اسے خوش کر دو - خدا تمہیں اس کا پھل دے گا - میری وارینکا خدا تمہیں ضرور اس کا صلہ دے گا -

تمہارا دوست

ماکار -

چھ جولائی -

میرے پیارے ماکار

آج فیڈورا نے مجھے پندرہ روبل لاکر دیئے — سب سکّے چاندی کے تھے - اور جب میں نے اسے تین روبل دیے تو وہ بے حد خوش ہوئی - بیچاری فیڈورا یہ خط میں ذرا جلدی میں لکھ رہی ہوں - میں تمہارے لئے ایک واسکٹ تیار کر رہی ہوں - کپڑا بہت ہی نفیس ہے - کپڑا پیلے رنگ کا ہے - اور اس پر پھول کاڑھے ہوئے ہیں - میں تمہارے لئے ایک کتاب اور بھیج رہی ہوں - وہ بھی کہانیوں کا مجموعہ ہے - میں نے اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں - "سردس کوٹ" نام کی کہانی تم ضرور پڑھو - تم اصرار کر رہی ہو کہ میں تمہارے ساتھ تھیٹر ضرور ہی چلوں - کیا پیسے زیادہ خرچ نہ آجائینگے ؟ اچھا یوں کرو کہ اگر ضرور ہی چلنا ہو تو پھر گیلری کے ٹکٹ خرید لینا - مجھے تھیٹر گئے ہوئے تو اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ کچھ یاد نہیں - لیکن پھر مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ مفت کی فضول خرچی ہو گی - فیڈورا تو بہ کرنے کے انداز میں سر ہلا ہلا کر کہتی ہے کہ تم چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہے ہو - اور پھر یہ تو میں دیکھ رہی ہوں کہ فقط مجھی پر تم کتنا خرچ کر چکے ہو - مجھے ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چلتے رہے تو کسی دن بہت بھاری مصیبت آجائیگی - فیڈورا نے بتایا ہے کہ کرائے کے سلسلے میں مکان مالکن سے تمہاری کچھ لے دے بھی ہوئی ہے - ماکار — مجھے تمہارا بہت فکر لگا رہتا ہے - اچھا خدا حافظ - اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں - کام تو بہت تھوڑا سا ہے لیکن ہے فوری — مجھے اپنے ہیٹ کا ربن بدلنا ہے -

اگر ہم تھیٹر گئے تو میں اپنا نیا ہیٹ پہنوں گی اور کالا اسکرٹ پہن کر جاؤں گی - بہت اچھا رہیگا - ہے نا ؟

سات جولائی -

میری پیاری وار وارا -

میں نے کل اپنی بات جہاں سے چھوڑی تھی آج خط میں وہیں سے شروع کرتا ہوں - میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب میں بھی بے پروا نوجوان ہوا کرتا تھا - میرے دل و دماغ پر ایک ایکٹرس اپنا جادو کر چکی تھی - لیکن معاملہ یہیں تک نہیں تھا - حد تو یہ تھی کہ ایک بار تھیٹر میں دیکھنے کے علاوہ اور میں نے اس ایکٹرس کو کبھی نہیں دیکھا تھا - لیکن پھر بھی مجھے اس سے محبت تھی - والہانہ محبت - اُن دنوں کچھ واہیات نوجوان میرے پڑوسی تھے اور میں صریحاً اپنی طبیعت کے خلاف ان کا دوست بن گیا - لیکن ان کے کارناموں سے میں ہمیشہ علیحدہ رہا تھا - ہاں — دوستی کے ناطے میں ان کی ہنسی مذاق میں ضرور شریک ہو جایا کرتا تھا - اس ایکٹرس کے متعلق مجھے انہی لوگوں نے بڑھا چڑھا کر باتیں بتائیں - اور ہر شام جب بھی کھیل شروع ہوتا تو یہ چلا سات لڑکوں کا پورا گروہ گیلری کے ٹکٹ لے کر تھیٹر میں ڈٹ جاتا ویسے زندگی کی معمولی سے معمولی ضرورت پورا کرنے کے لئے ان کے پاس دھیلا نہ ہوتا - لیکن اس ایکٹرس کی خاطر وہ ہر شام وہاں جا پہنچتے اور پاگلوں کی طرح اندھا دھند تالیاں بجاتے اور چیخ چیخ کر اس ایکٹرس کا نام لے لے کر نعرے لگاتے - اور تھیٹر ختم ہونے کے بعد سونے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا - ساری رات ہر ایک شخص اپنی محبوبہ گلاشا کے بارے میں ہوائی قلعے بناتا - ہم سب کے سب اس ایکٹرس کی محبت میں سر سے پاؤں تک گرفتار تھے - وہ مجھ سے بہت پہلے اس پر عاشق ہو چکے تھے اور پڑوسی ہونے کے ناطے سے اس جال میں مجھے بھی کھینچ کر لے گئے اور پیشتر اسکے کہ میں کچھ سمجھ پاتا میں نے اپنے آپ کو اُن کے ہمراہ گیلری میں موجود پایا - جہاں مجھے کرسی ملی تھی وہاں سے پردے کا ذرا سا حصہ نظر آتا تھا لیکن میرے کان کسی واقعے سے محروم نہ رہتے - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی آواز بہت ہی شیریں تھی - اس کی آواز ایسے تھی جیسے گھنٹیاں سی بج رہی ہوں — جیسے کانوں میں شہد ٹپک رہا ہوں - ہم اتنا چیخے کہ ہمارا گلا بیٹھ گیا - اتنی زور سے اور اتنی دیر تک تالیاں

جائیں کہ یہ خود دیکھنے لگے اور اس قدر اودھم مچایا کہ بمبئی میں سے ایک وکال بھی دیا گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو یہ عالم تھا کہ پلے کچھ پڑا نہ تھا اور جیب میں صرف ایک روبل باقی تھا اور تنخواہ ملنے میں ابھی دس دن پڑے تھے۔ اور وارنیکا تم کیا سوچتی ہو۔ اگلی صبح دفتر پہنچنے سے پہلے یہ روبل بھی میں نے خوشبودار تیل اور صابن خریدنے میں خرچ کر دیا۔ میں نے وہ تیل صابن کیوں خریدا اس کے بارے میں میں آج بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس دن میں نے روٹی کھائے بغیر گزار دیا۔ اور سارا وقت اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر گزار دیا۔ وہ تیسری منزل پر رہتی تھی۔ دفتر سے گھر پہنچ کر میں گھنٹہ بھر آرام کرتا اور پھر ہو سکی یہ اس کے گھر

کے نیچے جا کھڑا ہوتا۔ پورا ڈیڑھ مہینہ مجھ پر یہی جنون چھایا رہا۔ کبھی کبھی بازار کے نکڑ پر میں ایک تیز رفتار تانگہ بھی کرائے پر کر لیتا تھا اور اس کی کھڑکی کے سامنے سے شہنشاہی جلال میں گزر جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا ہر بال بال قرضے میں جکڑ گیا لیکن آخر کار اپنا جنون تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ درحقیقت میں اکتا گیا تھا دیکھنی جاؤ کہ ایک ایکٹرس ایک ایماندار شخص کو کس پستی تک اتار سکتی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ وہ میری نوجوانی کے ایام تھے۔

ایم۔ ڈی۔

آٹھ جولائی۔

میری پیاری وارورا۔

اس مہینے کی چھ تاریخ کو جو کتاب مجھے ملی تھی میں نے فوراً اسے واپس کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی وجہ بھی بیان کر دی تھی۔ عزیزم — ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے دینا کہاں کی شرافت تھی۔ خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کو زندگی میں وہ مقام عطا کیا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ کچھ لوگوں کو تقدیر نے جرنیلوں کے حکم کی تعمیل کے لئے بنایا ہے۔ کچھ وہ ہیں جنہیں پریوی کونسلر کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے کچھ حکم چلائیں گے اور باقی ان کی تعمیل کریں گے۔ اس کے خوف سے تھر تھر کانپیں گے اور زبان پر ایک لفظ تک نہ لا سکیں گے۔ قدرت نے جس انسان کو جس رتبے کے قابل سمجھا اسے بنا دیا۔ کچھ لوگ ایک کام کر سکتے تو کچھ لوگ دوسرا۔ اور یہ حکم خدا خود جاری کرتا ہے مجھے دفتر میں کام کرتے ہوئے آج تیس برس ہونے کو آئے۔ میرے کام پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا — میرے رویے سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا اور کبھی کسی نے مجھے ہڑبونگ مچاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک شہری کی حیثیت سے جہاں میں اپنی خامیوں سے آگاہ ہوں وہاں خدا شاہد ہے کہ مجھ میں خوبیاں بھی ہیں۔ میرے افسر میری عزت کرتے ہیں حتیٰ کہ ہز ایکسی لینسی بھی مجھ سے خوش ہیں۔ اگرچہ انہوں نے میری کوئی خاص رعایت نہیں کی تاہم میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے خوش ہیں۔ میں اپنی عمر گزار کر بوڑھا ہونے کو آیا لیکن کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس سے

میرا سر شرم سے جھک جائے یا میں اندر ہی اندر ہی ڈرتا رہوں۔ میرے کردار پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔ رہی بات معمولی خطاؤں کی تو ایسی خطائیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہر شخص دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ تم بھی یہ کوشش کرتی ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات میں نے آج تک نہیں کی جس سے دوسروں کو نقصان پہنچا ہو یا کسی کی بے عزتی ہوئی ہو۔ میں نے کبھی قانون نہیں توڑا۔ کبھی امن کو خراب نہیں کیا۔ نہیں کبھی نہیں۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب تمغے کے لئے میرا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن ایسی بات کرنے کا کیا فائدہ۔ انصاف کا تو یہ تقاضہ ہے کہ تمہیں اس واقعہ کا علم ہونا چاہیئے تھا اور اس مصنف کو بھی۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے ہر بات کو بیان کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہی ہے تو اسے ہر بات جاننی بھی چاہیئے۔ وارنیکا — باقی لوگوں کا تو ذکر ہی کیا — کم از کم مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بدقسمت گوشۂ تنہائی میں بھی چھپ کر آرام سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ حالانکہ وہ صرف جیسے بھی روکھی سوکھی مل رہی ہے کھائے۔ اس کے علاوہ خدا کا خوف کھائے — کسی سے زیادتی نہ کرے اور دوسروں سے فقط یہ توقع کرے کہ وہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ وہ اپنے کام سے مطلب رکھیں گے اور اس کے معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ آخر کسی کی ذاتیات کے بارے میں کسی کو جاسوسی کرنے کا حق کیا ہے۔ انہیں اس فکر میں گھلنے کی کیا مصیبت ہے کہ کسی کے پاس

واسکٹ ہے یا نہیں ۔ آیا کسی کے بدن پہ کپڑے ہیں یا نہیں اور آیا ان جوتوں کے نیچے عمدہ تلا لگا ہوا ہے یا نہیں ؟ انہیں یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی کیا کھاتا ہے ۔ کیا پیتا ہے ۔ جہاں سڑک خراب ہوتی ہے اگر میں وہاں اپنے جوتوں کو بچانے کے لئے پنجوں کے بل چلتا ہوں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔۔ کیوں اعتراض ہو ؟ کسی مصنف کو یہ تحریر کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ جو آدمی جی رہا ہے بیفاقے کر رہا ہے ۔۔ یہ چار پیسے بغیر گزارہ کرتا ہے ۔ جیسے جا رہینا زندگی کا فرضِ اوّلین ہو ؟ کیا میں بیٹھا اپنے پڑوسی کے گھنے گندا رہتا ہوں ؟ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایسی حرکت کبھی کی ہے ؟ تو پھر دوسرے کیوں ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ۔ بس وار دار اس میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں ۔ کوئی آدمی لاکھ ایمانداری سے اپنا کام کرے ۔ اسکے افسر اس کی لاکھ عزت کریں (تم جو چاہو کہو لیکن یہ سب سچ ہے) لیکن اچانک کہیں سے کوئی موقع شناس آ ٹپکتا ہے اور اس ایماندار شخص کو سب کی نظروں میں بدھوا اور بے وقوف بنا دیتا ہے ۔ اور کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ جو شخص بے وقوف بنایا گیا ہے وہ کبھی کبھار پہننے لئے نیا کپڑا بھی سلوا لے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس قدر خوش ہو کہ رانش جاگ جاگ کے کاٹ دے ۔ کم از کم میں تو نئے بوٹ پہنتے ہوئے ایسا ہی محسوس کرتا ہوں ۔ ہاں ۔۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کیوں کہ میں اپنے پاؤں نئے چمڑے میں محسوس کر کے خوشی سے پھولا نہیں سماتا ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مصنف نے یہ باتیں حرف بہ حرف صحیح لکھی ہیں ۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی ہے کہ ہمارا افسر نیوڈ ور ایسی کتابوں کے حق میں ہو ۔ اسے تو ایسی کتابوں کے خلاف ہونا چاہیئے ۔ اسے اپنے کردار کی حفاظت میں کچھ کہنا چاہیئے تھا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ابھی نیا اور نوجوان افسر ہے اور جیسا کہ کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے اسی طرح وہ ہمیں لعن طعن بھی کرتا رہتا ہے ۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ لعن طعن کیوں نہ کرے ۔۔ وہ ہماری مٹی کیوں نہ پلید کرے ۔ جو لوگ چھوٹے ہوتے ہیں نا اگر انہیں کبھی کبھار ڈانٹ پھٹکار ملتی رہے تو ان کے لئے اچھا رہتا ہے ۔۔ میں مانتا ہوں کہ بعض اوقات وہ یہ ڈانٹ پھٹکار محض اپنی افسری جتانے کے لئے بھی کرتا ہے لیکن میں پھر پوچھتا ہوں کہ وہ کیوں نہ کرے ۔ ہمیں اپنے مقام کا احساس دلاتے رہنا اس کا فرض ہے ۔ اس کا فرض ہے کہ ہمیں خدا کا خوف دلاتا رہے کیوں کہ وارنیکا میں صرف اپنی تمہاری بات کرتا ہوں کہ خوفِ خدا کے بغیر ہم ایسے ناچیز انسانوں کی قیمت ایک کوڑی بھی نہیں پڑ سکتی ۔ اور ہم سب اپنی اپنی تنخواہوں پر گزر اوقات کرنے کی سوچتے ہیں ۔ سوال کام کرنے کا نہیں ہے سوال تو تعلق ہے ۔ اور چونکہ ہم سب کا جدا جدا مرتبہ ہے اور ہم سب اپنے سے چھوٹے آدمی کو کھلتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کھیلنے کے انداز علیحدہ علیحدہ ہیں ۔ اور یہ طریقہ کیسے بدل سکتا ہے ۔ جان من دنیا کا دستور جو یہی ٹھیرا اپنے اپنے انداز میں جو کسی سے بڑا ہے وہ اس کو کھیل رہا ہے ۔ اور اگر یہ رواج قائم نہ رہے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے ۔ خدا کی تنظیم ٹوٹ جائے ۔ مجھے واقعی حیرت ہے کہ فائیڈ ور ایسی گستاخی کو برداشت کر گیا ۔

اور پھر ایسی باتیں لکھنے سے حاصل کیا ہے ؟ کیا فائدہ ہوا کیا کتاب پڑھنے والا مجھے نیا کوٹ سلوا دے گا ؟ یا نئے جوتے خرید دے گا ؟ وارنیکا ایسی کوئی کتاب نہیں ہونے کی ۔ وہ یہ قصہ پڑھے گا اور مزید پڑھنے کے لئے اس کا اشتیاق بڑھے گا ۔ اس کی طلب اور زیادہ بڑھ جائے گی ۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی فکر سب کو لگی رہتی ہے ۔۔ افواہوں اور سرگوشیوں کو لپنے آپ بچانے کے لئے کون احتیاط نہیں کرتا ۔ رائی کا پہاڑ بنایا جا سکتا ہے اور پیشتر اس کے کہ تم جان سکو کہ کیا ہو گذرا ہے تمہارا پورا الٹنا کھلی کتاب کی طرح کسی کہانی میں پیش کر دیا جائے گا ۔ تمہارا مذاق اڑے گا ۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے ۔ اس کے بعد کوئی کس منہ سے کسی سے ملے ؟ ہر بات کو ہر واقع کو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ لوگ ہماری حالت سے ہمیں پہچان جائیں گے ۔ اگر مصنف کتاب کے آخر میں ذرا عقل سے کام لیتا تو معاملہ اتنا نازک نہ ہوتا ۔ بات اتنی نہ بڑھتی ۔ اور اگر اس کردار کو آخر میں مار نہ دیا جاتا تو اور بھی اچھا ہوتا ۔ مناسب یہی تھا کہ اسے اس کا کوٹ واپس دلا دیا جاتا ۔ ایسی صورت پیدا کر دی جاتی کہ عالی جناب اسے اپنے دربار میں طلب کرتے اور پھر اس کی خدمات کے بارے میں تحقیق کر کے اسکو انعام اور تمغہ عطا کرتے تاکہ یہ سبق ملتا کہ انجام کار خوبی اور نیکی کی جیت ہوتی

ہے اور بدی اور پستی کو سزا ملتی ہے۔ اگر میں کہتا تو اسی طرح لکھتا۔ اور جس انداز میں اس نے کہانی کو بڑھایا ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟ ہماری روزمرہ زندگی کا مذاق اڑایا گیا ہے اسکے علاوہ اس نے کیا؟ وارنیکا ـــ تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ ایسی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے بھیج دی؟ بہت بری کتاب ہے یہ۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی جھوٹ ہے کیونکہ ایسا کوئی کلرک اس دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کتاب کے خلاف۔ احتجاج کرنا چاہئیے۔

تمہارا دوست
ماکار

۲۷ جولائی۔

مائی ڈیئر ماکار

پچھلے دنوں سے کچھ باتیں ایسی ہو رہی ہیں اور تمہارے تین چار خطوں نے تو مجھے اتنا حیران کیا کہ میں پریشان ہو اٹھی۔ آخر فیڈورا نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ ماکار اس قدر دکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے جتنی صفائی پیش کی ہے اس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اور میرا خیال ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ مجھے وہ ملازمت کر ہی لینی چاہئیے تھی۔ حال ہی میں جو کچھ ہو گذرا ہے اس سے میں تو بہت ڈر گئی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ محض میری محبت کی خاطر تم نے مجھ سے اتنا کچھ چھپایا۔ اور ادھر میں تمہارے احسان تلے دبی جا رہی تھی حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ تم اپنے بنک کی جمع شدہ رقم مجھ پہ خرچ کئے جا رہے ہو۔ اب ذرا تم ہی مجھے بتاؤ یہ جان کر مجھ پر کیا گذری ہے کہ بنک میں تو تمہارا ایک دھیلا نہ تھا اور تم میری حالت پہ رحم کھا کھا کر کئی مہینوں کی تنخواہ پیشگی لے کر خرچ کر چکے ہو۔ میری علالت کے دوران میں تم نے اپنا کوٹ تک بیچ دیا۔ اوہ میرے ناچار ماکار اب میں کیا کروں! دوستی اور محبت کے جذبے کے تحت اگر تم نے یہ سلسلہ شروع کیا ہی تھا تو تمہیں بہت پہلے اسے ختم کر دینا چاہئیے تھا۔ تمہیں عیش و عشرت کے مقامات پر یوں روپیہ برباد نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ تم ایک سچے دوست نہیں ہو! تم نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ اور اب جبکہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم آخری کوڑی تک کپڑوں۔ مٹھائیوں، سینما کی ٹکٹوں، کتابوں اور تفریح کے سامان پر خرچ کر چکے ہو تو اندازہ کرو کہ مجھے خود اپنی بے خیالی پر کس قدر اذیت ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ کیا میں نے تمہاری ضروریات کا خیال کئے بغیر یہ سب تحفے قبول نہیں کئے؟ تم نے مجھے خوشی پہنچانے کا جتن کیا، اس کا انجام یہ ہوا کہ میں رنج و غم کے اتھاہ ساگر میں غرق ہو گئی ہوں۔ پچھلے دنوں سے میں تمہیں پریشان بھی دیکھتی رہی اور خود حیران بھی ہوتی رہی لیکن جب مجھ پر حقیقت کھلی تو میرے حواس باختہ ہو گئے۔ میں کسی اندرونی خوف سے کانپ رہی ہوں۔ ماکار ـــ غضب خدا کا تم اپنے آپ پر کتنی اعتنا کیسے کھو بیٹھے! لوگ کیا کہیں گے؟ اور پھر میرے لئے یہ احساس کس قدر اذیت دہ ہے کہ تم ایسا شخص، نیک اور شریف انسان اس علت کا شکار ہو جائے جس سے تمہیں تمام عمر نفرت رہی ہو۔ اندازہ کرو کہ یہ جان کر میرا کیا حال ہو گا کہ تم شراب کے نشے میں دھت پائے گئے اور پولیس نے تمہیں گھر پہنچایا! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔ اور ویسے میرا دل کہتا تھا کہ چونکہ تم گذشتہ چار روز سے مجھے ملنے نہیں آئے لہذا کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی ہو گی۔ ماکار تم نے کبھی یہ بھول کے سوچا کہ اگر تمہارے افسران کو تمہاری غیر حاضری کی صحیح وجہ معلوم ہو جائے تو وہ کیا کہیں گے۔

تم خط میں لکھتے ہو کہ ہر شخص تمہارا مذاق اڑا رہا ہے اور سب لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا ہے نیز تمہارے پڑوسی بات بات میں منہ بنا کر میرا نام لیتے ہیں۔ ماکار ـــ خدا کے لئے نہ انکی پروا کرو نہ اپنے آپ کو دکھی کرو۔ افسر کے ساتھ تمہارا جو جھگڑا ہوا تھا اس کی خبر سن کر میں بھی بہت فکرمند ہوں۔ خدارا اس کے متعلق مجھے کھل کے بتاؤ۔ تم نے لکھا ہے تم سچی بات کہنے سے ڈر رہے ہو اور خاص کر اس بات سے ڈر رہے کہ کہیں میری دوستی نہ کھو بیٹھو۔ تم لکھتے ہو کہ تم اس لئے مایوس رہے تھے کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میری مدد کس طرح کرو اور مجھے ہسپتال نہ داخل کرانے کی کیا صورت ہو۔ تم لکھتے ہو کے تمہارا بال بال قرضے میں جکڑ چکا ہے اور کرائے کے مکان مالکن سے تمہاری شدید جھڑپیں ہوئی ہیں۔ ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے کہ تم اس سے زیادہ بری بات اور کیا کر سکتے تھے

یہ سب کچھ مجھ سے چھپائے رکھا۔ خیر اب تو مجھے ہر بات کا علم ہو گیا ہے۔ آخر تم نے بات کھول ہی دی کہ تمہاری ہر آرزو کا سبب صرف میں تھی۔ لیکن تمہارے رویے کو جان کر میرے دکھ دو گنے ہو گئے ہیں۔ میرے دوست ماکار تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ بدقسمتی چھوت کی بیماری کی طرح ہے۔ ماکار ہم سب کو جو کہ غریب اور مصیبت زدہ ہیں ایک دوسرے کے نزدیک نہ پھٹکنا چاہیے۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے دور دور رہنا چاہیے۔ تم نے اپنی زندگی میں جن آلام اور مصائب کا سامنا کیا تھا میں نے تمہیں انہی سے دوچار کرا دیا۔ اور یہ تصور میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

اب تو مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم پر کیا بیتی اور تمہاری یہ حالت ہوئی کیسے! اور اگر ممکن ہو تو کوئی ایسی بات بھی بتاؤ جس سے کچھ تسکین ملے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم سے یہ سب پوچھنا کیا میری خود غرضی نہیں ہے۔ لیکن تم نے میرے دل میں اس طرح گھر کیا ہے کہ تمہاری دوستی میرے دل سے کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔ خدا حافظ — میں بڑی بے چینی سے تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔ اور میرے بارے میں ایسا سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔

تمہاری مخلص دوست

دار وارا

۲۸ جولائی۔

میری انمول بچی دار وارا

اب جبکہ طوفان ختم چکا ہے گرد جم رہی ہے اور میری زندگی پھر اپنی روش پر بہہ نکلی ہے تو تو سنو میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ کیونکہ تمہیں یہ فکر جو لگی ہوئی ہے کہ نہ جانے لوگ کیا سوچیں تو سنو۔ مجھ پر یقین کرو کہ مجھے اس دنیا میں اپنی عزت سے بڑھ کر اور کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ اسی روشنی میں تم میری تمام مصیبتوں اور شکستوں کو دیکھو اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے افسران کو نہ ان باتوں کی خبر ہے نہ ہو سکتی ہے۔ بس — وہ آج بھی میری عزت کرتے ہیں اور پھر میری برائی ان کی نظروں میں مجھے اور بھی عزت کا مستحق بنا دیتی ہے۔ مجھے صرف ایک بات کی فکر ہے اور وہ ہے افواہیں پھیلانے والوں کی حرکات۔ تم نے جو دس روبل مجھے بھیجے تھے ان سے مکان مالکن کا تو منہ بند ہو چکا ہے اب میرے سر پر اس کا کوئی کرایہ واجبی نہیں ہے۔ رہی دوسرے لوگوں کی بات تو وہ زیادہ پریشان نہیں کرتے۔ اور ان لوگوں سے جب تک میں ادھار نہیں لیتا تب تک ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور عزیزم میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ تمہاری عزت مجھے اس زندگی میں سب سے زیادہ عزیز اور لائق احترام ہے۔ اور تمہاری پاکیزگی میری ان چھوٹی چھوٹی شکستوں کی بخوبی تلافی کر دیتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس طوفان کے پہلے تھپیڑے اب ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ تم مجھے خود غرض شخص اور جھوٹا دوست نہ سمجھو۔ اے میرے ننھے سے فرشتے میں تم سے اس قدر پیار کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑنے یا دھوکہ دینے کا تصور بھی میرے لئے ناقابل برداشت عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا ہے اور میرے حوصلے پہلے سے دوگنے ہو گئے ہیں لہٰذا اب میں اپنے کام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ کل میں جب البتاف ایوانوچ کے قریب سے گذرا تھا تو اس نے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ نہیں — میں اب یہ راز نہیں چھپاؤں گا کہ میں قرضے تلے پس چکا ہوں۔ اور میرے کپڑے بہت ہی خستہ حالت میں ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور میں التجا کرتا ہوں کہ تم ناحق پریشان نہ ہوتی پھرو۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے پچاس کوپکس وصول کر کے میرے دل پر کیا بیتی۔ میں سینہ مسوس کر رہ گیا۔ میں خون کے آنسو رو دیا کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ کیونکہ اب یہ بڈھا بے وقوف تمہاری مدد نہیں کر رہا بلکہ ایک بے آسرا بچی میری مدد کر رہی ہے۔ فیڈورا واقعی قابل تعریف ہے کہ اس نے یہ رقم حاصل کر لی۔ لیکن جانِ من ابھی کچھ دیر تو کہیں سے پیسہ ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جونہی کوئی صورت نظر آئے گی میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر تو اس بات کی ہے کہ نہ جانے کیا کیا افواہیں پھیلیں گی۔ اپنے نرم و نازک ہاتھوں پر میری طرف سے بوسہ لو۔ میں اور زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ مجھے دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ مجھے گذشتہ فرو گذاشت کی تلافی کرنی ہو گی۔ آج شام میں باقی سانحات کے بارے میں لکھوں گا کہ افسران حضرات سے میرا جھگڑا کیسے ہوا۔

تمہارا دوست

ماکار

۲۸ جولائی۔

وارنیکا۔

اب مجھے نہیں بلکہ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ یہ بات ساری عمر تمہارے احساس میں پھانس کی طرح کھٹکتی رہے گی۔ تمہارے آخری خط نے تو مجھے بالکل ورطہ میں ڈال دیا۔ میں ورطہ حیرت میں گم ہو گیا لیکن جب میں نے اپنا دل ٹٹولا تو دیکھا میں سراسر سچائی پر تھا۔ یہاں میں گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا (انھیں تو بھلا دو۔ بہت ہو چکی) لیکن میں تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ صرف میں تمہارا آرزو مند ہوں۔ اور تم ایسی ہستی سے پیار کرنا کوئی نازیبا بات نہیں ہے۔ اگر تمہیں ایک بار احساس ہو چکا کہ مجھے تم سے کتنا پیار ہے تو تم ایسی باتیں ہرگز نہ لکھو۔ تم سے مجھے دکھ پہنچے۔ اور تم اپنے دل سے کچھ نہیں کہہ رہیں۔ یہ تمہارا دماغ ہے جو تمہیں ایسی باتیں سکھانے کے لئے اکساتا ہے۔

اگر انصاف سے سوچا جائے تو مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آرہا کہ میرے اور ان افسران حضرات کے درمیان تلخی کیسے پیدا ہوئی۔ بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں خاصہ پریشان رہا ہوں۔ پورا مہینہ بھر میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں لٹکا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا کہوں کہ زندگی دو بھر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دل کا حال تم سے چھپایا۔ اپنے پڑوسیوں سے چھپایا لیکن وہ مکان مالکن تو چڑیل ہے چڑیل۔ لیکن میں نے اس کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دیا اور من ہی من میں سوچ لیا کہ اسے بکنے دوں۔ وہ جی کھول کر بکے۔ اوّل اوّل تو اس نے ادھر طرح ذلیل کیا لیکن نہ جانے اسے ہمارے خطوں کے بارے میں کیسے علم ہو گیا۔ بس پھر کیا۔ پھر تو اس نے وہ واہی تباہی بکی کہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دوسروں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کی بجائے اپنے کان کھڑے کر لئے — اب میں کیا کہوں — اب بھی اس یاد سے میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

وارنیکا۔ اس مصیبت کے طوفان نے مجھے تو قریب قریب ختم ہی کر دیا تھا۔ اور اس پہ ستم یہ کہ تم بھی اس توہین کا شکار ہو گئیں۔ مجھے ڈر ابتا رہی تھی کہ کسی ذلیل شخص نے تمہاری بھی بہت توہین کی تھی۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہو گا۔ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کیونکہ یہ واقعہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے۔ یہ جنون سوار ہو گیا میں دیوانہ وار اس ذلیل انسان کے گھر کی طرف لپکا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں کیا کر گذاروں گا۔ لیکن میں تمہاری توہین کی خبر سن کر ضبط نہ کر سکا۔ مجھے بہت رنج ہوا تھا۔ اور ادھر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گلیاں اتنی گیلی ہو چکی تھیں کہ پاؤں اپنے آپ پھسل رہے تھے۔ مجھ سے زیادہ نہ بھاگا گیا تو دل پہ اداسی اور بھی گہری چھا گئی۔ میں اپنا ارادہ ترک کر کے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ۔ پھسل کر دھڑام سے منہ کے بل جا گرا۔ اچانک میری ملاقات ایمیلا سے ہو گئی۔ ایمیلا بیچارہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ لمبے وہاں سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اور میں یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کی گذر اوقات کیسے ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں اسی جانب بڑھ گئے۔ لیکن وارنیکا— تم اپنے دوست کے دکھ درد اور مصیبت بھری کہانی پڑھ کر کیا کرو گی۔ اس سے تین روز بعد ایک شام ایمیلا نے مجھے اس افسر سے ملنے پر مجبور کر دیا۔ اس افسر کا پتہ مجھے ایک تانگے والے سے مل گیا۔ اب اس افسر کی سنو وہ مجھے کچھ خبطی ہے۔ جب وہ ہمارے گھر میں رہتا تھا تو میں اس کی حرکات کو بغور دیکھا کرتا ہے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ جب میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو مناسب لباس میں نہ تھا۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں کہ وہ کمرہ کئی افسران حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یا مجھے ایک ایک کی جگہ دو دو افسر نظر آرہے تھے۔ خدا جانتا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ میں نے وہاں کیا کہا تھا لیکن مجھے اتنا یاد ہے۔ کہ میرے منہ میں جو کچھ آیا تھا میں کہہ گیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے کمرے سے باہر نکال دیا بلکہ دھکا دے کر سیڑھیوں سے لڑھکا دیا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے مجھے دھکا دے دیا اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے مجھے گھر سے باہر ضرور نکال دیا تھا۔ باقی تو تم جان ہی چکی ہو میں گھر کیسے پہنچا۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے وقار کو ٹھیس پہنچی تھی۔ لیکن کوئی غیر شخص اس واقعے کے بارے میں آگاہ نہیں ہے۔ اور چونکہ اس واقعے کو صرف تمہیں جانتی ہو لہٰذا میرے لئے یہ واقعہ ہو گذرا یا نہیں ایک ہی بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا وارنیکا؟ میں اس بارے میں کوئی دلیل پیش

نہیں کروں گا کہ میں واقعی پستی پہ اتر آیا ہوں۔ ہاں میں پستی پہ اتر آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ اور مجھے جتنا یقین ہے کہ خدا کو ایسا ہی منظور ہے۔ اس کا کیا کون ٹال سکتا ہے قسمت کے پھیر سے کون بچ سکتا ہے۔ بس وارنیکا میری ذلت یا مصیبت کی اتنی ہی داستان تھی۔ اور یہ داستان کچھ ایسی ہے نہیں کہ اسے پڑھا جائے یا اس پر غور کیا جائے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھ پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتی ہو۔

تمہارا مخلص دوست

ماکار

۹ جولائی۔

میرے پیارے ماکار۔

میں نے تمہارے دونوں خط پڑھے اور سخت پریشان ہوئی میرے بے بس دوست یا تم اپنی مصیبت بھری داستان کا کچھ حصہ چھپا رہے ہو۔ اچھا دیکھو۔ آج شام ہم لوگوں سے ملنے ضرور چلے آؤ۔ ملنے ہی کیا۔ بلکہ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ۔ تم مجھے یہ بھی نہیں بتا رہے کہ ان دنوں تم اپنا گذارہ کیسے کر رہے ہو۔ اس مکان مالکن کا اب برتاؤ کیسا ہے۔ نظر آتا ہے کہ تم جان بوجھ کر چپ اختیار کئے بیٹھے ہو۔ اچھا۔ شام کو ضرور آنا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ تم شام کا کھانا کھایا ہی نہیں کرو۔ فیدورا بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔

تمہاری وار وارا

میری اپنی وار وارا

تم خوش ہو۔ خداوند نے تمہیں توفیق عطا کی ہے کہ محبت کا صلہ محبت سے دو۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کیونکہ تم میں محبت کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ مجھے برا بھلا مت کہا کرو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہارے برا بھلا کہنے پر میں بھی تمہیں ڈانٹ پھٹکار سناؤں گا۔ نہیں۔ چلو اگر تم اسی بات پر بضد ہو کہ وہ گناہ تھا تو گناہ سہی۔ لیکن تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے واقعی صدمہ پہنچتا ہے۔ یوں خفا ہو کر مجھے ایسی جلی کٹی نہ سنایا کرو۔ میرا دل پہلے ہی بہت ستایا ہوا ہے۔ غریب لوگ ویسے بھی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ پیدائشی نازک مزاج ہوتے ہیں۔ یہ احساس پہلے بھی مجھے کئی بار ہوا ہے۔ غریب آدمی ہمیشہ شکی ہوتا ہے۔ وہ ہر اک چیز اور ہر چیز کو بغور دیکھتا ہے۔ کہ کہیں وہ دنیا کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا ہے کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں — شاید وہ یہ کہہ رہے ہیں — ور کیا زندگی ہے اس کی بھی — یہ بھلا کیا سوچے گا۔ یہ کسی کو کیا منہ دکھانے کے قابل ہے؟ اور وارینکا اس بات سے کون واقف نہیں کہ غریب کی کوئی عزت نہیں — اس کی عزت کے دام کوڑیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ لوگ بک بک کیا کئے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زمانہ اپنی صدیوں پرانی روش پر قائم رہا ہے اور رہے گا۔ اور کیوں نہ ہو؟ لوگ ایک غریب آدمی سے توقع رکھتے ہیں کہ ہر عذاب کو پی جائے۔ ہر ذلت کو برداشت کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تماشہ بھی بنے۔ سب کچھ سہے لیکن اس میں جذبات کی گہرائی نہ پیدا ہو۔ ایسی کوئی بات نہ ہونی چاہئے جو اس کی نظروں میں تبرک کا مقام حاصل کر لے۔ رہا ذاتی عزت کا سوال — تو غریب کی ذاتی عزت نہیں ہوتی کل ہی کی بات ہے ایمیلا مجھے بتا رہا تھا کہ اس کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ لیکن ہر دس کوپیکس اکٹھے ہونے کے بعد سرکاری طور پر تفتیش کی جاتی تھی اور اس کی ضروریات کو پرکھا جاتا تھا۔ چندہ دینے والوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک غریب آدمی کی عینک کے لئے پیسے دے رہے تھے۔ آج کل خیرات بھی عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ یا کون جانے کہ ازل سے اسی طرح خیرات دی جاتی ہو۔ یا خیرات دینے والوں کو یہ علم نہیں کہ اس کا صحیح طریقہ کیا ہے یا وہ پھر بہت زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو ہونا اسی طرح ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری باتوں سے متعلق ہم بہت کم واقفیت رکھتے ہوں لیکن اس پہلو کے بارے میں ہم اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ وہ واقفیت خود ہمارے حق میں اچھی نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ تجربہ یہی ثابت کرتا ہے۔ کیوں کہ کوئی نہ کوئی شریف انسان ہمیں ضرور نظر آجاتا ہے جو ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اپنے آپ سے یہ کہتا جاتا ہے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کنگال کلرک آج رات کا کھانا کیسے کھائے گا؟ میں تو خیر بریانی اور پلاؤ کھاؤں گا اور یہ شخص شاید

بھی ہو گوشت اور دودھ بھی میں ممکن ہے کہ بغیر مکھن کے کھاتے۔

اسے یہ سوچنے کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ واقعی کیا واقعی ہمارے ماحول میں ایسے شریعت زادے موجود ہیں۔ بالخصوص اتنا بدمعاش واقعہ ہوا ہے کہ یہاں تک غور سے دیکھیں گے آیا ہم ٹھیک ڈھنگ سے زمین پر پاؤں رکھ رہے ہیں یا نہیں۔ کیا لوگوں محکمے کے کلرک کا جوتا آگے سے پھٹا ہوا ہے یا اس کے کوٹ سے اس کی کہنیاں ننگی نظر آرہی ہیں۔ پھر وہ گھر پہنچ کر اس واقعہ کو کاغذ پہ اتار دے گا اور اپنی اس بکواس کو کتابی صورت میں شائع کرا دے گا۔ ان نواب نادوں سے کوئی پوچھے کیوں صاحب آپ کو اس جانچ پڑتال کی کیا مصیبت پڑی ہے کہ میری کہنیاں کوٹ سے باہر نکلی ہوئی ہیں یا نہیں۔ دار غیکا۔ مجھے اس تلخ کلامی کے لئے معاف رکھنا لیکن ایک غریب انسان اتنا ہی شرم سے پانی پانی ہوتا ہے جتنی ایک نوخیز دوشیزہ۔ میرے گنوارپن کے لئے معاف کرنا لیکن تم اجنبی لوگوں کے سامنے کپڑے اتار کر نہیں کھڑی ہو جاؤ گی۔ بالکل اسی طرح ایک غریب شخص بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی امیرزادہ اس کے گھریلو ماحول یا اس کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کرے۔ اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے دشمنوں کے رویے سے اتنا شدید گھائل کیوں ہو گیا تھا۔ انہوں نے میری شرافت اور میری عزت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

دفتر میں بھی۔ میں بالکل بے زبان جانور کی طرح سہما بیٹھا رہتا ہوں۔ اس خیال سے ہی میں زمین میں شرم کے مارے گڑ جاتا ہوں۔ پھٹی ہوئی کہنیوں یا ٹوٹے ہوئے بٹن دیکھ کر کیسے نہیں شرم آئے گی۔ لیکن بدقسمتی عجب دن دکھاتی ہے۔ آج میرے کپڑے جس قدر خستہ حال تھے شاید ہی پہلے کبھی ہوتے ہوں۔ حتیٰ کہ سٹیفن کار لودیچ بھی توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کسی دفتری بات کے دوران میں کہہ اٹھا، بھئی ماکار۔ خدا کے واسطے۔۔۔ لیکن پھر اچانک چپ ہو گیا۔ لیکن مجھ پر سارا ماجرا کھل گیا اور مجھے اس قدر شرم آئی کہ میرے گنجے سر پہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک طرح سے دیکھو تو بات کچھ نہیں غور کرو تو بہت کچھ ہے بلکہ سبھی کچھ ہے۔ کیا انہیں کسی بات کی خبر ہو گئی تھی؟ خدا نہ کرے ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے

ایک شخص پر شک ہے بھی۔ جنہیں کسی کی بے بسی کا مذاق اڑانا ہوا نہیں کیا۔ وہ تو ایک دمڑی میں تمہاری ذاتی زندگی کے تمام راز بیچ دیں گے ان کے لئے کچھ بھی پاکیزہ نہیں ہے۔

اور میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ داتا زیف کے علاوہ یہ کام اور کسی شخص کا نہیں ہو سکتا۔ ہماری منسٹری میں کسی شخص کی اس کی جان پہچان ہے اور اسی نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ اور ممکن ہے کچھ بڑھا چڑھا کر ہی بتایا ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی منسٹری میں یہ بات کی ہو اور وہاں سے یہ بات ہمارے محکمے تک پہنچی ہو۔ میرے پڑوس کا بھی ہر شخص اس بات سے واقف ہے۔ میں نے انہیں تمہاری کھڑکی کی طرف اشارے کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جب میں رات کا کھانا کھانے تمہارے کمرے میں آیا تھا تو سب لوگ اپنی اپنی کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ مکان مالکن بولی کہ بوڑھے کو شرم بھی نہیں آتی ایک بچی پہ پر دے ڈال رہا ہے اور اس نے تمہیں گالیاں بھی دیں۔ لیکن یہ سب باتیں داتا زیف کی اس حرکت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی ایک کتاب کا کردار بنا کر پیش کیا اور ہر بات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کیا۔ اس نے اتنی زیادہ باتیں کی ہیں کہ کچھ خیرخواہ لوگوں نے مجھے آگاہ بھی کیا ہے۔ میں تو کچھ کر گزرنے کی حدوں تک اتر آیا ہوں۔ آخر تم کر بھی تو کیا؟ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہمیں سزا ملے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ وقت گزارنے کے لئے تم مجھے کتاب بھیجو گی۔ خیر لیکن کتاب کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر ایک کتاب ہوتی کیا ہے؟ بس یہی ادھر ادھر کی چہ میگوئیاں۔ ناول کس بلا کا نام ہے؟ بیکار لوگوں کا دل بہلانے کے لئے فضول کی بکواس۔ اور کیا! میں کیا یہ کچھ اتنے طویل تجربے سے بھی نہیں جان سکتا! لوگ جب شیکسپیئر کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "اگر آپ ادب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو شیکسپیئر کا ذکر بھی لازم ہے۔" تو تم یقین مانو کہ وہ بھی باقی کتابوں کی طرح واہیات اور بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ سب دوسرے پہ کیچڑ اچھالنے کی بات ہے۔

ماکار

۱۲ - اگست

میرے پیارے مالکار

کسی بات کا غم نہ کرو ۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائیگا ۔ فیڈورا نے ہم دونوں کے لئے بہت کام حاصل کر لیا ہے اور تندہی سے کام کرنا بھی شروع بھی کر دیا ۔ امید ہے کہ سب مشکلیں آسان ہو جائینگی ۔ فیڈورا کو شک ہے کہ ان دنوں میری جو بدنامی ہو رہی ہے اس میں اپنا کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے ! آج نہ جانے کیوں میں بہت خوش ہوں ۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم دوبارہ قرض لینے کی سوچ رہے ہو ۔ خدا نہ کرے یہ سچ ہو ۔ دیکھو قرض کی ادائیگی کے وقت تمہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ خدا کے لئے تمہیں احساس ہونا چاہیئے کہ تم ہمارے سب سے قریبی دوست ہو ۔ ہم سے ملنے کے لئے اکثر اوقات چلے آیا کرو ۔ تمہاری مکان مالکن جو کچھ بکتی پھر رہی ہے اس پر توجہ نہ دو ۔ رہا سوال تمہارے باقی دشمنوں اور نقصان پہنچانے والوں کا تو مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا یہ خوف بے بنیاد ہے ۔ میں نے تمہیں ایک بار بتایا تھا کہ تمہارے لکھنے کے انداز میں اکھڑا پن ہے اور وہ ابھی تک ہے ۔ اچھا دوبارہ ملاقات ہونے تک الوداع ۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد ہی ملنے چلے آؤ گے ۔

تمہاری

وی ۔ ڈی ۔

میرے ننھے فرشتے وار وارا

میں کب سے تمہیں یہ بتانے کا مشتاق تھا کہ میری امیدیں دوبارہ بندھ رہی ہیں ۔ لیکن تم یہ کیسے کہہ رہی ہو کہ میں مزید قرض نہ لوں ۔ یہ تو ناممکن سی بات ہے ۔ میرے پلّے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے ۔ اور خدا نہ کرے اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو پھر کیا کریں گے ۔ تم تو بہت ہی نازک ہو ۔ لہٰذا میں پھر بھی کہوں گا کہ قرض لینا از حد ضروری ہو گیا ہے ۔ لیکن پہلے ضروری باتیں کر لیں ۔

ہاں تو پہلے یہ سنو کہ دفتر میں مجھے ایمیلان آئیو نو ویچ کے پاس بٹھا گیا ہے ۔ یاد رہے کہ یہ شخص وہ ایمیلا نہیں ہے جس کے بارے میں تمہیں میں کچھ بتایا تھا ۔ یہ شخص سب سے نچلے درجے کا کلرک ہے ۔ اس دفتر میں وہ اور میں سب سے پرانے ملازم ہیں ۔ وہ بہت ہی رحم دل اور کام آنے والا شخص ہے ۔ بڑا محنتی آدمی ہے ۔ اور اس کا دستخط بہت نفیس اور عمدہ ہے ۔ سچی بات پوچھو تو اس کا دستخط مجھ سے برا نہیں ہے ۔ المختصر کہ خوبیوں کا مالک ہے ۔ ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست تو نہیں تھے ہاں دعا سلام تک بات تھی ۔ بس کبھی کبھار پنسل یا چاقو کی ضرورت پڑ گئی تو میں اس سے مانگ لیا کرتا تھا ۔ لیکن آج وہ اچانک کہہ اٹھا ۔ "یہ بھی لاکھ روپے کی بات کی ہے ۔" میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ تہِ دل سے میرا خیر خواہ تھا لہٰذا میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ۔ سب کچھ کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ایک بات بتا دی ۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں ۔ لیکن چونکہ میں حالات کے ہاتھوں بہت زیادہ پریشان تھا اس لئے اس سے مطلب کی بات کہہ دی ۔ وہ سنتے ہی کہہ بولا ۔ "میرے عزیز دوست ۔ پیوتر پیٹرو وچ سے کچھ روپیہ کیوں نہیں لے لیتے ؟ وہ مجھے سود پہ قرض دے دیتا ہے ۔ اور سود اچھی ہے ۔ دم توڑنے والا نہیں" اور وار نیکا جانتی ہو کہ یہ خبر سنتے ہی میرا دل کس طرح بلیوں اچھل پڑا ہوگا ! مجھے امید ہے کہ رب کریم پیوتر پیٹرو وچ کے کان میں غیبی طور پہ سب کچھ کہہ دے گا اور التجا کرے گا کہ وہ مجھے قرض پہ روپیہ دے دے ۔ میں ویسے بھی اس الجھن میں گرفتار تھا کہ مکان مالکن کی بقیہ رقم کیسے چکائی جائے ۔ تمہاری مدد کس طرح کی جائے اور کچھ اپنی ضروریات کیسے پوری کی جائیں ۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے تو میرا جی جلتا رہتا ہے ۔ علاوہ ازیں مذاق اڑانے والے بھی تو میری جان پر آ بنے ہیں ۔ انہیں خدا ہی سمجھے ۔ حضورِ انور بھی کبھی کبھار ہماری میز کے سامنے سے گذر جاتے ہیں ۔ خدا خیر کرے " اگر کبھی ان کی نظر میرے لباس پر جا پڑی تو کیا ہوگا ۔ وہ صفائی کے بہت سختی سے پابند ہیں ۔ ممکن ہے کہ حضورِ انور بغیر کچھ کہے دیکھتے ہوئے گذر جائیں لیکن میں تو شرم کے مارے زمین میں گڑ جاؤں گا ۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پیوتر پیٹرو وچ کے پاس گیا ۔ اور مجھے جہاں ادھار مانگنے کا خوف تھا وہاں امید تھی ۔ اور وار نیکا اندازہ کر لو کہ حاصل کچھ بھی نہ ہوا ۔ جب میں وہاں پہنچا تو پیوتر پیٹرو وچ کسی صاحب سے باتیں کرنے میں مشغول تھا ۔ میں اس کی بغل کو

[یہ]وں جو اچھے کہہ رہا ہوں۔ جناب قبلہ پیڑ ودیج صاحب۔ [ج]ب اس نے گھوم کر دیکھا تو میں نے مدعا بیان کیا کہ مجھے تین سو لیا کی ضرورت ہے۔ پہلے پہلے تو یوں نظر آیا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں [آ]تی ہو جب میں نے مکمل کر بات کی تو وہ زور سے ہنسا اور بات [ہ]وا کی دھن میں ختم ہو گئی۔ میں نے ازسر نو التجا کی۔ میرے بار بار [ا]صرار کرنے پر وہ بولا۔ کیا ضمانت پیش کرتے ہو۔؟ یہ کہہ کر وہ پھر کاغذات میں گم ہو گیا اور مجھے یوں نظر آیا جیسے وہ میرے وجود کو بالکل بھول چکا ہو۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں نے [م]سکرا کر کہا۔

"نہیں سرکار ضمانت تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن تنخواہ سے [ی]ہ پائی پائی لوٹا دوں گا۔"

میں ابھی اتنا کہہ پایا تھا کہ اسے کوئی شخص بلا کر لے گیا۔ میں [و]ہاں کمرہ انتظار کرتا رہا اور جب وہ واپس آیا تو اپنے قلم کی نوک درست [ک]رنے میں یوں منہمک ہو گیا جیسے میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ میں نے [پ]ھر گڑگڑا کر کہا۔ "مسٹر پیوتر پیڑ ودیج۔ کیا کوئی انتظام ہو سکتا ہے؟" وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے میری آواز سنی ہی نہ ہو۔ میں [و]ہاں بہت بنا کھڑا رہا۔ آخر میں نے سوچا کہ آخری بار پھر دیکھوں۔ میں نے ملتجی انداز میں پھر اس کی کہنی کو چھوا۔ اور تم کیا سوچ رہی ہو کہ وہ کیا وہ منہ سے کچھ بولا۔ نا۔ بالکل نہیں۔ اس نے قلم کی نوک سنواری اور پھر لکھنے میں محو ہو گیا۔ میں واپس چلا آیا۔

عزیزم۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ اچھے ہوں۔ لیکن اتنے مغرور ہیں۔ افوہ۔ اس قدر مغرور ۔۔۔ جیسے وہ ہماری دنیا کے لوگ نہ ہوں۔ وہ واقعی ہم سے بہت دور ہیں۔ لیکن میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں؟ بات یہ ہوئی کہ میں نے ایمیلان سے پورا قصہ کہہ سنایا۔ وہ بالکل پیوتر پیڑ ودیج کے انداز میں ہنسا اور سر ہلانے لگا۔ یہ شخص اچھا ہے۔ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک اور شخص سے متعارف کرائے گا۔ وہ بھی سود پر ادھار دیتا ہے۔ ایمیلان کا کہنا ہے کہ وہ ضرور قرض دے دے گا۔ میں کل اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ جاؤں یا نہیں۔ خدا کرے کہ مجھے ادھار مل جائے۔ مکان مالکن مجھے نکالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس پہ طرہ یہ کہ مجھے روٹی نہیں دیتی۔ میرے بوٹ بھی بالکل پھٹ چلے ہیں۔ اور کپڑوں پر بٹن نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا؟ اگر کسی بڑے افسر نے ایک نظر میرے کپڑوں پر ڈال دی تو غضب ہو جائے گا۔ دارنیکا۔ ہماری مصیبتوں کا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔

ماکار

۴۔ اگست

میرے مہربان دوست ماکار

جتنی جلدی ہو سکے تم روپیہ ادھار لے لو خدا کے لئے موجودہ حالات کے پیش نظر میں کبھی تمہیں مدد کرنے کے لئے نہ کہتی لیکن تم جان سکو کہ ہم کن حالات میں یہاں رہ رہے ہیں۔ اب ہم اس کوٹھری میں زیادہ نہیں رہ سکتے۔ مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ آج صبح ایک معمر شخص جو بزرگ نظر آتا تھا۔ اور اس نے اچھا خاصہ لباس پہن رکھا تھا وہ سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا۔ میں اس قدر حیران ہوئی کہ اس کی آمد کا مقصد بھی نہ سمجھ پائی وہ پوچھنے لگا کہ میں کس طرح رہ رہی ہوں۔ گذارا کیسے ہوتا ہے اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولے کہ میں اس افسر کا چچا ہوں۔ اور اپنے بھتیجے کے رویئے پر سخت ناراض ہوں کہ اس نے ہمارے بارے میں افواہیں پھیلا دی ہیں۔ وہ بولا کہ اس کا بھتیجا تو ایک آوارہ اور لغو شخص ہے اور اس نے میری حفاظت کرنے کی پیش کش بھی کی۔ نیلوورا کچھ خرید فروخت کرنے بازار گئی ہوئی تھی۔ وہ نصیحت کرنے لگا کہ نوجوانوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے اور بولے کہ میں اسے اپنے باپ کی طرح سمجھوں اور وہ بھی مجھے بیٹی ہی سمجھتا ہے اور ہر وقت میری مدد کرنے کے لئے تیار رہے۔ میں گھبرا رہی تھی اور میری کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ لیکن مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے کی بالکل نہ سوجھی۔ یہ کہتا رہا کہ میرے چہرے کے خال و خط بہت حسین ہیں۔ میری صورت بہت اچھی ہے۔ وہ میرے گالوں کو گدگدانے لگا اور یہ بھی کہنے لگا کہ وہ تو فقط ایک بوڑھا آدمی ہے۔ شیطان کہیں کا! اور یہ کہہ کر میرا منہ چومنے کی کوشش کرنے لگا اتنے میں اوپر سے فیڈورا آگئی۔ اب وہ ذرا گھبرایا اور پھر کھلاہٹ میں مجھے یقین دلانے لگا کہ میری شرافت اور علمی نے اسے بہت متاثر کیا ہے اور اس کی نظروں میں میری عزت بڑھ گئی ہے اور کہنے لگا

کہ میں اسے اجنبی نہ سمجھوں۔ یہ کہنے کے بعد وہ فیڈورا کو ایک طرف لے گیا اور اسے کسی بہانے سے کچھ روپے قبول کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ فیڈورا نے صاف صاف انکار کر دیا۔ آخر کار وہ جانے کے لئے اٹھا اور بولا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کے لئے آئے گا اور آتے ہوئے میرے لئے کانوں کی بالیاں لیتا آئے گا۔ (اب اسکی بوکھلاہٹ صاف نمایاں ہو چلی تھی)۔ اس نے مجھے بھی نصیحت کی کہ میں کسی اچھے مکان میں رہوں۔ اور پھر ایک بہت ہی اچھا مکان اس کی نظروں میں ہے بھی۔ وہاں رہنے کی مجھے کچھ لاگت بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اس نے ایک بار پھر کہا کہ میں اسے بے حد پسند آئی ہوں کیوں کہ میں بہت ہی ایماندار اور سمجھدار لڑکی ہوں اور اس نے تنبیہ کی کہ مجھے آوارہ گرد لڑکوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بالآخر وہ کہہ ہی بیٹھا کہ وہ اینا فیڈ روونا کو بھی جانتا ہے اور اینا مجھ سے ملنے کے لئے بہت جلد یہاں آئے گی بھی۔ اب تو مجھ پر سب حقیقت واضح ہو گئی اور میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس درجہ غصہ آیا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے آپ کو اتنے غصے میں دیکھا۔ میں آپے سے باہر ہو گئی اور اسے صاف بتا دیا کہ میں اس جیسے لچے اور لفنگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ فیڈورا نے بھی اسے خوب جلی کٹی سنائیں اور ہم دونوں نے مل کر اسے قریب قریب دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ سب اینا کی کرتوت ہے۔ ورنہ اُسے ہمارے بارے میں کیا خبر ہو سکتی تھی۔

ماکار۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ان حالات میں ہمارا ساتھ نہ چھوڑو۔ خدا کے لئے کہیں سے قرض لے لو کیونکہ ہمیں مکان تبدیل کرنا ہی۔ فیڈورا بھی میری رائے سے متفق ہے۔ ہمیں کم از کم ۲۵ روبل درکار ہیں۔ میں یہ پوری رقم واپس کر دوں گی۔ میں کماؤں گی۔ فیڈورا میرے لئے کام تلاش کرے گی۔ سود کی پرواہ مت کرو۔ جتنے سود پر بھی ملے قرض لے لو۔ میں ایک ایک پائی چکا دوں گی۔ بس تم اس وقت میری مدد کر دو۔ ان حالات میں جب کہ خود تمہاری جان عذاب میں ہے تمہیں تکلیف دینا ایک حد تک ظلم ہے اور مجھے اس بات کا بہت رنج ہے لیکن تم میری واحد امید ہو۔ خدا حافظ ماکار۔ ذرا میرے دل پہ غور کرو۔ اور خدا کا نام لے کر قرض لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

وی۔ ڈی۔

میری پیاری وارورا

ان اچانک اور غیر متوقع صدموں نے مجھے توجڑ سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ بدمعاش تو ہم لوگوں کے لئے سانس لینا بھی دوبھر کر دیں گے۔ مجھے اب چاہے موت کے گھاٹ کیوں نہ اترنا پڑے لیکن میں تمہارے لئے ضرور قرضہ حاصل کروں گا۔ لیکن وارینکا۔ قرضہ مل جانے پر بھی تو میری موت یقینی ہے کیونکہ پھر تم مجھ سے دور بہت دور چلی جاؤ گی۔ اور میری زندگی ویران ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ غم گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ وارینکا! تم میرے ساتھ ایسا ظلم کیسے کر سکتی ہو! میں جانتا ہوں تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے اور تم بے حد دکھی ہو لیکن تم نے جہاں مجھے مدد کرنے کے لئے کہا ہے وہاں یہ لکھ دیا ہے کہ تم پائی پائی لوٹا دو گی۔ محنت کر کے کماؤ گی۔ یعنی تم اپنی صحت پر ظلم کرو اور اسے اور زیادہ برباد کر دو گی! ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ آخر تمہیں یہ سب کچھ کرنے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ میں اپنی حالت بھی بخوبی جانتا ہوں کہ اب میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہارے کام آؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ میں اور زیادہ کام کروں گا۔ میں ادیبوں کی تحریروں کی نقل اتارنے کا کام حاصل کر لوں گا۔ میں خود ان کے پاس جاؤں گا اور منت سماجت کر کے مزید کام حاصل کر لوں گا۔ تم نے لکھا ہے کہ میں سود کی پروا نہ کروں۔ بے فکر رہو اب مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ میں کہیں سے بھی چالیس روبل کا انتظام کر کے رہوں گا۔ میرا خیال ہے یہ رقم کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ادھار دینے والے میرے وعدے کا یقین کر لیں گے؟ وعدہ کرنے کے سوائے اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میری شخصیت ایسی ہے کہ لوگ ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے قرض دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ ان چالیس روبل میں ۲۵ روبل میں تمہیں دے دوں گا۔ ۲ روبل مکان مالکن کے حوالے کر دوں گا اور باقی رقم سے اپنی ضروریات پوری کر لوں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکان مالکن کو زیادہ پیسے دینے چاہئیں۔ وہ مطالبہ کرنے میں جائز بھی ہے۔ لیکن اگر تم اندازہ کرو تو تم پر بہ آسانی کھل جائے گا کہ میں اسے زیادہ رقم دینے کے قابل نہیں ہوں۔ لہٰذا اسکا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔ کچھ پیسوں میں ایک نیا بوٹ خریدا جا سکتا ہے۔

میرا یہ انا جو اتنا اس قابل بھی نہیں ہے کہ کل مجھے دفتر تک بھی پہنچا سکے۔ اور پھر فیس — وہ تو زندہ لازم ہیں۔ کہیں حضور انور نے مجھے فیشن والے کپڑے پہنے ہوئے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا کہہ بیٹھیں۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے اگر میں قرض لینے میں ناکام رہا تو پھر کیا بنے گا۔ خدا ہی میری مدد کرے۔ میں دعا گو ہوں کہ مجھے کامیابی نصیب ہو۔

ماکار۔

۵ اگست

میرے معزز دوست

ماکار

اگر تم اسقدر مایوس ہو جاؤ گے تو ہمارا کیا حال ہو گا۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو! ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپک بھیج رہی ہوں۔ اس سے زیادہ رقم میں نہیں بھیج سکتی۔ ان سے صرف وہی اشیاء خریدنا جن کی تمہیں خود ضرورت ہو۔ فیڈورا اور میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ ہم دونوں کل کیا کریں گی۔ یہ سچ ہے کہ یہ بہت ہی افسوسناک بات ہوئی ہے لیکن ہم اپنے آپ کو اتنا پریشان نہ کرو۔ تمہیں روپیہ حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی نہ سہی لیکن تم سے جو بھی بن پڑا تم نے اتنا تو کیا۔ فیڈورا کا خیال ہے کہ ہمیں یہیں رہنا چاہیئے کیونکہ اگر وہ بدمعاش چاہیں تو ہمیں نئی جگہ پر بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن اگر آج نہیں تو کل۔ بہر صورت ہمیں اس جگہ سے تو اب جانا ہی ہے۔ میں اور زیادہ لکھتی لیکن میرا دل بجھ گیا ہے۔

ماکار۔ تم بھی عجیب کردار ہو۔ ہر بات تمہارے دل پر کتنی جلدی اثر کرتی ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو تم زندگی بھر خوش نہیں رہ سکو گے۔ میں تمہارے خط پوری توجہ سے پڑھتی ہوں اور مجھ پہ یہ حقیقت صاف واضح ہے کہ تم بے وجہ پریشان ہوتے رہتے ہو۔ اپنی بساط سے باہر غم کھاتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم رحمدل انسان ہو۔ میں بھی یہی کہوں گی لیکن میں آج کچھ نصیحت دینا چاہتی ہوں۔ اسے ایک دوست کی نصیحت سمجھنا۔ ماکار۔ تم نے میرے لئے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لئے بہت شکرگزار ہوں۔ مجھے تمہارے احسانات کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ میں تو تمہاری مصیبتوں کی وجہ بنی ہوں اور تم ہو کہ میری خوشیوں اور مصیبتوں میں بھی شریک ہوتے رہتے ہو۔ تم فقط میری محبت کے سہارے پر زندہ ہو۔ اور تم جو دوسرے لوگوں کے دکھ میں یوں شریک ہوتے رہتے ہو پھر کیا عجب ہے کہ تم کبھی سکھی نظر نہیں آتے۔ دفتر سے لوٹ کر تم جب کل شام ہمیں ملنے کے لئے آئے تھے تو میں تمہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ تمہارا چہرہ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ تمہارا رنگ اڑا ہوا تھا اور چال ایسی تھی جیسے زندہ لاش چل رہی ہو۔ آخر کیوں؟ محض اس لئے کہ تم قرضہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ بات مجھے بتاتے ہوئے ڈرتے تھے؟ بس؟ اور جب میں تمہیں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی تو تمہارے چہرہ پر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جیسی ہنسی گی سب لیں گے لیکن غم نہ کیا کرو۔ ماکار۔ کچھ ہوش سنبھالو۔ میں بھیک مانگتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو یہ مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ورنہ جیسے تم لوگوں کے دکھ میں گھلتے رہتے ہو تمہارے لئے زندگی جنجال بن جائے گی۔ اچھا خدا حافظ میرے دوست۔ میرے بارے میں اتنا زیادہ نہ سوچا کرو۔

دی۔ ڈی۔

۵ اگست

میری ننھی فاختہ واربنکا

اگر تم کہتی ہو کہ قرض نہیں ملا تو گھبرانے کی بات نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر میں بہت خوش ہوں۔ اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اب مجھے یقین آیا اور مجھے ایک سچی خوشی کا احساس ہوا۔ اور مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ تم یہیں رہو گی۔ اگر اپنے دل کی بات کہوں تو تمہارا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ تم میرے جذبات کی کتنی قدر کرتی ہو۔ میں یہ سب باتیں کسی غرور یا فخر کے ساتھ نہیں کر رہا بلکہ اس جذبے سے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ مجھے اپنا دل کمزور نہیں کرنا چاہیئے۔ بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ کسی بھی آدمی کا دل کمزور نہیں

دینا چاہیئے۔ لیکن جان من میرے دماغ پر تو بوٹ کا تصور سوار ہے کل تک اگر نئے جوتے نہ لے سکا تو دفتر کیسے پہنچوں گا۔ کوئی ایک مشکل تھوڑے ہی ہے۔ ایسے ہیر سے چھوٹے غم جان کا روگ بن جاتے ہیں۔ اور میں اپنے لئے دکھی نہیں ہو رہا ہوں مجھے ان باتوں کی پرواہ نہیں ہے کہ میرے پاس بوٹ ہے یا نہیں۔ میں تو زبردست گھر میں بھی ننگے پاؤں اور بغیر آستین والی قمیض پہن کر چل نکلوں گا۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اپنی عمر گزار بیٹھا لیکن اگر لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو وہ کیا کہیں گے۔ میرے دشمن نہ جانے کیسی کیسی افواہیں پھیلائیں گے۔ بس یہی وجہ ہے کہ آدمی بوٹ اور کوٹ پہنتا ہے۔ وارنیکا میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہو گی کہ میری عزت اور نیک نامی کو بچانے کے لئے نئے جوتے بہت ضروری ہیں۔ پھٹے جوتوں میں آدمی نہ جانے کیا کھو بیٹھتا ہے۔ مجھ پہ یقین کر دیہ باتیں میری عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔ لہٰذا تم ایسی باتوں پر کان نہ دھرو بلکہ ایک بوڑھے آدمی کی بات کا یقین نہ کرو۔

لیکن میں نے ابھی یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آج کیا گذری۔ آج صبح جو کچھ میں نے برداشت کیا ہے اگر کوئی اور ہوتا تو پورا سال روتا رہتا۔ میں منہ اندھیرے اٹھ کر چل دیا تاکہ اس سے بھی مل لوں دفتر بھی دیر نہ ہو جائے۔ زور کی بارش ہو رہی تھی اور جگہ جگہ گڑھے تھے، میں اپنے کوٹ میں لپٹا ہوا چلا جا رہا تھا اور دعا مانگ رہا تھا ——

"رب کریم میرے گناہ بخش دینا۔ میری دعا سن لو۔ بس اب کی بار میری دعائیں قبول کر لو ——"

جب میں ایک چرچ کے سامنے سے گذرا تو ذرا جھک کر سجدہ بجا لایا اور بار بار دل میں کہتا گیا گنہگار کے گناہ بخش دو۔ میری مصیبتوں کو کاٹ دو۔ لیکن مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ خدا سے اس طرح شرطیں نہیں باندھی جاتیں۔ بس اسی دھن میں چلتا گیا۔ میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے آس پاس کی کسی چیز کی سدھ نہ تھی اور راستے میں جو کچھ آتا تھا میں اس سے گھبرایا نہیں۔ گلیاں سنسان تھیں اور اگر کوئی اکا دکا راہی گذرتا تو وہ بھی میری طرح اپنے خیالات میں غرق گذر جاتا تھوڑی دور آگے جا کر مجھے کچھ مزدور نظر آئے اور ان بد شغل

نے اس بارش میں مجھے اچھی طرح دھکے دیئے۔ میں گھبرا اٹھا اور تیز تیز چلنے لگا۔ جونہی میں واسکریسنکی پل پر پہنچا تو میرے جوتے کا تلا بالکل جواب دے گیا۔ اور ایک ایک قدم اٹھانا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ عین اسی وقت سامنے سے یرمولائی چلا آ رہا تھا۔ وہ جو نیز کلرک سے بھی نچلے درجے کا نقل نویس ہے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لئے ذرا سا رکا۔ اور پھر میرے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے مجھ سے ایک روپیہ ادھار مانگنا چاہتا ہو۔ میری صحت کی خیر مانگنے کے لئے۔ "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" میں نے سوچا ——" میری صحت کی خیر کیوں منہ چاہو" —— میں جب اور نہ چل سکا تو ذرا سا ستانے کے لئے رک گیا اور پھر چل پڑا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ لیکن کوئی ایسا خیال نہ آتا تھا جو دیر پا ثابت ہوا اور اسی ذہنی کشمکش کے عالم میں میں سیدھا ایک کیچڑ بھرے گڑھے میں دھنس گیا اور میرے کپڑے اتنے گندے ہو گئے کہ شرم کے مارے میرے آنسو نکل پڑے۔ آخرکار مجھے کافی فاصلے پر ایک پیلا مکان نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ مارکوف کا یہی گھر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایمیلان نے اسی جگہ بتلایا تھا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا لیکن میں اپنے حواس اس قدر کھو بیٹھا تھا کہ میں نے ایک چوبدار سے پوچھ ہی لیا —" کیوں دوست۔ یہ کس کا مکان ہے؟" اس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا —" یہ مارکوف کا گھر ہے —" میں تین بار گھر کے سامنے سے ہو کر گذر گیا لیکن مجھے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اندر چلا جاؤں۔ میرے دل سے یہی آواز اٹھتی تھی —" وہ مجھے ادھار نہیں دے گا۔ ہرگز نہیں دے گا۔ میں ایک نرا اجنبی شخص ہوں۔ پھر حلیہ کیا بنا رکھا ہے اور معاملہ پیسے کا ہے —" لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فیصلہ قسمت پہ چھوڑ دیا جائے۔ آخر وہ لوگ مجھے کھا نہیں جائیں گے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ لیکن اب مصیبت یہ مصیبت کھڑی ہو گئی۔ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی کتے کا پلا زور سے بھونکتا ہوا میرے سامنے ناچنے لگا۔ اب تم جانو کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے ہوش اڑ جائیں۔ میں سہمے ہوئے ابھی ڈیوڑھی تک ہی پہنچا تھا کہ ایک بوڑھی عورت سے ٹکرا کر اس پر لڑھک گیا۔ وہ وہاں

بیٹھی دودھ کے مرتبانوں سے دودھ چھان رہی تھی۔ دو ایک مرتبان دودھ کے بھی گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ "چلا گیا ملنے آئے ہو۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو..." اور یہ دودھ جانے کہاں گئی ... وارنیکا۔ میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ جب بھی کبھی کوئی ایسا موقعہ آیا ہے تو مجھ پر ایسی ہی بیتی ہے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ اس کی چیخ پکار سن کر مکان مالکن آگئی، میری بیچاری جان ہی خشک ہو گئی۔ لیکن میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کیا مارکوف یہیں رہتا ہے ... وہ بولی۔ یہ مارکوف کا مکان نہیں ہے لیکن اس نے مجھے ایک نظر اچھی طرح دیکھا اور مجھے نظر آیا کہ اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے کیونکہ اس نے میری آمد کا مقصد پوچھا۔ میں نے بتایا کہ مجھے ایمیلان نے بھیجا ہے۔ اور میں نے اس عورت کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ اس کی بیٹی لمبے قد کی تھی اور وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آ پہنچی۔ "اباجان کو بلا لاؤ۔ وہ اپنے کرایہ داروں سے باتیں کر رہے ہیں ..." پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اندر تشریف لائیے ..."

کمرہ کافی حد تک تسکین دہ تھا، دیواروں پر تصویریں لٹک رہی تھیں۔ زیادہ تصویریں فوجی جرنیلوں ہی کی تھیں۔ ایک صوفہ تھا۔ ایک گول میز تھی۔ اور کوئی چیزیں پڑی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آج واپس چلے جانے ہی میں بھلائی ہے اس لئے واپس چلے جاؤ۔ کل پھر آجانا۔ موسم بھی اچھا ہوگا۔ دودھ کے مرتبان بھی نہیں لڑھکیں گے۔ اور میں نے دروازے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوا وہ چھوٹے قد کا بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا اور کمر پر ایک سنہری دھاگا باندھ رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا کہیے۔ آپ کو کیا چاہیے ..." میں نے ایمیلان کا حوالہ دیا۔ اور چالیس روبل کی ضرورت بیان کی اور اپنا دکھڑا سنایا۔ لیکن اس کی نظروں سے مجھ پر کھل گیا کہ مجھے ناکامی ہوتی ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بولا۔ "تمہیں روپیہ فوراً چاہیے۔ اور میرے پاس ہی نہیں اور پھر تم ضمانت کے طور پر کیا پیش کر سکتے ہو؟" میں نے کہا کہ ضمانت تو میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ لیکن میں نے پھر ایمیلان کا ذکر کیا اور پھر التجا کی کہ مجھے روبلوں کی سخت ضرورت ہے۔ "تم بات بات میں ایمیلان کو یوں گھسیٹ رہے ہو۔ وہ کیا کرے گا۔ اس کے اپنے پاس پیسہ ہی نہیں ہے۔ کیوں دوں گا۔ میں تو بہت پہلے جانتا تھا۔" میں اپنے دل میں سب ہی کچھ کہہ گیا۔ وارنکا کاش اس وقت زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا۔ میری ٹانگیں پتھر کی مانند بھاری ہو گئیں اور میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہا ہو۔ "اچھا اب معاف کرو جاؤ" اور اگر یہ کاروباری بات چیت ہوتی تو مجھے بہت پریشانی ہوتی۔ اس نے صاف پوچھ لیا۔ "تمہیں روپیہ کس لئے چاہیئے ..." میں نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔ "نہیں۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے مجھے سخت افسوس ہے۔" میں نے بار بار التجا کی۔ وعدے کے وقت پر رقم لوٹا دوں گا بلکہ یہ بھی کہا کہ وقت سے پہلے لوٹا دوں گا۔ وہ جتنا سود لگانا چاہے مجھے منظور ہے۔ وہ جتنی رقم دے سکتا ہے اتنی ہی دے دے۔ مجھے اس وقت تمہارا خیال آ رہا تھا اور تمہارے اس آدھے روبل کا خیال آ رہا تھا جو تم نے مجھے دیا تھا۔ اس نے پھر زور دے کر کہا۔ "نہیں۔ اور تم سود کی کیا بات کر رہے ہو۔ تمہیں ضمانت کے طور پر کچھ پیش کرنا چاہیئے بلکہ میرے پاس پیسہ ہے ہی نہیں۔ مجھے خدارا افسوس ہے ..." وہ چور۔ وہ لٹیرا۔ خدا کا نام لے رہا تھا۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں گھر سے باہر کیسے نکلا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ میرے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ میں دفتر دیر سے پہنچا۔ میں نے چاہا تو تھا کہ برش سے کپڑے جھاڑوں لیکن چوکیدار نے اجازت نہ دی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں برش خراب نہ ہو جائے اور تم جانتی ہو کہ برش آخرکار دفتر کا مال تھا سو تم نے دیکھا۔ دنیا کا بس چلے تو میرے جسم سے اپنے پاؤں پونچھ دے۔ مجھے روپے کی کمی نہیں مار رہی۔ مجھے یہ سلوک مار رہا ہے۔ یہ آوازے، یہ تمسخر، یہ مذاق اور اس پر اتنی توہین۔ خدا نہ کرے کہ کبھی حضورِ انور کے کانوں تک یہ بات پہنچے۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ میرے برے دن آگئے ہیں۔ آج اور کچھ

نہیں سوجھا تو میں نے تمہارے تمام گذشتہ خطوط ایک بار پھر پڑھ ڈالے۔ اچھا خدا حافظ۔

ماکار۔

ممکن ہے میں کل تم سے ملنے چلا آؤں۔ میں نے یہ واقعات مزاحیہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ تم ہنسو لیکن یوں ہو نہ سکا۔

۱۱۔ اگست

واراوارا

لو کہانی سب ختم ہو گیا۔ میں مٹی میں مل گیا۔ اور میرے ساتھ تمہاری عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ ہم دونوں کہیں کے نہ رہے۔ دیکھتے دیکھتے سب کیا دھرا دھڑام سے نیچے آگرا۔ میری عزت میری نیک نامی خاک میں مل گئی۔ میں خود برباد ہوا اور ساتھ تمہیں بھی برباد کر بیٹھا۔ تمہاری تباہی کا میں ذمہ دار ہوں۔ دنیا والے مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ مجھے لعن طعن کر رہے ہیں اور مکان مالکن نے تو حد کر دی۔ اس نے بھرے مجمعے میں مجھے ذلیل کیا۔ اور داتازیف کے ہاں ایک دعوت ہو رہی تھی اس میں کسی شخص نے میرا ایک خط زور زور سے پڑھ کر سب کو سنایا جو میں نے تمہیں لکھا تھا۔ وہ خط میری جیب سے گر گیا تھا۔ انہوں نے خوب پھبتیاں کہیں اور جی کھول کر ہمارا مذاق اڑایا۔ انکے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ میں غصے کے عالم میں کمرے میں داخل ہو گیا اور میں نے داتازیف کو جی بھر کے برا بھلا کہا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور بولا کہ غدار اور دھوکے باز وہ نہیں میں ہوں۔ اس نے مجھے پراسرار شخص بتایا اور کہا کہ میں دوسرا نویس ہوں۔ اب سب لوگ مجھے مسٹر نویس کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بہت برا ہوا۔ وہ سب کچھ جان گئے۔ میرے تمہارے بارے میں۔ ذرا سوچو تو کہ فلاڈوفی بھی گستاخ ہو گیا ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ پنساری کی دکان پر جا کر سودا خرید لائے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور بولا۔ اسے فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا ــ "لیکن یہ کام کرنا تمہارا فرض ہے" "جی نہیں۔ بالکل نہیں ــ" وہ بولا۔ "اور وہ اس لئے نہیں ہے کہ آپ کرایہ ادا نہیں کر رہے ــ" میں ایک گنوار اور جاہل شخص سے یہ بات نہ سن سکا اور میں نے اسے بے وقوف کہہ دیا۔ جانتی ہو اس نے جواب میں کیا کہا۔ "بیوقوف آپ ہوں گے" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں ہے۔ میں نے چلا کر کہا "جاہل۔ احمق۔ نشے میں بکار رہے ہو ــ" اور اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ــ "آپ کا میں کچھ نہیں پیتا۔ بلکہ حضور کی جیب میں تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ برسوں صبح ہوش میں آنے کے لئے ذرا گھونٹ بھی چڑھا سکیں۔ کیا آپ نے اس عورت سے دس کوپک نہیں مانگے تھے۔ اور وہ بھی گڑگڑا کر" لیکن اتنا کچھ کہہ کر بھی اسے صبر نہ آیا۔ بولا کیا کہنے آپ کی شرافت کے۔ خوب شریف آدمی ہیں۔"

سن لو وارنیکا۔ اب ہماری اتنی بھی عزت نہیں رہ گئی۔ مجھے تو جیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں تو زندگی سے عاجز آگیا۔ لوگ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے میں اچھوت ہوں۔ جیسے میں خانہ بدوش ہوں۔ کیا بدبختی ہے۔ مٹی میں مل گیا۔ ایسا برباد ہوا کہ تلافی نہیں ہو سکتی۔

ایم۔ ڈی۔

۱۳۔ اگست۔

بد قسمتی پہ بد قسمتی چلی آرہی ہے میرے معزز دوست ماکار۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ تمہارا آخر کیا بنے گا؟ یا میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟ آج لوہے سے میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ لوہا آگ کی طرح جل رہا تھا۔ بس میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور مجھے جلا کر رکھ دیا۔ اب میں کیا کروں؟ میں تو کام کرنے کے قابل رہی نہیں فیدورا تین روز سے بیمار پڑی ہے۔ میں اب سخت پریشان ہوں۔ میں تمہارے لئے چاندی کے تیس کوپک بھیج رہی ہوں۔ بس ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اور نہ کر سکنے کا احساس جلانے کے لئے بہت کافی ہے۔ خدا حافظ میرے عزیز دوست اگر آج تم ملنے چلے آؤ تو مجھے بڑا سکون ملے گا۔

۱۴۔ اگست۔

ماکار۔

تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا تمہارے دل میں خدا کا خوف بالکل نہیں رہا۔ تم مجھے پاگل کر کے چھوڑو گے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اپنے آپ کو یوں تباہ کر رہے ہو۔ ذرا اپنی عزت کا خیال کرو۔ تم ایک باعزت شخص ہو۔ تم ایسی حرکت کرتے ہو؟ اگر یہ بات دفتر میں پھیل گئی تو کیا ہوگا؟ تم شرم کے مارے مر جاؤ گے۔ اپنے سفید بالوں کا لحاظ کرو۔ خدا سے خوف کھاؤ۔ فیڈورا کہتی ہے کہ اب وہ تمہاری مزید مدد کرے گی اور نہ ہی میں کروں گی۔ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے کردار سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہاری بدولت کتنا عذاب سہہ رہی ہوں۔ میں سیڑھیوں پر نہیں جا سکتی کہ جہاں سب کی نظریں مجھ پر جمی رہتی ہیں اور طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شرابی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اور جب لوگ تمہیں کندھوں پر اٹھا کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں تو لوگ مجھے سنا سنا کر کہتے ہیں "وہ دیکھو اس کلرک کو کچھ لوگ جو یہاں تک پہنچا گئے۔" مجھے اتنی شرم آتی ہے کہ چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں یہاں سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ میں نوکرانی بن جاؤں گی۔ دھوبن کا کام کروں گی لیکن میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔

میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے ملنے چلے آؤ لیکن تم نہیں آئے۔ میری التجاؤں اور میرے آنسوؤں کا تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں اس پہ حیران ہوں کہ تمہارے پاس پیسہ آیا کہاں سے؟ خدارا کچھ اپنا خیال رکھو۔ کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو۔ اور پھر کس وجہ سے؟ میں نے سنا ہے کہ تمہاری مکان مالکن نے تمہیں کمرے میں نہیں گھسنے دیا اور تمہیں رات برامدے میں گذارنی پڑی۔ توبہ توبہ۔ جانتے ہو جب مجھ تک یہ بات پہنچی تو مجھ پہ کیا بیتی ہوگی!

خدا کے لئے ہم سے ملنے کے لئے چلے آؤ۔ تمہیں یہاں خوشی ملے گی۔ ہم اکھٹے مل کر کوئی کتاب پڑھیں گے اور پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں گے۔ فیڈورا جن متبرک مقامات پر جا چکی ہے وہ ان کے بارے میں بتائے گی اور میرے عزیز دوست خدا کے لئے اپنے آپ کو یوں تباہ نہ کرو۔ میں صرف تمہارے لئے جی رہی ہوں اور زندہ ہوں۔ صرف تم ہو کہ جس کی وجہ سے میں یہاں رہ رہی ہوں۔ باعزت شخص بنو۔ مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ غریب ہونا گناہ نہیں ہے۔ اور پھر تم اتنے مایوس کس لئے ہوتے ہو۔ خدا سب کا نگہبان ہے ہماری مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن آدمی میں برداشت کا مادہ ہونا چاہیے۔ میں تمہارے لئے بیس کوپک بھیج رہی ہوں۔ اس سے تمباکو خرید لو یا اور جس چیز کی تمہیں اشد ضرورت ہو وہ خرید لو لیکن میری قسم اسے غلط کاموں میں خرچ نہ کر دینا۔ اور ہم سے ملنے ضرور آؤ۔ شاید عادت کے مطابق تمہیں ملتے ہوئے شرم آ رہی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے اس جھوٹے دکھاوے کو ختم کر دو اور سچے دل سے پچھتاوا کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی سب کام ٹھیک کر دے گا۔

و ی۔ ڈی۔

۱۹۔ اگست

میری پیاری نازو ادا

سچ مانو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ اور اتنا نادم ہوں کہ اپنا منہ ہاتھوں میں ڈھانپنے کے لئے تیار رہوں۔ لیکن تم سوچو تو آخر ایسا بھی کیا بگڑ گیا ہے۔ کیوں نہ کبھی کبھی اپنے دل کو خوش کر لیا جائے۔ میں یہ بھول جاتا ہوں کہ میرے جوتوں کے تلے بالکل بے کار ہو چکے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو تلے تو گھسنے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی بے کار چیز۔ کچھ بھی کہہ لو۔ ہیں تو جوتوں کے تلے ہی۔ اور بوٹ بھی واہیات چیز ہیں۔ اگر یونان کے فاضل مدبران کے بغیر چل سکتے تھے تو ہم ایسے لوگ ان کے لئے اتنا پریشان کیوں ہوں؟ پھر لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں اور میرا مذاق اڑائیں۔ وہ میری توہین کیوں کرتے ہیں؟ عزیز من۔ کیا تمہیں خط لکھنے کے لئے کوئی اچھا مضمون نہیں سوجھتا۔ اور میری طرف سے فیڈورا کو کہہ دو کہ وہ آفت کی پرکالہ ہے بلا کی بے درماں ہے اور پرلے درجے کی بے وقوف عورت ہے۔ رہا سوال میرے سفید بالوں کا، تو عزیز من تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ جتنا تم سمجھتی ہو میں اتنا بوڑھا بھی نہیں۔ ایمیلا آداب عرض کرتا ہے۔ تم لکھتی ہو کہ تم نے میرے بڑے دکھ برداشت کئے اور تم

روئیں — اور میں یہ کہتا ہوں میں تمہارے لئے برباد ہو گیا۔ اور رو یا میں بھی۔ اب اس کے سوا ئے میں اور کیا کہہ سکتا کہ خدا تمہیں اچھی صحت عطا کرے اور خوش رکھے۔ رہا میرا سوال تو میں تندرست ہوں۔

تمہارا دوست

ما کار

میری پیاری اور قابل قدر دوست دار وارا

میں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے کیونکہ گناہ کرنے سے پہلے بھی میں اپنے آپ کو کم گناہ گار محسوس نہ کرتا تھا۔ اور اس گناہ کے احساس کے باوجود میں پھنس گیا۔ سنو۔ میں دل کا برا یا کمینہ آدمی نہیں ہوں۔ تمہیں چوٹ پہنچانے کے لئے تو کسی جنگلی اور خونخوار چیتے کا جگر چاہیئے اور میرے سینے میں تو بھیڑ کا دل ہے اور تم جانتی ہو کہ ظلم کرنا میں نے نہیں سیکھا۔ انجام کار میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قصور صرف مجھ اکیلے کا نہیں ہے۔ میرے دل کا، میرے دماغ کا، میرے مزاج کا بھی کوئی قصور نہیں۔ قصور کس کا ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ تو ایک مبہم چیز ہے اس کا میں نام کیا لوں۔ تم نے پہلے مجھے چادر کے پیس کو بجیں بھیجے۔ بعد میں بیس اور۔ میں بیٹھا اس رقم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ تمہارا ہاتھ جل چکا ہے۔ تم کام کرنے ناقابل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ جلد ہی فاقے کرو گی لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم میرے لئے پیسے بھیج رہی ہو تاکہ میں تمباکو خرید سکوں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا کہ ایک بے آسرا بچی کی خون پسینے کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر کھا لوں؟ میرا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ بےکار شخص ہوں۔ اپنے جوتوں کے تلوں سے زیادہ بےکار۔ میری نظروں میں میری کوئی اہمیت نہ رہی بلکہ اس کے برعکس میں اپنی نظروں میں ذلیل ہوا۔ جو نہی میں اپنی نظروں سے خود گر گیا تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ میں کسی قابل نہیں ہوں۔ اور رنجوں نے مجھے میرا زوال دکھایا۔ جانتی ہو۔ بدقسمت تھی۔ میں اپنے آپ کو ذرا تازہ دم کرنے کے لئے باہر نکل گیا اور پھر بات سے بات بڑھتی گئی۔ قدرت بھی بےحد اداس تھی۔ موسم سرد تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور راستے میں ایمیلا مل گیا۔ وہ اپنا سب کچھ گروی رکھ چکا ہے۔ وارینکا اس کے پاس جو کچھ بھی تھا سب گروی ہو گا دو روز سے اس کے پیٹ میں ایک دانہ بھی نہ گیا تھا۔ میں اپنی ضروریات کے ہاتھوں اتنا تباہ نہ ہوا تھا جتنا رحم کے جذبے سے مارا گیا۔ بس یہاں سے میرا گناہ شروع ہوتا ہے۔ ہم دونوں رو رہے روتے اور ہم دونوں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ ایمیلا بہت اچھا شخص ہے۔ اس کے سینے میں انسان کا دل دھڑکتا ہے۔ نازک آدمی ہے۔

میں اپنے بارے میں بھی تو یہی کچھ محسوس کرتا ہوں — یہی وجہ ہے کہ میری یہ حالت ہو گئی ہے میں چونکہ یہ باتیں محسوس کرتا ہوں اسی لئے تو مجھ پہ یہ مصیبتیں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ پہ تمہارے کتنے احسانات ہیں۔ اور جب میں نے تمہیں جان لیا تو میں اپنے آپ کو اور اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو اور اچھی طرح جانا تو تمہیں اور زیادہ پیار کیا۔ اور اس سے پہلے میں اس بھرے جہان میں اتنا تنہا تھا کہ جیا تو کیا محض سویا رہا۔ ان دنوں لوگ کہا کرتے تھے کہ میرے تو چہرے پہ نحوست برستی ہے اور ان لوگوں نے مجھ سے اتنی نفرت کی کہ خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں جاہل ہوں اور مجھے بھی یقین آ گیا کہ میں جاہل ہوں۔ لیکن جب تم میری زندگی میں آئیں تو ایسے جان پڑا جیسے میری زندگی میں آسمان سے کوئی فرشتہ اتر آیا ہو — جیسے میری زندگی میں نور ہی نور ہو — میرے تاریک وجود کو تم نے روشن کیا۔ تم نے میرے دل، میری روح کو روشنی عطا کی۔ آخر مجھے اندر سے چین آ گیا اور میں جان گیا کہ میں باقی لوگوں سے زیادہ برا نہیں ہو سکتا ہے کہ مجھ میں شائستگی کی کمی ہو — ممکن ہے ذہانت اور خوش اسلوبی کی بھی کمی ہو — لیکن میرے دل و دماغ میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ میں انسان ہوں۔ لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب میرا وہم تھا۔ میری نظروں میں پھر میری کوئی عزت نہیں رہی اور نامرادیوں نے

ہے بالکل چکنا چور کر دیا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے تو میری ایک التجا سن لو۔ میں ان روتی ہوئی آنکھوں سے التجا کرتا ہوں کہ دوبارہ اس بات کا ذکر نہ کرنا۔ میں بہت تھک چکا ہوں — میں تھکا ہارا شخص ہوں — میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔

تمہارا سچا دوست
ماکار

۲ ستمبر

ماکار —

میں اپنا خط پورا نہ کر پائی تھی — کچھ اور لکھنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں ایسے کئی لمحات آتے ہیں جب تنہا ہو کر مجھے خوشی ہوتی ہے — میں ان لمحات میں بے اندازہ خوش اور اداس ہو جاتی ہوں اور ایسا عالم میری زندگی میں بار بار آتا ہے۔ یاد کا ایک ایسا پہلو ہے جسے کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا — اور وہ پہلو کچھ ایسا ہے جو مجھے بے ساختہ طور پہ اس دنیا سے اتنی دور لے جاتا ہے کہ آس پاس زندہ لوگوں کے لئے میں پہروں بے خبر رہتی ہوں۔ اس وقت نہ اداسی ہوتی ہے نہ خوشی — میرے احساس پہ کوئی ایسا اثر نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنے احساس پہ کسی ایسے ہی تجربے کی پرچھائیں تیرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر بچپن کے واقعات دل و دماغ میں گھوم رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ جونہی یہ عالم ختم ہوتا ہے تو میں اتنی دل شکستہ ہوتی ہوں جس کا اندازہ نہیں۔ میں کمزور ہو جاتی ہوں۔ میری یہ بے خبری مجھے بری طرح تھکا کے رکھ دیتی ہے اور میں محسوس کر سکتی ہوں کہ میری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔

لیکن آج کی صبح بہت ہی پیاری اور دل خوش کرنے والی تھی۔ خزاں کے موسم میں ایسی صبحیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور اپنے آپ کو تندرست محسوس کر رہی ہوں۔ تو — خزاں شروع ہو گئی۔ ہائے۔ دیہات میں تو میں اس موسم پہ جی جان سے قربان ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت میں بچی تھی لیکن مجھ پہ ہر چیز کا کتنا اثر ہوتا تھا۔ پہاڑیوں سے پرے ایک جھیل تھی۔ اور وہ جھیل میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ میں قریب قریب اسے اب بھی دیکھ رہی ہوں۔ جھیل بہت چوڑی تھی۔ ورصاف شفاف تھی۔ بالکل شیشے کی طرح۔ اور جب شام چپ چاپ ہوا کرتی تھی تو جھیل کا پانی ہلنے تک کا نام نہ لیتا تھا۔ اور آس پاس کے درخت بھی چپ سادھ لیتے تھے۔ کسی پتے تک کے کھڑکنے کی آواز نہ آتی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی تھی۔ اور دور دور تک گھاس کی ننھی ننھی پتیوں پر دبے پاؤں آ کر بیٹھ جاتی تھی — گھاس پھوس کے ڈھیروں سے اچانک روشنی کی کئی لکیریں ابھر آتی تھیں اور مویشی اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بس ایسے وقت میں سب کی آنکھوں سے خود کو بچا کر جھیل کے کنارے آ پہنچتی تھی۔ میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔ میں پہروں بیٹھی آگ کے شعلوں کے اس عکس کو پانی پہ ناچتے ہوئے دیکھتی رہتی جو جھیل کے کئی کناروں پہ بھڑک اٹھتے تھے۔ یہ آگ مچھیرے سلگایا کرتے تھے۔ اور اوپر ٹھنڈے نیلے آسمان کو دیکھتی رہتی جو اس رنگ میں چاند کے ابھرنے تک ہلکا ہلکا سرخ نظر آیا کرتا تھا۔ اور ہوائیں سرسراتی تھی جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کسی پرندے کے پر ہلانے کی آواز۔ جھاڑیوں کی ذرا سی سرسراہٹ یا کسی مچھلی کی ڈبکی سے ابھرنے والی آواز سناٹے کی جان ہوا کرتی تھی۔ اور پھر دھند ابھرنی شروع ہو جاتی تھی اتنی باریک اور پانی جیسی پتلی دھند اس تاریکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ دور کی تمام چیزیں دھندلی پڑتی چلی مٹ کے رہ جاتی تھیں۔ لیکن ایک ہاتھ پرے تک کی ہر چیز یوں نظر آتی تھیں جیسے کسی بت تراش نے بت تیار کر کے لٹا رکھے ہیں مثلاً کشتیاں، پانی کا کنارہ، پانی میں کہیں کہیں خشکی والی جگہ، یا بھولی بھٹکی لکڑی کا تختہ یا پیلے پھولوں والی جھاڑیاں جہاں اور جس عالم میں کوئی چیز ہوتی اسی اسی پہلو پڑی رہتی تھی۔ اچانک کوئی پرندہ اوپر سے ٹھنڈے پانی میں کسی مچھلی کے شکار کے لئے غوطہ لگاتا اور پھر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ جاتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی تھی۔ سب کچھ محسوس کرتی تھی، سب

کچھ سنسنی تھی، اور ایک عجب حیرانی میں ڈوبی رہتی تھی — اس وقت میں بچی تھی۔

ہاں مجھے خزاں سے محبت تھی۔ خاص کر موسم خزاں کے آخری دنوں سے بے پناہ محبت تھی کیونکہ اس وقت فصل کاٹی جا چکی ہوتی تھی — سب کام ختم ہو چکے ہوتے تھے اور دیہاتی لوگ ایک دوسرے کے جھونپڑوں میں اکٹھے ہو کر موسم سرما کے بارے میں بات چیت کیا کرتے اور گایا بجایا کرتے تھے۔ پھر گھرے ہوئے آسمان کے تلے ہر چیز پر اداسی چھا جاتی تھی۔ سردی سی آجاتی تھی اور ننگے جنگلات کے کناروں پر جھاڑیوں اور پھولوں کی پتیاں بکھری نظر آتی تھیں۔ اور دن بدن وہ کالی پڑتی جاتی تھیں — ان کا رنگ نیلا ہو جاتا تھا۔ خاص کر شام کو دھند چھا جانے کے بعد ننگے درخت دیوؤں کی طرح منہ پھاڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایسے بھی کئی لمحات آتے تھے جب میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھی اور پھر رات گئے گھر لوٹتی تھی — اور پھر اچانک مجھے احساس ہوتا کہ میں تو بالکل اکیلی تھی۔ بس میں ڈر کے مارے سہمے ہوئے گھر کی طرف بھاگ نکلتی تھی — میں خود بھی پتے کی طرح کانپتی اور مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ کسی بھی درخت کے کھوکھلے پن سے کوئی بھیانک چہرہ ابھر آئے گا۔ اور پھر تیز اور تند ہوا سارے جنگل میں پاگل اور وحشی کی طرح گھومتی گرجتی ماتم کرتی اور باقی کے رہے سہے پتے بھی اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیتی۔ پھر اچانک چیخیں اور پھر وہ غول در غول، بے پناہ شور مچاتے ہوئے آسمان کو تاریک کرتے ہوئے بھاگ اڑتے اور میں اکیلی وہاں رہ جاتی — ڈر کے مارے میں سہم جاتی — میں اپنے من ہی من میں ایک آواز سنتی —" بھاگو — میرے بچے — بھاگو —" یہاں تو قیامت آئی لو آئی —" بھاگو —" اور میں دم رد کے بھاگ کھڑی ہوتی — گھر پہنچ کر میں دیکھتی کہ ہر طرف خوشی ہوتی اور ایک خاص رونق ہوتا۔ ہم بچوں کو سبزی کاٹنے یا دوسرے کام پہ لگا دیا جاتا — اور ادھر گیلی لکڑی تڑاخ پڑاخ کرتی ہوئی انگیٹھی میں جلتی رہتی۔ امی جان ہم سب کو پیار بھری نظروں سے دیکھتیں۔ بوڑھی نرس الاتینا ہمیں ہولے سے زمانے کی باتیں بتاتی۔ جادوگروں اور چڑیلوں کی کہانیاں سناتی۔ ہم ڈر کے مارے ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر اچانک سب پہ سناٹا چھا جاتا۔ کیا کسی نے دروازے پر تو دستک نہیں دی۔ لیکن کہاں! یہ تو بوڑھی فرولوفنا کے چرخے کی آواز ہوا کرتی۔ پھر کتنے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ لیکن راتوں کو بھیانک اور ڈراؤنے سپنوں کے ڈر سے ہی نیند نہ آتی تھی۔ میں آدھی رات گئے جی کڑا کر کے اٹھ کے بیٹھ جاتی اور پھر پو پھٹنے تک جاگتی رہتی تاکہ کہیں کوئی ڈراؤنا سپنا نہ آجائے۔ لیکن اتنا جاگنے پر بھی جب صبح ہوئی تو میں پھول کی طرح شگفتہ اور تازہ دم ہوتی میں کھڑکیوں سے باہر جھانک کے دیکھتی کہ سردی نے کھیتوں کی ساری ہریالی ختم کر کے رکھ دی ہے اور خزاں کی دھند باقی ماندہ سبزے کو چاٹ رہی ہے۔ جھیل کی سطح پر ہلکی ہلکی برف کی تہ جم جاتی اور چاروں طرف پرندے خوشی سے چہچہاتے پھرتے۔ لیکن سورج کی گرم گرم کرنوں سے وہ برف کی پتلی سی تہ آسانی سے پگھل جاتی۔ دنیا نکھر اٹھتی۔ خوشبو سے مسرور ہو اٹھتی۔ اور ہم گوشت صاف کرنے میں لگ جاتیں اور ایک بار انگیٹھی سلگنے لگتی — ہمارا کالا کتا۔ اگرچہ ابھی تک رات سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہوتا لیکن کھڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر امید بھرے انداز میں اپنی دم ہلاتا۔ اچانک کسی کسان کے ٹھیلے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ کوئی کسان ایندھن اکٹھا کرنے کے لئے جنگل کی طرف جا رہا ہوتا۔ کیا دن تھے وہ کہ ہم سب خوش تھے اور چین سے رہتے تھے۔

یہ یادیں مجھے رلا دیتی ہیں — ماضی کتنا روشن اور اچھا نظر آنے لگتا ہے اور اس کے مقابلے میں حال — تھکا دینے والا اور مایوس کن — اور وہ خدا — جانے یہ پاپ کٹے گا — سنو۔ کیا تم اس بات سے واقف ہو کہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں اس خزاں میں مر جاؤں گی — مجھے پورا پورا یقین ہے — دیکھو تو میں کتنی بیمار ہوں — میں کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں — میں یہاں نہیں مرنا چاہتی — میں اس مٹی میں دفن نہیں ہونا چاہتی — ممکن ہے پچھلی بہار کی طرح میں دوبارہ بستر پہ پڑ جاؤں — تم جانتے

ہوکہ میں پورے طور پہ تو اچھی ہوئی ہی نہ تھی۔ اب بھی میں اپنے آپ کو بہت بیمار محسوس کرتی ہوں۔ فیڈررا آج سارا دن بارش ہی ہے۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ ہاں ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب مجھے تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے اور ہر وقت جی میں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی شخص میرے کمرے میں ہے۔ کوئی مجھ سے بات کر رہا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت بہت شدید ہوتی ہے جب میری بے خبری کے دورے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اتنا لمبا خط لکھا ہے۔ جب میں لکھتی ہوں تو ڈر نہیں لگتا۔ اچھا خدا حافظ۔ اب تو مجھے خط ختم ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کاغذ بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ ہیٹ اور لباس تیار کرنے کے معاوضے میں جو رقم ملی تھی اس میں صرف ایک روبل اور دو کوپک چاندی کے باقی بچے ہیں مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے اپنی مکان مالکن کو چاندی کے دو روبل دے دیئے۔ اب کچھ دنوں کے لئے اُس کا منہ بند رہے گا۔

اپنے کپڑوں کو ترتیب با دے کر رکھو۔ اچھا دوست خدا حافظ میں اتنی کمزور ہوں کہ بہت جلد تھک جاتی ہوں۔ ذرا سی کوشش کرنے پر تھک جاتی ہوں۔ ہانپنے لگتی ہوں۔ میں کام کرنے کے قابل تو رہی نہیں ہوں اگر مل بھی گیا تو کروں گی کیسے؟ بس یہ خیال ہی تمام اُمیدوں کا خاتمہ کرنے کے لئے بہت ہے۔

دی۔ ڈی

۵ ستمبر

پیاری دارنیکا

آج مجھے کئی باتوں کا تجربہ ہوا۔ پہلے پہل تو شدید سر درد رہا۔ سر درد کا علاج کرنے کے لئے میں نے سیر کرنے کا فیصلہ کیا اور فونٹانکا کے کنارے دور تک سیر کی۔ شام بھیگی بھیگی تھی اور اندھیرا چھا چکا تھا۔ ان دنوں پانچ بجے کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن بارش نہ ہوئی تھی۔ لیکن دھند بارش سے زیادہ بُری تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لوگ بھاگم بھاگ کناروں پر چلے جا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب خوف و ہراس طاری تھا۔ کچھ کسان شراب کے نشے میں دُھت اِدھر اُدھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ ان کنانیں جھکی ہوئی تھیں اور سر گنجے تھے۔ لمبے لمبے جوتوں میں فن لینڈ کی عورتیں سیر کر رہی تھیں کاریگر لوگ مزدور کلرک اور ہر طبقے کے لوگ وہاں موجود تھے۔ غالباً ہر طبقے کے لوگوں کے اجتماع کا یہی وقت ہوتا ہوگا اور یہ نہر بھی تو دیکھنے کے قابل تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنی کشتیاں وہاں سما کیسے گئیں۔ پل پہ عورتیں سیلے ہوئے بیٹھے کیک بیچ رہی تھیں اور گلی سڑی سبزیاں اور پھل فروخت کر رہی تھیں۔ فونٹانکا سیر کے لئے قطعاً اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر تو جی اور اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف دھند اور آسمان پر گہر چھائی ہوئی تھی۔ تو کتنی اُداس شام تھی وہ۔

جب میں گروکوایا تک پہنچا تو بہت اندھیرا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے گیس کے لیمپ جلانے شروع کر دیئے تھے۔ میں اس گلی میں نہ تو اں مدت آیا تھا مجھے یہ گلی بہت اچھی لگی۔ اس میں زندگی کے آثار تھے۔

خوبصورت دکانیں تھیں۔ بڑی چھوٹی سبھی دکانیں سجی ہوئی تھیں اور قیمتی اشیا سے چمک دمک رہی تھیں۔ اس سے تم یہ اندازہ بھی لگا سکتی ہو کہ یہ سب اہتمام خوبصورتی کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ہمارے ماحول میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اتنی خوبصورت اور قیمتی چیزیں اپنی بیویوں کے لئے واقعی خرید لیتے ہیں۔ اس بازار میں دولت کا کوئی حساب نہیں۔ مالدار جگہ ہے۔ اسی گلی میں کئی جرمن باورچی بھی رہتے ہیں مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ لوگ بھی ضرور امیر ہوں گے بے شمار گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ گلی کا پتھر ان سب کا بوجھ کیسے برداشت کر لیتا ہے۔ اور پھر کس قدر شاندار رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی گاڑیاں ہیں۔ بگھیوں میں کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے اور گاڑیوں کے ہمراہ چلنے والے پیادوں کے ہاتھ میں نیزے یا تلواریں تھیں۔ جب یہ گاڑیاں میرے قریب سے گذرتی تھیں تو میں دل ہی دل میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ شہزادیاں ہیں یا شاہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے ڈانس اور شام کی دعوتوں پہ جانے کا یہی وقت ہوگا۔ جبھی تو اتنی سج دھج کر یہ عورتیں بگھیوں میں سوار ہو کر جا رہی تھیں۔ ایک بات ہے کہ کسی بھی رئیس خاتون یا شہزادی کو قریب سے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے آج سے پہلے میں نے کبھی کسی شہزادی یا امیر عورت کو قریب سے نہیں دیکھا تھا مجھے اس وقت تمہارا خیال آگیا اور میرا دل رواں رواں رو اُٹھا۔ دارنیکا۔

تم اس قدر دُکھی کیوں ہو؟ تم کس لحاظ سے باقی دُنیا سے بُری ہو؟ تم اتنی رحمدل ہو۔ اتنی اچھی ہو۔ خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو ؟ تو پھر تم یہ بُرے دن کیوں دیکھ رہی ہو۔ قدرت کا یہ اصول میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک اچھا انسان اس طرح سِسک سِسک کر جینے پر کیوں مجبور ہو؟ اور کیا بات ہے کہ دوسرے لوگوں کو بِن مانگے خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے کیونکہ اس سے آزاد خیالی میں خلل پڑتا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کوئی پیدا ہونے سے پہلے ہی قسمت کا دھنی ہوتا ہے اور کوئی اس لئے رگڑ رگڑ کے مرتا ہے کیونکہ وہ بے آسرا پیدا ہوا ہے۔ بھوت پریت کی کہانیوں میں تو ایسا اکثر ہوا ہے کہ بے وقوفوں کو انتہائی خوشی نصیب ہو جاتی لیکن حقیقی زندگی میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس طرح سوچنا گناہ ہوسکتا ہے لیکن ایسے کئی گناہ وجود رکھتے ہیں جو اس سے پہلے کہ ہمیں علم ہو ہمارے دل میں گھر کر چکے ہوتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم بھی ان گھٹیوں میں ہوا کے دوش پر کیوں نہیں اُڑتی پھرتیں۔ جرنیلوں کے ہمراہ کیوں نہیں ہنس ہنس کے باتیں کرسکتیں۔ میرا مطلب ایسے جرنیل سے نہیں ہے جو سلام کا بھی بھوکا ہو تم ان چیتھڑوں کی بجائے سونے چاندی کے گہنوں میں لدی ہوئی نظر آؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو کیا اتنی کمزور اور بیمار رہ سکتی ہو جتنی اب ہو۔ تمہارے نزدیک بیماری بھٹک تک نہیں سکتی۔ تم بھی اپنے محل کی چمکتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو کر اپنا سایہ دیکھا کرو اور خوشی سے پھولی نہ سماؤ کہ تم کتنی حسین اور سعادت مند ہو۔ لیکن افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا اصلی رُوپ کتنا مختلف ہے۔ بُرے لوگوں نے تمہیں رنج والم کا شکار بنا کے رکھ دیا ہے۔ اور زخم پر نمک گرانے کا کام اس بدمعاش نے کردیا۔ کیا فقط اس لئے کہ اُس کے بدن پر اچھے اچھے کپڑے ہیں اور وہ سونے کے بل پر اینٹھتا پھرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ جیسے چاہے تمہارے ساتھ ویسا سلوک کرسکتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ باقی لوگوں کو اُس کی بیہودگی برداشت کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا واقعی کرنی چاہیئے؟ آخر کیوں؟ کیونکہ تم ایک غریب اور بے آسرا لڑکی ہو اور تمہارا ایسا کوئی طاقتور دوست نہیں ہے جو تمہاری حفاظت کرسکے؟ میں پوچھتا ہوں وہ کوئی انسان ہے جو ایک معصوم لڑکی کی آبرو کا دشمن ہو جائے۔ وہ اور کچھ ہوسکتا ہے انسان نہیں۔ وہ شیطان کے بھیس میں انسان بنا پھرتا ہے۔ اُس سے اچھا تو وہ مستری ہے جو مجھ سے گرد کھو فایا گیں ہوا تھا۔ اگر وہ ایک آنہ اور کمانے کے لئے سارا دن گلی میں مارا مارا پھرتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے اس کی انسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے۔ وہ کسی کا غلام نہیں۔ اپنے من کا مالک ہے محنت کرکے روٹی کھاتا ہے۔ بھکاری نہیں ہے بلکہ لوگوں کے چاقو اور اُسترے ٹھیک اور تیز کرتا ہے۔ خون پسینے کی کمائی کھاتا ہے۔ جیسے کہتا ہو ـــــ مزے اُڑاؤ ـــــ آخر میں اور کس کام کا ہوں؟ شاید وہ بھی بھکاری ہے۔ شاید حقیقی معنوں میں بھکاری ہے لیکن ایک باعزت بھکاری ہے۔ بھوکا ہو تھکا ہارا ہو لیکن وہ اپنی دھن میں لگا رہتا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ سچ مانو۔ ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں اور بمشکل دو وقت کی روٹی کما سکتے ہیں لیکن یہ لوگ نہ کسی کے سامنے جھکتے ہیں نہ ہاتھ پسارتے ہیں۔ میں بھی اُس مستری کی طرح ہوں۔ اُس مستری کی طرح ہو بہو تو نہیں لیکن پھر شائستگی اور عزت کے لحاظ سے اُس کی طرح ہوں۔ جتنی محنت مجھ سے بن پڑتی ہے میں کر دیتا ہوں۔ بتاؤ اور کیا کروں؟

آج مجھے اس مستری کا خیال یوں آرہا ہے کہ آج مجھے اپنی غربت کا شدید احساس ہورہا ہے۔ میں اسے اوزار تیز کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے ذرا سا رُک گیا۔ اور میں اپنے دل سے کچھ مایوس کن خیالات کو جھٹکنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ شاید طبیعت کسی اور طرف مائل ہو۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ یہ مستری کسی مکان کی کھڑکی کے نیچے اپنا سامان رکھ کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر میری نظر ایک دس برس کے بچے پر جا پڑی۔ اگر یہ بچہ پیلا زرد اور کمزور نہ ہوتا تو اچھا حسین لڑکا ہوتا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور محض ایک قمیض پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک جگہ کھڑا منہ کھولے کچھ دیکھ رہا تھا۔ لڑکے آخر لڑکے ہوتے ہیں۔ سامنے ایک جگہ تیلی کا ناچ ہو رہا تھا وہ کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا اُس کے گھٹنے آپس میں بج رہے

تھے لیکن وہ وہاں کھڑا اپنی قمیض کا ایک کونہ منہ میں چبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا کاغذ بھی تھا کہیں سے کچھ لوگوں نے اس ڈبے میں کچھ پیسے ڈال دیئے جس پہ وہ تتلیاں ناچ رہی تھیں۔ پیسوں کی کھنک سے لڑکا چونکا اور اس نے سہمی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ پیسے شاید میں نے ڈالے ہیں کیونکہ وہ لپک کر میری طرف آیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے وہ کاغذ مجھے تھما دیا اور رُندھی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ اسے پڑھوں۔ میں نے وہ کاغذ کھولا۔ اس میں وہی کچھ لکھا ہوا تھا جو ہر چہرے سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسی کئی تحریریں میں کئی بار پڑھ چکا ہوں کہ ماں بخار سے مر رہی ہے

اور ننھے ننھے بھائی بھوکوں مر رہے ہیں۔ اے مہربان لوگو! خدا کے نام پر کچھ مدد کر دو۔ اسے سمجھنے میں زیادہ مشکل نہ پیش آئی لیکن اسے دینے کے لئے میرے پاس تھا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں لیکن مجھے کتنا دکھ ہوا۔ یہ معصوم عمر۔ یہ سردی اور اتنا کمزور بازو اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ بھوکا بھی تھا۔ وہ میرے سامنے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ نہیں میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسی مائیں زندہ ہیں جو اپنے معصوم بچوں کو اس موسم میں ادھ ننگا کر کے بھیج دیتی ہیں۔ شاید وہ حوصلہ ہار بیٹھی ہو اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو اور بچاری ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ یہ بھی سچ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی بیمار ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے مناسب افسروں کے پاس درخواست کرنی چاہیئے۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ان بچوں کو بھیج کر لوگوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ اُبھار کر پیسے وصول کرنا چاہتی ہو۔ بچے کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتی ہو اور خود بیٹھی کھلی ہو! لیکن کاغذ کے اس ٹکڑے سے اسے کتنے روپے مل جائیں گے؟ وہ بھاگ بھاگ کے لوگوں سے التجا کرتا ہے گڑگڑاتا ہے لیکن اس کی بات سننے کی لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہے۔ لوگوں کے دل پتھر کے ہو گئے ہیں ان کی زبان خنجر۔" بھاگ —— بدمعاش کہیں کا ——" لڑکے کا چہرہ مرجھا جاتا تھا اور وہ ٹھٹھرتا ہوا

کسی اور کی طرف لپکتا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سُن تھے اور اس دم توڑ دینے والی ٹھنڈی ہوا میں اس کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جان سکے وہ کھانسنے لگے گا اور اس کے اس ننھے سینے میں تپ دق سانپ ناگ کی طرح کنڈلی مار کے دھرنا دے بیٹھے گا۔ پھر کیا ہے۔ پھر موت اس کے سرہانے آ کھڑی ہو گی کسی غلیظ اور تاریک کونے میں اس کی منتظر رہے گی۔ اس کی پرواہ کرنے والا کون ہے۔ اس کی مدد کرنے والا کون ہے؟ اور اس کی مختصر سی زندگی ختم ہو جائے گی۔ دارنیکا کی زندگیوں کی بس اتنی سی ہی داستان ہے۔ کسی کے منہ سے یہ الفاظ سُن لینا آسان نہیں ہے کہ "عیسیٰ مسیح کے نام پر میری مدد کر دو"

اور پھر یہ کہہ کر گزر جانا تو بہت ہی مشکل ہے کہ —" خدا تمہاری مدد کرے گا ——" میں مانتا ہوں کہ ایسے بھی کئی واقعات ہو گزرتے ہیں عیسیٰ مسیح کا نام بھی دل پہ خاص اثر نہیں کرتا کیونکہ کچھ بھکاری یہ فقرہ کہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کی آواز دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کو کچھ نہ دینا کوئی بُری بات نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ مصیبتوں کے پالے ہوئے ہوتے ہیں۔ عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح جی ہی لیں گے۔ لیکن جب آج اس بچے نے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا —" عیسیٰ مسیح کے نام پہ ایک پیسہ دے دو صاحب ——" تو میرے دل پہ برچھیاں چل گئیں۔ اس کی آواز اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں کیا دے سکتا تھا اسے! میرے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ لیکن میں سوچ نہیں سکتا کہ جب ایک غریب آدمی اپنی بدقسمتی کے ہاتھوں دکھی ہو کے بھیک مانگتا ہے تو امیر لوگ اسے بلائے جان کیوں کہتے ہیں۔ اسے دھتکار کیوں دیتے ہیں؟ کیا غریبوں کی ماتمی آواز سے ان کی راتوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ واقعہ اس قدر تفصیل میں اس لئے لکھا ہے کہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا اور اپنی طرزِ تحریر کا نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے تم دیکھ رہی ہو کہ گزشتہ کچھ عرصے سے میری طرزِ تحریر سنور رہی ہے۔ اب تو میں اتنا

بے دل ہو چکا ہوں کہ میں اپنے آپ کو تسلی دیتا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس تسلی کا فائدہ کچھ بھی نہیں ہوگا تاہم کبھی کبھی اپنے آپ کو تسلی دینا اپنے آپ سے انصاف کرنے کے مترادف ہے۔ اور خاص کر اُس شخص کے لئے تو بہت ضروری ہے جو جگہ جگہ ذلیل ہوتا ہو اور اپنا وقار کھو بیٹھا ہو۔ موازنے کے طور پہ کہہ رہا ہوں کہ میں اُسی طرح پس چکا ہوں جس طرح وہ لڑکا دار نیکا۔ کبھی کبھی جب میں دفتر جلدی چلا جاتا ہوں تو مجھے ایک نظر شہر کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مکانوں کی چمنیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں اور ایسے بے شمار نظارے مجھے اپنے چھوٹے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن آؤ ذرا زندگی کو اور قریب سے دیکھیں۔ ذرا دھیان سے سوچو کہ ان بڑے بڑے مکانوں کے اندر کیا ہوتا ہے، یہ دیکھو اور پھر سوچو کیا فقط اپنی غربت کی بنا پر اپنی نظروں میں گر جانا ٹھیک ہے؟ میرا مطلب کسی شخص سے نہیں ہے۔ ویسے ہی بات کر رہا ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ان عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم چاہے یہ سمجھو کہ میں جھک مار رہا ہوں یا میں نے یہ سب کچھ کسی کتاب سے نقل کیا ہے یا میرا مزاج برہم ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب گھر آیا تو بہت اُداس تھا۔ میں نے انگیٹھی پر کیتلی رکھ دی تاکہ ایک پیالہ چائے پی سکوں ـــــ اُس وقت میرا پڑوسی گروشکوف میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے صبح بھی محسوس کیا تھا کہ وہ باقی لوگوں سے نظر بچا کر مجھے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ گروشکوف کے بارے میں تمھیں اتنا ضرور بتا دوں کہ اُس کی زندگی مجھ سے بھی بدتر گزر رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ اُس کی بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ اگر میں گروشکوف ہوتا تو نہ جانے کیا کر گزرتا۔ گروشکوف کمرے میں آیا۔ ذرا سا جھکا اور پھر چپ چاپ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے اُسے کرسی پیش کی۔ بس میرے پاس یہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی ہے۔ پھر میں نے اُسے چائے پیش کی۔ وہ بہت دیر بیٹھا معافی ہی مانگتا رہا اور چائے پینے سے انکار کرتا رہا لیکن آخر اُس نے چائے کا پیالہ قبول کر ہی لیا لیکن اُس نے چینی لینے سے انکار کر دیا بلکہ بہت عاجزی سے کہتا رہا نہیں چینی نہیں ـــ بہت بہت شکریہ ـــ جب میں نے بہت زور ڈالا تو اس نے چمچی بھر چینی لے لی اور مجھے بار بار کہتا جاتا تھا کہ چائے بہت ہی اچھی اور میٹھی ہے۔ افسوس انسان کو کتنا عاجز بنا دیتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

"کہو زندگی کیسی گزر رہی ہے ـــ" اور اب اُس نے کہنا شروع کیا ـــ" ماکار ـــ تم خدا کے نام پر کچھ مدد نہیں کر سکتے ـــ ایک بدقسمت کنبے کی ذرا سی امداد کر دو۔ شاید تمھیں علم ہو کہ پچھلے دو روز سے میری بیوی اور میرے بچوں نے کچھ نہیں کھایا ـــ کچھ کھانے کے لئے ہے ہی نہیں ـــ میں باپ ہوں اور بے بسی سے اُن کا منہ تکتا رہتا ہوں۔"

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اُس نے روک دیا اور بولا ـــ میں یہاں کے ہر کرایہ دار سے ڈرتا ہوں ـــ اتنا ڈرتا نہیں جتنا شرم کے مارے اُنھیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ وہ لوگ ہم سے کتنے مختلف ہیں۔ کتنے علیحدہ ہیں۔ میرے دوست میں تمھیں کوئی تکلیف نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہو۔ تم میری مدد نہیں کر سکتے لیکن خدا کے لئے کچھ اُدھار دے دو۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ تمہارے پاس آنے کی مجھے ہمت کیسے ہوئی لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں بہت ہی نازک دل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی میری طرح ضرورت مند ہو اور جانتا ہوں کہ میری مصیبت کا حال سُن کر تم مجھ سے زیادہ دُکھی ہو گے۔ اور وہ دخل اندازی کے لئے پھر معافی مانگنے لگا۔

اُس کی مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھر گڑگڑایا ـــ "میرے دوست ماکار۔ کچھ رحم کرو۔ میں زیادہ نہیں مانگ رہا لیکن ذرا میری حالت پر غور کرو (اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا) میری بیوی اور میرے بچے ـــ تم جانتے ہو ـــ وہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ تم کیا دس کوپک بھی نہیں دے سکتے؟" یہ فقرہ سُن کر شرم سے میری گردن جھک گئی۔ اُس کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ میرے پاس کُل سرمایہ بیس کوپک تھے۔ اور مجھے کچھ بہت ضروری چیزیں خریدنا تھیں۔

"نہیں — مجھے معاف کرو — میرے پاس کچھ بھی نہیں —"
"لیکن بابا — جو کچھ بھی کہو — جو جی میں آئے کرو۔
اور ارکر مجھے دس کو پیسے دے دو —"
مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنے جیب کو پیسے نکالے
اسے دے دیئے۔ اور جیب کو پیسے بھی جانتی ہو خیرات
دیئے گئے۔ کیا خوبی ہے۔ ہم نے بات چیت شروع کر دی
آخر میں پوچھ ہی بیٹھا کہ جب اس کی یہ حالت ہے تو اس
پانچ روبل پہ کمرہ کیسے کرائے پہ لے رکھا ہے۔ وہ
کہ آتے آتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور تین مہینوں
کا کرایہ اس نے پیشگی ادا کر دیا تھا۔ لیکن اب اس صورت
حالات کے پیش نظر اسے کچھ پتا نہیں کیا کرے۔ اسے امید تھی
اتنے لمبے عرصے میں اس کے مقدمے کا کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔
اس نے ایک سوداگر پہ مقدمہ چلا رکھا ہے کہ خزانے میں اس
نے گڑبڑ کی تھی۔ جب مقدمے کی پیروی کی گئی تو بیچارہ گروشکوف
بھی لپیٹ میں آگیا۔ گروشکوف کا صرف اتنا قصور ہے کہ حساب
میں غلطی اس کی نظروں سے بچ گئی لہذا اس پر یہ الزام عائد ہوتا
ہے کہ اس نے ملک کے مفاد کو دھکا پہنچایا ہے۔ یہ مقدمہ کئی
برسوں سے چل رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا
اور بیچارے گروشکوف کو آئے دن نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا
ہے۔ گروشکوف کہتا ہے — "میں بالکل بے گناہ اور معصوم
ہوں — میری جس قدر توہین ہوئی ہے۔ مجھ پہ جعل سازی
کا جو الزام لگا ہے سب غلط ہے میں بالکل معصوم ہوں —"
لیکن اس مقدمے سے اس کا اعتبار تو اٹھ گیا۔ اسے نوکری
سے برخاست کر دیا گیا۔ اور اگرچہ اس کے خلاف کوئی الزام
ثابت نہ ہو سکا تاہم بات صاف نہ ہوئی۔ اگر وہ باعزت
طور پہ الزام سے بری کر دیا جاتا ہے تو اس سوداگر کو اسے خاصی
رقم ادا کرنی پڑتی۔ مجھے تو گروشکوف کی بات پہ اعتبار ہے
لیکن کچہری کے ججوں کو نہیں ہے۔ یہ اتنا الجھا ہوا مقدمہ ہے۔
اس قدر پیچیدہ مقدمہ ہے کہ اس کے فیصلے کے لئے سو سال
درکار ہیں۔ وکیل اور جج مر مر کے ایک گتھی سلجھاتے ہیں تو وہ
کمبخت سوداگر ایک اور پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے گروشکوف
سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ اس بیچارے کو کوئی کام نہیں
ملتا۔ اس کا اعتبار لوگوں کی نظروں سے اس طرح اٹھ گیا ہے
کہ کوئی اسے ملازمت نہیں دیتا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ تو
بیچ کے کھا چکا۔ مقدمہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا اور اسی
مقدمے کے دوران میں اس کے گھر ایک لڑکا بھی پیدا ہوا کتنے
غلط وقت پہ پیدا ہوا۔ کیونکہ اس پہ پیسہ خرچ آتا ہے۔ جب بچہ بیمار
پڑ گیا تو پھر پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ اور جب وہ مر گیا اور پیسہ خرچ
ہو گیا۔ اس کی بیوی بیمار ہے — اور اسے بھی ایک پرانا روگ
لگ ہوا ہے۔ بہت دکھ اٹھایا ہے اس نے۔ لیکن اسے امید
ہے کہ کچھ ہی دنوں میں کوئی موافق فیصلہ ہو جائے گا وہ کہتا
ہے کہ اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔ وارنیکا مجھے اس
کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے۔ مجھ سے جتنا بن پڑا میں نے
اسے تسلی دی۔ اس کا بھی کوئی نہیں۔ اسے حوصلہ دینے والا
کوئی نہیں۔ اچھا — خدا حافظ — خدا تمہیں تندرست رکھے۔
تمہارا خیال ہی دکھی روح کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اور تمہارے
لئے دکھ اٹھانے میں ایک خاص چین ہے۔

تمہارا سچا دوست — ماکار۔

۹ ستمبر۔

وارووارا۔

مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا۔ غضب ہو گیا ہے۔ میرا سر
چکر رہا ہے اور مجھے ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ تم
سوچ تک نہیں سکتیں کہ میں کیا بتانے والا ہوں۔ ہمیں ایسی بات
کی امید تک نہ تھی۔ لیکن ہاں۔ مجھے کچھ ہلکا سا علم تھا۔ میرا
دل کہتا ہے یہ ہو جائے گا۔ کچھ اسی نوعیت کا خواب بھی میں نے
پچھلی رات دیکھا تھا۔

ہاں تو قصہ یوں ہے — لیکن ایک بات ہے کہ میں اپنی
تحریر کی نوک پلک سنوارے بغیر سب کچھ لکھوں گا۔ جیسے میرے
من میں خیال آتے جائیں گے لکھتا جاؤں گا۔ آج صبح میں حسب
معمول اپنے دفتر پہنچا اور جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر کام میں محو ہو گیا۔
ہاں میں کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ کل
جب آیو نووچ نے آکر کہا تھا کہ اس کاغذ کی دوسری نقل فوراً

تیار کر دو تو میں یہی کام کر رہا تھا۔ آئیونو وچ نے کہا تھا ۔۔ "اسے خوشخط بنا کر اور صاف لفظوں میں لکھنا لیکن جتنی جلدی ہو سکے اتنی جلد نقل تیار کر دو۔ حضورِ انور اس کاغذ پر آج ہی دستخط کریں گے۔" اور اب تم سے کیا چھپانا ہے کل میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میں بہت اداس تھا اور شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا اور پھر میں تمہارے بارے میں بہت فکرمند ہو رہا تھا۔ اب اسے شیطان کی کرتوت سمجھو یا یہ سمجھو کہ قسمت میں ہی ایسا لکھا تھا بات یوں ہوئی کہ نقل اتارتے وقت میں ایک سطر بالکل چھوڑ گیا۔ اور اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس سطر سے اس مضمون کا سارا مطلب کیسے ختم ہو گیا۔ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ اس میں کوئی مطلب تھا یا نہیں بہرحال دفتر والے کل تو حضورِ انور سے دستخط نہ کرا سکے انھوں نے آج اس پر دستخط کئے۔ میں جب دفتر آیا تو مجھے ایسی کسی بات کا سان گمان نہ تھا اور میں بڑی تسکین سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں تو فطرتاً ہی شرمیلا ہوں لہذا آج بھی میں بے وجہ جھینپ رہا تھا اور کسی کی نظروں سے نظریں نہ ملا رہا تھا۔ وہ ظالم آئیونو وچ بولا ۔۔ "ماکار تم ۔۔۔ کی طرح کیوں بیٹھے جھینپ رہے ہو ۔۔" اور اس نے یہ فقرہ کہہ کر اس طرح منہ بنایا کہ سارا دفتر ٹھٹھا کے ہنس پڑا۔ لوگوں کی ہنسی تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح بیٹھ گیا گویا میں نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میں اسی طرح لوگوں سے اپنا پیچھا چھڑاتا ہوں اچانک سامنے کے کمرے سے کچھ حرکت ہوئی اور پھر میرا نام لے کر پکارا گیا مجھے یقین نہ آیا لیکن نہیں میرا ہی نام پکارا جا رہا تھا ۔۔ دیوشکن ۔۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی مجھے نہ جانے کیا ہو گیا لیکن میں کسی انجانے خوف کے تحت سمٹ کے گھڑونچی سا بن گیا۔ میں کرسی کے ساتھ چپک گیا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ آخر بلانے والا میرے قریب آپہنچا۔

"دیوشکن ۔۔ کون ہے دیوشکن ۔۔"

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ۔۔

"ماکار ۔۔ تمھیں حضورِ انور نے طلب کیا ہے۔ تم نے وہ دستاویز بالکل خراب کر کے رکھ دی ہے۔"

اس نے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔ لیکن اتنا ہی بہت تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کرسی سے کیسے اٹھا اور کیسے چل سکا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دماغ میں کیا خیالات چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں نے ایک کمرہ پار کیا پھر دوسرا۔ پھر ایک اور ۔۔ اور آخرکار حضورِ انور کا کمرہ آہی گیا۔ میں وہاں مجرموں کی طرح کھڑا تھا اور سامنے حضورِ انور اور باقی افسران حضرات بیٹھے تھے۔ مجھے پورا اندیشہ ہے کہ میری جو کیفیت تھی میں حضورِ انور کے سامنے جھکنا بھی بھول گیا۔ میرے ہونٹ کے کونے پھڑک رہے تھے اور میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ کمرے کے ایک طرف شیشہ لٹک رہا تھا۔ میں نے اس میں ایک نظر اپنے آپ کو دیکھا ۔۔ توبہ ۔۔ کیا حلیہ تھا ۔۔ کیا چہرہ کیا کپڑے سب پہ لعنت برس رہی تھی۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ آج تک میں نے دفتر میں ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے کوئی میرا واقف بن سکے۔ حضورِ انور کو کیا علم کہ میں دفتر میں ہوں بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے میرا نام ضرور سنا ہو لیکن انھوں نے مجھے جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔۔ وہ غصّے کے عالم میں بولے ۔۔

"آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ تم احتیاط سے کام کیوں نہیں کرتے؟ یہ کاغذ اتنا ضروری تھا اور تم نے اس کا ناس پیٹ دیا۔"

یہ کہنے کے بعد ہز ایکسیلینسی آئیونو وچ سے مخاطب ہوئے۔ میں یہی کچھ الفاظ سمجھ پایا ۔۔ "ایسی غفلت ۔۔ اتنی لاپروائی ۔۔ کام بڑھا ۔ وقت ضائع ہوا ۔۔"

میں نے معافی مانگنے کے لئے کئی بار منہ کھولا لیکن منہ سے کوئی آواز نہ نکلی ۔۔ میرا بس چلتا تو وہاں سے بھاگ نکلتا لیکن پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ اور پھر مجھ سے وہاں کھڑے کھڑے وہ حرکت سرزد ہو گئی کہ ۔۔ لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے میرے کوٹ پہ ایک ہی بٹن تھا اور وہ بھی کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا ۔۔ وہ اچانک ٹوٹ کے گر گیا ۔ اور ۔۔ ٹن ٹن کرتا ہوا سیدھا حضورِ انور کے قدموں کے پاس جا کر رکا۔ بٹن ٹوٹنے سے پہلے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ اس سناٹے میں یہ بٹن ٹوٹ گیا۔ یعنی معافی مانگنے کی جگہ یہ حرکت ہو گئی۔ حضورِ انور نے آنکھ اٹھا کر

مجھے دیکھا میری صورت اور میرے لباس کا جائزہ لیا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے شیشے میں اپنے آپ کو کیسا پایا تھا۔ میں بٹن ریشانے کھلے تھا۔ ایک بار بٹن کو تھام بھی لیا لیکن وہ ہاتھ سے پھر پھسل گیا ___ دیکھ رہی ہو۔ میں نے کس قدر شرمندگی کا سامنا کیا؟ آخر کار میں نے بٹن اٹھا ہی لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں سیدھا کھڑا ہوتا اور میرے ہاتھ نیچے ہوتے۔ لیکن کہاں مجھے بٹن سنبھالنا تھا کہ پھر کوٹ کو کھلنے سے روکنا تھا۔ اور نہ جانے کیوں میرے چہرے پہ کھسیانی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ہاں۔ میں مسکرا رہا تھا۔ برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ حضورِ انور نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا لیں ___ ایک نظر پھر مجھے دیکھا اور آئیو لوویچ سے مخاطب ہوئے۔

"یہ کیا بات ہے ___ ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو ___"

میرے اللہ کیا عزت پائی میں نے ___ "ایک نظر اس آدمی کو دیکھو تو ___" آئیولوویچ بولا ___ "بہت پرانا ملازم ہے سرکار ___ لیکن اس کے خلاف ابھی تک ایک بھی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ چال چلن ___ قابلِ تعریف ہے ___ اور تنخواہ کا حساب بھی پائی پائی تک درست ہے ___"

حضورِ انور نے فرمایا۔ "تو پھر اس کی مدد کی جائے۔ اسے پیشگی کچھ دے دیا جائے۔"

"حضور۔ حساب کے مطابق جتنی پیشگی رقم یہ لے سکتا تھا لے چکا ہے ___ حالات نے اسے پیشگی رقم لینے پر مجبور کر دیا۔ بہت اچھے کردار کا مالک ہے ___ اس کے خلاف ایک بھی شکایت نہیں ہے ایک بھی نہیں ___ کسی کو اس کے خلاف کچھ بھی کہنا ___"

میرا حال یہ تھا جیسے میں جہنم کی آگ میں جل رہا ہوں۔

حضورِ انور مجھے سنانے کی غرض سے بولے ___ "تو ٹھیک ہے ___ خیر ___ جتنی جلدی ہو سکے اس دستاویز کی دوسری نقل تیار کی جائے ___ اور دیوشکن ___ ادھر آؤ۔ اب کے بار بغیر غلطی کئے اس کی دوسری نقل فوراً تیار کر دو اور سنو ___" یہ کہہ کر حضورِ انور نے سب لوگوں کو باہر بھیج دیا۔

اور صرف ہم دونوں وہاں رہ گئے۔ انھوں نے جلدی سے اپنی میز کا ایک خانہ کھولا۔ سو روبل کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا ___ "یہ لو ___ اسے قرض سمجھ کر لے لو۔ میں تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کروں گا ___"

مجھے کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے ___ میں نے ہوش میں ہوتا تو اُن کے ہاتھ چوم لیتا ___ اچانک اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور پھر۔ اور پھر ___ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھ رہا وارنیکا ___ پھر انھوں نے مجھ نا چیز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زور سے ہاتھ ملایا جیسے میں اُن کے برابر کا آدمی ہوں اور کہنے لگے ___ "اچھا ___ اب تم جاؤ ___ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمہاری اور زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن اب دوبارہ غلطی نہ کرنا جو کچھ ہو گیا۔ اس کا الزام ہم دونوں اپنے سر لے لیں گے ___"

وارنیکا ___ میں تم اور چند دوسرے یہی چاہتا ہوں کہ ہر روز حضورِ انور کے حق میں دعائیں مانگو ___ اگر میرے بچے ہوتے تو میں اُن سے بھی دعائیں مانگنے کو کہتا ___ میں خود بھی دعائیں مانگ رہا ہوں۔ میں نے بہت بُرے دن دیکھے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔ میں قسم اٹھا کے کہتا ہوں کہ یہ سو روبل اتنے عزیز نہیں جتنی یہ حقیقت کہ حضورِ انور نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک شرابی اور نچلے درجے کے آدمی سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے مجھے دوبارہ انسان بنا دیا ہے۔ انھوں نے عمر بھر کے لئے مجھے جینے کی ہمت عطا کی ہے اور میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ میں لاکھ گنہگار سہی لیکن حضورِ انور کے حق میں جو دعائیں میں مانگ رہا ہوں وہ ضرور قبول ہوں گی۔

وارنیکا ___ مجھے اپنی سُدھ بُدھ بھول گئی ہے۔ میں خوشی کے مارے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا ہے۔ میں ۴۵ روبل تمہیں بھیج رہا ہوں۔ بیس روبل میں اپنی مکان مالکن کو دے دوں گا۔ پھر میرے پاس باقی ۳۵ روبل رہ جائیں گے۔ بیس ایک کے قریب تو میرے کپڑوں پر

خرچ آجائیں گے۔ اور باقی ضروریات پوری کرنے کے لئے پندرہ ڈالر پھر بچ رہیں گے۔ آج صبح کے واقعے نے مجھے بالکل پاگل کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے لیٹ جانا چاہیے۔ مجھے اس وقت بہت چین محسوس ہو رہا ہے۔ ہاں میری رُوح ضرور دُکھی ہے اور میں محسوس کر سکتا ہوں کہ میرے اندر ہی اندر کوئی چیز کانپ رہی ہے۔ میں تم سے پھر کبھی ملنے آؤں گا۔ اس وقت میں کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔ میری بچی۔ خدا سب کی سُنتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ سب پہ نظر رکھتا ہے۔

ماکار۔

۱۵ ستمبر

میرے پیارے ماکار

میں یہ واقعہ سُنکر بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے حضورِ انور کی فیاضی کی داد دیتی ہوں۔ اب کم از کم تمھیں پریشانیوں سے تو نجات ملے گی لیکن خدا کے لئے اس رقم کو ضائع نہ کر دینا۔ آرام سے رہو۔ شان میں نہ آجانا اور ہو سکے تو اب ایک ایک پائی کر کے کچھ پیسہ جمع کرنا شروع کر دو تاکہ دوبارہ مصیبت کے دن آئیں تو تم کچھ مقابلہ کر سکو۔ اور خدا را ہمارے بارے میں فکر مت کیا کرو۔ اور فیڈورا اپنا گذارہ کر لیں گی۔ ماکار۔ تم نے ہمیں اتنے ڈالر کیوں بھیج دیئے؟ واقعی ہمیں اتنی رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اسی سے اطمینان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر تبدیل کرنے کے لئے ہمیں پیسہ درکار تھا لیکن فیڈورا کو توقع ہے کہ اسے اپنا ایک پرانا قرضہ واپس مل جائے گا۔ میں ضروری کام پورا کرنے کی غرض سے بیس ڈالر اپنے پاس رکھ رہی ہوں اور باقی تمھیں واپس بھیج رہی ہوں۔ پیسے کو سوچ سمجھ کر خرچ کرنا بلکہ اسے محفوظ رکھو۔ خدا حافظ۔ خدا کرے کہ تم پریشانیوں سے نجات پاؤ اور سُکھ کی زندگی بسر کرو۔ اگر میں تھکن محسوس نہ کر رہی ہوتی تو اور زیادہ لکھتی۔ کل سارا دن تو میں بستر ہی پہ پڑی رہی۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تم نے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔

دی۔ ڈی۔

میری پیاری دار وار!

دیکھو اب تو جانے کا نام نہ لو۔ اب تو میں اتنا خوش ہوں اور چین سے ہوں۔ اب یہاں سے نہ جاؤ۔ فیڈورا کے کہنے میں نہ آجاؤ۔ تم جو کہوگی میں کر دوں گا۔ میں اچھی طرح رہوں گا۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ پہلے کی طرح ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کو خوشیوں بھرے خط لکھیں گے۔ اور اگر مصیبتیں آئیں تو مصیبتوں کا حال لکھیں گے۔ ہم چین اور سُکھ سے رہیں گے۔ ہم پھر ادب کا مطالعہ شروع کر دیں گے۔ میری زندگی ہر لحاظ سے بدل چکی ہے۔ مکان مالکن دوست بن گئی ہے۔ تھریسا اب زیادہ سمجھدار ہو گئی ہے اور فالڈونی بھی کہنا مانتا ہے۔ میں نے راتا زیف سے بھی صلح کر لی ہے۔ میں اتنا خوش تھا کہ میں خود اُس سے ملنے چلا گیا۔ وہ آدمی دل کا اچھا ہے۔ اور لوگوں نے اُس کے بارے میں جو بکواس کی ہے وہ سب غلط ہے۔ اُس نے کبھی نہیں چاہا کہ ہمیں اپنی کسی کہانی کا کردار بنائے۔ اُس نے یہ سب باتیں خود مجھے بتائیں۔ اور اُس نے مجھے اپنی کچھ نئی کہانیاں پڑھ کر سُنائیں۔ وہ کہہ رہا تھا جہاں تک تمھیں یہ شکایت ہے کہ تمہارا نام مسٹر لولیس کیوں ڈالا گیا تو یہ لفظ کوئی بُرا نہیں ہے اور نہ یہ گالی ہے۔ یہ لفظ کسی بدیشی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہے سخت آدمی۔ پاکستانی زبان میں یوں بھی کہہ لو۔ کیا تیز زبان آدمی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہے۔ سو یہ تو ایک بے ضرر مذاق تھا۔ میں ٹھہرا اَن پڑھ آدمی بُرا مان گیا۔ لیکن میں نے معافی مانگ لی ہے۔ آج تو موسم بھی بہت اچھا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی اور صبح کچھ دھند بھی تھی لیکن اس سے موسم اور نکھر گیا ہے۔ میں نے بہت عمدہ جوتے خریدے ہیں۔ آج صبح میں سیر کرنے کے لئے نیوسکی تک گیا تھا۔ وہاں ذرا دیر کے لئے میں "بی" اخبار پڑھنے کے لئے بھی رُکا تھا۔ میں تمھیں خاص بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ آج صبح حضورِ انور کے متعلق آئیوان دیچ اور الیگزینڈر سے میری بات چیت ہوئی تھی۔ پتا چلا ہے کہ انھوں نے صرف مجھی پہ کرم نہیں کیا۔ حضورِ انور اپنی دریا دلی کے لئے مشہور ہیں۔ ساری دنیا اُن کی تعریف کرتی ہے اور کئی لوگ آنکھوں میں آنسو بھر کر اُن کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں۔ سُنا ہے

کہ بہت پہلے انھوں نے ایک یتیم بچی کو گود لے لیا تھا اور جب وہ جوان ہو گئی تو ایک افسر کے ساتھ اُس کی شادی کر دی تھی یہ واقعہ بھی عام ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک بیوہ کے لڑکے کو ملازمت بھی دلائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ میں نے یہ باتیں سُننے کے بعد اپنا قصہ سُنانا بھی اپنا فرض سمجھا۔ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مجھے شرم تو بہت آئی لیکن میں نے سب کچھ کہہ سُنایا۔ میں چاہتا ہوں کہ ساری دُنیا حضورِ انور کے گن گائے۔ میں نے بڑے فخر سے سارا قصہ سُنایا۔ میں نے انھیں اور بھی بہت کچھ بتایا (لیکن تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا) میں نے ان لوگوں کو مکان مالکن ماتا ریعت؟ اپنے جوتوں اور مارکوف کے بارے میں سب کچھ کہہ سُنایا۔ کچھ لوگ ہنسے بھی۔ ممکن ہے میرے چہرے یا میرے جوتوں میں کوئی ایسی بات ہو کہ انھیں ہنسی آ گئی۔ اے ہاں ضرور میرے جوتوں پر انھیں ہنسی آئی ہوگی۔ لیکن وہ میری ہنسی نہیں اُڑا رہے تھے۔ بھلا وہ لوگ حضورِ انور کی فیاضی کا مذاق کیسے اُڑا سکتے تھے۔ کیوں وارنیکا؟ جانِ من مجھے ابھی تک تسلی نہیں ہوئی کیونکہ ان واقعات کی مجھے توقع نہ تھی۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس ایندھن تو ضرورت کے مطابق ہے نا! اپنی صحت کا خیال رکھو کہیں سردی نہ کھا بیٹھنا۔ تمہاری اُداسی بھری باتیں مجھے بہت دُکھ پہنچاتی ہیں۔ میں خدا سے ہمیشہ تمہارے لئے دُعا مانگتا رہتا ہوں۔ تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا یا سویٹر بھی ہے یا نہیں؟ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو مجھے فوراً بتا دو۔ اس بوڑھے آدمی پہ بڑا احسان کرو گی۔ بُرے دن گذر گئے اب اچھا وقت آگیا ہے۔

بہت دُکھ اُٹھائے ہم نے۔ لیکن اب وہ دن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے ہیں اور جُوں جُوں وقت گذرتا جائے گا ہم اُن دنوں کو بھی آہیں بھر بھر کے یاد کیا کریں گے۔ مجھے اپنی جوانی کے دن ابھی تک یاد آتے ہیں۔ ایسا بھی وقت گذرا ہے جب میری جیب میں ایک کوپک نہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں خوش رہا کرتا تھا۔ اُن دنوں میرا یہ عالم تھا کہ آج صبح جیسا حسین چہرہ میں نے نیوسکی پہ دیکھا تھا اگر اُن دنوں دیکھ لیتا تھا تو بس سارا دن خوش رہا کرتا تھا۔ وہ وقت بھی خوب گذرا۔ زندگی بہت حسین ہے وارنیکا۔ خاص کر اگر پیٹرس برگ میں کٹے تو کیا کہنے! کل میں عبادت کرنے بیٹھا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور میں نے دعا کی کہ بُرے وقتوں میں مجھ سے جو گناہ بھی سرزد ہوا ہے وہ بخش دیا جائے۔ اس کے لئے معاف کر دیا جاؤں۔ عبادت کے دوران میں مجھے تمہارا خیال بھی آیا کیونکہ تمہیں نے مجھے حوصلے عطا کئے۔ آرام پہنچایا۔ آج میں نے ہر خط کو چوما۔ مجھے پتا چلا ہے کہ پیٹرس میں کوئی سروس کوٹ بک رہا ہے۔ میں اُس کے بارے میں اطلاع حاصل کر لوں گا۔

خدا حافظ۔

ماکار

۱۵ اگست۔

میرے پیارے ماکار۔

میں بہت پریشان ہوں۔ میرا ہر خدشہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اب ذرا تم ہی غور کرو۔ وہ بائیکوف سینٹ پیٹرس برگ میں رہتا ہے۔ فیڈورا اُس سے ملی تھی۔ وہ ایک بگھی میں کہیں جا رہا تھا۔ جب اُس نے فیڈورا کو دیکھا تو اس سے ملنے کے لئے اُتر گیا اور فیڈورا سے پوچھنے لگا کہ ان دنوں کہاں رہتی ہے۔ جب فیڈورا نے بتانے سے انکار کر دیا تو ذرا ہنس کر کہنے لگا کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تمہارے ساتھ اور کون رہتی ہے۔ (یہ بات ضرور ادیزا نے اُسے بتائی ہوگی) فیڈورا سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے سرِعام اُس کو بہت بُرا بھلا کہا اور بولی کہ وہ اوّل درجے کا لفنگا شخص ہے بداخلاق ہے اور میرے تمام دُکھوں کی واحد وجہ ہے۔ اس پر وہ بولا کیونکہ اس کے پاس ایک دھیلا نہیں ہے لہٰذا دُکھی تو وہ رہے گی۔ فیڈورا نے اُسے بتایا کہ وہ کما کر بھی کھا سکتی ہے کسی سے شادی بھی کر سکتی ہے لیکن اُس کی بدولت اور اُس کی مہربانیوں کی بدولت ان دنوں سخت بیمار ہے اور اگر کسی دن مر بھی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ اس پر وہ بدزبان بولا — کہ میں ابھی جوان ہوں، اور پھر ایکیلی—؟ ہوں اور بولا کہ میری آبرو میں داغ بھی لگ چکا ہے۔ (یہ اُس کے لفظ ہیں)

میرا اور فیڈورا کا خیال تھا کہ آج ہمارے مکان کے بارے میں کوئی علم نہیں لیکن کل میں کچھ خرید و فروخت کرنے ذرا اگوسٹنی ڈور تک ہی گئی تھی کہ وہ ہمارے کمرے میں آیا۔ وہ جان بوجھ کر اس وقت آیا تھا جب میں گھر پر نہیں تھی۔ اس نے فیڈورا سے میرے متعلق کئی سوال کئے۔ میری زندگی کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور قریب قریب گھر میں جو چیز رکھی تھی اس کا معائنہ کیا۔ میرے ہاتھ کی کاڑھی ہوئی چیزیں بھی دیکھیں اور آخر کار بولا۔ "وہ کلرک کون ہے جس سے تمہاری اتنی گہری واقفیت ہوگئی ہے؟" عین اسی وقت تم برامدے سے گذر رہے تھے اور فیڈورا نے تمہاری طرف اشارہ کرکے بتایا کہ وہ ہے۔ اس نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور بس مسکرا دیا۔ فیڈورا نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور اس سے کہہ دیا کہ میری تمام مشکلات اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس کا مجھ سے ملنا میری مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا لیکن کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ کہ ایک خاص کام کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے فیڈورا کو پچیس روبل پیش کرنا چاہے۔ فیڈورا نے انھیں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ وہ یہاں کیوں آیا؟ میری تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ اسے ہمارے بارے میں ہر بات کا علم کیسے ہوا۔ فیڈورا کہتی ہے کہ اس کی چچا زاد بہن اگسینا جو ہمیں کبھی کبھی ملنے آتی ہے وہ ناسٹاسیا کو جانتی ہے۔ ناسٹاسیا دھوبن ہے اور اس کا چچا زاد بھائی اس منسٹری میں کام کرتا ہے جہاں اینا کے بھتیجے کی جان پہچان والے لوگ اعلیٰ افسر ہیں ضرور اسی طرح اینا کو ہمارے بارے میں خبریں پہنچی ہیں۔ شاید فیڈورا غلطی کر رہی ہو۔ میں کچھ نہیں سوچ رہا کہ اب کیا کریں۔ کیا وہ کمبخت دوبارہ آئے گا۔ میری جان تو اسی خیال سے خشک ہو رہی ہے۔ جب فیڈورا نے مجھے یہ سب باتیں کل بتائیں تو میں قریب قریب غش ہی کھا گئی تھی۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں اس سے نہیں ملنا چاہتی۔ وہ مجھ غریب کی جان کو کیوں آیا ہے۔ وہ کیوں میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مجھے تو ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے۔ اگر بائیکوف اسی لمحے آگیا تو پھر کیا ہوگا۔ خدا جانے میری قسمت میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھ سے ملنے کے لئے فوراً چلے آؤ۔ ماکار۔ خدا کے لئے فوراً چلے آؤ۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔ ترس کرو۔ پل بھر کے

وار۔ ڈ۔

۱۰ ستمبر۔

مائی ڈیر وار وارا

آج کی تاریخ کو ہمارے مکان میں ایک سمجھ نہ آنے والا اور بالکل غیر متوقع سانحہ گذرا۔ وہ بیچارہ گرشکوف آج بر الزام سے بری کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ تو جج حضرات نے بہت پہلے کر لیا تھا لیکن آج وہ آخری فیصلہ سننے کے لئے گیا تھا۔ یہ مقدمہ اس کے لئے بہت خوش قسمت ثابت ہوا۔ غلطی یا جرم کی جو بھی خطا اس سے سرزد ہوئی تھی اسے برطرف کر دیا گیا۔ اور اس سوداگر سے اسے ایک اچھی خاصی رقم معاوضے میں دلا دی گئی ہے۔ اس کے حالات اس سے سنور گئے ہیں اور اس کے اخلاق پر جو داغ آیا تھا وہ بھی دھل گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ اس کی توقعات صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ کوئی دوپہر کے تین بجے کچہری سے واپس لوٹا۔ اس کا چہرہ گندھک کی طرح پیلا پڑ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اس نے آتے ہی اپنی بیوی کو کس کے سینے سے لگا لیا۔ بچوں کو خوب پیار کیا۔ ہم سب لوگ ہجوم کی صورت میں آئے مبارکباد دینے لگے۔ وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ جھکا ہی جا رہا تھا۔ وہ بار بار جھک رہا تھا۔ اور ہم میں ایک ایک کے ساتھ اس نے کئی کئی بار ہاتھ ملایا۔ کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ لمبا ہو گیا ہو۔ جیسے اس کی کمر سیدھی ہو گئی ہو۔ اُف وہ۔ کتنا خوش تھا وہ۔ وہ ایک منٹ بھی تو چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ایک چیز اٹھاتا تو دوسری رکھ دیتا۔ برابر شکریئے ادا کئے جا رہا تھا۔ ہزار بار تو وہ اٹھا اور بیٹھا ہی ہوگا۔ جو بات اس کے منہ تک آتی تھی وہ ہمیں سنا دیتا تھا۔ اپنے اعلیٰ چلن کے متعلق اپنی بیوی اپنے بچوں کے بارے میں نہ جانے کیا کیا اس نے بتایا ۔۔۔ وہ جذبات کی شدت میں رو بھی دیا تھا۔ ہم میں سے کئی لوگوں کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ممکن ہے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے راتا زیف نے کہا ہو "میرے

دوست کی جیب میں پیسہ نہیں ہے تو کیا موت کو جانتا ہے۔ اصل بات تو پیسہ ہے۔ تمہیں اس بات کے لئے شکرگزار ہونا چاہئے۔" اور راتا زیف نے اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔ مجھے یوں جان پڑا گروشکوف کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ اس نے غالباً محسوس کیا تھا۔ یعنی کہ اس نے کوئی ایسی ویسی بات ہی دی تھی بالکل نہیں۔ بس اس نے راتا زیف کو عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا تھا۔ وہ پہلے ایسی بات کبھی نہ کرتا۔ خیر۔ ہر شخص کا کردار مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں خوشی کے ایسے موقع پر اتنا مغرور کبھی نہ ہوتا [illegible] میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب آدمی مختلف وقتی اور [illegible] تے پر ہی جھک جاتا ہے۔ لیکن اپنے متعلق کیوں [illegible] دوں؟ گروشکوف نے راتا زیف کے جواب میں کہا تھا —"ہاں — ٹھیک کہتے ہو۔ پیسہ بھی اچھی چیز ہے۔ اس کے لئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس کی بیوی نے شام کے کھانے کے لئے اچھے اچھے پکوان تیار کرنے کو کہا اور ہماری ان مکان مالکن نے اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کیا۔ ہماری مکان مالکن بھی اپنے ڈھنگ کی اچھی عورت ہے۔ کھانے کا انتظار کرتے وقت گروشکوف بہت بے چین ہو گیا اور وہ قریب قریب ہر کمرے میں گیا — یہ اور بات تھی کہ کسی کو دعوت دی یا نہیں۔ وہ فقط کمرے میں جاتا مسکرا کر آداب بجا لاتا پھر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کچھ بات کرتا یا بالکل ہی خاموش رہ کر واپس چلا آتا۔ بحری فوج کے افسر نے اسے تاش کھیلنے کے کمرے میں مدعو کیا۔ اب وہ چار ساتھی ہو گئے لیکن گروشکوف نے سارے کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا۔ بغیر سوچے سمجھے چال چل دیتا اور آخر میں یہ کہہ کر اٹھ گیا —"میں تو بس ایک دو بازیاں کھیلنے کے لئے آیا تھا۔" جب وہ مجھ سے برآمدے میں ملا تو اس نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے مجھے عجیب لیکن محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر زور سے میرے ہاتھوں کو دبایا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی بیوی خوشی کے مارے پاگل ہو رہی تھی۔ ان کے کمرے کا یہ عالم تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا —"میرا خیال ہے مجھے تھوڑی دیر آرام کرنا چاہئے —" پھر کچھ دیر اپنی منجھلی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کے اپنی بیوی کو دیکھا اور بولا —"پیٹکا کہاں ہے —" اس کی بیوی وہیں سجدے میں جھک گئی اور اسے یاد دلایا کہ پیٹکا کی تو وفات ہو چکی ہے —"ارے ہاں —" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا —"پیٹکا تو جنت میں ہے —" اس کی بیوی نے دیکھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اور اس واقعہ سے اس کی حالت کچھ غیر ہو گئی ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ وہ اب سو جائے —"ہاں — یہی ٹھیک ہے۔ مجھے اب سو جانا چاہئے —" وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی گردن اٹھائی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اس کی بیوی کو کچھ سمجھ نہ آیا اور اس نے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کو جب یقین ہو گیا کہ وہ سو گیا ہے تو وہ اٹھ کر مکان مالکن کے پاس چلی گئی اور وہاں گھنٹہ بھر بیٹھی رہی۔ جب وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہا تھا اور وہ کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اپنے کام میں اتنی مصروف رہی کہ وہ اسے بھی بھول گئی۔ لیکن اچانک وہ بڑبڑا کے کام سے اٹھ بیٹھی — اور کسی انجانے ڈر کے تحت سہم کے رہ گئی۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر بستر کی طرف دیکھا۔ اس کے خاوند نے ابھی تک کروٹ نہ بدلی تھی۔ وہ جس پہلو سے لیٹا تھا اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب گئی اور دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ گروشکوف — جیسے اس پر فالج گر گیا ہو۔ اور کسی کو علم نہیں کہ کیوں گر گیا؟ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا ہے کہ میں ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا۔ آدمی اس طرح کیسے مر سکتا ہے۔ بیچارہ گروشکوف — کیا زندگی گزاری اس نے! کیا زندگی گزری اس کی! اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کے مارے وہ کچھ بول نہ سکتی تھی۔ اس کی ننھی لڑکی دبک کے کونے میں جا بیٹھی۔ پھر قیامت آ گئی۔ سنا ہے کہ اس کی نعش کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ میں اپنے دکھ کو لفظوں میں نہیں بیان کر سکتا۔ ہم میں سے

کون قسمت کے کھیل کو جان سکتا ہے۔ آج یہاں ہیں تو کل کیا ہو نہیں۔

تمہارا ماکار

میری پیاری دار وارا۔

میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ راتا زیعت نے میرے لیے کسی ادیب کے ہاں ایک کام ڈھونڈ دیا ہے۔ وہ ادیب ایک ضخیم مجموعہ لے کر راتا زیعت کے پاس آیا تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ کافی کام مل گیا۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ اُس ادیب کا دستخط اتنا بُرا ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ لیکن کام جلد ختم کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اصل مسودہ اتنا بُرا لکھا ہوا ہے کہ سطر پر سطر چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کوپیک فی کاغذ کے حساب سے معاملہ طے ہوا ہے۔ میں یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اب میرے پاس کچھ مزید رقم اور بھی آجائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔ مجھے اپنا کام شروع کرنا ہے۔

تمہارا دوست ماکار

۲۴ ستمبر

میرے پیارے دوست ماکار

میں نے گذشتہ تین روز سے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا لیکن ان تین دنوں میں مجھ پر آفت آپڑی ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ بائیکوف پھر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ فیڈورا کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ جب میں نے دروازے پر دستک سن کر دروازہ کھولا اور اُسے دیکھا تو اتنی زیادہ ڈر گئی تھی کہ اپنی جگہ سے ہلنا محال ہو گیا تھا۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ حسبِ معمول زور سے ہنسا اور اندر آگیا۔ کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک کونے میں بیٹھ کر کام میں لگ گئی۔ جب اُس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا تو اُس کی مسکراہٹ دب کے رہ گئی۔ میں اتنی کمزور ہو چکی ہوں۔ یہ اخیال ہے میرا رنگ کاغذ کی طرح سفید پڑ چکا ہے۔ وہ لوگ جو ایک سال پہلے مجھے جانتے تھے اگر اب مجھے دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کچھ دیر تو وہ سنجیدگی سے بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر اُس کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر آئی۔ اُس نے کچھ کہا تھا۔ میں نے جواب میں کیا کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں لیکن وہ زور سے ہنسا تھا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ یہاں بیٹھا رہا۔ سوالات کرتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا (یہاں میں اسی کے الفاظ دہرا رہی ہوں) دار وارا۔ یہ بات ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیئے۔ یہ جو تمہاری رشتہ دار اور میری واقف اینا ہے نا یہ کمینی اور بد اخلاق عورت ہے۔ اُس نے تمہاری چچا زاد بہن ساشا کو آوارہ لڑکی بنا دیا ہے اور تمہیں بھی تباہ کیا ہے۔ رہا میرا سوال تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا رویہ لفنگوں اور لچوں جیسا رہا ہے۔ اور ہر انسان کردار کی کمزوری کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ زور سے ہنسا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ وہ اچھا مقرر نہیں ہے لیکن اس نے مزاحیہ انداز میں جو کہنا چاہا وہ کہہ گیا اور اب وہ چھوٹی سی بات صاف صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہے۔ اُس نے وہیں اور کھلے الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میری عزت اور وقار کو قائم کرنا اُس کا فرض ہے۔ وہ امیر ہے اور کہہ رہا تھا کہ شادی کے فوراً ہی بعد وہ مجھے اپنے گاؤں لے جائے گا جہاں وہ خرگوشوں کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اب وہ پیٹرس برگ بالکل نہیں جائے گا کیونکہ وہ شہر خراب ہے۔ اُس کی فضا خراب ہے۔ اُس شہر میں اُس کا ایک آوارہ بھتیجا بھی رہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اُسے ایک پائی نہیں دے گا اور اُس سے تعلقات ختم کر دے گا۔ اُس نے کہا کہ شادی کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ وہ اپنی دولت کا شریک کسی غیر آدمی کو نہیں بنانا چاہتا۔ پھر بولا کہ جب اتنی غریبی میں رہ رہی ہو تو بیمار ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ اور بولا کہ اگر ایک مہینہ اور یونہی رہی تو دیکھ لینا کہ چل بسو گی۔ اور کہتا گیا کہ پیٹرس برگ میں رہنا تو اپنی آبرو سے کھیلنے کے برابر ہے اور مجھ سے کہہ گیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔

اُس کی اس پیش کش سے میں اس قدر گھبرائی کہ بہت روئی۔ رونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سمجھا کہ میں شکر کے احساس سے رو رہی ہوں اور بولا کہ اُسے ہمیشہ اس بات

ساتھیں تھا کہ میں ایک نیک اچھی اور سمجھدار لڑکی ہوں لیکن تاہم جب تک اُس نے میرے بارے میں مکمل تحقیق نہ کر لی تھی تب تک یہ قدم نہ اُٹھایا تھا۔ پھر اُس نے تمہارے بارے میں کچھ سوالات پوچھے اور کہنے لگا سنا ہے وہ آدمی بھی اصول کا مالک ہے۔ نیک ہے اور وہ بھی تمہارے لئے کسی بوجھ تلے نہیں دبنا چاہتا۔ کیا اُس نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے اُس کے معاوضے میں پانچ سو روبل کافی ہوں گے ؟"

جب میں نے اُس کو بتایا کہ تمہارے احسانات کا بدلہ کسی صورت نہیں چکایا جا سکتا ۔۔۔ دولت سے تو بالکل نہیں چکایا جا سکتا تو وہ بولا کہ یہ سب بکواس ہے۔ کہنے لگا یہ سب کتابی قصّے کہانیاں ہیں۔ کہنے لگا میں ابھی بچی ہی ہوں اور شاید مجھے ابھی تک شعر و شاعری پڑھنے کا شوق ہو۔ کہنے لگا اسی شعر و شاعری اور ناولوں نے تو نوجوان لڑکیوں کو تباہ کیا ہے۔ کتابیں اخلاق بگاڑ دیتی ہیں اسی لئے تو وہ انھیں بُرا سمجھتا ہے۔ اگر میں بھی اتنا جی گئی جتنی اس کی عمر ہے تو شاید لوگوں کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ جبھی مجھے پتا چل سکے گا کہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ وہ کہنے لگا اُس کی پیش کش پر اچھی طرح سوچ بچار کروں کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اگر میں جلد بازی اور بغیر سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کروں گی تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی جلد بازی اور ناسمجھی نے تو نوجوانوں کو تباہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے منہ سے ہاں سُننا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ پھر اُسے مجبوراً ماسکو کے ایک سوداگر کی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی کیونکہ وہ اپنے بھتیجے کو اپنی دولت کا وارث نہیں بنانا چاہتا۔ اور وہ میرے انکار کرنے پر بھی میری الماری کے اوپر پانچ سو روبل رکھ گیا۔ اُس نے کہا تھا مٹھائی کھا لینا۔ وہ کہتا تھا کہ میں دیہات میں اتنی صحت مند ہو جاؤں گی کہ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے حد مصروف نظر آتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سارا دن بھاگ دوڑ میں گذر گیا ہے۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر چلا گیا۔ میں نے اُس کے جانے کے بعد بہت سوچا اور جتنا سوچا اتنا دُکھی ہوئی لیکن آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی ہوں۔ میں اس آدمی سے شادی کروں گی۔ میں اس کی پیش کش قبول کروں گی۔ اگر کوئی شخص مجھے اس ذلت سے بچا سکتا ہے۔ میری نیک نامی مجھے لوٹا سکتا ہے مجھے غربت اور ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے تو وہی شخص ہے۔ اس سے زیادہ میں اپنے مستقبل سے اور کیا مانگ سکتی ہوں! اس سے زیادہ میں تقدیر سے کیا چاہتی ہوں۔ فیڈورا کہتی ہے انسان کو اپنی خوشی سے منہ نہیں پھیرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ خوشی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے تو میرے دوست مجھے کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا۔ میں اتنا زیادہ کام کر رہی ہوں کہ میری صحت برباد ہو گئی ہے۔ کہیں استانی یا نوکرانی بن جاؤں ؟ تو سوائے اس کے کہ تنہائیوں میں گھُل گھُل کے مروں اور کسی کام کی نہ رہوں اور کیا ہوگا! میں خطا معاف کرو رہوں اور ہمیشہ کسی نہ کسی پر بوجھ بنی رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں جنت میں نہیں جا رہی لیکن میں کیا کروں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں ؟ مجھے کونسا راستہ نظر آرہا ہے۔

میں کوئی رائے نہیں چاہتی۔ میں اس معاملے پر خود غور کرنا چاہتی ہوں۔ میرا فیصلہ جو تم پڑھ چکے ہو وہ اب بدلا نہیں جا سکتا۔ اور میں بائیکوف کو اس فیصلے کی اطلاع دے دوں گی۔ کیونکہ وہی پیش کش کر رہا ہے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا اور میرے کچھ وہموں کی بنا پر وہ شادی کی تاریخ کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں خوش ہوں گی یا نہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن اپنی قسمت کا فیصلہ اُس پروردگار پہ چھوڑتی ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بائیکوف اچھا انسان ہے۔ وہ میری عزت کرے گا اور ممکن ہے کہ میں بھی اُس کی عزت کرنا سیکھ جاؤں گی۔ پھر اس شادی سے میں اور کیا توقع کروں؟

ماکار میں نے یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ مجھے یقین ہے تم معاملے کی نزاکت کو سمجھو گے۔ مجھے اب اس فیصلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش نہ کرنا۔ تمھیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس بات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو اور سوچو کہ کن حالات نے مجھے یہ قدم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ پہلے میں بہت پریشان ہو اُٹھی تھی لیکن اب مجھے اطمینان ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرا کیا بنے گا۔ قسمت کو کون جانتا ہے۔ آدمی جو چاہے کرے ۔۔ ہوتی خدا کی

مرضی ہی ہے۔

بائیکوف ابھی ابھی کمرے میں آیا ہے۔ میں یہ خط ادھورا چھوڑ رہی ہوں۔ حالانکہ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔

۲۳ ستمبر

میری عزیز وارا

میں تمہارے خط کا جواب بواپسی ڈاک دے رہا ہوں۔ اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سخت حیران ہوں۔ کہیں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے۔ کل ہم نے گروشکوف کو دفنا دیا۔ ہاں۔ بائیکوف نے نیکی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن عزیزم کیا تم واقعی ہاں کر چکی ہو؟ خیر سب کچھ کرنے والا تو وہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ اور خدا جیسا چاہتا ہے قسمت ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ فیڈورا بھی متفق ہے۔ چلو۔ اب تم خوش رہو گی۔ میری ننھی سی فاختہ۔ میرے خوبصورت فرشتے اب تم چین سے رہو گی۔ آنند سے رہو گی۔ لیکن وارینکا اتنی جلدی کیوں۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ارے ہاں۔ مسٹر بائیکوف کے کاروباری معاملات میں فرق آتا ہوگا۔ آخر ہر شخص کو اپنا کام ختم کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اسے تمہارے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھی وضع قطع کا مالک ہے۔ اچھی صورت ہے لیکن کہیں نہ کہیں کچھ خرابی ضرور ہے۔ سوال یہ نہیں کہ وہ اچھی صورت کا ہے سوال یہ ہے کہ مجھے فکر دامن گیر ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو خط کیسے لکھ سکیں گے۔ اور میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ میں تمہاری تمام دلیلوں پر غور کر رہا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے غور کر رہا ہوں۔ میں اس ادیب کے سودے کا بیسواں صفحہ لکھ رہا تھا جب تمہارا خط مجھے پہنچا۔ تم جا رہی ہو۔ تم کو زندگی کی ضروریات کا پورا سامان خرید لینا چاہیے۔ جرابیں۔ سویٹر۔ جوتے وغیرہ وغیرہ۔ گروکھووایا پر ایک دوکان ہے۔ یاد ہے میں پہلے بھی تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ لیکن اب تم مجھے چھوڑ کیسے رہی ہو؟ یہ خیال مجھے کھا جا رہا ہے۔ تم اس وقت نہیں جا سکتیں ــ بالکل نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ابھی اتنا کچھ خریدنا ہے اور پھر ٹوپی بھی خریدنی ہے۔ موسم خراب ہے اور دیکھو تو سہی کہ کتنی بارش ہو رہی ہے۔ تمہیں سردی لگ جائے گی۔ اور پھر کیا ایک اجنبی کے ہمراہ جاتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ میرا یہاں کون رہ جائے گا؟ فیڈورا کہتی ہے کہ تم بہت خوش قسمت ہو۔ لیکن وہ تو چڑیل ہے۔ وہ تو مجھے برباد کرنے کی سوچتی رہتی ہے۔ کیا تم ویسپرز دیکھنے جاؤ گی؟ میں وہاں تمہیں ایک نظر دیکھنے جاؤں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہو۔ لیکن اگر وہ سوداگر کی لڑکی سے شادی کر لے تو اس کے لئے اچھا رہے گا کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ اندھیرا چھا جانے کے بعد میں گھنٹہ بھر کے لئے تم سے ملنے چلا آؤں گا۔ ان دنوں جلدی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں آج ضرور آؤں گا بس شام ہوتے ہی چلا آؤں گا۔ تمہیں بائیکوف کے آنے کی امید ہوگی اور بس اس کے جاتے ہی میں چلا آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا میں ضرور آؤں گا۔

ماکار دیوشکن

۲۷ ستمبر

میرے پیارے دوست ماکار

مسٹر بائیکوف کا کہنا ہے کہ میرے پاس اعلیٰ پرکین کا ریشم کی تین درجن قمیضیں ہونی چاہئیں۔ دو درجن جمپر تیار کرنے کے لئے مجھے ایک درزن تلاش کرنی پڑے گی۔ اور وقت بہت کم ہے۔ [illegible] ہے وہ کہتا ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت تکلیف پہنچاتی ہیں۔ ہماری شادی پانچ دن بعد طے پائی ہے اور اس سے اگلے روز ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بائیکوف کو بہت جلدی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا زیادہ وقت ضائع کرتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔ میں اتنی بھاگ دوڑ کر چکی ہوں کہ میری ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ ابھی اتنا کام کرنا باقی ہے اور بہت سارا کام تو بغیر کئے ہی چھوڑنا پڑے گا۔ ہاں ایک بات اور ہے ہم نے ریشمی دھاگے اور ڈوریاں زیادہ نہیں خریدیں اور پھر ہمارے پاس خریدنے والا ہے بھی کوئی نہیں۔ بائیکوف کہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو دیہاتی لباس میں نہیں دیکھنا چاہتا اور اس کے بقول مجھے مقامی عورتوں کا سر نیچا کرنا ہوگا۔ کیا تم گروکھووایا جا کر میڈیم شفون سے مل سکتے ہو؟ اس سے کہو کہ فوراً کسی درزن کو بھیج دے اور عین کرم ہو گا اگر خود چلی آئے آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے

ہمارا نیا کمرہ بہت ٹھنڈا ہے اور ابھی اسے صاف کرنے کا کام باقی ہے۔ بائیکوف نے ایک گائے بھی لی ہے۔ وہ اتنی بوڑھی اور بیمار ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ ہماری روانگی سے پہلے ہی نہ چل بسے۔ بائیکوف کہتا ہے کہ فکر مت کرو۔ وہ اپنے آپ چلی آئے گی۔ ہر چیز بے ترتیب ہے۔ بائیکوف خود یہاں رہتا نہیں اور نوکر خدا جانے کہاں بھاگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو صرف فیڈورا کام کرنے کے لئے رہ جاتی ہے۔ بائیکوف کا ایک خاص نوکر ہے۔ عام طور پر سب انتظام اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ تین روز کے لئے چلا گیا ہے۔ بائیکوف ہر صبح یہاں آتا ہے اور جب بھی آتا ہے غصے ہی میں آتا ہے۔ کل اس نے باورچی کو اتنا مارا کہ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ اب تم تک میرے خط پہنچانے والا کوئی نہیں لہذا میں یہ خط ڈاک ہی میں ڈال رہی ہوں۔ ارے بابا۔ میں سب سے ضروری بات تو بھول ہی گئی۔ میڈم شیفے سے کہنا کہ وہ بلاؤز کا ڈیزائن کل کے بھیجے ہوئے نمونے کے مطابق تیار کرے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ وہ خود چلی آئے اور مجھے سب ڈیزائن دکھا دے۔ ہاں اسے یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے جبرون کے بارے میں اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اب میرے جبرون "کروشیا" سے تیار کئے جائیں۔ اور دامنوں پر ریشمی دھاگوں کی بجائے گلکاری کی جائے۔ تمہیں یہ سب باتیں یاد رہیں گی نا؟ میں تو ہر بات بھولتی جا رہی ہوں۔ اسے یہ بھی کہنا ہے کہ اوور کوٹ کے کالر ذرا اونچے ہونے چاہئیں۔ اور ان پر ریشمی ڈوری سے کڑھائی ہونی چاہئے۔ دیکھو بھولنا نہیں۔

تمہاری

دی۔ ڈی۔

مجھے بہت شرم آتی ہے کہ میں تمہیں اس طرح تکلیف دے رہی ہوں۔ پرسوں بھی تم ساری صبح بھاگتے پھرے تھے۔ لیکن اب میرے کام کون کرے گا۔ یہاں کوئی چیز ترتیب سے نہیں ہے اور میں بیمار ہوں۔ ماکار مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔ میں پہلے ہی بہت اداس ہوں۔ میرے نیک دل دوست جانے میرا کیا بنے گا! میں آنے والے کل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ میں کچھ بھی اندازہ کرتے ہوئے ڈرتی ہوں اور ہر بات سے غافل ہو کر جا رہی ہوں۔ میں نے جو کام بتائے ہیں انہیں نہ بھول جانا۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں تم غلطی نہ کر بیٹھو۔ بھولنا مت ریشمی دھاگے سے نہیں بلکہ گلکاری۔

۲۷ ستمبر۔

میری پیاری وار وارا۔

میں نے تمہاری ہدایت پر پوری توجہ سے عمل کیا ہے۔ میڈم شیفے کہتی تھی کہ وہ خود گلکاری کا کام کرے گی کیونکہ یہ زیادہ خوبصورت ہوگا یا کیا ہوگا مجھے یہ یاد نہیں رہا۔ اس نے ریشمی دھاگے کے بارے میں بھی کچھ کہا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس نے ریشمی دھاگے کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔ مجھے تو وہ عورت پاگل نظر آتی ہے۔ اور اس نے کیا کہا تھا؟ وہ خود ہی تمہیں بتا دے گی۔ میں تو بھاگ بھاگ کے تھکن سے اتنا چور ہو چکا ہوں کہ آج دفتر بھی نہیں گیا۔ لیکن تم اس کا فکر مت کرو۔ میں تمہارے سکھ کی خاطر شہر کی ہر دوکان پر پہنچنے کو تیار ہوں۔ تم کہتی ہو کہ تم مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرتی ہو تو سات بجے تمہیں ہر بات کا علم ہو جائے گا۔ میڈم شیفون نے سات بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمت نہ ہارو۔ یوں دل نہ چھوڑ بیٹھو۔ سب ٹھیک ہوگا۔ اے کیا وہ ریشمی دھاگے کی مصیبت ہے۔ نہ یاد آتی ہے نہ بھولتی ہے۔ میں خود تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ میں ضرور آؤں گا۔ درحقیقت میں دو بار تمہارے گھر کے دروازے کے آگے سے گزرا بھی ہوں لیکن وہ بائیکوف ہمیشہ اتنے غصے میں ہوتا ہے کہ بس ـــ واقعی ـــ خیر کیا ہو سکتا ہے۔

ماکار

۲۸ ستمبر۔

میرے پیارے ماکار

دیکھو فوراً بھاگ کے جوہری کی دوکان پر جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ زمرد اور نگینے کے بندے نہ بنائے۔ بائیکوف اب کہہ رہا ہے کہ قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ بائیکوف بہت ناراض ہے اور کہتا ہے کہ ان چیزوں میں پہلے ہی اندھی دولت خرچ آ چکی ہے۔ اور اسے لوٹا جا رہا ہے۔ کل بھی وہ کہہ رہا تھا کہ اگر اسے ان اخراجات کا اندازہ پہلے ہو جاتا تو وہ یوں وعدہ نہ کر بیٹھتا۔ اس نے کہا تھا کہ شادی ہوتے ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔ کسی مہمان کو نہیں بلایا جائیگا

کوئی دعوت نہیں کی جائے گی اور ایک عرصے تک کسی دعوت کی اُمید نہیں۔ وہ اسی طرح باتیں کرتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں اور بائیکوف نے خود انھیں تیار کرایا ہے۔ میں اُسے جواب اس لئے نہیں دیتی کیونکہ وہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ نہ جانے میرا کیا بنے گا؟

۲۸ ستمبر۔

میری بچی وار وارا

میں کہنا ——— میرا مطلب ہے کہ جوہری تک تمہارا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ میں کہنے یہ لگا تھا کہ میں بیمار ہوں اور بستر پر پڑا ہوں۔ کتنا بدقسمت ہوں کہ جب کام کا وقت آتا ہے تبھی بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اور میری مزید بدقسمتی یہ ہے کہ حال ہی میں حضورِ انور بہت غصے میں تھے اور انھوں نے ایمیلان ایئولوویچ کو اس قدر ڈانٹا کہ بیچارہ بے ہوش ہو گیا۔ بس میں تمھیں یہ بتانا چاہتا تھا۔ میں اور لمبا خط لکھتا لیکن اس خیال سے قلم رُک گیا ہے کہ تمھیں ناواجب پریشانی ہوگی۔ میں چالاک آدمی کہاں ہوں۔ میں تو صاف صاف باتیں کہنا جانتا ہوں اور جو میرے دل میں آتا ہے وہ خط میں لکھ دیتا ہوں۔ جبھی تمھیں نظر آتا ہے کہ میری کچھ باتیں اتنی صاف نہیں ہوتیں جتنا انھیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ماکار

۲۹ ستمبر۔

میری پیاری ننھی بچی۔

آج مجھے فیڈورا ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کل تمہاری شادی ہو جائے گی اور پرسوں تم چلی جاؤ گی۔ سُنا ہے مسٹر بائیکوف نے گھوڑے کرائے پر لے بھی لئے ہیں۔ میں حضورِ انور کے متعلق تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ اور کیا لکھنا ہے؟ ارے ہاں گرد کھووایا کی دوکان کے جتنے بل آئے تھے میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے۔ بل تو ٹھیک ہیں لیکن بہت ہی مہنگی اور قیمتی خریدی گئی ہیں۔ اور یہ بتاؤ یہ بائیکوف تم پر کیوں خفا ہوتا ہے۔ میں تو اتنی ہی دعا کر سکتا ہوں کہ تم ہمیشہ ہمیشہ خوش رہو۔ یہ جان کر کہ تم خوش ہو میں بھی بہت خوش ہوں گا۔ اگر میری پیٹھ میں درد پھر نہ شروع ہو گیا تو میں شادی کے موقع پر ضرور آؤں گا۔ ہاں ——— خطوں کا ذکر دوبارہ زبان پر آجاتا ہے ——— خط کون پہنچائے گا؟ فیڈورا ——— خیر اُس کی جھولی تم نے بھر دی یہ بہت اچھا کیا ——— تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ اور اس کے عوض خدا تمھیں صلہ دے گا۔ اچھے کام کا ضرور پھل ملتا ہے۔ اور نیکی اُس پروردگار کے انصاف کو ضرور جیت لیتی ہے۔ میری پیاری۔ میری بچی میں تو ہر گھنٹے کے بعد تمھیں خط لکھنا چاہوں گا۔ ہر منٹ کے بعد لکھنا چاہوں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ لکھتا جاؤں گا۔ میرے پاس تمہاری وہ کتاب The Tales of Ivan Lkin ہے۔ اُسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ اور میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں اُسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ سردیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ اور اب شامیں بڑی ہو جائیں گی۔ بڑی ہو جائیں گی اور اداس ہو جائیں گی۔ اُس وقت کچھ پڑھنے کو جی چاہے گا۔ میں اس کمرے سے تمہارے پرانے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ جہاں اب فیڈورا رہتی ہے۔ میں اُس نیک اور ایماندار عورت کو کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں کروں گا۔ بہت اچھی عورت ہے۔ کیا کہنے۔ کل میں تمہارا خالی کمرہ دیکھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں خوب گھوما۔ ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک کونے میں تمہاری سلائی کڑھائی کا ادھورا کام بھی پڑا تھا جسے تم کرتے کرتے چھوڑ گئیں۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھا اور ایک دو اور چیزیں بھی دیکھیں۔ مجھے یہ جان کے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے ریشم کی گولی بنانے کے لئے میرے ایک خط کو استعمال کیا ہے۔ میز پر مجھے کاغذ کا ایک ایسا ٹکڑا نظر آیا جس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا ”ڈیئر ماکار۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں ———“ اُس وقت شاید کوئی آ گیا ہوگا اور یہ خط یونہی رہ گیا ہوگا۔ اور اُس پردے کے پیچھے میں نے تمہارا چھوٹا سا پیارا سا بستر بھی دیکھا۔ میری ننھی سی فاختہ۔ اچھا۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ۔ میری عزیز بچی ——— جواب دینا ——— اچھا!

ماکار۔

۳۰ ستمبر

میرے بچے اور مخلص دوست مالکار

جو مہ ناتا سو چکیا۔ ناتا ہو گیا۔ اب میری قسمت میں کیا لکھا ہے یہ میں نہیں جانتی لیکن اب میں اس پروردگار کے ہاتھ میں ہوں۔

میرے قریبی دوست، میری زندگی کے رکھوالے میرے آقا — میں یہ الوداعی سطریں لکھ رہی ہوں کیونکہ کل ہم چلے جائیں گے۔ میرے لئے مت رونا۔ خوش رہنا۔ مجھے یاد کرو گے نا۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔

میں تمھیں ہمیشہ یاد کیا کروں گی اور دعا کے وقت تمہارا نام لیا کروں گی۔ میری زندگی کے جو دن یہاں گذرے تھے تو ان کا خاتمہ ہو چکا۔ مستقبل میں مجھے جو کچھ یاد آئے گا اس سے مجھے چین تو کم ملے گا لیکن تمہاری یاد مجھے سب سے عزیز ہوگی۔ ساری دنیا میں صرف تمھیں میرے دوست ہو — تمھیں وہ ہو جس نے مجھ سے پیار کیا۔ میں جانتی تھی مجھے سب معلوم تھا کہ تمھیں مجھ سے پیار ہے۔ محض میری مسکراہٹ یا میرے ہاتھ کی ایک سطر تمھیں خوش کرنے کے لئے بہت تھی۔ اب تمھیں مجھے بھلانا پڑے گا۔ آف — تم کس قدر تنہا رہ جاؤ گے؟ اب تمھیں آرام پہنچانے والا یہاں کون رہ جائے گا — تمھیں کون تسکین دے گا۔ میرے مہربان اور دلی دوست میں وہ کتاب، وہ سلائی کڑھائی کا کام اور وہ خط جو ادھورا رہ گیا تھا تمہارے لئے یہیں چھوڑ جاؤں گی۔ بس پہلی سطر کو پھر پڑھو — پھر پڑھو اور دیکھو کہ باقی مضمون کے متعلق اندازہ کر کے تمھیں کتنی خوشی ہوگی۔ خدا جانے میں کیا لکھنے بیٹھی تھی۔ یا کیا لکھتی! دیکھو اپنی وارنیکا کو ضرور یاد رکھنا۔ تم نے اتنا پیار کیا ہے تو بھول نہ جانا۔ میں نے تمہارے تمام خط فیڈورا کی میز کے اوپر والے خانے میں رکھ چھوڑے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ تم بیمار ہو لیکن بائیکوف آج مجھے باہر نہیں جانے دے گا۔ میں تمھیں خط ضرور لکھا کروں گی لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ میرا کیا بنے گا اس لئے میرے عزیز ترین دوست، میری روح، میرے لاڈ بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو آخری الوداع اور خدا حافظ کہہ دیں۔ میرا بس چلتا تو میں تمہارے سینے سے لگ جاتی۔ خدا حافظ میرے دوست خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا خوش رہنا۔ میں تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگوں گی۔ میں اپنے دل کا بوجھ بیان نہیں کر سکتی۔ بائیکوف بلا رہا ہے۔ پچ مانو میرا رواں رواں رو رہا ہے۔ میری روح رو رہی ہے۔ آنسو آنکھوں میں یوں امڈے چلے آ رہے ہیں کہ جی گھٹتا جا رہا ہے۔ خدا حافظ — اپنی بے آسرا وارنیکا کو یاد رکھنا۔

ہمیشہ تمہاری

وارنیکا۔

وارنیکا، میری جان۔ میری فاختہ۔ میری زندگی۔ وہ تمھیں مجھ سے بہت دور لئے جا رہے ہیں۔ تمھیں زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ وارنیکا تم جا رہی ہو کیا! ایسے اس طرح کرنے سے انھوں نے کسی خنجر سے میرا دل کیوں نہیں چیر کے رکھ دیا۔ تم نے انھیں مجھ پر یہ ظلم کرنے کیسے دیا؟ تم رو رہی ہو لیکن جانے پر مجبور ہو۔ مجھے تمہارا جو خط ابھی ابھی پہنچا ہے وہ ابھی تک آنسوؤں کے قطروں سے گیلا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم جانا نہیں چاہتیں۔ اور وہ زبردستی کر رہے ہیں — اور تمھیں میری یاد آ رہی ہے — تمھیں میرے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے — تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ اب تمہارا خیال کون رکھے گا۔ تمہارا ننھا سا تنک دل تنہائیوں میں رو رو کر ہلکان ہو گا۔ تمھیں رنج گھن بن کے کھا جائے گا۔ تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ تم وہاں تنہائیوں میں گھل گھل کے مر جاؤ گی اور وہ ظالم تمھیں یخ بستہ مٹی میں دفنا دیں گے۔ وارنیکا — تمہاری قبر پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔ بائیکوف تو خرگوشوں کے شکار میں مصروف ہو گا۔ اُسے فرصت نہیں ملے گی۔ میری بچی تم نے ایسا قدم اٹھایا کیوں؟ ارے تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے یہ کیا کیا۔ اپنے ساتھ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ لوگ مل ملا کر تمھیں دھکے دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ تمہارا تنکا مجروح کر دیں گے۔ میرے ننھے فرشتے تم تو اتنی نازک ہو جیسے فاختہ کا ننھا سا پر۔

ارے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ارے میں نے کیا کیا۔ میں دیکھ رہا تھا میں جانتا تھا کہ بچی بیک گئی ہے۔ میری بچی بیمار ہے۔ مجھے جان پر کھیل کے بھی۔ لیکن اب کیا۔ میں تو بے وقوف بنا رہا۔ میں تو بیوقوف رہا مجھے کچھ نہیں سوجھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ جیسے جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھ پر خدا کی مار! میں بیوقوفوں کی طرح ریشمی دھاگے کے پیچھے بھاگتا پھرا۔ نہیں وارنیکا۔ یہ نہیں ہو گا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ میں کل ٹھیک ہو جاؤں گا اور میں بستر پر نہیں لیٹا رہوں گا کل ۔۔ میں تمہاری بگھی کے نیچے سر دے دوں گا۔ میں نہیں تمہیں جانے دوں گا یہ تو ظلم ہے۔ انھیں یہ ظلم کرنے کا کیا حق ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اگر تم مجھے ساتھ نہ لے جاؤ گی تو میں تمہاری بگھی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔ جب تک سانس ساتھ دے گا تب تک بھاگوں گا۔ وارنیکا! کہاں جا رہی ہو؟ کیا جانتی بھی ہو؟ سنو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم چٹیل علاقوں میں جا رہی ہو۔ وہ علاقے میرے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح بے جان ننگے اور خشک ہیں۔ تم وہاں کس سے ملو گی؟ وہاں اجڈ اور گنوار دیہاتیوں کی بیویاں ہوں گی۔ ان کے شوہر شرابی اور بدتمیز ہوں گے۔ سردی اور بارش نے تو وہاں کے درختوں کو بھی کالا اور ننگا کر دیا ہے۔ میری بچی تم اس جگہ جا رہی ہو! بائیکوف خرگوش کا شکار کرتا رہے گا اور تم؟ تم میری بچی۔ کیا ایک زمیندار کی بیوی بننا چاہتی ہو؟ وارنیکا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اب خط کسے لکھوں گا؟ اب میں وارنیکا کہہ کر کسے پکاروں گا؟ میں اس پیارے نام سے کس کو آواز دوں گا۔ میرے ننھے فرشتے میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ میں مر جاؤں گا! وارنیکا۔ میں یہ صدمہ نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں نے تمہیں خدا کا نور سمجھ کر پیار کیا ہے اپنی بچی جان کر پیار کیا ہے۔ میں تمہارا نام لے لے کر جیتا تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میری زبان پر تمہارا نام رہتا تھا۔ میں کام ختم کر کے اور مسودوں کی نقل اتار کے خطوں میں اپنے جذبات بیان کر دیتا تھا کیونکہ اس طرح میں تمہیں اپنے قریب محسوس کرتا تھا۔ شاید تم نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا لیکن یہ سچ ہے۔ سنو میری بات سنو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جا رہی ہو۔ تم نہیں جا سکتیں۔ یہ ناممکن ہے! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ارے بارش کتنے زور سے ہو رہی ہے۔ تمہیں تو سردی لگ جائے گی۔ تم اتنی کمزور اور نازک ہو۔ بگھی کی چھت سے پانی نیچے ٹپک پڑے گا۔ بگھی ٹوٹ جائے گی۔ اس شہر کی سڑکوں سے جاتے ہی تمہاری بگھی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ کون جانے۔ پیٹرس برگ کی بگھی بنانے والے تو گدھے ہیں۔ انہیں تو صرف اتنا پتہ ہے کہ بگھی کو اور زیادہ خوبصورت کیسے بنا دیا جائے۔ لیکن وہ مضبوط بگھی نہیں بنا سکتے۔ نہیں وہ نہیں بنا سکتے میں قسم اٹھا کے کہتا ہوں۔ میں بائیکوف کے پاؤں پکڑوں گا۔ اس کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی بات کو ثابت کر دوں گا۔ وہ سب سمجھ لیں گے۔ اور جانِ من تم بھی تو اس سے کہو۔ اسے کہہ دو کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتیں کہہ دو کہ میں یہیں رہوں گی۔ میرے خدا۔ اس نے ماسکو کے سوداگر کی لڑکی سے کیوں نہ شادی کر لی۔ اسے کیا مصیبت پڑی تھی۔ اس کے ساتھ شادی کر لینا تو اسی کے حق میں اچھا رہتا۔ سوداگر کی لڑکی اس سے نباہ کر لیتی۔ مجھے پورا یقین ہے۔ پھر تم میرے پاس یہاں رہ سکتی تھیں۔ اور پھر تمہیں بائیکوف کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ وہ تمہیں کب سے پیارا ہو گیا۔ ریشمی کپڑوں کی بنا پر تو تمہیں اس سے پیار نہیں ہو گیا نا؟ اور ریشمی دھاگے ہوتے کیا ہیں۔ ان کا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔ بکواس ہے۔ اب سوال زندگی اور موت کا ہے ریشمی دھاگوں کا نہیں۔ ریشمی دھاگے کیا چیز ہیں کپڑا اور کیا۔ ارے گھٹیا کپڑا۔ بس مجھے تنخواہ مل لینے دو۔ ہیں۔ میری تنخواہ آنے کا انتظار کر لو میری بچی تم جتنے ریشمی کپڑے کہو گی میں تمہیں خرید دوں گا؟ اسی دوکان سے۔ یاد ہے نا؟ بس میری تنخواہ آ لینے دو۔ وارنیکا۔ میری زندگی۔ تب تک انتظار کر لو۔ وارنیکا خدا کے لئے رک جاؤ کیا تم واقعی بائیکوف کے ساتھ چلی جاؤ گی ہمیشہ کے لئے؟ نہیں وارنیکا نہیں۔ تم مجھے پھر خط لکھنا۔ اچھا۔ ایک خط تو اور لکھ دو! اور ان چٹانوں کی بستی میں جا کر دوبارہ لکھنا۔ اگر تم نہیں لکھو گی تو یہ جو تمہارا خط میرے پاس پڑا ہے یہ آخری خط بن جائے گا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ آخری خط نہیں ہو سکتا۔ ارے یہ کیسے ممکن ہے۔ ایکدم۔ یہ احساس کہ یہ تمہارا آخری خط ہے۔ میں نہیں برداشت کر سکوں گا۔ میں تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم بھی لکھنا۔ اب تو میرے لکھنے کا انداز بگڑ رہا ہے۔ کیسا انداز ہے مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ لیکن جب تک میں لکھے جاؤں تب تک کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میری ننھی فاختہ
۔۔ میری بچی ۔۔ میری اپنی ۔۔!

میکسم گورکی

حقیقت پسندی کی حامل تمام ادبی تخلیقات کی بنیاد زندگی پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے گورکی نہ صرف بہت بڑا حقیقت پسند تھا بلکہ زندگی کا عظیم معلم بھی تھا۔ انشا پردازی ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے لئے ایک ادیب کو اپنے تجربوں، اپنی معلومات، اپنے مشاہدوں، اخلاقی قدروں، اپنے جمالیاتی ذوق اور زبان و اظہار پر اپنے عبور کی مدد سے حقیقت کی ایک جھلک دکھانا پڑتی ہے۔ میکسم گورکی نے اپنی تمام تخلیقات میں حقائق کو کچھ ایسے ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔ میکسم گورکی نے زندگی کو نہایت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ وہ روس جیسے عظیم ملک کے ہر گوشے میں اکیس برس تک آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔ زندگی کے مختلف سرچشموں سے اپنے ذہن و فکر کو سیراب کرتا رہا تھا۔ اس نے زندگی کے اتنے دلآویز نقش پیش کئے ہیں کہ آج تک وہ دنیا کے حقیقت پسند ادیبوں کو متاثر کرتا چلا آ رہا ہے۔ ادیب اس کی نگارشات سے نور عرفان حاصل کرتے ہیں۔

گورکی نے اپنے ادب میں اپنے نظریہ (کمیونسٹ خیالات) کو کچھ ایسے خوش اسلوبی کے ساتھ سمویا ہے کہ انھیں عظیم ادب کا روپ دے دیا ہے۔ اس کے ناولوں سے، اس کے مقالوں سے اور اس کے خطوط سے انسان کے ساتھ بے پناہ محبت کا چشمہ بہتا ہے۔

گورکی کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کے تاریخی حالات سے اچھی طرح آگاہ تھا یہی وجہ ہے کہ گورکی نے روسی عوام کے انقلابی شعور کو اور بھی پختہ کیا۔ گورکی کے شہ پارے آج کے حقیقت پسندانہ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گورکی کے وہی ناول اور افسانے زیادہ مقبول ہیں جو انھوں نے اپنی ابتدائی انقلابی زندگی کے دوران لکھے۔ آج کے ادب میں مثبت ہیرو کا وجود، سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج گورکی کی دین ہے۔ گورکی نے سماج کو گھن کی طرح چاٹنے والی تمام قوتوں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی بیخ کنی کے لئے آواز بلند کی ہے۔ عوام کی انقلابی سرگرمیوں نے گورکی کی تخلیقات میں بار پایا۔ اور گورکی نے عوام کی انقلابی سرگرمیوں کو کچھ ایسے حسن کے ساتھ پیش کیا کہ اب وہ دوسروں کے لئے چراغ منزل ثابت ہو رہا ہے۔

گورکی کی اپنی زندگی بھی تاریکیوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد تھی۔ وہ تپ دق کا مریض تھا، ان پڑھ اور یتیم تھا لیکن اس نے زندگی کی ان تمام دشواریوں پر عظیم الشان فتح حاصل کی۔ گورکی کا افسانۂ حیات انسان کی فتح و نصرت کا عظیم افسانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی کے ہر ایک ناول میں جاندار رجائیت کارفرما دیکھتے ہیں۔ اس کی تخلیقات میں زندگی سے مایوس کردار بھی رکاوٹوں کو قدموں تلے روند دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔

گورکی کے اس ناولٹ "اے غم دوراں" میں بھی گورکی کے تمام فنی محاسن جذب ہیں۔ یہ داستان اتنی پیاری اور زندگی سے اتنی قریب ہے کہ آپ اپنی زندگی کی نیرنگیوں پر حیران بھی ہوتے ہیں اور زندگی سے محبت کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی زبردست خواہش بھی محسوس کرتے ہیں۔



میکسم گورکی

مترجم: خلیل احمد

اے غمِ دوراں!

گندے اور چھوٹے سے احاطے کے گرد لکڑی کے پرانے اور بوسیدہ مکان ہیں۔ یہ سیلن بھرے تنگ کمروں کی مانند ہے۔ انہیں میں سے ایک مکان کی بالکل نچلی منزل کی دو کھڑکیوں سے ہر شام کو یہ ہنگامہ سنائی پڑتا۔

ٹھہر، ٹھہر۔ بدمعاش، شرابی، ٹھہر۔ ایک تیز نسوانی آواز آتی۔

نہیں مجھے جانے دے۔ کوئی مرد کہتا سنائی پڑتا۔

میں نہیں جانے دوں گی۔ کمبخت۔

اچھا تو نہیں جانے دے گی۔ دیکھتا ہوں۔

نہیں نہیں چاہے تو مجھے مار ڈالے۔

مار ڈالوں تجھے؟ نہیں جانے دیگی؟ نہیں۔ اچھا تو لے۔

ہائے اللہ! یہ مجھے مار رہا ہے۔ اللہ

لے اب تو جانے دیگی۔

سینکا پیسزک رنگ ساز تیخ کوف کے پاس کام سیکھتا تھا۔ اور تمام دن اس احاطے کے ایک شیڈ میں بڑا ہر طرح کے رنگوں کو گھولا کرتا تھا۔ وہ پہلی ہی آواز پر دوڑ پڑتا اور چلاتا کہ "میاں بیوی پھر لڑ رہے ہیں"

اُسے اس طرح کے ہنگاموں سے ایک خاص دلچسپی تھی اور وہ اطمینان کے ساتھ آکر کھڑکی کے پاس لیٹ جاتا۔ اور کھڑکی میں سر ڈال کر اس تاریک کمرے میں جھانکنا شروع کرتا۔ جھانکنے میں اس کی ناک میں کچھ چمڑے کی بساند، موم کی بو اور کمرے کی سیلن کی مہک آتی نیچے تاریک کمرے میں دو انسان ہنگامہ کرتے ہوتے۔ گالی گلوچ لات اور مکے۔

تو مجھے مار ڈالے گا کمبخت۔ عورت چلاتی۔

کوئی فکر نہیں۔ اسکا شوہر اسے طنزاً تسکین دیتا۔

تھپڑ لات اور گھونسوں اور ساتھ ہی ساتھ عورت کی ہائے وائے اور کراہ کی آواز آتی۔

اف کمبخت نے آخری گھونسہ کتنا زبردست رسید کیا۔ سینکا دوسرے تمام تماشائیوں کو بتاتا۔ مفت کا تماشا دیکھنے کو کافی لوگ جمع ہو جاتے۔ خصوصیت کے ساتھ عدالت کا پیادہ نیوجنکو اور باجے والا کسیلاکوف اس موقع پر ضرور موجود ہوتے۔ اور اندر کمرے کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے چین۔ اگر سینکا تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا تو وہ اسکی ٹانگ گھسیٹنے لگتے۔ اور کوئی اسکا رنگ آلود پتلون بھی کھینچنے لگتا۔ ہر شخص اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لیتا۔

چھا! اب وہ اُسے پیٹھ کے بل زمین پر گھسیٹ رہا ہے۔ اور اسکی ناک زمین پر رگڑ رہا ہے۔ سینکا شان کے ساتھ منتظر تماشائیوں کو بتاتا۔

دوسرے لوگ بھی بری طرح اس تماشے کو دیکھنے کے مشتاق ہو جاتے ہر شخص کھڑکی کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ اگرچہ ان میں سے تقریباً سب کو اس طرح کی مارپیٹ کا اپنا ذاتی تجربہ تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اداروف کی طرح استاد نہ تھا۔

"ارے کیا ظالم نے اس کی ناک توڑ ڈالی؟"

"اف، خون کے فوارے بہہ رہے ہیں۔"

"ہائے اللہ" عورتیں چلاتیں۔ "بڑا سفاک ہے ظالم"

لیکن مردوں کی تنقیدیں زیادہ ڈھنگ کی ہوتیں۔

"یہ اسے ضرور مار ڈالے گا" وہ کہتے۔

"میری بات سن رکھو۔ یہ اُسے ایک نہ ایک دن چھرا مار دے گا" کسیلاکوف صاحب پیشین گوئی کرتے۔

"کھیل ختم" سینکا نے کہا۔ اور کھڑکی سے کود کر الگ ایک دوسری جگہ کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں اداروف باہر آجائیگا۔

"اچھا چھٹک ہو گئی"۔ کسیا کوف نے اس کے پاس نکلتے ہوئے پوچھا۔ "اماں تم اس حالت میں کب تک بیٹھے رہو گے۔ آؤ چلیں کچھ پئیں پلائیں۔"

"ذرا ٹھہر کر۔" ادرلوف نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔

"اچھا میں وہیں بیٹھ کے انتظار کروں گا۔"

تھوڑی ہی دیر میں ادرلوف بھی وہیں پہنچ جاتا اور اس کے جاتے ہی اسکی بیوی کا سر سے پاؤں تک شال میں لپٹی ہوئی گھر میں سے دیواروں کا سہارا لیتی نکلتی۔ شال کے گھونگھٹ میں اس کا چہرہ ذرا ذرا سا دکھائی پڑتا۔ اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی اسی سیڑھی پر بیٹھ جاتی۔ مشروبہ کو دیکھ کر کسی کو تعجب نہ ہوتا۔ اس لئے یہ ایک معمول ہو چکا تھا ــــ وہ اپنے شوہر کے چلے جانے کے بعد آکر وہاں بیٹھ جاتی۔ اور سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ اپنے شوہر کے آنے تک اب وہیں بیٹھی رہے گی۔ گھر میں بھی حبس تھا۔ دوسرے جب اسکا شوہر نشے میں بدمست گرتا پڑتا آئے گا تو اسے اس کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔ ان کے گھر کا زینہ بالکل کھڑا تھا۔ اور ایک مرتبہ ادرلوف نشے کی حالت میں اس سے گر چکا تھا۔ اور اسکی کلائی میں اتنی سخت موچ آئی تھی کہ وہ دو ہفتہ تک کام کے قابل نہ ہو سکا۔ مشروبہ کو ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کچھ برتن اور تن بیچنا پڑے تھے۔ اس کے بعد سے ہمیشہ مشروبہ اسکا انتظار کرتی۔

کبھی کبھی اسکا کوئی پڑوسی بھی اسکے پاس آ بیٹھتا۔ عموماً حوالدار لیوجنکو اس خدمت کو سرانجام دیتا۔ لیوجنکو کی مونچھیں جھکی جھکی۔ سر گنجا ہوا اور ناک لال چقندر سی تھی۔

"پھر جھگڑا ہو گیا؟" اس نے اسکی بغل میں بیٹھتے اور جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"پھر تم کو کیا؟" مشروبہ جھلاتی۔

"نہیں۔ میرا تو کوئی مطلب نہیں۔" وہ پُرسکون جواب دیتا۔

اور پھر کچھ دیر بالکل سکوت رہتا۔

لیکن عورت کی سانس کچھ گہری اور سنجیدہ ہو جاتی۔

"تم لوگ کیوں لڑتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد لیوجنکو پوچھتا۔

"یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

"اسمیں کیا شک ہے۔" لیوجنکو تائید میں سر ہلاتا۔

"پھر کیوں بلاوجہ ٹانگ اڑا رہے ہو؟"

"عجیب عورت ہے۔ اس سے تو بات کرنا دشوار ہے۔ اور بھئی تیرا اور گریگوری کا جوڑا بھی ٹھیک ملا ہے۔ تجھ پر صبح و شام دو مرتبہ ضرور ڈنڈے بازی ہو۔ تب جا کے تیرا مزاج درست رہے۔ عجیب عورت ہے"

اس طرح بک بک جھک جھک کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ عورت اطمینان کا سانس لیتی۔ اسے لیوجنکو کی موجودگی کبھی پسند نہ آتی خاص طور سے جب سے لوگوں نے اسے لیوجنکو کے ساتھ بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ اس وجہ سے اسے اس سے جلن پیدا ہو گئی تھی۔ ویسے تو اسے سب ہی سے ایک طرح کا بغض ہو گیا تھا۔ اور لیوجنکو باوجود ۶۰ سال کی عمر کے فوجی سپاہیوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔

یک بارگی سینکا بھی معلوم نہیں کہاں سے وہاں پہنچ جاتا

"یہ عورت تو ... مزاج ہے تیتا مزاج۔ اور سے یہ ادرلوف کی جورو۔" وہ لیوجنکو کے کان میں مشروبہ کی طرف اشارہ کر کے دھیرے سے کہتا۔

"اچھا بتاتا ہوں تجھے تیتا مزاج کیا ہوتی ہے۔" لیوجنکو اسے دھمکاتا۔ لیکن اسے یہ دبلا پتلا لڑکا بہت پسند تھا۔ اور اسکی باتیں وہ بہت دلچسپی سے سنتا۔ کیونکہ سینکا کو پورے احاطہ بھر کے راز معلوم تھے۔

مشروبہ کے پاس کسی کی دال نہیں گلتی۔ پیٹرو میکسیم نے بھی ڈورے ڈالنا چاہے لیکن اسنے دھتا بتا دیا۔

سینکا ابھی صرف بارہ برس کا تھا۔ لیکن اس پر اس گندے ماحول کا پورا اثر پڑ رہا تھا۔ اس لڑکے کے بچپن سے جوانی مل رہی اور یہ دونوں قسم کے جذبات سے پوری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و جذبات کے اثرات ابھی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔

احاطے میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ آسمان اگرچہ روشن تھا تارے چمک رہے تھے لیکن اگر اوپر سے اس احاطے کو دیکھا جاتا تو ایک ایسے اندھیرے گڑھے کی طرح دکھائی دیتا۔ جس کے چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہوں۔ اسی احاطے کے ایک کونے میں ایک عورت بیٹھی اپنی مار کو سہلا سہلا کر تسکین دیتی اور اپنے بدمست شرابی شوہر

دوسرے لوگ بھی جلد جلد کھسکنے لگتے۔ وہ ڈرتے کہ کہیں غصہ سے بھرا ہوا پی انہیں جاسوسی کرتے نہ دیکھ لے۔ وہ ایسی حالت میں اس کے سامنے آنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اور سب تماشا ایک آنچ کے ٹھنڈے ختم ہوتا۔ اور ایسا ان کے لئے اور کوئی دلچسپی کی چیز باقی نہ رہتی۔

عام طور سے ایسے وقت سوائے سینکا کے اس احاطے میں کوئی نہ ہوتا۔ اودرلوف باہر نکلتا تو اس کی سانس چڑھی ہوئی۔ چہرہ غصہ سے تمتمایا اور نفرت میں ڈوبا وہ اپنی لال لال انگارہ آنکھوں سے پورے احاطے کا جائزہ لیتا۔ تھوڑی دیر اپنے ہاتھ کو کمر کے پیچھے کر کے ٹہلتا۔ اور ایک سیلی گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اور پھر کبھی کبھی تاؤ میں آکر سیٹی بجاتا۔ اس کے منہ کا پسینہ اور خون کے دھبے پونچھنے لگتا پھر اسے جیسے بہت زیادہ تکان کا احساس ہوتا۔ اور وہ تھکے تھکے انداز میں ان کوارٹروں کے اس کونے کی طرف دیکھنے لگتا۔ جہاں کا پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔ اور جہاں کوف اور دوسرے رنگ ساز اکثر اسی جگہ دیوار پر رگڑ رگڑ کے اپنے برش صاف کرتے تھے۔

اودرلوف کی عمر یہی کوئی تیس برس کی تھی۔ خد و خال دلآویز تھے۔ چہرہ اس کے بہت حساس ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ مونچھیں اس کے چہرے پر خاص طور سے بہت سجتی تھیں سیاہ بھویں بہت گھنی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ بھوؤں کے نیچے سیاہ گہری آنکھوں سے ذہنی بے اطمینانی نمایاں تھی۔ بدن کافی مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد درمیانہ جو کام کی وجہ سے کچھ جھکا جھکا سا معلوم ہوتا۔ وہ دیر تک اس طرح سیلی پر بیٹھے بیٹھے اس کونے کو گھورا کرتا۔ اور وہ رہ رہ کر گہری ٹھنڈی سانس لیتا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ لیکن احاطے میں ویسا ہی حبس تھا۔ گلی سڑی ترکاریوں کی لساند۔ رنگوں اور تارکول کی بدبو مل کر ایک عجیب طرح کا تعفن پیدا کر رہی تھی۔ دونوں منزلوں کی تمام کھڑکیوں سے لڑنے اور گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی کبھی کسی کھڑکی سے کوئی جھانک کر ایک نظر اودرلوف پر بھی ڈال لیتا اور پھر ہنس کر غائب ہو جاتا۔

جب رنگ ساز لوگ اپنے کام سے لوٹتے تو وہ چلتے چلتے اودرلوف پر بھی ایک نظر ڈال لیتے۔ اور پھر ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے اور اپنی "کاسٹرما" بولی میں باتیں کرنے لگ جاتے، کوئی نہانے کی تیاری کرتا اور کوئی اور کچھ کام کی۔ پھر دھوبیوں کی بھی ٹولی اپنے کوارٹروں سے باہر نکلتی اور رنگ سازوں کو چھیڑنے لگتی اور کبھی کبھی ان کے ٹیڑھے میڑھے تلفظ کا مذاق اڑاتی۔ پھر خوب دھما چوکڑی مچتی۔ لیکن اودرلوف اسی طرح بیٹھا رہتا جب کوئی اس کے پاس ایسی حالت میں آتا اور نہ اس سے مذاق یا چھیڑ چھاڑ ہی کی ہمت کرتا۔

وہ غصہ میں بھرا بیٹھا رہتا۔ سانس زور زور سے چلتی۔ نتھنے پھولا کرتے۔ اور ہونٹوں کو وہ بیٹھا بیٹھا عجیب عجیب طرح سے توڑ موڑا کرتا اور کبھی کبھی اس کے پیلے دانت بھی نمایاں ہو جایا کرتے۔ کبھی اسکی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا اور آنکھوں کے سامنے سرخ حلقے ناچنے لگتے۔ اس وقت اس کے دل میں واڈکا کی زبردست خواہش پیدا ہوتی لیکن ابھی تو تھوڑی ہی رات گئی تھی اور شراب خانے میں بھیڑ ہو گی اور اسے ان لوگوں میں جاتے ہوئے شرم آتی۔

وہ ان کے مذاق کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ گھر میں بھی تو نہ جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں اسکی بیوی پڑی کراہ رہی ہوگی۔ اور ایسی حالت میں اودرلوف اس سے گھن کرتا۔

وہ وہاں پڑی کراہا کرتی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ وہ بے گناہ تھی اور اودرلوف ظالم اور بیدرد تھا۔ اسی کی ساری زیادتی تھی۔ خود اودرلوف کو اسکا پورا احساس تھا ـــــ وہ خوب سمجھتا تھا کہ غلطی اسکی اور صرف اسکی تھی۔ لیکن یہی احساس اس کے غصے کو اور بڑھاتا اور پھر اسے نیکی بدی کی تمیز نہ رہتی۔ اور اس کے اعصاب پر سفاکی اور بے رحمی کی خواہش غالب آ جاتی تھی جسے صرف واڈکا کی ایک بوتل ہی پوری کر سکتی

تھوڑی دیر میں کسیلیاکوف باجے والا سرخ ریشمی قمیص اور مخملی صدری پہنے ـــــ پتلون کو جوتے کے اندر ٹھونسے آ موجود ہوتا۔ سبز کپڑے میں لپٹا ہوا اسکا باجہ اسکی بغل میں ہوتا۔ اس کی مونچھیں خوب اینٹھی اور کھڑی کھڑی تھیں۔ چہرہ سے مسخرہ پن صاف نمایاں تھا۔ وہ آتے ہی اودرلوف پر جملہ چست کرتا۔ جنگ میں فتح مبارک اور ساتھ ہی ساتھ پھٹے ہوئے ہونٹ اور دھنسی ہوئی آنکھ کا انعام بھی۔

اس کے مذاق کا اودرلوف برا نہ مانتا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کسیلیاکوف کا مذاق محض تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں طنز اور مضحکہ کا کوئی شائبہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

کا انتظار کرتی ہوتی۔

اورلوف کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اُن کے ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن اٹھارہ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ جس کا غم میاں بیوی نے بہت کیا تھا۔ لیکن اس امید پر کہ شاید اُن کے کوئی اور اولاد ہو جائے۔ دونوں نے صبر کر لیا۔

نچلی منزل کا وہ کمرہ جس میں وہ رہتے تھے بہت تاریک تھا اور اُسکی چھت ڈاٹ پر کی تھی۔ دروازے کے پاس کھڑکی کے نزدیک ایک روسی چولہا تھا۔ اس چولہے سے گزر کر دو کھڑکیاں احاطے میں کھلتی تھیں۔ اور روشنی کی دو ایک لکیریں ان کھڑکیوں میں سے گزر کر اس تہ گھر میں آتیں۔ کمرہ میں تاریکی اور سیلن کی افراط تھی۔ اور اس کے سوا وہاں جیسے کچھ نہ ہو۔ اگرچہ اس جگہ پر کچھ لوگ رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود موت کی سی سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔ چولہے سے ہٹ کر ایک بڑا پلنگ بچھا رہتا جس پر ایک پھولدار زرد رنگ کی چادر بچھی ہوتی۔ اس بستر کے مقابل میں ایک میز تھی جس پر یہ میاں بیوی کھانا کھاتے اور ناشتہ کرتے۔ دیوار اور [illegible] کی درمیانی جگہ میں بیٹھ کر میاں بیوی اپنا کام کرتے۔ کیونکہ [illegible] کھڑکیوں سے روشنی چھن کر گرتی تھی۔

[illegible] ادھر اُدھر جھینگر صاحب محو خرام ہوتے۔ ان [illegible] کو جھنجھوڑ کر اورلوف دیواروں پر تصویریں چپکایا کرتا تھا بطور خوان نعمت استعمال کرتے۔ مکھیاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں بھنبھنایا کرتیں۔

اورلوف کے گھر کا معمول تھا کہ مٹروینہ صبح ۶ بجے اٹھتی اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے ٹوٹے پھوٹے سینکڑوں پیوند لگے ہوئے سماوار میں پانی گرم کرنے کو رکھ دیتی۔ اور پھر کچھ صفائی وغیرہ کر کے سودا لینے چلی جاتی۔ وہاں سے آکر شوہر کو جگاتی اور جب تک وہ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوتا سماوار میں پانی اُبلنے لگتا اور میاں بیوی چائے اور روٹی کے ناشتہ کے لئے بیٹھ جاتے۔

اورلوف بہت ہی اچھا موچی تھا اور اُسے کبھی کام کی کمی نہ رہتی۔ ناشتہ میں ہی وہ دن بھر کے کام کو گنا دیتا۔ باریک اور نازک کام تو وہ خود کرتا اور چھوٹے موٹے کام مثلاً سوت کو موم مل کر کرا کرتا۔ لیکن جوتا مٹروینہ کرتی۔ ناشتہ پر ہی دوپہر کے کھانے کے متعلق طے ہو جاتا۔ جب اتواروں میں وہ کچھ زیادہ کماتے۔ اس لئے کھانے کا موضوع اُن کے لئے کافی دلچسپ ہوتا۔ لیکن گرمیوں میں وہ ذرا ہاتھ روک لیتے۔ اور چولہا تو صرف اتوار کو جلتے۔ بلکہ بعض بعض اتوار کو بھی ناغہ کر جاتے۔ اس لئے وہ ایسی چیزیں کھاتے جنہیں چولہے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ نہیں تو کبھی کسی پڑوسی کے چولہے پر اپنا گوشت پکا لیتے۔ ناشتہ کے بعد وہ کام پر بیٹھ جاتے۔ اورلوف تو ایک برتن اوندھا کر لیتا۔ اور اس پر گدے کے لئے کچھ چیتھڑا رکھ کر بیٹھ جاتا۔ مٹروینہ اسکی بغل میں ایک لکڑی کی بنائی چھوٹی چوکی پر بیٹھتی۔

کچھ دیر تو خاموش کام میں مصروف رہتے۔ کیونکہ بات کرنے کی کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ یا کبھی کبھی کام کے متعلق ایک آدھ بات ہوتی تو ہو گئی۔ ورنہ دیر تک دونوں چپ رہتے۔ صرف ہتھوڑے کی کھٹ کھٹ یا سلائی کے وقت دھاگوں کے شپ شپ کی آواز کانوں میں آتی۔ کبھی کبھی اورلوف جماہی لیتا۔ اور ساتھ ہی ہاہو کا ایک آدھ نعرہ لگا دیتا۔ مٹروینہ بھی ایک آدھ گہری ٹھنڈی سانس لیتی۔ گرگیوری کبھی کبھی گنگنانے لگتا۔ اسکی آواز اگرچہ سخت تھی۔ لیکن وہ گانا خاصا اچھا گاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسکی آواز تیز ہو جاتی۔ اور پھر وہ پوری طرح گانے لگتا۔ اور اب مٹروینہ بھی اس کے ساتھ گلا ملانے لگتی۔ پھر دونوں کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو جاتی۔ اور مٹروینہ جھومنے لگتی۔ اور کبھی کبھی چپ بھی ہو جاتی۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں پھر اس کا ساتھ دینے لگتی۔ چنانچہ وہ ایک طرح سے اپنے غموں کو اس میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔ اپنی کھوکھلی زندگی میں وہ اس خیالی زندگی کو لانا چاہتے جو ان کے اپنے شعور میں بھی ابھی نا پختہ تھی۔ کبھی کبھی اورلوف فقروں میں اپنے الفاظ گھسیڑ دیتا۔ اور مٹروینہ ان سے چڑ جاتی۔

"کیا بیہودگی ہے۔ یہ بیٹا بالس۔ روکو۔ اسکے اس جملہ کا اورلوف پر ہمیشہ بہت برا اثر پڑتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بدمعاش کچھ رہی ہیں۔ گدھی کہیں کی۔ اچھا چیخنا بند کر کے اب بھونکنا شروع کر دیا"

"چپ رہ بدتمیز! اور اپنا کام کر۔ چلی ہے بڑی تمیز سکھانے"

اور یہ سنتے ہی مٹروینہ بالکل چپ ہو جاتی۔ وہ دیکھ لیتی۔ کہ اورلوف کی گردن کی رگ پھول چکی ہے۔ یہ خطرہ کی علامت ہوتی پھر مٹروینہ دیر تک چپ سادھے رہتی۔ حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بات کا بھی جواب نہ دیتی۔ اورلوف کو غصہ جتنا جلد چڑھتا اتنی تیزی سے

آخر کیا ہوا۔

اورلوف اسکی طرف صلح کے لئے جھکتا اور اس کی مسکراہٹ کا منتظر رہتا لیکن وہ نظریں ہٹائے رہتی۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اسکے جذبات سے کھیلنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اور اکثر اس کے مجنونانہ غصے کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے یہ خوشی ہوتی کہ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہے اور وہ اسے منانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس میں زندگی ہے احساس ہے اور جذبات ہیں۔

دونوں جوان اور تندرست تھے۔ ایک دوسرے سے محبت رکھتے اور اس پہ ناز بھی کرتے تھے گریگوری نوجوان خوبصورت اور تندرست تھا۔ مٹرونہ گوری۔ گداز بدن اور حسین تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔ زندگی بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے دلوں میں اب جذبات اور امنگیں نہیں تھیں۔ وہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ تھے۔ خواہش۔ احساس۔ مختصر یہ کہ زندگی کی کمی کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں کچھ اس طرح سے مر گئیں تھیں کہ اب انہیں کوئی خواہش پیدا ہی نہ ہو۔ خواہ وہ صرف دولت ہی جمع کرنے کی خواہش ہو۔ پیسہ پیسہ جوڑنا۔ لیکن یہ بھی انہیں میسر نہ تھا۔

ہر وقت اکٹھا رہنے سے وہ ایک دوسرے کو اس طرح سے جان گئے تھے کہ اب مزید کسی علم کا کوئی امکان ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ جانتے کہ اب دوسرا کیا کہے گا میں کیا جواب دوں گا۔ روزانہ ایک سی زندگی۔ زندگی میں کوئی جان نہ رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں وہ دوستوں سے بھی ملنے جاتے۔ لیکن ان کے دوست ان سے بھی زیادہ کم مایہ۔ ان میں تو احساس بالکل مردہ ہو چکا تھا۔ یہ دوست کبھی اورلوف کے گھر بھی آتے لیکن سوائے شراب و ناچ کے اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نہ جنگ۔ نہ جھگڑا نہ فساد۔ زندگی کی ایک بھی علامت نہیں اور پھر دوسرا دن آتا۔ بالکل اس طرح سے جیسے سلسلے کی کڑیاں ہیں جو کہ ایک کے بعد دوسری آتی چلی جاتی ہیں۔ وہی کام وہی لوگ۔ وہی اکتاہٹ وہی یکسانیت۔ وہ زندگی سے عاجز تھا۔

کبھی کبھی اورلوف کہتا۔

یہ کمبخت زندگی۔ اسکا مصرف ہی کیا ہے! کام کرو اور افسوس کرو۔ اور پھر کام کرو۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اپنی نظریں چھت کی طرف اٹھاتا اور زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑانے لگتا۔ خدا کی مرضی سے میری ماں مجھے اس دنیا میں لائی۔ ان کے خلاف کیا ہوں۔ پھر میں نے اپنا کام سیکھا۔

لیکن اس سے فائدہ۔ کیا دنیا میں موچیوں کی کمی ہے۔ خیر چلو میں بھی ایک موچی سہی۔ آخر اس سے مجھے کیا ملا۔ اس گندی کوٹھڑی میں بیٹھے کیلیں جڑا کروں۔ ایک دن میں مر جاؤں گا۔ جیسے جیسل رہا ہے۔ جیسے وہ کبھی زمانے میں ایک موچی تھا۔ جیسے کچھ اندر گئی ہی کیا ہوا اس سے اگر میں زندہ رہوں اور جوتے بناؤں یا مر جاؤں۔

مٹرونہ چپ چاپ سنا کرتی۔ اپنے شوہر کے خیالات سنتے سنتے اس کے دل میں اس کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہوتا۔ پھر بھی اسے ایسی باتیں کہنے سے منع کرتی۔ کیونکہ یہ گناہ ہے اور اللہ کے خلاف بغاوت ہے۔ خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے۔ اور کبھی جب وہ جھنجلا جاتی تو کہتی کہ تم شراب پینا چھوڑ دو تو تمہاری زندگی سدھر جائے۔ دوسرے کتنے لوگ ہیں جو روپیہ بچا کر کارخانے قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر شریفوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

تم بدھو ہو اور عقل سے خالی۔ ذرا سوچو تو میں شراب کیسے چھوڑ دوں۔ میری زندگی میں مسرت کی تو یہی ایک کرن ہے۔ دوسرے لوگ! دوسرے لوگوں کے متعلق تمہیں کیا معلوم ہے۔ کیا میں بھی شادی سے پہلے ایسا ہی تھا۔ اور سچ کہنے کو ہو تو تم نے میری تمام مسرتوں کو چوس لیا۔ تم جونک ہو جونک۔

مٹرونہ کو اسکی بات بری معلوم ہوتی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے شوہر کی سچائی سے متاثر ہوتی۔ وہ سوچتی کہ ہاں وہ حقیقت میں پہلے بہت ہنس مکھ تھا۔ پہلے تو وہ نشے میں بھی ہنساتا تھا۔ ہاں گریگوری شادی سے پہلے بہت نرم دل اور ہمدرد تھا۔

میں اس پہ بار ہوں! وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

یہ سوچ سوچ کر اسے جھرجھری آ جاتی۔ اور وہ اپنی اور اورلوف دونوں کی زندگیوں پر افسوس کرنے لگتی۔ پھر وہ اسکی طرف محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتی۔ اور اس کے سینے سے لگ جاتی۔

اچھا اب ہٹ جا۔ بہت ہو چکے نخرے۔ اورلوف مسکراتے ہوئے اس طرح سے کہتا جیسے کہ وہ ابھی اسے اپنے سے الگ کر دے گا۔

لیکن مسٹروینہ اس سے اور لپٹ جاتی اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے نہ ستائے گا۔

اس پر اورلوف بھڑک اٹھتا۔ اور کام کو چھوڑ چھاڑ کر بیوی کو اپنی گود میں بٹھا لیتا۔ اور اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ اور اس سے بہت دھیرے دھیرے محبت کی باتیں کرنے لگتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اسکی محبت کی باتوں کو سن لے۔

آخر مسٹروینہ ہماری بھی زندگی کیا زندگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح پھاڑ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے کچھ بھی نہیں یہ صرف ہماری قسمت ہے۔ ہر آدمی کا ستارہ ہوتا ہے اور وہ ستارہ اسکی قسمت ہے۔ منحوس یا نیک۔

لیکن اسے اس جواب سے تشفی نہ ہوتی۔ وہ اپنی بیوی کو اور لپٹا لیتا اور سوچنے لگتا۔

وہ دونوں دیر تک اس طرح اس تاریک اور متعفن کمرے میں بیٹھے رہتے۔ مسٹروینہ سوائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے کچھ نہ کہتی اور اس موقع پر اسے وہ چوٹیں یاد آتیں جو اس کے شوہر نے بلاقصور اسے پہنچائی ہیں۔ اور پھر اس کے آنسو نکل آتے۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ لفظ شکایت کا بھی اس کے منہ سے نکل جاتا اور اورلوف اسوقت بہت متاثر ہوتا۔ اور اسے زیادہ پیار کرنے لگتا۔ اس کی تسکین اور دلاسے سے پر مسٹروینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور اورلوف بگڑ جاتا۔

چل اب بسورنا بند کر۔ نہیں تو میں تجھے پھر پیٹ کر رکھ دوں گا۔ چاہے مجھے پچھتا کر جان بھی دے دینا پڑے۔ سن لیا اچھا اب چپ ہو جا۔ عورت کو انگلی پکڑاؤ۔ اور وہ فوراً گردن ناپنے لگتی ہے۔ یہ رونا دھونا بند کر۔ ایک زندگی سے عاجز مرد کو اس طرح تسکین دیا کرتی ہے۔

کبھی کبھی جب وہ ہوش میں ہوتا تو ایسے موقعوں پر اسے سمجھانے کی بھی کوشش کرتا۔

میرے جیسے آدمی کس کے کام کے! میں نے تمہیں ہمیشہ دکھ دیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے ہمیشہ تم کو اپنا سمجھا۔ ہاں کبھی کبھی مجھ پر خود فراموشی کا دورہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ اور پھر بھی تجھے بھی ایک نظر برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کا بھی کبھی تم نے خیال کیا ہے۔ میں نے تم سے بہت زیادہ محبت کی ہے اور اب جیسے میرا جی بھر گیا ہے۔ اور پھر مجھ پر جنون کا دورہ پڑتا ہے اور میں چاہتا ہوں۔ تمہارے سے بلکہ اپنے بھی ٹکڑے کر ڈالوں۔

اگرچہ وہ اس کی پوری بات نہ سمجھ پاتی۔ لیکن پھر بھی اسکی اس طرح کی گفتگو سے وہ بہت متاثر ہوتی اور اسے کچھ تسکین بھی حاصل ہوتی۔

خدا نے چاہا تو یہ مشکلیں سب دور ہو جائیں گی۔ اور ہم ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ وہ شاید کبھی جانتی نہ تھی کہ وہ دونوں نہ جانے کب کے ایکدوسرے سے بہت زیادہ قریب ہو چکے ہیں۔ اتنے قریب کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کھا ڈالا ہے۔

"اگر ہمارے ایک بچہ ہوتا" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔ "تو ہمارے لئے ایک دل بہلاوا ہو جاتا۔"

"تو پھر کیوں نہیں ایک بچہ پیدا کر لیتی۔"

"لیکن میرا حمل رک کب سکتا ہے۔ تم تو اس بیدردی اور بے ڈھب طرح سے مجھے مارتے ہو کہ حمل قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ تم پیٹ پیٹ کسی عقیدہ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اور گھونسے لگنے کی اور بات ہے لیکن تم تو لاتیں بھی بہت بے احتیاطی سے مارتے ہو۔"

"ہوں۔ تو کوئی ایسا بھی ہے جو غصے میں احتیاط کے ساتھ مارپیٹ کرتا ہو۔ میں مکار نہیں ہوں۔ مارتا ہوں تو مارتا ہوں اور وہ بھی اپنی مسرت کے لئے نہیں بلکہ میری بے بسی و بیچارگی مجھے مارپیٹ پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"یہ بے بسی کہاں سے آتی ہے۔ تمہاری بے بسی؟"

"یہ میری قسمت ہے مسٹروینہ۔ گریگوری فلسفیانہ انداز میں کہتا یہ میری قسمت ہے اور میری فطرت۔ مجھے دیکھو۔ کیا میں دوسروں سے الگ لگتا ہوں۔ لیو چیکو کو ہی دیکھو۔ وہ اکیلا ہے۔ نہ اسکے بیوی ہے اور نہ اور کوئی۔ اگر میری بیوی نہ ہو تو میں مر جاؤں لیکن وہ کمبخت پھر بھی ہر وقت خوش رہتا ہے اور مگن اپنا پائپ پیا کرتا ہے۔ اسے یہی ناز ہے کہ اس کے پاس ایک پائپ تو ہے۔ لیکن مجھ سے یہ کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے بالکل سکون نہیں۔ میری آتما معلوم نہیں کتنی بھوکی ہے۔ شاید اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے گا میں

کو ایک بیہودہ سی دعوت سمجھتا ہوں۔ جیسے ہوا کی ایک جنبش محسوس نہیں ہوتی۔ دن بھر گھر میں رہتا ہوں۔ شام کو بازار جاتا ہوں۔ وہاں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں۔ میں انہیں دیکھتا اور پھر گھر چلا آتا ہوں تنہا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز میری اپنی نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اور میں آپے میں نہیں رہ پاتا۔ لیکن لیوچیکو اسکو جیسے کوئی پرواہ ہی نہیں۔ مجھے تو اسکا سکون دیکھ کر بھی غصہ چڑھ جاتا ہے مردہ دل جیسے کسی چیز کی چاہت ہی نہیں۔ اس کا کام بغیر کسی چیز کے چل رہا ہے۔ اور میں ہوں کہ مجھے ہر چیز چاہئیے۔ ایک چیز کی کمی بھی مجھے پاگل بنا دینے کو کافی ہے لیکن میرے لئے صرف یہ ایک تاریک کمرہ ہے۔ اور کوئی بھی چیز میری نہیں ہے۔ تم اپنے ہی کو لو۔ تم میری بیوی ہو۔ لیکن اس سے کیا ہوا۔ تم صرف ایک عورت ہو جیسی کوئی دوسری عورت۔ اور پھر میں تم کو بالکل جان گیا ہوں۔ سر سے پیر تک۔ اب تم میں کوئی ایسی چیز نہیں رہ گئی۔ جسے اور جانا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے اب تم رو دو گی تو تمہارا منہ کیسا بنے گا۔ کل غصہ ہوگی تو کیسی شکل ہوگی اور اگلے دن اگر چیخو گی تو کیسی آواز آئے کیونکہ میں لاکھوں بار دیکھ چکا۔ ہزاروں بار سنتے اور ہمیشہ دیکھتے سن چکا ہوں وہ شکلیں اور آوازیں میرے آنکھ کان میں رچ بس گئی ہیں اب یہ میرے لئے نئی کیا لا سکیں گی۔ کچھ بھی نہیں۔ اور اسی لئے میں شراب خانے چلا جاتا ہوں۔ وہاں کچھ تسکین ہو جاتی ہے

"پھر تم نے شادی کیوں کی؟" مٹرونہ نے پوچھا۔

گرگوری ہنسا۔

"خدا جانے کیوں! اور سچ پوچھو تو مجھے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مجھے تو خانہ بدوش ہونا چاہئے تھا۔ شاید اس سے مجھے فاقے کرنے پڑتے۔ لیکن کم از کم میں آزاد تو ہوتا جہاں چاہتا چلا جاتا۔ اور اس طرح تمام دنیا کے چکر لگاتا۔"

"تم اب بھی جا سکتے ہو۔ مجھے آزاد کر دو۔" مٹرونہ نے رہانسی آواز میں کہا۔

"تمہیں؟ اچھا تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" گرگوری نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"جہاں میری مرضی۔"

"بتا کہاں؟" اسکی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔

"چلاؤ مت۔ تم اس طرح مجھے دھمکا نہیں سکتے۔"

"اچھا تو تو نے کسی اور کو دیکھ لیا ہے۔ بتا وہ کون ہے؟ جلد بتا۔"

"بس مجھے جانے دے۔"

"کہاں جانے دوں؟" گرگوری گرجا۔ اور پھر اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ گرگوری کے غصے نے مٹرونہ کو بھی تاؤ دلا دیا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اسکی تسکین کرتی وہ اسے معنی خیز نظروں سے اسکی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ گرگوری اب غصے کی تاب نہ لا سکا۔ اور اسے بری طرح مارنے لگا۔

رات کو جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی کراہ رہی تھی۔ اس کے تمام بدن پر نیل پڑ گئے تھے۔ اور کہیں کہیں زخم پھوٹ گیا تھا۔ تو گرگوری نے اسکی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔ اسکا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ پھر اسکی جلن بے وجہ تھی۔

"اچھا تو بھی اب سن جا۔ میں مانتا ہوں کہ میرا قصور تھا۔ پھر تو نے بھی تو کچھ جواب نہ دیا۔ بلاوجہ مجھے بھڑکا دیا۔ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟"

اسنے کوئی جواب نہ دیا اسے معلوم تھا کہ مار پیٹ کرنے کے بعد اسے ہوش آجاتا ہے اور وہ پھر اسے منانے کی کوشش کرتا اور پھر وہ مجسم محبت بن جاتا اور اس کی محبت کے لطف تصور ہی سے اسکی آنکھیں بھر آتیں۔ "آجا۔ پیاری مٹرونہ اب آجا۔ میری پیاری۔ میری لڑکی۔ اب نہ رو۔ مجھے معاف کر دے۔ میری جان۔" وہ اس کے بالوں کا بوسہ لیتا۔ اور اسے خوب پیار کرتا۔

ان کے گھر کی کھڑکی اگرچہ کھلی تھی۔ لیکن وہاں سے آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ بیچ میں ایک دیوار حائل تھی۔ اور ان کے کمرہ میں بدبو، حبس اور اندھیرا تھا۔

"آخر یہ کیا زندگی ہے۔ کتے کی زندگی۔" کہہ کر گرگوری نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور وہ اپنے درد کے اظہار کے لئے الفاظ ہی نہ پاتا تھا۔ "یہ سب اس مردار کال کوٹھڑی کی بدولت ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہم یہاں جیتے جی دفن کر دیئے گئے ہیں۔"

"تو پھر کہیں اور جگہ کیوں نہ چلے چلیں؟" مٹرونہ نے اسکا مطلب

نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اگر ہم محل میں بھی چلے جائیں تو وہ ہمارے لئے کال کوٹھڑی ہوگا۔ یہ کمرہ نہیں کال کوٹھڑی بلکہ یہ ہماری زندگی ہے جو ہر چیز کو کال کوٹھڑی بنائے ہوئے ہے۔"

مسز رونہ تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "اگر خدا نے چاہا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

"دن پھرنے کی بات تم روز کہا کرتی ہو لیکن دن تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری لڑائیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔"

اسکی یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ اب انہیں جلد جلد جھگڑا ہونے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو سوائے سنیچر کے ایسا اتفاق کم ہوتا تھا

"سنیچر آج ہے۔ اب خانے میں جاکر خوب شراب پیوں گا۔ یعنی شراب اتنی شراب کہ پھر مجھے کسی چیز کی ہوش نہ رہے۔"

مسز رونہ کی بھویں سکڑ گئیں۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم ہرگز نہ بولنا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ خاموشی ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اور بودن نے دن میں کئی بار اپنے ارادے کو بیان کیا جیسے جیسے شام ہوتی جاتی تھی۔ اس کے خیالات کا زور بڑھتا رہا تھا۔ اسے بار بار یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ سے مسز رونہ کے دل پر چوٹ پڑتی تھی۔ اور اس کے دل کو اس سے ایک طرح کی راحت سی پہنچتی تھی۔ لیکن ایسے موقع پر اسے مسز رونہ کی خاموشی بہت کھلتی تھی۔ اور وہ کمرے میں ادھر ادھر پھرا کرتا تھا۔ اسکا سکون اس سے چھنتے تو اور بڑھتا رہا تھا۔

اور پھر شام کو سنیچر نے بات کے جھگڑے کا اعلان کر ہی دیا۔

جب بھی اودیودن اپنی بیوی کو مارتا۔ اس دن وہ تمام رات واپس نہ آتا۔ اور کبھی کبھی تو وہ اتوار کو بھی واپس نہ لوٹتا۔ نوکروں سے پتہ۔ مسز رونہ پڑی اپنے شوہر کا انتظار کرتی۔ اسکا شوہر جب آتا تو اسکی حالت بہت ہی خستہ ہوتی۔ لیکن وہ خاموش رہتی۔ پر اسکا دل ہمدردی سے بھر جاتا۔ آخر یہ اسکا شوہر ہی ہے۔ جو لوٹ کر ہر حالت میں اسی کے پاس آتا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ اب اسکا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ اور اسے خمار کی تکلیف ہوگی۔ اس خیال سے وہ تھوڑی سی شراب اس کے لئے اپنے پاس رکھتی۔ اور لوٹ کو بھی اسکا علم تھا۔

"مجھے کچھ دے۔" اور پھر دو تین گلاس پی کر وہ کام پر بیٹھ جاتا۔

تمام دن وہ اپنے ضمیر کی سرزنش برداشت کرتا۔ اور اکثر جب یہ تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی تو وہ کام سامنے چھوڑ دیتا۔ اور اول تول بکنے لگتا۔ اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ یا جاکر بستر پر پڑا رہتا۔ مسز رونہ انتظار کرتی کہ وہ قابو میں آئے اور پھر دونوں میں صلح ہو جاتی۔

شادی کے تجزیہ کے دنوں میں جنگ کے بعد صلح کے لمحات ایک خاص مسرت لاتے جنہیں درد اور مٹھاس دونوں ہی ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ زندگی کی مجبوریاں غالب آگئیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اب وہ دونوں ایکدوسرے سے بغیر بولے گزارہ نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اور اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ہفتہ تک ایکدوسرے سے نہ بولیں۔

"تم ایک دن شراب پیتے پیتے مر جاؤ گے۔" مسز رونہ آہ بھر کر کہتی

ہاں۔ اور لوٹ تائید کرتا۔ اور پھر ایک عجیب استغنا کے ساتھ تھوکتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے جینے اور مرنے کی پروا نہیں۔ اور پھر تم مجھے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ گی۔ اور لوٹ اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہتا۔

وہ اپنی نظریں جھکا لیتی۔ اور وہ اتنی حیا پہلے نہ کرتی تھی اور لوٹ اسے دیکھ کر بھویں سکوڑ لیتا اور دانت بھینچ لیتا۔ مسز رونہ اپنے شوہر کو بلا بتائے بہت سے جوتشیوں اور پیروں کے پاس گئی۔ کتنے ہی جڑی بوٹیاں اور تعویذیں لاتی۔ بزرگوں کے مزاروں پر گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ ایسے بزرگوں جنہوں نے ہزاروں کی بگڑی کو آن واحد میں ولی کر دیا تھا۔

لیکن اسکی دعائیں بے اثر رہیں۔ اور پھر اس کے بیچ بیچ میں اس خرابی سے گھن آنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اسکا دل اور لوٹ کی طرف سے سخت ہوتا گیا۔ حالانکہ یہ وہی آدمی تھا جس نے تین سال پہلے اپنی نرم و نازک بات اور ہنس مکھ پن سے اس کے دل کو جیت لیا۔ اور اس کے دل میں ہزاروں نئی نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں

اس طرح سے یہ دو طالب علم جن میں کوئی بھی دل کا بُرا نہ تھا، آہستہ آہستہ ایک ایسی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو جس وقت کہ یہ میاں بیوی ناشتہ کر رہے تھے کہ ایک پولیس مین دن کے تاریک کمرے کے دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ دیکھتے ہی اورلوف گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سوچنے لگا کہ ادھر اس سے کونسی غلطی ہوئی۔

"ادھر آئیے۔ اس طرف"۔ پولیس مین نے کسی اور سے کہا۔

آپ کا کمرہ کال کوٹھری کی طرح تاریک ہے۔ خدا اس سینٹ پیٹرزبرگ سے بچائے۔ کسی نوجوان کی آواز کھنچے سنائی دی۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ نوجوان کمرے میں تھا۔ وہ یونیورسٹی کے لڑکوں کی سفید یونیفارم پہنے تھا۔ وہ ٹوپی اتارے اپنے ہاتھ میں لئے تھا۔ اس کے بال تراشے ہوئے تھے۔ اسکا چہرہ مسکراتا ہوا تھا۔ اور وہ عینک لگائے تھا۔

گڈ مارننگ۔ اس نے کہا۔ میں سینیٹری انسپکٹر ہوں۔ اور یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ لوگوں کے گھروں میں کیسی صفائی ہے۔ اصطبل کی ہوا کثیف ہے بہت ہی کثیف

اورلوف کی جان میں جان آئی اور اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ اورلوف کو یہ نوجوان پہلے ہی نظر میں بھا گیا اس کے چہرے کی سرخی اور اسکا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے نیک اور شریف ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ اور اسکی مسکراہٹ اورلوف کے اس تاریک کمرہ کو بھی روشن کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

اچھا جناب اسے لیکچر کے کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو اب یہ کوڑا باہر پھینکا کریں۔ کیونکہ سب سے زیادہ بو کا باعث تو یہی کوڑا اور اسکی سڑاند ہوتی ہے۔ اور میں اب سے یہ بھی عرض کردوں گا کہ یہ برتن مانجھنے کی جگہ بھی ذرا صاف کرلیا کریں۔ اور ہاں بھئی تم منہ کیوں لٹکائے ہو۔ اس نے اورلوف کا ہاتھ پکڑتے اور اسکی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکے کی تیز کلامی اور بے تکلفی نے دونوں کے منہ بند کردیئے۔ مشرونہ تو اسے دیکھ دیکھ کر صرف مسکرا رہی تھی۔ اور خاموش تھی۔ لیکن اورلوف کی مسکراہٹ میں کچھ گھبراہٹ بھی معلوم ہوتی تھی۔

تمہارے پیٹ کا کیا حال ہے۔ پاخانہ وغیرہ ٹھیک ہوتا ہے۔ اس طالب علم نے پوچھا گھبراؤ نہیں۔ ہمارے سب کے پیٹ ہیں۔ ہاں اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو فوراً کہہ دو۔ میں دوا دیدونگا۔

ہم ٹھیک ہیں۔ اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ گریگوری نے مسکرا کر جواب دیا۔ اچھا یہ ستایا چہرہ ——— ہو۔ ارے یہ کچھ نہیں ہے اور اگر سچ پوچھئے تو یہ کل کی شراب کا خمار ہے۔

ٹھیک۔ ٹھیک۔ میری ناک بھی بتا رہی ہے کہ کل آپ نے کچھ تھوڑی سی چکھی ہے۔

اس نے کچھ اس مضحکہ خیز ڈھنگ سے کہا۔ کہ گریگوری کھلکھلا پڑا مشرونہ بھی ساتھ ہی ہنس پڑی۔ لیکن اس نے ایپرن سے اپنا منہ ڈھک لیا۔ اور طالب علم نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔ لیکن وہ سب سے پہلے قابو میں بھی آیا۔ اور جیسے قہقہے کی تسکین اور اثرات اس کے چہرے سے ختم ہونے اور وہ سنجیدہ معلوم ہونے لگا۔

ٹھیک ہے مزدور کو پینا بھی چاہیئے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کب بس کرے۔ لیکن بھئی زمانہ وہ آ لگا ہے کہ اگر انسان پرہیز کرے تو بہتر ہی ہے۔ کیا آپ لوگوں نے پھیلی ہوئی وبا کے بارے میں بھی کچھ سُنا ہے۔

پھر اس نے بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر آسان طریقے سے ہیضہ اور اس سے بچاؤ کی ترکیبیں بتانا شروع کر دیں۔ اور باتیں کرتے کرتے وہ کمرے کی دیوار کے سہارے اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں ہاتھ منہ دھونے کی نشست رکھی تھی۔ اور جہاں برتن دھوئے جاتے تھے۔ اس نے کچھ کر کے اس جگہ کو سونگھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے بیان میں اور روانی پیدا ہوتی گئی۔ جو اسکی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں آپ ہی آپ اترتی جاتی تھیں گویا جیسے اپنے مقصد اور خلوص پر بہت زیادہ بھروسہ ہو۔

گریگوری بہت حیرت سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مشرونہ کے منہ سے کوئی صاف آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پولیس مین وہاں سے کھسک چکا تھا۔

اب آپ لوگ آج ہی سے اپنے گھر کی صفائی شروع کر دیں۔ پڑوس میں ایک مکان بن رہا ہے۔ اور وہاں سے پانچ لوگ

کوپیک میں آپ جتنا چاہیں مجھ کو خرید سکتے ہیں۔ اور بہتر ہو کہ آپ شراب چھوڑ دیں۔ اچھا چلے۔ گڈ بائی۔ پھر ملیں گے۔

جیسے وہ آیا تھا ویسے ہی وہ یکبارگی غائب ہوگیا۔ لیکن اُسکا مسکراتا ہوا چہرہ۔ میٹھی باتیں ابھی میاں بیوی کے نظروں میں پھر رہا تھا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اور اپنے تاریک کمرہ میں اس طرح کے انسان کے آنے نے انہیں سخت متحیر کر جاتا

ایک لمبی ہوں کے ساتھ گریگوری نے کہنا شروع کیا۔ یہ تھا تمہارا سینیٹری انسپکٹر۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو زہر دیتے ہیں۔ ایسی شکل کا انسان کس کو زہر دے سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اس کی باتیں کتنی دل نشین تھیں۔ اور وہ کتنی صاف گفتگو کرتا تھا۔ اُس نے کتنی سادگی اور صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ میں سینیٹری انسپکٹر ہوں۔ اور پھر اُس نے چونے کو کہا تھا۔ کیا چونا بھی کبھی زہر ہوا ہے اور سٹرک ایسڈ۔ یہ کیا ہے۔ شاید معمولی تیزاب۔ لیکن سب سے اہم بات تو صفائی ہے۔ صاف فرش۔ صاف برتن اور صاف برتن مانجنے کی جگہ اور صاف نالیاں۔ یہ لوگوں کو زہر دیں گے! اِخ۔ کیا خوب آدمی تھا۔ مٹروِنہ تم نے سنا تھا کہ اُس نے کہا تھا کہ ایک مزدور کو شراب ضرور پینی چاہیئے۔ لیکن اُسے معلوم ہو کہ کب بس کرنا چاہیئے۔ اچھا مٹروِنہ تو پھر تم مجھے ایک گلاس دے دو نا۔ کچھ رکھے ہو؟

اور پھر مٹروِنہ کہیں سے ایک بوتل نکال لائی۔ اور اُسکا آدھا گلاس بھر دیا۔

وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ ہر ایک کو بھلا لگنے والا۔ مٹروِنہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسکی نظروں کے سامنے اس طالب علم کا چہرہ گھوم گیا۔ ہاں یہ جو زہر کی بات تھی۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کچھ لوگ اس کے لئے نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔

نوکر رکھ لئے گئے ہوں۔ گریگوری نے بات کاٹی۔ کس لئے! آخر انہیں کیوں کوئی رکھے گا۔

لوگوں کو مارنے کے لئے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور انہیں کم کر دینے کا حکم ہو چکا ہے۔ مٹروِنہ نے تشریح کی۔

کون کہتا ہے؟

سب ہی لوگ۔ انہیں رنگ سازوں کی بادرچن بھی اُس دن کہہ رہی تھی۔ اور سب ہی لوگ کہتے ہیں۔

سب گدھے ہیں۔ اس سے کسی کو کیا نفع ہوگا۔ تم خود ہی سوچو کہ تیاری میں کتنی الجھن اور کتنا خرچ ہوتا ہے۔ اور پھر دفنانا۔ قبر۔ کفن اور معلوم نہیں کتنے خرچ بڑھ جائیں گے۔ اور یہ سب خرچ گورنمنٹ کیوں بلا وجہ اپنے سر مول لے۔ اگر وہ ان سے نجات ہی پانا چاہتی ہے تو پھر سب کو سائبیریا بھیج دے۔ جہاں ایسے ایسے کروڑوں آدمی ایک کونے میں آ سکتے ہیں اور پھر وہاں بھیجنے پر گورنمنٹ کو نفع ہی نفع ہے۔ مار کر دفن کر دینے میں تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اور گورنمنٹ تو ہمیشہ منافع چاہتی ہے کیا وہ کبھی اپنے لئے گھاٹا چاہے گی۔ اب اسی طالب علم کو لے لو۔ کیا کوئی اسے مارنے کے لئے نوکر رکھے گا۔ اس کی شکل ہی مارنے والوں کی سی نہیں۔ وہ کیا کسی کو مارے گا۔ ہاں وہ ہماری حالتوں میں انقلاب ضرور چاہتا ہے۔

اس دن تمام وقت اسی طالب علم کے متعلق باتیں کرتے رہے اسکی ہنسی۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ۔ اسکا مسکراتا چہرہ۔ اسکا لباس وغیرہ۔ بلکہ ایک بار تو میاں بیوی اس بات پر جھگڑ پڑے اسکے کوٹ کا جو بٹن ٹوٹا تھا وہ کس طرف کا تھا۔ مٹروِنہ کہتی تھی کہ وہ داہنی طرف کا تھا۔ لیکن اولوف اصرار کرتا کہ نہیں وہ بائیں جانب کا بٹن ٹوٹا تھا۔ اور غصہ میں آ کر اُس نے مٹروِنہ کو تین چار صلواتیں سُنا دیں۔ لیکن پھر اسے فوراً یاد آ گیا کہ مٹروِنہ نے ابھی بوتل میں تھوڑی سی شراب بچا رکھی ہے۔ اس لئے وہ اسکی بات مان گیا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ کل وہ تمام فرش وغیرہ صاف کر ڈالیں گے اور اس کے بعد وہ پھر تا نہ جوش و خروش کے ساتھ اس طالب علم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

کمبخت۔ ہم سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ جیسے ہم سے اسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ہر جگہ اپنی ٹانگ پھنسا رہا تھا اور پھر لکچر دے کر چلتا بنا۔ نہ کوئی غرور۔ نہ غل۔ نہ کوئی دھونس۔ وہ آیا اور کہہ کر چل دیا۔ مٹروِنہ میں کہتا ہوں کہ یہ سب گدھے ہیں۔ یہ سینیٹری انسپکٹر تو ہماری جان کی حفاظت کے لئے آیا تھا۔ اور یہ زہر دہر

کی بات مجھ کو اس ہے۔ ہمارے پیٹ کا بھی حال تو اس نے پوچھا۔ اور پھر کس اچھی طرح سے اس نے جراثیم کے بارے میں بتایا کہ نام بتایا تھا اس نے مٹروفنہ۔ خیر جانے دو۔ لیکن یہ بات تو اس نے صرف ڈرانے کو کہی تھی کہ ہم مکان و فرش صاف رکھیں۔

کون جانے۔ ہو سکتا ہے اس نے جو کچھ کہا ہو سچ ہی ہو۔ آخر مشینوں ہی کیڑے تو پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اس نے ان کیڑوں کا نام کیا بتایا تھا۔ ہولی ڈگ۔ نہیں نہیں۔ ارے نام تو میرے دل میں ہے لیکن زبان پر نہیں آرہا ہے۔

سوتے سوتے بھی وہ اسی کی باتیں کرتے۔ انہیں آج بچوں کی طرح سے مسرت حاصل تھی۔ بلکہ وہ نیند میں بھی سب بڑبڑا رہے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی انہیں رنگ سازوں کی باورچن نے آ جگایا۔ اسکا چہرہ آج کچھ اترا ہوا تھا۔

اٹھنے کا وقت ہو گیا۔ ہمارے گھر میں تو ہیضہ آگیا خدائی لعنت۔ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

"ارے کیا پاگل ہوئی ہے!" گریگوری نے کہا۔

"میں تو کل نشست بھی صاف کرنا بھول گئی تھی" مٹروفنہ نے نادم ہوتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں تو نوکری چھوڑ رہی ہوں اور اپنے گاؤں چلی جاؤں گی"۔ باورچن نے کہا۔

"کس کو ہیضہ ہو گیا"۔ گریگوری نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"باجے والے کو" "رات کے وقت اسے ہیضہ ہوا۔ بہت تکلیف ہے اور دست و قے ایک منٹ بھی بند نہیں ہوتے"

"باجے والا"۔ جیسے گریگوری کو یقین نہ آرہا ہو کتنا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ابھی تو کل ہی کیسا ہنس ہنس کر بول رہا تھا۔ میں تو اسے دیکھنے جا رہا ہوں"۔ گریگوری نے زور سے کہا۔

"نہیں گریگوری نہیں۔ یہ چھوت کی بیماری ہے" دونوں عورتیں بیک وقت چلائیں۔

"خدا خیر کرے۔ ایسی بات نہ سوچو۔"

"چپ" گریگوری نے جوتے پہنتے ہوئے کہا اور بغیر کنگھا کئے اور قمیص کا بٹن لگاتے وہ باہر جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اسکی بیوی نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اورلوف نے اسکی انگلیوں کی تھرتھراہٹ محسوس کی۔ اور پھر معلوم نہیں کیوں اسے غصہ آگیا۔

"ہٹ! نہیں تو تیرا سر توڑ دوں گا"۔ وہ چلایا اور اس کے سینے پر دھکا دے دیا۔

احاطے میں بالکل سناٹا تھا اور ایک عجیب سی خاموشی چھائی تھی۔ اورلوف کے دل پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ اور وہ آپ ہی آپ کچھ کانپنے لگا اور اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر کوئی اور اسے نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن یہ خیال کہ وہی اکیلا ہے جو بیمار پچی کو جا رہا ہے اسے کچھ ہمت ہوئی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ ایک دوسری اسے مریض کو دیکھنے جاتے دیکھ رہا ہے تو اسے ایک عجیب طرح کا فخر محسوس ہوا۔ پھر وہ سیٹی بجانے لگا اور سر کو غرور سے اٹھا لیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور جب دروازے کو سیتکا چیرک نے کھولا تو اسکا منہ تک گیا کہ وہ پہلا شخص نہیں جس نے اس خطرے کو کمزور سمجھا۔

گریگوری چچا وہ تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔

کمرے سے بو کا ایک بھبکا آیا۔ گریگوری ابھی باہر کھڑا سیتکا کی باتیں سن رہا تھا۔ اور دروازے ہی سے مریض کی حالت دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا اسے ایک گلاس پانی پلا دوں گریگوری چچا!" سیتکا نے یکبارگی پوچھا۔

دونوں کے چہروں پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

"لاؤ تھوڑا پانی لے آؤ!" گریگوری نے کہا اور ہمت کر کے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ لیکن کمرے میں جاتے ہی اس کے قدم جیسے رک گئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اسے پیچھے دھکیل رہا ہو۔ اس نے دیکھا کہ کسلیاکوف دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے پیٹ کے بل میز پر پڑا ہے۔ اور پیر گیلے فرش پر بار بار پٹک رہا ہے۔

"بھئی کون آیا!" اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

گریگوری ہمت کر کے اسکی طرف بڑھا۔ بلکہ اسے خوش کرنے کی نیت سے کہا: "میں ہوں گریگوری اورلوف۔ کیوں کیا رات زیادہ کھا گئے تھے۔ اتنا نہ کھاؤ کہ جو منہ پھر جائے۔"

لیکن یکبارگی جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ کسلیاکوف اسے پہچان بھی نہیں رہا ہے۔

کسیاکوف کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ گال کی ہڈیاں عجیب بھیانک طور سے نکل آئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے سے موت کی علامات اور موت کا خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ صرف جبڑوں کی حرکت سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ابھی اس میں کچھ جان ہے۔ کسیاکوف اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گریگوری کو گھور رہا تھا۔ یک بارگی گریگوری کے دل پر ایک خوف طاری ہوا اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی سرد سرد ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اور اس کمرے میں جہاں ہمیشہ نغمہ و سرود اور چہل پہل رہتی تھی اسوقت موت کے خوفناک طرح بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ گریگوری چاہتا تھا کہ کس طرح سے وہ اس کمرے سے نکل بھاگے۔ لیکن اس کے قدم منوں من کے ہو رہے تھے۔

"اچھا!" گریگوری نے رخصت ہونے کے انداز سے کہا۔

کسیاکوف کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور اسکے ہونٹوں کے کناروں پر سیاہ کف جم گیا۔ اور ایک بے آواز کی آواز میں اس نے کہا۔

"میں مر رہا ہوں!"

یہ تین لفظ گریگوری کے دل و دماغ پر ایک گھونسہ تھے۔ اور پھر وہ بیوقوفوں کی طرح سے مسکرایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا لیکن اسی وقت سینکا پسینہ میں شرابور ہانپتا کانپتا پانی کا گھڑا لئے ہوئے آ موجود ہوا۔

"سپرنٹنڈنٹ کے کنوئیں سے پانی لایا ہوں۔ سؤر کے بچے مجھے پانی ہی نہیں بھرنے دیتے تھے۔" کہتے کہتے سینکا کونے سے گلاس اٹھا کر لایا۔ اور کہتا جاتا تھا کہ وہ لوگ کہنے لگے "اچھا تم لوگوں کو میٹھا ہوا ہے، ہیضہ نے جا دبایا"۔ "تو پھر تم کو کیا! کم بختو وہ تم کو بھی ہوگا اور کوئی بھی نہ بچے گا۔" حرامزادوں نے پھر مجھے مارا۔

گریگوری نے گلاس بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس پی گیا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک کسیاکوف کی آواز "میں مر رہا ہوں" گونج رہی تھی۔

"پانی!" کسیاکوف نے کہا۔

سینکا نے لپک کر گلاس اس کے بے رنگ ہونٹوں سے لگا دیا۔ گریگوری کا دیدہ کا سہارا [illegible] تھا اور [illegible] کا سا عالم طاری تھا۔ اور اسی حالت میں اس نے سنا کہ سینکا کہہ رہا ہے۔ "حضور ہم ابھی تمہارا لباس بدل کر تمہیں [illegible] لٹائے رہتے ہیں۔" اتنے میں اس نے سنا کہ [illegible] پکانے والی کھڑکی سے جھانک کر کہہ رہی ہے۔ کہ [illegible] اس میں تھوڑی سی ملا دو۔ ایک گلاس رم میں دو چمچے۔

احاطے میں سے کوئی کھڑے کسی نے [illegible] آئل امپیریل رم میں ملا کر دو۔ یک بارگی جیسے گریگوری کو ہوش سا آ گیا اور اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر دوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور احاطے میں سے ہوتا ہوا سڑک پر نکل گیا۔

"ہائے اللہ! اس موچی کو بھی ہیضہ ہو گیا۔ وہ ہسپتال جا رہا ہے۔" کھانا پکانے والی نے اور عورت کو اس طرح ہنستے دیکھ کر مندے انداز میں کہا۔

مسٹرز جو اس کے ہمسایہ کھڑی تھی۔ یکبارگی پیلی پڑ گئی اور اس کی آنکھیں جیسے نکل آئیں۔

"یہ جھوٹ ہے!" اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ "یہ موذی بیماری اسے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ نسے کیسے ہونے دے گا۔"

لیکن کھانا پکانے والی ابھی تک زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک اچھا خاصا مجمع احاطے میں اکٹھا ہو گیا۔ ہر ایک کے چہرے پر حسرت کے یاس اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان میں بعض اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یاس جیسے کسی [illegible] اڑا رہی ہو۔ سینکا بار بار آکر انہیں کسیاکوف کی کیفیت سے مطلع کرتا۔

لوگ سب ایک ہی جگہ جمع ہو کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اور ان کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی یا اللہ پکار اٹھتا تھا۔

"وہ دیکھو ایلاف!"

ایلاف ایک گاڑی میں بیٹھی تھی۔ پیچھے ایک سفید وردی پہنے ہوئے آدمی چلا رہا تھا۔

"بچو! بچو!" گاڑی والے نے چلا کر کہا۔ اور گاڑی کو [illegible] کی طرف بڑھا دیا۔ مجمع پر یکبارگی سکوت طاری ہو گیا۔ اور کچھ لوگ ادھر ادھر

جب گاڑی [illegible] ادولفت کا گھر آیا تھا [illegible] ہو گئے تھے۔ وہیں یہاں سے اس نے پوچھا۔ گریگوری نے اس کو [illegible] سے دیکھا۔ اور اس کی نگاہوں میں کچھ غصہ بھی تھا۔

"آپ سے مطلب؟ آپ نفسیات دان بنتے ہیں۔" کسی نے اس کی سنجیدگی کا مذاق اڑایا۔

"دیکھتے جاؤ۔ یہ تمہیں کیسا بھونڈے ہیں؟" کسی اور صاحب نے بھی پوچھا۔

"یہ ایسا لگتا ہے کہ پرسوار آ جانے کا۔" کسی نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "اس جگہ پہ ایک تجربہ تھا۔ لیکن خوف اور اطمینان کا فرق ظاہر ہے۔"

"لیکن یہ لوگ ہیں بڑے شدید" ایک شخص نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے۔

گریگوری کی طبیعت کچھ بوجھل ٹھہر گئی۔ وہ اسے لئے جا رہے ہیں اس حرامی ادولفت کو دیکھو۔

"ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

"سالہ فراڈی ہے۔"

"ادولف ذرا سنبھلے۔ اسکا پیر اور ذرا اٹھاؤ۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ گاڑی لے چلو۔" طالب علم نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔ ہاں ادولفت اب ہمیں اس جگہ کو صاف کرنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سیکھ جاؤ گے کہ مریضوں کی جگہ کو کیسے صاف کرتے ہیں۔ کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے فخر سے سینہ تانتے ہوئے گریگوری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں بھی مدد کروں گا" سیکا نے کہا۔ وہ مریض کی گاڑی کو سڑک تک پہنچا کر آیا تھا۔

طالب علم نے عینک کے درمیان سے جھانک کر کہا۔ "اور تم کون ہو؟"

"میں، میں تو سیکا ہوں۔ انہیں رنگ سازوں میں سے۔ میں دراصل ان کے پاس ابھی کام سیکھتا ہوں۔" سیکا نے پوری تشریح کی۔

"کیا تم ہیضے سے نہیں ڈرتے؟"

"نہیں نہیں! میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

"اچھا۔ خوب! ان سب کی پہلی بات تو یہ ہے" طالب علم نے وہاں پڑی ہوئی ایک بیرل پر بیٹھ کر بجھتے ہوئے انہیں سمجھایا "کہ تم سب کو پہلے اپنے آپ کو بالکل صاف رکھنا چاہیئے۔"

مطرونہ معمولی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آ کھڑی ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اپنے بچے کپڑوں سے آنکھ پونچھتی ہوئی باورچن آ گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ طالب علم ان کے بیچ میں کھڑا ہو گیا تھا اس نے کہنا شروع کیا۔ "ہیضے سے بچنے کے لئے سب سے ضروری بات صفائی ہے۔ جسم کی صفائی جگہ کی صفائی اور ہوا کی صفائی۔"

"ہیضے سے بچنے کی یہ صورت ہرگز نہیں۔ اگر کوئی صورت ہے تو یہ ہے کہ ہم شبیہ یا خدا سے دعا مانگیں۔ تو وہ ہمیں نجات دلا سکتے ہیں۔" باورچن نے کہا۔ "سینکڑوں آدمی صحت [illegible] بعد صاف ہوا میں سانس لیتے ہیں لیکن مر جاتے ہیں۔" (مجمع سے ایک نے اپنی رائے پیش کی)۔

ادولف اپنی بیوی کے برابر کھڑا تھا۔ اتنے میں سیکا نے اس کی آستین پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اور آہستہ سے اس سے پوچھا۔ کہ "چچا گریگوری۔ کیسیا کوف تو اب مر جائے گا۔ اور اس کے کوئی عزیز بھی نہیں ہے۔ پھر یہ باجا کون لیگا۔"

"چپ شیطان کہیں کا" گریگوری نے جھٹک کر آستین اس کے ہاتھ سے چھڑالی۔

سیکا وہاں سے چلا گیا اور جا کر کسیا کوف کے کمرے میں کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ وہاں اس کی آنکھیں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں۔

"چونا اور تار کول۔" وہ طالب علم زور زور سے گنگنا رہا تھا۔

اُسی ہنگامہ خیز دن کی شام کو جب وہ کھا رہے تھے تو مطرونہ نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"آج تم اس طالب علم کے ساتھ کہاں گئے تھے؟"

گریگوری نے اس کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔

کسیا کوف کے کمرے کو دواؤں وغیرہ سے دھو دھا کر وہ اس طالب علم کے ساتھ چلا گیا تھا۔ لیکن تین بجے کے قریب جب وہ واپس آیا تو وہ کچھ متفکر اور گھبرایا ہوا سا تھا۔ وہاں سے آ کر وہ چپ چاپ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اگرچہ مطرونہ نے اس سے دو ایک بار بات پوچھی لیکن اس نے

کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی عادت کے خلاف اس نے کوئی گالی بھی نہ دی۔ بلکہ صرف چپ چاپ پڑا رہا۔ اس سے مرٹونا کو فکر تھی اور اُسے بات کی کرید لگ گئی تھی۔ چونکہ اُسے شوہر سے ایک خاص لگاؤ تھا اس لئے وہ اس کے رجحانات اور خیالات کے درپے رہا کرتی تھی۔

"کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟"

گرگوری نے اپنی پیالی کا آخری گھونٹ پینے کے بعد ہاتھ سے مونچھ صاف کی۔ اور پھر اطمینان کے ساتھ پیالی کو بیوی کی طرف بڑھایا۔

"میں آج طالب علم کے ساتھ بیرک گیا تھا۔" اس نے اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں؟ ہیضہ بیرک۔ کیا بہت لوگ بیمار ہیں؟" مرٹونا نے پوچھا۔

"کسلیا کورٹ کو لے کر ۳۰ آدمی ہیں۔ کچھ اچھے بھی ہو رہے ہیں۔"

"ہیضہ سے اچھے ہو رہے ہیں۔ ناممکن۔ ہوسکتا ہے انہیں کوئی اور بیماری ہو اور بات بنانے کو اُسے ہیضہ بتا دیا ہو۔ کہ لوگ اُن کی دوا کے قائل ہو جائیں۔"

"تم بے وقوف ہو اور اس احاطے والے سب کے سب پاگل ہیں۔" گرگوری نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "ایک سے ایک بڑا جاہل ہے۔ تم لوگوں کی تو صحبت بھی ہیضہ سے زیادہ مضر ہے۔ ہر ایک کوڑھ مغز ہے۔ کوڑھ مغز۔ کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی۔" کہتے کہتے اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اُسے بھرا اور بالکل خاموش ہو گیا۔

"تم آج کہاں سے علامہ کی ڈگری لے کر آئے ہو۔" مرٹونا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

گرگوری نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ مرٹونا کو دوبارہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ کمرے میں لالٹین اور احاطے کے دوسرے کونے کی ملی جلی آوازیں رہی تھی — میاں بیوی خاموشی سے بیٹھے بیٹھے اپنے حصہ کی چائے پی رہے تھے۔ مرٹونا کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ اور گرگوری بیٹھا انگلیوں سے میز بجاتا رہا۔

"تم نے کوئی چیز بھی اسقدر صاف شفاف نہ دیکھی ہوگی۔" اس نے اچانک کہنا شروع کیا۔ "ہر آدمی بالکل دودھ جیسے سفید کپڑوں میں ملبوس ہے مریضوں کو ہر گھڑی نہلایا جاتا ہے۔ انہیں بہترین غذائیں دی جاتی ہیں۔ آدھے ڈھائی ڈھائی گوٹل کو رم کی ملتی ہے۔ تیمارداری تو اس طرح سے ہوتی ہے کہ مادری شفقت بھی اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پتہ نہیں یہ کونسا مذاق ہے کہ انسان کی تمام زندگی میں تو اسکا پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب موت کا پیغام آنے لگتا ہے تو اسکی اس طرح خبر گیری کی جاتی ہے کہ اسے دنیا کی تمام آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر وہ یہی آسانیاں زندگی اور تندرستی کے ایام میں بہم پہنچائیں تو زندگی کسقدر آسودہ ہو جائے۔ اس حالت میں اتنا روپیہ اور محنت برباد کرنے میں کونسی عقلمندی ہے۔ یہ خرافات کرکے۔ ہم کہتے ہیں ڈھائی ڈھائی بوتلیں روز یونہی ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہی آسانیاں وہ تندرستی کے دنوں میں مہیا کریں۔ تو کتنا اچھا ہو۔ خواہ سال میں دو ہی مہیا ہوں۔"

مرٹونا اسکی باتیں سن رہی تھی۔ لیکن وہ انہیں سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کر رہی تھی۔ مرٹونا اس سے سوال کرنا ہمیشہ خطرناک سمجھتی تھی۔ کیونکہ وہ الٹا ہمیشہ اسکے سوالوں سے الجھ جاتا تھا۔ لیکن آخر اُس سے نہ رہا گیا اور وہ بول اٹھی۔

"شاید وہ لوگ اس بات کو تم سے بہتر سمجھتے ہوں۔" مرٹونا نے شوہر کو رکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

گرگوری نے اپنے شانوں کو ایک بے نیازانہ شان کے ساتھ جنبش دی۔ اور مرٹونا پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"خیر یہ ان کا اپنا کام ہے۔ خواہ وہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ لیکن اگر میں زندگی کے یہ مزے اٹھائے بغیر مر گیا تو مجھے کم از کم یہ حق مزید ہے کہ اس مسئلہ میں اپنی رائے پیش کروں۔ میں کہوں گا کہ میں اپنی موجودہ زندگی سے عاجز آ چکا ہوں اور اب اسکا قطعاً انتظار نہیں کر سکتا۔ کہ مجھے ہیضہ آکر دبا لے اور پھر اس کے بعد آپ لوگ مجھ پر لذیذ طعام کے دریا کریں۔ میں کسی طرح سے اس امید پر نہیں رہ سکتا۔ پوشکن ماموں نے کہا ہے کہ تقدیر کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ ایک طرف تقدیر اور دوسری طرف تم خود پھر دیکھو کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔ یہ جنگ جنگ ہو اور اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہ ہو سمجھیں۔ میں اسپتال میں کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں اپنا سر خنجر کے منہ میں ڈالدوں گا۔ خواہ وہ میرا سر ہی کاٹ ڈالے۔ ہمیں دو بل ہفتہ تنخواہ اور شاید کچھ بونس۔ شاید اس کام میں مجھے جان دینی پڑے۔ لیکن میں اس جگہ پر تو اس سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔" یہ کہہ کر گرگوری نے اتنی زور کا مکا میز پر مارا کہ تمام پرچ پیالیاں اچھل پڑیں۔

شروع تقریر کو تو مرٹونا نے کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن آخر کے جملوں نے اسے چونکا دیا۔ اور اس نے معاندانہ لہجہ میں کہا۔

"اچھا تو اُس بدمعاش نے آپ کی صلاح دی تھی۔" مرٹروڈ نے نکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ تو میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے دوسروں کے مشورہ کی کم ضرورت ہے کہ گریگوری نے بات اٹھائی ہے۔"

"آپ اور گریگوری نے میرے بارے میں تمہیں کیا صلاح دی" مرٹروڈ نے پوچھا۔

"تمہارے بارے میں تو گریگوری کچھ بھی کہہ چکا ہوگا۔ اس نے پہلا جملہ کے بارے میں ایک سوچا ہی نہ تھا اور یہ سوال اُسے بے ڈھب معلوم ہوا۔ وہ اُسے گھر پر چھوڑ سکتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی تو اپنی بیویوں کو گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن مرٹروڈ کو اس طرح سے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اُس نے مرٹروڈ سے کہا تم گھر پر رہو گی اور میں اپنی تنخواہ لاکر تمہیں دیا کروں گا۔

"خوب" مرٹروڈ معنی خیز نظروں سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ گریگوری کو بہت بری معلوم ہوئی۔ اور اس کے شبہات اور شدت پکڑ گئے۔ اور اس کے دل میں رشک کی جلن پیدا ہو گئی۔ گریگوری ان معاملات میں بہت زیادہ ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی خودداری نے اُسے اظہار خیالات سے روک لیا۔

"تم بیٹھی گھر اندر سے سیتی رہنا۔ اور تم کر ہی کیا سکتی ہو۔" اور اس نے کہا اور پھر مرٹروڈ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

مرٹروڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ اسی طرح سے اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"لیکن ہمارا کیا ہوگا" گریگوری نے کہا۔

"یہ کیا؟" مرٹروڈ نے پوچھا۔

"زہریلی ناگن۔ یہ طنز رہنے دے۔ ورنہ میں مزا چکھا دوں گا" گریگوری نے غصہ سے کہا۔ "خواہ میں موت ہی کے منہ میں جانا چاہتا ہوں لیکن تجھے سبق دینا چاہوں گا۔"

"میں تو تمہیں وہاں نہیں بھیج رہی ہوں۔ مت جاؤ۔"

"اچھا کم بخت میں خوب سمجھتا ہوں کہ تیرے دل کی تمنا کیا ہے تو چاہتی ہے کہ میں جہاں جاؤں اور پھر لوٹ کر نہ آؤں۔" وہ زور سے چلایا۔

جواب میں مرٹروڈ بالکل نہ بولی۔ اس نے اور اس کے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کی سب سے بڑی دُہری یہ تھی کہ فوراً ہی اس کے خیال میں ایک چال آ گئی تھی۔

"میں تجھے خوب سمجھتا ہوں۔ تو تو مجھے پھنسا کر بہت ہی خوش ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی ایسا کروں گا کہ تو آپ اپنی چال میں پھنس جائے۔ دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے جھپٹ کر اپنی ٹوپی اٹھائی اور کمرے کے باہر نکل گیا۔ اس کی بیوی اپنی حرکت پر افسوس کرتی رہی۔ کہ اُس نے بے کار اُسے چڑا دیا۔ اور پھر وہ کچھ متفکر بھی ہوئی کہ اب معلوم نہیں وہ کیا کرے۔ اس کی بیوی فکر میں پڑ گئی۔ اور اللہ پر منانے لگی۔

وہ بڑی دیر تک میز پر بیٹھی سوچتی رہی۔ معلوم نہیں اس کا شوہر کیا کرے۔ اور اب کی بار معلوم نہیں اُسے کیا حرکت سوجھی ہو۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی شعاعیں کھڑکی میں گزر کر صاف کے مونے مونے پر پڑ رہی تھیں۔ جس سے اس تہ خانے میں بھی تھوڑی سی روشنی ہو گئی۔ اور مرٹروڈ اس روشن جگہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور برتن وغیرہ اپنی جگہ پر رکھ کر سونے کے لئے اپنے پلنگ پر لیٹ رہی۔

رات گئے گریگوری لوٹا۔ زینوں پر اُس کے قدموں کی آہٹ سن کر مرٹروڈ کو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت خوش ہے۔ وہ اندھیرے کو کوستا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھا اور اس کی بغل میں بیٹھ گیا۔

"اچھا بوجھو؟" گریگوری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا بوجھوں؟"

"تم میرے ساتھ کام کرو گی؟"

"کہاں؟" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اُسی بیرک میں جہاں میں کام کروں گا۔" اور اس نے سینہ تان کر کہا۔

مرٹروڈ نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے اسے لپٹا لیا اور اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ مرٹروڈ نے یہ حرکت کچھ اس بے ساختہ پن کے ساتھ کی۔ گریگوری نے اُسے جھٹک دیا۔

اس نے سوچا کہ یہ مجھے بیوقوف سمجھتی ہے۔ کہ میں اس کی حرکت سے یقین کر لوں گا کہ یہ میرے ساتھ کام پر راضی ہے۔ مکار کہیں کی۔

اس کے دل میں آیا وہ اسے اٹھا کر زمین پر دے مارے۔ لیکن اُس نے جذبات پر قابو پا کر اس سے پوچھا "یہ حرکت کیوں کی تھی؟"

"صرف اس لئے کہ ......" اُس نے اترا نے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"بس بس۔ دیکھو مکار نہ بنو۔ میں تجھے خوب سمجھتا ہوں۔"

"پیارے!"

"چل ہٹ!"

"گریگوری۔ میری جان۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" گریگوری کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس نے پوچھا۔

"کیا تم ڈرتی نہیں؟"

"کس بات سے۔ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے نا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

گریگوری کو یہ جواب سن کر خوشی ہوئی۔

"میری جان!" کہہ کر گریگوری نے اتنے زور کی چٹکی لی کہ وہ اچھل پڑی۔

برک میں کام کے پہلے ہی دن کثرت سے مریض آتے رہے۔ یہ جوڑا ابتک جس تن آسانی کا عادی رہا ہے اسکی بنا پر انہیں اس ہما ہمی سے تھوڑی سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اور اپنے بھونڈے پن پر انہیں اور بھی الجھن ہوتی تھی۔ جو کچھ کہا جاتا تھا وہ اتنی جلدی انکی سمجھ میں نہ آتا تھا اور اس وجہ سے وہ اور بھی الجھتا۔ اور ہر وقت یہ سوچتا کہ اب وہ ڈانٹا جائے گا۔ اور اسے سخت سست کہے گا لیکن اسے بہت حیرت تھی کہ انکی اتنی بڑی بڑی غلطیوں پر بھی اسے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔

ایک دن ایک لمبے تڑنگے ڈاکٹر نے گریگوری سے ایک مریض کو اٹھانے کو کہا۔ اور گریگوری نے اسے اس طرح سے جوش اور بھونڈے پن سے اٹھایا کہ بیمار کی چیخ نکل گئی۔

"یار! دبا کر اسکا کچومر نہ نکال۔ یہ نہ ہو کہ ہم نہانے کے ٹب میں سے اسکے ایک ایک عضو کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔"

گریگوری کا سر شرم سے جھک گیا۔ لیکن مریض نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ سیکھ جائیں گے۔"

جب یہ میاں بیوی برک میں پہنچے تو وہاں ڈاکٹر نے انہیں سب سے پہلے یہ بتایا کہ مریض کے ساتھ کیسے برتاؤ کریں۔ مریضوں کو لاتے لیجاتے کیسے پکڑیں۔ کیسے اٹھائیں۔ کیسے بٹھائیں۔ اور مرض کی مختلف حالتوں میں کیا کریں۔ آخر میں ڈاکٹر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ نہا چکے ہیں۔

اور اس کے بعد اس نے انہیں سفید لبادے پہنا دئیے۔ یہاں ہر شخص سفید لباس میں تھا۔ اور ان کے سفید سفید غلاف کپڑوں سے بہت معصوم ہو گئے۔ سارا کام بہت پھرتی سے ہوتا تھا۔ مریضوں کی کراہ اور دواؤں کی تیز بو سے تمام برک بھری تھی۔

پہلے پہل تو گریگوری کو اس سارے کاروبار سے ایک اکتاہٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ یہ سوچتا تھا کہ وہ یہاں کبھی کام کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا اور اسکا دم گھٹ جائے گا یا بیمار ہو جائے گا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی اس ہنگامہ میں شامل تھا۔ اس میں بھی وہ جوش عمل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ بھی کسی کام کا ہو سکے۔ شاید یہ زندگی اور خدمت کی یہ لگن اس کی زندگی کو کچھ خوشگوار کر دے۔

"کسی دوا کے لئے ایک ڈاکٹر نے پکارا۔

"گرم پانی!" ایک طالب علم چیخا۔

"ارے تمہارا کیا نام ہے۔ ہاں اندریت۔ ذرا اس مریض کے پیر تو دباؤ۔ ارے یوں بس یوں۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا آہستہ آہستہ۔ اسکی کھال نہیں اتارنی ہے۔" ایک دوسرے طالب علم نے کہا۔ اور پھر اس نے خود مریض کے پاؤں دبا کر بتائے کہ کس طرح مالش کرنا چاہئے۔

"ایک اور مریض آیا ہے"۔ کوئی پکارا۔

"اور لوٹ ذرا اسکو اندر تو لانا۔"

گریگوری پسینہ میں شرابور۔ گھبرایا ہوا۔ ہر کام کے انجام دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ کام میں اتنا محو ہو جاتا تھا کہ اپنے وجود کو بھی فراموش کر جاتا تھا۔ مریضوں کی افسوسناک حالت۔ انکی کراہیں۔ الٹی ہوئی آنکھیں اور سارے بدن کو مروڑ ڈالنے والی درد۔ آخر کار گریگوری کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

ایک آدھ بار گریگوری نے اپنی بیوی کو بھی ادھر آدھر سے گزرتے دیکھا۔ لیکن وہ بھی بہت جلدی میں ہوتی تھی۔ اسکا چہرہ بھی ستا ہوا اور کام کی وجہ سے ماند نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دبلی بھی نظر آتی تھی۔

"کیسے حال ہیں؟" ایک بار اس نے پوچھ لیا۔

لیکن مٹروونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

گریگوری کو خیال گزرا کہ اس نے مٹروونا کو ایسی خطرناک جگہ لا

کر ڈالی گئی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اس لئے جب اس نے اُسے دوبارہ آہستہ سے گرتے دیکھا۔ تو ذرا سختی سے اس نے اسے ڈانٹ دیا۔

"دیکھو اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا۔ اور ذرا احتیاط سے۔"

"اور اگر میں احتیاط نہ کروں"۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

گریگوری کو تاؤ آگیا "چڑیل نے کیا بھدا مذاق کی تجویز کی ہے۔ یہ لڑکیاں بھی شرارتی ہوتی ہیں۔ لیکن سسٹر نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ لیا اور بغیر کچھ کہے چپکے سے عورتوں کے وارڈ میں چلی گئی۔

کچھ ہی لمحہ بعد وہ ایک پولیس مین کو مردہ خانے لے جا رہا تھا۔ سپاہی آرام سے اسٹریچر پر لیٹا تھا۔ اور اسکی بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گریگوری اسکی طرف دیکھنے لگا تو اُسے ایک جھرجھری آگئی۔ ابھی تین دن ہوئے کہ یہی سپاہی اس سے اکڑ رہا تھا۔ وہ کتنا مضبوط اور تندرست معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آج اسکی وضع کیسی بے طرح بگڑی اور اکڑی پڑی ہے۔

موت و حیات کا یہ مسئلہ گریگوری کو عجیب معلوم ہوتا تھا۔ کیسے آدمی اس طرح سے پیدا ہو کر صرف ایک ہی دن میں، یعنی بڑی بیماری سے مر جاتا ہے۔ اور وہ سپاہی کو دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔

یکبارگی سپاہی کا ہاتھ اٹھا اور سیدھا ہو گیا اور اسکا ادھ کھلا منہ بالکل بند ہو گیا۔

"ارے یہ زندہ ہے"۔ "چہ وتن؟ ٹھہر۔" گریگوری نے اپنی طرف کا اسٹریچر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

اسٹریچر کے دوسری طرف والا آدمی رُک گیا۔ اور پھر مردہ پر اس نے نظر ڈالی۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ارے اس نے تو ہاتھ کو اس لئے سیدھا کیا ہے کہ آسانی سے کفن میں سما سکے۔ چل اُٹھا۔"

"لیکن ابھی تو ہلا تھا"۔ گریگوری نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا۔

بس اُٹھا اور چل۔ تیری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی۔ یہی تو کہ کفن کے لئے اس نے ہاتھ سیدھا کیا۔ یعنی وہ اس لئے ہلا۔ تم اپنی بیوقوفی سے ضرور پھنسو گے۔ مردوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہیں کہتے۔ کیا کوئی مصیبت کھڑی کرنا چاہتے ہو۔ سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ اور اگر یہ بات تم منہ سے نکالو گے تو یہ بات پھیل جائے گی اور بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اور ایک قیامت برپا کر دیں گے کہ ہم زندہ ہی لوگوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ اچھا اب چپ چاپ یہ سرا ادھر بائیں طرف رکھو۔

اس آدمی کی اطمینان بخش باتوں سے گریگوری کو کچھ ڈھارس ہوئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ آہستہ آہستہ تم ان باتوں کے عادی ہو جاؤ گے میں کیا۔ ہم تو مزے میں ہیں۔ اچھا کھانا اور اچھا پینا اور پھر اس سے کیا ایک دن ہم خود اس طرح سے مردہ خانے میں ڈال دیئے جائیں گے خیریت تک تم بالکل چپ رہو۔ ایک لفظ بھی زبان سے۔ اچھا کچھ پینے دیتے بھی ہو۔

"ہاں"۔ گریگوری نے کہا۔

"میں نے ایک بوتل ادھر کونے میں چھپا رکھی ہے۔ چلو ایک ایک گھونٹ پی لیں۔"

وہ دونوں اس کونے کی طرف گئے۔ اور بوتل میں سے تھوڑی تھوڑی سی شراب پی۔ اس کے بعد اس آدمی نے تھوڑی سی شکر پر پیپرمنٹ چھڑک کر گریگوری کو دی۔ اور خود بھی کھائی۔ تاکہ منہ سے بدبو نہ آئے۔

اسے کھاؤ۔ یہاں لوگ دارو کا پینے کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ تمہارے منہ کی بو ٹھیک دور ہو جائے گی۔

"تم تو اب عادی ہو گئے ہو گے"۔ گریگوری نے پوچھا۔

"میں یہاں تو پہلے ہی دن سے ہوں۔ اور میں نے بہتوں کو مرتے دیکھا ہے۔ اور نہ یہ کوئی آرام دہ جگہ ہے۔ ویسے بری نہیں ہے۔ یہ تو خیر کا کام ہے۔ یہ ایک جنگ کا میدان ہے۔ تم نے کبھی میدان جنگ کی نرسوں اور ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ میں نے تو ترکوں کی جنگ میں انہیں خود دیکھا ہے۔ اور یہ لوگ حقیقت میں سپاہیوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ ہم تو میدان جنگ میں بندوق لے کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ گولیوں کی بوچھاڑ میں ہنستے پھرتے ہیں۔ گویا کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ اور میدان سے زخمیوں کو اٹھاتے رہتے ہیں خواہ وہ روسی ہوں یا ترک۔ گولیوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو گولی آکر انہیں بھی زخمی کر دیتی ہے۔

شراب اور اس گفتگو کے بعد گریگوری کچھ نیند محسوس کرنے لگا اب جب سفر شروع ہو گیا تو ہو گیا۔ رکنا نہیں ہے۔ اس نے

ایک مریض کے پیروں پر پالش کرتے ہوئے سوچا۔ اس کے کانوں میں دوسرے مریضوں کی کراہ کی آواز آ رہی تھی۔

"پانی۔ خدا کے لیے ایک گھونٹ" کوئی مریض کراہا۔

"گرم شربت اور اسی سے تسکین ہوتی ہے۔ ان میں اور گرم پانی ملا لو۔"

"اسے تھوڑی سی شراب دے دو" ڈاکٹر داس چنکو نے حکم دیا۔

کام کرتے کرتے اب اورلوت کو پتہ لگ گیا۔ کہ یہ کام اتنا بھیانک اور برا نہیں ہے جتنا اس نے پہلی نظر میں محسوس کیا تھا۔ اور نہ اب ہنگامہ بے ترتیبی اور گڑبڑ ہے بلکہ یہ تمام ظاہری گڑبڑ ایک ٹھکانے کی تنظیم تھی۔ لیکن پھر بھی جب اسے اس پولیس مین کی یاد آتی تو وہ کانپ اٹھتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ وہ شاید مر ہی گیا تھا۔ پھر خود ہی اس کی تردید کر دیتا۔ وہ سوچتا کہیں وہ پولیس مین اٹھ کر چلانے نہ لگے۔ اس نے سنا تھا کہ ایک بار ہیضہ کا ایک مریض تو نعش کے صندوق میں اٹھ بیٹھا تھا اور اس سے نکل کر بھاگ گیا۔

اسے پھر بیوی کا خیال آیا۔ وہ کیا کر رہی ہوگی۔ اور اس کا دل چاہنے لگتا کہ کسی طرح سے کام چھوڑ کر دیکھ آئے کہ مٹرونا کیا کر رہی ہے لیکن پھر اسے اپنے اس خیال ہی سے شرم آنے لگتی۔ اور پھر وہ خود ہی اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا کہ وہ مٹرونا سے کہے گا۔

"ہاں کام کیے جا۔ کیے جا۔ یہاں تک کہ تیرا یہ گداز جسم گل جائے اور پھر تو تجھے کوئی نہ پوچھے گا۔ اور تیری سب تجویزیں خاک میں مل جائیں گی۔"

اسے اکثر یہ شک ہوتا کہ مٹرونا اسے ایک نہ ایک دن چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ اور یہ بات اسے اپنے شوہرانہ وقار کے منافی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے کو قائل کرتا کہ جبکہ وہ خود ہی اس کے متعلق اتنے برے خیالات رکھتا ہے۔ تو اگر وہ اسے چھوڑ کر بھاگ بھی جائے تو کیا برا ہے۔ اسکی زندگی کونسی اچھی گزر رہی تھی۔ اور جو اس طرح کی زندگی گزاریگا۔ اسکے ہی دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھیں گے اور پھر ان ہی خیالات کی بنا پر اسے یقین ہو جاتا۔ کہ مٹرونا ضرور اس سے بیوفائی کرے گی کبھی یہ سوچنے لگتا کہ آخر وہ اپنی کوٹھری چھوڑ کر کیوں اس ابلتے ہوئے کڑاہ میں گر پڑا۔ اسکی سمجھ میں اسکا کوئی جواب نہ آیا۔ اور پھر وہ خیالات کے دریا میں ڈوب جاتا۔ لیکن ان ڈاکٹروں کی بے غرض خدمات دیکھ کر اس کے دل نے جو اثر قبول کیا تھا۔ وہ خیالات اسکی فطری خود غرضی کو آگے نہ بڑھنے دیتے۔ وہ ڈاکٹروں اور طالب علموں کے تھکے ہوئے چہرے دیکھتا۔ ان کی ماندگی اور اس پر سے کام کی لگن دیکھ کر وہ سوچنے لگتا کہ ان کا کمایا ہوا ایک ایک کوپک حلال کا ہے۔

شام کو جب اسکا کام ختم ہو گیا۔ تو وہ اسپتال کے احاطے میں چلا گیا۔ اس کا سر سنسنا رہا تھا اور تمام بدن تھکاوٹ کی وجہ سے چور چور تھا۔ اور وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ اور آسمان پر دوڑتے ہوئے رنگین بادلوں کو تکنے لگا۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ سو گیا۔

اس نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر نے اسکی اور اسکی بیوی کی دعوت کی ہے۔ ایک بہت بڑا سا کمرہ ہے۔ اور اس میں ہسپتال کے تمام مریض بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اور مٹرونا بیچ فرش پر کھڑے ناچ رہے ہیں اور وہ خود رباب بجا رہا ہے۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ ڈاکٹر کی ٹانگیں بہت بہت لمبی ہیں اور ناچ میں مٹرونا کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے اور عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا ہے۔ تمام مریض بھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ دروازے پر وہی پولیس والا کھڑا دھمکا رہا ہے۔ "تم گریگوری! ہم تجھے مردہ سمجھ کر مردہ خانے میں ڈال آئے تھے۔ اور اب خود مزے سے رباب بجا رہے ہو۔ چل۔ اٹھ۔ کھڑا ہو۔"

گریگوری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر داس چنکو اس کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا

"تم عجیب آدمی ہو۔ یہاں باہر میدان میں گھاس پر پڑے ہو۔ تمہیں جب کمرہ اور بستر مل چکا ہے۔ تو تم گھاس پر کیوں لیٹے ہو۔ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گے۔ اور جلد ہی ٹھنڈے ہو جاؤ گے اور خود تمہیں بھی پتہ نہ چلے گا۔ ایسی حرکت پھر نہ کرنا۔ ارے تمہیں زکام ہو گیا۔ دیکھا نہ۔ خیر چلو۔ میں دوا دیتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب میں بہت تھک گیا تھا" گریگوری نے رک رک کر کہا۔

"تب تو یہ اور بھی بری بات ہے۔ تمہیں احتیاط کرنی چاہیئے۔ اور اس طرح تو بات بگڑ جائے گی۔ اور ابھی ہمیں تمہارے جیسے آدمیوں کی بہت ضرورت ہے۔ اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

گریگوری ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے گیا۔ اور وہاں ڈاکٹر نے اسے دو گلاسوں میں دوا دی۔ گریگوری ایک ایک کرکے انہیں پی گیا۔ دواؤں کو پی کر اس نے برا سا منہ بنایا اور وہیں فرش پر تھوک دیا۔

"اچھا اب جاؤ اور جاکر سو رہو۔" کہتا ہوا ڈاکٹر تو ایک طرف کو روانہ

پوچھا۔

گریگوری تھوڑی دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر مسکرا کر اس کے پیچھے دوڑا دوڑا۔

"شکریہ ڈاکٹر"

"کس لئے؟"

"آپ نے اتنی زحمت کی۔ میں آپ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ جو آپ نے مجھ پر کیا۔ اور میرے متعلق جن نیک خیالات کا اظہار کیا بہرحال آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ڈاکٹر اسے تھوڑی دیر حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور خوشی کی جھلک تھی اور پھر وہ مسکرا دیا۔

"تم عجیب آدمی ہو" اس نے کہا۔ "بہت زیادہ مخلص اور راست گو۔ تمہاری بات مجھے بہت پسند آتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تمہارا خلوص اب اور محنت اور خلوص سے کام کئے جاؤ۔ میرے لئے نہیں۔ بلکہ ان مریضوں کے لئے جن کی خدمت پر تم مامور ہو۔ ہمیں ایک بڑی جنگ کرنی ہے لوگوں کو اس موذی بیماری کے چنگل سے چھڑانا ہے۔ اور ہم اس کام میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اور اسے ایک نہ ایک دن ناکامیاب بنا دیں۔ اور تم ہمارا ساتھ دو گے اچھا اب سب سے پہلے تم جاؤ تھوڑی دیر سو رہو۔"

اس کے ایک منٹ بعد ہی گریگوری اپنے بستر پر لیٹا اونگھ رہا تھا۔ اس کے تمام چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی تھوڑی دیر کی اس گفتگو نے اسے ایک حسین جنت میں پہنچا دیا تھا۔

سوتے سوتے اسے یہ دھیان آیا کہ افسوس مٹروزہ نے یہ گفتگو نہ سنی۔ اور اب اگر میں اس سے کہوں گا بھی تو وہ پوری طرح یقین نہ کرے گی۔ چڑیل کہیں کی۔

صبح آ کر اسے بیوی نے جگایا۔

"اٹھو چل کر چائے پی لو۔"

اس نے سر اٹھا کر مٹروزہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بالوں میں کنگھا کئے ہوئے وہ سفید لباس میں بہت صاف اور حسین نظر آ رہی تھی۔ اسے وہ بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں جلن اٹھی کہ وہ ایسی حسین تو اوروں کو بھی نظر آتی ہوگی

"کہاں چل کر چائے پی لوں۔ میرے پاس خود چائے موجود ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہم دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گریگوری نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا چلتا ہوں۔"

مٹروزہ کے جاتے ہی گریگوری پھر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔

پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ کیوں مجھے چائے کے لئے بلانے آئی۔ اور پھر مجھے دیکھ کر کیوں مسکراتی تھی۔ وہ کچھ ذہین نظر آ رہی تھی۔ اسے اس پر افسوس آ رہا تھا اور وہ اسے خوش کرنے کی کوئی بات سوچنے لگا۔ وہ چائے کے لئے اگر کچھ مٹھائی خریدے تو بہتر ہو۔ لیکن منہ دھوتے دھوتے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس سے عادت خراب ہو جائے۔ بلا وجہ کیوں ایک عورت کو بری چیزوں کا عادی بنایا جائے۔ بغیر مٹھائی کے اچھی طرح سے کام چل سکتا ہے۔

چائے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی اور میز پر میاں بیوی اور مٹروزہ کی ایک سہیلی تھیں۔ تیسری عورت کا نام فیتا وگورونا تھا۔ وہ بھی غیر شادی شدہ تھی اور اسکا باپ کسی کالج میں فیلو تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سماوار کا گرم کیا ہوا پانی پیتی تھی۔ اور اسپتال کے گرم پانی سے پرہیز کرتی تھی۔ اس نے یہ تمام باتیں گریگوری کو چائے پینے کے دوران بتائیں۔ تھوڑی دیر میں اس سے گریگوری سے کہا کہ اب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرلے۔ اور پھر خود باہر چلی گئی۔

"کیا کل تم بہت تھک گئی تھیں؟" گریگوری نے مٹروزہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا

"بس کچھ پوچھو نہیں۔ میں تو تھک گئی تھی کہ اب میرے پیر رہ جائیں گے۔ اور مجھے چکر آ رہا تھا۔ بلکہ آخر میں تو لوگ جو مجھ سے کہتے تھے وہ میری سمجھ میں بھی نہ آتا تھا۔ میں تھک کر چور ہو گئی۔ اور سارے وقت خدا سے دعا کرتی رہی۔"

"کیا تم ڈرتی ہو؟"

"ہاں مجھے صرف مردوں سے ڈر لگتا ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا مرنے کے بعد بھی مردے ہاتھ پیر ہلاتے رہتے ہیں۔"

گریگوری نے بھی ایک عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا۔ میں نے تو خود دیکھا ہے۔ کل میں اور ڈاکٹر پولیس میں کی لاش کو سیدھا کر رہا تھا کہ لاش کا ہاتھ کھینچ کر اٹھا اور اسنے تان کر ایک گھونسہ مارا۔ اگر میں بیچ میں نہ ہوتا تو ڈاکٹر کو چوٹ آ جاتی۔ یہ کیا تھا۔ گریگوری نے محض بات بنانے کیلئے کہا۔

اس شفاف کمرے میں چائے پیتے ہوئے اُسے بڑا مزا آ رہا تھا۔ اور اس وقت کا ماحول اُسے بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اسکی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسکی خوشی کی وجہ کیا ہے۔ یا یہ خوشی آپ ہی آپ اس کے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ آج وہ اپنی نیکی کا رعب جما کر مڑونہ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

اگر میں نے کام کرنا شروع کیا تو اس زمین کی وسعت بھی میرے لئے کم ہو جائے گی۔ کم لوگوں میں ایسا خدمت کا جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ڈاکٹر اس نے کافی مبالغہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر والی بات بھی سچی تھی۔ مڑونہ سن کر متاثر معلوم ہوتی تھی اور اسکا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

اور یہ کام تو خاص طور سے بہت اہم ہے۔ ایک کارزار جس کے ایک طرف ہیضہ اپنی فوجیں لئے تباہی و بربادی کے واسطے آمادہ ہے اور دوسری طرف مریض اور ہم لوگ مداخلت کے لئے۔ کون کہتا ہے؟ اس میں بہت دماغ کی ضرورت ہے۔ ہیضہ ہوتا کیا ہے۔ پھر آسکو اچھی طرح جان لینے کے بعد ہم اسکی سب سے کمزور جگہوں پر حملہ کریں گے۔ ڈاکٹر واسن چنکوف نے تو کہا کہ گورلوف ہمیں تو تم جیسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے جیسے جوان ہمت مردہی ہیضہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور تمہاری مدد سے ہم ہیضہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ اور ان مریضوں کو موت کے منہ سے نکال لیں گے۔ ایسی اس زندگی کے لئے یہ مریض تمہارے ہمیشہ احسانمند رہیں گے۔ گریگوری نے فخر سے سینہ تان لیا۔ اور اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

مڑونہ نے بھی اُسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ اسوقت بہت حسین نظر آ رہا تھا۔ اور آج وہ ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ شادی سے پہلے تھا۔

ہمارے بھی وارڈ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ ایک موٹی سی ڈاکٹر ہے۔ وہ عینک لگاتی ہے لیکن مریضوں کی تیمارداری ایسے کرتی ہے کہ جیسے وہ اس کے لڑکے ہوں۔ اور پھر اُسے اپنی خدمت کا ذرا بھی غرور نہیں۔ اور بات اس نرم و نازک لہجہ میں کرتی ہے کہ تھکے آدمی کو بھی ایک لفظ میں تروتازہ کر دیتی ہے۔

اچھا تب تمہیں بھی یہ زندگی پسند ہے۔ گریگوری کا جوش کچھ دب گیا۔

بالکل۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ اب بارہ روبل ہفتہ مجھے ملتا ہے جبکہ روبل مجھے ملتے ہیں۔ کل بتیس روبل ہوئے۔ اور ہمارا بیٹا کوئی خرچ نہیں اس لئے اگر جاڑوں تک یہ ہیضہ رہا تو پھر اسوقت تک ہم کافی بچا لیں گے۔ اور اس کال کوٹھڑی کو چھوڑ کر کوئی اچھا سا مکان لے لیں گے۔

ہاں بھئی یہ بات تو سوچنے کی ہے۔ گریگوری نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ پھر مڑونہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھکر اس نے جوش سے کہا۔ اور پھر تو ہمارے گھر میں بھی دھوپ آیا کرے گی۔ اور زندگی اس سے کہیں زیادہ حسین ہو جائے گی۔

مڑونہ مجسم مسکراہٹ تھی۔ کاش تم . . . . .

"اب کچھ اور نہ کہو۔ جب دن بدل جائیں گے تو میری عادت بھی بدل جائے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو"

"بس بھئی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے"

"پیارے گریگوری!"

ان کے دلوں میں کئی امنگیں تھیں۔ اور ایک نئی زندگی کی تمنا۔ ان کے دل کو بے پایاں مسرت سے بھر رہی تھی۔ اتنی مسرت کی تمنا میں وہ سخت سے سخت محنت کے لئے تیار تھے۔

ادھر اورلوف بہت تن دہی سے کام کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی بار اسکی خدمت کا اعتراف کیا اور دوسروں کے سامنے اسکی تعریف کی۔ اس کے بہت سے ساتھی اُس سے جلنے لگے تھے۔ اور موقع ملنے پر اسکی بیجا شکایتیں بھی کرتے۔ سب تو سب پیروشن بھی اُس سے جلنے لگا اگرچہ پیروشن اُسے پسند تھا۔ اُسی سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سن لیتا تھا۔ لیکن اورلوف بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

بدمعاش۔ پیروشن کا خیال آتے ہی اُس نے دل میں کہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنی تمام باتیں مڑونہ سے کہہ سکتا ہے۔ اور وہ دوسروں کی طرح اسکی کامیابی سے جلے گی نہیں بلکہ خوش ہی ہوگی۔

اورلوف کام میں اور دلچسپی لینے لگا۔ اسے ہمیشہ یہی دھن لگی رہتی کہ مریضوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کس طرح کی جائے۔ وہ اب دواؤں کو محض سونگھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کس وقت مریض کو دی جائیں۔ دوائیں اور مریضوں کی تیمارداری میں اُسے وارڈ کا سے زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر اور طلبا میں بھی اسکی ہردلعزیزی بڑھتی جاتی تھی اور لوف کو اب اپنی شخصیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے یہ دھن تھی

کرے۔ وہ اپنے کارنامے نمایاں کر جائے جو دوسروں سے ممکن بھی نہ ہوں۔ اور وہ اپنے کو سب سے اونچا کرنا چاہتا تھا سب سے نمایاں اور منفرد۔ اور اس کے لئے وہ ہر قربانی کے لئے تیار تھا۔

اب وہ اپنے مریضوں کی خدمات اپنے ذمہ لیتا۔ جن سے لوگ گھن کرتے۔ لیکن وہ چھوت چھات کی پرواہ کئے بغیر ان کی خدمت کرتا رہتا۔ ایک دن تو وہ ایک بیمار مریض کو اپنی پیٹھ پر لاد کر غسل خانے لے گیا اور وہاں سے بغیر کسی کی مدد کے اسے اٹھا لایا۔ اب وہ دشوار سے دشوار اور سخت سے سخت کام کے لئے ہر طرح سے تیار رہتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب اسے اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں۔ لیکن اب بھی اسے سکون نہ تھا۔ وہ کوئی اس سے بڑا کام کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیوی سے اس موضوع پر بات کرتا۔

ایک دن شام کو کام ختم کرنے کے بعد میاں بیوی نے اکٹھے کھانا کھایا اور اس کے بعد دونوں سیر کو نکل گئے۔ اسپتال شہر سے تھوڑی دوری پر بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور ایک طرف کسانوں کے کھیت تھے۔ چڑھتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں وادی کے سبزہ زار میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اور دوسری جانب مغرب کی سمت کے مکانات کی کھڑکیوں کی ہلکی روشنی بہت ہی حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ کہیں سے گانے کی لمبی آواز آ رہی تھی۔ گریگوری اس حسین منظر میں کھویا کھویا سا مٹروڈ کے ساتھ چل رہا تھا۔ مٹروڈ کو اس کا یہ متفکرانہ انداز کبھی بھی پسند نہ آیا۔ اس لئے اس نے بات شروع کرنے کے لئے پوچھ لیا۔ معلوم نہیں یہ گانے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے اسپتال سے؟

"گانا؟" گریگوری نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ لعنت بھیجو اس گانے پر۔ تم اس وقت اس فکر کو سنو جو میرے دل میں چھڑا ہوا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو" مٹروڈ نے شوہر پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ بس میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میرا دل کچھ کرنے کو تڑپ رہا ہے۔ کوئی بڑا کام۔ یہی ہے کہ اگر ایک دیو بن جائے تو بھی میں اس سے لڑنے کو تیار ہو جاؤں اور اس وقت تک لڑتا رہوں۔ جب میرے جسم کا ایک عضو بھی باقی ہے

میں اسے خدا کے مقابلے کے لئے للکاروں گا۔ کاش کہ وہ مجھ سے مقابلہ کرے۔ اور پھر جب میں اس سے لڑتے لڑتے مر جاؤں تو لوگ میری قبر پر یہ کتبہ لگائیں کہ یہ گریگوری اور لوون کا مزار ہے جس نے [illegible] بدلا لیا اور اپنے آخری دم تک لڑتا رہا۔ اور آخر میں اس نے [illegible] آزادی [illegible] آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سرخی [illegible]

میرے شوہر! [illegible]

میں اپنے [illegible] اگر [illegible] انسان بڑی قربانی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر [illegible] اور وہ [illegible] وقت [illegible] ایثار اور قربانی کے [illegible] ہیں۔ جن کی زندگی لوگوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ یہ خدمت محض خدمت کے لئے کرتے ہیں۔ [illegible] نہیں۔ [illegible] کام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ ان کی خدمت اور خلوص کا جواب [illegible] ان کی محنت اور اس کے [illegible] کیا یہ روپیہ کے لئے کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ انہیں [illegible] کی اتنی پرواہ نہیں۔ ان کی زندگی تو خدمت ہے صرف خدمت۔ انہوں نے کیسے کیسے لوگوں کی خدمت کی ہے۔ [illegible] زندگی [illegible] نیکی اور اچھائی چھوڑ کر نہیں [illegible] جس نے تمام عمر [illegible] نہیں [illegible] معلوم اور کتنے [illegible] ہیں۔ لیکن انکو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو اسے [illegible] نہیں لینا چاہتے تھے۔ اور پھر جس دن وہ اچھا ہو کر اسپتال سے نکل رہا تھا [illegible] خوش تھا [illegible] سارا دنیا کی مسرتیں سمٹ آئی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کاش مجھے وہی مسرت نصیب ہو۔ اور اتنی نصیب ہو کہ میں اس میں ڈوب جاؤں۔ مجھ سے دوسروں کی ایسی مسرت برداشت نہیں ہوتی۔ میں خود تڑپنے لگتا ہوں۔ عجیب کیفیت ہے میری۔ خدا [illegible] کرے۔

گریگوری پھر [illegible] میں پڑ گیا۔

مٹروڈ [illegible] کچھ نہ بولی۔ لیکن [illegible] اپنے شوہر [illegible] ڈر گئی تھی۔ اس کے الفاظ میں پوشیدہ اپنے شوہر کی ایک ایسی خواہش جھلکتی نظر آتی تھی جسے اس نے کبھی سمجھا تھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو صرف اپنا شوہر رہتا۔ اور وہ کسی [illegible] کبھی [illegible] رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ پہاڑی کے کنارے پہنچ گئے۔ چیڑ کے درختوں کی شاخیں جیسے انہیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ نیچے تمام گہرا نیل پھیلا ہوا تھا۔ اور ایک سوندھی سوندھی سی مہک اٹھ کر ساری فضا کو مہکا رہی تھی۔ اور تمام وادی میں جیسے ایک پرسکون آواز رقص کر رہی ہو۔ درخت کچھ اس طرح سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جیسے ان کی گود میں کوئی سو رہا ہو۔ اور وہ ڈر رہے ہوں۔ کہ ان کے زور سے بولنے سے کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ مٹرونہ اور گریگوری چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گریگوری اپنی انگلیوں سے اپنے گھٹنے کو بجا رہا تھا اور مٹرونہ خاموش، محبت بھری نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"میرے پیارے۔ میری جان گریگوری" مٹرونہ نے آہستہ سے کہا۔ تم کتنے عجیب معلوم ہوتے ہو۔ میرے پیارے یہ دن تمہیں ہماری شادی کے پہلے دنوں کی طرح اچھے اور بہت پیارے لگ رہے ہیں۔ اب تم صرف محبت کی باتیں کرتے ہو۔ اور مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتے ہو۔ اب مار پیٹ بھی نہیں ہے۔ یہ دن کتنے اچھے ہیں" "اچھا تمہیں یہی پسند ہے۔ اور اب بھی ایک آدھ گھونسہ اور لات رسید کر سکتا ہوں" گریگوری نے اپنی بیوی کی طرف محبت اور رحم بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

مٹرونہ اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں کو تھپتھپانے لگا۔ جیسے وہ کوئی ننھا بچہ ہو اور کسی بڑے کی محبت بھری آغوش میں ہو۔ اس کے بازوؤں میں کتنی گرمی اور کتنا سکون تھا۔

"پیارے۔"

"کہو میری جان اور کچھ کہو۔ یقین کرو کہ میں تمہارا سب سے بڑا دوست ہوں۔ تم شاید اوروں کا سہارا ڈھونڈتی رہی۔ میں نے جب بھی تمہیں مارا ہے تو مجبور ہو کر۔ وہ زندگی ہی ایسی تھی۔ نہ روشنی اور نہ مسرت۔ اس تنگ و تاریک جگہ میں نفرت کی بجائے محبت کیسے ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت اندھا تھا۔ زندگی ہی کچھ ایسی تھی۔ تم میری بیوی تھیں اور میری سب سے بڑی دوست۔ لیکن کیا بہت سے لوگ تو بہت ہی برے ہوتے ہیں۔ پولن وغیرہ۔ خیر چھوڑو ان کی بات۔ اب ہم اچھی طرح سے رہیں گے۔ بس تم خوش رہو میری بچی!"

"ارے یہ کیا"۔ مٹرونہ کے مارے خوشی کے آنسو نکل آئے۔

"میں اب مجھے اپنے آپ سے نفرت آتی ہے۔ میں کتنا بھدا ہوں۔ عورتوں کے بہکانے میں آ جاتا ہوں۔ تم لوگ تو نہیں بتانا چاہتی ہو۔ میں ایسا بدھو نہیں ہوں کہ اتنی آسانی سے تمہیں پھنس سکا۔ سمجھ گئیں۔ تو اتنی آسانی سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔"

"اچھا تو تمہیں افسوس ہے کہ کل شام تم میرے اتنے قریب کیوں آ گئے۔ تم نے مجھے پیار کیوں کیا۔ مجھ سے محبت کی باتیں کیں۔ میرے بوسے کیوں لئے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ان الفاظ سے تم نے میرے دل پر کتنا بڑا چرکا لگایا۔ تم نے ان الفاظ سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ کیا تمہارا دل مجھ سے بالکل بھر گیا۔ کیا تم مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے؟"

اس نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تلخی تھی اور وہ اپنی بات کا جواب چاہتی تھی۔

"نہیں" گریگوری نے کچھ بے چینی سے جواب دیا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ ہم اب تک کیسی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اور اس کا خیال ہی ہماری طبیعت کو منغض کر دینے کو کافی ہے۔ اور اب جبکہ ہم اس سے نکل چکے ہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہ ہر چیز اتنی جلد جلد بدل رہی ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم کچھ اور تھیں میں کچھ اور تھا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"گریگوری جو کچھ خدا چاہے گا وہی ہوگا۔ لیکن کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ تم نے مجھے شام کو اتنا پیار کیوں کیا تھا۔"

"خیر اب اس کا تذکرہ چھوڑو۔" گریگوری نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ ہماری زندگی سے کچھ حاصل ہوگا۔ نہ ہماری پہلی زندگی آرام دہ تھی۔ اور نہ موجودہ زندگی سے مجھے بہت زیادہ امید ہے۔ خواہ میں شراب چھوڑ دوں۔ تمہیں نہ پیٹوں یا گالی نہ بکوں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

مٹرونہ بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اب تو تمہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تم یہ حرکتیں کر سکو۔"

"خیر تمہارا... پینے کا وقت اگر میں چاہوں تو پیا جا سکتا ہے۔" گریگوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اب میں خود ہی نہیں جاؤں گا۔ یہی تو ایک بات ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں خوف و لالچ کی بنا پر کرتا ہوں۔ یا میں شراب سے ڈر گیا ہوں۔" کہتے کہتے وہ گہری فکر میں

گیا۔

"پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ اچھی خاصی زندگی ہے۔ اگرچہ تھوڑی سی محنت ضرور ہے۔ تمام ڈاکٹر تم سے محبت کرتے ہیں اور دوسرے تم نے بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر اور تمہیں کیا چاہیئے۔ پتہ نہیں تم میں کون سا پارہ بھرا ہے!"

"یہ تو ٹھیک ہے میں ہمیشہ بیقرار رہتا ہوں۔ اور کبھی کبھی تو تمام رات سوچتے گزر جاتی ہے۔ پوشیر آدا کہتا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ تو کیا میں انسان نہیں۔ پھر بھی ڈاکٹر واس چکو مجھ سے بہتر ہے۔ اور پاشر آئی فورتا بھی۔ اسے یوں سمجھو۔ کہ نہ وہ میرے برابر ہیں اور نہ میں انکے برابر ہوں میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مشا کا علاج کیا۔ اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ایک آدمی کو اچھا کر کے لوگ خوش کیوں ہوتے ہیں۔ کیونکہ سچ پوچھو تو مشا کی زندگی تو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور وہ سب اس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی اسکی زندگی بچا کر وہ خوش خوش ہیں۔ لیکن میں تو نہیں خوش ہو سکتا۔ اگر مجھ سے پوچھو تو آخر اس میں خوش ہونے کی بات کیا ہے؟"

"لیکن وہ لوگوں کے لئے افسوس بھی تو کرتے ہیں۔"

ہمارے بھی وارڈ میں جب کوئی مریضہ اچھا ہونے لگتی ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ غریب ہوتی ہے تو اسے دوا اور پیسے بھی دیتی ہیں۔ تم سنو تو شاید رو پڑو۔ وہ لوگ کتنے اچھے ہیں!"

"ہوں۔ نہیں مجھے صرف حیرت ہوتی ہے۔" بس گریگوری نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر مرٹرونا کو جوش آگیا۔ اور وہ اپنے شوہر کو رحم اور محبت کے معنی سمجھانے لگی۔ اور باتیں کرتے کرتے وہ اس پہ جھک پڑی۔ اور نظروں میں بے پایاں محبت جھلکنے لگی۔ گریگوری سوچنے لگا۔

اب تو یہ خوب بولنے لگی ہے۔ آخر اسے اتنے الفاظ کس نے بتائے۔ اور تم بھی ان پہ ترس کھاتی ہو۔ کیوں کیا تم نے نہیں کہا کہ اگر تمہیں کہیں ہیضہ ہو جائے تو تم اسکی ہڈیاں تک توڑ ڈالو گے تم ایسا کر دیں گیوں۔ ہیضہ تم لوگوں کے بعد سے تو تمہاری زندگی سدھر

گئی ہے۔

گریگوری بہت زور سے ہنسا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ میری زندگی تو ضرور سدھر گئی۔ لیکن بحث ہے اس زندگی پر کہ لوگ جیسے بسر رہے ہیں۔ اور میری زندگی بنتی رہی ہے۔ اسے تم زندگی کہتی ہو؟"

گریگوری ہنستا ہوا دروازے سے اٹھ کر کام پر چلا گیا۔ اور اسپتال کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا مرٹرونا خوبصورت ہے لیکن بات پتہ کی کہتی ہے۔ اگر وہاں دو چار آدمی اور ہوتے اور اس کی باتیں سنتے تو ٹھیک ہوتا۔ وہ مسکراتا ہوا مردانہ وارڈ میں چلا گیا۔ جہاں سے مریضوں کی کراہ کی آواز اور ڈاکٹر کی پکار آ رہی تھی۔

مرٹرونا یہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کے شوہر کی نظر میں اسکا وقار بڑھتا جا رہا ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے جتنی کوشش کر سکتی تھی کرتی رہی۔ اور اپنی کوشش اور محنت کو دیکھ دیکھ کر وہ خود اپنی نظروں میں اونچی ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ سنجیدگی اور غور سے کسی بات کے سوچنے کی عادی نہیں تھی۔ لیکن پھر جب وہ اپنی کال کوٹھری والی زندگی سے موجودہ زندگی کا مقابلہ کرتی تو اسے ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسکی یاد سے گزشتہ دن محو ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اسپتال کا تمام عملہ اسکی عزت کرنے لگا تھا۔ لوگ اسکی پھرتی اور محنت کی تعریف کرتے۔ اور ہر ایک اس سے پیار اور محبت سے پیش آتا۔ اور اسے بھی انسان سمجھا جا رہا تھا۔ اب وہ ایک ایسی زندگی بسر کر رہی تھی جس کا اسے پہلے کوئی تجربہ نہ تھا اور اس زندگی نے اسے اپنے سے بھی محبت کرنا سکھا دیا تھا۔

ایک بار رات کی ڈیوٹی پر سے لوٹی۔ ڈاکٹروں نے اس کے حالات پوچھے۔ اور مرٹرونا نے بھی باتوں باتوں میں اسے سب کچھ بتا دیا اور پھر وہ ہنس پڑا۔

"تمہیں ہنسی کس بات پر آئی؟" ڈاکٹر نے کہا

"نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن وہ پہلی سی زندگی کی مجھے آج محسوس ہوا ہے۔"

بیتے ہوئے دن یاد کرکے مرٹرونا کے دل میں اب بھی اپنے شوہر کا خیال آتا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اور اسکی محبت بالکل اندھی تھی۔

وہ عورت تھی اور محبت کے باب میں بالکل اندھی۔ اب وہ سوچتی کہ شوہر کا سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔ اب وہ جب کبھی بھی اس کے ساتھ بات کرتی تو بہت سنبھل سنبھل کر۔ وہ اب بالکل یہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکا شوہر کسی بات پر بھڑک کر گالیاں بکنے لگے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے دل میں یہ شک بھی گزرتا کہ شاید وہ کبھی بھی صلح و امن کی زندگی نہ گزار سکیں گے۔ اور پھر وہ یہ بھی سوچتی کہ گریگوری کی اب وہ پہلی حالت نہیں رہی۔ اور اب اسکا غصہ گھٹ گیا ہے۔

قسمت ہی کی بات تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی گئے دونوں جوان اور محنتی تھے۔ اور روزانہ زندگی کے لئے بہت محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ لیکن پھر بھی زندگی کی الجھنیں ان کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اور گریگوری کا بے چین دل تو کبھی بھی مطمئن نہ رہتا تھا۔ وہ اس روز روز کی سخت محنت سے بالکل عاجز آ چکا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن شام کو ایمبولنس کار اسپتال کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی اور ڈرائیور نے بتایا کہ وہ سینٹ پیٹرز کوٹ کے احاطے سے ایک اور مریض کو لایا ہے۔ یہ وہی اس لڑکے کو اٹھا رہا تھا۔ اسکی سانس بہت رک رک کر چل رہی تھی۔

"کون سینکا!" گریگوری نے کھینچی آواز میں کہا "ارے تو نے مجھے پہچانا۔"

ہاں۔ سینکا نے بہ دقت جواب دیا۔ اس نے اپنے سر کو آہستہ آہستہ حرکت دی اور لوف کی طرف جو کہ اسٹریچر کو سر کی طرف سے پکڑے تھا۔ دیکھتے ہوئے کہا۔ اورلوف کو ایک دھچکا لگا۔ سینکا کی حالت خراب تھی۔ اور اورلوف کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھ رہا کہ

"آخر لڑکوں کو یہ بیماری کیوں ہوتی ہے؟"

سینکا کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اور وہ بالکل خاموش تھا — انہوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اور اس کے نجس اور گندے چیتھڑے کو اتارنے لگے۔ اسکا تمام جسم غلاظت میں تر بتر تھا۔

"میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے" سینکا نے کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔ ابھی ہم تمہیں گرم پانی سے نہلاتے ہیں اور تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے" گریگوری نے اسے تسلی دی۔

نہیں اب میں اچھا نہیں ہوں گا۔ گریگوری چچا۔ ذرا میری ایک بات تو سن لو۔ میں نے کسی کوٹ کا بوجھ چرایا ہے۔ چوری کے بعد آج بیس دن ہو گئے کہ میں نے پہلی بار اسے بیچا تھا۔ اور اسی دن مجھے ہیضہ ہوا۔ گریگوری چچا میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور یہ اسی کی سزا ہے۔ میں نے زینے کے نیچے دبا دیا۔ پڑا ہوا ہے اور پھر اس کے اوپر کچھ لکڑی وغیرہ ڈال کر چھپا دیا تھا۔ چچا اسے کسی طرح سے پھیر دو۔ کسی کوٹ کی ایک بہن بھی ہے جو وہاں آئی ہوئی تھی۔ اس نے بابے کو مانگا بھی تھا۔ چچا تم اس کو واپس کر دینا۔" کہتے کہتے سینکا درد سے تڑپنے لگا۔ اور پیٹ میں سخت درد اٹھ رہی تھی۔

سینکا کو بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن مرض اس کے کمزور جسم پر پورا قابو پا چکا تھا۔ آخر شام کو اورلوف اسکی لاش کو مردہ خانہ میں پہنچا آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسکا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔

وہاں مردہ گھر میں اسنے چاہا تھا کہ وہ سینکا کے ہاتھ پیر تو سیدھے کر دے۔ لیکن وہ سب بہت جلد اکڑ گئے تھے کہ وہ انہیں پھر ٹھیک بھی نہ کر سکا۔ اور اسی طرح سے بے چین۔ تھکا ہوا اور افسردہ دل ہی دل میں روتا ہوا وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس کے ذہن میں سینکا کا اکڑا ہوا جسم سمایا ہوا تھا۔ ایک دن یہی لڑکا کتنا نس مکھ اور تیز تھا۔

آج وہ موت کے سامنے کتنا مجبور نظر آ رہا تھا۔ اس نے سینکا کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ڈاکٹروں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن وہ مر گیا۔ اس کے دل میں یکبارگی بغاوت کا طوفان اٹھنے لگا۔ ایک دن شاید اسے بھی ہیضہ ہو جائے اور اسکی نس نس کو توڑ کر رکھ دے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اور پھر اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ کاش وہ کسی سمجھدار آدمی سے اسکے متعلق بات کر سکتا۔ کئی مرتبہ طالب علموں سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی۔ لیکن انہیں فلسفیانہ خیالات کے لئے فرصت ہی نہ تھی۔ اب سوائے اس کے کہ وہ بیوی سے جا کر بات کرے چارہ ہی کیا تھا۔ اور وہ ویسا ہی افسردہ اس کے کمرہ کی طرف چل پڑا۔

ماٹرونا اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ سماور میز پر کھا ابل رہا تھا اور پانی کے ابلنے کی آواز تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

گرگوری کمرے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور اپنی بیوی کو ہنستے دیکھتا رہا۔ کمرے کے اندر پانی کی سنسناہٹ کی آواز صاف ہو رہی تھی۔ باہر قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اور گرگوری چپ چاپ قدموں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔
یکبارگی اسے اپنی بیوی کے کندھے سیسیلا کے کندھوں جیسے معلوم ہونے لگے۔ ویسے ہی سرد اور آگے کو جھکے ہوئے۔ اور وہ یکبارگی کہہ اٹھا۔

"سیسیلا مر گیا" اس نے ڈوبی ہوئی آواز سے —— بیوی کو بغیر مخاطب کئے ہوئے کہا۔ "سیسیلا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس نے اسکی کوشش کی تھی کہ یہ نہ مانگے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" گرگوری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

بڑا شیطان تھا۔

لیکن اب تو وہ مر چکا ہے۔ ایسی بات کہنے سے فائدہ۔
بہرحال اس کی موت افسوسناک ہے۔ وہ بڑا تیز تھا۔ ہمارے کسٹمر کا باپ تھا نا۔ خیر وہ لڑکا بہت تیز اور ہوشیار تھا۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ اسے اپنے پاس لے لوں اور رکھ سکوں۔ اور بیچارہ یتیم تھا۔ ہم اس سے اولاد کی طرح محبت کرتے۔ ویسے تو تم ابھی جوان ہو اور تندرست ہو۔ لیکن کاش ہمارے ایک بچہ ہوتا۔ تو شاید ہمارا دل بہلاوا ہو جاتا۔ اور پھر زندگی بھی اتنی دوبھر نہ معلوم ہوتی۔ یہ ہم جو اتنی محنت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ کیا صرف پیٹ بھرنے کے لئے۔ کہ ہم اور محنت کر سکیں۔ اور پھر صرف پیٹ بھریں۔ آخر اس پاگل پن کی کوئی حد بھی ہے۔ ہاں اگر ہمارے اولاد ہوتی تو اور بات ہوتی۔

کہتے کہتے اس نے گردن جھکا لی۔ اور اس کے لہجے میں شکایت بھری ہوئی تھی۔ مٹرونا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اور اس کی بات سن کر وہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔

"ہم دونوں ہی جوان ہیں۔ دونوں تندرست ہیں۔ پھر ہمارے اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے۔ میں یہی سوچا کرتا ہوں۔ اور پھر عاجز آکر شراب خانے چلا جاتا ہوں۔"

"یہ سب بکواس ہے" مٹرونا نے چیخ کر کہا۔ ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ تم محض عیاشی کے لئے شراب پیتے ہو۔ اور یہ محض بکواس ہے۔ اور جب وہ بچارا ہماری تمہاری اپنے آپ پر ذمہ داری قبول نہیں۔

گرگوری بھنا بھنا اٹھا۔ اور پھر کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ تاکہ مٹرونا کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ یہ دیکھ مٹرونا سے ایسی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس نے اسے ایسی باتیں کرتے نہ سنا تھا۔ نہ اس نے کبھی طعنہ دیا تھا۔ اور نہ اس کا اس طرح سے غصہ بڑھایا تھا۔

اچھا۔ گرگوری نے کرسی کی بانہہ پکڑتے ہوئے کہا۔ ہاں تو اور کیا کہنا چاہتی ہو۔

بہت کچھ۔ میں تمہارے لئے کوئی لڑکا پیدا کر لیتی ... کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ شراب میرے دل کا کانٹا نہیں ہو گا۔ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

"بس اب چیخ مت۔" اس کے شوہر نے کہا۔

"کیوں نہ چیخوں۔ یاد ہے تم نے مجھے کتنی بار انتہائی بے رحمی سے پیٹا ہے۔ کتنی بار تم نے میرے پیٹ پر لاتیں ماری ہیں۔ کیوں اور انہیں یاد کرو جو تم نے کیسے مجھے پیٹا ہے۔ تمہارے گھونسوں نے میرا کتنا خون بہایا ہے۔ میرے تن مر گئے۔ خون میں تر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ تمہیں خود شرم آنی چاہئے اور مجھے اپنی صورت نہ دکھانی چاہئے۔ اپنے بچوں کے قاتل تم ہو۔ اور پھر مجھے الزام دیتے ہو۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا اور تمہیں معاف کرتی رہی۔ لیکن تمہارے ان الفاظ کو مرتے دم تک کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کیوں تم نہیں جانتے کہ اگر میرے اولاد نہیں ہوتی تو قصور تمہارا ہے۔ تمہاری مار پیٹ کا ہے۔ کیا میں دوسری عورتوں سے الگ ہوں۔ میرا دل اولاد کے لئے بے چین نہیں ہوتا؟ معلوم نہیں۔ کتنی راتیں میں نے گڑگڑاتے گزار دیں کہ تمہاری مار سے خدا میرے پیٹ کے بچے کو محفوظ رکھے۔ لیکن تم ظالم، سفاک، قاتل۔ تم نے کبھی مجھے نہیں سمجھا۔ دوسری عورتوں کے بچے دیکھ دیکھ کر میں فدا ہو جاتی۔ میں اولاد چاہتی تھی۔ سیسیلا کو بھی بیٹے کی طرح چاہنے کی خواہش کرتی۔ ہائے اللہ۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکی۔ لیکن اس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی رہے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ دل میں ہوک اٹھ رہی تھی۔ اور الفاظ اس کے گلے کو چیر رہے تھے۔

گریگوری بالکل مبہوت ہو کر اسے تک رہا تھا۔ اس نے اس عورت کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے کبھی ایسی باتیں کرتے سنا تھا۔ اب وہ اس عورت سے ڈر رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ اچھل کر اس کا گلا نہ دبا دے۔ لیکن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ شیرنی سی معلوم ہو رہی تھی۔ روز کی طرح اسے اسی وقت پیٹ دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آج مرونہ کے چہرے پہ ایک جنون تھا جو گریگوری کو کمزور بنائے دے رہا تھا۔

"تم نے میری روح کو زخمی کر دیا ہے۔ تم نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں اب تک سب کچھ سہتی رہی اور میں تم سے کچھ صرف اس لئے نہ کہتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتی تھی۔ لیکن تمہارے یہ ظلم میری برداشت سے باہر ہیں اور میں ان کی تاب نہیں لا سکتی۔ خدا تجھے جہنم رسید کرے۔"

"چپ رہو کم بخت" گریگوری نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔ "سنو۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ کیا تم اس وقت بھول رہی ہو کہ تم کہاں ہو۔"

گریگوری جوش اور غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ اور اس نے دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھا اور فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ مرونہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر آخر کار وہ ٹٹولتی ہوئی اپنے بستر پر گر پڑی۔

اندھیرا چھا چکا۔ مسکراتا ہوا چاند اس کا حال پوچھنے کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بادل چھا گئے اور بارش ہونے لگی۔

کھڑکی کی کھٹ کھٹ اور کھڑکی کے شیشوں پر پانی کی ٹپ ٹپ ایک بہت ہی ہم آہنگ نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ مرونہ اسی طرح بے سدھ پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کی ابھری ہوئی آنکھیں چھت کی طرف لگی تھیں۔ دانت بھنچے ہوئے تھے اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پانی اسی طرح سے گر رہا تھا۔ جیسے اپنی بات منوانے کے لئے کوئی کسی بات کو بار بار ایک ہی لہجے میں دہرائے چلا جا رہا ہو اور بار بار اس پیہم اصرار کے اس کے لہجے میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ جیسے بڑی سے بڑی بے التفاتی بھی اسے اس کی التجا سے نہ روک سکے گی۔

دن نکلنے تک بارش ہوتی رہی۔ وہ مرونہ بھی تمام رات سو نہ سکی۔ مانو تمام بارش کے قطرے اس سے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا ہو گا۔

جواب کیا اسے اپنی نظر کی شراب میں مدہوش تصویر نظر آتی تھی؟ لیکن اب اس کے لئے ایک محبت بھری زندگی کے خواب کو بھلانا ناممکن تھا وہ اب تک اس خواب کے سہارے زندہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر ایک نہ ایک دن سیدھے راستے پر آ جائے گا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب اگر اس نے ایک بار بھی شراب پی لی تو پھر وہ قابو میں نہ آ سکے گا۔ اس کے شراب خوری کے دنوں کی یاد اس کے لئے بہت تلخ تھی۔ اور اب جبکہ کچھ دنوں سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امن سے رہ رہی تھی تو اسے گذشتہ ایام دوزخ سے بھی بدتر نظر آ رہے تھے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی اس دنیا کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن وہ پھر بھی عورت تھی۔ اور اپنے تمام دکھوں کو قسمت پر ٹال دیتی۔

"یا اللہ یہ سب کیا تھا۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی خونخوار درندہ تھا جس کی زنجیر ٹوٹ گئی ہو

اب اجالا ہو چلا تھا۔ اگرچہ کھیتوں پر کہر ابھی تک طاری تھا۔

"مرونہ اٹھو۔ ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو گیا۔"

یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور آہستہ آہستہ اسپتال کی طرف چل دی۔ آج وہ کچھ سست نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں اور ستے چہرے نے ہر ایک کو متاثر کیا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے"، ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"ہم سے بتانے میں کیا بات ہے۔ تمہاری جگہ آج کسی اور کو بلایا جائے۔"

مرونہ کو بہت شرم معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ کوئی دوسرا اس کے بھید سے واقف ہو۔ یہ ڈاکٹرنی اگرچہ اس پر بہت مہربان تھی۔ لیکن پھر بھی اجنبی تھی۔ اور پھر کوشش کر کے وہ ہنسی۔

"کوئی بات نہیں۔ ذرا ہم میاں بیوی میں بول چال ہو گئی تھی۔"

لیکن کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

"بے چاری۔" کسی کو کیا معلوم تھا کہ خود اسکی زندگی میں کیا بھید ہے۔

مرّوہ کا دل اُمڈ آیا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس عورت سے لپٹ کر خوب روئے۔ لیکن اُس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی اور ہونٹوں تک آئی ہوئی کراہ کو زبردستی دانت تلے بھینچ کر روکا۔

کام ختم کر کے جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں جا کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ نیچے ایمبولنس اسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ شاید کوئی اور نیا مریض آیا ہو۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور نیچے اب کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مرّوہ وہاں سے ہٹ آئی اور میز پر آ کر بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھی یونہی ایک طرف کو تکتی رہی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ہر آواز پر چونک اٹھتی۔ جہاں برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھتی اور دروازے کی طرف دیکھ لیتی۔

لیکن جب آخر کار دروازہ کھلا۔ اور گرگوری اندر آیا وہ اسی طرح سے بے تعلق بیٹھی رہی۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ جیسے اُس کے سینے پر ایک سِل رکھ دی گئی ہو۔ اور اسے بے طرح دبائے جا رہی ہے۔

گرگوری پہلے تو آ کر دروازے میں تھوڑی دیر رکا اور وہیں سے اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی اتار کے فرش پر پھینک دی۔ اس کے تمام کپڑے پانی میں تر بتر تھے۔ اور چھپ چھپ کرتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر بیوقوفوں جیسی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل بدصورت نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا شکل بنائی ہے؟" مرّوہ نے کہا۔

اور اس نے عجیب نامعقولیت سے سر ہلا دیا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پیروں پر پڑ کر معافی مانگوں؟"

مرّوہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آیا اس معاملے میں میری غلطی ہے کہ نہیں۔ لیکن اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلطی میری ہی تھی۔ اور اسی وجہ سے میں تم سے پوچھ رہا تھا میں تمہارے پیروں پر گر کر معافی مانگوں۔

وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔ اور بوف کے منہ سے واڈکا کی تیز بُو آ رہی تھی۔ اور اسکا دل بیٹھا جو رہا تھا۔

"میں زیادہ نخرے نہیں برداشت کر سکتا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے معاف کر سکتی ہو یا نہیں۔" گرگوری نے چیختے ہوئے سوال کیا۔

"اسوقت تم نشے میں ہو۔ بہتر ہے کہ جا کر سو جاؤ۔" مرّوہ نے گہری لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ ہے۔ مجھے بالکل نشہ نہیں ہے۔ ہاں میں ذرا تھک گیا ہوں۔ میں ابھی تک بیٹھے ہوئے یہی بات سوچ رہا تھا۔ اور میں یہ سب سوچ رہا تھا۔ اچھا اب ہوشیار ہو جاؤ۔"

اس نے اسکی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شیطنت بھری آواز سے کہا۔

"منہ سے کیوں نہیں بولتی؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"اچھا کیوں؟"

اس کی آواز میں سختی تھی اور اسکی مٹھیاں بھنچ رہی تھیں۔

"دیکھ! کل تو نے یہاں میری بیعزتی کی تھی۔ مجھ پر چیخی چلائی تھی اور اب میں ہی تجھ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ اچھی طرح سے سمجھ لے اس بات کو۔"

اسکی آواز میں دھمکی تھی۔ اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ مرّوہ اسکا مطلب خوب سمجھ رہی تھی۔ اسکی نظروں میں وہ کوٹھڑی والی زندگی اور سینکڑوں شامتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ مار پیٹ۔ وہ عقوبت اور وہ دوزخ۔ اس کے ذہن میں پھیل رہی تھی۔ اب اس میں اُس زندگی کو برداشت کرنے کی قوت نہ رہ گئی تھی۔

"میں خوب سمجھ رہی ہوں۔ تم میں وہی درندگی پھر کروٹ لے رہی ہے۔"

"درندگی؟ پھر میری زندگی سے تمہاری زندگی میں کیا فرق

پڑتا ہے۔ میں تو تم سے صرف معافی چاہتا ہوں۔"

"گریگوری! بس، اب تم چلے جاؤ" مٹرونہ نے روتے ہوئے کہا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"چلا جاؤں!" وہ شیطانی ہنسی ہنسا۔ "اور تمہیں رنگ رلیاں منانے کے لئے چھوڑ دوں۔ یہ چرتر کہاں سے سیکھا" کہتے کہتے اس نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔ اور ایک زنگ آلود چاقو نکال کر کھول لیا۔

"کمبخت تو مجھے ماربھی ڈال" کہتے کہتے اس نے اسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور خوف سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر مٹرونہ کے لہجے نے الفاظ سے زیادہ اثر ڈالا۔ یہ بات تو اس نے کئی بار پہلے بھی کہی تھی۔ لیکن کبھی اسکا لہجہ ایسا نہ تھا۔ پہلے تو وہ چھوٹتے ہی ہاتھ چلا دیتا تھا۔ لیکن آج اسے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ اور اس نے چاقو کو میز پر پھینک دیا۔ جیسے وہ اس کے الفاظ سے ڈر گیا ہو۔

"چڑیل! تو مجھ سے آخر کیا چاہتی کیا ہے؟" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

"میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی۔ تو مجھے مارنے آیا ہے۔۔ مار ڈال!"

گریگوری بالکل بوکھلا سا گیا۔ وہ حیرت سے اسکا منہ تکنے لگا۔ آج وہ یہ سوچکر آیا تھا کہ آج وہ اپنی بیوی کو دبا لے گا۔ کیونکہ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کل شام کو اسکی بیوی نے اسے دبا لیا تھا اور یہ اسکی بے عزتی ہے۔ لیکن آج اس نے اپنی بیوی کو زیر کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے نیچا دکھائے گا۔

اور یہ سوچ سوچ کر اسکا غم دم بدم بڑھ رہا تھا۔ پھر بیوی کے لگائے ہوئے الزامات [illegible] اور تلخ معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ ٹھیک تھے۔ گریگوری جھنجلا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ مٹرونہ بغاوت پر آمادہ ہے اور وہ اسی لئے چاقو لے کر چلا تھا کہ اگر مٹرونہ نے مقابلہ کیا۔۔۔ تو وہ اسکا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن یہاں نقشہ ہی الٹا تھا۔ مٹرونہ نے کوئی جدوجہد نہ کی۔ وہ اس کے سامنے مرنے کے لئے بالکل تیار کھڑی ہو گئی۔ اور یہ ایسی صورت ہو گئی تھی۔ جسے اس نے [illegible] سوچا بھی نہ تھا۔ اور مٹرونہ کی پہلی بے بسی نے اسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا تھا۔ مٹرونہ کی اس سنجیدگی نے گریگوری کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

"سُن۔ اب اتنی اونچی نہ اُڑ۔ میں تیرے سینے میں چاقو اتار سکتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لے۔ سُن۔ میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔"

فوراً ہی یہ سمجھا کہ یہ گفتگو بالکل مہمل سی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ بالکل چپ ہو گیا۔ مٹرونہ بھی ویسے ہی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک سوال چکر لگا رہا تھا

"اب کیا ہوگا؟"

"مٹرونہ" گریگوری کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "میں مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری غلطی ہے۔ لیکن اب ہو گیا!" اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"اُف یہ زندگی۔ تم اسے زندگی کہتی ہو۔ ٹھیک ہے کہ ابھی تک ہیضے کے مریض آ رہے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری زندگی اسکی وجہ سے کہاں آسان ہوئی۔ ہیضے کے مریضوں میں کچھ مرتے ہیں تو کچھ اچھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں تو اسی طرح سے زندہ ہوں۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ بس ایک وبال ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے پوری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا۔ اب میں یہ زندگی بالکل نہیں بسر کر سکتا۔ ان مریضوں کو دیکھو۔ انکی کیسی تیمارداری ہوئی۔ میری بھی تو روح بیمار ہے۔ اور کیا مجھے تیمارداری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ہیضے کے مریضوں سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔ میری روح میں مروڑے اُٹھ رہے ہیں۔ چاہے تم مجھے اس کے لئے ظالم کہو۔ شرابی کہو!"

گریگوری یہ الفاظ بہت آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ لیکن مٹرونہ کا دھیان دوسری طرف تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسکا دماغ وہ تکلیفیں جو جھیل چکی اسوقت محسوس کر رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔

"اب تم بالکل نہ بولوگی؟" گریگوری کے جذبات اُمنڈ آئے۔ "تم بولتی کیوں نہیں! آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔ کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر تم خود کیا چاہتے ہو؟" مٹرونہ نے رُک رُک کر جواب دیا۔

"میں کیا چاہتا ہوں۔ میں۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں۔۔۔"

لیکن پھر گریگوری کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا جس سے اسکی خواہش ختم ہو جائے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب اسکے اور مٹرونہ کے درمیان ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اور ان دونوں [illegible] میں ایک سمجھوتہ

اس کو پاٹ نہ سکیں گے۔

پھر اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اور اس نے تان کر مٹرونا کے ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اور سے پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگا۔ "منہ کی کھائی۔ آخر تو جانتی ہے۔ میں تجھے مار کر رکھ دوں گا۔"

گھونسہ پڑتے ہی مٹرونا کا سر میز سے جا ٹکرایا۔ لیکن وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور انتہائی نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پھر مار" وہ انتہائی نفرت انگیز لہجے میں چلائی۔

"چپ رہ"

"آ۔ پھر مار"

"او۔۔ او۔۔ بڑیا کہیں کی"

"بس۔ بہت ہو چکا۔ گریگوری۔ بس اب ہو چکا۔"

"چپ"

"بس اب تم میرے ساتھ من مانی نہیں کر سکتے۔"

وہ دانت پیستا ہوا کچھ پیچھے ہٹا۔ شاید وہ دوسرا حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی لمحہ ڈاکٹر داس جھٹ کمرے میں آ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم اس جگہ کو کیا سمجھتے ہو۔ آخر تمہارا اس حرکت سے مطلب کیا ہے؟"

ڈاکٹر کے چہرے سے حیرت و خشونت کا بیک وقت اظہار ہو رہا تھا۔

لیکن گریگوری نے ان الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ وہ ڈاکٹر کے سامنے تعظیماً جھکا بھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ذرا سی میاں بیوی کی گرما گرمی تھی۔"

اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا

"تم کل کام پر کیوں نہ آئے" ڈاکٹر نے اسکی بے حسی پر غصہ ہوتے ہوئے کہا۔

گریگوری نے یونہی کندھوں کو جنبش دی۔

"مجھے تھوڑا سا ذاتی کام تھا اس وجہ سے نہ آیا۔"

"کل رات کون یہاں جھگڑا کر رہا تھا"

"ہم۔ ۔ ۔ ۔"

"تم۔ بہت خوب۔ اور تم سمجھ رہے ہو کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ بغیر پوچھے جب جہاں چاہتے باہر چلے گئے۔"

"ہم تمہارے غلام نہیں ہیں۔ کیونکہ۔ ۔ ۔"

"خاموش۔ تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ بدتمیز۔ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

گریگوری کے دماغ میں یک بارگی بغاوت کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کو برباد کر دے۔ ہر چیز توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اب وہ موقع آ گیا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کر سکتا تھا۔ آج وہ ان تمام بیڑیوں کو جو اسکی روح کو جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈالے۔ اسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور پھر اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

"چلا جاؤ یہاں سے۔ نہیں تو گلے کی نالی پھٹ جائے گی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم مذبح خانے میں ہیں۔ جہاں جانوروں کے بدلے انسان ذبح کئے جاتے ہیں۔"

"کیا۔ کیا کہا تم نے؟" حیران ڈاکٹر اسکی طرف بڑھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم خود سب جانتے ہو۔ باندھو مٹرونا اپنا سب۔"

"نہیں یہ سب کچھ نہیں۔ پہلے تم میری بات کا صاف صاف جواب دو۔ نہیں تو میں۔ ۔ ۔"

"بس بس چلا کر ساری دنیا کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

گریگوری نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ جیسے جیسے وہ بولتا جاتا تھا اسکا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ بیمہ نے تمہیں یہ حق دے دیا ہے کہ تم جو چاہو وہ کر سکتے ہو۔ تم کچھ نہیں ہو۔ اور تمہاری دوائیں وغیرہ اب فریب ہیں۔ ہاں اسکو ذبح خانہ کہنا شاید غلط ہو۔ اور میرے منہ سے غلط بات نکل گئی ہو۔ لیکن پھر بھی تمہیں اس طرح چیخنے کا کوئی حق نہیں۔"

"یہ کیا؟ اچھا اب تم ادھر آؤ۔ میں بھی تمہیں ایک آدھ حق دوں؟"

لوگ شور سن کر برآمدے میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گریگوری نے بھویں سکوڑ کر کہنا شروع کیا۔

"میں کوئی جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں لیکن آپ کے جانے سے پہلے میں بھی وہ ایک بات بتا دوں؟"

"ضرور کہو۔"

"شہر جا کر میں سب کو بتا دوں گا کہ آپ لوگ بیمہ والے کیسے علاج کرتے ہیں۔"

"یہ کون سی بات ہے ؟"

"جی وہاں آگ و آتشبازی کی وصولی دی جاتی ہے ۔"

"یہ کیا نامعقولیت ہے ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو"۔ ڈاکٹر کچھ سنجیدہ ہو اُٹھا تھا ۔ وہ اب تک اسے ایک اچھا اور محنتی کارکن سمجھتا تھا ۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں وہ اس قسم کی اختراپردازی کر رہا تھا ۔

"بے وقوف ! کیا کہہ رہا ہے ؟"

"بے وقوف" ۔ گریگوری نے ڈاکٹر کی بات دُہرائی ۔ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے الفاظ درست ہیں ۔ لیکن اس لفظ کو اس نے اپنی بےعزتی سمجھا ۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ۔ اسے سمجھتا بھی ہوں اور ٹھیک بھی ہے میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں ۔ کہتا ہوں ۔ میں سچی بات چھپاتا نہیں ۔ اچھا مٹروونا ! اب یہاں سے چل ۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی" مٹروونا نے صاف جواب دیا ۔

ڈاکٹر نے دونوں کو بیک وقت دیکھا ۔ اور پھر اس نے اپنی پیشانی پہ ہاتھ پھیرا ۔ اسکی سمجھ میں بات نہ آرہی تھی ۔

"تم نشے میں ہو ۔ اور ہوش سے باہر ۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو ؟"

گریگوری اب بھی اپنی بات پر جما تھا ۔ آپ ہیضہ کے مریضوں کا علاج کر رہے ہیں لیکن تندرست زندگی سے عاجز آکر مرتے جا رہے ہیں مٹروونا "اگر تو فوراً نہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں تیرا سر توڑ دوں گا ۔"

مٹروونا کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ۔ لیکن اس کے چہرے سے بلا کی متانت اور پختہ عزم کا اظہار ہو رہا تھا ۔ گریگوری باوجود انتہائی جوش میں تھا لیکن اس سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا ۔

"لاحول ۔ اس کمبخت کو خود بھی ہوش نہیں کہ وہ کیا بک رہا ہے ۔"

"بس اب یہاں سے نکل جا ۔ اسی کو غنیمت سمجھ کہ میں تجھے جیل نہیں بھجوا رہا ہوں ۔ اب فوراً یہاں سے نکل جا ۔"

گریگوری کی گردن جھک گئی ۔ اگر اسکی ان لوگوں نے پٹائی کی ہوتی یا اسے جیل بھجوا دیا ہوتا تو وہ اتنا بُرا نہ محسوس کرتا ۔

"تو آتی ہے کہ نہیں ۔ بس یہ آخری سوال ہے" ۔ گریگوری نے گلوگیر آواز میں اپنی بیوی سے کہا ۔

"نہیں ۔ ہرگز نہیں" ۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا جیسے وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں گریگوری پھر مکا نہ مار دے ۔

"تم سب جہنم میں جاؤ ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ۔"

"چل ۔ دفع ہو یہاں سے" ۔ ڈاکٹر نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا ۔

"چپ رہو جی ۔ بڑا آیا طرم خان کا بچہ ۔ میں تو جا رہا ہوں ۔ اچھا شاید اب ہم ملیں نہ ملیں ۔ لیکن اگر کبھی کہیں اور ملے تو پھر تمہاری خیر نہیں ۔"

اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا ۔

"خدا حافظ" ۔ ڈاکٹر نے طنزاً کہا ۔

گریگوری چلتے چلتے رک گیا ۔ اسکی آنکھوں سے کرب و بےچینی کا اظہار ہو رہا تھا ۔

"بس اب مجھے نہ چھیڑو ۔ اور مجھے غصہ نہ دلاؤ ۔ بہتر ہے کہ تم اپنی گردن سلامت لے جا رہے ہو ۔ اسکو غنیمت جانو ۔"

اس نے فرش پر سے ٹوپی اٹھائی ۔ اسے پہنا ۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ چلتے وقت اس نے اپنی بیوی پر آخری نظر بھی نہ ڈالی ۔

ڈاکٹر مٹروونا کو دیکھ رہا تھا ۔ اسکا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا ۔

"اسے کیا ہو گیا ہے" ۔ ڈاکٹر نے گریگوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔

"مجھے نہیں معلوم ۔"

"اب وہ کدھر گیا ہوگا ؟"

"شراب خانے" ۔ مٹروونا نے بغیر جھجک کے جواب دیا ۔

ڈاکٹر نے ایک بار نظر اٹھائی ۔ اور کمرے کے باہر نکل گیا ۔

مٹروونا کھڑکی میں سے جھانکی ۔ باہر ایک انسانی شکل جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی بارش و ہواؤں میں سے گزرتی ہوئی جا رہی تھی ۔ بالکل تنہا ۔ کھیتوں میں سے ہو کر شہر کی طرف ۔

مٹروونا کا چہرہ اور سفید ہو گیا ۔ وہ اپنے کمرے کی عبادت گاہ کے پاس گئی ۔ اور حضرت مریم کے سامنے جھک گئی ۔ وہ ایک ہی دُعا کو بار بار دہرا رہی تھی ۔ اور اپنے گلے اور سینے کو سہلاتی جاتی تھی ۔

× × × ×

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھے اپنا صنعتی اسکول دکھانے کے لئے مدعو کیا ۔ اسے اپنے اس اسکول سے بہت محبت تھی ۔ اور وہ اسے اپنی عزیز اولاد کی طرح سے سمجھتا تھا ۔ اور ہر ایک کو دکھانے کی کوشش کرتا ۔ اسے اپنے اسکول پر فخر تھا ۔ اور وہ کہنے لگا کہ معلوں کا نوجوان طبقہ

کس طرح سے ہم سے قربانی کر رہا ہے۔ اور اس اسکول کی نیک نامی کے لئے تو وہی سب کچھ ہے۔ آپ چاہیں تو آپ اپنا بچہ جو تمہاری کی کلاس کو دیکھ لوں۔ اس کی معلمہ دوسروں کے لئے مشعلِ راہ سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ پیدائشی معلمہ ہے۔ اسے اپنے طالب علموں سے بالکل ماں جیسی محبت ہے۔ اگرچہ اسے صرف ۱۱ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اسی تنخواہ پر دن رات محنت کرتی ہے۔ بلکہ دو غریب طالب علموں کی کفالت بھی کرتی ہے۔ آپ اس سے ضرور ملئے۔ آپ کو اس سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔

میرے دوست کی تعریف نے میرے شوق پر تازیانہ کا کام کیا اور میں اس سے ملنے دوسرے ہی دن اسکے گھر پہنچ گیا۔ اور یہیں مجھے مٹرونہ اور روف نے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ اور روف سے الگ ہو جانے پر بھی اور روف نے اسے چین نہ لینے دیا۔ وہ آکر اسے ستاتا۔ شراب کے نشے میں بدمست وہ مارپیٹ بھی کرتا۔ وہ اکثر سڑکوں پر کھڑا اسکا انتظار کیا کرتا۔ کہ اگر مٹرونہ نکلے تو اسے ستائے اور مارپیٹ اور جھگڑا کرے۔ لیکن مٹرونہ نے سب کچھ برداشت کیا۔

آخر جب ہسپتال بند ہو گیا تو ڈاکٹروں نے اسے اس اسکول میں سفارش کر کے رکھوا دیا۔ ایک نرس نے اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ اور اس کے بعد مٹرونہ کی زندگی پرسکون ہو گئی تھی۔ وہ یتیم خانے سے دو بچوں کو پرورش کرنے کے لئے لے آئی تھی۔ اور انہیں بہت عزیز رکھتی۔ اپنے طالب علموں کے لئے وہ ہر محنت اور مشقت کے لئے تیار رہتی۔ ان کے لئے بڑی سے بڑی محنت بھی آرام کے مترادف تھی۔ اسکی اس محنت اور جانفشانی نے اس کے لئے دوسروں کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اب وہ بالکل مطمئن تھی۔ لیکن ماضی کی درد بھری یاد اب بھی اس کی آنکھوں میں جھلکتی تھی۔ اسے بہت ہی بری قسم کی کھانسی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے اور رخسار مرجھا گئے تھے۔

مجھ سے گریگوری کی بھی ملاقات ہوئی۔ وہ شہر کے بدترین علاقوں میں رہتا تھا۔ میں دو تین ہی ملاقاتوں میں اسکا دوست ہو گیا۔ اس نے بھی اپنی زندگی کی داستان قریب قریب وہی کہی جو مٹرونہ نے بیان کی تھی۔ اور کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا :-

یہ ہے میری رام کہانی۔ سوچتا تھا کچھ دن کے لئے میں ابھرا لیکن پھر نیچے گر جاؤں گا۔ اور میں زندگی کا وہ بڑا کام جسے کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا۔ لیکن اسکی چاہت اب بھی میرے دل میں ہے۔ میں اب بھی چاہتا ہوں کہ اس زمین کو جس کو ٹھوکر کر دوں۔ یا آگ لگا کر سرد ہو جاؤں۔ کوئی بھی غیر معمولی اور اہم کام کر ڈالوں جو مجھے عام لوگوں سے بلند و بالا اٹھا دے۔ تاکہ میں وہاں سے ان پر تھوک سکوں۔ اور ان سے کہوں کہ زمین پر رینگنے والے کیڑو تمہاری حیثیت کیا ہے۔ تمہاری زندگی کتوں سے بدتر ہے اور پھر تم اسکو زندگی کہتے ہو۔ اور اس کے بعد میں خود اس بلندی سے سر کے بل آ پڑوں یعنی خاتمہ۔ یہ زندگی کس قدر غلیظ اور بے مزہ ہے۔ جب میں نے مٹرونہ کو چھوڑا تھا تو میں نے کہا تھا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ اب مزے ہی مزے ہیں۔ لیکن جیسے دن رات کی روانی ہی رک گئی ہو۔ زندگی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ لیکن میں پھر بھی دنیا کو ضرور دکھا دوں گا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میری بیوی . . . . لعنت بھیجو بیوی پر۔ میرے جیسے انسان کو بیوی کی کیا ضرورت۔ یا پھر اسکو میری کیسی حاجت۔ وہ تو جیسے چاروں طرف سے الجھنیں گھیرے ہوں۔ میں ہمیشہ سے ناآسودہ رہا۔ اسے کبھی بھی سکون نہ ملا۔ آوارہ گردی میری فطرت میں ہے۔ میں ہر جگہ پھرا۔ چلا۔ گھوما۔ لیکن کہیں سکون نہ ملا۔ شراب۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں۔ وودکا۔ اف یہی ایک چیز ہے۔ جو میرے دل کی آگ کو بجھاتی ہے۔ اس میں آگ بجھانے کی بہت بڑی صلاحیت ہے۔ میں ہر چیز سے تنگ آ گیا ہوں۔ شہر۔ دیہات۔ آدمی۔ چھوٹے۔ بڑے۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا اس سے بہتر اور کچھ بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ہر آدمی دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہے۔ ہر شخص درندہ ہے۔ سفاک ہے بھیڑیا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ سب کو پیس کر رکھ دوں۔ یہ دنیا شیطانی کارنامہ ہے۔

شراب خانے کا دروازہ۔ بار بار کھلتا اور بند ہوتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے یہ ایک اژدہا ہو اور ایک ایک کر کے تمام روسیوں کو نگلے جا رہا ہو۔ خواہ وہ آسودہ ہوں یا ناآسودہ۔

یہ ناولٹ بھی ضرور ملاحظہ فرمائیے

سیندور جب راکھ بن جاتا ہے تو ——— پیار کے ریشمی تار میں بندھے ہوئے دو دل ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ واقعی جُدا ہوتے ہیں؟ ——— اس کا جواب

کشمیری لال ذاکر نے اپنے ناولٹ

سیندور کی راکھ

میں دیا ہے

جو مختصر سی ازدواجی زندگی کی دلآویز اور اندوہناک داستان ہے۔

جس میں ذاکر نے اپنی شریکِ حیات کو دوام بخشا ہے۔

جو ہمارے چھوٹے چھوٹے گھروندوں اور ان کی چار دیواری میں سانس لینے والی زندگی سے متعلق ایک سحر آفریں مرقع ہے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

ایہہ کیو کی سچی کہانی

مصنف: چین کا پریم چند ——— لُو شون

مترجمہ: ہنس راج رہبر

ایہہ کیو ——— نکبت و افلاس کے باوجود انسان تھا۔ مگر اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہ ہوا۔

ایہہ کیو ——— کو کام اور محنت کرنے کا جنون تھا مگر کام اتنا ملتا کہ پیٹ کی آگ نہ بجھتی۔

ایہہ کیو ——— نے چین کے ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں کوئی حصہ نہ لیا۔ مگر اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چین کے عظیم فنکار کا شاہکار ناولٹ قیمت سوا روپیہ

زُلفوں کے سائے میں

انقلابی بحران اور انقلاب کی کامیابی کے زمانہ کی تصویر

۱۹۴۳ء، ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۹ء تک کا زمانہ

مشہور چینی ادیب شہید یَن کا ناولٹ

اس ناولٹ میں زندگی کی تلخ کامی اور شادمانی کو جس خوبصورتی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ بول رہی ہے کہ میرا داستان گو کنارے سے تماشہ دیکھنے والوں میں نہیں۔ وہ ہر موڑ پر میرے ساتھ ساتھ چلنے کی طرح رہا ہے۔ مترجم ظ۔ انصاری، قیمت ۱۲؍

پہلی محبت

تورگنیف کا رومان پرور ناول

پہلی محبت ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عشق ہے جسے ایک دوشیزہ سے پیار ہو جاتا ہے۔ جو دراصل اس کے باپ کی محبوبہ ہے۔ وہ لڑکی اس سے محض ملتفت ہو جاتی ہے کہ وہ اُس کے عاشق کا بیٹا ہے۔ باپ بیٹے کی ایک عورت کے ساتھ محبت کا یہ پیچیدہ قصہ انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی عظمت کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔

ضخامت ۱۴۴ — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

چیخوف

——— جس طرح افسانہ نگاروں میں یکتائے روزگار ہے بالکل اسی طرح اس کے دو ناولٹ

وارڈ نمبر ۶ اور ریل اوٹ پہاڑ

★ افسانوی ادب میں عدیم النظیر ہیں۔

★ اسلوبِ بیان، دلچسپی اور حقائق افروزی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔

★ دنیا کے عظیم ادب کے آئینہ دار ہیں۔

★ علمِ حیات کا سرچشمہ ہیں۔

مترجمہ: محمد یوسف

ضخامت ۱۲۰ صفحات — قیمت ایک روپیہ چار آنہ

دل ہی تو ہے

فرانس کے انتہائی بے باک ناول نگار ایملی زولا کا ناول ★ سماجی خرابیوں کے جنم داتا کون ہیں ★ خارجی حالات انسان کے طور و اطوار اور عادات و خصائل پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ★ فرسودہ نظامِ حیات میں ذرا سی مسرت حاصل کرنے کیلئے کن کن مصائب سے گذرنا پڑتا ہے۔ ★ ان تمام سوالات کا جواب آپ کو اس ناولٹ "دل ہی تو ہے" میں ملے گا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

مکتبہ شاہراہ اُردو بازار دہلی

تورگنیف

تورگنیف کا شمار دنیا کے گنے چنے عظیم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی ہر تصنیف کو عالمی ادب میں حقیقت پسندی کی ایک زندۂ جاوید روایت کا درجہ حاصل ہے۔ نامور نقاد بلینسکی لکھتے ہیں: "تورگنیف ایک انتہائی ذہین فنکار ہے۔ اس کی ہر بات میں عظمت کے ابدی نشان ملتے ہیں۔" دنیا کے عظیم ترین ناول نگار دستوفسکی اس کے بارے میں کہتے ہیں: "قدرت نے تورگنیف کو عدیم المثال ذہانت، بے نظیر قوتِ اظہار اور اسلوب کی بیش بہا شعریت عطا کی ہے۔" ایک اور عظیم نقاد ہرزن نے لکھا ہے: "تورگنیف کا مقام روسی ادب میں بہت بلند ہے۔" اس طرح فرانس کے شہرۂ آفاق ادیبوں فلوبیئر اور زولا نے تورگنیف کو حقائق کا داستان سرا بتایا ہے۔ ماریس بیرنگ انگریزی ادب کے نامور نقاد تو تورگنیف کی تخلیقات کا یوں جائزہ لیتے ہیں: "تورگنیف ایک شاعر ہے۔ ایک کلاسیکی فنکار ہے اور اس کی نثر میں چشموں کی روانی، بہاروں کی تازگی اور کلیوں کی صباحت ہے۔"

گزشتہ صدی میں روسی ادب کا ایک عظیم دور شروع ہوا تھا اور اس عظیم دور کی ابتداء تورگنیف ہی سے ہوتی ہے۔ تورگنیف نے اپنے ناولوں میں نئے روس کے ابتدائی خدوخال کی تصویر کشی کی ہے۔ تورگنیف جس عہد میں پیدا ہوا، اس نے اس عہد کی نہایت ہی صحیح عکاسی کی ہے۔ اس وقت کے تمام تضادات کو اجاگر کیا ہے۔

تورگنیف ایک اچھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ گزشتہ صدی کے روس اور مغربی یورپ کی تاریخ کے ہنگامہ خیز دور میں زندہ رہا۔ تورگنیف اپنے عہد کا انسان تھا۔ اس نے اپنی ادبی تخلیقات سے اپنے وقت کی پود کے ذہن اور دل کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔

تورگنیف زندگی کے مشاہدات کو فن کارانہ رنگ دینے میں کمال رکھتا تھا۔ وہ وقت کے نئے تقاضوں پر عبور حاصل کر لیتا تھا اور وہ اس بات کا سختی سے حامی تھا کہ قومیت کے بغیر نہ کوئی آرٹ ہے، نہ کوئی صداقت ہے اور نہ ہی کوئی زندگی ہے — تورگنیف روسی عورتوں کی صحیح عکاسی کے لئے مشہور ہے۔ تورگنیف نے اپنے اس ناولٹ میں بھی روسی عورت اور اپنے عہد کے نوجوانوں کے کردار کو ان کے اصل رنگ میں پیش کیا ہے۔



ٹیگور



یوسف جامی

تورگنیف

یوسف جامعی

پھرتے ہیں میر خوار

گرمیوں کی ایک پرسکون صبح تھی۔ صاف شفاف آسمان میں سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ لیکن کھیت ابھی تک شبنم سے چمک رہے تھے۔ وادی سے جو ابھی بمشکل بیدار ہوئی تھی۔ ایک تازہ مہک اٹھ رہی تھی۔ اور جنگل میں جو ابھی تک خاموش اور نم آلود تھا۔ صبح سویرے بیدار ہونے والے پرندے کلیلیں کر رہے تھے۔ ایک ڈھلوان پہاڑی پر جو اپنے دامن سے چوٹی تک رائی کی فصل سے لبریز تھی ایک چھوٹا سا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ رائی ابھی حال ہی میں پکی تھی۔ گاؤں کو جانے والی ایک تنگ پگڈنڈی پر ایک نوجوان عورت ململ کے لباس میں چل رہی تھی۔ اس کے سر پہ پیچ دار گول تنکوں کی ٹوپی تھی۔ اور اس کے ایک ہاتھ میں چھاتا تھا ایک ملازم لڑکا اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا

نوجوان عورت بڑے سکون کے ساتھ قدم رکھ رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سیر سے لطف اندوز ہو رہی ہے اس کے ارد گرد رائی کی بلند فصل کے اوپر جو نرم اور طویل لہروں میں جھوم رہی تھی اور کبھی نقرئی سبز رنگ کی ہو جاتی تھی اور کبھی سرخ ہو کر دمکنے لگتی تھی۔ چنڈول منڈلا رہے تھے۔ یہ نوجوان عورت اپنے گاؤں سے آ رہی تھی۔ جو سامنے کی بستی سے ایک میل سے کم دوری پر واقع تھا جس کی طرف وہ جا رہی تھی۔ یہ نوجوان عورت الیگزینڈرا پاولونا لپینا تھی اور بیوہ تھی۔ جس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ ایک امیر عورت تھی وہ اپنے بھائی سرگئے پاولووچ والنتیف کے ساتھ رہتی تھی۔ جو رسالے کا ایک سبکدوش کپتان تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ اور بہن کی جاگیر کا تمام انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا۔

مادام لپینا سامنے کے گاؤں میں پہونچ گئی اور نزدیکی جھونپڑے کے آگے جا کر رک گئی۔ جس کی چھت بہت نیچی تھی، اور بڑی خستہ حال تھی۔ اس نے لڑکے کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ وہ جھونپڑے کے اندر جائے اور اس جھونپڑے کی مالکن کی خیریت پوچھے۔ لڑکا ایک پتلے سے کسان کے ہمراہ جلدی باہر آ گیا۔ کسان کی ڈاڑھی سفید تھی

"کیا حال ہے اس کا؟" لپینا نے پوچھا۔

"ابھی تک زندہ ہے" بوڑھا بڑبڑایا۔

"کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔"

مادام لپینا نے جھونپڑی کے اندر قدم رکھا۔ یہ جھونپڑی تنگ اور تاریک تھی۔ دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر دم گھٹتا تھا انگیٹھی نما صوفے پر کسی نے کروٹ لی اور وہ کراہنے لگا۔ اس طرف دیکھتے ہوئے مادام لپینا کو نیم تاریکی میں ایک بڑھیا کا زرد اور جھریوں دار چہرہ نظر آیا۔ چارخانے کا ایک رومال اس کے سر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ سینے تک ایک بڑے کوٹ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشکل کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے لمبے لمبے ہاتھ بڑی نقاہت کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

مادام لپینا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور بڑھیا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی جل رہی تھی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" انگیٹھی نما صوفے پر جھک کر اس سے پوچھا۔

"آہ" عورت نے کراہتے ہوئے اور مادام لپینا کو پہچانتے ہوئے کہا۔ "برا حال ہے، بہت ہی برا پیاری خاتون! میری آخری گھڑی آ پہنچی ہے"

"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ میتریونا۔ تم شاید اچھی ہو جاؤ۔ کیا تم نے دوا پی تھی۔ جو میں نے تمہیں بھجوائی تھی؟"

بوڑھی عورت نے دردناک انداز میں کراہتے ہوئے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا۔

"خدا ہی جانے ہے —" بوڑھے نے جواب دیا۔ جو دروازے میں کھڑا تھا۔

مادام لینا بوڑھے کی طرف مڑی۔

"کیا تمہارے سوا اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہیں ہے؟"

اس نے پوچھا۔

"ہاں ایک لڑکی ہے۔ اس کی پوتی۔ لیکن وہ اکثر باہر رہتی ہے۔ وہ دیر تک ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتی۔ بڑی شریر ہے۔ اسی کا حال ہے کہ اپنی دادی کو پانی کا ایک چلو تک نہیں دے سکتی۔ اور میں بہت بوڑھا ہو گیا۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا —"

"تو کیا میں اسے اپنے اسپتال میں لے جاؤں؟"

"نہیں۔ وہاں اسے کیوں لے جایا جائے؟ اسے مرنا تو ہے ہی۔ وہ اپنی زندگی گزار چکی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ وہ تو اس صوفے پر سے اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اور اسپتال کی بات کرتی ہیں! اگر اس کو اٹھانے کی کوشش کی گئی تو مر جائے گی —"

"آہ — بڑھیا کراہی — پیاری خاتون میری یتیم بچی کو تنہا نہ چھوڑ دینا۔ ہمارے مالک بہت دور رہتے ہیں۔ اور تم..."

بوڑھی عورت خاموش ہو گئی۔ اس کی طاقت جواب دے گئی۔

"فکر نہ کرو —" مادام لینا بولی — "ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ یہ لو میں تمہارے لئے چائے اور کھانڈ لائی ہوں۔ چاہو تو تھوڑی سی پی لو..... تمہارے پاس سماوار ہے کہ نہیں۔؟" اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سماوار؟ نہیں ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر میں لا سکتا ہوں۔"

"ضرور لاؤ — نہیں تو میں تمہیں اپنا بھجوا دوں گی۔ اپنی پوتی سے کہنا کہ وہ گھر پر رہا کرے — یہ بھی کہنا کہ اسے شرم آنی چاہیئے۔"

جواب دیئے بغیر بوڑھے نے چائے اور کھانڈ کا پارسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تیرا پوتا خدا حافظ!" مادام لینا بولی — "میں تمہیں پھر دیکھنے کے لئے آؤں گی۔ ہمت نہ ہارنا اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتی رہو"

بوڑھی عورت نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس نے اپنی آنکھوں پر زور دے کر اپنی محسنہ کی طرف دیکھا

"خاتون — ذرا اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاؤ —"

مادام لینا نے بوڑھی عورت کی التجا کی تعمیل نہ کی۔ اس کی بجائے وہ جھکی اور اس نے بوڑھی عورت کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ چلتے ہوئے مادام لینا نے بوڑھے سے کہا — "یہ بات یاد رکھنا — مادام کی کے ساتھ دوا دیتے رہنا اور کچھ چائے بھی پلا دینا۔"

بوڑھے نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اور صرف اپنا سر جھکا کے رہ گیا۔

جب تک مادام لینا باہر تازہ ہوا میں نہ آئی تب تک وہ آزادی کے ساتھ سانس نہ لے سکی۔ اس نے اپنا چھاتا کھولا۔ اور گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں جھونپڑے کے نزدیک ایک چھوٹی سی دو پہیہ کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس میں تیس برس کی عمر کا ایک ... رنگ کے میلے کوٹ میں بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی۔ نوجوان عورت کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور اس کی طرف مڑا۔ اس کا چوڑا اور زرد چہرہ چھوٹی بھوری آنکھوں اور یکساں ترشی ہوئی دو مونچھوں کے ساتھ اس کے لباس کے رنگ سے ملتا تھا۔

"صبح بخیر —" اس نے طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا — "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"ایک بیمار عورت کو دیکھنے آئی تھی اور تم کہاں سے آ رہے ہو میخیل؟"

جس شخص کو اس نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرایا۔

"تم بہت اچھا کر رہی ہو کہ بیماروں کی دیکھ بھال میں لگی ہو۔ تم اسے اپنے اسپتال کیوں نہیں لے جاتیں؟"

"وہ بہت کمزور ہے۔ اور ہلنے چلنے کے قابل نہیں —"

"اور تم کیا اسپتال سے دستکش ہو رہی ہو —؟"

"وہ کیوں؟ میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگی۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں"

"بڑا عجیب خیال ہے تمہارا۔ یہ بات تمہارے ذہن میں سمائی ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہارے ہی مادام لاسنسکایا سے گہری دوستی ہے۔ اور تم پر اس کا اثر ہے۔ اور اس کے خیال میں یہ اسپتال اور یہ اسکول محض بکواس ہیں۔ بیکار خوش فہمیاں ہیں۔ سخاوت کو اور سختی کے ساتھ ایک ذاتی معاملہ ہونا چاہیئے اور تعلیم کو بھی —"

میرے خیال میں اس کے الفاظ کو میں صحیح طور پر ادا کر رہا ہوں یہ

نوجوان ہوں کہ وہ اس قسم کے خیالات کہاں سے لاتی ہے۔۔۔"

مادام لینا ہنسی "ہاں یہ ایک ذہین عورت ہے۔ میں اس کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اور مجھے اس سے محبت ہے۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ اس سے کوئی غلطی نہ سرزد ہو۔ وہ ہر … اس کی ہر بات اعتبار نہیں کرتی۔"

"تمہیں کیا ابھی نہیں چاہیے ۔۔۔" اس مرد نے اپنی رائے دی وہ ابھی تک گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ "کیونکہ وہ خود بھی جو کچھ کہتی ہے۔ اس پر آدھا اعتبار کرتی ہے۔ خیر تم سے ملاقات ہو گئی میں بہت خوش ہوں۔۔۔"

"کیوں؟"

"کیا سوال ہے؟ جیسے تم سے ملاقات باعث مسرت نہ ہو آج تم اس صبح کی طرح تروتازہ اور دلفریب ہو۔"

نوجوان عورت کچھ مسکرائی۔

"تم ہنس کس بات پہ رہی ہو؟"

"مجھ سے ہنسے بغیر رہا جو نہیں جاتا۔ تعریف کا یہ کتنا سرد اور بے روح طریقہ ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے آخر یہ الفاظ کہتے ہوئے جماہی کیوں نہ لی۔"

"سرد تو ہے لیکن تمہیں آگ کی ضرورت ہے۔ مگر آگ کوئی فائدہ بھی تو ہو۔ یہ کہتا ہی تو ہے۔ دھواں اٹھتا ہے اور کچھ باقی…"

"لیکن گرمی تو پہنچاتی ہے۔" عورت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ہاں مگر جلا بھی دیتی ہے۔"

"جلا دیتی ہے۔ تو پھر کیا ہوا؟ اس میں برائی کی بات ہی کون سی ہے۔ آگ بہتر چیز ہے۔"

"اس وقت نہ جانے تم کیا کہو گی بہتر ہے میں چل دوں گا۔۔"

مائیکل نے [illegible] ہو کر کہا۔ اس نے لگام کھینچی گھوڑے کے چابک لگائی۔

"خدا حافظ!"

"ذرا ٹھہرو ۔۔۔" نوجوان عورت چلائی "تم ہمارے یہاں کب آ رہے ہو؟"

"کبھی ۔۔۔ اپنے بھائی سے میرا سلام کہنا"

اور گھوڑا گاڑی دور نکل گئی۔

نوجوان عورت اپنی آنکھوں سے اس کا تعاقب کرتی رہی اور اس نے سوچا ۔۔۔ "یہ تو ایک بہت بڑی بوری کی طرح ہے۔"

گرد سے اٹا ہوا اور گردن جھکا کر بیٹھا ہوا اور اپنی ٹوپی کو سر سے پیچھے کی طرف کھسکائے ہوئے جس میں سے اس کے زرد رنگ کے بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ واقعی آٹے کی مل کی بہت بڑی بوری کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

مادام لینا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی۔ اس کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ایک جوان گھوڑے پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔

اس نوجوان کا قد چھوٹا تھا۔ اس کے سیاہ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور اس کی نکٹائی ہلکے رنگ کی تھی۔ اس کے سر پر بھورے رنگ کی ٹوپی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیر کی چھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر تک مادام لینا کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا اگرچہ وہ دیکھ رہا تھا کہ مادام لینا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اپنے گردو پیش سے بے خبر ہے۔ جونہی مادام لینا رکی وہ اس کے قریب گیا اور نہایت ہی پر لطف انداز آواز میں بولا ۔۔۔ "صبح بخیر انگزندرا پاولونا ۔۔۔ صبح بخیر!"

"آہ کانسٹنٹین دیومیدووچ!" اس نے جواب دیا۔ "کیا تم داریا کے یہاں سے آ رہے ہو؟"

"بالکل وہیں سے آ رہا ہوں ۔۔۔ مادام!" نوجوان نے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

"داریا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اور میں نے پیدل چلنا مناسب سمجھا … صبح … ہے۔ اور پھر صرف … میل ہی کا تو فاصلہ ہے … اگر تم گھر پر نہیں تھیں۔ تمہارے … نے اطلاع دی کہ تم … اور وہ خود کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ لہٰذا میں تم سے ملنے کے لئے یہاں چلا آیا … بالکل ۔۔۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

یہ نوجوان اچھی اور صحیح روسی زبان بول رہا تھا۔ اگرچہ اس کا لب و لہجہ بدیسی تھا۔ اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ

لب ولہجہ کہاں کا تھا۔ اس کے خدوخال میں کچھ ایشیائی انداز تھا۔ لمبی ناک، بڑی بڑی غیر متحرک آنکھیں موٹے موٹے سرخ ہونٹ، ترچھی پیشانی اور گھرے سیاہ بال۔ اس کی ہر بات کہہ رہی تھی کہ مشرقی نسل سے ہے۔ تاہم وہ نوجوان اپنا نام پنڈے لانسکی بتاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ وہ خوشنویسی کا رہنے والا ہے۔ اگرچہ اس کی پرورش بائیلوروس میں ہوئی، اور اسے ایک سخاوت پسند امیر بیوہ نے پالا تھا۔ ایک اور بیوہ نے اس کے لئے غیر فوجی ملازمت مہیا کر دی تھی۔ عام طور سے ادھیڑ عمر کی عورتیں پنڈے لانسکی کی سرپرستی کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ انھیں ڈھونڈھنا اور پھر ان کو راہ پر لانا جانتا تھا۔ اب بھی وہ مادام لاسنکایا ایک امیر جاگیردار عورت کے یہاں رہتا تھا۔ اس کے سہارے گذر بسر کر رہا تھا یعنی وہ مفت خورہ تھا۔ وہ انتہائی مہربان، اطاعت گذار، جذباتی اور عشرت پسند تھا۔ اس کی آواز نہایت خوشگوار تھی۔ پیانو بہت اچھا بجاتا تھا۔ اور جس سے وہ بات کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی عادت تھی وہ بڑی نفاست کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور دیر تک ایک ہی سے کپڑے پہنے رہتا تھا۔ وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کی بڑی احتیاط کے ساتھ حجامت بناتا تھا۔ اور اپنے سر کے ایک ایک بال کو خوب سنوارتا تھا۔

مادام لیڈیا نے اس کی بات سنی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہوئی ——" کتنا اچھا دن ہے۔ ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات ہوئی ابھی ابھی میں لیزنف سے باتیں کر رہی تھی ——"

" آہ لیزنف —— کیا وہ کہیں جا رہا تھا ؟"

" ہاں —— اور خیال تو کرو وہ بھی دوڑ لگانے کی گاڑی میں، ٹھاٹ پہنے ہوئے تھا۔ بالکل ٹھاٹ۔ گردمیں اٹا ہوا عجیب وغریب انسان ہے —!"

" ہاں ہے تو مگر خوب آدمی ہے ——"

" کون ! موسیو لیزنف ؟" پنڈے لانسکی نے ناقابل اعتبار لہجے میں پوچھا۔

" ہاں ماتیخل لیزنف ——" وانتیف نے بات دہرائی ——" اچھا تو بہن خدا حافظ —— مدت ہو گیا کہ میں تمہارے کھیتوں کی طرف چل دوں —— ان دونوں کھیتوں کی بوائی ہو رہی ہے —— موسیو پنڈے لانسکی تمہیں گھر تک چھوڑنے جائیں گے ——" اتنا کہہ کر وانتیف گھوڑے کو دلکی چال چلاتا ہوا دور نکل گیا۔

" مجھے بہت خوشی ہوگی ——" اور پنڈے لانسکی نے نوجوان عورت کو اپنا بازو پیش کیا۔

نوجوان عورت اس کے بازو میں بازو ڈال کر اس پگڈنڈی پہ ہو لی۔ جو اس کی جاگیر کی طرف جاتا تھا۔

• • • • •

مادام لیڈیا کو اپنے بازو پر لئے ہوئے پنڈے لانسکی بڑی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی مشرقی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اکثر نم آلود رہتی تھیں۔ پنڈے لانسکی کی آنکھیں فوراً ڈبڈبا آتی تھیں اور پھر کون ایسا ہے۔ جو ایک حسین نوجوان عورت کے بازو میں بازو ڈال کر خوش نہیں ہوتا !

گوبرنا کا پورا علاقہ متفقہ طور سے اعلان کیا کرتا تھا۔ کہ مادام لیڈیا ایک دلفریب عورت ہے۔ اور گوبرنا کے لوگ غلطی پر نہیں تھے اس کی باریک خم دار ناک ہی کسی فانی انسان کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کی مخملیں اور بادامی آنکھوں، اس کے سنہرے بالوں، اس کے گڑھے دار سرخ رخساروں اور اس کی دوسری دلی آویزیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ جب وہ ہنستی تھی تو ایک بچے کی طرح معصوم معلوم ہوتی تھی۔ گوبرنا کی خواتین اسے بڑی سادہ لوح عورت خیال کرتی تھیں۔ کوئی اس کے سوا اور کیا تمنا کر سکتا ہے ؟

" تم ابھی کہہ رہے تھے کہ مادام داریا نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔" اس نے پنڈے لانسکی سے پوچھا۔

" ہاں مادام داریا لاسنکایا نے مجھے بھیجا ہے ——" پنڈے لانسکی نے " س " کے حرف کو ہکلاتے ہوئے ادا کیا۔ جیسے انگریز " تھ " کا حرف ہکلا کر ادا کرتے ہیں۔ " مادام لاسنکایا یہ چاہتی ہیں کہ آپ ضرور آئیں۔ اور رات کے یہاں کھانا کھائیں ——" پنڈے لانسکی اس بات کی خاص احتیاط رکھ رہا تھا۔ کہ اس کے لہجے میں بے تکلفی کا عنصر داخل نہ ہونے پائے۔ وہ یہ احتیاط خاص طور پر خواتین کے معاملہ میں روا رکھتا تھا ——" مادام لاسنکایا کے یہاں ایک نیا مہمان آ رہا ہے۔ اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ اس سے ضرور ملیں ! ——"

" وہ کون ہے ؟ "

"میرے منگل جوئنٹ پیٹرز برگ میں رہتا ہے۔ اور جو ملک معظم کی خواب گاہ کا منتظم ہے۔
مادام لاسنکایا کی اس سے حال ہی میں شہزادہ گارن کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ مادام کا خیال ہے کہ وہ ایک نہایت ہی شائستہ اور عالم و فاضل شخص ہے۔ اور ادب میں بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ آہ کتنی حسین تلہ ہے۔ ذرا اس کی طرف دیکھئے تو . . . . . . بیرن منگل سیاسی اقتصادیات کے خاص طور پر دلدادہ ہیں۔ انھوں نے ایک جاذب نظر موضوع پر ایک مقالہ لکھا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مادام لاسنکایا اس کے بارے میں اپنی رائے صادر فرمائیں۔
"سیاسی اقتصادیات پر مقالہ!"
"اسلوب کے نقطۂ نظر سے . . . . . آپ تو بلا شبہ جانتی ہیں کہ مادام لاسنکایا اپنی دوسری خوبیوں کے علاوہ اسلوب سے متعلق اپنی رائے دینے میں مستند خیال کی جاتی ہیں۔ زدکا واسکی شاعر تو ان سے مشورہ لیا کرتا ہے۔ اور میرے سابقہ محسن معزز و محترم وگسولن میرپا درووچ سانڈریکا جو آڈیسہ میں رہتے ہیں — آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"
"بالکل نہیں۔ میں نے ان کا نام کبھی نہیں سنا —!"
"اس معزز شخص کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا۔ خیریت ہے ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہو مونیور سانڈریکا بھی مادام لاسنکایا کے روسی زبان پر عبور کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں —"
"آج کے مہمان بیرن منگل کیا ایک نظریہ پرست ہیں؟"
"بالکل نہیں۔ اس کے برعکس مادام لاسکایا کا خیال ہے کہ انھیں دیکھ کر فوراً ہر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک دنیادار شخص ہیں۔ بیرون نے مشہور نغمہ نگار بیتھوون کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں کہ بوڑھا شہزادہ گارن بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کاش میں وہاں ہوتا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ موسیقی میرا مرغوب موضوع ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو یہ جنگلی پھول پیش کردوں!"
مادام لیبا نے وہ پھول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور چند قدم چل کر وہ پھول زمین پر گرا دیا۔ اب مادام لیبا کا گھر دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ گھر نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تابندہ و درخشندہ کھڑکیاں جو پرانے لیموں کے پیڑوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اس گھر میں آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔
"تو پھر میں مادام لاسنکایا سے جا کر کیا کہوں؟" پینڈرے لافسکی نے اپنے پھول کے انجام سے ہراساں ہوتے ہوئے یہ جملہ کہا۔ "کیا آپ رات کا کھانا وہاں کھائیں گی؟
مادام لاسنکایا نے آپ کے بھائی کو بھی مدعو کیا ہے —"
"ہاں۔ ہم ضرور آئیں گے — نتالیا کا کیا حال ہے؟"
"وہ اچھی ہیں — اوہ ہم تو مادام لاسنکایا کی جاگیر کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچ گئے ہیں! مادام مجھے اب رخصت دیجئے؟"
مادام لیبا ایک لمحہ کے لئے رکی اور بولی — "کیا آپ اندر نہیں چلیں گے؟" — اس کے لہجے میں ایک جھجک سی تھی۔
"نہیں — میں بہت مسرور ہوتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ مادام تھالی برگ کا نغمہ سننا چاہتی ہیں مجھے ذرا مشق کرنا ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میری بیہودگی میں آپ کو لطف نہیں آئے گا —"
"تمھیں یہ گمان کیوں گذر رہا ہے . . . . ."
پینڈرے لافسکی نے ایک سرد آہ بھری اور بڑے معنی خیز انداز میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔
"صبح بخیر مادام! —" اس نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اپنا سر جھکایا اور اسی طرف قدم اٹھا کر وہ اپنے راستہ پر ہو لیا۔
مادام لیبا مڑی۔ اور اپنے گھر کی طرف بڑھی۔
پینڈرے لافسکی بھی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے چہرے پر جو رسمی شگفتگی کا نقاب اوڑھے رہتا تھا۔ وہ اب اس کے چہرے پر سے اڑ چکا تھا۔ اب اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور سنجیدگی کے آثار تھے۔ اب تو اس کی چال میں بھی فرق آگیا تھا۔ اب اس کے قدم لمبے اور بھاری ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی چھڑی کو لہراتا ہوا دو فرلانگ آگے بڑھ چکا تھا۔ کہ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر تبسم نے بل سا کر دیئے اس نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان اور شرمیلی کسان لڑکی کو دیکھا جو کھیت کی طرف اپنے بیل لئے جا رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کے قریب جا پہونچا۔ اس وقت اس میں ایک بجلی کی سی پھرتی پیدا ہو گئی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی پہلے تو خاموش رہی۔ پھر وہ تھوڑی سی شرمائی اور دبی زبان میں ہنسی اس کے

بعد اس نے اپنی آستین سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور مڑتے ہوئے بولی — "اپنی راہ لیجئے سرکار —"

پینڈرے لافسکی نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس سے کہا کہ وہ اس کے لئے لیموں کی چند بالیاں ضرور لا دے۔

"آپ کو ان کی کیا ضرورت پڑ گئی حضور — کیا ہار بناؤ گے؟" لڑکی نے مذاق کیا — "اچھا اب اپنا راستہ ناپئے سرکار!"

"ذرا ٹھہرو تو میری جان —" پینڈرے لافسکی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی۔

"جانے دو۔ وہ رہا آپ کا راستہ" لڑکی نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا — "چھوٹے آقا آ رہے ہیں —!"

پینڈرے لافسکی نے مڑ کر دیکھا۔ واقعی سامنے سے وانیا اور پیٹیا مادام لاسنکایا کے بیٹے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا استاد بیسے توف تھا کالج سے تازہ نکلا ہوا بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ بیسے توف کافی لمبا تھا۔ اس کی ناک تیکھی تھی۔ اس کی آنکھیں سؤر کی سی تھیں۔ وہ بدصورت تھا۔ لیکن نہایت ہی سیدھا اور صاف اور مہربان و ایماندار شخص تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن کے ساتھ کپڑے پہنتا تھا۔ اور اپنے بال نہیں کٹواتا تھا۔ یونہی نمائش کے طور پر نہیں بلکہ کاہلی کی وجہ سے۔ وہ اچھے کھانے کا شائق تھا۔ ایک اچھی کتاب، سرگرم گفتگو اور بحث کا بھی وہ دلدادہ تھا۔ وہ اپنے دل کی گہرائی سے پینڈرے لافسکی کے ساتھ نفرت کرتا تھا۔

مادام لاسنکایا کے بیٹے بیسے توف کی پرستش کرتے تھے اور اس سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ وہ گھر کے دوسرے افراد کا بھی گہرا دوست تھا۔ اور مادام لاسنکایا اس دعوے کے باوجود کہ وہ کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتی تھی۔ بیسے توف کی اس بے تکلفی کو پسند نہیں کرتی تھی۔

"میرے نوجوان نیپر!" پینڈرے لافسکی نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا — "آج تم صبح سویرے ہی سیر کے لئے نکل پڑے ہو — اور میں —" اس نے بیسے توف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا — "کافی مسافت طے کر چکا ہوں۔ قدرت کے نظاروں میں مجھے بہت لطف آتا ہے —"

"ہاں یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ کہ تم کس طرح قدرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے —" بیسے توف نے کہا۔

"تم تو ایک مادیت پرست ہو۔ نہ جانے تم کیا سوچتے رہتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں —"

پینڈرے لافسکی جب بیسے توف جیسے اشخاص سے بات کرتا تھا۔ تو وہ جھلا اٹھتا تھا اور بڑی صفائی کے ساتھ "س" کا تلفظ ادا کرتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس لڑکی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ رہے تھے؟" بیسے توف نے دائیں بائیں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا — اسے اس بات کا احساس تھا کہ پینڈرے لافسکی اس کے چہرہ کو گھور رہا ہے۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ تم ایک مادیت پرست ہو۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ تم ہمیشہ ہر چیز کی کھردری طرف دیکھتے ہو —"

"لڑکو —" بیسے توف نے دفعتاً حکم دیا — "وہ سامنے چراگاہ دیکھ رہے ہو نا — دیکھیں وہاں سب سے پہلے کون پہنچتا ہے؟ ایک — دو — تین!"

"رذیل کمین!" پینڈرے لافسکی نے سوچا — "یہ ان لڑکوں کا اخلاق بگاڑ دے گا — نادار انسان — اور نہیں تو کیا!"

اپنے نفیس اور صاف ستھرے بدن کی طرف دیکھتے ہوئے پینڈرے لافسکی نے اپنی انگلیاں پھیلا کر اپنا کوٹ جھاڑا۔ اپنا کالر سیدھا کیا۔ اور اپنے راستہ پر ہو لیا۔ اپنے کمرہ میں آ کر اس نے اپنا نہایت اچھا شب خوابی کا لباس پہنا۔ اور ایک خاص مقصد کے ساتھ پیانو کے سامنے جا بیٹھا۔

۲

داریا نیکولافنا لاسنکایا کا گھر گوبرنا کے علاقہ میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ یہ پتھر کا گھر تھا۔ اور اٹھارویں صدی کی طرز کی عمارتوں کے مطابق اس کا نقشہ راستریلی نے تیار کیا تھا۔ یہ مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اور اس پہاڑی کے دامن میں روس کا ایک بڑا دریا بہتا تھا۔ خود لاسنکایا ایک دولت مند خاتون تھی اور روس کی قانون ساز مجلس کے رکن کی بیوہ تھی۔ اگرچہ پینڈرے لافسکی یہ کہا کرتا تھا کہ مادام لاسنکایا سارا یورپ گھوم چکی ہے اور

اسے جانا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یورپ میں اسے کوئی نہیں
اور سنیٹ پیٹرز برگ میں بھی اسے کوئی خاص مقام
یا تھا۔ البتہ ماسکو میں اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور جو ضیافتیں
تی تھی ان میں ہر کوئی شریک ہوتا تھا۔ وہ دولت مند جاگیر
سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اسے نہایت ہی عجیب و غریب مگر ل
ہوشیار عورت سمجھا جاتا تھا۔ اپنے عہد شباب میں وہ بہت
۔ شاعروں نے اس کی تعریف میں نظمیں کہی تھیں ——"
نے اس کی خاطر اپنے دل الٹ دئے تھے۔ اور مشہور شخصیتیں
ساتھ شادی کی خواہش مند رہی تھیں۔ لیکن اس بات
۳۰ برس گذر چکے تھے۔ اس کے سابقہ حسن کے آثار۔ اب
رہے تھے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اسے اب دیکھتا تھا۔ وہ
سے سوال کرتا تھا —— کیا یہی وہ عورت ہے۔ جس کی عمر
یادہ نہیں۔ بلکہ ذرا کچھ دبلی پتلی ہے۔ ناک بھی لمبی ہے جو
ت میں بہت ہی حسین ہوتی تھی —— ؟" اور ہر شخص اس کی
بے پناہ تبدیلی پر جی ہی جی میں حیران ہوتا۔ پینڈے لافسکی
بھی یہ خیال تھا۔ کہ مادام لاسنکایا کی آنکھوں کا حسن ابھی تک
اور یہی پینڈے لافسکی یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ تمام یورپ
سنکایا کو جانتا ہے۔

ہر موسم میں لاسنکایا اپنے دیہی مکان میں اپنے بچوں کے ساتھ
اس کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے جن کی عمر نو اور دس برس
اور ایک سترہ برس کی لڑکی نتالیا۔) اپنے اس مکان کے
سے کھلے رکھتی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں مہمانوں کو
ہے۔ اس کے یہاں خاص طور پر کنوارے مرد ہوتے ہیں۔
ت میں رہنے والی خواتین کو پسند نہیں کرتی۔ وہ سمجھتی ہے
ں بڑی یکسانیت ہوتی ہے۔ مادام لاسنکایا ایسی خواتین
ملتے ہوئے درشت کلامی سے کام لیتی ہے۔ اس وقت وہ
ر سے کم نہیں ہوتی۔ تمام اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے
نت میں وہ اپنی زبان کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ اس
اظ پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مادام لاسنکایا دیہات میں زندگی کی ذرہ
ا نہیں کرتی۔ مگر پابندیوں سے آزاد اس کی سادگی میں

ایک بڑے شہر کی رہنے والی عورت کی وہ نفرت پائی جاتی تھی۔ جو اپنے ارد گرد منڈلانے والے لاعلم اور حقیر انسانوں کے لئے اپنے دل میں رکھتی ہے۔ وہ اپنے شہر کے شناساؤں کے ساتھ بھی تضحیک آمیز سلوک کرتی ہے۔ لیکن وہاں نفرت غائب ہوتی ہے۔

اتفاقیہ طور پر یہاں قارئین سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے ماتحتوں سے گریز کرتا ہے۔ وہ اپنے بڑوں کے ساتھ کیوں ایسا نہیں کر پاتا —— ! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خیر اس قسم کے سوالات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

جب پینڈے لافسکی نے ھال برگ کے نغمہ اینوڈے کو زبانی یاد کر لیا۔ تو وہ اپنے صاف ستھرے کمرے سے نیچے اترا اور نشست گاہ میں پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے لوگ وہاں جمع تھے مجلس شروع ہو چکی تھی۔ گھر کی مالکہ ایک چوڑے صوفہ پر بیٹھی تھی اور وہ ایک فرانسیسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب دوسری جانب نتالیا لاسنکایا اور میڈموازیل بون کورٹ بیٹھی تھیں۔ بون کورٹ نتالیا کی استانی تھی۔ اور اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی اور نہایت ہی دبلی پتلی تھی۔ اس نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی اور وہ گھر پر پہننے کی رنگ دار ٹوپی کے نیچے ایک چھوٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ دروازے کے قریب ایک کونے میں بیٹے توف اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی دائیں طرف پیٹیا اور وانیا ڈرافٹ کھیل رہے تھے۔ انگیٹھی کے قریب جھکا ہوا شخص جس نے اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ افریکن پگاسف تھا۔ جس کا قد پست تھا اور جس کے بال سفید تھے۔ اور چہرے کی رنگت سیاہی مائل تھی۔ اور آنکھیں سیاہ تھیں۔

پگاسف ایک عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کو ہر چیز سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ عورتوں کا خاص طور پر دشمن تھا۔ وہ صبح سے شام تک شکوہ سرا رہتا۔ کبھی اس کی یہ شکایت بڑی تیکھی ہوتی اور کبھی بڑی احمقانہ ہوتی۔ مگر ہر وقت وہ بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی جھلاہٹ ہمیشہ بڑی رکیک ہوتی۔ اس کی ہنسی، اس کے لہجہ، اور اس کا تمام وجود تنک مزاجی کا پروردہ تھا۔ مادام لاسنکایا بڑی فراخ دلی کے ساتھ پگاسف کا خیر مقدم کیا کرتی تھی۔ پگاسف کی ہنسی ٹھٹھول سے وہ خوش ہوتی تھی۔

اس کا ہنسی ٹھٹھا مسخرے پن کی حد کو چھوتا تھا۔ اسے بالعموم آرائی کا جنون تھا۔ مثال کے طور پر جب اسے کسی قدرتی آفت کا حال بتایا جاتا۔ یعنی یہ کہ بجلی کی کڑک سے ایک گاؤں جل گیا۔ سیلاب میں باندھ بہہ گیا۔ یا ایک کسان نے لکڑیاں چیرتے ہوئے اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ تو وہ غیر متوقع بہت رغبت کے ساتھ پوچھتا ––– وہ کون تھی؟ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کس عورت کی وجہ سے یہ آفت آئی۔ اس کا یہ یقین تھا کہ مصیبت کا سبب کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر معاملہ کی تہہ کو کریدا جائے تو کوئی نہ کوئی عورت ہی ہر واقعہ کی وجہ نظر آئے گی۔

ایک دفعہ اس نے ایک بالکل اجنبی عورت کے سامنے اپنے آپ کو گھٹنوں کے بل جھکا دیا جو اس کے سامنے سے گذر رہی تھی۔ اور اپنے ہاتھ پہل ہیرا کرتے ہوئے انتہائی غیظ و غضب سے کہا کہ وہ اسے اس خاطر و مدارات سے باز رکھے۔ اس نے اس عورت کو یقین دلایا کہ وہ آئندہ پھر کبھی اس کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ ایک مرتبہ دام لاسکا کا گھوڑا ان کی دھوبن کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے بدک گیا۔ اور اس نے اس دھوبن کو ایک کھائی میں جا گرایا۔ وہ بیچاری مرتے مرتے بچی۔ اس وقت کے بعد سے پگاسف اس گھوڑے کو بہت سے شاندار گھوڑا کہہ کر پکارتا رہا۔ اس نے تو یہاں تک کہا کہ وہ پہاڑی اور خندق سیر تفریح کے لئے نہایت اچھے مقامات ہیں۔

پگاسف نے اپنے اس خبط کی وجہ سے زندگی میں ترقی نہیں کی تھی وہ ایک غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کے باپ نے کئی جگہ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں۔ وہ بہت کم پڑھا لکھا جاتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو کھلایا پلایا۔ اور اسے کپڑے پہنائے اس کے سوا اس نے اور کچھ نہ کیا۔

اس نے اپنے بیٹے پگاسف کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی اس کی اماں نے اس سے بہت لاڈ کیا۔ مگر وہ جلد مر گئی۔ پگاسف نے اپنی ہمت سے زندگی میں قدم رکھا۔ وہ خود ہی اسکول گیا۔ اسکول سے کالج پہونچا۔ اس نے تین زبانیں سیکھیں۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور لاطینی اور نہایت اچھی سند کے ساتھ وہ کالج سے باہر نکلا اور ڈورپٹ چلا گیا۔ جہاں وہ مسلسل افلاس و تنگیا کے خلاف لڑتا رہا اور وہاں اس نے تین سال کا نصاب ختم کیا۔ پگاسف کی خوبیاں بس یہ عمومی درجہ ہی کی رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بلا کا صبر و تحمل رکھتا تھا۔ مگر اس کے لئے سب سے طاقتور تحریک اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بڑے لوگوں کے حلقہ میں قبول کر لیا جائے اس کی دولت چاہے اسے کتنا ہی کیوں نہ پچھاڑے۔ مگر وہ دوسروں سے پیچھے پڑ رہے۔ یہ اس کی خواہش تھی جو اسے ڈورپٹ کی یونیورسٹی میں لے گئی تھی۔ افلاس نے اس کے مشاہدے پر دھار رکھی۔ اس کی طرز گفتگو نرالی تھی۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں اس نے اپنی گفتگو میں چرچرا پن اختیار کیا۔ اس کے خیالات اگرچہ معمولی آدمیوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ نہ ہو سکے۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو کچھ اس طرح پیش کرتا کہ اسے نہ صرف حاضر دماغ بلکہ ایک ذہین اور دانشمند خیال کیا جاتا۔

گریجویٹ ہو جانے کے بعد پگاسف نے طے کیا کہ وہ درس و تعلیم کا پیشہ اختیار کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ اپنے ماحول کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی اونچے طبقہ میں سے چنتا تھا اور جانتا تھا کہ ان کے ساتھ تعلقات کس طرح قائم کئے جاتے ہیں وہ خوشامد سے بھی احتراز نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ ہمیشہ جھلاہٹ سے کام لیتا تھا۔ اس مقصد کے لئے چٹان کے سے کردار والے شخص کی ضرورت تھی۔ پگاسف نے علم کو علم حاصل کرنے کی نیت سے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس کی معلومات محدود تھیں۔ بحث مباحثہ میں وہ بری طرح ناکام رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ جو طالب علم اس کے کمرہ میں رہتا تھا اور جس کا اکثر وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس سے سبقت لے گیا۔ اس ناکامی نے پگاسف کو چراغ پا کر دیا۔ اس نے اپنی تمام کتابوں اور کاپیوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اور سول سروس میں شامل ہو گیا۔

پہلے پہل تو اسے اپنی کامیابی کے امکانات روشن نظر آئے۔ لیکن وہ روز پیدائش ہی سے بدمزاج تھا۔ وہ خوش کار نہیں تھا۔ لیکن اپنی اسی کمی کو وہ خود نمائی اور دلیری سے پورا کیا کرتا تھا۔ دنیا میں ترقی کرنے کی جلدی میں وہ مصیبت میں مبتلا ہوا اور اس نے غلط قدم اٹھایا۔ اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ وہ تین برس تک اپنے گاؤں میں رہا۔ جو اس نے خرید لیا تھا۔ غیر متوقع طور پر اس نے ایک دولت مند اور نیم خواندہ دیہاتی عورت سے شادی کر لی جس پر وہ رات دن اپنی طنز اور تلخی کے نشتروں کی بوچھاڑ کرتا رہتا

پگا سف کا گرداب نہایت تلخ اور مرتعان زدہ ہو چکا تھا
واجی زندگی اس لیے بھی وبال جان بن گئی تھی۔ اس کی بیوی اس
ساتھ چند سال رہ کر اسکو بھاگ گئی۔ اور اس نے اپنی جاگیر ایک
بازن کے ہاتھ فروخت کر دی۔ پگا سف نے اس کی جاگیر پر بھی مکان
ہریں کروایا تھا۔ یہ آخری ضرب بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ پگا سف
ایک۔ یکی پہ مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اس مقدمے میں وہ ہار گیا۔
کے بعد وہ تنہا رہنے لگا۔ کبھی کبھی اپنے پڑوسیوں کے یہاں جا
جن کو وہ بیٹھے پیچھے گالیاں دیتا۔ اور بعض اوقات تو وہ ان
منہ پر انھیں گالیاں دیتا۔ اس کے بعد پگا سف نے کبھی اپنے ہاتھ
کوئی کتاب نہ پکڑی۔ وہ سو غلام کسانوں کا مالک تھا۔

"آہ کانتیتین! مادام لاسنکایا پنڈے لافسکی کے
ست گاہ میں داخل ہوتے ہی بولی ——"کیا انگریز بھی نیا آ
ا ہے؟"

مادام لینا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کروں اور
بہن نے یہ بھی کہا تھا کہ ضرور آئیں گی —" پنڈے لافسکی نے
بائیں سر جھکا کر یہ بات کہی۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنے صنوبری
بالوں پر آہستگی کے ساتھ ہاتھ بھی پھیرتا رہا۔

"کیا ولنتسیت بھی آئے گا؟"

ہاں —— موسیو ولنتسیت بھی آئیں گے۔

"ہاں تو تم یہ اعتراف کر رہے ہو ——" مادام لاسنکایا نے پگا سف
مخاطب ہوتے ہوئے کہا —— تمام نوجوان عورتیں اس مرض کا شکار

پگا سف کے ہونٹوں میں بل پڑ گئے اور اس کی کہنی پھڑپھڑانے
—— "میں کہتا ہوں کہ ——" اس نے واضح لہجے میں کہا —— "
گھبراہٹ اور برہمی کے عالم میں بھی بڑے صاف لہجے میں بات کیا
تھا —— نوجوان عورتیں عام طور پر اس مرض کا شکار ہوتی ہیں
ہیں وہ نوجوان عورتیں شامل نہیں جو یہاں موجود ہیں ..... "

"کون تمھیں ان کو بھی ان میں شامل کرنے سے روک رہا ہے
——" مادام لاسنکایا نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

میں یہاں کی عورتوں کو ہمیشہ ہر بات سے خارج رکھتا رہا ہوں
—— ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نوجوان خواتین بڑی جذباتی ہوتی ہیں

مثال کے طور پر جب ایک نوجوان عورت ڈر جاتی ہے یا بہت
خوش ہوتی ہے۔ یا پریشان ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ اسطرح کا
ڈرامائی انداز اختیار کرتی ہے —" یہاں پگا سف نے نہایت بے ڈھنگے
پن کے ساتھ اپنی کمر کو بل دیا اور اپنے ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیے
—— اس کے بعد وہ چلاتی ہے —"اوہ —" یا ہنستی ہے۔ یا
آنسو بہانے لگتی ہے۔ ایک دفعہ البتہ مجھے جذبات کا صحیح اور پرخلوص
اظہار دیکھنے میں آیا تھا —

"وہ کیسے؟ ——"

پگا سف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی —"میں نے پیچھے
سے اس عورت کے پہلو میں ایک چھڑی سے ضرب لگائی۔ وہ چلائی
اور میرے منہ سے نکلا —— "شاباش ——" یہ چیخ ایک فطری
آواز تھی —— کمرے میں موجود ہر شخص زور سے ہنسا۔

"کیا خرافات بک رہے ہو ——" مادام لاسنکایا بولی —"کیا تم
یہ چاہتے ہو کہ میں اعتبار کر لوں۔ کہ تم نے ایک لڑکی کے پہلو میں چھڑی
سے ضرب لگائی —— "

"ہاں ہاں۔ میں سچ کہتا ہوں ——"

"موسیو پگا سف ذرا بچوں کا تو خیال رکھیے ——" بورس اتانی
یون کورٹ نے قہقہے لگاتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھیں اس کی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ تم تو اسے اچھی
طرح جانتی ہو ——"

"مادام لاسنکایا بولی ——"
مگر فرانسیسی عورت دیر تک ہنستی رہی اور بڑبڑاتی رہی۔

"تمھیں شاید اعتبار نہیں آرہا ہے۔ لیکن میں اب بھی یہی کہوں
گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اور میں تنہا وہ شخص نہیں جو اس بات کو جانتا
ہوں۔ تم تو یہ کہو گی کہ تمھیں میری پڑوسن مادام جیبو زوفا کا بھی اعتبار
نہیں جس نے اپنے بھتیجے کو قریب قریب ہلاک کر دیا تھا ——"

"کیسی بات کر رہے ہو ——"

"مجھے بات تو ختم کر لینے دو۔ میری بات پوری سن لو اور پھر
خود ہی فیصلہ کر دینا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ میں اس پر کوئی الزام نہیں
لگا رہا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ جیسے ہر کوئی کسی عورت کو پسند
کر سکتا ہے۔ اس کے گھر میں کیلنڈر کے سوا کوئی کتاب نہیں ہے

وہ جب بھی پڑھتی ہے تو بلند آواز سے پڑھتی ہے۔ پڑھنے کا اور کوئی طریقہ اسے معلوم ہی نہیں ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے اسے پسینہ آجاتا ہے۔ بعد میں وہ شکوہ کرتی ہے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑنے کو ہیں۔ ویسے وہ بہت اچھی عورت ہے۔ اس کی عادتیں سب کی سب فربہ اندام ہیں ——— خیر میں اس پر کیوں الزام لگاؤں ———"

"تم پھر بہکنے لگے ہو ———" مادام لاسنکایا بولی۔ "تم نے اپنا من بھاتا موضوع چھیڑ دیا ہے۔ اور اب رات تک تمہاری زبان قینچی کی طرح چلے گی ———"

"میرا من بھاتا موضوع ——— یعنی عورتیں میرا من بھاتا موضوع ہیں۔ اگر میرا من بھاتا موضوع ایک ہے تو عورتوں کے تین ہیں۔ ان کے بارے میں وہ اس وقت تک باتیں کرتی ہیں جب تک کہ سو نہیں جائیں۔"

"وہ موضوع کیا ہیں؟"

"شکوہ شکایت، ملامت اور لعن و تشنیع!"

"خدا کی قسم پگاسف ———" مادام لاسنکایا نے کہا ——— "تم عورتوں کے بارے میں اس قدر تلخ ہو تو تمہارے پاس ضرور اس کی کوئی مضبوط وجہ موجود ہوگی۔ کسی عورت نے یقیناً تمہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مجھے دکھ پہنچایا ہوگا۔ تم یہی کہنا چاہتی تھیں نا؟"

مادام لاسنکایا ذرا گھبرا گئی۔ کیونکہ اس وقت وہ پگاسف کی اندوہناک شادی کے حالات کو یاد کر رہی تھی۔ وہ صرف اتنا سرہلا کر رہ گئی۔

"مجھے عورت نے صرف ایک دفعہ سخت اذیت پہنچائی ہے اگرچہ وہ عورت بہت مہربان تھی۔"

"وہ کون تھی؟"

"میری اماں ———" پگاسف نے اسٹیج پر کی جانے والی سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تمہاری اماں ——— وہ بھلا تمہیں کیونکر اذیت پہنچا سکتی تھی؟"

"مجھے جنم دے کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مادام لاسنکایا کے ابروؤں پر بل پڑ گیا ——— "مجھے ڈر ہے کہ اب ہماری گفتگو افسردگی کا رخ کر رہی ہے ——— کانستنتین تم تھالبرگ کا نغمہ مجھے سناؤ۔ شاید موسیقی پگاسف کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دے ——— کیا آرفیس نے جنگلی درندوں کو موسیقی سے رام نہیں کر لیا تھا ———"

پینڈے لافسکی پیانو کے پاس جا بیٹھا اور اس نے نہایت اطمینان بخش طور پر وہ نغمہ بجایا۔ پہلے تو ثالیا غور سے سنتی رہی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بہت خوب!" مادام لاسنکایا بولی ——— "مجھے تھالبرگ بہت پسند ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو پگاسف؟"

"میں سوچ رہا ہوں ———" پگاسف نے آہستگی کے ساتھ کہا ——— "کہ دنیا میں تین قسم کے انانیت پرست ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو خود بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی جینے دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خود تو زندہ رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کو جینے نہیں دیتے۔ اور تیسرے وہ جو خود بھی زندہ نہیں رہتے۔ اور دوسروں کو بھی جینے نہیں دیتے۔ عورتیں تیسرے زمرے میں آتی ہیں ———"

"تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ پگاسف ایک بات جو مجھے پریشان کرتی ہے یہ ہے کہ تم اپنے فیصلہ کی قطعیت میں یقین رکھتے ہو۔ جیسے تم کبھی کوئی غلطی نہ کر سکتے ہو ———"

"نہیں میں بھی غلطیاں کرتا ہوں۔ مرد بھی غلطی کر سکتا ہے مگر تم ہماری اور عورتوں کی غلطیوں میں شاید فرق کو نہیں جانتیں۔ نہیں تم اس فرق سے آگاہ نہیں ہو۔ اگر مرد مثال کے طور پر یہ کہتا ہے۔ کہ دو اور دو چار نہیں پانچ ہوتے ہیں۔ یا ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ تو عورت یہ ضرور کہے گی۔ کہ دو اور دو ایک موم بتی ہوتے ہیں ———"

"تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی۔ میری سنی ہوئی ہے۔ مگر کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں۔ کہ تمہارے تین قسم کے انانیت پسندوں کے نظریہ اور اس موسیقی کے درمیان ربط کیا ہے۔ جو تم نے ابھی سنی ہے؟"

"کوئی ربط نہیں۔ کیونکہ میں موسیقی سن ہی نہیں رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کبھی درست نہیں ہو سکتے ———" مادام لاسنکایا نے گریبوودف کے الفاظ کی شرح کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم موسیقی کو پسند نہیں کرتے۔ تو پھر تمہیں کیا چیز پسند ہے ——— کیا ادب ———؟"

"ہاں میں ادب کا شیدائی ہوں۔ مگر جدید ادب کا نہیں۔"

"کیوں ؟"

"اس کی ایک وجہ ہے ——— حال ہی کا ذکر ہے میں نے ایک شخص کے ساتھ کشتی میں لوگا دریا کو پار کیا۔ کشتی کنارے کے قریب جا کر رک گئی۔ اب ضرورت تھی کہ کشتی کو ہاتھ سے کنارے تک کھینچا جائے۔ میرا ہمنوا ذرا بھاری بھرکم شخص تھا۔ کشتی بان جبکہ پورا زور لگاتے ہوئے اپنی کمر توڑ رہے تھے۔ اور کشتی کو کنارے تک گھسیٹ رہے تھے۔ وہ بھاری بھرکم شخص کراہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ تقسیم محنت کے نظام کا یہ نیا اطلاق ہے۔ یہی بات جدید ادب پر منطبق کی جا سکتی ہے ——— دوسرے جبکہ کام کرتے ہیں۔ اور زور لگاتے ہیں۔ نیا ادب صرف کراہتا ہے ———"

مادام لاسنکایا مسکرائی ———

"اور وہ اس کراہنے کو نئی زندگی کی عکاسی کہتے ہیں" چرب زبان پگاسف نے جو بات کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں تھا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ———" سماجی مسائل سے گہری دلچسپی اور اس قسم کی دوسری باتیں محض حسین الفاظ ہیں ——— !"

"مگر جن عورتوں پر تم حملہ کرتے ہو۔ وہ تو حسین الفاظ استعمال نہیں کرتیں ———"

پگاسف نے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا ———" وہ انھیں اس لئے استعمال نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ انھیں استعمال کر ہی نہیں سکتیں ———"

مادام لاسنکایا کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا ———" پگاسف تم بدتمیز ہوتے جا رہے ہو ———" مادام نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

کمرے میں چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

"زالون تنوشا کہاں ہے ؟ ———" ایک لڑکے نے اپنے استاد جیسی ترت سے دفعتاً پوچھا۔

"پولتو نا گوبرینا میں میرے بچے ———!" پگاسف تیزی کے ساتھ بیچ میں بول پڑا ———" کھاکھولوں[1] کے ملک میں ———"

پگاسف خوش تھا کہ اسے گفتگو کا رخ کسی دوسری طرف موڑنے کا موقع مل گیا تھا ———" ادب کی بات ہو رہی تھی ———" اس نے کہا ———" اگر میرے پاس فالتو روپیہ ہو تو میں فوراً ایک یوکرینی شاعر بن سکتا ہوں ———"

"مگر میں تو ایسا کبھی نہیں کر سکتی ——— اور تم کیا شاعر ہو گئے!" مادام لاسنکایا نے کہا ———" تمھیں کیا وہ زبان آتی ہے ؟"

"بالکل نہیں ——— اور وہ زبان جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں ———"

"ضرورت بھی نہیں ؟"

"قطعاً نہیں ———" ایک کاغذ اٹھاؤ۔ اور اس کے ایک کونے پر لکھ دو۔ مرثیہ۔

اور اس مرثیہ کا یوں آغاز کرو۔ ہائے مقدر۔ وائے مقدر ! یا پھر اس طرح ——— کاسک نیلو اشکو ایک پہاڑی پہ بیٹھا ہے . . . . . . یا اسی انداز سے کچھ اور لکھ دو۔ نہایت اچھی نظم تسلیم کی جائے گی۔ یوکرینی اسے گھر گھر پڑھیں گے۔ اپنے ہاتھ پر اپنی ٹھوڑیاں رکھ کر ——— اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے ———"

"خدا کے لئے ——— بیسے ترت نے کہا ———" آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ لغو اور بیہودہ۔ میں یوکرین میں رہا ہوں۔ مجھے یوکرین سے محبت ہے۔ میں ان کی زبان جانتا ہوں اور یوکرین کی زبان کے بارے میں تمھارا سارا علم سنی سنائی خرافات سے کم نہیں ———"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے باوجود، یوکرینی آنسو بہائے گا۔ اور تم زبان کی بات کر رہے ہو۔ کیا کیا یوکرینیوں کی بھی کوئی زبان ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک کھاکھول سے درخواست کی کہ وہ ایک روسی محاورہ کا ذرا ترجمہ کر دے جو اس وقت مجھے یاد آ گیا تھا۔ اس کا ترجمہ طوطے کا رٹا ہوا جملہ معلوم ہوتا تھا۔ اور تم اسے زبان کہتے

---

[1] زار شاہی روس میں یوکرین کے رہنے والوں کو کھاکھول کہا جاتا تھا۔

ہو۔ کیا وہ ایک خود مختار زبان ہے؟ اگر تم یہ ثابت کر دو۔ تو میں اپنے بہترین دوست کی قربانی دینے کو تیار ہوں ــــ"

"میں تو ات اس بحث کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

"اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو ــــ"، مادام لاسنکایا فوراً بول اٹھی ــــ،

تم اس سے مہمل باتوں کے سوا اور کیا سُن سکتے ہو ــــ"،

پگاسوف کے لبوں پر زہر پھیل گیا۔ اتنے میں ایک خادم نے اندر آکر مادام لپنا اور اس کے بھائی کی آمد کا اعلان کیا۔

مادام لاسنکایا اپنے مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے اٹھی۔

"ایگن ندرنیا کہو تمھارے کیسے مزاج ہیں ــــ" مادام لاسنکایا نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ــــ" تم نے واقعی مجھ پر بڑا کرم کیا ہے ــــ کہو کیسے ہو سرگئے پافلووچ؟"

والنتیف نے مادام لاسنکایا سے ہاتھ ملایا اور فوراً نتالیا کی طرف بڑھا۔

"کیا تمہاری جان پہچان کا وہ بیرن آج آئے گا بھی کہ نہیں؟"

"ضرور آئے گا ــــ"،

"یہ افواہ سننے میں آئی ہے کہ وہ ایک عظیم فلسفی ہے۔ ہیگل کا ہمنوا ہے ــــ" اس بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے میزبانہ مادام لپنا کو صوفہ کے قریب لے گئی۔ اور اس کے پاس خود بھی بیٹھ گئی۔

"فلسفہ ــــ"، پگاسوف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ــــ"، ایک انتہائی بلند و بالا نقطۂ نظر ہے۔ یہ بلند و بالا نقطۂ نظر ہے جو میری جان نے اینچے۔ اگر کوئی شخص اتنی بلندی پر کھڑا ہو تو وہ نیچے کی طرف کب دیکھ سکتا ہے۔ اگر تم گھوڑا خریدنا چاہتے ہو۔ تو تم اسے کبھی مینار پہ کھڑے ہو کر نہیں دیکھو گے ــــ"،

"سنا ہے کہ بیرن اپنا کوئی مقالہ تمھیں سنانے کے لئے لا رہا ہے ــــ؟" لپنا نے مادام لاسنکایا سے پوچھا۔

"ہاں ــــ" مادام لاسنکایا نے مبالغہ آمیز لاپرواہی کے ساتھ جواب دیا ــــ"، وہ مقالہ روس میں صنعت سازی کے ساتھ تجارت کے رشتہ پر ہے۔ مگر تمھیں خوفزدہ ہونے کی

ضرورت نہیں۔ وہ مقالہ ہم یہاں نہیں پڑھینگے۔ میں نے اس غرض سے تمھیں نہیں بلوایا۔ میں تو یہ چاہتی تھی۔ کہ تم اس سے ملو۔ وہ نہایت اچھی روسی زبان بولتا ہے ــــ

"روسی زبان وہ خوب بولتا ہے۔ مگر اس کی تعریف تم فرانسیسی زبان میں کر رہی ہو ــــ" پگاسوف نے طنز کی

"پگاسوف تم طنز کرتے ہو۔ تمھیں اپنے پریشان بالوں کے ساتھ یہی زیب دیتا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں ــــ"،

مادام لاسنکایا نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا ــــ"، آؤ ذرا باغ میں چلیں۔ کھانے میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر ہے۔ اور موسم نہایت خوشگوار ہے ــــ"،

محفل باغ میں جانے کے لئے اٹھی۔

مادام لاسنکایا کا باغ دریا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں لیموں کے درختوں کے بہت سے جھنڈ تھے۔ ببول اور بنفشہ کے پیڑ تھے ان سے مہک آ رہی تھی

نتالیا اور میڈموزیل بون کورٹ کے ساتھ مادام لپنا کا بھائی والنتیف درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کی طرف بڑھا وہ نتالیا کے پہلو میں خاموشی کے ساتھ چل رہا تھا۔ میڈموازیل ان کے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔

"آج تم دن بھر کیا کرتی رہی ہو ــــ؟" والنتیف نے اپنی بھوری مونچھوں کو مروڑتے ہوئے آخرکار پوچھا ــــ"،

والنتیف کے خد و خال بالکل اس کی بہن کی طرح تھے مگر اس کی بہن کی طرح زیادہ جاندار اور شگفتہ نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی کی جھلک تھی۔

"کچھ بھی تو نہیں کرتی رہی ــــ"، نتالیا نے جواب دیا ــــ" تھوڑی سی ایک کتاب پڑھی کچھ کشیدہ کاری کی اور پھر پگاسوف کی ہرزہ سرائی سنتی رہی ــــ"،

"کون سی کتاب پڑھتی رہی ہو؟"

"صلیبی جنگوں کی تاریخ ــــ"، نتالیا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

والنتیف نے اس کی طرف نگاہ کی اور بولا ــــ بھائی

دلچسپ ہوگی —"

پھر اس نے ایک خاموش ترکی۔ اور اسے اپنے ہاتھ میں گھمانے لگا۔ وہ بیس قدموں تک یونہی خاموشی سے بڑھتے گئے۔

"یہ بیرن کون ہے جس سے تمھاری ماں نے جان پہچان پیدا کی ہے —" اس نے پوچھا۔

"شہنشاہ کی خواب گاہ کا منتظم ہے۔ اور اس علاقے میں نیا نیا آیا ہے۔ اماں اس کے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتی ہیں۔"

"تمھاری اماں بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں —"

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ اماں کا دل ابھی تک جوان ہے —" شالیا بولی —"

"ہاں — سنو میں تمھاری گھوڑی بہت جلد لوٹا دوں گا۔ اس کی تربیت ختم ہو چکی ہے۔ صرف اسے سرپٹ دوڑانا باقی ہے —"

"شکریہ مگر میں اس کے لئے بہت بیقرار ہوں۔ اور تم ہو کہ اسے اپنے بچے چڑھا رہے ہو — سنا ہے کہ . . . "

ولنتیف نے بات کاٹتے ہوئے کہا — "مجھے بہت خوشی ہوگی اگر میں تمھارے کسی کام آسکوں —"

ولانتیف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

شالیا نے اس کی طرف نگاہ کی اور پھر بولی — "شکریہ!"

"آخر اس میں بات ہی کونسی ہے —" ولانتیف نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا — "میں یہ باتیں تم سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ تم تو جانتی ہی ہو —" اسی وقت گھر میں گھنٹی بجنے کی آواز آئی —"

"کھانے کی گھنٹی بج رہی ہے —" میڈم مواز بل بون کورٹ کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت پیچھے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

بیرن کھانے کی دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ انھوں نے اس کا آدھ گھنٹہ تک انتظار کیا۔ کھانے کی میز کے گرد گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ ولانتیف شالیا کی طرف دیکھنے کے بغیر اور کچھ نہ کر سکا۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھا رہا اور اسے پانی کے گلاس بھر بھر کے دیتا رہا۔ پینڈرے لافسکی نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی مادام لیناکی تفریح کے سامان مہیا کرنے کی بیہودہ کوشش کی۔ وہ بڑی کوشش کے ساتھ میٹھی اور نرم باتیں کرتا رہا۔ مگر مادام لینا جمائیاں لیتی رہی۔

بیتوف خالی الذہن بیٹھا رہا۔ یگاسیف بھی خاموش رہا تھا اور جب مادام لاسنکایا نے اس کے بارے میں اس بات کا اظہار کیا کہ آج وہ کچھ زیادہ دلکش نہیں ہے۔ تو وہ بولا — "کیا میں کبھی دلکش رہا بھی ہوں؟ —" اور پھر اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا — "ذرا صبر کرو۔ مجھے روسی شراب پی لینے دو — ہاں وہ شہنشاہ کی خواب گاہ کے منتظم حضرت . . . "

"خوب —" مادام لاسنکایا نے بات کاٹتے ہوئے کہا — "ایگی سرف حد سے بڑھ جا رہا ہے۔ وہ حضرت آئے بھی نہیں اور بیگاسیف کا دل رقابت کے مارے کھول رہا ہے"

یگاسیف نے ماتھے پر تیوری چڑھائی اور خاموش رہا — کلاک نے سات بجائے اور محفل دوبارہ نشست گاہ میں آکر جم گئی۔

"میرا خیال ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا —" میزبانہ بولی —"

عین اس وقت گاڑی کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی یہ ایک چھوٹی سی ٹم ٹم تھی۔ جو احاطہ میں داخل ہو چکی تھی۔ چند منٹوں کے بعد ایک خادم نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اور اس نے چاندی کی طشتری پر گھر کی مالکن کو کاغذ کا ایک پرزہ پیش کیا گھر کی مالکن نے وہ رقعہ پڑھا اور پوچھا کہ جو صاحب یہ رقعہ لائے ہیں وہ کہاں ہیں۔

"وہ صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ کیا مادام میں انھیں یہاں بلا لاؤں؟ —"

"ضرور —"

خادم چلا گیا

"کیا حماقت ہے — بیرن کو پیٹرز برگ سے حکم ملا ہے۔ کہ فوراً واپس چلے آؤ۔ اس نے اپنا مقالہ اپنے ایک دوست کے ہاتھ بھجوایا ہے۔ ان کے دوست کا نام مونسیور رُودن ہے بیرن اس آدمی کو مجھ سے ملانا چاہتے تھے۔ بیرن نے اس شخص کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر کتنی عجیب بات ہے۔ میرا خیال

تھا۔ کہ بیرن اس علاقہ میں چند روز قیام کریں گے ——۔،،
" مسٹر ژرودن ! " خادم نے مہمان کی آمد کا اعلان کیا

۳

۴۵ برس کی عمر کا ایک دراز قامت شخص جو ذرا جھک کر چلتا تھا۔ نشست گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے زیتون کا سا رنگ تھا۔ سیدھے سادے خدوخال تھے۔ مگر بشرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کی تیز اور گہرے نیلے رنگ کی آنکھوں میں ایک نم آلود چمک تھی۔ اس کی ناک چوڑی اور سیدھی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں دلآویز خم تھا۔ اس کا لباس نیا نہیں تھا اور اس کے بدن پر بہت کس کے آیا تھا۔ جیسے وہ اپنے اسی لباس میں سن بلوغ کو پہنچا ہو اور پروان چڑھا ہو۔

وہ پھرتی کے ساتھ مادام لاسنکایا کی طرف بڑھا۔ اور اس نے تعظیماً جھک کر اطلاع دی کہ وہ ایک مدت سے اس تعارف کا خواہشمند تھا۔ اور اس کے دوست بیرن کو بے حد افسوس ہوا۔ کہ وہ ذاتی طور پر الوداع کہنے کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔

رودن کی مہین آواز اس کے قد اور اس کے فراخ سینے کے مطابق نہیں تھی۔

" تشریف رکھئے —— میں واقعی آپ سے ملکر بہت خوش ہوئی ہوں ——،، مادام لاسنکایا نے کہا اور پھر سب کے ساتھ اس کا تعارف کرانے کے بعد اس نے ژرودن سے پوچھا۔ کہ وہ اس علاقہ کا رہنے والا ہے۔ کہ اس علاقہ میں ایک اجنبی ہے

" میری جاگیر گوبرنا میں ہے ——،، ژرودن نے جواب دیا وہ اپنی ٹوپی اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھا ——" مجھے یہاں آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے ہیں۔

میں ایک خاص کام کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ اور آپ کے قصبے میں مقیم ہوں ——،،

" کس کے یہاں ٹھہرے ہو ؟ ،،

" ڈاکٹر کے یہاں۔ وہ یونیورسٹی کے وقت کا میرا دوست ہے

" اوہ ڈاکٹر —— ڈاکٹر یہاں کافی مشہور ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے فن کا ماہر ہے —— کیا آپ بیرن کو ایک مدت سے جانتے ہیں ؟ ——،،

" نہیں گذشتہ سردیوں میں ان سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور اب ایک ہفتہ یہاں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گذارا ہے ——،،

" بیرن بہت دانشمند ہے ——،،

" ہاں مادام —— ! "

مادام لاسنکایا نے اپنے رومال سے عطر سونگھا اور سوال کیا ——،، کیا آپ سول سروس میں ہیں ؟ ،،

" کون —— ؟ میں ۔ ،،

" ہاں آپ ——،،

" نہیں۔ میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہوں ——"

تھوڑی دیر تک توقف رہا۔ اس کے بعد پھر گفتگو کا آغاز ہوا —— "

" کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں ——" پگاسف نے رودن سے مخاطب ہو کر کہا ——،، کہ بیرن نے جو مقالہ بھجوایا ہے۔ اس کے مندرجات سے آپ واقف ہیں ؟ "

" ہاں ——،،

پگاسف بولا ——،، مادام آپ نے یہی کہا تھا نا کہ مقالہ میں ہمارے ملک کی صنعت کے ساتھ تجارت کے رشتہ پر بحث کی گئی ہے —— ! ،،

" ہاں۔ یہی اس مقالہ کا موضوع ہے ——" مادام لاسنکایا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

" یہ ٹھیک ہے۔ کہ میں ایسے مقالوں پر اپنی رائے نہیں دے سکتا ——،، پگاسف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ——" مگر میں اس بات کا اعتراف ضرور کروں گا۔ کہ مقالہ کا عنوان —— میں صاف طور پر کیوں نہ کہوں ذرا مبہم اور الجھا ہوا ہے ——،،

" آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے —— ؟ ،،

پگاسف نے طنز سے مسکراتے ہوئے اور مادام لاسنکایا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ——،، کیا آپ کو یہ عنوان صاف اور غیر مبہم معلوم ہوتا ہے ——،،

پگاسف نے اپنا لومڑی کا سا چہرہ رودن کی طرف موڑ دیا — "

" ہاں — "

" خیر — آپ بہتر جانتے ہیں —! "

" کیا تمہارے سر میں درد ہے ؟ " مادام لپنا نے میزبانہ سے پوچھا — "

" نہیں — "

" کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں — " پگاسف نے دوبارہ ناک میں بولتے ہوئے پوچھا — " آپ کے واقف بیرن منغل۔ میرے خیال میں یہی ان کا نام ہے — "

" بالکل — "

" کیا بیرن منغل سیاسی اقتصادیات کو اپنا مشغلہ تصور کرتے ہیں۔ یا لمحات فرصت گذارنے کے لئے اس پہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ سماجی لذتوں اور سرکاری فرائض سے فراغت پاتے ہیں۔ رودن نے پگاسف کا جائزہ لیا

" بیرن اس موضوع کے شائق ہیں — " رودن نے ذرا سا سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا — " لیکن ان کے مقالے میں بہت سی باتیں جائز اور تعمیری ہیں — "

" جب تک میں وہ مقالہ پڑھ نہ لوں۔ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ مگر یہ پوچھنے کی جرأت ضرور کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کے دوست کا یہ مقالہ عام نقطۂ ہائے نظر تک محدود ہے۔ یا اس میں کچھ حقائق بھی ہیں — "

" حقائق بھی ہیں اور حقائق پر مبنی نقطہ ہائے نظر بھی ہیں — "

" بالکل — میں آپ سے یہ کہوں گا۔ کہ میرے خیال میں۔ بعد میں اپنے اس خیال کو کبھی کبھی ظاہر بھی کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تین سال تک ڈورپاٹ میں رہا ہوں۔

یہ تمام نام نہاد نظریے، مفروضے اور نظام وغیرہ وغیرہ مجھے معاف کرنا۔ کیونکہ میں ایک دیہاتی ہوں۔ سب کے سب بالکل بیکار ہیں۔ لوگوں کو احمق بنانے کے لئے فلسفہ چھانٹا جاتا ہے۔ ہمیں تو صاف اور سیدھے حقائق کی ضرورت ہے اور بس! "

" واقعی — " رودن نے طنز کی — " کیا حقائق کی اہمیت بیان نہیں کی جانی چاہیئے۔

" عام مفروضے — " پگاسف نے سلسلۂ کلام جاری رکھا — " یہ مفروضے، یہ استفسار اور یہ نتائج میرے لئے تو جان لیوا ہیں۔ ان سب کی بنیاد نام نہاد یقین کامل پر ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنے عقائد کی بات کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ ان کا احترام کیا جائے۔ اور ان کے بارے میں وہ جھگڑتا ہے۔ . . . . "

پگاسف نے اپنا مکّا ہوا میں لہرایا۔ پنڈرے لافسکی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

" اچھی بات ہے — " رودن بولا — " آپ کو اس بات پہ اصرار ہے کہ عقائد یا یقین نام کی کوئی چیز نہیں —؟ "

" ہاں ایسی کوئی چیز نہیں ؟ "

" کیا یہ آپ کا یقین یا عقیدہ ہے ؟ "

" ہاں — "

" تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسی کوئی چیز نہیں ؟ آپ نے تو ابتدا ہی ایک یقین سے کی ہے — "

کمرے میں موجود ہر شخص مسکرایا۔ سب کی نگاہیں آپس میں ملیں — "

" ذرا ٹھہرو — " پگاسف نے بات شروع کی۔ لیکن مادام لاسنسکایا نے تالی بجائی اور کہا — " شاباش۔ شاباش پگاسف کو شکست ہو چکی ہے — " اور مادام لاسنسکایا نے رودن کی ٹوپی بڑی آہستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

" اتنی جلدی خوش کیوں ہوتی ہو — " پگاسف نے تلخی کے ساتھ کہا۔ محض بزرگانہ انداز میں کوئی دانشمندانہ بات کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔ اسے ثابت کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں تو ہم اپنے موضوعِ بحث سے بھٹک گئے ہیں — "

" معاملہ نہایت صاف ہے — " رودن نے کہا۔ " آپ عام مفروضوں اور عقائد کی افادیت میں یقین نہیں رکھتے — "

" بالکل نہیں - میں کسی بات پر یقین نہیں رکھتا ـــ "
" اچھی بات ہے ـــ آپ کوئی عقیدہ نہیں رکھتے ـــ "
" مجھے ان الفاظ کے استعمال کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی - دوسری بات یہ ہے ـــ "

" کوئی بات کر رہا ہو تو اس میں دخل اندازی نہیں ہونی چاہئے ـــ " مادام لزسنکایا نے مشورہ دیا -

" اسے گردن سے پکڑ لو ـــ کتنا اچھا کتا ہے ـــ " پینڈ لاقسکی نے اپنے آپ سے کہا اور فرطِ مسرت سے مسکرایا -

" میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں - وہ معنی رکھتے ہیں اور آپ انھیں سمجھتے ہیں - اس لئے میں انھیں کیوں نہ استعمال کروں آپ کسی بات پر یقین نہیں رکھتے - پھر آپ حقائق پہ کیوں یقین رکھتے ہیں ـــ ؟ "

" کیوں - ؟ یہ بھی کیا سوال ہے ؟ ہم سب حقائق پر یقین رکھتے ہیں - ہر شخص جانتا ہے - کہ حقائق کیا ہوتے ہیں - میں ان کے بارے میں اپنے تجربہ سے اپنے ادراک سے فیصلہ کرتا ہوں ـــ "

" لیکن آپ کا ادراک آپ کو دھوکا بھی تو دے سکتا ہے ؟ کیا آپ کا ادراک آپ کو یہ بتاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے ؟ شاید آپ کو پرنیکس سے بھی اتفاق نہیں رکھتے ! کیا آپ کو اس پر بھی اعتبار نہیں ؟ "

ایک دفعہ پھر سب کے لبوں پر تبسم پیدا ہوا - اور سب کی نگاہیں رودن پر جم گئیں -

" یہ شخص کوئی مفکر معلوم ہوتا ہے ـــ " ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا -

" آپ مذاق کر رہے ہیں - خیر کیجئے ـــ " پگاسف بولا - آپ کا مذاق کس قدر فطری ہے - لیکن اس کا اصلی نقطۂ بحث سے کوئی تعلق نہیں ـــ "

" جو بات میں نے کہی ہے - مجھے افسوس ہے کہ وہ بالکل طبع زاد یا فطری نہیں ہے ـــ "

رودن نے طنز کی ـــ " اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے اور اسے ایک ہزار مرتبہ دہرایا جا چکا ہے - ہاں اصلی نقطۂ بحث یہ نہیں ہے ـــ "

" تو پھر وہ کیا ہے ؟ " پگاسف نے تحقیر انگیز لہجہ میں پوچھا پگاسف عام طور پر حقارت آمیز لہجہ میں بحث کی ابتدا کیا کرتا تھا - پھر گستاخ ہو جاتا تھا - اور بحث کے آخر میں پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بالکل خاموش ہو جاتا تھا -

" وہ یہ ہے کہ ـــ " رودن بولا ـــ " میں اعتراف کرتا ہوں - مجھے واقعی افسوس ہوتا ہے - جب میں کسی دانشمند شخص کو حملہ کرتے ہوئے سنتا ہوں ـــ "

" نظاموں پر ـــ "

" اگر آپ چاہیں تو اپنے حملہ میں نظام بھی شامل کر سکتے ہیں - نظام کے لفظ پر آپ کو نفرت کیوں ہے ؟ ہر نظام بنیادی اصولوں یعنی زندگی کے بنیادی اصولوں کے علم پر مبنی ہوتا ہے "

" مگر یقیناً انھیں سمجھا یا دریافت نہیں کیا جا سکتا ! "

" مجھے معاف کیجئے ـــ ہر شخص کی ان تک رسائی نہیں ہوتی . . . . . انسان غلطی بھی کرتا ہے - مگر آپ یقیناً مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے - کہ نیوٹن نے ان بعض اصولوں کو دریافت کر لیا تھا - وہ واقعی ایک ذہین اور دانشمند شخص تھا - مگر دانشوروں کی دریافتوں تک اب ہر آدمی کی رسائی ہے ـــ ہر انفرادی مظہرِ قدرت میں بنیادی اصولوں کو دریافت کرنا انسانی ذہن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے - اور ہم اپنے مکمل علم کے ساتھ . . . . . "

" اچھا تو آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے ـــ " ! پگاسف نے ہر لفظ کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے دخل اندازی کی ـــ " میں ایک باعمل شخص ہوں - اور میں ان تمام مابعد الطبیعاتی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہتا ـــ "

" بہت اچھا جیسی آپ کی مرضی - مگر یہ بات جان لیجئے - کہ ایک باعمل شخص بننے کی تمھاری خواہش بھی ایک نظام ہے - ایک تنظیم ہے - اور ایک نظریہ ہے ـــ "

" آپ تنظیم کی بات کر رہے تھے ـــ " پگاسف نے پھر بات کاٹی ـــ " تعلیم کیا اچھی چیز ہے ـــ ! آپ جس تعلیم کی ڈینگ مار رہے ہیں - وہ لوگوں کا کیا بھلا کر رہی ہے ـــ "

میں آپ کی اس تعلیم کی ذرہ بھر قدر نہیں کرتا ــــ"

" افریقن پکاسف بحث کرنے کا یہ انداز نہیں ہوتا ـ !"

میزبانہ نے اپنی رائے دی ـ اور وہ جی ہی جی میں اپنے نئے مہمان کی سکون مزاجی پہ خوش ہو رہی تھی ـ وہ رودن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ کہہ رہی تھی ــــ "یہ شخص کسقدر سنجیدہ اور متحمل مزاج ہے ـ ! مجھے اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرنا چاہیئے ــــ" یہ آخری الفاظ اس نے اپنے ذہن میں روسی زبان میں ادا کیے ـ

" میں تعلیم کی حمایت میں کچھ نہیں کہوں گا ــــ" رودن نے توقف کے بعد کہا ـ ـ ـ "اور تعلیم کو میری امداد یا حمایت کی ضرورت بھی نہیں ــــ آپ تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں ـ یہ آپ کی اپنی پسند ہے ـ تعلیم پر بحث ہمیں اصل موضوع سے دور لے جائے گی ـ تاہم مجھے اجازت دیجئے ـ کہ میں آپ کو ایک پرانی کہاوت یاد دلاؤں !" "اے مورچ دیوتا تو ناراض ہے ـ اس لئے تو ہی قصوروار ہے ــــ !" میرے کہنے کا مطلب یہ ہے ـ کہ نظاموں ، عام مفروضوں وغیرہ پر حملہ اس لحاظ سے اور بھی قابلِ مذمت ہے ـ کہ ان نظاموں کے ساتھ ساتھ لوگ علم ـ سائنس اور ان میں اعتقاد کی بھی تردید کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ کے طور پر خود اپنے آپ میں اعتقاد اور اپنی صلاحیتوں کی بھی تردید کرتے ہیں ـ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانوں کو اس اعتقاد کی ضرورت ہے ـ وہ صرف اپنے محسوسات اور ادراک پر زندہ نہیں رہ سکتے ـ کسی خیال پر نادم ہونا اور اس کا یقین نہ کرنا غلط ہے بے اعتقادی کو ہمیشہ بے اثری اور نامرادی کا نام دیا گیا ہے ــــ"

" یہ محض الفاظ ہیں ــــ" پکاسف بڑبڑایا ـ

" عین ممکن ہے کہ یہ محض الفاظ ہوں ـ مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے ـ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ــــ "یہ محض الفاظ ہیں ــــ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اکثر الفاظ سے زیادہ کوئی واضح بات کہنے کی ضرورت کو نظر انداز کرتے ہیں ــــ"

"کیا کہا ؟" پکاسف نے اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا

" جو کچھ میں نے کہا ہے ـ وہ آپ سمجھ تو گئے ہیں ــــ"

رودن نے جان بوجھ کر طنز کی ـ مگر فوراً ہی اپنی بے صبری پر قابو پاتے ہوئے کہا ــــ "لیجئے میں اپنی بات دہراتا ہوں ـ اگر کوئی شخص ایک ٹھوس اصول نہیں رکھتا جس پر اسے یقین ہو ـ اور اس کے قدموں تلے کوئی پائدار بنیاد نہیں ـ تو وہ اپنی قوم کی ضروریات کردار اور مستقبل کے بارے میں اپنے ذہن کی کھڑکیاں کیونکر کھول سکتا ہے ـ وہ کیسے جان سکتا ہے ـ کہ اسے کیا کرنا ہے ـ اور اگر ـ ـ ـ ـ"

"میں تمھارے لئے میدان چھوڑ رہا ہوں ــــ" پکاسف نے اختتامیہ کہا اور سر جھکا کر کسی کی طرف دیکھے بغیر الگ کرنے میں چلا گیا ـ

رودن نے اس کی طرف نگاہ کی اور نہایت آہستگی کے ساتھ مسکرایا ـ اور اس نے کچھ نہ کہا ـ

" آہا ــــ پکاسف دم دبا کر بھاگ گیا ــــ" مادام لاسنکایا نے کہا ــــ "کوئی بات نہیں ـ ـ ـ ـ ـ مجھے معاف کرنا ــــ" اس نے مسکرا کر رودن کی طرف دیکھا اور پوچھا ــــ "آپ کا آبائی نام کیا ہے ــــ ؟"

" نکولے روچ ــــ"

" کوئی بات نہیں پیارے دمتری نکولے وچ ـ ہم میں سے کسی کو بھی اس نے متاثر نہیں کیا ـ وہ اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ بحث نہیں کرنا چاہتا ـ لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ تم سے بحث نہیں کر سکتا ــــ ذرا اور قریب آ جاؤ ـ آؤ ہم باتیں کریں ـ"

رودن نے اپنی آرام کرسی ذرا آگے کھسکا لی ـ

" یہ کیا بات ہے کہ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ــــ" مادام لاسنکایا بولی ــــ "مجھے تو حیرت ہوتی ہے ـ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے ؟"

یہ کہکر مادام لاسنکایا نے رودن کو وہ کتاب پکڑا دی ـ جو وہ خود پڑھ رہی تھی ـ

رودن نے وہ کتاب لے لی اور اس کے چند ورق الٹے اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اعلان کیا ـ کہ اس نے "مونسیور ٹوکے ویلے" کی یہ کتاب نہیں پڑھی ـ مگر اس کتاب کا مصنف جس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرتا ہے اس پر اکثر غور کیا ہے ـ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز ہوا ـ رودن پہلے تو جھجکتا رہا ـ الفاظ تلاش کرتا رہا ـ مگر اس کے بعد اس نے اس موضوع پر گرم جوشی کے ساتھ بحث شروع کر دی ـ پندرہ منٹ کے بعد کمرے میں

صرف اسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ محفل اسکے گرد جمع ہو گئی تھی
لیس پگاسف ہی انگیٹھی کے قریب ایک کونے میں بیٹھا رہا۔

رُودن نہایت ہوشیاری، روانی اور دانشمندی کے ساتھ بات کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ علم کے دریا بہا دیتا تھا۔ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس محفل میں کسی شخص کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا حیرت انگیز شخص ہے۔ کیونکہ اس کا لباس دلآویز نہیں تھا۔ اور اس کے آنے سے پہلے کوئی افواہ نہیں پھیلی تھی ایک ایسے ہوشیار شخص کی اچانک آمد پر اور وہ بھی اس دیہی علاقہ میں ہر شخص حیران تھا اور اسے یہ بات ناقابلِ فہم معلوم ہو رہی تھی لہٰذا وہ سب حیران تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ خاص طور پر مادام لاسنکایا ——— وہ اس بات پر خوش تھی۔ کہ یہ شخص اس کی اپنی دریافت ہے۔ اور وہ اس کو سماج کے بہترین حلقہ میں متعارف کرانے کی تجویزیں تیار کر رہی تھی۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود مادام لاسنکایا بچوں کی طرح اپنے پہلے تاثرات سے بہت مرعوب ہوتی تھی۔ مادام لیناکی سمجھ میں اگرچہ وہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ جو رودن کہہ رہا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بھی خوش تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا بھائی ولنتیف بھی دل ہی دل میں رُودن کی تعریف کر رہا تھا۔ پینڈے لافسکی مادام لاسنکایا کی طرف حسد کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ پینڈے لافسکی سوچ رہا تھا ———"

"میں پانچ سو روبل کی خاطر اس سے زیادہ اچھی فاختہ ڈھونڈ سکتا ہوں ———"

بیسے توف اور نتالیا رودن سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ بیسے توف تو اپنا سانس روک کر بیٹھا تھا۔ کبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا اور کبھی ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اور رودن کی بات گہری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور آج تک اس گہری توجہ کے ساتھ اس نے کسی کی بات نہیں سنی تھی۔ نتالیا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں رودن پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں بار بار چمک اٹھتی تھیں۔

"اس آدمی کی آنکھیں کتنی حسین ہیں!" ولنتیف نے نتالیا سے سرگوشی کی ———"

"ہاں ———"

"افسوس کی بات ہے۔ کہ اس کے ہاتھ بڑے ہیں۔ اور سرخ ہیں ———"

نتالیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

چائے پیش کی گئی۔ اب گفتگو عام باتوں پر ہونے لگی۔ لیکن جب رودن بات کرنے کے لئے ہونٹ کھولتا تھا۔ تو اس وقت اچانک جو خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا۔ کہ اس نے ان پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔

مادام لاسنکایا کو یکایک یہ خیال سوجھا کہ پگاسف کو چھیڑا جائے۔ اس کے قریب جاکر وہ دبی زبان میں بولی
"تم کیا ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ اس سے کچھ تو بولو ———"

پگاسف نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ رودن کی طرف بڑھی اور اپنی انگلی سے پگاسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ــــ
"ایک اور بات کا شاید تمہیں علم نہیں۔ پگاسف عورتوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور ان پر حملہ کرتے ہوئے کبھی تھکتا نہیں ہو سکے تو اس کی یہ عادت ذرا درست کر دو ———"

رُودن نے پگاسف کی طرف دیکھا۔ رودن قامت میں پگاسف سے کہیں بلند تھا۔ پگاسف نے اس کی طرف ملامت آمیز انداز میں دیکھا۔ اور اس کا جھلایا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا ———

"مادام داریا لاسنکایا غلطی پر ہیں۔ میں صرف عورتوں پر ہی حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ عام طور پوری انسانیت کا دشمن ہوں ———"

"وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں انسانوں کے بارے میں اتنی گھٹیا رائے رکھنے پر مجبور کیا ہے؟" رودن نے اس سے پوچھا ———"

پگاسف نے اس کی نظر سے نظر ملاتے ہوئے کہا ــــ "ہو سکتا ہے کہ یہ میرے دل کا اپنا مطالعہ ہو۔ اور یہ دل کا مطالعہ مجھے روز بروز بے بضاعت باتوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے میں دوسروں کے بارے میں اپنے دل کے ذریعہ رائے قائم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات غیر منصفانہ ہو اور میں خود دوسروں سے زیادہ بُرا انسان ہوں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ یہ میری عادت ہے ———"

"میں سمجھتا ہوں اور تم سے پوری ہمدردی رکھتا ہوں —" رُودن نے جواب دیا — "ہر نیک آدمی نے اپنی تذلیل خود کی ہے لیکن اس غیر محکم صورت حال میں ہمیشہ کیلئے رہنے سے تو کام نہیں چلتا —"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے مجھے ایک نیک انسان کہا ہے —"

پگاسف نے طنز کی —"لیکن میں جس حال میں ہوں۔ مطمئن ہوں۔ چاہے یہ صورت حال نا محکم ہے۔ مجھے اس کی کیا پروا ہے۔ میں اس صورت حال کو بدلنے کیلئے تیار نہیں —"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ ذرا مجھے معاف کرنا۔ کہ زندہ رہنے اور صداقت کی روشنی میں زندہ رہنے کی خواہش پر آپ اپنے آپ سے محبت کو ترجیح دیتے ہیں ...."

"بالکل —" پگاسف بولا —"اپنے آپ سے محبت تو ایک بات ہوئی۔ میرا خیال ہے آپ کیا ہم سبھی اسکو سمجھتے ہیں جہاں تک صداقت کا تعلق ہے۔ صداقت کس چڑیا کا نام ہے یہ صداقت کہاں ہے ؟"

"میں تمھیں خبردار کردوں کہ تم اب باتیں دہرانے لگے ہو"، میزبانہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

پگاسف نے اپنے کندھے ذرا بلند کئے اور کہا —"اگر میں اپنی بات دہرا رہا ہوں۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ صداقت ہے کہاں ؟ خود فلسفی یہ نہیں جانتے کہ صداقت کیا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ صداقت یہ ہے مگر ہیگل کہتا ہے صداقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ صداقت یہ ہے —"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہیگل صداقت کے بارے میں کیا کہتا ہے ؟"

رودن نے اس سے پوچھا۔

"میں پھر یہ بات دہراتا ہوں —"، پگاسف نے تیزی سے جواب دیا —"کہ میں صداقت کو سمجھنے سے قاصر ہوں — میرے خیال میں تو صداقت کا کوئی وجود نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ صداقت نام کے لفظ کا تو وجود ہے۔ مگر خود صداقت کا کوئی وجود نہیں ہے —"

"شرم کرو —" مادام لاسنکا یا چلائی —"تم بڑا سنے پاپی ہوتے ہوئے یہ بات کیونکر کہہ سکتے ہو کہ صداقت کوئی چیز نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو انسان کے لئے جینے کی خاطر کیا رہ جاتا —؟"

"مادام میں واقعی یہ سوچتا ہوں۔ کہ آپ صداقت کے بغیر تو گذارہ کر سکتی ہیں۔ مگر اپنے باورچی اسٹیفن کے بغیر گذارہ نہیں کر سکیں جو نہایت اچھا شوربہ تیار کرتا ہے۔ آپ صداقت سے کونسا اچھا کام لے سکتی ہیں جو آپ صداقت سے اپنی ٹوپی کا پھندنا نہیں بنا سکتے۔!"

"مذاق دلیل نہیں ہوا کرتا —" مادام لاسنکا یا بولی —"خاص طور پر جب اس سے اتہام کی بو آرہی ہو —"

"میں تمھاری فلسفیانہ صداقت کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا مگر گھریلو صداقت کے بارے میں ضرور جانتا ہوں۔ جسے نگلنا ذرا دشوار ہوتا ہے —" پگاسف نے اتنا کہا۔ اور ناراض ہو کر دوبارہ اپنے کونے کی طرف چلا گیا۔

رودن نے غرور کی بات چھیڑ دی۔ اور اس نے اس موضوع پر نہایت اچھی باتیں کہیں۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ غرور کے بغیر آدمی کچھ بھی نہیں۔ اور غرور تو ارشمیدس کے پیور کی طرح ہے۔ جو زمین کو اس کے محور سے اوپر اٹھا سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انسان کا لقب پانے کا اہل وہی شخص ہے۔ جو اپنے غرور پر قابو پائے۔ جیسے ایک گھوڑ سوار اپنے گھوڑے پر قابو پاتا ہے اور عام انسانوں کی بھلائی کیلئے خود کو قربان کر دیتا ہے۔

آخر میں اس نے کہا کہ —"جھوٹا غرور خودکشی کے مترادف ہے۔ اس غرور کا شکار شخص ایک بانجھ درخت کی طرح سوکھ جاتا ہے۔ اور وہ غرور جو اکملیت یا کمال حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ تمام عظمتوں کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ایک انسان کو اپنی انانیت کی خود غرضی کو دبانا چاہیئے اور اسے صحیح راستہ پر ڈالنا چاہیئے"

"کیا آپ مجھے ایک لمحہ کیلئے پنسل عنایت کر سکتے ہیں ؟"

پگاسف نے بیسے نوف کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

بیسے نوف کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے —"آپ کو پنسل کس لئے چاہیئے ؟" اس نے آخر کار پوچھا —

"میں نیورودن کا آخری جملہ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں نے یہ جملہ نہ لکھا تو بھول جاؤں گا۔ تمہیں مان لینا چاہیئے کہ یہ آخری جملہ "برج" کے کھیل میں گرینڈ سلیم جتنا شاندار ہے"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ نیورینگا سف جن کا مذاق اڑانا انتہائی شرمناک ہوتا ہے ——" جیسے توف نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ کہا۔ اور رنگ سفید کی طرف منہ پھیر لیا۔

اس اثنا میں رودن نتالیا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نتالیا کے چہرے سے بے کلی کا اظہار ہو رہا تھا ولانتیف جو اس کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا ——"

"یہاں مجھے پیانو دکھائی دے رہا ہے ——" رودن نے ایک شہزادہ کی طرح بات کا آغاز کیا —— "کیا آپ پیانو بجا لیتی ہیں —— ؟"

"ہاں ——" نتالیا نے ہکلاتے ہوئے کہا —— "مگر مجھے اس میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ موسیو پینڈے لافسکی مجھ سے زیادہ اچھا پیانو بجاتے ہیں ——"

پینڈے لافسکی نے اپنا منہ آگے بڑھا یا۔ وہ مسکرا رہا تھا "نتالیا الیگزینڈ تمہیں یہ بات نہیں کہنا چاہیئے۔ تم اتنا ہی اچھا پیانو بجاتی ہو۔ جتنا کہ میں ——"

"کیا آپ شوبرٹ کا نغمہ "ارل کوئنگ" بجا لیتے ہیں !"

"ہاں ——" میزبانہ نے جواب دیا۔ "کانستنتین ذرا پیانو کے قریب جا بیٹھو۔

کیا دمتری نکولےوچ آپ کو موسیقی پسند ہے ؟ ——"

رودن نے اس بات کے جواب میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اور بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ جیسے وہ پیانو بجانے کیلیئے خود کو آمادہ کر رہا ہو۔ پینڈے لافسکی نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔

نتالیا رودن کی طرف منہ کر کے پیانو کے قریب کھڑی تھی جونہی پیانو سے پہلے سر بلند ہوئے۔ رودن کا چہرہ بےحد حسین ہو گیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں کمرے میں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ اور کبھی کبھی نتالیا کے چہرے پر آ کر ٹھہر جاتیں۔

پینڈے لافسکی نے وہ نغمہ ختم کیا۔ رودن کسی قسم کی رائے کا اظہار کئے بغیر کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک خوشبودار دھند باغ کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ پاس کے درخت غنودگی آلود تازگی چھوڑ رہے تھے۔ اور آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ گرمیوں کی رات ٹھنڈی تھی۔ اور ہر لمحہ زیادہ ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ رودن نے تاریک باغ میں جھانکا اور پھر مڑ کر ہمیں سے کہا۔

—— "موسیقی اور یہ رات مجھے جرمن میں اپنے طالب علمی کے ایام کی یاد دلا رہی ہے —— ہمارے وہ جلسے ....."

"کیا تم جرمنی میں بھی رہے ہو ؟" میزبانہ نے سوال کیا۔

"میں ایک سال تک ہیڈل برگ میں رہا ہوں اور سال کے لگ بھگ برلن میں ——"

"کیا ان دنوں تم طالب علموں کا سا لباس پہنا کرتے تھے ؟ میں نے سنا ہے کہ وہاں طالب علم عجیب و غریب لباس پہنتے ہیں :

"میں ہیڈل برگ میں رسالے کے فوجیوں کی طرح گھٹنوں تک آنے والے بوٹ اور جھالر دار کوٹ پہنتا تھا۔ اور میرے بال میرے شانوں پر گرتے تھے۔ برلن میں طالب علم عام لوگوں کا لباس پہنتے ہیں ——"

"اپنی طالب علمی کی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی حکایت سناؤ ——" مادام لیپا نے درخواست کی ——"

پہلے پہل تو رودن کی داستان بہت بےکیف تھی۔ اس میں نہ تو رنگ تھا اور نہ ہی مزاح تھا۔ تاہم وہ جلد ہی اپنے تجربوں کا ذکر ختم کرنے کے بعد سائنس، تعلیم اور یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کی زندگی پر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بیباکی کے ساتھ ان سب کی ایک واضح تصویر کھینچی۔ سامعین اس کی ایک ایک بات پر عش عش کر اٹھے۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ دل کو موہ لینے والے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ تھوڑے سے ابہام سے بھی کام لے رہا تھا۔ اور اس سے اس کے الفاظ میں مزید دلکشی پیدا ہو رہی تھی۔

خیالات کے بہاؤ نے رودن کو وضاحت اور صفائی کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے سے روکا۔ وہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر کھینچتا۔ ایک تشبیہ کے بعد دوسری تشبیہ دیتا۔ اور وہ تشبیہ نہایت موزوں ہوتی۔ اس کی گفتگو میں ایک تجربہ کار

مقرر کا سا انداز نہیں تھا۔ اس کی ہر بات میں ایک سچا جوش و خروش تھا۔ وہ الفاظ کے لئے اپنے ذہن پر زور بھی نہیں دیتا تھا۔ الفاظ اس کا حکم مانتے ہوئے خود بخود اس کے لبوں پر آ جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لفظ اس کے دل سے ابھر رہا ہے۔ اور ہر لفظ اس کے یقین سے دمک رہا ہے۔

رودن خطابت کی موسیقی کا جو سب سے بڑا اسرار ہے ماہر تھا۔ جب وہ دل کے ایک تار پر انگلی رکھ دیتا تھا۔ تو دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھتے تھے۔ سامعین میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ان کے سینے میں زیر و بم پیدا تھا۔ اور ایک بے نام تابناکی ان کی نگاہوں کے سامنے پیدا تھی ——

رودن کے تمام خیالات ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ مستقبل کی جھلک ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خیالات جوان اور پرشباب معلوم ہوتے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر بات کر رہا تھا وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان عورتوں کی موجودگی عام ہمدردی اور توجہ اور رات کے حسن کی وجہ سے وہ اپنے ہی جذبات میں بہا جا رہا تھا۔ اور اس کی خطابت شاعری کی سرحدیں چھو رہی تھی —— اس کی نرم اور پرخلوص آواز کی صورت اس کے الفاظ کو ایک نئی دلکشی عطا کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی عظیم قوت جس سے وہ خود بھی آشنا نہیں تھا۔ اس کے لبوں کے ذریعہ بات کر رہی ہے۔ رودن وہ باتیں کہہ رہا تھا۔ جو مختصر انسانی زندگی کو ابدی قدر عطا کرتی ہیں۔

"مجھے سکینڈے نیویا کی ایک حکایت یاد آ رہی ہے" اس نے آخر میں کہا —— "

ایک بادشاہ آگ کے گرد ایک تاریک کھلیان میں اپنے جنگجو سپاہیوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ دفعتاً ایک ننھا سا پرندہ ایک دروازے سے اڑ کر دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ یہ پرندہ ایک لمحہ روشنی اور گرمی میں گزار کر تاریکی سے باہر آیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ سب سے بوڑھے جنگجو سپاہی نے کہا —— "اے شہنشاہ یہ پرندہ تاریکی میں فنا نہیں ہوگا۔ وہ اپنا گھونسلہ ڈھونڈ لے گا —— "

یہ سچ ہے کہ ہماری زندگی مختصر سی ہے۔ بے بضاعت بھی ہے۔ لیکن یہ عظیم کارنامے انسان ہی انجام دیتا ہے۔ انسان کا یہ ادراک کہ وہ بلند و ارفع قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ اس کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ موت میں بھی انسان اپنی زندگی کو ڈھونڈ لے گا۔ اپنا آشیانہ تلاش کر لے گا —— "

رودن نے ایک لمحہ کیلئے توقف کیا اور غیر ارادی طور پر گھبراہٹ کے عالم میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"نہایت عمدہ —— تم تو بہت بڑے شاعر ہو" مادام لاسنکایا کے منہ سے نکلا۔

دل ہی دل میں میں نے مادام لاسنکایا کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم پیگاسوف اس بات سے متفق نہیں تھا۔ اس نے رودن کی طویل تقریر کو آخر تک سننے کا انتظار کئے بغیر اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اور جاتے ہوئے اس نے پینڈے لافسکی کے کان میں جو دروازے کے قریب کھڑا تھا یہ کہا —— "اس سے تو کہیں اچھا ہے۔ کہ میں احمقوں کی مجلس میں جا بیٹھوں —— "

کسی نے بھی پیگاسوف کو روکنے کی کوشش نہ کی اور کوئی بھی اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کر سکا۔

خادم رات کا کھانا لے کر اندر آئے۔ اور آدھ گھنٹے بعد سرگئی اپنی گاڑی میں یا پیدل روانہ ہو گیا۔ میزبانہ نے رودن سے اصرار کیا۔ کہ وہ رات اس کے یہاں بسر کرے۔ اپنے بھائی کے ساتھ گھر لوٹتے ہوئے مادام لیپانے بار بار رودن کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف کی اور اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ وولانتسیف بھی اس کا ہم خیال تھا۔ اور اس نے صرف اسی قدر کہا کہ رودن بعض اوقات مبہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور اس کی آنکھیں جو گاڑی کے ایک کونے میں جھانک رہی تھیں اور بھی افسردہ ہو گئیں۔

پینڈے لافسکی نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے اپنے کندھوں پر سے ریشمی تسمے اتارتے ہوئے کہا —— "فوراً قبول عام حاصل کر لینے والا شخص ہے —— !" اور پھر اس نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر نکل جائے۔ اچانک اس کا چہرہ بہت سنجیدہ ہو

گیا۔ رودن تمام رات سو نہ سکا۔ وہ اپنا لباس تبدیل کئے بغیر پلنگ پر پڑا رہا۔ اور ماسکو میں اپنے ایک دوست کے نام خط لکھتا رہا تھا لیا اگرچہ لباس تبدیل کر کے بستر پر جا چکی تھی۔ مگر نیند اسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی رہی۔ اس کا ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا۔ اور وہ تاریکی میں گھور رہی تھی۔ اس کی رگوں میں اس کا لہو تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اور اس کے سینے سے سرد آہیں ابھر رہی تھیں۔

(۴)

دوسرے دن صبح کو رودن اپنا لباس تبدیل ہی کر رہا تھا کہ جب ایک خادم اس کے پاس مادام لاسنکایا کی یہ دعوت لے کر آیا کہ وہ چائے اس کے ساتھ اس کے ذاتی کمرے میں پیئے۔ رودن نے مادام لاسنکایا کو تنہا پایا۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملی۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ رات کو اسے نیند تو اچھی آئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی پیالی میں چائے انڈیلی اور اس سے دریافت کیا۔ کہ چائے میں شکر کافی ہے کہ نہیں۔ اسے سگریٹ پیش کی۔ اور دو مرتبہ اپنے اس تعجب کا اظہار کیا۔ کہ وہ اس سے پہلے کیوں نہ مل سکی۔ رودن پہلے تو اس سے دور بیٹھا رہا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے جلدی اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر تھوڑا سا اس کی طرف جھک بھی گئی۔ اور اس سے اس کے رشتہ داروں، اس کے آئندہ تجاویز اور ارادوں کے بارے میں دریافت کرتی رہی۔ مادام لاسنکایا خود تو کبھی کبھار بات کرتی۔ لیکن اس کی باتیں بڑے غور کے ساتھ سنتی۔ رودن پر یہ بات نہایت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ وہ خوشامد کی حد تک اس سے شائستگی کے ساتھ پیش آ رہی ہے۔ اس نے صبح کی ملاقات کا یونہی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اس نے لباس تو نہایت سادہ پہنا تھا۔ مگر بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ بہرکیف اس نے جلد ہی اس سے سوالات پوچھنے بند کر دیئے۔ اب وہ اپنی باتیں کرنے لگی۔ اپنی جوانی کی، اپنے رشتہ داروں کی اور ان لوگوں کی جنھیں وہ جانتی تھی۔ رودن نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کی تمام باتیں سنیں۔ مادام لاسنکایا جس شخص کے بارے میں بھی بات کرتی۔ اسے تو وہ پس پشت ڈال دیتی۔ اور خود اپنے کو زیادہ ابھار دیتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ جس شخص کے بارے میں وہ بات کر رہی ہوتی۔ وہ تو بالکل غائب ہو جاتا اور وہ خود ہی سامنے رہ جاتی۔ ان سب باتوں کے باوجود رودن کو اس بات کا تفصیل کے ساتھ پتہ چلا۔ کہ مادام لاسنکایا نے فلاں مشہور شخص سے کیا کہا تھا۔ اور فلاں نامور شاعر پر اس کا کتنا گہرا اثر تھا۔ مادام لاسنکایا کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس صدی کے گزشتہ چوتھائی میں یہ مشہور آدمی اس سے ملنے کیلئے بیتاب تھا۔ اور اس کی عنایات کا طلبگار تھا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے گہرے دوست رہے ہوں۔ وہ ان کی تعریف اور ان کی قصیدہ خوانی نہیں کر رہی تھی۔ بعض اشخاص کو تو وہ بہت ہی عجیب و غریب ڈھنگ سے پیش کر رہی تھی۔ جس وقت وہ ان سے متعلق باتیں کر رہی تھی تو ان کے نام اس کے ہونٹوں سے اس طرح ادا ہو رہے تھے۔ جیسے وہ نام خود مادام لاسنکایا کے نام میں تحلیل ہوتے جا رہے ہوں۔ ایک نایاب ہیرے کے گرد جڑے ہوئے نگینوں کی طرح۔

رودن سگریٹ پیتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموش رہا۔ کبھی کبھی وہ اس خودنما خاتون کی بات پر یونہی سی کوئی رائے دے دیتا۔ رودن نہایت اچھی طرح بولتا تھا۔ اور باتیں کرنے میں اسے مزہ آتا تھا۔ وہ دوسروں سے بات چیت اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دوسروں کی باتیں خوب غور سے سنتا تھا۔ جن لوگوں کو وہ ابتدا ہی میں بوکھلا نہیں دیتا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں کھل کر باتیں کرتے تھے۔ وہ جب دوسروں کے بیان کے تسلسل کو قائم رکھنے میں امداد دیتا تو اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ نہایت اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ ان لوگوں کی طرح نیک طینت تھا۔ جنھیں اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ بحث کرتے ہوئے وہ اپنے مدمقابل کو یہ موقع نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنی بات پوری طرح کہہ سکے۔ کیونکہ وہ اس کے طرز کلام کی روانی اور شستگی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔

مادام لاسنکایا روسی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اپنی مادری زبان پر اپنے عبور کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اگرچہ اس

یے بسوں میں فرانسیسی محاورے اور ضرب الامثال بار بار نمودار ہوتی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر عام بول چال کی زبان استعمال کر رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ غیر موزوں جملے بھی کہہ جاتی۔ یہ کھچڑی سی زبان رودن کو برہم نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان باتوں پر غور نہیں کر رہا تھا۔

جب مادام لاسنکایا تھک گئی۔ تو اس نے اپنی بازوؤں والی کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا۔ اور رودن کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

میں اب سمجھا ہوں۔ کہ آپ گرمیوں میں اپنے اس دیہی مکان میں کیوں آتی ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ راجدھانی کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد یہاں سکون کی زندگی انسان کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ قدرت کی دلفریبیوں سے ہمدردی رکھتی ہیں ——،،

مادام لاسنکایا نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

"قدرت —— ہاں کیوں نہیں۔ میں تو قدرتی مناظر کی پرستار ہوں۔ لیکن پیارے دستری دیہات میں بھی احباب کے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ لگاسف کو یہاں سب سے تیز و طرار اور ذہین شخص خیال کیا جاتا ہے —— ..،،

"وہ کل کے تلخ مزاج سن رسیدہ بزرگ ——،،

"ہاں —— دیہات میں تو اس کا بھی خیر مقدم کیا جا سکتا ہے"

"وہ شخص تو احمق ہے —— ،، رودن بولا ——، کیونکہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ آپ شاید مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر ہر بات کی نفی اور شدید نفی ہمیشہ لاحاصل ہوا کرتی ہے۔ مگر ایک یہ بات بھی ہے۔ کہ آپ ہر چیز کی تردید کیجئے۔ آپ کو خدا رسیدہ بزرگ تصور کیا جائے گا۔ اور سادہ لوح لوگ بہت جلد یہ اعتبار کر لینگے کہ آپ جس بات کی تردید کر رہے ہیں۔ آپ اس سے برتر ہیں۔ درحقیقت ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ابتداء میں آپ ہر شے میں نقص تلاش کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے اگر آپ اسی پر بھی ہیں۔ تو آپ آخر میں فتحیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ذہنی نفی پر تل جاتا ہے۔ وہ خشک اور ٹھس ہو جاتا ہے۔ اپنے غرور کی تسکین آپ کو غور و فکر کی مسرت سے محروم کر دیتی ہے —— زندگی اور اس کا نچوڑ آپ کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور آپ اپنی بات کو گالیوں پر ختم کرتے ہیں اور ہر آدمی کے مذاق کا موضوع بن جاتے ہیں۔ پس جو شخص محبت کرتا ہے۔ اسے ہی تنقید کا حق پہونچتا ہے ——..

"بہت خوب —— .. مادام لاسنکایا کے منہ سے نکلا —— تم لوگوں کا جائزہ لینے میں مہارت رکھتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ لگاسف نے تمہاری یہ بات ہرگز تسلیم نہ کی ہوتی۔ کیونکہ اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے ——،،

"وہ اپنے آپ پر تنقید اس لئے کرتا ہے۔ کہ دوسروں پر تنقید کر سکے —— ..

رودن نے کہا —— "

مادام لاسنکایا ہنسی —— ،، یعنی اسطرح الزام . . .

ہاں وہ کیا کہاوت ہے —— ،، اس نے کہاوت کو یاد کرنے کی بے سود کوشش کی ——..

یعنی اسطرح الزام دوسروں پر لگایا جائے — ہاں یہ تو کہو بیرن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ——؟ "

"بیرن ایک نہایت اچھا شخص ہے — وہ دل کا نرم ہے اور وسیع معلومات رکھتا ہے۔ مگر اس کا کردار مضبوط نہیں وہ عمر بھر نیم خادم رہے گا۔ اور نیم دنیا دار رہے گا میرا مطلب یہ ہے کہ فنون لطیفہ کا قدردان رہے گا۔ اور اس طرح بے بضاعت اور حقیر رہے گا —— ،، اور یہ کسقدر افسوس کی بات ہے —— ،،

"میں نے خود بھی اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے ——،، مادام لاسنکایا نے کہا —— ،،

"میں نے اس کا مقالہ پڑھا ہے . . . . . "

"کیا آپ کا اور بھی کوئی دلچسپ پڑوسی ہے —؟ ..

مادام نے اپنی سگریٹ کی راکھ اپنی چھنگلیا سے جھاڑی۔

"نہیں کوئی نہیں —— مادام لینا ہیں۔ جنھیں تم نے کل رات کو یہاں دیکھا تھا۔ ایک شریف عورت ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اس کا بھائی بھی ایک اچھا آدمی ہے۔ ایک گھریلو قسم کا شخص ہے۔ شہزادہ گارن کو تو تم جانتے ہی ہو۔ اور یہاں

کوئی نہیں۔ دو تین اور پڑوسی بھی ہیں۔ مگر قابل ذکر نہیں ہیں۔ یہ وہ بس یا یسے آدمی ہیں۔ دنیا دار بالکل نہیں ہیں۔ میں خواتین سے بہت کم ملتی ہوں۔ ایک اور پڑوسی بھی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا تعلیم یافتہ اور عالم ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ مادام لینا اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ اور اس سے کچھ مرعوب بھی ہے۔ دمتری تمہیں چاہیئے کہ تم اس پر ذرا توجہ دو۔ مادام لینا ایک نہایت پیاری عورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری توجہ اسے بہت بہتر بنا سکتی ہے ——"

"واقعی ایک دلآویز عورت ہے ——" رودن بولا۔

"مگر بالکل بچی ہے۔ گود میں کھیلتی ہوئی بچی — وہ بیوہ ہے۔ اگر میں مرد ہوتی تو ایسی ہی عورتوں سے عشق کرتی ——"

"واقعی؟"

"ہاں —! ایسی عورتیں بڑی تازہ اور شگفتہ ہوتی ہیں۔"

رودن ہنسا —— وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اور جب کبھی ہنستا تھا۔ تو اس کا چہرہ عجیب و غریب انداز اختیار کر لیتا تھا۔ نہایت ہی بے ڈھنگا انداز ——" اس کی آنکھیں سکڑ جاتی تھیں اور اس کی ناک میں بل پڑ جاتے تھے۔

"وہ سنکی شخص کون ہے۔ جس سے مادام لینا اس قدر مرعوب ہیں؟" رودن نے پوچھا۔

"مونیور یزنف —— مائیکل مائیخلوف —— ایک مقامی جاگیردار ہے ——"

رودن نے حیرت سے کہا ——" یزنف —" کیا وہ تمہارا پڑوسی ہے؟"

"ہاں —— کیا تم اسے جانتے ہو؟"

رودن ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا ——"

"ہاں میں کبھی اس سے واقف تھا —— مگر ایک مدت ہو چکی ہے۔ وہ ایک دولت مند شخص ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ——" اس نے اپنی کرسی کے بازوؤں پر زور سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ دولت مند ضرور ہے۔ مگر نہایت بھونڈا اس پہنتا ہے۔ اور دو ڈوالی گاڑی میں گھومتا رہتا ہے۔ جیسے وہ کوئی گماشتہ ہو۔ میں نے اسے یہاں بلانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بڑا ہوشیار شخص ہے۔ میں اس سے کاروبار کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں میں اپنی جاگیر دار کا انتظام خود کرتی ہوں ——" تمہیں شاید اس کا علم ہو ——؟"

رودن نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"میں اپنی جاگیر کا خود انتظام کرتی ہوں۔ اسی لئے میں زیادہ خوشحال ہوں ——"

"میں ان لوگوں کی بات کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ عورت با عمل نہیں ہوتی ——"

مادام لاسنکایا مسکرائی ——" آپ ایک نہایت مہربان شخص ہیں۔ ہاں تو یزنف سے میرا زمین کی حد بندی کے بارے میں جھگڑا ہے۔ میں اسے بار بار بلوا چکی ہوں۔ مگر وہ آتا ہی نہیں۔ وہ بڑا شکی ہے ——"

اتنے میں دروازہ کا پردہ اٹھا کر ایک۔ ملازم اندر آیا۔

"کیوں کیا ہے؟"

"مونیور یزنف تشریف لائے ہیں ——"

"او میرے خدا —— شیطان کا ذکر کرو۔ اور وہ فوراً آدھمکتا ہے۔

اسے اندر بھیج دو ——"

ملازم باہر چلا گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ کہ وہ شخص بڑا سنکی ہے۔ اور وہ آخرکار آ ہی گیا۔ بڑے غلط وقت یہاں آیا ہے۔ ہماری گفتگو میں خلل انداز ہوا ہے ——"

رودن کرسی پر سے اٹھا لیکن مادام لاسنکایا نے اسے روک دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی موجودگی میں بھی بات کر سکتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ تم اسے بھی پگاسف کی طرح آڑے ہاتھوں لو ——"

"رودن ایک لمحہ کیلئے سوچ میں پڑ گیا۔ مگر دوبارہ اپنی جگہ

بند کیا۔"

یزنف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنا پرانا لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ اور چائے کی میز تک آ گیا۔

"آپ نے اپنی تشریف آوری سے آخر کار مجھ پر احسان کر ہی [illegible] —

تشریف رکھئے —"

یزنف دعوت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"میرا خیال ہے کہ . . . . . " اس نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھا لیا۔

"ہاں ہم دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھ رہے تھے —"

"مگر اس کے بعد بھی تو ہماری ملاقات ہوتی تھی۔"

مادام لاسنکایا ان دونوں کی طرف بڑی پریشانی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے مجھے شاید حدبندی کی خاطر بلایا ہے —"

"مگر میں تو یہ بھی چاہتی تھی۔ کہ آپ میرے مہمان بھی ہوں۔ باہم ایک دوسرے کے نزدیکی پڑوسی، نہیں ہیں؟"

"شکریہ —" یزنف بولا —

"جہاں تک حدبندی کا سوال ہے۔ میں سارا معاملہ آپ کے [illegible] سے طے کر چکا ہوں۔ میں ان کی تمام تجاویز قبول کر چکا ہوں"

"یہ میں جانتی ہوں —"

"اس نے یہ بات کہی تھی کہ کاغذات پر آپ سے ملاقات ہونے پر دستخط ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں میرا یہی اصول ہے —"

"تو میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں —"

"آپ کے لہجے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ میرے یہاں آنے میں جھجکتے رہے ہیں —"

"کیونکہ میری یہ عادت ہے کہ میں کہیں بھی نہیں جاتا —"

"کیا مادام لینا کے یہاں بھی نہیں —؟"

"ہاں وہاں جاتا ہوں۔ کیونکہ ان کا بھائی میرا دوست ہے"

"اس کا بھائی؟ خیر میں کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتی۔ لیکن میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ اور اس بات پر تمہیں سرزنش بھی کر سکتی ہوں۔ تم ایک سادھو کی سی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو — کہیں یہ بات تو نہیں کہ تمہیں میرا گھر پسند نہیں —"

"نہیں — آپ کا گھر تو ایک نہایت شاندار گھر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ میں ذرا آرام پسند واقع ہوا ہوں — میرے پاس شام کا لباس نہیں۔ دستانے نہیں —" "میں دراصل آپ کے حلقے کا آدمی نہیں ہوں —"

"کیوں۔ تم نے اتنی اچھی تعلیم پائی ہے۔ امیر گھرانے میں جنم لیا ہے —"

"جنم اور تعلیم کا میری اس عادت سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی کو اپنے ڈھنگ سے رہنا چاہیے —"

مادام لاسنکایا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ پھر وہ بولی "تم نہیں چاہتے۔ کہ اپنے جاننے والوں کے حلقے میں مجھے شامل کرو —"

"موسیو یزنف ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ [illegible] کے بعد سے ذاتی آزادی کے ذرا زیادہ ہی قائل ہیں —" [illegible] نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

یزنف نے کوئی رائے نہیں دی اور وہ دروازے کی طرف نگاہ کر کے رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

"تو پھر میں یہ سمجھوں کہ سارا معاملہ طے ہو چکا ہے —! کیا آپ کے [illegible] کاغذات بھجوا دئے —"

"[illegible] دوست — ویسے تمہارا [illegible] کو دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے۔ کہ انکار کر دوں"

"وہ کیوں — نئی حدبندی سے تو آپ ہی کو فائدہ ہوگا"

"کیا آپ ناشتہ [illegible] یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"بہت بہت شکریہ — میں ناشتہ نہیں کیا کرتا۔ اور پھر مجھے جلدی بھی ہے —"

"اچھا تو میں تمہیں کیوں روکوں —" مادام لاسنکایا نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ —" اور یزنف کمرے سے باہر چلا گیا۔

"دیکھا تم نے کس قدر عجیب آدمی ہے۔ میں نے تو یہ سن رکھا تھا۔ کہ وہ ایک عجیب و غریب شخص ہے۔ مگر آج

توعد بھی ہو گئی ——"۔

"یہ اور پچاسف ایک ہی مرض کے شکار ہیں۔" رودن نے وضاحت کی ——"دونوں ہی بہت خود پرست ہیں۔ مغرور ہیں۔ ان میں ذرہ بھر صداقت نہیں۔ ذرہ بھر محبت نہیں۔ اپنے آپ کو ذہین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر دونوں ہی ذہانت اور قابلیت کو دفنا چکے ہیں ——"۔

"تم لوگوں کا کتنا اچھا تجربہ کرتے ہو۔ تمھاری نگاہ سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا ——"۔

"ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دینی چاہیئے۔ میں اس شخص سے محبت کرتا رہا ہوں۔ مگر بعد میں ہم دونوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں اور ——"

"اور پھر تم دونوں آپس میں لڑ پڑے ——"۔

"نہیں —— یہ نوبت تو نہیں آئی۔ مگر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شاید ہمیشہ کیلئے ——"۔

"تم شاید جبھی خاموش رہے۔ بہر حال میں آج کی خوشگوار صبح کے لئے تمھاری شکر گذار ہوں۔ تم ناشتہ کے وقت تک ٹہل سکتے ہو —— میں ذرا اپنا کام کر لوں ——"۔

مادام لاسنکایا نے اپنا ہاتھ رودن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور اس پر بوسہ دیا۔ وہ نشست گاہ سے ہوتا ہوا چھجے کی طرف چل دیا۔ اور چھجے کے اوپر اس کی ملاقات نتالیا سے ہوئی۔

(۵)

مادام لاسنکایا کی بیٹی نتالیا پہلی نگاہ میں حسین نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور رنگ سیاہی مائل تھا اس کی کمر میں ذرا سا خم تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح نشو و نما نہیں پائی تھی۔ اس کے ابرو بہت دلآویز تھے۔ پیشانی چوڑی تھی۔ وہ بہت کم باتیں کیا کرتی تھی۔ مگر سنتی زیادہ تھی کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوتا اور غائب ہو جاتا۔

میڈموازیل بون کورٹ اکثر کہا کرتی تھی کہ ایک نوجوان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ کھوئی ہوئی سی رہے۔

مادام لاسنکایا اپنی بیٹی کو نہایت مدبر اور سگھڑ خیال کرتی تھی اور مذاق کے طور پر اکثر کہا کرتی تھی —— "میری نتالیا سرد ہے وہ مجھ پر نہیں ہے۔ یہی اس کے لئے اچھا بھی ہے —— وہ زندگی میں خوش رہے گی ——"۔ مگر مادام لاسنکایا غلطی پر تھی آخر کون ایسی ماں ہے جو اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتی ہے۔

فرمانبردار بیٹی ہوتے ہوئے بھی نتالیا اپنے سب راز اپنی ماں سے نہیں کہتی تھی۔

"تمھیں مجھ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیئے ——" مادام لاسنکایا اکثر اسے ہدایت دیتی۔

رودن جب چھجے میں داخل ہوا تو نتالیا میڈموازیل بون کورٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں جارہی تھی۔ تاکہ ٹوپی پہن کر باغ کی سیر کے لئے جائے۔ وہ اپنا صبح کا مطالعہ ختم کر چکی تھی۔ نتالیا کے ساتھ اب بچوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نتالیا صبح کو تاریخ سفرنامہ یا کتاب اور دوسرا صاف ستھرا ادب پڑھا کرتی تھی ——" استانی بون کورٹ اسے ہر قسم کا فرانسیسی ادب ڈوما کے ناولوں کے سوا پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ ڈوما کے ناول استانی بون کورٹ خود پڑھتی تھی۔ چوری چھپے نتالیا دوسری کتابیں بھی پڑھتی جن کا علم استانی بون کورٹ کو نہیں تھا۔ اسے پشکن کا مجموعہ کلام زبانی یاد تھا۔

رودن کو دیکھ کر نتالیا ذرا سا مسکرائی۔

"کیا آپ سیر کے لئے جا رہی ہیں؟" رودن نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ ذرا باغ تک جارہی ہوں ——"

"کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ ——"

نتالیا نے استانی بون کورٹ کی طرف دیکھا۔

آپ بڑی خوشی کے ساتھ ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں ——" ادھیڑ عمر کی استانی نے فرانسیسی زبان میں کہا۔

رودن اپنی ٹوپی اٹھا کر ان دونوں کے ساتھ ہولیا۔

نتالیا پہلے پہل تو رودن کے ہمراہ چلتے ہوئے ذرا گھبرائی لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ رودن اس کے درس و مطالعہ کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔

رودن نے شالیا کا سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ۔" آپ دیہی علاقہ میں بے کیفی تو محسوس نہیں کرتیں ؟ "

" نہیں ۔ میں تو خوش ہوں ۔۔۔۔"

" خوش ہو ۔۔۔ خوشی بڑی چیز ہے ۔۔۔ آخر آپ کیوں خوش ہوں ۔ آپ جوان جو ہیں ۔۔۔۔"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری رہی۔

" آج صبح میں آپ کی والدہ سے باتیں کرتا رہا ہوں ۔ وہ ایک غیر معمولی عورت ہیں ۔ میں اب سمجھا ہوں کہ ہمارے شاعران کے ساتھ دوستی کی کیوں اتنی قدر کرتے رہے ہیں کیا آپ کو شاعری سے کچھ شغف ہے ۔ ؟ "

شالیا نے سوچا ۔۔۔ " یہ شخص میرا امتحان لے رہا ہے " پھر اس نے جواب دیا ۔۔۔ " ہاں ۔۔۔ "

رودن بولا ۔۔۔ " شاعری دیوتاؤں کی زبان ہے ۔۔۔ میں شعر و شاعری کا دلدادہ ہوں ۔ مگر شاعری صرف نظموں تک محدود نہیں ۔ شاعری تو ہر جگہ موجود ہے ۔۔۔ ہمارے چاروں طرف ۔۔۔ ذرا ان درختوں کی طرف اور آسمان کی طرف دیکھئے ۔۔۔ ہر چیز سے حسن اور زندگی پیدا ہے ۔ اور جہاں کہیں حسن اور زندگی ہوتی ہے ۔ وہیں شاعری بھی موجود ہوتی ہے ۔۔۔ " اس نے آگے چل کر کہا ۔۔۔ " آؤ ذرا یہاں بنچ پر بیٹھ جائیں ۔۔۔ " اس کے بعد اس نے شالیا کی طرف بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ۔۔۔ " جب آپ مجھ سے مانوس ہو جائیں گی ۔ تو آپ میری دوست بن جائیں گی کیوں آپ کا کیا خیال ہے ۔۔۔ ؟ "

" وہ مجھ سے ایک اسکول کی طالبہ کی طرح سلوک کر رہا ہے ۔۔۔ " شالیا نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا وہ دیہات میں ایک لمبی مدت تک رہے گا ۔۔۔ "

" اب گرمیاں یہیں گذاروں گا شاید سردیاں بھی ۔ میں دولت مند نہیں ہوں ۔ میرے حالات خراب ہیں ۔ اور پھر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے تھک گیا ہوں ۔۔۔ اب میرے آرام کرنے کا وقت ہے ۔۔۔ "

شالیا حیرت زدہ رہ گئی ۔۔۔ " کیا واقعی یہ آپ کے آرام کا وقت ہے ۔ ! "

" اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے ! ۔۔۔ " اس نے ذرا سا گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا ۔۔۔ " میرا مطلب ہے کہ دوسرے تو آرام کر سکتے ہیں ۔ مگر آپ کو کام کرنا چاہیئے ۔ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیئے ۔ اگر آپ کام نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا ۔۔۔ "

" آپ کی اس تعریف کے لئے آپ کا شکریہ ۔۔۔ " یہ کہنا کہ کوئی مفید کام کرو ۔ ایک آسان بات ہے اگر مجھ میں یہ یقین بھی پیدا ہو جائے کہ میں کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو مجھے ہمدرد کہاں میسر آئیں گے ۔۔۔ " رودن خاموش ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ افسردہ بھی۔

شالیا جی ہی جی میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو رات کو اتنی گرم جوش تقریریں کر رہا تھا۔

یک بیک رودن نے اپنے بال پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا ۔" میں جو کچھ کر رہا ہوں بکواس ہے ۔۔۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں ۔۔۔۔ "

شالیا اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔ " میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں ۔۔۔ "

شالیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ۔ کہ وہ اس کا شکریہ کس بات کے لئے ادا کر رہا ہے

" آپ کے ایک ہی لفظ نے مجھے میرے فرض کا احساس دلا دیا ہے ۔ آپ نے مجھے صحیح طور پر میرا راستہ دکھایا ہے ۔۔۔ ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ میں عمل کروں مجھے اپنی ذہانت چھپا کے نہیں رکھنا چاہیئے ۔۔۔ "

اس کے منہ سے الفاظ ندی کے بہاؤ کی طرح نکل رہے تھے اس نے اپنے آپ کی ملامت کی ۔ اپنی بے حسی کو کوسا ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کام کرنے والے شخص کے ہمدرد پیدا ہو جاتے ہیں ۔ آخر میں اس نے ایک بار اور شالیا کا شکریہ ادا کیا ۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا سا مروڑا اور کہا ۔۔۔ " آپ بہت خوبصورت ہیں ۔ آپ ایک نیک دل خاتون ہیں ۔۔۔ "

میڈ موازیل بون کورٹ رودن کی بے باکی اور بے تکلفی پر حیران ہو رہی تھی ۔ استانی بون کورٹ نے اگرچہ چالیس برس روس میں گذارے تھے ۔ مگر وہ روسی زبان کو مطلقاً نہیں سمجھتی تھی ۔ وہ تو صرف رودن کے بات کرنے کے انداز کی جی ہی جی میں تعریف کر رہی تھی ۔ وہ اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹا نہیں رہی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ ایسے شخص اخلاق کے اتنے پابند نہیں ہوتے ۔۔

وہ اٹھی اور اپنے لباس کے بل سیدھے کرنے لگی اور اس نے

نگاہوں ہی نگاہوں میں نتالیا سے اشارہ کیا کہ ان کا اب گھر کے اندر جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ناشتہ پر ولانتیف بھی آ رہا ہے۔

"لو ولانتیف تو آ بھی پہونچا ——" بوڑھی استانی نے گھر کی طرف آنے والے راستے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ولانتیف اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے دور ہی سے سر جھکا کر سب کو سلام کیا اور نتالیا کی طرف اضطراب کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ "آہ —— تم سیر کر رہی ہو —— !"

"ہاں —— ہم گھر کو لوٹنے ہی والے تھے ——" نتالیا نے جواب دیا ——۔

"تو آؤ چلیں ——" وہ سب گھر کی طرف چل دئے۔

"آپ کی بہن کیسی ہیں ؟" رودن نے ولانتیف سے پوچھا۔

"شکریہ۔ وہ اچھی ہے۔ شاید وہ آج یہاں آئے۔ میرا خیال ہے۔ کہ آپ کسی بات پر بحث کر رہے تھے ؟"

"ہاں۔ نہایت عجیب باتیں کر رہے تھے۔ اور نتالیا الیگزنڈریا نے ایک ایسی بات کہی ہے جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ——"

ولانتیف نے یہ نہ پوچھا کہ وہ بات کیا تھی اور وہ خاموش گھر کو لوٹ گئے۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے محض ایک دفعہ پھر گئی لیکن بحث نہ آیا۔ رودن بھی اس وقت اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ پینڈلے لافسکی نے بھوون کا نغمہ بجایا۔ ولانتیف فرش کی جانب نظر جھکا کر دیکھتا رہا۔ نتالیا اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھی رہی۔ بیسے نوف رودن کی طرف دیکھتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ وہ رودن ابھی کوئی دانشمندانہ بات کہے گا۔

اس بے کیفی میں تین گھنٹے گذر گئے۔ مادام لپینا دوپہر کے کھانے پر آئی۔ جونہی محفل کھانے کی میز پر سے اٹھی۔ ولانتیف نے اپنی گاڑی منگوائی اور کسی سے خدا حافظ کہے بغیر وہاں سے کھسک آیا۔

ولانتیف کا دل غم سے لبریز تھا۔ وہ ایک مدت سے نتالیا کے ساتھ محبت کر رہا تھا۔ مگر وہ شادی کی تجویز ابھی تک پیش نہیں کر سکا تھا۔ نتالیا اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتی تھی مگر اس کا دل اس کی طرف نہیں کھنچا تھا۔ ولانتیف بھی اس کے دل میں جذبات کو سلگانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس امید میں تھا کہ وہ خود بخود اس کی طرف راغب ہو جائے گی پھر کیا وجہ تھی کہ وہ مضطرب تھا۔ ؟ اس نے نتالیا میں کون سی تبدیلی دیکھی تھی۔ ؟ نتالیا اس سے پہلے کی طرح برتاؤ کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مضطرب اور بیقرار تھا۔

جب وہ گھر پہنچ کر اپنی بہن سے ملا تو اس نے پوچھا ——" آج تم اس قدر جلد کیوں لوٹ آئے ہو ؟ "

لزنف بھی اس وقت گھر میں موجود تھا۔

"میں اکتا گیا تھا ! ——" ولانتیف نے جواب دیا۔

"کیا رودن وہیں ہے۔ ؟ "

"ہاں —— "

ولانتیف نے اپنی ٹوپی زور سے ایک کونے میں پٹک دی اور بیٹھ گیا۔ اس کی بہن اس سے مخاطب ہوئی ——" بھیا ذرا میری مدد کرو۔ لزنف یہ بات مانتا ہی نہیں کہ رودن ایک ذہین اور دانشمند شخص ہے ——"

ولانتیف زیر لب کچھ بڑبڑایا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ رودن دانشمند نہیں یا ایک نہایت اچھا مقرر یا خوش بیان نہیں۔ میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ شخص مجھے پسند نہیں ہے —— ۔"

"کیا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ؟" ولانتیف نے پوچھا۔

"ہاں آج صبح ہی۔ مادام لاسنکایا کے یہاں۔ وہ تو ان دنوں مادام کا وزیر بنا ہوا ہے۔ مگر وہ دن جلد آنے والا ہے۔ جب وہ اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر پینڈے لافسکی سے جدا نہیں ہوگی۔ . . . . میں نے اسے وہاں دیکھا۔ اس لئے وہاں سے جلد کھسک آیا۔"

"تم وہاں کس لئے گئے تھے۔ ؟ "

"حد بندی کا معاملہ طے کرنے کے لئے . . . . . ."

"میرا خیال ہے کہ رودن کی برتری تمہاری ناراضگی کا باعث ہے" مادام لپینا نے کہا —— "شاید اسی بات کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس کا دل اور اس کا ذہن بھی نہایت اچھا ہے۔ ذرا اس کی آنکھوں کی طرف تو دیکھا ہوتا ——"

"اس کی آنکھوں میں پاکیزہ اخلاق کا جھلک ہے ——" کیا یہی کہنا چاہتی ہو نا ؟" لزنف نے بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بگڑ جاؤں گی —— اور رو پڑوں گی۔ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ میں مادام لاسنکایا کے یہاں کیوں نہ گئی اور تمہارے ساتھ

پاس کیوں بیٹھی رہی۔ اب مجھے زیادہ مت ستاؤ۔ اور مجھے اس کے شباب کی داستان سناؤ —"

"کس کے شباب کی۔ کیا رودن کے شباب کی؟"

"ہاں۔ تم نے ابھی تو کہا ہے کہ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ اور بہت عرصے سے جانتے ہو —"

رزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "ہاں —" اس نے بات شروع کی — "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ میں اس کے شباب کا قصہ سناؤں۔ بہت اچھا تو سنو۔ وہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین غریب جاگیردار تھے۔ اس کے والد کی جلد موت ہو گئی۔ وہ اور اس کی ماں تنہا رہ گئے۔ اس کی ماں ایک نہایت مہربان اور شفیق عورت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پرستار تھی۔ وہ اپنا پیٹ کاٹتی تھی اور جس قدر روپیہ اس کے پاس ہوتا تھا اپنے بیٹے کو دے دیتی تھی۔ اس نے ماسکو میں تعلیم پائی۔ اس کے تعلیمی اخراجات اس کے کسی چچا نے برداشت کئے اور پھر ایک امیر شہزادہ اس کی تعلیم کا خرچ دیتا رہا۔ وہ اس شہزادے کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ اچھا مجھے معاف کرنا — میرا مطلب ہے کہ وہ شہزادہ اس کا دوست بن گیا تھا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ میری ملاقات اس سے یونیورسٹی میں ہوئی ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔ ان دنوں کی اپنی زندگی کا حال میں پھر کبھی سناؤں گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد وہ غیر ملک کی سیر کو نکل گیا . . . ."

رزنف برابر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اور مادام لپنا کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"جن دنوں وہ غیر ممالک میں تھا اس نے اپنی اماں کو کبھی خط نہ لکھا۔ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے کے لئے گیا۔ اور وہ بھی دس روز کے لئے۔ بوڑھی خاتون کا اس کی عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا۔ جب اس کی ماں نے دم توڑا تو اس وقت بھی رودن کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں ان دنوں گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ میں اکثر اس کی ماں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی مہمان نواز عورت تھی — اس کے بعد غیر ممالک میں میری ملاقات رودن سے ہوئی۔ اس وقت وہ ایک خاتون کی نظروں پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خاتون نہایت بدشکل تھی۔ ویسے ہماری ہموطن تھی۔ وہ ایک مدت تک اس خاتون سے وابستہ رہا۔ بعد میں اس نے اسے چھوڑ دیا — مجھے معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ اس خاتون نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے چھوڑ دیا — "

رزنف خاموش ہو گیا۔ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو خیر رزنف تم شاید سمجھتے ہو — معلوم نہیں — تم ایک بدطینت شخص ہو بالکل … صفت کی طرح — میری سمجھ میں … اگر تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور تم نے کوئی بات اپنی طرف سے بڑھائی نہیں مگر تم نے کتنی سنگدلی کے ساتھ یہ داستان سنائی ہے۔ غریب وہ خاتون، اپنے بیٹے کے ساتھ اس کا لگاؤ، تنہائی میں اس کی موت — غیر ممالک میں رہنے والی ہماری ہموطن خاتون . . . . . . یہ سب باتیں تم نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کی ہیں . . . ."

رزنف اپنی کرسی پر سے پھر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں رنج پہنچا ہے مادام۔ میں نے کسی پر بہتان نہیں لگایا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ یہ قصہ میں نے سیاہ رنگ کے ساتھ بیان کیا ہے — مگر کون جانے رودن بدل چکا ہو۔ شاید میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا . . . ."

"دیکھا تم نے — تم مان رہے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس کے ساتھ دوبارہ دوستی پیدا کرو گے تاکہ تم اسے اچھی طرح جان سکو اور پھر اس کے بارے میں کوئی آخری رائے دے سکو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ مگر ولانتیف تم کیوں خاموش ہو؟"

ولانتیف چونک پڑا جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے —"

"آج تمہارا رنگ زرد ہے —" اس کی بہن نے کہا۔

"میرے سر میں درد ہے —" ولانتیف نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مادام لپنا اور رزنف نے ولانتیف کا نگاہوں سے تعاقب کیا۔

(۶)

دو مہینے گزر گئے۔ اس مدت کے دوران میں رودن نے مادام

لاسنکایا کے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ وہ مادام لاسنکایا کیلئے ایک ضرورت بن گیا۔ ایک روز جب اس نے مادام لاسنکایا سے یہ کہا کہ اس کا روپیہ ختم ہوچکا ہے۔ اور وہ جانا چاہتا ہے تو مادام لاسنکایا نے اسے پانچ سو روبل دے دیئے اور وہ رک گیا۔ اس نے دو سو روبل ولانتیف سے قرض لئے۔

پگاسف اب مادام لاسنکایا کے یہاں کبھی کبھی آتا۔ وہ رودن کی موجودگی میں اپنا سکہ نہ بٹھا سکتا۔ رودن نے تنہا پگاسف ہی کو کچل کے نہیں رکھ دیا تھا۔ بلکہ کچھ اور بھی روندے اور مسلے گئے تھے۔

پگاسف اب یہ کہتا — "رودن روسی زندگی سے متعلق کسی ناول کے کردار کی طرح بولتا ہے۔ اگر آپ کو چھینک بھی آتی ہے۔ تو وہ آپ پر جھپٹ پڑتا ہے۔ جب وہ آپ کی تعریف کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی اعزاز بخش رہا ہو —"

پینڈے لافسکی بھی رودن سے ہراساں تھا اور وہ اس کی خوشامد کرنے لگا تھا۔ رودن اگر اس کی کبھی تعریف کرتا پینڈے لافسکی کو یہ خنک گزرتا کہ وہ اسے بنا رہا ہے۔ ولانتیف کی بھی یہی حالت تھی وہ نتالیا کی وجہ سے رودن سے حسد کرنے لگا تھا۔

جیسے توف برابر رودن کی پرستش کرتا رہا۔ رودن اس کی طرف دھیان تک نہیں دیتا تھا بس ایک روز صبح کو رودن نے بیسے توف سے بات چیت کی تھی۔ نہایت نازک مسئلوں پر بحث چھڑی تھی۔ اس نے بیسے توف کے دل کو خوب گرمایا تھا۔ اس روز کے بعد رودن نے بیسے توف کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یزنف اب اکثر مادام لاسنکایا کے یہاں آنے لگا تھا۔ رودن اس کے ساتھ کبھی بحث نہیں کرتا تھا اور جب وہ موجود ہوتا تو رودن اکثر باہر چلا جاتا تھا۔ یزنف بھی اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا۔ اس نے مادام لپنا کو رودن کے بارے میں اپنی آخری رائے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ رودن کی تعریف کرتی تھی۔ مگر یزنف پر اعتبار بھی کرتی تھی۔

مادام لاسنکایا کے گھر کا ہر فرد رودن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا جاتا۔ ان کا پروگرام رودن وضع کیا کرتا۔ رودن اب تو مادام لاسنکایا سے اس کی جاگیر کے بندوبست سے متعلق بھی اپنی رائے دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بچوں کی پرورش کے بارے میں بھی مشورے دیتا۔ وہ بڑے غور کے ساتھ اس کی باتیں سنتی۔ وہ اس کی محض لفظی تعریف کرتی مگر عمل اپنے گماشتہ کی نصیحت پہ کرتی۔

مادام لاسنکایا کے بعد رودن دیر تک نتالیا سے باتیں کرتا۔ وہ چوری چھپے اسے کتابیں لا کر دیتا۔ اس کو اپنے ارمان اور اپنی تمنائیں بتاتا۔ مستقبل میں جو مقالے اور جو کتابیں وہ لکھنے والا تھا۔ ان کے بارے میں نتالیا سے بحث کرتا۔ اس کی بعض باتیں نتالیا کی سمجھ میں نہ آتیں۔ رودن اس بات کی پروا نہ کرتا کہ نتالیا اس کی باتیں سمجھتی نہیں تھی۔ وہ تو خوش تھا کہ نتالیا بڑے غور کے ساتھ اس کی ہر بات سنتی تھی۔

مادام لاسنکایا غلطی پر تھی۔ نتالیا بچوں کی سی باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ واقعی رودن سے مرعوب تھی۔ وہ اس کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتی جب رودن اسے کی کتاب "فاؤسٹ" پڑھ کر سناتا اور جو پیرے اس کی سمجھ میں نہ آتے اس کی تشریح کرکے بتاتا تو وہ جرمنی کی رومان پرور فضا میں پہونچ جاتی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حسین و جمیل اور پر اسرار منظر کھل جاتے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم پیدا ہو جاتا۔ اس کے دل میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ اس کے جذبات کی چنگاریاں شعلے بن جائیں

ایک دن کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے نتالیا نے اس سے پوچھا — "اب کے سردیاں تم پیٹرزبرگ میں گذار رہے ہو نا؟"

"ابھی مجھے اس کا علم نہیں —" رودن نے کتاب اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے جواب دیا — "اگر مجھے ذرائع میسر آ گئے تو میں ضرور پیٹرزبرگ جاؤں گا —"

وہ صبح سے بیکار رہا تھا۔ اس لئے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا

"مجھے یقین ہے کہ تم ذرائع حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہوگے"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے"

نتالیا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

"وہ دیکھو سیب کا درخت اپنے پھلوں کے بوجھ سے ٹوٹ چکا ہے —" رودن نے کہا۔

"ہاں اس لئے ٹوٹ گیا کہ اس کا کوئی سہارا نہ تھا —" نتالیا بولی

"آدمی کے لئے سچائی کی تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے ——"

رودن نے کہا ——

ناتالیا نے بے اختیار ہنستے ہوئے پوچھا —— "تم دیہات میں سرما کیوں بسر کرو گے۔؟"

"میں اپنی کتاب زندگی اور آرٹ میں المیہ لکھوں گا ——"

"کیا تم یہ کتاب شائع کرواؤ گے ——؟"

"نہیں ——"

"نہیں —— تو پھر یہ کتاب لکھو گے کیوں؟"

"تمہارے لئے ——"

ناتالیا نے اپنی نگاہیں جھکا لیں —— "یہ تو بہت بڑا ایثار ہوگا ——"

"اس کتاب کا نام کیا ہوگا۔؟" بیسے توف نے دور سے بات سنتے ہوئے پوچھا۔

"آرٹ اور زندگی میں المیہ ——" رودن نے جواب دیا ہاں — مونیور بیسے توف بھی میری یہ کتاب پڑھیں گے۔ ابھی اس کتاب کا بنیادی خیال میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ابھی تو میرے ذہن میں محبت کی المناک اہمیت ہی واضح ہوتی ہے ——"

محبت کے بارے میں رودن بہت کم باتیں کیا کرتا تھا۔ استانی بون کورٹ پہلے تو محبت کے لفظ پر اپنے کان کھڑے کرتی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی محبت کے موضوع پر گفتگو سے مانوس ہو گئی اور جب کبھی محبت کا لفظ اسے سنائی دیتا تو وہ اپنے ہونٹ بھینچ لیتی اور نسوار کی چٹکی ناک میں چڑھانے لگتی۔ "مجھے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کا المیہ یہی ہے کہ جس کا حاصل نہ ملے ——"

"نہیں ——" رودن بولا "یہ تو محبت کی مضحکہ خیز صورت ہے محبت تو ابتدا سے آخر تک ایک اسرار ہے۔ محبت کا پیدا ہونا۔ محبت کا پروان چڑھنا اور محبت کا غائب ہونا۔ یہ سب ایک راز ہے۔ اسرار ہے ابھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک نئے دن کی طرح مسرت انگیز ہوتی ہے۔ پھر راکھ تلے دیر تک سلگتی رہتی ہے۔ ایک شعلہ بننے کیلئے۔ اس کے بعد وہ دل میں ناگن کی طرح رینگتی ہے۔ اور دفعتاً کہیں گم ہو جاتی ہے . . . . یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ اور پھر ہمارے اس زمانے میں محبت کرتا ہی کون ہے۔ کون محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ——"

رودن دیر تک محبت کے موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔ یکا یک اس نے سوال کیا —— "کیا بات ہے ایک مدت سے مونیور دلاسیف دکھائی نہیں دیتے؟"

ناتالیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں نہیں جانتی وہ کیوں نہیں آتے ——" ناتالیا نے سرگوشی کے انداز میں کہا ——

"وہ بہت اچھے انسان ہیں" رودن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک روسی رئیس زادے کی بہترین مثال ہیں ——"

استانی بون کورٹ نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رودن نے اٹھتے ہوئے کہا —— "برگد کا پیڑ آپ نے دیکھا ہے۔ اس کے پرانے پتے اس وقت جھڑنے لگتے ہیں۔ جب نئے پتوں کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔"

"ہاں میں نے اکثر دیکھا ہے ——" ناتالیا نے آہستگی کے ساتھ کہا ——

"یہی حالت پرانی محبت کی ایک مضبوط دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ پرانی محبت دل میں سلگ رہی ہوتی ہے۔ مگر نئی محبت کے بیدار ہوتے ہی پرانی محبت دم توڑ دیتی ہے ——"

ناتالیا نے اس بات پر اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"اس بات سے اس کی مراد کیا ہے ——"

رودن دیر تک کھڑا ہوا اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔

ناتالیا اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ دیر تک رودن کے آخری الفاظ پر دماغ سوزی کرتی رہی۔ یک بیک اس نے تالی بجائی اور زار و قطار رونے لگی۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ بار بار اپنے آنسو پونچھتی لیکن پھر رو پڑتی۔ جیسے دیر سے ایک بند چشمہ پھوٹ بہا ہو ——

اس روز ماولم لیپا نے رودن کے متعلق لزنف سے بات کی پہلے تو لزنف نے رودن کے بارے میں بات کرنے سے انکار کیا لیکن

مادام لینا نے اصرار سے کام لیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم رودن کو بدستور ناپسند کرتے ہو۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اسے ناپسند کیوں کرتے ہو ۔۔۔"

"جیسی تمھاری مرضی ۔۔۔" لزنف نے متحرک نکالتے ہوئے کہا ۔۔۔ "اگر تم ناراض نہ ہو تو کہوں ۔۔۔"

"کہو بھی ۔۔۔"

"ہاں میں رودن کو ناپسند کرتا ہوں ۔ وہ ایک بہت ہی چالاک شخص ہے ۔۔۔"

"بالکل ۔۔۔"

"نہایت ہی چالاک شخص ہے لیکن کھوکھلا ہے ۔۔۔"

"خیر کھوکھلا ہونا تو کوئی برائی نہیں ۔ میں اسے یہ الزام بھی نہیں دوں گا کہ وہ ایک سنگدل شخص ہے ۔ جاہل ہے اور کافی ذہین بھی نہیں ۔۔۔"

"کافی ذہین بھی نہیں ؟" مادام لینا نے زور دے کر پوچھا۔

"ہاں کافی ذہین بھی نہیں ۔ دوسرے وہ برف کی طرح سرد ہے ۔"

"سرد اس کی روح تو بہت گرم ہے ۔"

"نہیں وہ برف کی طرح سرد ہے ۔ وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے اور خواہ مخواہ گرمجوش بننے کی کوشش کرتا ہے ۔ وہ ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے ۔ یہ کھیل اس کے لئے خطرناک نہیں ۔ کیونکہ وہ خود گرہ سے کبھی ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کرتا اور دوسرے اس کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں ۔۔۔"

"تم کس کی باتیں کر رہے ہو ؟"

"رودن کی ۔۔ وہ ایماندار بھی نہیں ہے ۔ وہ ایک نہایت اچھا مقرر ہے ۔ مگر وہ ایک بچے کی طرح اپنے الفاظ سے حظ اٹھاتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ رودن کے الفاظ محض الفاظ ہوتے ہیں ۔ اس کے الفاظ کبھی عمل میں تبدیل نہیں ہوتے ۔ مگر یہ الفاظ ایک نوخیز دل کو تباہ بھی کر سکتے ہیں ۔۔۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو ؟"

"کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں ۔ نتالیا کی ۔" مادام لینا ایک لمحہ کے لئے ششدر رہ گئی ۔۔۔ "کیا بات کرتے ہو ۔ نتالیا تو ابھی بچی ہے ۔ اگر میں تمھاری بات مان بھی لوں ۔ تو مادام لاسنکایا اس کی ماں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کی ماں بہت بڑی انانیت پرست ہے ۔ وہ تو اپنے آپ میں گم رہتی ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف ایک نگاہ ڈالے گی اور ہر بات ٹھیک ہو جائے گی ۔ وہ خود کو ایک ذہین عورت سمجھتی ہے ۔ مگر وہ ایک احمق بیوہ کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ نتالیا بچی نہیں ہے ۔ وہ سوچنے کی عادی ہے اور اکثر اس کی سوچ مجھ سے اور تم سے گہری ہوتی ہے ۔ کس قدر شرمناک بات ہے ۔ کہ ایک ایماندار، جذبات سے لبریز لڑکی کو ایک اداکار کے حوالے کر دیا جائے"

"اداکار ۔۔۔"

"ہاں اور نہیں تو کیا ۔ کیا ایک شریف شخص کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی گھرانے کے امور میں دخل دے ۔۔۔"

"تم اس وقت بہت مشتعل ہو ۔ مجھے تو یہ جان پڑتا ہے کہ تہہ میں کوئی اور بات بھی ہے ۔۔۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا ۔ کہ تم ایسا ضرور سوچو گی ۔ ایک عورت کے ساتھ عقلمندی کی بات کرو تو وہ عورت ہر بات کی تہہ میں کوئی راز ڈھونڈنے لگتی ہے ۔۔۔"

لزنف کی اس بات پر مادام لینا کو بہت غصہ آیا ۔ وہ بولی "موسیو لزنف تم تو پگاسف کی طرح عورتوں سے نفرت کرنے لگے ۔ چاہے تم کچھ بھی کہو مگر میں یہ نہیں مان سکتی کہ تم ایک شخص کو اتنی مختصر سی مدت میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہو ۔ اگر تمھاری بات سنی جائے تو رودن ایک نکلا بھگت معلوم ہوتا ہے ۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ وہ بگلا بھگت بھی نہیں ۔ بگلا بھگت کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کی جستجو میں ہے ۔ مگر یہ شخص تو اپنی ذہانت کے باوجود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے ۔۔۔"

لزنف اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ "میں چونکہ رودن کے بارے میں اپنی بے باک اور کڑی رائے کا اظہار کر رہا ۔ اس لئے تم مجھ سے ناراض ہو رہی ہو ۔ مگر مجھے حق حاصل ہے ۔ کہ میں اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کروں ۔ یہ حق حاصل کرنے کے لئے میں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے ۔ میں اسے نہایت اچھی طرح جانتا ہوں ۔ میں اس کے ساتھ دیر تک رہا ہوں ۔ اور تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ میں اپنا دنوں کی زندگی کے بارے میں

سیں پھر کبھی قصہ سناؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ قصہ مجھے اب بیان کرنا ہوگا۔ کیا تم صبر کے ساتھ یہ داستان سن سکو گی؟"

"ہاں ہاں۔ کہو۔"

"اچھا تو سنو۔" یہ لفظ کہہ کر وہ ٹہلنے لگا۔ اور بات کرتے کرتے وہ کبھی کبھی رک بھی جاتا۔ "شاید تمہیں معلوم ہو میرے والدین کا سایہ لڑکپن میں میرے سر پر سے اٹھ گیا تھا۔ میں اس وقت سترہ برس کا تھا۔ میں ماسکو میں اپنی چچی کے یہاں رہتا تھا میں ان دنوں بڑا خود پسند اور کھوکھلا لڑکا تھا۔ میں یونیورسٹی میں داخل ہوا اور اسکول کے لڑکوں کی طرح عمل کرنے لگا جس کی وجہ سے مجھے مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ مصیبت کیا تھی وہ قابل ذکر بھی نہیں۔ میں بہت جھوٹ بولتا تھا اور اس کی وجہ سے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا گیا۔ میں رات بھر روتا رہا۔ میں اس وقت اپنے ایک دوست کے کمرے میں تھا۔ اور وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب میرا مذاق اڑا رہے تھے مگر اس کو مجھ پر ترس آگیا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر وہاں سے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔

"کیا وہ رودن تھا؟"

"نہیں وہ شخص اب مر چکا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ اس کا نام پوکورسکی تھا۔ میں چند لفظوں میں اس شخص کو بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں نے اس کی بات شروع کر دی تو پھر کسی دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا وہ ایک نیک طینت فرشتہ خصلت اور بے نظیر انسان تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ وہ بعض اوقات اپنے کسی مہمان کو ایک کپ چائے بھی نہیں پلا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہزاروں آدمی اس سے ملنے آتے تھے۔ ہر شخص اس سے پیار کرتا تھا۔ وہیں رودن سے میری ملاقات ہوئی کیونکہ ان دنوں اس کے دوست شہزادہ اسے چھوڑ چکا تھا۔"

"پوکورسکی میں غیر معمولی بات کیا تھی؟" مادام سیہلنے پوچھا۔

"الفاظ اس کی فطرت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ اپنی ذہانت کے باوجود بچوں کی طرح دلکش تھا۔"

"کیا وہ بہت اچھی باتیں کرتا تھا؟"

"ہاں جب وہ موڈ میں ہوتا تھا۔ مگر میرا کسی حد تک نہیں وہ ان اوقات میں بھی اس سے بیس گنا اچھی باتیں کرتا تھا۔"

لژنف ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر سینے پر اپنے ہاتھ باندھ کر بولا: "رودن اور پوکارسکی میں کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ رودن زیادہ بھڑکیلا تھا۔ بلند بانگ الفاظ کا مالک تھا اور شاید زیادہ جوشیلا بھی تھا۔ وہ پوکورسکی سے زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پوکورسکی سے اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ رودن ایک خیال کی نہایت اچھی وضاحت کرتا تھا اور نہایت اچھی بحث کرتا تھا۔ لیکن اس کے خیالات اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتے تھے۔ دوسری طرف پوکارسکی اگرچہ سادہ، شریف اور کمزور تھا۔ مگر وہ شعر و نغموں کا دلدادہ تھا۔ تفریح کا عاشق تھا۔ اور اس میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ وہ خیالات کا بادشاہ تھا۔ رودن یوں تو بڑا گرم جوش تھا۔ لیکن برف کی طرح سرد تھا۔ ان دنوں ہمارا حلقہ نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ ہم آرٹ، علم اور زندگی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم بڑے حسین الفاظ کے گرویدہ تھے۔ ہم کائنات کے واضح کا شعور نہیں رکھتے تھے اور جاہلانہ انداز میں بحث کیا کرتے تھے اور جب ہم رودن کی باتیں سنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام باتیں پوری ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر ہمارے خیالات طبع زاد نہیں تھے تو اس کی کون پروا کرتا تھا۔ ہاں ایک بات کہ ہم جس قدر علم حاصل کر سکے وہ رودن کی بدولت ہی حاصل کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے پوکورسکی ہمارے دلوں میں عمل کی آگ روشن کر دیتا تھا۔ مگر وہ بعض اوقات بری طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ پوکورسکی کی صحت بہت خراب تھی رودن ایک خوبصورت جوان تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ وہ ہر بات میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ وہ ہر بات کی وضاحت اور تشریح کی کوشش کرتا تھا۔ میں اس وقت اس زمانے کے رودن کی بات کر رہا ہوں۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۲۵ برس کی عمر میں بھی اس کے خیالات نہیں بدلے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ادھر ادھر گھومنے سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہوتی ہے۔"

"میں اس طرح زیادہ اچھی طرح بات کر سکتا ہوں۔ میں جب پوکورسکی کے حلقے میں شامل ہو گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا نیا جنم ہوا ہے۔ میں زیادہ منکسر ہو گیا۔ ہر بات کی زیادہ کھوج کرنے لگا۔ پانچ چھ نوجوان جمع ہوتے رات بھر باتیں ہوتیں۔ صبح کا اجالا پھیلتا اور ہم اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوتے۔ کتنا اچھا زمانہ تھا۔"

لژنف خاموش ہو گیا۔ اس کا بے رنگ چہرہ اس وقت سرخ ہو رہا تھا۔

"مگر تمہارا رودن سے جھگڑا کب ہوا؟" مادام سیہلنے لژنف کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا اس سے جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا

جب مجھے پردیس میں اس بات کا پتہ چلا کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ ماسکو میں اس سے بچکانہ پن کی بو موجود تھی۔ اس نے میرے ساتھ نہایت رذیل دھوکہ کیا"

"وہ دھوکا کیا تھا ۔۔؟"

"بتاتا ہوں۔ میں ہمیشہ کسی لڑکی سے محبت کرنے کا جنون رکھتا تھا۔"

"تم ؟"

"ہاں۔ سنو تو سہی۔ میں ایک نہایت ہی پیاری لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو ؟ میں تمہیں اس سے زیادہ حیران کن بات بتا سکتا ہوں۔"

"ذرا میں بھی سنوں وہ کونسی بات ہے ۔۔؟"

"تو سنو جن دنوں میں ماسکو میں تھا تو میں اپنے باغ میں جاتی ہوئی سے پیار کرتا تھا۔ لیموں کے درخت سے۔ میں لیموں کے درخت سے لپٹ جاتا۔ اس کے تنے کو اپنے آغوش میں لے لیتا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری قدرت میرے آغوش میں ہو۔ مگر میں تو تمہیں اپنی محبت کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک لڑکی سے میری واقفیت ہو گئی۔"

"لیموں کے درخت سے محبت چھوڑ دی ؟"

"ہاں۔ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ بڑی نیک دل۔ اس کی آنکھیں بہت ہی چمکدار تھیں اور اس کی آواز چاندی کی گھنٹی کی آواز کی طرح تھی۔"

"تمہاری قدرتِ بیان پر حیرت ہوتی ہے۔ مادام سنہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔"

"تم نہایت ہی بڑی نقاد ہو۔ خیر تو وہ لڑکی اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس لڑکی سے ملاقات کے تیسرے دن میں نے اپنی محبت کا ذکر رودن سے کیا۔ کیونکہ ایک نوجوان کے لئے اپنی محبت کو چھپانا دشوار ہوتا ہے۔ جب رودن کو میری محبت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے میرے فرض سے آگاہ کیا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ اس کے الفاظ نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ رودن نے میری محبوبہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے ہی اسے اس لڑکی سے متعارف کرانے پر زور دیا ہوگا۔"

"اب میں سمجھی رودن تمہاری محبوبہ لے اڑا اور اس کے لئے تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔ کیوں میں ٹھیک کہتی ہوں نا !"

"نہیں رودن میری محبوبہ کو نہیں لے اڑا۔ اس کا یہ ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے میری مسرت کا گلا گھونٹ دیا۔ اور آج اس بات کے لئے میں اس کا شکریہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ مگر ان دنوں تو میں پاگل ہو گیا۔ رودن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ عادت تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی زندگی کا پروگرام مرتب کیا کرتا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو بتایا کہ ہمیں ایک دوسرے سے کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس نے تو ہم سے خط و کتابت بھی شروع کر دی جس نے ہم دونوں کو اکتا کر رکھ دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہم کم سے کم چند مہینے تو مزے سے گزار سکتے تھے۔ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ ایک روز رودن نے کہا کہ وہ ہمارا بہترین دوست ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ لڑکی کے باپ سے بات کرے اور وہ لڑکی کے باپ سے بات کرنے چلا گیا۔"

"کیا واقعی ؟"

"ہاں ایسا اس نے میری مرضی اور اجازت سے کیا۔ میں اس وقت بڑا پریشان تھا۔ مجھے سفید چیزیں سیاہ اور سیاہ چیزیں سفید نظر آ رہی تھیں۔ اب بھی مجھے جب اس کا خیال آتا ہے۔ تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"اور تمہیں اس لڑکی سے الگ ہونا پڑا ؟" مادام سنہا نے بڑے پیار سے اور نزاکت سے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ اور یہ جدائی بڑی الم ناک تھی۔ میں بھی رویا اور وہ لڑکی بھی روتی۔ مجھے نہیں معلوم ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا۔ بہرکیف اس جدائی کا نتیجہ اچھا نکلا۔ اس لڑکی نے ایک قابل شخص سے شادی کر لی ہے اور خوش ہے۔"

"اس پر بھی تم یہ کہتے ہو کہ رودن کو معاف نہیں کر سکتے۔"

"نہیں یہ بات نہیں جب رودن غیر ممالک کی سیر کے لئے روانہ ہوا تو میں بچوں کی طرح لپٹ کر اس سے رویا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نفرت کا بیج اس دن سے میرے دل میں بویا جا چکا تھا۔ اس کے بعد پردیس میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت عمر میں ذرا بڑا ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رودن کیا تھا۔"

"تم نے کیا دریافت کیا ؟"

"وہی ایک گھنٹہ پہلے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ خیر رودن کا قصہ اب بہت ہو لیا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں اس کے بارے میں سخت فیصلہ صادر کر رہا ہوں تو اس لئے نہیں کہ میں اسے جانتا نہیں

بلکہ اسے جلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔ میں اب اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تم ذرا اسے سمجھنے تو دو دوست"

"سمجھنے پر ـــ وہ کیوں؟"

"ذرا اس کی طرف دیکھو تو ـ کیا تمہیں کوئی بات نظر نہیں آتی؟"

"نظر کیوں نہیں آتی ـ میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان ہے۔ کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ ـــ"

"ذرا آہستہ ـــ" لڑنف نے سرگوشی کی "مجھ پر اعتماد کرو بالکل بچی ہے۔ اگرچہ وہ ایک ناتجربہ کار بچی ضرور ہے۔ میری بات یاد رکھنا ایک دن وہ لڑکی تمہیں حیرت میں ڈال دے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایسی لڑکیاں ہی ڈوب مرتی ہیں یا زہر کھا لیتی ہیں۔ تم اس کی سادگی پر نہ جاؤ۔ وہ اندر سے آگ ہے آگ۔"

"رہنے بھی دو تم تو شاعری کرنے لگے تمہیں تو جس بھی ایک آتش فشاں پہاڑی نظر آتی ہوں گی"

"اور نہیں تو کیا ـــ" لڑنف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ولاتیف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی اور لڑنف پر ایک طنزیہ سی نگاہ ڈالی۔ وہ گزشتہ دنوں میں بہت دُبلا ہو گیا تھا۔ ولاتیف کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نتالیا اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ اس کے پیروں تلے کی زمین نکل رہی ہے۔

دوسرے دن اتوار تھا اور نتالیا ذرا دیر سے جاگی۔ کل کے دن وہ بہت خاموش رہی تھی جی ہی جی میں اپنے آنسوؤں پر ندامت محسوس کر رہی تھی۔ رات کو اسے نیند نہیں آئی تھی۔ پیانو کے سامنے بیٹھ کر وہ نہایت دھیمے سروں میں اسے بجاتی رہی تھی تاکہ استانی بون کورٹ کی آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ رودن کے بارے میں کم مگر اس کے خیالات کے بارے میں زیادہ سوچتی رہی تھی۔ کبھی کبھی ولاتیف کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی وہ جانتا تھا کہ ولاتیف اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر وہ جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتی وہ ایک عجیب و غریب کھلبلی سے دوچار تھی۔

صبح کو وہ تیزی کے ساتھ اپنا لباس تبدیل کر کے باغ کی طرف نکل گئی۔ وہ دن بہت گرم تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا میں ایک تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ نتالیا ٹہلتی ہوئی تالاب کے قریب جا پہنچی۔ دفعتاً رودن اس کے سامنے آ کھڑا ہوا جیسے زمین نے اسے اگل دیا ہو۔

"تم حیران ہو گئیں۔"

"کیا تم اکیلی ہو؟"

"ہاں" نتالیا نے جواب دیا ـــ "مگر میں ذرا سی دیر کے لئے باہر آئی ہوں۔ مجھے اب لوٹ جانا چاہئے۔"

"کیا میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں؟"

یہ کہہ کر رودن اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"تم آج افسردہ دکھائی دے رہی ہو!"

"کیا واقعی؟ اور میں یہ کہنے والی تھی کہ تم آج زیادہ ملول ہو۔"

"مجھ پر اکثر غم کے دورے پڑتے ہیں۔ مگر تمہاری عمر اداس ہونے کی نہیں۔"

"کیوں؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ کہ مجھے کبھی کوئی رنج نہیں ہوتا؟"

"تمہاری عمر میں تو ہر شخص کو زندگی کا لطف اٹھانا چاہئے"

نتالیا چند قدم تک خاموش رہی۔ پھر یکایک بولی!

"ہاں کہو کیا بات ہے؟"

"کیا تمہیں وہ موازنہ یاد ہے جو تم نے کل کیا تھا ـ وہ برگد کے پیڑ کا قصہ؟"

"ہاں"

نتالیا نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا اس سے مطلب کیا تھا؟"

رودن نے سر جھکا لیا۔ اور دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "نتالیا تم نے یہ بات دیکھی ہو گی کہ میں اپنے متعلق بہت کم ذکر کرتا ہوں میں اپنے دل کے بہت سے تاروں پر انگلی نہیں رکھتا۔ کسی کو یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ میں کن مصائب میں سے گزرا ہوں۔ لیکن میں تم سے صاف صاف باتیں کر سکتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ میں نے بھی محبت کی ہے اور دکھ جھیلے ہیں۔ میرا دل بے پایاں مسرت اور بے کراں دکھ سے آشنا رہا ہے ـ" رودن ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا۔ "کل جو بات میں نے کہی تھی وہ مجھ پر صادق آتی ہے مگر میں دھوپ سے جلتے ہوئے راستے پر ایک مسرت انگیز گاؤں میں سفر کر رہا ہوں میری منزل کب آئے گی، یا آئے گی بھی کہ نہیں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے ......

"آؤ اب ہم تمہارے بارے میں باتیں کریں۔"

"دمتری نکولے وچ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں زندگی سے کوئی توقع ہی نہیں رہی؟"

"نہیں میں زندگی سے بہت توقع رکھتا ہوں۔ زندگی جو مسرت اور سرگرمی عطا کرتی ہے۔ میں اسے کبھی ترک نہیں کروں گا۔ لیکن محبت شاید میری قسمت میں نہیں ہے۔ محبت میں مبتلا ایک عورت مرد کے کل وجود کو طلب کر سکتی ہے۔ مگر میں اپنے پورے وجود کو نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ جوانی بڑی خوبصورت ہوتی ہے میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں کسی کو اپنا دیوانہ نہیں بنا سکتا۔"

"میں سمجھتی ہوں" نتالیا بولی "کہ جو شخص ایک بلند وارفع مقصد حیات رکھتا ہے وہ اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے لیکن کیا کوئی بھی عورت اس شخص کی قدر نہیں کر سکتی۔؟ مجھ پر اعتبار کرو کہ عورت نہ صرف ایثار کی قدر کرتی ہے بلکہ اس کی اہل بھی ہوتی ہے۔"

نتالیا کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ رودن سے ملنے سے پہلے اس نے کبھی اتنی زور دار بات نہیں کی تھی۔

"تم عورت کے بارے میں میری بات سن چکی ہو" رودن بولا "میرے خیال میں تو جون آف آرک ہی صرف فرانس کو بچا سکتی تھی۔ لیکن میں تو تمہارا ذکر کر رہا تھا۔ تم زندگی میں قدم رکھ چکی ہو اس لئے تمہارے مستقبل سے متعلق بات چیت زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ اگر میں ایک سوال کروں تو اس سے تم کوئی میرا مقصد تو غلط نہیں لو گی؟ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا دل آزاد ہے؟"

نتالیا حیا سے سرخ ہو گئی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ رودن رک گیا اور وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" وہ بولی — "لیکن تمہارے اس سوال کی مجھے توقع نہیں تھی۔"

"بہرکیف تمہیں اس سوال کے جواب دینے کی ضرورت نہیں — میں تمہارے دل کا بھید جانتا ہوں۔"

نتالیا نے گھبراہٹ کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ تمہارا اس سے اچھا اور کوئی انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے وہ تمہاری قدر کرے گا۔ زندگی نے اس پر کوئی خراش نہیں ڈالی۔ وہ اب بھی تابناک اور صاف ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔"

"تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟"

"جیسے تمہیں علم ہی نہ ہو۔ میری مراد والنتیف سے ہے۔ کیا میں سچ نہیں کہہ رہا؟"

نتالیا نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا — وہ بہت گھبرا گئی۔

"کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ بھلا کبھی جب وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے تو پھر اپنی نگاہیں تم پر سے نہیں اٹھاتا۔ تمہاری ہر حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔ ہر آدمی کے لئے اپنی محبت کو چھپانا بہت دشوار ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"

"دمتری نکولے وچ" — نتالیا نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بات بیچ میں کاٹ دی۔ "میرے لئے اس معاملے پر بحث کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔"

"غلطی پر ہوں — نہیں میرا یہ خیال نہیں ہے۔ ہم اگرچہ ایک دوسرے کو پرانے دوستوں کی طرح نہیں جانتے۔ پھر بھی میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں..... ورنہ جو میں تبدیلی تم میں دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تم وہ نہیں ہو جو چھ ہفتے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ نہیں نتالیا تمہارا دل آزاد نہیں ہے۔"

"شاید" نتالیا نے دبی زبان میں کہا۔ "مگر تم غلطی پر ضرور ہو"

"وہ کیسے؟"

"براہ کرم مجھے تنہا چھوڑ دیجئے اور مجھ سے سوالات نہ کیجئے۔"

وہ گھر کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی بڑھی۔ اس کے سینے میں جو جذبات یک بیک ابھر آئے تھے وہ ان سے خوفزدہ تھا۔

رودن نے اسے جا لیا۔ اور وہ اسے روک کر بولا "نتالیا یہ گفتگو یوں ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے لئے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیسے سمجھ پاؤں گا۔؟"

"مجھے تنہا چھوڑ دیجئے" — نتالیا نے بات دہرائی۔

"نتالیا خدا کے لئے جواب دو" — رودن زرد پڑ گیا تھا۔ "تم ہر بات کو سمجھتی ہو۔ اس لئے تم مجھے بھی سمجھ سکتی ہو۔ ابھی نے

اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا اور گرد و پیش پر نگاہ ڈالے بغیر گھر کی طرف چل پڑی۔

"خدا کے لئے ایک بات سنتی جاؤ......" روون نے التجا کی۔

وہ رک گئی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

روون بولا — "تم نے اپنی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے برگد کے درخت کا قصہ کیوں سنایا تھا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے یہ قصہ میرا اور تمہارا قصہ تھا۔"

"میرا قصہ تھا؟"

"ہاں تمہارا بھی۔ تم جانتی ہو میں نے ایک نئے احساس اور ایک نئے جذبے کی بات کی تھی۔ آج سے پہلے میں یہ جرأت کبھی نہ کرتا۔"

نتالیا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور گھر کی طرف بھاگ گئی۔

نتالیا گفتگو کے اس غیر متوقع عروج سے اتنی حیران ہوئی تھی کہ وہ ولاتیف کو دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گئی۔ ولاتیف ایک پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگا کر کھڑا تھا۔ وہ پندرہ منٹ پہلے مادام لاسکایا کے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے گھر کی مالکہ کو نشست گاہ میں پایا تھا۔ اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد نتالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ ایک عاشق کے سے احساس کے ساتھ وہ سیدھا باغ میں پہنچا تھا۔ اس وقت نتالیا اپنا ہاتھ روون کے ہاتھوں سے چھڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ نتالیا کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر پیڑ کی اوٹ سے باہر نکلا۔ روون نے جب اپنی نظر اٹھائی تو اس نے ولاتیف کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں نے سر جھکا کر ایک دوسرے کو سلام کیا۔ اور دونوں الگ الگ سمت چل دئے۔

"یہ ابھی انجام نہیں ہے۔" دونوں سوچ رہے تھے۔

ولاتیف باغ میں ٹہلتا رہا۔ اور جی ہی جی میں بل کھاتا رہا۔ اس کے دل پر منوں بوجھ تھا اور بعض اوقات اس کا خون کھولنے لگتا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ روون اپنے کمرے میں پہنچا وہ بھی پریشان تھا۔

کھانے کی میز پر کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ نتالیا کا رنگ بالکل زرد تھا وہ بمشکل کرسی پر بیٹھ سکتی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھا رہی تھی۔ ولاتیف بدستور اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ نتالیا سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس روز پگاسوف بھی مادام لاسکایا کے یہاں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ سب سے زیادہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو بھی کتوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسی چھوٹی دم کے کتے، لمبی دم کے کتے۔ چھوٹی دم کے کتے یا آدمی ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ مگر جن کتوں کی دم گھنی اور لمبی ہوتی ہے وہ ہمیشہ تقدیر کے دھنی ہوتے ہیں۔ اس نے کہا "میرا شمار چھوٹی دم والے کتوں میں ہوتا ہے اور پاگل بنا دینے والی بات تو یہ ہے کہ دُم میں نے خود چھوٹی کی ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں —" روون بولا — "تم وہ بات کہنا چاہتے ہو جو کہ ریچے فوکو لڈ بہت پہلے کہہ چکا ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ کرو تو دوسرے تم پر بھی بھروسہ کرنے لگیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دُم کہاں سے آئے گی؟"

"ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جس طرح وہ چاہے آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔" ولاتیف نے غضب آلود ہو کر کہا۔ "اور اگر آپ مطلق العنانی کے بارے میں میری رائے پوچھتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ان نام نہاد ہوشیار اشخاص کی مطلق العنانی سے بڑی چیز دنیا میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ خدا انہیں غارت کرے۔" سب طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر آدمی ولاتیف کے یک بیک بھڑک اٹھنے پر حیران رہ گیا تھا۔ روون نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں کی نگاہیں دیر تک متصادم نہ رہ سکیں۔ روون مسکرایا اور خاموش رہا۔

"اچھا تو تم بھی دُم کٹے کتے ہو —" پگاسوف سوچ رہا تھا۔

نتالیا کا کلیجہ اس کے منہ کو آ گیا تھا۔ مادام لاسکایا بھی ولاتیف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اس خاموشی کو توڑا اور ایک وزیر کے کتے کا ذکر لے بیٹھی۔

کھانا ختم ہوتے ہی ولاتیف نے اجازت چاہی اور جاتے جاتے وہ نتالیا سے دبی زبان میں کہہ گیا — "تم کیوں پریشان ہوتی ہو جیسے تم کوئی مجرم ہو۔ تم کبھی کسی کے سامنے مجرم نہیں ہو سکتیں"

نتالیا اس کی بات کے مطالب نہ سمجھ سکی اس نے ولاتیف کی طرف بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ کمرے کے باہر جا رہا تھا۔

چائے سے پہلے رودن اس کی میز کے قریب آیا اور انجلا کو خوشی سے بہلاتے کرتے ہوئے اس نے کہا "یہ سب باتیں ایک خواب ہیں - کیا نہیں ہیں؟ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" اور پھر اس نے نتالیا کی طرف ذرا اور جھکتے ہوئے کہا - "میں نے باغ میں آٹھ بجے تمہارا منتظر رہوں گا -"

رودن میرانِ ہیگا سف کے ہاتھوں میں تھما کر باہر چلا گیا۔

آج کی شام کا ہیرو ہیگا سف تھا - مادام لاسنکا یا اس کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھی - پہلے تو ہیگا سف نے اپنے ایک پڑوسی کی کہانی سنائی جو زن مرید تھا - اس نے بتایا کہ یہ مرد تو بھی شہوانی حرکات کرنے لگا اور ایک دن تو اس نے اپنے کوٹ کا کنارا اس طرح اوپر اٹھایا جیسے عورتیں پیٹی کوٹ اٹھاتی ہیں - پھر اس نے دیہات میں رہنے والے ایک زمیندار کا قصہ چھیڑ دیا - مادام لاسنکا یا خوب ہنس رہی تھی - ہیگا سف اپنی عورتوں پر فتوحات کا بھی ذکر کر رہا تھا وہ بتا رہا تھا کہ عورت کو عورت بنا دینا یا اسے محبت میں مبتلا کر دینا نہایت آسان ہے بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ بس روز تک لگاتار اس سے یہ کہو کہ اس کے ہونٹ بہشت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں اور دوسری تمام عورتیں کھلونے ہیں گیارہویں دن وہ خود یہ کہنے لگے گی کہ اس کے ہونٹ جنت ہیں اس کی آنکھیں مسرت ہیں - وہ تم سے عشق کرنے لگے گی - یہ باتیں اکثر ہوتی ہیں شاید ہیگا سف ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ساڑھے نو بجے رودن باغ میں پہنچ گیا آسمان پر کوئی کوئی تنہا ستارا ٹمٹما رہا تھا اور سامنے سایا گھر تاریکی میں لپٹا ہوا تھا کھڑکیوں میں نہایت مدھم روشنی تھی - رودن اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا - اس نے اپنا سانس روک رکھا تھا - آخرکار اسے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی - کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آ رہا تھا -

رودن اچھل کر نتالیا کی طرف بڑھا اور اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے - لڑکی کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے "نتالیا" رودن نے سرگوشی کے انداز میں کہا "میں کل تک انتظار نہ کر سکا میں تم سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں - اس سے پہلے مجھے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں"

نتالیا کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں کپکپا اٹھے -

"مجھے تم سے محبت ہے - معلوم نہیں اب تک میں اندھا تھا - ویسے میں تم سے ایک مدت سے محبت کر رہا ہوں اور تم نتالیا -؟"

نتالیا نے سانس لیتے ہوئے کہا - "تم دیکھ تو رہے ہو کہ میں آ گئی ہوں"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ ---" اس نے سرگوشی کی۔

رودن نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

"مجھے چھوڑ دو میں خوفزدہ ہوں --- میرا خیال ہے کہ کوئی میری باتیں سن رہا ہے"

"اس کی پرواہ نہ کرو --- تم دیکھ تو رہی نہیں کہ وہ پہرہ کو میں نے اس کی بات کا جواب تک نہیں دیا"

نتالیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے جانے دو"

"صرف ایک منٹ کے لئے ٹھہر جاؤ"

"تم مجھ سے خوفزدہ دکھائی دیتی ہو -"

"نہیں --- مجھے اب جانا چاہئے"

"ایک بات بتاتی جاؤ -"

"تم خوش ہو نا؟" نتالیا نے پوچھا -

"ہاں - میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں - کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے -"

نتالیا نے اپنی گردن اوپر اٹھائی - اس وقت وہ بہت حسین — پرجذبات اور پرشباب دکھائی دے رہی تھی —

"تو اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری ہوں"

"اے میرے خدا!" رودن کے منہ سے نکلا۔

نتالیا اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھر کی طرف بھاگ گئی - رودن وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا - اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ "میں خوش ہوں" اس نے زیر لب کہا "ہاں میں بہت خوش ہوں" جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش

کر رہا ہو۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے سینے کو جھٹکا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان کی طرف بڑھا۔

اسی اثنا میں پنشے ملانسکی بھی پیڑوں میں سے باہر نکلا اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنے آپ سے کہا "مادام ماسکایا کو تمام باتیں بتا تا ہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ بھی تاریکی میں غائب ہوگیا۔

ولاتیف جب گھر پہنچا تو وہ اس قدر اداس تھا کہ اس نے اپنی بہن کے جملے پوچھنے کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور فوراً کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور مادام سنیا نے فیصلہ کیا کہ وہ اندر سے لزنف کو بلوائے اور اس سے مشورہ کرے۔ لزنف کے یہاں سے پیغام آیا کہ وہ کل صبح آسکے گا۔

دوسرے دن صبح کو بھی لزنف آیا۔ اس اور کھویا کھویا سا تھا۔ وہ چائے پینے کے بعد کھیت پر کام کرنے کی غرض سے جانا چاہتا تھا۔ مادام سنیا کی نگاہیں اپنے بھائی کی نگاہوں سے ملیں مگر اس نے کوئی سوال کرنے سے احتراز کیا۔ اتنے میں ایک گاڑی صدر دروازے کے آگے آکر رکی۔

"خدا کا شکر ہے" وہ بولی — "ضرور لزنف آیا ہوگا" اتنے میں ایک ملازم اندر آیا اور اس نے رودن کی آمد کا اعلان کیا۔

ولاتیف نے اپنی کتاب میز پر پھینک دی اور گردن اٹھا کر پوچھا "کون؟"

"مونسیور رودن" ملازم نے جواب دیا۔

ولاتیف اچھل کر کھڑا ہوگیا — "انہیں اندر لے آؤ" — پھر وہ اپنی بہن سے مخاطب ہوا "بہن تم ہمیں ایک لمحے کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

"اس کی وجہ بعد میں بتاؤں گا"

رودن گھر کے اندر داخل ہوا۔ ولاتیف کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ تک نہ پیش کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری آمد کی توقع نہیں ہوگی۔" رودن نے اندر آتے ہی کہا اور اپنی ٹوپی میز پر پھینک دی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ بے قرار دکھائی دیتا تھا۔ اور اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بالکل نہیں" — ولاتیف نے جواب دیا — "کل رات جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد تو مجھے تمہاری طرف سے پیغام کی توقع تھی اور یہ توقع نہیں تھی کہ تم خود آؤ گے"

"سمجھا" — رودن نے بیٹھتے ہوئے کہا — "میں تمہاری صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔ میں خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں ایک شریف انسان کی طرح"

"ان صفات کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں اپنی آمد کو مقصد بتانا چاہتا ہوں۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں تکلیف کی کیا ضرورت ہے"

"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات پر دھیان دو گے"

"کچھ کہو گے بھی کہ نہیں" — اس نے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے رودن کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تم سے کچھ باتیں کہنے آیا ہوں اور فوراً ان کی ابتدا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ایک تیسرے آدمی کا سوال بھی ہے"

"وہ تیسرا آدمی کون ہے؟"

"نہیں معلوم ہے۔ سرگے ولاتیف"

"نہیں دفتری نکولے وچ میں اسے نہیں جانتا"

"تو تم جانتے ہو"

"میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ تم ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو اور اصل بات کرو"

ولاتیف کا غصہ دم بدم تیز ہوتا رہا تھا۔

رودن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا — "اچھا تو میں ہی آغاز کرتا ہوں"

"ویسے تمہیں اس کا اندازہ بھی ہے۔ مجھے نتالیا سے محبت ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے"

ولاتیف کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ خاموش رہا۔ کھڑکی کے قریب جا کر وہ رودن کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"تم تو سمجھتے ہو" رودن بولا۔ "اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں یہاں —"

"اوہ میرے خدا" ولاتیف بیچ میں بول اٹھا "مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں"

"مبارک ہو — لیکن تم مجھے یہ خبر سنانے کیوں آئے ہو؟ مجھے اس سے واسطہ — مجھے اس کی کیا پرواہ ہے — کہ تم کس سے محبت کرتے ہو۔ اور کون تم سے محبت کرتا ہے۔ اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی"

ولاتیف کھڑکی میں سے باہر گھورتا رہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی — روون اٹھ کھڑا ہو گیا — "یہ نہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے تم سے یہ راز چھپانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔ اسی لئے آیا ہوں۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نتالیا کے لئے اپنے دل میں کیا جذبہ رکھتے ہو۔ اب جب کہ تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں فریب سے کام نہیں لینا چاہیئے"

ولاتیف ابھی تک سینہ پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا جیسے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے جذبات کے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"سرگے ولاتیف" روون نے آگے چل کر کہا "میں نے تمہارے احساسات کو مجروح کیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں۔ مگر سمجھنے کی کوشش کرو"

ولاتیف ہنسا اور بولا "کیا تم صرف اپنی طرف سے بول رہے ہو۔ کیا نتالیا کو تمہاری اس آمد کا مقصد معلوم ہے؟"

روون ایک لمحے کے لئے حیرت زدہ رہ گیا "نہیں۔ میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری ہم خیال ہے"

"تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں — میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے مکار اور سازشی خیال نہ کرو — میرے خلوص پر شبہ نہ کرو۔ ہمیں دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہیئے — مجھ سے ہاتھ ملاؤ —" یہ کہہ کر روون ولاتیف کی طرف بڑھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں" ولاتیف روون کے روبرو ہوتے ہوئے اور ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "میں تمہارے ارادے سے انصاف کرنا چاہتا ہوں — تمہارے ارادے نیک ہیں عظیم ہیں۔ لیکن مجھ جیسا سادہ لوح شخص تمہارے ذہن کی پرواز کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک پرخلوص ہے وہ میرے نزدیک خودغرضی ہے۔ جو چیز تمہارے نزدیک سادہ اور واضح ہے۔ وہ میرے نزدیک الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ مجھے معاف کیجئے میں تمہیں اپنا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ اور تم سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔"

روون نے اپنی ٹوپی اٹھالی اور افسردہ لہجہ میں کہا "اچھا تو سرگے ولاتیف خدا حافظ! میں نے تم سے غلط توقع رکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے یہی سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ تم راستی پر ہو — الوداع! مگر مجھے تم پر اب بھی اعتماد ہے"

"حد ہو گئی" ولاتیف بولا "میں نے تمہارا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ اور تمہیں بھی حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر اعتماد کرو"

روون کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ ولاتیف نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

اتنے میں دروازے کے باہر سے اس کی بہن کی آواز سنائی دی۔ "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

ولاتیف نے کوئی جواب نہ دیا — لیکن نہ جانے اس نے کیا سوچ کر کہا "ایک لمحہ کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو"

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر دروازے تک آئی "لزنف آگیا ہے — کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" وہ صوفے کے قریب بازو والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

ولاتیف کہنیوں کے بل بیٹھ گیا — اور اس نے اپنے دوست کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس نے روون کے ساتھ اپنی ساری گفتگو من و عن کہہ سنائی:۔ اس نے آج تک نتالیا سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی محبت چھپی ہوئی نہیں۔

"مجھے روون سے تو بہت عجیب و غریب باتوں کی توقع تھی لیکن اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا — لیکن اس بات میں بھی وہ صاف طور پر جھکتا ہے۔

تم نے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہوتا۔ وہ یہاں کیوں آیا؟"

"سنو میرے دوست اس کی آمد کے مقصد میں ریاکاری نہیں تھی —

ایسا کرنا واقعی نیک دلی کا ثبوت ہے۔ وہ یہاں اپنی خوش بیانی کی مشق کرنے آیا تھا۔ اور وہ ایسے مواقع کی تلاش رہتا ہے۔ یہ ایک بہترین موقع تھا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی زبان [illegible] کی دشمن ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان اس کی غلام ہی ہے۔ خادم بھی ہے"

ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ بڑے یقین کے ساتھ یہاں آیا اور نہایت بیدھڑک ہو کر باتیں کرنے لگا۔ "خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ اس کی اس حرکت کے کیا معنی ہیں؟۔ کیا یہ فلسفہ ہے؟"

"ہاں ۔۔۔ ایک طرف تو یہ فلسفہ ہے اور دوسری طرف اس کی یہ حرکت بالکل الگ مقصد رکھتی ہے"

میرا تو خیال ہے کہ وہ ایک بہت بڑے جھوٹ سے کام لے رہا تھا"

"نہیں ۔۔۔ خیر چھوڑو ۔۔۔ آؤ پائپ سلگائیں اور تمہاری بہن کو آواز دیں۔ وہ ہمیں چائے پلائے گی۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔ الیگزنڈرا! اب اندر آجاؤ۔" اس نے اپنی بہن کو آواز دی۔

خادمہ نتھا اندر آئی تو اس نے اپنی بہن کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور ان پر بوسہ دیا۔

رودن گھر لوٹا تو وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ وہ اپنے آپ سے ناراض تھا۔ اپنے اوپر ملامت کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ بچگانہ حرکت کیوں کی۔ اس بات سے کہ یا وہ تکلیف دہ کوئی اور بات نہیں ہوتی۔ جب اس کا آپ کو احساس ہو کہ آپ سے حماقت سرزد ہوگئی ہے۔

رودن متأسف تھا ۔۔۔ "میں اس جاگیردار کے یہاں کیوں گیا۔ کس بات نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔"

اس اثنا میں مادام لاسنسکایا کے گھر میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے۔ گھر کی مالکن صبح سے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پینڈلیوسکی ہی کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ مادام کے سر میں درد ہے۔ رودن کو نتالیا بھی کہیں نہ دکھائی دی ۔۔۔ وہ استانی بونکورٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ جس وقت وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کی مڈبھیڑ نتالیا سے ہوئی۔ اس نے اس کی طرف افسردگی سے دیکھا۔ اور رودن کا دل ڈوب گیا۔ اس کے چہرے میں ایک نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ رودن کے دل میں غلط فہمیاں سر اٹھا رہی تھیں۔ وہ [illegible] سے ملنے چلا گیا اور بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد مادام لاسنسکایا نشست گاہ میں آئی۔ وہ رودن سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملی۔ مگر اس سے الگ تھلگ ہی۔ کبھی وہ مسکراتی اور کبھی ناک بھوں چڑھاتی۔ رودن کے ساتھ وہ سرد مہری سے پیش آرہی تھی ۔۔۔ "آخر معاملہ کیا ہے؟" رودن سوچ رہا تھا۔"

اُسے زیادہ دیر تک یہ سوچنا نہ پڑا۔ وہ جب اپنے کمرے میں آدھی رات کو لوٹ رہا تھا تو تاریک ڈیوڑھی میں کسی نے اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دے دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی اُلٹے پاؤں واپس جا رہی تھی۔ اس نے پہچان لیا یہ نتالیا کی خادمہ تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے نوکر کو باہر بھیج دیا اور نتالیا کا خط پڑھنے لگا ۔۔۔

کل صبح ساڑھے چھ بجے اودیوکن تالاب کے کنارے پہنچ جانا۔ اس وقت کے سوا ملاقات مشکل ہے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی ۔۔۔ یہ انجام ہوگا ۔۔۔ ضرور آنا۔ ہمیں جلد فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر تم نہ آئے تو ہم ایک دوسرے سے مل نہ سکیں گے۔ اور ایسی حالت میں تمہیں پھر ایک رقعہ بھجواؤں گی۔

رودن سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ رقعہ اپنے تکئے کے نیچے رکھ دیا۔ لباس تبدیل کیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ بہت دیر تک نیند نہ آئی ۔۔۔ ابھی پانچ بھی نہیں بجے تھے کہ وہ بیدار ہو گیا۔

اودیوکن تالاب جہاں نتالیا کو رودن سے ملنا تھا۔ اب تالاب نہیں رہا تھا۔ تیس سال ہوئے اس کا پانی [illegible] ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ جو ایک گڑھا رہ گیا تھا۔ بس اسی سے لوگ پہچان سکتے تھے کہ یہاں کبھی تالاب تھا۔

تالاب کے کنارے ایک جوگی دارکا گھر تھا۔ لیکن اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

اس تالاب کے بارے میں دیہاتی لوگوں میں عجیب و غریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تالاب کے کنارے صنوبر کے جو دیوقامت درخت تھے ان کے نیچے لوگوں کا خیال تھا کہ بھیانک جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے یہ مقام آسیب زدہ خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ اس تالاب کی طرف محض اشد ضروری کام کی غرض سے آتے تھے ورنہ اس سے دور رہتے تھے۔ نتالیا نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

سورج آسمان میں کافی بلند ہو چکا تھا جب رودن ورکن تالاب پر پہنچا تو یہ ایک بے کیف صبح تھی۔ آسمان میں دو دھیا رنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ رودن وہاں پہنچنے لگا۔ وہ بہت بے قرار اور مضطرب تھا۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ انجام قریب ہے۔ ادھر رودن ٹہل رہا تھا اور ادھر نتالیا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی تالاب کی طرف بڑھ رہی تھی ——— سینڈ موازیل آپ کے پاؤں بھیگ جائیں گے۔ اس کی خادمہ بار بار اسے خبردار کر رہی تھی۔

نتالیا اس کی التجاؤں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

" سینڈ موازیل کیا ہوگا۔ اگر لوگ ہمیں یہاں دیکھیں گے۔ اگر سینڈ موازیل یون کورٹ ہمارے ہو گئیں تو کیا ہوگا ——— مونیور رودن ——— ملازم کی رودن پر نگاہ پڑی ——— وہ اس طرح ہمارے سامنے کیوں کھڑے ہیں " وہ کہیں غیب کیوں نہیں گئے "

" ماشا تم یہاں ٹھہرو ——— نتالیا نے اپنی پریشان خادمہ سے کہا ——

رودن نتالیا کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے کے آثار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نتالیا کے ابروؤں پر بل تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی جھلک تھی ——

" ڈمتری نکولے وچ ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے میں صرف چند منٹوں کے لئے یہاں آئی ہوں۔ میں تمہیں بتا دوں۔ میری والدہ کو سب باتوں کا علم ہے۔ پینڈسے لافکی ہماری نگرانی کرتا رہا ہے۔ وہ اماں کا جاسوس ہے۔ اس نے کل مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا "

" اوہ میرے خدا ——" رودن کے منہ سے نکلا ——" یہ تو بہت برا ہوا ——— تمہاری اماں نے کیا کہا ——؟"

" وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے ——— اور اس نے مجھے ڈانٹ بھی نہیں پلائی ——— صرف اتنا کہا کہ میں بچوں کی طرح عمل کر رہی ہوں "

" بس ؟"

" ہاں ——— اور یہ کہا کہ اگر میں تم سے شادی کر دوں گی تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے گی "

" کیا انھوں نے یہ کہا تھا ؟"

" ہاں ——— اور میری اماں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تم مجھ سے محبت کی پینگ محض اس لئے بڑھا رہے ہو کہ تم بے کیفی محسوس کر رہے ہو اور انہیں اس بات کی تم سے توقع نہیں تھی ———"

نتالیا کا لہجہ نہایت پھیکا تھا۔

" تم نے ان سے کیا کہا نتالیا ؟"

" میں نے اس سے کیا کہا ؟" نتالیا نے اس کا سوال دہرایا اور کہا " تم اب کیا کرنا چاہتے ہو ؟"

" اوہ میرے خدا ——— کس قدر ظلم ہے۔ کیا تمہاری والدہ بہت ناراض تھیں ؟"

" ہاں ——— وہ تو تمہارا نام تک سننا نہیں چاہتیں ——"

" اوہ کس قدر ظلم ہے ——— پھر تو کوئی امید نہیں ؟"

" کوئی نہیں "

" نتالیا تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے ——— مجھے صرف یہ خوشی ہے کہ تم کس قدر پرسکون ہو "

" تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خود پریشان نہیں ہوں ؟"

" رودن نے ٹہلنا شروع کر دیا ——— تمہاری والدہ نے سوالات تو نہیں کئے —— ؟"

" ہاں ——— اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں کہ نہیں "

" تو تم نے کیا جواب دیا ؟"

نتالیا ایک لمحہ کے لئے رکی اور بولی ——— " میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکی "

" تم کتنی نیک دل اور پاک دامن ہو ——— لڑکی کا دل تھا لیں

"مونا ہوتا ہے ۔" کیا تمہاری والدہ ہماری شادی کے سخت خلاف ہیں؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ اسے یقین ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ۔"

"وہ مجھے دغا باز سمجھتی ہیں۔ میں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے؟" روون نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"دفع کرو اسے۔ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں ۔۔۔" نتالیا بولی "۔۔۔ یہ بات یاد رکھو کہ میں پھر کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ میں یہاں رونے اور شکوہ کرنے کے لئے نہیں آئی۔ میں تم سے مشورہ کرنے آئی ہوں۔"

"میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں نتالیا؟"

"کیا مشورہ دے سکتے ہو۔۔۔؟ تم مرد ہو۔۔۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ میں آخر دم تک تم پر بھروسہ کروں گی ۔۔۔" مجھے بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"میرا ارادہ ۔۔۔۔ تمہاری اماں مجھے گھر سے نکال دیں گی۔"

"ہو سکتا ہے۔ وہ کل مجھے بتا چکی کہ وہ تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔"

"مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"یہی کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" روون نے پھر اس کا سوال دہرایا۔ "ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔"

"پیچھے ہٹ جانا چاہیئے۔" نتالیا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ہونٹ سفید ہو گئے۔

"ہاں قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں ۔۔ ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اگر امیر بھی ہوتا تو کیا میں تمہاری والدہ کے غصہ کی تاب لا سکتا تھا۔ کیا میں تمہارے کہنے سے اس طرح الگ ہو سکتا تھا؟ نہیں نتالیا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنا تقدیر میں نہیں لکھا تھا۔ اور ہم نے کتنی بڑی مسرت کا خواب دیکھا تھا۔"

نتالیا اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"نتالیا، عزیز از جان نتالیا ۔۔۔ " وہ چلا یا "اس طرح کیوں روتی ہو۔ مجھے کیوں کرب و اذیت سے دوچار کرتی ہو۔ اپنے آپ کو ذرا سنبھالو۔"

نتالیا نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں چپ ہو جاؤں۔"

اس نے کہا۔ "میں اس بات کے لئے آنسو نہیں بہا رہی ہوں جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو۔ مجھے اس بات پر رنج ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ۔۔۔ میں اس وقت یہاں تم سے مشورہ لینے آئی تھی، اور تم سب سے پہلی بات مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ میں ہتھیار ڈال دوں۔ کیا تم آزادی اور اشیاء کے بارے میں تم اپنے خیالات کو یونہی عمل میں لاتے ہو۔"

یہاں پہنچ کر اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"لیکن نتالیا ۔۔۔" روون نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو کہ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"

"تم نے مجھ سے ابھی پوچھا تھا کہ میں نے اپنی والدہ کو کیا جواب دیا۔ جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں نے اگر تم سے شادی کی تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے اسے کیا جواب دیا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر کسی دوسرے شخص سے میری شادی کی گئی تو میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ میری والدہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ کہ تم میری طرف اس لئے متوجہ ہو کہ تم یہاں بے کیفی محسوس کر رہے ہو۔"

"نتالیا میں قسم کھاتا ہوں ۔۔۔" میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔"

لیکن نتالیا نے روون کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

"مگر تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟" مجھے شرم آ رہی ہے۔ خیر اب تو بات ہی ختم ہو گئی۔"

"ذرا صبر سے کام لو ۔۔۔ ہم دونوں کو مل کر سوچنا چاہیئے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"تم بہت باتیں کرتے رہے ہو۔ اگر تم نے اس وقت مجھ سے یہ کہا ہوتا کہ نتالیا میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر تم سے شادی نہیں کر سکتا ۔ لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو اور میرے ساتھ چلو تو میں نہیں یقین ہے کہ میں

کہیں تمہارے ساتھ چل پڑی تھی میں ہر بات کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ لیکن بات اور عمل میں بہت فرق ہوتا ہے "

رودن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نتالیا کے بے باک الفاظ نے اس پر بہت اثر کیا۔ نتالیا کے آخری جملے نے۔ اس کی خود پسندی پر بھر پور ضرب لگائی۔

"نتالیا اس وقت تم اپنے آپے میں نہیں ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ اس وقت تم کس قدر سنگدلی کے ساتھ مجھے رنج پہنچا رہی ہو۔ مگر وقت آئے گا جب تم میرے ساتھ انصاف کرو گی۔ اس وقت تمہاری سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ اس مسرت کو ترک کرتے ہوئے کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے "

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں نے تم پر اعتبار کیا۔ آئندہ بات کرنے سے پہلے تول لیا کرو۔ جب میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے تو اس بات کے مفہوم کو میں جانتا تھا۔ میں ہر بات کے لئے تیار تھی ویسے جو سبق تم نے مجھے دیا ہے میں اس کے لئے تمہاری شکر گزار رہوں گی الوداع!"

"ٹھہرو خدا کے لئے ٹھہرو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں میں نے تمہاری نفرت کا ہدف بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں قسم کھاتا ہوں تم ذرا میری جگہ لے کر سوچو میں تمہارے اور اپنے دونوں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں نے فوراً یہ پیشکش کی ہوتی کہ آؤ بھاگ چلیں جلد یا بدیر تمہاری والدہ نے ہمیں معاف کر دیا ہوتا لیکن اپنی مسرت کے بارے میں سوچنے سے پہلے میں نے ..... وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے ہو کہ تم ایک باعزت شخص ہو "

نتالیا بولی " مجھے اس بارے میں ذرہ بھر شک نہیں۔ لیکن کیا میں تمہاری جانب سے اس ثبوت کے لئے یہاں آئی ہوں؟

"نتالیا مجھے خیال نہیں تھا کہ "

"آہ آخر تم نے وہ بات کہہ دی نا " ہمیں یہ خیال نہیں تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا " گھبراؤ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ اور میں خود کو تم پر ٹھونسنا نہیں چاہتی " مجھے تم سے محبت ہے — رودن بولا "

نتالیا تن کر کھڑی ہو گئی — " ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ محبت کہاں ہے؟

شاید تمہیں اپنے الفاظ یاد ہوں "مکمل مساوات کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی تم مجھ سے بلند درجہ رکھتے ہو۔ میرا اور تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ میری یہی سزا تھی۔ مجھے یہ دن یاد رہے گا۔ خدا حافظ "

"نتالیا تم جا رہی ہو؟ کیا ہمیں اسی طرح ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا؟"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نتالیا رک گئی۔ رودن کی التجا نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا۔

"نہیں " وہ بولی " مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چیز میرے اندر ٹوٹ گئی ہے۔ میں یہاں آئی اور تم سے اس طرح باتیں کرتی رہی جیسے مجھے ہوش آنا چاہئے۔ جب میں یہاں آئی تو میں اپنے گھر کو اپنے تمام ماضی کو خیرباد کہہ کے آئی تھی۔ لیکن میری یہاں کس سے ملاقات ہوئی! ایک کمزور اور ناتواں دل سے — تمہیں یہ وہم کیونکر ہوا کہ میں اپنے کنبے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تم واقعی دفری رودن ہو۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو میں نے اسے بھی محسوس کر لیا ہوتا۔ مگر نہیں — اچھا خدا حافظ۔!"

وہ مڑی اور اپنی خادمہ ماشار کی طرف دوڑی۔ ماشار بڑی دیر سے اسے اشارے کر رہی تھی۔

"تم بزدل ہو نتالیا۔ میں بزدل نہیں ہوں — " رودن زور سے چلایا۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے ہوئے نتالیا کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف بڑھتی رہی۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچ کر اسے چکر سا آیا اور وہ اپنی خادمہ ماشار کے بازوؤں میں جا گری۔

رودن اس تالاب کے پاس دیر تک گھومتا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت شرمندہ اور مضطرب تھا " کیا لڑکی ہے! وہ سوچ رہا تھا " اور عمر میں اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں " نہیں میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ حیرت انگیز لڑکی ہے۔ کیا قوت ارادی رکھتی ہے " وہ ٹھیک کہتا ہے " میں اس کی محبت کا مستحق نہیں ہوں "

اور گھوڑوں کی گاڑی نے اسے چونکا دیا " گاڑی میں ازنف تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو سر کے جنبش سے سلام کیا۔ رودن جلد راستہ کاٹ کر مادام لاسنکا یا کے گھر کی طرف چل دیا۔

ازنف نے اسے گزر جانے دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے اس کی طرف

…بچی رہا اور پھر وہ ولاتیف کے مکان کی طرف چل پڑا جہاں اس نے رات بسر کی تھی۔ اس نے ولاتیف کو سویا ہوا پایا۔ اس نے ملازموں کو تنبیہ کی کہ وہ اسے سویا ہوا رہنے دیں اور پیچھے بیٹھ کر وہ بیکار رہا اور جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔

ولاتیف دس بجے بیدار ہوا۔ کمرے میں لزنف کو بیٹھا ہوا پاکر بہت حیران ہوا۔ اس نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ تم تو گھر جا چکے تھے"

"نہیں راستے میں مجھے رودون مل گیا۔ وہ کھیت میں تنہا تھا اور بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس لئے میں یہاں لوٹ آیا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم یہاں اس لئے لوٹ آئے کہ تمہیں راستے میں رودون مل گیا تھا؟"

"ہاں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں لوٹ آیا۔ شاید اسے دیکھ کر مجھے تم یاد آ گئے۔ یا شاید اس لئے کہ مجھے گھر جانے کی جلدی نہیں تھی"

ولاتیف مسکرایا "ٹھیک ہے تم ان دنوں جب بھی میرے بارے میں سوچتے ہو تو تمہیں رودون کا بھی خیال آ جاتا ہے" پھر اس نے زور سے چلا کر کہا "کوئی ہے — ذرا چائے کی لے آؤ"

دونوں دوست چائے پینے لگے۔ لزنف نے کاروباری باتیں شروع کر دیں۔

ولاتیف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں رودون کو مبارزت کی دعوت دوں گا۔ یا تو خود گولی کا نشانہ بن جاؤں گا یا اس کے فلسفے سے لبریز سر کو گولی سے چھید کر دوں گا۔"

"رہنے دو بھی۔ کیوں اتنا چلاتے ہو، میرے منہ سے تو میرا پائپ گر چلا تھا۔ یہ تمہیں یک بیک کیا ہو گیا"

"میں اب اس کا نام نہیں سن سکتا" میرا خون کھولنے لگتا ہے۔

"تمہیں شرم آنی چاہئے" کیا احمقانہ باتیں کر رہے ہو"

"نہیں اس شخص نے میری توہین کی ہے۔ میں اس فلسفی کو گولی سے اڑا دوں گا"

"اس کا فائدہ" تم اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہو کیا اس طرح

تمہارا معاملہ سلجھ جائیگا"

ولاتیف اپنی کرسی میں جا گرا "میں یہاں سے کہیں چلا جاؤں گا" میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں"

"تم کہہ رہے ہو کہ تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ گے۔ میرا بھی خیال ہے کہ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ آؤ ہم دونوں کہیں دور نکل چلیں۔ کاکیشیا چلیں یا پھر سیر کریں"

"اور اپنی بہن کو یہاں چھوڑ جاؤں؟"

"نہیں۔ مادام تنہا بھی ہمارے ساتھ چل سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی خبرگیری کیا کروں گا" وہ صرف ایک مرتبہ ہاں کر دیں پھر تو میں ہر رات کو ان کی کھڑکی کے نیچے باجا گاجا لے کر پہنچ جایا کروں گا۔ گاڑی بان کو عطر میں نہلا دوں گا۔ اور پوری سڑک پر پھول بچھوا دوں گا" میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دوست ہم دونوں کا نیا جنم ہوگا — اور جب ہم واپس آئیں گے تو ہماری توند نکلی ہوئی ہوگی"

"بس تم تو مذاق کر سکتے ہو"

"نہیں مذاق نہیں کر رہا" تمہیں واقعی ایک نہایت اچھا مذاق سوجھا ہے"

"وہ سب واہیات ہے" میں اس سے مبارزت لڑوں گا"

"پھر وہی بات"

اتنے میں ایک خادم اپنے ہاتھ میں ایک خط لئے ہوئے اندر آیا"

"یہ کس کا خط ہے؟ لزنف نے پوچھا"

"مونسیور رودون کا — مادام لاسنسکایا کا ملازم ابھی ابھی لایا ہے"

"رودون کا؟" ولاتیف نے پوچھا "کس کے نام ہے؟"

"آپ کے لئے حضور!"

"میرے لئے — لاؤ ادھر لاؤ"

ولاتیف نے جھپٹ کر وہ خط ملازم کے ہاتھ سے لے لیا اور تیزی کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور عبارت پڑھنے لگا۔ لزنف غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ولاتیف کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی —

"کیا لکھا ہے؟" لزنف نے سوال کیا۔

"خود ہی پڑھ لو —" وانتیف نے وہ خط اپنے دوست کو دے دیا۔ لزنف نے پڑھنا شروع کیا — رودن نے لکھا تھا —

پیارے وانتیف!

میں آج مادام لاسنکایا کا مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں — تمہیں حیرت ہوگی۔ خاص طور پر کل کے واقعہ کی وجہ سے میں تمہیں اپنی روانگی کی اطلاع دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ تم مجھ سے ناراض ہو اور مجھے ایک بدنام شخص خیال کرتے ہو۔ میں اپنی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو وقت کریگا۔ جو شخص بھی مجھے جانتا ہے وہ مجھے معاف کر دے گا۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ تم ایک ایماندار شخص ہو۔ ہاں تو میں جا رہا ہوں اور تمہاری مسرت کا خواہاں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے پر تم میرے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کر لو۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم پھر کبھی مل سکیں گے بھی کہ نہیں — اس کے باوجود میں ہمیشہ تمہارا دوست رہوں گا — دمتری رودن —"

نوٹ:۔ جو دو سو روبل تمہارے مجھے دینا ہیں وہ میں اپنے گاؤں پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم اس خط کا مادام لاسنکایا سے ذکر نہ کرنا۔ ایک درخواست اور بھی ہے کہ نتالیا سے کبھی اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ میں تم سے ملنے آیا تھا۔

"کیوں؟ اس خط کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے —؟"

وانتیف نے لزنف سے پوچھا جس نے خط پڑھ لیا تھا۔

"کوئی کیا کہہ سکتا ہے" لزنف نے کہا "کوئی مشرقی انداز میں ماشاءاللہ کہنے اور دانتوں میں انگلی دبانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے" "وہ جا رہا ہے اچھا ہوا" "جان بچی لاکھوں پائے" عجیب بات تو یہ ہے کہ اس نے تمہیں خط لکھنا اپنا فرض سمجھا۔ اس قسم کے حضرات جو بھی قدم اٹھاتے ہیں وہ ایک فرض ہوتا ہے۔ ان کے ذمہ کوئی نہ کوئی فرض ہوتا ہے یا کوئی نہ کوئی قرض" اس نے خط کے آخری حصہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھو تو کیا جملے لکھے ہیں —"

لزنف نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی جھلک تھی۔

وانتیف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے مادام لاسنکایا کے یہاں جانا چاہئے۔ مجھے جا کر اس خط کا مطلب [illegible] چاہئے"

"میرے دوست، صبر سے کام لو۔ اسے وقت دو کہ وہ یہاں سے جا سکے"

"وہ یہاں سے غائب ہو رہا ہے" "تم اور کیا چاہتے ہو؟ اس سے تو زیادہ اچھا ہے کہ جا کر سو رہو۔ تم ساری رات کروٹیں بدلتے رہے ہوگے۔ لیکن اب تمہارا معاملہ سلجھ رہا ہے"

"تمہیں یہ خیال کیوں پیدا ہو رہا ہے؟"

"صاف ظاہر ہے — جاؤ جا کر سو رہو۔ اور میں تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں"

"سونے کو میرا جی نہیں چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ذرا کھیتوں کا جا کر ایک چکر لگا لوں —"

"خیال تو برا نہیں"

اس کے بعد لزنف مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لزنف نے مادام سنہا کو نشست گاہ میں پایا۔ مادام سنہا نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ کل رودن کی آمد کے وقت سے پریشان تھی۔

"میرے بھائی سے ملے ہو۔ آج اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے — وہ کھیتوں کی طرف گیا ہے۔" مادام سنہا ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر اس نے اپنے رومال کے کنارے سے جھانکتے ہوئے کہا — "کیا تمہیں رودن کی آمد کا — مقصد معلوم ہے —" لزنف نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا "ہاں! وہ خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"

"خدا حافظ کہنے آیا تھا؟"

"ہاں! کیا تم نے سنا نہیں — وہ مادام لاسنکایا کے یہاں سے جا رہا ہے"

"جا رہا ہے؟"

"ہاں اور ہمیشہ کے لئے"

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے"

"یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں — میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ اس نے ساز کے تار کو ذرا زیادہ کس دیا ہوگا۔ اور وہ تار ٹوٹ گیا۔"

"تم کن معنوں میں بات کر رہے ہو — ہمیشہ مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

"مذاق کون کر رہا ہے۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ وہ جا رہا ہے۔ اس نے اپنی روانگی کی تحریری اطلاع بھیجی ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ وہ جا رہا ہے۔ مگر اس کی روانگی نے ایک بے نظیر تجویز کو تہہ و بالا کر دیا ہے جس پر میں تمہارے بھائی کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔"

"وہ کیا تجویز تھی؟"

"میں نے تمہارے بھائی کو مشورہ دیا تھا کہ یہاں سے کہیں دور تفریح کی غرض سے چلا جائے اور روزن بھی اپنے ساتھ لیجایا جائے۔ اور میں نے تمہاری دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لی تھی۔"

"خوب میں جانتی ہوں جس طرح تم میری دیکھ بھال کروگے ہوکاں ہاں دو گے۔"

"تم دراصل مجھے جانتی نہیں ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ میں پتھر کی مورت ہوں۔ لیکن تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ میں بھی موم کی طرح پگھل سکتا ہوں اور کئی دن اپنے گھٹنوں کے بل گزار سکتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر لزنف اٹھا اور مادام سنہا کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گیا — پھر آہستگی سے بولا — "مجھے جاننا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔"

"کیا کہا —؟"

"وہی جو میں ایک مدت سے کہنا چاہتا تھا — اور میں کہہ چکا ہوں۔"

"میں اس وقت تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تاکہ تم سوچ سکو میں تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ اور اگر تمہیں میری پیشکش منظور ہو تو مجھے بلوا بھیجنا۔"

مادام سنہا نے لزنف کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ تیزی سے مڑ کر جا چکا تھا۔ جب وہ باغ میں سے گزر رہا تھا۔ تو اس کے سر پر ٹوپی بھی نہیں تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ نے آواز دی — "مونیور لزنف مالکن تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

لزنف تیزی کے ساتھ مڑا۔ اس نے خادمہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور حیران و ششدر خادمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور پھر وہ مادام سنہا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لزنف سے مڈبھیڑ کے بعد روزن گھر لوٹا تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور اس نے دو خط لکھے ایک تو والنتیف (جس سے آپ واقف ہیں) اور دوسرا نتالیا کے نام۔ دوسرے خط کو تحریر کرتے ہوئے اس نے زیادہ وقت لیا۔ اس خط میں اسے بہت کچھ کاٹنا پڑا۔ اور بہت کچھ دوبارہ لکھنا پڑا۔ اس خط کو پھر سے از سر نو صاف کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا — انتہائی افسردگی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پھر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اپنی ہتھیلیوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پھر وہ اٹھا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن لگائے اور نوکر کو آواز دی۔ نوکر کمرے میں آیا تو اس نے اس سے کہا کہ وہ مادام لاسنکایا کے پاس جائے اور جا کر پوچھے کہ وہ کب اس سے مل سکتی ہیں۔

نوکر جلد ہی واپس آگیا اور اس نے اطلاع دی کہ مادام اس کی منتظر ہیں۔

مادام لاسنکایا روزن سے اپنے ڈرائنگ روم میں ملی۔ اس وقت مادام لاسنکایا تنہا نہیں تھی۔ پینڈے لافکی اس کی بغل میں بیٹھا تھا۔

مادام لاسنکایا نے روزن کا بڑی شائستگی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ روزن بھی سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ مگر اس کے چہرے کی طرف ایک ہی نگاہ کسی بھی طالب علم کو یہ بتا سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناخوشگوار واقعہ گزر چکا ہے۔ روزن جانتا تھا کہ مادام لاسنکایا ناراض ہے۔

پینڈے لافکی نے جو راز مادام لاسنکایا کو بتایا تھا اس سے مادام کے اندر ایک عظیم خاتون بیدار ہو گئی تھی۔ اسے اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ روزن جیسا مفلس بے بضاعت اور گمنام شخص اس کی بیٹی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ دارایا میخیلوفنا لاسنکایا کی بیٹی پر۔

"ٹھیک ہے کہ وہ ایک ذہین اور ہوشیار شخص ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا رہا تھا "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ایک ذہین مگر مفلس شخص میرا داماد بن جائے"

"مجھے تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ آدمی اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو بھول جاتا ہے۔" پینڈرے لافکی نے مادام کے غصہ کو ہوا دی تھی۔

برہمی کے عالم میں مادام نٹالیا پر جھوٹ بولی تھی۔

مادام لاسنکایا نے رودن کو بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ سابقہ رودن سے نہیں جو گھر کا مالک بن گیا تھا جو ایک پرانا دوست تھا۔ بلکہ ایک نئے رودن سے اب جس کی حیثیت ایک اجنبی مہمان سے زیادہ نہیں تھی۔

"مادام میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں" رودن نے گفتگو کا آغاز کیا "میں آپ کا مہمان نوازی کے لئے شکرگزار ہوں۔ میرے گاؤں سے میرے نام خط آیا ہے اور میں آج جا رہا ہوں"

مادام لاسنکایا نے لاپروائی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اپنے جی میں کہا "وہ پہل کر چکا ہے۔ چلو اچھا ہوا ہے نہیں تو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوتا"

"کیا واقعی جا رہے ہو؟" اس نے بلند آواز میں کہا "خیر اگر تمہیں ضرور جانا ہے تو پھر میں تمہیں کیونکر روک سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سردیوں میں تم سے ماسکو میں ملاقات ہوگی۔"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا مادام۔ شاید میں ماسکو نہ جا سکوں۔ ہاں اگر مجھے ذرائع میسر آئے تو پھر میں ماسکو میں شرف ملاقات ضرور حاصل کروں گا۔"

پینڈرے لافکی جی ہی جی میں سوچ رہا تھا "میرے دوست کل یہاں تمہارا راج تھا۔ اور آج تم کس انداز میں بات کر رہے ہو" "کیا تمہارے گاؤں سے کوئی بری خبر آئی ہے؟"

"ہاں"

"شاید فصل اچھی نہیں ہوئی؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ بہرحال میں تمہارا ممنون ہوں۔ یہاں میرا بہت اچھا وقت گزرا"

"میں بھی اپنی اس ملاقات کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ کب جا رہے ہو؟"

"آج دوپہر کو کھانے کے بعد"

"اس قدر جلد ... خیر میری خواہش ہے کہ تمہارا سفر اچھی طرح کٹے اور اگر تمہارے گھریلو امور تمہیں جلد فارغ کر دیں تو تم ہمیں یہیں پاؤ گے"

"میں شاید نہ آ سکوں" رودن نے اٹھتے ہوئے کہا "ہاں میں آپ کا اس وقت قرض ادا نہیں کر سکتا ... مگر گھر پہنچتے ہی ..."

"چھوڑو بھی دفری تم کیسی باتیں کر رہے ہو ... کیا وقت ہو گیا؟" پینڈرے لافکی نے اپنی سونے کی گھڑی واسکٹ کی جیب سے نکال کر جواب دیا "دو بجکر ۴۳ منٹ ہو چکے ہیں"

"اچھا تو میں ذرا اپنا لباس تبدیل کر دوں۔ خدا حافظ دفری"

رودن کمرے سے باہر گیا۔ مادام لاسنکایا اور اس کے درمیان تمام بات چیت ایک خاص نوعیت کی تھی۔ اداکار اسطرح اپنے پارٹ کی مشق کرتے ہیں۔ یا پھر سیاست دان کانفرنس میں پہلے ہی سے تیار کئے گئے جملوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔

رودن اپنے تجربے سے یہ بات جانتا تھا کہ اونچی سوسائٹی کے لوگ نہ صرف ایک شخص کو اپنے حلقے سے بڑی آسانی کے ساتھ نکال باہر کرتے ہیں۔ بلکہ جب ضرورت ہوتی ہے تو اسے اپنے دستانے کی طرح ناچ کے بعد گرا دیتے ہیں جیسے وہ دستانہ لاٹری کا ٹکٹ ہو۔ جس کا انعام نہ نکلا ہو۔

رودن نے اپنا سامان عجلت کی ساتھ باندھا اور اپنی روانگی کے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ گھر میں ہر شخص اس کی یک بیک روانگی پر حیران تھا۔ ملازم بھی اس کی طرف پریشانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ بیس توف تو خاص طور پر اداس تھا۔ نٹالیا سے قطعی طور پر نظرانداز کر رہی تھی۔ تاہم رودن اس کے ہاتھ میں اپنا خط دینے میں کامیاب ہو گیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت مادام لاسنکایا نے ایک دفعہ پھر اپنی یہ بات دہرائی کہ ماسکو جانے سے پہلے شاید اس سے پھر ملاقات ہوگی مگر رودن نے کوئی جواب نہ دیا۔ پینڈرے لافکی نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ رودن کا جی چاہا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کے گلابی اور صحت مند چہرے کو نوچ ڈالے مادموازیل بونکورٹ کنکھیوں سے رودن کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "اب تمہارے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جا رہا ہے"

آخر وہ چلے گئے۔ اور روڈن کے لیے گاڑی گھر کے احاطے میں آ گئی۔ روڈن نے سب کے ساتھ سب سے رخصت طلب کی۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا اور وہ ملول تھا۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اسکو اس انداز میں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گھر سے نکالا جا رہا ہو۔ کیا اچھی صورت حال ہے۔ میں نے اب کیوں کیا؟ خیر جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے نتالیا کی طرف آخری نگاہ ڈالی۔ اور اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کی نگاہوں میں اسی کی جھلک اس کے لئے سرزنش سے کم نہیں تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں پر سے اترا اور گاڑی کی طرف دوڑا۔ بیس توف اسے رخصت کرنے کے لئے آگے بڑھا اور کود کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی جب احاطے سے گزری اور صنوبر کے پیڑوں والی سڑک پر آگئی تو روڈن بولا "تمہیں یاد ہوگا جب ڈان کوکزاٹ جس کے بارے باہر نکلا تھا تو اس نے دریافت کیا تھا کہ آزادی ایک بے تعبیر تحفہ ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ وہ شخص بہت خوش ہے جسے خدا روٹی کا ایک نوالہ دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سوا کسی اور کا ممنون نہیں۔ جو بات ڈان کوکسزاٹ نے اس وقت محسوس کی تھی، میں اب محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کرے پیارے بیس توف کہ تمہیں بھی اس تجربے سے ایک دن گزرنا پڑے۔"

بیس توف بہت متاثر ہوا۔ اس نے روڈن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس وقت بیس توف کا دل اس کے سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ راستے بھر روڈن انسان کے وقار کی اور سچی آزادی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بڑی ایمانداری اور تقدس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اور جب رخصت کے وقت آیا تو بیس توف نے روڈن کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور سرد آہیں بھرنے لگا۔ روڈن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ بیس توف سے جدا ہونے کی خاطر آنسو نہیں بہا رہا تھا۔ یہ اس کی خود نمائی کے آنسو تھے۔

نتالیا اپنے کمرے میں آکر روڈن کا خط پڑھنے لگی۔

"پیاری نتالیا!" اس نے لکھا تھا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میرے لئے اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ مجھ سے یہ کہا جاتا کہ یہاں سے چلے جاؤ میں جا رہا ہوں۔ میری روانگی کے بعد حالات معمول پر آجائیں گے۔ اور کوئی مجھے یاد بھی نہیں کرے گا۔ اور کوئی مجھے کیوں یاد کرے؟ یہ ایک حقیقت ہے پھر بھی میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں؟ میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں اور میرے لئے یہ بات بڑی اندوہناک ہوگی۔ اگر تم میرے بارے میں کوئی برا خیال رکھو گی۔ اسی لئے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں اس وقت اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، اور کسی دوسرے پر کوئی الزام بھی لگانا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف تمہاری جانب اپنے رویّے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ چند دنوں کے واقعات غیر متوقع طور پر اچانک ظہور میں آئے تھے۔

تم سے ہماری ملاقات میرے لئے ایک ناقابل فراموش سبق ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے ناآشنا تھا۔ اپنی زندگی کے دوران ہر قسم کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے۔ بہت سی عورتیں اور لڑکیاں میری دوست رہی ہیں۔ لیکن تم تنہا۔ تم ایک پاکیزہ اور ایماندار لڑکی ہو۔ لہٰذا مجھے حیرت ہوئی اور میں انصاف نہ کر سکا۔ میں پہلی ملاقات ہی سے کھنچ گیا تھا اور تمہیں بھی اس کا علم ہے۔ جو گھنٹے تمہارے پاس بیٹھا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہ پہچان سکا۔ اور میں ایمانداری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی کوشش بھی نہیں کی — اس پر بھی میں یہ خیال کر رہا تھا کہ میں تمہاری محبت میں مبتلا ہوں — اس گناہ کی مجھے یہ سزا ملی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی ایک عورت سے محبت کی اور اسے بھی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن اس کی سمت میرے احساسات بڑے پیچیدہ تھے اور وہ بھی میری جانب سے پیچیدہ احساسات رکھتی تھی۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی فطرت سادہ نہیں تھی۔ مگر اس وقت مجھ پر حقیقت کا انکشاف نہ ہوا۔ لیکن جب اس سے میں دوچار ہوا تو وقت گزر چکا تھا۔ کوئی ماضی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری زندگی متحد ہو جاتی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ میں یہ کیسے ثابت کروں کہ میں نے تم سے شاید ہی محبت کی ہوتی

وہ محبت جو دل سے کی جاتی ہے خیالات سے نہیں۔ لیکن شا میں اس قسم کی محبت کے قابل نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ قدرت نے مجھ کو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اور اس وقت میں انکسار و عجز سے کام نہیں لینا چاہتا۔ خاص طور پر ایسے لمحوں میں جب میں انتہائی ندامت محسوس کر رہا ہوں ــــ ہاں قدرت نے مجھکو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں کوئی مفید کام کئے بغیر مر جاؤں گا۔

نہ جانے مجھ میں کیا کمی ہے ــ شاید مجھ میں اس بات کی کمی ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ کسی عورت کے دل پر فتح نہیں پا سکتا۔ میری قسمت عجیب و غریب ہے۔ میں بڑے شوق کے ساتھ جان و دل کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا چاہتا ہوں مگر ایسا کرنے کی اپنے میں قدرت نہیں پاتا۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی ایسی احمقانہ بات کے لئے خود کو قربان کر دوں گا جس پر میں یقین نہیں رکھتا ہوں گا۔ او میرے خدا! پینتیس برس کی میری عمر ہو چکی ہے اور میں ابھی تک کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ باندھ رہا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کے سامنے اپنا دل یوں کھول کر نہیں رکھا یہ میرا اعتراف ہے۔

خیر میں اپنے بارے میں بہت سی باتیں کہہ چکا ہوں۔ اب مجھے تمہارے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے سوال کا اور بات کا اہل نہیں ہوں۔

تم ابھی جوان ہو اور تم چاہے کتنی دیر زندہ کیوں نہ رہو۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ہمیشہ اپنے دل کی رہنمائی قبول کرنا اپنے یا کسی دوسرے کے خیالوں سے بہک نہ جانا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ ایک شخص کی زندگی کا حلقہ جس قدر تنگ اور سادہ ہوتا ہے اس قدر وہ اچھا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے نئے امکانات تلاش نہ کئے جائیں۔ بلکہ زندگی کو تمہارے مراحل سے گزرنے دیا جائے۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو اب اپنی جوانی میں جوان رہتا ہے ــ لیکن مجھے ایسا ہو رہا ہے کہ یہ مشورہ خود میرے اپنے لئے ہے اور تمہارے لئے نہیں۔

بات تو یہ ہے نٹالیا میں اس وقت نہایت ہی بری صورت حال میں مبتلا ہوں۔ میں نے تمہاری والدہ میں جو احساسات بیدار کئے تھے ان کی نوعیت سے متعلق میں نے خود کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ایک عارضی پناہ گاہ میسر آگئی ہے ــ لیکن مجھے ایک مرتبہ پھر بے خانماں ایک جگہ سے دوسری جگہ آوارہ رہنا ہوگا۔ تمہارے ساتھ گفتگو تمہاری موجودگی اور تمہاری دانشمندانہ اور ایماندارانہ نگاہ ان کا بدل مجھے نہیں ملے گا۔ میں ہی مورد الزام ہوں۔ تم بھی اس بات کو تسلیم کرو گی کہ قدرت نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ مگر میں تمہیں وہ باتیں کیوں یاد دلاؤں جو تم پہلے ہی کہہ چکی ہو ــــ آج میں بڑی عجلت کے ساتھ روانہ ہو رہا ہوں۔ اور اپنے دل پر جبر کر کے یہ وضاحت پیش کر رہا ہوں۔ مستقبل کی کوئی امید نہیں .... اور میں نے جو اظہار رنج و کرم کیا ہے اس کو تم پوری طرح نہیں جانتیں۔ بعض اوقات میں اس قدر باتیں کرتا ہوں۔ خیر۔ اب چھوڑو میں تو جا رہا ہوں۔

یہاں رودن نے نٹالیا کو آگاہ کیا تھا کہ وہ والنتیف سے ملنے گیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے پورا پیرا کاٹ دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ لکھا تھا۔

میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور خود کو ان باتوں کے لئے وقف کرتا ہوں جن کے میں قابل نہیں۔ تم نے صحیح یہ طنز کیا تھی۔ کاش میں ان باتوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکوں۔ اور اپنی سستی اور کاہلی کو تیاگ سکوں۔ لیکن نہیں میں ہمیشہ ایک کمزور دل شخص رہوں گا۔ میرے راستے میں ایک ہی رکاوٹ پیدا ہوگی اور میری ہمت جواب دے جائے گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ گزرا ہے وہ اس کا ثبوت ہے۔ میں اس ذمہ داری سے ڈر گیا جو میرے کندھوں پر آپڑی تھی اور اس لئے میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری خاطر اپنے حلقہ کو چھوڑ دو ــ شاید یہ ایک اچھی بات ہوئی ہے شاید میں اس آزمائش سے پاکیزگی کے ساتھ اور ایک مضبوط آدمی بن کر ابھروں گا۔

میں تمہاری بھرپور مسرت کا خواہاں ہوں۔ الوداع مجھے کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا ــــ مجھے امید ہے کہ میں تمہیں پھر خط لکھوں گا۔

(رودن)

نٹالیا کے جس ہاتھ میں رودن کا خط تھا وہ اس کی گود میں جا گرا اور وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ اس خط نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا

…اس محبت نہیں تھی مگر وہ ایک تنہا ہستی ہو دی گئی تھی
…بیٹھ رہا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ تاریک موجوں نے
…لیا تھا اور وہ ڈوب رہی تھی سب صاف اور شل ہو کر
…دیا وہم کو بہا اور اذہیتہ تکلیف دہ ہوتا ہے مگر
…تسکین کے سلئے جو خود فریبی میں تسکین نہیں ڈھونڈتا یہ
…داشت ہو جاتا ہے —

…ثالیا کو اپنا بچپن یاد آیا۔ کس طرح شام کو سیر کے وقت
…کی روشنی کی طرف آگے بڑھتی رہی تھی۔ جب غروب
…آفتاب شعلہ ریز تھا۔ وہ تاریکی کی طرف کبھی قدم
…اٹھی تھی۔ اب زندگی اس کے سامنے تاریک تھی اور روشنی
…وہ منھ موڑ کر کھڑی تھی —

…ثالیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو ہمیشہ تسکین کا باعث
…کرتے۔ آنسو تو محض اس وقت مرہم ثابت ہوتے ہیں
…جب آنکھوں میں رُکے پڑے ہوں۔ مگر آنسو سرد بھی ہونے
…وسے کے انبار میں نکلتے ہیں اور وہ آنکھوں سے دل پر
…بوجھ کی وجہ سے ایک ایک بوند کی صورت میں ٹپکتے ہیں
…کوئی تسکین نہیں ہوتی۔ دل کو آرام نہیں آتا۔ شاید یہی
…ن لیے آنسو بہاتا ہے اور اس شخص کو ہم صحیح معنوں میں
…نہیں کہہ سکتے جو یہ آنسو بہا نہیں پاتا۔ ثالیا اس روز
…دونوں سے واقف ہوئی —

…دو گھنٹے گزر گئے اپنے کو سنبھالتے ہوئے ثالیا اٹھی جس نے
…دیو کے اور موم بتی جلائی۔ روڈن کے خط جلا دیا اور راکھ
…سے باہر پھینک دی۔ اس کے بعد اس نے ٹیگور کا مجموعہ کلام
…اور بے سوچے سمجھے اس کا ایک ورق اُلٹا (وہ اپنی تقدیر کا
…جاننے کے لئے اکثر ٹیگور کی مدد لیا کرتی تھی) اس کی نگاہ
…سطروں پر پڑی —

جس کسی نے بھی جنوں خیز محبت کی ہے
بیتے ایام کے عفریت ستاتے ہیں اُسے
کوئی بھی شے ہو مسرت نہیں ملتی اس کو
اس کی یادیں اسے سانپوں کی طرح ڈستے ہیں
حیات جاتا ہے تأسف دل محزوں اس کا

ثالیا ایک لمحہ تک کھڑی رہی پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی اور وہ مسکرائی اس نے اپنے سر کو جنبش دی اور نیچے نشست گاہ میں چلی گئی۔

اسے دیکھتے ہی مادام لاسنکا یا اس کو اپنے دارالمطالعہ میں لے گئی۔ اس نے ثالیا کو اپنے قریب بٹھا لیا اور بڑی شفقت کے ساتھ اپنی بیٹی کی طرف دیکھتی رہی۔ مادام لاسنکا یا دل ہی دل میں پریشان تھی۔ اسے ابھی ابھی یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو نہیں جانتی تھی۔

جب پہلے ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بیٹی اور دن سے چوری چھپے ملتی ہے تو اسے صدمہ کی بجائے حیرت ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی بھلا اس طرح کیونکر عمل کر سکتی ہے۔ جب اس نے اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلا کر اُسے ڈانٹ پلانی شروع کی تھی تو ثالیا کے توی جواب نے اسے پریشان کر دیا تھا اور وہ ڈر گئی تھی۔

روڈن کی اچانک روانگی نے اس کے دل پر سے بھاری بوجھ اُٹھا دیا تھا مگر اس وقت وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی آنسو بہائے گی اور کہرام بپا کر دے گی ——— ثالیا کے ظاہری سکون اسے بے حد مضطرب بنا رہا تھا۔

"بیٹی آج تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

ثالیا نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا

"تمہارا عاشق تو جا چکا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیوں اس قدر جلد یہاں سے چلا گیا۔"

"اماں ——" ثالیا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر تم اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہو گی تو میں بھی اس کے بارے میں خاموش رہوں گی"

"اچھا تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو نا"

ثالیا نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنا جملہ دہرایا —— "میں اس کے بارے میں خاموش رہوں گی"

"میں تمہارے اس وعدہ پر یقین کرتی ہوں ——" اس کی اماں نے مسکراتے ہوئے کہا —— "مجھے تم پر اعتبار ہے۔ لیکن کل تم نے —— تمہیں تو یاد ہی ہوگا —— خیر اب میں کچھ نہ کہوں گی —— بات ختم ہو چکی ہے۔ کون گڑے مُردے اکھاڑے۔ تم اب مجھے پہلے کی طرح

دکھائی دے رہی ہو ۔ ویسے تم نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا — لاؤ مجھے بوسہ دو بیٹی —

نتالیا نے اپنی امّاں کا ہاتھ اٹھا کر اس پر بوسہ دیا اور مادام لاسنکایا نے اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر پر بوسہ دیا ۔

ہمیشہ میرے مشورے پر عمل کیا کرو ۔ تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ تم لاسنکایا ہو اور میری بیٹی ہو — میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم خوش رہوگی — اچھا اب جا سکتی ہو —

چپکے سے نتالیا وہاں سے چلی آئی ۔ معمر عورت نے نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا ، اور وہ سوچنے لگی — اس کی ہر بات میں مجھ سے کتنی ملتی جلتی ہے ۔ کس قدر آسانی کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے — اس کے بعد مادام لاسنکایا بیتے ہوئے ایّام کی یادوں میں کھو گئی ۔

مادام لاسنکایا نے میڈموازیل لون کورٹ کو بلوا بھیجا اور وہ دونوں دیر تک بند کمرے میں باتیں کرتی رہیں ۔ لون کورٹ کے جانے کے بعد اس نے پینڈسے لافکی کو بلوایا ۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ روس کی روانگی کا سبب جان کر رہے گی ۔

پینڈسے لافکی نے اُسے مطمئن کر دیا ۔ وہ اس بات میں بڑی مہارت رکھتا تھا —

دوسرے دن والنٹیف اور اس کی بہن نے مادام لاسنکایا کے یہاں کھانا کھایا ۔ مادام لاسنکایا پہلے سے کہیں زیادہ ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئی ۔ نتالیا کی اس وقت بُری حالت تھی ۔ مگر والنٹیف بڑی شائستگی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وہ کچھ اس قدر گھبرا کر باتیں کر رہا تھا کہ نتالیا خود کو اس کا ممنون سمجھ رہی تھی ۔

دن بڑی تیزی مگر بے کیفی کے ساتھ گزر گیا اور جب محفل برہم ہوتی تو ان سب نے اس طرح محسوس کیا جیسے وہی پُرانے دن لوٹ آئے ہوں ۔

ہاں پُرانے دن لوٹ آئے تھے ۔ مگر نتالیا یہ محسوس نہیں کر رہی تھی ۔

آخر کار وہ اپنے پلنگ پر جا گری ۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور غم زدہ تھی ۔ اسے زندگی انتہائی تلخ نظر آ رہی تھی ۔ اُسے اپنے وجود پر اپنی محبت پر اور اپنے غم و آلام پر ندامت ہو رہی تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ اُسے اس وقت موت آ جائے — وہ بہت دنوں تک اُداس رہی ۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر کاٹ دیں ۔ لیکن ابھی جوان تھی اس کی زندگی کا ابھی آغاز ہی تھا ۔ کسی کا غم چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو اسے کھانا تو کھانا ہی پڑتا ہے ۔

نتالیا نے بہت دکھ اُٹھائے ۔ یہ دکھ سہتے پہلی مرتبہ اُٹھائے تھے مگر پہلے دکھ پہلی محبت کی طرح اپنے آپ کو دہراتے نہیں ہیں ، اور یہی خوش نصیبی کی بات ہے —

دو سال گزر چکے تھے ، مئی کے مہینے کا آغاز تھا ۔ مادام اب مادام لزنف بن چکی تھی اور وہ اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھی تھی ۔ اس کی شادی ہوئے ایک سال سے زیادہ مدت ہو چکی تھی ۔ وہ پہلے کی طرح حسین جمیل تھی ۔ اس کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا ۔ برآمدہ کے سامنے باغ میں ایک آیا گلاب جیسے چہرے والے بچے کو کھلا رہی تھی ۔ اس بچے کی ماں اس کی طرف دیکھ رہی تھی بچہ رو نہیں رہا تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بچہ اپنے قابل باپ لزنف کی طرح ذہین ثابت ہوگا ۔

بیگاسف اس وقت مادام لزنف کے قریب برآمدہ میں بیٹھا تھا ۔ اب اس کے بال سفید ہو گئے تھے ۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ دبلا پتلا دکھائی دے رہا تھا ۔ وہ جب بولتا تھا تو سیٹی سی بجتی تھی ۔ کیوں کہ اس کے تمام اگلے دانت جھڑ گئے تھے ۔ وقت کے گزرنے پر اس کا ذہن کند ہو گیا تھا ۔ اب وہ اپنی باتیں دہرانے لگا تھا لزنف گھر پر نہیں تھا ۔ توقع کیا رہی تھی کہ وہ چائے کے وقت آ جائے گا ۔

سورج غروب ہو چکا تھا ۔ افق پر زرد رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ فلک پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے تھے ۔

یک بیک بیگاسف نے ہنسنا شروع کیا ۔

”کیوں کیا ہوا ؟ مادام لزنف نے پوچھا ۔

کچھ نہیں کل میں نے ۔ ایک کسان کو اپنی چرب زبان بیوی سے یہ کہتے سنا — ” لڑنا چھوڑو — مجھے یہ بات بہت پسند آئی

تو یہ بھلا عورت سے کیا بات کر سکتا ہے۔ معاف کرنا۔ میں
بات نہیں کر رہا۔ ہمارے پیش رو ہمارے آباؤ اجداد
بھی آدمی تھے۔ ان کے پہلوؤں کے فقروں میں عورت کا ذکر کہیں بھی
نہیں ہے اور ایک لفظ ہے جو نہیں لگاتی ہے، اور ہوتا بھی
ہے۔ تم خود ہی فیصلہ کر دو کہ ہمارے اس علاقے کے مارشل
کی بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ وہ میرے اس رجحان کو پسند نہیں کرتی
۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نہایت قریب سے گولی
دی ہو — رجحان کی بھی ایک ہی کہی — کیا ہی اچھا ہو۔ اگر
ت اُسے زبان سے محروم کر دے؟"

تم ابھی تک اپنی پرانی ڈگر پر قائم ہو اور ہم غریب عورتوں
لامت کا نشانہ بنائے رہتے ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں
تمہاری سب سے بڑی بدقسمتی ہے — مجھے تم پر ترس آ جاتا ہے۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟ — دنیا میں صرف تین قسم کی
بیبیاں ہیں۔ سردیوں میں ایک سرد کمرے میں بیٹھ رہنا — گرمیوں
تنگ جوتے پہننا — اور روتے ہوئے بچے کے کمرے میں سونا
— کیا یہی تو اب میرے بھی اخلاقی اصول ہیں"

کیا اخلاقی اصول ہیں؟ ابھی کل ہی کی بات ہے مارشل
بیوی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی تھی"

— سچ؟ ذرا میں بھی تو سنوں اس نے میرے بارے
تم سے کیا کہا؟"

اس نے یہی کہا کہ تم صبح سے شام تک اس کے سوالوں
جواب —"

کیا کہا — کہا کہ [illegible] ہے اور وہ بھی چیختی
ہوئی آواز میں"

لیگانیف زور سے ہنسا۔ "میں نے بہت اچھا کیا"

"کیا عورت کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا اچھی
بات ہے؟"

"کیا تم مارشل کی بیوی کو عورت سمجھتی ہو؟"

"عورت نہیں تو وہ اور کیا ہے؟"

"ایک ڈھولک ہے — ڈھولک جسے لکڑیوں
سے پیٹا جاتا ہے"

"ہاں۔ ہاں" مادام لاسنکایا نے بات کا موضوع
بدلنے کی غرض سے کہا۔ "میں نے یہ سنا ہے کہ تمہیں مبارکباد
دینی چاہیے"

"کس بات پر؟"

"یہی کہ تم مقدمہ جیت گئے ہو۔ اور چراگاہیں اب
تمہارے قبضہ میں رہیں گی"

"ہاں" — لیگانیف نے اُداسی کے ساتھ جواب دیا۔

"سالوں تک یہ مقدمہ تم لڑتے رہے ہو اور اب
یہ مقدمہ جیت لینے پر تم غیر مطمئن نظر آ رہے ہو!"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں" لیگانیف نے
سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"ایک مسرت جو مدت کے بعد حاصل ہو اس سے بڑی اور
کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس سے تم ایک رعایت سے محروم ہو جاتے
اپنی قسمت کو کوستے رہنے کی مسرت انگیز رعایت سے — میں
ٹھیک کہتا ہوں مادام جو مسرت مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے
وہ بہت گھناؤنی ہوتی ہے"

مادام صرف اپنے کندھے جھٹک کر رہ گئی "آیا!"
اس نے آواز دی "مسز کورٹ لا دو" لاؤ مجھے دو"

وہ اپنے بچے کو کھلانے لگی — لیگانیف بڑبڑاتا ہوا
برآمدہ کے دوسرے کونے میں چلا گیا"

دفعتاً لزنف باغ کے گرد گھومتا ہوا سڑک پر نمودار
ہوا۔ وہ اپنی دو گھوڑوں والی گاڑی میں آ رہا تھا۔ دو نچلے قد کے
کتے اس کے گھوڑے کے آگے دوڑ رہے تھے۔ یہ کتے ایک
دوسرے کے دوست بھی تھے اور آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے"

"لزنف — ادھر دیکھو۔ میں اپنے ساتھ کسے لایا ہوں"
لزنف نے دور ہی سے اپنی بیوی کو آواز دی —

مادام لزنف اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو
پہچان نہ سکی — آخر کار وہ بولی "اوہ مونیور میس توف!"

"یہ ایک نہایت اچھی خبر لائے ہیں"

لزنف احاطہ میں داخل ہوا — احاطے سے ہوتا ہوا
میس توف کے ہمراہ برآمدے میں پہنچا —

"خوش ہو جاؤ، سنتا، تمہارے بھائی کی شادی ہو رہی ہے"

"کس سے؟"

"تتالیا سے اور کس سے ـــ ہمارا دوست بیس توف ماسکو سے یہ خبر لایا ہے اور تمہارے نام ایک خط بھی ہے ـــ سنو میتا!" اس نے پھر اپنے بچے کو بیوی کی گود سے چھینتے ہوئے کہا ـــ "تمہارے ماموں کی شادی ہو رہی ہے! تم تو بس رال ٹپکاتے ہو بیٹے ہو یا آنکھیں جھپکتے رہتے ہو ـــ!"

"اسے نیند آ رہی ہے" آیا نے کہا ـــ

"ہاں ـــ" بیس توف نے مادام لزنف کے قریب جاتے ہوئے کہا "میں مادام لاسنکایا کے حکم کے مطابق آج ہی ماسکو سے یہاں آ رہا ہوں ـــ یہ رہا وہ خط!"

مادام لزنف نے لفافہ چاک کر کے اپنے بھائی کا خط پڑھا۔ یہ ایک مختصر خط تھا ـ صرف چند ہی سطور میں مسرت کے عالم میں اس نے اپنی بہن کو اطلاع دی تھی کہ اس نے نتالیا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور وہ مان گئی ـ اس کی اماں بھی رضامند ہے ـ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے خط میں وہ تمام تفصیلات لکھے گا ـ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بے خودی کے عالم میں یہ خط لکھا تھا ـ

چائے آ گئی اور بیس توف پر سوالات کی بوچھار کر دی گئی ـ لیگا سف بھی اس خبر پر خوش تھا ـ

"ہم پر ایک شخص موسوم کور جاگن سے متعلق افواہیں پہنچی تھیں ـ میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹی ہیں ـــ"

کور جاگن ایک خوبصورت نوجوان تھا بڑا تند مزاج اور اکھڑ ـ وہ کچھ اس قسم کے دبدبے کا اظہار کرتا تھا ـ جیسے وہ انسان نہ ہو بلکہ ایک مجسمہ ہو جس پر کوئی عبارت کندہ ہو ـ

"نہیں بالکل جھوٹی تو نہیں ہیں ـــ" بیس توف نے مسکراتے ہوئے کہا "مادام لاسنکایا اس کے حق میں تھیں ـ مگر میڈموازیل نتالیا اس کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتی تھیں ـــ"

"میں اس شخص کو جانتا ہوں ـــ" لیگا سف بولا "بالکل کاٹھ کا الو ہے ـ خدا کی قسم اگر تمام انسان اس جیسے ہوتے تو میرے لئے جینا محال تھا"

"مگر دیکھئے طبقوں میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے"

"چلو اب اس کی بات ہی چھوڑ دو ـــ" مادام لزنف نے کہا "میں خوش ہوں کہ میرا بھائی کامیاب ہو چکا ہے کیا نتالیا بھی خوش ہے؟"

"ہاں! وہ ہمیشہ بڑی پُرسکون رہتی ہے ـــ"

وہ شام نہایت گرمجوش باتوں میں بسر کی گئی ـ پھر رات کے کھانے کا وقت ہو گیا ـ

"ہاں ـــ یہ تو کہو ـــ" لزنف نے بیس توف کے جام میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا ـــ "کیا کبھی کچھ رودن کے بارے میں بھی سنا ہے ـ؟"

"نہیں ایک مدت ہو چکی ہے وہ گزشتہ سردیوں میں تھوڑی سی دیر کے لئے ماسکو آیا تھا اور پھر ستمبر تک چلا گیا وہ ایک کنبے کے ہمراہ تھا ـ ہم دونوں میں کچھ دنوں تک خط و کتابت ہوتی رہی ـ اپنے آخری خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ سمبرسک چھوڑ کر جا رہا ہے ـ کہاں ـــ اس بات کا ذکر نہیں کیا ـ پھر مجھے اس کی کوئی خبر نہیں معلوم ہو سکی"

"وہ شخص اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے ـــ" لیگا سف بیچ میں بول اٹھا ـــ "میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی کہیں بیٹھا ہوا پرچار کر رہا ہے ـ اس شخص کو ہر وقت دو تین مداح میسر آ سکتے ہیں جو حیرت سے کھلے ہوئے منہ کے ساتھ اس کی باتیں سن سکتے ہیں اور اسے روپیہ قرض دے سکتے ہیں ـ میری بات یاد رکھنا اس کا انجام یہ ہو گا کہ وہ کہیں دور افتادہ مقام میں مثلاً زارف کاک یا کھوما میں ایک بوڑھی عورت کے بازوؤں میں دم توڑے گا جو اسے نہایت قابل شخص سمجھتی ہو گی"

"آپ اس کے بارے میں نہایت سخت الفاظ ادا کر رہے ہیں ـــ" بیس توف بولا ـــ

"بالکل نہیں ـ میں سچی بات کہہ رہا ہوں ـ میرے خیال میں وہ ایک مفت خورے کے سوا کچھ بھی نہیں ـــ" لیگا سف نے پھر لزنف کی طرف مڑتے ہوئے کہا ـــ "میں تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا ـ کہ میری ملاقات تارلوخوف

ـــ بڑی تھوڑی رہ گئی ہیں۔ رودن کے ہمراہ رہ چکا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ اس شخص نے رودن کے متعلق مجھے کیا کچھ بتایا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ وقت گزرنے پر رودن کے سبھی دوست دشمن بن جاتے ہیں "

۔ یہ ان میں سے نہیں ـــ بیس توف نے گرم ہوتے کہا۔

۔ تمہاری بات دوسری ہے ـــ میں تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں "

۔ تمہیں تاروخوف نے کیا بتایا؟ مادام لزنفانے پوچھا۔

۔ بہت سی باتیں بتائیں۔ مجھے سب تو یاد نہیں مگر ایک نکتہ تو نہایت ہی اچھا ہے۔ رودن جیسے شخص ہر وقت ترقی کرتے رہتے ہیں جب کہ دوسرے کھاتے اور سوتے ہیں۔ ایسے شخص کھاتے اور سوتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ترقی بھی کرتے ہیں۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا مسٹر بیس توف! (بیس توف نے کوئی جواب نہ دیا) اس طرح وہ مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں۔ رودن کو یہ خیال سوجھا کہ وقت آگیا ہے کہ محبت کی جائے۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی شناسائی ایک فرانسیسی عورت سے ہو گئی۔ وہ نہایت ہی حسین عورت تھی۔ یہ قصہ دریائے رائن پر واقع ایک جرمن شہر ہے۔ رودن اس عورت کے یہاں مسلسل جانے لگا۔ اسے اپنی کتابیں دیتا رہا اور اس سے ہیگل اور قدرت کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ فرانسیسی عورت نے اسے ایک نجومی خیال کیا۔ تم تو جانتے ہی ہو رودن دیکھنے میں برا نہیں۔ پھر وہ ایک بدیسی تھا روسی۔ فرانسیسی عورت کی نگاہ پر چڑھ گیا۔ آخر کار انہوں نے ملاقات کے لئے ایک جگہ مقرر کی۔ یہ جگہ تھی خاعرانہ تھی۔ دریا میں کشتی کی سیر ـــ فرانسیسی عورت مان گئی۔ بہترین لباس پہنا اور اس کے ساتھ کشتی کی سیر کو چل پڑی۔ وہ دو گھنٹے تک کشتی میں سیر کرتے رہے اور جانتے ہو اس نے کیا کیا؟ وہ عورت کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور خواب آلود آنکھوں سے آسمان کو تکتا رہا۔ اور بار بار اس عورت سے یہ کہتا رہا کہ وہ اس کے لئے ایک باپ کی سی شفقت محسوس کر رہا ہے۔ یہ عورت بڑی برافروختہ ہو کر گھر لوٹی۔ اس نے بعد میں یہ سارا قصہ تاروخوف کو سنایا ـــ ہاں تو رودن ایسا شخص ہے ـــ "

ـــ نیگا سف سنیا۔

"تم بہت بڑے کلبیت پسند ہو ـــ" مادام لزنفانے اسکو ڈانٹتے ہوئے کہا ـــ "مجھے دن بدن یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ جو شخص بھی رودن کو برا بھلا کہتا ہے اس کے پاس کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے وہ برا ثابت ہو۔"

یہ بری بات ہی نہیں ـــ وہ دوسرے لوگوں کی جیب پر ہو کر جو ڈالتا ہے ـــ قرض لینے کی اسے عادت ہے ـــ مونیو رلزنف اس نے ضرور تم سے کچھ روپیہ قرض لیا ہوگا؟"

ادھر دیکھو مونیو رنگا سف ـــ لزنف نے بات کی ابتدا کی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار پیدا ہو گئے ـــ تم بھی جانتے ہو اور میری بیوی بھی جانتی ہے کہ میں رودن کا قدردان نہیں ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس میں کئی عیب نکالے ہیں لیکن اس کے باوجود میں "

یہاں پہنچکر لزنف نے سب کے گلاسوں میں شراب ڈالی اور کہا "

یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اپنے بھائی اور اس کی محبوبہ کی صحت کا جام پینے کے بعد ہم رودن کی صحت کا جام پئیں "

مادام سنیا اور نیگا سف نے لزنف کی طرف حیرت سے دیکھا۔ بیس توف سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے مسرت جھلک رہی تھی "

"میں رودن کو اچھی طرح جانتا ہوں ـــ" لزنف نے اپنی بات جاری رکھی "

میں اس کے عیوب اور اس کی کوتاہیوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ مگر یہ کوتاہیاں اس لئے ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ بذات خود کوئی چھوٹا آدمی نہیں ہے۔

رودن ایک نہایت ہی ذہین شخص ہے۔ بیس توف نے دخل اندازی کی۔

"ہاں اس میں ذہانت کی چنگاریاں ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے انسان ہونے کا تعلق ہے۔ مصیبت تو یہی ہے کہ وہ پورا انسان نہیں ہے۔ خیر یہ ایک غیر متعلقہ بات ہے

میں صرف اس کی تقریروں کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں جوش و خروش ہے ــــ ہمارے اس عہد میں ایک گراں قدر خوبی ہے۔ ہم سب بے حس ہو چکے ہیں۔ لاپروا بن چکے ہیں ــــ ہم سو رہے ہیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔ ہمیں اس شخص کا ممنون ہونا چاہئے جو ہمیں جگاتا ہے اور ہم میں گرمی کی لہر دوڑاتا ہے چاہے یہ گرمی الحماقتی ہی کیوں نہ ہو۔ سنیا تمہیں یاد ہوگا پچھلی مرتبہ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اس پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ سرد ہے۔ میں اس وقت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اور غلط۔ اس کے خون میں سردی ہے۔ یہ اس کا اپنا کوئی نقص نہیں۔ مگر اس کے ذہن میں آگ ہے۔ وہ کوئی اداکار نہیں ہے جیسا کہ پہلے میں نے اسے کہا تھا ــــ وہ بہروپیا بھی نہیں ــــ ریاکار بھی نہیں۔ وہ دوسرے شخص کے اخراجات پر ایک چالاک شخص کی طرح زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک بچے کی طرح۔ عین ممکن ہے کہ تنگدستی اور ناداری میں اس کی موت واقع ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ محض اس بات کے لئے اسے سنگسار کر دیا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خود کوئی کامیابی نہیں حاصل کر سکے گا۔ اس لئے کہ اس میں ہمت نہیں اور اس کا خون سرد ہے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ مفید ثابت نہیں ہو رہا اور مفید ثابت ہی نہیں ہوگا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کے الفاظ نے جوان دلوں میں بیداری کے بیج بو دئے ہیں ان نوجوانوں کے دلوں میں جو عمل کی قوت رکھتے ہیں اگرچہ قدرت نے اسے عمل کی قوت عطا نہیں کی ہے۔ دور کیوں جائیے خود میں اس کا بہت ممنون ہوں کہ میرے دل میں بھی اس نے بیداری کا بوٹا لگایا ہے میری بیوی سنیا جانتی ہے کہ جوانی کے ایام میں رودن کا میرے دل میں کیا قدر و قیمت تھی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ رودن کے الفاظ انسانوں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اس کے الفاظ ان انسانوں کو متاثر نہیں کرتے جو سن رسیدہ ہیں اور میری طرح زندگی کے تلخ تجربوں سے گزر چکے ہیں مگر نوجوان جو ابھی پختہ کار نہیں ہوئے اس کے الفاظ سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ نوجوان جو کچھ اس سے سنتے ہیں اسے حسین اور خوبصورت پاتے ہیں تو پھر بے عملی کی کون پروا کرتا ہے۔ وہ نوجوان اپنے میں خود قوت عمل پیدا کر لیں گے۔

"خوب۔ خوب۔ میں تو فٹ بول اٹھا ــــ لیکن سچی بات کہی ہے۔

جہاں تک تاثر کا تعلق ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ شخص نہ صرف دلوں میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ بلکہ وہ آپ کو آگے بڑھاتا ہے اور آپ کے آگے بڑھنے کو جاری رکھتا ہے وہ تمہیں جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور آگ لگا دیتا ہے۔ سنیا تم نے ترلف سے دیکھا سنف کی مڑتے ہوئے کہا۔

اب تمہیں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم فلسفہ پر حملہ کرتے ہو۔ مگر تمہیں حملہ کرتے وقت الفاظ موزوں نہیں ملتے میں خود بھی فلسفہ کا اس قدر قائل نہیں ہوں اور میری سمجھ میں بھی کم آتا ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ ہماری مصیبتوں کا باعث صرف فلسفہ ہی نہیں۔ ایک روسی کبھی فلسفیانہ شعبدہ گری سے متاثر نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ جو شخص بھی صداقت کی تلاش کرتا ہے۔ ہم اس کی اس تلاش کو فلسفہ کہہ کر مغضوب نہیں بنا سکتے رودن کی یہ بدقسمتی ہے کہ روس کو نہیں جانتا۔ روس کو ہماری ضرورت نہیں مگر ہمیں روس کی ضرورت ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ روس کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ دکھ اٹھاتا ہے۔ اپنے آپ کو پردیس کا ظاہر کرنا خود کو متنازعہ بنانا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ رودن کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی ہے اور ہمیں اس پر الزام لگانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے اندر جو اچھائیاں ہیں۔ ہمیں تو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ہمیں اس کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے خود اپنے آپ کو سزا دی ہے۔ خدا کرے اس کے اندر جو برائیاں ہیں وہ تباہ ہو جائیں اور وہی کچھ باقی رہ جائے جو اس کے اندر خوبصورت اور دلنشیں ہے میں رودن کے نام پر جام پیتا ہوں "

اس پر سب نے نیزلف کے ساتھ اپنے گلاسوں کو ٹکرا دیا۔ اپنے جوش و خروش میں رودن نے اپنا گلاس توڑ دیا۔ مادام نر . . . نے اپنے خاوند کا ہاتھ دبایا۔

"مجھے اس کی امید ہی نہیں تھی کہ تم بھی ایک اچھے مقرر ہو۔ تم تو رودن کی طرح خوش بیان ہو۔"

"نہیں میں خوش بیان نہیں ہوں ــــ خیر رودن کے متعلق بہت باتیں

۔ آؤ اب گفتگو کا موضوع بدل دیں۔ کیا پینیڈے والوں ابھی تک
خانا کے بہلا مچتا ہے ؟"
ہاں ۔۔۔ مادام پینتا کو نے اُسے نہایت اچھی ملازمت حاصل
ہے !"
یہ ختم ہوا تو مہمان رخصت ہوگئے۔ مادام پینا اپنے خاوند کے
ساتھ گئی ۔ اُس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی ،" آج تم
دیا ۔ آج تم نے رودون کے حق میں ہمدردی دکھائی ۔ میں نے تم کو
جوش و خروش سے کبھی بولتے ہوئے نہیں سُنا :
یں اس وقت آدمی کا یہ محسوس نہیں کر سکتی جو گڑ بڑ ہو رہی
اور پیاسف بہت تلخ ہوگیا تھا جب وہ رودون پر نکتہ چینی
تھا !"

" میں نے محض پیاسف کی وجہ سے رودون کا ساتھ دیا تھا ۔ وہ
رسیوں کو چھوڑ کیونکر کہہ سکتا ہے جبکہ وہ خود ایک سپری کچڑ ہے۔
معلوم ہے جب پیاسف سرکاری ملازم تھا تو رشوت لیا کرتا تھا"
" نہیں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا ۔۔۔!" اور پھر اس کے بعد اُس
نے شوہر سے پوچھا ۔" تمہارا کیا خیال ہے زمیرا ابجائی نتالیا کے
خوش رہے گا ؟"

" ہاں کیوں نہیں ۔۔۔ نتالیا جلد ہی غم والم پر قابو پالے گی ۔۔۔
کی آپس میں محبت ہے ۔ ہم بھی تو ایک دوسرے سے محبت کرتے
اور خوش ہیں "
وہ مسکرائی اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر
سے دبایا ۔

جس دن مادام پینا کے گھر میں وہ واقعہ ہوا جس کا ذکر کیا جا چکا
اس دن ایک چھکڑا جسے کسانوں کے تین گھوڑے کھینچ رہے تھے ۔
ں کے علاقہ تگیرنا کے دور و دراز علاقہ میں دوپہر کے وقت بڑھا جا رہا
. کوچوان کی نشست پر سفید بالوں والا ایک کسان پھٹا پرانا کوٹ پہنے
ئے بیٹھا تھا ۔ ترپال کے نیچے ایک لمبے قد کا شخص بیٹھا تھا ۔ اس کے ہاتھ
ایک تھیلا تھا ۔ اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی تھی اور اس کا کوٹ گرد
دھا ۔ یہ شخص رودون تھا ۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی
آنکھوں تک جھکا رکھی تھی ۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔
" کیا ہم کبھی اس چوٹی تک پہنچ بھی سکیں گے ؟" اس نے کسان سے پوچھا ۔

" حضور صرف ایک دو میل کی بات ہے ۔"
" تم ایسے ذرا تیز سے نہیں ہو !"
تھکے ہوئے گھوڑے آخرکار اس چوکی تک پہنچ گئے ۔ رودون تیزی
سے اُس گاڑی میں سے اُترا ۔ اُس نے کسان کو کچھ رقم دی اور جو تھیلا جیب
اٹھا ۔ اس گھر میں داخل ہوا ۔

میرے ایک دوست نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جس چوکی میں روسی
جرنیلوں کی تصویریں لٹکی رہتی ہیں وہ فوراً تمہیں تازہ دم گھوڑے دیتے
ہیں لیکن جس چوکی میں جوار سے جانے کی جرأت کی تصویر آویزاں ہوتی ہے
وہاں آپ کو کتنے ہی دن پڑے رہتے ہیں اور گھوڑے نہیں ملتے جس کمرے
میں رودون نے قدم رکھا اس میں اُس جواری کی تصویر لٹکی ہوئی تھی ، اُس
نے جب آواز دی تو ایک شخص اونگھتا ہوا اس کے قریب آیا ۔ اُس نے
خواب آلود لہجے میں انکشاف کیا ۔" گھوڑے ابھی نہیں مل سکتے ۔"
" کیا مطلب ہے تمہارا !"
" حضور گھوڑے ہوں تو دوں !"
رودون گھبراہٹ کے عالم میں کھڑکی کے قریب چلا گیا ۔
گزشتہ دو برسوں میں اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی
البتہ اس کا چہرہ ذرا زیادہ مغموم ہوگیا تھا ۔ اس کے گھنگریالے بالوں
میں سفیدی نمودار ہوگئی تھی ۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں اپنی خوفزدگی سی
چمک کھو بیٹھی تھیں ۔ اس کے لبوں کے گرد اُس کے گھٹے ہوئے جذبات
نے جھریاں پیدا کردی تھیں ۔ اُس کا لباس پرانا اور بوسیدہ تھا جوانی
کے ایام گزر چکے تھے ۔
رودون نے دیوار پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنا شروع کردی ۔
دفعتاً دروازہ چرچرایا اور چوکی کا مالک اندر آیا ۔
" آپ کے گاؤں تک جانے کیلئے گھوڑے مل نہیں رہے ۔ دیر
تک ملنے کی امید بھی نہیں ۔ ! گاؤں اوف تک گھوڑے مل سکتے ہیں "
" کیا گاؤں پنیزا تک گھوڑے نہیں مل سکتے ؟"
" نہیں "
" اچھا تو اوف تک ہی سہی ۔ گھوڑے جوتنے کا حکم دو !"
جلد ہی گھوڑے تیار ہوگئے ۔ رودون نے اپنا تھیلا اُٹھایا
اور گاڑی میں اُچک کر جا بیٹھا ۔ وہ اب بھی اپنے سر کو جھکائے ہوئے
تھا ۔ اس کے خمیدہ جسم سے واقعی افسردگی اور اس کی مایوسی کا اظہار

ہوتا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور جھٹکوں کی وجہ سے اُس کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

اختتامیہ

چند سال اور گزر گئے۔

موسم خزاں کا یہ ایک سرد دن تھا دفعتاً گو برنلکے علاقہ کے قصبہ الیسن کے سب سے بڑے ہوٹل کے سامنے ایک سفری گاڑی آکر رُکی۔ اس میں سے ایک شخص نکلا اور اُس نے انگڑائی لی۔ وہ کوئی بوڑھا شخص نہیں تھا۔ اس کے طور و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی مہذب اور دولت مند شخص ہے۔ وہ سیڑھیوں سے اس ہوٹل کی پہلی منزل پر پہنچا۔ کہیں ایک دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور ایک خادم نمودار ہوا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر مسافر نے اپنا کوٹ اُتار دیا۔ یہ مسافر لیزنف تھا۔ وہ ایک سال سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی مہم پر تھا اور اب وہ قصبہ الیسن میں پہنچا تھا۔

اتنے میں لیزنف کا خادم بھی آگیا۔ یہ ایک گلابی رخساروں والا نوجوان تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

"آخر ہم پہنچ ہی گئے ۔۔۔ اور وہ گاڑی کا ٹائر جس کے متعلق تم اتنے فکرمند تھے ٹھیک ہی رہا ۔۔۔" لیزنف بولا۔

"ہاں پہنچ ہی گئے حضور" خادم نے جواب دیا۔

ڈیوڑھی میں سے آواز آئی ۔۔۔ "اندر کون ہے!"

"ذرا ہیلو ۔۔ اندر کون ہے ۔۔" یہ آواز پھر آئی۔

لیزنف اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے ایک دراز قد شخص کھڑا تھا جس کی کمر خمیدہ تھی۔ اس کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اُس نے کمبل کا کوٹ پہن رکھا تھا جس میں پیتل کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ لیزنف نے اسے فوراً پہچان لیا۔

"رودن" اسکے منہ سے نکلا۔

رودن ہکا بکا کھڑا تھا وہ ابھی تک لیزنف کو نہیں پہچان سکا تھا چونکہ لیزنف روشنی کی طرف اپنی پیٹھ موڑ کر کھڑا تھا۔

"تم مجھے پہچانتے ہی نہیں ہو؟" لیزنف بولا۔

"اوہ، ٹھیک لیزنف ۔۔!" رودن نے حیرت سے کہا اور اُس نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

لیزنف نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"آؤ۔ آؤ۔ میرے کمرے میں آجاؤ ۔" اور پھر رودن کو دھکیل کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

"تم کسقدر تبدیل ہو چکے ہو؟"

"ہاں مگر تم بھی تو بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہاری بیوی کا کیا حال ہے؟"

"شکریہ۔ اچھی ہے ۔ مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں یہاں اتفاقیہ پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے ایک شناسا کو یہاں ڈھونڈنے آیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی!"

"تم کھانا کہاں کھاتے ہو؟"

"میں ۔ جو ہوٹل بھی سامنے آجائے وہیں کھا لیتا ہوں لیکن آج مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔!"

"کیا یہ اتنا ہی ضروری ہے؟"

رودن نے معنی خیز طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں وہ مجھے میرے گاؤں میں بھیج رہے ہیں"

"آؤ۔ میرے ساتھ کھانا کھاؤ ۔۔!"

رودن نے لیزنف کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم واقعی مجھے کھانے کی دعوت دے رہے ہو؟"

"ہاں۔ بالکل اچھے دوستوں کی طرح۔ پرانے دنوں کی طرح کیا تمہیں یہ دعوت منظور ہے؟ میرے خدا مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ ہم اس طرح جدا نہیں ہو سکتے"

"بہت اچھی بات ہے۔!"

اس پر لیزنف نے زور سے رودن کا ہاتھ دبایا اور نوکر کو بلا کر اسے میز پر کھانا لگانے اور برف میں لگی ہوئی شیمپین شراب لانے کا حکم دیا۔

- - - - - - - - -

کھانے کے دوران لیزنف اور رودن جھجکتے ہوئے اپنی طالب علمی کے ایام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بہت سے واقعات

ے لوگوں کو یاد کیا۔ پہلے پہل تو رودن ذرا خاموش تھا
نے ہم سے ۔ کو گن دیا۔ شام جب کھانا لگا کر چلا گیا
ر ملازم نے دروازہ بند کر دیا۔
" تم مجھے ہم سے جدا ہونے کے بعد کا سارا قصہ سنائو گے!"

رودن نے لیزنف کی طرف دیکھا۔ لیزنف سوچ رہا تھا۔
سا یہ غریب آدمی کتنا تبدیل ہو چکا ہے!"
رودن کے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی صرف اس
کا انداز بدلا ہوا تھا۔
کیا وہ سارا قصہ سناؤں!" رودن بولا۔ میں تمہیں
نہیں سنا سکتا۔ میں نے بہت آوارہ گردی کی ہے
دکھ اٹھائے ہیں۔ لوگوں اور بہت سی باتوں پر سے میرا
اٹھ چکا ہے۔ بعض اوقات مجھے اپنے ہی الفاظ پر غصہ
میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو گالیاں دی ہیں۔ میں کہاں
ں گھوما۔ اور بعض راستے بہت ہی گندے تھے۔ کیا تمہیں
ہے مونسیور۔!"
یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیوں تکلف سے کام لے رہے ہو
تا تکلف کہاں تھا۔ آؤ شراب پئیں ۔" لیزنف بولا۔
" ہاں میرے دوست آؤ شراب پئیں!"
" کیا تمہیں معلوم ہے۔" اب کے رودن نے سولینور کا
دیا۔
میرے اندر سا ایک کیڑا ہے جو مجھے آہستہ آہستہ کریدر رہا
بے چین کر رہا ہے۔ مجھے چین میسر نہیں۔ یہ ان لوگوں کو میرے
ہے جو مجھ سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ جب سے میں تم سے جدا
ہوا ہوں میں نے بہت سی چیزوں کو آزمایا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ نئی زندگی
کیا اور اس کا جو انجام ہوا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو!"
" تم میں صرف ہمت کی کمی ہے۔" لیزنف نے کہا۔
" کیا کہا مجھ میں ہمت نہیں میں کبھی ایک معمار نہیں رہا۔ جب کسی
س ایک ٹھوس بنیاد ہی نہ ہو وہ کیا تعمیر کر سکتا ہے۔ خیر میں
، وہ تمام واقعات نہیں سناؤں گا۔ یا یوں کہو اپنی ناکامیوں کا
نہیں کروں گا۔ لیکن تم سے صرف واقعات بیان کروں گا۔ اپنی

زندگی کے وہ واقعات جب میری تقدیر مسکرا اٹھی تھی اور مجھے
کامیابی کی امید ہو گئی تھی:"
رودن نے اپنے سفید بالوں کو انگلیاں پھیر کر سیدھا کیا اور
اپنے بالوں کی موٹی لٹوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا بولا:" سنبراسکو میں
میری ایک عجیب و غریب شخص سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سرکاری ملازم
نہیں تھا مگر بہت دولت مند تھا۔ اس کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔
وہ سائنس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ اسے سائنس سے محبت کیوں تھی۔ وہ اس کیلئے موزوں
نہیں تھا۔ تقریر تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بڑی محنت کرتا تھا
خوب پڑھتا اور لکھتا تھا۔ وہ ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔
وہ تنہائی پسند تھا اور لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ایک عجیب
و غریب انسان ہے۔ میں نے اس سے واقفیت پیدا کی۔ وہ
مجھ سے متاثر ہوا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس سے واقعی
کوئی اچھا کام کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کے یہاں رہنے لگا۔ دیہات
میں اس کی جاگیر تھی وہاں بھی اس کے ہمراہ گیا۔ میں نے بہت سے
منصوبے تیار کئے تھے۔ میں بہت سی اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔
میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں۔
" جیسا تم نے مادام لاسنکایا کے یہاں کیا تھا!" لیزنف
نے مسکراتے ہوئے کہا۔
" نہیں ۔۔ وہاں تو مجھے علم تھا کہ میرے الفاظ کی کوئی قیمت
نہیں۔ مگر یہاں مجھے ایک شاندار موقع مل رہا تھا۔ میں نے اپنی تجاویز
کی آزمائش کی اور وہ صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ خود بھی گہری دلچسپی کا
اظہار کرتا۔ ہر تجویز میں سرگرمی سے حصہ لیتا لیکن جلد ہی اس
ساری تجویز کو ملیامیٹ کر دیتا اور نئی تجویز پر عمل شروع کر دیتا۔ لہذا
میں اس سے برسوں تک جدوجہد کرتا رہا۔ دشواریوں کے باوجود
کام اچھی طرح ہو رہا تھا مگر میں جلد ہی اپنے دوست سے اکتا گیا۔
میں نے اس پر طنز شروع کر دی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ میری
کامیابی سے ڈر کر میری ہر تجویز کو منسوخ کر دیتا تھا۔ بعد میں مجھ پر
یہ انکشاف ہوا کہ میں خواہ مخواہ اس سے چمٹا ہوا ہوں۔ اس بات کا
انکشاف بہت تلخ تھا۔ میری تمام امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ یہ
انکشاف بہت تکلیف دہ تھا کہ میں اپنا وقت اور اپنی قوت ضائع

کر رہا ہوں ۔ میں یہ سب جانتا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر میرا کیا حال ہوگا لیکن میں نے ان باتوں کے باوجود اُس سے جھگڑا کیا اور اس رئیس زادہ کو چھوڑ کر چلا آیا۔ جب روس آنے میں جرمنی کا دلیر مل کر گوندھا گیا تھا ۔۔۔!"

"یعنی تم نے اپنی روزی پر لات مار دی ۔۔۔!" نیرنفت نے رودن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں ۔۔۔ ایک دفعہ پھر میں نے خود جوکا اور ننگا پایا۔ میرے ہر طرف بیکراں خلا تھا اور میں جہاں بھی چاہتا اُڑ کر جا سکتا۔ خیر آؤ شراب پئیں "

"میں تمہاری صحت کا جام پیتا ہوں ۔" نیرنفت نے اُٹھ کر رودن کے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے کہا ۔" میں تمہاری صحت کے لئے دوبارہ گرسکیں کی میں جام پیتا ہوں ۔۔ اُس میں بھی غریب رہنے کا حوصلہ تھا۔"

"ہاں تو یہ پہلا واقعہ تھا ۔ کیا میں اپنی کہانی جاری رکھوں ؟"

"ہاں ہاں ۔۔ خوشی سے !"

"میرے دوست اب میں باتیں کرتا ہوا تھک جاتا ہوں۔ خیر ۔ بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے تجارت شروع کرنی چاہیئے ۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میری ملاقات کوربیف سے ہو گئی ۔ کیا تم نے اس کا نام سُنا ہے ؟"

"نہیں ۔۔۔ مگر رودن میرے دوست تمہیں تاجر بننے کا خیال کیوں آیا؟ ۔ تاجر بننا کونسی اچھی بات ہے ۔"

"میں جانتا ہوں ۔" رودن بولا ۔ "کاش تم نے کوربیف کو دیکھا ہوتا ۔ میں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا ۔ وہ ایک بہت دانشمند شخص اور صنعت و تجارت کے متعلق بے پناہ واقفیت رکھتا تھا ۔ اس کا ذہن تجاویز کا مرقع تھا ۔ ہم نے مل کر عوام کے مفاد کا ایک کام کرنا چاہا ۔"

"وہ بھلا کیا تھا ؟"

رودن نے اپنی نگاہیں جھکا کر کہا ۔" سنوگے تو ہنسو گے !"

"ہم نے فیصلہ کیا کہ گوبرنا کے علاقہ میں دریائے ... کو جہاز رانی کے قابل بنائیں ۔" رودن اس انکشاف پر مسکرایا۔

"کیا خوب بات سوچی ۔ کوربیف ضرور کوئی سرمایہ دار ہوگا ۔۔؟"

"نہیں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ غریب تھا ۔" رودن نے حسب دستور سر جھکائے ہوئے کہا ۔

نیرنفت نے ایک قہقہہ سر کیا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور رودن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے دبایا اور بولا ۔" تمہاری تجویز کاغذ پر ہی رکھی رہی ہوگی ؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے ۔ ہم نے مزدور رکھ لئے پھر کام شروع کر دیا لیکن جلد ہی ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ بات یہ تھی کہ مِل کے مالک اس منصوبہ کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں تھے ۔ ہمیں مشینری کی ضرورت تھی ۔ ہمارے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا ۔ ہم چھ مہینے تک مٹی کی جھونپڑیوں میں رہے ۔ اور جب آخری دھیلا تک خرچ ہو گیا تو ہم وہاں سے واپس آ گئے ۔۔۔!"

"اور تم کر ہی کیا سکتے تھے ؟"

"بالکل ۔۔۔ مگر میں اتنا کہہ دوں وہ منصوبہ تھا شاندار !"

"کوربیف اب کہاں ہے ۔۔؟"

"وہ سائبیریا میں ہے نئے کھود کر سونا نکالنے میں مصروف ہے ۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن وہ بے پناہ دولت پیدا کرے گا ۔۔!"

"ہو سکتا ہے ۔ مگر تم کبھی بھی دولت پیدا نہیں کر سکو گے !"

"خیر تم تو ہمیشہ نکما سمجھتے رہے ہو ۔!"

"تم اور نکمے ہو ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ٹھیک ہے ایک وقت تھا جب میں صرف تمہاری کمزوریوں کو دیکھتا تھا لیکن مجھ پر اعتبار کرو ۔ اب میں تمہاری قدر و قیمت کو پہچانتا ہوں ۔ تم دولت پیدا نہیں کر سکو گے ۔ مجھے اس لئے تم سے محبت ہے ۔"

رودن مسکرایا ۔۔ "کیا سچ ۔۔!"

"ہاں میں تمہارا احترام کرتا ہوں ۔۔ اچھا اب تم مجھے تیسرا واقعہ سناؤ ۔۔"

"جب میں ان باتوں میں ناکام ہو گیا تو میں نے سوچا کہ مجھے بچوں کو پڑھانا چاہیئے ۔۔ میں نے جو علم حاصل کیا ہے اسے اب دوسروں کو بھی عطا کرنا چاہیئے ۔ میں نے ملازمت کے لئے

درخواست دے دی کیونکہ میں پرائیویٹ طور پر پڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کار مجھے ملازمت مل گئی۔"

"کیا تم ایک اُستاد بن گئے ——؟"

"ہاں میں مدرسے میں ادب پڑھانے لگا۔ میں نے بڑے جوش و خروش سے یہ کام شروع کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نوجوانوں کے ذہن کو بہتر طریقے سے ڈھال سکوں گا۔ میں نے تین ہفتے تک اپنے لیکچر لکھنے میں صرف کئے ——!"

"کیا اس کی کوئی نقل تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں وہ مجھ سے گم ہو چکی ہے — پہلا ہفتہ اس کام میں بہت کامیاب رہا — پہلا موقعہ تھا۔ انسپکٹر بھی موجود تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا — پتلا دبلا — میں نے جب پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر لیکچر دیا تو میرا خیال تھا کہ وہ لیکچر ایک گھنٹے میں ختم ہوگا۔ لیکن یہ صرف بیس منٹ رہے — وہ بوڑھا انسپکٹر بولا "لیکچر اچھا تھا۔ ذرا مبہم تھا دراصل موضوع پر بہت کم باتیں کی گئی ہیں —" مگر میرے شاگردوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور انہوں نے میری حمایت کی۔ اس کے بعد میں نے لکھے بغیر زبانی لیکچر دینے شروع کر دئے۔

"کیا تم اس میں بھی کامیاب رہے ——؟"

"ہاں — اس جماعت میں صرف تین چار لڑکے ایسے تھے جو میری باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے باقی سب کند ذہن تھے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ لڑکے میری باتوں کو سمجھتے تھے وہ بھی بعض اوقات مجھ سے ایسے سوالات کرتے تھے جن سے میں اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ اس کے باوجود انھیں مجھ سے محبت تھی اور وہ امتحان میں پورے نمبر حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد میرے خلاف ریشہ دوانیوں کا آغاز ہوا۔ میں دراصل پڑھانے کے سلسلے میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا۔ تعلیم کے طریقے میں اصلاح کا قائل تھا۔ میں ہیڈ ماسٹر کی مدد سے یہ اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر ایک نیک انسان تھا۔ اُس کی بیوی میرا ہاتھ بٹایا کرتی تھی — میں اُس جیسی بہت کم عورتوں سے ملا تھا۔ اس کی عمر تیس برس سے زائد تھی لیکن وہ ہر خوبصورت چیز سے ایک پندرہ برس کی لڑکی کی طرح محبت کرتی تھی، ہر ایک کے سامنے وہ اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کرتی تھی میں اس کی روح کی پاکیزگی اور اس کے مقدس جوش و خروش کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ اس کے مشورے سے میں نے ایک تجویز تیار کی مگر میرے سامنے ہی اس پر پابندیاں لگانے کے لئے علم دشمنی کے اُس دلدادہ نے جو پگاسف کی طرح تھا مجھے سخت نقصان پہنچایا۔"

"ہاں یہ تو کہو پگاسف کا کیا حال ہے؟"

"اُس نے شہر کی ایک عورت سے شادی کر لی ہے اور یہ عام افواہ ہے کہ وہ عورت اُسے پیٹتی ہے ——!"

"جیسے کو تیسا ملنا چاہئے۔ نتالیا ماسنکایا کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہے ——"

"خوش ہے؟"

"ہاں ——"

رودن خاموش ہو گیا اور پھر چونکتے ہوئے بولا — "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ خوب یاد آیا — مجھ سے جو انسپکٹر تھا وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ یہ بات بنائی کہ میرے لیکچر آگے ہوتے ہیں — بالکل آگے۔ اور پھر اُس نے یہ بات پھیلا دی کہ ہیڈ ماسٹر کی بیوی کے متعلق میری نیت اچھی نہیں ہے — انسپکٹر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جس سے میری [illegible] سکی تھی۔ اس انسپکٹر نے ہیڈ ماسٹر کو میرے خلاف کر دیا۔ جھگڑا ہوا۔ میں نے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کا حکام کو بھی پتہ چلا اور مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ مگر میں چپ نہ بیٹھا۔ میں انہیں بتا دینا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اب میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا پڑے گا۔"

رودن خاموش ہو گیا اور دونوں دوست دیر تک خاموش رہے اور پھر رودن بولا — "میں کولتسف؎ کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں —" تم نے میری محبوبہ مجھے اتنے دُکھ دئے ہیں کہ اب نجات کا بھی کوئی راستہ میرے سامنے کھلا نہیں ہے —" میں تمہیں بتا دوں کہ اب میرے لئے کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کے باوجود اس دھرتی پر کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے میں نہ کر سکوں میں پہلے یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن اب میں بلند آواز سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کیا چاہئے۔ میں حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے

؎ کولتسف روس کا ایک سرکردہ جمہوری شاعر تھا۔ یہ الفاظ اس کی نظم "دور" سے لئے گئے ہیں۔

کے لئے تیار ہوں ۔ میرا مطالبہ زیادہ نہیں ہے ۔ میں اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک ہے ۔ تاکہ میں کسی کام آسکوں ۔ وہ کونسی چیز ہے جو مجھے دوسروں کی طرح کام کرنے سے روک رہی ہے ؟ ۔ بس اب میں یہی سوچتا ہوں اور یہی میرے خواب ہیں ۔ میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اب میں یہاں جم گیا ہوں ۔ اس وقت تقدیر میرے خلاف ہو جاتی ہے ۔ کیا تم میرے لئے یہ معمہ حل کرسکتے ہو ؟ "

" یہ واقعی ایک بہت بڑا معمہ ہے ۔ " لیزنف بولا " تم خود بھی میرے لئے ایک معمہ رہے ہو ۔ تم عظیم قوتیں رکھتے ہو ۔ لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تھکا دینے والا راستہ اختیار کرتے ہو "

" وہ محض الفاظ تھے میرے دوست میں نے کوئی کام نہیں کیا " رودن بولا ۔

" ہاں ۔ مگر اچھا الفاظ بھی ایک کارنامہ ہوتا ہے "

رودن نے خاموشی سے لیزنف کی طرف دیکھا اور اپنا سر اوپر اُٹھایا لیزنف کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر کر رہ گیا ۔

" تم کیا واپس اپنے گاؤں جا رہے ہو ۔ ؟ " لیزنف نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ "

" کیا ابھی تک تم اس کے مالک ہو ؟ "

" ہاں اس کا کچھ حصہ ابھی تک میرے پاس ہے ۔ صرف دو چار غلام کسان ہیں ۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا کونہ ہے جہاں میں آرام سے مر سکتا ہوں ۔ تم شاید سمجھ رہے ہو کہ میں اب بھی خوبصورت الفاظ ادا کر رہا ہوں ۔ لیکن یہی الفاظ میری تباہی ہیں ۔ میں ان سے نجات حاصل نہیں کرسکتا ۔ تم نے میرے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا ہے اور کڑا تجزیہ کیا ہے ۔ لیکن میرے دوست یہ صرف الفاظ نہیں ہیں ۔ یہ بال ۔ یہ جھریاں ۔ یہ گھسی ہوئی کہنیاں ۔ خیر اب وقت گذر چکا ہے ۔ لیمپ میں تیل نہیں رہا اور شعلہ بھڑک رہا ہے ۔ میرے دوست موت ہی سکون کا پیغام لائے گی "

لیزنف اچھل کر کھڑا ہو گیا ۔ " رودن تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو ۔ کیا تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں ۔ تو سنو ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رہا وہ شخص جو اپنی ذہانت کی وجہ سے کیا کچھ حاصل نہیں کرسکتا تھا ۔ وہ اس دُنیا کی کونسی دولت جمع نہیں کرسکتا تھا ۔ اگر وہ چاہتا تو وہ یہ سب کچھ حاصل کرسکتا تھا ۔ لیکن آج میں اُسے بھوکا اور بے گھر دیکھ رہا ہوں ۔ "

" تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو " رودن نے کہا ۔

" نہیں تم یہاں غلطی کر رہے ہو ۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں ۔ اگر تم نے اس امیر جاگیردار کو ہی خوش کیا ہوتا تو وہ تمہارے قدموں پر دولت کے انبار لگا دیتا ۔ تم اسکول میں کیوں ناکام ہوئے ۔ اسلئے کہ تم نے اپنے مفادات کی قربانی دی "

" میں تو پیدا ہی اسلئے ہوا تھا کہ ایک پتھر کی طرح لڑھکتا رہوں اور ہمیشہ لڑھکتا رہوں گا "

" ٹھیک ہے ۔ لیکن یہ اس کیڑے کی وجہ سے نہیں ہے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا تھا ۔ تمہارے باطن میں صداقت کے لئے محبت کا دیا جل رہا ہے ۔ اور تمہارے اندر یہ دیا ہم لوگوں کے دیئے سے زیادہ روشن ہے ۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کیڑے کو کبھی کا خاموش کر چکا ہوتا اور ہر بات پر تیار ہو جاتا مگر تم نے اس سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ۔ میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ تم ایک نوجوان کی طرح پھر کسی تحریک کا آغاز کرنے والے ہو "

" نہیں میرے دوست میں بہت تھک چکا ہوں "

" تھک چکے ہو ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا مر گیا ہوتا ۔ تم سمجھتے ہو کہ موت سکون بخش ہوتی ہے ۔ مگر تمہارا کیا خیال ہے کیا حیات بھی سکون نہیں بخشتی ؟ جو شخص زندہ ہے اور اپنے ساتھیوں کی طرف روادار نہیں ہے وہ اپنے لئے بھی روادار نہیں ہوسکتا ۔ تم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے ہو ۔ تم اور کیا کرتے ؟ "

" میرے دوست ۔ تم تو ایک بالکل بدلے ہوئے انسان ہو " رودن نے سرد آہ بھر کے مداخلت کرتے ہوئے کہا ۔

" یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے چونکہ میں نے ایک دولت مند گھرانے میں جنم لیا تھا ۔ مگر غور سے دیکھو ۔ ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں ۔ ہم ایک سی زبان بولتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو فوراً سمجھ لیتے ہیں ۔ ہم ایک ہی ساگر میں لیکر بڑے ہوئے ہیں ہم میں سے اب رہ ہی کتنے گئے ہیں میرے دوست ۔ پہلے ہم ایک دوسرے سے اختلاف کرسکتے تھے لیکن اب کیونکر کرسکتے ہیں جبکہ نئی پود ہمارے سامنے سے گذر رہی ہے اور ہماری منزل پر پہنچنے کے لئے تلی ہوئی ہے ۔ ہمیں اب ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہیئے ۔ میرے دوست

اپنا ملک میں ہمسایہ اتحاد کے معاہدہ پر دستخط کریں۔"
دونوں دوستوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ وہ لوگ بے حد متاثر
ہوئے اور دونوں [illegible] اپنے وقت کا وہ گیت
[illegible]
"میں جانتا ہوں کہ اب تم گاؤں جا رہے ہو" لیزنف بولا۔
"تم پیرس نہیں ٹھہروگے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔
لیکن یہ بات تم یاد رکھنا کہ تم پر چاہے کچھ بھی کیوں نہ بیت جائے
تمہارے پاس ہمیشہ ایک جگہ ہے۔ ایک آشیانہ جہاں تم پناہ لے سکتے
ہو۔ میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں میرے دوست۔ خیالات بھی
دربدر ہوتے ہیں انہیں بھی گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔"
روداں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "شکریہ میرے دوست۔
شکریہ۔ میں اس بات کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ میں اگرچہ اس کے قابل
نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی غلط بسر کی ہے۔ میں نے اپنے خیالات
کی اس طرح خدمت نہیں کی جس طرح کہ مجھے کرنا چاہیئے تھی۔
"چپ رہو۔ قدرت نے جس طرح کسی انسان کو بنایا ہے وہ
اسی طرح رہتا ہے" لیزنف بولا۔ "اس سے کسی اور بات کا مطالبہ نہیں
کیا جا سکتا۔ تم اپنے آپ کو ایک آوارہ گرد یہودی کہتے ہو۔ لیکن
تمہیں کیا خبر ہے شاید تمہاری قسمت میں مسلسل آوارہ گردی لکھی ہے۔
شاید تم اسی طرح کوئی مقصد عظیم پورا کر رہے ہو جس کی تمہیں خبر نہیں۔
کیا تم جا رہے ہو" لیزنف نے پوچھا چونکہ روداں نے اپنی ٹوپی
اٹھالی تھی۔ "کیا تم رات یہاں بسر نہیں کروگے؟"
"نہیں میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ اور شکریہ۔ ہاں میرا
بہت برا انجام ہوگا۔"
"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیا تم واقعی جانا چاہتے ہو؟"
"ہاں خدا حافظ۔ مجھے ہمیشہ مہربانی سے یاد کرنا۔"
"بہت اچھا۔ تم بھی مجھے مہربانی سے یاد کیا کرنا۔ اور میں
نے جو بات کہی ہے اسے بھول نہ جانا۔ اچھا خدا حافظ۔"
دونوں دوست بغلگیر ہوئے اور روداں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا
چلا گیا۔ لیزنف دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر کھڑکی کے قریب جاکر
رک گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بڑبڑا رہا تھا: "بیچارا
(بیچارا)" پھر وہ میز کے گرد جا بیٹھا اور اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔
باہر ہوا چل رہی تھی اور چیخ رہی تھی اور اس کی کھڑکیوں کو کھڑکھڑا
رہی تھی۔ موسم خزاں کی طویل رات آپہنچی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش
قسمت ہیں جو اپنے گھروں کی چھت تلے بیٹھتے ہیں اور جن کے پاس ایک
گرم گوشہ ہوتا ہے۔ اور خدا بے گھر آوارہ گردوں پر اپنا رحم کرے

....

۲۶ر جون ۱۸۴۸ء کی ایک گرم دوپہر کو پیرس میں مزدوروں کی
بغاوت کو دبانے کی مہم آخری مرحلے میں تھی اس وقت ایک باقاعدہ
پیدل پلٹن فوبرگ سینٹ انطون کے شہر کی ایک گلی میں ایک مورچہ پر
حملہ کر رہی تھی۔ توپ کے گولوں نے اس مورچہ کو توڑ دیا تھا اور اس
مورچہ کے جتنے محافظ بچ رہے تھے وہ سب کے سب اپنی
جان بچانے کی سوچ رہے تھے۔ دفعتاً اس مورچہ کے عین اوپر ایک
ٹوٹی پھوٹی بس پر ایک دراز قد شخص نمودار ہوا۔ اس نے ایک پرانا
اور بوسیدہ کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے سر پر سرخ رنگ کی شکنوں والی
ٹوپی تھی اور اس ٹوپی میں سے اس کے سفید بالوں کی لٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں
اس کے ایک ہاتھ میں سرخ جھنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کند تلوار
تھی۔ وہ عجیب و غریب لہجہ اور چیختی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور
اپنے سر کے اوپر اس جھنڈے اور تلوار کو لہرا رہا تھا۔ شاہی حکومت
کے ایک فوجی نے نشانہ باندھا اور گولی داغ دی۔ وہ دراز قد شخص
جھنڈے کو پھینک کر ایک بوری کی طرح اوندھے منہ گر پڑا۔ جیسے وہ
اپنے آپ کو کسی کے قدموں پر گرا رہا ہو۔ گولی اس کے دل کو چیرتی ہوئی
نکل گئی تھی۔ ایک باغی نے بھاگتے ہوئے کہا "یہ ہمارا کمانڈر تھا۔"
"ہاں۔" دوسرے نے جواب دیا۔ اور پھر وہ دونوں ایک گھر کے
تہ خانے کی طرف بھاگ گئے جس کی کھڑکیاں بند تھیں اور اس مکان کی دیواریں
گولیوں اور توپ کے گولوں سے چھدی ہوئی تھیں۔
اور وہ کمانڈر دمتری روداں تھا۔

دنیا کے مشہور ترین ناول

میکسم گورکی کا شہرۂ آفاق ناول

ماں

یہ ناول اس دور سے متعلق ہے جب زار کے مظالم اور شخصی حکومت کے استبداد سے نالاں عوام نے ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادی تھی گورکی کا یہ ناول انقلابی قوتوں کی عظیم جدوجہد کی ہی داستان نہیں ہے بلکہ اس ناول میں گورکی نے اپنی ژرف نگاہی سے کام لیتے ہوئے انسانی زندگی کے تمام حقائق کو ان کی اصلی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کو قوتِ استحکام اور شعور کی پختگی عطا کرتا ہے۔ انسان دشمن طاقتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ گورکی کی فنی خصوصیات اس ناول میں اپنی معراج پر ہیں۔

اس ناول یعنی انقلابی صحیفے سے عوام کو مستفیض کرنے کے لئے اس کا سستا مگر جاذبِ نظر ایڈیشن بلاترمیم و اختصار شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت ۴۰۰ صفحے — قیمت چار روپے

روس کے عدیم المثال ناول نگار

نکولائی گوگول

کا

شجاعت اور حب الوطنی سے لبریز ناول

تاراس بلبا

سرزمین روس کا پہلا ناول

جس میں طبقاتی جنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ مٹھی بھر کسانوں نے اپنے ملک کو بیرونی حملہ آوروں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادی تو شخصی حکومت بھی اس بغاوت سے بوکھلا اٹھی۔ روسیوں کو روسی حکومت سے لوہا لینا پڑا۔ ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں لیکن ایک عظیم انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی۔

مترجمہ خلیق انجم — قیمت ۲/۸

نٹ ہمسن

نوبل پرائز یافتہ مصنف

کا

شاہکار ناول

بھوک

جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے۔
جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے۔
جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بناتا ہے
جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو کمربستہ کرتا ہے۔

مترجمہ
محمود جالندھری
قیمت
تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

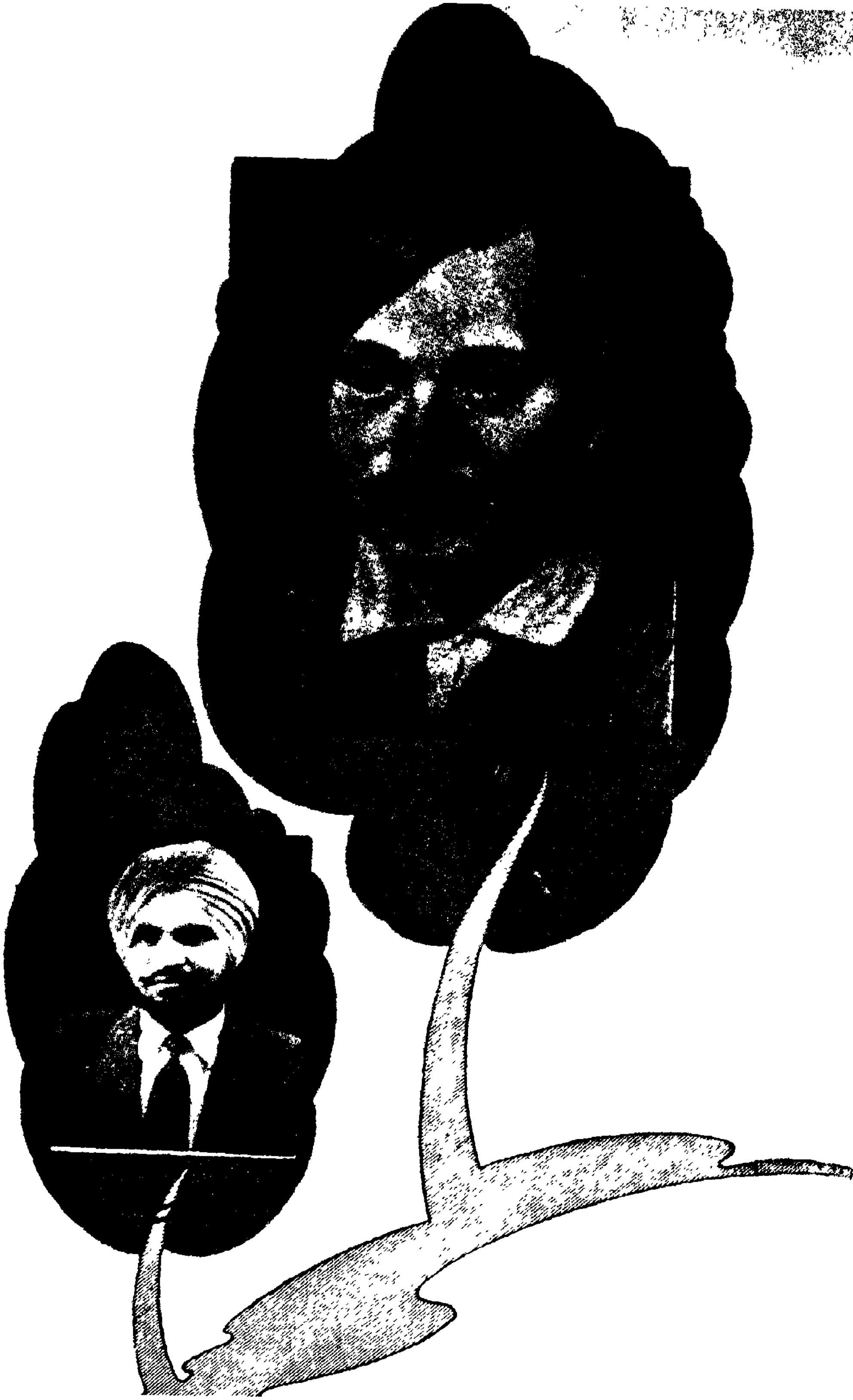
نکولائی گوگل

نکولائی گوگل پولٹاوا کے قریب سارو چینزی کے مقام پر ۳۱ مارچ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ گوگل نے اپنا بچپن وسطی یوکرین میں بسر کیا۔ وہ زمانہ یوکرین کا سنہری زمانہ تھا۔ اس کے والدین چھوٹے جاگیر دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ ایک اچھا اداکار تھا اور اس نے کچھ مزاحیہ ناٹک بھی لکھے تھے۔ گوگل کو یہ صفات اپنے باپ سے ورثہ میں ملیں۔ اپنے اسکول کے ایام میں گوگل بھی ایک اچھا اداکار تھا۔

گوگل کا قد چھوٹا تھا اور وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ گوگل اپنی ان کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس نے اپنی کمزوریوں کا بہتر حل ڈھونڈنے کے لئے مشاہدہ پہلوانی کا آغاز کیا اس نے طنز و مزاح کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ وہ افسانوں میں مضحکہ خیز باتوں کا خاص طور سے مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کی دو اہم تخلیقات "انسپکٹر جنرل" اور "مردہ روحیں" اسکے اس ذہنی جھکاؤ کا ثبوت ہیں۔

اس نے طنز و مزاح میں بڑا نام پیدا کیا اپنے فن میں پختگی حاصل کرنے سے پہلے اُسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لئے ہمیشہ اس انداز میں سوچتا تھا کہ اُسے دنیا میں عظیم کارنامے سرانجام دینا ہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے سینٹ پیٹرس برگ پہنچا۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ ایک شاندار زندگی کا آغاز کرے گا ــــــ مگر وہاں جاکر اُسے ایک کلرک بننا پڑا اور اس کی تمام تمناؤں پر اُوس پڑ گئی ــــ کلرکی سے مایوس ہو کر اُس نے اسٹیج پر اداکاری کو اپنا پیشہ بنانا چاہا۔ لیکن اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ یہاں بھی اُسے ایک تلخ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ــــ آخرکار سب طرف سے مایوس ہو کر اس نے ادب کے میدان کا رُخ کیا۔ اس کی کہانیاں بہت کامیاب ہوئیں۔ ان کہانیوں میں مزاح کی نہایت اچھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ نشتر زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ گوگل نے خود اپنے اس فن کی وضاحت کی ہے۔ اُس نے کہا ــ "میں بہت اداس رہتا تھا اور مجھے قہقہوں کی تلاش تھی ــــ میں یہ قہقہے اپنے افسانوں میں سمو دیا کرتا تھا۔"

سینٹ پیٹرس برگ میں نکولائی گوگل نے ایک نہایت اندوہناک زندگی بسر کی تھی۔ اس نے اپنے اس ناولٹ "نفیسکی پراسپیکٹ" میں سینٹ پیٹرس برگ سے انتقام لیا ہے۔ جن لوگوں نے اُسے رنج پہنچایا تھا اس نے اس ناولٹ میں اُن کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ مگر اتنا خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اُس نے حقیقت کو کہیں مسخ نہیں ہونے دیا۔ گوگل مضحکہ خیز کردار اور عجیب و غریب واقعات ایجاد کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور اس کا یہ ناولٹ اس کی جدت و اختراع کا منہ بولتا ثبوت ہے۔



نکولائی گوگل

مترجم: دلیپ سنگھ

دیارِ جاناں

سینٹ پیٹرس برگ میں بہر صورت بازار نیفسکی پراسپیکٹ کا کسی دوسرے بازار سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس شہر کے لئے یہ بازار ہر چیز پر حسن ہے۔

اس بازار کا حسن ہے ـــــ مجھے یقین ہے کہ اس شہر کی زردار کلرکوں کی آبادی میں سے ایک بھی شخص نیفسکی پراسپیکٹ کو کسی دوسری ارضی نعمت سے تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا ـــــ نہ صرف ۲۵ برس کی عمر کا نوجوان جس کی مونچھیں حسین ہوتی ہیں۔ اور جو کسی اچھے درزی کا حیرت انگیز حد تک سلا ہوا نفیس لمبا کوٹ پہنتا ہو۔ بلکہ وہ شخص بھی جس کی ٹھوڑی پر سفید بال اُگے ہوتے ہیں۔ اور جس کا سر چاندی کی طشتری کی طرح ہموار ہوتا ہے۔ بازار نیفسکی پراسپیکٹ کے بارے میں بہت جوش وخروش کا اظہار کرتا ہے ـــــ اور خواتین! اوہ ان خواتین کے لئے تو یہ بازار بہت بڑی مسرت ہے ـــــ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس بازار کے سلسلے میں مسرور کون نہیں ہے ـــــ

آپ ابھی اس بازار میں داخل ہی ہوتے ہیں۔ کہ آپ پاکیزہ چہل قدمی کی خوشبو سے دوچار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ضروری کام بھی ہوتا ہے تب بھی آپ اس بازار میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ غرض پسند نہیں ہیں۔ اور جہاں انھیں وہ ضرورت اور کاروباری مفاد نہیں لاتا جس نے سارے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے ـــــ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بازار نیفسکی پراسپیکٹ میں جس آدمی سے ملتے ہیں وہ مارسکایا، گوروخووایا، لِتے نایا اور میش چانسکایا کے بازاروں میں ملنے والے آدمی کی بہ نسبت کم انانیت پسند ہے۔ جہاں حرص وہوس، ذاتی مفاد اور ضرورت کے آثار ہر راہ گیر اور اُن لوگوں کے چہروں پر ثبت ہوتے ہیں۔ جو گاڑیوں اور ٹم ٹم میں بھاگے پھرتے ہیں۔ نیفسکی پراسپیکٹ ایک طرح سے سینٹ پیٹرس برگ کی چوپال ہے ـــــ وہ شخص جو سینٹ پیٹرس برگ میں یا وابورگ ضلع میں رہتا ہے اور اپنے دوستوں سے سینٹرز یا ماسکو دروازے پر ملنے کے لئے برسوں نہیں گیا ہوتا اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے احباب اس بازار میں ضرور مل جائیں گے۔ نیفسکی پراسپیکٹ میں جتنی صحیح اطلاع مل سکے گی، وہ نہ تو کوئی تیسری کی کتاب اور نہ کوئی ڈاک خانہ مہیا کر سکتا ہے ـــــ نیفسکی پراسپیکٹ قادرِ مطلق ہے ـــــ سینٹ پیٹرس برگ میں رہنے والا ایک غریب آدمی جب اس میں سیر کے لئے آتا ہے تو بے مثال جوش وخروش محسوس کرتا ہے۔ ـــــ اس کی پیٹڑیاں کتنی صاف ہیں۔

اوہ میرے خدا ـــ کتنے ہی قدموں کے ان پر نشانات موجود ہیں۔ ایک مُبکدوش فوجی کے بھونڈے اور گندے بوٹوں کے نشان جس کے بوجھ تلے چٹان بھی چیخ جاتی ہے ـــــ اور ایک عورت کے ننھے منے دھوئیں کی طرح ہلکے سلیپروں کے نشان، جو دوکانوں کی تابناک کھڑکیوں کی طرف یوں اپنی گردن موڑتی ہے جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف ـــــ ان پیٹڑیوں پر ایک علم بردار فوجی کی تلوار کا نشان بھی ہے۔ جس سے اُن پر خراش پڑ گئی ہے ـــــ ہر شخص ان پیٹڑیوں سے اپنی کمزوری اور اپنی طاقت سے انتقام لیتا ہے ـــــ یہاں ایک دن کے دوران کتنے ہی فریب نظر کے مظاہر جمع ہوتے ہیں ـــــ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہاں کتنی ہی تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔

ہم اپنی کہانی کا آغاز بہت سویرے سے کرتے ہیں جب تمام سینٹ پیٹرس برگ ایک تازہ پکائی ہوئی گرم روٹی کی طرح خوشبو چھوڑتا ہے۔

اور سب سے پیچھے اِن میں ملبوس بوڑھی عورتیں پاک باز اور رحم دل راہ گیروں سے بھیک مانگنے کی غرض سے دعا مانگ رہی ہیں۔

اس وقت نیوسکی پراسپیکٹ خالی ہوتا ہے۔ موٹے پیٹ والے دوکاندار اور اُن کے منشی بابو اس وقت سوئے ہوتے ہیں۔ اور یا پھر منہ ہاتھ دھو کر کافی پی رہے ہوتے ہیں۔ پیسٹری بنانے والوں کی دکان کے سامنے بھیک مانگنے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور جنھیں جو کل رات کلیٹ کے پیالے ہاتھوں میں تھامے مکھی کی طرح اُڑتا پھر رہا تھا۔ اب نیم خوابی کی حالت میں ہاتھ میں جھاڑو تھامے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے دوکان سے باہر نکلتا ہے اور باسی پیسٹریاں اور روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے اُن کی طرف پھینکتا ہے۔ سڑک کے کنارے آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنھیں مجبوراً وہاں آنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی روسی کسان جس کے بوٹ چونے میں اس قدر لتھڑے ہوئے ہیں۔ کہ انھیں کیتھرائن دی گریٹ کی نہر جو اپنی صفائی کے لئے مشہور ہے۔ بھی شاید صاف نہ کر سکے۔ کام پر جاتے ہوئے سڑک کو عبور کرتا ہے۔ ایسے وقت پر عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ روسی لوگ اپنے خیالات کا اظہار کچھ ایسے نامناسب الفاظ میں کرنا پسند کرتے ہیں کہ عورتیں انھیں تھیٹر میں ہی سننا پسند کرتی ہیں۔ کبھی کبھار کوئی کلرک اپنی بغل میں فائلوں کا پلندہ تھامے جاتے نظر آ جاتا ہے۔ اگر اُس کے دفتر کا راستہ اُس گلی کی طرف سے ہو۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے بارہ بجے تک نیوسکی پراسپیکٹ کسی کی منزلِ مقصود نہیں۔ بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آہستہ آہستہ اس میں ایسے لوگ آنے شروع ہوتے ہیں جنھیں اپنی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور جو اپنے خیالات میں گم ہم چلے جاتے ہیں۔ اور جنھیں اس گلی کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ روسی کسان اپنی ساتھ "گوش" چاندی کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ بوڑھے مرد اور عورتیں۔ اپنے ہاتھوں کو ہلا رہے ہوتے ہیں۔ اور بڑے نمایاں اشاروں کے ساتھ خود سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں لیکن کوئی نہ تو اُن کی بات سنتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھوں کی حرکت پر ہنستا ہے سوائے اُن شریر بچوں کے جو لکیر دار کپڑے کی بنی جھگیاں پہنے ہاتھ میں خالی برتن یا مرمت شدہ جوتے لئے اُس گلی میں بجلی کی سی پھرتی سے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوپہر کے وقت ہر قوم کے گورنس طلبا کے ہمراہ اس گلی پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی اُستاد اپنے شاگردوں کو اُنگلی لگائے مناسب سنجیدگی سے یہ بتاتے ہوئے گزرتے ہیں کہ یہ جو دوکانوں پر سائن بورڈ لگائے گئے ہیں۔ یہ اس لئے لگائے گئے ہیں کہ لوگ اِن ہی کو دیکھ کر بتا دیں کہ فلاں دوکان کے اندر کونسی چیز بکتی ہے۔ زرد رنگ کی مامائیں اپنے ساتھ شوخ و شنگ ننھی لڑکیوں کو یہ بتاتے ہوئے گزرتی ہیں کہ اپنے کندھوں کو تھوڑے اُبھار کر اکڑ کر چلنا چاہئے۔ مختصر یہ کہ نیوسکی پراسپیکٹ پر اس وقت مدرسانہ ماحول چھایا ہوتا ہے۔

دو بجے کے قریب یہ اُستاد مامائیں اور طلبا کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس گلی میں بچوں کے بھلے چنگے والدین اپنی شوخ و شنگ خاتون دوستوں کو ساتھ لئے اس گلی میں آ دھمکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان میں وہ تمام لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنے گھر کے ضروری معاملات میں مصروف تھے۔ اور ابھی ابھی اُن سے فارغ ہوئے ہیں۔ اُن کے ضروری معاملات کچھ اس قسم کے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کے ساتھ موسم کے متعلق بات چیت کی۔ اور اُس نامعلوم سی پھنسی کے بارے میں اُس کا مشورہ لیا، جو اُن کی ناک پر اُبھر آئی ہے۔ یا اپنے گھوڑوں اور بچوں کی خیر و عافیت دریافت کی یا اخبار میں تازہ واردانِ شہر اور شہر سے رخصت ہونے والوں کے نام کی فہرست پڑھی یا کسی تھیٹر کا اشتہار دیکھا۔ اور آخر میں کافی کا ایک پیالہ پیا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس گلی میں آ شامل ہوتے ہیں جنھیں خدا نے کلرک کے عزت دار رتبے سے سرفراز کیا ہے۔ پھر

میں وہ لوگ آ ملتے ہیں جو خاص آفس میں کام کرتے ہیں اور اپنے پیشے اور عادات کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ میرے سکرٹریٹ اور یہ ملازمتیں کتنی حیران کن ہوتی ہیں۔ یہ دل تو کس قدر خوشی پہنچاتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں ملازم نہیں ہوں اور اپنے افسرانِ بالا کی ہیک ہونے کا اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔ جو آپ کو نیوسکی پراسپیکٹ میں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ اپنے کوٹوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے نوجوان ہوں یا سُرخ سفید اور نیلی ساٹن کا لباس اور خوبصورت پینٹ پہنے والی عورتیں ہوں۔ یہاں آپ کو قسم قسم کی مونچھیں نظر آئیں گی۔ بھوری مونچھیں، ریشمی مونچھیں کوئلے کی طرح سیاہ مونچھیں — لیکن یہ سیاہ مونچھیں آپ کو محکمہ خارجہ کے کلرکوں کے چہروں پر نظر آئیں گی۔ خدا نے دوسرے دفتروں میں کام کرنے والوں کو یہ عطیہ نہیں بخشا۔ وہ چاہے کتنا ہی ناپسند کریں۔ انہیں مجبوراً سُرخ مونچھیں رکھنا پڑتی ہیں — آپ کو یہاں ایسی ایسی مونچھیں نظر آئیں گی جو نہ تو برش بنا سکتا ہے نہ قلم بیان کر سکتا ہے۔ ایسی ایسی مونچھیں جن پر زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا گیا ہے۔ انہماک و محبت سے جن کی حفاظت کی گئی ہے — مونچھیں جنہیں بہترین قسم کی خوشبوؤں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جنہیں رات کے وقت بہترین قسم کے کاغذ میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ مونچھیں — جن پر ان کے مالکوں نے محبت کے حسین ترین جذبات قربان کر دیئے ہیں۔ مونچھیں — جنہیں راہگیر حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس گلی میں آپ کو ہزاروں قسم کے زنانے کوٹ، پینٹ اور رومال نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور جو کم سے کم دو دن کے لئے اپنے مالک کے جسم سے جدا نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تتلیوں کا ایک بھاری گروہ پھولوں سے اُٹھ کر ایک بادل کی طرح مردوں کے کالے سروں پر منڈلا رہا ہو۔ یہاں آپ کو ایسی ایسی کمر نظر آئے گی جو آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ایسی ایسی پتلی کمر جو بوتل کی گردن سے زیادہ پتلی نہیں۔ جنہیں دیکھ کر آپ ادب سے ایک طرف ہو جائیں گے کہ کہیں آپ کی کہنی اُس سے چھو نہ جائے۔ آپ کے دل پر خوف سا چھا جائے گا کہ کہیں آپ کی کوئی گستاخ سانس قدرت اور فن کے اس عجوبہ کو ضرر نہ پہنچائے۔ اور پھر عورتوں کے کیسے کیسے آستین اس گلی میں نظر آئیں گے۔ اوہ صنعت کے کتنے حسین نمونے ہیں۔ بالکل دو غباروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگر ان عورتوں کو نہ تھامیں تو یہ ہوا میں اُڑ جائیں کیونکہ ایک عورت کو ہوا میں اُٹھا لینا اتنا ہی آسان ہے اور پُرلطف جتنا ایک شمپین کے گلاس کو ہونٹوں تک لے جانا۔ دنیا کے کسی کونے میں دو آدمی ایک دوسرے کو اس طرح جھک کر نہیں ملتے۔ جیسے اس گلی میں ملتے ہیں۔ یہاں پر آپ کو بے مثال مسکراہٹیں نظر آئیں گی۔ جن کو پیدا کرنے میں بڑی فنکاری سے کام لیا گیا ہے۔ کبھی ایسی مسکراہٹ جو آپ کو خوشی سے پاگل کر دے۔ اور کبھی ایسی کہ آپ شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ اور پھر کبھی ایسی کہ جسے دیکھ کر آپ اپنے کو کسی جہاز کے مستول سے بھی زیادہ بلند محسوس کریں۔ یہاں آپ کو ایسے آدمی ملیں گے جو موسم یا کسی کنسرٹ کا ذکر بھی کریں۔ تو آپ کو ان کے خاندان کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو ہزاروں قسم کی عادات و اخلاق کے لوگ ملیں گے۔ کیسے کیسے عجیب غریب آدمیوں سے اس گلی میں ملاقات ہوتی ہے یہاں کئی ایسے آدمی ہیں جو آپ سے ملتے ہیں تو عموماً آپ کے جوتوں پر نگاہ ڈال لیتے ہیں لیکن جب آپ گذر جاتے ہیں تو وہ پیچھے مُڑ کر آپ کے کوٹ کا دامن دیکھتے ہیں مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ شروع شروع تو مجھے خیال ہوا کہ یہ شاید موچی ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط تھا کیونکہ اُن میں سے اکثر دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گھوم پھر کر یا چائے خانوں میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے اپنا وقت گذارتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ عام طور پر شریف ہوتے ہیں۔

بعد از دوپہر اور دو بجے کے درمیان کے خوش نصیب وقت پر یہ گلی اپنی پوری تابانی پر ہوتی ہے۔ انسان کی بہترین تخلیق کی اس وقت یہاں نمائش ہوتی ہے کہیں تو آپ کو بہترین فراک کوٹ نظر آتا ہے۔ اور کہیں یونانی ناک کا بہترین نمونہ کہیں پر بہترین مونچھیں نظر آتی ہیں۔ کہیں پر کوئی عورت — دو خوبصورت آنکھیں اور ایک حیران کن چمکیلا ہیٹ اور پھر کوئی اور عورت جس کی نازک اور خوبصورت انگلی پر ہیرے کی طلسمی انگوٹھی نظر آتی ہے۔

جونہی تین بجتے ہیں۔ تو اس گلی میں گھومنے والوں میں ایک اور تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔ اس وقت اس گلی میں اچانک بہار آجاتی ہے۔ اس میں سبز لباس پہنے والے کلرک آ دھمکتے ہیں۔ اس وقت یہاں آپ کو کالجیٹ رجسٹرار اور پروونشل سکریٹری اس انداز سے ٹہلتے ہوئے نظر آئیں گے جس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے کہ

وہ کونسل چیمبر میں چھ گھنٹوں سے زیادہ نہیں بیٹھے لیکن بوڑھے کالجیت سکریٹری اور کونسلرز سر جھکائے تیزی سے چلتے ہیں۔ راہ گیروں کا نظارہ کرنے کی انھیں فرصت نہیں۔ وہ ابھی تک اپنے دفتر کے کام سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر پائے۔ اب بھی اُن کے دماغ میں دفتر کے کاغذات گھوم رہے ہیں۔ کافی دیر تک انھیں دوکانوں کے سائن بورڈز کی بجائے کاغذوں سے بھرے ہوئے بکسے اور چانسلر کے دفتر کے افسر اعلیٰ کا چہرہ دکھائی پڑتا ہے۔

چار بجے کے بعد نیوسکی پراسپکٹ خالی ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو یہاں پر ایک کلرک بھی نظر نہیں آئے گا۔ کوئی ایک دوکان میں نکل کر نیوسکی پراسپکٹ میں سے گذر جائے یا کوئی اجنبی جس کے لئے سارا وقت ایک سا ہے۔ یا کوئی لمبی اور پتلی انگریز عورت جس کے ہاتھ میں ایک مالا اور ایک کتاب ہے۔ ایک روسی مزدور ایک اوور کوٹ پہنے جس کی کمر اُس کی پشت پر آتی ہے۔ اور جس کی مختصر سی داڑھی ہے جس نے اپنی تمام زندگی تیزی سے چلتے ہوئے گذار دی ہے۔ اور جس کی ہر چیز ہلتی ہے۔ کمر، ہاتھ، ٹانگیں، سر جب وہ چلتا ہے تو اُس کا سب کچھ ہلتا ہے۔ یا کبھی کبھار کوئی مستری۔ اس وقت اس گلی میں آپ کو ان لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں ملے گا۔

لیکن جونہی مکانوں اور گلیوں پر شام کے دھندلکے چھا جاتے ہیں۔ اور چوکیدار اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹ کر لیمپ جلانے کے لئے نکل پڑتا ہے۔ اور دوکانوں کے شوکیسوں میں سے ایسی ایسی چیزیں جھانکتی ہیں جو دن کے وقت شکل دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتیں۔ تب نیوسکی پراسپکٹ پر پھر رونق آ جاتی ہے اور پھر وقت شروع ہو جاتا ہے جب لیمپ ہر شے کو حیران کن اور عجیب و غریب بنا دیتی ہے۔

اس وقت آپ بہت سے نوجوانوں سے دو چار ہوں گے جن میں سے اکثر کنوارے ہوتے ہیں اور گرم کوٹ اور چغے میں ملبوس ہوتے ہیں اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کا یہاں آنے کا کوئی مقصد ہو۔ یا مقصد سے ملتا جلتا کوئی جذبہ ہو یعنی آپ یہاں بغیر کوشش کے کھنچے چلے آئے ہیں۔ ہر ایک کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے ہوتے ہیں۔ دیواروں اور سیڑھیوں پر لمبے لمبے سائے ابھرتے ہیں جو "پولیس برج" سے بھی اونچے اُٹھ جاتے ہیں نوجوان کالجیت سکریٹری کچھ دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن بوڑھے کالجیت سکریٹری اور رجسٹرار عام طور پر اس وقت گھر پر بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ یا تو وہ شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اور یا پھر اُن کے جرمن باورچی جو اُن کے گھروں میں ہوتے ہیں بہت اچھا کھانا پکاتے ہیں۔ آپ اُن عزت مآب بزرگوں سے جو دو بجے کے قریب اِسی گلی میں ٹہل رہے تھے اور جن کی چہل قدمی سے اُن کی اہمیت اور برتری کا احساس ہوتا تھا، ملیں گے۔ لیکن اس وقت وہ بھی کالجیت سکریٹری اور کونسلر کی طرح تیزی سے چلتے ہوئے دکھائی دیں گے کیونکہ انھیں بھی اُس عورت کے ہیٹ کے نیچے جھانکنا ہے جس کے اُبھرے اُبھرے سرخ ہونٹ بہت پیارے لگتے ہیں۔ خاص طور پر بارمین، مزدور اور دکاندار، جو ہمیشہ جرمن اوور کوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اور بعض ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔

"ایک منٹ ٹھہرنا" لفٹیننٹ پیروگو نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ڈریس کوٹ میں ملبوس نوجوان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "دیکھا تم نے؟"

"ہاں بھئی دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔"

"تم کونسی کی بات کر رہے ہو؟"

"اُس کی، جس کے بال کالے ہیں" اوئی اللہ! کتنی پیاری آنکھیں ہیں۔ اور اُس کے چہرے کے نقوش کتنے پیارے ہیں۔"

"لیکن میں تو بھورے بالوں والی اُس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو اُس کے پیچھے گئی ہے، لیکن اگر تم کو وہ لڑکی اتنی پیاری لگی ہے تو اُس کا تعاقب کیوں نہیں کرتے"۔

"تعاقب! کیا بکتے ہو۔ کیا تم اُسے اُن عورتوں میں سے سمجھتے ہو جو شام کو نیوسکی پراسپکٹ میں گھومتی ہیں وہ تو ضرور کسی اونچے خاندان کی عورت ہے اُس کا تو اکیلا کوٹ ہی اسی روبل کا ہوگا"۔ اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف کہیں کا"۔ پیروگو نے زور سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جاؤ جاؤ" اُس کے پیچھے جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے اور میں بھورے بالوں والی لڑکی کا تعاقب کرتا ہوں"۔

دونوں دوست جدا ہو گئے۔

"ہم تمہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں" پیٹرو گو نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوئی حسینہ اسے پسند نہیں کر سکتی۔

ڈریس کوٹ میں ملبوس نوجوان شرماتا اور ڈرتا ہوا اس گلی میں داخل ہوا۔ جیسے جیسے وہ اس پراسرار گلی میں چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹوپی بھی تو لیمپ کی روشنی میں چمک اٹھتی اور کبھی تو بھر کے لئے سایوں میں ڈوب جاتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور انجانے میں اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ وہ اس حسینہ کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا وہ صرف وہ مکان دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ حور شمائل مکین تھی۔ وہ حسینہ جو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس گلی میں آسمان سے اتر آئی ہو اور پھر شاید کسی نامعلوم جگہ کو چلی جائے۔ وہ اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ وہ لگاتار کئی داڑھی دار بھوری مونچھوں والے آدمیوں کو پرے دھکیل رہا تھا۔

یہ نوجوان اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو ہمارے درمیان عجیب سا لگتا ہے۔ اور سینٹ پیٹرز برگ کے ساتھ اس کا وہی تعلق ہے جو خواب میں دیکھے ہوئے ایک چہرے کا حقیقی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی یہ مخصوص کلاس اس شہر میں خاص طور پر عجیب لگتی ہے۔ جہاں کا ہر ایک باشندہ یا تو کلرک ہے یا دکاندار اور یا پھر جرمن کاریگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ یہ عجیب سین ہے کیا؟ آرٹسٹ اور سینٹ پیٹرز برگ میں۔ برفیلی زمین آرٹسٹ۔ اس جگہ کا آرٹسٹ جہاں کی ہر چیز بھیگی بھیگی سی ہے۔ صاف چیتھڑے۔ بھوری اور دھندلی ہے۔ یہ آرٹسٹ اٹلی کے آرٹسٹوں سے مختلف ہیں۔ اٹلی کے آرٹسٹ اپنے ملک کی زمین اور آسمان کی طرح مغرور اور جوشیلے ہیں۔ یہاں کے آرٹسٹ عام طور پر نیک۔ شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے لوگ ہیں۔ اکثر آپ ایک دو دوستوں کے ساتھ کسی چھوٹے سے کمرے میں چائے پیتے ہوئے اپنے کسی پسندیدہ مضمون کے متعلق گفتگو کرتے سنتے ہیں۔ اور اس مضمون سے ہٹ کر کبھی کوئی بات نہیں کرتے۔

یہ آرٹسٹ اکثر کسی بڑھی فقیر عورت کو گھر لے آیا کرتا۔ اور اسے مجبور کرتا کہ وہ پورے چھ گھنٹے وہاں بیٹھی رہے۔ صرف اس لئے کہ وہ اس کے درد انگیز چہرے کو کینوس پر منتقل کر سکے۔ وہ اپنے کمرے کو پینٹ کرتا ہے جس میں ہر قسم کی غلاظت کا ڈھیر ہے جس کا اس کے پیشے کے ساتھ کوئی تعلق ہو سکتا ہے ــــ پلاسٹر آف پیرس ــــ جس کا رنگ وقت اور گرد کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے کافی سوچکا ہے ــــ ٹوٹے ہوئے فریم ــــ ٹوٹا ہوا ٹائلیں جو الماری پر پڑا رہتا۔ بجاتے ہوئے ایک دوست کی تصویر۔ رنگ سے آلودہ دیواریں۔ اور ایک کھلی کھڑکی جس میں سے نیوا کے زرد رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور اس کے رشتہ دار غریب مچھیرے اپنی سرخ قمیصوں میں کھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہمیشہ بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں ــ مشرقی علاقوں کا خاص نشان لیکن باوجود ان سب باتوں کے یہ آرٹسٹ بڑی محنت سے کام کرنے میں حقیقی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعی اچھے فنکار ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی وہ اٹلی کی تازہ ہواؤں میں سانس لے سکتے تو ان کا فن بھی شاید اسی آزادی اور بغیر رکاوٹ کے ترقی کرتا جیسے ایک پودا پھیلتا پھولتا ہے۔ جسے کمرے سے اٹھا کر باہر رکھ دیا جائے۔ عام طور پر وہ بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں کسی اچھے لباس میں ملبوس آدمی کو دیکھ کر وہ اکثر اپنی تصویروں کی قیمت کم کر دیتے ہیں۔ وہ فیشن ایبل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فیشن میں بھی گنوارپن کی جھلک نظر آتی ہے کبھی آپ کو یہ لوگ بڑے خوبصورت ڈریس کوٹ میں ملبوس لگتے ہیں لیکن اس کے اوپر ایک گندہ سا چغہ ہوگا۔ کبھی ایک قیمتی ٹائی اور اس پر رنگ آلود جیکٹ۔ یعنی اسی طرح آپ ان کو کسی نامکمل سینری پر ایک حسینہ کی تصویر دیکھیں گے جس کا سر نیچے ہوتا ہے۔ اور پاؤں اوپر۔ اور کسی اور مناسب جگہ کی ناموجودگی میں یہ تصویر کسی اور نامکمل سینری کا پر لٹکا دی جائے گی۔

یہ آرٹسٹ کبھی آپ سے آنکھ نہیں ملائیں گے۔ اور اگر کبھی مل جائے تو شرما کر پرے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے

دیکھتے ہیں نہ تو عقاب کی سی تیزی ہوتی ہے نہ باز کی سی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کے نقش و نگار دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے کسی ہرکولیس کے نقش و نگار بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جو اُن کے کمرے میں پڑا ہوتا ہے۔ یا وہ اپنی وہ تصویر دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ابھی انھوں نے بنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کی باتوں کا جواب اکثر ٹوٹے پھوٹے اور نامناسب الفاظ میں دیتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں مضامین کی آمیختگی انھیں اور شرمیلا بنا دیتی ہے۔

اور اس کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نوجوان جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر رہے تھے۔ آرٹسٹ پکاریو ــــ شرمیلا۔ گوشہ نشیں۔ لیکن اُس کی روح میں احساسات کے ایسے ذرے روشن تھے جو موقع ملنے پر شعلوں کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ وہ بے پاؤں اپنی خواہشات کے مرکز کے پیچھے جس نے اُسے اس قدر مسحور کیا تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس بدسلوکی پر خود حیران تھا۔ اس اثنا میں اس اجنبی نے جس پر اُس کی آنکھیں اُس کے خیالات اُس کے احساسات مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دم مڑ کر دیکھا اللہ! اللہ! کتنے حسین نقش تھے اُس کے۔ ایک نہایت ہی حسین ماتھے کی چند حیا دینے والی سفید رنگت خوبصورت بالوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اُس کی حسین زلفیں ہیٹ سے نکل کر اُس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ رخسار جن میں، سے شام کی ٹھنڈی ہواؤں کی تازگی جھلک رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے اردگرد حسین خوابوں کا سلسلہ چھایا ہوا تھا ــــ اُس نے پکاریو کو پلٹ کر دیکھا پکاریو کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے اُسے بے حسی سے دیکھا۔ اِس قسم کے بیہودہ تعاقب کی وجہ سے اُس کے چہرے پر حقارت کے جذبات ابھر آئے تھے لیکن غصے نے اُس کے چہرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ شرم اور کمزوری کے غلبے کی وجہ سے وہ نظریں جھکا کر رُک گیا۔ لیکن اُس مندر کا پتہ لگائے بغیر جہاں وہ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کوئی کیسے اُس پری وش سے سبکدوش ہو جائے۔ اُس نوجوان کے دماغ میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے اور اُس نے تعاقب جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے اس ارادے کو چھپانے کی خاطر وہ کافی فاصلے پر چل رہا تھا۔ یوں ہی اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔ ظاہراً دوکانوں کے بورڈوں پر نگاہ ڈالے جا رہا تھا۔ لیکن اُس حسین عورت کے ایک قدم سے بھی غافل نہیں تھا۔ راہ گیر کم ہوتے گئے۔ گلی میں خاموشی چھا رہی تھی۔ اُس عورت نے مڑ کر دیکھا اور اُس نوجوان کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ کانپ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

نہیں! اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ضرور لیمپ کی روشنی کا بھرم ہے۔

نہیں! یہ ضرور اُس کے اپنے خوابوں کا عکس ہے۔ اُس کا سانس سینے میں گھٹا جا رہا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اُس کے احساسات جل رہے تھے۔ اور اُس کی نظروں کے سامنے ہر چیز دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہو اور گاڑیاں تیز گھوڑوں کے باوجود ساکن کھڑی ہیں۔ پُل پہلے سے بلند ہو گیا اور پھر ٹوٹ گیا۔ سامنے والا مکان اُلٹا کھڑا ہے۔ ایک جھونپڑی گرتی نظر آئی۔ ایک بورڈ کے سنہری الفاظ اُسے اپنی بھوؤں پر جھکتے نظر آئے ـــ یہ تمام تصورات ایک حسین چہرے کی فقط ایک جنبش کا نتیجہ تھے۔ بغیر کچھ سُنے دیکھے یا سمجھے وہ اُن حسین قدموں کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے پاؤں اس کے دل کی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی تو وہ اُس حسینہ کے اشارے کے متعلق شک میں مبتلا ہو جاتا۔ اس پر وہ ایک لمحے کے لئے رُک جاتا لیکن اُس کے دل کی دھڑکن اور ایک غیبی طاقت اُسے مجبور کرتی کہ وہ آگے بڑھے اچانک اُس کے سامنے ایک چار منزلہ مکان نمودار ہوا جس کی کھڑکیوں کی چار قطاروں میں سے روشنی چھن چھن کر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے اُس حسینہ کو اُس مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر واپس مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ وہ ہونٹوں پر انگلی رکھے اُسے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں ڈگمگائے۔ اُس کے احساسات اور خیالات جل اُٹھے۔ خوشی کا شعلہ تیزی سے

اُس نے دل کو چیر کر نکل گیا۔

نہیں یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میرے اللہ! ایک لمحہ میں اس قدر مسرت۔ ایک پل میں اتنی حسین زندگی۔

لیکن یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیا وہ حسینہ جس کے ایک اشارے پر وہ اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھا جس کے در پر پہنچا ایک ناقابلِ بیان مسرت تھی ـــــ کیا وہ اب اُس کی طرف اس قدر مہربان ہو سکتی ہے ـــــ وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اُس کے دماغ میں کوئی دنیاوی خیالات نہ تھے۔ نہ ہی اس کے دل میں دنیاوی جذبات کی گرمی تھی۔ وہ اُس لمحے ایک کنواری لڑکی کی طرح پاک و پوتر تھا جس کے دل میں محبت کا ایک ناقابلِ بیان روحانی تصور ہوا اور بس۔ ایک ایسی چیز جو ایک عام انسان میں گھٹے قسم کے جذبات بیدار کر دیتی۔ بِکاریو کے جذبہ انسانیت کو ابھارنے کا باعث ثابت ہوئی۔

اُس نازک اندام حسینہ نے جو اعتقاد اُس پر رکھا وہ اُس کے لئے بالکل ویسے ہی تھا جیسے ایک بہادر آدمی کا ارادہ یا ایک غلام کی غلامی۔ اُس کی صرف ایک خواہش تھی وہ یہ کہ وہ حسینہ اُسے مشکل سے مشکل حکم دے تاکہ اُس کو سرانجام دینے میں اُسے اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑے۔ اُسے یقین تھا کہ کسی غیبی طاقت نے اُس حسینہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اُس پر اعتقاد رکھے۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اہم خدمت کے لئے تیار کیا جائے گا۔ اور وہ اُس قوت ارادی اور طاقت کو اپنے اندر پہلے سے ہی محسوس کر رہا تھا۔ جو اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے درکار تھی۔

سیڑھیاں آگے جا کر مڑ گئیں اور ان کے ساتھ اُس کے خیالات کا دھارا بھی "دیکھنا! دھیان سے چڑھنا" بنسی کی لے کی طرح کی ایک آواز نے اُس کے دل میں ایک نیا جوش بھر دیا۔ چوتھے چھت کے گہرے اندھیرے میں اُس اجنبی نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ایک حسین سی عورت ہاتھ میں موم بتی لئے انھیں ملی۔ اُس نے بِکاریو کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اُس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے کے مختلف کونوں میں اُسے تین عورتیں دکھائی دیں۔ ایک تاش کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دوسری دو انگلیوں سے پیانو پر ایک پرانے گیت کی دھن بجا رہی تھی۔ تیسری ایک آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اور ایک اجنبی کی آمد سے اُس نے بار سنگھار میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ہر ایک چیز سے ایک نالپسندیدہ بے ترتیبی کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے عام طور پر ایک کنوارے آدمی کے کمرے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ فرنیچر پر جو کہ خاصہ اچھا تھا۔ گرد کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی۔ انگیٹھی پر جگہ جگہ مکڑی کا جالا بنا ہوا تھا۔ ایک اور کمرہ جس کا دروازہ اس کمرے میں کھلتا تھا۔ اس میں سے ایک انگیٹھی اور صوفے کے علاوہ ایک سرخ لباس نظر آرہا تھا۔ ایک مرد اور عورت کے ملے جلے قہقہوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

یاخدا! وہ کہاں آگیا ـــ پہلے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اُس نے کمرے کے سامان کو زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن آرائش سے مبرا دیواریں اور بے پردہ کھڑکیاں اس بات کی شاہد تھیں۔ کہ یہاں کوئی گھریلو قسم کی عورت نہیں رہتی۔ ان قابلِ رحم مرجھائے ہوئے چہروں میں سے ایک اُس کے بالکل قریب تھا۔ اور اسے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے بِکاریو کسی اور کے لباس پر ایک دھبہ ہو۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک ایسے غلیظ ماحول میں آگیا ہے جہاں قابلِ رحم گراوٹ مکین ہے۔ گراوٹ جو ایک ایسے نظام کی پیداوار ہے۔ جہاں ایک طرف تو دولت کے انبار ہیں اور دوسری طرف بھوک اور افلاس ـــــ ایسے ماحول میں جہاں انسان نے ہر پاک اور پوتر احساس کا گلا گھونٹ کے رکھ دیا ہے۔ جہاں عورت جو دنیا کا حسن اور تخلیق کا راز ہے۔ ایک بے حقیقت سی چیز بن کے رہ گئی ہے۔ اُس سے اس کی روح کی پاکیزگی اور عورتیت چھن گئی ہے۔ اور نزاکت اور حسن جو عورت کا خاص سرمایہ ہے چھن کر اُس میں مرد کے سے انداز اور دلیری آگئی ہے۔ بِکاریو نے اُس عورت کو

سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کہ آیا یہ وہی عورت ہے جس نے اس پر اس قدر جادو کر دیا تھا کہ وہ اُس کے پیچھے یہاں تک کھنچا چلا آیا ہے۔۔۔ وہ اپنے حسن کی تمام رنگینوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے بال ویسے ہی خوبصورت تھے۔ اُس کی آنکھوں میں وہی سحر انگیزی تھی۔ اُس کے چہرے کی تازگی بھی ویسی ہی تھی۔ اُس کی عمر صرف سترہ برس کی ہوگی۔ ابھی تک پیکار یو میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ وہ اُس کے تازہ اور گلابی رخساروں کو چھو سکے۔ وہ بہت حسین تھی۔

وہ اُس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اپنے آپ میں کھو جانے کے لئے ویسے ہی تیار تھا۔ جیسے وہ پہلے اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ لیکن وہ حسین لڑکی اس لمبی خاموشی سے تنگ آ گئی۔ اور پیکار یو کی نگاہوں میں جھانکتی ہوئی معنی خیز طور پر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک دردناک بیہودگی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر اتنی عجیب لگ رہی تھی جتنا کسی جلاد کے دل میں رحم اور کسی شاعر کے ہاتھ میں ہی کھاتہ۔ وہ کانپ سا گیا۔ اُس نے اپنے حسین ہونٹوں کو جنبش دی اور کچھ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ سب فضول اور بیہودہ تھا۔۔۔ جیسے پاکیزگی کے چھن جانے سے عقل بھی چھن گئی ہو۔ وہ اب کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ پیکار یو میں ایک بچے کی سی سادگی تھی۔ اس قسم کا موقع کسی بھی اور شخص کے لئے مسرت کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گلی میں اُتر آیا۔

سر جھکائے اور اپنے بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑے وہ اپنے کمرے میں ایک ایسے دکھی انسان کی طرح بیٹھا تھا جو ایک نایاب ہیرا پا کر اسے سمندر میں گرا دے۔ "اتنی حسین عورت! اتنے پیارے نقش و نگار! اور کہاں پڑی ہے؟" وہ صرف یہی الفاظ کہہ سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم اس قدر رحم دل کبھی نہیں ہوئے جتنا ہم ایک حسین چہرے کو غلاظت کے گڑھے میں گرا دیکھ کر ہوتے ہیں۔ بدصورتی اور غلاظت کو ایک جگہ دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن حسن۔۔۔ حسن کی اور بات ہے۔ حسن کا تعلق ہمارے خیالات میں پاک و صاف چیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ حسین لڑکی جس نے پیکار یو کو مسحور کر دیا تھا۔ واقعی حسن نسوانیت کا ایک حسین نمونہ تھی۔ اُس غلاظت کے گڑھے میں اُس کی موجودگی کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہی تھی۔۔۔ اُس کے چہرے کے نقوش اس قدر متناسب تھے۔ اُس کے چہرے سے اس قدر برتری ٹپکتی تھی کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ گراوٹ نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

وہ ایک نایاب ہیرا ہو سکتی تھی۔ ایک بے پناہ محبت کرنے والے خاوند کی جنت ہو سکتی تھی۔ وہ ایک خاندان کا چشم و چراغ ہو سکتی تھی۔ اُس کے حسین لبوں کی جنبش حکم صادر کر سکتی تھی۔ رقص و سرود کی محفلوں کی وہ شہزادی ہو سکتی تھی۔ جہاں موم بتی کی روشنی میں ہزاروں عشاق اپنے دلوں کے نذرانے اُس کے قدموں پر پیش کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن افسوس کسی شیطانی قوت کے زیر اثر وہ زندگی کی قدروں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس غلاظت کے کنوئیں میں دھکیل دی گئی تھی۔

دکھ اور رحم کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا وہ موم بتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ آدھی رات کب کی گذر چکی تھی۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی سے جب آدھی بجنے کی آواز آئی تو وہ نیند سے بیدار گم سم پڑا تھا۔ نیند کی دیوی آہستہ آہستہ اُسے اپنی گود میں لے رہی تھی۔ کمرے کے در و دیوار اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیال میں گم تھا۔ اُسے صرف موم بتی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کانپ سا گیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک بڑے قیمتی لباس میں ایک کوچوان اندر داخل ہوا۔ آج تک اس کمرے میں کبھی اتنے حسین لباس میں ملبوس کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ اور پھر اتنی رات گئے اُسکی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوچوان کو اُس نے بڑے بے صبر تجسس سے دیکھا۔ کوچوان جھک کر آداب بجا لایا اور کہا "میری مالکہ جس سے آپ چند گھنٹے ہوئے مل کر آئے ہیں آپ کو بلا رہی ہے۔ میرے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا فرمایئے۔ گاڑی نیچے کھڑی ہے"

پیکار یو حیرت میں گم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی! حسین لباس

یہ بلوری کی چوان بھی منہ بگاڑ رہا ہے۔

"شوروست لاؤ" اُس نے جھنجھلاہٹ میں کوچوان سے کہا۔ "تم غلطا غلط جگہ پر آگئے ہو۔ تمہاری مالکن نے تمہیں کسی اور کے پاس جانے کو کہا ہے۔"

"نہیں حضور۔ مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔ کیا آپ ہی تو نہیں ہیں جو میری مالکن کو کلب کے ایک مکان کی چوتھی چھت پر چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"ہاں۔ میں ہی تھا۔"

"حضور پھر جلدی کیجئے۔ میری مالکن ابھی اس وقت آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اور ان کا حکم ہے کہ میں ابھی آپ کو لے کر آؤں۔"

پیکاریو نیچے اترا۔ ایک گاڑی وہاں صحن میں کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوا۔ گاڑی کے پہیے اور گھوڑوں کے سم پتھریلی سڑک پر بلند آواز پیدا کرنے لگے۔ گاڑی چلتے ہوئے سائن بورڈ اور مکانوں کو پیچھے چھوڑتے بھاگی جا رہی تھی۔

پیکاریو راستہ بھر سوچتا گیا۔ لیکن وہ فیصلہ نہ کر پایا کہ یہ سب کیا ہے۔ ایک پرائیویٹ مکان۔ گاڑی۔ باوردی کوچوان۔ یہ تمام چیزیں چوتھی منزل کے اس مکان کے ساتھ جس کی کھڑکیوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ جہاں ایک بے سُرا پیانو بج رہا تھا۔ نامناسب معلوم ہوتی تھیں۔

گاڑی ایک روشن برآمدے میں رُکی۔ پیکاریو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار کو چوانوں کی گپ شپ۔ روشن کھڑکیوں اور موسیقی کی سروں نے اُسے حیران کر دیا۔ ایک خوبصورت باوردی کوچوان نے اُسے گاڑی سے اتارا۔ اور اُسے کمرے میں لے گیا۔ جس کے ستون سنگِ مرمر کے تھے جس کے باہر سنہری لباس میں ملبوس چوکیدار کھڑے تھے۔ جہاں خوبصورت فرکوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ اور جہاں کئی لیمپ روشن تھے۔

سامنے ایک شاندار زینہ تھا۔ جہاں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لوگوں کی بے پناہ بھیڑ سے گھبرایا ہوا وہ پہلے کمرے میں داخل ہوا۔

لوگوں کے اس قدر ہجوم نے اُسے مکمل طور پر گھبرا دیا۔ اُسے ایسا لگا۔ جیسے شیطان نے دنیا کو کئی حصوں میں موڑ کر پھر انہیں بغیر کسی ترتیب کے رکھ دیا ہو۔ عورتوں کے چمکتے ہوئے کندھے مردوں کے کالے ڈریس سوٹ۔ قمقموں کی روشنی، رنگ برنگے پردے اور ایک بڑا بینڈ بجانے والوں کا گروہ۔ ہر چیز اُسے حسین لگ رہی تھی۔

اُسے ایک ہی نظر میں کئی با عزت بوڑھے ادھیڑ عمر دو بچے ہوئے لباس پہنے، عورتوں کی ایک خاصی بڑی تعداد، نزاکت سے چلتی ہوئی یا کرسیوں پر جلوہ نشین دکھائی دی۔ کئی انگریزی اور فرانسیسی زبان کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔

علاوہ ازیں، کالے ڈریس سوٹ میں ملبوس نوجوان اس قدر خوبصورت تھے۔ ان کی گفتگو یا خاموشی۔ اس قدر بارعب تھی۔ فضول باتوں سے پرہیز کرنے کی عادتیں اس قدر تمیز تھی۔ وہ ایسی بلند آواز میں لطیفے کہہ رہے تھے۔ ان کے مسکرانے کا انداز، اُن کی مونچھوں کا رعب اور اپنی نکٹائی کو درست کرتے وقت اپنے حسین ہاتھوں کی نمائش کرنے کا سلیقہ، عورتوں کی خود پسندی اور مسرت اور نگاہیں جھکانے کا انداز اس قدر دلفریب تھا کہ...

لیکن یہ ستون کے ساتھ لگے ہوئے پیکاریو کی نگاہیں صاف گویا تھیں۔ کہ وہ اپنی شدھ بدھ سے غافل تھا۔

اُس وقت بہت سے لوگ ناچنے والوں کے گروہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ چکر لگا رہے تھے۔ پیرس میں بنے ہوئے بہت ہی باریک لباس میں ملبوس — لباس جو کہ ہوائی دھاگوں سے بنا ہوا تھا۔ اُن کے ننھے ننھے پاؤں فرش کو نفرت سے دیکھ رہے تھے اور زمین سے اٹھ کر وہ کہیں زیادہ نورانی لگ رہے تھے۔

ان چہروں میں ایک بہت زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ سب سے حسین تھا۔ اس کا لباس خوبصورت ترین تھا۔ اس کے بناؤ سنگھار میں ایک حسین سلیقے کا احساس ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی عیاں تھی کہ وہ اس بناؤ سنگھار سے خود بھی بے بہرہ ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ ہو گیا ہے۔

وہ نمائش بینوں کے اس گروہ کو بیک وقت دیکھ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔ اس کی خوبصورت پلکیں بغیر کسی مقصد کے اٹھتیں اور اُس کی چندھیا دینے والی حسین گردن پر دیکھنے والے کی نگاہ کا حدِ مرکز تھی۔ اس اثنا میں اُس نے جب

ایک طرف سر گھمایا تو اُس کے ماتھے پر ایک ہلکا سا سایہ اُبھرا۔

پکاریو نے اپنی تمام کوششوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تاکہ اُسے دیکھ سکے۔ لیکن کسی کا بڑا سر اور لمبے سیاہ بال اُس کی آنکھوں کے لئے سدِ راہ بن گئے، اور پھر بھیڑ میں وہ اس قدر پھنسا ہوا تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ اس کشمکش میں کسی پروی کونسلر کو نہ دھکیل بیٹھے۔ آخر کار کسی طرح سے وہ آگے بڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اچانک اُس کی نظر اپنے لباس پر پڑی جس میں سجاوٹ کی بہت کمی تھی۔ میرے اللہ! یہ کیا! وہ ایک کوٹ پہنے تھا جس پر رنگ کے چھینٹے تھے۔ پہنچنے کی جلدی میں وہ لباس تبدیل کرنا بھول گیا تھا۔ شرمندگی کی سُرخی اُس کے کانوں تک پھیل گئی۔ اُس کا سر جھک گیا۔ وہ زمین میں دھنس جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ نوجوان امیرزادے زرق برق لباس پہنے ایک دیوار کی شکل میں اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُس نے چاہا کہ وہ اُس حسین ماتھے اور سیاہ پلکوں والی حسینہ سے زیادہ دور کھڑا ہو۔ اُس نے ڈرتے ہوئے آنکھیں کھولیں کہ کہیں وہ اُسے دیکھ تو نہیں رہی۔ ارے! وہ تو بالکل اُس کے سامنے کھڑی تھی لیکن یہ کیا؟ "یہ تو وہی ہے" وہ چلا اٹھا۔ یہ واقعی وہی لڑکی ہے۔ جو اُسے "نادسکی پرسپیکٹ" میں ملی تھی اور جس کے پیچھے وہ اُس کے گھر تک گیا تھا۔

اس اثنا میں اُس نے اپنی پلکیں اُٹھائیں اور سارے ہال پر نگاہ ڈالی۔ "ہائے کتنی حسین ہے"۔ پکاریو اُکھڑی ہوئی سانس میں بس یہی کہہ سکا۔ پھر اُس نے نگاہ جو پھیری۔ تو اُس کی آنکھیں پکاریو کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

"ہائے یہ حُسنِ دلفریب، یہ جنت۔ میرے خدا مجھے طاقت دے کہ میں اِس حُسن کی تاب لاسکوں میری زندگی اِس حُسن کی تاب نہیں لاسکتی۔ یہ تو میری روح کو اُڑا کر لے جائے گی۔ اُس نے اشارہ کیا۔ ہاتھ سے نہیں۔ نہ ہی سر سے بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اس طرح اشارہ کیا۔ کہ پکاریو کے علاوہ کوئی اور نہ دیکھ سکا۔ رقص جاری رہا۔

تھکی تھکی موسیقی کبھی تو بند ہوتی نظر آتی۔ لیکن پھر سے تیز ہوجاتی۔ آخرش رقص ختم ہوا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ باریک لباس میں اُس کے سینے کا اُتار چڑھاؤ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ (ہائے کتنے خوبصورت ہاتھ تھے) اُس کے گھٹنوں پر آپڑے اس وجہ سے اُس کا حسین لباس سمٹ گیا لباس میں سے ایک طرح کی موسیقی پیدا ہوئی۔ لباس کے رنگ کے تضاد سے اُس کے ہاتھوں کی سفیدی اور بھی نمایاں ہوگئی۔ پکاریو کو اُس کے ہاتھوں سے چھو جانے کی تمنا تھی اور بس۔ اُسے کوئی اور خواہش نہ تھی۔ کیونکہ باقی تمام خواہشیں بیہودہ ہیں۔ وہ اُس کی کرسی کے پیچھے زبان بند کئے اور سانس روکے کھڑا تھا۔ "تم بور ہو گئے تھے۔ میں خود بور ہوگئی تھی وہ کہنے لگی۔ "میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو" اُس نے اپنی پلکیں جھکا کر کہا۔

"تم سے نفرت اور مجھے" پکاریو جو مکمل طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا کہنا چاہتا تھا۔ اور شاید ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور بھی بہت کچھ کہہ جاتا۔ لیکن عین اس وقت ایک رئیس جو کہ ایک بڑا خوبصورت ہیٹ پہنے تھا۔ وہاں آگیا۔ اس نے کوئی دلچسپ بات کہی۔ اور اُس کے ساتھ اپنے خوبصورت دانتوں کی نمائش کی۔ لوگوں نے اُس کی بات پر خوب زور کے قہقہے لگائے۔ اس پر اُس نے اور لطیفے کہنے شروع کئے۔ ہر لطیفے کے ساتھ پکاریو کے دل پر چھُری سی چل جاتی۔ آخرش خوش قسمتی سے کسی نے اُس رئیس کی توجہ ایک سوال کے سلسلے میں اپنی طرف مبذول کرلی۔

کتنا ناقابلِ برداشت ہے یہ سب کچھ" وہ نگاہیں اُٹھا کر بولی۔ "میں بال روم کے دوسرے کونے پر بیٹھی ہوں۔ وہاں آجاؤ" یہ کہہ کر وہ بھیڑ کو چیر کر غائب ہوگئی۔ وہ بھی کسی بادل کی طرح لوگوں کو دھکیلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"کیا یہ وہی ہے"۔ وہ ایک ملکہ کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ تمام حسیناؤں کی ملکہ اس کی آنکھیں پکاریو کی متلاشی تھیں۔

تم آگئے وہ دھیرے سے بولی میں تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری آج کی ملاقات تمھیں شاید کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ کیا تم یقین کرسکتے ہو کہ میں اُس قابلِ نفرت فرقے سے تعلق رکھ سکتی ہوں۔ جہاں تم نے مجھے دیکھا تھا۔ میری حرکات تمھیں بُری لگیں گی۔ میں تمھیں راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ کیا تم، میرے راز کو راز رکھ سکو گے؟" "ضرور ضرور"

اسی وقت ایک بوڑھا سا شخص کہیں سے آ دھمکا۔ اُس نے جو اُس زبان میں تھا جس میں اُس حسینہ سے کچھ کہا جو بیچارے کی سمجھ سے باہر تھا۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا جو اُس حسینہ نے تھاما اور بیچارے کی طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اشارہ کیا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے۔ وہ وہیں رہے لیکن بے صبری کی وجہ سے وہ حکم ماننے سے قاصر تھا۔ چاہے وہ حکم اس حسینہ کے ہونٹوں سے ہی کیوں نہ نکلا ہو۔ وہ اُس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن بھیڑ نے انھیں الگ کر دیا۔ وہ کہیں زیادہ اب اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگا جا رہا تھا۔ اور راہ روکنے والوں کو بڑی بے رحمی سے دھکیل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی — راہ ملنا مشکل تھی۔ کیونکہ تمام کمرے لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں بہت سے بزرگ فوجی اور غیر فوجی پیشوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک اور کونے میں نوجوانوں کا ایک گروہ ایک محنت کش شاعر کی مشکلات کا ذکر کر رہے تھے۔ بیچارے کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بزرگ نے اُس کو کوٹ کے بٹن سے پکڑ کر مخاطب کیا ہو۔ لیکن اس نے اُسے بھی دھکیل دیا۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ اس آدمی کے گلے کا ہار اُس کی اہمیت کا ثبوت تھا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو بھاگا ....

وہ وہاں نہ تھی تیسرے کمرے میں گیا۔ وہ یہاں بھی نہ تھی .... آخر گئی کہاں۔ "اُس کو مجھے دیدو۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ..... میں اُس کے راز کو جاننا چاہتا ہوں۔" وہ چیخ اٹھا۔

لیکن اُس کی جستجو فضول ثابت ہوئی۔ فکر اور تھکاوٹ کے عالم میں وہ ایک ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں اب بھی بھیڑ میں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُس کو ہر ایک چیز ڈولتی ڈولتی نظر آ رہی تھی ....

آخرکار اپنے کمرے کی دیواریں اُسے صاف طور پر دکھائی دیں۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں۔ سامنے موم بتی جل رہی تھی۔ شعلہ دم توڑ رہا تھا۔ موم بتی تقریباً پگھل گئی تھی۔ اور پگھلی ہوئی موم اس کی میز پر پھیلی ہوئی تھی۔

اوہ! تو وہ سو رہا تھا بستر پر۔ اللہ یہ سب خواب تھا۔ وہ کیوں بیدار ہوا۔ وہ کیوں نہ سویا رہا۔ شاید وہ پھر مل جاتی۔ ایک مایوس کن صبح ہم اور غم دکھی ہے اس کی کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ اس کے کمرے پر بے ترتیبی چھائی ہوئی تھی۔ وہ حقیقت کس قدر تلخ ہوتی ہے۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے اتارے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تاکہ دوبارہ خواب کی کڑیاں جوڑ سکے۔ تاکہ وہ دوبارہ اُسے اپنی آغوش میں لے لے اور وہی نظارے دکھائے جن میں وہ نظارے نہیں تھا جن کو دیکھنے کی اُسے تمنا تھی — اُس کے خوابوں میں کبھی لیفٹیننٹ میدان کارزار اپنے بازو کے ساتھ پھرتا۔ کبھی اکیڈمی کا قلی۔ کبھی کوئی کونسلر اور کبھی فن لینڈ کی وہ عورت جس کی کبھی اُس نے تصویر بنائی تھی۔ یا پھر اس قسم کی کوئی اور بکواس۔

وہ دوپہر تک نیند کی خواہش لئے بستر میں لیٹا رہا لیکن اُسے نیند نہ آئی۔ کاش ایک لمحے کے لئے وہ اپنی حسین شبیہ دکھائے۔ کاش وہ ایک بار اُس کے حسین قدموں کی چاپ سن سکے۔ کاش اُس کا ننگا سفید ہاتھ ایک بار اُس کی نظروں کے سامنے سے گذرے۔

وہ ہر ایک چیز کو نظر انداز کئے ہر شے سے غافل بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر شکست اور نراشا کا عکس جھلک رہا تھا۔ اُس کا جی کسی چیز کے چھونے کو نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے خالی نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ یوں ہی اُس کی نگاہ صحن پر پڑی۔ وہاں ایک غلیظ بہشتی پانی تقسیم کر رہا تھا۔ ایک آواز اُس کے کانوں میں آئی۔

"پرانے کپڑے والا۔"

روزمرہ کی حقیقتیں اُس کے کانوں کو عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ دن بھر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اور پھر حریصانہ بستر پر گر پڑا۔ وہ بہت دیر تک بے خوابی کے خلاف جنگ کرتا رہا۔ آخرکار اُسے کامیابی نصیب ہوئی۔ پھر اُسے کوئی بے ہودہ خواب نظر آیا۔

"میرے اللہ۔ مجھ پر رحم کر۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اُس کا دیدار بخش دے۔"

وہ اب شام کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے اُسے نیند آگئی۔ نیند کے ساتھ خواب آئے۔ ایک کلرک کا خواب جو ایک کلرک بھی تھا اور سپاہی بھی۔ کس قدر ناقابل برداشت تھے یہ خواب... آخر وہ بھی نمودار ہوئی۔ اُس کا سر۔ اُس کی زلفیں ... اسے نظر آئیں۔ لیکن صرف چند لمحوں کے لئے پھر ایک دھندلکا سا چھا گیا۔ اور پھر اُسے کوئی اور گھٹیا سا خواب دکھائی دیا۔

یہ خواب آہستہ آہستہ اُس کی زندگی بن گئے۔ اب اُس کی زندگی کے دھارے نے ایک خاص رُخ اختیار کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیداری میں سوتا ہے، اور نیند میں جاگتا ہے۔ اگر کوئی اُسے اپنی میز پر گم سم بیٹھے دیکھ لیتا۔ یا اُسے گلی میں چلتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ شاید پکارلو کو پاگل یا شرابی سمجھتا۔ اُس کا چہرہ بالکل بے حس تھا۔ اور غفلت جو اُس کی پیدائش سے اُس کی زندگی کا ایک حصہ تھی اب اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ اُس کا چہرہ ہر قسم کے احساس و حرکات سے عاری ہو گیا۔ رات کو البتہ اُس میں کچھ گرمی پیدا ہوئی۔

ان حالات میں اُس کی صحت بالکل تباہ ہو گئی۔ شب بیداری اس کے لئے ایک مصیبت بن گئی۔ اس ایک خزانے کو پالینے کے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ افیم کھانے سے خوابوں کی کڑیاں جوڑی جا سکتی ہیں۔ اُسے ایک دم ایک ایرانی کا خیال آیا۔ جو شالیں بیچتا تھا۔ اور پکارلو سے اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر بنا دو۔ پکارلو نے اُس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہاں سے افیم مل سکے گی۔

ایرانی اُسے آلتی پالتی مارے دیوان پر بیٹھا ملا۔

"تمہیں افیم کس لئے چاہیئے" ایرانی نے پوچھا۔

پکارلو نے اپنی بے خوابی کا حال کہہ سنایا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں افیم دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے ایک بہت ہی حسین لڑکی کی تصویر بنا دو۔ دیکھو۔ لڑکی بہت خوبصورت ہو۔ اُس کی پلکیں سیاہ ہوں اُس کی آنکھیں بادام ایسی ہوں۔ مجھے اُس کے قریب لیٹا ہوا دکھاؤ۔ میرے منہ میں میرا پائپ ہو۔ مجھے لڑکی بے حد خوبصورت ہونی چاہیئے"

پکارلو نے تمام شرطیں منظور کر لیں۔ ایرانی ایک پل کے لئے باہر گیا۔ جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں سیاہ رنگ کا پانی سا تھا۔ اُس نے اس ڈبے میں سے کچھ ایک اور ڈبہ میں الٹا اور پکارلو کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ ایک وقت میں سات بوندوں سے زیادہ نہ پیئے۔ پکارلو نے لالچی ہاتھوں سے ڈبیا کو اُس سے چھین لیا۔ ڈبہ۔ جو اُس کے لئے سونے کی ایک ڈلی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا—— اور ایک ہی سانس میں گھر پہنچ گیا۔

واپس پہنچ کر اُس نے اُس میں سے چند قطرے ایک گلاس میں ڈالے اور ایک ہی گھونٹ میں انہیں پی گیا۔ سونے کے ارادے سے وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

اُس کی مسرت کی انتہا نہ رہی، وہ اس کے خوابوں میں نمودار ہوئی۔ لیکن ایک بالکل نئے ماحول میں وہ ایک گاؤں کی ایک جھونپڑی کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اُس کا لباس شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھا۔ کس قدر سادگی تھی اُس کے بال بھی بڑے سادہ انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔

لیکن کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اُس کی تراشی ہوئی گردن کے گرد ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس کی ہر چیز سادہ تھی۔ انوکھی تھی۔ اور ایک ناقابل بیان سلیقے کی حامل تھی۔

اُس کے چلنے کے انداز میں ایک عجیب بانکپن تھا۔ اُس کے قدموں کی چاپ اور لباس کی سرسراہٹ میں کس قدر موسیقی تھی۔ بالوں کے بنے ہوئے کنگن میں اُس کا ہاتھ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی پریم آنکھوں سے پکارلو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

"مجھے بُری مت سمجھو۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ غور سے دیکھو اور کہو کہ میں وہ کر سکتی ہوں جس کے تم مجھے اہل سمجھتے ہو۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔ جو تمہیں اپنے بچے کا ..."
لیکن اس پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں درد سا ہو رہا تھا۔

"بہتر تھا کہ تمہارا اس دنیا میں وجود ہی نہ ہوتا۔ تم محض ایک خواب ہوتیں۔ تاکہ میں تمہیں ہمیشہ دیکھتا رہتا، اور سے ہو جاتا ہوتا۔ تم ہمیشہ میری سانسوں میں رہتیں۔ اگر میرے خواب کی تکمیل ہو سکے تو اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی خوش نہ ہوگا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں خواب اور بیداری کے عالم میں تمہیں اپنے محافظ فرشتے کی طرح پا جاتا۔ خدائی نور کی عکاسی کرتے وقت میں تمہارے حسن کا سہارا لیتا۔ لیکن اب ـــ کس قدر تلخ ہے میری زندگی۔ مجھے تمہاری ہستی سے کیا ہے۔ کیا ایک پاگل کی زندگی اس کے دوستوں اور عزیزوں کے لئے جنہیں وہ کبھی محبت نہیں کرتا، خوشگوار ہو سکتی ہے؟ میرے اللہ! یہ بھی کیا زندگی ہے۔ جہاں حقیقتیں خوابوں سے اس قدر مختلف ہیں!" وہ ہر وقت اس قسم کے خیالات میں گھرا رہتا۔ اُسے کسی اور چیز کا خیال نہیں تھا۔ بہت ہی کم کھاتا تھا۔ ایک عاشق کی طرح ہمیشہ اپنی آرزوؤں کے بر آنے کا شدت سے انتظار کیا کرتا۔ اُس کے تمام خیالات ایک نقطہ پر مرکوز ہو جانے کی وجہ سے اُسے تقریباً ہر روز اپنی خواہشات کا عکس نظر آتا۔ اور اکثر اُن حالات میں نظر آتا جو حقیقت سے کہیں دور تھے۔

چونکہ اس کے خیالات ایک بچے کی طرح پوتر تھے۔ اس لئے اُس کے خوابوں کا محور بھی پوتر اور روحانی چہرے کے طور پر نظر آتا۔

افیم کے استعمال نے اُس کے خیالات کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اُس کی حالت اُس بدبخت عاشق کی سی تھی۔ جو پوری شدت اور پاگل پن کو آخری حد تک اپنے محبوب سے محبت کرتا ہے۔

آج تک جو خواب اُس نے دیکھے تھے۔ اُن میں سے ایک بہت ہی پیارا تھا۔ اس خواب میں اُسے اپنا شہزادہ نظر آیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اُس کے ہاتھ میں رنگوں کی طشتری تھی۔ اور وہ بھی وہیں تھی۔ اُس کی بیوی کی حیثیت سے۔ وہ اُس کے قریب بیٹھی تھی۔ اُس کی کرسی کی پشت پر اپنی کہنی ٹکائے اُسے کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی خواب آور آنکھوں میں مسرت کی جھلک تھی۔ اس کے کمرے میں جنت کی سی کیفیت تھی۔ بڑا سجا سجایا اور زندگی سے بھرپور تھا۔ اللہ! اُس نے اپنا حسین سر اُس کی چھاتی پر جھکا دیا۔ اس سے حسین تر خواب اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خواب کے بعد جب اُس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ اپنے میں نئی زندگی محسوس کر رہا تھا۔

اُس کے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اُس نے سوچا شاید وہ کسی حادثے کی وجہ سے اس غلاظت کے کنوئیں میں جا پڑی ہے شاید وہ پراشچت کرنے کو تیار ہو۔ شاید وہ خود بھی اس غلاظت کے گڑھے سے نکلنے کی متمنی ہو۔ اور یقیناً کوئی بھی غلاظت کے اس دریا میں بہتے نہیں دیکھ سکتا۔ خاص طور پر جب اُسے بچانے کے لئے محض ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔

وہ سوچے جا رہا تھا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو میرے معاملات سے کیا۔ اور پھر دنیا سے ڈرتا نہیں۔ اگر وہ سچے دل سے توبہ کرے اور اپنی زندگی کا رُخ بدل لے تو میں اُس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں اُن کئی لوگوں سے بہتر ہوں گا جو اپنی بھونڈی نوکرانیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔

اس قسم کا پلان بنا لینے کے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے رخساروں میں نیا خون اُبل آیا ہو۔ اُس نے آئینہ دیکھا۔ تو وہ ڈر سا گیا۔ اُس کے رخسار اندر کو پچکے ہوئے تھے اور رنگ زرد تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو سنوارنا شروع کیا۔ نہایا۔ بال سنوارے۔ نیا کوٹ پہنا۔ ایک خوبصورت واسکٹ پہنی۔ اور گلی میں نکل پڑا۔ تازہ ہوا میں سانس لے کر اُسے بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی بیمار کافی عرصے بیمار رہنے کے بعد پہلی بار باہر آئے۔

جب اُس نے اُس گلی میں قدم رکھا جہاں وہ اُس ناقابلِ

فراموش عادات کے بعد کبھی نہیں گیا تھا۔ تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ کافی دیر تک اُس مکان کو تلاش کرتا رہا جہاں وہ حد شائل رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی یادداشت کھو گئی ہو۔ وہ دو بار گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کہاں رکنا چاہئیے۔ آخر ایک مکان اُسے بالکل ویسا ہی لگا۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا۔ سامنے کون کھڑا تھا۔ اُس کا نصب العین۔ اُس کے خیالات کی دیوی اُس کے خوابوں کا عکس جس کے لئے وہ اس قدر شدت سے اِس قدر دکھ سے اس قدر پیار سے زندگی گذار رہا تھا۔

وہ خود اُس کے سامنے کھڑی تھی وہ کانپ سا گیا کمزوری کی وجہ سے اُسے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لیکن وہ انتہائی مسرت محسوس کر رہا تھا۔

وہ اس کے سامنے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ گو اُس کی آنکھیں خواب آلود تھیں۔ اگرچہ اس کا چہرہ قدرے مرجھایا ہوا تھا لیکن اُس کا حُسن بدستور قائم تھا۔

دو بج چکے تھے۔ پکاریو کو دیکھ کر وہ چلائی "اوہ تم! اُس دن کیوں بھاگ گئے تھے"؟

پکاریو تھکاوٹ کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی طرف گھورنے لگا۔

"میں ابھی ابھی جاگی ہوں۔ وہ صبح سات بجے مجھے گھر چھوڑ گئے تھے۔ میں شراب کے نشے میں بدحال تھی" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اف! اس قسم کی باتیں کرنے سے اُس کا گونگا اور بہرہ ہونا بہتر تھا۔ اُس نے ایک ہی فقرے میں اپنی زندگی کی مکمل تصویر اُس کے سامنے پیش کر دی تھی لیکن ان سب باتوں پر واہ کئے بغیر اور اپنے حقیقی جذبات کو چھپا کر وہ آج یہ جاننے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ آیا اُس پر اس کی نصیحتوں کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔

پکاریو جوش اور خوف سے ملی جلی آواز کے ساتھ وہ اُس کی حالت کی گراوٹ بیان کرنے لگا۔ وہ اُس کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی لیکن اُس کے چہرے سے وہ تعجب عیاں تھا۔ جو ہمیں کسی عجیب غریب نظارے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سہیلی کی طرف دیکھا جو کمرے میں ایک طرف بیٹھی اپنے بال سنوارتے سنوارتے پکاریو کی ناصحانہ باتوں کو غور سے سن رہی تھی۔

"میں غریب ہوں۔ مجھے معلوم ہے"۔ پکاریو نے ایک لمبی ناصحانہ تقریر کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم محنت کریں گے۔ اپنی محنت پر زندہ رہنے سے زیادہ کوئی چیز خوشگوار نہیں۔ میں تصویریں بناؤں گا۔ تم میرے پاس بیٹھ کر میرا حوصلہ بندھانا۔ یا تم کڑھائی کا کام کرنا یا کوئی اور کام کرنا جو تمہیں پسند ہو۔ ہم دونوں محنت کریں گے۔ تو ہم غریب نہیں رہیں گے۔"

"میں کام کروں" اُس نے حقارت آمیز آواز میں اُسے ٹوکا۔ "کیا میں کوئی دھوبن یا درزن ہوں جو کام کروں"۔

ان الفاظ سے اُس کی کھوکھلی زندگی کا کمینہ پن پوری طرح عیاں تھا۔

"تمہارے ساتھ شادی"! کونے میں بیٹھی ہوئی اُس کی سہیلی جو ابھی تک خاموش تھی۔ بول اٹھی "اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو پھر بیٹھا کرتی"۔ یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنے قابلِ رحم چہرے پر ایک عجیب مضحکہ خیز تاثر پیدا کیا۔ جو اس حسینہ کو بیحد پسند آیا۔

یہ انتہا تھی۔ وہ اسے برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔

وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے خیالات اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ اُس کا دماغ خالی تھا۔ وہ بغیر کچھ دیکھے سُنے یا محسوس کئے سارا دن بے مقصد پھرتا رہا۔ کوئی اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ رات بھر سویا رہا ہے، وہ کہیں دوسرے دن کسی فضول سے جذبے کے ماتحت اپنے مکان پر پہنچا۔ اُس کا زرد چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ اُس

ے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کے چہرے پر پاگل پن
ے آثار نمایاں تھے۔

اُس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ کسی کو اندر آنے
نہیں دیتا تھا۔ اُسے کسی چیز کی تمنا نہ تھی۔ چار دن گذر گئے
اور اُس کے کمرے کا دروازہ ایک بار بھی نہ کھلا۔ ہفتہ گذر گیا
لیکن وہ اسی طرح بند رہا۔ لوگ اُس کے دروازے سے پہ
نہ ہو گئے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخرکار دروازہ توڑا
گیا۔ اندر اُس کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ خون
میں لت پت ایک استرا پاس پڑا تھا۔ اُس کے مڑے ہوئے
ہاتھ اور اُس کے چہرے کی مسخ شدہ حالت اس بات کی
ظاہر تھی کہ اُس کے ہاتھوں نے ٹھیک طور پر کام نہیں کیا۔
اور کی گناہ گار روح جسم کے پنجرے سے نجات پانے سے پہلے
بہت دیر تک تڑپتی رہی تھی۔

اس طرح بیچارہ نیکاریو مٹ گیا۔ نکاریو جو ایک اندھے
جنون کا مریض تھا۔ خاموش۔ شرمیلا جس میں ایک بچے کی
سادگی تھی۔ جس میں فن کے شرارے تھے۔ جو وقت گذرنے
پر شعلوں کی بلندی اور چمک دمک اختیار کر سکتے تھے۔
ختم ہو گیا اُس کی موت پر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے۔ اُس
کی لاش کے قریب کوئی شخص نہ تھا۔ سوائے مکانوں کے
دائمزر اور پولیس کے ڈاکٹر کے اُس کا جنازہ خاموشی سے
اٹھایا گیا۔ اور بغیر حرج کی رسوم کو ادا کئے اُسے اوکھٹا
لے جایا گیا۔ اُس کے جنازے کے ساتھ صرف ایک ماتمی تھا۔
ایک سپاہی۔ وہ بھی اس لئے کہ اُس نے رات زیادہ ووڈکا
پی لی تھی۔ لفٹیننٹ پیرودگو کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی میں
دوستی کا حق نبھایا تھا۔ وہ بھی اس بدقسمت کی لاش کے آخری
دیدار کے لئے نہ آیا۔ دراصل اُس کے پاس ایسے کاموں کے
لئے وقت ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود ایک دلچسپ مہم سر کرنے
میں لگا ہوا تھا۔ آیئے ہم اُس کی باتیں کریں مجھے لاشیں پسند نہیں۔
جب کوئی جنازہ میرے راستے سے گذرے تو مجھے ایک عجیب
بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں جب بھی ریشمی کفن میں ملبوس
کسی لاش کو دیکھتا ہوں۔ تو میں اپنے دل پر ایک بوجھ سا
محسوس کرتا ہوں۔ لیکن جب میں کسی غریب کی بے کفن لاش کو
دیکھتا ہوں جس نے مجھے صرف ایک بھکارن ہوتی ہے۔
اور وہ بھی اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی اور کام نہیں ہوتا۔
تو میرے دل کے بوجھ میں غم کے آثار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ہم لفٹیننٹ پیرودگو سے اُس
وقت جدا ہوئے تھے جب وہ بیچارے نیکاریو کو چھوڑ کر
اُس سنہرے بالوں والی لڑکی کے پیچھے چل پڑا تھا۔ سنہرے
بالوں والی لڑکی بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ وہ ہر شوونڈو
کے سامنے رکی اور پیٹیاں۔ رومال۔ بالیاں۔ دستانے
غرض جو بھی خرافات شوکیسوں میں رکھی تھی اُن میں نگاہ ڈالتی ہوئی
جا رہی تھی۔ اُس کی نگاہ ہر طرف اٹھ رہی تھی آگے پیچھے دائیں
بائیں۔

"میری جان، تم میری ہو" لفٹیننٹ پیرودگو نے اُس
کا تعاقب کرتے ہوئے پورے بھروسے کے ساتھ کہا۔ اُس
نے اپنے چہرے کو کوٹ کے کالروں میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ
اگر اُس کا کوئی ملنے والا مل جائے تو پہچان نہ سکے۔ یہاں
قارئین کو لفٹیننٹ پیرودگو کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری
نظر آتی ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ لفٹیننٹ پیرودگو کے بارے میں کچھ
کہا جائے یہ بہتر ہوگا کہ اُس سوسائٹی کا ذکر کیا جائے
جس سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں کچھ ایسے
افسر تھے۔ جو اس شہر کا درمیانہ درجہ شمار ہوتے تھے۔ کونسلرز
کی طرف سے دی جانے والی پارٹیوں پر (کونسلر چاہے وہ
وہ پیدائشی ہوں یا اپنی محنت کی وجہ سے اس رتبے پر پہنچے
ہوں) اس قسم کے لوگوں سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ ان
کے علاوہ ان پارٹیوں پر آپ کو چائے کی میزیں پیانو اور
ڈانس کے ساتھ ساتھ آپ کو کچھ بے رونق سی عورتیں نظر آتی
ہیں، جن کی جوانی ڈھلک چکی ہے۔ ان بے رونق عورتوں
کو ہنسانا یا اپنی طرف متوجہ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے کیونکہ
اس کے لئے بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔ یا بلکہ یوں
کہئے کہ کسی کاریگری کی ضرورت نہیں۔ آپ کی گفتگو نہ تو بہت

سنجیدہ ہونی چاہیئے اور نہ بہت دلچسپ۔ بس ایسی ہونی چاہیئے جس میں ہر قسم کی وہ خرافات شامل ہو جو عورتوں کو ہمیشہ پسند رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مذکورہ بالا نوجوان بہت کامیاب ہیں۔ ان بے رونق عورتوں کی باتوں کو سننا اور انھیں خوش کرنا ان لوگوں کی خاص خوبی ہے۔ اور اس خوبی کا معاوضہ اکثر انھیں ان الفاظ میں ملتا " اب بس بھی کرو۔ اس قسم کا مذاق کرتے تمھیں شرم نہیں آتی "۔ اونچے طبقے میں یہ لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ بلکہ نظر آتے ہی نہیں۔ تاہم انھیں پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ سمجھا جاتا ہے۔ انھیں ادبی گفتگو کا بہت شوق ہے۔ وہ بلگرن' لیشلن اور گرینج کی تعریف کرتے ہیں اور اے اے۔ آر لو کا نام آتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں۔ وہ پبلک میں کبھی مسن نہیں کرتے چاہے وہ حساب کتاب اور جنگلات کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے کچھ لوگ آپ کو تھیٹر میں ضرور مل جائیں گے۔ چاہے وہاں " فلاٹھا " قسم کی کوئی چیز سٹیج کی جاری ہو جو اُن کے مذاق اعلیٰ کو پسند نہیں۔ تھیٹر کے ڈائریکٹروں کے لئے یہ لوگ بڑے مفید ہوتے ہیں ڈرامے میں اچھے اشعار کو پسند کرنا اور ایکٹروں پر آوازے کسنا ان کا محبوب شغل ہے۔ ان میں اکثر سول سروس کا امتحان دیتے ہیں یا دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن آخر دو گھوڑوں کی ایک گاڑی خرید لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ تب اُن کی دوستی کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہوتا ہے۔ آخر کار وہ کسی بیوپاری کی لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جو پیانو بجا سکتی ہے۔ اور جس کے پاس ہزار ایک روپیہ نقد اور بہت سے رشتے دار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عزت انھیں اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی جب تک وہ کرنل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ رشتہ دار روسی باوجودیکہ اُن سے گوبھی کی بو آتی ہے۔ اپنی لڑکی کی شادی جنرل یا کم سے کم کرنل سے کم کے ساتھ کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔

یہ تو اس کلاس کے مخصوص ؟ تھے۔ لیکن لفٹیننٹ پیرو گو میں بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جو محض اس کی ذات تک محدود تھیں۔ مثال کے طور پر وہ " ڈمنزی دانسکا کے " اور ڈی مسفار جونز آف دی انگ کلیوز " میں سے بڑی خوبصورتی سے شعر پڑھ سکتا تھا۔ اُسے اپنی پائپ سے دھوئیں کے دائرے بنانے میں اس قدر مہارت تھی کہ وہ ایک کش کے ساتھ ایسے دس دائرے بنا لیتا تھا۔ اس قسم کے دلچسپ تھے کہ ایک بندوق کیوں ہے اور ایک توپ' توپ کیوں' سنانے میں اُسے بہت جلد تھی۔ پیرو گو کی تمام خوبیوں کا' جو اُسے قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھیں بیان نہایت مشکل ہے' وہ ایکٹروں اور تھاموں کے بارے میں گفتگو کرنے کا بہت مشتاق تھا لیکن اُس کی گفتگو ایک نئے رکروٹ کی طرح بدمزہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے عہدے سے بہت خوش تھا جس میں اُس کی ابھی ابھی ترقی ہوئی تھی۔ ویسے وہ کبھی کبھی کہا کرتا تھا۔ کہ اگر میں لفٹیننٹ ہوں تو کیا ہے۔ یہ عہدے وغیرہ سب بکواس ہے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے عہدے سے بہت خوش تھا۔ وہ اکثر بات چیت کے دوران میں اپنی پوزیشن کے متعلق اشارہ کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب بازار میں اس کا ایک کلرک سے جھگڑا ہو گیا تھا جس نے اُس کی شان میں کچھ گستاخ الفاظ کہے تھے۔ تو پیرو گو نے دو ٹوک اُن کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ ایک لفٹیننٹ سے بات کر رہا ہے۔ کسی ایرے غیرے سے نہیں۔ اور اُس نے یہ بات نہایت فصیح زبان میں کہی تھی کیونکہ اُس وقت وہاں سے دو قدر سے حسین عورتیں گزر رہی تھیں۔

پیرو گو کو ہر حسین شے کا اشتیاق تھا۔ اسی لئے وہ پیکاریو کا حوصلہ بندھایا کرتا تھا' ویسے ہو سکتا ہے۔ پیکاریو کے ساتھ اس کی دوستی کی حقیقی وجہ یہ ہو کہ پیرو گو اپنے حسین نقش تصویر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہو۔

پیرو گو کی بہت سی خوبیاں ہم نے بیان کر دیں لیکن یہاں پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ انسان خدا کی ایک ایسی حیران کن تخلیق ہے کہ کوئی بھی اس کی تمام خوبیاں بیان نہیں کر سکتا۔ اور جب بھی کوئی اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی کئی اور خاصیتیں اُبھرتی ہیں' اور ان سب کا بیان کرنا ناممکن ہے۔

پیرو گو اُس اجنبی لڑکی کا تعاقب کرتا رہا۔ اور وقتاً فوقتاً کئی ایسے سوالوں سے اُس کا جی بہلاتا رہا جن کا جواب وہ

کرے تک پہنچا اور گول ہوا، الفاظ میں دی تھی وہ اندھیرے کا زنان گیٹ سے گزر کر گلی شتاپا میں داخل ہو گئے۔ یہ تمباکو بیچنے والوں کی گلی تھی۔ یہاں تمباکو فروشوں کے علاوہ زین کاریگروں کی دکانیں تھیں۔ وہ سنہرے بالوں والی لڑکی تیزی سے ایک تنگ گلی سے مکان میں داخل ہو گئی۔ پیروگور بھی اس کے پیچھے اس مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اندھیری سیڑھیوں میں سے گزر کر ایک دروازے میں داخل ہوئی۔ پیروگور بھی دلیری سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے کمرے میں پایا جس کی دیواریں کالی اور چھت دھواں زدہ تھی۔ دھات کے پرزوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے کانی کے برتن اور رم بتیاں میز پر پڑی تھیں۔ فرش پیتل اور لوہے کے برادے سے چمک رہا تھا۔ پیروگور فوراً سمجھ گیا کہ یہ ایک کاریگر کا مکان ہے۔ اجنبی لڑکی بغل کے دروازے سے نکل گئی۔ پیروگور نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور پھر روسی قاعدے کے تحت اسی دروازے میں داخل ہو گیا۔ اب وہ ایک اور کمرے میں تھا۔ جو پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ بڑا صاف اور ستھرا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا۔ اس کا مالک ایک جرمن کاریگر ہے۔

یہاں اس نے ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھا، جسے دیکھ کر وہ حیران پریشان رہ گیا۔ اس کے سامنے شلر بیٹھا تھا۔ وہ شلر نہیں جس نے Wilhelm Tell اور The History of the Thirty Years War لکھی ہے۔ بلکہ یہ تو وہ مشہور شلر تھا جو اس گلی میں لوہار کا کام کرتا تھا۔ اس کے پاس ہافمین کھڑا تھا۔ ہافمین ادیب نہیں۔ بلکہ آفیسرز سٹریٹ کا موچی جو شلر کا بڑا قریبی دوست تھا۔ شلر بہت سی شراب پیئے ہوئے تھا اور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں کو زمین پر مار رہا تھا۔ اور بڑی گرمجوشی سے باتیں کر رہا تھا لیکن پیروگور کی حیرانی کا کارن یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی حیرانی کا سبب ان لوگوں کے بیٹھنے کا انداز تھا۔ شلر اپنا چہرہ اونچا کئے ہوئے اپنی موٹی ناک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہافمین اپنی انگلیوں سے اس کی ناک کو پکڑے ہوئے تھا۔ اور اس پر موچیوں کا چاقو پھیر رہا تھا۔ دونوں جرمن بول رہے تھے۔ اور چونکہ پیروگور جرمن بہت کم سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ ماجرے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ دراصل شلر یہ کہہ رہا تھا "مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے ناک کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "میں مہینے میں تین پونڈ تمباکو اکیلی ناک پر خرچ کرتا ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ مجھے ایک گھٹیا سی روسی دکان سے لینا پڑتا ہے۔ (کیونکہ جرمن دکاندار روسی تمباکو نہیں بیچتے) اس گلی سڑی روسی دکان کو مجھے ایک پونڈ کے تیس کوپک دینے پڑتے ہیں یعنی ایک روبل اور بیس کوپک۔ ایک روبل اور بیس کوپک سے ضرب دو تو ہو جائیں گے چودہ روبل اور چالیس کوپک سمجھتے ہو ہافمین بھائی۔ چودہ روبل اور چالیس کوپک اکیلی ناک پر اور چھٹی والے دن میں ریپے (rapee) لیتا ہوں۔ کیونکہ میں چھٹی والے دن گھٹیا روسی تمباکو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے سال میں دو پونڈ ریپے خریدنا پڑتا ہے۔ اس پر میرے بچے روبل خرچ آتے ہیں چھ اور چودہ تیس۔ بیس روبل۔ اور چالیس کوپک صرف تمباکو پر۔ یہ لوٹ ہے۔ کیوں دوست ہافمین ہے کہ نہیں لوٹ۔ ...... ہافمین چونکہ خود شراب پیئے ہوئے تھا اس لئے اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"بیس روبل اور چالیس کوپک۔ میں جرمن ہوں۔ ایک ایسے ملک کا باسی جہاں پر شاہی حکومت ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں چاہئے یہ ناک۔ اسے کاٹ دو تمہارے سامنے رکھی ہے۔

..... اور اگر اچانک لفٹیننٹ پیروگور نہ آ جاتا۔ تو ہافمین اپنے دوست کی خواہش پوری کر چکا ہوتا۔ کیونکہ وہ چاقو کو بالکل اسی حالت میں پکڑے ہوئے تھا جیسے وہ گلا کاٹتے وقت پکڑتا تھا۔

شلر کو بڑا غصہ آیا کہ ایک اجنبی کی بے موقع آمد اس کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئی ہے بیر اور وسکی کے ملے جلے

نشے کے باوجود اُس نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سین کے درمیان کسی اجنبی کی موجودگی اچھی نہیں لگتی یعنی اس وقت پیروگور نے قدرے جھک کر اُن آداب کے ساتھ جن سے وہ قدرتی طور پر آشنا تھا کہنے لگا۔

"معاف کیجئے گا . . . ."

"باہر نکل جاؤ" شلر نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس سے پیروگو کو بھی غصہ آگیا۔ وہ اس قسم کے سلوک سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ یکلخت غائب ہو گئی۔ اور اُس نے زخم خوردہ آن سے کہا۔

"جناب . . . . میں حیران ہوں . . . . آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا۔ میں ایک افسر ہوں"۔

"افسر ہو تو کیا۔ میں جرمن ہوں۔ میں خود (اس پر شلر نے میز پر مکہ مارا) میں خود افسر بن سکتا ہوں۔ سال ایک سال کے لئے کیڈٹ، دو سال میں لفٹیننٹ۔ میں کل ہی افسر بن جاؤں۔ لیکن میں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ افسر، تھو"۔ اور شلر نے اپنی ہتھیلی پر تھوک دیا۔

لفٹیننٹ پیروگور سمجھ گیا کہ یہاں سے چلے جانے کے سوا چارا نہیں۔ لیکن ایسے چلے جانا اُس کی پوزیشن کے خلاف ہونے کے علاوہ اس کے لئے ویسے بھی اچھا نہ تھا۔ وہ کئی بار سیڑھیوں میں رکا۔ جیسے وہ اپنی ساری طاقت اکٹھا کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ شلر کو کیسے اُس کی بدسلوکی کا مزا چکھائے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شلر کو معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ اور پھر جب اُسے اُس سنہرے بالوں والی لڑکی کا خیال آیا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ اس سارے قصے پر مٹی ڈالو . . . . . . دوسرے دن لفٹیننٹ پیروگور صبح صبح لوہار کی دکان پر آدھمکا۔

پہلے کمرے میں اُس کی اُس حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ لڑکی نے بڑے روکھے پن سے جو اُس کے چہرے پر بہت مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ پوچھا

"تمہیں کیا چاہیئے"؟

"میری جان۔ آداب عرض کرتا ہوں ـــــ مجھے پہچانا نہیں۔ . . . . . . تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں۔

اس پر لفٹیننٹ پیروگور اُسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبا لینا چاہتا تھا لیکن لڑکی نے چیخ کر اسی روکھے پن سے پوچھا۔

"تمہیں کیا چاہیے؟"

"میں صرف تم سے ملنا چاہتا ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے" لفٹیننٹ پیروگور نے مسکراتے ہوئے اور قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ شرمیلی حسینہ بغل والے کمرے میں کھسک جانا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا۔

"جانِ من سنو۔ میں کچھ ایڑیاں (Spurs) بنوانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ تم سے محبت کرنے کے لئے ایڑیوں کی اسقدر ضرورت نہیں جس قدر چابک کی . . . . تمہارے ہاتھ کس قدر خوبصورت ہیں۔

لفٹیننٹ پیروگور اس قسم کی وضاحتیں پیش کرنے کا خدا تھا۔

"میں ابھی اپنے خاوند کو بلاتی ہوں" جرمن لڑکی نے چیخ کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کچھ لمحے گزرنے کے بعد شلر نیم بیداری کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا۔ کل رات پی ہوئی شراب کا خمار ابھی تک اُس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ اُسے صاف طور پر کچھ یاد نہیں تھا۔ لیکن اُسے اتنا احساس ضرور تھا کہ کل رات اُس سے کچھ ناواقف حرکت سرزد ہوئی تھی۔ اس لئے اُس نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"میں ایڑیوں کے پندرہ روبل سے کم نہ لوں گا"۔

ایک ایماندار جرمن کی حیثیت سے اُسے ایسے آدمی سے باتیں کرتے ہوئے جس نے اُسے نہایت گھٹیا حالت میں دیکھا تھا۔ اُسکا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا۔

شلر دو ایک دوستوں کو چھوڑ کر کسی کے سامنے شراب نہیں پیتا تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے کاریگروں سے بھی چھپ کر پیتا تھا۔

پیروگو نے نہایت ادب سے پوچھا۔

"اس قدر مہنگے کس لئے؟"

"جرمن کاریگری کی وجہ سے" شلر نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کسی روسی سے بنوالیجئے۔ وہ آپ کو دو روبل میں بنا دے گا"

"اچھی بات ہے۔ اس امر کا ثبوت دینے کے لئے کہ تم مجھے بہت پسند ہو اور میں تم سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق رکھتا ہوں۔ میں پندرہ روبل ہی دے دوں گا۔"

شلر ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گیا۔ چونکہ وہ ایک ایماندار جرمن تھا۔ اس لئے اُسے بہت شرم محسوس ہوئی۔ اس خواہش میں کہ کسی طرح پیروگو آرڈر دینے سے باز آجائے۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایڑیاں پندرہ دن سے پہلے تیار نہ ہوسکیں گی۔ لیکن پیروگو اس پر کچھ نہ کہا بلکہ یوں ظاہر کیا کہ اس قدر وقت کا لگ جانا بالکل جائز ہے۔

شلر اب یہ سوچ رہا تھا کہ کام کس خوبصورتی سے کیا جائے کہ وہ پندرہ روبل کا نظر آئے۔

اس اثنا میں سنہرے بالوں والی وہ لڑکی ورکشاپ میں آگئی۔ اور اُس میز سے جھاڑ پونچھ شروع کر دی جس پر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ لفٹیننٹ شلر کی خود فراموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا اور اُس کے قریب جا کر اُس کے بازو پر جو کندھوں تک ننگا تھا چٹکی دی۔

شلر کو یہ بات بہت بُری لگی۔

"مین فرا" اُس نے جرمن زبان میں کہا۔

"وازدولٹ سائی ڈاچ" لڑکی نے جواب دیا۔

"گون سائی ان ٹودی کچن"۔

لڑکی چلی گئی۔

"تو پھر پندرہ دن میں ہو جائے گا تیار"۔

"ہاں ہو جائے گا"۔ خیالات میں ڈوبے ہوئے شلر نے جواب دیا۔ "مجھے ان دنوں بہت کام ہے"۔

"اچھا میں پھر آؤں گا"۔

"بہت اچھا"۔ شلر نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اُس جرمن لڑکی نے پیروگو کو صاف ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُس کا پیچھا جاری رکھا جائے۔ یہ بات سمجھنے سے وہ بالکل قاصر تھا کہ کوئی اُس سے کیسے غیر دوستانہ برتاؤ روا رکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر جب اُس کی شکل و صورت اور رتبہ اس قدر اچھا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ شلر کی بیوی باوجود اپنے حسن کے بہت بے وقوف تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بے وقوفی عورت کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ میں کم سے کم کئی ایسے خاوندوں کو جانتا ہوں جنہیں اپنی بیویوں کی بے وقوفی بے حد پسند ہے۔ اور اسے وہ طفلانہ معصومیت کا نام دیتے ہیں۔ حسن کئی معجزوں کا محرک ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت کی تمام روحانی کمزوریاں بُری لگنے کی بجائے نسبتاً زیادہ خوبصورت لگتی ہیں خود بُرائی حسین لگنے لگتی ہے لیکن اگر کوئی عورت حسن سے محروم ہو تو ایک مرد کی محبت تو کیا عزت حاصل کرنے کے لئے بھی اُسے مرد سے بیس گنا زیادہ چالاک ہونے کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ شلر کی بیوی بے وقوف ہونے کے باوجود اپنے فرائض سے واقف تھی۔ ان حالات میں پیروگو کے لئے اپنی اس دلیرانہ مہم میں کامیاب ہونا ممکن نہ تھا لیکن رکاوٹوں کو دور کرنے میں بھی ایک عجیب لطف ہے وہ لڑکی دن بدن اُس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی گئی۔ وہ اکثر ایڑیوں کے بارے میں پوچھنے چلا جاتا۔ اس سے شلر بہت تنگ آگیا۔

وہ جلد سے جلد ایڑیاں تیار کر دینا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن وہ مکمل ہوگئیں۔ "کاریگری کا کتنا حسین نمونہ ہے"۔ لفٹیننٹ پیروگو نے ایڑیاں دیکھ کر کہا۔ "خدا کی قسم کتنی حسین بنی ہیں۔ ہمارے جنرل کے پاس بھی اس قدر خوبصورت ایڑیاں نہیں ہیں۔"

خود پسندی کی ایک لہر شلر کے دل میں دوڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ اور دل ہی دل میں پیروگو سے اُس کی نفرت جاتی رہی۔

"روسی افسر اچھے کام کی قدر کرنا جانتا ہے"۔ اُس نے سوچا۔

"میرے خیال میں تم چھری کا دستہ قسم کی چیز بھی بنا

سکتے ہو۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔" شلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم مجھے چھری کا ایک دستہ بنا دو۔ میں کل چھری لے آؤں گا۔ میرے پاس ایک بہت خوبصورت ترکی چھری ہے۔ لیکن میں اس کا دستہ بدلنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ شلر کو تیر کی طرح چبھے۔ اچانک اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی۔ کہ یہ مصیبت پھر گلے ڈال لی ہے۔ انکار کرنا اب کمینگی کے مترادف ہے۔ خاص طور پر جب کہ روسی افسر اس کے کام کی اس قدر تعریف کرتا ہے اس نے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا . . . . .

لیکن اس بوسے والے واقع نے اسے عجیب کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔

میرے خیال میں قارئین کو اس وقت شلر کے بارے میں ذرا اور تفصیل کے ساتھ بتا دینا بیجا نہ ہوگا۔ شلر ہر لحاظ سے جرمن تھا۔ ایک صحیح جرمن کی خوبیاں۔ برائیاں سب اس میں موجود تھیں۔ بیس سال کی عمر میں جب ایک روسی عیاشی میں لگا ہوتا ہے۔ شلر نے اپنی زندگی کا مکمل پلان بنا لیا تھا۔ اور حالات کا اتار چڑھاؤ اسے اس پلان سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہ کر سکے۔ وہ ہر صبح سات بجے اٹھتا تھا۔ دو بجے کھانا کھاتا تھا۔ بہت کم گو تھا۔ ہر اتوار کو شراب پیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ دس سال میں پچاس ہزار روپے کمائے گا، اور اس کے لئے یہ فیصلہ نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل تھا۔

ایک کلرک دفتر میں داخل ہو کر اپنے افسر کے کمرے میں جھانکنا بھول جائے لیکن ایک جرمن اپنے فیصلے سے کبھی نہیں بدلتا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے خرچ میں اضافہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اگر آلوؤں کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے۔ تو بجائے خرچ بڑھنے کے وہ آلوؤں کی مقدار میں کمی کر دیتا تھا۔ اس سے اسے کبھی کبھی بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی محتاط رہنے کی عادت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کے بوسوں کا بھی راشن مقرر کر رکھا تھا۔ وہ دن میں صرف دو بار اپنی بیوی کا بوسہ لیتا تھا۔ اور دو سے زیادہ بار بوسے لینے کی ترغیب سے بچنے کے لئے وہ اپنے شوربے میں ایک چمچ سے زیادہ کالی مرچ نہیں ڈالتا تھا۔ ہاں البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اتوار کو اس قانون پر سختی سے کاربند نہیں رہتا تھا۔

لیکن اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ اتوار کو وہ دو بوتلیں بیئر اور واڈکا کی بوتل پیتا تھا۔ شراب وہ انگریزوں کی طرح نہیں پیتا تھا۔ جو رات کو کھانا کھا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں اور اکیلے پیتے ہیں۔ بلکہ وہ تو جرمنوں کی طرح ہمیشہ دوستوں کے ساتھ پیتا تھا۔ شراب یا وہ ہاف مین موچی کے ساتھ اور پھر ایک اور جرمن دوست کنز۔ ترکھان کے ساتھ جو خود بڑا شرابی تھا۔ پیتا تھا۔

یہ تھا شلر مختصر جو ایک بڑی عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا اگرچہ وہ پیدائشی قسم کا جرمن تھا لیکن پیروگو کی حرکتوں نے اس کے دل میں حسد سا پیدا کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا۔ لیکن اسے روسی افسر سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہ آ3۔ اس عرصے میں پیروگو اپنے دوستوں کے درمیان پائپ پیتے ہوئے ——
یہ قدرت کا اصول ہے کہ افسری ملتے ہی آپ کو پائپ مل جاتا ہے۔
ایک حسین مسکراہٹ کے ساتھ وہ ایک حسین جرمن لڑکی کے ساتھ اپنے تعلقات کی طرف بڑا معنی خیز اشارہ کرتا۔ اس کی باتوں سے کہ وہ اس لڑکی سے کافی میل جول پیدا کر چکا ہے اور اسے حاصل کرنے کی اسے رتی بھر امید نہیں۔

ایک دن شستا یا گلی میں گھومتے ہوئے اتفاقاً اس دکان کی طرف دیکھا۔ جس پر شلر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ جب اس نے اس حسینہ کو کھڑکی سے سر باہر نکالے راہگذر کا نظارہ کرنے میں مشغول پایا۔ وہ وہیں رک گیا۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"سلام عرض کرتا ہوں۔"

جواب میں اس لڑکی نے بالکل ویسے ہی ہاتھ ہلایا جیسے ایک دوست ہلاتا ہے۔

"تمہارا خاوند گھر پر ہے؟"

"ہاں" وہ بولی۔

"وہ گھر پر ہی ہے؟"

"ان کا کمرہ نہیں ہوتا؟" اُس بے وقوف لڑکی کے منہ سے نکل گیا۔

"یہ بھلائی بُرا نہیں" ہیرد گو نے دل ہی دل میں کہا مجھے ضرور اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ اگلے اتوار کو وہ اپنا اُس پیش کش کے ساتھ پیش ہوا۔ شلر واقعی گھر پر نہیں تھا۔ گھر کی حسین مالکن گھبرا سی گئی لیکن اس بار ہیرد گو نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ اُس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ اور جھک کر اپنے حسین جسم کی مکمل نمائش کی۔ وہ بڑی عزت کے ساتھ بڑی عجیب باتیں کرتا رہا لیکن وہ بھولی بھالی لڑکی صرف ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ آخر کار جب اُس کے تمام حربے اُس حسینہ کو رام کرنے میں ناکام رہے۔ تو اُس نے رقص کی تجویز پیش کی۔ ہیرد گو کو رقص سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ ایک یہ تو ایسی شے تھی جو اس لڑکی کو پسند تھی۔ دوسرے اُس میں وہ اپنے حسن کی نمائش بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔ تیسرے رقص میں چونکہ ایک دوسرے کے قریب آنا پڑتا تھا۔ لہذا اُسے بغل گیر ہونے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ قصہ مختصر اُسے یقین تھا کہ رقص یقیناً اس کی کامیابی کا باعث ثابت ہوگا۔ وہ کسی گیت کا ایک مصرعہ گنگنانے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جرمن لڑکیوں کے ساتھ تیزی دکھانے سے کام نہیں چلتا۔ لڑکی کمرے کے وسط میں چلی گئی اور اپنا خوبصورت پاؤں رقص کے انداز میں اُٹھایا۔ لڑکی کے اس انداز کو دیکھ کر ہیرد گو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ وہ اُس کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا۔ لڑکی رونے لگی۔ رونے سے اُس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ہیرد گو نے اس کی آنکھوں کے بے شمار بوسے لئے ——— اچانک دروازہ کھلا۔ اور شلر ہاف مین اور کنسٹر ترکمان کے ساتھ اندر داخل ہوا تمام کاریگر حضرات نوابوں کی طرح شراب میں بدمست تھے۔

شلر کے غصے کا اندازہ قارئین خود لگا سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں خاموش رہنا بہتر سمجھوں گا۔

"کمینے" وہ غصے میں چلایا۔ "میری بیوی کا بوسہ لینے کی جرأت تمہیں کیسے ہوئی۔ تم روسی افسر نہیں۔ حرامی ہو۔ تم شیطان کی اولاد۔ میں جرمن ہوں۔ تمہاری طرح کوئی روسی کمینہ نہیں۔ کیوں بھائی ہاف مین (ہاف مین نے سر ہلا کر اُس کی ہاں میں ہاں ملائی) مجھے نہیں چاہئے افسری افسری۔ ہاف مین بھیا اسے گردن سے پکڑ کر باہر پھینک دو۔ مجھے نہیں چاہئے ......" وہ اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُس کی واسکٹ کی طرح سُرخ تھا۔

"میں آٹھ سال سینٹ پیٹرز برگ میں رہا ہوں۔ میری ماں سوتیا میں اور میرا چچا نیورمبرگ میں۔ میں جرمن ہوں۔ کوئی گدھا نہیں۔ ہاف مین اسے باہر پھینک دو۔ کامریڈ کنسٹر اسے ٹانگوں سے پکڑ لو۔

جرمنوں نے ہیرد گو کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ ہیرد گو کو اپنے آپ کو چھڑانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ یہ تینوں کاریگر سینٹ پیٹرز برگ کے مضبوط ترین انسان تھے اُنھوں نے ہیرد گو کے ساتھ اس قدر بیہودہ سلوک کیا کہ مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ دوسرے دن شلر کو بخار ہوگیا ہوگا۔ وہ سارے دن پتے کی طرح کانپتا رہا۔ اُسے ہر لحہ پولیس کا انتظار تھا۔ اور وہ خدا کے حضور میں منتیں مانگتا رہا کہ کل کا واقعہ کسی طرح خواب ثابت ہو۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اور اس میں تبدیلی ناممکن تھی۔ ادھر ہیرد گو کے غصہ کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اپنی بے عزتی کا خیال آتے ہی وہ پاگل ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں شلر کم از کم دیش بدر کیا جانے کا مستحق تھا۔ وہ سیدھا گھر گیا تاکہ کپڑے بدل کر جنرل سے جا کر جرمنوں کی بغاوت کا ذکر سخت ترین الفاظ میں کرے۔ وہ چیف آف سٹاف کو اس سلسلے میں تحریری درخواست دینا چاہتا تھا۔ اور اگر وہاں سے شلر اور اُس کے ساتھیوں کو مناسب سزا نہ ملے تو وہ یہ شکایت افسرانِ بالا تک لیجانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن اس سارے واقعہ کا خاتمہ بڑے عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔ گھر واپس آتے وقت راستے میں وہ ایک ریسٹورانٹ

تک داخل ہوا وہاں کچھ سینڈریاں کھائیں۔ نادروں بی بی کی ورق گردانی کی۔ گھر پہنچنے تک اُس کا غصہ کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا علاوہ بریں شام کی خنک ہوا نے نادسکی پراسپیکٹ میں گھومنے کا موڈ پیدا کر دیا۔ نو بجے تک اُس کا غصہ بالکل ہوا ہو چکا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو جنرل کو تکلیف دینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ چنانچہ وہ شام گزارنے کے لئے کنٹرول ڈیپارٹمنٹ کے کسی ڈائریکٹر کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہاں اُس کی رجمنٹ کے بہت سے کلرک اور افسر جمع تھے۔ وہاں اس نے بہت پُرلطف شام گزاری۔ جہاں اس کے گیتوں نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں میں بھی جوش و خروش پیدا کر دیا۔

پرسوں "نادسکی پراسپیکٹ" میں گزرتے ہوئے ان دو واقعوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ "یہ دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ قسمت جو کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے وہ کتنا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ ایسا ہوگا۔ کیا ہم کبھی اس طرف کا خیال بھی کرتے ہیں۔ جہاں قسمت ہمیں لے جا رہی ہوتی ہے۔ ہر ایک بات ہماری خواہشات کی الٹ واقع ہوتی ہے۔ ایک تو وہ آدمی ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے بڑے خوبصورت گھوڑے عطا ہوتے ہیں۔ اور وہ اُن پر سواری کئے جا رہے ہیں۔ لیکن انھیں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ وہ ان گھوڑوں کی خوبصورتی کی طرف متوجہ ہوں۔ یا خدا کا شکر بجا لائیں کہ اُس نے اُن پر اپنا خاص کرم کیا ہے۔ اور ایک وہ ہیں جن کے دل کو گھوڑے کے گوشت کی آرزو نے جلا کر رکھ دیا ہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے جب کوئی تیز رفتار گھوڑا اُس کے قریب ہو کر گزر جاتا ہے تو اُس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

ایک آدمی ہے جس کے پاس روٹی ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے اُس کا منہ اس قدر چھوٹا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک آدھ ٹکڑے سے زیادہ کھا نہیں سکتا۔ اور ایک وہ ہیں۔ جن کا منہ جنگی دفتر کے گیٹ کے برابر کھلا ہوتا ہے، لیکن آلو کھانے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قسمت انسان سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ لیکن جو کھیل آپ سے نادسکی پراسپیکٹ میں کھیلے جاتے ہیں وہ عجیب ترین ہوتے ہیں۔ اس گلی کا کبھی اعتبار نہ کریں۔ جب کبھی یہاں سے گزرتا ہوں اپنے اوور کوٹ کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیتا ہوں۔ اور جو لوگ راہ میں مجھ سے دوچار ہوتے ہیں اُن پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتا۔ یہ گلی ایک دھوکا ہے۔ چھلاوہ ہے۔ خواب ہے۔ حقیقت سے بہت دور ——— تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو اُس خوبصورتی سے سلے ہوئے کوٹ میں ملبوس چلا جا رہا ہے۔ بہت امیر ہے۔ وہ کوٹ ہی اُس کا تمام سرمایہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ بھاری بھرکم آدمی جو اُس زیر تعمیر چرچ کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ اُس کے فن تعمیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ نہیں صاحب وہ تو یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ دو کوے جو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں کتنے عجیب ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان جو بڑے جوش و خروش سے اپنے بازو ہلا رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ کیسے اُس کی بیوی نے ایک اجنبی افسر پر کھڑکی سے کوڑا پھینکا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو [illegible] پر بحث کر رہا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ عورتیں۔ عورتوں پر بالکل بھروسہ نہ کرو۔ شوکیسوں میں بہت زیادہ مت جھانکو۔ جو چیزیں اُن میں نظر آتی ہیں وہ خوبصورت ضرور ہیں۔ لیکن اُن میں سے مزدوروں کے خون کی بو آتی ہے لیکن عورتوں کو بیٹ سے نیچے دیکھنے سے آپ کو خدا بچائے۔ میں کسی قیمت پر بھی اُن کا پیچھا کرنے کو تیار نہ ہوں گا۔ خدا کے لئے لیمپ سے دور بہت دور رہیئے اور جتنی جلدی سے ہو سکے وہاں سے گزر جائیے۔ اگر تم وہاں سے اپنے خوبصورت کوٹ پر تیل کے ایک دو دھبوں کو گرا کر بچ نکلے تو سمجھ لو کہ تم سستے چھوٹ گئے۔ صرف لیمپ ہی نہیں۔ ہر چیز میں دھوکا ہے۔ "نادسکی پراسپیکٹ" بجائے خود ایک بڑا جھوٹ ہے۔ لیکن خاص کر رات کے دھندلکے میں جب کہ مکانوں کی سفید اور پیلی دیواریں اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ جب تمام شہر شور و غل سے جاگ اٹھتا ہے۔ جب ہزاروں گاڑیاں سڑکوں پر دندناتی ہیں جب ہرکارے چیختے ہوئے اپنے گھوڑوں پر سوار گزرتے ہیں اور شیطان خود اپنے ہاتھوں سے لیمپ جلا کر ہر ایک شے کو ایک مصنوعی شکل میں پیش کرتا ہے تو یہ جھوٹ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

سومرسیٹ مام

سومرسیٹ مام ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا۔ اُسے گزشتہ نصف صدی سے انگریزی کے نہایت ہی مقبول ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اُسے تمام اصناف ادب پر عبور حاصل ہے جس نے افسانہ، ناول اور ڈرامہ کے میدان میں اپنی بلند قامتی کو برقرار رکھا ہے۔

پیرس میں اُس کے والد برطانوی قونصل تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی اُس نے فرانس میں ہی حاصل کی۔ ابھی وہ آٹھ سال کا تھا کہ اُس کی ماں مرگئی۔ اور پھر دو سال بعد اُس کا باپ بھی رخصت ہوگیا۔ والدین کی موت کے بعد اُسے اُس کے چچا نے اپنے پاس انگلستان بلا لیا۔ اُس کے چچا ایک پادری تھے وہ مام کو بھی پادری کی تعلیم دلانا چاہتے تھے مگر مام بڑا خود سر واقع ہوا تھا کبھی مصوری کی طرف لپکتا اور کبھی ڈاکٹری کی طرف۔ اُس کا بچپن اور جوانی عجیب و غریب کشمکشوں میں گذری۔ اُس نے ماحول اور سماجیت سے شدید ٹکر لی۔ اور آخر اپنا راستہ خود متعین کیا۔

مام کا مرتبہ تو وہی ہے جو موپساں اور دیگر انفرادیت پسند ادیبوں کا ہے۔ اس کا شمار چوٹی کے ادیبوں میں ہے۔ اُس نے ادب کے ذریعہ لاکھوں روپے کمائے۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گذارتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اونچے طبقہ کا نمائندہ ادیب ہے تو کسی حد تک بےجا نہ ہوگا مگر اس کے لئے ہم اُسے سرزنش نہیں کرسکتے۔ وہ زندگی کے حسن اور قبح کی طرف بے نیازانہ رویہ رکھتا ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کو جوں کا توں اپنی کہانیوں میں سمو دیتا ہے اور تجزیہ و تبصرہ کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ اُن کے آلام اور مصائب پر نہ روتا ہے اور نہ ہنستا ہے۔ مام نے دنیا کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ مام ادب برائے ادب کا قائل ہے مگر اس کے باوجود اُس کے ادب میں زندگی کی جھلک ہے۔

سومرسیٹ مام کا کوئی خاص اسلوب نگارش نہیں ہے۔ اور یہی بات اُس کا منفرد اسلوب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ایک طالب علم اور ایک ادیب کو جی بھر کے سیاحت کرنی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سومرسیٹ مام کے یہاں ان گنت کردار ملتے ہیں۔ جو ایک دوسرے قطعاً مختلف ہیں۔ سومرسیٹ مام مزاج کے اعتبار سے رومانیت پسند ہے۔

سومرسیٹ مام خود تنقیدی کا زبردست حامی ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں جتنے بھی کردار ملتے ہیں وہ اپنے آپ پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سومرسیٹ مام نے اپنے آپ کو ہر پہلو سے دیکھا ہے جب ہی اپنی بیشتر کہانیوں میں وہ خود موجود ہے۔ وہ ایک نیا کردار تلاش کرتا ہے اور اس کردار میں اپنے آپ کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

سومرسیٹ کا یہ ناولٹ "تسخیر" - ان ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے کرداروں کے دلچسپ پہلو بے نقاب کئے گئے ہیں۔



سومرسٹ ماہم

تسخیر

مترجم اے نصیر خاں

(۱)

وہ بنگلہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس کے چبوترے سے فلورنس کا ایک خوبصورت حسین منظر بہت بھلا لگتا تھا۔ بنگلہ کے عقب میں ایک پرانا باغیچہ تھا۔ باغیچہ میں پھول کم تھے مگر اس کے درخت بہت خوبصورت تھے۔ چوکور حاشیہ کی جھاڑیاں سلیقہ سے کٹی ہوئی تھیں۔ خوبصورت گھاس کے لان میں ایک مصنوعی غار بنایا گیا تھا جس میں ایک مجسمہ سے سر دنفری کا بستا گرا کرتا تھا۔ یہ بنگلہ سولہویں صدی میں کسی معزز اطالوی نے بنوایا تھا اور اس کے موجودہ وارثان نے اسے ایک انگریز کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ میری پلٹن نے اسی انگریز سے اسے کچھ مدت کے لئے کرایہ پر لیا تھا۔ بنگلہ کا رقبہ کچھ بہت طویل نہ تھا مگر اس کے کمرے وسیع اور بلند تھے۔ میری کے لئے اس کے رکھ رکھاؤ کو تین ملازم کافی تھے۔ اس میں پرانا فرنیچر سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ہر چند کہ فرنیچر زیادہ نہ تھا۔ مگر اپنی سجاوٹ کی وجہ سے خوب دیدہ زیب تھا۔ بنگلہ پر کشش نہ تھا۔ مگر اس کے جدید مالکان نے اس میں بجلی کے آتش دان اور گرم غسل خانے بنوا دیئے تھے۔ میری مارچ میں وہاں پہنچی تھی۔ اس وقت بھی موسم سرما کا اثر بہت زیادہ تھا۔ مگر آتش دانوں اور گرم غسل خانوں کی موجودگی میں میری کو کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ اب جون کا مہینہ تھا اور میری دن کا بیشتر وقت سامنے کے چبوترہ پر بیٹھ کر گزارتی تھی۔ جہاں سے فلورنس کے حسین گنبد اور مینار اچھی طرح نظر آتے تھے یا پھر کبھی کبھی وہ باغیچہ میں چھوٹے چبوترہ پر بیٹھ جاتی تھی۔

اپنے قیام کے شروع کے چند ہفتے اس نے فلورنس کے عجائب گھروں اور گرجاؤں کی سیر میں گزارے۔ وہ خوشگوار صبحیں اُفیزی اور بارگیلو میں گزارتی یا بازاروں میں یونہی آوارہ گردی کرتی۔ لیکن اب وہ نشیب میں واقع فلورنس میں کم ہی جاتی یا اگر جاتی تو وہ صرف کسی تقریب کے موقع پر ہی جاتی۔ وہ باغ میں بیٹھنے اور کتابوں کے مطالعہ سے مطمئن تھی اور اگر کبھی اس کا دل باہر جانے کو چاہتا تو وہ اپنی فیئٹ دو پہیوں کی کار لے کر نواح کے دیہات کی طرف نکل جاتی۔ ٹسکنی کے اُس پُرفریب معصوم منظر سے زیادہ دُنیا میں اور کیا شے حسین ہو سکتی تھی۔ وہ پھلدار درختوں پر لدے ہوئے پھل اور کونپلوں کا پھوٹنا اور تازہ چھڑکا ہوا رنگ اور اُس کے گرد زیتون کا دائمی سبزہ یہ سب کس قدر فرحت بخش تھا۔ وہ طبیعت میں ایک نیا ہلکا پن محسوس کرتی۔ اپنے شوہر کی غمگین موت کے بعد سے، جسے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا وہ غیر معمولی پریشانیوں میں مبتلا رہی تھی۔ گذشتہ مہینوں میں اسے زیادہ وقت گھر پر رہنا پڑتا تھا کہ وہ وکیل جو اس نے شوہر کی فضول خرچیوں سے بچی کھچی جائداد کے حصول کے لئے کر رکھے تھے۔ اور اسے ہر وقت گھیرے رہتے تھے کسی فوری مشورہ کے لئے ہر وقت اس سے مل سکیں ــــ چنانچہ ان تمام الجھنوں کے بعد وہ بیونارڈ سے اس مکان کو حاصل کرنے کے بعد بہت خوش ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے اعصاب کو آرام دے۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ طے کرے۔ آٹھ سال کی مسرفانہ زندگی اور ناخوشگوار شادی کے بعد تیس سال کی عمر میں اس کے پاس صرف کچھ قیمتی موتی اور صرف اتنی آمدنی کی جائداد بچ گئی تھی کہ وہ سخت کفایت شعاری کے بعد اپنی گذر کر سکے۔ بہر حال یہ غنیمت تھا کیونکہ شروع میں تو وکیلوں نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ اسے بتا دیا تھا کہ قرضے ادا کرنے کے بعد کچھ بھی نہ بچ سکے گا۔ ڈھائی مہینے فلورنس میں گزارنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ مستقبل کا مقابلہ وہ استقلال سے کر سکے گی جب وہ انگلینڈ سے روانہ ہوئی تھی تو اس کے پرانے رفیق وکیل نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپکتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تمہارے لئے کوئی پریشانی نہیں رہی۔ تمہیں صرف اپنی صحت کو بحال کرنا ہے۔ میں تمہاری خوبصورتی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم ایک جوان اور بہت خوبصورت عورت ہو اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تم پھر شادی کرو گی۔ مگر آئندہ محبت کی خاطر شادی مت کرنا یہ ایک بڑی غلطی ہوگی شادی صرف ساتھ اور عزت کے لئے کرنا۔"

وہ یہ سن کر ہنس رہی تھی۔ اسے شادی کا تلخ تجربہ تھا اور وہ آئندہ شادی کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اب وہ بالکل ویسی کرنے کا ارادہ کر رہی تھی جو اس کے وکیل نے کہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس شام اس کے متعلق فیصلہ کرنے والی ہے۔ ریڈگر سوفٹ اس کے بنگلے میں پہنچنے والا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے اس نے فون پر بتایا تھا کہ وہ اچانک لارڈ سی فیرز سے ملنے کینسی جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس سے فوری ملنا چاہتا ہے۔ لارڈ سی فیرز وزیر ہند تھے۔ اس اچانک بلاوے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار ایڈگر کو وہ عہدہ دیا جانے والا ہے۔ جس کے لئے وہ متمنی تھا۔ سر ایڈگر سوفٹ، اس کے والد کی طرح ہندوستانی سول سروس کے آدمی تھے۔ سر ایڈگر کا ماضی بہت ممتاز تھا۔ وہ صوبہ سرحد کا گورنر رہ چکا تھا۔ اور بدامنی کے زمانہ میں غیر معمولی قابلیت سے حالات کو قابو میں رکھا تھا۔ پانچ سال کی گورنری کے بعد وہ ہندوستان میں تعینات برطانوی افسران میں سب سے زیادہ فائق خیال کیا جاتا تھا اس نے خود کو ایک عظیم منتظم ثابت کیا تھا۔ اس میں متضاد خوبیاں تھیں سخت گیری کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور موقع شناس بھی تھا۔ وہ ایک مصلحت پسندی کی حد تک منصف بھی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو اس نے اپنی سیاست میں جکڑ رکھا تھا۔ اور بظاہر یہ دونوں قومیں اسے پسند کرتی تھیں۔ میری اسے بچپن سے جانتی تھی۔ جب اس کے والد جوانی میں مر گئے۔ اور میری اور اس کی ماں کو ہندوستان چھوڑ کر ولایت آنا پڑا۔ تو بھی ایڈگر سوفٹ نے ان سے اپنا تعلق ختم نہ کیا۔ وہ جب کبھی چھٹی گزارنے انگلینڈ آتا تو زیادہ وقت انہیں کے گھر گزارتا۔ جب وہ بچی تھی تو وہ اسکو سرکس اور مزاحیہ تھیٹر میں لے جاتا تھا، عنفوان شباب کو پہنچی تو ڈراموں اور سینما میں اس کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ اسے اسکی سالگرہ پر ہمیشہ تحفے بھیجا کرتا تھا

جب وہ انیس سال کی ہوئی تو اسکی ماں نے اس سے کہا تھا

"میں اگر تمہاری عمر کی ہوتی تو ایڈگر سے اتنا زیادہ نہ ملتی۔ پتہ نہیں تم نے کچھ محسوس کیا یا نہیں، وہ تم سے محبت کرتا ہے!"

میری ہنسی تھی۔

"واہ، وہ تو ایک بوڑھا آدمی ہے بیچارہ!"

"وہ صرف تینتیس سال کا آدمی ہے!" اس کی ماں نے ترشی سے کہا تھا

لیکن جب اس کے دو سال بعد میتھو پیٹن سے شادی کی تو ایڈگر نے اسے کچھ خوبصورت ہندوستانی زمرد تحفہ میں دیئے تھے۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسکی شادی ناخوشگوار رہی تو اس کے ساتھ بہت ہی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اپنی پانچ سالہ گورنری کے بعد جب وہ لندن پہنچا تو یہ معلوم کر کے کہ وہ فلورنس چلی آئی ہے وہ اس سے ملنے کے لئے یہیں چلا آیا۔ وہ کئی ہفتہ سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور میری نے تاڑ لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کی درخواست کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اس سے کتنے عرصے سے خاموش محبت کر رہا تھا۔ ماضی کے متعلق سوچتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ پندرہ سال کی عمر سے ہی وہ اس کا دلدادہ ہے۔ اس وقت ہندوستان سے لندن چھٹی گزارنے آیا تھا اور اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کہ اب وہ بچی نہیں ہے۔ یہ طویل لگاؤ قدرے دلگیر تھا۔ دراصل انیس سال کی لڑکی اور تینتالیس سال کے مرد میں اس وقت جو تفاوت تھا وہ اب تیس سال کی عورت اور ۴۵ سال کے مرد میں نہ تھا۔ یہ تفاوت اب بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ ایک نامعلوم ہندوستانی افسر نہ تھا۔ بلکہ ایک ممتاز اعلیٰ افسر تھا۔ اور وقت کے دھاروں کو موڑ سکتا تھا۔ یہ سوچنا غلط تھا کہ حکومت اسے ملازمت میں نہ رکھے گی۔ اسے یقیناً ایک اہم عہدہ ملنے والا تھا۔ میری کی ماں بھی اب مر چکی تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی عزیز اور رشتہ دار نہ تھا۔ اور اس کے لئے دنیا میں ایڈگر سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔

"کاش کہ میں خود کو آمادہ کر سکتی" اس نے اپنے دل میں کہا۔

وہ اب آنے ہی والا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اس سے کہاں ملا جائے۔ آیا اپنے ڈرائنگ روم میں جس میں آبی رنگ سے وہ مشہور تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جن کا تذکرہ مقامی سیاحت کی کتابوں میں

ہے گا ۔"

وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی گفتگو کا رُخ کدھر جا رہا ہے مگر اُس کی شرارت بھری چنچل اور چمکدار آنکھوں سے اور اپنے رویے سے وہ ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ اس کے عندیے سے بے خبر ہے۔ دیکھتی ہی دیکھتے دل ہی دل میں بہت مسرور ہو چلی تھی۔

"درحقیقت ایک گورنر کے لئے شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ایک مجرد کے لئے اس عہدہ کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔"

جب اُس نے جواب دیا تو اُس کی آنکھوں میں بڑی عجیب شرارت کی جھلک تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے تمہیں بہت سی ایسی معقول عورتیں مل جائیں گی جو تمہارے اس ٹھاٹ باٹ میں خوشی سے حصہ بٹانا چاہیں گی۔"

"میں ہندوستان کے پچھلے تیس سال کے قیام میں یہی سوچتا رہا کہ بہت سی عورتیں مجھ سے شادی کرنا پسند کریں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی عورت ہے جس سے میں شادی کرنے کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔"

اب بات قریب آ چکی تھی۔ اسے ہاں کہنا چاہیئے یا نہیں، اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے تم ضرور جانتی ہو گی کہ مجھے تم سے اُس وقت سے بے پناہ محبت ہے جب سے تم نے بال کٹوانے شروع ہی کئے تھے۔"

وہ اس کا کیا جواب دیتی صرف ہنس سکتی تھی۔

"اوہ ایڈگر آج تم کیسی باتیں کرنے لگے۔"

"میں نے دنیا میں جتنی بھی جاندار چیزیں دیکھی ہیں تم ان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش اخلاق ہو۔ دراصل میں سمجھتا تھا کبھی یہ بتانے کا موقع نہیں آیا۔ میں تم سے پچیس سال بڑا ہوں اور تمہارے باپ کا ہمعصر تھا۔ اور مجھے شک ہے کہ تم بچپن میں مجھے عجیب اگلے وقتوں کا آدمی سمجھتی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔" میری اونچی آواز میں بولی۔ اس میں کچھ کچھ سچائی بھی تھی۔

"بہرحال جب تم محبت میں گرفتار ہو چکیں تو یہ قدرتی بات تھی کہ تم اپنے ہم عمر سے محبت کرتیں۔ میں تم سے یقین کرنے کی استدعا کرتا ہوں کہ جب مجھے تمہاری شادی کی خبر ہوئی تو میں صرف یہی چاہتا تھا کہ تمہاری اور اُس کی زندگی خوشگوار گذرے۔ اور جب مجھے علم ہوا کہ تم خوش نہیں ہو تو مجھے سخت دماغی تکلیف پہنچی۔"

"ہماری شادی کی ناکامی کا سبب شاید ہمارا کم عمری میں شادی کرنا تھا۔"

"اُس وقت سے لے کر اب تک کئی خطوط گذر چکے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ ہماری عمروں کا تفاوت اب بھی اتنا اہم ہے جتنا پہلے تھا۔"

اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا اور میری نے سوچا اُسے کا سلسلہ کلام منقطع نہ کرے۔

"میری، میں اپنی صحت کا بہت خیال کرتا ہوں۔ مجھے اپنی عمر کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا عجیب پہلو یہ ہے کہ وقت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تمہاری خوبصورتی تو پہلے سے بھی زیادہ دوبالا ہو گئی ہے۔"

وہ مسکرائی۔

"ایڈگر کیا یہ ممکن ہے کہ تم بھی مدح سرائی بن سکتے ہو۔ میں تمہیں نو عمر آدمی سمجھتی تھی اور آج تم خلافِ اُمید بدلی ہوئی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم بڑی سرپرست ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ جہاں تک نوتادی آدمی کا تعلق ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری محبت میں ہمیشہ میں روئی کا گالا بنا رہا ہوں۔"

"کیا میں یہ سمجھنے کا حق بجانب ہوں کہ تم مجھ سے شادی کی فرمائش کر رہے ہو؟"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہیں اچنبھا ہوا یا صدمہ؟"

"یقیناً مجھے کوئی صدمہ نہیں۔ تم جانتے ہو ایڈگر میں تمہیں بہت عزیز رکھتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں۔ جتنے انسانوں سے بھی میں آج تک ملی ہوں تم ان میں سب سے زیادہ باکمال ہو۔ میری انتہائی عزت افزائی ہے کہ تم مجھ سے شادی کی فرمائش کر رہے ہو۔"

"تو کیا تم راضی ہو؟"

اُس کے دل میں عجیب قسم کا شک پیدا ہوا۔ وہ یقیناً بہت خوبصورت تھا۔ بنگال کے گورنر کی بیوی بننا یقیناً بڑا ہیجان خیز تھا۔ اُس کے ارد گرد اے۔ ڈی۔ سی رہیں گے۔ جو اس کے احکامات پر سرِ تسلیم خم کیا کریں گے۔

ملتا تھا اور جس میں نشاۃ ثانیہ کے زمانہ کا شاہی فرنیچر اور شمعدان آراستہ تھے۔ لیکن وہ ذہنی اور پرتکلف کرہ تھا اور اُس نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اس کمرہ میں بیٹھنے سے ایک عجیب قسم کے سنجیدہ پن کا احساس ہوگا۔ اس لئے سوچ اُسکا استطار چبوترہ پر بیٹھ کر ہی کرنا چاہیئے۔ جہاں وہ تمام کو ہیٹ کرتی تھی اور اس پر سے نظر آنے والے منظر سے وہ کبھی نہ تھکتی تھی یہ نسبتاً بے تکلیف جگہ ہے۔ کیا وہ واقعی اس سے شادی کے متعلق کہے گا۔ اگر ایسا ہے تو دونوں کے لئے ایسے ماحول میں بات کرنا آسان تر رہے گا۔ چائے کی میز پر جیکہ وہ کیک کا نرم ٹکڑا دانتوں سے کتر رہی ہوگی۔ وہ بے تکلفی سے اس سے دل کی بات کہدے گا۔

جائے وقوع مناسب اور کسی حد تک رومانی تھی چبوترہ کے سرے پر چینی کے بڑے بڑے گملوں میں سنترے کے درخت رکھے ہوئے تھے۔ جن کے بھوں گملوں کے کناروں پر جھول رہے تھے۔ چبوترہ ایک پرانے پتھر کے جنگلے سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑے بڑے پیالے بنے ہوئے تھے اور اُس کے سروں پر کسی بدنما پیشوا کے خستہ حال بت نصب تھے

میری ایک لمبی بیت کی کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور اُس نے اپنی خادمہ نینا کو چائے لانے کا حکم دیا۔ دوسری کرسی ایڈگر کا انتظار کر رہی تھی۔ آسمان پر بادل بالکل نہ تھے۔ اور نیچے گھاٹی میں شہر جون کی سہ پہر کی نرم دھوپ میں نہا رہا تھا۔ معاً اُسے بنگلہ کی سمت آتی ہوئی ایک کار کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحہ بعد اس کے خادم نینا کے شوہر سیرو نے ایڈگر کو چبوترہ پر پہنچا دیا۔ نیلی سرج کے سوٹ اور کالے فیلٹ ہیٹ میں اس کا لمبا جسم کسرتی اور ممتاز نظر آ رہا تھا۔ اگر میری اُس سے واقف بھی نہ ہوتی تب بھی وہ یہ قیاس کر سکتی کہ وہ ایک اچھا ٹینس کا کھلاڑی شہسوار اور نشانچی ہے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا۔ اُس کے سر کے بال کالے اور گھنگر یالے تھے اور مشکل ہی سے کوئی بال سفید ہوگا۔ اس کا چہرہ ہندوستانی دھوپ سے تانبہ کے رنگ کی طرح سرخ ہوگیا تھا۔ اس کا چہرہ پتلا، ٹھوڑی مضبوط اور ناک کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھوری اور تیز بین تھیں۔ چوّن[۵۴] سال؟

وہ پینتالیس سال سے ایک دن بھی زیادہ نہ معلوم دیتا تھا۔ ایک خوبصورت انسان جو کامیابی کے زینہ پر کھڑا ہے۔ اس کی شخصیت میں وقار تھا۔ اس میں اعتماد کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ وہ شخصیت تھی جسے کوئی اچانک واقعہ یا حادثہ نہ گھبرا سکتا تھا۔ وہ بے مقصد اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضایع نہ کرتا تھا۔

سی فیر نے آج مجھے فون کیا اور بنگال کی گورنری کی پیشکش کی ہے۔ وہ طے کر چکا ہے کہ موجودہ صورت حال میں انگلینڈ سے کوئی نیا آدمی اس عہدہ پر نہ بھیجا جائے گا۔ کیونکہ اسے پہلے وہاں کے حالات کو سمجھنا ہوگا۔ اس لئے وہ ایسے آدمی کو اس عہدہ پر بھیجنا چاہتا ہے جو وہاں کے حالات سے واقف ہو" اس نے رسمی گفتگو کے بعد کہا۔

"تم نے یقیناً اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے" میری بولی

"بالکل۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے ہر شخص مشتاق تھا"

"مجھے بہت ہی خوشی ہوئی"

"مگر مجھے اس سلسلے میں بہت کچھ گفت و شنید کرنی ہے اور میں نے آج شام ہی ملان جانے کا انتظام کر لیا ہے۔ جہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز میں کشتی پیچکر لارڈ سی فیر سے ملوں گا۔ مجھے دو تین دن لگیں گے۔ اور وہاں میرا مل نہ سکے گا۔ مگر سی فیر مجھ سے فوری ملنا چاہتا تھا" وہ بولا

"یقیناً"۔ میری بولی۔

اُس کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جو عہدہ مجھے مل رہا ہے وہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اگر میں اس فرض سے عہدہ برآ ہوگیا ——— تو میری مقبولیت اور عزت میں نمایاں اضافہ ہوگا"

"مجھے یقین ہے تم ضرور کامیاب رہوگے"

"اس عہدہ کا مطلب ہے بہت زیادہ کام اور ذمہ داری۔ اور میں ان چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔ درحقیقت اس کا نعم البدل بھی کم نہیں بنگال کا گورنر ایک بڑی عمارت میں رہتا ہے اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں تعجب نہیں کہ مجھے یہ شاٹھ باٹ پسند ہیں۔ بنگال کے گورنر کا گھر ایک محل سے کم نہیں اور میرے یہاں دعوتوں کا سلسلہ بکثرت

"تو کیا سچ مچ تم دو تین دن کے باہر جا رہے ہو؟"

"ہاں صرف تین دن کے لئے کیونکہ سو نیز پھر لندن جانے گا۔"

"کیا تم اپنی واپسی تک صرف تین دن تک میرے جواب کا انتظار کر سکتے ہو؟"

"یقیناً! میں سمجھتا ہوں موجودہ حالات میں یہ بہت مناسب ہوگا۔ مجھے یقین ہے یہ بہت اچھا ہوگا کہ تم اپنی رائے کو خوب پختہ کر لو۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر جواب نفی میں ہو تاکہ تمہیں مزید سوچنے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" وہ مسکرائی۔

"اچھا تو بات کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اب مجھے رخصت ہونا چاہیئے ورنہ ریل کے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر ہے۔"

وہ اُسکو ٹیکسی تک چھوڑنے کے لئے ساتھ ہولی۔

"خوب یاد آیا۔ کیا تم نے شہزادی کو کہہ دیا ہے کہ تم آج رات وہاں نہ جا سکو گے؟"

اُن دونوں کو شہزادی سان فرڈیننڈو نے رات کے کھانے کی پارٹی میں دعوت دے رکھی تھی۔

"ہاں میں نے اُسے فون کر دیا ہے کہ میں دو تین دن کے لئے فلورنس سے باہر جا رہا ہوں۔"

"کیا تم نے اُسے بتایا کس لئے باہر جا رہے ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے وہ کھوسٹ بڑھیا کتنی شریر ہے۔" وہ دلجوئی کے انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری دعوت کی عدم شرکت کی معذرت پر بہت مضطرب ہوئی اور مجھے صورت حال کا اعتراف کرنا پڑا اور اُسے اصل واقعہ بتانا پڑا۔"

"پھر اُسے تمہارا نعم البدل تلاش کرنا پڑے گا۔" میری نے یوں ہی کہہ دیا۔

"میں تمہیں مشورہ دوں گا تم اپنے ملازم سیرو کو ساتھ لے جانا۔ کیونکہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا۔"

"نہیں بھئی۔ میں نے سیرو اور نینا سے کہہ دیا ہے کہ شام کو اُنکی ضرورت نہ پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ان سنسان سڑکوں پر رات کو تنہا موٹر نہ چلانا چاہیئے۔ اچھا تو تم اپنے عہد پر عمل کرو گی۔ ہے نا؟"

"کون سا عہد؟ اچھا وہ پستول والا عہد۔ ارے بھئی یہ تو بڑا مضحکہ خیز سا ہے۔ یہاں کی سڑکیں اتنی ہی محفوظ ہیں جتنی انگلینڈ کی۔ بہرحال تمہارے اطمینان کی خاطر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں پستول ضرور ہمراہ لے جاؤں گی۔"

ایڈگر کو یہ معلوم تھا کہ میری کو تنہا موٹر میں گشت کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور انگریزوں کے عام خیال کے مطابق وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ غیر ملکی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لئے اُس نے اُسے ایک پستول دے رکھا تھا اور اس سے یہ عہد کرا رکھا تھا کہ وہ جب بھی گھر سے باہر جائے گی اُسے اپنے ساتھ باہر لے جائے گی۔

"یہ علاقہ بیکاروں اور مہاجرین سے پٹا ہے۔" اُس نے کہا۔ "مجھے تمہاری طرف سے ہر وقت فکر رہتی ہے تاوقتیکہ مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ ضرورت پڑنے پر تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"

اُس کے ملازم سیرو نے ٹیکسی کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ ایڈگر نے پانچ روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکالا۔ اور اُسے تھما دیا۔

"دیکھو سیرو میں آج باہر جا رہا ہوں اور رات کو انہیں لینے نہ آ سکوں گا۔ جب یہ دعوت میں جائیں تو پستول انہیں ضرور یاد دلا دینا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"بہت بہتر حضور" ملازم بولا۔

۲

میری آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اُس کی خادمہ نینا اُس کے پیچھے کھڑی ہوئی اسے مناسب مشورے دے رہی تھی۔ نینا بنگلہ کے مالکان کی بہت عرصہ سے ملازم تھی۔ اور انگریزی بول سیکھ گئی تھی۔ اور اپنے پانچ ماہ کے قیام میں میری نے بھی اطالوی زبان حسب سیکھ لی تھی۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کی بات خوب سمجھ لیتے تھے۔

"نینا کیا تمہارا خیال ہے میں نے سُرخی زیادہ لگائی ہے؟"

"جب آپ کا رنگ قدرتی خوبصورت ہے تو پھر آپ نے سُرخی لگائی ہی کیوں ہے؟"

"بات یہ ہے پارٹی میں جو دوسری عورتیں ہوں گی وہ خوب سرخی تھوپ کر آئیں گی اور اگر میں نے ذرا سی بھی سُرخی نہ لگائی تو میں بہت بھدی لگوں گی۔"

اُس نے اپنا فراک پہنا ——— جن زیورات کو آج پہننا چاہتی تھی وہ بھی زیب تن کئے۔ پھر ایک بہت خوبصورت ہیٹ اٹھایا کیونکہ وہ پارٹی

اس قسم کی تھی جس میں یہ لباس موزوں تھا۔ پارٹی ایک ایسے ریسٹوران میں دی جا رہی تھی جو ندی کے کنارے تھا۔ اور جہاں کھانا بہت اعلےٰ بنتا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے جون کے چاند کی روشنی میں ندی کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے مکانوں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ بوڑھی شہزادی نے ایک مغنی کا انتظام کیا تھا جس کی سُریلی آواز کی وہ بہت مداح ہے۔ اور وہ اپنے مہمانوں کو پوری طرح خوش کرنا چاہتی تھی۔

میری نے اپنا پرس اُٹھایا۔

"اَب مَیں تیار ہوں۔"

"حضور آپ پستول لینا تو بھول ہی گئیں۔" پستول سنگار دان پر پڑا تھا۔ میری ہنس پڑی۔

"ارے پگلی اسی کو تو مَیں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی پستول نہیں چلایا۔ اور مجھے اسے لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میرے پاس لائسنس نہیں ہے اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو مجھے بلاوجہ پریشان ہونا پڑے گا۔"

"حضور نے سرکار سے وعدہ کر لیا تھا کہ اسے ساتھ لیجائینگی۔"

"سرکار تو نرے وہمی ہیں۔"

جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" نینا نے جذباتی ہو کر کہا۔

میری کچھ سوچنے لگی۔ وہ اس معاملہ کو زیادہ اہمیت نہ دینا چاہتی تھی۔ اطالوی ملازم بہت اطاعت شعار اور محنتی ہوتے ہیں۔ میری جانتی تھی کہ نینا اس موضوع پر اس سے دل کھول کر بات کرنا چاہتی ہے اس نے اپنا پرس کھولا۔

"اچھا تو اس کمبخت کو بھی ڈالے لیتی ہوں۔"

بیرو نے گراج سے گاڑی نکال دی تھی۔ کار چھوٹی اور کپڑے کی چھت کی تھی۔ میری نے اُسے بنگلہ کرایہ پر لیتے وقت خریدا تھا۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔ اور اسٹارٹ کر کے احتیاط سے چل پڑی۔ اور لوہے کے پھاٹک کو طے کرنے کے بعد ایک پرپیچ سڑک پر مڑ گئی۔ اور جب وہ بڑی سڑک پر پہنچی تو بتی جلا کر گھڑی میں وقت دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ ابھی بہت وقت باقی ہے۔ کار کو فرحت بخش انداز میں کم رفتاری سے

چلانا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشہ میں وحشت کی ناخوشگواری کا احساس جاگ رہا تھا۔ وہ آج اپنے بنگلہ کے چبوترہ پر کھانا کھانے کو پسند کرتی اور جون کی خوشگوار رات میں تادیر کھانا کھانے کے بعد وہیں بیٹھی رہتی۔ ایسا کرنے سے میری کبھی نہ اُکتاتی تھی۔ اس میں اسے بہت خوشگوار سکون ملتا تھا۔ یہ سکون اس قسم کا نہ تھا جو کاہلی کی پیداوار ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں اُسکا ذہن اور اس کا احساس جاگتا رہتا تھا۔ غالباً یہ تسکین کی فضا اور اُس میں گھلی ہوئی ہوا کا اثر تھا کہ انسان کی جسمانی خواہشات میں بھی روحانیت سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سکون میں ایسا احساس کارفرما رہتا تھا جو موزارٹ کی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جس کی فرحت خیز دُھنوں کے نیچے غم کی لہریں اس طرح اُبھرتی ہیں کہ آدمی خوشی اور طمانیت کے احساس سے جھوم اٹھتا ہے اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ گوشت پوست کے وجود سے ماورا بھی کوئی چیز ہے۔ اس سکون میں موسیقی کی دُھنوں کی طرح کچھ منٹ کے لئے آدمی زندگی کی ہما ہمی اور الجھنوں سے بے نیاز ہو کر خود کو صرف محبت اور سکون کا محور سمجھنے لگتا ہے۔

"مَیں نے گھر سے نکل کر حماقت کی۔" میری خود سے کہنے لگی۔ "جب ایڈگر ہی اس دعوت میں نہیں جا رہا تو مجھے بھی منع کر دینا چاہئے تھا۔ مگر یہ بھی بڑی حماقت ہوتی۔ وہ تنہائی میں ایڈگر سے کی گئی بات چیت پر اب خوب غور کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس نے ایڈگر کے ارادہ کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا لیکن آج سہ پہر تک اُسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ وہ آخر شادی کی فرمائش کر ہی دے گا۔ اور اسی لئے اُس نے اس مسئلے پر کسی جواب کے متعلق آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت اور غیر ضروری سمجھا تھا۔ اُس نے اسے لمحاتی کیفیت پر اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب جبکہ وہ فرمائش کر چکا ہے تو اُسے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ شہر میں پہنچ چکی تھی اور سائیکل سوار اور پیدل چلنے والوں نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی توجہ دوسری طرف سے ہٹا لے اور احتیاط سے گاڑی چلائے۔

جب میری ریسٹوران میں پہنچی تو اُسے معلوم ہُوا کہ وہ سب سے آخر میں پہنچی ہے۔ شہزادی سان فرینیڈو امریکہ کی رہنے والی تھی۔ وہ ایک معمر عورت تھی اور اُس کے بال نیم سفید تھے۔ اُس کے اطوار تمکنانہ تھے وہ چالیس سال سے اٹلی میں مقیم تھی اور اس عرصہ میں کبھی اپنے وطن نہ گئی

تھی۔ اُس کا شوہر ایک روسی شہزادہ تھا۔ جس کا پچیس سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جو اٹلی کی فوج میں ملازم تھے۔ اُس کے پاس زیادہ دولت نہ تھی۔ اُس کی عادت بہت اچھی تھی مگر اُسکی زبان میں درشتگی تھی۔ اُس کا قد سیدھا تھا اور اس کی آنکھیں بڑی تھیں۔ جوانی میں اگرچہ وہ خوبصورت نہ تھی مگر اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اب پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی۔ کہا جاتا ہے اُس نے شوہر کے ساتھ وفا نہیں کی مگر اس کی حیثیت پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہر شخص سے واقف تھی اور ہر آدمی اس سے خوش تھا۔ اسکے علاوہ دعوت میں ایک انگریز سیاح کرنل گرسیس ٹریل اور اُنکی بیوی ایک انگریز نوجوان روپلے فلنٹ اور کچھ اطالوی معززین شریک تھے۔ میری نے اٹلی کے قیام میں روپلے فلنٹ سے بخوبی واقفیت ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ اُس کی طرف بہت توجہ دے رہا تھا۔

"ممبئی میں تو اس پارٹی میں اچانک بلا لیا گیا ہوں" اُس نے میری سے مصافحہ کے وقت کہا

"ان کی یہ بہت بڑی مہربانی ہے" شہزادی بولی "جب مسٹر ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ پارٹی میں نہ آسکیں گے تو میں نے اس سے درخواست کی۔ اس نے یہاں آنے کی خاطر ایک دوسری دعوت کو ترک کر دیا"

"شہزادی صاحبہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آپ کی دعوت میں آنے کے لئے میں دنیا بھر کی دعوتیں ٹھکرا سکتا ہوں" وہ بولا۔ شہزادی خشک انداز میں مسکرائی۔

"بات یہ ہے کہ میری دعوت قبول کرنے سے پہلے یہ صحیح صحیح جاننا چاہتا تھا کہ دعوت میں کون کون آرہا ہے"

"یہ ہماری عزت افزائی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ دعوت میں شرکت منظور کر لی" میری نے کہا۔

شہزادی نے روپلے کی طرف اُس مخصوص خاموش مسکراہٹ سے دیکھا جو اُس کی عیاش مزاجی کی عکاسی کر رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں اُس کا شوخ ماضی جھلک رہا تھا۔ جسے نہ اُس نے بھلایا تھا اور نہ جس پر اُسے افسوس تھا بلکہ یہ مسکراہٹ اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ ساری دُنیا کو خوب سمجھتی ہے اور خود سب سے زیادہ پاک چلن ہے۔

"روپلے تم بڑے اکھڑ ہو اور تمہارے پاس معذرت کے لئے کوئی معقول بات نہیں۔ بہرحال ہم لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں" شہزادی بولی۔

یہ صحیح ہے کہ روپلے دیکھنے میں کچھ زیادہ خوش اندام نہ تھا۔ اُس کی شخصیت گوارا تھی۔ وہ متوسط قد کا آدمی تھا اور کپڑوں میں کسی قدر موٹا معلوم دیتا تھا۔ اس کے خد و خال میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے اچھا کہا جا سکے۔ اُس کے دانت سفید تھے لیکن متوازی نہ تھے۔ اس کا رنگ تازہ تھا۔ مگر کھال صاف نہ تھی۔ اس کے بال گھنے تھے لیکن بال بے ترتیب رنگ کے تھے۔ جیسے کالے اور سفید رنگ کی آمیزش سے بنے ہوں۔ اُس کی آنکھیں خوب بڑی تھیں۔ مگر اُن کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ جسے کچھ کچھ بُرا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت سے پراگندگی ٹپکتی تھی۔ اور جو لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اُسے مکار، بدمعاش کا خطاب دیتے تھے۔ اُس کے عزیز ترین دوست اس بات کا اعتراف کرتے تھے وہ قابلِ اعتماد آدمی نہیں۔ اس کا ماضی خراب تھا۔ جب وہ بیس سال کا تھا تو ایک ایسی لڑکی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ جس کی منگنی کسی اور سے ہو چکی تھی۔ تین سال بعد وہ ایک طلاق کے مقدمہ میں ماخوذ پایا گیا۔ اور جب اس عورت کو اس سے ناجائز تعلقات کی بنا پر طلاق ہو گئی تو اسکی بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کر لی۔ پھر اُس نے بجائے اُس عورت سے شادی کرنے کے جس کو اس کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی۔ ایک اور عورت سے شادی کر لی اور دو تین سال بعد اسکو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ تیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

درحقیقت وہ ایک بدنام اور جوان آدمی تھا اور وہ اپنے حالات کی وجہ سے اس بدنامی کا مستحق بھی تھا۔ غرض اُس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اُسے مقبول بناتی۔ کرنل ٹریل جو ایک معزز اور جانفیہ آدمی تھے حیران تھے کہ شہزادی نے اس جیسے بدقماش اور آمدہ آدمی کو دعوت پر کیسے مدعو کر لیا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی اس لائق نہیں کہ کوئی معقول عورت اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھ سکے" اگر موقع ملتا تو وہ یہ جملے ضرور کہہ دیتا۔

اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اگرچہ اُسکی بیوی روپلے کے برابر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر وہ اسکی باتوں کو پسند نہیں کرتی۔ اس کا سب سے بالاتر پہلو یہ تھا کہ یہ شخص کوئی جمہوریت پسند انسان نہ تھا۔ دراصل وہ اس کی بیوی کا دُور کے رشتہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اسکی ایک معقول

آمدنی تھی۔ آج تک اُس نے کبھی کما کر نہ کھایا تھا۔ بہرحال ہر خاندان میں ایک نکما بھی ہوا کرتا ہے۔ کرنل کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آتی تھی کہ عورتیں روڈے میں کیا خوبی دیکھتی ہیں جو اُس پہ مرنے لگتی ہیں۔ اس سیدھے سادے انگریز کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ روڈے کی شخصیت میں بڑی جنسی اپیل ہے۔ اور عورتوں کے متعلق اُس کے رویہ نے اسے اور بھی اہمیت دے دی تھی۔ کوئی عورت اس سے کتنی ہی بدظن کیوں نہ ہو اگر اُس کے ساتھ نصف گھنٹہ تنہائی میں گزار لے تو اسکی بری طرح گرویدہ ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے بعد وہ کہنے لگتی ہے کہ روڈے کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔ اور اگر اُس سے معلوم کیا جائے کہ اُس نے روڈے میں کیا دیکھا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے گی۔ وہ دیکھنے میں کوئی خاص خوبصورت نہ تھا بلکہ کسی کارخانے کا مزدور سا لگتا۔ وہ اپنے کپڑے لاپرواہی سے پہنتا تھا۔ اُس کے مزاج میں لاپرواہی جھلکتی تھی۔ جیسے وہ کپڑوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو یہ بات جھنجلاہٹ کا باعث تھی کہ وہ کسی چیز کو بھی اہمیت نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ محبت کرنے کو بھی۔ اس کی شخصیت سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ عورت سے صرف ایک چیز چاہتا ہے۔ اُسکی شہوت پرستی خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اُس میں ایک طرح کی شرافت ایسی بھی تھی جس کی وجہ سے آدمی ایک دم ہنسنے لگتا۔ اُس کے بے باک رویے کے پیچھے ایک گرم خلوص بھی تھا۔ وہ عورتوں کو مردوں کی نسبت ایک عجیب مخلوق سمجھتا تھا۔ جس سے عورتیں بہت متاثر ہوتی تھیں اُس کے چہرے میں ایک عجیب سحر اور آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

بوڑھی شہزادی نے معاملہ کو بڑی خوبصورتی سے سلجھا دیا۔

"سچ مچ یہ بہت برا آدمی ہے۔ ایک بہت ہی برخود غلط آدمی۔ اگر میں تیس سال چھوٹی ہوتی اور یہ مجھ سے بھاگ چلنے کو کہتا تو میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مجھے ایک ہفتہ بعد چھوڑ دیگا اور میں تمام عمر بربادی میں گزاروں گی ایک لمحہ کے لئے بھی نہ جھجکتی۔"

شہزادی عام بات چیت کی شوقین تھی اور جب تمام مہمان اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو اس نے میری سے خطاب کیا۔

"مجھے سر ایڈگر کی عدم شرکت کا بہت افسوس ہے۔"

"جی ہاں انہیں بھی بہت افسوس تھا مگر انہیں کینس جانا پڑ گیا۔"

پھر شہزادی نے پوری پارٹی کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ ایک بڑا راز ہے۔ آپ سب اپنے تک ہی محفوظ رکھیں وہ بنگال کے گورنر بنا دیئے گئے ہیں۔"

"واللہ سچ مچ!" کرنل تقریباً چیخ پڑا۔ "یہ تو بہت بڑا عہدہ ہے۔"

"کیا تمہیں اچنبھا ہوا؟" شہزادی بولی۔

"نہیں انہیں معلوم تھا کہ وہ اس عہدہ پر فائز کئے جانے والے ہیں"۔ میری نے کہا۔

"وہ اس جگہ کے لئے موزوں ترین آدمی ہے۔ اس کے متعلق کوئی شک نہیں کیا جا سکتا!" کرنل بولا۔ "اگر وہ اس مقام پر کامیاب رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اُسے ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا جائے۔"

"میں دنیا میں وائسرائن بننے سے زیادہ اور کسی چیز کو پسند نہیں کرتی"۔ شہزادی بولی۔

"تو تم اُن سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں!" میری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ شادی شدہ نہیں ہیں"۔ کرنل کی بیوی بولی۔

"نہیں!" شہزادی نے میری کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے یہ حقیقت نہیں چھپانا چاہتی کہ وہ اپنے قیام کے پچھلے چھ ہفتوں میں مجھ سے شدید اظہار محبت کرتا رہا ہے۔"

روڈے ہنسنے لگا اور اُس نے میری کی طرف منہ پھیر کر دیکھا

"تو پھر کیا شہزادی تم نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس بے چارے کو زندگی کا لطف اُٹھانے کا زیادہ موقع نہ ملے گا۔"

"میرا خیال ہے یہ بہت ہی مناسب جوڑ رہے گا"۔ میری بولی۔

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ روڈے اور شہزادی دونوں اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں لیکن وہ انہیں کسی بات کا علم نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ ایڈگر سوفٹ نے اپنے قیام کے دوران میں سب پر یہ بات بخوبی واضح کر دی تھی۔ کہ وہ میری سے محبت کرتا ہے اور

شہزادی کو یہ بات معلوم کرنے کے لئے بے قرار تھی کہ اس رومان کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا — یا نہیں !"

" میرا خیال ہے شہزادی تمہیں معلوم ہے کی اب دعوا موافق نہ آئے گی " کرنل کی بیوی نے کہا۔ وہ اس گفتگو کو سنجیدگی پر مبنی سمجھ رہی تھی۔

" اوہ ! اب میری عمر ایسی نہیں کہ میں شادی کروں " شہزادی بولی " میں تو بس دل بہلانے کے لئے ملتی ہوں۔ اسی لئے تو رومیو کے لئے میرے دل میں خاص جگہ ہے۔ مگر اسکی نیت صاف نہیں !"

کرنل نے اپنی پلیٹ پر جیں بجیں ہو کر نظر جمالیں اور اسکی بیوی طنزاً مسکرا دی۔

اس ریسٹوران میں آرکسٹرا کا بھی انتظام تھا۔ باجے والوں کا لباس سلیقے کا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی بولی

" میرا خیال ہے اب مغنی کو بلوانا چاہیئے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ وہ بہت میٹھے سروں میں گاتا ہے۔ ریسٹوران کا مالک اسے باقاعدہ گانے کی تعلیم دلانا چاہتا ہے۔ اس نے ہیڈ ویٹر کو بلایا " اس آدمی سے گانے کو کہو جس نے اس دن میری موجودگی میں گایا تھا "

" یور ایکسیلینسی مجھے افسوس ہے کہ وہ آج آیا نہیں ہے۔ وہ بیمار ہے "

" یہ تو بڑی تکلیف دہ خبر سنائی۔ میں اپنے احباب کو خاص طور سے اس کا گانا سنوانا چاہتی تھی۔ میں نے ان لوگوں کو اس ریسٹوران میں صرف اسی لئے دعوت دی تھی۔"

" اس نے اپنے عوض دوسرا آدمی بھیجا ہے۔ مگر وہ صرف وائلن بجاتا ہے۔ میں اس سے وائلن بجانے کو کہتا ہوں "

" مجھے موسیقی میں صرف وائلن پسند نہیں " اس نے جواب دیا۔

ہیڈ ویٹر نصف درجن سے زیادہ زبانیں بخوبی بول سکتا تھا۔ مگر سمجھتا ایک کو بھی نہ تھا۔ اس نے شہزادی کی گفتگو سے یہ سمجھا کہ وہ اس کے مشورہ سے خوش ہو گئی اور وائلن والے سے وائلن شروع کرنے کو کہا اس پر اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور کورنش بجا لایا۔ وہ ایک گورا اور لمبا نوجوان تھا۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں سے بھوک اور افلاس ٹپکتا تھا۔ اور اس کے چہرہ سے افسردگی جھلکتی تھی۔ سازندوں کے بھڑکیلے لباس میں وہ عجیب روہانسا سا لگ رہا تھا۔ وہ بھوک کا ستایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چکنا چہرہ پتلا تھا اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اس نے وائلن پر ایک گت شروع کر دی۔

" ارے بھائی یہ تو بہت خراب نکلا " شہزادی نے ہیڈ ویٹر سے کہا۔

اس مرتبہ ویٹر نے بات کو سمجھ لیا۔

" بے شک شہزادی صاحبہ یہ کوئی خاص نہیں بجاتا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ چلہ والا آدمی کل ہی آ جائے گا۔"

وائلن والے کو روک دیا گیا اور آرکسٹرا پھر شروع ہو گیا۔ رومیو نے برابر بیٹھی ہوئی میری کی طرف دیکھا اور بینڈ کی اونچی آواز سے فائدہ اٹھا کر میری سے بولا۔

" آج تم بہت حسین نظر آ رہی ہو "

" شکریہ " میری نے جواب دیا۔

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

" کیا میں تمہیں وہ بات بتاؤں جو میں خصوصیت سے تمہارے متعلق محسوس کرتا ہوں ! دوسری عورتوں کی نسبت جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم خوبصورت ہو تو تم اسے جھوٹ نہیں سمجھتیں۔ تم اسے بالکل قدرتی بات سمجھتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی تم سے کہے کہ تمہاری انگلیاں پانچ ہیں۔"

" جب تک میں نے شادی نہیں کی تھی میرا حسن ہماری روزی کا ذریعہ تھا۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میری اور میری والدہ کی گذران کی پنشن میں تھی۔ جب میں نے مدرسہ کی تعلیم ختم کی تو مجھے صرف میری خوبصورتی کی بدولت فوراً اداکاری مل گئی۔ میرا حسن میری خوش قسمتی کا باعث ہے۔"

" میرا خیال ہے تم فلمی زندگی میں لاکھوں پیدا کرتیں۔"

وہ ہنس پڑی۔

" بدقسمتی سے مجھ میں اچھی اداکاری کی صلاحیت نہ تھی۔ بس صرف خوبصورتی ہی خوبصورتی تھی۔ اگر میں کچھ دن فلم میں اور کام کرتی تو شاید اداکاری میں بھی کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے شادی کر لی اور اداکاری چھوڑ دی۔"

اس کے چہرہ پر ایک ہلکی سی لہر دوڑنے لگی اور اسے ایک لمحہ

کے لئے اپنے ماضی کی یاد آگئی۔ روبے اس کی طرف برابر دیکھتا رہا۔ درحقیقت وہ بہت ہی خوبصورت واقع ہوئی تھی۔ صرف اس کے خدوخال ہی موزوں نہ تھے۔ بلکہ اس کا رنگ بھی نہایت شاندار تھا۔

"تم سونے کا ایک حسین مجسمہ ہو۔ ٹھیک ہے نا؟" روبے نے کہا۔

اُس کے بال گہرے سنہری تھے۔ اس کی بڑی آنکھیں گہری عنابی تھیں۔ اور اُس کی جلد زرد سنہری۔ یہ اُس کا رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اُس کا حسن سرد اور بے جان نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے رنگ سے حرارت اور اُس کے خدوخال سے شدید جاذبیت ٹپکتی تھی۔

"میرا خیال ہے میں نے دنیا میں جتنی بھی عورتیں دیکھی ہیں تم اُن میں سب سے زیادہ حسین ہو۔" روبے بولا۔

"تم نے کتنی عورتوں سے یہ بات اور کہی ہے؟"

"بہتوں سے۔ مگر جب میں تم سے کہتا ہوں تو اس کی سچائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"بہرحال ہمیں اس موضوع کو ختم کر دینا چاہیئے۔"

"کیوں؟ یہی تو میرا محبوب ترین موضوع ہے۔"

"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے برابر یہی کہہ رہے ہیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ اور اب ان جملوں کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ یہ ایک سرمایہ ہے اور یہ میری بے وقوفی ہوگی اگر میں اس کی قیمت کا شعور نہ رکھوں۔ بہرحال خوبصورتی کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔"

"تم بہت سمجھدار لڑکی ہو۔"

"اب تم مجھ سے ایسی بات کہنے لگے جو میرے نفس کو بہکائیگی۔"

"میں تمہیں بنا نہیں رہا۔"

"تم بیچ بیچ آگے بڑھ رہے ہو۔ بہت سے لوگوں نے اسی طرح میری طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ تم بالکل اس کہاوت پر عمل کر رہے ہو کہ ایک عام لڑکی کو سیب پیش کرو اور ایک خوبصورت لڑکی کو کتاب پیش کرو۔ اُسے مطلق شرمندگی نہ ہوگی۔"

"آج تمہارے تیور کچھ ٹھیک نہیں معلوم دیتے۔"

"افسوس کہ تم یہ سوچتے ہو۔ میں تم سے نہایت صفائی کے ساتھ بتا دوں کہ مجھ سے تمہیں کچھ حاصل ہو سکے گا۔"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تم سے شدید محبت ہوگئی ہے؟"

"غالباً شدید کا لفظ موزوں نہ ہوگا۔ تم نے پچھلے ہفتوں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم مجھ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو۔ فلوریڈا کی رومانی آب و ہوا میں ایک خوبصورت بے سہارا بیوہ سے فائدہ نہ اٹھانا بیوقوفی ہوگا۔ تمہارا مطمع نظر بھی یہ ہے۔"

"تم مجھ پر بڑا بھاری الزام لگا رہی ہو۔ موسم بہار میں ایک نوجوان کا دل ایک حسین عورت پر آ جانا قدرتی بات ہے۔"

اُسکی حرکات میں بے تکلفی تھی۔ وہ خود کو اس قدر بے تکلف ظاہر کر رہا تھا کہ میری مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں تم پر الزام نہیں رکھ رہی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ تم ایک غلط درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور مجھے تمہارے وقت ضائع کرنے پر نفرت ہوتی ہے۔"

"کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ دراصل میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت کی کمی نہیں۔"

"سولہ سال کی عمر سے لوگ مجھ سے محبت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر آدمی چاہے وہ بدشکل ہو یا خوبصورت ہو، بڈھا ہو یا جوان ہو یہی سمجھتا ہے کہ میں اُس کی آرزؤں کو پورا کرنے کے لئے بنائی گئی ہوں۔"

"کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی؟"

"صرف ایک مرتبہ۔" وہ بولی۔

"کس سے؟"

"اپنے مرحوم شوہر سے۔"

ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر شہزادی نے کوئی بات کہنی شروع کر دی اور بات چیت کا رُخ پھر عام موضوعات کی طرف مُڑ گیا۔

— ۳ —

اُنہوں نے کھانا دیر میں شروع کیا تھا۔ اور گیارہ بجتے ہی شہزادی نے بل طلب کیا۔ جب یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ چلنے والے ہیں تو وائنس والا لڑکا پلیٹ لے کر اُن کے پاس آیا۔ برابر کی میز سے اُسے کچھ سکے ملے تھے اور اسکی پلیٹ میں سکوں کے علاوہ ایک دو چھوٹے چھوٹے نوٹ بھی نظر آ رہے تھے۔ اسے اس طرح سے جو کچھ وصول ہوتا تھا وہی اسکا معاوضہ تھا۔ میری کا اسنے

بنا پرسس کرو ہ۔

"تم کیوں دیتی ہو" روے بولا۔ "میں اسے کچھ دے دونگا"۔

اُس نے اپنی جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کی پلیٹ میں رکھدیا۔

"میں بھی اسے کچھ دینا چاہتی ہوں"۔ میری بولی۔

اور پھر میری نے سَو روپے کا نوٹ اُس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ لڑکا حیران ہوگیا۔ اُس نے میری کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔ اور سر کو خم کر کے واپس ہوگیا۔

"تم نے اسے سَو روپے کیسے دے ڈالے؟" روے نے حیرت ناک لہجہ میں کہا۔ "یہ تو محض غلطی کی"۔

"کیونکہ اسے وائلن بجانا نہیں آتا اور یہ بہت آفت زدہ معلوم دیتا ہے"۔ میری نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن یہ لوگ اتنے انعام کی توقع نہیں رکھتے"۔

"مجھے معلوم ہے اسی لئے تو میں نے اُسے دیئے ہیں۔ اس بے چارے کے لئے یہ بہت زیادہ ہوں گے۔ ہوسکتا ہے اس سے اس کی زندگی ہی بن جائے"۔

برطانوی لوگ اپنی اپنی کاروں میں رخصت ہو گئے۔ اور شہزادی بھی ان کے پیچھے چل دی

"میری تم ذرا روے کو اس کے ہوٹل میں چھوڑتی جانا" شہزادی بولی۔ "اس کا ہوٹل میرے رستے میں نہیں پڑتا"۔

"کیا تم محسوس کروگی" وہ بولا۔

میری کو شبہ ہوگیا کہ یہ اسکیم پیشتر سے بنائی گئی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بڈھی عیاش مزاج شہزادی کو دو مرد عورتوں کے تعلقات بڑھوانے میں مزا آتا ہے۔ اور روے اس کا دل پسند نوجوان تھا۔ مگر اس معقول درخواست کو ٹھکرانا بدتہذیبی ہوتی۔ اور مجبوراً میری نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ اس کی کار میں بیٹھ گیا اور وہ دونوں ساحل کے کنارے کنارے چل دیئے۔ چاندنی شباب پر تھی۔ وہ زیادہ گفتگو نہ کر رہے تھے۔ روے سوچ رہا تھا کہ وہ ان خیالات میں غرق ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اسی لئے اُس نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر جب وہ ہوٹل پر پہنچ گئے تو اس نے کہا:-

"کیسی شاندار رات ہے۔ ایسی حسین رات میں بستر پر سو جانا بدذوقی ہوگی۔ کیا تم تھوڑی دور اور نہ چلو گی۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی"؟

"نہیں"۔

"چلو ذرا دیہات کی طرف گھوم آئیں"۔

"نہیں ابھی بہت رات ہوگئی۔ دیہات کی طرف جانے کا وقت نہیں رہا"۔

"کیا تم دیہات سے ڈر رہی ہو یا مجھ سے؟"

"کسی سے بھی نہیں"۔

اس نے گاڑی پھر چلا دی وہ دریا کے کنارے کنارے چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھیتوں کی برابر سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"کیا تم ایڈگر سوفٹ سے شادی کر رہی ہو؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

اس نے حیرت سے اُسکی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں اس وقت اسی کی بابت کیوں پوچھ رہا ہوں"

"مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟"

جواب دینے کے لئے پہلے وہ کچھ دیر رکے۔

"آج کینس جانے سے پہلے اُس نے مجھے شادی کا پیغام دیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ میں واپسی پر اُسے جواب دونگی"۔

"تو تمہیں اُس سے محبت نہیں ہے؟"

میری نے گاڑی کی رفتار ہلکی کردی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتی ہے۔

"تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟"

"اگر تمہیں اُس سے محبت ہوتی تو تم تین دن کی مہلت نہ مانگتیں۔ تم اسی وقت ہاں کر دیتیں"۔

"میرا خیال ہے تم درست کہتے ہو۔ بے شک مجھے اُس سے محبت نہیں ہے"۔

"خیر اُسے تو تم سے محبت ہے"۔

"وہ میرے باپ کا دوست تھا اور میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ میرے اوپر بہت مہربان رہا ہے اور میں اُسکی

شکر گزار ہوں۔"

"وہ تم سے بیس سال بڑا ہوگا۔"

"نہیں چوبیس سال۔"

"کیا تم اس کے مرتبہ سے مرعوب ہوئی ہو!"

"ہاں شاید۔ تم نہیں جانتے کتنی عورتیں اس مرتبہ پر پہنچنا چاہیں گی۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ جس آدمی سے محبت نہ ہو اُس کے ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی مزہ نہیں۔"

"مگر مجھے محبت نہیں چاہیئے۔ میں نے محبت کا مزہ خوب چکھ لیا ہے۔"

اُس نے یہ بات اس قدر تلخی سے کہی کہ روے چونک پڑا۔

"تمہاری عمر کی عورت سے میں بڑی عجیب بات سن رہا ہوں۔"

اب وہ دیہات میں بہت آگے نکل آئے تھے اور ایک پتلی سڑک پر چل رہے تھے۔ چودھویں کا چاند اپنی چاندنی فضائے بسیط میں بکھیر رہا تھا۔ اور آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ اُس نے کار روک لی۔

"بات یہ ہے میں اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لوگ کہتے تھے میں نے اُس سے شادی کرکے سخت بیوقوفی کی ہے۔ وہ کہتے تھے وہ جواری اور شرابی ہے۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اُسکے پاس روپیہ کی کمی نہ تھی۔ اگر اس کے پاس ایک پائی بھی نہ ہوتی تو بھی میں اُس سے شادی کر لیتی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ اس زمانے میں کتنا خوبصورت تھا۔ وہ بڑا پیارا لگتا تھا۔ وہ اُس زمانہ میں بڑا خوش مزاج اور نرم دل تھا۔ ہم بہت تفریح کرتے تھے۔ اُس میں بہت کشش تھی۔ جب وہ سنجیدہ ہوتا تو بہت ہی مہربان اور رحم دل بن جاتا۔ جب وہ شراب پئے ہوئے ہوتا تو بے حد لڑاکو، اکھڑ اور پرشور بن جاتا۔ ایسے وقتوں میں مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ اُسکی اس حالت پر مجھے بڑی شرم آتی تھی۔ مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا تھا کیونکہ بعد میں وہ اپنے کئے پر بُری طرح پچھتاتا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتا تو شراب پینا نہ چاہتا تھا اور بڑی شرافت سے پیش آتا تھا۔ مگر جب وہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ ہوتے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ اور دو تین پیگ کے بعد اُس کی عقل اور انسانیت جواب دے جاتی۔ ایسے وقت میں میں اُس وقت تک انتظار کرتی جب وہ بالکل مدہوش ہو جاتا اور اُسے بستر پر لٹا دیتی۔ میں نے اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مگر میری کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ میرا خیال ہے شرابی کی اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی بہرحال میں اس کی خدمت کرنے پر مجبور تھی۔ جب کبھی میں اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے اپنی اُستانی سمجھ بیٹھے۔ مگر میرے پاس اُس کی اصلاح کے سوا کیا چارہ کار تھا۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ضبط پر قابو نہ رہتا پھر ہمارا جھگڑا بڑی عجیب شکل اختیار کر لیتا۔ وہ ایک بیحد بڑا جواری تھا۔ اور شراب پینے کے بعد ہزاروں روپے ہار دیتا۔ اگر وہ اپنے وقت پر نہ مرتا تو ہم لوگ بالکل دیوالیہ ہو جاتے۔ اور مجھے پھر اداکاری کی طرف لوٹنا پڑتا۔ اب میری آمدنی کچھ ہزار سالانہ کی ہے یا پھر کچھ تھوڑے بہت زیورات بچ گئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ رات کو زیادہ شراب پی لیتا اور واپس نہ لوٹتا۔ میں سمجھ جاتی کہ وہ نشہ میں اندھا ہو گیا ہوگا۔ اور جو بھی عورت اُسے ایسے میں مل گئی ہوگی۔ اُسی کے ساتھ سو گیا ہوگا۔ شروع شروع میں مجھے بڑا حسد اور غصہ آتا۔ مگر بعد میں اسے غنیمت سمجھ بیٹھی۔ کیونکہ اگر نشے کے اندر اُسے کوئی عورت نہ ملتی تو وہ گھر آکر مجھے بری طرح جھنجوڑتا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بدبو آتی۔ اور اس کا منہ بگڑ جاتا۔ وہ مجھے بازاری عورتوں کی طرح پیار کرتا اور میرا دم سخت گھٹنے لگتا۔ اور جب وہ اپنی پیاس بجھا لیتا تو ایک دم خراٹے لے کر سونے لگتا۔ تم میرے اس کہنے پر کہ میں محبت کا مزہ خوب چکھ چکی ہوں حیران ہوگے۔ دیکھا تم نے یہ تھی محبت۔"

"مگر تم نے اُسے چھوڑ کیوں نہ دیا!"

"میں اُسے کیونکر چھوڑ سکتی تھی۔ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتا تھا۔ جب کبھی وہ بیمار ہوتا یا اُس پر کوئی مصیبت آتی وہ صرف میری ہی ذات تھی جو اس کا سہارا بنتی۔ وہ مجھ سے بچوں کی طرح چمٹ جاتا۔" اسکی آواز بھرا گئی "اُس کی ایسے وقت کی کیفیت پر میرا دل اُس کے لئے سدنے لگتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اُسے مجھ سے شدید محبت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ ایک دن بھی نہ جی سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اُس کی واحد ہمدرد صرف میں ہی ہوں اور جب

اس نے میری خوشی جو تم نے دیا تو میرا دل پھٹ کچھ ہو گیا۔"
اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اس نے انہیں روکنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ روڈلے نے سوچا کہ رونے سے اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اور اس نے سگریٹ سلگا لی۔

"مجھے بھی ایک سگریٹ دو۔ رہ جانے میں کیوں جذبات میں بہہ گئی۔"

اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اسے پیش کی۔

"ذرا میرا رومال بھی نکال دو۔ میرے پرس میں ہوگا۔"

پرس ان کے بیچ میں رکھا تھا۔ اور جب اس نے رومال نکالنے کے لئے اسے کھولا۔ تو اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اور وہ چونک پڑا۔

"تم نے پستول کس لئے رکھ چھوڑا ہے؟"

"ایڈگر کو میرا تنہا جانا پسند نہ تھا۔ اس نے مجھ سے پستول لے جانے کا وعدہ لے لیا تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ بیوقوفی ہے۔"

مگر جو موضوع روڈلے نے چھیڑا تھا اس پر بحث کا اسے بہت احساس تھا وہ خود کو معمول پر لانا چاہتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود پر قابو نہ رہا تھا" وہ بولی۔

"تمہارے شوہر کا انتقال کب ہوا؟"

ایک سال پہلے۔ میں اب خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ ورنہ میری زندگی میں سوائے لا انتہا مصیبت کے اور کچھ نہ تھا اب میں مطمئن ہوں۔"

"وہ جوان عمری میں مر گیا ہے نا؟"

"اس کی موت کار کے حادثہ میں ہوئی۔ وہ ساٹھ میل گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلا رہا تھا کہ موٹر پھسل کر سڑک سے نیچے جا پڑی۔ اور وہ چند گھنٹوں کے بعد مر گیا۔ میری قسمت کہ میں اس تک مرنے سے پہلے پہنچ گئی۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔

"میری میں نے تم سے ہمیشہ محبت کی ہے" اس نے آہ بھری۔ اس کی موت نے ہم دونوں کو آزاد کر دیا۔"

تھوڑی دیر وہ سگریٹ پیتے رہے۔ روڈلے نے اپنی سگریٹ کے ٹکڑے سے دوسری سگریٹ سلگا لی۔

"کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم پھر خود کو غلامی میں سونپ رہی ہو اور ایک ایسے آدمی سے شادی کر رہی ہو جس سے تمہیں محبت نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"تم ایڈگر کو اچھی طرح نہیں جانتے۔"

"میں اس سے پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں بکثرت مل چکا ہوں وہ معمار شخصیت ہے اور مجھے اس قسم کا آدمی کبھی پسند نہیں آیا۔" بڑی آہستہ سے ہنسا۔

"نہیں ایسی بات نہیں وہ تو ایک ہوشیار اور محنتی آدمی ہے۔"

"غرض وہ سب کچھ جو میں نہیں ہوں۔" اس نے طنزاً کہا۔

"کیا تم تھوڑی دیر کے لئے اپنی ذات کو بیچ میں نہ لاؤ گے۔"

"اچھا تو تم اس کی خوبیاں بھی بیان کرو۔"

"وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ وہ عہدہ اور مقام کا بھوکا ہے۔ اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں۔ اور آئندہ بھی وہ بڑے اہم کام کرتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے میں اس کی اس جدوجہد میں مددگار ثابت ہوں۔ اگر میں تمہاری طرح کی دنیا میں با صرف زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو شاید تم سے بیوقوفی سمجھو گے۔"

"تمہاری میرے متعلق رائے اچھی نہیں ہے۔ ہے نا یہ بات؟" اس نے پوچھا۔

"بے شک میری رائے تمہاری نسبت کچھ ٹھیک نہیں۔" وہ ہنسی۔

"مجھے حیرت ہے آخر اس کا سبب؟"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں بتا دوں۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔ "کیونکہ تم ناکارہ اور بیکار صرف آدمی ہو کیونکہ تم سوائے اس کے کچھ اور نہیں سوچتے۔ کہ جتنی عورتیں تمہارے جال میں آ سکیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکو۔"

"میرا خیال ہے تم کچھ کچھ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ خوش قسمتی سے مجھے ترکہ میں اتنی معقول دولت ملی ہے کہ میں نے اور کمانا ضروری نہ سمجھا۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ میں ایسی دولت کمانے کے پیچھے پڑ جاتا جو کسی غریب فاقہ کش کے منہ سے چھین لی جائے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آدمی صرف ایک مرتبہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے میرے حالات ایسے ہیں۔ کہ میں اپنی زندگی سے پورا پورا فیض اٹھا سکتا ہوں۔ میں عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔ اور عجیب بات ہے کہ وہ بھی

مجھے چاہتی ہیں۔ میں جوان ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے جوانی ہمیشہ نہیں رہتی۔ تو پھر مجھے اگر زندگی میں لطف اُٹھانے کا موقع ملتا ہے تو اُسے رائگاں کیوں جانے دوں؟"

"میرا خیال ہے تمہارے اور ایڈگر کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ایڈگر کے مقابلہ میں میرے ساتھ تم بہتر زندگی گزار سکتی ہو۔"

"تم بھول رہے ہو کہ ایڈگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے ایک مختصر اور عارضی زندگی کا مشورہ دے رہے ہو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟"

"اس لئے کہ تم شادی شدہ ہو۔"

"اسے تمہیں غلط معلوم ہے۔ دو ماہ ہوئے کہ میری بیوی نے طلاق حاصل کر لی ہے۔"

"تم اس کے متعلق ہمیشہ خاموش رہے ہو۔"

"قدرتاً۔ عورتیں شادی کے متعلق عجیب خیالات رکھتی ہیں۔ ان حالات میں یہی مناسب ہے کہ کبھی اسکا ذکر نہ آنے دے۔"

"تو پھر تم نے میرا مقصد سمجھ لیا ہوگا۔"

"اب میں سمجھی۔" میری مسکراہٹ "تم نے مجھے یہ گندا راز کس لئے بتایا ہے؟ اسی لئے نا کہ اگر میں تمہارے ساتھ اچھی طرح پیش آؤں تو تم مجھے شادی کی انگوٹھی پہنا دو۔"

"جانِ من۔ مجھے خوب معلوم ہے تم سب سمجھتی ہو۔"

"تمہیں مجھے جان کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چھوڑو۔ یہ بھی میں تو آپ کو شادی کی پیشکش کرنے کے لئے راستہ صاف کر رہا ہوں۔"

"وہ کیوں کر؟ کس لئے؟"

"میرا خیال ہے اس میں کوئی عیب نہیں۔"

"یہ ذلیل خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

بات یہ ہے کہ جب تم اپنے شوہر کا ذکر کر رہی تھیں۔ میرے دل میں تم سے شادی کا خیال یکلخت پیدا ہو گیا۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ مجھے تم سے شدید ترین محبت ہو گئی ہے، ایسی بات نہیں کہ میرے دل میں پہلے سے تمہاری محبت نہ تھی۔ بلکہ اسی محبت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔"

"تمہیں ہرگز ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتیں۔ تم بچے شیطان ہو تم خوب سمجھتے ہو کہ عورتوں کو کس قسم کی باتیں کر کے رام کیا جاتا ہے۔"

"جب میں عورتوں کے جذبات کو سمجھتا ہی نہیں تو پھر کیسے وہی باتیں کر سکتا ہوں۔"

"اچھا بس خاموش رہیئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ مجھے غصہ کم آتا ہے اور میرا مزاج بھی کچھ یہ مذاق ہے۔ چلئے میں آپ کو ہوٹل پہ چھوڑ دوں۔"

"تو پھر میں کیا سمجھوں کہ جواب نفی میں ہے؟"

"یقیناً"

"کیوں"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجھے تم سے مطلق محبت نہیں ہے۔"

"مجھے ذرا بھی تعجب نہیں۔ مجھے اس کا علم تھا۔ اگر تم خود کو میری طرف ملتفت کرنے کا ذرا بھی موقع دو تو تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

"تم بھی کتنے بھولے بنتے ہو! مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تمہاری طرف التفات برتوں؟"

"تو کیا تم نے ایڈگر سوفٹ سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟"

"ہاں اب میں نے بالکل پکا ارادہ کر لیا ہے۔ بالخصوص تمہاری گفتگو کے بعد شکریہ ہے تمہاری بات چیت سے میں اس نتیجہ پر جلد پہنچ گئی۔ تمہاری گفتگو میرے کام آ گئی۔"

"لعنت ہے مجھ پر اگر میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔"

"عورتیں مردوں کی طرح سوچنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ تم نے جو کچھ کہا اور میں نے بھی مرحوم شوہر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے میری ایڈگر کی عقیدت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ چٹان کی مانند ہے۔ مگر جانتی ہوں۔ میں اس پر بھروسہ کرتی ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہ بھٹکنے دے گا۔ وہ مجھے تحفظ بخش رہا ہے۔ مجھے اس لمحہ اس سے اتنی عقیدت بڑھ گئی ہے کہ اُسے محبت کہا جا سکتا ہے۔"

یہاں سڑک بہت پتلی ہے۔ اگر تم محسوس نہ کرو تو کار کا رخ
میں پھیرے دیتا ہوں" وہ بولا۔

"جی نہیں شکریہ! میں اپنی کار خود پھیر سکتی ہوں" اس نے
جواب دیا۔

اس کے جملے نے ایک لمحہ کے لئے اسے جھنجھلا دیا۔ اس لئے نہیں کہ یہ اس کے موٹر چلانے کی مہارت پر طنز تھی۔ بلکہ اس لئے کہ ایک لمحہ پہلے اس نے ایڈگر کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس میں وہی بات آ گئی تھی۔ وہ ہنسنے لگا۔

"سڑک کے دونوں طرف گہرائی ہے۔ اگر خدا نخواستہ تم کسی بھی طرف کو گر پڑیں تو مجھے سخت گھبراہٹ ہوگی۔"

"اپنی فضول زبان کو لگام دیجئے۔"

اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ پوری قوت سے اسٹیرنگ گھمانے لگی۔ وہ دیکھتا رہا۔ اس نے آخر بند کیا۔ اور پھر ہینڈ بریک کو دبایا۔ اور پیچھے لوٹانے کے لئے گیئر بدلا۔ اور آہستہ آہستہ ہوشیاری سے گاڑی کو پیچھے لوٹایا۔ آخرکار گاڑی کو لوٹا کر واپس شہر کی طرف چل دی۔ وہ خاموش رہے یہاں تک کہ ہوٹل آ گیا۔ رات ہو چکی تھی اور ہوٹل کا دروازہ بند تھا۔ روبے حسب دستور گاڑی میں بیٹھا رہا۔

"لیجئے آپ کا ہوٹل آ گیا" میری بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

وہ ایک لمحہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے گردن گھمائی اور میری سے بولا۔

"میری جان تم بیوقوف ہو۔ مجھے [illegible] کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں تمہارے شوہر کے برخلاف اچھا شوہر ثابت ہوں گا۔ مگر تم اپنے سے پچیس سال بوڑھے آدمی سے شادی کر کے حماقت کر رہی ہو۔ تمہاری کیا عمر ہوگی؟ تیس سال نا! تم کوئی ـــ ماہر تو ہو نہیں۔ تمہاری آنکھوں، تمہارے جسم اور تمہارے خدوخال سے صاف ٹپکتا ہے کہ تم ایک جذباتی اور لذت پسند عورت ہو۔ یہ صحیح ہے کہ تم زمانے کی ستائی ہوئی ہو، مگر جلدی تم اپنے آپ میں آ جاؤ گی اور پھر محبت کے چکر میں مبتلا ہو گی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم اپنی جنسی خواہشات کو نظر انداز کر سکو گی۔ تمہارا یہ حسین جسم صرف محبت کے لئے بنا ہے۔ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم زندگی کی لذتوں کے دروازے اپنے اوپر ابھی سے بند کر لو۔"

"روبے تمہاری گفتگو سے مجھے نفرت آتی ہے۔ تم ایسی بات کہہ رہے ہو گویا محبت ہی زندگی اور دنیا میں سب کچھ ہے۔"

"کیا تمہیں کبھی کوئی محبت نہیں ملی؟"

"کبھی نہیں۔"

"تمہارے شوہر کے علاوہ تم سے بہت لوگوں نے محبت کی ہوگی؟"

"معلوم نہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جانے میرے لئے وہ کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ میں نے ہمیشہ جذبات کو دبایا ہے۔ میرے جذبات کبھی برانگیختہ نہیں ہوئے۔"

"تم اپنی جوانی اور حسن کو کیوں ضائع کرتی ہو۔ ان کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ایسی دولت کا کیا فائدہ جس سے آدمی پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکے۔ تم ایک رحم دل اور سخی مزاج عورت ہو۔ کیا تمہارے دل میں اپنی دولت غریبوں میں تقسیم کرنے کا خیال نہیں آتا۔"

میری ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی پھر بولی۔

"اگر میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میرا خیال ہے تم مجھے جتنا بے وقوف اب سمجھتے ہو یہ بات سن کر اس سے بھی زیادہ سمجھنے لگو گے۔"

"ہو سکتا ہے۔ بہرحال بتاؤ۔"

"مجھے اگر اپنی خوبصورتی کا پوری طرح احساس نہ ہو تو مجھ سے بڑھ کر اور کون بیوقوف ہو سکتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں کسی آدمی کو کوئی ایسی چیز دے سکتی جو اس کے لئے بہت اہم ہو ـــ کیا یہ بہت عجیب سا لگتا ہے؟"

"نہیں یہ تو ایک عام سچائی ہے۔"

"میں خیال ہی خیال میں طرح طرح کے معاملات میں بہت وقت ضائع کر چکی ہوں۔ اگر میں نے کسی کا دل بہلایا تو وہ [illegible] آدمی ہو گا۔ تم آخری آدمی ہو گے جسے میں اپنی [illegible] میں [illegible] کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اگر مجھے کسی ایسے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہو جو زندگی کی تمام لذتوں سے محروم ہو۔ سماج، قبول اور محبت کا ستایا ہوا ہو جسے زندگی کی کوئی نعمت نہ میسر ہو اور غریب ہو [illegible]

چیز سے محروم رہا ہو جسے روپیہ سے خریدا جا سکتا ہے تو میں اسے ایک عجیب تجربہ کراؤں۔ اسے ایک گھنٹہ کی غیر محدود خوشی بخشوں، میں اسکی ہر جسمانی آرزو پوری کراؤں۔ اسے ایک ایسا تجربہ کراؤں جو اسے زندگی بھر یاد رہے اور جس کا کبھی اس نے بھول کر بھی خواب نہ دیکھا ہو۔ میں اسے خوشی کے ساتھ وہ سب کچھ دے دوں گی جو میرے پاس ہے۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی عجیب اور پُر جنون بات نہیں سنی۔"

"بہرحال ان تو سن لی۔ اچھا اب اتریئے اور مجھے گھر جانے دیجئے۔"

"تم تنہا چلی جاؤ گی نا؟"

"بالکل۔"

"اچھا تو شب بخیر، اُس معمار شہنشاہیت سے شادی کرلو اور خوش رہو۔"

میری فلورنس کی سنسان سڑکوں پر گاڑی چلانے لگی۔ سڑک کی چڑھائی اونچی تھی اور گھوڑے کی نال کی طرح چکردار تھی۔ آدھی چڑھائی چڑھنے پر ایک چبوترہ ملتا تھا جو نیم گول تھا۔ اُس پر سرو کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے اور ایک منڈیر بنی ہوئی تھی۔ رات کے حسن سے متاثر ہو کر میری نے وہاں کار روک لی۔ اور اُتر گئی۔ وہ چبوترہ کے سرے پر آئی اور نیچے گھاٹی کو دیکھنے لگی۔ ساری وادی چاندنی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وسیع اور بند آسمان کے نیچے وادی میں، چاندنی کے نغمے نے اس کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا۔

معاً اُسے احساس ہوا کہ سرو کے درخت کے نیچے کوئی آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ جل رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا سی گئی مگر خود کو قابو رکھا۔ وہ اُس کے سامنے آیا اور ہیٹ اُتار کر سلام کیا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ وہی ہیں نا جو ریسٹوران میں فیاضی سے پیش آئی تھیں؟ وہ ہولا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

وہ اُسے پہچان گئی۔

"تم وہی وائلن بجانے والے ہو نا؟"

اب اُس نے سازندوں والا بھڑکیلا لباس نہ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک عام لباس پہنے ہوئے تھا جو بوسیدہ اور میلا نظر آرہا تھا۔ وہ انگریزی خاصی بول سکتا تھا۔

"مجھے مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ میرے مالک مکان شریف ہیں مگر انہیں روپے کی ضرورت تھی۔ اب میں انہیں باقی ماندہ کرایہ ادا کر سکوں گا۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میری نے پوچھا۔

"دراصل یہ جگہ میرے راستے میں پڑتی ہے۔ میں صرف نظارہ کی خاطر رُک گیا تھا۔"

"کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو؟"

"میں ان جھونپڑیوں میں رہتا ہوں جو آپ کے بنگلہ کے سامنے بنی ہوئی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا میں اُس بنگلہ میں رہتی ہوں؟"

"میں نے تمہیں کار میں گذرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارا باغیچہ بہت خوبصورت ہے اور تمہارے کمروں کی دیواروں پر بہت بڑھیا تصویریں بنی ہوئی ہیں۔"

"تو تم اُس کے اندر ہو آئے ہو؟" ایک کسان سے مجھے اس کے متعلق پتہ چلا تھا۔

"نہیں میں بھلا کیسے جا سکتا تھا۔"

میری کی گھبراہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ ایک خوش گو اور ترمیلا نوجوان تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ریسٹوران میں وہ کس قدر جھینپا ہوا تھا۔

"کیا تم وہ باغیچہ اور تصویری دیکھنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا

"مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ جب بھی آپ مناسب سمجھیں میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

رولے اور اُس کی شادی کی غیر متوقع فرمائش سے وہ سخت کوفت محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل ابھی بستر پر لیٹنے کو نہ چاہ رہا تھا۔

"ابھی کیوں نہیں؟" وہ اچانک وقتی کیفیت کے تحت کہنے لگی۔

"ابھی"۔ اُس نے حیرت سے کہا۔

"باغیچے چاندنی میں ہو تو اور بھی حسین لگتے ہیں۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اُس نے تکلفاً کہا۔

"آؤ گاڑی میں بیٹھو میں تمہیں لے چلتی ہوں"

وہ اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ راستے میں خاموش [illegible]

ــــ وہ جھونپڑیوں کے قریب پہنچے۔ تو وہ بولا
"میں ان جھونپڑیوں میں رہتا ہوں۔"
اس نے گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ اور ان افلاس زدہ جھونپڑیوں کی طرف دیکھا، وہ بہت غلیظ اور تنگ معلوم دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

اس نے گاڑی روک دی اور وہ دونوں سیڑھی پر چڑھنے لگے۔ میری کا سونے کا کمرہ اور دوسرے مخصوص کمرے دوسری منزل پر تھے۔ جن پر جانے کے لئے ایک خوبصورت زینہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور بجلی روشن کی۔ ہال میں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اس نوجوان کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں دیواروں پر مصوری کے نادر نمونے نقش تھے۔ یہ ایک اعلیٰ کمرہ تھا جسمیں مالکان نے اعلیٰ فرنیچر سجا رکھا تھا۔ بڑے بڑے گلدانوں میں پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بنی ہوئی رنگین تصویریں اگرچہ پرانی ہو چکی تھیں اور ان کے نقوش بھدے پڑ گئے تھے۔ مگر ان میں زندگی کا شدید احساس ہوتا تھا۔

"بہت خوب، بہت ہی خوب" وہ خوشی سے چلایا۔۔ "میرا خیال تھا ایسی چیزیں صرف عجائب گھروں میں ہوا کرتی ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ لوگ ان کے مالک بھی ہو سکتے ہیں۔"

اسے اسکی خوشی سے ایک کیف سا محسوس ہوا۔ اس نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہاں اس کے معیار کی کوئی کرسی نہیں ہے۔ اور سردی میں سنگ مرمر کے فرش اور ہوادار چھت کے باعث بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"کیا یہ سب تمہارا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں یہ میرے دوستوں کا ہے۔ انہوں نے مجھے عارضی طور پر دے دیا ہے۔"

"معاف کیجئے گا، آپ بہت حسین ہیں اور آپ کو ایسی اعلیٰ عمارت میں رہنا زیب دیتا ہے۔"

"چلو میں تمہیں انگور کی شراب کا ایک گلاس پلاؤں گی۔ پھر اس کے بعد باغیچہ میں چلیں گے۔"

"نہیں، میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، شراب مجھے بیخود کر دیگی۔"

"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

وہ اس کی سادگی پر ہنسنے لگا۔

"میرے پاس روپے نہیں تھے، مگر آپ اسکی کوئی پروا نہ کیجئے، میں صبح کھا لوں گا۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ چلو باورچی خانے میں چلیں۔ شاید کچھ بچا کھچا مل جائے۔"

"مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔ یہ [illegible] کا نظارہ کرنے سے بہتر ہے۔ مجھے اس محل کی [illegible] نظارہ کرا دو۔"

"باغ اور چاندنی کہیں نہیں جا رہے۔ میں پہلے تمہارے لئے کھانے کا انتظام کر دوں۔ پھر تم جو چاہو دیکھنا۔"

وہ باورچی خانے میں گئے۔ باورچی خانہ بہت بڑا تھا جس میں ایک بڑی پتھر کی میز پڑی ہوئی تھی۔ جس طرح باورچی خانے میں پچاس آدمیوں کا کھانا تیار ہو سکتا تھا۔ لیکن اور اس کا فرنیچر کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اور اسکا باورچی ملازمت کو چھوڑ چکا تھا۔ میری خود اس اجنبی نے خود کو چور کی طرح محسوس کیا۔ انہیں ٹھنڈی الماری میں گوشت، انڈے اور شہد سب مل گئے۔ میری نے بجلی کا چولہا جلایا اور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن لگایا اور تھوڑی دیر میں انڈوں کی ٹکیاں تیار رکھیں۔

"تھوڑا سا گوشت بھی ہونے دیجئے" وہ بولا۔ "بہت عمدہ کھانا کیا ہے!"

ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں گوشت کا ٹکڑا پکڑے ہوئے وہ بولا۔ "کارل رچرڈ، میں کلا کا طالب علم ہوں۔"

"ارے میرا خیال تھا تم اطالوی ہو، تم تو بڑے معقول دکھائی دیتے ہو۔"

"جی نہیں آسٹریا کا باشندہ ہوں۔" اسکی آواز میں تلخی سی تھی۔

میری نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کیا کبھی تم انگلینڈ گئے ہو؟"

"جی نہیں، میں نے کالج میں پڑھی تھی۔" وہ مسکرایا۔ "آپ کھانا بنانے میں خوب ماہر ہیں۔"

"شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ میں ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی اور مجھے اپنا کھانا خود تیار کرنا پڑتا تھا۔"

"مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔" وہ بولا۔

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے ہمیشہ سے امیرانہ زندگی بسر کی ہے اور نوکروں چاکروں پر حکومت کی ہے۔"

"بالکل، پریوں کی شہزادی کی طرح، تم شروع سے امیر معلوم دیتی ہو۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے، میں نے اپنے اسکول میں کھانا پکانے کی تعلیم حاصل کی تھی اور میری ماں نے مجھے پریوں کی شہزادی کی طرح ہی تربیت دی تھی۔"

جب ساری چیزیں تیار ہو چکیں تو انہوں نے ساری چیزیں ایک ٹرے میں رکھیں اور میری اُسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ ڈرائنگ روم کا کمرہ بھی بہت بڑا تھا۔ اور اس کی چھت پر بھی نقشا دیر بنی ہوئی تھیں، اس میں رنگین پردے لٹک رہے تھے اور لکڑی کی منقش الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ وہ شاہانہ عکسی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"مجھے اپنے میلے کپڑوں سے شرم آرہی ہے۔" وہ بولا "اس عالیشان کمرے کیلئے ریشمین سوٹ کا ہونا ضروری ہے۔"

اُس کا سوٹ واقعی میلا تھا، اُس کے جوتوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور قمیض بھی پیوند زدہ تھی، اُس کا گلے کا بٹن کھلا ہوا تھا اور اُس نے کوئی ٹائی نہ باندھی ہوئی تھی۔ لمبی موم بتیوں کی روشنی میں اُس کی آنکھیں سیاہ نظر آرہی تھیں، اُس کا سر عجیب تھا جس پر گھنے بال جمے ہوئے تھے، اُس کے گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، اس کی جلد زرد تھی، اور اس کے چہرہ سے افلاس اور مصائب ٹپک رہے تھے، جس سے آدمی کا دل متاثر ہونے لگتا، میری نے سوچا اگر وہ قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہوتا تو خاصا خوبصورت نظر آتا۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" میری نے پوچھا۔

"تیئیس سال۔"

"پھر تمہیں اور کیا چاہیئے۔"

"ایسی جوانی کس کام کی، جس کا کوئی لطف نہ اٹھایا جاسکے، میں تو ایک قیدی جیسی زندگی گذار رہا ہوں جس سے کوئی مفر نہیں۔"

"کیا تم کلاکار ہو۔"

وہ ہنسا۔

"کیا تم میرا وائلن سننے کے بعد بھی یہی سمجھتی ہو، میں وائلن بجانے والا نہیں ہوں، جب میں آسٹریلیا سے یہاں پہنچا تو ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا مگر ہوٹل والے کا کام اچھا نہ چلا اور مجھے علیحدہ ہونا پڑ گیا، میں ادھر اُدھر کچھ کام کر لیتا ہوں، مگر پردیسی ہونے کی وجہ سے کام کا ملنا بہت مشکل ہے۔ وائلن تو میں صرف زندہ رہنے کے لئے بجاتا ہوں، مگر مجھے روزانہ یہ کام نہیں ملتا۔"

"تم نے آسٹریا کیوں چھوڑ دیا۔"

"ہمارے کچھ طالب علموں نے حکومت کے خلاف احتجاج کیا تھا، حکومت سے ٹکر ہوئی مگر ہم مقابلہ نہ کر سکے، ہمارے دو ساتھی مر گئے اور باقیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا، مجھے بھی چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی مگر میں فرار ہو گیا اور اٹلی میں آکر پناہ لی۔"

"یہ تو بڑی وحشتناک بات معلوم دیتی ہے۔" میری بولی۔ واقعی میری کو اسکی روداد سن کر وحشت ہوئی اور اس نے اس کی طرف ملعون نظروں سے دیکھا۔

"میں اپنے عقیدہ کا واحد آدمی نہیں ہوں، دنیا میں ہمارے ہم عقیدہ ہزاروں آدمی ہیں۔ بہر حال میں آزاد ہوں۔"

"مگر مستقبل کے لئے تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

اس کے چہرے پر ناکامی کی کیفیت اُبھر آئی۔ اور وہ جواب دینے ہی والا تھا۔ مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس نے گردن کا مایوسی اشارہ کیا اور جھینپ کر ہنسنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے اسی طرف سوچنے دو۔ مجھے ان قیمتی لمحوں سے پورا پورا حظ اٹھانے دو، مجھے زندگی میں ایسا خوشگوار موقع کبھی نہیں ملا، میں اس موقع سے پورا پورا لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں تاکہ میری زندگی میں اسکی یاد ایک قیمتی سرمائے کی طرح محفوظ رہے۔"

میری نے اسکی طرف عجیب نظروں سے دیکھا، اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے دل کی دھڑکن سن رہی ہے۔ اس نے روبے سے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہا تھا وہ صرف ایک مذاق تھا کسی بیکار لمحہ میں اس کے ذہن میں وہ خیال آیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وقت آنے پر وہ ایسا کبھی نہ کر سکے گی۔ کیا وہ لمحہ آچکا ہے! اس نے خود کو بے قابو سا محسوس کیا، وہ شراب بہت کم پیا کرتی تھی۔ مگر اس کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے دوبارہ پھر پی لی تھی۔ اور اسکی طبیعت بے قابو ہو رہی تھی۔ اس بڑے کمرے میں جس نے ہزاروں رومان دیکھ رکھے تھے۔ اس اجنبی کے ساتھ شراب کے سرور کی کیفیت

میں بیٹھنا عجیب معلوم ہو رہا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے خوشگوار اور ہلکی ہلکی ہوا اندر آ رہی تھی میری نے اپنے ہیجان خیز جذبات کے پیچھے ہلکی ہلکی کمزوری سی محسوس کی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے سینے کے اندر پگھلا جا رہا ہے۔ اسکی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو چکی تھی، وہ میز سے یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور اب میں تمہیں اپنا باغیچہ دکھاؤں، اور پھر تم کو چلے دینا چاہیئے۔"

باغیچہ کے لئے قریب ترین راستہ ڈرائنگ روم سے ہو کر تھا وہ اسی طرف لے جانے لگی، کمرہ میں پہنچکر وہ ایک علم دان کو دیکھنے کے لئے رک گیا جو دیوار کے سہارے کھڑا تھا، پھر اسکی نظر گراموفون پر پڑی۔

"اس ماحول میں یہ کتنا عجیب لگتا ہے!"

"کبھی کبھی میں جب باغ میں بیٹھتی ہوں تو کوئی ریکارڈ اس پر لگا دیتی ہوں"

"کیا میں ایک ریکارڈ بجا سکتا ہوں؟"

"ہاں اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے۔"

اس نے سوئچ کھول دیا۔ اتفاق سے مشین پر والنٹز کا ریکارڈ چڑھا ہوا تھا، خوشی سے اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"دنیا، یہ میرا محبوب ترین والنٹز کا ریکارڈ ہے۔"

اس نے اسکی طرف چمکدار آنکھوں سے دیکھا، اس کا چہرہ اب بدل چکا تھا، وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر اسے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، وہ مسکرانے لگی۔

"کیا تم ناچنا جانتے ہو؟"

"ہاں ہاں میں خوب جانتا ہوں۔"

"اچھا دیکھوں کیسا ناچتے ہو!"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ اور پھر اس پُرتکلف کمرے میں وہ دونوں والنٹز کی دھن پر رقص کرنے لگے، پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باغیچہ میں لے گئی۔ دن کے وقت باغ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑھیا عورت ہو جس نے اپنے شباب میں خوب رنگ رلیاں منائی ہوئی ہوں، مگر اس چاندنی رات میں اسکی سلیقہ سے کٹی ہوئی جھاڑیوں، خوبصورت آبشار اور ہموار سبز گھاس کے لان نے اس میں ایک عجیب حسن پیدا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا صدیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔ اور وہ اس نئی نسل کے انسان ہیں جو جذبات کی تسکین کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اور نتائج سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہلکی نرم ہوا میں سفید پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش ٹہل رہے تھے۔

"وہ کتنا حسین ماحول ہے!" وہ آہستہ بڑبڑایا۔ "تقریباً ناقابل برداشت!" پھر اس نے گوئٹے کے فاؤسٹ کی وہ مشہور لائن دہرائی جس میں فاؤسٹ دائیں رواں وقت سے رکنے کی درخواست کرتا ہے "تم بہار! بہت خوش ہو گی؟"

"بہت!" وہ مسکرائی۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ایک مہربان اور فراخ دل انسان ہو۔ تم مسرت کی مستحق ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ مل جائے جس کی تمہیں تمنا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی

"مجھے زندگی میں وہ سب کچھ حاصل رہا ہے جس کی مجھے خواہش ہوتی ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری۔

"میں آج کی رات مرنا چاہتا ہوں، آئندہ مجھے ایسی خوشی کبھی میسر نہ ہوگی میں اسکو تمام عمر یاد رکھوں گا، مجھے یہ شام اور تمہاری خوبصورتی ہمیشہ یاد رہے گی، میں تمہیں ہمیشہ جنت کی دیوی سمجھوں گا اور میں مریم کی طرح تمہاری پرستش کرتا رہوں گا۔"

اس نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں کی طرف اٹھایا اور بے ڈھنگے پن سے جھک کر اسے بوسہ دیا، میری نے بھی اس کا چہرہ نرمی سے چھوا۔ معاً وہ اپنے گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور اس کے لباس کے حاشیہ کو چوم لیا۔ اور وہ بے پناہ وجد کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے کھڑا کر کے اس کی آنکھوں اور چہرہ کو بوسوں سے پاٹ دیا اس عمل میں ایک عجیب سنجیدگی اور کیفیت تھا، اس کے دل میں عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ اس کا دل ہمدردانہ محبت سے لبریز ہو اٹھا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔ تیئس سال کا تھا اور

وہ بھی کوئی ایسی ویسی ہستی نہیں جس کی طرف بڑھا کی جا سکتی ہے آخرش گوشت پوست کی ایک جوان عورت ہی تو تھی۔

وہ خاموشی سے کمرے کی طرف چل دیئے۔

۴

کمرے میں اندھیرا تھا، مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور چاندنی اندر آ رہی تھی۔ میری ایک پرانی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور نوجوان کا سر اسکی ران پر ٹکا ہوا تھا، وہ سگرٹ پی رہا تھا اور نیم تاریکی میں اسکی سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ اس کے سوالوں کے جواب میں وہ اُسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ اسٹریا کی پولیس میں ایک افسر تھا، اُس کے باپ نے حملہ آوروں کو سختی سے دبا دیا تھا، بڑا وطن پرست آدمی تھا اور جرمنوں کا قبضہ اپنے ملک پر ہونا نہ چاہتا تھا۔ اس کے باپ کے نازی بہت سخت دشمن ہو گئے تھے۔ اور جب جرمن کی افواج آسٹریا میں گھس آئیں تو اُس نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اُس وقت وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس نے آرٹ کی تعلیم ختم کر لی تھی اور ایک اسکول میں جگہ ملنے والی تھی۔ اسی زمانہ میں ہٹلر آسٹریا آیا تھا۔ اور اسکی تقریر پر لوگوں نے بڑی تالیاں بجائی تھیں۔ مگر بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کا فاتح بڑا ظالم ہے۔ تمام قوم میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایک جماعت جرمنوں کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے بنائی گئی۔ مگر ان کی حرکات و سکنات سے خفیہ پولیس خوب واقف تھی۔ یکبارگی وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ دو آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ باقیوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا، تین ماہ بعد وہ فرار ہو کر اٹلی کی سرحد میں پہنچ گیا۔ اُس کے پاس کوئی پاسپورٹ نہ تھا اسے ہر وقت گرفتار ہونے کا ڈر تھا۔ اس صورت میں یا تو وہ آوارہ سمجھ کر جیل میں ڈال دیا جائے گا یا واپس نازیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور اس صورت میں اسے کافی سخت سزا ملے گی۔

"اگر میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں بھی اپنے باپ کی طرح خودکشی کر لیتا۔"

اُس نے اسکا ہاتھ اٹھایا اور اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ "بس اسی جگہ جہاں تمہارا ہاتھ ہے وہاں گولی مار لیتا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو" میری نے اپنا کپکپاتا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ وہ کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگا۔

"تم نہیں جانتیں۔ میں نے کتنی دفعہ دریا کی طرف دیکھا ہے اور یہ سوچا ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ میں اس میں کود کر جان دے دوں۔"

میری نے گہری سانس بھری، اس کی قسمت ایسی خراب تھی کہ اس کے والد کو اگر کوئی جلاد کہا جاتا تو وہ نشتر کا کام کرتا، اس نے اس کا ہاتھ پکڑ دبایا۔

"آہیں مت بھرو" اُس نے کہا "مجھے کسی چیز کا غم نہیں۔ آج کی رات کی خوشی سے مجھے تمام تکلیفوں کا بدلہ مل گیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے، میری اسکی مصیبت زدہ کہانی کے متعلق سوچنے لگی، مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ کیا اُسے کچھ روپیہ دیدے؟ مگر اس سے کتنے دن کام چل سکے گا۔ وہ ایک رومانی نوجوان تھا۔ جو اپنے پڑھا ہے۔ تجربوں سے زیادہ کتابوں کو اہمیت دیتا تھا۔ اور یہ قطعی ممکن تھا کہ وہ اسکی دی ہوئی کوئی رقم قبول نہ کرے گا۔ دفعتاً ایک مرغ کی اذان سنائی دی۔ اس آواز نے خاموشی کو اس تیزی سے چیرا کہ وہ بوکھلا گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"اچھا میرے عزیز اب تمہیں جانا چاہیئے۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ میری جان میری روح!"

"صبح ہونے والی ہے۔"

"ابھی نہیں" اُس نے خود کو گھٹنوں پر کھڑا کیا اور اس کی گردن میں ہاتھ حائل کر دیئے "میں تمہاری پرستش کرتا ہوں!"

اُس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

"اب تمہیں چل دینا چاہیئے۔ رات بہت گذر چکی ہے خدارا مان جاؤ!"

اُس نے اُس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ محسوس کی وہ گھٹنے لگا۔ اور اپنا کوٹ اور جوتہ تلاش کرنے لگا، اُس نے بتی جلا دی۔ جب اُس نے لباس پہن لیا تو اس سے ہم آغوش ہو لیا۔

"میری پیاری میری جان!" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنی عظیم مسرت بخشی ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم خوش ہو گئے" وہ بولی۔

"تم نے وہ چیز بخشی ہے جس کے سہارے میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ اب جب تم مجھے حاصل ہو تو پھر میرے پاس سب کچھ ہے مستقبل

ہمارے تعلقات کو استوار کرے گا، زندگی میں جیسے کا لطف تو اب آیا ہو۔"

"تو مجھے کبھی نہ چھوڑو گے؟" اس نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔"

اس نے اپنے ہونٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"اچھا تو خدا حافظ۔"

"کیا ہمیشہ کیلئے خدا حافظ؟" اس نے جذباتی ہو کر عاجزی سے پوچھا۔

"ہمارے ملنے کے لئے، میں یہاں سے بہت جلد چلی جاؤں گی، بس ان دو دنوں کے اندر۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ اور کیا کہے۔ "اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں خود مختار نہیں ہوں۔"

"کیا تم شادی شدہ ہو؟ مجھے پتہ چلا تھا کہ تم بیوہ ہو۔"

وہ آسانی سے جھوٹ بول سکتی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ایسا کیوں نہ کر سکی، وہ جھجک سی گئی۔

"تم نے اس سے کیا مطلب نکالا کہ میں خود مختار نہیں ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا اور تمہارا اب آئندہ ملنا ناممکن ہے۔"

"مگر میں تم سے ایک مرتبہ اور ملنا چاہتا ہوں صرف ایک مرتبہ ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"پیارے مدہوش نہ ہو، میں تم سے کہہ رہی ہوں یہ ناممکن ہے اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی، وہ نامہربانی کا ثبوت نہ دینا چاہتی تھی، مگر اس نے مناسب سمجھا کہ اسے صحیح حقیقتِ حال بتا دے۔

اس نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا ایک لمحہ کے لئے مسکرائی۔

"نہیں۔"

اس نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔

"تو پھر تم مجھے کیوں لائی تھیں؟"

"چونکہ تم تنہا اور پریشان تھے، میں تمہیں تھوڑی دیر کی خوشی بخشنا چاہتی تھی۔"

"اف، تم کس قدر ظالم ہو، کتنی سنگدل ہو۔"

وہ گھبرا گئی۔

"ایسا مت کہو، میں تم پر کوئی ظلم نہ کرنا چاہتی تھی، میرا دل رحم اور ہمدردی سے پُر تھا۔"

"میں نے تم سے کبھی رحم کی درخواست نہیں کی، تم نے مجھے میرے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیا۔ تم نے مجھے جنت میں داخل کیا۔ اور اب پھر دوزخ میں پھینک رہی ہو۔ نہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس کے الفاظ میں وقار کی جھلک تھی۔ اس کی جھنجلاہٹ کے پیچھے غم کا طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ بری طرح مرعوب ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسی بات سوچے گا۔

"شاید میں نے سخت حماقت کی ہے۔" وہ بولی "میں تمہیں ستانا نہیں چاہتی۔"

اس کی آنکھوں میں اب محبت کی کوئی جھلک نہ تھی بلکہ ایک سوز تھا۔ اس کا سفید چہرہ سفید تر ہو گیا تھا۔ اس کے چہرہ پر موت کے سے آثار چھائے ہوئے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے اب محسوس کیا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے۔ نوکر وغیرہ گردش میں سو رہے تھے۔ اور اگر وہ چیختی تو ان تک آواز نہ پہنچ سکے گی۔ وہ کتنی بڑی پاگل اور احمق تھی، اس کا علاج صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ خوفزدہ ہے۔

"مجھے بے انتہا افسوس ہے، میں تمہارے جذبات کو تکلیف دینا نہ چاہتی تھی۔ اگر میں تمہاری تکلیف کا کوئی کفارہ دے سکتی ہوں تو اس کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔" اس کی زبان میں لرزش تھی۔

اس نے تلخی سے منہ بنایا۔

"تم زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتی ہو۔ یہی نا کہ مجھے کچھ روپے دے دو۔ مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ تمہارے پاس اسوقت کتنے روپے ہیں؟"

اس نے اپنا پرس سنگھار دان سے اٹھایا اور جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا۔ اس کا ہاتھ پستول پر پڑا۔ اس کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے زندگی میں کبھی پستول نہ چلایا تھا۔ نہیں اس کی نوبت کبھی نہ آئی تھی پھر بھی خدا کا شکر ہے اس کے پاس پستول تھا۔ خدا ایڈگر کو خوش رکھے وہ بڑا دور اندیش آدمی ہے۔ اس کے دل میں مختلف شبہات پیدا ہو رہے تھے، بہرحال اس عجیب خیال سے وہ بہت خوش ہوئی وہ اس کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ اب وہ اپنے آپ میں تھی۔

"میرے پاس اسوقت صرف دو تین ہزار روپے ہیں۔ ان سے تم بہ آسانی سوئٹزرلینڈ پہنچ سکتے ہو، تم وہاں زیادہ امن سے رہو گے۔ یقین کرو مجھے ان کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔"

بے شک تمہارے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تم امیر ہو۔ صحیح ہے نا؟ تم ایک رات کی خوشی کے لئے اتنی بڑی رقم بآسانی صرف کر سکتی ہو۔ کیا تم ہمیشہ اسی طرح نوجوان لڑکوں سے لطف اندوز ہوتی ہو؟ اگر مجھے روپے کی ضرورت ہوتی تو کیا میں اسی پر قناعت کرتا۔ میں تم سے جواہرات مانگتا۔"

"تم انہیں بھی لے سکتے ہو۔ میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ سنگھار میز پر رکھے ہوئے ہیں۔ جاؤ لے لو۔"

"تم بہت کمینی عورت ہو۔ کیا تم اتنی ذلیل ہو کہ ہر آدمی کو پیسے سے خرید لو۔ تمہیں نہیں معلوم اگر میں روپیہ کو کوئی اہمیت دیتا۔ تو نازی مجھے روپیہ دینا چاہتے تھے۔ مجھے وطن سے دور فاقے مرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یا اللہ! تمہاری سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آتی! میں تمہارے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتی تھی اور تم سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہیں نقصان کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں میری ذات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ میں صرف تمہاری بھلائی چاہتی تھی!"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم ایک شہرت پرست اور آوارہ عورت ہو۔ تم نے زندگی میں کبھی کوئی بھلا کام کیا ہے؟ تم نئے نئے معصوم نوجوانوں کو پھانستی ہو۔ ان کے جذبات برانگیختہ کرتی ہو اور نئے نئے تجربوں سے لطف اٹھاتی ہو۔ تمہیں جو بھی نوجوان ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اسی کو اپنی وقتی تسکین کے لئے پکڑ لیتی ہو۔ تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ اس سے دوسروں کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس دفعہ تم نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ اجنبی آدمی کو اپنے گھر میں لے جانا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ میں تمہیں ویسی سمجھا تھا مگر تم رنڈی نکلیں۔ اگر میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ابھی ختم کر دوں تو یہ بہتر رہے گا۔ تاکہ تم کسی اور معصوم کو نہ ستا سکو۔ میں بہت آسانی سے ایسا کر سکتا ہوں۔ کسی کو مجھ پر شبہ تک نہ ہوگا۔ مجھے اس مکان میں داخل ہوتے کس نے دیکھا ہے؟"

وہ اسکی طرف ایک دم آگے بڑھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔ اس کا سوکھا چہرہ نفرت سے بگڑ گیا تھا اور اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ابھی تک پرس اسکے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے پستول نکال لیا اور اس کی طرف تان لیا۔

"اگر تم فوراً نہ گئے تو میں گولی مار دوں گی!"

"تو پھر مارو گولی۔"

وہ اسکی طرف ایک قدم اور بڑھا۔

"اگر تم ایک انچ بھی آگے بڑھے تو میں گولی داغ دوں گی۔"

"مارو۔ کیا تم سمجھتی ہو میں زندگی کو پسند کرتا ہوں۔ تم مجھے ایک ناقابل برداشت مصیبت سے چھٹکارا دلا دو گی۔ مارو۔ مارو۔ مارو میں تمہیں ہر چیز کے لئے معاف کر دوں گا۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔" اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ پہلی جیسی تلخی کے آثار ختم ہو چکے تھے۔ اور اس کی بجائے اب اسکی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس نے اپنا سینہ اس کے نشانے کے لئے پیش کر دیا تھا۔

"تم بڑی آسانی سے کہہ سکتی ہو کہ تمہارے گھر میں ایک چور گھس آیا تھا اور تم نے اسے گولی مار دی۔ لو اب جلدی کرو۔ مارو نا گولی۔"

اس نے پستول کو اپنے ہاتھ سے چھوٹ جانے دیا اور ایک کرسی پر گر کر آنکھوں کو ڈھک کر بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اسکی طرف دیکھا۔

"کیا تم میں جرأت نہیں ہے؟ کمزور عورت۔ تم کتنی بیوقوف ہو۔ تمہیں لوگوں سے اس طرح کھیلنا نہیں چاہیئے۔ اٹھاؤ اسے اور مارو گولی۔"

اس نے اپنے بازو اسکی گردن میں حمائل کر دیئے۔ اور اسے پاؤں کے بل کھڑا کرنے لگا۔ وہ نہیں سمجھ سکی وہ کیا چاہتا ہے۔ اور کرسی سے چمٹی رہی۔ اور برابر روتی رہی۔ اس نے اسکا ہاتھ جھٹکا اسکی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور درد کے مارے وہ کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اسے اٹھا کر کمرے میں دوسری طرف لے گیا۔ اور بستر پہ لے جا کر پٹک دیا اور خود بھی اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اور اسے زور سے چمٹا لیا۔ اور اس کے منہ پہ بوسوں کی یلغار کر دی۔ اس نے خود کو اس سے علیحدہ کرنا چاہا۔ مگر اس نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔ وہ اپنے وجود سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور اسکی مضبوط گرفت کے آگے بے بس

پھر بھی۔ آخر اس نے نعرہ لگانا بند کر دیا۔ اور خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اس کی چولی چول ہل گئی تھی۔ وہ پلنگ کے پاس کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھ پر کیا ستم کر دیا۔ میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ میں تو بھلا دوں گا ۔ مگر تم نہ بھلا سکو گی۔"

وہ ساکت رہی اور خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ایک کرخت قہقہہ لگایا۔

"ڈرو مت! میں تم پر حملہ نہ کروں گا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی قہر آلود نظروں کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتہً اس نے تاریک کمرے کے اندر کسی کے پاؤں چلنے کی آہٹ محسوس کی۔ اس کے کان میں گولی کی آواز آئی اور پھر ایک جسم زمین پر گرا۔ وہ چیخ مار کر ایک دم کھڑی سی ہو گئی۔

"ہائے اللہ تم نے کیا کیا"

وہ کھڑکی کے سامنے لیٹا ہوا تھا اور چاندنی اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پر جھک گئی، اور اسے نام لے کر پکارنے لگی۔

"کارل — کارل یہ تم نے کیا کر ڈالا!"

اس نے اس کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور جب اسے چھوڑا تو وہ بے جان ہو کر نیچے آن پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے چہرہ اور پھر دل پر رکھا وہ مر چکا تھا۔ وہ خوف سے پیچھے پلٹ گئی۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ بیہوش ہونے والی ہے۔

معاً وہ کھڑی ہو گئی کیونکہ باہر کسی کے ننگے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ آواز رک گئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ دروازہ پر کوئی کھڑا ہوا ہے۔ وہ خوف سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگی اور آہٹ سننے لگی کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ چیخ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ وہیں زمین پر قطعاً ساکت بیٹھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے برابر میں پڑی نعش۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ اس نے قوت لگا کر آواز نکالی۔

"ہاں، کیا بات ہے؟"

"حضور آپ خیریت سے ہیں؟ یہ نینا کی آواز تھی۔ میرا خیال ہے میں نے کچھ آواز سنی تھی۔"

میری نے اپنی انگلیاں اپنی ہتھیلی میں گڑا دیں تاکہ وہ ہونٹ مروڑ کے لہجے میں بول سکے۔

"تم خواب دیکھ رہی ہوگی۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔ جاؤ سو جاؤ۔"

"بہت بہتر حضور۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ اور پھر اس نے ننگے پاؤں دور جانے کی آہٹ سنی۔ میری دور تک اس آہٹ پر کان لگائے رہی۔ اس نے ان دو لمحوں کے لئے اپنی قوت جمع کر لی تھی۔ اس نے گہری آہ بھری۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نعش کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ اٹھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اس نے ایک ہاتھ مرے ہوئے آدمی کے سر کے نیچے ڈالا اور اسے کھڑکی سے باہر پھینکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کسی شدید خوف کے باعث وہ اسے کمرے سے باہر ڈالنا چاہتی تھی۔ مگر نعش وزنی تھی۔ اس نے بے بسی سے آہ بھری۔ اس نے خود کو بے جان محسوس کیا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ معاً اسے خیال آیا کہ نینا کو اس طرح ٹال دینا سخت غلطی ہے۔ اس نے اس سے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس نے کوئی آواز نہیں سنی۔ جب کہ گولی اس چہار دیواری میں چلی ہے۔ اپنی بدنامی کے ہر قسم کے خیالات اس کے دل میں جگہ لینے لگے۔ بے عزتی شرم اور رنج جانے کیا کیا۔ آخر وہ کیا جواب دے گی۔ کہ اس نے کیوں خودکشی کی ہے۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سچ سچ کہہ دے۔ اور سچ میں بدنامی تھی۔ ایسی حالت میں تنہا ہونا سخت پریشان کن تھا۔ اسکا کوئی معاون نہ تھا۔ اس مایوسی کی حالت میں اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی سے ملے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ سخت ضرورت ہے۔ رودلے! ایسے میں صرف وہی واحد آدمی ہے جو کام آ سکتا ہے اسے یقین تھا کہ اگر اس نے اسے بلایا تو وہ ضرور آئے گا۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے اس سے محبت ہے۔ ہر چند کہ وہ برا آدمی ہے مگر اسوقت ضرور کام آئے گا۔ بہر حال وہ اسے مشورہ ضرور دے گا۔ وہ رات میں اس سے کیسے مل سکتی ہے؟ مگر وہ دن نکلنے تک انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اگر صبح ہونے سے پہلے پہلے کچھ نہ کیا تو کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

اس کے بستر کے قریب فون رکھا ہوا تھا۔ اسے ہوٹل کا نمبر حلد

تھا۔ کیونکہ ایڈگر وہیں ٹھہرا تھا۔ اُس نے ہوٹل سے فون ملایا۔ شروع میں کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ایک اطالوی نے جواب دیا۔ غالباً وہ سوتے سے اٹھا تھا۔ اُس نے اُس سے فون رونے کے کمرے میں ملانے کو کہا۔ اُس نے گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خوف زدہ ہوگئی۔ کہیں وہ باہر نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں باہر چلا گیا ہو۔ کہیں جوا کھیل رہا ہو یا کسی عورت کے پاس ہو۔ مگر جب اُس نے ایک تیز خواب آلود آواز سنی۔ تو ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"ہاں، کون ہے؟"

"رونے، میں میری بول رہی ہوں۔ میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

اُس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل جاگ چکا ہے اور وہ آہستہ سے ہنسا۔

"اتنی رات گئے کیسی پریشانی، آخر کیا بات ہے؟"

"میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بہت سخت بات ہے۔ میں چاہتی ہوں تم یہاں چلے آؤ۔"

"کب؟"

"ابھی۔ اسی وقت۔ جتنی بھی جلدی ہو سکے۔ خدا کے لئے جلدی آؤ"

اُس نے اُس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا۔

"اچھا میں ابھی آیا گھبراؤ مت۔"

یہ دو بول کتنے سکون بخش تھے۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس نے سوچا وہ کتنی دیر میں یہاں پہنچے گا۔ ہوٹل تین میل دور تھا۔ اور زیادہ راستہ چڑھائی کا تھا۔ اس وقت اُسے کوئی ٹیکسی بھی نہ ملے گی۔ اگر وہ پیدل آیا تو ایک گھنٹہ سے کم نہ لگے گا۔ ایک گھنٹہ بعد دن نکل آئے گا۔ وہ کمرہ میں انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر پٹڑی میں آ گئی جس چاندنی سے تھوڑی دیر پہلے وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اب اس کے خوف سے درختوں کی چھاؤں میں چلنے لگی۔ بالآخر وہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اور یہاں اُس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ وقت کے تیزی سے گزرنے کے خوف سے پریشان ہو رہی تھی۔ معاً اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ اور چونک کر درخت کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ کوئی شخص پہاڑی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں اس کے بنگلہ کے دروازے کے نیچے سامنے گھاٹی میں اترتی تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو وہ بنگلہ کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ جب وہ تاریکی سے باہر چاندنی میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ رونے تھا۔ اُسکو دیکھ کر اُسے بے اندازہ سکون ہوا۔

"خدا کا شکر ہے تم آ گئے! تم یہاں اتنے جلدی کیسے پہنچے؟"

"ہوٹل کا ملازم سو رہا تھا۔ میں نے اُسکی سائیکل اٹھائی اور چلا آیا۔ سائیکل پہاڑی کی نشیب میں چھوڑ دی ہے۔ میں نے سوچا میں سیڑھیوں سے ہو کر جلدی پہنچ سکتا ہوں۔"

"اچھا آؤ" وہ بولی۔ اُس نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"تم بڑی گھمبیر نظر آ رہی ہو۔"

اُس نے اپنا سر ہلایا۔ وہ کچھ نہ بتا سکی۔ اُس نے اُس کا بازو پکڑا اور تیزی سے کمرے کی طرف چل دی۔

"زیادہ سے زیادہ خاموش رہنے کی کوشش کرو۔" اُس نے سرگوشی کی۔ "بالکل مت بولو۔"

وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور وہ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اندر پہنچ کر اُس نے قفل لگا لیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ روشنی کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بہرحال اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اُس نے سوئچ دبایا۔ کمرے کی چھت میں ایک بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ ایک دم تمام کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ جب رونے کی نظر اس مردہ جسم پر پڑی تو اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہے معبود!" اسکی چیخ نکل گئی۔ اور اُس نے اسکی طرف دیکھا

"یہ کیا ہے؟"

"یہ مر گیا ہے۔"

"یہی تو میں دیکھ رہا ہوں۔" گھٹنے ٹیک کر وہ نیچے جھکا۔ اور اُس مرد کی آنکھ کا غلاف اوپر کو اٹھایا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے دل پہ رکھا۔

"یہ تو بالکل مردہ ہے۔" پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔ "اس نے خود ہی گولی مار لی ہے۔"

"کیا تم نے سوچا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے۔"

"نوکر کہاں ہیں؟ کیا تم نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"مگر تمہیں فوراً بلانا چاہیئے۔ اُسے یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔" ٹھیرو سوچے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر اس آدمی کی مٹھی میں سے پستول نکال لیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ تو وہی پستول معلوم دیتا ہے جو تم نے مجھے کار میں دکھایا تھا۔"

"وہی ہے۔"

اُس نے اُسکی طرف خالی الذہن ہوکر دیکھا، اسکی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ مست حال بالکل اچنبھا بنی ہوئی تھی۔

"اس نے خودکشی کیوں کی!"

"خدا کے لئے مجھ سے اس وقت سوالات نہ کرو!"

"تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟"

"نہیں!"

اُس کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بیہوش ہو جائے گی۔

"میری تمہیں خود کو سنبھالنا چاہیئے۔ گھبرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایک لمحہ ٹھہرو۔ میں ڈائننگ روم سے تمہارے لئے کچھ برانڈی لے آتا ہوں۔ کہاں رکھی ہے؟"

وہ جانا چاہتا تھا مگر اُس نے اُسے روک لیا۔

"مجھے تنہا نہ چھوڑو۔ مجھے سخت ڈر لگے گا۔"

"اچھا تو میرے ساتھ آؤ!" اُس نے ایک دم کہا۔

اُس نے اُسکے گرد باہیں ڈالیں اور اُسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آیا۔ ڈائننگ روم میں ایک بتی جل رہی تھی۔ کمرے میں گھس کر اسکی نظر سب سے پہلے اُن دو خالی پلیٹوں، فرائی پین، دو گلاسوں اور شراب کی بوتل پر پڑی۔ جس میں ان دونوں نے کھایا پیا تھا۔ روئے میز پر پہنچا جس کرسی پر کامل بیٹھا تھا اس کے برابر والی کرسی پر اس کا میلا ہیٹ پڑا ہوا تھا۔ روئے نے اُسے اُٹھایا، ایک نظر اسکی طرف اور پھر میری کی طرف دیکھا۔ وہ اُس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔

"جب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اسے نہیں جانتی تو یہ غلط تھا"

"مجھے کہنا پڑے گا کہ واقعی یہ بات صاف ظاہر ہے۔"

"خدا کے لئے بس باتیں نہ کرو روئے، میں سخت پریشان ہوں!"

"مجھے افسوس ہے۔" وہ بولا۔ "تو پھر یہ کون ہے؟"

"وہی وائلن بجانے والا، جو ریسٹوران میں ملازم ہے اور جو ہیٹ لے کر آیا تھا کیا تمہیں یاد نہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، مگر اسوقت وہ سازندوں کا لباس پہنے تھا۔ اسی لئے میں اسے نہ پہچان سکا۔ اور اب وہ مختلف نظر آرہا ہے۔ وہ یہاں کیسے پہنچا؟"

میری جھجکی۔

"جب میں گھر کی طرف آرہی تھی تو راستے میں اس سے مڈبھیڑ ہوگئی وہ پریشان تھا، مجھے اس پر ترس آگیا۔"

روئے نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ میری دنیا میں آخری عورت تھی جس پہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتی ہے۔

"میری میری جان۔ میں تمہارے لئے دنیا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا۔"

"وہ بھوکا تھا۔ میں نے اُسے کچھ کھانے کو دیا۔" وہ بولی۔

روئے نے منہ بنایا۔ "تمہارا مطلب ہے اُس نے کھانا کھایا اور پھر گولی مار لی!"

میری رونے لگی۔

"لو کچھ برانڈی پیو! پھر بعد میں رو لینا۔"

اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں، اب نہ روؤں گی، میں اب سمجھ کہ میں نے حماقت کی ہے۔ مگر اسوقت مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ میرا خیال ہے ایک منٹ کے لئے میں دیوانی ہوگئی تھی، تمہیں معلوم ہے۔ میں نے تمہارے کار سے اترنے سے پہلے کیا کہا تھا۔"

وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے:

"میرا خیال تھا وہ صرف ایک بدمانی مذاق تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم ایسی احمقانہ حرکت کر بھی سکتی ہو۔ مگر اس نے خودکشی کیوں کی؟"

"مجھے نہیں معلوم، مجھے نہیں معلوم۔"

اس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور پھر پلیٹوں کو اٹھا کر ٹرے میں رکھنے لگا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا

"تم نہیں سمجھتیں کہ تمہیں ایسی کوئی علامت گھر میں نہ چھوڑنی چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی اجنبی گھر میں آیا تھا۔ باورچی خانہ کدھر ہے؟"

"دروازہ کے سامنے نیچے زینہ سے اُتر کر!"

وہ ٹرے باہر لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو میری اپنا سر پکڑے ہوئے میز پر بیٹھی تھی۔

"خوش قسمتی تھی کہ میں نیچے چلا گیا۔ تم نے تمام بتیاں جلا کر چھوڑ دیں

"لیکن، تم اپنے جرائم کو چھپانے کی عادی نہیں معلوم ہوتیں، تمہارے ملازمین نے آدھے برتن صاف نہ کیے تھے۔ میں نے وہ برتن انہیں میں ملا دیئے، اُمید ہے کہ انہیں پتہ نہ چلے گا، اب ہمیں پولیس کو بلانا چاہیئے۔"

وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"رودلے نہ — !"

"میری جان ذرا ہوش میں آؤ، میں نے اس معاملہ پر خوب غور کر لیا ہے۔ اور تم میرا مشورہ سنو، تم کہنا کہ میں سو رہی تھی کہ ایک آدمی کی آہٹ سے جاگ پڑی، جو یقیناً چور تھا۔ اور تمہارے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ تم نے بتی روشن کی اور برابر کی میز سے اس نے پستول اٹھایا پھر وہ تم سے لپٹ گیا۔ اور اتفاق سے پستول چل گیا۔ تم نے اُسے مارا یا اس نے تمہیں مارا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ گھر گیا ہے۔ اور تمہاری چیخوں سے نوکر جاگ جائیں گے تو اس نے گولی ماری۔"

"اس کہانی پر کون یقین کرے گا، یہ ناقابل یقین ہے۔"

"بہرحال یہ سچائی کے مقابلہ میں زیادہ قابل یقین ہے، اگر تم اس بات پر جمی رہیں تو کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"نینا نے گولی کی آواز سنی تھی کہ وہ میرے کمرے کے دروازہ تک دریافت حال کے لئے آئی تھی، میں نے کہا کوئی بات نہیں ہے، جب پولیس اس سے پوچھے گی تو وہ یہ بات بتا دے گی، پھر میں کیا کہوں گی، آخر جب میرے کمرہ میں ایک مردہ آدمی پڑا ہوا تھا تو میں نے اُسے کہدیا کہ کوئی بات نہیں ہے، یہ بالکل مایوس کن بات ہوگی۔"

"آخر تم مجھے تو سچ سچ بتا ہی دو۔"

"یہ سخت ذلیل بات ہے، مگر اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ میں کوئی بہت نیک کام کر رہی ہوں۔"

وہ اور زیادہ نہ کہہ سکی اور وہ اس کی طرف نیم نیم انداز میں دیکھنے لگا، اس نے ایک گہری آہ بھری۔

"اچھا تو پھر پولیس کو بلا لو۔ اور معاملہ کو ختم کرو، اس کا مطلب بربادی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ میں اسکی مستحق بھی ہوں۔ میں پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی، سارے اخباروں میں یہ خبر چھپے گی۔ اور ایڈگر کو بھی معلوم ہوگا، اور پھر میری شخصیت ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائے گی۔"

رودلے نے اسکی طرف غور سے دیکھا۔

"بے شک اس کا مطلب بربادی ہی ہے، اور یہ بدنام کہانی سب میں پھیل جائے گی۔ میری جان تم نے بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے، تمہاری کوئی بھی مدد نہ کر سکے گا، کیا تم ایک خطرہ مول لینے کو تیار ہو؟ میں بتائے دیتا ہوں کہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے اور اگر تم اپنے اقدام میں کامیاب نہ ہو سکیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

"میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر ہمیں نعش کو کہیں اور سرکوانا ہوگا، اس کے بعد کون شبہ کر سکتا ہے کہ اسکی موت کا تم سے کوئی تعلق ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔"

"نہیں بالکل نہیں، اگر تم میری مدد کرو تو ہم اسے موٹر میں ڈال لیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں پہاڑیاں بہت ہیں، ہم نعش کو کسی ایسی جگہ ڈال دیں گے۔ جہاں اسکا مہینوں پتہ نہ چلے گا۔"

"مگر لوگ اس کی تلاش شروع کر دیں گے۔"

"انہیں کیا ضرورت ہے، ایک اطالوی سازندے کی کوئی پروا کرے گا۔"

"نہیں وہ اطالوی نہ تھا، وہ تو ایک آسٹرین مہاجر تھا۔"

"پھر تو یہ اور بھی بہتر ہے، کسی کو بھی اسکی تلاش نہ ہوگی۔"

"مگر رودلے یہ سخت خطرناک کام ہے، اور کیا تمہیں اپنا خیال نہیں تم کتنا سخت خطرہ مول لے رہے ہو۔"

"مگر میری جان اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے خطرے مول لینے میں مزہ آتا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میری کا دل بندھنے لگا۔ اسکی پریشانی کم ہو چلی تھی، اس تجویز میں اُمید کی کرن نظر آتی تھی۔ مگر اُسے ایک اور شبہ نے گھیر لیا۔

"مگر اب دن نکلنے والا ہے، دھندلکا ہوتے ہی کسان اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔"

اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"روشنی کب ہوگی؟ پانچ بجے کے بعد، ابھی ہمارے پاس ایک گھنٹہ ہے، اگر ہم نے مستعدی برتی تو ہم فوراً ایسا کر سکتے ہیں۔"

اس نے گہری سانس لی۔

"میں خود کو تمہارے حوالے کرتی ہوں، میں وہی کرونگی جو تم کہوگے"

"اچھا تو اُٹھو، اور خدا کے لئے دل کو قابو میں رکھو۔"

تب وہ مُردہ آدمی کا جسم اُٹھا کر وہ اس کمرے میں آگئے، جہاں اس کی نعش پڑی ہوئی تھی۔

"تم اس کی ٹانگیں پکڑو" وہ بولا۔ "اور میں اس کی کمر پکڑتا ہوں۔"

انہوں نے اُسے اُٹھایا۔ اور ہال کمرے میں لے گئے۔ روے نے بڑی مشکل سے اسے اُلٹے پاؤں سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ پھر انہوں نے اس کی نعش نیچے رکھدی۔

"کیا تم کار یہاں تک لا سکتی ہو؟" روے نے کہا۔

"ہاں مگر یہاں واپس موڑنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، مجھے اُلٹی چلانی پڑے گی۔" غیر یقینی سے بولی۔

"یہ کام میں کرلوں گا۔" وہ بولا۔

وہ پتلی پٹری پر کار لینے چل پڑی۔ اسی اثنا میں روے مکان کے اندر گیا، سنگِ مرمر کے فرش پر خون جما ہوا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ آدمی نے گولی اپنے دل پر ماری تھی۔ اور خون اندر ہی جذب ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ غسل خانے میں گیا اور ایک تولیہ کو پانی میں بھگو کر اُسے فرش پر رگڑا۔ فرش سنگِ مرمر کا تھا اور اُسے یقین تھا کہ بغیر گہری نظر ڈالے کوئی بھی خون کو محسوس نہ کر سکے گا۔ وہ خون سے بھیگے ہوئے تولئے کو لیکر باہر آگیا۔ میری کار کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اُس سے کچھ نہ پوچھا۔

روے نے موٹر کی پچھلی کھڑکی کھولی، اور پھر اس مردہ آدمی کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال دیئے، اس نے اسے اوپر اُٹھایا۔ اور میری نے یہ دیکھ کر اُسے سخت زور لگانا پڑ رہا ہے۔ اس کے پاؤں اُٹھالئے، انہوں نے نعش فرش پر لٹا دی۔ اور روے نے تولیہ کو اس کے سینہ کے گرد لپیٹ دیا۔ مبادا جھٹکے لگنے سے پھر خون جاری نہ ہو جائے۔ اس نے اس کے ملائم ہیٹ کو اس کے سر پر منڈھ دیا، روے گاڑی میں بیٹھ گیا اور اُسے دروازہ تک اُلٹی لے گیا۔ اب یہاں گھمانے کے لئے کافی جگہ تھی،

"کیا میں ہی چلاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں دہنی طرف کو موڑو۔"

"ہمیں جلد از جلد بڑی سڑک سے گذر جانا چاہیئے۔"

"یہاں سے چار پانچ میل دور ایک چھوٹی سی سڑک مڑتی ہے۔ جو ایک پہاڑی پہ واقع چھوٹے سے گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سڑک کے آس پاس جنگل ہے۔"

جب وہ چوڑی سڑک پر پہنچ گئے تو روے نے گاڑی تیز کردی۔

"تم بہت تیز چل رہے ہو۔" میری بولی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے جان من۔" روے ترشی سے بولا۔

"مجھے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

"گاڑی کے سامنے ... نہیں، تم سنبھل کر بیٹھی رہو۔"

اُس کے مزاج میں تلخی تھی۔ اسے خاموش ہونا پڑا۔ چاند چھپ چکا تھا اور رات تاریک ہو چلی تھی۔ میری رفتار کی سوئیاں نہ دیکھ سکی۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ اسی میل فی گھنٹہ سے کم نہیں جا رہے۔ دونوں ہاتھ بھینچے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈر رہی تھی۔ مگر اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنے دل میں بڑبڑا رہی تھی۔

"میں نے کتنی بڑی حماقت کی۔"

"اب ہم پانچ میل نکل آئے ہیں۔ کیا وہ موڑ پیچھے تو نہیں چھوٹ گیا؟" وہ بولا۔

"اب ہم جلدی وہاں پہنچنے والے ہیں۔ گاڑی ذرا ہلکی کرلو۔"

وہ چلتے رہے میری اس سڑک کے فکر میں لگ گئی۔ جو اس پہاڑی کی طرف جاتی تھی، وہ تین چار مرتبہ اس سڑک پر جا چکی تھی،

"یہ رہی!" وہ اچانک بولی۔

مگر روے اس سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اس نے بریک لگائے اور گاڑی اُلٹی چلائی پتلی سڑک پر چڑھ کر وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ وہ دونوں تاریکی میں اس جنگل کو دیکھنے لگے، مس میری نے اس کا بازو پکڑا۔ اور بائیں طرف اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی روک دی، سڑک کے ایک طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا بن کھڑا ہوا تھا اور زمین گھاس کباڑ سے پٹی ہوئی تھی۔ سڑک سے جھاڑیوں کی طرف ایک دم سیدھی گہرائی تھی۔ اس نے گاڑی کی بتیاں گل کر دیں۔

"میں نیچے جاتا ہوں۔ اور جگہ کا معائنہ کرتا ہوں، میرے خیال میں یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔"

وہ نیچے اترا۔ اور کباڑ میں داخل ہو گیا، اس تاریکی میں اسکے پاؤں نیچے کباڑ کی آواز بڑی اونچی اور ڈراؤنی معلوم دیتی تھی۔ دو تین منٹ بعد وہ پھر واپس آگیا۔

میرے خیال میں یہ جگہ بالکل ٹھیک ہے، وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا کیونکہ وہاں دور دور تک کوئی متنفس نہ تھا۔ اچھا ذرا اسے باہر نکالنے میں میری مدد کرو، اگر میرے بس کا ہوتا تو خود ہی لے جاتا۔ تم نیچے نہ جا سکو گی۔ تمہاری کھال اور کپڑے سب پھٹ جائیں گے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔" وہ بولی۔

"تم اپنے نوکروں سے کیا کہو گی۔" وہ بولا۔ "تمہارے کپڑے اور جوتے سب پھٹ جائیں گے، میں تو سب سنبھال لوں گا۔"

وہ گاڑی سے اُتری اور انہوں نے پچھلی کھڑکی کھولی وہ نعش کو اٹھانے ہی والے تھے کہ انہیں روشنی نظر آئی، یہ ایک کار کی روشنی تھی جو پہاڑی کی طرف سے نیچے آ رہی تھی۔

"اُفوہ! اب ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ گھبرائی، "روے تم بھاگ جاؤ، ورنہ تم خواہ مخواہ پھنس جاؤ گے۔"

"ایسی پاگل باتیں نہ کرو۔"

"میں تمہیں مصیبت میں تنہا نہ چھوڑوں گا۔"

وہ رونے لگی۔

"پاگل نہ بنو، اگر تم نے خود کو قابو میں رکھا تو سب ٹھیک رہیگا۔"

"ہم انہیں دھوکا دے سکتے ہیں؟"

"نہیں روے، اب میری خیر نہیں۔"

"ٹھہرو، تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ چلو گاڑی میں پیچھے بیٹھو۔"

"مگر وہاں تو نعش رکھی ہے۔"

"خاموش رہو۔"

اس نے اُسے اندر دھکیلا، آنے والی کار کی روشنی ایک موڑ کی وجہ سے چھپ گئی تھی، مگر اگلے موڑ پر وہ بالکل سامنے آنے والی تھی۔

"مجھ سے لپٹ جاؤ۔ وہ ہمیں آشنا سمجھیں گے، جو آوارگی کے لئے ایک تنہا جگہ نکل آئے ہیں۔ مگر بالکل خاموش رہنا۔ بالکل مت ہلنا۔"

اب کار سامنے آ چکی تھی۔ دو تین منٹ میں وہ اُن تک پہنچ جاتی۔ سڑک بہت پتلی تھی۔ اور کار اُن کے بالکل برابر سے گزرے گی۔ بس بالکل اُن کی کار سے رگڑ کر ہی گزرے گی۔ روے نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اُسے خوب چمٹا لیا۔ اُن کے پاؤں کے نیچے نعش سکڑی ہوئی پڑی تھی،

"میں تمہارا بوسہ لوں گا۔ تم بھی میرا بوسہ لینا، ایسا معلوم ہو جیسے ہم یہاں اسی لئے آئے ہیں۔"

کار اب قریب تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بھاگی ہوئی آ رہی ہے۔ اور پھر انہیں اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے قہقہے سنائی دیئے۔ جو خوب اونچی آواز سے گا رہے تھے،

"واللہ وہ پئے ہوئے معلوم دیتے ہیں، خدا کرے وہ ہمیں نہ دیکھیں، کہیں ایسا نہ ہو نشے میں ہم سے ٹکرا جائیں، جلدی کرو میرا بوسہ لو۔"

اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے گویا کہ وہ آنے والی کار سے بالکل غافل ہیں اور اپنے مزہ میں وہ کھوئے ہوئے ہیں۔

گاڑی آدمیوں سے خوب بھری ہوئی تھی اور وہ بہت اونچی آواز سے بول رہے تھے۔ گویا مردہ بھی جاگ پڑے گا۔ شاید آس پاس کلبوں میں کوئی تقریب ہوگی۔ جہاں انہوں نے خوب ڈٹ کر پی ہوگی اور اب واپس اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ وہ بیچ سڑک میں آتے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا کہ اُن کی گاڑی ان کی کار سے ٹکرا جائے گی مگر کیا جا سکتا تھا۔ اچانک اُن سب کی چیخ نکل پڑی، موٹر کی بتیاں کھڑی ہوئی کار پر پڑیں۔ پھر بریکوں کی تیز چنگھاڑ نکلی اور وہ کار آہستہ ہو گئی۔ معلوم ایسا دیتا تھا۔ کہ اس غیر متوقع حادثہ سے ڈرائیور ہوش میں آ گیا تھا اور اب وہ بہت آہستہ چل رہا تھا، اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ کھڑی ہوئی کار کے اندر ایک جوڑا ایک دوسرے سے چپٹا بیٹھا ہے۔ تو وہ سب ایک ساتھ زور سے ہنسے، ایک آدمی نے ایک غلیظ جملہ کہا۔ اور وہ تین آدمی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ روے نے میری کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا، کوئی سمجھے کہ وہ محبت کے جوش میں گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہیں۔ ایک دوسرے آدمی نے ایک بازاری گیت شروع کر دیا۔ اور پھر سب نے اسے دہرانا شروع کر دیا۔ اور سیٹیاں بجانے لگے۔ انہوں نے کار بہت آہستہ سے برابر سے نکالی۔ صرف ایک انچ کا بچاؤ تھا،

"اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دو۔" روے نے اس کے کان میں کہا اور جب اُن کی کار اُن کے برابر سے گزری تو اُس نے خوشی سے اپنا ہاتھ دوسری گاڑی میں بیٹھے ہوئے شرابیوں کی طرف ہلایا۔ "خوش رہو، شاباش خوب موج کرو۔" وہ چیخنے لگے، اور پھر انہوں نے وہی بازاری گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر اُن کی آوازیں دور ہوتی گئیں،

اس وقت روے نے اپنے بازو علیحدہ کئے اور پھر میری کار کے کونے میں وحشت زدہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہم نے اس وقت بالکل ٹھیک کیا۔" روبلے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ورنہ کوئی نہیں ڈرتا۔ اچھا اب ہمیں اپنا کام جلد ختم کرنا چاہیئے۔"

"کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟ اگر نعش اسی جگہ ملی تو ......"

"کوئی بات نہیں، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ کوئی محفوظ جگہ تلاش کریں۔ اور وہ پیچھے چھوٹ گئے۔ تم سوچو، فیبڈ کا بچہ بیکاروں میں ہی ہم پر کوئی شبہ کرے گا، سب یہی سمجھیں گے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ مجھے اس سے بچنا چاہئے۔"

"مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں کھڑی بھی ہو سکوں۔"

"مگر تمہیں اسے نکالنے میں میری مدد کرنی ہوگی، اس کے بعد تم بیٹھ جانا۔"

وہ باہر نکلا اور اسے کھینچا۔ مگر نٹ پیرل پر پہنچکر وہ بے قابو ہو کر رونے لگی، اس نے اس کا بازو پکڑا۔ اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا، وہ اتنی گھبرائی کہ ایک دم اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور رونا بند کر دیا، اس کے منہ سے آہ تک بھی نہ نکلی۔

"اب میری مدد کرو۔"

بغیر ایک لفظ کہے انہوں نے نعش کو باہر نکالا۔ روبلے نے اسے بغلوں کے نیچے سے پکڑ رکھا تھا۔

"اب اسکی ٹانگیں میرے دوسرے بازو پر رکھدو، اس میں بہت ہی بوجھ ہے۔ اچھا ان جھاڑیوں کو ایک طرف کرو تاکہ میں بآسانی گذر سکوں۔"

اس نے وہی کیا جو کہا گیا تھا۔ اور پھر وہ ایکدم گہرائی میں اتر گیا اس کے گرنے سے اتنے زور کی آواز نکلی جس نے تمام فضا کو چونکا دیا، جتنی دیر وہ نظروں سے اوجھل رہا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت لامحدود ہو گیا ہے۔ آخر اس نے اسے اوپر آتے ہوئے دیکھا

"میں نے سوچا تھا جس راستے سے میں گیا ہوں اس سے واپس نہ لوٹوں گا۔"

"سب ٹھیک ہو گیا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے، خدا کی قسم میں سخت تھک گیا ہوں، بغیر شراب کے میں اتنا کام نہ کر سکتا تھا۔"

اس نے اسکی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "اب تم جتنا چاہو رو سکتی ہو۔" وہ کچھ نہ بولی اور وہ دونوں کار میں بیٹھکر روانہ ہو گئے۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہاں کار نہ گھما سکوں گا، اس کے علاوہ ہم کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑنا چاہتے جس سے یہ معلوم ہو کہ ایک کار یہاں تک آئی اور واپس ہو گئی، کیا تمہیں معلوم ہے کہ آگے کوئی ایسی سڑک ہے جس سے گھوم کر ہم بڑی سڑک پر پہنچ جائیں۔"

"میرا خیال ہے صرف یہی ایک سڑک ہے، یہ سڑک گرموف گاؤں میں جا کر ختم ہو جائے گی۔"

تھوڑی دور وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

"تولیہ ابھی تک کار میں پڑا ہے۔"

"میں اسے ساتھ لیجا کر کہیں دور پھینکدوں گا۔"

"مگر اس پر مالکان بنگلہ کا نام کڑھا ہوا ہے۔"

"تم اسکی پرواہ نہ کرو۔ میں اس میں ایک بھاری پتھر باندھکر دریا میں پھینکدوں گا۔"

ایک دو میل کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک کچھ زیادہ چوڑی تھی۔ اور گاڑی بمشکل گھمائی جا سکتی تھی۔ روبلے نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔

"ارے۔" وہ چیخا۔ "پستول تو ......"

"کیا، وہ تو میرے کمرے میں ہی رہ گیا ہے۔"

"اگر لوگوں نے اسے بغیر پستول کے دیکھا تو وہ طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں پستول اسکے برابر میں رکھنا چاہیئے تھا۔"

"اب کیا کیا جائے؟" وہ بولی

"خدا کا شکر کرو کہ وہ ابھی تک ہمارے پاس ہی ہے، اگر نعش بغیر پستول کے ملی تو پولیس سوچے گی کہ کوئی آدمی یہاں آیا اور پستول اٹھا کر چلتا بنا۔"

وہ جس تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے واپس چل دیئے کبھی کبھی روبلے آسمان کی طرف رات کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھ لیتا۔ ابھی رات باقی تھی، مگر تاریکی اب زیادہ نہ رہی تھی۔ ابھی دن نہ نکلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن نکلنے ہی والا ہے، اطالوی کسان بہت سویرے کھیتوں کو چل دیتے تھے۔ اور روبلے میری کو جلد از جلد بنگلے پر چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر وہ اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے جس پر بنگلہ واقع تھا۔ صبح کاذب ہونے ہی والی تھی۔

"اچھا اب تم سو جاؤ۔ میں نے سائیکل یہیں چھوڑی تھی۔"

اس نے اسکی بے جان مسکراہٹ دیکھی، وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے اس کے کندھے کو تھپکا۔

"بس سب ٹھیک ہے۔ گھبراؤ مت، اور دیکھو دو خواب آور گولیاں کھا لینا۔ جاگنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، گہری نیند کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اب میں کبھی نہ سو سکوں گی۔"

"اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خواب آور گولیاں کھا لینا۔ میں دن میں کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔"

"میں تمام دن گھر پر ہی رہوں گی۔ اور اگر کسی نے پوچھا تو کہدوں گی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں تمہیں ایسا نہ کہنا چاہیئے، تمہیں ایسا ظاہر کرنا چاہیئے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی، یہ ایک معمولی بات ہے۔ فرض کرو کسی نے تم پر شک کیا تو تم اپنے رویے سے بالکل اس کا اظہار نہ کرنا۔ سمجھیں؟"

"ٹھیک ہے۔"

میری اسٹیرنگ وہیل پر بیٹھ گئی اور روے کو سائیکل اٹھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب وہ چلا گیا تو وہ بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے کار گیرج میں کھڑی کی جو دروازہ کے پاس ہی بنا ہوا تھا، اور پھر جلدی سے گھر کی طرف چلدی۔ وہ اپنے کمرہ میں پہنچی اور ایک لمحہ کے لئے جھجکی۔ اسے توہمات نے گھیر رکھا تھا، کہ دروازہ کھولتے ہی اسکا بھوت اس کی جھپٹ پڑے گا، ہر چند وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک انجانا سا خوف اس پر برابر حاوی تھا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ اور جلدی سے بتی روشن کی۔ اور جب دیکھا کہ کمرہ خالی ہے تو اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے مسہری کے پہلو میں رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھا، ابھی پانچ نہ بجے تھے۔ اس تھوڑے سے وقفہ میں کتنے خطرناک واقعات گزر چکے تھے۔ چند گھنٹے کی زندگی کو خریدنے کے لئے وہ دنیا کی مہنگی سے مہنگی چیز دے سکتی تھی کاش وہ پہلی جیسی باعزت اور آزاد عورت بن سکتی۔ آنسو اسکے رخسار پر بہنے لگے۔ وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی اور اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اسے سارے واقعات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے، اس نے آہستہ آہستہ کپڑے بدلنے شروع کر دیئے۔

وہ اس بستر پر لیٹنا نہ چاہتی تھی مگر اس کے علاوہ دوسرا حل نہ تھا۔ اسے اس بنگلہ میں ابھی کئی دن اور ٹھہرنا تھا۔ روے اسے بتائے گا کہ یہاں سے جانا کب مناسب رہیگا۔ اگر وہ ایکدم اپنی منگنی کا اعلان کر دے گی تو اس پر کسی کو شک نہ ہوگا۔ کہ وہ فلوریڈا میں اپنے طے شدہ پروگرام سے زیادہ کیوں نہ ٹھہر سکی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ہندوستان کب روانہ ہوگا۔ مگر غالباً جلد ہو جائے گا۔ وہاں پہنچکر وہ بالکل محفوظ ہو جائے گی۔

جوں ہی بستر پر وہ لیٹ رہی تھی، اسے وہ برتن یاد آ گئے جو روے نے باورچی خانہ میں رکھد ئیے تھے۔ اس کے کہنے کے باوجود اس کا دل نہ مانا، اور وہ خود جاکر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔ اگر کسی نوکر نے اسے دیکھ لیا تو وہ کہدے گی کہ اسکی آنکھ بھوک سے کھل گئی اور وہ کچھ کھانے کے لئے یہاں چلی آئی۔ اس نے اپنا گاؤن پہنا اور ڈرائنگ روم سے ہوکر باورچی خانے میں چلی گئی۔ سارا گھر خاموشی اور ویران معلوم دے رہا تھا اور باورچی خانہ کسی غار کی طرح مہیب لگ رہا تھا۔ اس نے گوشت کو میز پر رکھا ہوا دیکھا اور اسے اٹھا کر الماری میں رکھدیا۔ اس نے انڈوں کے خول ٹب میں پھینک دئیے۔ اور وہ پلیٹیں اور گلاس جن میں اس نے اور اس مردہ آدمی نے کھایا پیا تھا۔ دھو کر صاف کئے اور انہیں پہلی والی جگہ پر رکھدیا۔ فرائی پین کو اسکی کیل پر لٹکا دیا۔ اب وہاں کوئی ایسی علامت نہ تھی جو کسی قسم کا شک پیدا کرتی۔ اس نے خواب آور دوا کھائی اور واپس اپنی خوابگاہ میں آ گئی۔ خواب آور گولیوں نے اسکی امید کے خلاف کوئی جلد اثر نہ کیا۔ اور اسے ایسے لگا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ مگر پھر تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں کھو گئی۔

— ۵ —

جب میری کی آنکھ کھلی تو اس نے نینا کو باہر میں کھڑے ہوئے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے غنودگی کی حالت میں پوچھا۔

"سرکار آپ بہت دیر تک سوتی ہیں۔ سرکار کو ایک بجے لنچ پر جانا تھا اور اب بارہ بج رہے ہیں۔"

معاً میری کو یاد آگیا، اب وہ پوری طرح جاگ چکی تھی اس نے ملازمہ کی طرف دیکھا، وہ بدستور شفقت سے مسکرا رہی تھی۔ میری نے

اپنے حواس درست کئے۔

"جب تم نے مجھے جگایا تو میں پھر سو نہ سکی۔ اور باقی رات جاگ کر گزارنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔"

"حضور مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو جگایا۔ مگر میں نے پھر آواز سنی تھی اور مناسب سمجھا کہ حضور کی خیریت دریافت کر لوں؟"

"کس قسم کی آواز؟"

"گولی چلنے کی سی۔ مجھے اس پستول کا خیال آگیا جو سرکار نے آپ کو دیا تھا اور مجھے خوف سا لگا۔"

"یہ کسی کار کی آواز ہوگی۔ رات میں دور کی آواز بھی پاس کی معلوم دیتی ہے۔ مجھے ایک پیالی چائے لا دو۔ پھر میں نہاؤں گی۔ جاؤ ذرا جلدی کرو۔"

جونہی نینا کمرے سے باہر گئی میری لپک کر اس الماری کے پاس پہنچی جہاں اس نے پستول رکھ دیا تھا، ایک لمحہ کے لئے اسے شک ہوا کہ مبادا نینا نے پستول نہ دیکھ لیا ہو اور اسے کہیں اور رکھ دیا ہو۔ اس کا شوہر سیدھا اسے بتا دے گا کہ ایک کارتوس چل چکا ہے، وہ کوئی آج سے پہلے کچھ سوچنے لگی، وہ سمجھ گئی کہ رولے نے اس سے کیوں اصرار کیا تھا کہ وہ بیچ پارٹی میں ضرور جائے۔ وہ خود کو اس کا بہت شکرگزار محسوس کرنے لگی، وہ کس قدر مطمئن تھا، اس نے کس قدر اطمینان سے کام سرانجام دیا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس اوباش آدمی میں ایسی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں جس وقت وہ شرابی نکے برابر سے گزرتے تھے اگر اس وقت وہ حاضر دماغی کا ثبوت نہ دیتا تو کیا حشر ہوتا۔ اس نے ایک آہ بھری۔ شاید وہ سوسائٹی کا ایک بدنام آدمی ہے۔ مگر وہ ایک ہمدرد دوست ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جب میری چائے پی چکی اور غسل کر کے سنگھار دان کے سامنے بال بنانے لگی تو اس نے خود کو مطمئن محسوس کیا۔ یہ تعجب خیز بات محسوس ہوتی تھی کہ اتنے اہم واقعات سے گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ان تمام خطروں اور مصیبتوں کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ خود کو بالکل چاق چوبند محسوس کرتی تھی۔ اس کی ارغوانی رنگ کی جلد پر کسی تھکاوٹ کے آثار باقی نہ بچے تھے۔ اس کے بال چمکیلے اور آنکھیں مسرور تھیں۔ اس نے خود کو ایک عجیب کیفیت میں ڈوبا ہوا پایا۔ وہ اس پارٹی کے متعلق سوچ رہی تھی جہاں اسے خوش اخلاقی اور لطیف طبعی کا ثبوت دینا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے آنے کے بعد لوگ یہ کہنے پہ مجبور ہو جائیں کہ آج میری بہت زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ رولے سے یہ پوچھنا بھول گئی تھی کہ وہ بھی پارٹی میں آئے گا یا نہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی وہاں ملے گا۔ اسکی وجہ سے اس میں اعتماد اور زیادہ آ جائے گا۔

اب وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے آئینہ میں اپنے اوپر ایک آخری نظر ڈالی۔ نینا نے اسے پسندیدہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"سرکار آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہیں۔"

"نینا تمہیں میرے نفس کو اتنا نہ بہکانا چاہیئے۔"

"مگر سرکار میں سچ کہہ رہی ہوں، حقیقی نیند نے آپ کو بہت آرام دیا ہے۔ آپ تر و تازہ معلوم دیتی ہیں۔"

جن لوگوں کے یہاں بیچ پارٹی میں جانا تھا وہ ایک امریکی جوڑا تھا جو پچھلے بیس سال سے اٹلی میں مقیم تھا۔ ان کا بنگلہ بھی بہت حسین تھا اور اس میں بھی دیواروں پہ اعلیٰ تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اس میں بہت قیمتی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ یہ امریکی جوڑا بہت متمول اور خوش مزاج تھا اور دونوں میاں بیوی اکثر پارٹیاں دیتے رہتے تھے۔ جب میری کو ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا تو بہت سے مہمان پیشتر سے پہنچ چکے تھے وہ ملازم باہر کھڑے ہوئے مہمانوں کو کاک ٹیل پیش کر رہے تھے۔ عورتیں پیرس کے سلے ہوئے قیمتی لباسوں میں خوبصورت نظر آ رہی تھیں اور مرد اپنے ٹھنڈے سوٹوں میں ملبوس عورتوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے باہر باغیچہ میں بڑے بڑے مجسمے اور پھولوں سے بھرے گملے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ جون کی اس گرم دوپہر میں ہر شخص کے اندر ایسی زندہ دلی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو طرح طرح کی خوش گپیوں اور لطیفوں کو دعوت دیتی ہے۔ وہاں پہنچ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہر آدمی فارغ البال ہے۔ وہ زندگی کا مقصد ہی خوش رہنا ہے۔ یہاں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل تھا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔

میری جب کمرہ میں داخل ہوئی تھی تو اسے وہاں کے ماحول کا بخوبی طرح اندازہ تھا۔ مگر اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا، جیسے کوئی گھنی چھاؤں کے بعد چلچلاتی دھوپ میں پہنچ جائے۔ وہ غریب لڑکا ابھی تک جھاڑیوں میں مرا پڑا ہوگا، معاً اسکی نظر رولے پہ پڑی جو کمرہ میں دوسرے سرے پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اسکی نصیحت یاد آ گئی۔ وہ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اُس کا میزبان ایک ادھیڑ عمر کا امریکی تھا۔ جسے خوبصورت عورتوں سے بات چیت کرنے میں مزا آتا تھا، اور وہ میری سے پدرانہ محبت کرتا تھا۔
وہ ابھی تک اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، اتنے میں روبے آگیا۔
"میں اس لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ وہ تصویر سے بھی زیادہ حسین ہے۔" امریکی میزبان نے روبے کی طرف مڑ کر کہا۔
"دوست تم اس پر اپنا وقت فضول خراب کر رہے ہو" روبے طویل مسکراہٹ کے بعد بولا "تم کسی تصویر کی ہی تعریف کرو۔"
"کیا تم اس کے گرویدہ ہو گئے ہو؟"
"بے شک۔"
"بات یہ ہے جناب والا"۔ اُس نے میزبان کو خطاب کر کے کہا۔ "مجھے لڑکے بالکل پسند نہیں میرا تجربہ ہے کہ پچاس سال کی عمر تک کا کوئی آدمی بھی لڑکیوں سے میل جول کے لئے ٹھیک نہیں۔"
"ہمیں کسی وقت مل جل کر اس مسئلہ کو حل کرنا پڑیگا۔" میزبان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمارے خیالات بہت حد تک مشترک ہیں۔"
پھر وہ ایک دوسرے مہمان کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھا۔
"تم پر تو آج بڑا رنگ آیا ہوا ہے۔" روبے نے دبی آواز میں کہا۔
اُسکی پسندیدہ نظروں نے اسکی ہمت بڑھائی۔ مگر پھر بھی اُس نے اسکی طرف کچھ خوفزدہ ہو کر دیکھا۔
"بالکل مت گھبراؤ۔ خود کو ایک ایسی اداکارہ سمجھو جسے ایک پارٹ ادا کرنا ہے۔"
"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اداکاری کا ہنر مجھے کبھی نہیں آیا۔" اُس نے مسکراہٹ کر جواب دیا۔
"اگر تم عورت ہو تو ضرور اداکاری کر سکتی ہو۔"
اور واقعی اُس نے اس عصرانہ میں یہی کیا بھی۔ عصرانہ جلد شروع ہو گیا۔ اُس کے داہنی طرف اس کا میزبان بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور اس کے بائیں طرف جو اطالوی آرٹسٹ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہ آرٹ کے متعلق بڑی دلچسپی سے باتیں کرتی رہی۔ فلورنس کی اونچی سوسائٹی کے لوگ زیادہ نہ تھے۔ اور اس عصرانہ میں بیشتر وہی لوگ تھے جو سارے بر ریسٹوران میں مدعو تھے۔ شہزادی سان فرڈینانڈو جو دعوت میں اسکی میزبان تھی، امریکی میزبان کے داہنی طرف بیٹھی ہوئی تھی، اسکی موجودگی سے میری کچھ پریشان سی تھی۔ بڑھی شہزادی میز پر جھک کر میری سے مخاطب ہوئی۔
"میں آپ سے بات کا ذکر کر رہی تھی۔" اُس نے امریکی میزبان کو مخاطب کیا۔ "میں نے کچھ دوستوں کو ایک شخص کا گانا سنوانے کے لئے ریسٹوران میں دعوت دی تھی، مگر وہ بیمار تھا۔"
"میں نے اسکا گانا سنا ہے۔ میری بیوی اس کے گانے کو بہت پسند کرتی ہے۔" امریکی میزبان بولا۔
"بجائے اُس کے انہوں نے ایک وائلن بجانے والے کو بلالیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک جرمن مہاجر ہے اور صرف اسکی امداد کے لئے انہوں نے اُسے وائلن بجانے کا موقع دیا تھا۔ اب وہ اُسے ملازمت میں کام نہ دیں گے، میری تمہیں یاد ہے نا وہ آدمی۔ وائلن بجانا تو آتا ہی نہیں۔"
"واقعی وہ اچھی وائلن نہ بجاتا تھا۔" میری بولی
"اس نے سوچا کہ اس کی آواز دوسروں کو بھی ایسی ہی محسوس ہوتی ہے جیسے خود اُس کو ہوتی ہے۔"
"یہ کہنا تو کم ہے۔" وہ بولی۔ "اگر میں اسکی طرح وائلن بجاتی تو اپنے کو گولی مار لیتی۔"
میری نے سوچا وہ کچھ بولے۔ اُس نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔
"ایسے پریشان حال لوگوں کو کام ملنا بہت مشکل ہے۔"
"آہ بے چارہ۔" امریکی میزبان بولا۔ "جوان آدمی تھا وہ۔"
"ہاں! ابھی عمر ہی کیا ہے بے چارے کی۔" شہزادی نے جواب دیا۔ "اُس کا سر بڑا عجیب ہے نا میری؟"
"میں نے اُسے غور سے نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔ "میرا خیال ہے وہ اُن کپڑوں میں عجیب سا لگ رہا تھا۔"
"مجھے خبر نہ تھی کہ وہ مہاجر ہے۔ اب مجھے اس پر ترس آرہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اُسکے اتنے پیچھے پڑ گئی کہ ریسٹوران والے نے اُسے کام سے علیحدہ کر دیا۔ پتہ نہیں کہ وہ مجھے کہیں مل سکے گا یا نہیں، میں اُسے سو دو سو روپے دینا چاہتی ہوں تاکہ وہ نوکری ملنے تک اپنا وقت نکال سکے۔" شہزادی کہہ رہی تھی۔
وہ اُس کے متعلق بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ میری نے روبے کی طرف مایوس نظروں سے دیکھا، مگر وہ میز کے دوسرے سرے پر تھا اور نظر سے اوجھل تھا۔ اُسے صورت حال کا تنہا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ [illegible]

غنڈوں کا سرغنہ بھاگ گیا۔ میری کی حالت گھبرا گئی تھی، وہ ایک موضوع کے بعد دوسرے موضوع پر گفتگو کرتی رہی مگر تمام وقت اس کے ذہن کے پس منظر میں رات کا ایک واقعہ کھٹکتا رہا۔ آخر کار جب وہ وہاں سے چلنے لگی تو اس نے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔

"شکریہ! دعوت بہت ہی کامیاب رہی، مجھے یاد نہیں پڑتا اس سے پہلے مجھے کسی دعوت میں کبھی مزا آیا ہو۔"

میزبان کی بیوی نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔

"شکریہ آپ کی عورت اور ... جس پارٹی میں آپ جیسی حسین عورتیں ہوں گی وہ تقریباً کامیاب رہے گی۔ میرا شوہر خاصا رنگین مزاج آدمی ہے آپ کسی بات کا خیال نہ کیجئے گا۔"

"نہیں وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ہم سے جلد جدا ہونے والی ہو؟"

اس کے لہجے سے میری کو اندازہ ہوا کہ اس کا مطلب ایڈگر سے ہے شاید شہزادی نے اسے کچھ بتا دیا ہے۔

"کون جانے۔"

"میرا خیال ہے جو کچھ ہم نے سنا ہے وہ سچا ہے، میں آدمی کو خوب پہچانتی ہوں۔ تم ایک نیک اور خوبصورت عورت ہو، خدا تمہیں خوش رکھے گا۔"

میری نے اپنی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل ضبط کیا۔ اس کے چہرہ پر ایک مایوس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ فوراً رخصت ہو گئی۔

— ۶ —

جب وہ گھر پہنچی تو ایک تار جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کل واپس پرواز کر رہا ہے — ایڈگر۔"

باغیچہ میں ایک اور چبوترہ بھی تھا۔ اور میری اسے بھی بہت عزیز رکھتی تھی، اس میں ایک چھوٹا سا گول لان تھا جسے سرو کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک حصہ، جدھر سے منظر کا نظارہ ہو سکتا تھا، خالی تھا۔ یہاں سے فلورنس نہیں بلکہ ایک گاؤں نظر آتا تھا۔ جو ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا جس پر زیتون کے درخت اُگے ہوئے تھے، اس پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتیں سرخ تھیں۔ یہ حصہ ایک گوشے میں تھا اور خوشگوار حد تک سرد تھی۔ میری کو یہاں بیٹھ کر بڑا سکون حاصل ہوتا تھا۔ تنہائی کا حاصل ہونا بڑا طمانیت بخش تھا، اب وہ اپنے پسندیدہ خیالات میں غرق ہو سکتی تھی، تھوڑی دیر کے بعد نینا اس کے لئے چائے لے آئی۔ میری نے اسے بتایا کہ رولے آنے والا ہے۔

"جب وہ آجائے تو کچھ برف، سوڈا اور وہسکی دے جانا!"

"بہت اچھا سرکار۔"

نینا ایک نوجوان عورت تھی جسے باتیں کرنے کا شوق تھا اور میری کو ایک نئی خبر سنانا چاہتی تھی۔

"حضور! باورچن ذکر کر رہی تھی کہ اس کے رشتہ داروں نے ایک جاپانی کو ایک جھونپڑی کرائے پر دے رکھی تھی مگر وہ کل سے غائب ہے۔ وہ بیچارے غریب لوگ ہیں اتنا بڑا نقصان کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے پاس سوائے جسم کے کپڑوں کے اور کوئی سامان نہ تھا جو کچھ تھوڑا بہت سامان ہے بھی تو وہ پانچ روپے سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ انہوں نے تین ہفتے سے اس سے کرایہ نہ مانگا تھا کیونکہ اس کی حالت سقیم تھی۔ مگر اب وہ روپیہ لے کر بھاگ گیا ہے نا اوچھی بات۔ اگر انہیں عقل آگئی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں نیکی کرنے سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔"

"وہ کب بھاگا؟" میری نے پوچھا۔

"وہ کل رات ایک ریسٹوران میں وائلن بجانے گیا تھا۔ اسی ریسٹوران میں جہاں رات سرکار کی دعوت تھی۔ وہ کہہ گیا تھا کہ وہاں سے پیسے لے گا اور وہ کرایہ ادا کر دے گا۔ مگر وہ واپس نہ آیا۔ انہوں نے دریافت کر معلوم بھی کیا۔ مگر وہاں کچھ پتہ نہ چلا۔ ریسٹوران والوں نے بتایا کہ اسے کام سے ہٹا دیا گیا ہے اگرچہ اس کے پاس رات کافی روپے تھے۔ صرف ایک ہی عورت نے سو روپے کا نوٹ دیا تھا!"

میری نے اس کی بات کاٹی۔ وہ اور کچھ نہ سننا چاہتی تھی۔

"باورچن سے پوچھو اس جاپانی پر کتنے روپے چڑھے ہوئے تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی غریب آدمی اس طرح ستایا جائے۔ سارا کرایہ میں ادا کر دوں گی۔"

"حضور آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ لوگ بہت ہی غریب ہیں، وہ کھانا بھی ان کے ذمے ہی کھاتا تھا اور حضور کو معلوم ہے آجکل

کتنی مہنگائی ہے۔ انہیں جنگ کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔"

"میں ضرور دیں لوں گی۔ اچھا اب تم جا سکتی ہو۔"

یہ دن میں دوسرا موقع تھا کہ اُسے مردہ آدمی کا تذکرہ سننا پڑ رہا تھا۔ میری پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ جس پریشان حال آدمی کی زندگی میں کوئی پروا نہ کرتا تھا۔ اب ہر شخص اسی کی فکر میں لگ گیا ہے۔ گویا کہ وہ مرنے کے بعد ہر آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے۔ اسے شہزادی کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ چونکہ اس کا کام اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب وہ اسے تلاش کرے گی اور اس کی کچھ مدد کرے گی اور وہ ایک ضدی عورت تھی۔ اگر وہ اسے نہ پا سکی تو زمین آسمان کا کونہ کونہ چھان مارے گی۔ "مجھے یہاں سے چل دینا چاہیئے۔ مجھے بہت خوف معلوم دیتا ہے" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

کاش رود ے جلد آ جائے۔ اس وقت وہی اس کا واحد سہارا تھا۔ ایڈگر کا تار اس کے پرس میں تھا۔ اس نے اسے نکالا اور ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ بس بھاگنے کی یہی ایک صورت تھی۔ وہ انہماک سے سوچنے لگی۔ بالآخر اس نے اپنا نام پکارتے ہوئے سُنا۔

"میری!"

یہ رودے کی آواز تھی۔ وہ لان کے دوسری طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے اور نہایت اطمینان سے آ رہا تھا۔ اسکی اس بے نیازانہ چال میں کوئی آدمی بھی اُسے ایک بدنام آدمی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس چال سے میری بہت متاثر ہوئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ مغرور تھا۔

"نینا نے مجھے بتایا کہ تم یہاں بیٹھی ہوئی ہو۔ وہ کچھ مشروب لا رہی ہے اور میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا۔ خدا کی قسم تمہارے بنگلے کی بلندی پر چڑھنا تھکا دیتا ہے۔" اس نے اسکی طرف غور سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی ہو؟"

"ذرا ٹھہرو! نینا آ کر چلی جائے۔"

وہ بیٹھ گیا اور ایک سگریٹ سلگا لی۔ جب نینا آئی تو اس نے اس سے مذاقاً کہا۔

"نینا تمہارا فرانسیسی کہتا ہے کہ ہر اطالوی عورت کو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے تم اس فرض میں کوتاہی کر رہی ہو۔"

"میرے یہاں آجکل تو اپنا پیٹ پالنا ہی مشکل ہے۔ آدمی مرغن بچوں کو کون کھلا سکتا ہے!"

جب وہ چلی گئی تو وہ میری کی طرف مخاطب ہوا۔

"اب کہو کیا بات ہے؟"

اُس نے اُسے عمرانہ والی بات بتائی جو شہزادی نے اس لڑکے کے متعلق کہی تھی۔ اور جو کچھ نینا نے انہیں کہا تھا وہ بھی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"مگر میری جان ان ساری باتوں میں کوئی بات بھی تشویشناک نہیں ہے۔ تم بہت شکی عورت ہو۔ سبھی لوگ یہی سوچیں گے کہ اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ اس پر مالک مکان کا قرض تھا۔ اور اس نے ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا مگر اس کے پاس روپے نہ تھے۔ فرض کرو اسکی نعش مل بھی گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے گولی مار لی اور اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں۔"

جو کچھ رودے کہہ رہا تھا وہ یقیناً معقول لگتا تھا۔ میری نے مسکرا کر ایک آہ بھری۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ بے شک مجھے وہم ہو گیا ہے۔ مگر میں تمہارے بغیر بہت گھبراتی ہوں۔"

"میں نہیں سمجھ سکتا کیوں؟"

"اگر ہم رات پکڑے جاتے تو پتہ نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا؟"

"جو کچھ بھی مصیبت آتی خیر مقدم کرتے۔"

میری نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہم جیل میں نہ جاتے؟"

اُس نے اسکی طرف طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

"اگر نوبت یہاں تک پہنچتی تو ہمارے پاس وجہ خیر نہ تھی۔ مقتول کی ایک نعش کو رات کی تاریکی میں لئے لئے گھومنا کیا معنی ہو سکتا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ہم انہیں کیسے یقین دلاتے کہ اس نے خود گولی ماری ہے۔ ہم میں سے کسی ایک نے ضرور گولی ماری ہے۔"

"تم کیوں مارتے؟"

"پولیس والوں کو اس میں بہت سے شکوک پیدا ہو سکتے تھے۔ ہم دونوں ریسٹوران سے رات ساتھ ساتھ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کے معاملے میں میں بہت بدنام ہوں۔ تم اپنی صنف میں غیر معمولی ممتاز ہو

بصورت دیگر ہم یہ کیسے ثابت کر سکتے تھے کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی نے آپ کو تمہارے کمرے میں دیکھا ہو اور پولیس کو اس سے شک ہو گیا ہو۔ اس نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ لیا ہو اور میں نے اسے تمہاری جرأت بچانے کی خاطر مار دیا ہو۔ آخر دنیا میں ایسے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"تم نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔"

"اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے" وہ بولا۔

"میں بات کرنا چاہتی تھی کہ تمہارا شکریہ کس طرح ادا کر سکوں۔ مگر میں تمہاری بڑی احسان مند ہوں۔ ہو سکتا ہے تم نے میرے ساتھ بہت بڑی ہمدردی کی ہے۔ اگر تم میری مدد نہ کرتے تو شاید میں خودکشی کر لیتی۔ ابھی نہیں جانتیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیسے ہے۔ جو تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لے لیا۔"

اس نے ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔

"میری جان میں کسی آدمی کے لئے بھی ایسا کر سکتا تھا اگر کوئی ایسا ہوتا تو اس کی بھی میں ایسے وقت ضرور مدد کرتا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے خطرات پسند ہیں۔ دراصل میں قانون کی پابندی زیادہ نہیں کرتا۔ اور مجھے ایسے کاموں میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایک دفعہ پیرس میں میں نے تاش کھیلتے ہوئے دس ہزار روپے داؤ پر لگا دیئے تھے۔ مجھے اس میں بڑا مزا آیا تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اچھا وہ پستول کہاں ہے؟"

"وہ میرے پرس میں ہے۔ میں اسے گھر میں نہ چھوڑ سکی۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ نینا کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا!

"ذرا اپنا پرس مجھے دینا۔"

اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اسے کیوں مانگ رہا ہے۔ مگر۔۔۔۔ پرس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اسے کھولا پستول نکالا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

وہ آرام سے کرسی پر لیٹ گیا۔

"میرا خیال ہے تھوڑی یا بدیر اس کی لاش کا پتہ چل جائے گا۔ میں اس کے متعلق برابر سوچتا رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں یہ اچھا رہیگا کہ پستول بھی اس کے پاس ہی پڑا ہوا ملے۔"

میری کے لبوں پر ایک ہلکی سی چیخ آ گئی۔

"تو کیا تم پھر اس جگہ جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں۔ موسم بہت خوشگوار ہے اور میرا دل ٹہلنے کو چاہتا ہے۔ میں نے ایک سائیکل کرایہ پر لے لی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں اس سڑک پر سیر کو نہ جاؤں اور وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوں۔"

"کوئی آدمی تمہیں جنگل میں گھستے دیکھ لے تو؟"

"میں یقیناً ضروری احتیاط برتوں گا اور داخل ہونے سے پہلے چاروں طرف دیکھ لوں گا۔"

وہ چلنے لگا۔

"تو کیا تم ابھی جاؤ گے؟"

"ہاں یہی سوچ رہا ہوں۔ دراصل وہ جنگل اتنا گھنا نہیں ہے میں نے تمہیں رات یہ بات نہ بتائی تھی کیونکہ تم اور زیادہ ڈر جاتیں۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی نعش جلد ہی مل جائیگی۔"

"تمہاری واپسی تک میں سخت پریشان رہوں گی۔"

"بہتر" وہ مسکرایا۔ "میں واپسی میں تم سے ملتا جاؤں گا۔ اگر تم کچھ پینے کا بھی انتظام کر لینا۔"

"اوہ ڈیئر!"

"درست۔ انسان فطرتاً خطرات کو پسند کرتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ چلا گیا۔ اس کا انتظار کرنا سخت مشکل کام تھا۔ وہ پہلے ان ہی مصائب سے گزر رہی تھی۔ واقعات اس پر گزر چکے تھے۔ اس کو اس اقدام سے باز رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس کام کو ایک تفریح کے طور پر کر رہا تھا اور بے دھڑک اپنا سر شیر کے منہ میں دیئے جا رہا تھا۔ اسے خطروں کا مقابلہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اسے اس پر سخت غصہ آنے لگا۔ اسے ایسی احمقانہ حرکت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اسے ہر حالت میں اسکو روکنا چاہیئے تھا۔ مگر وقتی طور پر اسکی موجودگی میں اسے یہ خطرہ اتنا اہم نہ معلوم ہوا۔ جتنا کہ اس کے جانے کے بعد۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب اس نے ایک کام کا ارادہ کر لیا تو اس سے اسے باز رکھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس سطحی آدمی کے اندر اسقدر عزم چھپا ہوا ہے۔

"درحقیقت وہ مایوسی کی حد تک بگڑ چکا ہے۔" اس نے خود سے کہا
بالآخر وہ واپس آگیا، تو وہ اس کی طرف جھومتا ہوا آرہا تھا۔ اور اس
کے چہرے پر فتحیک آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر
صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ وہ آرام کرسی
پر بیٹھ گیا۔ اور وسکی اور سوڈا پینے لگا۔

"کام بہت اطمینان سے ہو گیا۔ وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ مجھے کبھی کبھی مجرم کو ایسے مواقع ملتے ہیں جو اس کے کام میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لاش کے پاس آج کچھ پانی جمع تھا۔ میرا خیال ہے وہاں کہیں قریب ہی کوئی چشمہ ہے۔ اسی لئے تو رات زمین میں اسقدر نم تھی۔ میں نے پستول نعش کے قریب پانی میں پھینک دیا، کچھ ہی دن میں اس میں زنگ لگ جائے گا۔"

وہ اس نعش کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی اگر الفاظ اسکی زبان پر نہ آسکے، کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اور تھکے تھکے انداز میں سگریٹ اور ٹھنڈی شراب پیتا رہا۔

"میں تمہیں رات کا واقعہ حرف بحرف سنانا چاہتی ہوں" وہ بولی۔
"تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں اہم واقعات کو خود محسوس کر سکتا ہوں اور جزئیات کی کوئی خاص اہمیت نہیں"
"مگر میں تو چاہتی ہوں، میں تمہیں اپنی شخصیت کے بدترین پہلو سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔ مجھے درحقیقت اس کا علم نہیں۔ اس بیچارے نے خودکشی کیوں کی۔ مجھے اس کے عبرتناک انجام پر سخت ذہنی صدمہ ہے۔"

وہ بغیر کچھ بولے سنتا رہا۔ اسکی آنکھوں میں خاموشی تھی۔ اس نے اسکو شروع سے لے کر آخر تک حرف بحرف پورا قصہ، مرحوم کار کے ملنے سے لے کر اس کے گولی مار لینے تک سنایا۔ کچھ کچھ باتیں بتاتی ہوئی جھجکی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی بات چھپائی تو وہ شعبدی آنکھیں جو اسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر تک رہی ہیں فوراً تاڑ جائیں گی۔ ان شرمناک واقعات کو سچ سچ سنانے سے اسکا بوجھ بھی ہلکا ہو رہا تھا، جب وہ پورا قصہ سنا چکی تو وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھول گیا اور اداۃً سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بناتا رہا۔
"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس نے خودکشی کیوں کی بالآخروہ بوڑھا دم خانماں برباد بھوکا اور قلاش تھا اُسے آئندہ زندگی

سے کوئی امید وابستہ نہ تھی۔ اور پھر اسکی تم سے ملاقات ہوگئی میرا خیال ہے اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی حسین عورت نہ دیکھی ہوگی۔ تم نے اُسے وہ چیز دی جو وہ خواب میں بھی نہ پا سکتا تھا۔ اس کے لئے تمہاری محبت ملتے ہی ساری دنیا بدل گئی۔ وہ یہ جان سکتا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اس میں محبت کو دخل نہ تھا۔ تم نے بتایا کہ اس کے پیچھے صرف رحم تھا، میری جان لوگ تم سے جذباتی ہوتے ہیں۔ اور لڑکے خاص طور پر کیا تم اسے نہیں سمجھتیں، اس پر شک نہیں کہ اس نے تم کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ مگر تم نے اسے ستاروں میں پہنچا کر غار میں دھکیل دیا، وہ ایک ایسے قیدی کی طرح تھا۔ جسے جیلر دروازہ تک لائے۔ اور جب وہ باہر نکلنے لگے تو دروازہ ایک دم بند کر دے۔ اُسے یہ طے کرنے کے لئے کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں یہ سب کافی تھا۔

"اگر یہ صحیح ہے تو میں خود کو کبھی معاف نہ کروں گی"
"میرا خیال ہے یہ صحیح ہی ہے مگر میں نہیں سمجھتا۔ کہ صرف یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وہ اپنی پچھلی زندگی میں بھی غیر متوازن تھا۔ غالباً وہ پوری طرح صحیح الدماغ بھی نہ تھا ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہو، ہو سکتا ہے کچھ لمحوں کی انمول مسرت کے بعد اس نے مزید ایک دن بھی زندہ رہنا بے کار سمجھا ہو۔ ہم میں سے اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اگر کبھی ہماری زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب ہم سرور کی تکمیل کے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو پھر ہم اپنے آپ سے کہتے ہیں خدایا کاش ہم ابھی مر جاتے۔ تو اُسے وہی لمحے میسر آگئے تھے، اور اس نے بھی یہی سوچا ہوگا اور پھر وہ مر گیا ہوگا۔"

میری نے رونالے کی حیرت سے دیکھا، کیا یہ وہی آزاد منش زندہ دل انسان ہے۔ جو ایسی بامعنی باتیں کر رہا ہے۔ اسوقت کا رونالے اس رونالے سے مختلف تھا۔ جسے وہ اب تک جانتی تھی۔

"تم یہ تاویلیں کیوں گھڑ رہے ہو"
"کچھ تو اسوجہ سے بھی کہ تم اس حادثہ کو ضرورت سے زیادہ محسوس نہ کرو، علاوہ ازیں اب اس معاملے میں تم کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم اس واقعہ کو بالکل فراموش کر دو۔ اور اسی لئے میں نے تمہیں اس واقعہ کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے۔" اس نے اس کی طرف مذاقیہ مسکراہٹ سے دیکھا۔ وہ اس مسکراہٹ کو خوب

سمجھتی تھی۔

"اَمد! اس کے علاوہ میں نے کچھ زیادہ دلچسپی رکھی ہے۔ اندازہ ہوا کہ بہت ہوں۔"

"مجھے بھی پہلی مرتبہ اُسکی طرف ایڈگر کا تار بڑھا دیا۔ اس نے اُٹھتے
"تو کیا تم اس سے شادی کروگی؟"

"میں یہاں سے جلد چلی جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اب اس گھر سے نفرت ہے، جب میں اپنے کمرہ میں جاتی ہوں۔ کوٹھی سے چیخیں نکلتی ہیں۔"

"اور ہندوستان یہاں سے بہت دور ہے" اس نے طنزاً کہا

"دراصل ایڈگر بہت معتمد اور نیک ہے، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں خود کو کسی کے سپرد کرنا چاہتی ہوں، میں جینے کے لئے سہارے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔"

"اچھا تو بات یہی ہے نا؟"

اُسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، اور استفساریہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اُسکی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے کسی جذبہ کا پتہ نہ چلتا تھا۔

اُس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مگر شاید وہ مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرے؟"

"یہ تم کیا کہنے لگیں، وہ تو تمہارے پیچھے پاگل ہو رہا ہے!"

"سنو۔ مجھے اُسے یہ واقعہ ضرور بتانا چاہیئے!"

"کیوں؟" وہ حیرت سے چیخ پڑا۔

"جب تک یہ واقعہ میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ میں اس سے شادی نہ کرسکوں گی۔ میرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی سکون نہ ملے گا۔"

"تمہارا سکون؟ مگر اُس کے سکون کا کیا ہوگا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے واقعہ سنانے پر شکرگزار ہوگا۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ آئندہ زندگی میں اسکی موت سے تمہارا کوئی تعلق کبھی ظاہر نہ ہو سکے گا۔"

"دراصل مجھے پُرخلوص ہونا چاہیئے۔"

اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تم ایک خطرناک غلطی کر رہی ہو، میں ان معاملات کی بہت کو خوب سمجھتا ہوں، ان کے خلوص وجذبہ کو خوب پہچانتا ہوں، انہیں کبھی خلوص کی ضرورت نہیں پڑتی، اُس کا اپنے متعلق اعتماد ختم کرنا پاگل پن ہے۔ وہ تم پر لٹو ہو گیا ہے، وہ تمہیں بالکل ٹھیک سمجھتا ہے۔"

"اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ جتنا لوگ تمہیں بہتر سمجھیں گے تم اتنا ہی اور بہتر ہونے کی کوشش کروگی، تم جانتی ہو کہ ایڈگر میں بہت سی صفات ہیں، لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس مرتبہ کا آدمی ہے اور اسی لئے اسے وہ عہدہ پیش کیا ہے، اگر تم برا نہ مانو تو اسکی شخصیت میں ایک احمقانہ جذبہ پائی جاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ کامیاب ہوا ہے۔ بغیر اس کے وہ اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا تھا۔ تم اس کے مزاج کے خلاف عمل کر رہی ہو۔ تم اس سے توقع رکھتی ہو کہ وہ عورت کے دل کی گہرائی میں پہنچ جائے۔"

"اگر اسے واقعی مجھ سے محبت ہے تو وہ محسوس نہ کریگا۔"

"اچھی بات ہے تم جانو، اگر میں عورت ہوتا تو اس جیسے آدمی سے کبھی شادی نہ کرتا، بہرحال اگر تم نے طے ہی کر لیا ہے تو کر ڈالو اگر اس سے شادی ہی کر رہی ہو تو یہ بات اُسے نہ بتاؤ۔ اور اس کے جذبۂ رقابت کو ہوا نہ دو۔"

وہ ہنسنے لگا اور اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا، اُسے اپنے لبوں تک لے جاتے ہوئے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گی، اُس کے دل کو ہلکا سا دھچکا لگا۔ اس نے اس سے شادی کا کہہ کے اچھا مذاق کی تھی۔ اور اگر وہ ہاں بھر لیتی تو وہ مایوسی سے مسکرا کر رہ جاتا۔

—— ۷ ——

اس سے اگلے دن چار بجے کا وقت تھا۔ میری باغیچہ کے اسی گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اَمد اپنی توجہ ہٹانے کے لئے ایک غلاف کاڑھ رہی تھی، اتنے میں نینا اس کے پاس آئی اور اُسے بتایا کہ ایڈگر سونٹ فون پر اسکا انتظار کر رہا ہے، وہ اپنے ہوٹل ابھی پہنچا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ میری سے ابھی مل سکے گا۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کا جہاز کب پہنچ رہا ہے اور لنچ کے وقت سے اُسکی آمد کا انتظار کر رہی تھی، اس نے نینا سے کہہ دیا کہ وہ اُسے کہہ دے کہ وہ اُسکا انتظار کرے گی، اس کا دل زور زور سے

دھڑکنے لگا۔ اُس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنے چہرہ کا جائزہ لیا اس نے رخساروں پر کوئی سرخی نہ لگائی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ ایڈگر سرخی پسند نہیں کرتا اور صرف ہونٹوں پر سرخی لگا رکھی تھی، اُسکا رنگ زرد تھا۔ اُس نے نیلے سلک کا ہلکا لباس پہن رکھا تھا، وہ بہت ہی سادہ دکھائی دیتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خادمہ کا لباس ہے۔ مگر درحقیقت اُسکا کپڑا قیمتی تھا۔ اور وہ پیرس کے اعلیٰ ترین درزی خانوں کا سِلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُسے کار کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ بعد ایڈگر سامنے آگیا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھی اور اُسکا استقبال کیا، حسب معمول وہ اپنے رتبہ کی مناسبت سے بہترین لباس میں ملبوس تھا، اُسکو دیکھنے سے مسرت ہوتی تھی، اس کا قد لمبا تھا۔ اور وہ سینہ تان کر چلنے کا عادی تھا، اُس نے اپنا ہیٹ اُتارا اور اس کے نیچے سے چمکیلے گھونگریالے بال نمودار ہوئے گھنی بھوؤں کے نیچے اُسکی آنکھیں دوستی اور خوشی کا پیغام دے رہی تھیں۔ اسکے چہرہ پر معمول کے مطابق کرختگی اور سنجیدگی کے آثار نظر آتے تھے بلکہ اس کی بجائے خوش اخلاقی ہویدا تھی۔ اُس نے گرمجوشی سے اُسکا ہاتھ دبایا۔

"تم کتنی مطمئن اور خوش نظر آ رہی ہو۔ واللہ جیسے کوئی حسین مرقع ہو"

امریکی ہمیشہ اُس سے ملنے پر یہی جملہ کہا کرتا تھا میری نے ایڈگر کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں اور سوچا کہ مرد ایک خاص عمر پر پہنچ کر اپنے سے کم عمر عورتوں کو اسی طرح خطاب کرتے ہیں۔

"تشریف رکھئے نینا ابھی چائے لاتی ہوگی، تمہارا سفر بخیر گذرا۔"

"مَیں تم سے دوبارہ مِل کر کتنا خوش ہوں" وہ بولا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے ایک صدی تم سے علیحدہ رہا ہوں۔"

"ہمیں جدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگا"

خوش قسمتی سے — ہر وقت تمہارا خیال میرے ساتھ رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کہاں کہاں رہی ہوگی اور میں اپنے خیال میں ہر جگہ تمہارے ساتھ رہا۔" میری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرا خیال ہے تم بہت مصروف رہے ہوگے"

واقعی میں بہت مصروف رہا، مجھے وزیر ہند سے دو تین دفعہ کافی طویل گفتگو کرنی پڑی۔ بہرحال سارے معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں میں ستمبر کے شروع میں ہندوستان روانہ ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھ سے یہ بالکل نہ چھپایا کہ یہ ذمہ داری بہت اہم ہے۔ اور یہ کہ میں بھی اسکی اہمیت سے اتنا ہی واقف ہوں جتنا کہ وہ۔ اور اسی لئے وہ مجھے یہ ذمہ داری دینا چاہتا ہے۔ خیر میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں وہ سب باتیں بتاؤں۔ جو اس نے مجھ سے کہی ہیں۔ ورنہ تم خواہ مخواہ بور ہوگی۔"

"نہیں میں بڑے شوق سے سنوں گی"

"اس نے مجھ سے کہا کہ خصوصی حالات کیوجہ سے انہیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو بیک وقت صلح جُو اور سخت ہو۔ اور اس نے کہا۔ میرے علاوہ وہ کسی اور آدمی میں ان خصوصیات کو نہیں پاتا۔"

"مجھے یقین ہے وہ ٹھیک کہتا تھا"

"بہرحال یہ تو صرف حسن ظن ہے، تمہیں معلوم ہے مجھے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ تب کہیں اس منزل پر پہنچا ہوں۔ یہ ایک بہت اہم عہدہ ہے، اس جگہ پہنچ کر میں آدھی بادشاہت کر سکتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور یہ بات میرے اور تمہارے درمیان تک رہنی چاہیے کہ واقعی میں اہم ترین کام انجام دوں گا۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا۔ "اور اگر میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگیا۔ تو پھر میرے لئے اور بھی اعلیٰ مواقع پیدا ہو جائیں گے"

"تم بڑے جاہ طلب آدمی ہو، ہے نا!" اُس نے لطیف طنز کی۔

"بے شک! مَیں اقتدار کو پسند کرتا ہوں اور ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتا، مجھ میں کچھ خوبیاں ہیں اور میں خوش ہوں کہ مجھے اُن کو عملی جامہ پہنانے کے واقع بھی میسر ہیں"

"پرسوں کی ریسٹوران والی دعوت میں ایک کرنل ترپل بھی تھے جو کہہ رہے تھے اگر تم بنگال کی گورنری میں کامیاب رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں ہندوستان کا وائسرائے نہ بنایا جائے"

ایڈگر کی بے باک نظروں میں ایک روشنی پیدا ہوئی۔

"اب وہ گورنر جنرل کہلاتا ہے۔ میرا خیال ہے ایسا ہونا امکانات کی حد سے باہر نہیں، انہوں نے ولنگڈن کو وائسرائے بنایا تھا اور وہ بہت ہی کامیاب وائسرائے تھا"

اب وہ چائے ختم کر چکے تھے، اُس نے اپنی پیالی میز پر واپس رکھدی۔

"میری تم جانتی ہو کہ جو اعزاز اور رتبہ مجھے بخشا گیا ہے۔ اسکی مجھے بہت خوشی ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ تم اس خوشی اور اعزاز میں میری شریک نہ ہوگی تو اسکی مسرت میرے لئے آدھی رہ جائے گی۔"

اُس کا دل ٹھہرنے لگا۔ آخر وہ لمحہ آگیا ہے۔ اپنے حواس پر قابو پانے کے لئے اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے اسکی طرف نہ دیکھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ مسلسل اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری واپسی پر جواب دو گی۔" وہ ہنسا۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ اس بات کا جواب جاننے کے لئے مجھے پورا ایک ہوائی جہاز کرایہ پر لینا پڑا ہے۔ اسکی اہمیت کا پورا ثبوت ہے۔"

اس نے جو سگریٹ ابھی سلگایا تھا بجھا دیا اور ایک چھوٹی سی آہ بھری۔

"قبل اسکے کہ ہم اس موضوع پر کچھ اور گفتگو کریں میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے تمہیں سخت تکلیف ہوگی۔ خدارا بغیر کچھ بولے میری بات پوری سن لینا جو کچھ تم کہنا چاہو یا پوچھنا چاہو بعد میں پوچھنا۔"

اس کا چہرہ یک لخت سخت ہوگیا اور اس نے اسکی طرف تیز نظروں سے گھورا۔

"اچھی بات میں کچھ نہ بولوں گا۔"

"مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اس بات کو اپنی حد تک رکھنے کے لئے میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کرسکتی ہوں۔ مگر تم سے اس بات کو چھپانا ریاکاری ہوگی۔ تم کو حقائق کا علم ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد تم جو چاہو فیصلہ کرنا۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں"۔ وہ بولا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے وہ تکلیف دہ طویل کہانی جو مدلے کو ایک دن پہلے سُنا چکی تھی۔ ایڈگر کو بھی سنادی۔ اس نے کوئی بات خلاف واقعہ نہ کہی۔ اس نے بات کو نہ تو بڑھانے اور نہ گھٹانے کی کوشش کی مگر مدلے کی نسبت ایڈگر کو یہ بات سنانی سخت تر تھی۔ وہ بغیر کسی جنبش کے سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سخت اور سنجیدہ تھا۔ اسکی آنکھوں اور چہرہ کی کیفیت سے بالکل پتہ نہ چلا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ اس بات سے باخبر تھی کہ مدلے کے مقابلے میں یہ کہانی ایڈگر کو سناتے وقت اسکی زبان پوری طرح اس کے قابو میں نہ تھی۔ وہ اس کو اپنے اصل مقصد اور اپنی پاکیزگی کا یقین دلانے میں ناکام رہی۔ کچھ واقعات تو بالکل ناقابل یقین محسوس ہوتے تھے۔ اور اس نے اچھی طرح تاڑ لیا کہ اسے ان باتوں کا یقین نہیں آرہا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کا مدلے کو فلیش کار میں ڈال کر باہر لے جانا محض غلطی تھی۔ اسکی سمجھ میں اب تک یہ نہ آیا تھا۔ وہ اس بدنامی سے کیسے بچتی اور پولیس کے چکروں سے کیسے پیچھا چھڑاتی۔ واقعہ ایسا نرالا تھا کہ کسی کو یقین ہی نہ آسکتا تھا۔ کہ اس جیسی عورت کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور یہ عام دنیا سے ماورا معلوم دیتا تھا۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ ایسے واقعات صرف خواب میں ظہور پذیر ہوسکتے ہیں۔

آخرکار اس نے بات ختم کی، تھوڑی دیر ایڈگر خاموش بیٹھا رہا اور پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دالان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا۔ اسکا سر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ پشت کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اسکے چہرہ پر بلا کی کرختگی تھی، اس سے پہلے میری نے کبھی اسکو اس کیفیت میں نہ دیکھا تھا، عجیب بات تھی کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ معمر سا لگ رہا تھا۔

بالآخر وہ اُس کے سامنے آکر خاموشی سے کھڑا ہوگیا اس نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر کربناک مسکراہٹ تھی مگر اس کی آواز اتنی ملائم تھی کہ اس کے دل کے تار بج اٹھے۔

"معاف کرنا۔ مجھے یہ واقعہ سن کر سخت حیرت ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تم آخری عورت ہو جس سے میں اس قسم کی لغزش کی توقع رکھ سکتا تھا۔ میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب تم ایک معصوم بچی تھیں۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ تم بھی دوسروں کی طرح . . . . ."

وہ ٹھہر گیا، مگر اس نے سمجھ لیا کہ اس کے ذہن میں کیا بات ہے۔ یہ بات ناقابل یقین معلوم دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی طرح ایک آوارہ نوجوان کی آشنائی پر اتر آئے گی۔

"میں اپنے متعلق کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہتی۔"

"معاف کرنا، میرا خیال ہے تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔"

"بہت ہی بڑی" اُس نے جھینپ کر کہا۔

"خیر ہمیں اس گہرائی میں زیادہ جانے کی ضرورت نہیں، میرا خیال ہے۔ مجھے تم سے اتنی شدید محبت ہے۔ کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اور معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آہستہ انسان کی آواز بھرانے لگی۔ اسکی مسکراہٹ میں اب نرمی آچکی تھی۔ تم ایک حسین اور پیاری لڑکی ہو! میں اس سے متفق ہوں۔ کہ اس بدنصیب لڑکے کی موت کے بعد تم نے جو کچھ کیا وہ حالات کے عین مطابق تھا! یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا، بہرحال اب معاملات ٹھیک معلوم دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں ایک آدمی کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ اسکی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا تم ان سب واقعات کو جاننے کے بعد بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

وہ ایک بہت مختصر لمحے کے لئے جھجکا، اتنے مختصر کہ میری کے علاوہ کوئی دوسرا محسوس تک نہ کرتا۔

"تم یقیناً مجھ سے یہ توقع نہ رکھو گی کہ میں تمہیں اس جھمیلے میں پھنسا رہنے دوں۔ میری — ! جانِ من میں کبھی بھی یہ گوارہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اپنے آپ سے بڑی ہی شرمندگی ہے۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے ملک کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ کوئی ہرج نہیں۔ اگر میں اب اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لوں۔ اور اپنے سے کم عمر کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے دوں۔"

وہ اُس کی طرف مبہوت ہوکر دیکھنے لگی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ڈارلنگ، بات یہ ہے کہ صورت حالات اب کچھ بدل گئی ہے میں اس عہدہ کو اب قبول نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک نہ ہوگا، اگر بات پھوٹ نکلی تو نتائج بہت تباہ کن ہو سکتے ہیں۔"

وہ بوکھلا گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

تم پرواہ نہ کرو جانِ من، میں مذیرِ منہ کو تار دے دوں گا۔ کہ میں شادی کر رہا ہوں اور اب ہندوستان نہ جا سکوں گا۔ میں تمہاری صحت کو ایک معقول بہانہ بنا سکتا ہوں۔ افسوس میں تمہیں معقولیت نہیں بخش سکتا۔ جو میں چاہتا تھا، مگر اسکی وجہ سے کوئی فرق نہ پڑیگا۔ ہم بہت اچھی زندگی گذار سکتے ہیں، ہم ساحل پر ایک بنگلہ خرید لیں گے، میں ہمیشہ سے ایک کشتی خریدنے کا مشتاق ہوں۔ ہم اس میں بیٹھ کر خوب تفریح کیا کریں گے۔"

"مگر اب جبکہ تم کامیابی کے عین قریب پہنچ چکے ہو تو تمہیں اس عہدہ کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

"سنو میری جان، جو ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے۔ اس کے لئے مجھے اپنی تمام دماغی اور جسمانی قوتوں کو مجتمع رکھنا پڑے گا۔ مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہے گا کہ کہیں کوئی بات پھوٹ نہ پڑے۔ اور جب کوئی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہو تو کسی کام میں بھی پورے انہاک سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"اب بات کیسے پھوٹ سکتی ہے؟"

"پستول ہی کو لو، پولیس نے محنت کی تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ میری ملکیت تھا۔"

"مجھے قطعی امید نہیں ایسا ہو، میں نے اسکے متعلق سوچ لیا ہے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس آدمی نے ریسٹوران میں اسے چرا لیا ہو؟"

"بیشک یہ صحیح ہے کہ پستول اس تک پہنچنے کے بہت سے معقول وجوہات ہو سکتی ہیں: مگر اس صورت میں مجھے صفائی دینی پڑے گی اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا، میں مخمصوں میں پھنسنے سے نہیں گھبراتا، مگر میں اس قسم کا آدمی نہیں کہ خواہ مخواہ جھوٹوں کا پلندہ اپنے ذمہ باندھ لوں، اور پھر یہ راز تمہیں تک محدود نہیں ہے، ارونے بھی اس سے آگاہ ہے۔"

"تم اسکی ایک لمحہ کے لئے بھی فکر نہ کرو کہ وہ کبھی اس بات کو ظاہر کر دے گا۔"

"مجھے اسی کی تو فکر ہے، وہ ایک غیر معتمد آدمی ہے، ایک کاہل اور خراب آدمی ہے۔ وہ اس قسم کا آدمی ہے جن کے لئے میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ تم کیونکر کہہ سکتی ہو کہ اگر اسے کوئی عورت مل گئی۔ تو وہ اپنے قابو میں نہ رہے گا۔ اور اسکو بطور کہانی کے سب سنا دیگا، یکے بعد دیگرے وہ جس عورت سے بھی ملے گا اسی کو یہ کہانی سناتا رہے گا، اور قبل اس کے کہ تم اس سے جواب طلب کرو سارے لندن کو اس راز کا علم ہو جائے گا۔ یقین کرو۔ پھر اس خبر کو ہندوستان پہنچنے میں دیر نہ لگے گی۔"

"ایڈگر تم غلط کہتے ہو جو تم نے اُسے سمجھا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آئندہ [illegible] ہے۔ اگر وہ جنگ آدمی نہ ہوتا تو میرے ساتھ یقیناً کبھی نہ لیتا۔ میں اُس پر پورا پورا اعتماد کرتی ہوں۔ وہ کبھی میری بُرائی نہ چاہے گا بلکہ وہ اس پر موت کو ترجیح دے گا۔"

"تم انسانی فطرت کے متعلق مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتیں، اس میں اتنے ضبط کا مادہ ہی نہیں کہ وہ کسی راز کو چھپا سکے۔"

"لیکن اگر تم یہ سوچتے ہو تو پھر ملازمت میں رہنے یا نہ رہنے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"ہوسکتا ہے اس معاملہ کا چرچا عام ہو جائے، لیکن اگر میں ذاتی زندگی گذار رہا ہوں گا۔ تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ ہم اس کی مطلق پرواہ نہ کریں گے لیکن گورنر بنگال کی حیثیت میں یہ بہت مشکل ہوگا، آخر کار تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک مجرمانہ فعل تھا، جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ناقابلِ معافی ہے، اُس سے برطانیہ کے تعلقات خراب ہیں اور وہ اس مسئلے پر خوب کیچڑ اچھالے گا، کیا تم نے محسوس کیا ہے کہ اُس آدمی کے قتل کا الزام تمہارے اوپر لگایا جا سکتا ہے؟"

اُس نے اُسکی طرف اس قدر تیز نظروں سے دیکھا کہ وہ کانپ اٹھی۔

"مجھے ایمانداری سے کام لینا پڑے گا۔" وہ بولتا رہا، "اور حکومت نے ہمیشہ مجھ پر بھروسہ کیا ہے اور میں اُس کے اعتماد کا احترام کروں گا، جو رتبہ مجھے سونپا جا رہا ہے۔ اس کے شایانِ شان یہی ہے کہ کوئی شخص میرے یا میری بیوی کے چال چلن کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے، ہندوستان میں اب ہماری قوم کی عزت کا انحصار منتظمین کی ذاتی خوبیوں پر ہے، اگر مجھے بے عزتی کے ساتھ مستعفی ہونا پڑا۔ تو اس سے بُرے تلخ نتائج برآمد ہوں گے۔ بحث کرنا بیکار ہے، میری، مجھے وہی کرنا ہوگا جو میں صحیح سمجھتا ہوں۔"

اُس کا لہجہ بتدریج بدل گیا تھا، اور اُس کے چہرہ کی سختی کے ساتھ اُسکا لہجہ بھی کرخت ہوگیا تھا۔ میری نے اُس بدلے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا جو اپنی انتظامی قابلیت کے علاوہ بے دھڑک عزم کے لئے بھی مشہور تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرہ کے ہر خط اور اسکی آنکھوں کی ہر حرکت سے میری نے اُس کے اندر کے خیالات کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ وہ اِس واقعہ کو سن کر سخت مایوس ہوگیا ہے، اس نے اپنے ناقابلِ برداشت جارحانہ رویے سے میری کی ہمدردی بالکل کھو دی تھی۔ اس نے اُس کے دل سے اپنا اعتماد قطعی ختم کر دیا تھا، مگر وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا جو اپنی

پیشکش کو واپس لے لیں۔ جب اُس نے اپنی ہی مرضی سے یہ راز اُسے بتا دیا تو وہ اسکی صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اُس سے شادی کرکے اتنی بڑی قربانی کر رہا تھا۔ کہ اتنے بڑے عہدہ کو چھوڑ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے اس قدر محبت کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس قربانی سے اسکا نفس تسکین پاتا تھا۔ اور وہ بدولی سے یہ ناخوشگوار قربانی دے رہا تھا، اُسے معلوم تھا کہ وہ اسے کبھی اتنی بڑی قربانی دینے پر مطعون نہ کرے گا۔ مگر ساتھ ہی وہ اتنے بڑے عہدے کو چھوڑنے پر تاحیات غم کھاتا رہے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اگر اُس کے احساس خود غرضی کو روک کے بغیر یہ شادی طے نہ ہو تو وہ آسانی سے اس سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر سکتا ہے۔ وہ عزت و جاہ کا غلام تھا۔

میری نے چند آنکھیں نیچی کرلیں تاکہ ایڈگر اُن آنکھوں میں خوشی کی جھلک محسوس نہ کر سکے، اچانک میری کو صورتِ حال بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالکل اتفاقیہ طور پر اُسے لگا کہ اگر وہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی ہو جائے تب بھی وہ اُس سے شادی کرنا نہ چاہے گی، وہ اس کو چاہتی تھی اور اس کے احسانات کو بھی تسلیم کرتی تھی، وہ اس بات کی بھی احسانمند تھی کہ اس نے اس حادثہ کو بڑی ہمدردی سے سنا ہے مگر اسے احتیاط سے کام لینا پڑے گا، اگر اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تو وہ ہر قیمت پر اُس سے شادی کرکے چھوڑیگا وہ بڑا ضدی آدمی ہے، مگر صورتِ حال کتنی ہی بدتر کیوں نہ ہو جائے وہ اُس سے شادی کبھی نہ کرے گی۔ چاہے وہ اس کی رہی سہی عزت بھی اپنے دل سے نکال دے، یہ بات ذرا بھی نہ رہے گی مگر اس صورت میں وہ اس سے اور بھی زیادہ بدظن ہو جائے گا۔ اور اس کا چھٹکارا آسانی سے ہو جائے گا۔

ایک ٹھنڈا سانس لے کر وہ رولے کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایڈگر کے مقابلہ میں اُس آوارہ آدمی کے ساتھ زندگی گذارنا کتنا آسان تھا؟ وہ چاہے کیسا بھی ہو مگر اُسے کبھی نہ ڈرتا تھا، اس نے خود پر قابو پایا۔

"تمہیں معلوم ہے ایڈگر پیارے، مجھے یہ سوچ کر سخت تکلیف ہوگی کہ تم نے اپنا منصب عالی کھو دیا ہے۔"

"مجھے اُمید ہے کہ تم اس کے متعلق کبھی نہ سوچو گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کبھی زندگی میں آنے کے بعد میں اس کے متعلق سوچوں گا

تک نہیں ؟"

" مگر ہمیں صرف اپنے متعلق ہی نہیں سوچنا ہے، تم اس مخصوص عہدہ کے لئے منتخب کئے گئے ہو۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی ذات کی خاطر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار نہ کرو۔"

" میں اس حد تک غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ کہ میری ضرورت ناگزیر ہے۔"

" میں تمہاری کتنی قدر کرتی ہوں، میں اس خیال کو برداشت نہیں کرسکتی کہ تم اپنا فریضہ ترک کر دو۔ جبکہ تمہاری موجودگی سخت ضروری ہے یہ بڑی کمزوری معلوم دیتی ہے۔"

اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اس نے محسوس کر لیا۔ کہ اسکی کمزوری اُس کے ہاتھ آ گئی ہے۔

" مگر اس کے سوائے چارہ کار نہیں، موجودہ صورت حال میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور بھی بے عزتی ہوگا۔"

" مگر یہ سوال تو بالکل آسان ہے، تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے مجبور تو نہیں ہو ؟"

اُس نے اُسکی طرف اس انداز سے دیکھا کہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکی، وہ بات کو تاڑ گیا تھا۔ اور اس کی نظروں سے یہ بات ظاہر تھی۔ کاش وہ اس صورت حال میں کامیاب ہو جاتی، کیا وہ نہیں جانتا وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ مگر اُسے اپنے تاثرات پر پورا قابو تھا۔ اور جب اس نے جواب دیا تو اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں پیار تھا۔

" مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، مجھے دنیا میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

تو کیا پھر اُسے اپنا نسخہ استعمال کرنا ہی پڑے گا ؟

" ایڈگر پیارے، تم مجھے بہت ہی عزیز ہو، مجھ پر تمہارا بہت کچھ حق ہے، تم میرے عزیز ترین دوست ہو۔ مجھے معلوم ہے تم کتنے بڑھیا، کتنے سچے، کتنے مہربان اور کتنے مخلص آدمی ہو۔ مگر مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

" درحقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تم سے کتنے ہی سال بڑا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اُس شدت سے محبت نہیں کرسکتیں جس شدت سے کہ اپنے ہم عمر سے کرسکتی ہو، مگر مجھے اُمید ہے کہ جو آرام تمہیں میری ذات سے حاصل ہوگا وہ بہت حد تک اس کمی کو پوری کر دیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ جو کچھ میں تمہیں اب پیش کروں گا وہ تمہاری قبولیت کے معیار پر خاطر خواہ پورا نہ اترے۔"

یا اللہ! وہ صورت حال کتنا پیچیدہ بنا رہا تھا، آخر وہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ وہ ایک گندی عورت ہے اور اچھا ہوا کہ اسے پہلے ہی ہوش آ گیا، جلتے ہوئے تیل کا کڑھاؤ اب بالکل ٹھنڈا آ گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لے اور اُس میں چھلانگ لگا دے۔

" ایڈگر میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتی ہوں، جب تم بنگال کی گورنری کے بارے میں کیفیں گئے ہوئے تھے تو تم اپنے کام میں بہت مصروف رہے تھے اور اسی طرح مجھے بھی بہت سے کام کرنے پڑے تھے۔ آخر میں ایک انسان ہی تو ہوں، اور متوقع حیثیت کی آنکھیں خیرہ کرنے والی ۔۔ یہ بات کافی معلوم ہوتی تھی کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ ہمارے تمہارے درمیان بہت سی باتیں مشترک تھیں اور محبت کا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اب مشکل ترین حقیقت آنا تھا۔ لیکن اگر ہم صرف ساحل پر ہی پُرسکون زندگی گزارنے والے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہو۔ جتنی کہ مجھ سے تمہیں ہے۔"

" کوئی ضروری نہیں کہ ہم صرف ساحل پر ہی آباد ہوں، جہاں تم چاہو ہم وہیں رہ سکتے ہیں۔"

" اُس سے کیا فرق پڑے گا ؟"

وہ کافی دیر خاموش رہا، جب اُس نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں سرد مہری جھلک رہی تھی۔

" تمہارا مطلب ہے تم صرف گورنر بنگال سے شادی کرنے کو تیار تھیں اور ایک ہندوستانی سول سروس کے پنشنر سے نہیں ؟"

" اب جب صاف بات کہنے کی ضرورت ہی پڑ گئی تو میں کہوں گی کہ واقعی یہی بات تھی جس کی وجہ سے میں تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

" ایسی صورت میں ہمیں اس مسئلے پر مزید گفتگو نہ کرنی چاہیے ؟"

" بے شک ایسا کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں، ہے نا ؟"

وہ پھر خاموش ہوگیا، وہ بہت گمبھیر ہوگیا تھا۔ اور اس کے چہرے سے اُس کے خیالات کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اُسکی سخت بیزاری ہوئی تھی، بے چارہ، مجبور آدمی، اُسے اُس کی ذات سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن میری یہ سمجھ جانتی تھی کہ اُس کے کندھوں سے ایک بڑا بار ہٹ گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ اُس پر کوئی بات ظاہر نہ کر سکا۔ بالآخر وہ جھٹکے سے کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

اب میرے فلورنس کے قیام میں کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر تم محسوس کرو کہ خودکشی کرنے والے قضیہ میں میری مدد کی ضرورت پڑے گی تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

"اوہ نہیں، میرا خیال ہے اسکی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایسی صورت میں کل لندن روانہ ہو جاؤں گا، شاید مجھے تمہیں ابھی الوداع کہہ دینا چاہیئے۔"

"خدا حافظ ایڈگر! مجھے معاف کر دینا۔"

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا، اور اُسے بوسہ دیا اور پھر بڑے پُرتمکین انداز میں لان پر سے گزرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اُس نے اُسکی جاتی ہوئی کار کی آواز سُنی۔

ایڈگر کی ملاقات نے میری کو تھکا دیا تھا۔ پچھلی دو راتوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی، موسم گرما کی ٹھنڈی اور خواب آور ہوا سے سرشار ہو کر وہ وہیں آرام کرسی پر پڑ کر سو گئی، ایک گھنٹہ بعد اس کی آنکھ کھلی، وہ اب خود کو تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ پُرانے باغیچہ میں ٹہلنے لگی۔ اور پھر اس کا جی چاہا کہ وہ بڑے چبوترہ پر بیٹھ کر ڈھلتے ہوئے دن کی روشنی میں شہر کے نظارہ سے لطف اندوز ہو مگر جوں ہی وہ اُدھر جانے لگی۔ اس کا ملازم سیرو اسکے قریب پہنچا

"حضور، رولے صاحب کا فون آیا ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"اُن سے کہو اپنا پیغام تمہیں دے دیں۔"

"مگر وہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میری نے اپنے کندھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا، وہ اُس وقت رولے سے بالکل بات نہ کرنا چاہتی تھی، مگر اُس نے سوچا وہ کوئی ضروری بات کہنے والا ہو، اُس بدنصیب لڑکے کی لاش کا بوجھ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا تھا، وہ ٹیلیفون پر پہنچی۔

"کیا تمہارے یہاں کچھ برف ہوگی؟"

"کیا تم نے صرف یہی پوچھنے کے لئے مجھے فون تک بلوایا تھا؟" اُس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"نہیں صرف یہی نہیں بلکہ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے پاس کون کون سی شرابیں مل سکیں گی؟"

"اور کوئی بات؟"

"ہاں تو میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر میں تمہارے پاس ٹیکسی میں بیٹھ کر ابھی پہنچ جاؤں تو کیا تم مجھے کاک ٹیل پلاؤ گی؟"

"مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"یہ اور بھی بڑھیا رہے گا میں بھی تمہارا کچھ ہاتھ بٹاؤں گا۔"

میری نے اپنے کندھوں کو نیم غصہ سے جھٹکا اور سیرو سے کاک ٹیل و شراب، بنانے کو کہا اور بڑے چبوترہ پر چلی گئی وہ جلد از جلد فلورنس کو چھوڑ دینا چاہتی تھی، اسے اس شہر سے نفرت ہوگئی تھی، مگر وہ اپنی جلد روانگی کے متعلق چہ میگوئیاں نہ چاہتی تھی۔ شاید رولے اسی لئے آ رہا ہو، وہ اس سے مشورہ لے گی، یہ بات بڑی عجیب تھی کہ وہ اس اوباش انسان پر اتنا اعتماد کئے ہوئے تھی۔

پندرہ منٹ بعد اُس کے سامنے تھا، ایڈگر اور اس کے چال میں بڑا فرق تھا۔ ایڈگر اپنے قد اور رکھ رکھاؤ سے بڑا ممتاز نظر آتا تھا، اسکی شخصیت سے قدرتی عظمت نمایاں تھی، اس کی شخصیت سے یہ بات ٹپکتی تھی کہ وہ دوسروں پر حکمرانی کرنے کا عادی ہے، اگر وہ کسی مجمع میں کھڑا ہو تو ہر آدمی ایک دوسرے سے کہے گا کہ یہ دیکھو آدمی کون ہے جس کی شخصیت سے اتنا رُعب ٹپکتا ہے۔ رولے ایک موٹا، متوسط قد کا بھرا بھرا آدمی تھا۔ وہ حسب عادت جیبوں میں ہاتھ پھنسائے ہوئے رہتا تھا اسکی ذات سے بڑی آزاد منشی ٹپکتی تھی اور میری کو اس میں کچھ کچھ جاذبیت محسوس ہوتی تھی، اسکی ہنستی ہوئی آنکھوں اور ہنس مکھ چہرہ سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بہت بے تکلف آدمی ہے اور اُس سے ہر آدمی کی خوب نباہ ہو سکتی ہے، میری کو اچانک

محسوس ہُوا کہ بلا لحاظ اُسکی غلطیوں اور میری کے ساتھ اُس کی ہمدردیوں کے وہ بہت ہی مہربان دوست ہے۔ اس کی موجودگی میں تم خود کو بہت آزاد رکھ سکتے ہو، تمہیں اسکی موجودگی میں تصنع کی ضرورت نہیں ہے، اُس کے مزاج میں کوئی بناوٹ نہیں اور نہ ہی دوسروں کے بننے کو پسند کرتا ہے۔

اُس نے کاک ٹیل تیار کیا اور ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار لیا اور پھر آرام سے کرسی پر دراز ہوگیا اور اس کیطرف شریر نظروں سے دیکھا۔

"تو جانِ من۔ سمار شہنشاہیت نے تمہیں ٹھکرا دیا نہ؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا؟" وہ جلدی سے بولی۔

"مَیں نے خود ہی سب تاڑ لیا۔ جب وہ ہوٹل نے ریلوں کی روانگی کی بابت دریافت حال کیا اور جب اُسے معلوم ہُوا کہ پیرس جانے والی ٹرین آج رات کو مِل سکے گی تو اس نے اسی وقت اسٹیشن جانے کے لئے موٹر منگائی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بد دِل نہ ہوتا تو اس قدر جلد یہاں سے نہ بھاگتا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارا راز فاش کرنا سخت بے وقوفی ہوگا، تم اس قسم کے آدمی سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتیں کہ وہ تمہاری کہانی کو برداشت کرے۔"

اس سانحہ کو اتنی اہمیت دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا جبکہ روِلے اُسے بالکل مذاحیہ انداز میں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میری مسکرائی۔

"اُس نے اپنا رویہ بہت اچھا رکھا۔"

"اُسے یہی چاہیئے تھا، میرا خیال ہے۔ اُس نے شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہوگا؟"

"وہ ایک مکمل شریف انسان ہے۔"

"وہ بظاہر مجھ سے زیادہ شریف لگتا ہے، میں پیدائشی شریف ہوں فطرتاً نہیں۔"

"روِلے تمہیں مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا تمہیں ناگوار لگتا ہے؟"

"نہیں، مَیں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ گفتگو کے دوران ہی میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے کسی قیمت پر بھی شادی منظور نہیں۔"

"تو تم اس جھمیلے سے اب باہر ہوگئی ہو، یہی تم سے زیادہ کہنا نہ چاہتا تھا کیونکہ تم نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا، تمہیں بھلا عقل آگئی، تم اُس قسم کی عورت نہیں جو کسی اعلیٰ افسر سے شادی کرو۔"

"روِلے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔" اور خود کو بڑا ہی ظاہر کرتا ہے۔ ایسے ہی جیسے چارلی چیپلن خود اپنی نقل کرنے لگے۔

"میں یہاں سے جلد جانا چاہتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں تمہیں ضرور ایسا کرنا چاہیئے، تمہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

"مجھے تم سے چھٹنا پڑے گا، تم نے میرے ساتھ بہت بھلائی کی ہے۔" وہ بولی۔

"مگر میں سمجھتا ہوں ہم ایک دوسرے سے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ قریب رہیں گے۔"

"یہ تم کیسے سوچتے ہو؟"

"جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں اب تمہارے لئے مجھ سے شادی کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی اور اسکی طرف گھورنے لگی۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"بھئی جب مَیں نے تم سے اُس رات شادی کی درخواست کی جب سے اب تک واقعات نے کتنے موڑ لئے ہیں، میرا خیال ہے تمہیں ابھی تک وہ بات خوب یاد ہوگی، میں نے تمہارے جواب کو اس وقت بھی جواب نہ سمجھا تھا، اب تک میں نے جتنی عورتوں سے بھی شادی کی درخواست کی ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی اس کو ردّ نہیں کیا۔"

"میرا خیال تھا تم مذاق کر رہے ہو، میرا خیال ہے تم میرے ساتھ اب شادی کرنا کبھی پسند نہ کرو گے۔"

وہ آرام کرسی پر دراز ہوگیا، اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہُوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی، اُس کے بے تکلف جملوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا

اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں جو مصائب سے پُر تھی۔ آخر وہ تمہارے لئے اہمیت ہی کیا رکھتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں اگر وہ کل سڑک پر تمہارے برابر سے گزرے تو تم اسے پہچان بھی نہ سکو گی اپنے ذہن کو ناممکن سے پاک رکھو، ڈاکٹر جانسن نے یہی بات کہی تھی اور سچ تو یہ بہت صحیح بات ہے۔"

اُس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں۔

"تمہیں ڈاکٹر جانسن جیسے مفکر سے کیا واسطہ؟"

"اپنی کالج زندگی کے بے مصرف لمحوں میں میں نے بہت کچھ مطالعہ بھی کیا ہے، شہرۂ آفاق جانسن میرا محبوب ترین مصنف ہے۔ وہ ایک مفکر تھا۔ اور انسانی فطرت کے بارے میں اچھا مشاہدہ رکھتا تھا۔"

"تم غیر متوقعات سے پُر ہو، رودلے، میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ تم سوائے کھیلوں کی خبروں کے کچھ سنجیدہ ادب بھی پڑھتے ہو گے۔"

"میں اپنا تمام سامان ایک ساتھ کبھی دکان میں نہیں سجایا کرتا۔" وہ ہنسا۔ "میرا خیال ہے تم مجھے شادی کرنے میں پہلے کی نسبت اب کم قباحت محسوس کرو گی۔"

وہ یہ پُر مذاق جملہ سن کر بہت خوش ہوئی۔

"مجھے یہ یقین کیونکر آ سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار رہو گے؟"

"دراصل اس کا انحصار تمہاری ذات پر ہے، لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو کام کی ضرورت ہے اور ذریعہ تمہارے لئے بہت مناسب رہے گا۔"

ایک لمحہ کے لئے اُس نے اسکی طرف جوابی نظروں سے دیکھا۔

"رودلے تم میرے ساتھ شادی کے جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہو، اگر تمہیں واقعی اپنے قول کے مطابق مجھ سے اتنی ہی محبت ہے۔ تو میں تمہارے ساتھ چلنے میں کوئی قباحت نہ محسوس کروں گی۔ ہم اور تم کار لے سکتے ہیں اور خوب سیاحت کر سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ مشورہ بھی ٹھیک ہے مگر یہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا؟"

"بات یہ ہے کہ ایک بے حقیقت اور اچھا شوہر ہونے کی بجائے تم ایک اچھے دوست ضرور ہو۔"

"واقعی ایک معزز عورت کو یہی کہنا چاہیے۔"

"میں اب اتنی معزز نہیں رہی، کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ میرے لئے اب ظاہرداری کا وقت گزر چکا ہے۔"

"نہیں، میں ہرگز یہ نہیں سوچتا، اور اگر تم احساس کمتری میں مبتلا ہو گئیں تو میں ایک مہینہ تک تمہیں اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں، مجھے تم سے شادی کرنے کی شدید آرزو ہے۔"

"مگر رودلے مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں اس رات بتایا تھا کہ اگر تم مجھے قربت کا موقع دو تو جلد ہی تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

اُس نے اس کی طرف تھوڑی دیر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر اچانک اسکی آنکھوں میں ایک شرمیلی چمک پیدا ہوئی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کہاں تک صحیح ہو۔" وہ زیرِ لب بولی۔ "اس رات جب اُن شرابیوں کی کار ہمارے برابر سے گزر رہی تھی اور تم نے مجھے آغوش میں لے رکھا تھا تو باوجود انتہائی خوف کے تمہارے ہونٹوں کے لمس نے مجھے ایک عجیب و غریب لذت بخشی تھی۔"

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

"بولو اب تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ بولا۔

"اچھا اگر تم مجھ سے شادی کرنا ہی چاہتے ہو تو ..... مگر ہم اب بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔"

"جانِ من زندگی نام ہی خطرہ کا ہے۔ مجھے خطرے مول لینے میں مزہ آتا ہے۔"

پریمیندر متر

پریمیندر مترا ۱۹۰۴ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ شروع میں اسکول میں مدرس رہے۔ اسکے بعد آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ بچوں کیلئے کہانیاں لکھنے کے علاوہ فلمیں بھی ڈائرکٹ کرتے ہیں۔ بیک وقت صف اوّل کے جرنلسٹ، افسانہ نگار، شاعر اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول اور افسانوں میں بنگال خصوصاً کلکتہ کی معاشرتی زندگی کی حقیقی جھلک ملتی ہے جدید بنگال کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہے۔

"مچھلی" (جلوس) پریمیندر مترا کا مشہور و معروف ناولٹ ہے۔ اس جلوس (زندگی کے جلوس) کی کوئی معین شاہراہ نہیں ہے۔ شاہراہ معین کرنے کی کوئی خواہش، کشمکش اور تصور بھی نہیں ہے۔ حالات جہاں کہیں لے جاتے ہیں وہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اسی بہاؤ میں بہہ جاتا ہے۔ لہریں جس ساحل پر لا کر پٹخ دیتی ہیں وہ اسی سے چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں اکثر یہی تو ہوتا ہے۔ ہم میں سے کتنے پار اُتر جاتے ہیں اور کتنے منجدھار میں ڈوب جاتے ہیں، اس کا حساب کون رکھتا ہے۔ اب ان کے اس ناولٹ کی بابت سنیے۔

"ملک کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے شامل ہونے والے ان نوجوانوں کی اس جماعت کی داستان جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی عبرت آموز۔ آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے جس جس کی داغ بیل ڈالی ہے ملک کی خدمت کو بھلا کر اُسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی بس کو خوبی سے نہیں چلا سکتے۔ ان میں شچین جیسا چلتا پرزہ زندہ دل اور عاشق مزاج نوجوان ہے۔ جس کا قول ہے زندگی اگر ضائع کرنی ہے تو چالاکی سے ضائع کی جائے۔ اس کا میں بہادری ہے لیکن اس کی زندہ دلی، سوجھ بوجھ، طنز، ہنسی مذاق اور ان سب کے اوپر مدن کے لئے اس کا دوستی کا جذبہ اور منّو سے ایک خاموش، مبہم اور بے لوث لگاؤ دیکھ کر آپ اسے چاہے بغیر نہیں رہ سکتے ..... مدن ایک طرح سے اس ناولٹ کا ہیرو کہا جا سکتا ہے لیکن شچین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ شچین کے بغیر مدن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شچین کی چالاکیوں سے نفرت کرنے کے باوجود اس کی شخصیت کے دباؤ سے آخر تک آزاد نہیں ہو پاتا۔ معصوم، دنیاداری سے بے خبر، پُر خلوص لیکن بدمعاشی کا مقابلہ کرنے کے نااہل۔ منّو اس کے بھولے پن کی وجہ سے اُسے چھیڑنے سے گھبراتی ہے۔ منّو کی یہ حسرت "اچھا میں تو چلتی ہوں، شاید پھر ملاقات نہ ہو۔" ایک دن اچھی طرح چھیڑنے اور چڑانے کی حسرت ہی رہ گئی۔ بہن حکومنّو ایک راہبہ ہے۔ ساری دنیا کا بار سر آنکھوں پر لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس نے صرف دینا سیکھا ہے لینا نہیں سیکھا۔

اس ناولٹ کا سب سے بڑا کردار اسٹیشن ماسٹر کا ہے جو ناولٹ کے آخر میں آتا ہے اور ہم سب پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ اس کے بارے میں مدن کہتا ہے "ماسٹر صاحب سے زندگی میں پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ آٹھ گز کی دھوتی پہنے، ننگے جسم، سر پر ٹوپی پہنے شاید آج بھی وہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر ریل گاڑیوں کو پاس کراتے ہوں گے ..... لیکن پھر بھی انسان کی کمینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں، ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔"

اس بات میں کوئی شبہ نہیں۔ ہم اور آپ بھی ایسے موقعوں پر اسٹیشن ماسٹر کو یاد کر کے دل کو تسلی دیں گے۔
رینو، شرت، بمان، گوسائیں جی، نندلال وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔



پیمیندرا متر



شیام سنہ

پامیشند رمتر

ترجمہ: شیام سُندر

جلوس

نہ جانے کب نیند آگئی۔

غنودگی کی حالت میں ایسا محسوس ہوا گویا نیچے سمندر گرج رہا ہو۔ میں چونک کر اُٹھا۔ واقعی سمندر کی ہی گرج تھی۔ بحث مباحثے کے سمندر کی گرج!

زندگی کے متنوع، عجیب و غریب اور مفصل رُوپ کی کہانی تیز رفتاری سے سیاہ حرفوں میں کاغذ پر اُتر رہی تھی۔

پروف کو میز پر رکھ کر اوناش نے کہا۔ "دیکھئے، ذرا جلدی سے دیکھئے۔ اس آرٹیکل کے واسطے فرمہ رکا ہوا ہے۔"

شیمپین ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہیں سے پھٹکار سنائی۔ "رکا ہوا ہے تو رکا رہے۔ میری بلا سے۔ تمہارا فرما تو رکا ہی رہتا ہے۔ ایک یہی تو کاغذ ہے اور وہ بھی گیلا۔ قلم رکھتے ہی پھٹ جائے گا۔ اتنی جلدی پروف کیسے پڑھا جائیگا؟ ذرا میں بھی تو سنوں؟"

اسی بات کی تائید کرتے ہوئے کاشی ناتھ نے کہا۔ "دوسرا پروف لانے کے لئے کہو۔ سمجھے؟ نہیں تو ہم لوگ جلدی نہیں کر سکیں گے۔"

سیاہی سے سنے ہوئے دونوں ہاتھوں کو بے بسی سے پھیلا کر اوناش نے کہا: "آپ ہی بتائیے۔ میں کیا کروں۔ میرے ہاتھ میں ہے ہی کیا!" یہ کہہ کر کاشی ناتھ نے پروف اٹھا لیا۔

شیمپین کی پھٹکار سے سہم کر اوناش نے صرف مجھی کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے غم کی داستان سنائی۔

"مجھے جھڑکنے سے کیا ہوگا۔ آپ ہی بتائیے۔ مجھے اس جلد بازی کی عادت تھوڑا ہی ہے۔ کل مشین ٹوٹ جانے سے دیر ہوگئی۔ ڈاک چھوٹ گئی اور میرے اوپر دو روپیہ جرمانہ ہوگیا۔ باوا آدم کے زمانہ کی تو مشین ہے۔ ہمیشہ بگڑی ہی رہتی ہے۔ لیکن سارا قصور میرے سر منڈھا جاتا ہے۔ اسی لئے جرمانے کے ڈر سے جی چاہتا ہے کہ کام جلد از جلد ختم ہو جائے۔"

اوناش میرا پرنٹر ہے۔ اخبار میں روزانہ اس کا نام بھی ایڈیٹر کے نام کے ساتھ ٹائپ کے حروف میں شائع ہوتا ہے۔ کوئی خطا ہو گئی تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ ضرورت پڑنے پر شاید جیل بھی جانا پڑے۔ لیکن اسے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

داڑھی مونچھ سے عاری، رسّی کی طرح اینٹھا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک خاص حد تک پہنچ کر اس کی عمر آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتی۔

"چھپ چھپا کر تھوڑی سی پی بھی لیتا ہے؟" پوچھنے پر بے باکی سے جواب دیتا ہے، "واہ نہ پیوں تو روزانہ رات کو کیسے جاگ سکتا ہوں۔"

نشہ کے اثر سے یا کسی دوسری وجہ سے، وہ ساری رات بھر گویا جاگتا رہتا ہے۔ اس بات میں کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں۔ آج پچیس سال سے وہ اسی طرح رات رات بھر جاگتا آیا ہے۔ جب موقع ملتا اور اسے پینے کی فرصت ہوتی تو وہ یہ بات سنانے سے باز نہ آتا۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتا، "آج تو یہ کاروبار بہت پھیل گیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں، تین تین روٹری مشینیں اور تین سو آدمی۔ لیکن جب یہ اخبار ایک چھوٹے سے مکان میں ہینڈ پریس میں چھپ کر نکلتا تھا، تب رات رات بھر یہ اوناش اکیلا ہی اپنے دم پر سارا اخبار نکالتا تھا۔"

ایک عجیب انداز سے انگلی سے سینے کی طرف جس کی

ایک ایک پسلی اُبھری ہوئی تھی، اشارہ کر کے وہ کہتا "آپ یقین نہیں کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رام بابو کو لکھنے کی فرصت نہ ہوتی۔ بس کھڑے کھڑے منہ سے بولتے جاتے اور میں سُن سُن کر کمپوز کرتا جاتا۔ اور تب وہ فتوے صادر کر دیتا، ایسا ایڈیٹر ایسا کبھی نہ پیدا ہوگا۔ اُن جیسا زور اب کس کی قلم میں ہے!"

پچیس سال پہلے جب "بےباک" کلکتہ کی ایک معمولی سی گلی کے ایک بوسیدہ اور پرانے مکان کی چھوٹی سی کوٹھری میں (آج تو کہیں اس گلی کا نشان ہے اور نہ اس گھر کا) ایک پرانے ہینڈ پریس کی کوکھ سے دھرتی پر گرا۔ تب اُس کی پرورش صرف دو آدمیوں نے کی۔ ایڈیٹر سوامی رام بابو اور ہمارا یہ اوناش۔ اُس کے بعد "بےباک" ناولی کی طرح دن بدن بڑھنے لگا۔ دو صفحوں سے سو صفحوں کا ہوا۔ ہینڈ پریس کی جگہ تین تین روٹری مشینیں ناکافی ہوتیں۔ بنگال کے دور افتادہ اور دشوار گذار راستوں والے گاؤں تک "بےباک" کی بےخوف آواز دوڑتی پہنچتی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ، دوسرے سے تیسرے، اس طرح اس کا حلقہ اور رسوخ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

"بےباک کی ترقی کی منزل تک اگر کسی نے لگاتار اس کا ساتھ دیا تو صرف اوناش بابو نے۔"

"لیکن جرمانے کی بات غلط ہے۔ میں کہتا ہوں تمہاری یہ بات جھوٹ ہے اوناش۔ بھلا تمہارے اوپر وہ لوگ جرمانہ کر سکتے ہیں"

یہ سنتے ہی اوناش کا لہجہ بدل جاتا۔ سوکھی ہنسی ہنس کر کہتا۔ "ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ایسا ہونے پر ایمان زندہ رہ جائے گا! کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن اُسے اپنی بات ختم کرنے کا موقع نہ ملتا۔

مضمون کا پروف سامنے پھینک کر، منہ بنا کر کاشی ناتھ کہتا۔ "اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لے جاؤ یہ سینکڑوں غلطیاں ہم لوگ یہاں تک درست کریں گے!"

اوناش جواب تک نہ دیتا۔ پروف لے کر ایک سانس میں نیچے اُتر جاتا۔ میز کے اوپر پیر پھیلا کر، کرسی سے سر ٹیک کر کاشی ناتھ کچھ دیر سو لینے کی کوشش کرتا۔

نیچے پریس سے رات کی خاموشی کا سینہ چیر کر روٹری مشین کا شور بلند ہوتا رہتا۔ نیند میں سمندر کی گرج کی طرح عجیب محسوس ہوتی۔

چھپائی کے حروف میں بند ہونے سے پہلے کراہت کی یہ آخری چیخ ہوتی!

x x x

صبح بنا ہی نفرت ہوتا۔

نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اٹھنے کو طبیعت نہ کرتی بلکہ پڑا پڑا سب آوازیں سنتا رہتا۔

قریب کے مکان میں چھاپنے والے نے کاغذ کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر ایک گرد آلود ڈھیر لگا دیا تھا۔ نیچے روٹری مشین اب بھی نہ رکی تھی۔ لیکن ٹھیکے والوں کے شور و غل، سائیکل والے اخبار فروش لڑکوں کی چیخ و پکار نے مشین کی آواز کو بھی دبا دیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بستر سے اٹھا تو آفس کے دروازے کے سامنے اخبار فروش پھیری والوں کی بھیڑ بہت کم ہو گئی تھی۔ میرے سامنے سے شاید آخری پھیری والا کمر پر لپیٹ کر لگائے باہر نکل گیا۔ بھاری بھاری پیپے جن میں کاغذ کے ترشے بھرے ہوئے تھے بیل گاڑی سے آ جا رہے تھے۔ باہر جانے کے تنگ راستے پر ان بڑے بڑے پیپوں کے پاس سے نکل کر جاتے جاتے دیوار پر چپکے پوسٹر کا پیغام نظر سے گزرا "ہندوستان کے نوجوانو! جاگو"

رات کو جاگنے سے جسم کسلمند تھا۔ یہ پیغام پڑھ کر ایک پھیکی سی ہنسی چہرے پر آئی لیکن یاد آتا ہے، ایک دن اسی پیغام کو پڑھ کر میں جوش سے بھر اُٹھا تھا۔ اس دن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ "بےباک" اس پیغام کو بنگال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا رہا ہے۔ بنگال کے نوجوانوں میں نئی زندگی کی روح پھونکنے کی تحریک کو چاہے کتنی بھی کامیابی ملی ہو، اس میں میرا بھی تھوڑا سا ہاتھ رہا ہے، یہ سوچ کر اُن دنوں میں نے شاید کچھ فخر محسوس کیا تھا۔

x x x

ایک دیہاتی لڑکا گاؤں کے محدود ماحول کے اندر ملک کی خدمت کرنے کا خواب دیکھتا ہوا گھر میں بیٹھ کر چرخہ کاتتا۔ کڑاکے کی سردی میں بھی اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا پہن کر سوچتا کہ ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔

گاؤں کے ختم کرنے کے جوش میں آکر آدھی آدھی رات کو ٹولی بنا کر مصروف کھیتوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرتے ہوئے اور دوسروں کے تالابوں میں جمی کائی پھیرتی ۔ اس کام میں کبھی کبھی تو مار اور پیٹ بھی ملتی تھی۔

اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں جتنا جیل میں کلکتہ پہنچا ۔ جیل ہی میں شمبھو سے ملاقات ہوئی ۔ ایک ہی کوٹھری میں ہم دونوں سوتے تھے ۔

ایک دن صبح تڑکے ہی نیند ٹوٹ گئی ۔ کوٹھری میں جھٹپٹا سا تھا ۔ پہرے دار بھاگ کے بستر پر جوڑ کا سوتا تھا ۔ اس نے جھنجھوڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔ "دیکھئے صاحب! کوئی گلے میں رسی باندھ کر لٹک گیا ہے ۔"

جلدی جلدی اٹھ کر دیکھا تو سامنے والی کوٹھری کی سلاخوں سے ایک لمبا کپڑا باندھ کر اس کا پھندہ گلے میں ڈالے ایک آدمی جھول رہا تھا ۔ اس کی چاروں طرف بھیڑ جمع ہو گئی تھی ۔

غور سے دیکھنے میں اس کا چہرہ بڑا بھیانک معلوم ہوا ۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی ۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی ، کناروں پر سیاہی لگی ہوئی تھی ۔

اس کو چھونے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی ۔ خطرے کی گھنٹی ابھی تک نہ بجائی گئی تھی ۔ جیلر کو خبر دے کر وارڈن اس عجیب واقعہ سے دم بخود ہو کر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا ۔

کسی نے کہا ۔ "کب کا مر گیا ہے بیچارہ ۔"

سپرنٹنڈنٹ نے وارڈن سے کہا ۔ "بت کی طرح کھڑے کیا دیکھتے ہو ۔ اسے اتار نہیں سکتے ہو" ـــــ یہ دیکھ کر اس میں ہمت نہیں ہے ۔ میں خود اسے اتارنے لگا ۔ آنکھوں کے سامنے یہ خوفناک منظر کب تک دیکھا جا سکتا تھا ۔

لوہے کی چارپائی کے اوپر کھڑا ہو کر گلے کا پھندہ کھولنے ہی والا تھا کہ یکایک اس کے جسم سے ہاتھ جو چھوا تو چونک پڑا ۔ اس کے جسم کی حرارت کم نہ تھی ۔ معلوم ہوا جیسی صحت مند آدمی کی ہوتی ہے ۔ اس کے سینے کے اندر دل بھی کافی تیزی سے دھڑک رہا تھا ۔

تعجب کے عالم میں یہ سوچ رہا تھا کہ اور لوگوں کو یہ بات بتاؤں یا نہ بتاؤں کہ گال پر ایک زور کا طمانچہ پڑا ۔

اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے پھندے سے گردن نکال کر وہ لڑکا چلایا

"بھلا بتاؤ کس خوبی سے اس نے گلے میں ایسا پھندہ باندھا تھا! میں حیران رہ گیا ۔ اترتے ہوئے اس نے کہا ۔ "کیوں تمہیں کا سارا مزا کرکرا کر دیا ۔ سپرنٹنڈنٹ کو وہ ناچ نچایا کہ یاد کرتا ۔"

چاروں طرف ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا ۔ اگر اس ہنسی میں کوئی شریک نہ تھا تو بیچارہ وارڈن ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بلا کیا کیفیت رہی تھی ۔ یہی سوچتا ہوا باری باری سب کے چہروں کو تاک رہا تھا ۔

آنکھ کے کناروں سے لالٹین کی سیاہی پونچھتے ہوئے اس خودکشی کرنے والے لڑکے نے ہنسی میں ڈانٹتے ہوئے کہا ۔ "بڑے چودھری بنے پھرتے ہو ۔ تمہیں کیا ضرورت تھی مجھے اتارنے کی ؟ بتاؤ!"

یہ تھا شمبھو ۔ وارڈن کو پریشان کرنے کے لیے روز روز کوئی نیا طریقہ سوچ رہا تھا ۔ وہ جانتا بھی بہت کچھ تھا ۔ گانا بجانا ، ناٹک ، جمناسٹک وغیرہ ۔ ان تمام ہنروں سے وہ اکیلا ہی سارے وارڈ کا دل لبھائے رکھتا تھا ۔

یاد نہیں پڑتا ، اتنی زندہ دلی اس سے پہلے کہیں دیکھی ہو ۔ اس کے ساتھ تعلقات جیل سے باہر آنے پر مضبوط ہوئے ۔ ہم دونوں ایک ہی دن چھوٹ کر باہر نکلے تھے ۔

کلکتہ میں میرا ایک ٹھکانہ تھا تو ضرور لیکن میں جانتا تھا کہ جیل سے چھوٹ کر ایک سرکاری ملازم کے گھر کچھ اچھا خیر مقدم نہ ہوگا ۔ مجھے کشمکش میں پڑا دیکھ کر اس نے خود مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی ۔ اس کے گھر کے بارے میں بغیر کچھ جانے بوجھے میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوا ۔

* * * * * *

کلکتہ کے ایک غریب محلے کے ایک ٹوٹے پھوٹے ، کچے گھر کی شکل دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ کلکتہ میں ٹھکانہ ہوتے ہوئے بھی شمبھو کی حالت میری نسبت کچھ ایسی اچھی نہ تھی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ گھر اس کا اپنا نہ تھا ۔ ایک کوٹھری میں وہ کرایہ دے کر رہتا تھا بس ۔

دروازہ کھٹکھٹاتے ہی ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی نے آکر کواڑ کھولے ۔ اور پیچھے ہٹ گئی ۔ شمبھو نے تقریر کرنے کے انداز میں کہا "دیکھا تو نے بیان کا حال ۔ اس سے ملک کی خدمت کرنے کی خواہش بھلا کیسے ہوگی ۔ کہاں تو جیل کے پھاٹک سے آواز آتی تھی جاگ

سے انسان جاگ۔ وہ تو دور رہا، راستے میں کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ گھر آنے پر ایک صنفِ نازک کی شکل نظر آئی تو وہ بھی غائب ہوگئی یا اچھا تو آ۔"

یہ سوچکر کہ یہ لڑکی رشتے میں اسکی کچھ لگتی ہوگی مجھے اُس کی بات پر ہنسی آئی۔ لیکن گھر میں جاکر بیٹھنے پر اسکی بات سے بڑی حیرانی ہوئی۔ گھر کے ایک کونے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی چٹائی کو کھول کر اس نے بچھا دیا۔ جس لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ شاید وہی دبے قدموں سامنے سے نکل گئی۔

اچانک میری دونوں آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے موند کر شمیم نے کہا۔ گدھا کہیں کا۔ ادھر اس طرح کیا دیکھ رہا ہے۔ میں نے تجھے گھر میں پناہ دی۔ اور تو مجھے ہی تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ تیری قسم دو برس کی ریاضت کے بعد وہ مقصود ہاتھ میں آنے کو ہے۔ میں کہے دیتا ہوں اب اگر تو نے کیا دھرا چوپٹ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔

اس کے بعد میرے چہرے کو دیکھ کر اتنے زور سے ہنسا کہ سارا گھر دہل گیا۔ بولا۔ تو تو دُرواسا رشی کا اوتار ہے۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

سوچا تھا۔ اسی دن اسکا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن جا نہ سکا۔ بات یہ نہ تھی کہ میرا کوئی ٹھکانا نہ تھا لیکن شمیم کو چھوڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ شمیم میں خامیاں کچھ کم نہ تھیں۔

کبھی کبھی ایسا لگتا کہ اس کے نزدیک زندگی کے کسی آدرش کی کوئی قیمت نہیں۔ کبھی کبھی اس کے معمولی فراق سے میرا دل دکھ جاتا۔ لیکن پھر نہ معلوم کیسے میں اُسے چاہنے لگا۔

اُسی کے سہارے دن گزر رہے تھے۔ شروع میں تو کئی دن تک میں نہ جان سکا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کسی دوسرے آدمی کا بوجھ اُٹھانا تو درکنار خود اپنا گزارہ کرنا بھی اُسکے بس کی بات نہ تھی۔ ایک دن شرم کے مارے میں نے واپس وطن جانے کی اجازت مانگی۔

شمیم پہلے تو سنجیدہ ہوگیا پھر ہنس کر زور سے آواز دی "منو"! منو کہیں نزدیک ہی تھی، اُس کے آتے ہی شمیم نے بھاری آواز بنا کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم روین کو پیٹ بھر کھانا نہیں دیتی ہو۔ یہ تمہاری بڑی بے انصافی ہے۔ گاؤں کا لڑکا ہے۔ یہ مانا کہ ملک کی خدمت کرنے آیا ہے۔ لیکن وہ فاقہ کرکے تو نہیں رہ سکتا۔ دیکھ لو وہ خفا ہوکر اپنے وطن جا رہا ہے!"

بے حد شرمندہ ہوکر میں نے کہا۔ "واہ کیا میں اس لئے وطن جانا چاہتا ہوں؟"

ادھر کئی دنوں سے منو میرے سامنے بالکل کھلنے لگی تھی۔ ان کئی دنوں کے تعارف سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ شرارت کرنے میں یہ نٹ کھٹ لڑکی کسی سے کم نہیں۔ چنانچہ اُس نے ہنس کر کہا "۔ فاقہ کرنے پر بھی دیو جیسا چہرہ ہے۔ دیکھنے سے ہی خوف آتا ہے۔ پیٹ بھر کھانا دے دیا۔ تو زندہ نہ چھوڑیں گے!"

منو جا رہی تھی۔ اُسے واپس بلا کر شمیم نے کہا۔ "دیکھو منو، یہ میں جانتا ہوں کہ روین نوجوان ہے۔ لیکن تم اس طرح میرے سامنے اسکے چہرے کی تعریف نہ کیا کرو۔ مجھے رشک ہوتا ہے!"

"میری بلا سے"۔ یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

شمیم کو میں پہچانتا تھا، میری بات کو اس نے اس طرح دبا دیا، یہ بھی میں نے سمجھ لیا۔ لیکن اس طرح کتنے دن کام چلے گا۔ یہ سوچکر میں فکر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اُس کی اپنی آمدنی کچھ بھی نہ تھی۔ پرانے تعلقات کے ذریعے یا کسی بھی رشتے سے اس غریب کنبہ پر اپنا بوجھ ڈال کر وہ رہ سکتا ہے۔ لیکن بلا وجہ ایک دوست کا بوجھ بھی ڈال دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ اس سے یہ بات کہنا بیکار ہے۔ میں نے ایک دن بڑے زور شور سے بات اٹھائی۔ اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔ انسان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو، بتاؤ تو سہی۔ ہم تو سب لوگوں کی بھلائی کریں اور ہماری بھلائی کوئی نہ کرے۔ ہمارا یہ غرور!

لیکن یہ بھلائی میرے لئے برداشت کرنا میرے لئے ناممکن ہوگیا۔ ایک اکیلے آدمی کی کمائی سے منو وغیرہ کے گھر کا خرچ جیسے تیسے چل رہا تھا۔ موٹر کے ایک کارخانہ میں مستری کا کام کر کے منو کا بڑا بھائی جو کمائی کرتا تھا، وہ اسکی بیوہ ماں اور بہن کے لئے ہی کافی نہ تھی۔ اس کے اوپر دو آدمیوں کے بوجھ سے اس گھر پر مصیبت آجائے گی، یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اُس کی پیشانی پر میں نے کبھی شکن تک نہ دیکھی۔ اتنے دنوں کے برتاؤ سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ شمیم سے ان لوگوں

اور بڑی عقیدت ہے۔ ان کے لئے وہ کسی دیوتا سے کم نہ تھا۔ اپنا کام ختم کر کے گھر لوٹتے ہیں اکثر رات ہو جاتی تھی۔ اس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ شمیم کے ساتھ سے وہ جب بات کرتے سنا تو میں حیران ہو گیا۔ ان لوگوں کو ان سے اتنی عقیدت ہو سکتی ہے۔ اس کا میں نے کبھی تصور ہی نہ کیا تھا۔ شمیم کے لئے اس عقیدت کو برداشت کرنا کوئی بڑی بات تھی یہ جانتے ہوئے بھی اس عقیدت کی پوجا سے رن کاٹنے کے خیال سے میرا دل شرم سے بھر جاتا تھا۔

پھر وطن جانے کی بات کو دبا کر شمیم اطمینان سے بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میں نے کہا "بھائی تمہارے پیروں پڑتا ہوں ذرا سی دیر کے لئے ہنسی مذاق کو بالائے طاق رکھ کر میری بات سن لو!"

میری طرف ایک بار دیکھ کر معلوم نہیں کیا سوچ کر چہرے پر آئی ہوئی ہنسی روک کر اس نے کہا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"اس طرح کاہلوں کی طرح دن گزارنا تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

"یہ تو ہوئی تمہید، اس کے بعد؟"

"اس کے بعد!...... اسی طرح اگر رہنا ہے تو کچھ کام دھندے کی کوشش نہیں کی جا سکتی! تم چاہے نہ کرو لیکن کیا میں بھی نہیں کر سکتا!"

تیزی سے اٹھ کر بیٹھتا ہوا شمیم بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ کچھ کام دھندہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں کاہلوں اور اپاہجوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس دھرتی کو خون پسینے سے سینچ کر سرسبز اور شاداب بنا دیا ہے۔ جنہوں نے اپنے ناخنوں سے دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں سے گوہر مقصود برآمد کیا ہے۔ ہم لوگ محتاج نہیں ہیں، جو ہاتھ ہم اپنے منہ میں ڈالتے ہیں وہ ہاتھ نازک نہیں ہیں بلکہ محنت سے سخت پڑ گئے ہیں۔۔۔ منو!"

اسکی بات سن کر میں جھینپ ضرور گیا لیکن جوش میں آ کر جب اس نے منو کو پکارا تو میں ہنس پڑا۔ بولا "پھر منو کی ضرورت کیوں آ پڑی؟"

"واہ انہی لوگوں کی تو پہلے ضرورت ہے۔ سب کاموں کے محرک وہی تو ہیں۔ وہی تو ہماری طاقت ہیں!"

"تمہارا جو شغل میں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت کس طاقت کی ضرورت ہے، ذرا سنوں تو سہی!" منو آکر چوکھٹ پر کھڑی ہو کر ہنسنے لگی۔

"جانتا ہوں تم سب باتیں سن رہی تھیں۔ تمہیں یہاں سے دیکھ کر تو بول رہا تھا۔ اچھا، تمہارا وہ کنگن ابھی ہے یا چلا گیا؟ جسے پھر پچھلے شاید تم سے لیا تھا۔ واپس دیا کہ نہیں، یاد نہیں آتا!"

"واپس دے دیا تھا۔ ٹھہرو لا دیتی ہوں!" یہ کہہ کر منو چلی گئی۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ بولا "تم بڑے بے حیا ہو شمیم۔ ان لوگوں سے اپنا اتنا ظلم کر کے بھی تمہیں چین نہیں آیا۔ منو کا کنگن تم نے کس شرم سے مانگا تھا!"

"بڑے خوبصورت، اپنی کمہ منہ سے ذرا دیکھو! کچھ دیر چپ رہ کر اس نے پھر کہا۔ "ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی۔ دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں!"

منو کے کنگن لا دینے پر شمیم مجھے ساتھ لے کر نکل پڑا۔ دل ہی دل میں کڑھتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں کاغذ میں لپٹے ہوئے کنگن کو ایک بار نکال کر شمیم نے کہا "تو نے ہی تو کام دھندے کی بات شروع کی تھی۔ ورنہ مجھے تو اسکا خیال تک نہ آتا!"

"خیال تو خوب ہے! چلے ہو ایک بیکس لڑکی کا زیور بیچنے!" شمیم مسکرا دیا اور میری کمر تھپتھپا کر بولا "لو پھر ڈھونگ کیا! اخبار کا بنڈل لے کر پھیری لگانے میں شرم لگے گا تو نہیں!"

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا "ارے پاگل تمام دھندے کے لئے بھی تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کنگن کا روپیہ اخبار کے دفتر میں جمع کرا دو۔ روز دونوں آدمی اخبار بیچا کریں گے۔ دو مہینے میں کنگن تو کیا منو کے لئے سونے کا ہار بنوا کر سارا قرض اتار دیں گے۔ سمجھا!"

سمجھ کر بھی میں زیادہ خوش نہ ہو سکا۔

اس کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر ایک دکان پر جب پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "راستے میں کسی اور سنار کی دکان نہ تھی؟"

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ دکان میں گھس گیا۔ لیکن اتنی

دو دو کرنے کے باوجود سودا نہ پٹ سکا۔ سنار جو دینا چاہتا تھا وہ شاید بہت کم تھا۔ کنگن کو کاغذ میں لپیٹ کر وہ واپس چلنے لگا تھا۔ یکایک نہ جانے کیا سوچ کر وہ مڑا اور موڑا ہوا کاغذ اس کی طرف پھینک کر بولا۔ "دیجئے جو آپ اپنا دھرم سمجھیں۔ وہی دیجئے۔ بہت گھوم چکا ہوں۔ اب اور ٹھوکریں کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

سنار نے شاید بیچ بیچ بازی مار لی تھی، کہیں ہمارا ارادہ بدل نہ جائے۔ یہ سوچکر اس نے جلدی سے روپیہ نکال کر دیئے۔

راستے میں چلتے چلتے میں نے کچھ تعجب سے پوچھا۔

"زیادہ قیمت حاصل کرنے کے ارادے سے اتنی دور آ کر اتنے کم پیسوں میں کیوں راضی ہو گئے؟"

"کیا کرتا اور کہاں کہاں گھومتا!" کہکر وہ ہنس پڑا۔

گھر آ کر اس کی ہنسی کا مطلب سمجھکر میرا دل تعجب، شرم اور نفرت سے بھر گیا۔ منو کو بلا کر شچین نے کہا "یہ روپے رکھ لینا منو۔ کل ان روپوں سے کوئی دھندہ شروع کریں گے۔ اور تمہارے کنگن کی آج ضرورت نہیں پڑی۔ اسے بھی رکھ لو!" کاغذ میں لپٹا کنگن نکال کر اس نے منو کو دیدیا۔

منو کے جاتے ہی اس نے میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "دنگ رہ گیا نہ تو روی! جادو ہے جادو۔ ہاتھ کی صفائی یونہی تھوڑا ہی سیکھی ہے۔"

"تمہارا جادو دیکھ کر دنگ نہیں ہوا شچین۔ لیکن خیر چھوڑو اس بات کو۔ کل سے میں یہاں نہیں رہوں گا۔" غم و غصہ سے میری آواز بھرا رہی تھی۔

"میرے پاس آ کر بیٹھ۔ میری طرف دیکھ ذرا!" وہ ہنس پڑا۔ پھر غمگین لہجہ میں بولا۔ "تم سب کارل مارکس اور لینن پڑھتے ہو۔ منہ سے کہتے ہو دنیا کی ساری ملکیت سب کو برابر تقسیم کر کے سب کو ایک معیار پر لانا چاہیئے۔ میں ٹھہرا سیدھا سادہ آدمی۔ یہ باتیں سن کر میں نے بیچارے سنار کے روپوں کے پہاڑ کا ایک کونہ ذرا سا سرکا دیا۔ بس اتنی سی بات پر ہی بگڑ گئے۔ لینن کی پارٹی چاہے مار دھاڑ اور خون خرابہ کر کے اپنا کام نکال لے۔ لیکن میری ذرا سی ہاتھ کی صفائی بھی جرم ہو گئی۔"

اس وقت اس کا مسخرا پن برداشت نہ کر سکا۔ غصے میں آ کر اتنا ہی کہا۔ "نہیں شچین میں اب اور یہاں نہ رہ سکوں گا!"

منو کھانا کھانے کے لئے بلانے آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اس کے کانوں میں میری بات چیت کا آخری حصہ پڑ گیا تھا۔ اس نے پوچھا "نہ رہ سکیں گے! کون نہیں رہ سکے گا؟"

شچین نے کہا۔ "روی کل یہاں سے چلا جائے گا منو! خیر چلا جائے۔ اچھا ہی ہے۔ رقابت کے مارے میری تو کئی راتوں سے نیند حرام ہو گئی ہے۔"

منو ہنس پڑی۔ بولی "رات دن کیا مذاق کرتے رہتے ہو۔"

اس رات کھانے کے وقت اور کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ شچین نے ایک آدھ بار مذاق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی بات کوئی نہیں سنتا وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔

اچانک اس گھر کو چھوڑ کر چلے جانے کا اپنا ارادہ ظاہر کر کے مجھے نہ جانے کیوں اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا گویا منو بھی میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے بھات پروستے وقت ایک بار نظریں جو ملیں تو اس نے ہنس کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ ہمارے روکھے سوکھے کھانے سے گھبرا کر بھاگ رہے ہیں!"

"اور چاہے کچھ بھی کہو، روی پر یہ الزام تم نہیں لگا سکتیں منو۔ تمہارا کھانا تو کیا جیل کی "لپسی" اور فرانسیسی "شیف" کے کھانے کا فرق روی سمجھ سکتا ہے۔ اسکا بڑے سے بڑا دشمن بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکتا!" کہہ کر شچین ہنس پڑا۔

دوسرے دن سویرے جب سو کر اٹھا تو زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی اپنے معمول کے مطابق نو بجے سے پہلے بستر چھوڑنا جس کے اصول کے خلاف تھا۔ وہ شچین اتنے سویرے اٹھ کر کہاں غائب ہو گیا؟ گھر میں اس کا پتہ نہ تھا۔

میرا تھوڑا سا سامان تھا وہ ایک پوٹلی میں باندھ رہا تھا۔ اتنے میں منو آ کر چوکھٹ پر بیٹھ گئی اور بولی "یہ تم کیا کر رہے ہو؟" بلاوجہ جھجکتے ہوئے میں بولا۔ "آج مجھے جانا ہے!" یہ سن کر پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ میری طرف لمحہ بھر عجیب نظروں سے دیکھ کر خاموشی سے اٹھ گئی۔ اس کے اس نئے اور اپنائیت کے تخاطب

سے مجھے جو تعجب ہوا تھا وہ ابھی دور نہ ہوا تھا۔

میرا سامان بندھ چکا تھا۔ صرف شمیم سے ملاقات کئے بغیر اور منو سے ایک بار اچھی طرح وداع لئے بغیر چلے جانا مناسب ہوگا یا نہیں یہی سوچ رہا تھا۔ کبھی یہ بھی شبہ ہونے لگتا تھا کہ شمیم کا اس طرح صبح صبح اچانک غائب ہو جانا کہیں مجھے روکنے کا بہانہ تو نہیں ہے۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی منو پھر آئی اور دروازے سے میری طرف دیکھے بغیر بولی "اگر بالکل جانا ہی چاہتے ہو تو کھانا کھا کر جانا۔ میں نے کھانا چڑھا دیا ہے۔"

منو کی بات سے میرا ارادہ بالکل پکا ہو گیا۔ زیادہ دیر یہاں رہنے پہ اتنی ہمت برقرار رہے گی کہ یہاں سے جا سکوں، مجھے اس بات میں شک ہونے لگا تھا۔ چنانچہ جلدی سے بول اٹھا "نہیں نہیں اب کھانے پینے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی جانا ہے۔" اور میں پوٹلی ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

منو یکایک ہنس پڑی۔ بولی "اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے؟ ہم لوگ زبردستی تو تمہیں یہاں نہیں باندھ سکتے۔"

شمیم ہوتا تو شاید اس بات کا جواب دیتا۔ منو کے سامنے خاموش رہ جانا پڑا۔

منو نے پھر ہنس کر کہا "اخلاق کی خاطر ہی سہی میری بات سے انکار تو نہ کرنا چاہئے تھا۔ ایسے منہ چور آدمی ملک کو آزاد کرنے چلے ہیں۔ تم فوراً گھر واپس چلے جاؤ، سمجھے!"

میں گونگا تو نہیں ہوں لیکن اس دن اس لڑکی کے سامنے میری زبان پہ تالے پڑ گئے تھے۔ مجرم کی طرح خاموش سر جھکائے پوٹلی لے کر دروازے سے باہر آ گیا۔ منو پہلے تو دروازہ چھوڑ کر پرے ہٹ گئی تھی۔ لیکن پھر میرے قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہی اس نے جھٹ میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں سہم کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کی کیسی عجیب حرکت ہے!

مجھے بھونچکا دیکھ کر منو پھر ہنس پڑی "اب اگر تمہیں پکڑ کر باندھ دوں تو؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ پھر بول اٹھی "سوچتے ہو گے کیسی بے حیا، بے شرم لڑکی ہے۔ ٹھیک ہے نا! نفرت اور غصّے سے شاید سارا جسم کانپ رہا ہوگا!

اس کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ کر بولی "لیکن تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ مذاق کرنا بھی پاپ ہے۔" اور پھر گھر کے دروازے تک میرے ساتھ ساتھ آ کر دروازے کے ساتھ کھڑی ہو کر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "میرے بارے میں چاہے کچھ بھی سوچنا لیکن میرے سلوک سے ساری عورت ذات کو غلط نہ سمجھ بیٹھنا۔ حالانکہ تمہارے جیسے آدمی سے یہ کچھ بعید نہیں!"

میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنا ضرور دیکھا کہ اس وقت بھی وہ ہنس رہی تھی۔ نشے کی حالت میں راستہ چلتے چلتے مجھے محسوس ہوا کہ آج تک ایسی ہنسی اس کے چہرے پہ کبھی نہ دیکھی تھی۔

x x x x x

کہاں جاؤں گا، کچھ طے نہ کر پایا تھا، بلا مقصد راستے پر چلا جا رہا تھا۔

شمیم کب میرے پیچھے لگ لیا تھا، یہ بھی پتہ نہ چلا۔ اچانک میری کمر پہ ایک دھول جما کر اس نے پوچھا "اس طرح کیا سوچتا چلا جا رہا ہے۔ بول نا؟ میں پانچ منٹ سے تیرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں!"

میں جو کچھ سوچ رہا تھا وہ شمیم کو بتانا تو درکنار خود میرے ذہن میں بھی زیادہ واضح نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اس کی طرف مڑ کر صرف اتنا کہہ سکا "اتنے سویرے کہاں چلے گئے تھے؟"

اس بات کا جواب نہ دے کر شمیم نے کہا "تو تو واقعی جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا مجھ سے ملے بغیر تو کبھی نہ جا سکے گا۔ لیکن تو ہے بھینسے کی ذات کا آدمی۔ تیرے لئے سب کچھ ممکن ہے۔"

اس سے پہلے منو نے بھی یہی بات کہی تھی۔ شمیم کی بات کا جواب نہ دے کر آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شمیم نے پوچھا "لیکن جا کہاں رہا ہے؟ پہلے جو تیرا ٹھکانہ تھا وہاں تو میرا خیال ہے جانے کا کوئی امکان نہیں۔"

بات صحیح تھی۔ میں نے جواب دیا "ابھی کچھ سوچ نہیں سکا ہوں۔"

"سوچنے کو رکھا ہی کیا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا "کلکتے

کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی فٹ پاتھ ہیں۔ دیکھ بھال کر ایک پورٹیکو میں بسیرا لینے پر میں نے دیکھا ہے۔ موسلادھار بارش میں بھی ایک بوچھار نہیں آتی۔ سر کے نیچے رکھنے کے لئے ایک اینٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس کا ملنا بھی دشوار نہیں ہوتا اس لئے تو جہاں بھی رہے گا اچھا ہی رہے گا۔

اس کے بات کرنے کے انداز میں ہنس پڑا۔

اُس نے پھر کہا "میرے ساتھ تو تو اب کہیں نہیں رہ سکے گا لیکن میری ایک بات سن کر کہیں حب الوطنی کی جنگ تو نہیں چھیڑ دے گا، بول؟"

میں نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟

"فٹ پاتھ سے کچھ ہی بہتر ایک جگہ میری دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص تو جگہ نہیں ایک میس ہے۔ ملک کی خاطر جو تین بار جیل ہو آیا ہو۔ اُس کے لئے وہاں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اس لئے اُمید ہے بسن بایت سین اور ڈی ویلرا کی میس میں تو آرام سے رہے گا!"

میس کا پتہ وغیرہ اُس نے بتا دیا تھا۔ تجویز بری نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں تذبذب میں پڑ گیا۔

شمبھو نے میرے دل کی بات کو بھانپ کر کہا "نہیں نہیں۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرو۔ جب بھی سہولت سے ممکن ہو کچھ دے دینا۔ نقد اگر کوئی چیز وہاں درکار ہے تو جذبۂ حب الوطنی، اور یہ تیرے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لوگ تجھے دیکھتے ہی یہ بات سمجھ جائیں گے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں" کہہ کر شمبھو نے اجازت مانگی اور چلا گیا۔

پتہ لگاتے لگاتے جب میں اس میس میں پہنچا تو دوپہر ہو گئی تھی۔ کھدر کی گاندھی ٹوپی ایک دبلا پتلا لڑکا میس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ میس میں رہنے کے لئے جگہ ہے یا نہیں موٹے چشمے کے اندر سے لو بھر وہ غور سے میری طرف دیکھتا رہا اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے کے بعد بولا "آپ کا ہی نام روبن بابو ہے؟"

اگلے ہی لمحہ بڑی عزت سے مجھے سلام کر کے لڑکے نے کہا "واہ میں آپ ہی کے انتظار میں تو کھڑا تھا۔ دیر کیسے ہو گئی؟"

معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن کچھ پوچھنے سے پہلے ہی لڑکے نے جلدی سے کہا "اوپر آئیے۔ آپ کے لئے اوپر ہی ایک سیٹ طے کی گئی ہے۔" اور پوٹلی گویا زبردستی میرے ہاتھ سے چھین وہ فوراً زینے سے اوپر چڑھ گیا۔

مجبور ہو کر اُس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا۔ لیکن یہ راز کچھ میں آیا۔ تھوڑی دیر کے تعارف سے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکا بڑا باتونی ہے فضول کی بکواس کئے جا رہا تھا۔ "سنگل سیٹ کا نام تو اس میس میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ڈبل سیٹ کا بھی ایک یہی ہے۔ آپ کیوں سے زمین کو زبردستی بھیجا گیا ہے۔ وہ آسانی سے تھوڑا ہی جانا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے وہ رجنی بابو کی سیٹ تھی۔ سرکاری قیدی رجنی مکرجی۔ سمجھ گئے آپ؟"

باتوں کی اس جھڑی میں کچھ پوچھنے کی گنجائش نہ دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ لیکن اسکی باتوں سے ہی راز کھل گیا۔

وہ کہہ رہا تھا "سنا ہے آپ تنہائی چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کریں بتائیے کمرہ تو ہے نہیں۔ سبھی کمروں میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی ہیں۔ آخر شمبھو بابو نے کہا یہ بات ہے تو پھر مجبوری ہے۔ یہی سیٹ دیدو۔ وہ تو ایک ماہ کا پورا خرچ دے رہے تھے ہم نے کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ یہاں دکان لگا کر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں!"

× × × × ×

ایک چھوٹا سا گھر۔

اُسی کے اندر بقول شمبھو مستقبل کے بسن یا میس ڈی ویلرا اور بسن بایت سین رہتے ہیں۔

لیکن چھوٹا ہونے پر بھی اس گھر کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

اس گھر کے کسی کمرے میں شاید دلیش بندھو رہتے تھے۔ اس گھر سے ہی وطن کا ایک سپوت ملک کے لئے اپنی قربانی دینے مانڈلے کی جیل میں گیا تھا۔

سال بھر میں دو بار اس گھر میں پولیس کا آنا معمولی بات تھی۔ میس کے قیام کے دوران میں وہاں کی پوری داستان سننے کی نوبت کبھی بار نہیں آئی۔ فضول کی بکواس کرنے کی عادت کے باوجود مجھے یہ لڑکا اچھا لگتا تھا۔ کمرے میں میرا ساتھی بھی یہی تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس

ہوتا تھا۔ کہ وہ عہدِ طفلی کے خوابوں کی دنیا سے باہر نہ نکلا تھا۔ وہ اپنی عمر کے ساتھ بڑھا نہ تھا۔ اور شاید کبھی نہ بڑھ سکے گا۔ اس کا بچوں جیسا معصوم جسم جس کے اندر انکساری اور دوسروں کی خاطر خود کو مٹا دینے کا جذبہ تھا۔ اسکی ان خصوصیات کو بزدلی سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ چھوٹا بن کر رہنا چاہتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا خوابوں اور عقیدت میں ہی اس کی زندگی کی حقیقت پوشیدہ ہو۔ اس نے ہمیشہ اوپر نظر اٹھا کر ہی انسان کو دیکھا تھا۔ نیچی نظروں سے کسی کو دیکھنا اس نے نہ سیکھا تھا۔

اس کے ساتھ تفصیلی گفتگو کر کے مجھے بڑا تعجب ہوا۔

اسکی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ وطن میں اسکی بیوہ ماں تھی کئی چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ بڑی امیدوں کے ساتھ تمام آسائشوں سے خود کو محروم کر کے اسکی ماں نے جس لڑکے کو پڑھنے کے لئے کلکتہ بھیجا تھا۔ وہ واپس گھر نہیں لوٹا۔ زندہ ہے یا مردہ، اسکی بھی کوئی خبر اس نے اپنی ماں کو نہیں بھجوائی۔

رِنے نے غمگین انداز سے مسکرا کر کہا۔ گھر پہ ماں فاقے کر رہی ہے اور یہاں میں ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ مذاق معلوم ہوتا ہے نہ روی دادا!

اس کے بعد وہ خود بخود کہتا گیا۔ لیکن سارے بنگال کی ماؤں کے بیٹے مر گئے ہیں روی دادا۔ ان کے غم میں میری ماں کا غم بھی شامل ہے۔

اتنا نازک مزاج اور جذباتی تھا رِنے۔

کسی دوسرے کے منہ سے سنتا تو شاید یہ باتیں مصنوعی معلوم ہوتیں۔ لیکن رِنے کے منہ سے سن کر کوئی غلط نہ معلوم ہوئی۔ رِنے کہتا گیا۔ اپنی قابلیت کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے روی دادا! ملک تو دور رہا اپنی ماں کا دکھ دور کرنے کی بھی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔ دنیا کے ناکارہ اور نااہل لوگوں میں میرا شمار ہوتا ہے، یہ میں جانتا ہوں لیکن زندگی کے کسی بنیادی مقصد میں اپنی نااہلیت ظاہر کر کے میں زندہ نہیں رہنا چاہتا روی دادا!

تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے پھر کہا۔ پروانے کو اگر جلنا ہی ہے تو اسے کم از کم یہ اطمینان تو ہو کہ وہ روشنی حاصل کرنے کی کوشش میں جلا ہے۔"

ہم دونوں لمحہ بھر خاموش بیٹھے رہے۔

کھڑکی کے باہر ویران نظروں سے دیکھتا ہوا وہ نے شاید اپنی اہمیت اور وجود کو شاعری کا رنگ دے کر دلکش بنا رہا تھا۔ ادھر میں یکایک اپنے دل کی تیز دھڑکن کا خیال کر کے شرمندہ ہو گیا پچھلے کتنی دنوں سے میرا تخیل جس مقصد کے حصول کے لئے چکر کاٹ رہا ہے۔ اسکا ٹھکانہ کہاں ہے۔ اس بات کو نہ چھپا نہ سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں شرمندہ ہی نہیں خوفزدہ بھی تھا۔

عورت کے بغیر زندگی کا خواب میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میری زندگی کو ناکامیابی کے راستے سے ہٹانے والی جس عورت کے پیکر کی میں نے اپنے ذہن میں تشکیل کی تھی۔ وہ مجھے زندگی میں ابھی تک نہ ملی تھی۔ سوچا تھا عورت پر کٹے ہوئے پرندے کی مانند میری آغوش میں آکر گر جائے گی۔ میری پناہ کی طلبگار ہوگی لیکن یہ خواب زندگی میں شاید پورے نہ ہوں گے۔

اچانک شمبھو کی بات سے میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب سے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ ہنستے ہنستے اور پھر سنجیدہ چہرہ بنا کر اس نے کہا۔

"مجھے بڑا اطمینان ہوا رِنے۔ ملک کے لئے اسی لگن کی ضرورت ہے۔ نیچے مکان مالک میس کا کرایہ لینے آیا ہے۔ کرایہ کے بدلے تمہارے رسوئیے مہاراج نے اسکی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا ہے۔ تم لوگوں کے اس میس کے جھگڑے سے آدھا کلکتہ پریشان ہے۔ لیکن تم لوگوں کے کان پر اگر جوں نہیں رینگتی تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

رِنے کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ شمبھو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ کہتا گیا۔ "ملک کی خدمت کے لئے جو لوگ آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کوئی تو صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں ہتھکڑی پہننے کے لئے! لیکن اس کے علاوہ کچھ دماغ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، یہ بات وہ لوگ نہیں جانتے۔

شمبھو کی تقریر جاری تھی کہ ایک گھنے اور الجھے بالوں والا میلا کچیلا لحیم شحیم لڑکا گھبرایا ہوا آکر بولا۔ دیکھو تو سہی رِنے تیرا

صندوق میں کیا ہے؟ جو کچھ ہے باہر نکال دے۔ آج اُس سالے کے سامنے سب روپے پھینک کر کل ہی یہ مکان چھوڑ دیں گے۔ جو کچھ بھی ہو تم نکال کر رکھو۔ ردی مہودا میں ابھی آتا ہوں"
اُس کے آخری الفاظ باہر سے سُنے گئے۔

پوچھ تاچھ کرکے جو کچھ معلوم ہُوا اُس میں مالک مکان کی زیادہ غلطی نظر نہ آئی۔ اُس کا شاید ۸ مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا۔ وہ کرایہ مانگنے آیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرایہ مانگتے ہوئے دیہاتی لڑکوں کے لئے اس کے منہ سے کوئی تلخ بات نکل گئی۔ یہ بے عزتی شاید اور سب برداشت کر سکتے تھے لیکن ہمارا سوئی برداشت نہ کر سکا۔ اسی وجہ سے جھگڑا شروع ہُوا۔

اخیر میں سب کا اثاثہ جمع کرکے جو کچھ اکٹھا ہُوا اس سے ۲ ماہ سے زیادہ کا کرایہ ادا نہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مالک مکان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اُسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ ہو رہا تھا۔

* * * * * *

دو مہینے کے کرایہ کے ساتھ مکان مالکوں کے لالچ کے بارے میں سو دو سو چیدہ چیدہ گالیاں دے کر سبحان اُسے رخصت کر آیا اور ہمارے کمرے میں گھس کر اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہُوا دھپ سے بیٹھ گیا اور بولا۔ آج تو ایکادشی ہے!"

دو چار دنوں کے اندر ہی میں نے مَیس کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تھا۔ صبح کا کھانا کھانے کے بعد کوئی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ شام کو کھانا بنے گا یا نہیں۔ اکٹھے دونوں وقت کے کھانے کا بھروسہ یہاں بہت کم لوگ کرتے تھے۔ اس لئے آج کھانا نہ بنے گا یہ جان کر کسی کو تعجب نہ ہُوا۔ پھر بھی ہم میں سے کئی کے چہرے لٹک گئے۔

معلوم ہوتا تھا آج مَیس کی مالی حالت دوسرے دنوں سے کچھ زیادہ خراب تھی۔ بنگالیوں کو اپنے کھانے پینے کی عادت بدلنی چاہیئے، پروٹین سے جسم کی طاقت بڑھتی ہے۔ ہندوستانیوں کی صحت کا منبع کیا ہے۔ ان سب باتوں کے بارے میں تقریر کرکے سبحان نے سب کو ستو کی آزمائش کرنے پر آمادہ کیا۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر سب نے آزمائش کی ضرور۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اس آزمائش سے بہت سے لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ صبح ستو کھانے کے بعد شام کو کھانے کی بات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی۔

مَیس کا انتظام سبحان کے ذمہ تھا۔ سخت سے سخت حالتیں میں بھی اُسے کبھی ہمت ہارتے نہ دیکھا تھا۔ آج اُسے بھی مایوس دیکھ کر سب کا دل بیٹھ گیا۔ سبحان نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا "غلطی ہی ہو گئی۔ کرایہ نہ دینا ہی بہتر تھا۔ اب تو سب کچھ بیچ دینے پر بھی ایک پائی نہ ملے گی" وِنے دروازے کی طرف منہ کرکے بیٹھا تھا۔ یکایک چونک کر بولا۔ لیکن یہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے۔ جہاراج نے چولہے میں آگ تو نہیں سلگائی ہے؟"

چولہے میں آگ! یہاں کا حال جہاراج سے پوشیدہ نہیں ہے تین سال سے وہ یہاں کام کر رہا ہے۔ اور تین سال کے اندر اُس کی ایک سال کی تنخواہ باقی ہے۔ ادا ہونے سے پہلے چولہا سلگانے کی طاقت تو وہ نہیں کر سکتا۔

لیکن رسوئی گھر سے دھواں اُٹھ رہا تھا تجسس کے مارے سب کے سب نیچے اتر پڑے۔ جہاراج نے جھجکتے ہوئے کہا کہ آج تنخواہ ملنے پر وہ مودی کی دکان سے کچھ دال چاول خرید لایا ہے۔

ہمارے یہاں کام کرنے کے علاوہ صبح شام سڑک کے نل سے پانی بھرنے کا کام کرکے جہاراج کو ماہ بماہ کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔

سبحان نے ناراض ہو کر کہا "یہ تمہاری بڑی بے انصافی ہے جہاراج۔ ہم تمہاری ایک سال کی تنخواہ تو دے نہیں سکے۔ اس کے باوجود۔۔۔۔۔۔"

شیجین نے اُسے روک کر کہا "خاموش رہو سبحان! انسان کی عظمت کو سیدھی طرح تسلیم کر لینا چاہیئے۔ تعریف کرکے اس کو مغرور بنانا گناہ ہے"

وِنے ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے کچھ جھنجھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا "ارے سُن! ردین منّو نے تجھے بلایا ہے۔ ایک بار ہو آنا" اور باہر جا کر ایک بار پھر چلّا کر کہا "بہت ضروری ہے یہ بات۔ اسی لئے آیا ہوں"

* * * * * *

منّو سے ملنے نہیں گیا، لیکن اس بات کو کسی طرح فراموش نہ کر سکا۔ ایک بار جا کر مل آتا، تو بات آسانی سے ختم ہو جاتی۔ بار بار یہ سوچ کر کہ میری یہ ضد ایک دھوکا ہے۔ دل میں بڑی کشمکش ہوتی پھر

لیکن اگر یہ آگ کا سلسلہ پھوٹ جاتا۔ مل کر مارے ہوئے سارا دن گھر میں بیٹھا رہا۔ یہ سوچتے ہیں کہ مکھن نے کیوں بلایا ہے کوئی نقصان نہ تھا۔ نقصان تو مہمان جانے میں تھا۔

اپنے دل کو میں نے اسی طرح بہلایا ہے۔

× × × × ×

تین دن کے بعد اچانک سویرے سویرے شمیمین پھر آموجود ہوا۔ سوچا منو کے ساتھ شہر میں نہیں گیا۔ اس کا طعنہ دینے آیا ہوگا۔ لیکن اس نے اس طرف اشارہ تک نہ کیا۔ اس سے اطمینان ہونا مناسب تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے مایوسی ہوئی۔

بستر پہ ایک کنارے بیٹھ کر شمیمین نے کہا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ تو اتنا بے شرم ہے بدی؟"

اُس کے اس مذاق کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ نہ سمجھ کر میں نے کچھ تعجب سے اسکی طرف دیکھا۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دھرمشالہ ہے یا لنگر؟ بیٹھا بیٹھا کب روٹی توڑتا رہے گا؟

"لیکن نقد حب الوطنی تو اب بھی مجھ میں موجود ہے شمیمین! تم نے تو کہا تھا کہ یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں!"

شمیمین کب دینے والا تھا۔ اُس نے کہا۔ لیکن اُسوقت یہ نہ معلوم تھا کہ میس مہاراج کے سہارے چلے گا۔

سبحان شاید باہر کھڑا تھا۔ شمیمین کی آواز سن کر اندر آ کر بولا "فضول کا ہمیں بدنام نہ کرو شمیمین دادا! آجکل ہم حسب دستور دلوا سکتے ہیں۔ ضرورت ہو تو مہینہ دو مہینہ ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو!"

"مہاراج دن میں تو نل چلاتا ہے۔ رات کو تمہارے لئے نقب لگاتا ہے کیا؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے شمیمین دادا، مہاراج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔"

شمیمین نے بڑے تعجب سے پوچھا "کیوں کیسے! اس میس کے اندر وہی تو سب سے بڑا محب الوطن تھا۔ تنخواہ نہ لے کر بھی اُس نے دو سال شوقیہ نوکری کی۔ یقین نہیں آتا۔ کہ وہی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔" کچھ دیر رک کر شمیمین نے پھر کہا۔ تم لوگ شاید اُس کی تنخواہ چکا دینا چاہتے تھے۔ شاید اس ہتک سے وہ جلا وطن ہونے پر مجبور ہوا!"

سب ہنس پڑے۔ ہنسی رکی تو دِنے نے کہا۔ نہیں شمیمین دادا مہاراج کے جانے سے واقعی بڑی پریشانی ہوگئی ہے۔ اس میس کے ہر آدمی کی اتنی خدمتگذاری اور کوئی نوکر نہ کرے گا۔ اور وہ گیا صرف سبحان کی غلطی سے۔"

سبحان نے تیز ہوکر کہا۔ "میری غلطی ہے؟"

اُسے جواب نہ دے کر دِنے نے اپنی بات جاری رکھی۔ اچانک اُس کی مذہبیت جاگ اٹھی۔ خالی میز پر کھانا نہ کھا کر نیچے کپڑا بچھانا شروع کیا۔ اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ سبحان سے مہاراج کو عقیدت تھی۔ ہم لوگ اسے مسلمان کہہ کر چڑاتے لیکن وہ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔ لیکن آخر میں انکا صبح شام نماز پڑھنا دیکھ کر اُسے شبہ ہوا۔ پھر بھی اسکا اعتقاد صرف سبحان کے اوپر تھا۔ ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے سبحان سے پوچھ ہی لیا۔ یہ شام سویرے آپ کیا کرتے ہیں بابو! تب بھی اگر سبحان بات ٹال دیتا تو کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن کم بخت نے پنڈت جی کے سر پر کھڑی اینٹ ماری: میں نماز پڑھتا ہوں۔ مسلمان جو ہوں۔ لیکن تب بھی مہاراج کو اس کی بات پہ یقین نہ آیا۔ اُن کے نزدیک سبحان کسی اوتار سے کم نہ تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کچھ جھجک کر کہا۔ آپ دل لگی کر رہے ہو بابو۔ لیکن سبحان بھی ایک ضدی ہے۔ وہ کب چھوڑنے والا تھا۔ اُن کو یقین دلا کر ہی دم لیا۔ . . ."

بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ کر سبحان نے کہا "اور تب شمیمین دادا تم نے اپنے محب الوطن کا غصہ دیکھا ہوتا۔ اُس نے ہماری جورو لڑکیوں کو کوس ڈالا۔ اتنے دنوں کی حب الوطنی مذہب کے سیلاب میں نہ جانے کہاں بہہ گئی۔

کچھ دیر خاموش رہ کر شمیمین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہندوؤں کی حب الوطنی کا ہمیشہ یہی حشر ہوا ہے۔"

ہم لوگ ہنس پڑے۔ دِنے نے کہا۔ "پوری بات کہنے دو سبحان۔ اُس کے بعد شمیمین دادا، مہاراج تو ناراض ہو کر چلا گیا ہم نے سوچا بیچارہ کفارہ ادا کر کے اپنے وطن لوٹ جائے گا۔

لیکن اس کے اگلے ہی دن وہ پھر آ موجود ہُوا۔ وہ سیدھا سبحان کے کمرے میں گیا۔ اور سبحان کے پاؤں پڑنے کے علاوہ اس نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ سبحان کی شدھی کر کے ہندو بنا لینا چاہتا تھا۔ اپنے گاؤں کے ایک مسلمان کو اس نے ہندو بنتے دیکھا تھا۔ اس نے کہا "اصل میں تو آپ ہندو ہیں بابو۔ سچے ہندو۔ ان کا یہ رہن سہن دیکھ کر ہی میں نے سمجھ لیا ہے۔ پچھلے جنم میں آپ کی چھوٹی سی خطا ہو گئی ہوگی۔ بس اسی لئے آپ کو ملیچھ کا جامہ پہننا پڑا۔ آپ کو شدھی کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔"

شمیم زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بولا "سارے مسائل کا اتنا بڑھیا حل! یہ آئیڈیا صرف مہاراج کے ذہن میں ہی آ سکتا ہے۔ تمہیں مہاراج کا ممنون ہونا چاہیئے سبحان!"

لیکن سبحان سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "یہ مذاق کی بات نہیں ہے شمیم دادا۔ تمہارے اس مہاراج کی تجویز سے مجھے واقعی ڈر محسوس ہوتا ہے جیسے کہ چولھے میں آگ سلگتے سلگتے وہ ایک دن سارے ملک میں آگ لگا دے گا۔ تم دیکھ لینا۔ یہ مہاراج عام ہندو کا مثالی نمونہ ہے اور شدھی تحریک ان کی ذہنیت کا آئینہ ہے۔ شدھی تحریک سے انسان پاک ہوتا ہے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی آزادی کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جائیں گے۔"

شمیم کچھ بے چین ہو گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بدلے نصرت نے جواب دیا۔ وہ سبحان کے ساتھ ایک ہی ضلع، ایک ہی گاؤں سے آیا تھا۔ دونوں میں جتنی گہری دوستی خیالات میں اتنا ہی اختلاف تھا۔ کسی نے کبھی ان دونوں کو ایک بات پر متفق ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

اختلاف ظاہر کرتے ہوئے نصرت نے کہا۔ "تمہارے اصول اور تمہاری دلیل میں سے کسی سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ مہاراج چند آدمیوں کو ہندو بنانے اور ہمارے دو چار مسلمانوں کو ہندو بنا لینے سے ملک تباہ ہو جانے کی دلیل میں نہیں مانتا۔"

سبحان نے جوش میں آ کر کہا "میں نے یہ تو نہیں کہا نصرت کہ صرف مسلمان کو ہندو بنانے سے ملک تباہ ہو جائیگا۔ تم لوگ کتنے بھی آدمیوں کو ہندو بناؤ۔ لیکن تمہارا مہاراج تو صرف ہندو بنانا نہیں چاہتا بلکہ وہ تو میری شدھی کرنا چاہتا ہے۔ ہم لوگ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے جاتے ہیں تو کہتے ہیں تمہارا مذہب خراب ہے ہمارا اچھا ہے۔ تم ہمارا مذہب اپناؤ۔ تم لوگ مذہب کی تبلیغ کے لئے کہتے ہو۔ تمہارا جسم گندہ ہے۔ تمہارا لمس ناپاک ہے۔ تمہیں پاک کریں گے۔ میرے چھونے سے تمہارا کھانا پینا خراب ہو جائے گا۔ چوکھٹ کے اندر قدم رکھنے سے تمہارا مندر ناپاک ہو جائےگا۔ ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ہم لوگ یہ توہین بہت دنوں سے برداشت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے مذہب کا پہلا سبق دیتے ہوئے بھی تم ناک سکوڑ کر کہو گے کہ تمہیں پہلے شدھ کرنا پڑیگا۔ اتنی بڑی توہین سے اگر ہمارا مذہب ہی نہیں بلکہ انسانیت بھی بغاوت کر بیٹھے تو اس میں تعجب کی بات نہ ہوگی۔"

وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ اسے روک کر سبحان نے پھر کہا۔ "آپس کے اس جھگڑے اور رنجش کا انجام یہ ہوگا کہ ہم لوگ مذہب کی دیوار اتنی اونچی اٹھا دیں گے کہ ہماری نظر اس میں الجھ کر رہ جائے گی۔ ملک ہمیں نظر تک نہ آئے گا۔ مجھے نظر آتا ہے کہ اس حالت پہ پہنچنے میں اب دیر نہیں ہے۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری تمہارے متعصب ہندوؤں پر ہے۔"

نصرت نے تالی بجا کر اور منہ چڑا کر کہا۔ "واہ مولوی صاحب کیا اچھے وار باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے پچھلے کئی دنوں سے بڑے زور شور سے کپڑا بچھا کر کھانے اور دھوتی کی لانگ کھول کر اٹھنے بیٹھنے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ اچھا میں یہ تو مانتا ہوں کہ شدھی کی تحریک سے ملک تباہ ہو جائے گا۔ لیکن ملک کو تباہی کے غار سے نکالنے کی کیا ترکیب ہے، ذرا یہ بتایئے!"

سبحان ہنس پڑا۔ نصرت کے سر پہ ایک چپت لگا کر بولا۔ "تیرے ساتھ اتنی دیر ناحق مغز پچی کی۔ لیکن اتنا کہے دیتا ہوں کہ ملک اگر کسی دن آزاد ہوا تو مسلمان ہو کر ہی ہوگا۔"

سب لوگ ہنس پڑے۔ شمیم نے کہا "تم نے کوئی غلط بات نہیں کی سبحان۔ اسلام کے مقابلہ میں باقی سارے مذہب ٹھنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ جذبات کو سرد کرنا ہی ان کا کام معلوم ہوتا ہے۔ صرف یہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو خون میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ اب مجھے

کہ پیدا ہوتے ہی اس نے دنیا کو سر کر ڈالا۔ کابل سے سپین تک سارے ملک ہلا ڈالے!

نصرت نے کہا۔ یو تو پڑھو ان کا بات سے شمیم دادا مسلمان ہونے سے پہلے اگر شادی ہو سکتی ہے تو آؤ ہم سب لوگ بیٹھ کر پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد آزاد ہونے پر پھر ہندو ہو جائیں گے۔ خواہ لوگ ہندو ہی رہیں۔"

سبحان کچھ جواب دینے والا تھا۔ لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی بات کا رُخ بدل دینے کی غرض سے شمیم نے کہا: "لیکن مس صاحبہ تو ـــــ ابھی تک کھلا ہی نہیں۔ میں ابھی تک یہ نہ سمجھ سکا کہ تمہارے مَیس کی حالت اچانک کیسے تبدیل ہو گئی؟"

"دادا یہ بھی نہیں جانتے! ہمارے گوپال بال نے شادی کی ہے! گوپال کو تو جانتے ہو گے۔ وہی جو کچھ دن بڑے جوش و خروش سے ملک کی فلاح و بہبود کی تحریک چلا رہا تھا۔ تم کہتے تھے اس کا اعتبار نہیں۔ لیکن وہ بھی بھیگی بلی ہے!" یہ کہہ کر سبحان منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

اسکو اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن اسکی شادی اور مَیس کی حالت تبدیل ہونے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ بہتیرا سوچنے پر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تعلق بھلا کیا ہوگا۔ شادی کی خوشی میں اس نے اپنے پرانے ساتھیوں کی امداد کے لئے تین سو روپیہ دے ڈالا۔"

شمیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ جھوٹ بات ہے شمیم دادا۔ نصرت اور سبحان دونوں نے سازش کر کے گوپال سے یہ روپیہ اینٹھا ہے۔ یہ یقیناً بلیک میل ہے۔ وہ بیچارہ کھدر چھوڑ کر خوشی خوشی اختیار کر کے ایک پولیس انسپکٹر کی اکلوتی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز سوچ رہا تھا اس لالچ میں کہ خاص رقم بھی ملے گی اور اچھی نوکری بھی۔ لیکن نصرت نے نہ معلوم کہاں سے یہ خبر سبحان کو دے دی۔ اس نے سنکر کہا، پھر تو ہم مَیس کی حالت ضرور بدل دیں گے۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے گوپال کو لکھا کہ یہ خط دیکھتے ہی اگر اس نے مَیس کے لئے تین سو روپے نہ بھیجے تو وہ اس کے ہونے والے سسر کو جا کر بتا دیں گے کہ وہ انقلابی پارٹی کا آدمی ہے۔ بلکہ اسے دیہاتی ڈاکوؤں کا سردار بتا کر کہے گا کہ پولیس کی گرفت سے باہر رہنے کی غرض سے گوپال یہ پیشہ کر رہا ہے۔ اس مَیس میں گوپال ایک سال گزار چکا ہے۔ اس بات کا ثبوت ملنے پر اس کے سسر کو ان کی بات میں شبہ نہ رہے گا۔ جب باتیں سبحان نے خط میں لکھ دیں حقیقتاً ڈر کی کوئی بات ہو یا نہ ہو لیکن خط ملنے کے تین دن کے اندر گوپال کا منی آرڈر پہنچ گیا۔

ہم سب لوگ ہنس پڑے۔ اس دوران سبحان اور نصرت نہ جانے کب چپکے سے کھسک گئے تھے۔

x x x x x

اگلے دن شمیم نے مجھے پھر پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ سویرے سویرے باہر نکلنا ہی پڑا۔ طے ہوا کہ اخبار فروخت کیا جائے۔ راستے بھر شمیم مجھے سمجھاتا رہا کہ اخبار فروخت کرنے سے ہم ایک دن بڑے آدمی بن جائیں گے۔

شمیم سے معلوم ہوا کہ کلکتہ کی شیئر مارکیٹ میں دلالی کرنے سے بڑھ کر اگر کوئی دھندہ ہے تو اخبار فروخت کرنا۔ شمیم چلتے چلتے کہہ رہا تھا، کلکتہ کی ایک سڑک کے ایک سرے سے شروع کر کے دیکھ لینا۔ ہم ایک دن سارے ملک میں اپنی دھاک بٹھا دیں گے۔ ہم لوگ اخبار کے آڑھتی بنیں گے۔ تو دیکھیگا کہ ایک دن ہمارے کارخانے میں بنگال کی ساری خبریں تیار ہوا کریں گی۔ ایک منٹ میں ہزار ہزار خبریں۔ رائٹر بھی تو ایک دن لندن کی سڑکوں پر اخبار فروخت کرتا تھا۔

میں نے ہنسکر اثبات میں سر ہلایا۔

"زیادہ تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ کام کرنے میں حرج بھی کیا ہے!"

میں نے کہا۔ اچھا تو تم یہ بتاؤ تمہاری کیا تمنا ہے۔ بڑا آدمی بننے کی یا خبریں تیار کرنے کی!"

شمیم نے کہا۔ "دونوں۔ بڑا آدمی اگر نہ بنا تو زندگی بیکار ہے۔ اور خبریں تیار نہ کر سکا تو ملک کے لئے کوئی امید نہیں کر سکوں گا۔"

میری طرف مخاطب ہو کر ہنس کر اُس نے پھر کہا۔ موجودہ دور کی سیاست اخبار کے سہارے ہی چلتی ہے۔ جن کے بس کا خبریں تیار کرنا نہیں وہ ملک کو بھلا کیا چلا سکیں گے۔ خبریں تیار کرنا یا انہیں توڑنا مروڑنا جو چاہے کر سکتے ہو!"

"پھر تو اخبار فروخت کرنے سے اخبار شائع کرنا بہتر ہوگا۔"

"آہستہ آہستہ!" شمیم نے ہنس کر قریب کی ایک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مستقبل کے بنگال کے اخبار نویسوں کے شینٹ ہوں کے عروج کا آغاز اس گلی سے ہوگا۔ چلو!"

x x x x x

گلی کے اندر ایک بڑا پرانا مکان ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے اوپر بنگالی اور انگریزی حروف میں ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ "بلے باک"! سائن بورڈ نیا تھا۔ اس کا نیاپن اور چمک دمک مکان کی بوسیدگی پر گویا طنز کر رہی تھی۔ لیکن اگر سائن بورڈ نہ بھی ہوتا تو بھی یہ سمجھنا دشوار نہ ہوتا کہ یہ کسی اخبار کا دفتر ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار فروش ابھی موجود تھے۔ سائیکلیں گلی میں قطار در قطار کھڑی تھیں۔ اندر سے اخبار کے بنڈل باہر آتے اور نہ جانے کدھر غائب ہو جاتے۔ پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک اخبار فروش سے پوچھا۔ "بیچنے کے لئے اخبار کس طرح ملے گا بھائی؟"

سائیکل کے اوپر اخبار کا بنڈل دبا کر وہ ہماری طرف ایسی چوکنی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا گویا ہم نے اس سے جنت کا دروازہ دکھانے کے لئے کہا ہو!

دوسرے آدمی نے تعجب کا اظہار تو نہیں کیا لیکن چھوٹے بڑے آدمی کا سوال اٹھا کر تفصیل سے سمجھایا کہ یہ کام شریف بنگالیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ ہم کسی دفتر میں نوکری کی تلاش کرتے۔ اس صلاح کے باوجود اس نے ہمیں بتایا کہ اخبار دینا نہ دینا ارجن سنگھ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہیں تو ایک بار اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔ حالانکہ اس بات کی امید کم ہے کہ اس سے بات کرنے پر بھی اخبار مل سکے گا یا نہیں۔ نئے لوگ تو درکنار پرانے اخبار فروشوں کو بھی جتنی تعداد وہ چاہتے ہیں نہیں ملتی۔

اس کے اس بیش قیمت مشورہ کو گانٹھ میں باندھ کر اور پیدل اور سائیکل والے اخبار فروشوں کو دھکیل کر ارجن سنگھ کی تلاش میں ہم اندر گھسنے ہی والے تھے کہ کسی نے پکارا۔ "ٹھہریئے بابو صاحب اندر جانے کا حکم نہیں ہے!"

یہ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اخبار کے دفتر پر بھی پہرہ ہوگا۔ دربان کے سامنے میں اپنا مقصد بیان کرنے والا تھا کہ شمیم نے اشارے سے مجھے روک کر کہا۔ "منیجر صاحب کے ساتھ ملاقات کرنا مانگتا!"

دربان اس بات سے بھی نہ دبا۔ بولا۔ "مطلب کہئے!"

آغاز میں ہی جہاں اتنی رکاوٹیں آئیں وہاں آخر میں کیا کام بنے گا اس بات کی مجھے نہ تھی۔ شمیم کو میں روکنے ہی والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس نے کاغذ پر لکھ دیا۔ "اشتہار دینے کے لئے ملنا چاہتے ہیں۔ ایجنٹ، پاپولر کیمیکل ورکس!"

دربان نے ایک چپراسی کو سلپ دے کر بھیج دیا۔ کچھ الگ ہٹ کر میں نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ پاپولر کیمیکل ورکس کہاں سے پیدا ہو گیا۔ اخبار بیچنے نکلے ہو۔ لیکن کیمیکل ورکس کے ایجنٹ کیسے بن گئے؟"

"اتنا بدھو نہ ہوتا تو ملک کی خدمت کرنے کیسے آتا۔ پاپولر کیمیکل ورکس ابھی ابھی تیار ہوا ہے!" کچھ دیر رک کر بولا۔ "یہ میرے دماغ کی پیداوار ہے۔ گدھے! اخبار کا منیجر ناٹ صاحب کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ لیکن اشتہار دینے والے کو نہیں لوٹا سکتا۔ سمجھا؟"

"لیکن اس کے بعد؟"

"ایک بار اندر گھس تو جائیں پھر دیکھا جائے گا!"

شمیم کا اندازہ غلط نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چپراسی نے آ کر کہا۔ "آپ لوگ منیجر صاحب سے ملاقات کر سکتے ہیں!"

چپراسی کو ہمیں راستہ دکھانے کے لئے چلنے پر آمادہ دیکھ کر شمیم نے کہا۔ "ٹھیرو تم اپنا کام دیکھو۔ ہم منیجر کا کمرہ جانتے ہیں۔ پہلے بھی ہم ایک بار آ چکے ہیں!"

نہ معلوم چپراسی نے کیا سمجھا۔ لیکن ہمارے جانے پر اس نے اعتراض نہ کیا۔ شمیم نے کہا۔ "پاپولر کیمیکل ورکس کا اشتہار اس بار بیکار نہیں جائے گا۔ چپراسی کی قسمت میں ڈانٹ کھانا لکھا ہے تو کھائے۔ خیر چھوڑو اسے، اب ارجن سنگھ کو تلاش کرنا ضروری ہے!"

اب میں نے چاروں طرف سے دیکھا۔ مکان پرانا ہوتے ہوئے بھی چمک رہا تھا۔ اس کے کشادہ صحن میں ٹین کے کچھ سائبان ڈال کر چھاپہ خانہ قائم کیا گیا تھا۔ جس شیڈ کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ اس میں چھت تک بڑے بڑے پیپوں کی طرح نیوز ریل کے بنڈل کے بنڈل لگے ہوئے تھے۔ اس کے برابر کے شیڈ سے سیسہ گلانے کی بو آ رہی تھی۔

لکڑی کی ایک تختی کے اوپر ایک آدمی کچھ ٹائپ کے حروف رکھے

ایک طرف سے دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ شمیم نے اس سے پوچھا "ارجن سنگھ کہاں ہیں؟"

اس آدمی نے لاپرواہی سے نیچے تک ہمارا جائزہ لیا اور بولا "ارجن سنگھ سے کیا کام ہے جناب جی۔ پریس میں کام کرنا چاہتے ہو تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ آنند بابو کو پکڑیے۔ کام تو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟ پہلے کبھی اخبار میں کام کیا ہے؟"

"پہلے کبھی کام نہیں کیا۔" ہمارے کہنے سے پہلے ہی تاڑ گیا اور بولا۔ "پھر تو کام نہیں بنیگا صاحب۔ اس فلیٹ مشین کا کام صرف ٹھیک کرنے سے نہیں ہوتا۔ بالکل مشین کی طرح ہاتھ چلانا پڑتا ہے۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو بس ہندوستانی! خود سنگھ جی پکڑ لیجے یا کسی اور کو۔ کیسے نہ جھکا۔" ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آدمی مشین کی طرح ہاتھ تو نہیں البتہ پیر چلاتا ہوا شیڈ کے باہر نکل گیا۔ ارجن سنگھ کا پتہ بتانے کی غالباً اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

آخر ارجن سنگھ نظر آئے۔ وہ ایک شیڈ کے پاس چارپائی ڈالے ننگے جسم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ہندوستانی نوجوان ان کی مالش کر رہے تھے۔ اور ان کا دیوہیکل جسم تیل مالش سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ شمیم نے باقاعدہ سلام کر کے کہا "سلام سنگھ صاحب۔ طبیعت اچھی ہے؟"

ارجن سنگھ نے بھویں سکوڑ کر ہماری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بولے "پہچانا نہیں آپ کو؟"

"کیسے پہچانیں گے بھلا۔ سنگھ صاحب۔ پہلے کبھی آپ سے ملنے کا شرف کبھی تو حاصل نہیں ہوا۔"

نہ جانے کیا سوچ کر سنگھ صاحب نے بنگالی میں کہا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"چاہتے کچھ نہیں سنگھ صاحب سنا ہے آپ کے سب اخبار فروش ایک سے ایک بڑھ کر کاہل الوجود ہیں۔ بازار میں اخبار کھپا نہیں پاتے۔ آپ دو اچھے اخبار فروشوں کی تلاش میں ہیں۔ یہ سن کر ہم یہاں حاضر ہوئے ہیں۔"

پوری بات کا مطلب سمجھے بغیر سنگھ صاحب بگڑ کر بولے۔ "کون کہتا ہے ہمارا اخبار بازار میں نہیں کھپتا؟ کون کہتا ہے؟ کون...!"

اور پھر اپنا غصہ دبا کر بولے۔ "جاؤ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے سنگھ صاحب۔ آج اگر ضرورت نہیں ہے تو ضرورت پیدا ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔ آج نہ خدا نہ کرے۔ آپ کے دو اخبار فروش گاڑی کے نیچے دب کر مر سکتے ہیں۔ ایسے آدمی مل سکتے ہیں تو انہیں ہاتھ میں رکھنا سب سے اچھا ہے۔ ہم لوگ کل ہی آ کر اخبار لے جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میں اپنی بڑی ہنسی کو اس بار نہ روک سکا۔ لیکن سنگھ صاحب نے غصہ ہو کر کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ ہم تمہیں اخبار نہیں دیں گے۔ جاؤ پریشان مت کرو۔"

شمیم ابھی تک چارپائی پر ایک کنارے بڑے آرام سے جما ہوا تھا۔ اب اٹھ کر بولا۔ "پھر تو مجبوری ہے سنگھ صاحب۔ اچھا چلیں پھر آئیں گے۔ لیکن ہماری بات بھولنے کا نہیں۔ ممکن ہوا تو پھر کسی دن آ کر آپ کی طبیعت کا حال چال پوچھ جائیں گے۔"

جواب میں سنگھ صاحب نے نہ جانے کیا کہا۔ کچھ صاف نہ سنائی دیا۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

میں باہر کی طرف جا رہا تھا کہ شمیم نے روک کر کہا۔ "جب یہاں آئے ہیں تو کیوں نہ گھوم کر ایک بار اس مکان کو دیکھ لیا جائے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم یہاں کس لئے آئے۔ اس طرح بات کرنے سے کہیں کام بنتا ہے؟"

"ضمیر کی آواز کیسے کہتی ہے، جانتا ہے؟ میں تو ابھی ہار گیا۔ اس لئے اس بار میں نے ضمیر کے زہریلے دانتوں کو توڑ دینے کا انتظام کیا ہے۔ پڑے پڑے جب بیکار زندگی نہ کٹے گی اور جب میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیجے گا۔ تب دل کی پریشانی دور کرنے کی ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔ کام تو نہیں ملا لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کام حاصل کرنے کی ہم نے کوشش بھی نہیں کی۔"

خیر شمیم کو اپنے ضمیر کو زیادہ دھوکا دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ ادھر ادھر کچھ دیر گھوم کر ہم دوسری منزل سے نیچے اتر رہے تھے کہ ایک صاحب ایڈیٹر کے کمرے سے سپرنگ والے دروازے کو دھکیل کر نکلے اور بولے "آپ لوگ کیا صداقت کی آواز سے آئے ہیں۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی شمیم بول اٹھا۔ "جی ہاں۔"

"اچھا تو اندر آئیے۔ مسٹر سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اندر جاتے جاتے آفس صاحب نے سوال کیا۔ "لیکن آپ کے یہاں سے تو ایک اور آدمی کے آنے کی بات تھی۔"

شمیم نے جھٹ جواب دیا۔ "جی ہاں تھی تو سہی لیکن معلوم ہوتا ہے وہ نہ آسکے گا۔"

شمیم کی باتوں میں میں نے ابتک کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ لیکن اب مجبور ہو کر میں نے اس کے کان میں کہا۔ "اس بار تم حد سے تجاوز کر رہے ہو شمیم۔ اسکا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔" شمیم نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دفتر مسٹر سرکار کون ہیں۔ "صداقت کی آواز" سے کون آنے والا تھا۔ اور وہاں سے مسٹر سرکار کو کیا غرض ہے۔ اس نے بلا سوچے سمجھے زبردستی مجھے بھی اس خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات سوچ سوچ کر مجھے شمیم کے اوپر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ نہ معلوم معاملہ کیا شکل اختیار کر لے۔ لیکن شمیم کو دیکھا تو وہ بالکل بے فکر تھا۔ فکر یا تردد کی کوئی بھی علامت اس کے چہرے پہ نہ تھی۔

مسٹر سرکار میز پہ بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ منہ اٹھا کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ "میں بہت دیر سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کو تو اس سے پہلے آنا تھا؟"

"جی ہاں! کچھ دیر ہو گئی۔" شمیم نے جواب دیا۔

"ہمیں پروف ریڈروں کی سخت ضرورت آ پڑی ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو آج سے ہی کام شروع کرنا ہوگا۔"

"جی آج سے تو نہیں البتہ کل سے آجائیں گے۔"

"اور آپ کا تیسرا آدمی کہاں ہے؟"

شمیم کے چہرے پہ شکن تک نہ آئی۔ اس نے یقینی لہجہ میں کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ وہ نہ آسکیں گے۔"

مسٹر سرکار نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ خیر اس وقت دو آدمیوں سے بھی کام چل جائے گا۔ لیکن ابھی تھوڑے دن آپ لوگوں کو رات کو کام کرنا ہوگا۔"

"ہم لوگ کریں گے، لیکن . . . . ."

مسٹر سرکار نے کہا۔ "ہاں میں نے طے کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں سے زیادہ تنخواہ ملے گی۔ اور آپ لوگوں کا اپائنٹمنٹ لیٹر (پروانۂ تقرری) آج منیجر صاحب دستخط کر کے تیار رکھیں گے۔ آپ کو کل مل جائے گا۔"

"اچھا اچھا ہمیں اسکی فکر نہیں ہے۔ اچھا تو ہم لوگ چلیں۔" شمیم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں تو آپ کل ہی رات کو آئیں گے۔ رات کو وہیں بیٹھئے۔ سعید بابو انہیں پروف ریڈروں کا کمرہ دکھا دیجئے۔"

مسٹر سرکار پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جن صاحب نے ہمیں بلایا تھا وہی ہمیں کمرہ دکھا کر چلے گئے۔ شمیم نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا۔ اخبار کی فروخت پہ مجھے زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ اخبار فروشی سے مصنف بننے کا امکان زندگی میں بہت کم ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "لیکن یہ بات کیا ہے شمیم۔ تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟"

"ابھی تو نہیں ہوا۔ لیکن کچھ دن پروف ریڈنگ کرنے پر ہو جائے گا۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔ دماغ کا زیادہ اچھا ہونا بھی پریشانی کی بات ہے۔ تھوڑا سا فتور آجائے تو کیا حرج ہے؟"

زینے سے نیچے اترتے ہوئے ہی بولا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں شمیم۔ کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ دوسرے آدمیوں کی جگہ ہم کام کر سکیں گے؟"

شمیم میری بات کا کچھ جواب دینے والا تھا کہ یکایک مجھے چھوڑ کر دھم دھم کرتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نیچے تین اشخاص زینے کے نزدیک اوپر چڑھنے میں ہچکچا رہے تھے۔ شمیم سیدھا ان کے پاس جا کر بولا۔ "آپ لوگ کیا صداقت کی آواز سے آرہے ہیں؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "جی ہاں؟"

"اوہ۔ آپ لوگوں نے تو بڑی دیر کر دی۔ مسٹر سرکار آپ لوگوں کا انتظار کر کے ابھی گئے ہیں۔"

تینوں آدمیوں کے چہروں پہ مایوسی کا سایہ پڑتے دیکھ کر واقعی بڑا افسوس ہوا۔

شمیم نے کہا۔ "کل اس وقت آپ لوگ ایک بار پھر آ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں پروف ریڈروں کی جو فوری ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر اس سے پہلے ہی آدمی لے لئے جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آپ لوگ بہت دیر کر کے آئے۔"

ایک آدمی نے مایوسی کے لہجے میں کہا: "پھر کیا طریقہ ہے۔ کچھ بتا سکتے ہیں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر تینوں باہر کی طرف چل دئیے۔ شتپین نے کہا۔ "آپ لوگوں نے صداقت کی آواز بالکل چھوڑ دی ہے کیا؟"

"نہیں بالکل تو نہیں چھوڑی۔ لیکن اگر یہاں بات بن جاتی تو ضرور چھوڑ دیتے۔"

تب اچانک شتپین نے بڑے جوش سے کہا۔ "تب تو بڑا اچھا طریقہ ہے صاحب۔"

تینوں نے ہم زبان ہو کر کہا۔ "کیا؟"

"صداقت کی آواز نہ چھوڑئیے" شتپین نے اپنی آواز ذرا بھاری بنا کر کہا۔ "ذرا یہ تو بتائیے کس وجہ سے یہاں آئے ہیں۔ میں دس سال سے پروف ریڈری کر رہا ہوں صاحب۔ لیکن یہاں سے نکل سکوں تو سمجھوں جان بچی۔ اور آپ لوگ ہیں کہ بڑی آرزو رکھتے ہیں یہاں آنے کی۔ حالانکہ ہمیں یہ باتیں کہنا سب نہیں ہے"

اپنے متجسس سامعین کے سوال کے جواب میں شتپین نے پھر کہا۔ "میری بات مانیں تو صاحب صداقت کی آواز بھول کر بھی نہ چھوڑئیے۔ وہاں ماہ بماہ تنخواہ تو مل جاتی ہے۔"

"یہاں بھی تو سنا ہے تنخواہ باقاعدگی سے ملتی ہے۔"

شتپین نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے جب آپ نے سن لیا تو ہمارے کہنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں آپ یہاں کام کرتے ہیں۔ آپ یہاں کا حال زیادہ جانتے ہیں۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔"

شتپین نے یکایک اپنا لہجہ بہت دھیما کر کے آہستہ آہستہ کہا: "پھر تو صاحب ایسی بیوقوفی بھول کر بھی نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ آخر میں پچھتانا پڑے گا۔ آپ لوگوں کو یہ مشورہ دینے میں ہماری کوئی غرض نہیں۔ آپ ہماری ملازمت تو چھین نہیں رہے۔ ہم لوگ چونکہ خود بھگت رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اب بھی اگر آپ کا دل چاہے تو کل مسٹر سرکار سے گفتگو کر کے دیکھ لیں۔"

لیکن جس طرح وہ لوگ لوٹ گئے۔ اسے دیکھ کر ذرا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں دوبارہ آنے کی خواہش باقی رہ گئی ہے شتپین نے میری طرف دیکھ کر ہنس کر کہا: "چلو دل میں ایک وسوسہ تھا وہ بھی دور ہوا۔ کسی کی روزی مارنے کا سوال نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر لیا ہوتا تب بھی تمہیں اعتراض نہ ہوتا۔"

شتپین نے حیرانی سے کچھ دیر میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اعتراض ہونا مناسب بھی نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے شتپین نے کہا۔ "اتنی بڑھیا خبر منو کو نہیں سناؤ گے؟ چلو!"

نہ جانے اس دن انکار نہ کر سکا۔ اصل تو یہ کہ شتپین سے اس بات پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ یہ خبر زیادہ بڑھیا نہیں ہے دوسرے منو کو یہ خبر سنانے کی خواہش کو دبانے کے لئے خود کو سمجھانے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس دن یہ سب باتیں فضول معلوم ہوئیں۔ ممکن ہے یہ میری کمزوری ہو۔ زندگی بھر کوشش کر کے اصولِ زندگی جو ڈھال تیار کی ہو۔ اس میں اگر بہت بڑا سوراخ نکل آئے تو اس کی وجہ سے خود کو لعنت ملامت کرنے کی خواہش نہ تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی کوئی خوف محسوس نہ ہوا کہ شتپین کی صحبت سے شاید میرے اندر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

چلتے چلتے شتپین نے یکایک کہا۔ "تیرے گاؤں میں کمنا نام کی لڑکی ہے نا؟"

حیران ہو کر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں تو نہیں جانتا!"

شتپین نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "ارے کملا سہی اس کا نام شاید دینا ہے۔ نہیں دیوا ہے یا سیوا ہے۔ نام مجھے یاد تھوڑا ہی رکھا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ایسی تو نہ جانے کتنی ہیں۔"

"کتنی نہیں میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ جو کانوں میں کرن پھول پہنتی ہے۔ ماتھے پر بندی۔ پاؤں میں آلتا۔ اوڑھنا آلتا نہیں اگر میں کس کر باندھی ہوئی نیلا مبری دھوتی۔ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی ہے۔ درختوں کے اوپر چڑھ کر چڑیوں کے بچے پکڑتی ہے۔ غصہ میں آکر اس نے ایک دن تیرے ہاتھ میں کاٹ کھایا تھا۔ اور جس دن تو آیا تھا اس دن رو کر بولی تھی۔ "روی دادا میں بھی چل جاؤں گی۔" کیوں ہے نہ ایسی ایک لڑکی؟"

"نہیں، یاد نہیں آتا۔"

"اوہ پھر تو غلطی ہو گئی۔ پاؤں میں اس کے آلتا ہی ہوگا۔

شرم کے مارے سامنے نہیں آتی۔ آتی ہے تو سر نیچا کئے رہتی ہے۔ پیچھے پھرنے پر مڑ کر چہرے کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن آنکھیں چار ہونے پر شرم سے سرخ ہو کر نظریں جھکا لیتی ہے۔ بات کرتی ہے تو گویا گلا جکڑ جاتا ہے۔"

شمیم نہ جانے اور کیا کہنے والا تھا۔ میں نے اُسے روک کر کہا۔ "بات کچھ بھی نہیں شمیم دادا!"

"نہ سہی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تو نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

"اچانک یہ سوال کیوں کیا؟"

"ایسے ہی پوچھ لیا۔ بتا نہ۔ کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اسکا جواب دینا آسان نہیں ہے شمیم دادا۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کچھ دیر میری طرف دیکھا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے تجھے یہ گھن لگ چکا ہے۔"

حیران ہو کر میں نے پوچھا۔ "اسکا مطلب؟"

"اسکا مطلب یہ کہ اگر آنکھ نہ لڑتی تو تیرے دل میں کوئی بات اس طرح نہ اُلجھتی۔" میری کمر پہ ہاتھ مار کر شمیم نے پھر کہا۔ "ہماری عدم تعاون کی تحریک نہ سہی۔ دل کو جانتے ہو نہ! وہ ہوتا تو صرف ایک بات کہتا۔ لیکن ہمارے دل کو تو بات کا جواب دینا مشکل ہو رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد دوسری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بالکل ایک نئی بات کہی۔ "یہ لڑکی منو بڑی عجیب ہے۔ ہے نہ؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "میری نسبت تم زیادہ جانتے ہو۔"

شمیم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ہاں شاید زیادہ ہی جانتا ہوں۔"

x x x x

منو کے گھر جس وقت پہنچے، دوپہر ہو چکی تھی۔ صبح سے گھومتے گھومتے کچھ کچھ تھک گیا تھا۔ اس غریب کنبے کی مہمان نوازی کا خیال آتے ہی کچھ خوشی سی ہوئی۔ گھر کے اندر داخل ہونے میں جو جھجک محسوس ہو رہی تھی وہ منو کی خاطر تواضع کے خیال سے جلد دور ہو گئی۔ کنڈی کھڑکانے کے تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو تعجب سے دیکھا کہ جس شخص نے دروازہ کھولا وہ ہمارے لئے قطعی ناآشنا تھا۔ ہماری طرف حیرانی سے دیکھ کر کسی قدر بے اعتنائی سے اُس نے کہا۔ "کس سے ملنا چاہتے ہیں صاحب؟" شمیم نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو کسی خاص آدمی سے نہیں ملنا۔ لیکن اندر جانے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

اُس آدمی نے جھنجلا کر کہا۔ "آپ لوگ کون ہیں جناب؟" وہ جس ڈھنگ سے دروازہ روکے کھڑا تھا۔ اُس سے ہمیں آسانی سے اندر جانے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اخبار کے دفتر میں ایک پاسبان نے روکا تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ منو کے گھر میں داخل ہونے میں بھی رکاوٹ پیش ہوگی۔ شمیم نے کہا۔ "دروازے پہ کھڑے کھڑے اپنا پورا تعارف دینا مناسب نہ ہوگا۔ چلئے اندر چل کر آپ کے تجسس کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے ہماری بات سمجھی یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن گرم ہو کر بولا۔ "کس سے ملنا چاہتے ہیں آپ، بتا نہیں سکتے؟ دروازے پہ کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ عجیب آدمی ہیں آپ!"

شمیم نے ہنس کر کہا۔ "پولیس کمشنر کا سرٹیفکیٹ کہیں گم ہو گیا ہے۔ ورنہ ابھی ثابت کر دیتے کہ چوری، جوا، ڈکیتی، رہزنی سبھی الزاموں سے ہم لوگ بری ہیں اور بالکل شریف آدمی ہیں۔ لیکن آپ کے سوال کا کہ کس سے ملنا چاہتے ہیں، ابھی جواب نہ دے سکیں گے۔"

شمیم کی تقریر کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہتا۔ اور نہ جانے اسکا کیا انجام ہوتا۔ دروازے پر کھڑا کھڑا میں اُسکی بکواس سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا۔ کہ اسی وقت منو نے آ کر سارا جھگڑا ختم کر دیا۔ دروازے کے سامنے آ کر اُس نے کہا۔ "آؤ!"

اس بار اُس شخص نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا اور بولا۔ "انہیں جانتی ہو کیا؟ تبھی یہ لوگ یہ بتانے میں ہچکچا رہے تھے کہ انہیں کس سے ملنا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ چھوڑ دیا اور حقارت آمیز طنزیہ ڈھنگ سے مسکرایا۔ سارا ماحول اسکی بات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دل میں کچھ عجیب پریشانی کا احساس ہو رہا تھا۔

شمیم نے گھر میں داخل ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے گا صاحب! بدقسمتی سے آپ کا تعارف حاصل نہ ہوا۔ آپ کی تعریف؟"

اُس نے خشک ہنسی ہنس کر کہا۔ "صاحب، تعارف بھلا کیا دوں۔ آپ کی طرح کسی اور کو ان سے اس لئے تکلف سے ملنے آتے نہیں دیکھا۔

رشتہ تم تو میری بھابی لگتی ہو" اس کے طنز سے میں کانپ گیا۔ لیکن شمیمن نے اسی طرح ہنس کر کہا "اتنی دور کا رشتہ! کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر قریبی رشتہ ہوتا تو شاید ابھی تین سال تک آپ کا نیاز حاصل نہ ہوتا۔" اس بار اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے اندر چلا گیا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ منو بھی نہ جانے کب چپ چاپ اندر چلی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس گھر میں قیام کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ شمیمن کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے کہا "میں اب جاتا ہوں شمیمن!"

شمیمن نے کہا "جانے کو تو سبھی۔ تیرا اس جگہ پر ہو رہی تو ہے نہیں۔ لیکن پھر بھی کھا پی کر جانا" اس کے بعد منو کو پکارا۔ "منورما دلہن، درشن دے گی کیا!"

منو نے دروازے پر آکر کہا۔ "کیا بات ہے؟"

آج میں نے منو کو غور سے دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ منو کو میں نے کبھی اداس تو درکنار سنجیدہ بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن آج میں نے حیرانی سے دیکھا اس کے چہرے پر درد و کرب اور بغاوت کا ایسا انقلابی سایہ تھا۔ کہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ امید تھی کہ وہ مجھے پیار اور احترام سے پکارے گی۔ لیکن اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ میں اتنے دنوں بعد اس کے گھر آیا ہوں۔ لیکن اس قسم کے کسی بھی جذبے سے اسکا چہرہ قطعی عاری تھا۔ یہ بات شمیمن نے بھی محسوس کی۔ بوجھل ماحول کو کچھ ہلکا بنانے کی غرض سے اس نے کہا۔ "حالانکہ ہمارا درجہ دروداشا رشتی سے بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی تو ہم معاف نہ کریں گے منورما بیوی۔ یاد رکھنا۔ جاؤ جلد تین آدمیوں کے لئے آپ تندولی دھوپ میں خشک کیا ہوا چاول، اور کیلے کا ساگ پکانے کا انتظام کرو۔ اس دفعہ کی مردم شماری میں رودین کی "دو" میں گنتی ہوئی ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ غلط بات نہیں ہے"

منورما کے چہرے پر کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔ اطمینان سے اس نے کہا۔ "نہیں اب لیکن دیکھنے کی گنجائش نہیں شمیمن دادا۔ میری ساس کی حالت خراب ہے۔ میرا دلور یہ خبر لے کر آیا ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا"

"زندگی میں جسکو دیکھنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی اسے بستر مرگ پر دیکھنے کی ایسی کیا ضرورت آ پڑی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی منو"

"سمجھنے کی کوشش جب میں نے ہی نہیں کی۔ تو تم کیوں کرتے ہو شمیمن دادا۔ اس بار میں نے طے کر لیا ہے۔ ضرور جاؤں گی"

شمیمن نے یکایک جوش میں آکر کہا۔ "نہیں تم نہیں جاسکتیں منو۔ تمہارے اوپر ان کا کوئی حق نہیں۔ تم اس بات کو اتنی جلدی کیوں بھول گئیں؟"

"بھولی نہیں ہوں تبھی تو جا رہی ہوں"

شمیمن نے بے صبر ہو کر کہا۔ "مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ نہ بناؤ منو میں تمہیں اس طرح اپنا خون نہ کرنے دوں گا"

"ور سنئے دو جان" سب نے چونک کر دیکھا۔ منو کا دلور دہلیز پر کھڑا تھا۔ بڑی زہریلی ہنسی ہنس کر بولا۔ "تمہارے جانے کی ضرورت نہیں رہی بھابی۔ ان کی مرضی کے خلاف تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ساس کو بیمار رہنے دو۔ تمہارے نہ جانے سے کوئی فرق نہ پڑے گا" کچھ رک کر ہم سب کی طرف دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔ "تمہارے پرائیویٹ گفتگو میں دخل انداز ہو کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا"

"واقعی اچھا نہیں کیا۔ کچھ دیر اگر آڑ میں کھڑے رہتے تو اور بہت سی باتیں سنتے۔ جلد بازی کر کے آپ نے بڑا سنہری موقعہ گنوا دیا" شمیمن نے کہا۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ بغیر سنے ہی جو کچھ سمجھ لیا ہے۔ وہی کافی ہے۔ میں چلا بھابی۔ ماں اکیلی مرجائے تو اچھا ہے۔ اسکے ساتھ تمہارا خون نہ ہونا چاہیئے۔ واپس پہنچکر اگر ماں زندہ ملی تو مرنے سے پہلے اس سے تمہیں آشیرواد دینے کے لئے کہوں گا"

وہ جانے لگا تو منو نے اسے روک کر کہا۔ "ٹھیرو لالہ میرے کپڑے لتے ابھی نہیں بندھے"

شمیمن اور میں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ شخص تذبذب میں پڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "اسکا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔ مجھے لینے آئے ہو تو لے کر ہی جانا"

منو کا دلور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ منو نے اسے روک کر کہا۔

"اگر تم نہیں لے جاؤ گے تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی"

منو کے جانے تک کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ گاڑی کے آنے پر منو کا دلیپ سامان رکھ کر، گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ منو کی ماں نے روتے روتے آکر لڑکی کو گاڑی میں بٹھایا۔ آخر میں جب شمیمن سے نہیں رہا گیا تو اس نے ایک بار صرف اتنا کہا "تم نے غلطی کی ہے منو!"

منو نے کچھ مسکرا کر کہا۔ "اتنے دنوں میں میں نے یہ بات سمجھ لی ہے شمیمن دادا۔ میرے لئے غلطی کرنا نہ کرنا برابر ہے"
اس کے بعد گاڑی روانہ ہونے پر یکایک میری طرف مڑ کر بولی۔ "اچھا، تو میں چلتی ہوں۔ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو۔" اور اگلے ہی لمحہ اپنے پرانے انداز میں ہنس کر بولی۔ "تمہیں ایک دن دل بھر کر چھیڑنے اور چڑانے کی حسرت ہی رہ گئی۔"

میں ہنسنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ کہہ نہ سکا۔

× × × × ×

گاڑی چلی گئی۔ نہ جانے ہم کب تک اسے ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھتے رہے۔ منو کے جانے کے بعد لمحہ بھر کے اندر زندگی میں اتنی بے کیفی اور بیزاری آسکتی ہے۔ ہم نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اس لڑکی کو میں کافی پہچان چکا ہوں۔ اس کے ساتھ کافی دنوں کا تعارف ہے۔ اور ایک دن گہرے تعلقات کا جو دھاگا ہم دونوں کے درمیان بندھنے لگا تھا۔ میں نے اسے بھی قبول کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ اسے توڑ دیا تھا۔ پھر آج یکایک میرا دل ویران کیوں ہو گیا! میری ساری قوتیں مجھ پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی دلیل اور تدبیر سے قطع نظر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی میرا دل ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔

اچانک شمیمن کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہ بھی منہ لٹکائے نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اس طرح مستغرق دیکھ کر اس نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔ یہ خیال کر کے مجھے کچھ جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے آواز دی "شمیمن!"

پہلے چونک کر پھر اگلے لمحے ہنس کر اس نے کہا۔ "ہاں، بھوک مجھے بھی لگی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "میں بھوک کی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

شمیمن نے کہا "بھوک ہی نہیں، چاہ بھی لگ رہی ہے منو چلی گئی، ہماری بلا سے۔ لیکن ہمیں بھوکا چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ اچھا نہیں ہوا دوست!"

شمیمن کا مذاق کچھ پھیکا محسوس ہوا۔ اس کی آواز بھی بے سُری لگی۔ اس کی ہنسی میں بھی وہ بات نہ تھی۔ میں نے کہا "اب کیا کرو گے؟"

"اب یہ پتہ لگاؤں گا کہ کھانا اور کچھ ناداں کہاں ملے گا؟ اس کے بعد کچھ دیر آرام کرنے میں بھی اعتراض نہ ہوگا۔"

"تب چلو۔ اپنے میس چلیں۔"

شمیمن نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ کھانا، ناداں اور آرام تینوں بیک وقت ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی وہاں آرام کے بارے میں بے فکری ہو جاتی ہے۔"

× × × × ×

میس میں جا کر دیکھا، وہاں نقشہ ہی الٹا تھا۔ سارے میس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف اژدہام تھا۔ ان کا حلیہ اور لباس اور سلوک دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ کلکتہ کی بجائے کسی دوسری دنیا کا ثواب لوٹنے آئے ہیں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا۔ کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ رونے کسی کام سے کالی گھاٹ گیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو پنڈوں کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر یہاں پناہ دی تھی۔ رونے کی سخاوت سے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ اوپر نیچے جدھر بھی نظر پڑی۔ میں نے دیکھا کوئی نہ کوئی چولہا سلگ رہا تھا۔ اور گیلی لکڑیوں سے اتنا دھواں نکل رہا تھا کہ سارا گھر دھوئیں سے بھر رہا تھا۔ آنکھوں سے کچھ دیکھنا اور سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

سب ملا کر پانچ خاندان تھے۔ چھوٹے بڑے سمیت ہر عمر کے مرد عورتوں کی گنتی لگ بھگ تیس تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی پچھلے تعارف کے بغیر ان تیرتھ یاتریوں نے سارے مکان پر قبضہ جما لیا تھا۔

سبحان پریشانی سے چاروں طرف دیکھتا ہوا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے سبحان! اس بھیڑ میں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

سبحان نے فکرانہ انداز سے کہا "میرا ایک مگدر نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔ کچھ معلوم ہے؟ ایک ہی مگدر نظر آتا ہے۔ دوسرا کہاں ہے؟"

شمیم نے کہا۔ "اس موضوع پر میں کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں۔ بےفکر رہو تمہارے مگدر نے بڑے نیک کام میں اپنی جان گنوائی ہے!"

سبحان بولا۔ "مذاق چھوڑو شمیم دادا۔ کل ہی مگدروں کی نئی جوڑی خرید کر لایا تھا!"

شمیم نے کہا۔ "اسکی کمسن زندگی کام آئی صبح میں ان حضرت کو دیکھ رہے ہو جو انگوچھے سے اپنے تیل میں ڈوبے ہوئے جسم سے پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا کہ انہوں نے ایندھن کی کمی کلہاڑی سے ایک مگدر چیر کر پوری کی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ تمہارا ہی مگدر ہو!"

سبحان کا چہرہ دیکھ کر آسانی سے کہا جاسکتا تھا کہ اسے اس خبر سے کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔

تبھی دیکھا کہ ونے پر بازار سے خریدا ہوا سامان لادے لئے پریشان حال ایک شخص کے پیچھے میس میں داخل ہوا۔ سبحان نے اسے پکڑ کر کہا "کیا معاملہ ہے ونے؟"

"چھوڑو مجھے فرصت نہیں ہے!"

لیکن سبحان اسے کب چھوڑنے والا تھا۔ بولا "معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ان ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں میرا ایک مگدر کام آگیا ہے۔ وہ تمہیں جمع کر دینا ہوگا، سمجھے!"

ونے نے تعجب سے کہا۔ "ناکارہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں مگدر کام آگیا؟ کیا مطلب؟"

شمیم نے مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ ہم لوگوں نے مگدر کی وفات حسرت آیات پر سبحان سے اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن ونے نے بڑے اطمینان سے کہا "ارے تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے!"

سبحان نے چڑ کر کہا "ہاں وہ تمہارے لئے ہے!"

نصرت نہ جانے کہاں تھا۔ ابھی تک اسے نہ دیکھا تھا۔ یکایک اس نے آکر کہا "چڑتے کیوں ہو سبحان۔ کسی دن تم اپنے حاجیوں کو بلاکر کھلا پلا دینا۔ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

جواب میں سبحان کوئی سخت بات کہنے والا تھا۔ شمیم نے اسے روک کر کہا۔ "اچھا تم لوگ اپنا یہ "دھرم یدھ" اور "جہاد" بند کرو۔ پہلے ونے کی اس بھیڑ کا تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔"

لیکن تب تک ونے سبحان سے چھٹکارا حاصل کرکے بازار سے لائے ہوئے سامان سمیت غائب ہو چکا تھا۔ تعارف حاصل کرنے کے لئے خود کوشش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

شمیم نے کہا۔ "تمہارے مگدر کو جن حضرت نے ٹھکانے لگایا ہے معلوم ہوتا ہے وہی اس عوامی قافلے کے سردار ہیں۔ دوسروں کی ملکیت تقسیم کرنے کا ان کا ایک اصول معین ہے۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں بھی وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ انہی سے گفتگو شروع کی جائے!"

اس وقت وہ حضرت پسینہ پونچھ کر اسی انگوچھے سے ایک بہت بڑی ہانڈی چولہے سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شمیم نے آگے بڑھ کر کہا "گوسائیں جی پرنام۔ کھانے دانے میں کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو؟"

ہانڈی اتار کر گھبراہٹ اور عجلت میں گوسائیں جی نے پرنام کا جواب دے کر کہا۔ "جی بالکل نہیں۔ آپ لوگوں اور گورو کی کرپا سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" اس کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر لے جاتے ہوئے عقیدت مندانہ انداز سے بولے "اور تکلیف ہو بھی کیسے۔ گورو اپنے بھگت کا بندوبست خود کر لیتے ہیں۔ صحرا ہو یا جنگل دو مٹھی پرشاد تو کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتا ہے۔"

نصرت نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن آپ کو معلوم ہے جنگل میں جتنی آسانی سے مل جاتا ہے، صحرا میں اتنی آسانی سے تھوڑا ہی مل سکتا ہے۔ جنگل کی تو بات ہی الگ ہے۔"

نصرت کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی احمقوں کی طرح اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش رہ گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اپنے دیوہیکل جسم میں کپکپی پیدا کرتے ہوئے وحشیانہ قہقہے سے ساری عمارت کو سر پہ اٹھاتے ہوئے بولے "اس میں کیا شک ہے بابو صاحب۔ گورو کے لئے صحرا اور جنگل سب برابر ہیں۔ ان کے لئے بھی کہیں کون و مکان کی قید ہو سکتی ہے!"

شمیم کا انہیں گوسائیں جی کہہ کر پکارنا کسی طرح موزوں نہ تھا۔

گلے میں تین لڑیوں کی موٹی مالا بھی اور پیشانی پر تلک لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سویرے کالی گھاٹ پر گنگا اشنان کیا ہوگا۔ پسینے سے تر جسم کو بار بار انگوچھے سے پونچھنے کے باوجود "سیتا رام سیتا رام" کا چھاپہ ابھی تک نہ مٹا تھا۔ بات چیت اور رنگ ڈھنگ سے انکساری ٹپکتی تھی۔

شسپین نے کہا: "میں نے کہا اگر کسی چیز کی کمی ہو تو بتا دیجئے گا۔ چولہے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہو تو کہئے۔ ایک گدڑ ابھی باقی ہے۔"

"گدڑ؟" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا اور پھر ہیں ہیں کرکے ہنس پڑے۔ بولے۔ "ہم تو فقیر ذات ہیں۔ گدڑ لے کر بھلا کیا کریں گے؟"

"اچھا اچھا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا ردین آج کا دن گوسائیں جی کے پرشاد پر گذارا جائے۔ کیا خیال ہے؟"

گوسائیں جی نے کہا۔ "ہماری خوش نصیبی ہوگی۔"

"ضرور ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ ہمارے اندر بھی تو خالی ہیں گوسائیں جی۔ ہم کسی کی بات ٹال نہیں سکتے۔ بیٹھو ردین۔ بیٹھ جاؤ شسپین دادا۔ سبحان اعتراض نہ ہو تو تو بھی بیٹھ جا۔ یہاں چھوت چھات بالکل نہیں ہے۔ سمجھ لے!"

گوسائیں جی کے چہرے کی طرف دیکھ کر رحم آتا تھا۔ بولے "آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ دو چار آدمیوں کے لئے اندازہ سے کھانا بنایا ہے۔"

گوسائیں جی کو کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر شرت نے فوراً کہا۔ "کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تکلیف بھلا کاہے کی! اس طرح پرشاد بانٹنے میں ہی انہیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کیوں گوسائیں جی؟"

گوسائیں جی نے غمگین انداز سے کہا۔ "جی ہاں۔ یہی بات ہے۔ اچھا تو ایک ہانڈی اور چڑھا دوں؟"

شسپین نے کہا۔ "خوب دیکھ بھال کر چڑھائیے گا۔ ہمارے کئی آدمی ابھی پہنچنے والے ہیں۔"

گوسائیں جی کے چہرے سے بچی کھچی ہنسی بھی کافور ہوگئی۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اور کتنے آدمی آئیں گے؟"

"یہی بارہ تیرہ آدمی ہوں گے۔" یہ کہہ کر شرت نے آواز دی "ارے ودنے ذرا ادھر آنا!"

ہمارا انداز دیکھ کر ودنے کو بات سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ بولا: "یہ تم لوگوں کی زیادتی ہے شرت۔ مہاجنوں کے اوپر ظلم!"

شرت نے فوراً کہا۔ "ظلم کیسا؟ اس دفعہ سبحان کا دوسرا گدڑ بھی کام آجائے گا!"

سبحان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا: "اگر اس سے بھی کام نہ بنا تو تیری چوکی اٹھا کر لے آؤں گا!"

شرت نے اس انداز سے کہا۔ "ٹھہرئیے آپ۔ لیکن ٹھہرئیے پہلے اس کا ٹھکانہ بتا دوں۔ کل پیسوں کی قلت کی وجہ سے میں اسے ایک دکان پر بیچ آیا تھا!"

سارے دن کی دوڑ دھوپ اور فاقے کے بعد نہایت شاندار دعوت ہوئی۔ کچھ بھی ہو۔ میں نے دیکھا گوسائیں جی کھانا پکانے میں طاق تھے۔

شرت نے کہا۔ "کچھ بھی کہو۔ بیچارہ بڑا آدمی ہے۔ بالکل گائے۔ بے ضرر!"

شسپین نے ودنے کی کمر ٹھوک کر کہا۔ "تمہارا مہاجنی قافلہ زندہ باد ودنے! صبح سے جیسی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہوئی تھیں ان سے تو امید نہ تھی کہ آج نوالہ منہ میں جائے گا!"

سبحان نے کہا۔ "ودنے کے مہبود میں میرا ایک گدڑ بھی شامل ہے شسپین دادا۔ یہ نہ بھولو!"

"گدڑ کے بغیر کوئی بھی مہبود خوبی سے نہیں چل سکتا سبحان۔"

ودنے نے جھلا کر کہا۔ "تمہارا یہ ہنسی مذاق مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا شسپین دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے تمہارے دل میں حقارت کا جذبہ ہے۔ اور درحقیقت ہمارا ملک انہی لوگوں پر مشتمل . . . !"

ودنے کی تقریر پوری نہ ہوسکی۔ اچانک نیچے صحن سے اتنا شور اٹھا کہ اسے برداشت کرکے بیٹھا رہنا دشوار ہوگیا۔ مجبور ہوکر ہم سب یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا بات ہے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر آکر پہلے تو شور و غل میں کچھ سننا مشکل ہوگیا۔ تیرتھ یاتریوں کے گروہ میں سبھی مرد عورتوں کی زبانیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

بلکہ میں کہیں تو کچھ بھی سمجھ نہ سکے۔ البتہ اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ اس بدمزگی نے صفت گوسائیں جی کے اوپر ہی اس جھگڑے کی بنیاد رکھی۔ گنڈے کا انگوچھا انہوں نے کس کر کمر پر باندھ لیا تھا۔ کمر کی لنگی کی ایک لانگ نہ معلوم کیسے ٹوٹ گئی تھی سرخ آنکھیں اور بھاری بازوؤں کے بار بار خم ٹھونکنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ گوسائیں جی مذہبی معاملات میں خواہ کچھ بھی ہوں۔ لیکن کشتی کے فن میں طاق ہیں۔ انکی یہ بدلی ہوئی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

دوسرے فریق کے چوہدری کی حیثیت سے جو شخص بحث کر رہا تھا اس کے زور بازو پر کچھ زیادہ اعتماد نہ ہوتا تھا۔ دبلا استخوانی چہرہ تھا اور پسلیاں جسم سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ لیکن جسمانی طاقت کی کمی وہ اپنے گلے سے پوری کر رہا تھا۔ اس کی زبان جتنی تیزی سے چل رہی تھی آواز بھی اتنی ہی بلند تھی۔

کچھ دیر اس لڑائی کا نظارہ کرنے کے بعد شمیم نے کہا "بھئی اس جنگ عظیم میں تیسری طاقت کی دخل اندازی کی ضرورت ہے"

بڑی مشکل سے بپھرے ہوئے دونوں فریقوں کی باتوں سے جوڑ توڑ کر اتنا سمجھ میں آیا کہ ہمارے گوسائیں جی کی رہنمائی میں، انکے گاؤں اور قریب کے گاؤں کے دس خاندان تیرتھ یاترا کے لئے نکلے تھے۔ کالی گھاٹ پر کالی دیوی کے مندر اور اسکے ساتھ کلکتہ کا عجائب گھر، چڑیا گھر، پرلیش ناتھ کا باغیچہ اور دوسرے قابل دید مقامات دکھانے کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی۔ ہر یاتری نے اُن پر اعتبار کر کے انہیں کچھ نقد روپیہ بھی سونپا تھا۔ اس وقت ان روپیوں پر ہی جھگڑا ہو رہا تھا۔ گوسائیں جی صرف کالی گھاٹ دکھا کر خاموش ہو گئے اور اب گاؤں واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن روپیہ لوٹانے کا نام نہ لیتے تھے۔ صرف یہی نہیں کالی گھاٹ پر پنڈوں کے گھر ٹھہرنے میں کرایہ کی رقم میں جو بچت ہوئی تھی اسکو واپس کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔

آخر میں گوسائیں جی ان سب باتوں سے عاجز آ کر بولے۔ "جاؤ! جاؤ میں روپیہ واپس نہیں کروں گا۔ جو ہو سکے کر لو۔ پنڈوں کے گھر ٹھہر کر کرایہ میں جو بچت ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اپنی دانشمندی سے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ پھر میں یہ روپیہ کیوں واپس کروں۔ بتاؤ؟"

ونے پر گویا سکتہ طاری تھا۔ نصرت نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ "ونے بات سنو!" دبلے پتلے شخص نے تیز ہو کر کہا۔ "اچھا کرائے کا روپیہ تو خرچ ہی ہوتا، تم نے رکھ لیا تو خیر۔ لیکن عجائب گھر اور چڑیا گھر دکھانے کے لئے جو روپے لئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

گوسائیں جی نے اُسے پوری بات نہ کہنے دی بولے۔ "جتنت جتنا کتنا روپیہ دیا تھا تم نے۔ عجائب گھر اور چڑیا گھر مفت تھوڑا ہی دکھائے جاتے ہیں؟"

اس کے بعد ان روپیوں پر جو شرمناک ہنگامہ شروع ہوا اور عورتوں اور بچوں کے سامنے ایک دوسرے کے لئے جس زبان کا استعمال کیا گیا اُسے دیکھکر خاموش رہنا دشوار ہو گیا۔

شمیم کی دخل اندازی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جھگڑا ختم کرنے کی کوشش میں ونے کی جس طرح بے عزتی ہوئی۔ اس سے مشتعل ہو کر لڑنے کے لئے کمر کستے ہوئے نصرت نے کہا۔ "نہیں شمیم اور زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ ٹھہرو میں ان بدمعاشوں کو دھکا دیکر باہر نکال آتا ہوں۔"

لیکن یہ لوگ صرف دھکے کھا کر نکلنے والے نہ تھے۔ گوسائیں جی نے کہا۔ "کیوں بے بنجو۔ کہتے ہیں خوب جانتا ہوں۔ نندپال کی دونوں بھتیجیوں کو تو یہاں کس لئے لایا ہے۔ بتا دوں؟ کہدوں سب کے سامنے؟ تو مجھ سے روپیہ لے گا! اس سے پہلے میں تجھے جیل بھجوا دوں گا۔ جانتا ہے؟"

بنجو کہنے نے بھی جان پر کھیل کر کہنا شروع کیا "تجھے جیل بھیجکر تو بچ جائے گا بدمعاش! تو نے خود پچاس روپے اس کے لئے پیشگی نہیں لئے؟"

سبحان اور نصرت اس بار واقعی غصے سے آگ بگولہ ہو کر انہیں مارنے دوڑے کہ شمیم نے کہا۔ "صرف مارنے پیٹنے سے اس جھگڑے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا سبحان۔ اتنی بات سننے کے بعد ہم خاموش کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔"

"مجھے بھی شمیم کی بات کی تائید کرنی پڑی۔ تیرتھ یاتریوں کے اس گروہ میں نندپال کی بھتیجیاں کونسی ہیں۔ یہ جاننے کی کوشش میں تھے۔ ان کے سلسلے میں جو ذلیل سازش ہو رہی تھی۔ اُسے معلوم کر کے خاموش نہیں رہا جا سکتا تھا۔

خسرت نے گوسائیں جی کے پکتے کے مانند پھولے ہوئے گال پہ ایک زوردار طمانچہ لگا کر کہا: "چپ رہ بدمعاش۔ بتا اس گروہ میں سندپال کی بھتیجیاں کونسی ہیں؟"

ایک ہی لمحہ میں گوسائیں جی کا برتاؤ، چہرے کا انداز، گفتگو سب کچھ بدل گیا۔ ایک بار سامنے دیکھ کر ہماری طاقت کا کچھ اندازہ کر کے اچانک نرم پڑ کر ملائمیت سے بولے۔ "مار بیٹے مجھے آپ لوگ پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ بے ادبی کر کے دو ہاتھ بھی مار سکتے ہیں!"

سبحان نے کہا۔ "بہانے مت تراشو۔ سندپال کی دونوں بھتیجیاں کہاں ہیں، جلدی دکھاؤ۔ ورنہ ہڈی پسلی باقی نہ بچے گی۔ سمجھ لے!"

سارے جسم میں کپکپی پیدا کر کے ایک زوردار قہقہہ لگا کر گوسائیں جی بولے، "آپ لوگ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لڑائی جھگڑے میں تو نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ آپ ان باتوں کو صحیح سمجھ بیٹھے سندپال کی بھتیجیاں بھلا یہاں کہاں؟ وہ تو اپنے گاؤں میں ہیں کیوں لبھو؟"

آفت آتی دیکھ کر لبھو نے اب تک خود کو اچھی طرح سنبھال لیا تھا، ہنس کر بولا۔ "جھگڑے میں ہمارے منہ سے نہ جانے کتنی باتیں نکل جاتی ہیں۔ سبھی پر اعتبار تھوڑا ہی کیا جاتا ہے۔"

سبحان نے اس کے گال پر بھی ایک طمانچہ جڑ کر کہا: "خبردار جھوٹ بولا تو پولیس میں دیدوں گا۔"

آسانی سے کامیابی ہوتے نہ دیکھ کر گوسائیں جی نے اس بار بات کا رخ پلٹ کر کہا: "پولیس میں کیوں دیں گے۔ ہم نے رہزنی کی ہے؟ دیکھتا ہوں۔ کون دیتا ہے پولیس میں۔ میں جتنی شرافت سے پیش آتا ہوں۔ اتنا ہی ظلم کرتے ہیں۔ واہ!"

خسرت نے سنجیدگی سے کہا: "تمہیں پولیس میں تو نہ دیں گے گوسائیں جی۔ یہیں بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیں گے۔ جانتے نہیں ہم سب دیہاتی لڑکے ہیں۔ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں!"

خسرت کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن نہ معلوم گوسائیں جی کا چہرہ کیوں فق ہو گیا۔ شاید دیہاتی لڑکوں کے بارے میں وہ اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ایک بار آخری کوشش کرنے کی غرض سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولے: "میں۔۔۔ لیکن۔۔۔ ارے لبھو۔ بولو نہ بھائی ہم بھلا سندپال کی بھتیجیوں کو کیا جانیں!"

لیکن انہیں زیادہ بتانے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ سفید موتی پہنے گھونگھٹ نکالے دو لڑکیاں آگے آ کر روہانسی آواز میں کہا: "سنو بابا۔ ہمیں گھر پہنچا دو۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے!"

ہم سب سکتے میں آ گئے۔ کچھ دیر تک کسی کے منہ سے بات نہ نکلی۔ گوسائیں جی اور ان کے ساتھیوں کو اتنا ڈرا تھے دھمکاتے وقت یہ نہ سوچا تھا۔ کہ یہ لوگ اتنے کمینے بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ لڑکیاں ابھی اپنے وطن میں ہوں۔ انہیں یہاں لانے کی شاید ان ڈھونگیوں کی ہمت نہ ہوئی ہو۔ لیکن اپنی آنکھوں سے انہیں اپنے سامنے موجود دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

گوسائیں جی کچھ دیر تو شش و پنج میں پڑے رہے پھر اچانک دونوں لڑکیوں کے سامنے جا کر ہاتھ پیر چلاتے ہوئے انہیں مارنے کو آمادہ ہو کر بولے "لڑکیوں۔ ای بدذات لڑکیو! تم ابھی رہو ہو دونوں۔ تمہاری شامت تو نہیں آئی!" اور پھر ناک بھوں سکوڑ کر بولے: "ذرا پھر کہنا کہ ہمیں گھر پہنچا دو! ہم تمہارے نام میں یا جسم!"

انہیں ہاتھ پیر چلاتے دیکھ کر لڑکیاں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئیں۔ سبحان اور خسرت نے دھکا دے کر گوسائیں جی کو پیچھے دھکیل دیا۔ "خبردار جو آنکھیں نکالیں۔ کچومر نکال دیں گے۔" اس کے بعد دونوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: "بہنو تمہارا گھر کہاں ہے؟"

ان لڑکیوں نے ڈرتے جھجکتے جس گاؤں کا نام بتایا۔ اس سے میں ناآشنا تھا۔ وہ لڑکیاں بھی گاؤں کے ضلع اور گھر کے مفصل پتے سے ناواقف تھیں۔ بھولی بھالی لڑکیاں دوسرے یاتریوں کے ساتھ اعتبار کر کے تیرتھ یاترا کے لئے چلی آئی تھیں۔ اس بات کا تو انہیں گمان بھی نہ تھا۔ کہ ان کے ساتھ کوئی سازش بھی کی جا سکتی ہے۔ میں نے سوچا ان لڑکیوں کو کتنا بھی ڈرایا دھمکایا جائے۔ صحیح بات کا علم نہ ہو سکے گا۔ ان کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ نکالنا ہو گا۔

سبحان نے کہا: "پولیس کے سپرد کر دوں ان ٹھگوں کو؟"

شمیم نے ہنس کر کہا: "ہاں تاکہ ان لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے تم بھلا اور کیا کرو گے؟"

لیکن سوال درپیش تھا کہ کیا کیا جائے!

بڑی پریشانی آن پڑی تھی۔ یاتریوں کے قافلہ میں مرد دو چار ہی تھے

لیکن انہوں نے صرف اپنا گروہ بنایا تھا۔ وہ لوگ جیتی کے ۔۔ شتے کر سکتے تھے کہ کلکتہ کے چند دا لیڈر پہو کرے ان کے گاؤں کے وہ آدمیوں کو دبالیں۔ اُن سے کوئی بات پتہ لگانا مشکل تھا عورتیں جتنی بھی تھیں سب ان پڑھ۔ اُن کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ ریل پر چڑھ کر کالی گھاٹ آئی ہیں۔ گاؤں کے نام کے علاوہ نہیں زیادہ کچھ نہ معلوم تھا۔

باہم دونوں لڑکیوں کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے۔ ان عیاروں کے چنگل سے انہیں چھڑانا مشکل نظر آتا تھا۔ پولیس کے سپروائزر نے میں یہ اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ان دونوں لڑکیوں کو بھی پریشان ہونا پڑے گا۔ موقع دیکھ کر گوسائیں جی نے کہا: ”ہمیں فضول کیوں حیران کر رہے ہیں۔ آپ لوگ رئیسوں کے لڑکے ہیں۔ آپ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔“

سبحان نے ڈپٹ کر انہیں خاموش کیا اور کہا ”شمیم دادا۔ نظر آتا ہے کہ انکی مرمت کئے بغیر سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا۔“ شمیم نے سر ہلا کر اسے منع کیا۔ اور پھر اچانک نہ جانے کیا سوچ کر گوسائیں جی کے ساتھ والے شخص کو بلا کر اسے ساتھ لے کر چلا گیا۔

بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ گوسائیں جی پہلے تو گھبرائے لیکن پھر آہستہ آہستہ خوش ہو گئے۔ مار کھانے کا اندیشہ دور ہو تا دیکھ کر ہی شاید وہ خوش ہوئے تھے۔

دونوں لڑکیوں سے کافی پوچھ تاچھ کرنے پر بھی ہمیں اس بات کا پتہ نہ چل سکا۔ کہ ان دونوں کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔ دونوں ہی دو ودھوا تھیں۔ اپنی جائیداد ہونے کے باوجود وہ چچا کے گھر رہتی تھیں۔ چچا کئی بار جائیداد اپنے نام کرانے کی کوشش کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئی تھیں۔ اس وقت انکے دل میں یہ شبہ تھا کہ شاید اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے چچا نے انہیں تیرتھ یاترا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن تیرتھ یاترا کی خوشی میں اُن لوگوں نے یہ بات سوچنے کی کوشش نہ کی تھی کہ اتنا معلوم کرنے کے بعد بھی انکے خلاف کی گئی سازش کی حقیقت نہ سمجھ سکا۔

گوسائیں جی دونوں لڑکیوں کی کہانی سنتے ہوئے بڑے بیہودہ انداز سے قہقہہ دیتے رہے۔ ”اتنے دن مجھے گود میں کھلایا اور آج میں تیرا دشمن ہو گیا۔ اور یہ اجنبی لڑکے یگانے ہو گئے۔ ہائے رے کلجگ! آج سے کان پکڑتا ہوں کبھی کسی کی بھلائی کی کوشش نہ کروں گا۔ میں نے سوچا بیچاری لڑکیاں گھر سے نہیں نکلتیں۔ میرے ساتھ کچھ تیرتھ یاترا کر لیں تو کیا حرج ہے، اور انہیں دیکھو تو مجھے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔“

نصرت اور سبحان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ نصرت نے کہا ”شمیم دادا نہ معلوم کہاں گئے۔ ہمیشہ دماغ کی طاقت سے کام نہیں چلتا۔ ڈنڈے بازو بھی کبھی کبھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شمیم دادا یہ بات نہیں سمجھتے۔“

لیکن شمیم کو زیادہ دیر نہ لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مسکراتا ہوا لوٹ آیا۔ سب نے پوچھا۔ ”اس شخص کو کہاں چھوڑ آئے؟“

شمیم نے کہا۔ ”اسے اُسکے گناہوں سے نجات دلا دی۔ اسے ایک نئے مذہب کا سبق دے کر آ رہا ہوں۔ اب تک وہ گیروے کپڑے پہن کر ہمارا پیغام پھیلانے نکل گیا ہو گا۔“

اس بات کا مطلب نہ سمجھ کر گوسائیں جی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”ایں۔ بتو! بھاگ گیا؟“

”بھاگ کر کہاں جائے گا گوسائیں جی۔ آپ لوگوں کی حقیر سازش کا راز افشا کرنے کے بعد اس کے اندر آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس لئے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔“

اب تو گوسائیں جی کے چہرے کا رنگ دیکھنے لائق تھا۔ بڑے غمگین انداز سے لیکن ہمت کر کے انہوں نے کہا۔ ”اچھی بات ہے بیٹا مجھے پھنسوا کر دیکھوں گا، بھلا کہاں جائے گا۔ میں ڈوبوں گا تو سب کو لے ڈوبوں گا۔ نند پال کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔“

شمیم نے سنجیدگی سے کہا ”چھوڑنا مناسب بھی نہیں ہے گوسائیں جی!“

”اور کیا میں نے روپیہ کھایا ہے تو اس حرامزادے نے نہیں کھایا! اور نند پال نے جائداد کے لالچ میں ہمیں جو رشوت دی وہ بھلا کیسے چھپ سکتی ہے۔“

شمیم نے اسی سنجیدگی سے کہا ”خود سے دیکھا جائے تو اصلی بدمعاش نند پال ہے مانا کہ دیوتا جیسی پوتر زندگی میں ایک لمحہ

کے لئے ناپاک کی نیّد میں بہہ کر آپ پھسل گئے اور آپ سے ایک معمولی سی غلطی سرزد ہو گئی۔ لیکن . . . . !

گوسائیں جی نے بھونچکے ہو کر دیکھتے ہوئے کہا "جی ؟"

مَیں نے کہا مانا کہ آپ نے کچھ روپے لئے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ کیا تو نہیں۔ ان لڑکیوں کو تباہ کرنے کی سکیم تو نندپال کے دماغ میں ہی آئی ہے۔ ساری بدمعاشی کی جڑ تو وہ ہے۔"

اندھیرے میں پھر کچھ روشنی ملنے پر گوسائیں جی نے کہا "بتایئے آپ ہی بتایئے نہ۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے۔ کہ میں نے روپیہ لیا ہے۔ اور حقیقت میں نے ابھی تک ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔"

شمیمن نے کہا۔ بے شک آپ کے خلاف کوئی الزام نہیں لگ سکتا۔ بشرطیکہ آپ ساری بات سچ سچ بتا دیں۔ لیکن اس سالے نندپال کو چھوڑنا مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے ؟

گوسائیں جی نے اور خوش ہو کر کہا "جی اور کیا ہُوا ؟"

شمیمن نے کہا "اُسے اگر سزا نہ ملی تو دنیا سے انصاف اُٹھ جائے گا۔"

"جی ہاں"

شمیمن نے گوسائیں جی کے کان کے نزدیک جا کر کچھ سرگوشی کی۔ "مصیبت آئے گی تو نندپال کی آئے گی۔ اُس نے آپ لوگوں سے کیا کہا تھا ؟"

گوسائیں جی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ بشنو ہی تھا"

"یہ کیا ہم لوگ جانتے نہیں ! لیکن پھر بھی آپ نے بات تو سنی ہے"

گوسائیں جی نے بڑے غمگین انداز سے کہا "جی سُنا تو ضرور ہے لیکن بڑی گندی بات ہے کیا کہوں !"

شمیمن نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "پھر بھی"

گوسائیں جی نے کہا "یہ نندپال بھی شیطان کا باپ ہے۔ اس کا بس چلتا تو دونوں لڑکیوں کو زہر دے دیتا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں بعد میں کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں لڑکیوں کو کالی دیوی کا مندر دکھانے کے بہانے کلکتہ بھیج کر وہاں کسی طرح چھوڑ آیا جائے۔"

"اس کے بعد !"

"اس کے بعد کیا ؟ گاؤں لوٹنے پر پتہ چلا [illegible] گھر سے نکل گئی ہیں۔ واپس لوٹنے پر ان کی نیک چلنی پر [illegible] کون انہیں اپنے گھر میں رکھتا۔ ایک ہی داؤ میں [illegible] نندپال کے قبضہ میں ہوتی"

شمیمن نے کہا "اچھا آپ لوگوں کا گاؤں . . . ؟"

گوسائیں جی نے بے خوفی سے گاؤں کا پتہ بتا دیا۔

اس کے بعد شمیمن کو بلا وجہ ہنستے دیکھ کر سب کو بڑا تعجب ہُوا۔ اُس نے ہنس کر کہا "ارے نصرت تمہارے بشنو عرف بخو فیقور بابو کو اب تنہائی کی قید ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو گی۔ اپنے کمرے کی چٹخنی کھول کر اُسے باہر لے آؤ۔"

"اس کا مطلب ہے بشنو گیا نہیں !" گوسائیں جی نے تعجب سے کہا۔

شمیمن نے کہا "نہیں۔ لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں وہ کوئی بات بتانے پر راضی نہ ہُوا۔ تو مَیں نے اُسے نہ جانے دیا"

"تو بشنو نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔"

جی ہاں مَیں نے دیکھا اس کا عہد آپ کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اس لئے مجھے آپ سے بات اُگلوانے میں تھوڑی سی چال چلنی پڑی۔ آپ اس کے لئے کچھ بھی کہیں لیکن میری درخواست ہے کہ اس کا بُرا نہ مانیں۔"

گوسائیں جی کا چہرہ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس وقت غصّہ آ رہا تھا۔ یا تعجب۔

شمیمن نے ہم سب کی طرف مڑ کر کہا۔ "ہم لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو ان دونوں لڑکیوں کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری لینی ہو گی۔ گوسائیں جی ٹھہرے بے چارے جاہل۔ اس واقعہ کے بعد بھی نندپال کی رشوت آسانی سے ہضم کرنا ان کے لئے دشوار ہو گا۔ چنانچہ ان دونوں لڑکیوں کو ان کے ساتھ بھیجنے کی ہمت نہیں ہوتی"

سبحان نے کہا "مَیں جاتا ہوں"

شمیمن نے سر ہلا کر کہا۔ "او جھوئے! زمانہ نازک ہے۔ جاؤ گے عورت ذات کی حفاظت کرنے کے لئے۔ لیکن اُلٹے اغوا کے الزام میں پکڑے جاؤ گے۔"

اُسی وقت نصرت بشنو کو قید سے آزاد کر کے آ گیا۔ یہ طے ہُوا کہ

بھی وہ نوبیاہتا لڑکیوں کو اُن کے گاؤں پہنچا کر ان کا سلسلہ بندوبست کر کے واپس آ جائے گا۔"

"پھر گسائیں جی اور ان کے گروہ کے بارے میں بحث ہونے لگی۔ ونے نے کہا۔ "اب انہیں زیادہ دیر تک پکڑ کر رکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ شمیم والوں ... انہیں چھوڑ ہی دیا جائے۔"

لیکن سبحان اور نصرت اس پر راضی نہ تھے۔

نصرت نے کہا۔ "ہم انہیں کچھ سزا دیئے بغیر نہ جانے دیں گے۔"

ونے نے کچھ گرم ہو کر کہا۔ "سزا دینے کا اختیار صرف ہم کو ہی ہے؟"

سبحان نے ونے کی کمر پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اختیار ہو یا نہ ہو دیوانی عدالت کی مصیبت کون بھگتے گا۔ اس جرم کے مقدمہ کا فیصلہ اس جرم سے پہلے کرنے کی فرصت عدالت کو نہیں ہوتی۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم ہی لوگ اس جھگڑے کو نپٹا دیں۔"

ونے نے کہا۔ "اچھا تو یہ بتاؤ کہ سزا کیا دی جائے؟"

نصرت نے کہا۔ "یہی تو سوچنے کی بات ہے۔"

انہیں سوچنے کا موقع دے کر میں شمیم کے ساتھ اوپر چلا گیا۔ سارے دن دل کے اور جسم کے اوپر جو گذری تھی۔ اُسکا اثر اب معلوم ہو رہا تھا۔ سارا جسم تھکن سے چور چور ہو رہا تھا لیکن آرام کرنے میں مجھے نہ معلوم کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آرام کرنے سے کبھی چین نہ ملے گا۔ دن بھر جس خلش کو باہر کے شور و غل میں بھلائے رہا۔ ذرا سا موقع پا کر وہ پھر دل پر چھا جائے گی۔ اس خلش کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی خوف تھا کہ اس خلش کی روشنی میں شاید اپنے دل کا وہ روپ نظر آئے گا جس کا میں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا اور جسکو برداشت کرنے کی طاقت میں ابھی تک نہ جٹا سکا تھا۔

شمیم دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ بلا کر اُسے قریب بٹھایا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔ جس بات نے دل پر غلبہ کیا ہوا تھا۔ اُسے بھلانے کے لئے کیا کہوں! اس مصیبت سے شمیم نے ہی نجات دلائی۔ بولا۔ "دیکھو دونوں لڑکیوں کے ساتھ اکیلے نصرت کو بھیج کر ہم بے فکر نہیں ہو سکتے۔ انہیں لے جانے میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ نصرت اکیلا ساری ذمہ داری نہیں اٹھا سکیگا سوچتا ہوں میں بھی ساتھ چلا جاؤں۔

"جان بچی۔ کچھ کرو کوئی بات تو ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "میرے جانے سے کام نہیں بنے گا؟"

شمیم نے کہا۔ "بنے گا کیوں نہیں۔ لیکن بڑا جھنجھٹ ...."

میں نے ہنس کر کہا۔ "جھنجھٹ ہی تو میں چاہتا ہوں!"

شمیم نے نہ معلوم کیوں کوئی مذاق نہ کیا۔ میری طرف عجیب نظروں سے کہا۔ "اچھا تم تو ہو ساتھ چلنا!"

اس کے بعد بہت دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ شام کا اندھیرا گھر آیا تھا۔ اور اس اندھیرے میں گھر کا سارا ماحول دھندلا دھندلا نظر آتا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس دھندلی روشنی میں مختلف سمتوں میں دیکھ رہے تھے۔ شمیم کو اس طرح خاموش بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اسکا یہ انداز دیکھ کر حیران ہونا قدرتی بات تھی۔ میں خاموش بیٹھا کوئی بات چھیڑنے کی سوچ رہا تھا کہ اچانک شمیم بول اُٹھا۔ "ہو سکے تو ایک بار لبستی پور ہو آنا۔ اُسی راستہ پر پڑ گیا۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "لبستی پور؟"

شمیم نے کہا۔ "ہاں! منو کا سسرال وہیں ہے۔" اور یہ کہکر وہ فوراً چلا گیا۔

x x x x x

نصرت اور سبحان نے گسائیں جی اور اُن کے گروہ کا کیا بندوبست کیا، یہ تو وہی جانیں۔ البتہ دوسرے دن صبح اٹھ کر دیکھا تو اُن کا پتہ نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ رات ہی گزار کر صبح ہوتے ہی وہ لوگ چلے گئے تھے۔ کافی دیر تک نصرت اور سبحان ہم سے کتراتے رہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گسائیں جی کے بارے میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا تھا لیکن ونے نے سارا معاملہ چھوڑ دیا۔ بلا شمیم اور نصرت اور سبحان کی بے انصافی دیکھی۔ مانا کہ سارا قصور گسائیں جی اور ان کے چیلوں کا ہے لیکن اس کے لئے سارے قافلے کو سزا دینا کہاں تک مناسب ہے؟

سبحان بچارا اس کو انکار کیسے کرتا۔ ونے کی بات کی تردید کرتے ہوئے بولا۔ "کیسی سزا۔ ایسے نیک کام میں حصہ لینے کا ثواب بھلا کیسے حاصل ہوتا ہے!"

شمیم نے کہا۔ "ذرا سنوں تو سہی کہ اس بار آپ نے کون سا نیک کام کیا ہے؟"

نصرت کے جواب دینے سے پہلے ہی ونے نے کہا۔ "اپنے پر تلی

کی یاد ہے نہیں؟ وہی جو ویدپران کا ماہر ہو گیا تھا۔ ان دنوں رنگ پور سے ایک بیز باتھ پاؤں کی مورتی اٹھا لایا تھا۔ اس کے بعد بہت کوشش کرلے پر اور بیکار رہنے پر جب اُسے کابل ثابت نہ کیا جا سکا تو ہمارے عالموں نے اُسے "پرانا سنگ میل" یا اس طرح کے دوسرے خطابات دیئے تھے۔ اور بعد میں اُسے ایک اندھیری کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا۔"

تعجب سے میں نے کہا۔ بہت بڑا تعلق ہے۔ ذرا سنئے تو سہی بات کو شرت کندھے پر اٹھا کر اس مورتی کو کوٹھڑی سے نکال لایا اور اُسے سامنے رکھ کر بولا "یہ بھدرکالی دیوی کی مورتی ہے۔ دیوی ظاہر ہوئی۔ لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے اس کی مناسب پوجا نہ ہو سکی۔ گر سائیں جی اور ان کے قافلے کے افراد مل کر ان کی پوجا کا خرچ دیدیں تو ان کے سات خون بھی معاف ہو سکتے ہیں"۔

میں نے پوچھا۔ "انہوں نے اس بات پر اعتبار کر کے پیسہ دیا؟"

اس بار شرت نے کہا۔ "دیں گے نہیں! دوسرے طریقے سے خواہ نہ دیتے۔ لیکن یہ سن کر کہ بھدرکالی دیوی کی مورتی ہے۔ اعتبار کیا یا نہیں کیا خوف سے پیسے نکال کر خود ہی دے گئے۔ افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ جن کو زیادہ سزا ملنی چاہئے تھی۔ انہی نے زیادہ روپیہ دیا"۔

میں نے کہا۔ "یہ تمہاری زیادتی ہے شرت۔ انسان کے مذہبی اعتقاد کا اس طرح مذاق اڑانا میری سمجھ میں مناسب نہیں معلوم دیتا"۔

ونے نے میری بات کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ مذاق نہیں ڈکیتی ہے"۔

شرت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "لیکن معلوم ہے کہ گوپال کے بیچے ہوئے تین سو روپے ختم ہونے والے ہیں۔ کالی گھاٹ کے پنڈے دنیا کو لوٹتے ہیں۔ ہم نے بھی اگر بھدرکالی دیوی کے نام پر کچھ لے لیا تو کیا ستم ہو گیا۔ بھدرکالی ماں اتنی سنگدل نہیں ہیں کہ اس بات سے ناراض ہوں"۔

ونے نے کہا۔ "تو کالی گھاٹ کے پنڈے ہی بن جاتے۔ ملک کی خدمت کا ڈھونگ کی کیا ضرورت تھی۔

شاستر پڑھ کر تو ملک کی خدمت کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی کسی ایسے عہدنامہ پر دستخط کئے ہیں کہ کبھی کسی کو دھوکا نہ دوں گا۔ ہمیشہ سچ بولوں گا"!

ونے کو واقعی غصہ آگیا۔ بولا "تم لوگوں کا یہ بے ہودہ پن تمہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ جانتے ہو؟ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک عہد بنایا ہے۔ انہوں نے اس لفظ کا استعمال بیز سوچے سمجھے نہیں کیا۔ شاستروں کی باتوں کا مذاق اڑا سکتے ہو۔ لیکن جو لوگ پاکیزگی کو شیشہ ٹوٹ گیا تو اس کے ٹکڑے خاک میں مل جائیں گے"۔

شرت ونے کی زبان بند کرنے کے لئے کچھ کہنے والا تھا لیکن ونے نے اسے روک کر اپنی بات جاری رکھی۔ "تم کہتے ہو کہ شاستروں کی پابندی سے انسان تنگ خیال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر ذہنی قوت بھی نہیں بڑھتی۔ جنہوں نے ملک کی خدمت کو ایک پاکیزہ عہد سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں۔ تم لوگ جسے بے ہودہ پن سمجھتے ہو وہ آہستہ آہستہ تمہارے دل پر چھاتا جا رہا ہے۔"

شرت نے ہاتھ کی انگلی پر گن کر کہا۔ "ضد۔ خاک۔ انتر قی پسند خیالات کیسے بھی ہوں۔ ونے لیکن یہ ماننا پڑے گا۔ کہ تیری زبان بڑی سلیس ہے"!

شمیمن نے سامنے آ کر انہیں خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو شرت کو گاڑی پکڑنی ہے۔ اس کی جگہ میں تمہارے ساتھ لڑتا ہوں"!

ونے نے ہنس کر کہا۔ "نہیں شمیمن دادا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف شرت ہی نہیں بلکہ اس دور کے سبھی آدمی بہت زیادہ چالاک بن کر اپنی زندگی ضائع کر رہے ہیں"۔

شمیمن نے کہا۔ "زندگی ضائع ہی ہوتی ہے۔ تو بیوقوفی سے کیوں نہ ہو۔ بہادری اسی میں ہے کہ چالاکی سے ہو"!

"میری بات تم نے کبھی نہیں شمیمن دادا۔ ہماری چالاکی کے پیچھے دلی خلوص نہیں ہے۔ یہ ایک افسردہ دل کی ظاہری شکل ہے۔ اس طرح ہم لوگوں نے منہ بچکانے کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا۔ لیکن منہ بچکا کر ہر بات کا مذاق اڑانے اور ہر چیز کو حقیر سمجھنے کی کوشش میں ہم خود بہت حقیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ پرانے لوگوں کے مقابلہ میں ہم بہت چھوٹے ہیں۔"

شرت نے کہا۔ "تمہیں دیکھ کر ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن تمہارے اس پیچیدہ احساس کا ذکر کرنا فضول ہے"!

ہم سب ہنس پڑے۔ شمیمن نے کہا۔ "شرت کو لوٹ آنے دو ونے۔ تبھی اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث کی جائے گی۔

× × × × ×

نصرت کے ساتھ دونوں لڑکیوں کو پہنچانے ہم بھی روانہ ہوا۔ [illegible] سے ریل پہ سوار ہو کر کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جنکشن پہ اترنا تھا۔ وہاں سے چھوٹی لائن کی گاڑی پہ سوار ہو کر دونوں لڑکیوں کو ان کے گاؤں تک پہنچانے میں دیر نہ لگی۔

جب ہم لوگ گاڑی سے سٹیشن پہ اُترے تو شام ہو گئی تھی۔ ایک میدان کے بیچ میں ٹین کے سائبان سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ گو سائیں جی سے اتا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ مگر اس سٹیشن سے دو کوس کے کھلے میدان کو پار کر کے دونوں لڑکیوں کا گاؤں ملے گا۔ یہاں کسی سواری کا بندوبست نہ تھا۔ اگر گاؤں میں کسی کا اثر و رسوخ ہو اور کافی پیسے خرچ کئے جائیں تو پالکی کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی سات دن پہلے کہنا ضروری تھا۔ بیل گاڑی ضرور چلتی تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی خاص راستہ نہ تھا۔ کبھی میدان میں چلتی تو کبھی کچے راستے پر۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ بیل گاڑی سے سفر کرنے میں جسم کا کوئی عضو سالم رہ جائے گا۔ کچھ بھی ہو بیل گاڑی سے سفر کرنے کی خواہش ہوتے ہوئے اس خواہش کی تکمیل کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

سٹیشن پہ ہمارے سوا کوئی نہ اُترا۔ جو شخص ایک ہری جھنڈی ہلا کر تھکی ہاری گاڑی کو ایک طرح سے زبردستی سٹیشن سے باہر ہانک کر لے گیا، اُس کے علاوہ سٹیشن پہ چڑیا کا بچہ بھی نہ تھا۔

اس شخص کا لباس کچھ عجیب تھا۔ جسم کی دھوتی جتنی چھوٹی تھی، اتنی ہی میلی۔ اُسے گھٹنوں سے نیچے پہننا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ جسم پہ دھوتی کی مانند میلی ایک صدری تھی۔ لیکن لباس خواہ کچھ بھی ہو سر کی طرف دیکھتے ہی اُس کے عہدہ کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ سر کی ٹوپی دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ یہی سٹیشن ماسٹر ہیں۔ اس چھوٹے سے سٹیشن پہ ٹکٹ بیچنے سے لے کر ٹکٹ واپس لینے تک تمام ضروری فرائض انہی کو انجام دینے پڑتے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ سب کام کرنے میں انہیں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے۔ صحتمند، گول مٹول چہرہ، چہرے پہ تازگی، بال پک گئے تھے لیکن چہرہ پہ جھریاں نہیں پڑی تھیں۔ چہرے پہ جو ہنسی تھی اُس سے یہ شخص سادہ لوح نہیں بلکہ بیوقوف نظر آتا تھا۔ پھر بھی ہنسی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے ٹکٹ لینے کے بعد اُن کا چلے جانے کا ارادہ نظر نہ آیا۔ ذرا ادھر اُدھر دیکھ کر۔ احمقوں کی طرح کئی مرتبہ ہنسکر انہوں نے پوچھا۔ "آپ لوگ کہاں جائینگے"

بات کرنے کا انداز دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس ویرانے میں انسان سے دو گھڑی بات کرنے کی سعادت حاصل کرنا اُن کے لئے بہت بڑی بات تھی۔

ہماری منزلِ مقصود کا نام سُن کر انہوں نے کہا۔ "یہ تو قریب دو کوس کا راستہ ہے۔ اب شام کے وقت جانا تو مشکل ہو جائے گی۔ آپ کے پاس لالٹین ہے؟"

نصرت نے کہا۔ "نہیں لالٹین تو نہیں ہے۔ لیکن ہو۔ تو خاص فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ روشنی میں راستہ دیکھ کر بھی ہم راستہ پہچان لیتے۔ ہم لوگ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔"

سٹیشن ماسٹر صاحب کے معصوم چہرے پر فکر و تردد کی گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کہا۔ "تب تو آپ راستہ نہ کھوج سکیں گے۔ بڑا پیچدار راستہ ہے۔"

ہم کو پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا۔ سٹیشن ماسٹر کی بات سے یقین ہو گیا۔ اور فکر پیدا ہوا۔ ان دونوں بے سہارا عورتوں کو لے کر رات کے وقت راستہ تلاش کرنے میں اگر گاؤں نہ پہنچ سکے تو نہ جانے کس مصیبت میں پڑ جائیں۔ پھر بھی امید کے آخری تنکے کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا "ایسا کوئی آدمی نہ دے سکیں گے کہ ہمیں راستہ دکھا دے۔ ہم لوگ اُسے کچھ بخشیش دے دینگے!"

"بخشیش تو دیدیں گے لیکن دے گا کون؟" یہ کہہ کر سٹیشن ماسٹر نے اپنے مذاق پر خود ہنسکر کمال کر دیا۔ ہنسی رکنے پر بولے۔ "سالا کیشا ہوتا تو آپ کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن جب سے یہاں آیا ہوں۔ شام کے وقت کبھی اس کی صورت نہ دیکھی۔ اسکی یہاں نائٹ ڈیوٹی ہے نا!"

سٹیشن ماسٹر صاحب کی ہنسی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی اُن کا پیٹنٹ مذاق ہے۔

کیشا کا تعارف راز کے پردے میں پوشیدہ ہونے پر بھی انہوں نے اسکی نقاب کشائی کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ میں نے کہا۔ "تو کوئی نہ مل سکے گا!"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا: "میں خود آپ کے ساتھ جا سکتا تھا۔ لیکن ساڑھے آٹھ بجے تھرڈ اپ پسنجر کو پاس کرانا ہے"

میں نے ان کی فیاضی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ سٹیشن چھوڑ کر بھلا آپ کو چلنے کے لئے کیسے کہہ سکتے ہیں!"

"ضرور کہہ سکتے ہیں۔ شوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح مجھے جانا نہیں پڑا؟ ابھی پرسوں سویرے کی بات ہے سرڈی کے ہمارے کلرجی حیاتے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بازار سے ایک گدھے کا بوجھ لے کر اترے اور پیدل۔ ماسٹر گھر کے لڑکے تو نظر نہیں آتے۔ دوپہر کی گاڑی سے آنے کی اطلاع دی تھی شاید اسی لئے نہیں آئے۔ سامان میں کیسے لے جاؤں۔ بتاؤ! کیا کرتا؟ سوچا ابھی سات بجے ہیں۔ دوپہر کی گاڑی ۱۲ بجے آتی ہے۔ اس سے پہلے گیارہ بجے ایک مال گاڑی کو پاس کرنا تھا۔ چنانچہ تیزی سے چل کر گیارہ بجے تک سرڈی سے واپس لوٹا جا سکتا ہے"

نشرت نے کہا۔ "تو ان حضرت کا سامان لے کر ان کے گھر گئے یا نہیں؟"

بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا۔ "نہ جاتا تو کرتا۔ آپ ہی بتایئے۔ ان کی مچھلی بارہ بجے تک سڑ نہ جاتی۔ وہاں سے لوٹ کر مال گاڑی کو صحیح وقت پر پکڑ تو لیا لیکن ذرا دوڑنا پڑا۔"

نشرت نے کہا۔ "اس عمر میں بھی آپ کھانا کھانے کے بعد دوڑ سکتے ہیں؟"

"کھانا کھانے کے بعد؟" سٹیشن ماسٹر صاحب نے قدرے تعجب سے پوچھا؟

میں نے کہا۔ "انہوں نے کھلا پلا کر ہی بھیجا ہوگا۔"

"ارے رام کا نام لو۔ کلرجی حیاتے بھلا کب کھلانے والے ہیں۔ اتنا کنجوس ہے کہ صبح اگر اسکا نام لے لو۔ تو دن بھر نوالہ منہ میں نہ جائے۔"

نشرت نے کہا۔ "اتنی دور ان کی مچھلی لاد کر لے جانے کے بعد انہوں نے آپ کو کھلائے پلائے بغیر جانے دیا؟"

سٹیشن ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔ "اور کیا۔"

ہم نے سوچا حالانکہ دور دیہات کے ایک چھوٹے سے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر ہے۔ لیکن ایسا آدمی ملتا کہاں ہے۔ یہ آدمی واقعی فراموش کرنے لائق نہیں ہے۔ اتنی سی دیر میں ہی اس شخص کے ساتھ یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ بھلا کیوں نہ ہوتی!

× × × × ×

ہم نے سوچا رات بھر کے لئے سٹیشن ماسٹر سے پناہ مانگنا مناسب نہ ہوگا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب نے خود ہی یہ بات چھیڑی۔ بولے "اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ آج رات اگر ہمارے یہاں گزار دیں تو کل صبح میں ہی آپ کو پہنچا آؤں گا"

"نیکی اور پوچھ پوچھ! یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے بڑی خوشی سے یہ تجویز منظور کر لی۔

ماسٹر صاحب بولے: "ذرا ٹھہریئے آفس کا کچھ کام باقی ہے۔ ذرا اس سے فارغ ہو لوں"

یہ کام بھی کچھ معمولی نہ تھا۔ ہمارے چاروں ٹکٹوں کو ایک ٹین کے ڈبے میں ڈالا۔ ٹوپی میز پر رکھی۔ اور اس کے بعد سٹیشن کی سرخ اور سبز شیشوں والی لالٹین اٹھا کر کہا۔ "چلئے"

نشرت نے کہا۔ "آپ کا کام پورا ہو گیا ماسٹر صاحب؟"

ماسٹر صاحب نے کہا۔ "جی ہاں! اب صرف آٹھ بجے والی ٹرین پاس کرنے کے بعد مکمل چھٹی ہو جائے گی"

میں نے کہا۔ "آفس کے کمرے میں تالا نہ لگائیں گے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے"

سٹیشن کے تحفظ کے بارے میں بھی مجھے جو غلط فہمی تھی وہ ان کا تعجب دیکھ کر دور ہو گئی۔ بولا۔ "کچھ نہیں۔ ایسے ہی کہہ رہا تھا"

ماسٹر صاحب آگے آگے لالٹین لئے چل رہے تھے۔ بولے "اور صاحب تالا ہوتا تو لگاتا۔ کیشٹو کمبخت نے نہ معلوم تالا کہاں غائب کر دیا ہے"

سٹیشن سے تھوڑی دور میدان میں ماسٹر صاحب کا کوارٹر تھا۔ سٹیشن کیسا بھی ہو کوارٹر برا نہ تھا۔ دو کمروں کا پکا مکان، ساتھ میں رسوئی، سامنے ایک کنواں۔

جیسا سٹیشن کا حال تھا وہی گھر کا تھا۔ تالا کہیں نہ تھا۔ باہر سے دھکیلتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ماسٹر صاحب نے اندر جا کر کہا۔ "جو سوچا تھا وہی ہوا۔ کمبخت کیشٹو نے آگ نہیں سلگائی۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ بدمعاش کو کتنی بار کہا کہ میں اور سب کام کر سکتا ہوں،

جولاہے کہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بھائی تو آتا مزہ کر دیا کرو لیکن موقع ملتے ہی اسے میری آنکھ بچا کر بھاگ جانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

سکینہ کا یہ نیا قاعدہ پاکر بڑا مزہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے اپنے والد کی کمزوریوں کو اُس نے خوب پہچان لیا تھا۔

ماسٹر صاحب نے الماری کے اوپر رکھا ایک سوزی جو معاذ ... ہے۔ نظر آتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ میں تو اکیلا ہی ہوں۔ میری گزر تو جیسے تیسے ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کھانے کے لئے کیا لا کر دوں۔"

ان کی پریشانی دیکھ کر انہیں تسلی دینے کے لئے میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے لئے آتنا ہی کافی ہے کہ رات گزر جائے۔ کھانا تو ملا۔ ایک دن نہیں کھائیں گے۔ تو کیا حرج ہے؟"

میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن دن بھر ٹرین میں دھکے کھانے کے بعد رات فاقہ کرنے کا خیال کوئی زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم ... فاقہ کر لیتے۔ ہو سکتے تھے۔ لیکن دونوں لڑکیوں کو کیسے بھوکا پیاسا رکھا جا سکتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے بے چین ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں بغیر کھائے پئے کیسے رہیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

شرت نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بغیر کھانا کھائے نہ رہ سکوں گا۔ آپ کا کوئلہ وغیرہ کہاں ہے ماسٹر صاحب ذرا بتائیے۔ میں ہی چولہا سلگاتا ہوں۔"

گہرے سمندر میں گویا کنارہ پاکر ماسٹر صاحب ہنس کر بولے۔ "کیا واقعی آپ چولہا سلگا سکتے ہیں؟" اُن کی تعریفی نظریں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ شاید انہوں نے اس بات کا تصور نہ کیا تھا۔ کہ ایک معمولی آدمی اتنی ہمت کر سکتا ہے۔

شرت کو عزت ملتے دیکھ کر میں جل کر بولا۔ "شرت چولہا تو سلگا سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ جس دن شرت کا چولہا سلگ گیا اس دن کھانے کا وقت نہ بچے گا!"

شرت مجھے تیز نظروں سے گھور کر باہر چلا گیا۔

× × × × ×

دو کمروں میں سے ایک لڑکیوں کے اٹھنے بیٹھنے کے لئے رکھا اور دوسرے میں ہم لوگوں نے ڈیرہ لگایا۔ یہ ماسٹر صاحب کا سٹور معلوم ہوتا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی چوکی پر چند ٹین کے ڈبے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف میز کے اوپر آلو اور دوسری سبزیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں سبزیوں کے چھلکے نہ جانے کتنے دنوں سے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ماسٹر صاحب کو انہیں پھینکنے کی فرصت نہیں ملی۔ چوکی کے نیچے کبھی تھوڑا سا تیل گر گیا ہوگا۔ آج تک اسے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ میز پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر ماسٹر صاحب کے گھر اور رہن سہن کا پورا اندازہ ہو گیا۔

کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہنے پر جب ماسٹر صاحب اور شرت نہ آئے تو میں انہیں دیکھنے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی آنکھوں کے سامنے جو منظر آیا اسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

ماسٹر صاحب زمین پر اکڑوں بیٹھے آنکھیں اور چہرہ سُرخ کئے ہوئے چولہا پھونک رہے تھے۔ اوپر سے شرت چولہے پر بڑے زور سے پنکھا کر رہے تھے۔ چولہے کا یہ حال تھا کہ آگ پکڑنا تو درکنار۔ ذرا سا دھواں دے کر بھی اُن کی محنت کامیاب ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

شرت نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ بولا۔ "ماسٹر صاحب تھوڑا سا تیل اور ڈال دوں؟"

ماسٹر صاحب نے مایوسی سے کہا۔ "اور تیل ہے کیا؟"

معلوم ہوا کہ تیل ڈالنے میں شرت نے کنجوسی سے کام نہ لیا تھا بولا۔ "تھوڑا سا ہے۔"

میں نے بھانپ لیا۔ کہ شرت کی قابلیت کے بارے میں ماسٹر صاحب کا تصور کافی ٹوٹ چکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی آگ نہ پکڑی تو؟"

شرت عاجز ہو چکا تھا۔ جل کر بولا۔ "تو اس چولہے کو پھینک دینا ہی مناسب ہوگا۔"

میں ان دونوں کی گفتگو سن کر ہنس پڑا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور میٹھی ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا۔ دیکھا تو تھوڑا سا گھونگھٹ نکالے دونوں لڑکیوں میں سے ایک قریب کھڑی تھی۔ دھوتی منہ میں دبا کر ہنسی روکتی ہوئی بڑے

میٹھے لہجہ میں بولی "آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیے"۔

نصرت شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ماسٹر صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے ملایمت سے کہا "آپ کہہ رہے تھے ذرا سا تیل باقی ہے۔ کہاں ہے؟"

اُن کی تمام و دو لڑکیوں نے دیکھی ہو گی۔ اور ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستی ہوں گی۔ اس خیال سے نصرت کی جو حالت ہوئی اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ شرم سے سرخ ہو کر اس نے تیل کی بوتل آہستگی سے آگے سرکا دی۔

اس کے بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ ماسٹر صاحب بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ جس ناخوشگوار کام کرنے کی کوشش میں انہیں اس قدر حیران ہونا پڑا تھا اُسے ان لڑکیوں نے دیکھتے دیکھتے کتنی جلدی کر ڈالا۔ میں سوچ رہا تھا چولھا جلانے کی اتنی سہل ترکیب اس سے پہلے ہم میں سے کسی کو کیوں نہ سوجھی۔ دونوں لڑکیوں کی حفاظت کا خیال ہمارے ذہنوں پر اس طرح مسلط تھا کہ بے بس ہونے کے علاوہ وہ کچھ کر بھی سکتی ہیں۔ اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔

لیکن سارا قصور ہمارا ہی نہ تھا۔ ان دو دنوں میں انہوں نے ہمیں گھونگھٹ کے علاوہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ دونوں نند پال کی بھتیجیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہ معلوم تھا۔ اور نہ کچھ جاننے کا موقعہ ہی ملا تھا۔

اِسی لئے میں نے محسوس کیا کہ ہماری مدد کے لئے آئی ہوئی اس لڑکی کے چہرے اور آنکھوں سے حیرانی اور تجسس کے آثار ابھی دور نہ ہوئے تھے۔ اسکی عمر کم تھی اور وہ غیر معمولی حسین تھی۔

اس کے بعد چولھا سلگنے میں دیر نہ لگی۔

ماسٹر صاحب نے اچھل کر کہا "بھد جیٹھوں کے علاوہ یہ کام کون کر سکتا تھا! مانا میں نہیں کر سکتا لیکن کیشنو بھی تو آدھی بوتل ختم کئے بغیر آگ نہیں جلا سکتا۔"

نصرت نے کہا "کیشنو کا زیادہ ذکر نہ کیجئے ماسٹر صاحب۔ آنکھوں سے تو اسے نہیں دیکھا۔ لیکن آپ کے منہ سے اسکی تعریف سُن کر میں اس کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔"

ماسٹر صاحب نہ معلوم کیا سمجھے۔ لیکن اس خیال سے کہ کیشنو کے حق میں ہم کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ وہ جلدی سے بولے "نہیں نہیں کیشنو اچھا آدمی ہے۔ بس تھوڑا سا سنکی ضرور ہے۔ دو گھڑی جم کر ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔"

کیشنو کیجئے ماسٹر صاحب کی کمزوری بھانپ کر اور یہ سوچ کر ایک بار اس کا ذکر شروع ہو کر ختم نہ ہو گا۔ میں نے بات کا رُخ بدل دیا۔

نصرت سامان وغیرہ اکٹھا کر کے دونوں لڑکیوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ابھی وقت ہے ماسٹر صاحب نصرت کو روکئے۔ چولھا سلگانے میں تو اس نے مٹی کے تیل کی ساری بوتل ختم کر دی۔ اب بھی اگر اس کے شوق کو نہ دبایا گیا۔ تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کھانا نہیں مل سکتا!"

میں نے محسوس کیا نصرت سے ماسٹر صاحب کا اعتقاد بالکل اُٹھ گیا تھا۔ میری بات سُنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو کر بولے۔ "نہیں نہیں نصرت بابو اب آپ کی ضرورت نہیں۔ انہیں کچھ پریشانی ضرور ہو گی لیکن جو کام آپ نہیں کر سکتے۔ اُسے کرنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اس سے ان کی پریشانی بڑھے گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

چنانچہ نصرت کو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ دونوں لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ اپنے اوپر ساری ذمہ داری لے کر لڑکیاں کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ چہرے پر تھوڑا سا گھونگھٹ ہونے کے باوجود ان کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ شاید رسوئی میں داخل ہوتے ہی صنفِ نازک کی ساری جھجک خود بخود دور ہو جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب کے سٹور سے چاول، آٹے، دال سبزی ترکاریوں کی بھی کمی نہ تھی۔ پھر بھی افسوس کرتے ہوئے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ نمک تیل تو ہے لیکن اور کوئی مسالہ نہیں ہے"!

لیکن ان کا اندیشہ فضول تھا۔ ان کا اندیشہ دور کرتے ہوئے چھوٹی لڑکی نے کہا "مسالہ تو ہے"۔ ماسٹر صاحب نے تعجب سے کہا "ایں؟ کہاں ہے؟ بھگوان جانے۔ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا"!

ہم سب لوگ ہنس پڑے۔

کھانا کھاتے وقت ہم نے دیکھا کہ مسالہ ہی نہیں ماسٹر صاحب

سوا اپنے گھر کی بہت سی چیزوں کا علم نہ تھا۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا
ہی۔ ماسٹر صاحب خود نہ سمجھ سکے کہ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں
اتنے لذیذ کھانے کا سامان کیسے اکٹھا کیا گیا۔

کھانے کے دوران میں انہوں نے دونوں لڑکیوں کا نام پوچھ لیا تھا اور ان کی بات چیت اور سلوک کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ان کے قریب ترین رشتہ دار نہیں ہیں۔

کھانا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ہماری تھالی کے قریب چٹنی کی کٹوری کملا چھوڑ کر پلٹ کر جا رہی تھی۔ (بنگال میں چٹنی کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے) اس بار مجھے دھوکا نہیں دے سکتی بیٹی۔ چٹنی کے لئے املی ضرور اپنے ساتھ لائی ہوگی۔

کملا نے آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے کچھ ہنس کر کہا "نہیں ہم املی کہاں سے لاتیں؟"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ املی ہمارے ہی گھر میں تھی۔ اور کل سویرے چٹنی کے لئے املی توڑنے آنے کے لئے میں گھنٹوں کیشو کی خوشامد کرتا رہا!"

کملا نے کہا "آپ نے کہاں تلاش کی تھی؟"

"سٹور میں۔ اور کہاں؟"

"املی تو آپ کے سونے کے کمرے میں تھی" یہ کہہ کر کملا چلی گئی۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ دیکھ کر ہم لوگ ہنس پڑے۔ اس بار تو گویا وہ آسمان سے گر پڑے تھے۔

کھانا ختم ہونے پر ہم لوگ کمرے میں بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے۔ کھانا بنانے اور پروسنے میں لڑکیوں کی جھجک کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ ماسٹر صاحب کی موجودگی سے ان کے اندر بے تکلفی بھی آگئی تھی۔ چنانچہ دونوں ہمارے نزدیک آکر بیٹھ گئیں۔ اچانک ماسٹر صاحب پوچھ بیٹھے "راج پور میں آپ کس کے گھر جا رہے ہیں؟"

اتنی دیر کے بعد یہ سوال پوچھنا ماسٹر صاحب کا ہی حق تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمیں کس کے گھر جانا ہے۔

نندپال کا نام سنتے ہی ماسٹر صاحب کا اعتقاد گہرا ہو گیا بولے "بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس جیسا گاؤں کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہے۔"

ماسٹر صاحب کی بات سے متعجب ہو کر میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی جس طرح دس آدمیوں میں سے ایک آدمی ہوتا ہے گاؤں میں وہ تالاب خواہ سب ہی غریب اور ستیوں کو دل کھول کر دان دیتا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے نندپال کا جو تعارف پیش کیا۔ اس سے میں کچھ خوفزدہ ہو گیا۔ "پھر تو پیسے والا آدمی ہوگا۔ کیوں؟"

"پیسے والا نہیں تو اور کیا ہے۔ دس ہزار روپے کا سود میں نکال رکھے ہیں۔ زمین، جائیداد، باغ اور تالاب کا کوئی شمار ہی نہیں۔"

اب سمجھ میں آیا کہ نندپال کو اپنی بھتیجیوں کی جائیداد کی اتنی فکر کیوں ہے۔ یہ بھی سمجھ لیا کہ دونوں لڑکیوں کو ان کے مشفق چچا کے گھر پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے کہا تھا

x x x x x

اگلے دن سویرے ماسٹر صاحب نے ہم لوگوں کو منزل پر پہنچا دیا۔ راستہ زیادہ مشکل نہ تھا۔ دن میں تو ہم خود لوگوں سے پوچھ تاچھ کر کے پہنچ سکتے تھے۔ البتہ رات کو دقت ہوتی۔

نندپال کے گھر کا ٹھاٹ باٹ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا۔ کہ وہ دولت مند اور فارغ البال شخص ہے۔ امید نہ تھی کہ اتنے دور کے دیہات میں اتنا ٹھاٹ باٹ نظر آئے گا۔ کھپریل اور ٹین سے ڈھکی ہوئی اس کی شاندار حویلی تھی۔ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔

نندپال نے ویشنو دھرم اختیار کیا تھا۔ مکان کے دو حصے تھے لیکن باہر کا حصہ اندرونی حصہ کے مقابلہ میں بڑا تھا۔ پکے صحن سے آگے چل کر ایک سوائلے گھر تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کرشن جی کا مندر۔

ہم نے دیکھا کہ نندپال کو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے ہی چندن اور تلک لگائے ہوئے دو برہمن ہمارے خیر مقدم کو آئے۔ ویشنو دھرم کے بارے میں کوئی سبق دینے کی بجائے وہ ہمارے ساتھ شائستگی سے پیش آئے۔ بولے "ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ہمارے گاؤں میں آنے کی تکلیف گوارا کی۔" یہ کہتے کہتے وہ سیدھے

اور آسان راستے سے ہمیں اندر لے چلے۔

شروع میں اتنی خاطر ہوتے دیکھ کر ہمیں کچھ تعجب ہوا۔ گھر کے اندر جا کر دیکھا۔ ہمارے سواگت کے لئے کچھ کم تیاری نہیں ہوئی تھی۔ نند پال کو اکا گنجا سر، تیل سے چکنا، فربہ جسم اور بازو میں سونے کا کڑا دیکھ کر ہی پہچان سکے وہ بڑے شائستہ اور مہذب طریقے سے ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔

سامنے ہی بڑے کمرے میں ایک فرش لگایا گیا تھا۔ چاندی کی فرشی اور زری کے کام کا مسند نہایت قاعدے سے لگا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر بھی ہمیں تعجب ہوا۔ انہوں نے اتنی تھوڑی دیر میں ہی ہمارے خیر مقدم کی اتنی تیاری کیسے کر لی! یہ سوچنا تو بیکار تھا۔ کہ اس دیہات میں مہمانوں کی خاطر کے لئے روزانہ بندوبست قائم رہتا ہے۔ لیکن ہماری حیرانی بہت جلد دور ہو گئی۔ ہمارے گوسائیں جی گلے میں کنٹھی پہنے ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا۔ اب میں سمجھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے انہوں نے ہی گاؤں پہنچ کر ہمارے آنے کی خبر نند پال کو دی تھی۔

نند پال نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسکی چودہ پشتوں کے نجات دہندہ بن کر فرش پر رونق افروز ہوں۔

نثرت نے مجھ سے کہا۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو سارے میس کو ساتھ لے آتا۔ کھانے کا بندوبست بھی پیشے کے بندوبست سے کچھ کم نہ ہوگا۔" میں نے گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔" اتنی عزت ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

نثرت نے چڑ کر کہا" تیرا مزاج تو شکی ہے۔ تیری نجات مشکل ہے"۔ لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس آؤ بھگت اور خاطر تواضع کے اندر جو فریب تھا اس کا پتہ چل گیا۔

نند پال کی دونوں بھتیجیاں کچھ دور ہمارے ساتھ آ کر اب گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے سنا۔ نند پال انہیں پکار کر کہہ رہا تھا" پگلی لڑکیو! ابھی سے گھر میں جانے لگیں۔ یہ بابو لوگ اتنی تکلیف اٹھا کر تمہیں یہاں ساتھ لائے ہیں۔ انہیں پرنام کر کے جاؤ۔"

نند پال کے لہجے سے شفقت اور محبت کا اظہار ہو رہا تھا دونوں لڑکیاں شرمندہ ہو کر لوٹیں۔ اور ہمارے قریب آ کر انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور ہمیں پرنام کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ اندر نہ جا سکیں۔ نند پال نے ہنس کر کہا۔ ارے اتنی جلدی کیا ہے بیٹھو۔ بیٹھو۔ یہیں بیٹھو۔ ان بابو لوگوں سے پورا قصہ تو سن لیں۔ میں یہاں کئی دنوں سے تمہارے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

نند پال کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کا حال جاننا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل دھڑک رہا تھا وہ ضرور کوئی شیطانی چال چل رہا ہے اس بارے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا۔

ماسٹر صاحب ٹھہرے بیچارے سیدھے سادے آدمی۔ نند پال کی باتوں پر ہنس کر بولے "لیکن بھائی تمہاری دونوں بھتیجیاں ہیں بہت اچھی۔ کل ہمیں ایسا کھانا بنا کر کھلایا کہ تم سے کیا کہوں؟" اس کے بعد لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے "لیکن چچا کے گھر آ کر اس بڈھے کو بھول نہ جانا۔ گھر کے کھانے سے جس دن طبیعت اکتا جائے گی۔ یہیں آ کر ڈیرہ ڈال دوں گا۔ پہلے بتائے دیتا ہوں"۔ لڑکیوں نے شرم سے سر جھکا لیا۔

نند پال اس بار فرش کے قریب میز پر بیٹھ کر بولا۔ لیکن بات کیا ہے ماسٹر کہو تو سہی۔ ان کے ساتھ لڑکیں دیکھنے کی تو امید نہ تھی"۔

ماسٹر صاحب نے کہا" ڈرو نہیں بھائی۔ ڈرو نہیں۔ میں آج ہی ڈیرہ نہیں ڈالوں گا"۔ اپنی بات پر خود ہی ہنستے ہوئے ماسٹر صاحب نے پھر کہا۔ میرے ساتھ نہ ہونے پر بھلا اپنی بھتیجیوں سے دوبارہ کیسے ملتے۔ یہ لوگ تو راستہ جانتے ہی نہیں"۔

نند پال نے کچھ کھانس کر چہرے پر غم کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا" پچھلے کئی دنوں سے فکر ہو رہا تھا ماسٹر۔ کھانا پینا سونا ایک طرح سے چھوڑ رکھا تھا۔ سوچتا تھا دونوں لڑکیاں اگر نہ جاتیں تو میں نہ جانے دیتا۔ گنگا نہانے کا لی گھاٹ گئیں تو نہ جانے کونسی آفت ٹوٹ پڑی۔ کئی دنوں سے کچھ پتہ نہ لگا۔ گاؤں کے لوگ جیسے ہیں تم جانتے ہی ہو ماسٹر۔ انہیں تو کوئی بہانہ ملنا چاہیئے"۔

اس بار نثرت نے فکر مند انداز سے میری طرف دیکھ کر اشارہ

کیا۔ اب جیسا سمجھا ویسا غصہ بے بنیاد تھا۔ لیکن ماسٹر صاحب جیسے بالکل بچے، صاف دل پر کوئی داغ نہ پڑا۔ انہوں نے نندپال کی بات کا منشا سمجھ کر کہا "کچھ بھی ہو بھائی۔ اب تو تمہیں بہنیں نہ ... اب تو تمہارا فکر دور ہو گیا۔ بیٹیوں کو کیونکر گھر میں جائیں گی سمجھ دن بھگوان نے ڈھنگ سے کھایا پیا نہیں ہے۔ اب بے فکر ہونے کی کوشش کرو۔"

نندپال نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا "نہیں ماسٹر بے فکر کیسے ہو سکتا ہوں۔ دنیا بے فکر کیسے ہونے دیگی۔ کمبخت گوسائیں نے آکر ایسی مجبوری سے کر سر چکرا گیا۔ تھانے میں رپٹ کروں یا کلکتہ جاؤں، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔"

اتنی لمبی چوڑی تمہید سے ماسٹر صاحب نے متعجب ہو کر کہا۔ کیا بکواس کرتے ہو نند۔ بھتیجیوں کی فکر کرتے کرتے کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل پڑا ہے؟

"اس میں اب کسر بھی کیا رہگئی ہے ماسٹر۔ میری جگہ اگر تم ہوتے تو تمہارا دماغ بھی چل پڑتا۔ گاؤں میں کیسی آفت مچی ہوئی ہے۔ کچھ اسکی بھی خبر ہے!"

اتنی دیر میں دونوں لڑکیاں مصیبت آتی دیکھ کر بے چین ہو اٹھیں۔ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا انہوں نے سادگی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

نندپال نے سر پہ ہاتھ رکھکر کہا "میری تباہی کا سامان ہوا ہے۔ جن لوگوں کی بھلائی کے لئے دن رات مرتا ہوں۔ وہی لوگ سر پہ چڑھتے ہیں۔ سمجھے ماسٹر؟"

سنجیدگی سے فلسفیانہ انداز میں ماسٹر صاحب نے نندپال کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا "ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ اسی لئے کسی کی بھلائی نہیں کرنی چاہیئے۔" اس مصیبت کے وقت بھی میں ماسٹر صاحب کی بات سن کر ہنس پڑا۔

نندپال کی تمہید اب شائد ختم ہو گئی تھی۔ اچانک اصلی موضوع پہ آکر اس نے کہا۔

"جانتے ہو ماسٹر اس کمینے گوسائیں نے گاؤں میں آکر کیا خبر اڑائی ہے؟"

ماسٹر صاحب نے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر کہا "گوسائیں جی کچھ بھی اڑائیں لیکن میرے خیال سے تو اس سے کچھ بگڑ نہیں سکتا۔"

نندپال نے یقینی لہجے میں کہا "میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ بھگوان جانتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی میرے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

ماسٹر صاحب نے چونک کر کہا "ارے کس نے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی؟"

نندپال ماسٹر صاحب کی سادہ لوحی سے تنگ آکر بولا "گھر میں آگ لگا دیتے تو بہتر تھا ماسٹر۔ لیکن اس کی بجائے یہ لوگ ہمیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے خاندان پر بدنامی کا ٹیکہ لگانا چاہتے ہیں۔ گوسائیں کے ساتھ گنگا اشنان کے لئے لڑکیوں کو بھیجا تھا۔ واپس آکر گوسائیں نے یہ خبر اڑادی کہ وہ نہیں آئیں۔ میں نے پوچھا کیوں نہیں آئیں۔ اس نے کہا۔ ان کا پتہ نہ چل سکا۔ غصے میں آکر میں نے پوچھا تم لوگوں کے ساتھ بھیجا تھا اور تم ہی لوگ پتہ نہ لگا سکے۔ اس کا کیا مطلب؟ اس پر بھی اس نے کہا آنکھوں سے اوجھل تو ہونے نہ دیا تھا۔ پھر بھی کھلونا خریدنے کے بہانے نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ پھر نہ ملیں۔"

بہت دیر سے دل میں غصہ بھر رہا تھا۔

دونوں لڑکیاں اس بار سب کے سامنے ہی بے چین ہو کر رو پڑیں۔ اپنے چچا کے پیر پکڑ کر بولیں "یہ ساری بات جھوٹ ہے چاچا جی۔ ہم تمہارے پیر چھو کر کہتی ہیں چاچا جی۔"

نندپال نے جلدی سے پیر کھینچ لئے اور کہا "اری پگلیو! میں کیا تمہاری بات پر یقین نہیں کرتا۔ کیسی پاگل لڑکیاں ہیں۔"

ہم دونوں ایسے گم سم بیٹھے تھے گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ ساری بات سمجھتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتے تھے۔ نندپال ایک تجربہ کار کھلاڑی کی طرح چاروں طرف سے مورچہ بنا کر چال چل رہا تھا۔

ماسٹر صاحب لڑکیوں کا رونا دھونا دیکھکر پہلے تو گھبرائے لیکن پھر سنبھل کر نندپال کی بات پر دھیان دے کر بولے "اری پگلیو! تمہارے بارے میں کوئی کچھ کہدے اس سے بات سچ تھوڑا ہی ہو جاتی ہے۔ جاؤ بیٹیو گھر کے اندر جاؤ۔"

اس بار نندپال واقعی ماسٹر صاحب پر بگڑ اٹھا۔ ہم لوگوں کو امید تھی کہ شاید اس شخص کی غیر معمولی سادگی ہی شاید نندپال کی چال کو گر دے

کر دے۔ لیکن نند پال نے اپنے تدبر سے بڑی خوبی سے بچا رکھا۔ اچانک ہمارے گوسائیں جی اور ڈبلا پتلا لبتو نہ جانے کہاں سے اس بساط پر نمودار ہوگئے۔ دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر اُن کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔

گوسائیں جی نے آنکھیں پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا "ادہو! یہاں موجود ہو! کچھ بھی ہو تم لوگ ہو خوب۔ کھلونا خریدنے کے بہانے گئیں اور ایسی کھسکیں کہ پتہ ہی نہ چلا"

دونوں لڑکیوں نے بے بسی سے روتے روتے صرف اتنا کہا "کیا بات کرتے ہو گوسائیں کاکا"؟

لبتو گوسائیں جی سے بھی ایک گز آگے نکلا۔ چیخکر بولا۔ "بات کیسی۔ نند پال کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے تمہاری بات چھپ نہ سکے گی۔ میں تو صاف بات کرنا جانتا ہوں۔ اُس دن چپکے سے کہاں کھسک گئی تھیں۔ بتاؤ؟"

اچانک ایک غیر معمولی واقعہ ہوگیا۔ میں دیکھ رہا تھا بہت دیر سے شرت کے نتھنے غصّے سے پھول رہے تھے۔ یکایک اُس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس نے لبتو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا اور کہا "زبان سنبھال کر بات کر بدمعاش۔ شیطانی کرنے کے لئے یہی جگہ ملی ہے؟" لبتو بھونچکا رہ گیا۔

معلوم ہوتا ہے نند پال نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ جب اُس نے خود اُٹھ کر لبتو کی گردن پکڑ کر باہر نکال دیا تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ اس بار میں نے سوچا کہ کہیں میں اب تک اُسے غلط تو نہیں سمجھتا رہا۔ تو کیا ماسٹر صاحب نے اس کے بارے میں جو تعریف کے پل باندھے تھے وہ صحیح تھے؟"

لیکن یہ شبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ دھکا دے کر باہر نکالے جانے کے باوجود لبتو کچھ دیر بعد گوسائیں جی اور دوسرے آدمیوں کو لے کر پھر آموجود ہوا۔ اس بار وہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہوکر آئے تھے۔

دو بیکس لڑکیوں کو تباہ کرنے کے لئے ان لوگوں نے جو گہری سازش کی تھی اُس کی حقیقت دیکھکر میں حیران رہ گیا۔ لبتو کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دینے کے بعد نند پال [illegible] سے ہماری کہانی سن رہا تھا۔

یہ واقعہ دیکھکر ماسٹر صاحب بھی کھسکتے ہیں [illegible] ہماری کہانی کے بیچ بیچ میں اپنی رائے دیتے جارہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ یہ آدمی اتنی غلط بات بھی اُڑا سکتے ہیں؟ کمبختوں نے لڑکیوں کے منہ کی طرف بھی نہیں دیکھا۔"

نند پال کا چہرہ دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بات سن کر اُسکا سارا شبہ دور ہوگیا۔ لیکن اگلے لمحے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ ہمارا یہ سوچنا کتنی بڑی غلطی تھی۔

لبتو اور گوسائیں کے ساتھ اس بار ایک نیا آدمی آیا تھا۔ بالکل بوڑھا۔ سر کے بال اور داڑھی بالکل سفید۔ اُس کے پکے ہوئے بال اور داڑھی دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑے ٹھنڈے دماغ کا ہوگا۔ لیکن اسکی ظاہری شکل کتنا بڑا دھوکا تھا۔ یہ معلوم ہونے میں دیر نہ لگی۔

نند پال نے اُس کا خیر مقدم کرکے جس عزت کے ساتھ اُسے بٹھایا۔ اسے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا۔ کہ اس شخص کا گاؤں میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ بوڑھے نے اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا "آپ لوگ شاید کلکتہ سے آرہے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بوڑھے نے کہا "کالج میں پڑھتے ہیں شاید؟"

میں نے ہنسکر جواب دیا "نہیں!"

بوڑھے نے تعجب سے کہا "پھر کیا کرتے ہیں۔ نوکری؟"

یہ سن کر کہ نوکری بھی نہیں کرتا وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے پھر خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد ہماری بات چھوڑ کر نند پال سے بولے "تم نے لبتو کو گردن پکڑ کر باہر نکال دیا نند؟"

نند پال نے جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہاں نکالا ہے۔ کیوں نہ نکالوں۔ جانتے ہیں اس نے میری کتنی بڑی بے عزتی کی ہے؟"

"کیا کیا ہے اس نے بھائی؟" یہ کہکر بوڑھے نے حقّے کی نے ہونٹوں میں دابی۔

لیکن نند پال کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ لبتو نے خود آگے بڑھ کر کہا "انصاف کی بات کہنے سے بے عزتی ہوتی ہے

ان کی بھتیجیوں کو ہم لوگ کالی گھاٹ دکھانے لے گئے تھے۔ ہمارے واپس آنے کے دو سال بعد آج وہ نہ جانے کہاں سے آئی ہیں۔ ذرا پوچھئے تو سہی"

نصرت کو پھر غصہ آگیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھلیا۔ غصہ مجھے بھی کم نہ آرہا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھ رہا تھا کہ غصہ ہو کر ان کی سازش ناکام نہ کر سکوں گا۔

نند پال نے بلتو کی بات پر بے حد غصہ ہو کر کہا۔ "اور یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہے؟"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا "یہ لوگ کچھ بھی کہیں۔ یہ بات تو سچ ہے کہ تمہاری بھتیجیاں بلتو وغیرہ کے ساتھ نہیں لوٹیں؟"

خواہش نہ ہونے پر بھی گویا نند پال نے مجبور ہو کر اس بات کو تسلیم کیا۔

بوڑھے نے کہا۔ "اونچے گھر کے ہندو کی دو دھرما دو بہن پردیس میں کہاں رہیں بھائی؟"

نند پال نے گویا بڑی مصیبت میں پڑ کر کہا۔ "ان لوگوں نے بتایا نہ......"

"یہ لوگ کچھ بھی کہیں۔ تم انہیں بہتر جانتے ہو یا بلتو اور گوسائیں کو؟"

نند پال کو جواب نہ سوجھا۔ شاید اسی لئے خاموش ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا۔ "اتنے دنوں سے گاؤں میں رہتے ہو۔ کبھی سنا کہ بلتو یا گوسائیں نے کوئی گندہ کام کیا ہے؟"

"نہیں کبھی نہیں سنا۔"

یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ ہم لوگ کتنی بڑی سازش میں آکر پھنس گئے ہیں۔ ان لوگوں نے کتنی خوبی سے اس بھیانک کھیل کی ایک ایک تفصیل کی تکمیل کی ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا پھر بھی مجبور ہو کر بیٹھے رہنا پڑا۔

بوڑھے نے گویا نند پال کے جواب سے اپنی بات کی صداقت کی سند حاصل کر لی تھی۔ فخر کے ساتھ بولا۔ "پھر بلتو اور گوسائیں کی بات پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟"

"یہ لوگ کلکتے کے ہیں۔ خوب پڑھے لکھے اور اچھے لڑکے ہوں گے۔ لیکن ہم تو انہیں پہچانتے نہیں۔ ہم لوگ بیوقوف گنوار ہیں تم ہمیں کیسے سمجھاؤ گے؟"

نند پال سنجیدہ چہرہ بنائے خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا۔ "تم گاؤں کے چودھری ہو۔ تمہارے پاس روپیہ ہے، نوکر ہیں جس طرح چاہو اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اپنی بھتیجیوں کو اگر عزت سے گھر میں رکھ لو۔ تو تمہیں روکنے والا کون ہے۔ لیکن یہ بتائے دیتا ہوں نند۔ ہمیں ذات برادری کا ڈر ہے۔ اس معاملہ میں ہم [illegible] کسی بھی معاملے میں ہم بیچ میں نہ پڑیں گے۔ تمہارے پاس روپیہ ہے روپیہ کے زور سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم لوگ غریب ہیں ہم کو تو سماج سے مل کر چلنا پڑے گا۔" بوڑھا بڑے غمگین انداز سے اپنی تقریر ختم کر کے ہم سب کو بھونچکا چھوڑ کر چلا گیا۔

...... نند پال اس کے چلے جانے کے بعد بھی غم کے بوجھ سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

دونوں لڑکیاں یکبارگی مایوس ہو کر اور ہم سب کی طرف دیکھ کر اپنے چچا کے قدموں پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگیں اور بولیں "بچاؤ... کی دہائی ہے۔ ہم لوگوں نے کوئی گناہ نہیں کیا چاچا......"

ہم دونوں کے جسم گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔ دونوں لڑکیوں کے غمگین اور بے بس چہروں کو دیکھ کر اس ظالمانہ بھیانک سازش پر اس قدر غصہ آرہا تھا۔ گویا دل میں آگ لگ گئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ سازش کتنی مضبوط اور گہری ہے اس کے خلاف ہماری ساری کوشش بیکار ہوگی۔ یا بزدلوں کا گروہ [illegible] کرنے کے لئے متحد ہو گیا تھا۔ ہمیں اپنے چنگل میں دبوچ کر [illegible] کھینچ لیں گے۔

[illegible] تو شاید نصرت کے صبر کی حد مٹ جاتی۔ [illegible] کرنے کی جو ہمت تھی لیکن اس سے ان دونوں لڑکیوں کے بجز نقصان فائدہ نہ ہو سکتا تھا۔ اور شاید نصرت نے یہ بات سمجھ بھی لی تھی۔

ہم دنگ گم سم بیٹھے رہے خاموشی دور کرنے کا کوئی طریقہ نہ سوجھ رہا تھا۔

یکایک میں چونک پڑا۔ اتنی دیر سے ماسٹر صاحب کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی موجودگی بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اچانک ان کا چہرہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

ماسٹر صاحب نے پکارا "نندا" اس آواز سے میں نے محسوس کیا کہ نند پال کا دولت کا نشہ ایک ہی لمحہ میں کافور ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے کہا "تم ان ذلیل آدمیوں کی بات پر اعتبار کرتے ہو نند؟"

نند پال نے ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن ماسٹر صاحب آسانی سے چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ بے بس لڑکیوں کے اوپر ظلم ہوتے دیکھ کر ان کی فطرت بدل گئی تھی۔ انہوں نے دوبارہ کڑک کر کہا "بولو۔ اعتبار کرتے ہو؟"

نند پال نے ہچکچاتے ہوئے کہا "اعتبار نہ کروں تو کیا کروں۔ آپ ہی بتائیے"

"کروں نہ کروں کی بات چھوڑو۔ تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے۔ تمہارا ایمان کیا کہتا ہے؟" نند پال کو خاموش بیٹھے دیکھ کر ماسٹر صاحب اور بھی تیز ہو کر بولے "پھر تو تم اچھے آدمی نہیں ہو نند۔ آدمی کا چہرہ دیکھ کر تم اُسے نہیں پہچانتے۔ تم کیسے ان لڑکیوں کے اوپر اتنا بڑا کلنک لگانا چاہتے ہو؟"

نند پال نے مایوسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا "میں کیا کروں بتائیے۔ مجھے تو سماج کے ساتھ ہی چلنا پڑے گا۔ دونوں لڑکیاں کلکتہ میں دو دن گزار کر نہ آئی ہوتیں تو اتنا بڑا ہنگامہ کیوں کھڑا ہوتا؟"

ماسٹر صاحب غصے کے مارے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس کا مطلب ہے تم نے دونوں لڑکیوں کو راستے میں چھوڑ آنے کے لئے یہ سازش کی تھی۔ میں یہ بات سب کے سامنے کہتا ہوں۔ لعنت ہے۔ تم اپنی بے سہارا۔ یتیم اور دو دو بھتیجیوں کو اس طرح تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔"

نند پال نے اس بار غصہ ہو کر کہا "پاگلوں کی طرح اُلٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالو ماسٹر۔ میں نے برداشت کیا ہے۔"

نند پال کے بہت سے تابعدار وہاں اس کے اشارے پر ہم لوگوں پر جھپٹنے کے لئے ایک طرف تیار کھڑے تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ میز کے اوپر زور سے ہاتھ مار کر کہا "اُلٹی سیدھی باتیں منہ سے نہ نکالوں! سب! یہ میں تمہارے گھر میں کھڑا ہو کر کہے دیتا ہوں کہ تم پاپی شیطان اور ڈاکو ہو۔ دونوں لڑکیوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا نند کہ تم آسانی سے کامیاب ہو جاؤ گے۔ اپنے گھر میں ان لڑکیوں کو جگہ نہیں دیتے تو نہ دو۔ میں انہیں لئے جاتا ہوں۔ دیکھوں گا کہ تم معصوم لڑکیوں کو کس طرح دھوکا دیتے ہو!"

اس سادہ لوح اور زندہ دل انسانی چہرہ کے سامنے نند پال دل میں خواہ کچھ بھی سمجھتا ہو لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

ماسٹر صاحب نے دونوں لڑکیوں کو پکار کر کہا "چلو بیٹی چلو۔ یہ سالا تمہارا چچا نہیں چمار ہے!" لیکن لڑکیوں نے پھر بھی چچا کے قدموں میں گر کر کہا "چاچا جی۔ کیا ہم کو اس طرح وداع کریں گے!"

نند پال کو اب اپنا اصلی چہرہ دکھانے میں کوئی عار نہ تھی۔ جس کرسی پر بیٹھا تھا اس سے پیچھے سرکا کر دانت پیس کر بولا "مجھے اب کیوں پوچھتی ہو۔ کلکتہ میں جو یار بنائے ہیں اب انہی کے پاس جاؤ نہ!"

لڑنے پر آمادہ ہو کر شرت اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ماسٹر صاحب نے کڑک کر کہا "زبان سنبھال کر بات کرو نند۔ مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ۔"

نند پال اس بار بھی بُت کی مانند خاموش رہا۔ ماسٹر صاحب نے خود دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو بیٹی چلو۔ قصائی کے اندر رحم نہیں ہوتا؟"

آخر ماسٹر صاحب کے ساتھ جانے کے علاوہ ہمیں کوئی راہ نظر نہ آئی۔ ہم لوگ ماسٹر صاحب کے ساتھ باہر چلے آئے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ دونوں لڑکیوں کی جانے کی بالکل خواہش نہ تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر اپنے چچا کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید اب بھی انہیں اُمید تھی کہ ان کا چچا انہیں واپس بلا لے گا۔

باہر آتے ہی ماسٹر صاحب کا ایک نیا روپ نظر آیا۔ یکایک جیب سے اپنی زنگ آلود گھڑی نکال کر انہوں نے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم نے تعجب سے پوچھا "یہ کیا ماسٹر صاحب!" لیکن وہ اُس وقت تک کافی آگے نکل گئے تھے۔ دور سے ان کی آواز سنائی دی "ساڑھے گیارہ بجے کی ریل گاڑی پاس کر آئی ہے۔ آپ لوگ انہیں لے کر آئیے۔"

× × × × ×

ہم نے طے کیا تھا کہ دونوں لڑکیوں کو ماسٹر صاحب کے پاس چھوڑ کر ہم رُک کلکتہ واپس لوٹ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ماسٹر صاحب کے کوارٹر میں نہ جانے کیسے آگ لگ گئی۔ ان کا تھوڑا بہت ہی جلنے کا سامان تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح تھوڑی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر ہم نے بڑی کوششوں سے دروازہ کھول کر باہر نکل کر جان بچائی۔ لیکن سامان کافی جل گیا تھا۔ کمرے بھی رہنے کے لائق نہ رہے تھے۔

صبح ہمیشہ خوش رہنے والے ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے۔ دونوں لڑکیاں روتے روتے کہہ رہی تھیں، ان کی پھوٹی قسمت کی وجہ سے ہی ماسٹر صاحب کا اتنا نقصان ہوا۔ لیکن ماسٹر صاحب یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بار بار یہی کہہ رہے تھے۔ "یہ بڑھا تمہیں چند روز بھی نہ دے سکا بیٹی" پھر ہم سے بولے "اب کیا کریں بھائی!" کوئی چارہ نہ دیکھ کر رات کو ہی میں نے یہ بات سوچ لی تھی۔ ماسٹر صاحب کو تسلی دے کر کہا "آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد اس چھوٹے سے گاؤں کے تھوڑے دنوں کی جان پہچان کے ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر سے رخصت لیتے وقت واقعی ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ گاڑی چلنے پر ہماری کھڑکی کو پکڑ کر چھوٹے بچے کی مانند روتے روتے ماسٹر صاحب پلیٹ فارم کے دوسرے سرے تک دوڑے آئے۔ دونوں لڑکیوں نے آنسوؤں میں آنسو لئے کھڑکی سے سر نکال کر ان سے وداع لی۔ نصرت اپنی سمت دل کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس وقت دیکھا وہ بھی دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھا تھا۔ اس طرف دیکھنے کی اسکی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ اس گاؤں سے انسان کی یہ بہترین دیکھ کر ایک ایسے شخص کی یاد لے کر جاؤں گا۔ جو عمر بھر یاد آتا رہیگا

× × × × ×

ماسٹر صاحب کے ساتھ اب شاید زندگی بھر ملاقات نہ ہوگی آٹھ گز کی دھوتی باندھے۔ ننگے جسم۔ سر پر ٹوپی پہنے شاید وہ اب بھی اس چھوٹے سے سٹیشن پر ریل گاڑیوں کو "پاس" کراتے ہوں گے۔ میں نے یہ بھی نہ معلوم کیا کہ اس سٹیشن سے ان کی تبدیلی کسی دوسرے سٹیشن پر تو نہیں ہو گئی۔ لیکن پھر بھی جب انسان کی کینگی دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں۔ ماسٹر صاحب کی یاد سے کچھ تسلی ملتی ہے۔

ایک معمولی سے سٹیشن ماسٹر کی اتنی تعریف شاید سب کو اچھی معلوم نہ ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ خوش نصیب ہیں۔ جنہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کہ دنیا میں چالاک انسانوں کی کتنی کمی ہے۔

× × × × ×

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دونوں لڑکیوں کو کہاں چھوڑا۔ انکی جلدی جا کر ادا نہیں آ جتنا نہ مل سکی۔ لیکن انہیں اسکا کوئی افسوس نہیں کسی گاؤں میں گھر کے رشتہ داروں میں گھری ہونے پر بھی تنہائی محسوس کرنے والی ایک حسین لڑکی مایوس نظریں لئے خاوند کے بغیر ہی سسرال کی گرہستی زندگی چلا رہی ہے۔ اس کے دل کی بات تو بھگوان ہی جانیں۔ اسکا چہرہ دیکھ کر کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایک دن شمیم نے انکے چھوٹے سے کنبے پر اپنا بوجھ ڈالا تھا میں اس بات پر ناراض ہوا تھا۔ آج اچانک پہلے سے پوچھے بغیر میں نے اسی کے سر پر دو اجنبی لڑکیوں کا بوجھ ڈال دیا۔ اور اس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔

پہلے کی طرح ہی اس نے ہنس کر پوچھا "تم اتنے پتلے کیوں ہو گئے جی۔ میرے بارے میں تو نہیں سوچتے رہتے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اس بات کا حق تم نے مجھے کہاں دیا ہے؟"

منو نے ہنس کر کہا "یہ تو اچھی بات ہے۔ کسی کی ہو گئی ہے تمہیں تو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ مجھے تو سچ مچ رشک ہو رہا ہے۔" اسکے بعد کچھ دیر رک کر منو نے مجھ سے کہا "پھر کب تم راستے سے بے کس لڑکیوں کو سمیٹو گے۔ بتاؤ؟"

میں نے تعجب سے پوچھا "کیا مطلب؟"

"تبھی تو انہیں اس بدنصیب کے سر منڈھنے آ گئے۔ ورنہ تمہارے دوست بھلا کیسے ہوں گے!"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا "واقعی کیا تم نے یہاں سے نہ جانے کی ٹھان لی ہے منو؟" جواب میں اس نے بس تھوڑا سا سر ہلا دیا۔ اسکی آنکھوں میں نہ جانے کونسا جذبہ تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہی مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ بولی "شمیم دادا——

میرے بارے میں بہت فکر کرتے ہیں نہ ؟"

میں نے کہا "یہ شاید ان کی بے انصافی ہے "

" میری زندگی رائیگاں گئی۔ شمیم دادا یہ سوچ کر بہت افسوس کرتے ہیں نہ ؟"

اس بات کا میں کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔

منو نے کہا۔ "شمیم دادا سے ایک بات کہنا۔ کہنا کہ انسان کی ساری کہانیاں پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن قسمت کی ساری کہانیاں شروع ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بڑی مشکل سے ایک پوری ہوتی ہے۔ سارے دھاگے نہیں ملتے — شمیم دادا سے ایک بار مل جانے کے لئے کہنا "

کلکتہ واپس لوٹنے پر شمیم نے پوچھا "بستی پورا ہو گیا تھا یا نہیں ؟"

ساری داستان سنانے کے بعد میں نے کہا۔ "منو نے تمہیں ایک بار مل جانے کے لئے کہا ہے "

شمیم نے کچھ دیر خاموش رہکر یکایک بڑے جوش سے کہا۔ "ارے تجھ سے کہنا بھول گیا۔ بے باک کے دفتر میں ملازمت پکی ہو گئی ہے۔ میں نے اتنے دنوں مجھے تیرا کام چلا دیا۔ آج سے تجھے حاضر ہونا ہے "

"بے باک کے دفتر میں ہی ملازمت کر رہا ہوں "

جے نیندر کمار

ہندی کے سربرآوردہ ادیب جے نیندر کمار ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں گھر ہی پڑھ کے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے دو سال تک بنارس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے کالج چھوڑ دیا۔ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ آپ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار اور پھر ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء میں دوسری اور تیسری بار جیل گئے۔ چونکہ کوئی ملازمت نہیں کی۔ اس لئے آپ کو مستقل بیکار سمجھتے ہیں۔

آپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پھانسی" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اور اس وقت کے بعد سے آپ مسلسل ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ـــ ان دنوں آپ بہ دقت بہت کم لکھتے ہیں۔ آپ بولتے جاتے ہیں اور کوئی دوسرا لکھتا ہے۔ آپ افسانہ، ناول اور فلسفیانہ مقالوں کی دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔

وہ ہندی ادب کے میدان میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منشی پریم چند نے کہا۔ "تم گورکی کو ڈھونڈنا چاہتے ہو ہندوستان میں کوئی گورکی۔ ہو سکتا ہے تو وہ جے نیندر ہے"۔

جے نیندر کمار نے ۱۹۲۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ انھوں نے افسانہ پردازی کو محض ایک تفریح سمجھا تھا۔ لیکن ان کی نگارشات کچھ اتنی مقبول ہوئیں کہ انھوں نے عوام کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔

جے نیندر کمار ادب اور سیاست کے تعلق کو ناگزیر تو سمجھتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ سیاست کو ادب کی بلندی عطا کرنی چاہیئے جس طرح ٹالسٹائی نے سیاست کو ادب کی بلندی تک اٹھایا۔ اس طرح ادب کی حیثیت ہنگامی ہونے کی بجائے دوامی ہو جاتی ہے۔

جے نیندر کمار نے اپنی تخلیقات میں گاندھی جی کے فلسفہ کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ آپ منشی پریم چند سے بھی متاثر ہیں۔ آپ بھی منشی پریم چند کی طرح فرقہ پرستی کے مخالف تھے۔ اور اردو ہندی کے درمیان کسی خلیج کو گوارا نہیں کرتے۔

جے نیندر کمار ادب میں داخلیت پسندی کے زیادہ قائل ہیں۔ آپ ہندی کے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں اور آپ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں ـــ آپ چونکہ ایک غیر ریاستی سماج کے حامی ہیں اس لئے آپ کی تخلیقات میں آپ کے اس نظریے کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے نظریات میں کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں جس کی مثال آپ کا یہ ناولٹ "استعفا" ہے۔ اس ناولٹ میں خارجیت اور داخلیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ ناولٹ ہندی زبان میں بے حد مقبول ہوا ہے۔



جنیندر کمار

جے نیندر کمار

مترجمہ: شریف احمد

استعفا

نہیں بھائی (گناہ اور ثواب) پر تبصرہ مجھ سے نہ ہو گا جج ہوں، قانون کی ترازو کی اہمیت کو جانتا ہوں، مگر ـــــ تولنے والوں کی بے حسی سے بھی واقف ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ جن کے اوپر رائی رتی تول کر پاپ کو پاپ کہہ کر سماج کا نظام برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے وہ جانیں۔ میرے بس کا یہ کام نہیں۔ میری بُوا (پھوپی) گناہ گار نہیں تھیں، یہ کہنے والا بھی میں کون ہوں؟ مگر آج میرا دل ان کی جدائی کے لئے چار آنسو بہا سکتا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف طرح طرح کی عزت کی دیوار کھڑی کر کے خوب مضبوط جمالی ہے مخالف ہواؤں کی کوئی لہر سے پار کر کے مجھ تک نہیں آ سکتی۔ لیکن بُوا کی یاد جیسے میرے سارے وجود کو کھٹا کر دیتی ہے۔ کیا یہ یاد مجھے اب چین نہیں لینے دے گی؟ ابھی ان کے مرنے کی خبر پا کر بیٹھا ہوں۔ یہ تو ان کی موت کے دسیوں سال پہلے جانتا تھا۔ پھر بھی جاننا چاہتا ہوں، کہ آخر وقت کیا انہوں نے اپنے اس بھتیجے کو بھی یاد کیا تھا؟ یاد کیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم لوگوں کا اصلی گھر پہاڑوں کی طرف تھا۔ پتا معزز شخص تھے اور ماتا ایک اچھی گھر بارن۔ جتنی اپنے کام میں ماہر تھیں اتنی ہی نازک بھی ہوتیں تو؟ مگر نہیں، وہی تو پتا کے منہ میں نہیں بڑھنا ہوگا۔ بڑھے کر گئے۔ پھر تو ساری کہانی اس منہ میں سما جائے گی اور اس میں سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا، اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ ماتا جتنی ماہر تھیں، اتنی نازک نہیں تھیں۔ بُوا پتا جی سے کافی چھوٹی تھیں۔ مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑی ہوں گی۔ میری ماتا کی دیکھ ریکھ میں میری ہی طرح بُوا بھی رہتی تھیں۔ دیکھ ریکھ کوئی معمولی نہ تھی اور آج بھی میرے ذہن میں اس دیکھ ریکھ کی سختی کے فوائد اور نقصانات کا خیال آتا رہتا ہے۔

پتا جی کے دو بھائی تھے اور تین بہنیں۔ بھائی پہلے تو اور سیری میں یو پی کے ان ضلعوں میں رہے۔ پھر یکایک ان کی خواہش کے مطابق انہیں برما بھیج دیا گیا۔ تب سے وہ وہیں بس گئے اور رفتہ رفتہ آنا جانا ایک رسم کی بات رہ گئی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم سا ہو گیا۔ دو بڑی بہنیں شادی ہونے کے بعد زندگی میں چل بسیں۔ اکیلی یہ چھوٹی پھوپی رہ گئی تھیں۔ پتا جی ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی سب ہی خواہشیں پوری کرتے تھے۔ پتا جی کی یہ محبت بگاڑ نہ دے، اس بات کا میری ماتا کو خاص خیال رہتا تھا، وہ اپنی دیکھ ریکھ میں چوکسی تھیں۔ میری پھوپی سے کم محبت کرتی تھیں۔ یہ تو کسی حالت میں بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن آریہ گھر بارن کا جو ان کے ذہن میں آدرش تھا، پھوپی کو وہ ٹھیک اسی کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھیں۔

پھوپی کا تب کا روپ سوچتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ ایسا حُسن خدا کب کسی کو دیتا ہے اور جب دیتا ہے تب شاید اس کی قیمت وصول کرنے کی بھی نیت ہوتی ہے۔ پتا جی تو پھوپی کی موہنی صورت پر جان چھڑکتے تھے۔ خیر! اس بات کو چھوڑیئے۔ میری اور پھوپی کی خوب بنتی تھی۔ وہ شہر کے بڑے اسکول میں بگھی میں بیٹھ کر پڑھنے جاتی تھیں اور گھر آ کر جو نئی شرارتیں وہاں ہوتیں اکیلے میں مجھے سناتی تھیں: "آج ماسٹر جی کو ایسا بنایا، ایسا بنایا، کہ بس موہے کیا بتاؤں؟" کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر اتنے زور سے ہنستیں کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔ اس وقت مجھے کہانی کی پریوں کا خیال آتا اور میں مورت کی طرح اپنی پھوپی کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

کہتیں: "اور سُنو، وہ ہیں نہیں حساب کے ماسٹر، شیلا نے ان کی کرسی کی گدی میں پن چبھو کر رکھ دی شیلا بڑی شریر ہے۔ ماسٹر کی ایک آنکھ تو نے نہیں دیکھی؟ خود ماسٹر جی دیکھتے اس طرف ہیں تو وہ آنکھ کسی اور ہی طرف کو دیکھتی ہے۔ پن جو چبھی تو خوب بگڑے، خوب بگڑے، ڈپٹ بولے، یہ کس کی شرارت ہے ـــ؟ وہ کھڑی ہو جاتے۔ سب لڑکیاں سہم گئیں۔ شیلا تو بس ایسی ہو گئی جیسی مٹھائی کے آگے گائے۔ ماسٹر نے

بید کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "میں کسی ایک کو معاف نہیں کروں گا" اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں بڑا غصہ آ رہا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر سب لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں ــــ یہ مجھے بڑا بُرا لگا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا، "یہ میرا قصور ہے ماسٹر جی۔" ماسٹر جی پہلے تو مجھے دیکھتے رہے پھر بولے، "یہاں آؤ" میں چلی گئی۔ کہا "ہاتھ پھیلاؤ" میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُس پھیلی ہتھیلی پر انھوں نے دو تین بید جڑ دیئے۔ میں سمجھتی تھی کہ ابھی اور ماریں گے لیکن جب بید انھوں نے ہاتھ سے الگ کر دیا تو میں نے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیا ــــ سچ! پرمود میرے پر اثر تک بھی نہ ہوا۔ میں اُن کی اس آنکھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر جی مجھے دیکھ رہے تھے، لیکن وہ آنکھ نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی ــــ پرمود! تو ماسٹر جی کو ایک بار تو ضرور دیکھ ــــ پھر ماسٹر جی نے چیخ کر کہا: "اب تو نہیں کرے گی"؟ میں چپ چاپ کھڑی رہی اور سوچتی رہی کہ ایک بار تو مجھے بھی سچ مچ کا قصور ہی کرنا چاہیئے ــــ ماسٹر جی بولے "جاؤ" میں اپنی جگہ پر آ گئی۔ شیلا میرے پاس بیٹھتی ہے۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے کھا ہی تو جائے گی۔ میں نے کہا: "ہٹ پگلی"۔ اُس نے میرے ہاتھ کو ڈسک پر رکھے رکھے اپنے ہاتھ سے دبا دیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑی پگلی لڑکی ہے یہ شیلا بھی ــــ میں نے کہا: "شیلا کیا کر رہی ہے؟ اری دیکھ! ماسٹر جی کی وہ آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے"۔ پرمود، تو شیلا کو جانتا ہے۔ شیلا بڑی اچھی لڑکی ہے، لیکن بڑی نٹ کھٹ بھی ہے ــــ ہم دونوں بڑی اچھی سہیلی ہیں ایک دوسرے کی ــــ لیکن وہ ہے پگلی ــــ اسکول سے میں آنے لگی تو اور کچھ نہیں تو میرے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا میں نے اس کے گال پر ایک چپت رسید کیا اور بولی: "یہ کیا ہے شیلا؟" وہ بلک بلک کر روتی رہی۔ بولی: "کچھ نہیں" پرمود مجھے ایک دن شیلا کے گھر لے چلوں گی۔ چلے گا نا؟"

یکایک نہ جانے انھیں کیا یاد آ جاتا ــــ چونک کر کہتیں۔ "ارے چل! نہیں تو تیری ماں بگڑے گی"۔ میری ماں سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھیں اور انھیں میرے سامنے ہمیشہ "میری ماں" کہا کرتی تھیں۔

بُوا کا پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دل نہیں لگتا تھا لیکن ان کی کتابیں کاپیاں بڑے سلیقے سے رکھی تھیں اسکول بڑے چاؤ سے جاتی تھیں۔ ویسے بڑی خوش مزاج تھیں بس ماں کے سامنے کچھ جھجک سی محسوس کرتی تھیں۔ بچپن کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں ــــ وہ کیسے مجھے کپڑے پہناتیں، کیسے چپت مار مار کر کھلاتیں، کیسے پیار کرتیں، اور کیسے اپنے راز کی باتیں مجھے بتاتی تھیں ــــ یہ سب کچھ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔

دن گزرتے گئے۔ میں بڑا ہوتا گیا اور پھوپی کو بھی شعور آتا گیا۔ مجھے انکی موجودگی میں ایک عجیب قسم کا اطمینان سا ملتا تھا، اور انکے ساتھ کا میں ہمیشہ بھوکا رہتا تھا جب بھی ملتیں، پیاری پیاری نصیحتیں کرتیں۔ "دیکھو بیٹا! بڑوں کا کہنا ماننا چاہیئے۔ اچھے لڑکے آگے چل کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔ کیوں پرمود بھیا! تم بڑے آدمی نہیں بنو گے ــــ" کبھی وہ مجھے بیٹا کہتیں، کبھی بھیا اور کبھی گدھے کا لقب بھی دیدیا کرتیں۔

نویں درجے میں تھیں یا دسویں میں مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں میری عمر کوئی بارہ سال کی ہو گی۔ میرا دل اس وقت صرف اُنھیں کے بس میں تھا۔ دراصل وہ مجھے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ان کے پیار کا رُخ بدل گیا ہے۔ وہ مجھے اب نصیحتیں نہ کرتیں بلکہ سینے سے لگا کر نہ جانے کہاں دیکھنے لگتی تھیں۔ نہ اب وہ مجھ سے زیادہ باتیں ہی کرتیں ــــ میں پوچھتا: "پھوپی! کیا بات ہے آج اسکول میں کیا ہوا؟" اس پر وہ کہتیں: "کچھ نہیں بھیا! کچھ بھی تو نہیں"۔ یہ کہہ کر جیسے اُن سے میری طرف دیکھا نہ جاتا۔ تب میں ہاتھ پکڑ کر ٹھیک اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا: "دیکھو، پھوپی، تم ہمیں کچھ نہیں بتاتیں"۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتیں اور داہنے ہاتھ سے چپت مار کر کہتیں: "ہے نا پرمود بالکل پاگل"!

میں نے انھیں دنوں یہ بھی محسوس کیا کہ تنہائی اب انھیں بُری لگتی تھی۔ شام کے وقت چھت پر کھٹولا ڈالے کبھی آسمان پر اُڑتی ہوئی چیلوں کو دیکھتیں، کبھی پتنگوں کے پیچ دیکھتے ہوئے اتنی محو ہوتیں کہ کٹی ہوئی پتنگ کا تعاقب انکی نگاہیں اس وقت تک کرتیں جب تک کہ وہ غائب نہ ہو جاتی اور نہیں تو کھرے کھٹولے پر پیٹ کے بل لیٹ جاتیں اور تنکے سے زمین پہ بے ڈھنگے نقش و نگار بنانے لگتیں۔ جب میں اوپر پہنچتا تو انھیں اس حالت میں دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا۔ جب انھیں میرے آنے کا احساس ہوتا تو دفعتاً چونک کر کہتیں "ارے پرمود! تو کہاں تھا؟"

"یہیں تھا۔"

"کیوں رے! تو اب مجھ سے بولتا بھی نہیں"

میں بغیر جواب دئے انکے پاس کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ وہ دھیرے دھیرے مجھے اپنے اوپر ہی گھسیٹ لیتی اور کہتی۔ دیکھ! پتنگ دیکھ!"

کچھ دیر تامل کے بعد کہتیں: "پتنگ تجھے اچھی لگتی ہے"؟

میں کہتا "ہاں"!

"تو پتنگ اُڑائے گا"؟

میں کہتا "بابو جی منع کرتے ہیں"

اُس پر وہ یکایک مجھے آغوش میں لے لیتیں اور کہتیں۔ "ہم تم دونوں ساتھ ساتھ پتنگ اُڑائیں گے — ایسی پتنگ جو سب سے نرالی، سب سے دُور ہو گی، کیوں پرمود! سب سے اونچی پتنگ اُڑائے گا نا"؟

میں کہتا، "پیسے دو، میں لاؤں"

وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہتیں۔ ان کی نگاہیں بظاہر میری طرف ہوتی تھیں لیکن دراصل مجھ سے بہت دُور خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہوتی تھیں۔ پھر ایک دم چونک پڑتیں۔ کسی قدر لجا کر دھیمی آواز سے کہتیں: "چل رے پتنگ سے بالک گر پڑتے ہیں"

انھیں دنوں کی بات ہے۔ ایک روز اسکول سے وہ خلافِ معمول کافی دیر میں لوٹیں۔ ماں نے پوچھا "کہاں رہ گئی تھی"؟

"شیلا کے گھر گئی تھی۔"

ماں سُن کر خاموش ہو گئیں۔

اُس دن سے بُوا میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی، لیکن یہ بے چینی تھی مسرت انگیز۔ وہ خوش رہنے لگیں۔ کام کاج سے طبیعت اُکتا گئی۔ انھوں نے میرے ساتھ طرح طرح کی تجویزیں رکھیں طرح طرح کی باتیں کیں۔ "پرمود! ایک دن نہر کے پُل پہ چلنا چاہئے، چلو گے؟ بتاؤ تمہیں کونسی مٹھائی پسند ہے؟ — گھیور — ہشت — گھیور بھی کوئی مٹھائی ہے۔ دیکھو تم پتنگ نہیں لائے نا — پرمود میں شیلا کے یہاں رہ گئی تھی تیری ماں کو تو کچھ خیال نہ ہوا ہوگا۔ چل رے چل پرمود، یہاں کیا کمرے میں بیٹھے ہیں چل کر اوپر ہوا میں بیٹھیں گے — ایک بات کہتیں کر جھٹ بھول جاتیں۔ اُس وقت انکے دل میں کچھ ٹھہرتا ہی نہ تھا، بے اثر بات ہو یا اثر۔ انکے لئے سب برابر تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا اُن کا پُورا وجود ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے اور دل ہے کہ باہر نکل کر اُڑ جانا چاہتا ہے۔ وہ بے بات ہنستی اور بے بات مجھے پکڑ کر اِدھر اُدھر کھینچتیں۔ اُس دن وہ میری سمجھ سے باہر تھیں۔ میں نے کہا۔ "بُوا، آج کیا بات ہے"؟

بولیں "میں بُوا ہوں۔ کیا بُوا" مجھے اچھا نہیں لگتا پرمود تو مجھے جی جی کہا کر۔ شیلا بھی تو مجھے جی جی کہتی ہے"

میں نے کہا "میری تو بُوا ہو"

"میں بُوا نہیں ہونا چاہتی — بُوا.... اچھی دیکھ تو سہی۔ چڑیا کتنی اونچی اُڑ رہی ہے۔ میں چڑیا ہونا چاہتی ہوں"

میں نے کہا "چڑیا"؟

"بولیں، "ہاں، چڑیا! کتنے نرم اور نازک پر ہوتے ہیں اس کے کتنی آزاد! پر تولے اور جہاں جی چاہا آسمان میں اُڑ گئی کیا مزے کی بات ہے، ننھی منی چڑیا، ننھی منی بوندھ... میں چڑیا بننا چاہتی ہوں۔

اُس دن وہ رات گئے تک مجھے اپنے سے چپٹائے رہیں

ایک بار پوچھ بیٹھیں: "کیوں پرمود، تو مجھے پیار کرتا ہے"؟ اتنا سنتا تھا کہ بغیر کچھ کہے سنے میں نے اپنا منہ اُن کی چھاتیوں میں چھپا دیا۔ اس پر وہ بولیں: "پرمود، میں تجھے بہت چاہتی ہوں"۔

اس دن کے بعد کئی دن تک وہ روز اسکول سے دیر میں واپس آتی رہیں۔ اور ایک دن تو اتنی دیر ہو گئی کہ انھیں بلانے کے لئے نوکر بھیجنا پڑا۔ نوکر انھیں سشیلا کے گھر سے لے آیا۔

اُس سے تین دن بعد کی بات ہے کہ میں گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ماں غیظ و غضب میں بھری چیختی جا رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر کسی قدر جھجکیں اور بولیں: "کیوں رے، کہاں تھا اب تک"؟

اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے جواب بن نہ پڑا۔

"پپو۔ بھاگ کے بید تو لے آ"۔

مجھے کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ماں کی تیزی اور غصے سے یہی سمجھا کہ میری ہی گھر شامت ہوگی — ایک دم بابوجی کے کمرے میں جا، بید اُٹھا لایا۔ ماں نے ایک جھٹکے سے بید میرے ہاتھ سے چھین لیا اور خاموش پچھلے کمرے کی طرف لوٹ گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے کواڑ بند کر لیے۔ اور پھر سڑائیں سڑائیں کسی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میرے پیر جیسے فرش میں گڑ گئے۔ بید کی پہلی ضرب پر تو ایک چیخ سنائی دی لیکن پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ بید کی سڑائیں سڑائیں پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں بوا تو نہیں ہیں۔ لیکن یہ شک شک ہی رہا، کوئی بات ایسی معلوم نہیں ہوئی جس سے میرا شک یقین میں بدل جاتا۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہاں کھڑا رہنا ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماں نے دروازہ کھولا اور باہر آئیں — ان کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، جس ہاتھ میں بید تھا، وہ بری طرح لرز رہا تھا۔ چہرے پر خاک سی اُڑ رہی تھی۔ اُن کی وحشت سے گمان ہوتا کہ اگلے لمحے وہ کہیں اپنے آپ کو ہی پیٹنا شروع نہ کر دیں۔ جیسے اپنے پر اب تک ہاتھ نہ اُٹھانا اُن پر بڑا گراں گزر رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے میرے سامنے سے ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ پھر جاتے جاتے یک بیک دروازے پر رُکیں اور بید زور سے دالان میں پھینک دیا۔ بید میرے پاس آ کر گر پڑا۔

کچھ دیر کے لئے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ بس یوں ہی سُٹ پٹایا سا کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہمت کر کے میں اُس کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر جا کر دیکھا تو بوا اوندھی پڑی ہیں۔ ساڑی جگہ جگہ سے بے جگہ ہو گئی ہے۔ اور کئی جگہ پے در پے خراش پڑنے سے اس کا کپڑا چھلنی ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں۔ کئی جگہ خون بھی چھلک آیا ہے۔ بوا بے ہوش سی پڑی ہیں۔ نہ روتی ہیں، نہ سسکتی ہیں۔ بال بکھرے ہیں۔ زمین پر پڑی دونوں بانہوں پر ماتھا ٹِکا ہوا ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھنا میرے لئے وبال ہو گیا۔ زبان پر جیسے کسی نے قفل لگا دیا۔ پھوپی کے گلے لگ کر تھوڑی دیر رو بھی لیتا تو بھی شاید طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ لیکن میرے لیے یہ بھی ناممکن تھا۔ اسی کش مکش میں وہاں سے دبے پاؤں لوٹ آیا۔

اس واقعہ کے بعد پھوپی ہنسنا بھول گئیں۔ پانچ چھ مہینے کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ ماں نے بڑی مستعدی سے جلدی جلدی تمام انتظام کر دیا۔ اور وہی دن پھوپی کے اسکول کا آخری دن تھا۔ اس دن سے وہ سینے پرونے، جھاڑو بہارو اور خانہ داری کے دوسرے کاموں میں بڑی خاموشی سے مصروف ہو گئیں۔ کام کرنے کے علاوہ انھیں اور کسی بات سے مطلب تھا نہ غرض۔ نہ وہ کسی کی نگاہوں میں چڑھنا چاہتی تھیں۔ دھوبی کے یہاں کے دھلے کپڑے اب وہ پہلے کی طرح جلدی جلدی میلے نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے بچی بچی اور کترائی کترائی سی رہتی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ بابوجی کا چہرہ بھی کافی گمبھیر ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی بوا سے ہنسی مذاق کرتے لیکن بوا کے پاس جواب میں صرف خاموشی، اور متانت دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ماں کی حالت تھی۔ بات بات پر مجھے ڈانٹتیں ڈپٹتیں۔ نوکروں بیچاروں کی تو شامت آ گئی تھی۔ خود کام کرتی ہوں یا نوکروں پر ڈانٹ ڈپٹ کی

ہوتی رہتی ہوں، بچا بچ بڑا عجیب بے جھل انداز سے نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک دم بھڑک پڑتی تھیں۔ میں سامنے ہوا اور فوراً گرجی داغی۔

"آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے، پرمود؟ بڑا ہے، بڑا اور جھاڑ نہیں دے سکتا۔ — آجکل کے لڑکے بڑے کام چور ہوتے ہیں"

کبھی حکم ہوتا۔

"کہاں گیا یہ منی؟ نہیں ہے؟ نہیں ہے؟ سارا کام بیچاری بڑی کو کرنا پڑتا ہے — خیر کوئی بات نہیں — ایک پیسہ کا نوکر — یہ نوکر بڑے حرام خور ہوتے جاتے ہیں"

اس طرح کی بہت سی باتیں تھیں جو روزانہ ماں سے سننے میں آتی تھیں۔ یہ سب تو تھا لیکن بڑا سے وہ سب سے منہ بات بھی نہ کرتی تھیں۔

یوں ہی شادی کے دن قریب سے قریب تر ہونے گئے اور ایک دن شادی بھی ہوگئی۔ شادی سے پہلے بڑا نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور گھنٹوں آنسو بہاتی رہیں۔ مجھے نصیحت کی: "بیٹا، پرمود بزرگوں کا حکم ہمیشہ بجا لانا چاہیئے۔ ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے۔ یہی طریقہ اچھے لڑکے بننے کا ہے۔ پرمود، تو ایک دن بڑا آدمی بنے گا نا؟"

میں اس وقت تک بچہ نہ رہا تھا، کافی بڑا ہو چلا تھا، پھر بھی اُس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں بڑا کی گود میں چپ چاپ پڑا رہا۔

بڑا بولیں: "پرمود، تیری بڑا تو مرگئی۔ اب اُسے کبھی یاد مت کرنا۔ میرا راجہ بیٹا بڑا اچھا ہے"

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن میں نے بڑا کو پتہ نہ چلنے دیا اور اُن کی گود میں دبکا پڑا رہا۔

بڑا کی رخصت کے وقت میں خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ میں نے کسی کی شرم نہ کی۔ میں نے مچل کر گھونگھٹ والی بڑا کا آنچل پکڑ لیا۔ اور گلوگیر آواز سے کہا: "میں بغیر بڑا کے نہ کھانا کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا"

ماں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا: "تو راکشس ہے اور میں اس گھر میں پیر بھی نہیں رکھوں گا" اس کا جواب مجھے وہیں مل گیا۔ لیکن ماں سے نہیں۔ بابوجی نے گرجتے کرتے دو تین چپت رسید کر دیئے۔ لیکن میں بھی اتنا سستا چھوٹنے والا تھوڑی تھا۔ چپت کھا کر آنچل چھوڑا تو بڑا کے پیروں سے لپٹ گیا۔ پیروں کے بچھوؤں کو میں نے زور سے پکڑ لیا، اس پر بڑا نے مجھے اپنے قدموں میں سے اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا گھونگھٹ میں ان کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ انھوں نے میری ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں لی اور میرے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"پرمود، تو میری بات نہیں مانے گا؟ مجھے جانے دے بیٹا۔ میں جلدی آجاؤں گی"

بڑا کے چہرے پر آنسوؤں کے موتی بکھرے پڑے تھے۔ ان موتیوں نے میری ضد کو موم بنا کر پگھلا دیا۔ میں نے پوچھا۔

"جلدی آجاؤ گی"؟

"جلدی آؤں گی"

"میری قسم کھاؤ"

"اپنے پرمود کی قسم"

پاس ہی ماں کھڑی تھیں۔ اُن کا منہ بھی سُستا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر جی میں آیا کہ کیوں نہ میں اُن کے گلے لگ جاؤں اور چیخ کر کہوں "ماں، میری ماں" اتنے میں بڑا نے میرے ہاتھ میں ایک ریشم کا رومال تھما دیا اور دوسرے لمحے خود تیزی سے چل دیں۔ میں سنبھلنے بھی نہ پایا کہ موٹر دروازے کے آگے سے روانہ ہوگئی۔

(۲)

بڑا کے چلے جانے کے بعد گھر سے میرا دل بالکل اُچاٹ ہوگیا۔ ماں مجھے سمجھاتی تھیں اور کبھی کبھی میں بھی ماں کو سمجھایا کرتا تھا۔ لیکن شادی کی دھوم دھام کے بعد گھر کی خاموشی کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

چوتھے روز بڑا آگئیں۔ شادی کے وقت میں نے پھوپھا کو دیکھا تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں تھیں، عمر بھی کافی معلوم ہوتی تھی۔

اچھے خاصے گرانڈیل تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ انکی دوسری شادی تھی۔ ہماری بُوا انکے سامنے بالکل تھپول سی معلوم ہوتی تھیں سسرال سے وہ جب آئیں تو میرے لئے طرح طرح کی چیزیں لے کر آئیں۔ مجھے الگ لے جا کر بیٹھنے لگیں۔

"پرمود۔ دیکھے گا میں تیرے لیے کیا کیا لے کر آئی ہوں"!

لیکن میں اُن چیزوں کا بہت آرزومند نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ بُوا مجھ سے باتیں کریں جس طرح پہلے ہر سکھ دُکھ کی بات کرتی تھیں اب بھی بتائیں کہ سسرال میں اُن پر کیا گذری۔؟ چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے؟ طبیعت بجھی بجھی سی کیوں ہے۔ دیکھو! بُوا میں وہی پرمود ہوں — میں اب بچہ نہیں رہا۔ ذرا کہہ کر دیکھو میں تمہارا سارا دُکھ سمجھ لونگا۔ میں اب رُو رو کر ناک میں دم کرنے والا بچہ نہیں ہوں جس نے تمھیں تکلیف پہنچائی ہوگی میں اس کی طبیعت دُرست کر دونگا۔ یہ چیز ویز مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

مجھے اپنے دل کا حال نہیں بتلاؤ گی بُوا؟

میں بغیر لب ہلائے یہ سب کچھ اُن سے کہہ دینا چاہتا تھا مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولیں "کیوں رے، اپنی چیز نہیں لے گا۔؟ چپ کیوں ہے"؟

میں نے ان کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا "دکھاؤ"

بُوا حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر پوچھا "یہ تو کیسے بول رہا ہے،

ہوا کیا ہے تجھے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں"

"پھر کیا بات ہے"۔؟

میں نے کہا "تم مجھے پہلے جیسا اب نہیں چاہتی ہو"

شاید انھیں یہ بات لگ گئی۔ بولیں "یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔

اگر پہلے جیسا نہیں چاہتی تو اب کیسا چاہتی ہوں"۔

"مجھے غیر سمجھتی ہو"

شاید اس کی انھیں توقع نہ تھی۔ وہ حیرت اور یاس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں، پرمود، سچ تو یہ ہے کہ میں ہی پرائی ہوگئی ہوں۔ تم سب لوگوں کے لئے غیر ہوگئی ہوں۔ تیری ماں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دھکا دے کر غیر بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں مجھے بھیجا گیا ہے پرمود، وہاں کا میرا دل نہیں۔ تو ایک کام کرے گا۔؟"

میں بے چین اور مشتاق نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

چاہتا تھا کہدوں کہ اگر تمہارا کام نہیں کرونگا تو پھر پرمود بن کر میں نے یہ جنم پایا ہی کیوں ہے؟

"کرے گا"؟

وہ بارہ یہ سوال سُن کر میں بڑی سُرعت سے انکی گود سے اُٹھ بیٹھا۔

اور کہا۔ کہو، بُوا، ابھی کروں گا۔"

وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں، پھر کسی قدر خفیف ہو کر بولیں،

"نہیں نہیں، کچھ نہیں۔"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سچ سچ بتاؤ بُوا، میں ضرور کروں گا۔"

"سسرال کے جائے گا۔"؟

"جاؤں گا"!

"جا کر کیا کرے گا۔"؟

میں سوالیہ نشان بنا انکی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولیں نہیں، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ کوئی کام نہیں"۔

اس کے بعد اپنی لائی ہوئی چیزیں زبردستی مجھے دکھانے لگیں ان چیزوں میں ایک بندوق بھی تھی۔ بندوق مجھے بہت پسند آئی بُوا نے دریافت کیا۔ "بندوق تجھے بہت اچھی لگتی ہے"؟

میں نے کہا، "بندوق سے کوؤں کو ماروں گا، یہ کوے مجھے بہت بُرے لگتے ہیں"۔

بُوا بولیں، "بندوق سے آدمی بھی مر جاتے ہیں۔ اسی لئے میں کھلونا لائی ہوں۔ مرنا کسے کہتے ہیں، تو جانتا ہے"۔؟

"جانتا ہوں۔"

"بھاگ گیا"؟

"مر کر آدمی — بس مر جاتا ہے"

بڑا ہنس پڑیں۔ لیکن پھر جلد ہی خاموش ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔

"میں مر جاؤں تو کیا کرے گا تُو"؟

جواب میں میں انھیں گھورتا رہا۔ میں کہہ دینا چاہتا تھا کہ میں اب بچہ نہیں ہوں۔ اس قسم کی ساری باتیں جانتا ہوں۔ گستاخی معاف! یہ باتیں اچھی نہیں ہیں۔ اگر وہ مر سکتی ہیں تو کیا میں نہیں مر سکتا۔ میں بڑے آرام سے مر سکتا ہوں۔ انھیں معلوم نہیں کہ میں کس آسانی سے مر سکتا ہوں۔ میں ان کے بعد زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب تک زندہ ہوں دیکھوں گا کہ انھیں کون مارتا ہے؟

اگلے دن ایک پرچہ دے کر انھوں نے مجھے شیلا کے یہاں بھیج دیا۔ میں شیلا کو جانتا تھا لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ اس کے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں۔ پرچہ صرف انھیں کے ہاتھ میں دینے کے لئے کہا گیا تھا۔ شیلا کے بڑے بھائی مجھے بہت اچھے لگے۔ لیکن پرچے کو وہ ایسی سوچ میں پڑ گئے کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں ان کے پاس کھڑا ہوں۔ میں نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ لیکن جلد ہی وہ لوٹ آئے۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز سے مجھے گود میں لے لیا، رخساروں پر بوسے دیئے، کندھے پر بٹھالیا اور نہ جانے کتنی قسم کی چیزیں مجھے دے ڈالیں۔ شیلا بھی مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں سوچنے لگا کوئی بہانہ ملے تو میں روز یہاں آیا کروں۔ اتنی دیر میں شیلا کے بھائی نے ایک خط لکھ کر میری جیب میں رکھ دیا۔ کہنے لگے: "تمہارا نام پرمود ہے نا! بڑے بہادر ہو تم" یہ کہہ کر مجھے پھر زمین سے بہت اوپر اٹھا کر چوم لیا، پھر بولے۔

"یہ خط اپنی بُوا کو دے دینا۔ دو گے نا"!

اگر ماں کے لئے خط ہوتا تب بھی میں پہلے بُوا ہی کو دیتا اور اب تو خط ہی بُوا کے لئے تھا — میں نے کوئی جواب دیا خاموش ہو رہا۔

شیلا کے بھائی نے میرے کوٹ کی دونوں جیبیں چاکلیٹ سے بھر دیں اور کہا۔

"تم بڑے پیارے لڑکے ہو۔ کونسی کلاس میں پڑھتے ہو"؟

"ساتویں میں"

"بہت خوب۔ پرمود، جا کر کہنا کہ میں ابھی ایک مہینہ یہاں اور رہوں۔ سمجھے نا"

میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"کیا سمجھے"؟

"— میں ایک مہینہ یہاں اور رہوں"

شیلا کے بھائی اس پر خوب ہنسے۔

"تم نہیں بھائی — میں، میں، میں"

دیا ہوا خط لفافے میں بند نہ تھا۔ اور اسی طرح بُوا نے بھی کاغذ موڑ کر دیا تھا۔ لیکن شیلا کے بھائی مجھے اتنے اچھے لگے کہ میں ان کی تحریر کی خوبصورتی بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے حروف مجھے بڑے پیارے معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کبھی اتنی اچھی انگریزی لکھ سکوں گا یا نہیں خط کے اوپر ایک کونے میں "مائی ڈیر" تو مجھے اتنا اچھا معلوم ہوا کہ بہت دنوں تک اپنے خطوں میں بالکل اسی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ گھر آ کر میں نے خط بُوا کے حوالے کر دیا۔ اور فوراً ہی کھول کر انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کوئی بہت لمبا چوڑا نہ تھا، پھر بھی وہ کئی منٹ تک اسے پڑھتی رہیں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ یہ کام میں نے کیا تھا۔ میری بھی کچھ اہمیت ہے، اور میں پاس ہی کھڑا ہوں۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے اس پرچے سے نظریں ہٹائیں۔ پرچے کو آہستہ سے تہ کیا اور میری طرف دیکھا، اس طرح جیسے مجھے پہچان نہ رہی تھیں، جیسے سب کچھ بھول گئی تھیں کہ کیا تھا، کیا ہے اور کیا ہوگا —؟ پھر اسی کھوئے کھوئے انداز سے اس پرچے کے بہت سے ننھے ننھے ٹکڑے کر دیئے۔ ان کے ہاتھ مجھے مشین کی طرح تیز چلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کام وہ نہیں کر رہی تھیں، کوئی اور ہی کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے حواس بحال ہوئے۔ گویا انھوں نے اب پھر کچھ کچھ دنیا کو سمجھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد بولیں "پرمود اب تو وہاں کبھی مت جانا، تجھ سے جواب لانے کو کس نے کہا تھا؟ کبھی کسی کا خط لانے کی ضرورت نہیں، سمجھا۔

میں کچھ نہ سمجھا تھا۔

وہ بولیں: "تو اتنا ناسمجھ کیوں ہے پرمود، تو نہیں جانتا کہ میری شادی ہوگئی ہے۔؟"

میں نے کہا: "جانتا ہوں۔"

بولیں، "تو کچھ نہیں جانتا، تو گدھا ہے۔ میرے دل میں آگ لگ رہی ہے۔۔۔!"

میں چپ رہ گیا۔

"۔۔۔۔۔ تو جانتا ہے دل کی آگ کیا ہوتی ہے۔"؟

دل کی آگ کو سچ مچ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس وقت بوا کو دیکھ کر اور انکے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی اس مسکراہٹ کو دیکھ کر جو ایک پل میں غائب ہوگئی تھی، میرا دل بھر آیا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح میں انکے کام آجاؤں، کوئی ایسا کام کروں کہ ان کا جی ہلکا ہو جائے۔ اور کچھ نہیں تو انکے گلے لگ کر رو ہی پڑوں۔

انھوں نے کہا: "دیکھ پرمود، شیلا کے بھائی کا کوئی پیغام آیا تو میں چھت سے کود پڑوں گی۔ سمجھے! انھوں نے سمجھا کیا ہے؟"

میں کہنا چاہتا تھا کہ شیلا کے بھائی نے کہا ہے کہ ابھی ایک مہینہ وہ یہاں اور رہیں گے اور یہ کہ وہ مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن انھوں نے موقعہ ہی نہ دیا۔ فوراً بولیں۔ "جاکر شیلا سے کہدینا، سچ کہتی ہوں میں مر جاؤں گی۔ ہرنال کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔"

یہ انھوں نے اس طرح کہا کہ جیسے ابھی انھیں بہت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ابھی تو انھیں پورے طور پر سمجھنا سمجھانا ہے کہ اس حالت میں انھیں مرنا ہی ہوگا۔ کسی قسم کا سوچ وچار اس کے علاوہ بیکار ہے۔

اس بار ہمارے یہاں انھیں چار پانچ دن ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد پھوپا آکر انھیں سسرال لے جانے والے تھے۔ سسرال جانے کے لئے وہ رضامند معلوم نہ ہوتی تھیں۔ جوں جوں جانے کا دن نزدیک آتا جاتا توں توں ان کی نگاہیں بندھی سی جا رہی تھیں۔ جہاں دیکھتیں بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ جیسے انھیں کچھ دکھتا ہی نہیں تھا بس قسمت دیکھتی تھی جس کے لکھے کو پڑھنا بہت مشکل ہے۔ وہ سر سے پیر تک سوال بن گئی تھیں، انکا چہرہ، ان کی نگاہیں نہ جانے کس سوال کا جواب پوچھنا چاہتی تھیں۔

اگلے روز پھوپا آنے والے تھے۔ رات کو انکی طبیعت بگڑی بگڑی سی ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے میں ایک کمزور سے تخت پر بیٹھی تھیں۔ مجھ سے بولیں: "پرمود، کل میں چلی جاؤں گی۔"

میں کچھ نہ بولا۔ سر داب رہا تھا۔

کہنے لگیں: "بس، اب رہنے دے۔"

میں نے کہا، "دوا تو تم پیتی نہیں ہو۔"

اس پر مجھے مسلسل کئی منٹ تک دیکھتی رہیں۔ کچھ رک کر بولیں: "ایک کام کرے گا پرمود۔ شیلا کے بھائی ڈاکٹری پڑھتے ہیں۔ دوا کا نام لکھے دیتی ہوں، تو ان سے لے آئے گا۔"؟

میں کیوں نہ لے آتا۔ انھوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر انگریزی میں کچھ لکھ دیا۔ اور میں اسے لے کر دوڑ گیا۔ لیکن اس پرزے میں نہ جانے کیا تھا کہ شیلا کے بھائی اسے پڑھ کر مجھے مارنے پر تل گئے۔ دھمکا کر پوچھا؟ "یہ کیا ہے؟"

"بوا نے دوا منگائی ہے۔"

"دوا"؟

"ہاں، دوا۔ ان کے سر میں درد ہے۔"

شیلا کے بھائی نے آگے کچھ نہ کہا۔ وہ تیزی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ کاغذ تڑا مڑا کر انکے ہاتھ میں گولی ہوگیا۔ اس کاغذ کی گولی پر انکی چٹکی سخت ہوگئی، اتنی سخت کہ انکے ہاتھ کا تناؤ دیکھ کر میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال پیدا ہونے لگے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے ہمت کر کے پوچھا: "میں جاؤں"؟

شیلا کے بھائی رک گئے۔ مجھے دیکھ کر نرمی سے بولے: "میں چل کر انکی طبیعت کا حال دیکھ نہیں سکتا ہوں؟ پرمود، مجھے لے چلوگے"؟

میں نے کہا: "نہیں۔ جی جی چھت سے گر کر مر جائیں گی۔"

اس پر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے پوچھا" دوا نہیں دیجئے گا؟"
انھوں نے مجھے للکارا:" دوا؟"
"نہیں دیجئے گا تو میں جاؤں؟"
اس پر انھوں نے اپنی چٹکی سے اُس کا ڈھکنا کھولا اور اُس چھوٹے سے پڑیے کے اور تھبت سے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور اُن سب کی پڑیا کر کے میری طرف پھینک کر کہا:" یہ ہے دوا، لے جاؤ!"
اس کے بعد مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔ اگلے روز پھوپا آئے میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں انکے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ بُوا کی طبیعت اب اور بگڑ گئی تھی۔ لیکن شکایت کوئی خاص نہ تھی۔ پھوپا نے سفر کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ بُوا کو کوئی تکلیف نہ ہوگی یہاں سے تین سو میل دور ہی تو جانا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، ضرورت ہوئی تو راستے میں ایک دو جگہ رک جائیں گے، ڈاک بنگلے جگہ جگہ ہیں ہی۔ چچا جی مطمئن رہیں کہ پھوپا ہماری بُوا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔
چچا جی نے کہا:" اچھا، اچھا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ !"
پھوپا نے کہا:" جی! آپ بے فکر رہیئے۔ انھیں تکلیف کسی قسم کی نہ ہوگی۔"
چچا جی نے کہا:" میرا مطلب ہے کہ اس کی طبیعت ذرا۔۔"
پھوپا نے کہا:" یہاں کی آب و ہوا کسی قدر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا تبدیلی چاہیئے ستمبر شروع ہوا کہ کشمیر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں ستمبر اکتوبر کشمیر کے سب سے خوشگوار مہینے ہیں۔ گل مرگ کی ہوا دہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
اگلے دن پھوپا پورے انتظام اور جاہ سے بُوا کو لے گئے۔

(۳۷)

کچھ دن بعد ہم لوگوں کو اِدھر یورپ کی طرف آنا پڑا۔ میں ہائی اسکول میں داخل ہو گیا اور اگلی جماعت میں پہنچ گیا۔ بُوا مجھے رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔ انکے خط آتے تھے لیکن بڑے مختصر۔ ان سے معلوم ہوا کرتا تھا کہ بُوا اچھی ہیں، خط میں اور کچھ نہیں لکھا۔ بابو جی سے بُوا کے متعلق کچھ پوچھتا تو وہ خاموش ہو جاتے۔ وہ اس بارے میں کچھ خوش نہیں تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں کہتا " بابو جی! مجھے بھیج دیجئے کہ میں بُوا کو دیکھ آؤں" وہ کسی قدر دلچسپی لیتے اور پوچھتے " تو جائیگا؟" "لیکن دیکھئے کہ دیکھتے اُن کی دلچسپی ختم ہو جاتی اور کہتے " تو کیا جائیگا کہاں جائیگا؟ مرتال تو اپنے گھر کی ہے گھر پر خوش ہے۔"
شادی کو آٹھ دس مہینے گذر چکے ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے پتا چلا کہ بُوا ایک نوکر کو ساتھ لئے چلی آرہی ہیں۔ بتایا کہ اُن کی یہ حرکت کسی کو نہیں بھی کچھ اچھی بھی نہیں لگی ۔۔۔۔ ماں نے ناراضگی یا خوشی کا کچھ اظہار نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ٹال مٹول کر کے پھوپا کو کبھی سرد و گرم کہہ ڈالا۔ بُوا آئیں کہ میرے پرانے دن لوٹ آئے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ بُوا میں بڑی تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ اُن کی طبیعت کو قرار نہ تھا۔ ابھی خاصی ہنسی خوشی بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ کہ یکایک کچھ سوچ کر فوراً سنجیدہ ہو جاتیں اور کمرے میں جا اکیلی پڑ رہتیں۔ ان کی تندرستی بھی اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ تمام جسم پیلا پڑ گیا تھا اور ایک دن میں نے سُنا کہ انھیں حمل ہے۔
ان کی طبیعت اکثر مالش کرتی۔ کھانا پینا کچھ اچھا نہ لگتا۔ کسی بات اور کسی کام میں دلچسپی نہ لیتیں۔ میں نے ایک دن تنہائی میں پوچھا۔ اب تو یہیں رہو گی نا۔
"بُوا! جلدی تو نہیں جاؤگی؟"
بُوا نے کہا:" نہیں جاؤں گی ۔۔۔ لیکن تو نے جانے کی بات کیوں کرتا ہے؟"
اپنے پڑھنے لکھنے کی بات کیا کر! یہ کہتے کہتے انکی آنکھیں نہ جانے کیسی ہو گئیں۔
آواز سانپ کر رک جانا چاہتی تھی۔
میں نے اپنے طور پر نہ جانے کیا سمجھ کر کہا" تو بُوا! پھر وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہیں جانے دوں گا۔"
بُوا نے کہا،" بھلا کیسے نہ جانے دوں گا؟"
"بس کہہ دیا، نہیں جانے دے گا۔"
بُوا طنز سے ہنسی۔
"تو روکنے کی بات کرتا ہے۔ تو پہلے ہی کیوں نہ روک لیا تھا۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بے بسی نے ان کے چہرے پر جیسے دھواں اُڑا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر جوش آگیا۔ بولا "کیوں نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھوں تو پھوپا کیسے لے جاتے ہیں۔؟"

بُوا بولیں "بڑے بہادر بنتے ہو پرمود — لیکن اس کے متعلق کیا بوا سے کچھ نہ پوچھو گے — اب بُوا یہاں کی نہیں ہے، وہاں کی ہے اپنے پھوپا کی چیز کو چھیننے والے بھلا تم کون۔؟"

میں ان ساری باتوں کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن ان کی آواز کا درد اور اضطراب مجھ سے کچھ کہتا ضرور تھا۔ اتنا میں سمجھ ہی گیا تھا کہ سسرال کا ذکر آتے ہی انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس میں کیا پس و پیش ہے۔

میری سمجھ میں نہ آتا تھا — وہ جگہ پسند نہیں ہے۔ وہاں نہ جائیں۔ بس

لیکن جس آسانی سے میں بس کہہ دیتا تھا، بات اتنی آسان نہ تھی — یہ میں آج جانتا ہوں۔ شادی کا رشتہ صرف دو کے درمیان نہیں ہے۔ اس کا تعلق سماج سے بھی ہے۔ یہ رشتہ چاہنے سے کیا ٹوٹ سکتا ہے؟ اس کی بنیاد محض جذبات پر ہی نہیں ہے بلکہ سماج پر بھی اس کی بنیاد ہے۔ یہ سوال اس طرح ٹالے ٹل سکتا ہے؟

وہ گرہ ہے کہ بندھ جائے تو کھل نہیں سکتی کوشش کی جائے تو ٹوٹ سکتی ہے لیکن ٹوٹنا کس چیز کا اچھا ہوتا ہے؟

لیکن آٹھویں جماعت کا طالب علم بھلا میں یہ باتیں کیسے سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے پورے اعتماد سے بُوا کو یقین دلایا کہ وہ اب یہیں رہیں گی۔ دیکھوں کون ہوتے ہیں پھوپا جو تمہیں لے جائیں؟ کیوں سوچ سوچ کر اپنی جان گھلاتی ہو بُوا؟ تمہیں آخر فکر ہے کیا؟ پرمود بڑا ہو کر خوب کمائے گا۔ تمہاری خوب خدمت کرے گا۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دے گا۔

بُوا کی میری باتوں سے بالکل بھی تسلی نہ ہوئی، یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے چہرے پر کیا فوراً اطمینان کی جھلک نہ آگئی تھی۔ آہستہ سے ہنس کر بولیں،

"تو ایسا بہادر ہے پرمود، تو پھر بڑا پاس ہے۔ کیوں؟ اچھا اب یہ بتا کہ تو اپنی کلاس میں اول ہے یا نہیں؟"

اول یا پسنڈ کا ہونے میں مجھے اس وقت دلچسپی نہ تھی۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ بُوا کے دل میں اب تو کوئی اندیشہ نہیں۔ میں نے پوچھا:

"سچ سچ بتاؤ بُوا تم وہاں جانا چاہتی ہو یا نہیں"؟

"سچ بتاؤں"؟

"ہاں، بالکل سچ سچ"!

بُوا نے ہنس کر کہا "کیوں بتاؤں سچ سچ؟"

میں نے ناراض ہو کر کہا "نہیں بتاؤ گی؟"

بولیں "اچھا بتاتی ہوں — میں تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں رکھے گا؟"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے یوں دیکھا کہ میں جھینپ گیا۔ مجھے کھینچ کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر ایک دم مجھے چپٹا کر بولیں "ایک بات بتا — تجھے بید کھانا اچھا لگتا ہے۔"

میں نے کہا "بید؟"

بولیں "میں ایک بار تجھے بید سے پیٹوں گی۔ دیکھوں گی تجھے اچھا لگتا ہے یا بُرا؟"

بُوا کے بات کرنے کا انداز کچھ عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "بُوا یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

بولیں "سچ سچ کہتی ہوں پرمود یہ باتیں میں نے کسی سے نہیں کہیں۔"

بس تجھ سے کہی ہیں — بید کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا — نہ یہاں نہ وہاں۔"

میں تعجب میں رہ گیا — بولا "کیا کہتی ہو بُوا، وہ مارتے ہیں؟"

"ہاں مارتے ہیں۔"

"بید سے مارتے ہیں؟"

"ہاں بید سے مارتے ہیں!"

"کیوں مارتے ہیں؟"

"میں خراب جو ہوں، اس لئے!"

یہ سن کر نہ جانے مجھ پر کیا اثر ہوا کہ میں بُوا کے چہرے کی طرف نظر نہ اٹھا سکا۔ جذبات سے مرعوب ہو کر میں نے اپنا منہ ان کے پہلو میں چھپا لیا۔ معاً جی چاہا میں نے چاہا کہ بُوا کو گود میں لے لوں

دھیرے دھیرے ان کی پیشانی تھپک کر کہیں "وہ سب بھول جاؤ
بُوا۔ اچھا بڑا سب بھول جاؤ۔ ایسی ہی جگہ ہے۔
جہاں کوئی خراب نہیں، جہاں کوئی بید نہیں۔ ہم دونوں وہیں چلی
رہیں گے۔"

یہ وچار بار بار میں اُن کے من سے پھٹا رہا۔ میں نے محسوس
کیا بُوا کا دل بھر آیا۔
آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک آدھ قطرہ بھی ٹپک پڑا۔

مجھے ساری باتیں تو یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ پتا جی
اور پھوپا کے خط و کتابت ہوئی تھی جو کافی عرصے تک جاری رہی
تین مہینے بوا ہمارے یہاں رہیں۔ آخر میں فیصلہ ہوا کہ پھوپا انہیں
لے جا سکتے ہیں۔ پتا جی شاید اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ اگر
اب کی بار وہ پھوپا کی مرضی کے بغیر چلی آئیں گی تو وہ اپنے گھر میں جگہ نہ
دیں گے۔

پھوپا نے پتا جی کے سامنے بُوا پر کچھ الزامات بھی لگائے تھے
جن کو انھوں نے معافی مانگ کر واپس لے لیا تھا۔

ایک بار میں بابو جی کے پاس تھا۔ بُوا آئیں اور خاموش
بابو جی کے پاس بیٹھ گئیں۔ بابو جی نے کہا "مرنال! کہو طبیعت کیسی
ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"یہاں شاید تمہارا دل نہیں لگتا' معلوم ہوتا ہے۔"

بُوا خاموش رہیں۔

"سسرال کی چٹھی آئی ہے۔ اتوار کو آ رہے ہیں۔ پانچ روز ہیں۔ منی
دیکھو اب ایسی غلطی مت کرنا۔ وہ بھلے آدمی ہیں' اس سے بات بن
بھی گئی۔ نہیں تو بیٹا!
ایسا کیا کرتے ہیں؟ تھوڑا بہت جھگڑا ہوتا ہی ہے۔ لیکن شوہر
پتی کے گھر کے علاوہ استری کو اور کیا آسرا ہے۔۔؟ یہ جھوٹ نہیں ہے
مرنال کہ پتنی کا دھرم پتی ہے۔ اس کا گھر صرف پتی کا گھر ہے۔ اس کا
دھرم کرم اور نجات سب وہی ہے۔ سمجھتی تو ہو نا بیٹا۔

کہتے کہتے ان کی آواز معذرت خواہ ہو گئی۔ بُوا اب بھی چپ
رہیں۔ تھوڑی دیر پھر پتا جی نے کہا' کہو کہو' مرنال' تم کچھ کہنا چاہتی
ہو؟"

بُوا نے کہا "میرا جی اچھا نہیں رہتا۔ میں ابھی جانا نہیں چاہتی۔"

"ابھی نہیں جانا چاہتی ہو!"

بُوا خاموش رہیں۔

"لیکن وہ تو آج ہی لے جانا چاہتے ہیں۔"

بُوا اب بھی چپ رہیں۔

بابو جی اس خاموشی پر کچھ مضطرب ہو گئے۔ انھوں نے پہلے
تو میری طرف دیکھ کر کہا "جاؤ' پڑھو اپنا سبق دیکھو۔" میں
فوراً نہیں اٹھا تو خفا ہو کر بولے، "سنتے نہیں ہو؟ جاؤ!" میں
کمرے سے باہر ضرور آ گیا لیکن دبک کر کھڑا ہو گیا۔ پتا جی نے
کہا "سنو! مرنال! ابھی بھیجنا میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری حالت
نازک ہے۔ لیکن تمہیں بتاؤ میں کیا کروں؟"

بُوا کچھ نہ بولیں۔

بابو جی کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر تک وہ بھی نہیں بولے پھر
کہنے لگے "منی'
سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" یہ کہہ کر رک گئے۔ بُوا چپ رہیں
تو پھر ٹہلنے لگے۔ پھر ایکا ایک رک کر بولے' "مرنال! میں دیکھتا ہوں
تمہیں تکلیف ہے۔ لیکن بتاؤ گی نہیں تو میں کیسے جانوں گا کیا
کروں گا؟ منی! تجھے پتا جی تو کیا یاد ہوں گے۔ ابھی تو ننھی سی تھی
تھی کہ پتا جی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ اور ماں تو اُن سے بھی پہلے چل
بسی تھیں۔ اب تو ماں' باپ' سب کچھ تیرے لئے میں ہی ہوں
مجھ سے نہ کہے گی اور کس سے کہے گی؟ مرنال بیٹا! سچ بتا کیا بات
ہے۔۔؟"

بُوا نے کہا "کچھ بھی بات نہیں بابو جی' لیکن میں جانا نہیں
چاہتی۔۔"

"جانا نہیں چاہتی ہو۔ یہ تو میں دیکھتا ہوں' لیکن بھلا
کہیں ایسا ہو سکتا ہے'
اور کب تک نہیں جاؤ گی؟"

"بالکل نہیں جاؤں گی۔"

بابو جی نے زچ ہو کر کہا "تو کیا کرو گی؟"

"آپ نکال دیں گے تو یہاں سے بھی نکل جاؤں گی۔"

بابو جی کو غصہ آ گیا "کہاں نکل جاؤ گی؟"

جہاں پتاجی چلے گئے ہیں۔ کوئی راہ بتا دے تو میں بھی وہیں چلی جاؤں۔"

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ البتہ پتاجی کے تیز قدموں کی چاپ ضرور سنائی دیتی رہی۔ دو ایک بار کھانسنے کی آواز بھی آئی جیسے کچھ گلے میں پھنس آ رہا ہو۔ چند لمحوں تک میں کچھ اور سننے کا منتظر رہا۔ لیکن پتاجی کے قدموں کی چاپ، کھانسی اور سرد آہوں کے علاوہ میں اور کچھ نہ سن سکا۔ آخر میں وہاں سے کھسک آیا۔

اس کے بعد میں نے بوا سے پوچھا "بوا! پتاجی بھیجنے کو کہتے ہیں؟"

بوا نے ڈپٹ کر کہا "چپ رہا کرو جی، پرمود! اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

ان کا یہ اچانک غصہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ردعمل کے طور پر میں بھی اس دن الگ الگ رہا۔ لیکن سرِشام مجھے سینے سے لگا کر پھر رونے لگیں،

اور بولیں، "تو روٹھ گیا پرمود؟"

تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگیں، "بابوجی مجھے بھیج رہے ہیں چلی جاؤں؟"

میں کیا کہتا۔؟

انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا، "مجھے چلا جانا چاہیئے۔ کیوں پرمود؟"

مجھے خاموش دیکھ کر بولیں، "اچھا جانے دو اس بات کو۔ یہ بتا میں چلی گئی تو مجھے یاد کرے گا؟"

اس بار میں نے کہا "بوا! میں تمہارے پیچھے تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔"

"میں مر جاؤں، تب بھی یاد کرے گا؟"

اب مجھے سمجھ آ گئی تھی۔ بولا "بوا! ایسی باتیں مت کرو۔ میں نہیں سننا چاہتا۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ جب بڑا ہو جائے گا اور میں بلاؤں گی تو آئے گا؟"

"فوراً آؤں گا۔"

"کیسی بھی حالت میں میں ہوں، تو آئیگا؟"

"ہاں! آؤں گا۔"

تو سن، میں کہتی ہوں تو نہیں آئیگا۔ تجھے بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں، تم سب لوگ مجھے بھول جانا۔ میں یہاں سے گئی، مری، برابر ہی ہے۔

اس کے بعد میں تم لوگوں کو بالکل تکلیف نہیں دوں گی۔

تھوڑی دیر بعد بوا نے مجھ سے پوچھا، "تو جانتا ہے تجھی کا مرگ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

"سورگ ہوتا ہے۔"

میں نے مان لیا کہ ہاں ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے اس آسانی سے مان لینے سے انھیں کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ بولیں "وہ سورگ بھی ہوتا ہے جس کے لیے ایسا نہیں ہوتا وہ بدقسمت ہے۔"

مجھے خاموش پا کر وہ پھر بولیں، "جانتا ہے سورگ کیا ہوتا ہے؟"

پھر خود ہی جواب دیا، "سورگ بڑے آرام کی جگہ ہوتی ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔"

اگلی صبح انکی حالت بہت سنبھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ماں سے انھوں نے کہا کہ دھوبی سے میرے کپڑے اتوار تک آ جائیں کیونکہ مجھے جانا ہے۔ دو چار چیزیں بھی مجھے بازار سے منگوانا ہیں۔ اس وقت وہ اپنا سامان رکھنے رکھانے میں بڑی مصروف نظر آتی تھیں۔ ایک بکس میں سامان نکال کر دوسرے میں رکھ دیا گیا۔ کتابیں سب نکال کر علیحدہ رکھ دی گئیں۔ کہنے لگیں۔ کتابیں اچھی نہیں ہوتی۔ انھیں "اچھی نہیں لگتیں ان سے وقت برباد ہوتا ہے۔

نہیں۔ اس بار کچھ نہیں۔ نہ نئی، نہ پرانی۔

دوپہر تک وہ اسی طرح مصروف رہیں۔ لیکن کھانا کھا کر جو لیٹیں تو سر میں درد شروع ہوا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا بوا؟" بولیں۔

"سر میں درد ہے۔"

"ماتھا داب دوں؟"

"نہیں۔"

"بام لگا لیجئے۔"

"نہیں۔"

"یوڈی کولن کی پٹی لاتا ہوں۔"

"ارے نہیں، نہیں، نہیں۔"

معلوم ہوا کہ دو تین روز سے انھیں سخت قبض ہے۔ پیٹ پتھر ہو رہا ہے

میں نے کہا، "ڈاکٹر ۔۔۔!"
"نہیں کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں۔"
میں نے پوچھا "پھر ۔۔۔۔؟"
"نہیں سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

وہ ٹالتی ہی گئیں۔ جیسے بہت تک درد کی شدت ہے وہ تڑپتی رہیں لیکن کسی کو پاس بلانا منظور نہ تھا۔ کمبل پڑی رہیں۔ میں کئی بار بابوجی کو اطلاع کی دینے کو تیار ہوا لیکن بُوا نے ایسا جھڑکا کہ میری ہمت نہ ہوئی۔ اب ان کے پیٹ میں بھی تکلیف معلوم ہوتی تھی۔ درد رہ رہ کر اٹھتا تھا۔ جیسے کوئی پیٹ میں بیٹھا ہوا رک رک کر آنتیں مروڑ رہا ہو۔ درد سے بےچین ہو کر ان کا چہرہ پیلا اور زرد ہو جاتا تھا۔ میں نہیں جانتا انہوں نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کر لیا اور کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ میں کہنے کے لئے جانا چاہتا تو وہ اپنی قسم کھلا کر روک لیتیں۔ ۔ پرمود اگر گیا تو مجھے میری صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہو۔

میں نے کہا کہ "پھر کیا ہو؟"

"پیٹ کا درد ہے۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائیگا۔"
"دیکھو اگر بازار جاتا ہو تو جمال گوٹا لیتے آنا۔ یاد رہے گا نا۔
جمال گوٹا۔"

میں اب بُوا کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔ پوچھا "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

درد کی حالت میں بھی وہ مسکرائیں اور کہا "تو اب سمجھدار ہوتا جاتا ہے۔

پرمود لیکن وہ مرنے کی چیز نہیں ہوتی۔ لے آئیگا نا؟"
میں نے پوچھا "اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔؟"
"ہاں ہو جائیگی۔ جائیگا؟"

جمال گوٹے کے استعمال سے ان کی جو بُری حالت ہوئی اسے دہرانا فضول ہے۔ ماں اور بابوجی دونوں پریشان ہو گئے۔ میں نے مارے ڈر کے کسی سے کچھ نہیں کہا اور یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں حمل نہ جاتا رہے۔ حمل تو نہ گرا لیکن اور سب کچھ ہو گیا۔ تین روز میں اتنا سا منہ نکل آیا کہ دیکھ کر دل بھر آتا تھا۔ لیکن کیا رحم کچھ خاص حد پار کر کے ظلم کا روپ دھار لیتا ہے؟ میں ان دنوں آگ بگولہ رہتا تھا۔ بُوا کو نہ جانے کتنی بار سخت سست سنا ڈالا۔ سنتی رہیں۔ بس یہی

بولیں "تو بھی مجھے ہی کہے گا پرمود۔"
"تم سے نہ کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا؟"
"اچھا کہہ لے بھیا، تو بھی کہہ لے۔"

انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میری تمام ترشی اور سارا غصہ کافور ہو گیا۔

ندامت سے کچھ پسینہ سا آ گیا۔ بولا "لیکن بُوا یہ تم نے کیا کیا؟"

"میں جانتا ہوں یہ جو کچھ بھی ہوا محض تمہاری وجہ سے ہوا۔"
بس یہ کچھ دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں "کیا جان پرمود میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں کیا جان بوجھ کر کرتی ہوں؟ یہاں کوئی بھی تو نہیں جو مجھے کچھ بتائے۔ اپنے دل کی بات کس سے کہوں؟ پرمود میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ایسے میں تو بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہرائے گا تو میں کیا کروں گی؟"

ان کی باتوں کے یہ معنے میں کسی طرح بھی حل نہ کر سکا۔ دل درد کی لہروں میں ڈوبنے لگا۔ میں نے پوچھا "بُوا تم کیا چاہتی ہو؟"
"کیا چاہتی؟"
"اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہو؟"
"صحت کیوں برباد کرتی ہوں؟ میں نہیں جانتی۔ اچھا بتاؤ صحت کا کیا کروں؟"

میرے سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ ایسی تکلیف ہو رہی تھی جس کا نہ کوئی مرکز تھا نہ مقصد۔ میں نے کہا "کیوں بُوا، بابوجی سے ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتی ہو۔؟ ڈر کیسا اور کس سے؟ پھر میں دیکھوں گا کہ کون زبردستی کرتا ہے۔"

بُوا عجیب انداز سے مجھے گھورنے لگیں۔ پھر وہیں عکس سے کہہ دیں "کیا کہہ دوں؟ کیسی صاف بات؟ یہ سب تو کیا کہہ رہا ہے؟ پرمود تو ابھی کچھ نہیں جانتا، تو ابھی بچہ ہے۔"

اپنے کو بچہ سن کر میں نے بے عزتی سی محسوس کی۔ بولا۔ "ہاں! بچہ ہوں، لیکن ایک بار تم کھل کر کہہ دو کہ تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کون بھیجتا تمہیں لے جاتے ہیں؟ تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ نہیں کہوں گا؟"
اس وقت وہ نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو گئیں۔ بولیں "چھی بھیا

کہیں ایسی بات کہتے ہیں ؟ عورت ذات کیا اپنے گھر کی ہوتی ہے ؟ میں کیا پرائی عورت ہوں ۔؟ پھر میرے بتا جی کہاں ہیں ؟ نہ ہوتے..."

میں بے اختیار چلّا اُٹھا "کون بتا ؟ کیسے بتا ؟ کیا کہہ رہی ہو۔

ہوا ؟ کیا بابو جی تمہارے نہیں ہیں ؟ ماں تمہیں ہیں ؟ میں نہیں ہوں ؟"

وہ آہستہ سے بولیں "کوئی نہیں ہے۔"

میں ان کے گلے سے الگ کر بولا "میں نہیں ہوں ؟"

اُنھوں نے مجھے باہوں میں جکڑ لیا۔ اور کہنے لگیں "تو ہے بھیّا! تو ہی تو ہے۔ ورنہ میں یہاں ہیٹ کا دوزخ لئے کیوں پڑی ہوتی۔"

اتوار کو پھوپا آگئے۔ بوا کی حالت دیکھکر انھیں بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے اس جگہ کا پانی انھیں موافق نہیں آیا۔ دیکھیئے نا کیا حالت ہو گئی ہے ؟ آخر ہوا کیا تھا ؟ تین روز تک دست اور قے۔"

اُف ..... ڈاکٹر آیا تھا۔ کیا یہاں ڈاکٹر بھی سلیقے کے نہیں مل سکتے۔

ضلع کے سول سرجن.....

پھوپا بوا کی حالت دیکھکر واقعی پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار ان کی بُری حالت پر تبصرہ کرتے جس سے ان کی دلی بے چینی اور ذہنی خلفشار معلوم ہوتا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ بابو جی سے بولے "ایسی حالت میں مجھے تار کیوں نہیں دیا گیا ؟ میں کچھ بند و بست کر دیتا ہمارے یہاں کا پانی اور گھی دودھ کیسا ہے، آپ جانتے ہی ہیں مثل مشہور ہے کہ گھی اور مرنجیاں کا... کیسی ہی گری طبیعت کیوں نہ ہو، وہاں دیکھتے دیکھتے سنبھل جاتی ہے۔"

بتا جی سے کوئی خاص جواب نہ بن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اعتراف کر رہے ہوں کہ انھیں کا قصور ہے۔ بس دو ایک بار بولے کہ "پھر حالت کمزور ہے، کچھ دن اور رُک کر لیجائیں تو کیا مناسب نہ ہوگا۔"

لیکن کمزور حالت ہی کی بنا پر پھوپا کا فرض کچھ اور شدید ہوا جاتا تھا۔

"آپ ہی سوچئے کہ ایسی حالت میں انھیں یہاں چھوڑ جانا کہاں تک مناسب ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہاں پہنچ کر تھوڑے ہی دنوں میں ان کی طبیعت درست ہو جائیگی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے موٹے مریضوں کے لئے اتنی بھاگ دوڑ اُن کی پرورش کرنا ہے۔ لاکھ علاج کا ایک علاج ہے بے فکری۔"

پھوپا نے پھر کہا "آپ نے انھیں سمجھا تو دیا ہی ہوگا۔ ذرا صحت کا خیال رکھا کریں۔ پھر دنیا کا بھی لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے آپ جانتے ہی ہیں کہ ہو منٹوں کی نیک چلنی ہی سب کچھ ہے۔ اپنے تو وہی پُرانے عقیدے ہیں۔ ہماری تو ایک پرانی روایت چلی آتی ہے اگر نہ ہی نہ بھی تو پھر کیا ؟ ذرا یہ باتیں سمجھا دینی چاہئیں۔ میں تو اپنی طرف سے تھوڑا بہت کہہ دیتا ہوں۔ لیکن آپ جانئے، آپ کی بات کا کہیں زیادہ اثر پڑیگا۔"

میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا کیا سمجھتا ہوں گا کیا نہ سمجھتا ہوں گا۔ پھر بھی یہ باتیں مجھے کسی طرح بھی اچھی نہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بے مطلب اور بے مقصد غصّہ آرہا تھا۔ جی چاہتا کہ بڑھ کر سب کچھ تلپٹ کر ڈالوں۔ اس کی وجہ کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن بابو جی کے چہرے پر ایک قسم کی افسردگی اور شکست خوردگی دیکھکر میرے باغیانہ جذبات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ جانے کس چیز نے روک لیا کہ میں ہمت نہ پڑا۔

بابو جی نے پھوپا کو جواب دیا "جی ہاں!"

فوراً ہی پھوپا میری طرف مخاطب ہوتے کہنے "جناب آپ کا اسم شریف —— ؟ اوہ، یاد آیا پرمود! پرمود نام تو اپنی جگہ بہت ہے۔ مگر اس سے کسی کو کیا مطلب ہے ؟ —— میں کچھ نہیں بولا۔

"کس درجہ میں پڑھتے ہو ؟"

"اس چھ ماہی امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔"

"فیل ہو گئے ہو —— بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن کس جماعت میں ؟"

میں چُپ رہا —— کیوں بولوں ؟ نہیں بولتا۔

"گھبراؤ نہیں —— کس جماعت میں پڑھتے ہو ؟"

"میں فیل ہونے سے نہیں ڈرتا !"

اُنھوں نے بڑی نرمی سے کہا۔ فیل ہونے سے ڈرنا چاہیئے بھائی! جو شروع میں دل لگا کر پڑھتے ہیں، وہی آگے چل کر کچھ کام کرتے ہیں۔ سمجھے ؟ اچھا یہاں آؤ۔ آؤ، ہمارے پاس آؤ۔"

میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔
پتاجی نے کہا "جاؤ بیٹا! جاؤ۔ جواب دو۔"
اس پر میں سینہ تان پھوپا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے دونوں کندھے پکڑ کر کہا "ساتویں پڑھتے ہو، یا آٹھویں میں؟"
"آٹھویں میں۔"
"دیکھو کلاس میں فیل نہیں ہونا چاہئے۔ اچھا بتاؤ کتنی لوگے بادامی؟" یہ کہہ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔
بات تو بُری تھی لیکن دل میں آئی کہ یہ الٹی گنتی میں یا نہیں لیکن اگر میں انکی بھی اسی شکل ہو تمھیں گنیوں تو کیسا رہے گا؟ بس اس کا جواب دے دیں، اگر راضی ہیں تو پھر میں ہی انھیں اٹھنی دے دوں گا۔
پھوپا نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا "بولو کتنی لوگے؟"
میں دیکھتا رہا۔ جواب کچھ نہ دیا۔
"جلدی بتاؤ ورنہ دونوں کا مال اڑ جائیگا سارے پھر دیکھتے رہ جاؤ گے۔"
"آپکو چاہئے تو دو تین میں آپ کو دے سکتا ہوں۔"
وہ جھینپ گئے اور کھسیانی ہنسی ہنس دئے۔ ان کی جھینپ اور کھوکھلی ہنسی نے میرے اندر ایک طرح کا بڑائی کا احساس پیدا کر دیا۔
میں نے کہا۔
"میں آٹھویں درجے میں پڑھتا ہوں اور اس امتحان میں اول آیا ہوں۔"
پھوپا اس پر پھر ہنسے "ہو، ہو، ہو۔"
میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کٹے کٹے سے ہو گئے۔ اور ان کے اس کٹے پن سے مجھے پتہ نہیں کیوں اور خوشی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے پتاجی کا بدلہ میں نے لے لیا۔ اگلے دن جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھ سے بُوا نے کہا "پرمو، میرا کہا سنا معاف کر دینا۔ جانے تم لوگوں سے کب مل سکوں گی۔"
میں نے سوچا کہ بُوا کے لئے مجھے مضبوط بننا ہوگا لیکن بُوا کے سامنے آتے ہی میری سب مضبوطی ختم ہو جاتی تھی۔ بُوا کی یہ بات سن کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پھر بھی صرف کہنے کے لئے ہی کہہ دیا، "بُوا، خط لکھتی رہوگی؟"
بُوا نے کہا "خط؟ دیکھو!"

میں نے کہا "ضرور لکھنا بُوا۔ بلاؤ گی تو میں فوراً آجاؤں گا۔ ریل میں اکیلا سفر کر لیتا ہوں۔"
"تجھے نہ بلاؤں گی تو اور کسے بلاؤں گی۔ لیکن یہ تو بتا کہ اکیلا سفر کرکے تو مجھ تک پہنچ بھی سکے گا؟"
"ہاں ہاں، ضرور بُوا، میں آؤں گا ۔۔۔ بلاؤ گی تو سارے کام چھوڑ کے آؤں گا۔"
بُوا نے میرے گال پہ ہلکا سا چپت مارا اور بولیں "پگلا" اس ... رجاتے ہوئے بُوا نے روتے ہوئے ... کے پیر چھوئے اور ماں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ لیکن بولیں کچھ نہیں۔ ماں نے بے تاب ہو کر انھیں گلے لگا کر کہا "منی!
میں تجھے جلد ہی بلاؤں گی۔ وہاں اپنی گرہستی اچھی طرح سنبھالنا ورتیجا کو تسلی رکھنا۔ منی ۔۔۔۔"
ماں نے ایک ہی سانس میں انھیں بہت سی دعائیں دے ڈالیں بُوا گردن جھکائے سب سنتی رہیں۔ شوہر کی فرماں بردار رہنے، پوتوں پھلنے، خوش قسمت ہونے وغیرہ کی دعائیں لیتے وقت وہ ایسی ہشاش بشاش نظر آرہی تھیں کہ اگر ان دعاؤں کے بوجھ تلے دب کر بھی مر جائیں تو امر ہو جائیں۔
پتاجی کے سامنے بُوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پتاجی نے رومال نکال کر چہرے کو پونچھا اور بے مطلب طریقے پر کہنا شروع کیا "ہے، کیا ہے؟
کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مت رو منی مت رو۔ ہشت! الھڑ بنتی ہے۔" اور کہتے کہتے فوراً بُوا کے سامنے سے چلے گئے۔ ساتھ جانے والی گٹھری، بکس، بستر اٹھوانے میں لگ گئے۔ ایسے ہی اور بہت سے کام ہیں ہمیں فرصت کہاں رکھی ہے؟
میں نے عہد کیا تھا کہ میں کبھی نہیں روؤں گا، ہرگز نہیں روؤں گا میں نہیں رویا۔ مجھے غصہ آرہا تھا کہ میں کیوں نہیں کوئی حرکت کر رہا ہوں۔
بار بار خیال آرہا تھا کہ اب تک میں کسی سے جھگڑا کیوں نہیں خواہ مخواہ کسی نہ کسی سے الجھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ رہیں بُوا سو نہیں وہ جاتی ہیں تو جائیں۔ میرا اُن سے کوئی مطلب نہیں۔ میرا کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ میں اکیلا سب سے نپٹ لوں گا۔ اکیلا، بالکل

اکیلا۔ مجھ سے کوئی نہ بولے۔ میں بُوا کو بھی یاد نہیں کروں گا۔ وہ کیوں جا رہی ہیں؟ میرے رستے کیوں جا رہی ہیں؟

پھوپا کون ہوتے ہیں جو لے جا رہے ہیں؟ لیجاتے ہیں تو لے جائیں — جائیں کہیں تلیں تو۔ ایک بے نام سا خوف مجھے دبائے لے رہا تھا۔ نہ رونے دیتا تھا، نہ کچھ کرنے دیتا تھا۔ اور پھر یہاں تک ہوا کہ بُوا کی رخصت کے وقت جھنجھلا کر میں بُوا کے کمرے میں بھاگ آیا اور اپنے آپکو بند کر لیا۔ کواڑ بند کر لینے سے اندھیرا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ گم سم کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا، زلزلہ آ جائے گا، کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا، اور آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چاہتا تھا کہ سانس روک لوں۔ بے جان ہو جاؤں۔ دنیا میں رہوں ہی نہیں۔

تبھی ماں کی تیز اور چیختی ہوئی آواز آئی — پرمود، پرمود! میں نہیں بولا — میں نہیں بولونگا — پرمود کہاں ہے؟ کہیں نہیں —

میں پرمود کو نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

”ارے پرمود! او بھیا پرمود۔“

ماں کی آواز اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ میں وہیں سے کھڑے کھڑے چیخا۔ ”کیا ہے؟ میں نہیں سنتا۔“

”کہاں ہے رے تو؟ تیری بُوا جا رہی ہے۔“

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ بغیر بولے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ باہر آ کر دیکھتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔ پھوپا کہہ رہے ہیں — جلدی کرو۔ جلدی۔“ بُوا کھڑی ہیں، منہ پر گھونگھٹ ہے۔ کیا میری ہی راہ دیکھ رہی ہیں؟ میں نے پاس آ کر کہا۔ ”بُوا کیا ہے؟“ وہ جھپٹ کر میرے گلے لگ گئیں۔ بلند آواز سے رونے لگیں۔

پھوپا نے کہا۔ ”ریل کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو چلو۔ کندھے سے لگے لگے ہی میں انہیں موٹر تک لے گیا۔ پھوپا نے بابو جی کو پرنام کیا اور موٹر میں جا بیٹھے۔ موٹر نے گھر گھر شروع کی۔ پھوپا نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”آداب عرض ہے پرمود صاحب! میں خون کا سا گھونٹ پئے کھڑا رہا۔ میں اب سانس لونگا۔ بہت کہہ چکا۔ میرا دل بڑا دُکھی ہے یوں تو جب یہ شروع کی ہے تو پوری بھی کرنی ہوگی۔ جینا جب تک کہ ایک بار موت آ کر رہا نہ کر دے، جینا ہی رہتا ہے۔ زندگی میں رہائی کہاں۔

لیکن میں ذرا سانس لینا چاہتا ہوں۔

یہ جو کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے ویسا ہی کیوں ہو رہا ہے مختلف کیوں نہیں ہوتا۔ اس کا کیا جواب ہے؟ جواب ہو یا نہ ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو مقرر ہے، وہی ہوتا ہے جو لکھا ہوا ہے۔ ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا۔ لکھنے والے نے جو لکھ دیا وہ نہ بدلے گا، بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن وہ ہے کون جس کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس گتھی کو بھی تو سلجھانا چاہئیے۔

شاید نہیں۔ عقلمند کہہ گئے ہیں کہ وہ اس کائنات میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نہ مانوں تو رہوں کیسے؟ چاہتا تھا کہ پکار کر کہوں کہ اے کرشمہ ساز! تیری کرشمہ سازیاں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ رونے بلکنے کی آواز چاروں طرف سے میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اے دُنیا کے مالک! یہ سب کیا ہے؟ تیری پُر امان نگر میں یہ نالہ و فریاد کیسی؟ کرشمے تو دکھاتا ہے، نیرنگیاں تیری نظر آتی ہیں، اور جیتے مرتے ہم ہیں — کیوں جیتے ہیں، کیوں مرتے ہیں؟ ہماری کوشش کیا ہے، ہمارا ارادہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ پوچھے جاؤ! جواب کچھ نہیں — پھر وہ بھی خاموش زبان میں ہمیشہ ظاہر ہے۔ اندر بھی جواب ہے اور باہر بھی۔ جس کا جی چاہے پڑھ لے، سمجھ لے۔ جیسا سمجھ میں آئے ویسا ہی پڑھ لے، سمجھ لے۔

اپنے سوال کا وہ خود ہی جواب ہے۔

لیکن اُسے اب چھوڑیں بھی۔ کہیں وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہو کر جو ہے کرم پھل ہے۔ میں آج جھوٹی اور بیکار عزت کے ٹیلے پر بیٹھا ہوں۔ یہ سب فریب ہے، چھلاوا ہے۔ دل کہاں ہے اس میں؟ سچی عزت کہاں ہے۔ لیکن یہی سب کچھ تو مجھے بند کئے ہوئے ہے۔ نامور وکیل رہا، اب جج ہوں۔ لوگوں کو پھانسی دیتا اور جیل بھیجتا ہوں۔ سماج میں اثر ہے، عزت ہے۔ ان سب باتوں کے تحت چلو یہی کہو کہ یہ کرم پھل ہے۔ لیکن کوئی پوچھے تو دل جانتا ہے کہ یہ کیا کرم کا پھل ہے؟

کامیاب وکالت اور ججی کے اس قدر عظیم شیش محل میں کیا روح

سا یہ ہی ہے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنی کوئی کہانی ختم نہیں کی ہے کبھی کامیاب و مکمل افسانہ نہیں لکھ سکا ہوں، اس کہانی کو میں یہاں کیوں چھیڑ رہا ہوں، جب کبھی موقع ہوگا تب ہی لکھوں گا۔

میرا دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ سماج کی دی ہوئی عزت کے جس مینار پہ آج میں کھڑا ہوں، وہ کسی کی قربانی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی دل خوف زدہ ہو جاتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔ لیکن کروں کیا؟ اس سماج کی بیو گھوڑے سے ہاتھ کیا آئے گا؟ نیو ڈھیلی ہی ہوگی۔ ہاتھ آنے والا کچھ نہیں ہے۔

سوچتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔

لیکن کیوں؟ میں یہ نہیں جانتا کہ سب لپٹے کو بونا اور جھگڑا ہے۔ سماج پہ مٹی جیسی چیزوں تو آتے د باتو سکتا ہوں، بدل نہیں سکتا۔ اس کے سجانے پھولنے کی تو ایک ہی ترکیب ہے کہ میں اپنے خون سے اس کی بنیادیں سینچ دوں۔ جاہل رہ کر عالم بنوں۔ جھوٹا بن کر نام کمانے میں کیا رکھا ہے؟ آہ! ایسی ناموری بیکار ہے، فضول ہے۔ روح کھو کر اگر دنیا کی دولت پائی تو کیا پائی۔ یہ تو لعل کو گنوا کر خزف ریزے پانے سے بھی کمتر ہے۔

زندگی میں ایک ہی بات تو نہیں ہے، سیوں باتیں ہیں جو بار بار دامن دل پکڑتی ہیں۔ ان کو قصداً نظر انداز بھی کیا جائے تو نہیں کیا جاسکتا۔ یہ میرے اندرون میں سُلگتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ان سے ایک شعلہ بھڑکتا ہے جس کی روشنی میں دیکھ سکتا ہوں کہ سچائی کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ تب میری بھی محض ایک چھلاوا معلوم ہوتی ہے، محض دھوکا معلوم ہوتی ہے۔ سچائی کو چھوٹا بننے میں ہے بے نیاز بننے میں ہے، تو اتلاف بننے میں ہے۔ بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ پڑھا ہے لیکن وہ سب جھوٹ ہے۔ سچ اتنا ہی ہے کہ مبارک ہے وہ انسان جو محبت کی آگ میں تپ کر زندگی کا عرفان پا جائے، گمراہ ہے وہ آدمی جو کبر و نخوت کے نشے میں چور زندگی کی پھونگوں پر چہکتا ہے۔

لیکن ان بے مقصد اور بے مطلب باتوں سے کیا فائدہ؟ اس طرح کچھ دیر کے لئے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور قابل برداشت ہو جاتا ہے لیکن اس کا فیضان چلے سے کہیں کم ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں۔ کیا انسانی زندگی کی رفتار اندھی ہے کیا اس کی کوئی سمت مقرر نہیں؟ اندھی ہے۔ یہ تو میں نہیں مانوں گا البتہ متحرک اور رواں ضرور ہے۔ جوں جوں انسانی زندگی گزرتی جاتی ہے درد بوند بوند اکٹھا ہو کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جاتا ہے یہی نچوڑ ہے۔ یہی انسان کا جوہر ہے، اسی کی روشنی میں حیات انسانی کی راہ منور ہوگی۔ ورنہ چاروں طرف گھنا جنگل ہے جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اور انسان بھوک، پیاس، عزت، لالچ اور حسد کے دھندلکے میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہاں جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن در اصل وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ کہیں نہیں جاتا۔ ایک ہی مقام پہ کولہو کا بیل بنا چکر کاٹتا رہتا ہے۔

اتنی عمر گذار کر، بہت سوں کو پیدا ہوتے اور بہت سوں کو مرتے دیکھ کر میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ درد میری زندگی کا مقصد بن جائے۔ دھن نہ چاہوں، من چاہوں۔ دھن میل ہے اور من کا درد امرت۔ سچائی کی جگہ اور کہیں نہیں۔ اس درد کے وجود سے اعترافات اور احسان مندی سے حقیقت اور عرفان کی کرنیں پھوٹیں گی۔ اس کے علاوہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سچائی صرف یہاں ہے اگر اور کہیں سے آواز آئے کہ یہ ہے سچائی تو وہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن سچائی نہیں۔

ہونی کے لئے کسے قصوروار ٹھہرایا جائے۔ پیدا کرنے والے کو تو دوش نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس تک تو میں اپنی مبارک باد بھی نہیں پہنچا سکتا۔ دوش دوں ہی کیوں؟ دل اگر دوش دینا ہی چاہتا ہے تو پھر دوش اپنے آپ ہی کو کیوں نہ دوں — میں یہ راز پا جاؤں کہ ہر ایک غم پیدا کرنے والے ہی نے دیا ہے۔ لیکن جو دنیا کی سختیوں کا بوجھ ہنستے کھیلتے برداشت کر کے چپ چاپ چلے جاتے ہیں، اور پھر وقت آنے پر اسی طرح ہنستے ہنستے دھرتی ماں کی گود میں سو جاتے ہیں، میں انھیں سلام کرتا ہوں۔ میں انھیں بد نصیب بھی کہوں گا، پاپی بھی کہہ لوں گا، لیکن میں انھیں سلام کرتا ہوں۔

ہوا کا جو حشر ہوا، اس پر میں کیا سوچوں؟ میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا شاید جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اس لئے کہ اسے اب کسی طرح نہیں بدلا جاسکتا لیکن اتنا سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو محبت مجھے ان سے ملی تھی کیا وہ

اب بھی مل سکتی ہے؟

کیا اُس محبت کو بھولا جا سکتا ہے؟ کیا وہ محبت بذات خود اتنی پاکیزہ تھی کہ جنت کے دروازے اس کے استقبال کے لیے کھل جائیں۔

میں نہیں جانتا۔ جنت، دوزخ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ قدرت کا نظام میری سمجھ سے بالا ہے۔ لیکن اتنا البتہ جانتا ہوں کہ اگر بے دل اور بے ضمیر نہ ہوتا تو اس کرسی عدالت پہ متمکن نہ ہوتا۔

اُس دن کے بعد جب بُوا جمال گوٹا لینے کے باوجود بھی بابا ——— کے ساتھ چلی گئیں تو ایک عرصہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ نویں جماعت سے دسویں میں آیا اور دسویں سے ایف۔ اے میں۔ یعنی کالج میں داخل ہو گیا اور پھر انٹرمیڈیٹ بھی پاس کر لیا۔ نیا ماحول ملا، نئے دوست ملے۔ نظر میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ زندگی کے ولولے اور خواہشیں منہ کھول کر واپس آ گئیں۔ بُوا کی یاد رفتہ رفتہ دھندلی ہو گئی۔ پہلے تو میں بے قرار ہو کر ان کی خیریت پتاجی اور ماں سے پوچھتا رہا۔ معلوم ہوتا رہا کہ بخیریت ہیں، اچھی طرح سے ہیں۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا رہ جاتا کہ یہ "بخیریت" اور "اچھی طرح سے" ہوتا کیا ہوتا ہے۔ کیا بُوا واقعی خوش ہیں؟ اگر ہیں تو پھر میں خوش کیوں نہیں ہیں ———؟ کچھ دن بعد پتہ چلا کہ ان کے ایک مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے اور خود انکی حالت بھی تقریباً مردوں جیسی ہو گئی ہے۔ لیکن جیسے خدا رکھے، اسے کون چکھے۔ بُوا بھی پہاتا کی کرپا سے بچ گئیں۔ کرپا کہتے ہوئے کچھ جی رُکتا ہے پھر بھی اگر کرپا تو اسے نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دن میں نے ماں سے پوچھا، "ماں! بُوا کا کچھ حال معلوم ہوا ہے؟

اب کی چھٹیوں میں میں ان کے پاس جاؤں گا۔" سن کر ماں پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں، بولیں کچھ نہیں۔

میں نے پھر لجاجت سے کہا، "بتاؤ، بُوا کا کچھ حال معلوم ہوا؟"

ماں نے اُبھرا ہی کے ساتھ کہا "نہیں۔"

میں نے پھر کہا، "معلوم ہوا ہے؟"

بولیں، "نہیں معلوم ہوا، نہیں معلوم ہوا، کیوں میری جان کھائے جا رہا ہے؟"

میں نے کہا، "کیا بات ہے؟ بتلاتی کیوں نہیں ہو؟"

بولیں، "بات! ارے کہہ تو دیا کہ بات کچھ بھی نہیں ——— وہ اچھی ہی ہوں گی اور کیا ———؟ پڑھنا لکھنا کچھ نہیں بس جب دیکھو بُوا، جوا مر گئی تیری بُوا ——— خبردار جو اب بُوا کی بات مجھ سے کی۔"

میں سکتے میں رہ گیا، پوچھا، "کیوں؟ کیا ہوا ہے؟"

کہنے لگیں، "کچھ نہیں چل جا اپنا سبق دیکھ۔"

کسی طرح ماں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ کچھ بجا سی بھی شدید تھیں۔ بابوجی سے پوچھا وہ بھی جواب میں خاموش رہ گئے۔

بابوجی آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے، بولے، "کس نے کہا ———؟"

"کسی نے بھی کہا، آپ سچ سچ بتلائیے ——— کیا مر گئی ہیں ———؟"

"نہیں تو!"

"تو کیا بات ہے ———؟"

"بات کچھ نہیں ہے۔"

مدت گذر گئی۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر رہا۔ اب بُوا کا ذکر گھر میں ممنوع ہو گیا تھا۔ ان کا نام آتا تو سب چپ رہ جاتے۔ پتاجی میں ایک خاص قسم کی تبدیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ سنجیدہ، کچھ غمگین ہو چلے تھے۔ ماں چڑچڑی سی ہوتی جاتی تھیں۔

بہت دنوں بعد جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ بُوا کو ان کے پتی نے چھوڑ دیا۔ بُوا کا چال چلن خراب ہے اور پھوپھا کو معلوم ہوا کہ ان کا چال چلن ہمیشہ سے خراب ہے۔ "چھوڑ دیا ہے" کا مطلب تو ایک میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہاں چھوڑ دیا ہے؟ کہاں چلی گئی ہیں وہ؟ یا کسی الگ جگہ انھیں رکھ دیا گیا ہے۔ یا اُسی گھر میں ہیں اور پھوپھا سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے ———؟ معلوم ہوا کہ اسی شہر میں انہیں ایک علیحدہ چھوٹے سے گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔ کوٹھری ہے ہی۔ وہاں چاہے جیسے رہیں، چاہے جیسا کھائیں پئیں۔ کہاں سے رہیں اور کیسا کھائیں پئیں اس کا بھی پتہ چلا کہ پھوپھا نے اُن سے کہا تھا کہ میکے چلی جاؤ لیکن بُوا ہی اس پر راضی نہ ہوئیں۔ دھمکایا گیا، مارا پیٹا گیا لیکن انہیں مرنا منظور تھا، ہمارے یہاں آنا منظور نہ تھا۔ تب خود پھوپھا نے انھیں الگ گھر میں چھوڑ دیا ہے۔

یہ سب کچھ میں نے یوں سُنا جیسے کہانی سُن رہا ہوں۔ پھر ایک عجیب سا خلفشار اور ہیجان میرے ذہن میں پیدا ہو گیا، لیکن جلد ہی ہیجان ٹھنڈا پڑ گیا اور زندگی پھر رفتہ رفتہ اُسی ڈھرّے پر آ گئی ——— میں نے اس کہانی کو قبول کر لیا۔

زندگی رواں دواں ہے۔ کون کس کا انتظار کرتا ہے، مرنے
والے مر جاتے ہیں، لیکن جینا ہے جنھیں، وہ تو مُردوں کو لے کر
نہیں بیٹھ سکتے۔ مرنے کے ساتھ کوئی مرتا ہے؟ یہ تو چکر ہے۔ آنے
جانے کے لیے سوچا اور پھر شرمندہ ۔ بس چلے چلو۔ اس چل چلاؤ
میں مجھے یکایک معلوم ہوا کہ بُوا اس جگہ نہیں ہیں۔ "فلاں" شہر
جا چکی ہیں کوئلے والا ایک بنیا سا تھا ہے۔ وہ "فلاں" شہر
جہاں ہم رہتے تھے، اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بُوا نے بھی
اسکا ایک گوشہ آباد کر دیا ہوگا۔ یہ بات بڑی تعجب اور ناممکن معلوم
ہوتی۔

اس کے تھوڑے دن بعد پتا جی کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ ذرا
پہلے جھکے رہنے لگے کیوں کہ ماں بڑی سوجھ وچار والی عورت تھیں
موٹی عقل سے بچتیں اور مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے
ہوئے تھیں۔ اس اثنا میں میں نے ایف۔ اے پاس کر لیا تھا اور
ایک تھرڈ ایئر میں پہنچ گیا تھا۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے اس شہر کا بورڈ دیکھا دل
میں طرح طرح کے جذبات موجیں مارنے لگے۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اب تو
نہیں امید میں یہاں اتروں گا۔ بُوا کو ڈھونڈھ نکالوں گا اور کہوں گا "بُوا
— یہ تمھارا کیا حال ہے؟ چلو، یہاں سے چلو۔"
ماں نے لکھ بھیجا تھا کہ چھٹی ہوتے ہی گھر چلے آؤ۔ بات یہ تھی کہ
میرے بیاہ کے سوت کو اٹھا کر ماں اس برس کی ٹھانٹھ دے دینا چاہتی تھیں
لیکن لوٹتے میں راستے کے اس اسٹیشن پر بغیر اُترے نہ رہا گیا۔ اور میں نے
بُوا کو ڈھونڈھ ہی نکالا۔

شہر کے اس محلے میں جاتے ہوئے میرا دل کسی ان جانے ڈر
ان دیکھے بوجھ تلے دبا جاتا تھا۔ کہاں بُوا؟ اور کہاں یہ زندگی؟ وہاں نیچے
درجے کے لوگ رہتے تھے۔ گلی میں اندر جا کر بُوا کی کوٹھری تھی۔ بنیئے نے باہر
ایک دکان کر لی تھی اور دن میں وہاں کوئلے کا بیوپار کرتا تھا۔ میں کوٹھری
کے دروازے پر پہلے تو ٹھٹھکا، پھر ہمت کر کے اندر داخل ہو ہی گیا —
وہ بُوا ہی تھیں — کیا وہی ہیں؟ لیکن وہی تھیں۔ ایک دھوتی
سے بدن ڈھانپے کوئلے کی آنچ پر روٹی سینک رہی تھیں۔
کسی کو آتے دیکھ، انھوں نے جھٹ ماتھے کے آگے آنچل کھینچ لیا
لیکن جب غور کیا اور مجھے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پہچانا نہیں؟
یا پہچان لیا؟ میرے پیر جیسے زمین میں گڑ گئے۔ میں اپنے آپ پر لعنت

کرنے لگا۔ کیوں آیا یہاں۔ کیوں آیا؟ تا ثیری اپنی نگاہ میں ایسی کچھ
کچھ۔ ...کے بعد انھوں نے اپنی نظریں پھر انگیٹھی پر جما لیں اور
روٹی پکانے لگیں۔
تھیں بُوا ہی — لیکن ان کا یہ کیا روپ تھا۔ جسم بھر ہو گیا تھا
منہ ستا ہوا کر نکل آیا تھا۔ یہ سب اندر پیلاپن اس بات کا اشارہ
تھا کہ وہ پھر حاملہ تھیں۔ پورا جسم ایک دھوتی میں چھپائے بیٹھی تھیں
چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا — کوٹھری کوئی
بارہ مربع فٹ ہوگی۔ باہر تھوڑی سی کھلی جگہ تھی، جہاں دھوتی اور انگوچھے
سوکھ رہے تھے۔ اندر کمرے میں کچھ میلے کچیلے کپڑے تتر بتر پڑے تھے
ان کے پاس کچھ بکس تھے۔ اوپر ایک بانس لگا ہوا تھا جس پر کسی قدر
اچھے کپڑے پڑے تھے۔ بُوا کی پشت کے پیچھے کچھ زنگ خوردہ کنستر
رکھے تھے۔ برتن اور دھکن ٹین کے ڈبے رکھے ہوئے تھے پاس ہی
کچھ پتیلیاں، المونیم کے برتن، ایک ٹین کی بالٹی، اور ایک پانی کا گھڑا رکھا
تھا۔ کونے میں ایک کوئلے کی بوری آدھی جھکی ہوئی کھڑی تھی۔
میں یہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا کہ جیسے یہ چیزیں اس سے
پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں۔ جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہوں — میں دیکھتا
رہا، بُوا خاموش روٹی پکانے میں لگی رہیں۔
میں نے کہا، "میں پرمود ہوں، بُوا — !"
وہ کچھ نہ بولیں۔
میں بھی چپ ہو رہا۔
پھر کچھ دیر بعد بولا، "میں جاؤں؟"
اس بار بھی انھوں نے نہ نظر اٹھائی، نہ لب ہلایا۔
لیکن مجھ سے جایا بھی نہ گیا — پاؤں زمین میں گڑ گئے میرے
منہ سے دفعتاً نکلا، "لو — ! نہیں جاتا — لیکن کچھ بیٹھنے کو دو تو
جب ہی آ کر بیٹھوں۔"
میں سوچ رہا تھا کہ اب تو انھیں بولنا ہی پڑے گا۔ لیکن
وہ اب بھی خاموش رہیں۔ اتنے میں باہر سے کسی کے پیروں کی
چاپ سُنائی دی اور آواز آئی :۔
روٹی پک گئی — ؟ اور دوسرے لمحے ایک آدمی ایک دم اندر داخل
اور مجھے دیکھ کر مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔
بُوا نے انگیٹھی پر نظریں جمائے ہوئے کہا، "سُنتے ہو! ان سے

کہہ دو کہ جائیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اُس آدمی کا تعجب پہلے سے اور زیادہ ہو گیا۔ وہ بار بار مجھے اوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ اس وقت مجھے غلطی کا احساس ہوا اور غصہ آیا کہ چلتے وقت کوٹ، پتلون اور ٹائی، ہیٹ کیوں پہن آیا۔ وہ شخص ابھی تک مجھے بدستور حیرت اور استعجاب سے گھور رہا تھا۔ جسم پر کپڑے کلٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں نے کہا، "بوا سچ بچ جاؤں؟"

بُوا نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، "لو تو میں جاتا ہوں لیکن کل سے مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا ہے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ یہ سچی بات ہے بُوا۔"

یہ کہہ کر میں چلنے کے لئے مڑا۔

بُوا نے بغیر کسی طرف دیکھے کہا، "سنتے ہو، کھڑے کیا ہو، باہر جا کر چار پیسے کا دہی لے آؤ۔ اور پُورا بھی لیتے آنا۔"

وہ شخص بغیر کسی تامل کے باہر چلا گیا۔

میں نے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولے اور بے تکلفی سے اُن کپڑوں پر جا بیٹھا جو ایک کونے میں پڑے تھے۔ میں بُوا کے بالکل مقابل تھا۔ میں نے کہا، "سچ جاننا بُوا، میں کل کا بھوکا ہوں۔"

بُوا نے اب آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُف آنکھوں میں کیا تھا؟ بولیں، "آپ یہاں کھائیں گے؟"

میں نے کہا، "میں آپ ہی سہی! لیکن میں بھوکا ہوں۔ نہیں کیسے کھاؤں گا۔"

بُوا نیچے دیکھنے لگیں۔ انھوں نے انگیٹھی پر سے توا اُتارا اور روٹی سینکنے لگیں۔ روٹی پھول گئی۔ وہ اسے ادھر اُدھر کر کے سینکتی رہیں، بولیں کچھ نہیں۔ روٹی سینک کر الگ رکھ دی۔ توا پھر انگیٹھی پر رکھ دیا اور پھر۔۔۔

مجھے محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں ایک دم اوپر نہیں اُٹھتیں۔ مجھے اس پر بڑی تکلیف سی ہوئی۔ چاہتا تھا کہ انھیں جتلا دوں کہ میں پرمود ہوں، پرمود۔ بُوا سنو تو، دیکھو تو میں وہی پرمود ہوں۔ اور تم بھی تو بُوا، وہی بُوا ہو، کیا نہیں۔؟

میں نے کہا، "بُوا!"

اُنھوں نے سُن لیا۔

میں نے کہا، "بابو جی تو چلے گئے بُوا۔ تمہاری یاد میں دل میں لئے چلے گئے۔ بتاؤ میرے اب کون ہے؟ ایک ماں اور دوسری تم!"

بُوا خاموش بیٹھی رہیں۔ اور کچھ نہ بولیں۔

دل میں آیا کہ کھل کر ان کے سامنے بچھ جاؤں تاکہ بُوا کچھ کہیں تو لوں کیوں مجھے سزا دے رہی ہیں۔

میں نے کہا، "بی۔ اے میں پڑھ رہا ہوں، بُوا۔ ابھی یونیورسٹی سے آ رہا ہوں۔ ماں بیاہ کی بات کر رہی ہیں۔ سنتی ہو نا؟ ماں اسی سال بیاہ کرنا چاہتی ہیں، لیکن میں نہیں چاہتا۔ جب تک بی۔ اے پاس کر لوں، تب تک اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا، بُوا؟ تم مت بولو، لیکن میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں کہ میں ابھی بیاہ نہیں کروں گا۔ لیکن ماں سے میرے دل کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے دبا لیتی ہیں۔ بُوا اگر میرے ساتھ زبردستی ہوئی تو ذمہ دار تم ہو گی۔ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے دیکھا کہ بُوا کے ہاتھ بیلن پر دھیمے ہوتے ہوتے بالکل رُک گئے۔ اور توے پر روٹی پھول کر اب جلنے کا انتباہ دے رہی ہے۔ اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی۔ بُوا جیسے چونک کر باخبر ہو گئیں۔ اور چکلے پر پڑی ہوئی روٹی پھر قاعدے سے بیلنے لگیں۔ اتنے میں وہ شخص اندر آیا اور دہی اور پُورا بُوا کے پاس رکھ دیا۔

بُوا نے کہا، "ابھی دکان پر بیٹھو۔ سنا کھانے کے لئے تھوڑی دیر میں آنا۔"

وہ شخص مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

بُوا نے آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں، "لو آؤ۔"

میں نے کہا، "پہلے تیار کر لو، پھر اطمینان سے کھاؤں گا۔"

بُوا نے کہا، "نہیں! تم بیٹھو۔"

میں نے کہا، "میرے ساتھ نہیں بیٹھو گی؟"

"نہیں"

"کب کھاؤ گی؟"

"بعد میں کھاؤں گی۔"

میں نے کہا "تم میں کب کھاؤگی؟ ابھی نہ کھاؤ؟"
"نہیں کھاکر کھاؤں گی؟"
میں نے مفلر اُتار کے کوٹ اتار کر بانس پہ ٹانگ دیا۔ منی انگنائی اور ایک لمحے سوچتا رہا کہ کہاں کیسے بیٹھوں۔
"وہاں سے ایک دری لے لو نا اور یہاں بچھا کر بیٹھ جاؤ۔"
میں نے دری لی اور ستائی ہوئی جگہ پہ بچھا کر بیٹھ گیا۔
کھانے کے وقت بُوا نے پوچھا "ماں اچھی ہیں؟"
"اچھی ہیں۔"
"یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟"
"اسٹیشن پہ ویٹنگ روم میں سامان پڑا ہے۔"
"کل ہی آئے ہو؟"
"کل ہی آیا۔"
"یہاں کا پتہ کس نے دیا؟"
"لگ گیا۔"
"کب جاؤ گے؟"
"جب تم چلو گی؟"
یہ سننا تھا کہ جیسے انہیں بجلی نے چھو لیا۔ چہرہ فق ہو گیا جیسے خون منجمد ہو گیا ہو۔ نگاہیں نیچی کر لیں اور کچھ نہ بولیں۔ میں بھی چپ ہو رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا "چلو گی نہیں؟"
بُوا نے قدرے درشتی سے کہا "کہاں؟"
میں نے کہا "کہاں کیا؟ گھر۔!"
بُوا نے اسی درشتی سے کہا "ماں نے کہا ہے؟"
"میں تو کہہ رہا ہوں!"
یہ سن کر گویا انہیں کچھ تسلی ہو گئی۔ چہرے کی کڑواہٹ اور درشتی کچھ کم ہو گئی۔ بولیں، "پہلے شادی تو کر لو۔ تب گھر بنے گا۔ اور اس وقت لینے آؤ گے، تب میرے سننے کا بھی وقت ہو گا۔"
میں نے زور سے کہا "میرا گھر نہیں ہے تو کس کا ہے؟"
وہ بدستور خاموشی سے مجھے تکتی رہیں۔ میں نے پوچھا "تو نہیں چلو گی؟"
وہ اس پر کچھ مسکرائیں۔ بولیں، "تم تو کہتے تھے کہ بی۔ اے میں پڑھتا ہوں لیکن میرا خیال ہے تم نے ابھی تک کچھ نہیں سیکھا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا یوں ہی سہی لیکن تمہیں گھر لے کے جاؤں گا۔"
بُوا نے کہا "اچھا پہلے کھانا تو لو، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"
میں نے کہا "تمہیں پتہ نہیں بیس برس کا ہو گیا ہوں۔ بالغ ہوں۔ گھر کا مالک میں ہوں۔ ماں میری ہے۔ میں تمہیں یہاں کیسے رہنے دوں گا۔"
بُوا بولیں "تو ضرور لے چلے گا؟"
"ضرور لے چلوں گا۔"
وہ ایک لمحے کے لئے رک گئیں۔
"ضرور لے چلے گا تو سن ــــ میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جا سکتی۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بی بی کے گھر کو چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ بی بی موجود ہیں لیکن دوسرے کے سہارے رہ رہی ہوں۔ تم نہ سمجھو لیکن میں تو سمجھتی ہوں۔ تم اپنی آنکھیں بند کر لو لیکن بھوت سا اپنا یہ پاپ نکل جانے کو نہیں کہہ سکتے۔ پھر جس کو ساتھ لے کر بی بی کو چھوڑ آئی ہوں، انہیں میں چھوڑ دوں؟ انہوں نے کون سی قربانی نہیں دی میرے لئے۔؟"
انہوں نے تو مجھے دوسری زندگی دی ہے۔ میں مر سکتی تھی لیکن۔ یہ نہیں مرنے کو میں انسانیت کے خلاف سمجھ کر ہی نہ کر سکی۔ جس کے سہارے میں موت کے منہ سے بچی، اُسی سے الگ ہو جاؤں۔ ؟ میں الگ نہیں ہو سکتی ــ پاپن ہو سکتی ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔ نہیں بدھو تم سب لوگ کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ میں مر گئی۔"
میں بھونچکا رہ گیا۔ اس قسم کی باتیں میں نے پہلی بار بُوا کے منہ سے سُنی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندرونی طاقت انہیں قائم رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ آدھ مری تو تھیں ہی۔
میں نے کھانا کھایا۔ بُوا نے بھی اپنا چولہے کا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ برتن رکھ کر مجھ سے کہنے لگیں، "سنو ابھی تو نہیں جا رہے ہو؟"
"ابھی تو نہیں۔"
"تو ایک کام کرو۔ باہر کی دکان پر جا کر انہیں کھانے کے لئے بھیج دو۔ تم اتنے پانچ منٹ وہاں بیٹھنا پھر یہاں آ کے آرام کرنا ہو سکے تو دوپہر بیتے جانا۔"
میں نے باہر آ کر اس شخص سے کھانے کے لئے کہہ دیا۔ میں خود سوچنے لگا کہ اس کوئلے کی دکان پر کیسے بیٹھوں؟ ایک ٹاٹ تھا جس

پر چھوڑا کیونکہ پڑا اتھا۔ اس چورے پر مجھ سے نہیں بیٹھا گیا۔ میں دکان کے آگے ٹہلنے لگا۔

عجیب و غریب محلہ تھا۔ دن وہاں شاید ہی نکلتا ہو، دن میں رات معلوم ہوتی تھی، رات میں کیا ہوگا، کچھ پتہ نہیں۔ کوٹھریاں ایک دوسرے سے اتنی ملی ہوئی تھیں کہ ایک دوسری میں گھستی معلوم ہوتی تھیں۔ پھر یہ کوٹھریاں ہی دکانیں بھی تھیں اور رات کو باپ کے اڈے بھی۔ کسی پر پہلوان خانے کی سستی چیزیں تھیں تو کسی پر باسی بنڈلیاں اور خشک دبے رس پھل رکھے تھے۔ کہیں نائی بیٹھا ہوا استرے پر دھار لگا رہا ہے، کہیں درزی بیٹھا سلائی کی مشین پر انگریزی وضع کے کپڑے سی رہا ہے۔ یہاں آسمان بھی ایک گلی معلوم ہوتا ہے۔ وقت کا شمار راتوں کے حساب سے ہوتا ہے۔

میں بی۔ اے کا طالب علم پتلون پر صرف قمیض اور قمیض پر ٹائی لگائے اس دکان کے آگے چکر لگاتا رہا اور بغیر سوچے بھی بوا اور اس ماحول کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

اتنے میں وہ شخص آیا اور بولا کہ بوا مجھے بلا رہی ہیں۔

میں چلنے لگا۔ یکایک اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے روک کر کہا "ایک منٹ، بس ایک منٹ۔" یہ کہہ کر مجھے وہیں چھوڑ وہ آگے لپک گیا۔ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا پان تھا۔ اُسے سامنے کر کے بولا "لیجئے۔"

میں نے پان لے لیا۔ پوچھا "تمباکو؟" میں نے کہا "جی نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ شاید مجھے بالکل بے تکلف دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بنڈی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی اور کہا "بنارسی تمباکو ہے، بابو!"

میں نے کہا "میں ....."

"..... روپے سیر والا ہے، بابو! بنارسی دکان کا۔"

مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ تمباکو کتنے روپے سیر تھا۔ ضرور وہ تمباکو اعلیٰ درجے کا ہی ہوگا۔ اپنی مجبوری پر میں شرمندہ ہو گیا۔ میں نے کہا "جی ..... میں ....."

وہ شخص ہمدردی سے میری مجبوری پر ہنس دیا۔ "ہیں، پیتے نہیں۔"

میں چلا آیا۔

آ کر دیکھا کہ کپڑوں کا ڈھیر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ بوا گذا رکھنے کے لئے نیچے کئی کپڑے ڈال کر اُوپر ایک نئی چادر بچھا رہی ہیں۔

مجھے آتے دیکھ کر بولیں "آؤ، اب ذرا آرام کر لو۔"

میں نے پوچھا "تم نے کھانا کھا لیا؟"

"ابھی کھاتی ہوں۔"

"تو کھا لو۔"

"بس کھاتی ہوں — تم یہاں بیٹھو تو۔"

میں بچھی ہوئی چادر پر آ بیٹھا۔ انھوں نے دور سے ہی دو تکیے میرے سامنے پھینک دئے اور کہا "لیٹ جاؤ نا۔"

میں نے کہا "لیٹ جاؤں گا۔"

اس پر بغیر کچھ کہے وہ جھوٹی تھالی مانجھنے لگیں۔ مانجھنے کے بعد اس میں کھانا نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں "آؤ، میرا ساتھ دو گے؟"

میں نے کہا "میرا ساتھ تو تم نے دیا نہیں۔"

بولیں "اب تم ساتھ نہیں دے سکتے۔"

میں نے کہا "دیکھ لیا بوا، تم میرا ساتھ نہیں چاہتیں۔"

"تمہارے ساتھ کے لائق میرا کیا منہ؟" کہہ کر تھالی اُٹھائی اور کونے میں چلی گئیں۔ کھا پی کر اسی وقت برتن مانجھنے لگیں۔

میں نے کہا "یہ بعد میں نہیں ہو سکتا۔"

بولیں "ابھی دو منٹ میں ہوا جاتا ہے۔"

میں نے اُدھر سے آنکھیں پھیر لیں، ایک تکیہ دبا کر وہ سے پڑ رہا۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ آنے والا کل آج سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ بلکہ کل ہی کو سرے سے بھول گیا۔ یہ حالت کچھ دیر بعد اتنی بحرانی ہو گئی کہ مجھے قصداً اسے بدلنا ہی پڑا۔ ورنہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ میں بھی یہیں کا، اسی محلے کا ایک فرد ہوں — کہاں میرا کالج؟ کہاں شادی کی بات چیت؟ کہاں ماں اور میری زندگی کے منصوبے، کیا واقعی اُن کا وجود ہے؟ نہیں، سب دھوکا ہے۔ مستقبل بے معنی لفظ ہے۔ جو کچھ ہے، بس وہی ہے۔ اور وہ بھی وقت کا اسیر معلوم ہوتا تھا کہ باہمی گفتگو، بحث و تمحیص اور اختلاف رائے کے لئے کوئی موضوع باقی نہ رہا تھا۔ سب کچھ ایک خلا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا

ہم دونوں کا وہاں ہونا بھی بس سب ٹھیک "بی کا ایک جزو تھا
ماضی، حال اور مستقبل کی حدیں ٹوٹ سی گئیں تھیں، اس تثلیث سے
اب صرف ایک حال ہی بنتا تھا۔
(حال) ابھی۔ اور اسی کے اشارے پر میں یہاں چلا آیا ہوں۔
اس بیداری کے خواب میں آواز آئی۔ سو گئے؟
کروٹ لے کر دیکھا تو بُوا میرے پاس زمین پہ بیٹھی تھیں "نیند
نہیں آئی کیا"؟
انھوں نے پھر پوچھا۔
" نہیں تو۔"
"نہیں آتی، تو اب ذرا آنکھ لگا لو۔"
"تمھیں اب کچھ اور کام ہے؟"
"کام۔ ؟"
"ہاں کچھ اور کام نہ ہو تو۔!"
"کام کی تو کمی نہیں ہے۔ لیکن وہ دیکھا جائیگا۔ پر تم"
"تو! تم یہیں بیٹھو۔ آج کام دام رہنے بھی دو۔"
"چھوڑ تو دیا ہے اور بیٹھی بھی ہوں۔"
میرے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات اُبھر
آئے۔ آج بُوا جس حالت میں ہیں اُس کی ذمہ دار وہ نہیں
ہیں۔ دل یہ بات مانتا ہی نہیں۔ انکی زبوں حالی نے مجھے
مجسّم ترس، رحم اور رقّت بنا دیا تھا لیکن باوجود کوشش کے
بھی یہ نہ ہو سکا کہ اُن سے ہمدردی کا اظہار کروں۔ اس گو مگو کی حالت
میں میرے منہ سے اچانک نکل گیا!
"بُوا۔ !"
بولیں، "کہو۔ کہو۔"
میں نے قدرے جھجک کر کہا، "میری سمجھ میں نہیں آتا یہ جگہ
اچھی ہے یا بُری؟"
"کون کہتا ہے جگہ اچھی ہے۔ لیکن جگہ تو ہے۔ کبھی کبھی
جگہ کا سوال ہی بہت بڑا ہوتا ہے۔ صاف صاف کہنا پڑے گا
کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟"
یہ کہہ کر انھوں نے نہ جانے کس انداز سے مجھے دیکھا۔ یہ انداز مجھے
اچھا نہ لگا۔

میں نے کہا، "تم کہیں رہوگی؟ اس جگہ؟ کب تک رہوگی۔؟"
"ابھی تو اسی جگہ ہوں۔ اس کوٹھری میں میں نہ رہوں گی اور کوئی
رہے گا۔ یہ کوٹھریاں تو آباد ہی رہتی ہیں ان میں رہنے والی آدمی بہت ہیں۔
آگے کا حال میں نہیں جانتی۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ زیادہ دن یہاں نہ
رہ پاؤں گی۔"
"کہاں جاؤگی۔"؟
"کون جانتا ہے۔؟"
"کیوں جاؤگی۔؟"
"تمہیں خبر، وہ آدمی جس کے ساتھ میں یہاں رہتی ہوں، زیادہ
دن یہاں نہیں رہ سکے گا۔ میں جانتی ہوں ایک دن چھوڑ کر چلا جائے گا
تب ہی اس کوٹھری سے میرا نکلنے کا دن ہوگا۔"
وہ جس تحمل اور بے بناوٹی انداز سے بات چیت کر رہی تھیں،
میں اسکی تاب نہ لا کر دبا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "پھر کیا کروگی۔؟"
"میں کیا کروں گی۔؟ میں ابھی سے کیسے بتا دوں؟ کوشش بھی کروں
تو کچھ نہیں بتا سکتی۔ لیکن ایک بات کہہ سکتی ہوں۔..."
یہاں جیسے اُن کی آواز کو ندامت نے دبا دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھ
کر مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا۔؟"
"طوائف کا پیشہ نہیں کروں گی، اس بات کا یقین رکھو۔"
یہ میرے لئے بہت تھا۔ میں کچھ خوف زدہ اور حیرت زدہ سا ہوگیا
۔۔۔جس کو تن دے دیا جائے اُس سے پیسہ کیسے لیا جا سکتا ہے میری
سمجھ میں نہیں آتا۔ تن دینے کی ضرورت تو سمجھ میں آتی ہے۔ تن
دے سکوں گی، شاید وقت ایسا کرنا ضروری بنا دے۔ لیکن لینا کیسا
دان عورت کا فرض ہے۔ اور فرض ہی کیا ہے؟ اس سے من مانگا
جاتا ہے، تن مانگا جاتا ہے۔ نیک چلنی بھی تو ہے۔ لیکن بکری؟
نہیں نہیں، یہ نہ ہوگا۔"
اگرچہ کہہ وہ مجھ سے رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم نہ ہوتا تھا
وہ تو اپنے باغی اور سرکش خیالات کو ظاہر کر کے خود ہی لا جواب کر رہی
تھیں۔ میں نے کہا، "بُوا ناراض نہ ہونا۔ میں پوچھتا ہوں ایسی تم
کیوں ہوگئی ہو۔؟ بی بی کو کیوں چھوڑ آئیں"؟
بُوا نے ٹکٹکی باندھ کر کہا، "میں تم ناراض ہوگی۔؟ یہ ہو سکتا ہے
بی بی کو میں نے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ میں تو بھی

مانتی ہوں کہ عورت کا مذہب ہے شوہر کی فرماں برداری۔ عورت کا دھرم اپنے پتی کے دھرم سے کیسے الگ ہو سکتا ہے؟

شوہر کی فرماں بردار بیوی یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ شوہر نہ چاہے اور وہ پھر بھی اس پر بوجھ بنی رہے۔ یہ جان کر کہ وہ مجھے نہیں چاہتے میں ان کی آنکھوں سے دور ہو گئی۔ انھوں نے کہا میں تیرا پتی نہیں ہوں۔ تو پھر میں کیوں انھیں ایذا پہنچاتی۔ شوہر پرست بیوی بھلا یہ کیسے کر سکتی ہے!

"بُوا! یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو۔؟ یہ سب کیوں ہوا۔؟"

"کیوں ہوا۔ یہی تو تمھیں بتاتی ہوں ——— بیاہ کے بعد میں نے بہت سوچا۔ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں دھوکا نہیں دے سکتی۔ دھوکا پاپ ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ بیاہتا عورت کا تو پتی ہی سب کچھ ہے۔ سب بعد کی باتیں ہیں، پتی کے لئے سچا ہونا پہلی بڑی چیز ہے۔ سچا بن کر ہی قربانی دی جا سکتی ہے۔ پرمود، شیلا کے بیاہ کو تم جانتے ہو؟"

اس اچانک سوال نے مجھے پھر حیرت میں ڈال دیا۔

"اُن کا ایک خط آیا تھا۔ کوئی خاص بات تو نہ لکھی تھی۔ یہی لکھا تھا کہ میں اب سول سرجن ہو گیا ہوں۔ شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی کرنے کا خیال ہے۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ تم خوش رہو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کرنا۔ اس خط کو پڑھتے ہی ذہن میں خیالات کی چکی چلنے لگی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ آپ کے خط کے لئے احسان مند ہوں، لیکن آئندہ کوئی خط نہ بھیجئے۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ خوش رہوں۔ جواب دینے سے پہلے دونوں خطوں کا ذکر تمہارے پھوپا سے کر دینا ضروری تھا۔ سن کر بولے کہ مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی۔؟ پھر کہا کہ میں حرام زادکا ہوں ——— میں نے کوئی چوں چرا نہ کی۔ اُس دن سے تمہارے پھوپا مجھ سے کھنچے کھنچے چلے گئے۔ مجھے ناراض ہونے کا کیا حق تھا۔؟

انھوں نے میری پروا کرنی چھوڑ دی۔ میں اسی قابل تھی۔ پھر بالا پروائی کے متعلق پوچھنے کا حق کیا تھا مجھے۔؟ کام کاج شروع کر دیا تھا، جو کچھ اس سے مل جاتا، اسی سے پیٹ بھر کر پڑ رہتی تھی ——— لیکن اس پر بھی میں اُن کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ اور اس کی وجہ بھی مجھ سے چھپی نہ رہی کہ میرا وجود کیوں انھیں ناگوار تھا، اور ایک روز میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ چاہیں تو مجھے گھر سے دور کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا 'جاؤ اپنے میکے چلی جاؤ' ——— میں نے کہا کہ وہاں سے تو ہمیشہ کے لئے آ چکی۔ آپ کی یہی خوشی ہو تو بھی وہاں جا سکتی ہوں۔ آپ کو ناراض کر کے وہاں جانا میرا دھرم نہیں۔ بولے، پھر جو جی چاہے کر جہاں چاہے جا۔ میں نے پوچھا 'کہاں جاؤں، کیا کروں۔؟'

اُنھوں نے کہا 'جان مت کھا، دُور ہو جا' ——— کچھ دن یونہی بیت گئے۔ میں ان کے راستے کا پتھر تھی۔ ایک دن انھوں نے اچانک کہا 'چل نکل یہاں سے'۔ میں نے حکم عدولی کی ضد نہ کی۔ شہر سے دور ایک اکیلی کوٹھری میں لا کر وہ خود ہی چھوڑ گئے۔ ساتھ ہی ضروری سامان بھی، خود سے لا کر دے دیا۔ یہ ہے کل کہانی۔"

میں بوا کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کا چہرہ ہر قسم کے تغیر سے عاری تھا۔ میں حیران تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا بوا کو اس کی شکایت نہیں ہے۔ میں نے بے تاب ہو کر کہا "تم گھر کیوں نہیں آ جاتیں بوا، اس آدمی کے ساتھ یہاں رہنے کیوں آ گئیں۔؟"

بولیں "پرمود، میں تجھے کیسے بتاؤں، میں گھر نہیں آ سکتی تھی۔ ایک بار گھر آ کر میں سمجھ گئی تھی کہ اب میکے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ عورت جب تک سسرال کی ہے تبھی تک میکے کی ہے۔ سسرال سے ٹوٹی تو میکے کا رشتہ خود بخود ختم۔"

میں تعجب سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے الفاظ سے میں کوئی خاص بات نہ سمجھ سکا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہی ہو۔؟ تم گھر نہیں جا سکتیں۔؟ یہاں آ کر ایک غیر شخص کے ساتھ رہ سکتی ہو، بس سکتی ہو۔ آخر یہ کیا ہے۔؟"

"گھر تو نہیں جا سکتی۔ ایک غیر آدمی کے ساتھ رہنے کی بات کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گی۔ لیکن وہ آدمی غیر کیوں ہے۔؟"

"وہ غیر کیوں ہے۔؟"

"ہاں غیر تو وہ نہیں ——— کیا میرا برتاؤ اس کے ساتھ غیر معلوم ہوتا ہے۔؟"

"وہ پتی ہے۔؟"

"پتی! میں نہیں جانتی ——— لیکن میرا وجود میرے لئے نہیں ہے۔ اس وقت تو بے شک میں اس کی خدمت کر رہی ہوں ———"

"خدمت ———؟"

مذمت کیوں نہیں — میں جب کوٹھی تک اُنکی چھوڑنے گئی تو بولی "کیوں نہیں — ؟ جانتے ہو — ؟ میں نے تو سوچا بھی تھا اور چاہا بھی تھا کہ مر جاؤں لیکن ایسے جینے میں کیا ہے — ؟ لیکن بیٹا ایک مجھ پر عائد کر جس نے پیدا کیا ہے — اسکو مارے گا — تو موت کا سوا آگے کون گی نہ زخم میں اگر مر جانے والی میں کون — ؟ بھوک سے مرنا پڑے تو میں مر ہی جاؤں — اپنے ہاتھوں کیسے گلا گھونٹ لوں — اسی حالت میں تین دن بعد جان جوکھوں میں ڈال کر اسی آدمی نے میری خبر لی تھی — اور اس خبرگیری میں بڑائی بھی کیا تھی — شاید میرے روپے کا لالچ بھی ہو لیکن اس کے لئے میں اسے کیا الزام دے سکتی ہوں — آنے والی مصیبتوں کی ذرا پرواہ کئے بغیر وہ میرے پاس آیا تھا — اس کا اپنا گھر بار تھا — عزیز تھے یار دوست تھے — اس نے ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں ملنے جلنے والے چھوٹ گئے لیکن میری مدد سے باز نہ آیا — جب پیچھے چوری اور جبر کا غم کھا — اس کے اس اچھے یا بُرے کام میں میرا ہاتھ نہ تھا — مدد اس نے میری یہ کی کہ کھانے کے لئے اور رکھ دیئے — اور وہ ایک نئی ڈھارس کی بندھی — میں نے موت سے منہ موڑ لیا لیکن موت سے منہ موڑ کر میں نے دیکھا کہ زندگی بھی میرے لئے سازگار نہ تھی — اور ٹھیک اس وقت اس آدمی نے میری مدد کی — میں نے احسان مند ہو کر اسکی مدد قبول کر لی پرمود، تم نے اُسے دیکھا تو ہے — میرے روپے کا لالچ اس پر سوار ہو گیا اور وہ اس نشے میں چور ہو گیا — مجھے اس پر ترس آ گیا — پرمود تمہیں کیسے بتاؤں، تم بچے ہو — اس بدقسمت پر یہ نشہ ایسا چڑھا کہ میں کہہ نہیں سکتی — وہ اپنے گھر کو بھول گیا، اپنا کاروبار بھول گیا — اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تُل گیا — ایک روز مجھ سے بولا "چلو بھاگ چلیں —" میں اگر سمجھاتی بھی تو کیا وہ سمجھتا — ؟ گرم توے پر جیسے پانی کی بوند گر کر چھن سے غائب ہو جاتی ہے، میرا عاجزانہ سے عاجزانہ مشورہ بھی اسی طرح اس پر بے اثر ہوتا — میں نے پوچھا "کہاں چلوگے — ؟"

"جہاں کہو، چلیں — میرا سب کچھ تمہیں ہو —" جیسے میں اس کی پیاری تھی اور پیاری ہوں — میں ہی جانتی ہوں — اس وقت میرے دل پر جو کچھ گذری، اس کا ذکر بیکار ہے — ایسی بے چینی تو میں نے کم ہی محسوس کی تھی — اسکی محبت کو قبول کرنے کا خیال بھی میرے لئے ناقابل برداشت تھا — لیکن کیا اس کا حق نہ تھا — اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس وقت اس کا سب کچھ میں ہی تھی — میں اگر اس کی طرف سے بے رُخی اختیار کرتی تو وہ ضرور کچھ کر بیٹھتا — یا اپنے ساتھ یا میرے ساتھ — سچ کہتی ہوں پرمود، اس وقت مجھے اُس آدمی پر کتنا رحم آ گیا تھا — تم ہی جانتی ہوں میں اس نے اس بھرم کو کسی طرح بھی نہ کھول سکی کہ میں بھی اس پہ فریفتہ ہوں — کیونکہ ایسا کرنا میرے نزدیک ظلم ہوتا — میرے پاس جو کچھ بچا کھچا تھا — میں نے اسی کو سونپ دیا — ہزار بارہ سو سے زیادہ کا مال نہ ہوگا — سب کچھ اس کے حوالے کرنے کے بعد اس جگہ کا نام میں نے ہی اسے بتایا — یہ دور جگہ ہے دیکھا چلو — جانتے ہو پرمود اس جگہ کا نام کیوں بتایا — اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ اس جگہ تم سے زیادہ دور نہیں — اور ایک نہ ایک روز میں تمہیں ضرور دیکھ لوں گی —"

میں بُوا کا منہ دیکھتا رہ گیا — میرے اندر ایک ہلچل سی مچ رہی تھی — میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیے اس سامنے بیٹھی ستائی ہوئی عورت سے نفرت کرتا ہوں یا ہمدردی — ؟ وہ عورت بدستور مجھے دیکھتی رہی، اپنا دکھڑا سناتی رہی —

"لیکن اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ تم ایک دن مجھے خود ہی ڈھونڈھ نکالو گے — میں سوچتی تھی کہ جب دل نہ مانے گا تو تمہیں دور سے دیکھ کر ہی اپنے آپکو سمجھا لیا کروں گی — تم مجھ سے نفرت کر سکتے ہو، پرمود — لیکن ہوں میں تمہاری بُوا ہی —"

میں اپنے کو بے بس پا رہا تھا — جی میں آیا کہ ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوں — لیکن ایک ایسی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی تھی جو دیکھی تو نہ تھی لیکن محسوس ہو سکتی تھی — منوں بوجھ تھا کہ مجھے دبائے دے رہا تھا — نہ غصہ سے چلا سکتا تھا — نہ محبت کے دفور میں رو سکتا تھا —

"... پرمود، میری حالت دیکھتے ہو — تم سے چھپاؤں گی کیا؟ یہ حمل اسی آدمی سے ہے ..."

یہ کہہ کر اُنھوں نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جس میں ہزاروں حسرتوں اور ارمانوں کا خون تھا — میں تاب نہ لا سکا اور تکیے میں منہ چھپا لیا —

"تمہیں لاج آتی ہے — ؟ لاج کی بات ہی ہے — لیکن اب یہ آدمی بھی مجھ سے کھنچ رہا ہے — وہ اپنے بیوی بچوں کو یاد کرنے لگا ہے یہ نہیں کہ میں اس وقت جبکہ وہ سب کچھ چھوڑ مجھے ساتھ لے جانے پر تُل گیا تھا، یہ نہ جانتی ہوں کہ اس کا یہ جوش اور اُبال کچھ دن کا ہے

اُسے بہت جلد اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ اور یہ بھی بے بس اور مجبور آدمی ایک دن پھر آزاد اور خود راے ہو جائیگا۔ یہ سب سمجھتے ہوئے اُسے سانس تو ے آئی۔ اس کی بے رُخی شروع ہو گئی ہے۔ اُسے اب چلا جانا ہی چاہیئے۔ اس کے بیوی بچے اکیلے ہیں۔ وہ میرے ساتھ نہیں نباہ سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اُکتا جائے۔ اپنی حالت میں جانتی ہوں۔ پیٹ میں بچہ ہے۔ لیکن خود غرضی مجھ سے نہ ہوگی مجھے چین تب ہی آئیگا جب وہ اپنے خاندان میں واپس چلا جائے وقت آگیا ہے کہ اُسے عقل آجائے۔ اب اس کی محبت کے منہ سے نقاب اُٹھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ میں اس کا سب کچھ نہیں ہوں ——— میں تو ایک بدذات، بدچلن اور آوارہ عورت ہوں۔"

تکیئے میں منہ چھپائے یہ سب سُنتا رہا۔ اتنی تکلیف شاید ہی کبھی پائی ہو —— دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ چاہتا تھا کہ پھوٹ پڑوں کہ وہ لاوا باہر آجائے لیکن آنسوؤں نے تو باہر نکلنے کی قسم کھالی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں یہ آدمی دو مہینے کے اندر یہاں سے چل دے گا۔ اور میرے پاس کوڑی بھی نہ چھوڑے گا۔ اُسے معلوم ہے کہ دنیا پیسے کی ہے۔ اس لئے سات سو آٹھ سو جو کچھ بچے گا، وہ اُسی کے آڑے دن کام آئیگا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک آوارہ عورت کسی نہ کسی طرح جی ہی لے گی۔ پھر پیسہ اس کے پاس چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— میں سب جانتی ہوں اور اسی لئے فکر نہیں کرنا چاہتی..... لیکن اس بچے کا کیا ہوگا۔؟"

اُنھوں نے ایک گہری سانس لی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔

"..... کیا ہوگا۔؟ بھگوان ہی جانتا ہے کیا ہوگا۔ میرا اور کوئی آسرا نہیں ہے۔ لیکن بھگوان دلوں کا حال جانتا ہے۔ مجھے کسی اور آسرے کی ضرورت بھی کیوں ۔؟"

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ میں تکیئے میں منہ دیئے پڑا رہا پھر بُوا بولیں، "پرمود، اسی لئے کہتی ہوں، جب تک وہ آدمی یہاں ہے تب تک غیر نہیں۔ میرا سب کچھ اس کا ہے۔ اس کی سیوا میں کمی نہیں کر سکتی۔ ہمارا دھرم یہی تو کہتا ہے۔"

اس کے بعد بہت دیر تک نہ وہ بولیں نہ میں بولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سنّاٹا ہے کہ سائیں سائیں کر رہا ہے، جیسے وقت کے پاؤں جم گئے ہیں۔ اس سنّاٹے میں ہم نے ایک دوسرے کے سانس کی آواز بھی سُنی۔ اس طرح کتنا ہی وقت گذر گیا۔ سنّاٹا کاٹنے لگا۔ تب بُوا نے خاموشی کی بوجھل چٹان کو توڑ کر کہا۔

"تم سوئے تو نہیں ہوگے۔! میں جانے کیا کیا بکتی رہی۔۔۔ کہنی اَن کہنی سب کہہ گئی۔ دُنیا میں ایک تم ہی تو ہو جس سے میں دو رنگی نہیں برت سکتی۔ اچھا، تم آرام کرو، میں ذرا پڑوس میں ایک بچے کو دیکھ آؤں۔"

میں پڑا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ بُوا چلی گئیں۔

۶

میں وہاں سو نہیں سکا۔ دل بہت گھبرانے لگا۔ جو کہانی سُنی تھی اُسے حقیقت سمجھنے کے لئے دل تیار نہ تھا۔ لیکن ایسا ہوا تھا، اُسے جھٹلانا بچکانہ حرکت تھی، بیوقوفی تھی۔ علاج یہی تھا کہ اس سے بچ کر چلا جاؤں۔ اُس دنیا میں چلا جاؤں جہاں ہر چیز اور آدمی کی عزت ہے، (خواہ کیسے بھی سہی) جہاں کوئی جھمیلا نہیں، جہاں راستہ بنا بنایا ہے، ڈھونڈھنے یا بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہر خواہش پر دم نہیں نکلتا۔ بُوا کا کیا کروں۔؟ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنا کیا رنگ کروں؟ یہاں کی ہر چیز تلپٹ ہو چکی ہے۔ شوہر کے گھر کو چھوڑ کر اس ذلیل بستی میں آکر رہنے والی عورت، شوہر پرستی اور دھرم کی باتیں کرتی ہے؟

اور مجھ جیسا پڑھا لکھا جاہل اُنھیں سُن کر اس عورت پر لعن طعن نہیں کرتا بلکہ اُس سے اور ہمدردی کرتا ہے۔ آہ، کتنی بڑی اور ناقابل معافی غلطی ہے۔

ایک دم غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ میں چلا جاؤنگا۔ میں یہاں نہیں رہونگا۔ بُوا گھر جانے پر آمادہ نہیں۔ میں نے اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ میں انھیں نہیں لے جا سکتا۔ میں ایک قدم بھی انکے راستے سے انھیں اِدھر اُدھر نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں معلوم میں شاید کچھ نہ کر سکوں گا۔ وہ مجھے کچھ نہ کرنے دینگی۔ انکی عقل ماری گئی ہے۔ وہ سدھرنا ہی نہیں چاہیں۔ تو میں انھیں کیا سُدھاروں۔ مجھے تو اب یہ بھی شک ہونے لگا ہے کہ سُدھار کی انھیں ضرورت ہے یا مجھے ۔؟ یہ شک جان لیوا ہو رہا ہے۔ میں بی اے کا ایک نوجوان طالب علم اپنے خیالات میں مست تعلیم، بڑائی اور بزرگی کی طرف دیکھتا تھا۔ اپنی اہمیت مجھ پر خوب واضح تھی۔

اس بیت کے دوسرے مصرعے بھائی نے بھی کہہ ڈالا تھا۔ جسے یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے بڑا برا لگا تھا۔

بیٹھے بیٹھے دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ نیچے بچھے بستر پر ایک ایک کر کے اور دیکھ دیا۔ سوچنے لگا کہ اس کوٹھری کی سجاوٹ کے لیے میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا کوئی کام مجھ سے نہ آیا۔ کوٹھری کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ کیوں نہ صاف کر کے لایا۔ ارے جھاڑو دے کر اور ... ہرج ہی کیا ہے۔ جلدی سے جوتا پہن کر کپڑے باندھے اور جھاڑو ہاتھ میں لے کام شروع کر دیا۔ بالکل چپ چاپ وہاں سے بات چلنے کی ہمت نہ تھی۔ احسان کا بوجھ کچھ کم ہو۔ مجھے تو یہ ... چار پانچ جھاڑو دے کر ابھی ... ہی چلایا تھا کہ بوا آ پہنچیں ... سا ہو گیا۔ جلدی سے جھاڑو پھینک ایسا کھڑا ہو گیا جیسے یہ ... ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور غلطی سے مجرم کے کٹہرے میں آ کھڑا ہوا ہوں۔

"پرمود یہ کیا سوجھی تمہیں۔؟ کیا ابھی جا رہے ہو۔؟ نیند نہیں آئی۔؟"

"ہاں اب جانا چاہیے۔"

"جانا تو چاہیے۔ مگر کوٹھری میں ایسا کوڑا نہیں کہ جھاڑو کی ضرورت ہو۔ اور کیوں بھائی یہ اب جانا ہی چاہیے؟"

"ماں نے گھر بلایا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔"

"اسی سلسلے میں جانا ہے۔"

"بیاہ کی بات چیت۔؟"

"میں نے کہا تو تھا۔"

"میں نے سنا نہ ہوگا۔ تو بیاہ کی بات چیت چل رہی ہے۔ تیرے بیاہ میں میں بھی شریک ہونا چاہتی تھی۔"

"چاہتی تھیں کیا مطلب؟ ضرور شریک ہونا پڑے گا۔"

انھوں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں رے۔ ضرور شریک ہوں گی۔ میں نے کام جو ایسے کیے ہیں۔ بات پکی ہو گئی ہے۔؟"

"بغیر میرے کیسی پکی ہوگی۔ بوا، میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔"

انھوں نے بات وہیں تک بڑھنے دی اور بولیں "کب جاؤ گے۔؟ ابھی گاڑی جاتی ہے۔؟"

اس کا جواب دیے بغیر میں نے پوچھا "بوا! آپ نے شادی تک بھی نہ کی۔؟"

"کیسے کرتی۔؟"

"جیسے کیا ہوتا ہے۔ دوسروں کی طرح سے کرتی۔ میں سماج کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔"

"تم پرواہ کرو تو جانو۔ ... لیکن مجھ سے تو نہیں ہو سکتا تھا ... میں سماج کو توڑنا جوڑنا نہیں جانتی۔ سماج ٹوٹ گیا تو ہم کس طرح رہیں گے۔ کوئی چیز نہیں بن سکے گی اور جو بنی ہے اس لیے میں اتنا ہی کر سکتی ہوں سماج کی بھلائی کے لیے ... سوچا تھا کہ تمہارا بیاہ ہوگا اور میں الگ ... جاؤں گی۔ ... جو ہونا ہے سو ہو رہے گا۔"

... کے چہرے کو دیکھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے کہا "تو پھر مجھے تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔" ... بوا نے کسی قدر ... کہا "ہاں یہ بھی سچ ہے۔ کام ایسے ہوتے ہیں کہ غیر ضروری ہوتے بھی ضروری ہو جاتے ہیں ... تمہارا آنا ہی کیا غیر ضروری بات نہیں ہے۔ لیکن کوئی بات بھی ایسے نہ روک سکی ... آ ہی گئے بس ایسے ہی۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا "اب نہ آؤں گا۔"

"آنا بھی نہیں چاہیے۔ میں تم کو خود ہی کہنے والی تھی۔ جو سماج میں ہیں سماج کا بھرم رکھنے کی ذمہ داری بھی انہیں پر ہے۔ ان کا فرض ہے۔ سماج کے کرتا دھرتا ہی زندگی کے نئے نئے تجربے کرتے ہیں ۔۔۔ پرمود، یہ بات تو صحیح ہے کہ سچ کے نئے نئے تجربے ہونے چاہئیں۔ لیکن ان تجربوں میں انھیں کو پڑنا چاہیے جو سماج سے بلند ہو چکے ہیں ۔۔۔"

میں اندر گر ... ان کی کوئی بات نہ سمجھ سکا۔ آج وہ باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ اور سمجھتا ہوں کہ جو شبد ... میں نہیں ملتی وہ روح کی تڑپ اور درد و کرب میں مل جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کی اتنی گمبھیر سچائی کو اتنی آسانی سے بوا کس طرح بس میں لا سکتی تھیں۔

میں نے اس وقت کہا تھا "بوا، اب میں نہیں آؤں گا۔" میں ایک ... مند دل لے کر آیا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ میری ہمدردی کی کسی کو ضرورت نہیں۔

تھے۔ لیکن حالات کے اس بے رحم دھارے میں اپنے آپکو اس طرح بہا دینے پر بھی آمادہ نہ تھا۔

..... وہاں کیا ہوا ہوگا۔۔؟ کیا وہ آدمی اب تک چلا گیا ہوگا۔؟ پھر اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔؟ کچھ بھی ہوا ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کر ہی کیا سکتا ہوں....؟

دل میں ایک گرہ سی پڑ رہی تھی۔۔ نہ کھلتی تھی، نہ کھلنی تھی۔ کچھ چھوڑ چھاڑ دو تو اور اُلجھتی اور کستی جاتی تھی۔۔ کچھ تو ہونا چاہیئے۔ ضرور کہیں گڑبڑ ہے۔ کہیں کیوں، ہر جگہ گڑبڑ ہی ہے۔۔ زندگی میں غلطی ہے، سماج میں غلطی ہے، اس پوری کائنات میں غلطی ہے یہ رات دن کا چکر محض اُوٹ پٹانگ ہے۔ میل جول جھوٹ ہے، ایثار و قربانی بے معنی۔۔ اس بے ہنگم پن کا کچھ نہ ہوگا کچھ تو اس کا کرنا ہوگا۔

لیکن کسی بات کا سرا ہاتھ میں نہ آتا تھا۔ دل گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ اس انتشار میں ساتھیوں سے ملنا جلنا میرا بہت کم ہو گیا وہ چڑنے لگے۔ میں نے پروا نہ کی۔ یہ خیال کہ امتحان دینا ہے ہر وقت ذہن میں چکر کاٹتا رہتا۔۔ امتحان دینا ہے اور امتیازی نمبر لے کر نام پیدا کرنا ہے۔ لیکن سماج سے میری بے تعلقی بڑھتی جا رہی تھی۔ العزلیت کا عفریت دا ہی سوکھ چلا تھا جو سماج کی کھلی فضا میں پھل پھول لاتا ہے۔ کم تعلقی یا بے تعلقی سے کھیلنے کودنے سے جو کمی محسوس ہوتی ہے، وہ مجھے نہ ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کرنے یا نہ کرنے قابل کام میں کر رہا ہوں۔۔ ایک دن ایسی ہی حالت میں میرے پاؤں کالج سے اس شہر کے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے

لیکن وہ کیلے کی دکان کہاں تھی۔۔؟ اس کوٹھری میں کچھ اور لوگ آ گئے تھے۔ نکوان سے بات چیت کی کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ اس آدمی کے متعلق معلوم ہوا کہ بہت دن ہوئے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ اور اپنی عورت کو مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔ لیکن پھر اس عورت کا کیا ہوا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اتنا اور معلوم ہوا کہ مرد کے جانے کے بعد بھی وہ عورت ڈیڑھ مہینے تک وہاں رہی۔ کپڑے سی کر پیٹ بھرتی تھی۔ بڑی بھلی عورت تھی۔ سُکھ دکھ میں دوسروں کے کام آتی بچوں کو گھر بٹھا کر پڑھاتی۔ اور سب کے چھوٹے موٹے کام کو تیار رہتی۔۔ لیکن کہاں گئی، یہ کسی کو نہیں معلوم۔

جب اور کھود کھود کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ پیٹ سے تھی اور اکثر اسی فکر میں مبتلا رہتی۔ اور کبھی کبھی اسپتال جانے کی بات بھی کرتی تھی۔

میں نے اسپتال میں جا کر چھان بین کی۔۔ شہر کے اسپتال میں پانچ مہینے ہوئے کہ مرنال نام کی ایک عورت آئی تھی اس کے وہاں ایک لڑکی ہوئی تھی۔ چار دن کے بعد اُس لڑکی کے جھٹکے نکلی۔ وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ نرسوں کو کچھ زیادہ یاد نہیں۔ پندرہ روز بعد لڑکی اچھی ہو گئی۔ اُسی روز سے ماں بیٹی کا نام رجسٹر میں نہیں ہے۔۔؟

کہاں گئی۔۔؟

میرے سوال پر اسپتال کی بڑی لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھتی رہ گئی، بولی "کیا آپ سچ مچ سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب ہم دے سکتے ہیں۔؟"

میں نے کہا "ہاں! ہو بھی سکتا ہے کہ آپ جواب دے سکیں" "مجھے آپ پر تعجب ہوتا ہے"

میں نے کہا "میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اپنی بچی کو مشن میں تو نہیں دینا چاہا؟"

بولیں "ہاں۔۔ یاد آیا۔۔ مہینہ کونسا تھا۔۔؟ ہاں ستمبر۔۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔۔ وہی کیس ہوگا۔ عمر کیا تھی۔؟"

"کوئی چوبیس پچیس!"

"ٹھیک۔۔ صاف رنگ۔۔؟"

"ہاں اچھا کھلا ہوا رنگ تھا۔"

"ٹھیک۔۔ پھر تو وہی کیس ہے۔۔ ہم سے وہ کچھ کام بھی مانگتی تھیں۔۔ نرس بننے کو تیار تھیں۔۔ انگریزی بھی جانتی تھیں نا؟ اچھی لڑکی تھی۔ مجھے یاد ہے۔۔ ہم نے کہا بچہ مشن کو دیدو اور تم عیسیٰ مسیح کو پہچان لو تو یہاں رہ سکتی ہو۔ اور کام بھی سیکھ سکتی ہو۔۔ وہ نہیں مانی۔ ہندوؤں میں یہی تو برائی ہے۔۔ وہ تمہاری کون تھی۔۔؟ لے تو سمجھا نا کہ مسیح خدا کا برگزیدہ نبی ہے۔ دنیا کو راہ بتانے والا۔۔ اس پر ایمان لانا چاہیئے۔

سمجھے نا۔۔!

میں نے دریافت کیا، پھر کیا۔۔ وہ نہیں رہی؟ چلی گئی؟"

"اب بھی نہیں آؤ گا۔"

...سمجھتا ہوں کہ تمہارا بھی دار ہوتے ہوئے بھی ایسی بے وقوفی کی بات میں نے کیسے کبھی ... اس کے جواب میں تم نے جو کہا تھا۔ مجھے آج بھی خوب یاد ہے۔

انھوں نے کہا تھا۔

"پرمود! مرد کی میں بھول کی نہیں ہو سکیا۔؟ تجھ سے ہی مجھے مدد نہ ملی تو پھر اس سے ملے گی۔؟ لیکن تو وعدہ کر کہ مجھے ... ... بھائی! مجھے معاف کر دے۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ مگر مجھے ... اور اس لئے چاہئے کہ کوئی مجھے کچلے تو کچل نہ جاؤں۔ اور ... ہو کر اس کے گناہ کے بوجھ کو بھی سہار لوں۔ اور سب کے لئے اچھوں کی دعا کروں۔ بڑائی مجھے کیوں چاہیئے۔؟ بس یہ چاہیئے کہ جیسی بھی گذرتی ہے صبر شکر سے گذر جائے۔"

ان کے یہ الفاظ بھی اس وقت میری سمجھ سے اونچے تھے۔ میں نے جواب میں کہا تھا "میں جاؤں۔؟"

انھوں نے کہا تھا "ہاں! جاتا ہے تو جاؤ — خوش رہو"

جاتے جاتے میں نے دل کو سخت کر کے کہا تھا "کچھ ضرورت ہو تو لکھنا۔"

بوا نے ہنس کر جواب دیا تھا "ہاں لکھوں گی۔"

میں کھڑا ہو گیا تھا، کوٹ بانہوں پر ڈال لیا تھا، ہیٹ ہاتھ میں تھا۔

اس نوبت میں ان کے سامنے چلنے کو تیار کھڑا اپنے آپ کو عجیب و غریب سمجھ رہا تھا۔ جھک کر ان کے پیر چھو لوں۔؟ ضرور چھونے چاہئیں — لیکن مجھ سے کچھ نہ بن پڑا۔ اس وقت میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو اس طرح دیکھا جیسے دیر ہو رہی ہے۔ پھر ذرا سر جھکا کر کہا "اچھا بوا، پرنام!"

اور کہتے ہی مڑ کر چل دیا۔

بوا نے کہا "سکھی رہو بھیا۔" اس دعا اور شفقت نے جسم میں پارہ بھر دیا۔ قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں یوں چلنے لگا گویا پھر کر دیکھا اور کسی نے پکڑا۔ جیسے ڈگ بھرتا باہر آیا اور سیدھی اسٹیشن کی راہ لی۔ باہر کوئلے کی دکان پر بھی نظر پڑی، جہاں وہ شخص ترازو کی ڈنڈی تھامے گاہک کو کوئلہ تول رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ میں نے ہیٹ نیچا کر لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

۷

گھر پر ماں نے پوچھا۔ "کہاں رہ گئے تھے۔؟ اسٹیشن کہتا تھا کہ کالج سے تو اس سے ایک روز پہلے تم نکل گئے تھے۔"

میں نے کہا "بوا کے ڈھونڈنے میں لگ گیا تھا۔ وہ اس شہر میں رہتی ہیں۔"

میری بات کے ختم ہونے تک ماں ... انہوں نے پوچھا "کون؟"

"بوا — میں ان سے مل کر آ رہا ہوں۔"

"کیا ...... میں۔"

"ہاں وہ یہاں نہیں آ سکتیں۔؟"

ماں نے زور سے کہا "اس کلمول کرشن پرمود — تیری بوا اب کوئی نہیں۔ میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔"

لیکن سنتی ہو ماں۔ میں نے کہا "میں انھیں نہیں بھول سکتا۔"

ماں نے کہا "تو جو چاہے کر — لیکن تیوہار جو کچھ سے اس کی کوئی بات کہی — کلنکن کہیں کی۔!"

بوا کے نام سے ماں کو جو نفرت تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے انھیں اس نام سے تکلیف ہو رہی تھی، اور اس تکلیف کا اظہار ان کے الفاظ میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں یہ نہ سمجھ سکا تھا۔ لیکن ان کا یہ رویہ مجھے اچھا معلوم نہ ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں اپنے کو ماں سے دور سمجھ سا تھا۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ شادی کی جو قرار داد اٹھائی گئی میں نے اسے منظور نہیں کیا۔ ماں ناراض ہو گئیں — میں نے دیکھ لیا کہ دنیا میں تنہا اکیلا ہوں۔ کوئی کسی کا نہیں — ناتے رشتے محض نام ہیں۔

زندگی وقت کے بہاؤ میں بہتی رہی۔ بی۔ اے کا امتحان نزدیک تھا۔ میں اس میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کہ بوا کی یاد مجھے بار بار پریشان نہ کرے۔ لیکن بے سود — ان کی یاد تو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ ان کی وجہ سے اس دنیا کا بہت کچھ بے رنگ، بے کیف اور فضول معلوم ہوتا تھا — جیسے ہر چیز لٹی لٹی، اجڑی اجڑی۔ خواہشات دم توڑ چکی تھیں۔ باہمی تعلقات جن سے زندگی کو رس ملتا ہے، وہم معلوم ہوتے

"ہاں یہاں سے چلی گئی — اس سے آگے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

امتحانات نزدیک آ گئے تھے۔ میں وہاں اور زیادہ دن نہیں رہ سکتا تھا۔ چلا آیا — اب میں نے مطالعہ شروع کر دیا تھا یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ بچپن تک جن لوگوں کے پاس رہا، اب انھیں تلاش بھی نہیں کر سکتا۔ وہی جو میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں، اب شاید مجھے بھول چکی ہیں۔ میں سوچتا — یہ دنیا میں ہم نے کیا کیا کھڑاگ کر لیا ہے جو دلوں کی محبت کو اس طرح کاٹ کر رکھتا ہے محبت کی اپنی جگہ کوئی نہیں۔ ؟ دل اس طرح ٹکڑے ہونے کے لئے ہے؟

دو دل جڑ کر ایک نہیں ہو سکتے۔؟

شادی کا مسئلہ پھر چھڑ گیا تھا اس بار رشتہ ماں کو بہت ہی پسند آیا خاندان، شرافت اور نجابت میں بہت اعلیٰ تھا لڑکی خوبصورت خوش مزاج اور پڑھی لکھی تھی — دیر بس یہ تھی کہ ایک بار اس کے یہاں پہنچ کر میں اُسے دیکھ لوں اور وہ مجھے دیکھ لے — میں اسے بہت دنوں سے ٹال رہا تھا۔ اپنے میں کوئی بڑی بات نظر ہی نہ آتی تھی یوں تعریف کرنے والے میرے بھی کم نہ تھے۔ لیکن خود مجھے قابل تعریف کوئی بات نظر نہ آتی تھی سوائے اس کے علاوہ جو کچھ میں دیکھ سکتا، اُسے دیکھ کر مایوس ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار وہاں جانا ہی پڑا — یہ اتفاق ہی تو تھا کہ اُسی دن اُس ڈاکٹر کے یہاں بُوا سے مڈبھیڑ ہو گئی — میں نے غور سے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چھوٹے بڑے بچوں کو جو عورت پڑھا رہی ہے وہ بُوا کے علاوہ اور کوئی نہیں — اس وقت میں کچھ نہیں بولا۔ اور انھوں نے بھی مجھے دیکھ کر ظاہر کیا کہ نہیں دیکھا۔ کچھ دیر تک میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ تھا۔

لڑکی نے مجھے ناپسند نہیں کیا (جہاں تک میں سمجھتا ہوں) مجھے ناپسند کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اُس کے حسن کی خامیوں یا خوبیوں پر سوچنے کا موقع ہی نہ تھا یہ شدھ بدھ بھی نہ رہی کہ وہ انسان کی نوع سے تعلق رکھتی ہے، حوا کی بیٹی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پرستان کی پری کیا ہوتی ہے۔؟ اس راج نندنی (کیا کروں، نام ہی یہ تھا) کے لئے تو دل ہی میں فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میری قوت گفتار میرا ساتھ نہ دے سکی — میں جھینپ کر رہ گیا — ایک لفظ زبان سے نہ نکلا — اس حرکت پر مجھے اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غصہ دوسروں پر ظاہر بھی ہو گیا تھا کیونکہ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ لڑکی مجھے پوری طرح پسند نہیں ہے۔ لیکن یقین ہے کہ دوسرے ہی لمحے میں نے لوگوں کی اس بدگمانی کو دُور بھی کر دیا —

اس پر اُس ہر گھر میں میرا وقار اور بڑھ گیا۔ سب کو میری خاطر منظور تھی۔ لیکن اب بات کچھ اور تھی — میری ہونے والی ساس کی بات تو بس کچھ پوچھئے مت۔ وہ مجھے ہر وقت گھیرے رہتی تھیں — باتوں باتوں میں ایک دن ان سے پوچھا، "بچے اسکول میں تو پڑھنے جاتے ہیں نا، یا گھر پر ہی پڑھتے ہیں —"

انھوں نے کہا، "اسکول میں تو جاتے ہی ہیں — لیکن کچھ پڑھائی یہاں بھی ہوتی ہے۔ اور یہاں اتنا شور مچاتے ہیں کہ بس کچھ مت پوچھو — اس سے ایک، تو ماسٹرنی لگا رکھی ہے اور ایک ماسٹر تیس روپے ماہوار علاوہ پڑھائی پر خرچ کرتی ہوں۔ تب تو . . . . ."

"ماسٹرنی اچھا پڑھاتی ہے۔؟"

"ہاں! بھلی عورت ہے — بیچاری غریب ہے۔ اچھی طرح سمجھا دیتی ہے — بڑی صبر والی ہے —"

"بچے اُن سے خوش ہیں۔؟"

"ہاں! بچے تو بہت ہی خوش ہیں — دو مہینے سے لگی ہے۔ لیکن ہمیں تو اس کا بہت سہارا ہو گیا ہے —"

"یہاں کہیں اسکول میں پڑھاتی ہوں گی؟"

"ہاں! پڑھاتی ہیں — ہم کیا دیتے ہیں، یہی آٹھ دس روپے کچھ ابھی طے بھی نہیں ہوا ہے۔ آٹھ دس میں بھلا کیا ہوتا ہے۔ لیکن غریب ہے۔ ایک سہارا ہی سہی۔ اُسے بلواؤں۔؟"

میں نے کہا، "نہیں، نہیں — کیوں بلوائیے۔"

انھوں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کام ہوتا ہے، میں بلوا لیتی ہوں — اور وہ آ جاتی ہے۔ اکیلی ہے۔ ہمارا کام بنا دیتی ہے۔ تو اس کا دل بہل جاتا ہے اور ہمیں سہارا بھی ہوتا ہے اچھی لڑکی ہے۔ بات کا بُرا نہیں مانتی۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے گھر سے بہت مانوس ہو گئی ہے۔؟"

"ہاں، آ جاتی ہے۔ اس شادی کا ایسے بڑا اچھا ہے مگر نے بچپنے کا شگوفہ تو ہماری کے مقدر میں ہی نہ تھا۔ تمہیں دیکھنے کو بڑی بے قرار تھی۔ جانے آج چلی کیوں گئی، ٹھہری کیوں نہیں۔ ہم سمجھا ورنہ تمہیں دیکھنے کی تو بڑی خواہش مند تھی۔"

"بجھ کر ۔۔۔؟"

"ہاں بڑی دراز تعلق اسے اس کی بڑی بڑی مٹی کی تازہ ہی تھی ہے ہم سب ہی اُسے جانتے ہیں۔ وہ اُسے مکھنی ہوں۔ ملنا جلنا۔"

میں نے جلدی سے کہا "نہیں، ٹھہر! کیا ضرور رستہ ہے۔۔؟"

میں کچھ ان ہونے والی ساس سے باتیں نہ بڑھانا چاہتا تھا لیکن وہ تو ایک بار بات شروع کرکے ختم کرنا بھول جاتی تھیں۔ پھر بولیں میں ابھی اُسے چمن کے ہاتھ بلوائی ہوں۔"

میں نے ذرا زور سے کہا، "ناحق کسی کو تکلیف ہو گی۔ رہنے بھی دیجئے۔"

بولیں "تکلیف ۔ ! اُسے کب کوئی بار بار بلاتا ہے۔؟"

میں نے کہا "کیوں۔ ؟"

بولیں "اکیلی بیوہ ہے۔ کہیں دور کی بتلاتی ہے۔ اس کا خاندان، عزیز رشتے دار یہاں تھوڑی ہیں۔"

میں نے پوچھا "نہیں کہیں پاس ہی رہتی ہوگی۔ ؟"

"یہی کوئی تین منٹ کا راستہ ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا "خیر کوئی بلانے کی ضرورت نہیں۔"

"تو جانے دو پھر ۔۔۔ ٹھیک ہے پریشان ہوگی بیچاری اب تم آرام کرو۔"

میں آرام تو کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت ان کا چلا جانا ہی میں نے غنیمت سمجھا۔

اُسی دن شام کو میں بوا کے یہاں گیا۔ اسکول کے پاس ہی وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی تھیں۔ پہنچا تو فریم پر رومال کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہا ۔۔۔ آؤ! اور ایک پیڑھی بیٹھنے کے لئے سرکا دی۔

بیٹھکر تھوڑی دیر انھیں دیکھتا رہا ۔ کوئی کچھ نہ بولا بغیر کناری کی سفید دھوتی تھی۔ بال جوڑے میں تو بندھے ہوئے تھے لیکن جوڑا کافی ڈھیلا تھا۔ آنکھوں سے بشاشت ٹپکتی تھی جسم اکہرا ۔ پورا سراپا بتا رہا تھا کہ انھیں اپنی قسمت سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ناموافق حالات سے انھوں نے ایک خوشگوار سمجھوتا کر لیا ہے۔ وقت کی تلخی جسم میں نفوذ کرکے رس بن گئی ہے۔

بالآخر میں نے سکوت توڑا۔ "میں وہاں گیا تھا۔"

آہستہ سے آواز ابھری "میں جانتی تھی۔"

"اسپتال میں بھی گیا تھا ۔۔۔ تم نے مجھے نہیں لکھا۔۔؟"

"کیا لکھتی ۔۔؟"

"اچھا، منی کہاں ہے۔"

"مر گئی ۔"

"کب مر گئی ۔ ؟ کیسے مر گئی ۔ ؟"

"دس مہینے کی ہو کر مری ۔۔۔ کچھ بیماری سے کچھ بھوک سے۔"

میں چپ رہ گیا ۔۔۔ پھر تھوڑی دیر میں بولا "جن والے ۔۔۔ سے مانگے تھے تم نے وے کیوں نہیں دیا ۔۔؟"

وہ خاموش رہیں۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر بولیں "ہاں غلطی ہوئی۔ ہاں جان کر غلطی کی۔"

میں نے پوچھا "یہاں کیسے آ گئیں ۔ ؟"

"بھٹکتی بھٹکتی ۔ !"

میں آگے اور کچھ نہ پوچھ سکا۔ خود ہی سوچنے لگا بھٹکتی بھٹکتی یہاں آئی ہیں، لیکن بھٹکنا ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔؟ ایسا لگتا ہے کہ بھٹکنا انکی قسمت بن چکا ہے، انھیں تو بھی اس کا احساس ہے کہ کیا ہونا ہے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی اور دھوپ چھاؤں سے اب انھیں کوئی شکایت باقی نہیں رہی۔ جیسے ایک ہی راستہ باقی بچا ہے ۔ دوسری طرف وہ نگاہ اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتیں۔

میں نے کہا "بوا! آئندہ کے لئے ...."

بولیں "آئندہ؟ آئندہ تیری شادی ہوگی نا ۔؟"

"ہوگی ۔۔۔! لیکن کیا تم جانتی تھیں ۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔! یہ جانتی تھی کہ راج نندنی کی شادی ہونے والی ہے یہ پتہ نہ تھا کہ وہیں تمہاری شادی بھی ہوگی ۔ اگر معلوم ہوتا تو میں یہاں ٹھہرتی ۔؟"

"کیوں ٹھہرتی کیوں نہیں ۔؟"

"میں بدچلن ۔۔۔ جو ہوں، آوارہ جو ہوں ۔۔۔ اور پھر منحوس بھی ۔

نحوست تو بنا کام بگاڑ دیتی ہے بھیا۔ سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ چلی جاؤں۔؟

لیکن سن پرمود! میں کہتی ہوں اب کوئی بیوقوفی مت کرنا۔ اس بار آ گیا تو آ گیا، آئندہ کبھی مت آنا بھیا۔ میرے حسب نسب کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔۔۔ اور سن، شادی کی بات چھڑی ہے تو کرنی ہی ہوگی۔۔۔ لڑکی میری دیکھی بھالی ہے۔ خوبصورت ہے، خوش مزاج ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "تو تمہاری رائے ہے کہ یہ رشتہ قبول کر لیا جائے۔۔؟"

"ضرور۔۔!"

"اچھی بات ہے، کرونگا۔۔ اب تک تو کچھ اور سوچتا تھا لیکن اب مجھے سب سے کھل کر کہدینا ہوگا کہ تم میری بُوا ہو۔"

انھوں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور بولیں، "نا، نا۔۔ نہیں بھیا، نہیں۔۔!"

"میں دھوکا نہیں دے سکتا۔ شادی کے معاملے میں تو دھوکا دے ہی نہیں سکتا۔ شادی جیسا اہم مسئلہ، جو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے، دھوکے کی چٹان پر کھڑا کیا جائے۔۔؟"

بُوا نے کہا، دھوکا تو آج یہ ہے کہ میں تیری کوئی بھی ہوں۔ بتا کیا اب بھی میں تیری بُوا ہوں۔۔؟ بتا میں تیری کون ہوں اب۔؟ کبھی میں تیری کچھ تھی۔۔ اس وقت یہ سچ تھا کہ میں تیری پھوپی تھی لیکن اس رشتے کے ان مول موتی کو میں نے گمراہی کے ایسے اتھاہ سمندر میں پھینک دیا، جہاں سے اُسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ تو چاہتا ہے کہ جھوٹی مٹی لا کر اُسے سچا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ دھوکا ہے۔ پرمود، مجھے میرے حال پر چھوڑ، یہاں سے چلا جا۔ تیرا یہاں زیادہ رُکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے۔"

انکی آخری بات نے مجھ پر زیادہ اثر کیا۔۔ میں سچ مچ ڈرنے لگا کہ میرا وہاں رُکنا خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔؟ میں آج اس پر تعجب کرتا ہوں کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔؟ "لوگ" اپنے اوپر لے کر ہم اپنی روش کو ٹھیک کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں کے اپنے منہ ہیں، اپنی زبانیں۔۔۔ وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نہ کہیں گے تو اور کیا کریں۔؟ پھر اُن پر کس کا زور ہو سکتا ہے؟ انسان کیوں یہ بوجھ خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کرتا۔ وہ کیوں اپنے ضمیر کی آواز نہیں سُنتا، کیوں اپنے اندر کے سچ کا خیر مقدم نہیں کرتا۔؟

میں وہاں دو روز رُکا۔ وہاں سب نے دیکھا کہ میری ماسٹرنی سے جان پہچان ہے۔۔ اور اب بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن کسی نے اس طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی، کیونکہ ماسٹرنی جی اپنے حلقے میں اتنی بھلی اور سادی تھیں کہ میرا ان کی طرف میلان کسی کو بُرا نہیں لگا۔۔ دن ہنسی خوشی گزر گئے۔ اور دوسرے بُوا کی طرف سے میری فکر بھی کم ہو گئی۔۔ دو چار آدمی ہیں ہی کہ ان کا حال پوچھ لیتے ہیں، روٹی آسانی سے مل جاتی ہے۔ سب مجھ سے خوش تھے۔ بچے ہر وقت مجھے گھیرے رہتے۔۔ سالے سالیاں اب مجھے نئے رشتے کے مطابق پکارنے لگی تھیں۔ اس درمیان میں راج نندنی بھی صرف ایک بار نظر پڑی۔۔ بڑی بھولی بھالی اور دل آویز معلوم ہوتی تھی۔۔ شرمیلی اتنی تھی کہ بمشکل ایک پل رُکی اور بھاگ گئی۔ تلک کی رسم بھی ادا کر ہی دی گئی۔ مجھے بہت سے روپئے اور ناریل بھینٹ چڑھائے۔ اُس وقت میرے دل میں بہت سے سوالوں نے سر اٹھایا۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ دل کا بھید چہرے سے ظاہر نہ ہو۔ پتہ نہیں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا۔ لیکن باوجود کوشش کے طبیعت تھی کہ بندھی جاتی تھی، میرے بار بار کانٹا سا چبھتا تھا کہ میں کیوں سچائی کو چھپا رہا ہوں۔ یہ چبھن آخر میں اتنی تیز ہو گئی کہ چلتے وقت میں نے جرأت کر کے ڈاکٹر سے کہدیا کہ ماسٹرنی میری بُوا ہے۔

توقع کے خلاف ڈاکٹر نے میری بات سُن کر تعجب یا پریشانی کا بھی اظہار نہیں کیا۔ میری ہمت بڑھ گئی، اب میں نے بات کی اور وضاحت کر دی کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں، سمجھ لیں، "ماسٹرنی میری بُوا ہے اور بُوا میں اُسے ہمیشہ مانونگا۔"

پھر ڈاکٹر کے چہرے پر رنگ بدلنا شروع ہوا، لیکن صرف یہی "آئی سی یو۔۔ وہاٹ مور ڈو آئی وانٹ۔؟"

ڈاکٹر کی اس روشن خیالی نے میرے شبہات دور کر دیئے بلکہ میں دل میں شرمندہ بھی ہوا کہ میں خواہ مخواہ ان لوگوں کے متعلق کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ راج نندنی نے مجھے مسکراہٹوں کے ساتھ الوداع کہا۔

لیکن تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ حالات میں ایک تیز تبدیلی ہوئی اور وہ سنبھالے نہ سنبھل سکی۔ رشتہ ٹوٹ گیا میری ساس اور خسر دیکھتے ہی دیکھتے رخصت ہو گئیں اور ان کی نئی نسل کی ساری حسرتیں ناآسودہ رہ گئیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ پوری برادری نے بھی ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب البتہ حالات کی اس تبدیلی پر بڑے مغموم تھے۔ آخر تک ان سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار رہے۔ وہ خطوں میں ہمیشہ وہی لب و لہجہ اختیار کرتے جو ایک بیٹے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نسرین نے دوسرے رشتے پر بھی انہوں نے اپنی آمادگی ظاہر نہیں کی اور یاد دلاتے رہے کہ بعد میں اس شادی کا نتیجہ بھی کچھ خوشگوار نہ ہوا تھا۔ بہرحال، جو کچھ اور جیسا کچھ بھی رہا ہو۔ ڈاکٹر کی ساری خاندان کی عزت اور شرافت اور برادری کی مرضی کے آگے نہ چلی۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن نہ جانے کیوں وہ ملازمت بہت جلد ختم کر دی گئی۔ نیوشن پہلے ہی چھوٹ گئی تھی۔

اس خبر کو سن کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ فوراً ایک خط لکھا، پھر ایک تار دیا۔ خود اس بار جانے کا موقع نہ مل سکا۔ نہ خط کا جواب آیا اور نہ تار کا ہی۔ یہ ضرور معلوم ہوا کہ انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ چھوڑ کر کہاں گئیں، کون جانے۔ اس دنیا میں کس گھر کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ کہ وہ سر چھپا سکیں۔ لیکن دنیا صرف گھروں اور دیواروں میں ہی تو بند نہیں ہے۔ وہ ابھی کہیں چلی ہی گئی ہوں گی، پوری دنیا ان کی ہے۔

۸

کہانی طویل ہوتی جاتی ہے۔ ختم کر دینی چاہیئے۔ اب زندگی بھی تو ایک کہانی سے زیادہ اور کیا ہے۔ پرانی کہانی میں اب وہ دلچسپی بھی کہاں رہ گئی ہے۔

واقعات اور سانحات ہوتے ہیں، گزر جاتے ہیں۔ ہم زندگی گزارتے ہیں اور مر جاتے ہیں، زندگی کا آغاز کس حوصلے اور کس ارمان سے کرتے ہیں، لیکن ابھی دوسرے کنارے پر نہیں پہنچے کہ طبیعت آجاتی ہے، دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ میں اس بیوقوفی یا دانشمندی پر سوچتا ہوں، بہت سوچتا ہوں۔ کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بجز حیرت کے۔

بحرِ ذخار ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ہم اپنی کاغذ کی چھوٹی سی، ناؤ کی سی ناؤ اس میں کھینے کے لئے اترتے ہیں۔ لیکن خیریت ساحل ہی پہ ہے۔ آگے تو اماں نہیں ہے۔ ہمت والے آگے بھی بڑھتے ہیں۔ کچھ موجوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ ہاتھ پیر مارتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ساحل پہ سفینوں کا ایک اژدھام ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہے۔ ہاتھ پیر بندھے ہیں اور کنارے کی باتیں ہیں، چھینا جھپٹی کر رہے ہیں۔ کرے بھی کیا۔ ؟ یہ تم فیصلہ آپس میں کر ڈالتے۔ ایک محدود دائرے میں چکر ہی کاٹ لیتا ہے، جی لیتا ہے۔ تینوں طرف سمندر کس جوش میں ہے۔ رہے ہمیں کہاں اتنی فرصت ہے کہ اس کے جوش اور بے کرانی کو دیکھیں۔ ہمیں اور کام بہت ہیں۔

اس طرف توجہ بھی کریں تو نتیجہ معلوم ہے! اس سمندر کا کہیں اور چھور بھی ہے۔ ؟ دوسرا کنارہ ہے کہیں۔ ؟ کوئی دوسرا سہارا بھی نہیں کہ ہماری تھکی آنکھیں کچھ دیر اسی سے تازگی اور روشنی حاصل کر لیں۔ ایک لق و دق میدان ہے جس کا کنارہ افق سے جا ملتا ہے۔ ہاں دھندلکوں میں پیلی نیلاہٹ ضرور ہے لیکن چھور اس کا بھی نہیں۔ چھور اگر ہے تو ہماری نظر کا۔ عقل مایوس و ناکام واپس آجاتی ہے۔

ہاں کھلا ہوا مست فریب ہستی۔ اس سمندر کی تلی نہیں ہے یہاں آواز، فریاد، نالہ پانی کی سطح پر تیرتا ہے۔ ایک سناٹا ہے جو دور دور تک مسلط ہے۔ آوازیں، فریادیں اور نالے سب اس اژدہے کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

سبکسارانِ ساحل ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔ یہاں ہمارے پیر زمین کو تو چھو لیتے ہیں، یہاں ہمارا لنگر دھرتی کا سہارا تو اور لے لیتا ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے ہم اس بحر ناپیدا کنار کی بے کناری پر ایک نظر بھی ڈالیں تو کیا کم ہے۔ ؟ اتنا ہی بہت ہے ہمارا دل تو اسی سے سہم جاتا ہے۔ ہماری نظریں تو اسی سے تھک جاتی ہے، ہمارا سر تو اسی سے سہم جاتا ہے۔ قوتِ برداشت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ پھر بھی برداشت کرتے ہیں، چھینتے رہیں کنارے کنارے بڑھتے رہیں، موجوں سے بچتے بچاتے، سلجھتے سلجھاتے ۔۔۔ بس یہی انسان کی زندگی ہے۔

تو اس سمندر کی طغیانی میں کیوں آنکلیں۔ انہیں پتہ تھا

یا نہیں کہ یہاں پاؤں ٹکانے کے لئے دھرتی نہیں ہے — پانی ہی پانی ہے — میں نے ساحل پر کھڑے کھڑے پکار کر کہا۔

"یہاں آجاؤ بُوا — یہاں آجاؤ — میں پرمود ہوں — تمہارا بھتیجا — جسے تم نے پیار کیا ہے، جسے تم نے لوریاں سنائی ہیں — بُوا یہاں آجاؤ — یہاں ہم سب ہی ہیں — یہاں دھرتی ہے اور مضبوط بھی ہے — یہاں کسی بات کا خوف نہیں۔ آرام ہی آرام ہے — اطمینان ہے، آسودگی ہے — سرزمین خشک ہے۔"

میری پکار بہت دیر میں پہنچی، بُوا کے گلے گلے پانی آچکا تھا — وہ ہاتھ پیر مار رہی تھیں — اسے تیرنا کیسے کہا جائے —؟ تیرنے کی تو انھوں نے کبھی مشق بھی نہیں کی — موجوں کے دوش پر لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"نہیں، پرمود نہیں — تم میرے وہی پرمود ہو۔ لیکن کنارہ ایک دفعہ چھوٹا تو چھوٹا — پرمود، میرا سانس پھول رہا ہے۔ بہت تھک چکی ہوں — اگر تھک کر اس سمندر کی گود میں سو بھی جاؤں تو کیا حرج ہے۔ میرا پریم لو پرمود — تم نہیں جانتے کہ جہاں پیر نہیں ٹکتا وہیں تیرا جاتا ہے — میں بھی تیر رہی ہوں — انجام سے بے خبر، اس منجدھار سے واپس کنارے پر آجاؤں —؟ نہیں نہیں، میں اتنی کم بخت اور کم ظرف نہیں ہو سکتی۔"

میں نے رسی پھینکی، انہوں نے نہیں پکڑی، مسکرا دیں اور کہا "تمہاری بڑی احسان مند ہوں پرمود —!"

میں پوری طاقت سے چلایا، "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔ اگر کرتی ہو تو آجاؤ۔"

وہ ڈبکیاں کھانے لگیں۔ انکی ڈبکیاں لگاتی آواز آئی، "تم سے پریم کرتی ہوں، بہت پریم کرتی ہوں، اسی لئے تمہیں نہیں پا سکتی۔ اور تمہارے پاس تو آ ہی نہیں سکتی — پانی کی چادر پھیلتی ہی جاتی ہے۔ مجھے اُس پار جانا ہے۔"

میں نے خفا ہو کر کہا، "جاؤ۔ میں اب تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

انھوں نے کہا، "دیکھنا بھی نہیں چاہئے — برابر دیکھتے رہنے سے کنارے سے پیر اکھڑ جائیں گے۔"

میں غضبناک ہو کر چیخا، "جاؤ، ڈوبو — مرو —!"

میری غضبناکی نے انکی ہنسی کو اور تیز کر دیا۔ بولیں، میرا ڈوب مرنا اتنا آسان ہوتا تو اچھا ہی نہ ہوتا — نہ جانے ابھی کتنے تھپیڑے کھانے ہیں۔ لیکن تم ان تھپیڑوں سے دور ہو — میں تم سے محبت کرتی ہوں، اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔

..... آخری بار جب اُن سے ملا تو وکیل تھا، اُن کی صحت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا — کوئی خطرناک مرض انکے پیچھے پڑ گیا تھا — وہ ایک اندھیری کوٹھری میں پڑی تھیں — دوا دارو کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کچھ پڑوسیوں کی ہمدردی انھیں ضرور حاصل تھی۔ لیکن ان کی یہ ہمدردی اس دور کی تھی جہاں پیسے کا سوال آتے ہی ہر اچھی چیز ایک بڑا صفر بن کر رہ جاتی ہے۔ بڑا تعجب یہ تھا کہ اس بار انھوں نے تعمداً مجھے خط لکھا تھا۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی خبر انھیں بہت دنوں میں ملی تھی، لیکن ملتے ہی انھوں نے فوراً خط لکھا تھا — اس خط کو کتنی بار پڑھ چکا ہوں، میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔ پڑھتا ہوں لیکن اس سوچ کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھوں — خط میں لکھا تھا۔

"پرمود! ماں نعمت ہوتی ہے — میں تو پیدائش سے ہی اس نعمت سے محروم ہوں۔ مجھے بڑا رنج ہے کہ میں سُورگباشی کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ چاہتی تھی کہ جیتے جیتے ایک بار اُن کے قدموں پر گر کے معافی مانگ لوں لیکن واہ ری بدقسمتی۔ میرا یہ چاہا بھی پورا نہ ہو سکا۔ میں اپنی بدقسمتی کو گلے لگاتی ہوں۔

"پرمود، کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ اس لئے میں نے اوپر اپنا پتہ بھی لکھ دیا ہے میں جانتی ہوں تم آؤ گے — میرے پہلے پتہ پر بھی تم نے ضرور چھان بین کی ہوگی — اور وہ خط اور تار تم نے کیوں بھیجے تھے، ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ان باتوں سے فائدہ —؟ میری بات بھی چھوڑو، یہ بھی اب بیکار ہو چکی ہے زندگی ایک آزمائش ہے — میں نے تو کم از کم بنا ہی لی ہے۔ آتے ہو تو آجاؤ — لیکن مجھ سے کوئی امید نہ لے کر آنا۔ اس بار جن لوگوں کے بیچ بسیرا ہے، وہ سماج کا بچا کھچا جھوٹا کھاتا ہیں اور کون جانتا ہے وہ جھوٹن بھی ہیں یا نہیں — بہرحال! انسان ہیں۔ یہ بات میں جو انکے درمیان رہ رہی ہوں، بڑے صاف طریقے سے دیکھ رہی ہوں۔ میں کسی اور سہارے پر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اب تو انکی انسان سوز انسانیت ہی کے سہارے جینا ہے۔ در در بھٹکنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ بُرے لوگوں کے نیک جذبات ہی پر جی

دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہوں ۔۔۔ اس کے علاوہ میری اور کوئی پونجی نہیں ہو سکتی ۔۔۔ اس کے علاوہ اور کسی سہارے پر جینے کی ہمت بھی نہیں رہی ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بے سہارا اور رنگین لوگوں کے دلوں میں برائی، بدمعاشی اور کینہ پن کی شدت کے باعث ایک تہہ داری سی ہوتی ہے ۔ اس تہہ کو دیکھ کر بھی پیار اور خلوص کی دودھ سی سفید اُسرت پھوٹ پڑتی ہے ۔ اس سے میرے لئے اب یہ کہنا بہت مشکل نہیں رہا ہے کہ سب کے دلوں میں پیار کا اتھاہ جذبہ ہے ۔۔ وہ پیار جو ہر چیز سے ۔ اس لئے یہاں سے نکل کر اور کہیں نہیں جانا چاہتی ۔ اور جاؤں بھی کہاں ۔ ؟

"تم پوچھو گے مجھے یہاں رہنے میں فائدہ ۔ ؟" فائدہ بہت ہے یہاں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں آوارہ ہوں یا پاکباز ۔ یہاں پاکیزگی سے انسان کی قدر و قیمت نہیں ناپی جاتی ۔۔ یہاں تو جو جانی مانی ہے ۔ اس کی بازیابی سے قیمت گھٹتی بڑھتی ہے ۔ میں مانتی ہوں کہ یہاں کا سب سے بڑا روگ بھی ہے، سب سے بڑی خرابی بھی ہے ۔ لیکن اس روگ اور خرابی میں فائدوں کی کئی تہیں ہیں اس جگہ آکر یہ ناممکن ہے کہ اپنے کو آدمی پاکباز ظاہر کرے ۔ دوسروں سے منہ موڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ پاکبازی نام کی اس بازار میں کوئی چیز نہیں ملے گی ۔ مگر دوسری جگہ درندگی دل کی گہری تہوں میں جا چھپتی ہے تو یہاں اوپر آ جاتی ہے ۔ یہاں اس چھل کپٹ نہیں جس پر مہذب سماج کی بنیاد رکھی جاتی ہے ۔ تہذیب کی جب کھپت نہیں تو آئے گی کہاں سے ۔ بے حیائی جتنی بے نقاب بلکہ ننگی ہو اتنی ہی یہاں رسیلی اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے ۔ یہاں انسانیت کے لئے عزت اور ناموس کی آڑ کی کوئی ضرورت نہیں درندگی یہاں بے لگام ہے ۔ جو آدمی یہاں جانور نہیں بن سکتا اُسے آدمیت کی لعنت سمجھا جاتا ہے ۔ اس لئے پاکباز یہاں تک ہی نہیں سکتا ۔ کپڑے جھاڑ، سر پر پاؤں رکھ ایسا بھاگتا ہے کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتا ۔ جو عریانی کی حد تک بے شرم ہے، وہی سچا ہے ۔ جو دل میں وہی منہ پر ۔۔۔ اندر شیطان چھپا بیٹھا ہو تو پھر یہاں کی آب و ہوا میں باہر کا انسان ایک پل نہیں ٹھہر سکتا ۔ انسان ہو تو اندر سا باہر دونوں طرف انسان ہونا ہوگا ۔ قطعی یہاں آتے ہی کھل جاتی ہے، ملمع یہاں چوری نہیں ہو سکتا ۔ اس بازار میں صرف سونے اور خالص سونے کا سکہ چلتا ہے، کیونکہ اُسے پرکھنے کی نوبت ہی نہیں کہ وہ پیتل نہیں ہے ۔ یہاں نہ سونے سے محبت ہے نہ پیتل سے گھبراہٹ ۔ گھبراہٹ تو تب ہو جب اس بات کا ڈر ہو کہ پیتل دبے پاؤں اس بازار میں آکر سونے کی جگہ لے لے گا ۔ یہاں کا تو ہر فرد کسوٹی ہے جو پیتل کو اپنی حدود میں قدم ہی نہیں رکھنے دیتا ۔۔۔ میرا ایمان ہے کہ پیتل دبے پاؤں اس بازار میں آکر سونے کی جگہ لے گا یہاں کا تو ہر فرد کسوٹی ہے جو پیتل کو اپنی حدود میں قدم نہیں رکھنے دیتا میرا ایمان ہے کہ تم اس کسوٹی پر پورا اترو گے، دھن پر بھروسہ کیا جاتا ہے

" پرمود! تمہاری سمجھ میں نہ آئیگا ۔ تم نہ آؤ تو ہی بہتر ہے ۔ تم نے ابھی زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے ۔ پرمود نے ابھی سر اُٹھایا ہے ۔ تمہارا مزاج نازک، خیالات بلند اور پاکیزہ ہیں ۔ یہاں بلندی اور پاکیزگی نہیں ہے ۔ یہاں گندگی اور غلاظت ہے ۔ اسی میں میں نے رہنا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ بلند خیالات اور پاکیزگی کا احساس ہی مر گیا ہو ۔ تم نہ آؤ تو ہی ٹھیک ہے ۔ تمہارا پریم کھو دینا مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گا ۔ پچھلی زندگی اور پچھلی دنیا کے لوگوں میں سے ایک تم ہی تو بچے ہو جسے میں جانتی ہوں، جس سے میں محبت کرتی ہوں، ورنہ نہ میں کسی کو جانتی ہوں اور نہ کوئی مجھے جانتا ہے لیکن صرف تمہاری وجہ سے اب تک میں اُس دنیا کے لوگوں سے نفرت نہیں کر سکی ہوں ۔ تم نہیں جانتے پرمود! تم ان جانے میں مجھ پر کتنا بڑا احسان کر رہے ہو ۔ جس سماج میں تم ہو، تمہارے رہتے میں اُس سے نفرت کا تصور بھی کر سکتی ہوں ۔ ؟ کبھی کبھی اس نفرت کی موج میرے دل میں بہت اونچی اُٹھ جاتی ہے لیکن تمہاری یاد اسے نیچا بہت نیچا کر دیتی ہے ۔ اور اس طرح نفرت کے اس زہر سے میرا وجود محفوظ رہتا ہے ۔ اور تمہیں یاد کر کر کے اسے طاقت بنا لیتی ہوں ۔ تمہارا پریم مجھے پاک رکھتا ہے ۔ لیکن ڈر ہے کہ تم یہاں آؤ اور یہاں پہنچ کر تمہارا پریم بھی میرے ہاتھوں سے جاتا رہے ۔ پھر میرا کیا حشر ہوگا ۔ ؟ زندگی ایک ویران ہو جائے گی بل کر جائے گا ۔ نراشا چاروں طرف سے مجھے گھیرے گی، پھر اتنی بڑی پہاڑ سی زندگی کے بیچ میرا کونسا سہارا ہوگا ۔ ؟ اب تو اس سہارے ہی کی وجہ سے دل اونچا کر کے تازہ اور کھلی فضا میں سانس

سے لیتی ہوں، پھر تو یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ مرجاؤں گی، اس کا ڈر نہیں ڈر اس کا ہے کہ جیون کی ٹیک ہاتھ سے چھوٹ جائیگی۔ مرنے مرنے میں فرق ہے۔ زندہ رہ کر مرنا کچھ اور ہے اور مر، مر کے مرنا کچھ اور ہے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے خوف ہے کہ تم آئے تو کہیں یہ زندہ رہنا مجھ سے نہ چھوٹ جائے۔ جہاں میں ہوں، وہ جگہ تمہارے آنے قابل اور دیکھنے قابل نہیں ہے۔ بس صرف تمہارے سہارے ہی یہاں رہتے ہوئے بھی یہاں کی نہیں ہوں۔ تم مت آؤ پرمود۔ مت آؤ — آئے تو تم جانو۔۔۔۔

یہ اتنا لمبا چوڑا خط میں نے کیسے لکھ دیا۔ میں خود نہیں جانتی لیکن کسی اور کو اتنا لمبا خط تھوڑی لکھ سکتی تھی۔ یہ باتیں صرف تم سے ہی کہہ سکتی تھی۔ لیکن میں نے لکھ کیسے دیں؟ انھیں تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی — !

"پرمود! اسے نامکمل مت سمجھنا کہ میں تمہیں پکاروں اور کہوں کہ میرا ہاتھ پکڑ لو، مجھے نکالو۔ کہوں گی، لیکن تب، جب جی کا حوصلہ ساتھ چھوڑ دے گا جب یہ زندہ رہنا چھوڑ دے گا — یہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں — تم مت آنا پرمود!"

لیکن میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ فضول کیوں طول دوں۔ جہاں اور جس حالت میں میں نے بُوا کو پایا اس کا بیان کرتے ہوئے قلم کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ میں بیان نہیں کروں گا لیکن اس خط سے اُس جگہ کا اندازہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا، جہاں شہر کی ساری سڑاند، سارا تعفن جمع ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کی بیوائیں بے کار، مجبور، معذور، پیشہ ور بھک منگے، قانون کی آنکھ اور چنگل سے بچ کر چھپے کام کرنے والے یہاں آباد تھے۔ بُوا وہاں کیسے آگئیں وہ بیمار تھیں، پلنگ سے لگی تھیں۔ اُوپر بیان کی ہوئی صفتیں رکھنے والے چار پانچ عورت، مرد اُنکے پاس تھے۔ ان کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بُوا کی وجہ سے وہ فکر مند ہیں۔ لیکن بات بڑی نابدداتی سے کرتے تھے۔ اور وہ باتیں اس حد تک بے باک اور ننگی ہوتیں کہ سُن کر مجھے متلی آتی تھی۔ اگرچہ وہ بُوا کی عزت کرتے تھے لیکن بات ایسے سستے اور آوارہ اتفاق سے کرتے تھے۔ حیا اور شرم کو وہاں آتے شرم آتی تھی۔ بُوا کے پلنگ کے پاس بھی اُنکے سستے اور بازاری اشارے ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ اجنبی کو اچھوڑ میاں پاکر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا، جیسے میں کسی غیر ملک کا ڈراؤنا اور بھیانک جانور تھا۔ ان میں نے بہت سوں کی باتیں اور اشارے بتلاتے تھے کہ وہ مجھے اس پلنگ پر پڑی بیمار عورت کا پرانا عاشق سمجھ رہے ہیں، ایسا عاشق جس کے عشق نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے۔ اُن کے ان اشاروں اور کچھ اور باتوں نے مجھے کاٹ کاٹ دیا۔

پلنگ پر خاموش پڑی بُوا۔ یہ سب کچھ سُنتی اور دیکھتی تھیں اور کسی سے کچھ نہ کہتی تھیں — لیکن کبھی کبھی کسی کی حد سے زیادہ چھچھوری بات پر ڈپٹ بھی دیتی تھیں اور ان کی ڈپٹ بے کار بھی ثابت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اکثر وہ اس طرف سے اُداس تھیں۔

میں نے کہا۔ "بُوا، چلو۔ میں لینے آیا ہوں۔"

"کہاں لے چلے گا۔؟"

"اب تو گھر بھرا پرا ہی رہ گیا ہے۔ شادی ہو گئی ہے۔ اپنی حکومت ہے۔ تیسرا کوئی نہیں۔ اب بس تمہارا ہی راج ہوگا۔"

"اس بڑھاپے میں چلوں۔؟"

"بڑھاپے سے کیا ہوا۔؟ بڑھاپے میں تو آرام کی اور بھی ضرورت ہے — میں کچھ نہیں جانتا — مجھے پورا یقین ہے کہ میری وکالت اچھی چل نکلے گی۔ کوئی فکر نہیں — بڑے بڑے افسر دوست ہوتے جاتے ہیں — میں کسی سالے کی پرواہ نہیں کرتا۔"

بُوا چپ چاپ پڑی رہیں۔ پھر بولیں، "پرمود، تم نے کہا بھارت تو بٹ جائے نا؟ یہ مشٹر جی سورگ گئے تو کسے کو بھی ساتھ لے گئے — یہ تیرا گھر کتنا بڑا ہے — ان سب کیسے چلے گا۔؟ یہ کتے نہیں ہیں، ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔"

میں نے دل تھامتے ہوئے کہا، "کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو بُوا، آخر میں تمہارا کچھ تو ہوں۔؟ دیکھتا ہوں اس حالت میں تم میرے ساتھ نہ جاؤ گی۔"

بُوا مسکرائیں۔ میں نے اس مسکراہٹ میں زہر کی تہیں دیکھیں، بولیں،

"ضرور لے چلو گے۔"

"ہُن، ضرور لے چلے گا۔؟"

"ہاں، ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ ضرور لے چلوں گا۔"

"یہ تو بتا، تیرے پاس کتنا روپیہ ہے؟"
میں نے کہا، "روپیہ —؟"
بولیں، "جتنا دے سکے مجھے دے جا۔ پھر تو میں تیرے گھر کی ہو جاؤں گی — ہوں یا نہیں —؟ اب بول؟"
میں تعجب سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کہنے کو تو کہہ بھی دیا،
"روپیہ کا کیا کرو گی —؟"
بولیں، "کیا کروں گی —؟ یہ تو میں بھی نہیں جانتی؟ لیکن پہلے تو تیرے دل کا بھرم مٹ جائے گا کہ مجھے تیری مدد کی کوئی ضرورت نہیں — پھر روپیہ دینے میں تیرا اپنا ہی بھلا ہے — خوب کما۔ کما کے جمع کر اور اس گڑھے کو پاٹ دے — سنتا ہے یا نہیں —؟ روپے کے زور سے دوزخ کے اس گڑھے کو پاٹ کر جنت میں بدلا جا سکتا ہے یا نہیں —؟ مجھے خود نہیں معلوم۔ پھر بھی روپیہ کچھ نہ کچھ کام آ ہی سکتا ہے —"

ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ٹال کر کہا، "چلو تمہیں یہاں کے اسپتال میں بھرتی کرا دوں۔"
انھوں نے کہا، "میرا کہا تیری سمجھ میں نہ آیا نا —؟"
— چلو، ٹھیک ہے۔ نہیں، بھائی اسپتال میں میں نہیں جاؤں گی۔"
اسپتال میں علاج اچھا ہو جائے گا — پرائیویٹ وارڈ میں داخل کرا دوں گا۔ خرچ کی فکر مت کرو بُوا ....."
بُوا نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن وہی تو فکر مجھے بھی ہے پر موے — تو بہت سا روپیہ دے جاؤ تو کیا بھاگ کر اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں چلی جانے والی ہوں —؟ پر موے، جب تک جینا ہے، دس بیماریاں لگی ہوئی ہیں۔ گھبراہٹ کس بات کی ہے؟ بات کیوں بڑھاؤں —؟ اس سے میری ہی نالائقی اور بدبختی کا اظہار ہوگا۔ مختصر یہ کہ میں انھیں نہیں لا سکا — یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کے لئے میں نے ان کے لئے کوئی خاص بندوبست کر دیا۔ ایک مقامی وکیل دوست کو سو دو سو روپئے دے آیا تھا کہ ان کی خبرگیری رکھنا۔ انھوں نے خبر تو رکھی ہوگی، روپیہ بھی خرچ کیا ہوگا، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ خبرگیری اور روپیہ محض واجبی سی واجبی رہا ہوگا —

بالآخر میں خفا ہو کر بہت سی نصیحتیں کر کے وہاں سے چلا آیا۔ آج خود کو وکالت میں اس خیال سے محو کر دیا کہ مجھے اِدھر اُدھر کچھ نظر نہ آئے۔ آنکھ صرف مطلب کی چیز پر پڑے — اور بس لیکن کیوں —؟ کیوں بُوا کی پہلی اور آخری مانگ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ انھوں نے مجھ سے اتنی محبت کی، مجھ پر اتنا بھروسہ کیا اور مجھ سے انھوں نے ایک سوال کیا تو مجھے دولت عزیز ہو گئی — مجھ سے کیوں نہ روپیہ بہایا جا سکا —؟ کیوں میں نے مٹھی بند کر لی —؟ اچھا یہ سب پوچھ بھی سہی، لیکن پھر کیوں میری روح بے قرار اور مضطرب نہیں رہتی —؟ کیوں کیوں؟
اس "کیوں" کا جواب میں دوں گا اور ضرور دوں گا — جواب ہے کہ میں شعور رکھتا تھا۔
وکالت میں اپنے آپ کو کیوں گم کر دیا تھا —؟ کیوں دل میں سمجھتا رہا کہ میں ٹھیک ہوں، حق پر ہوں —؟ میں نے کیوں فرض سے جان بوجھ کر آنکھیں پھیریں —؟ جواب ہے کہ میں عقلمند تھا، بیوقوف نہیں پھونک پھونک کر قدم رکھا، تول تول کر چلا اور دولت اپنے ہاتھ میں رکھی۔
لیکن آج اصلی ترازو میں اپنے کو ہلکا پا رہا ہوں۔ آج اس وکالت کی عقل اور دولت کے ڈھیر پر بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ مجھ سے تھوڑا سا بیوقوف کیوں نہ بنا گیا —؟ اس بے جان اور بے روح ڈھیر کا میں کیا کروں، جب وقت آنے پر ہم کی ایک معمولی سی قربانی سے کترا گیا۔ یہ سب میل ہے جو میں نے نہ جانے کس کس طرح جوڑا ہے یہ میل میری روح کی جوت کو ڈھانپ رہا ہے — مجھے نہیں چاہئے یہ
اس بات کو سترہ سال سے کچھ اوپر ہی ہو گئے ہیں۔ آج تعجب اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ یہ سترہ برس میں نے بغیر بُوا کے دیکھے کیسے گزار دیئے وہ بُوا جنھوں نے بگھرنے دیا۔ جنھوں نے کچھ تو کیا، مجھ سے محبت ہی کی — جن کی یاد میرے دل میں آگ سی بن کر جل رہی ہے — جن کی زندگی کسی طرح بھی گزری لیکن ہمیشہ اٹھی ہوئی نظر بنی رہی۔ دھواں بھی اٹھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ روشنی مدھم پڑ گئی ہو۔ انھیں بُوا کو نظرانداز کر کے میں کس طرح زندگی گزارتا رہا —؟
آج خبر آئی ہے۔ وہ مر گئیں۔ کیسے مر گئیں — ؟ جلنے

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو جلنے بیٹھا ہوں، وہی کیا کم ہے۔ اگر اسی کو سہہ جاؤں تو غنیمت ہے۔

بوا تم گئیں۔ تمہارے جیتے جی میں راہ پر نہ آیا۔ اب سنو، میں اس جی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دنیا کے اچھے برے سے مجھے کچھ مطلب ہی نہیں۔ اوروں کے لئے نئے سرے سے زندگی گذارتا، شاید مجھ سے نہ سیکھا جائے۔ عادتیں پک گئی ہیں۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے اس زندگی سے نباہ کرتا ہی زندہ رہوں گا جتنا ممکن ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔

بھگوان! تم میری بات سنتے ہو۔ [illegible] دو لیکن وعدہ کا پاس نہ کروں تو نرک [illegible]

دستخط: ایم۔ ڈی پال

مورخہ ۴-۳

نوٹ:۔ اطلاعاً عرض ہے کہ جی سے اپنا استعفیٰ [illegible] داخل کر دیا ہے۔

ایم۔ ڈی مورخہ ۴-۳

(ختم شد)

لوچن بخشی

لوچن بخشی نے ۱۹۲۳ء میں ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں گوجر گڑھ میں جنم لیا۔ پوٹھوہار کی یہ سرزمین صدیوں سے ادب، آرٹ اور کلچر کا گہوارہ چلی آ رہی ہے۔ ٹیکسلا کی مشہور اور قدیم درسگاہ بھی یہیں ہے۔ اس سرزمین نے پنجابی کے کئی عظیم ادیب پیدا کئے ہیں۔

اُردو کی طرح پنجابی کے بھی بیشتر ادیب متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوچن بخشی نے بھی درمیانی طبقے کے ایک گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس کا بچپن پنجاب کی صحت مند اور شاداب آب و ہوا میں گذرا۔ لوچن بخشی کی تمام کہانیاں دیہات اور اپنی فوجی زندگی کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کے والد چونکہ ملازمت پیشہ تھے اس لئے لوچن بخشی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے کئی مقامات کی سیر کی جس نے اس کے لئے زندگی کے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ ابتدا ہی سے ایک دوربین نظر رکھتا تھا۔ آنے والے دنوں میں زرحیات کے پھول چنتا رہا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد وہ لاہور آیا تو اس کے سامنے شہری زندگی بے نقاب ہوئی۔ اس نے مشاہدات کا جو ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اس میں نئے لعل و گہر کا اضافہ ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ فوج میں ملازم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک نئے ماحول اور ایک نئی زندگی کا منظر کھلا ـــ اس فوجی زندگی نے اس کے مشاہدے کو مزید سان پر چڑھایا۔ اس کی بہترین کہانیاں اس دور سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک دانش ور اور ایک ادیب تھا۔ یہ فوجی ملازمت اس کی زندگی کا ایک مختصر سا پڑاؤ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ تلوار کی بجائے اپنے قلم سے زندگی کی خرابیوں کے ساتھ بہتر طریقہ سے لڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۴۵ء میں جنگ سے واپس آتے ہی اس نے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی۔ ویسے بھی وہ اپنی زندگی میں کسی ادھورے پن کا قائل نہیں۔ اگر یہ کہاوت تسلیم کر لی جائے کہ "وہی ادیب عظیم ہوتے ہیں جو بھرپور زندگی بسر کرتے ہیں" تو لوچن بخشی اس کا بہترین ثبوت ہے۔ خلوص عظیم ادب کا خالق ہوتا ہے ـــ اور یہ خلوص لوچن بخشی کی فطرتِ ثانی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب گریجویٹ ہو جانے کے بعد اس نے سول سپلائی محکمہ کی ملازمت کی تو جہاں اس کے ساتھی اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے وہاں وہ صرف خلوص کی دولت لئے بیٹھا تھا اور اپنی کہانیاں ادب کے بینک میں جمع کرا رہا تھا۔ تقسیم ملک نے اس کی انسان دوستی پر مزید جلا کی ـــ اس کے ذہن و نظر میں کہیں کہیں جو دھندلاہٹ ابھی باقی تھی وہ بھی تابندہ ہو گئی۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا قصد کیا۔ نئی بلندیوں کو چھونے کا اس کا قصد ادب کے میدان میں بھی جاری ہے۔ وہ ایک مقام پر ٹھہرنے کا قائل نہیں۔

لوچن بخشی کا فنی کمال یہی ہے کہ وہ زندگی کے نگار خانے میں بیشتر اُلٹی ہوئی تصویروں کو نہ صرف سیدھا دیکھتا ہے بلکہ انہیں سیدھا کر کے دوبارہ لٹکا دیتا ہے ـــ اس کے ناولٹ "بھرے میلے میں" بھی بعض تصویریں الٹی لٹکی ہوئی ہیں جنہیں وہ چابکدستی سے آہستہ آہستہ سیدھا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آپ کو آخر میں ہر تصویر سیدھی لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ لوچن بخشی کی تحریر نگاری کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ ایک توانا زندگی کے کردار چنتا ہے اور ماحول میں کچھ اتنی توانائی سرایت کر دیتا ہے کہ کہانی کا ماحول بھی بجائے خود ایک کردار بن جاتا ہے ـــ اس کے اس ناولٹ میں "بنتو" جس عورت کے روپ میں پیش کی گئی ہے وہ ہر عورت میں چھپی ہوئی عظیم عورت کی ایک امنٹ اور جاوداں شبیہہ ہے۔



لوچن بخشی

مترجمہ محمود جالندھری

بھرے میلہ میں

پیرجی

بھئی دین ایمان کی قسم! میں تم سے کچھ جھوٹ کہوں تو مجھ پر واہگورو کا عتاب نازل ہو۔ لیکن ایک بات سنو۔ میری تم سے ابھی ابھی جان پہچان ہوئی ہے۔ تم کہوگے کیسا عجیب آدمی ہے۔ ملتے ہی قسمیں کھانے لگا۔ اور پھر قسم تو جھوٹے کھاتے ہیں۔ میں تو تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھئی یہ بات ہے سولہ آنے سچی تم اس پر اعتبار کرو نہ کرو!

ہاں جناب تو اس جگہ جہاں سے ستلج دریا پُر پیچ پہاڑوں کی کوکھ سے نکلتا اور سمٹتا ہوا گزرتا ہے۔ وہاں پہاڑ اور میدان کے اتصال پر ایک چھوٹا سا گاؤں تمہیں ضرور دکھائی دیا ہوگا۔ اور تم اسے دیکھنے کے لئے ادھر چلے آئے۔ مگر دیکھئے تو سہی یہ گاؤں بھی کیا ہے۔ بمشکل سے آٹھ دس گھر ہونگے ان گھروں سے تم ذرا اور آگے بڑھو تو تم ایک بڑا کھنڈر دیکھوگے۔ ٹوٹے ہوئے مکان۔ پانی اور نمی سے گری پڑی دیواریں اور ان پر جما ہوا کیچڑ اور کائی۔ مٹی کے برتنوں کی ٹوٹی پھوٹی ٹھیکریاں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر تمہیں حیرت نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ایک بار تو تمہارے دل میں خوف و ہراس کی لہر ضرور دوڑ جائے گی۔ معاف کرنا تمہیں اس طرح خوف زدہ دیکھ کر اگر تم میرے دوست ہوتے تو میں تمہیں ایک موٹی سی گالی دے دیتا، لیکن تم تو راہگیر ہو اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں دل ہی دل میں تمہیں اپنی کہانی سنانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں اب تم سے کیا کہوں۔ لیکن میں تمہیں تھوڑی دور تک اور لے جاؤں گا۔ ڈرنے اور جھجکنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ اسی راستے پر چلے آؤ۔ سامنے بیریوں کے جھنڈ میں — وہاں جہاں تم چند دیواری سی دیکھ رہے ہو —

لو بس صرف اتنی سی بات تھی۔ ہیں یہ کیا تم تو ڈر گئے۔ یہ کوئی قتل گاہ تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو تم پیرجی کے مزار تک آ گئے ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پیرجی مسلمان تھے۔ اور وہ اس جگہ کو "مدفن شریف" کہتے ہیں لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق پیرجی ہندو تھے۔ پیرجی ہندو تھے یا مسلمان یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ لیکن پیرجی تو پیرجی تھے۔ خدا رسیدہ فقیر تھے۔ سادہ لوح تھے۔ دریا دل اور سخی تھے۔ اور ایک دفعہ جس پر بھی ان کی مہر کی نظر ہو جاتی وہ نہال ہو جاتا۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ جگہ کس قدر حسین ہے۔ لیکن شاید تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ جگہ کس قدر بھیانک بھی ہے۔ ویران اور سنسان۔ غیر آباد۔ مگر جناب میں نے ٹھیک کہا ہے نا۔ اگر سچ پوچھو تو یہ جگہ مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ویسے یہ بات اور ہے کہ اگر کوئی مسافر دن دہاڑے لوٹ لیا جائے یا کسی کو قتل کر کے اس کی لاش کو ستلج دریا میں پھینک دیا جائے اور یا کوئی ایک اکیلی عورت اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے۔ میں یہ باتیں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس دھرتی پر ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اس میں پیرجی کا کیا قصور ہے۔ یہ بات تو اب دھرتی کے خمیر میں ازل سے موجود ہے۔ اس دھرتی کا چپہ چپہ ایک آرزو اور حسرت کی تصویر ہے نہ جانے کیوں اس چار دیواری میں آ کر میرے دل میں کچھ گدگدی سی ہونے لگی ہے اور پھر میں بولتا چلا جاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں یہ سوچتا ہوں کہ اس سکوت سے اس دھرتی کی ویرانی میں اضافہ ہوتا ہے اور آواز تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بے جھجک کی لڑک کی ناشناسی کے سینے کو بیدھتی چلی جاتی ہے۔

تم تو کہوگے کہ کسی عجیب بیوقوف کے ساتھ واسطہ آ پڑا ہے لیکن میں تمہیں زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہتا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر میں اس جگہ کے حسن کا تمہیں قصہ سناؤں۔ ہاں یہی بات اچھی رہے گی۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ ایک

بہت ہی حسین وجمیل اور پیاری وادی ہے ۔ لیکن اس پر شباب سال بھر میں صرف ایک ہی بار آتا ہے ۔ بہار کے دنوں میں جب پروا چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دھرتی کی تمام آرزوئیں بیدار ہو گئی ہیں ۔ اس کے سینے میں چھپی ہوئی خوشبوئیں ابھر آتی ہیں ہر طرف خودرو جنگلی پھول کھل اٹھتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں پیر جی اپنی چلہ کشی ترک کر کے باہر آ جاتے تھے ۔ ان کے چیلے چانٹے دور دراز سے دیش کے ہر حصے سے آیا کرتے تھے ۔ ان سے پیر جی بات چیت اور تبادلۂ خیالات کیا کرتے ۔

انہی دنوں ایک جمعرات کو پیر جی کا عرس ہوتا ہے ۔ کاش آپ نے اس رات کی چہل پہل اور رونق دیکھی ہوتی ۔ ایک نئی نویلی دلہن کی طرح اس دھرتی کا یہ خطہ سج دھج کے اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے ۔ ایسے تو ہر جمعرات کو اس چار دیواری میں کوئی نہ کوئی گمنام عقیدت کیش چراغ جلا جاتا ہے ۔ مگر رات کو جیسے ساری کی ساری دھرتی پہ چراغاں ہوتا ہے ۔ سارا دن ساری رات قوالیاں گائی جاتی ہیں اور وجد میں آ کر سامعین جھوم جھوم اٹھتے ہیں ۔ اس میلہ میں پریم کے بندھن مضبوط بھی ہوتے ہیں اور ٹوٹتے بھی ہیں ——

مدت سے سینے میں دبے ہوئے ارمان یہاں نکلتے ہیں ۔ لاڈ چاؤ سے پالی ہوئی آرزوئیں اس میلہ میں پروان چڑھتی ہیں ۔ یہاں چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی آدمی کو قتل کیا جا سکتا ہے اور بڑی سی بڑی قربانی بھی یہاں بے اثر ثابت ہو سکتی ہے ۔ معاف کرنا میں نے یہ سب باتیں اپنی ان آنکھوں سے دیکھی ہیں ۔ اس لئے تمہیں یہ سب باتیں بتا رہا ہوں ۔ تم اب تک یہ بھی جان گئے ہو گے ۔ کہ میں سلیقہ کا قائل ہوں اور سلیقہ سے تمہیں اس بات کا پس منظر بتانا ضروری تھا ۔ اس سلئے میں تمہیں اس ویرانے میں کھینچ لایا ہوں ۔ دراصل میری اس کہانی کا تعلق اس میلہ سے ہے جس کا ذکر تم ابھی تک سنتے رہے ہو ۔ میری اس کہانی سے تم نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہو گا ۔ کہ میں یہ میلہ ہر سال ضرور دیکھنے آتا ہوں گا ۔ ہاں جناب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں سال کے ان دنوں میں کہیں بھی کیوں نہ ہوں ۔ اس میلہ میں ضرور شامل ہوتا ہوں ۔ اس میلہ کا میرے زندگی سے نزدیکی اور گہرا تعلق ہے ۔ تعلق بھی کیا ہے حقیقتاً یہ میلہ ہی میری زندگی ہے ۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ۔ اس میلہ کو دیکھتا چلا آیا ہوں ۔ ان گنت آرزوؤں کا اس میلہ میں جنم ہوا ۔ ان گنت حسرتوں نے اس میلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفنا دیں ۔ مثلاً تم میرے دوست جیلے ہی کو لو ۔

جیلا

اگر تم اس علاقہ کے رہنے والے ہوتے تو جیلے کا نام سنتے ہی تمہارا دم خشک ہو جاتا اور تم غش کھا کر گر پڑتے ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل کی دھڑکن ہی بند ہو جاتی ۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں ۔ اور میں تمہیں ابتداء میں بتا چکا ہوں کہ قسم تو چھوٹے کھاتے ہیں ۔ اب میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گا ۔ مجھ پر اعتبار کرو ۔ ایسے واقعات کئی بار ہوئے ہیں ۔ ادھر جیلے کا نام لیا گیا اور ادھر سننے والے کی دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں ۔

جیلا میرا دوست بھی تھا ۔ اس علاقہ کا بدنام ڈاکو بھی تھا ۔ اس کی دھاک دور دراز ان پہاڑیوں میں بھی بیٹھی ہوئی تھی ۔ جہاں سے ستلج دریا نکلتا ہے ۔ اس کی شہرت پنجاب کے ان میدانوں میں بھی تھی جہاں ستلج دریا مست و مدہوش ہو کر اٹھلاتا ہوا بہتا ہے ۔ ستلج کے بہاؤ کی طرح لوگ اس سے واقف تھے ۔ جب وہ بل بولتا تھا تو دریاؤ کے چڑھاؤ کی طرح آگے بڑھتا جاتا تھا ۔ اس کو کبھی کوئی روک نہیں سکا تھا ۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار قتل کئے تھے ۔ بے شمار ڈاکے ڈالے تھے لوگ کہتے ہیں کہ وہ شرابی اور بدکار تھا ۔ اس میں ہزاروں عیب تھے ۔ لیکن جناب وہ ہمارا یار تھا ۔ ہمیں اس کی برائیوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا ۔ ہمیں تو اس کی یاری سے غرض تھی ۔ ایسا دوست اگر تم چراغ لیکر بھی تلاش کرو تو حشر تک ڈھونڈتے رہو گے اور پھر بھی حسرت تمہارے دل میں کھٹکتی رہے گی ۔

اس کے ساتھ میری دوستی اس چراغاں کے میلہ میں ہوئی تھی اور وہ بھی محض اتفاقیہ ۔ اس وقت میری مسیں نہیں بھیگی تھیں ۔ ان دنوں مجھے پہلوانی کا بہت شوق تھا ۔ ایک دن اکھاڑہ میں کسرت کے دوران ہماری آپس میں تو تو میں میں ہو گئی ۔ اور میرے چار ساتھی مجھ پر ایکدم ٹوٹ پڑے ۔ تھوڑی دیر تک تو میں پہلو بچاتا رہا ۔ لیکن صاحب کہاں تک بچتا ۔ وہ چار تھے اور میں اکیلا ۔ میں آخر گر پڑا ۔ مجھے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے

رہی سر ندر سے نکال رہا ہو۔ اتنے میں ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ "بہادر بنتے ہو! یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ پہلوان کے سامنے ہوتے تو ۔ لیکن ایک سے اکیلا لڑنے تو بات بھی ہے۔"

لیکن وہ لڑکے باز نہ آئے اور مجھ پر ہی رگیدتے رہے۔ اتنے میں وہ اجنبی نے آگے بڑھ کر ایک ایک رسول ان کی گدی پر یوں جمائی کہ وہ بلبلا اٹھے۔ ایک لڑکے کی تو گردن کا منکا ہی ٹوٹ گیا۔ دوسرا بھی بے ہوش کرچکا تھا۔ دو لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس نے مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور بولا "جوان تو اچھا ہے"۔ اس کے بعد اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور کہا "بات سن بے او پہلوان کے بچے۔ آج تو تجھے بچا دیا ہے لیکن آئندہ دوست بناتے ہوئے ذرا سوچ لیا کرنا۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے کئی بار ملا۔ مجھے پہلوانی سکھاتا رہا۔ کئی داؤ پیچ بتاتا رہا۔ دراصل وہ مجھ پہ مہربان ہو گیا تھا۔ جیسے پیر جی کی کسی پر مہر کی نظر ہو جاتی ہے۔ خود بخود اور بے غرض —

لیکن اس دوران میں مجھے ایک بار بھی اس نے یہ نہ بتایا کہ اس کا نام جیلا ہے۔ میں سوچتا ہوں ایک طرح تو اس نے اچھا کیا۔ جناب اگر وہ اس وقت مجھے اپنا نام بتا دیتا تو میرے دل کی دھڑکنیں ہی بند ہو جاتیں۔ اس وقت تک میں جیلے کے متعلق ان گنت قصے سن چکا تھا مگر جس شخص کے ساتھ میری دوستی ہوئی تھی وہ جیلا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کوئی خدا دوست انسان تھا۔ جس کو ہمیشہ کمزور پر ترس آتا تھا۔ جو پیر جی کا عقیدت مند تھا اور ہمیشہ غریبوں کے لئے لنگر لگاتا تھا۔ جو امامات کے میلے پر ہزاروں روپے خرچ کرتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں مجھے اس وقت معلوم ہوئیں جب میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کی ٹولی میں آ شامل ہوا۔ اس کے ساتھ جا ملنے کا قصہ بہت ہی عجیب ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں یہ قصہ سناؤں تمہیں اپنے متعلق ایک دو باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں

میرا باپ ایک دولت مند زمیندار تھا۔ ہمارا ایک کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچپن سے میری طبیعت میں لاابالی پن اور ناپختگی زیادہ تھی۔ چھوٹی عمر کی مجھے صرف ایک ہی بات یاد ہے۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا جب میں سب سے آگے تھا اور پڑھنے لکھنے میں بھی چھوٹا نہ تھا۔ میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ میں اچھا کھاتا تھا اور گڑ دا پرتا تھا۔ اچھا کھانے پینے کی بات تو تم سن ہی چکے ہو۔ اب ذرا میرے ایڈ ہونے کا قصہ سنو۔

ایک دن منشی جی (منشی جی) کے پاس ایک لڑکے نے یہ شکایت کی کہ میں نے شراب پی کر ان کو گالیاں دی ہیں۔ معاف کرنا۔ ہر ایک جاٹ کا بیٹا خود بخود ہی یہ کام سیکھ جاتا ہے۔ میرا یقین اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا۔ جب ہمارا منشی میرے باپ سے ملنے آیا۔ منشی جی نے میرے باپ سے کہا "آپ کا بیٹا شراب پیتا ہے۔ آپ کا بیٹا چوری کرتا ہے اور آپ کا بیٹا جوا کھیلتا ہے۔ معاف کرنا آپ کے بیٹے میں ایک ایسی بری عادت بھی ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔"

شاید تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ یہ بات سن کر میرے والد کو تشویش ہوئی ہو گی۔ "نہیں جناب۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو تو معاف کرنا تمہارا واسطہ کسی خاندانی جاٹ سے نہیں پڑا۔" منشی جی کی باتیں سن کر میرا باپ تو بہت خوش ہوا۔ اور ہنس کر بولا "منشی جی! اگر آپ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے تو آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ اپنے بیٹے کے متعلق یہ باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا بیٹا واقعی میرا بیٹا ہے ——"

اس دن کے بعد سے میں کبھی سکول نہ گیا۔ اس دن کے بعد سے میرا کام صرف پہلوانی رہ گیا تھا۔ گھی پیتا تھا۔ بادام کھاتا تھا۔ اور پہلوانی کرتا تھا —" ایک دن کی بات ہے میں اپنے کنوئیں پر بیٹھا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں بیلوں کو چارہ ڈلنے اٹھا ہی تھا کہ اچانک میرے پیچھے ایک لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں گھنگرو چھنکنے لگے ہوں۔ مگر یہ ہنسی خود بخود بند ہو گئی اور ایک بھیانک چیخ مجھے سنائی دی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نمبردار کی بیٹی بنتو کو جیسے کوئی مرد اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے اٹھا کر بھاگ جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر منڈا سا باندھا ہوا تھا میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ایک لمبے تڑنگا طاقتور مرد تھا۔ خیر صاحب! ایک تو لڑکی پھر اپنی جان پہچان کی لڑکی اور پھر بنتو جیسی لڑکی —" میں تیزی سے اٹھا اور جاتے ہی اس شخص کے پہلو میں زور سے دو گھے

جاسکے ۔ لوجی وہ لمبے قد کا مرد دو تکے بھی نہ سہہ سکا ۔ دھرتی پہ اوندھے منہ جا پڑا ۔ اس کی ناک اور منہ سے خون کا دھارا بہہ نکلا ۔ لیک بہانہ ساز کی طرح وہ اپنی آنکھیں چڑھا کر لیٹا رہا ۔ بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی ۔ اس دن پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میرے تکے میں کتنی طاقت ہے ۔ آدمی کو ہلاک کرنا کتنا آسان ہے اور بنتو کتنی حسین ہے ۔ اس دن کے بعد سے کئی لوگ کہتے ہیں کہ مجھے بنتو سے پیار ہو گیا تھا ۔ لیکن جناب مجھے واہگورو کی سوگند ـــــ میں ابھی تک یہ نہیں جانتا کہ پیار کس بھوت کا نام ہے ۔ معاف کرنا میں پھر قسم کھانے پر مجبور ہو گیا تھا ۔ مگر یہ بات تمہیں سولہ آنے صحیح بتا رہا ہوں مجھے تو بنتو سے نفرت ہو گئی تھی تم پوچھو گے کیوں ـــ ؟ لو یہ بات بھی سن لو ـــــ

جس وقت بنتو مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی ۔ اس وقت مجھے وہ کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی ۔ اب میں آپ سے کیا کہوں ۔ بس اتنا سمجھ لو کہ اس کی آنکھیں کبھی تو مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور کبھی ان میں سے اندھیری راتوں کی تاریکی جھانکنے لگتی تھی میں سوچ ہی رہا تھا ۔ کہ اس سے پوچھوں ـــــ بنتو تجھے کیا ہو گیا ہے ۔ میری طرف یوں نہ دیکھ ـــــ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیچھے پڑی ہوئی لاش نے ایک جھرجھری سی لی ہو ۔ اور پھر ایک سایہ سا میرے سر کے اوپر سے گذرتا ہوا لمبا ہوتا ہوا دور کھیتوں تک پھیل گیا تھا ۔ میں نے لاش کی طرف دیکھا ۔ وہ اسی طرح دھرتی پہ اوندھے منہ پڑی تھی ۔ میرا جی چاہا کہ چارہ کترنے والا ٹوکہ لا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور دریا میں بہا آؤں ۔ یہی بات میں نے بنتو سے کہی تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا ۔ وہ کہنے لگی "یہ بات بعد میں کرنا ۔ پہلے مجھے گاؤں تک چھوڑ آ ۔ میری تو ڈر سے جان نکلی جاتی ہے ـــــ" اور وہ گاؤں کی طرف چل دی اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا ۔ ہم دونوں خاموش تھے ۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی ۔ لیکن میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال موجزن تھا میرے والد کہا کرتے تھے ۔ کہ جب جاٹ کا کوئی لڑکا پہلا قتل کرلے تو یہ سمجھ لو کہ وہ جوان ہو گیا ۔ میں آج جوان ہو گیا تھا ۔ جب میرے والد نے پہلا قتل کیا تھا تو اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی ۔ اس بات کو سچ جاننا جناب جس ماحول کا پروردہ ہوں وہاں

اگر سات سال تو کیا چودہ سال کی بھی سزا ہو جاتی تو میں شاید پروا نہ کرتا ۔ بنتو جیسی حسین لڑکی کے لئے چودہ سال کی سزا کیا تھی ۔ مجھے اس کا ذرہ بھر غم نہ ہوتا ۔ مجھے تو غم اس بات کا تھا کہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس نے کہنا شروع کر دیا ـــ "قتل میرے لئے ٹھوڑا ہے ۔ مجھے کیا خبر کہ اس کو کس نے ہلاک کیا ہے ـــ"

مجھے اس بات پر بہت غصہ آ رہا تھا بنتو نے میری محبت اور ہمدردی سے اپنی عزت کو زیادہ بہتر خیال کیا تھا ۔ میری غیرت کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میرا جی چاہتا تھا کہ میں واپس کنوئیں پہ جاؤں اور بنتو کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دوں لیکن میری حیرت کی حد ہی نہ رہی ۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ کنوئیں پر لاش کا نام و نشان ہی نہیں تھا ۔ جس شخص کو میں اپنی طرف سے قتل کر کے کھیتوں میں پھینک آیا تھا وہ ایک پیشہ ور استاد کی طرح مجھے جُل دے گیا تھا ۔ میں نے سوچا اس مسئلہ کو جیسے استاد سے حل کروایا جائے ۔ تو پھر کیا تھا جناب ـــ میں بیلے کے پاس چلا گیا ۔ وہ میری بات سن کر بے تحاشا ہنسا ۔ اس نے پوچھا ـــ "وہ کون تھا ۔ یہ بات تمہیں کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کوئی بھی ـــ" اس کے بعد وہ پھر یوں ہنسا جیسے بادل پھٹ پڑا ہو ۔ اس کی آنکھیں کبھی مجھے شعلوں کی طرح جلتی ہوئی نظر آتی تھیں اور کبھی ان میں کالی راتوں کا گہرا اندھیرا پھیل جاتا تھا ۔

بنتو

زر ، زمین اور زن ـــ یعنی عورت ۔ ان کے متعلق ہمارے علاقہ میں یہ عام مشہور ہے کہ یہی ہمیشہ آدمی کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ تم میری اس بات سے اتفاق کرو ۔ اگر اتفاق نہ بھی ہو تب بھی کوئی بات نہیں ۔ معاف کرنا ، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ چلتے چلتے یہ بات بھی ذرا ہو جائے ۔

زمین کے متعلق قتل ہوتے تو ہم روز دیکھتے ہیں ۔ یہ تمہاری نظر سے بھی گذرے ہوں گے ۔ جس طرح فصل کے اُگنے پر اس کا کاٹنا اور پھیلانا ضرور ہوتا ہے ۔ میں سوچتا ہوں اس طرح زمین کے متعلق کسی کا قتل ہونا ہماری زندگی کی ایک عام بات ہے ۔ چونکہ یہ بہت آسان اور سادہ ہوتی ہے

ایک عام بات ہی دلچسپ ہوتی ہے اس لئے اس کا بیان بھی غیر دلچسپ ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک بات۔

ڈرے متعلق قتل تو روز ہی ہوتے تھے یہ جانا پہچانا تھا۔ ہم ڈاکہ ڈالتے تھے اور کے لئے دن کی روشنی کی طرح یہ بات بھی صاف ظاہر ہے۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے۔ چلو اسے بھی چھوڑو۔

اب بنتو دن کی بات — ہاں جناب یہ عورت کوئی سیدھی سادی عورت نہیں ہے بلکہ خود بنتو ہے اس لئے اس کا بیان ضروری ہے — بنتو تو خود دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں آپ سے زیادہ کیا کہوں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ بنتو بے حد حسین اور بہت جوان تھی۔ میں تمہیں پہلے یہ بھی بتا چکا ہوں کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جیلے کو بنتو سے محبت ہے مگر تم ان لوگوں کے سر پر خاک ڈالو۔ وہ تو یونہی بکتے ہیں۔ تم بنتو کی بات سنو۔ ہاں جی اس قتل کے کچھ دنوں بعد بنتو کی شادی ہو گئی اور وہ چلی گئی۔ میں جیلے کی ٹولی میں جا شامل ہوا اور بنتو کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ دیکھئے یہ بات ہی بھول جانے والی تھی۔ چونکہ ہمارے علاقہ میں عورتیں ہوتی ہی کم ہیں خاندان میں اگر ایک بھی بھائی کا بیاہ ہو جائے تو بس یوں سمجھئے کہ سارے خاندان کو ایک نعمت مل گئی ورنہ جناب اگر کوئی شخص ساری عمر اس دھرتی پر پیاسے کے گہرے راز دل سے ناواقف رہے تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ جیلے کا سنتے ہی کوئی شخص کسی عورت کی بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔

مہتم نے تو سنیاس دھار لیا ہے — یہ بات جیلا کئی مرتبہ کہا کرتا تھا۔ یہ اس کا اصول تھا اور معاف کرنا جیلا اپنے اصول کی خاطر کبھی مرنے مارنے سے بھی نہیں ٹلتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ کافی دولت مند گھر تھا۔ جب ہم سارا سامان باندھ کر چلنے لگے تو اندر کے کمرے سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ پلک جھپکنے میں جیلا اندر کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ ہمارا ایک ساتھی اسی گھر کی ایک عورت کا بازو پکڑے کھڑا تھا۔ جیلے کا بیان ہے کہ وہ اس کی چوڑیاں اتارنے لگا تھا۔ جیلے نے اس سے کہا — "حرامزادے — بے اصول کتے" اور فوراً گولی مار کر اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اس عورت سے معافی مانگی اور کہا

"بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میرے ساتھی چاہے سارا گھر لوٹ لیں، چاہے سارے گھر کے آدمیوں کو قتل کر دیں۔ لیکن کسی عورت کے بدن پر پہنا ہوا زیور وہ نہیں اتار سکتے — دیکھ میں جیلا تیرے سامنے ہاتھ باندھ کر شرمندہ کھڑا ہوں۔"

"جیلا" اس لڑکی نے کہا اور خود کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیلے کو وہ عورت بہت ہی عجیب نظر آئی۔ عام عورتیں تو جیلے کا نام سنتے ہی بے ہوش ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں تو جیلا خود اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خیر جی جیلے نے اس گھر کا سارا سامان واپس کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو خالی ہاتھ لے جا کر پیر جی کے مزار پر چلا گیا۔ یہ بھی اس کا ایک اصول تھا۔ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے پیر جی کے مزار پر سلام کرنے جاتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد لوٹی ہوئی دولت کا دوسرا حصہ پیر جی نذر کرتا۔ کہتے ہیں کہ اس نے آج تک کبھی اس اصول میں ہیرا پھیری نہیں کی تھی لیکن — اب پتہ نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیلا اپنے اصول میں ہیرا پھیری کرنے لگا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسی عورت کے حسن پر فدا ہو گیا ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ چونکہ وہ بے حد خوبصورت بتائی جاتی تھی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے کی اس ادا پر وہ عورت فریفتہ ہو گئی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جیلے نے اس عورت سے ملنے کے لئے ہی یہ سارا ڈھونگ رچایا ہو۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جیلا آدمی بڑا دشمنا تھا اور اس لئے اس کی چالوں کا کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اگر اسے مغرب کی طرف جانا ہوتا تو وہ مشرق کی طرف یلغار کرتا۔ اس لئے میں اسے شک کی نگاہ ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن میں بیریوں کے جھنڈ تلے بیٹھا تھا کہ جیلا میرے پاس آیا۔ اس نے اس روز اپنا سر دھویا تھا اور اپنی داڑھی میں جڑنے کئے ہوئے گھاس کی طرح ہموار اور یکساں نظر آ رہی تھی اس نے سرسوں کا تیل لگا رکھا تھا۔ وہ کمبخت اپنے اس روپ میں بے حد حسین نظر آ رہا تھا۔ اس کا نکلتا ہوا قد، بھرپور جوانی، پرجلال چہرہ اور دو ظالم آنکھیں نشیلی اور قہر آلود تھیں۔ اونچا لمبا قد۔ دو پتلے پتلے ہونٹ اور ان پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی مسکراہٹ — اس پر طرہ یہ کہ یکساں ترشی ہوئی اور تیل سے چپڑی ہوئی داڑھی۔

"خدا خیر کرے —" جب بھی جیلا اس روپ میں نمودار ہوتا تھا تو یہ سمجھ لینا پڑتا تھا کہ ضرور کوئی اہم معاملہ ہوگا۔ "اور جناب ہوا بھی یونہی — وہ چپکے سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا: کیا بات

ہے؟" ـ اُس نے کچھ نہ کہا اور دھرتی پر بیٹھا جنگلی پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بے چینی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ضرور اس کے دل میں کوئی بات کھٹک رہی ہے جو اُسے چین نہیں لینے دیتی۔ میں نے پھر پوچھا۔ "جیلے تم پر کیا بیت گئی ــ؟" جیلے نے جواب دئے بغیر میری طرف ٹکر ٹکر دیکھنا شروع کر دیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک دفعہ بنتو نے میری طرف دیکھا تھا۔ "جیلے تجھے خدا کی قسم۔ میری طرف یوں نہ دیکھو اور منہ سے کچھ پھوٹ۔" خیر صاحب وہ بڑی ناز و ادا کے ساتھ بولا۔ "میں آج سے جیلا نہیں ــ جرنیل سنگھ ہوں ــ۔"

"یہ تجھے کیا ہو گیا جیلے ــ"

"ارے مجھے جیلا نہیں، جرنیل سنگھ کہو۔ یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ نہایت ہی سیدھی سادی بات ہے۔ مجھے ایک گورو مل گیا ہے بس یوں سمجھو کہ نہلے پہ دہلا پڑ گیا ہے ــ ایک بات سُن ــ تجھ سے کیا چھپاؤں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں پیر جی کے مزار والی چار دیواری میں سجدے میں پڑا تھا۔ بالکل بے خود تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی عورت میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو وہی اس رات والی لڑکی میرے سر پر کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی ــ "کتنا حسین جوان ہے اور کن دھندوں میں پڑ گیا ہے۔" مجھے بہت غصہ آیا۔ اور میں ایک ہی وار میں اس کا صفایا کرنے لگا تھا کہ ایک دم کسی نے مجھے پکڑ کر زور سے جھنجوڑ دیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ وہاں نہ وہ لڑکی تھی اور نہ کوئی اور۔ بس میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پیر جی کا مزار بھیگ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یہ تو پیر جی کی کوئی کرامات ہے۔ اگر کوئی عورت پیر جی کے مزار تک پہنچ سکتی ہے تو اس میں ضرور کوئی بھید ہے جبکہ یہاں تو ایک عورت کیا اس کا سایہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہ عورت کوئی سچ مچ کی عورت نہیں ہو سکتی ــ"

"ہاں جیلے تیری بات تو ٹھیک ہے ــــــ تو نے وہ بات تو سن رکھی ہے نا ــ جب سیار پور (ہوشیار پور) کا ایک ساہوکار اپنی بیوی کے ہمراہ "چراغاں" کے میلے میں آ گھسا تھا اور جب وہ نیاز دیکر واپس آیا تو اس نے کیا دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کی بیوی کے گرد چکر کاٹ رہے تھے اور شور کر رہے تھے ــ "لیجئے جناب ــ ایک دفعہ تو لالہ چکرا گیا اور جب لالہ جی سنبھل کر اپنی بیوی کے ہمراہ یکہ میں بیٹھنے لگے تو جناب جھاڑیوں سے ایک گھوڑ سوار جوان نکلا اور جھٹ سے اُس عورت کو اپنے گھوڑے پر ڈال کر رہا ہو گیا ــ آج تک نہ اس عورت کا پتہ چلا اور نہ اس جوان کا۔

جیلا ایک دم زور سے ہنسا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔

"ہاں یہ بات آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کون تھا ــ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ پیر جی کی کرامات تھی۔ پیر جی نے اُسے سزا دینا ہی تھی آخر وہ اپنی اس مال کو اپنے ساتھ لیکر آیا ہی کیوں تھا پیر جی کے مزار پر اس دن کے بعد سے "یہ لڑکی ہے جو پیر جی کے مزار پر آتی ہے" جیلے "یہ بالکل جھوٹ ہے ــ!" میں نے کہا ــ وہ بولا "میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا ہے۔ آخر یہ کیا بھید ہے ــ" میں نے اُس کو بہت سمجھایا لیکن وہ تو کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھا تھا ــ وہ میری کیا سُنے اور یہ کہے جائے ــ "وہ عورت نہیں تھی۔ ایک چھلاوہ تھی۔ خیر میرا نام بھی جرنیل سنگھ ہے۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم۔ ایک دفعہ تو اُسے نتھ پہنا کر چھوڑوں گا ــ!"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیلے پر کیا بیت گئی ہے۔ اس کے بعد سے وہ کبھی ڈاکہ ڈالنے نہ گیا ــ اس کے بعد سے جیلے نے چوری کرنی چھوڑ دی ــ اس کے بعد سے جیلا شراب بھی کبھی نہ پیتا ــ ایک صبح کو جب ہم سارے ساتھی ڈاکہ ڈال کر لوٹے تو جیلے نے اپنا گھر آباد کر لیا تھا۔ جو کھنڈر آپ ابتدا میں دیکھ کر آئے ہیں وہی جیلے کا گھر تھا۔

چھلاوہ

اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ چھلاوہ کیا ہوتا ہے تو بھئی مجھے معاف کرنا میں بھی یہ سمجھا تو نہیں سکتا لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ چھلاوہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جو چاہے تو بلی بن کر تمہیں نظر آئے اور پھر تم سے ڈر کر "میاؤں میاؤں" کرے اور پھر روپوش ہو جائے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شیر بن کر تمہارے سامنے آئے اور پل میں تمہیں چٹ کر جائے۔ ایک بات اور ہے۔ اگر کوئی چھلاوہ غلطی سے عورت کا روپ دھار لے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس عورت سے خدا ہی بچائے۔ جناب جانے یا بیلے کو سچ مچ عورت کے روپ میں چھلاوہ مل گیا تھا۔ بس جناب دن رات اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ ہمارے سامنے آتا تو اس کی تعریف

بیا کرتا۔ اس کے سامنے جیتا جاگتا آنسو بہانے جھکیاں لیا ہوگا۔ غیرتی
میں جتنی بھی [illegible] سب ۔ بچے دے ۔
[illegible] دل میں [illegible] اگر [illegible] تیری یہ محبت
[illegible] مجھے [illegible] یہ عورت تیری
[illegible] اور تجھے تباہ کرکے چھوڑے گی:

"مجھ [illegible] وہ فوراً [illegible] اٹھا۔ اس کے تن بدن میں جیسے
آگ لگ گئی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ [illegible] تھا۔ [illegible] حالت
میں جیلا شیر کی طرح گرج اٹھا تھا وہ دیکھتا ہی [illegible]
ہی ایک دم جھپٹ پڑتا تھا اور اپنے سامنے کھڑے [illegible]
ڈال دیتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ جیلے نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو
پالیا اور بڑے سکون کے ساتھ بولا۔ "تو نے ابھی اسے دیکھا ہی نہیں"
جیلانے جواب دیا: "اسے دیکھنے کی میرے دل میں کوئی آرزو
بھی نہیں۔"

وہ چپ چاپ لوٹ گیا۔ جیلے میں جو تبدیلی آگئی تھی وہ میری کچھ
سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس دن یہ بات ضرور ہوئی کہ میرے اپنے دل میں اس
عورت کو دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھی ساتھ ہی ساتھ اس عورت کے خلاف
میرے دل میں نفرت کا لاوا ابل اٹھا۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا خواہش
تھی۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم۔ میں تمہیں سولہ آنے سچی بات بتا رہا
ہوں۔ بس یہی میرے جی میں آ رہی تھی کہ ایک دفعہ وہ مل جائے تو پھر
اس سے پوچھوں کہ کتنے [illegible] ہوتے ہیں۔ وہ اگر جیلا کی تھی تو جیلے کیلئے
ہو سکتی تھی۔ میرے لئے تو وہ ایک عام عورت تھی۔

معاف کرنا میں عام چیزوں کے متعلق اپنے خیالات پہلے ہی
بتا چکا ہوں۔ شاید ایک بات میں نے تمہیں نہیں بتائی۔ جیلا اس عورت
کو لے تو آیا تھا لیکن نہ جانے اس کے دل میں کون سا چور چھپا بیٹھا تھا۔
ہر وقت اسے سات پردوں میں رکھتا۔ گھر کی چار دیواری کے باہر اسے
کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ باہر تو کیا کسی نے اس کے گھر میں بھی اس
عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ دراصل جیلے کی حرم سرا میں کوئی گیا ہی نہیں
تھا۔ ہاں مگر کبھی کبھی شام سویرے وقت بے وقت میں جب ادھر سے
گذرتا تو مجھے اس کے گھر سے جیلے کی بھری ہوئی ہلکی ہلکی آواز سنائی
دیا کرتی تھی جس میں سے وہ بڑا [illegible] جا تا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔
جیسے کسی نے آزاد جنگلی ہاتھی کو بے بس کر دیا ہو۔ اور اب وہ رسوں کے

جنگل میں جکڑا [illegible] وہ [illegible] پیاسا چیخ
رہا تھا۔ [illegible] تو اب [illegible] میں [illegible] تھا۔
[illegible]
[illegible]
مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے یہ آواز کہیں سن رکھی ہے۔ میرے کانوں
میں [illegible] لگتے تھے۔ جیسے میں [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو چکا ہوں چاندنی
رات ہو [illegible]
اور [illegible] میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے کبھی [illegible]
دور ہوتی ہے کہ میرے لئے اس کے شور شرابے کا اندازہ [illegible]
دشوار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جھنکار اتنی نزدیک سنائی دیتی ہے کہ
میں چونک اٹھتا ہوں جیسے یہ جھنکار خود میرے اندر سے اٹھ رہی ہو۔

خیر صاحب ۔ یہی بہار کے دن تھے۔ پروا چل رہی تھی
جب سندر کی ساری دھرتی جنگلی پھولوں سے ڈھک گئی تو ہم نے [illegible]
کیلئے باہر جانا چھوڑ دیا۔ پیر جی کا عرس آگیا تھا اور "چراغاں" کے میلے
کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دور و نزدیک سے لوگ آنے لگے تھے
انہی دنوں ہمارے ایک ساتھی نے بات چھیڑ دی۔ "جیلا کتنا بدنصیب
ہے ایک عورت کیلئے سارا ساتھ چھوڑ گیا۔ دیکھو تو سہی پیر جی کے مزار
پر بھی نہیں آتا۔"

"اس پر پیر جی کا قہر نازل ہوگا۔!"

"جو لوگ اس دھرتی پر پیدا ہوئے ہیں وہ پیر جی کے مزار سے
دور نہیں رہ سکتے۔"

"میں کہتا ہوں۔ جیلا آئے گا اور ضرور آئے گا۔ آج نہیں تو
کل آئے گا۔!"

اور ہوا بھی یونہی۔ دوسرے روز "چراغاں" کا میلہ
تھا۔ ان گنت لوگ آئے ہوئے تھے۔ لوگ آتے اور سجدہ کرتے۔
نذر نیاز دیتے۔ اور پھر باقی کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ میں پہلے
ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ میلہ بہت سی باتوں کے اعتبار سے نہایت ہی
شاندار ہوتا تھا۔ اس میلے میں دور و نزدیک سے اور دیش کے کونے
سے آئے بیوپاری لوگ اپنی اپنی اشیاء کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ہزاروں

سے پہلے کا کاروبار ہوتا ہے۔ کوئی کچھ خریدنے آتا ہے اور کوئی بکریاں بیچنے۔ کوئی گھر کے بنے ہوئے کھلونا لیکر آتا ہے تو دوسرا چلنے پھینے اور گڑ۔ مگر ایک بات سب میں مشترک ہے۔ سارے ایک ہی پیر کے مرید ہیں۔ سب لوگ ایک سانجھے لنگر میں بیٹھ کر بڑے پریم سے کھانا کھاتے ہیں۔ اور گھر کی نکالی ہوئی شراب جو یہاں عام بکتی ہے ضرور پیتے ہیں۔ پیر جی کے مزار پر قوالیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کلکاریاں مارتی ہوئی کوئی ٹولی ادھر آتی ہے تو دوسری ٹولی ستلج دریا کے کنارے وارث شاہ کی ہیر گانے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

خیر صاحب میلا اپنے پورے جوبن پر تھا کہ جنگل کی آگ کی طرح ایک بات سارے میلے میں پھیل گئی۔ ایک جاٹ اپنی بیوی کو ساتھ لیکر میلے میں آیا ہے۔ وہ جاٹ بڑا بانکا ہے ہاتھ میں سم چڑھی لاٹھی جو اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ لاٹھی کو اس نے تیل پلا رکھا ہے۔ اس کے گلے میں تعویز ہے۔ لمبا کرتہ اور کمر میں تہبند ہے۔ جٹی بیحد حسین تھی!

میں یہ بات سنتے ہی جان گیا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور جیلا ہی ہے۔ میں اس خبر کے لئے جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ میں اٹھا اور میلے کی طرف چل دیا۔ میں نے اُن کو دُور سے دیکھا۔ ہاں جیلا ہی تھا۔ وہی لمبا قد۔ چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط بدن۔ عورت بھی انتہائی حسین معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان سے دور ہونے کے باعث میں اُسے پہچان نہ سکا۔

وہ پہلے پیر جی کے مزار پر گئے۔ چڑھاوا چڑھایا۔ نذر نیاز دی اور واپس آ گئے۔ لوگ ان کے سامنے سے جیسے خود بخود ہٹتے جاتے تھے۔ جیلے کا رعب ہی کچھ ایسا تھا اور پھر جناب وہ گھوم پھرے میلہ دیکھنے لگے۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی اور جیلا اپنے کاندھے پہ لاٹھی رکھے اس کے نقش پا پر چل رہا تھا۔ جدھر سے وہ گذرتے لوگ ان کی طرف دیکھتے ہی رہ جاتے۔ خبر نہیں۔ یہ جیلے کے چہرہ کا جلال تھا۔ کہ اس کی ہمراہی ہوتی لاٹھی کا رعب تھا یا عورت کی صورت کا جادو۔ لوگ انہیں خود بخود راستہ دیتے جاتے اور وہ گھومتے جاتے۔ اس طرح جیسے کوئی گم کی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ سیئیے جب سارا میلہ گھوم کر باہر نکلے تو یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ وہ اُدھر آ نکلے جہاں میں کھڑا تھا۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ جیلے کے ساتھ ساتھ چلنے والی لڑکی کوئی اور نہ تھی بلکہ خود بنتو تھی۔ ہاں جی نمبرداروں کی لڑکی بنتو جس کے تم کئی قصے سن چکے ہو۔ جیلے نے میری طرف نہ دیکھا اور ہجوم سے باہر آتے ہی اپنی بھرپور آواز میں شیطان کی طرح ہنستے ہوئے گرجا۔ یوں جیسے بادل پھٹتا ہے۔ اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا۔ اُس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیئے۔ "بب! بے" کی آواز نکالی اور پھر بنتو سے مخاطب ہوا۔ "لے دیکھ لے بنتو نار! آج تک کسی ماں نے ایسا بیٹا جنم نہیں دیا جو اس جوان کے سامنے ٹھہر سکے۔ میں تجھے بھرے میلہ میں سے نکال لایا ہوں۔ سوں واہگورو دی بنتو! اگر تیری طرف کوئی آنکھ بھر کے دیکھتا تو اس کی گردن زمین پر لڑھکتی نظر آتی۔ ہا ہا۔ ہا ہا۔"

اور اس نے بنتو کو آغوش میں لے لیا۔

میں نے دیکھا کہ جیسے کسی ان جانے ڈر سے بنتو کا رنگ سرسوں کی طرح زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں سے چنگاریاں چھوٹ رہی ہوں۔ میں اور آگے بڑھا۔ بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "بنتو!" اس سے پہلے کہ جیلا اپنی لاٹھی اوپر اٹھاتا بنتو میری آغوش میں تھی۔

"اوہو — تو —" جیلا چیخ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے جیلے کی لاٹھی میری گردن میں دُور تک اتر گئی ہو جیسے میری گردن چیخ گئی ہو۔ لیکن اس کے بعد جیلا لاٹھی کا دوسرا وار نہ کر سکا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک ہی ضرب لگا کر اس کا دم ٹوٹ گیا تھا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور وہ دوڑ کر پیر جی کے مزار پر چلا گیا اور جاتے ہی یوں سجدے میں گرا کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکا —

بنتو کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں اٹھا اور میں نے بنتو کے پانچ سات ہاتھ لگا دئے۔ وہ بلبلا اٹھی اور سسکتی ہوئی بولی۔ "اس میں میرا کیا قصور ہے —" وہ مجھے اس وقت بہت ہی لاچار نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ تو مجھے مشعلوں کی طرح روشن دکھائی دے رہی تھیں اور نہ ہی ان سے تاریک راتوں کا اندھیرا جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ وہ جس انداز سے مجھے دیکھ رہی تھی اس پر مجھے پیار آ گیا۔

"بنتو!" میں نے کہا۔ اور ایک دفعہ پھر وہ میری آغوش میں تھی۔

اس کے بعد بنتو میرے یہاں رہتی رہی۔ میری مرہم پٹی کرتی رہی۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے دودھ پلاتی رہی اور میرے تلوے سہلاتی

رہی۔ وہ مجھے کہیں چھلاوہ دکھائی نہ دیں — وہ مجھے ایک سیدھی سادی اور عام عورت نظر آتی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے عام چیزوں سے چڑ ہے۔ ایک بات ہے اس کے ہوتے ہیں کبھی ڈاکہ ڈالنے نہ گیا۔ کبھی چوری نہ کی۔ یہاں تک کہ اب مجھے شراب کی ابھی نہیں لگی تھی — انہی دنوں بنتو ایک صبح کو خود مجھے سے چھوڑ کر چلی گئی — اس کے جانے کے بعد اب کئی مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوتا بنتو سچ مچ ایک چھلاوہ تھی۔ اسے پیشہ ور مجرم اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسے چور اور ڈاکوؤں سے محبت تھی۔ جو یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس سے کوئی بڑا ڈاکو بن سکے چونکہ وہ خود ایک ڈاکو تھی۔ معاف کرنا بنتو کا خیال آتے ہی پھر سینہ سلگ اٹھا ہے میرا بند بند پھڑک رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بنتو اگر مجھے کہیں اتفاق سے مل جائے تو میں اس سے پوچھوں : کتنے میں سو ہوتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی "چراغاں" کے میلہ پر میری بنتو سے ضرور مڈ بھیڑ ہوگی۔ اور اس کے ساتھ اس کا نبلغا وند بھی ضرور ہوگا۔ مجھے پیر جی کے مزار کی قسم میں ایک ہی وار میں اُسے قیمہ بنا دوں گا۔ میری باہوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ میں اب بھی اپنی آغوش میں اُٹھا کر بھرے میلے میں سے لے جاؤں گا۔

دریا

لیجئے۔ بنتو تو چلی گئی — مگر تم تو جانتے ہو کہ اس کے جاتے جاتے اس کی کئی نشانیاں میرے پاس رہ گئیں۔ بنتو کی یاد میرے سینے میں آشیانہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔ لوگ کہا کرتے —

"تیری ہک تے آلنا پایا نی گونیدے
جنگلی کبوتر نے —"

اے گونیدہ تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے آشیانہ بنالیا ہے!
لیکن — یہاں تو خود گونیدہ جنگلی کبوتر کے سینے پر آشیانہ بنائے بیٹھی ہے — نہ جانے کب سے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ستلج کی لہروں کی طرح بنتو ایک دن ہنستی کھیلتی میرے پاس آئی اور جاتے ہوئے اپنے ساتھ میرا سب کچھ بہا کر لے گئی — اگر تم نے دریاؤں کی زندگی کے متعلق سوچا ہو تو تم قیاس کر سکتے ہو کہ بنتو بھی اصل میں ایک دریا ہی تھی — اس کا معصوم بچپن شاید اس طرح ہوگا جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بوند بوند رستا ہے پاکیزہ موتیوں کی طرح درخشاں اور اُبھرتا — اور پھر وہ میرے سامنے پل پل پروان چڑھتی گئی۔ ٹپ ٹپ رستا ہوا پہاڑی چشمہ بڑھتا بڑھتا ایک دریا بن گئی۔ اس دریا میں سے لہریں اچھلتیں اور پھر روپوش ہو جاتیں اور جب کبھی ایک طوفان اٹھتا تو پانی میں ہلچل پیدا ہوتی جیسے کناروں کو نگل دے گا۔ اور جب یہ دریا پرسکون ہو جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس جیسا کوئی بھلا مانس کوئی اور نہ ہو۔ پتہ نہیں کیوں جب جب میں بنتو کے متعلق سوچتا ہوں تو وہ ایک بھرپور دریا کی طرح مجھے کبھی چنچل اور کبھی گمبھیر معلوم ہوتی ہے۔

لیجئے میں اپنی دریا جیسی بنتو کی ایک اور جھلک تمہیں دکھاتا ہوں۔ ایک صبح کو جب جیلے کی موت کے بعد میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو کہیں نظر نہیں آ رہی — ادھر ادھر جھانکا۔ اسے پکارا لیکن وہ تو جیسے روپوش ہو گئی تھی۔ اُسے ڈھونڈتا ہوا میں جیلے کی حویلی میں جا نکلا۔ میں ابھی اس کی حویلی کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ اندر سے مجھے بنتو کی دبی دبی چیخوں کی آواز سنائی دی — میں بھاگ کر اس حویلی کے اندر گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ بنتو دھرتی پر پڑی ہوئی بلک رہی ہو یوں جیسے کسی نے اس پر کاری ضرب لگائی ہو۔

"بنتو —" میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہ کہے اور مجھے دیکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی جائے — میں نے اسے پیار کیا۔ دلاسہ دیا۔ تب جا کر اس نے مجھے بتایا کہ اسے پرسوت پڑ گئی ہوئی ہے —

"جیلے کی اولاد کے لئے اس نے جیلے کی حویلی انتخاب کی ہے" — ایک۔ دم یہ بات میرے دماغ میں آئی۔ مجھے جیسے اس وقت بنتو سے نفرت ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کیا اسے جیلے کی اولاد سمیت جا کر ستلج میں بہا آؤں۔ اس نے میری آنکھوں میں نفرت کی یہ جھلک دیکھ لی تھی — وہ بولی — "اسی لئے تو میں یہاں چلی آئی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے" اور میں نے سوچا کہ واقعی اس بچاری کا کیا قصور ہے۔

اس کے بعد وہ دھرتی پر پڑی بلکتی رہی۔ کبھی چیختی تھی کبھی ہچکیاں لیتی تھی اور کبھی کبھی چپ چاپ پھیل کر لیٹ جاتی تھی — نحیف اور نڈھال ہو کر — میں اس طرح اُسے کتنی دیر تک جدوجہد کرتے دیکھتا رہا — کبھی

زندگی سے اور کبھی موت سے ـــــ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ـــ اس نے پانی مانگا اور میں پانی لانے کیلئے ستلج کے کنارے کی طرف دوڑا ـــ جب میں واپس آیا تو بنتو مال بن چکی تھی ـــ ایک میٹھی سی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ ایک صناع کی طرح جو اپنی تخلیق کے مکمل ہونے پر خوش ہوتا ہے۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے آج تک اُسے کبھی یوں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ اندازہ لگایا کہ کسی کو زندگی دینا کسی کو ہلاک کر دینے کی بہ نسبت کتنا عظیم کام ہے ـــ میں آج تک تاریکی میں رہا تھا۔ مجھے تو صرف موت ہی کا علم تھا۔ میں نے ان گنت لوگوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا لیکن بنتو کی اس مسکراہٹ نے میری تاریک راہیں جگمگا دی تھیں۔

"کسی کو مٹانے کے لئے صرف ایک پل چاہیئے" میں نے سوچا "مگر کسی کو بنانے کیلئے ایک ماں کا کلیجہ چاہیئے۔ دائرہ جتنی وسعت چاہیئے۔ کسی صناع کی صناعی چاہیئے" اور میں بہت خوش تھا ـــ

بنتو نے اپنی جیسی ایک اور بنتو کو جنم دیا۔ جنم دیا اور خود چل دی۔

دریا کی بھی یہی خاصیت ہے۔ بہتے ہوئے دریا میں سے اگر کوئی نہر نکلتی ہے تو دریا اس کے لئے رک نہیں سکتا۔ دریا کا کام آگے بڑھتے رہنا ہے۔ اور وہ مسلسل بہتا چلا جاتا ہے۔ نہر اپنے راستے پر ہو لیتی ہے کبھی تم نے دریا میں طغیانی دیکھی ہے؟۔ اس وقت اس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ کوئی رکاوٹ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس وقت دریا چڑھ کر اترتا ہے تو وہ اپنے کنارے پر منوں ریت چھوڑ جاتا ہے۔ ریت جس میں سونے کے ریزے ہوتے ہیں۔ کنکر اور پتھر ہوتے ہیں ـــ میں نے بھی اسی ریت پر اپنا محل تعمیر کیا تھا۔ اس میں میری بنتو کی نشانی کے طور پر ایک ننھی سی بنتو پرورش پا رہی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دریا اپنی پرشباب روانی میں اپنے دل کا بھید اپنے لبوں پر لے آیا ہو۔ آج میں نے بھی تمہیں اپنے اس بھید میں شریک کر لیا ہے تاکہ اس ناطے تم مجھے بھی ایک دریا کہہ سکو۔ لیکن یہ بھید میرا اپنا بھید ہے ـــ جس بھید کی میں آپ کو کہانی سنا رہا ہوں وہ جیلے اور بنتو کا مشترکہ بھید تھا۔ مگر میں بھی اس بھید میں شامل ہوں ـــ میں اُسے اپنی بنتو سمجھتا ہوں۔ وہ بنتو نہیں جو ایک ندی کی طرح میرے اور جیلے کے درمیان آکر پھیل گئی تھی۔ اور ہمیں دو کناروں کی طرح جس نے ایک دوسرے سے جُدا رکھا۔ بلکہ وہ بنتو جو نفرت کے زخموں کو اپنی محبت سے رفو کرے گی۔ آؤ میں تمہیں اپنی بنتو سے ملاؤں۔ اب میری بنتو سیانی ہو گئی ہے۔ اس کے خد و خال اپنی ماں کی طرح ہیں۔ میرے سامنے وہ پلا پل پروان چڑھ رہی ہے۔ آزاد جنگلی ہرنی کی طرح سارے علاقہ میں چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ وہ اس سارے علاقہ کی ملکہ ہے ـــ ابھی ابھی اس دریا کے کنارے پر گھروندے بنا رہی تھی ہو سکتا ہے جھاڑیوں میں تتلیاں پکڑنے چلی گئی ہو ـــ یا کہیں دریا کے کنارے بیٹھی ہوئی شاید لہریں گن رہی ہو ـــ یہ اس کا من بھاتا کھیل ہے ـــ دریا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکا کر گھنٹوں بیٹھی رہے گی۔ اصل میں وہ خود بھی تو دریا کی ایک لہر ہے۔ میں نے کئی بار اسے لہروں سے باتیں کرتے سُنا ہے۔ لہریں اس کو بہت عزیز ہیں۔ جب بھی وہ لہروں کی اس دنیا میں کھو جاتی ہے تو میں اُس سے کئی بار یہ کہتا ہوں ـــ "پگلی ـــ لہروں کا کیا بھروسہ ـــ چھوڑو انہیں ـــ ان کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا ـــ"

مگر وہ جیسے لہروں کی زبان سمجھتی ہے۔ لہریں اس کے دل کے راز کو جانتی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ اور خود لہروں کی "تل تل" کی طرح اس کی ہنسی دریا کی سطح پر پھیل جاتی ہے۔ لہریں اس کی ہنسی کو کہیں دور لے جاتی ہیں ـــ اپنے ساتھ ـــ اور وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے ـــ دور تک پانی کے بہاؤ کو۔

"پتن سے گذرا ہوا پانی لوٹ کر نہیں آتا" میں پھر اس سے کہتا ہوں کہ اور وہ اُداس ہو جاتی ہے۔

"کیا رکھا ہے سپنوں کے اس دیش میں ـــ چھوڑو انھیں ـــ آؤ چلیں پیر جی کے مزار پر۔"

شام ہو جاتی ہے اور وہ میرے ساتھ لوٹ آتی ہے۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پیر جی کے مزار پر چراغ جلاتی ہے ـــ چراغ کی لو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں جھلملا اٹھتی ہے ـــ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چاروں طرف چاندنی چھٹک گئی ہو اور اس وقت وہ مجھے بالکل مختلف نظر آتی ہے ـــ میرے سامنے اس بنتو کا چہرہ تابندہ ہو جاتا ہے جس نے اُسے جنم دیا تھا۔ اور یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور لہر سے لہر نکلتی چلی آتی ہے۔

پیر جی کے مزار پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ننھی منی بنتو

رہا ہوتا ہے تو مجھے بے حد پیاری لگتی ہے۔ پیچ ماتا میں نے ان گندہ مردوں کو اس مزار پر چڑھاتے دیکھا ہے لیکن ان کے ہاتھوں میں یہ بیٹھے سکّے اور بے رنگی نظر آتی ہے۔ لیکن بنتو کے ہاتھوں میں ایک دلکشی ادا ہو جاتی ہے — ایک حقیقت ہوتی ہے — محبت کا ایک جذبہ۔ بھتیجا جو کسی بیمار کو بھی اچھا کر کے بھی معاف کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں کسی کو دکھی دیکھ کر رحم کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ میری اس بنتو کے صدقے ایک دن ایسا آئے گا جب یہ مزار، یہ چار دیواری اور ویران چبوترے اور ٹھاکر دوارے کی پناہ گاہ نہیں بنے گا اور ایک مقدس مقام بن جائے گا۔ عورتیں بلا روک ٹوک یہاں آ جا سکیں گی — اور کیا عجب کسی روز بنتو بھی پھر کسی "چمڑا خان" کے میلے پر گھومتی ہوئی مجھ سے یہاں آ ملے۔ دریا کے دو کنارے آپس میں ملیں یا نہ ملیں۔ لیکن لہر کو لہر ضرور مل جاتی ہے۔ مجھے تو ان تمام برسوں میں دریا کی ان لہروں کی زبانی سے اپنا سندیشہ اُسے بھیجتا رہا ہوں —

• بھٹکے دلیس دو آبے — انھیاں نوں ترسیاں

• دوآبے کی سرزمیں چھوڑ کر تو آنسوؤں کو ترس جائے گی :

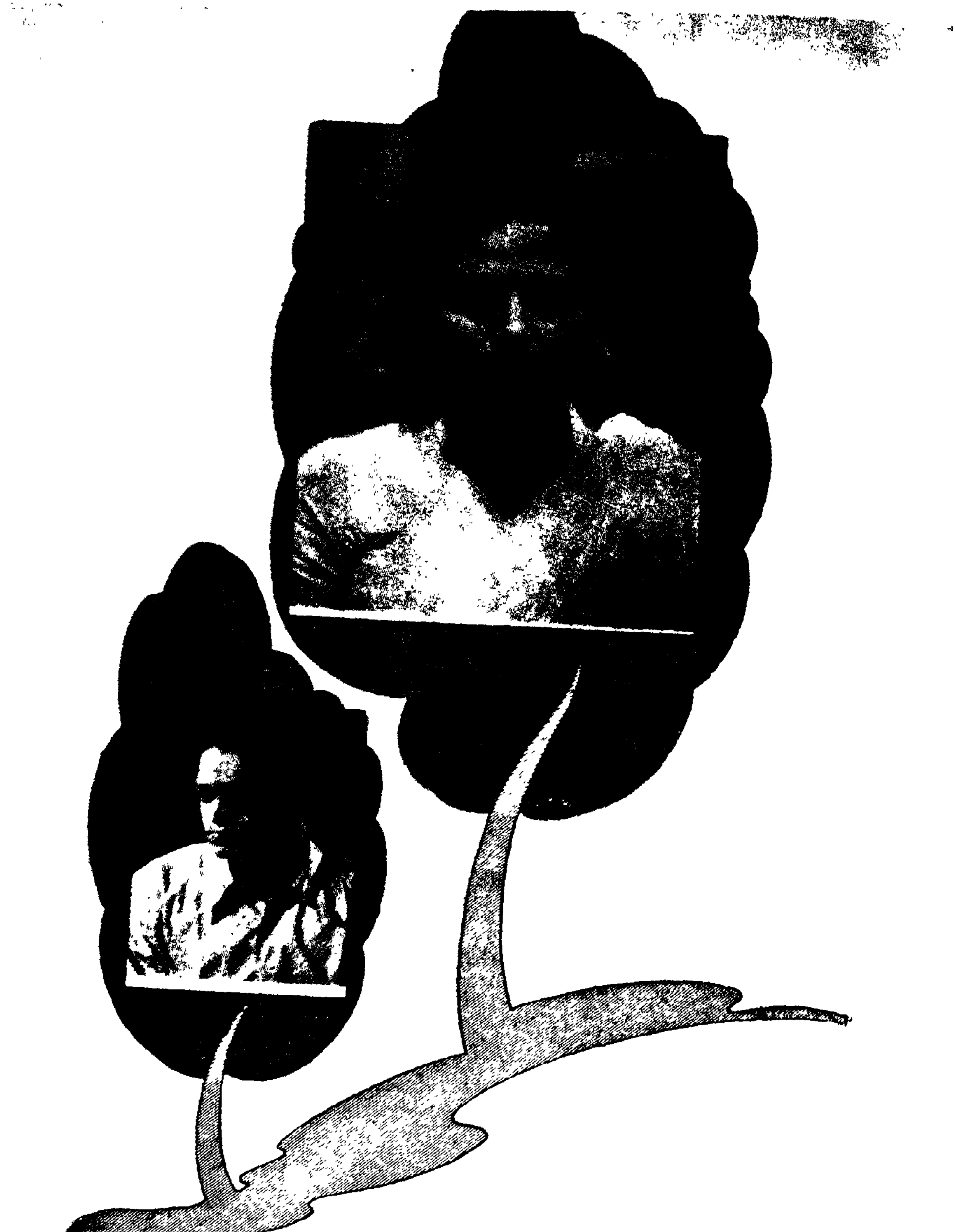
سندری اتم چندانی

سندری اتم چندانی ۲۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسکول میں تھیں جب مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۴۶ء میں "ساتھی" رسالے کی نائب مدیرہ رہیں۔ یہ رسالہ کراچی سے عورتوں کے لئے نکلتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں موصوفہ کی شادی جناب اتم سے ہوئی جو سندھی زبان کے اچھے ادیب ہی نہیں بلکہ وہاں کی ترقی پسند ادبی تحریک کے روح رواں تھے۔ اس شادی نے اُن کی ادبی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اردو، مراٹھی اور بنگالی زبانوں کے ترقی پسند مصنفین کرشن چندر، عصمت، سجاد ظہیر، تاپالو ساٹھے اور مانک بنرجی کی کہانیاں سندھی زبان میں منتقل کیں جو وہاں کے ترقی پسند رسالے "نئی دنیا" میں شائع ہوتیں۔ ۱۹۵۲ء "ممتا" کہانی پر پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسری بہترین کہانی "کوشان" پر بھی ۱۹۵۴ء میں پہلا انعام ملا۔ یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے بھی براڈکاسٹ ہوئی۔ مصنفہ نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں ۲۵ کہانیاں، تین ناٹک اور دو ناول "گرتی دیواریں" اور "پریت پرانی ریت نرالی" ناموں سے لکھیں۔ یہ دونوں ناول سندھی زبان میں بہترین مانے جاتے ہیں۔

"گرتی دیواریں" میں مصنفہ نے عورت کی اہمیت اور اس کی جدوجہد نمایاں طور پر پیش کی ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ عورت صرف بیوی ہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں اس کی جیون ساتھی ہے۔ ناولٹ کے دو اہم کردار "ریکھا" اور چندن دو متضاد خیالات کے حامی ہیں۔ ریکھا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عیش و عشرت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اور اس کی دلی خواہش یہ ہے کہ چندن صرف اس کا ہی ہو جائے۔ لیکن چندن بیوی کا ہوتے بھی ایک ایسا حساس دل رکھتا ہے جس میں ریکھا جیسی ہزاروں عورتوں، مردوں اور بچوں کے لئے بھی محبت ہے۔ زندگی کی یہ کشمکش کچھ عرصے بعد ریکھا کو مجبور کرتی ہے کہ وہ چندن کے دوش بدوش چلے۔ اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ چندن کے پاس اس کے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے ایک محبت بھرا مگر دکھی دل ہے۔

سندری کی تحریر میں دکھی جیون کی تخلیقی تصویر کشی، قوت دار کردار نگاری اور اصلاحی پہلو کے ساتھ ساتھ رنگین بیانی بھی ہے۔ یہ ناولٹ ان تمام خوبیوں کا حامل ہے۔



سندری اُتم چندانی
مترجم: دریائی لعل اجوانی

گرتی دیواریں

(۱)

دیپک نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا:۔

"پتاجی! دکان کا سارا سامان جا تا رہا اور بازار کا قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بیوپار سے سنیاس لینے کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہا۔"

گوپال داس نے اپنی ساری زندگی جائداد میں دوکان جانے میں بتادی تھی تاکہ جب دیپک قابل ہوگا تو دکان اس کے ہاتھوں میں سونپ کر باقی زندگی اپنے دیس میں چین سے گذاریں گے مگر دیپک نے پانچ سال میں ہی دکان چوپٹ کر دی۔ دیپک کے بھاگ جانے کی اطلاع جب حیدرآباد (سندھ) پہنچی تو اس ہرے بھرے گھر کا نصیب ڈوبنے کی راہ پر ڈھلک رہا تھا۔

گوپال داس ویسے تو اتنے معمر نہیں تھے مگر اس واقعے نے کی کمر توڑ کر رکھدی اور وہ اتنے نحیف ہوگئے کہ اُٹھنے کے لئے کمر پہ ہاتھ رکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ زیادہ باتیں کرتے تو کھانسی کا دورہ پڑنے لگتا۔ چوٹ بھی کوئی معمولی چوٹ نہیں تھی ان کی ساری جائیداد بک گئی۔ اس جائیداد کے بل بوتے پر ہی تو انھوں نے ریکھا کی بیس برس تک لاڈ پیار سے پرورش کی تھی اور پندرہ ہزار روپے اپنی بڑی لڑکی کے جہیز میں دے کر اُسے چار سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ہونہار شوہر کے ہاتھ سونپا تھا۔

گوپال داس اب کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے جو رشتے دار انکے گھر میں ڈیرا ڈالے پڑے رہتے تھے اب بڑے بڑے تیوہاروں پر بھی مشکل سے بلائے جاتے۔ دوستوں کے گھر میں آنا جانا بند ہو چکا تھا۔ جب وہ اکیلے ہوتے تو اپنے ننھے پوتے کو گود میں لیکر کہتے "بیٹے جب دانہ ہی ختم ہوگیا تو پنچھی کیوں آئیں گے؟ چلو ہم دونوں کھیل کر من بہلائیں۔"

بچہ پوچھ بیٹھتا "دادا، میرے ساتھ کھیلنے کے لئے میرے پتاجی کب آئیں گے؟"

پوتے کا یہ سوال سن کر اُن کا دل بھر آتا اور دُکھ کی گھٹائیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ کہتے ــــ

"جب اُس کی سمجھ میں آجائے گی۔ تبھی آئے گا بیٹے۔"

اُن کا دل تڑپ اُٹھتا۔ آخر اس بچے نے کیا گناہ کیا ہے؟ ماں کے پیار سے تو بچپن میں ہی محروم ہو گیا تھا اور زمونی پرائے جال میں پھنسا پڑا ہے۔"

ریکھا کی ماں جب کبھی دیپک کی تصویر دیکھتی اُسے ایسا محسوس ہوتا گویا اُس کی آنکھوں کی روشنی بجھتی جا رہی ہے۔ ریکھا جب اپنے کمرے میں بیٹھی، بینا کے تار چھیڑتے ہوئے درد بھری آواز میں کوئی گیت گاتی تو گوپال داس کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ ریکھا کی ماں آنسو بہانے لگتی۔ گوپال داس کہتے۔ اگر ریکھا کے نصیب میں سکھ لکھا ہوتا تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ تب اسے ایسا شوہر دیکر دیتا کہ ساری دُنیا اُس پر رشک کرتی رہ جاتی۔

اور تب اچانک غدر کی ایک آندھی آئی۔ دیس کے بٹوارے کی بھیانک آندھی۔

پہلے تو لوگ سہم گئے پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد کی گلیاں سونی ہونے لگیں۔ ریکھا کی ماں کہنے لگیں ـــــ "پہلے جب مہاماری آتی تھی تب بھی لوگ ایسے نہیں بھاگتے تھے۔ اب ایسا کیا ہوگیا کہ لوگ اپنی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ کر بھاگے جا رہے ہیں؟"

گوپال داس اُسے اخبار پڑھکر سُناتے کہ کس طرح لاہور میں مال اسباب اور انسانوں کی تباہی اور دوشیزاؤں کی لوٹ بھی ہوئی ہے۔

اور پھر والدین کی نگاہیں ریکھا کے خوبصورت سڈول جسم پر جا کر ٹک جاتیں اور اُن کا دل کسی خوفناک تصور سے کانپ اُٹھتا جب ریکھا ابھی بچی تھی اور ماں کے ساتھ باہر نکلتی تو لوگ کہتے "یہ لڑکی تو تم نے دودھ اور گھی میں مل کر پیدا کی ہے۔"

بیٹی کی خوبصورتی کے متعلق تعریف سن کر رکمنی خوشی اور فخر سے پھول جاتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ اس کومل بچی کو گرم ہوا نہ لگے۔

ایک دن گوپال داس کی بہن نے آ کر کہا "بھیا، بیوپار میں بھاری نقصان اُٹھانے پر بھی آپ کے پاس اتنا کچھ باقی ہے کہ مشکل پڑنے پر آسانی سے پاکستان چھوڑ سکتے ہیں۔ پرماتما کی مہربانی سے آپ پر کسی کا قرض بھی نہیں ہے مگر میرے پاس تو سو دو سو روپے بھی نہیں کہ لڑکیوں کو لیکر کہیں جا سکوں۔"

گوپال داس بولے۔ "بہن ایسا نہ کہو۔ تمہاری لڑکیاں تو ابھی چھوٹی ہیں جس کے گھر میں سیانی لڑکی ہے وہی سب سے بڑا قرضدار ہے اگر ریکھا کے لئے دس ہزار بھی بچ رہتے تو اس جھگڑے میں بھلا اس بوجھ کو سر پر لادے پھرتا ہے تاہم دل کا کنجوس نہیں ہوں وقت آنے پر سو دو سو دینے سے نہیں چوکوں گا۔"

بہن نے سر جھکا لیا اور بولی —— "بھیا، بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو بہن۔ تم بھی میرے لئے ریکھا سے کم نہیں ہو۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"تو پھر ریکھا کی سگائی میری دیورانی کے بھتیجے کے ساتھ کر دو۔ لڑکا تین تین کالج پڑھا ہے اور کماتا بھی ہے لین دین کی کھینچا تانی بھی نہ ہوگی۔ بڑی بہو میکے چلی گئی ہے۔ کام کاج میں ہاتھ بٹانے والی کوئی نہیں ہے۔"

بہن چلی گئی تو ریکھا کی ماں نے گلا پھاڑ کر اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ ایسے کنگال گھر میں اپنی لڑکی کبھی نہیں بیاہے گی۔

شہر خالی ہوتا رہا۔

گوپال داس اخبار پڑھ پڑھ کر ریکھا کی ماں کو سمجھاتے رہے کہ کس طرح انگریز ایک ضدی بچے کی مانند، جو کھلونے کو اپنے پاس نہ رکھ سکنے کی حالت میں توڑ ڈالتا ہے، اس وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تباہی کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔

ملک بھر میں سنسنی پھیل گئی تھی سندھ کے گاؤں میں ہر رات سینکڑوں شادیاں ہونے لگی تھیں۔ لوگ لڑکیوں کو بوجھ سمجھ کر دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کی دوڑ میں گویا ایک دوسرے سے بازی جیتنے کی فکر میں حواس باختہ ہو رہے تھے۔

ایک روز پڑوس سے لوٹ کر آنے پر رکمنی سیدھے پتی کے کمرے میں جا کر بولی۔

"اب تو میرا دل بیٹھتا جا رہا ہے۔ سبھی یہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم جوان کنواری لڑکی کو لے کر کہاں کہاں بھٹکیں گے؟"

گوپال داس نے کہا "پگلی گھبرا کیوں رہی ہے، یوں رونے سسکنے سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تم سے یہ تو ہوتا نہیں کہ اُس کے لئے کسی گھر۔ ور کی تلاش کرو۔ بہن والی بات بھی تجھے پسند نہیں۔"

"آپ کا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہے۔ اور بھی تو کئی گھر ہیں۔ اُن کی کوئی پوچھتا تک نہیں بس اسی کی رٹ جاری ہے۔ ہر وقت دیدی والی سگائی۔ میں کہتی ہوں آپ کو سیتل داس کے گھر کا خیال کیوں نہیں آتا؟"

"لیکن، — چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گوپال داس نے کہا۔ "سیتل داس کو چاہیں۔ تیس ہزار روپے، یہاں گانٹھ میں بیس سو بھی نہیں، چلی ہے ہاتھیوں کے ساتھ گنا کھانے۔"

"روپے تو بہت تھے مگر انہیں ختم ہونے کونسی دیر لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ لڑکی کا بوجھ اُتارنے کے قابل نہیں رہے۔"

رکمنی دن بھر آنکھوں سے آنسو بہاتی رہی رات کو وہ دل میں چھپے ہوئے نشتر کو برداشت نہ کر کے شوہر سے بولی "اگر دیدی کی بات مان لیں تو ریکھا بُرا تو نہیں مانے گی؟"

"جا کر ریکھا سے پوچھ لو۔"

گوپال داس کے ہاتھوں پر گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں ٹپکیں چونک کر بولے "ارے پگلی روتی ہے؟ اگر ریکھا کا نصیب اچھا ہوگا تو اُس کا ستارہ ضرور چمکے گا۔"

"— مگر ریکھا کیا کہے گی؟" بھاری آواز میں ریکھا کی ماں بولی۔ "پھولوں میں پال پوس کر کانٹوں میں کیسے پھینک دیں؟"

"ہاں، میں کچھ نہ کہوں گی۔"

گوپال داس کے ماتھے پر گرم گرم آنسوؤں کی بوندیں ٹپکیں۔ بلک کر بولے

ریکھا نے ہمت باندھ کر جو اب تک دبا رکھا تھا مگر اب وہ ڈگمگا کر وہیں ٹک نہ سکی اور کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ شادی کی ساری تیاریاں جلدی جلدی ہونے لگیں۔ اس دن جیسے ہی ریکھا کی آنکھ کھلی اسے محسوس ہوا کہ سارا سنسان جگمگا رہا ہے جو کچھ وہ رات بھر سوچتی رہی تھی اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تو پانی میں تیرتے ہوئے پھولوں کی طرح اس کے دل کے تالاب میں ایک ہی بات تیرنے لگی ———

——— آج میری شادی ہے ———"

اس نے سوچا، آج تک میری زندگی کی ناؤ بھٹکتی رہی ہے اب کنارہ سامنے ہے۔

اتنے میں اندرا، شیلا اور گوپی تینوں رشتے کی بہنیں اس کے سرہانے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہنسی مذاق سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔ ایک دوسرے کو چٹکی کاٹتے ہوئے وہ ریکھا سے مذاق کرنے لگیں۔

ایک نے مسکرا کے کہا۔ "دیدی نے آج رات بڑا سہانا سپنا دیکھا ہوگا"

دوسری بولی۔ "ذرا دیر سے اٹھی، آج تو ساری رات جاگنا پڑے گا"

تیسری الہڑ اور پیار میں مینگ ملانے کی خاطر بولی "ارے ایک آدھ رات ہی کیا اب تو نجانے کتنی راتیں جاگ کر گزارنی ہوں گی۔ ان ساری راتوں کے لئے آج ہی نیند پوری کر لینی کیا؟"

ریکھا شرمائی، مسکرائی، ہنسی، جھینپی، بہنوں کی چٹکیوں کو سہتی چوکے تک جا پہنچی، چہرے سے لاج اور مسکان کی لالی دھونے کے لئے گلاس میں پانی لے کر دھونے لگی۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے اندر جھانکا تو اس کی ماں، میری بہن اور شیلا آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

ریکھا کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر ریکھا کو کچھ کھٹک سا ہوا۔ ان کے اترے ہوئے چہرے دل میں نیزے کی مانند چبھنے لگے۔ وہ چاچا کے کمرے کے پردے سے ہٹ کر گزری تو دیکھا، اس کی ماں کرسی پر بیٹھی شوہر سے باتیں کر رہی تھی۔ ریکھا کو دیکھتے ہی دونوں چپ ہو گئے۔ ریکھا نے اندر جا کر دیکھا دونوں کے چہرے پر غم کے اندھیرے کا سایہ پڑا ہوا تھا، اس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ ضرور کوئی بری بات ہوئی ہے۔

مگر ایسا بھی کیا راز ہے جو اس سے چھپایا جا رہا ہے؟

دوسرا کمرہ بھی، جو ابھی تک ہنسی مذاق سے گونج رہا تھا، یکایک شمشان گھاٹ بن گیا۔ ریکھا وہاں پہنچی سب غور سے چاچی کی بات سن رہی تھیں۔ ریکھا وہاں پہنچی تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کمرے میں اتنی عورتیں موجود ہونے کے باوجود ریکھا کو بھیانک سناٹے کا احساس ہوا وہ سوچنے لگی۔ کہاں جاؤں، کیا کروں؟ یہ سب میری طرف ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ اور دیکھ کر اپنا منہ کیوں موڑ لیتی ہیں؟

اس نے چاہا سب کا دامن کھینچ کھینچ کر پوچھے کہ اس نے کیا گناہ کیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں گئی، رکمنی تکیے کی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی یہ دیکھ کر ریکھا کے دل کی رفتار رک سی گئی۔ جب ماں کو اس وقت گھر بھر میں دوڑ دوڑ کر سب کے کھانے پینے کی فکر کرنی چاہئے اس وقت اس حالت میں کیوں؟ وہ رہ رہ کر ہوا میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا... کیوں؟ کیوں؟ اور کیوں؟—

ایک انجانے خوف کے تصور سے اس کے منہ سے چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ وہ دوڑ کر ماں کی گود میں جا گری۔ سسکتے ہوئے اس نے پوچھا "ماں، آپ سب لوگ اس طرح چپ کیوں ہیں؟

رکمنی، ریکھا کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہلاتے ہوئے بولی "یونہی بیٹی، کوئی خاص بات نہیں ہے"

"میری قسم! اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے ریکھا نے پوچھا۔

رکمنی کا دل پسیج گیا۔ بولی ... رات کو ایک بری خبر سنی ہے"

"کیا سنا ہے؟ ایسی کونسی بری بات سنی ہے ماں؟" ریکھا بے صبر ہو کر بولی۔ اس نے ماں کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔

ماں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "رات کو تمہارے پتا جی کے پاس چودھری رام پرشاد تھا وہ تمہاری جیٹھانی کا رشتہ دار ہے وہ کہتا تھا چندن شکل سے اتنی روپیہ ماہوار کماتا ہے، مگر میاں اتنی

مفلسی ہے کہ بڑی بہو کھانے پینے کی تنگی کی وجہ سے اپنے میکے چلی گئی ہے۔"

ریکھا کچھ دیر خاموش رہی پھر چنچل بچے کی مانند مسکرا کر بولی —
"بھلا اس میں ایسی کیا بڑی بات ہے ماں جو سارے گھر میں اُداسی چھا گئی ہے؟"

بیٹی کی معصوم نگاہوں میں جھانکتے ہوئے رکمنی بولی: "میں نے تمھیں پھول کی طرح پالا پوسا۔ اب تمھیں ایسے کنگال گھر میں کیسے جانے دوں؟ میں تو پہلے ہی انکار کر رہی تھی۔"

ریکھا چونک اٹھی گوپال داس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بیوی کے آخری الفاظ سن لیے تھے۔ بولے "پگلی۔ تو کیا شادی کے دن سگائی توڑنے کا خیال ہے؟ اب تو وچن دے دیا سو دے دیا۔"

"بہو بیٹیوں والے گھر میں لڑکی جا رہی ہے، بھوکوں نہیں مرے گی۔ جو کچھ نصیب میں لکھا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ ہم بھی تو مجبور ہیں۔ . . اچھے بَر، خوش حال خاندان بنا جہیز کے کہاں ملتے ہیں؟"

رکمنی خاموش رہی۔ دل ہی دل میں کہا "یہ مجبوری اور بے بسی ہی تو سب سے بڑا دکھ ہے۔"

ریکھا چپ چاپ باہر چلی گئی۔ سوچنے لگی۔ ابتک ماتا پتا نے مجھے پالا پوسا ہے اب میرا یہ فرض ہے کہ میں اُن کا بوجھ ہلکا کردوں۔

دوپہر کے کھانے تک ہری رام والی بات تقریباً سبھی بھول چکے تھے، صرف رکمنی ہی اس فکر میں گھلتی رہی تھی۔ بار بار اُسے چکر سا آجاتا تھا۔ ریکھا کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ جو اونچے درجے کے رہن سہن میں، ذرا سی کمی بھی برداشت نہیں کرتی تھی، ایسی غریبی میں بھلا کس طرح گذار سکے گی؟ . . . . . اس خیال سے وہ رہ رہ کر اُداس ہو جاتی۔ جب کبھی ریکھا ماں کی یاس اور ممتا بھری نگاہ دیکھ لیتی، اُس کے دل کی مینا پر بجتے ہوئے لگن کے سہانے گیت خاموش ہو جاتے تھے مگر پھر گھر کے شور و غل، سہیلیوں کے ہنسی مذاق اور کھل کھلاہٹ کے درمیان وہ سب کچھ بھول جاتی۔

گھر کے رسم و رواج کے خلاف کام کرنا رکمنی کے بس کی بات نہیں تھی، گو ناک خالی بھرتے ہوئے بھی، اُس نے رشتے داروں کو بلا کر گھر بھر لیا تھا۔ دن بھر نئی نویلی دوشیزائیں ریکھا کو چاروں طرف سے گھیرے رہتیں اور اپنے اپنے مدھر تجربے سنا کر اس کے جذبات کو اُکساتی رہتیں۔

۲

سہاگ رات کو ریکھا نے جو کچھ دیکھا، اُسے الفاظ کی شکل دے کر دل کے ایک کونے میں محفوظ کر لیا کہ "چندن کے پاس میرے جذبات کو سمجھنے والا دل نہیں ہے۔"

بات معمولی تھی۔ چندن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آؤ۔ چارپائی پر آکر سو جاؤ۔"

ریکھا نے انکار کیا۔ "نہیں، میں الگ چارپائی پر سوؤں گی۔" اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

چندن اُداس ہو کر بولا . . "بدنصیب، اس کمرے میں دوسری چارپائی رکھنے کی جگہ ہی کہاں ہے۔"

ریکھا شوہر کی اس صاف گوئی پر حیران سی رہ گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ اُس کا دولہا اُس کی بل کھاتی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنی چارپائی پر لٹائے گا، پھر ہنس ہنس کر کہے گا: "رانی، کہیں میاں بیوی بھی الگ الگ سوتے ہیں۔" اور بوسوں سے اُسکا مکھڑا کمل اُٹھے گا۔ مگر ریکھا کا تصور صرف تصور ہی رہا۔ وہ آہستہ سے کرسی پر سے اُٹھ کر بستر پر جا لیٹی۔

اُس رات میاں بیوی میں بہت باتیں ہوئیں۔ باتوں ہی باتوں میں زندگی کے مقصد پر خیالات کی لے دے ہونے لگی۔ ریکھا نے کہا "میرے لئے، میرے خیال میں، پتی پتنی کا باہمی پریم ہی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔"

چندن بولا: "میں تو دیش واسیوں کی سیوا کرنا ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتا ہوں۔"

یہ بات ریکھا کے گلے میں نہ اُتری۔ بولی، "دوسروں کی اُلجھنوں سے ہمیں سروکار؟ دوسروں کی زندگی سے ہمیں کیا تعلق؟ یہ بڑی بڑی آدرش کی باتیں مجھے نہیں بھاتیں۔" اور اچانک ریکھا کو اپنے چاروں طرف بازوؤں کا بندھن ڈھیلا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اُسکا دل زخمی ہو گیا۔ کچھ دیر تک دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور نہ ہی پھر بازوؤں کا بندھن کسا۔ آہستہ آہستہ پتی کی باہوں سے آزاد ہو کر ریکھا کروٹ بدل کر سو گئی۔

صبح جب وہ اٹھی تب اُسے ایسا لگا گویا رات بھر وہ بُرے سپنے دیکھتی رہی ہو۔ اُسے اپنے سارے بدن میں درد سا محسوس ہوا۔ کھڑکی سے پر سورج کی سنہری کرنوں کو اپنے سہاگ سندور میں چمکتے دیکھ کر بھی وہ خوش نہ ہو سکی۔

بڑے دھیان سے اپنے نئے گھر کی چھت اور دیواروں کو دیکھنے لگی ہر طرف ایک عجیب اُداسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ریکھا نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بیس سالہ سانولی لڑکی ہاتھ میں برش لیے ادھر سے جا رہی تھی۔ اُس نے ریکھا کو نکلتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لیے چھجے میں جا بیٹھی۔ دونوں مسکرانے لگیں مگر دونوں کے دل ساون کی گھٹاؤں سے گھرے آسمان کی طرح برسنا چاہتے تھے۔ کملا سوچ رہی تھی۔ کاش میں بھی اسی طرح کسی کے آغوش سے نکل کر آفتاب کی نئی کرنوں میں اس کائنات کو دیکھتی اور ریکھا سوچ رہی تھی کہ دنیا بیتی رات کو بھول جائے اور میں اپنے پچھلے سنسار میں لوٹ جاؤں!

مگر دونوں بے بس تھیں۔ ایک کا باپ غریب تھا، دوسری شادی کے بندھن میں جکڑ چکی تھی۔ دل بھاری ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر دونوں ہنس رہی تھیں۔

تین دن کے اندر ہی ریکھا اور کملا ایک دوسرے کو بڑی طرح چاہنے لگیں مگر اُن کی یہ محبت دونوں کے لئے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ چوتھے دن کملا نے ریکھا کی ساس سے کہا۔ "پھوپھی، آج بھیا مجھے لینے ضرور آئیں گے!"

اور سچ مچ ہی کملا اُسی روز اپنے گھر چلی گئی۔

ریکھا کی جیٹھانی اُس دن دوپہر کو ہی جھگڑ کر میکے چلی گئی تھی۔ ایسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گلاب (جیٹھ) کی ماں دھوپ میں گیہوں چھان رہی تھیں، ساتھ ساتھ اپنے بوڑھے جسم کو دھوپ میں گرما بھی رہی تھیں۔

اگرچہ سردی زیادہ نہ تھی پھر بھی گلاب کی بیوی دھوپ میں گرم پانی سے اپنے بچے کو نہلا رہی تھی، اتفاق سے پانی کی کچھ بوندیں چھٹک کر گیہوں میں جا گریں۔ گلاب کی ماں نے کہا: "دیوی ذرا ہٹ کر بچے پر پانی ڈال، سردی تو اتنی زیادہ نہیں ہے جو دھوپ میں گرم پانی سے نہلا رہی ہو۔"

بڑی بہو جلتی بھنتی بولی: "ماں جی، پھر آپ کو کیوں سردی لگ رہی ہے جو دھوپ میں بیٹھی گیہوں چھان رہی ہیں؟ کیا صرف بچے کے لئے ہی سردی کہی ہے؟"

اُسی وقت ریکھا نئے بھڑکیلے لباس میں ساس سے میکے جانے کے لئے چھٹی مانگنے آئی۔ دیوی اپنی جلن میں جل رہی تھی اُسے یہ معلوم نہ ہوا کہ ریکھا پیچھے کھڑی ہے۔ جان بوجھ کر اُس نے سارا پانی بچے پر اُنڈیل دیا۔ ریکھا کی ساڑھی پر پانی کی کچھ بوندیں جا پڑیں۔ اُسے گھر میں آئے ابھی تین ہی دن تو ہوئے تھے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر اُسکا چہرہ ضرور اُتر گیا۔

ساس سر اٹھا کر بولی: "ہاں ہاں، جاؤ چھوٹی بہو، بھگوان تمھیں خوش رکھے!"

ریکھا تو چلی گئی مگر بڑھیا خاموش نہ رہی۔ بولیں۔ "بیچاری کتنی بھلی لڑکی ہے نئی ساڑھی خراب ہو گئی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔"

بڑی بہو کے سینے میں گویا تیر سا چبھ گیا۔ چار دن سے لگاتار ساس ریکھا کے روپ اور گُن کی تعریف کرتی آ رہی تھیں جیسے ہر بات میں دونوں کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ بڑی بہو بولی

"ہاں جی، دوسری تو تمھارے ساتھ جھگڑتی ہے نہ؟"

بڑھیا اُڑتی چڑیا کو پہچاننے والی تھیں۔ بولیں۔

"میں نے تمھیں تھوڑے ہی کہا۔ گیہوں بھی بگڑے؟ بیچاری کی ساڑھی خراب ہو گئی، دُکھ نہیں ہو گا؟"

"دُکھ نہیں ہو گا!" ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دیوی بولیں۔ "جو گھر میں کچھ لائے گی وہی کچھ بول سکے گی۔ جو لائے گی ہی کچھ نہیں وہ بولے گی کیا؟"

ساس بولیں: "تم لین دین کی باتیں نکالنے والی کون ہوتی ہو؟ بھگوان نے میرے چندن کے نصیب میں جو کچھ لکھا ہو گا وہ اُسے دے گا ہی!"

دیوی نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے کہا: "جانتی ہوں، مجھے دیکھتے ہی انکے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے! میں تو آ ہی نہیں رہی تھی۔ پہلے آپ کے ساتھ نہیں رہی ہوں کیا؟ بڑے شکوے دیتے ہیں؟ کہتی تھیں، شادی میں چل کر ہماری عزت رکھ لو۔ اب شادی ہو گئی نہ۔ اب مجھے کیوں رہنے دینے لگیں۔ اماں نے بہتیرا سمجھایا، سُندر کے باپ ہی آ کر تیری خبر لیں گے!" مگر میں نہ مانی۔ چل سُندر اپنے کپڑے

لے آ، تیری ننھیال چلیں گے۔"

شام کو جب ریکھا میکے سے گھر لوٹی تو دیوی گھر میں نہ تھی چندن نے انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا: "ماں، بھابھی اتنی جلدی کیوں چلی گئیں؟"

ماں نے سارا واقعہ لفظ بہ لفظ سُنا دیا۔ پھر بولیں: "نجانے کہاں سے یہ ڈائن میرے گلاب کے گلے آ پڑی۔"

"بھیا کو اس بھابھی کی ضرورت تھوڑے ہی تھی، اُسے تو پانچ ہزار روپے چاہیئے تھے۔"

"بیٹے، اس میں اُس بیچارے کا کیا قصور؟ اُن پانچ کو پچاس بنانے کے لیئے ہی تو وہ سمندر پار گیا ہے۔ آج کل روپے کو روپا ہی کھینچتا ہے ورنہ اس کالی کلوٹی کو گھر کیوں لاتا؟ آج بھی اُس سے جو کچھ ہوتا ہے بھیجتا رہتا ہے۔"

ریکھا نے کھانا پروستے ہوئے یہ سب کچھ سُن لیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ قیاس کر لیا تھا کہ گلاب ضرور کوئی بُرا آدمی ہوگا۔ جس نے روپوں کے لئے شادی کی ہے مگر جب اُس کی تصویر کی طرف آنکھیں اُٹھا کر باتیں کرنے لگیں تو وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ خوبصورت چہرہ، مسکرانے کے لئے تیار، ریکھا تصویر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اتنے میں چندن بولا: "ماں تم پانچ منٹ میں ہی دُنیا بھر کی باتیں بتا دیتی ہو۔"

"اب بھی گھر گرہستی کی طرف توجہ نہیں دو گے تو کب دو گے؟ تمہارے ایسے خیالات کی وجہ سے تو میں نے تمھیں شادی بیاہ کے بندھن میں باندھا ہے۔"

چندن ٹھنڈی سانس لیکر، کپڑے بدلنے کے لیئے جاتے ہوئے کہتا گیا۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے خیالات کی قربانی دینے کے لئے ہی مجھے بیاہ کروا رہی ہو تو میں ہرگز شادی نہ کرتا۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا لیکن ... خیر، میرے بجائے تمھاری گھر گرہستی میں چاہ لینے والی ایک تو مل گئی۔"

ریکھا تعجب بھری نگاہوں سے پتی کی طرف دیکھتی رہی، تب تک جب تک اس کے ساتھ جلتی ہوئی پرچھائیں بڑی ہوتے ہوئے اُس سے پہلے ہی کمرے میں غائب نہ ہو گئی۔

کھانے کی تھالیوں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر ریکھا سوچنے لگی کہ بیکن دن میں جیسے زمانہ ہی بدل گیا ہو۔ اس گھر میں اور اُس گھر میں کتنا فرق ہے؟ وہ گھر بلندی کی چوٹی سے گزر رہا تھا جبکہ یہ گھر نیچی گھاٹی میں کھڑا ہو کر بھی اوپر اُٹھنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ خواب تو پہلا گھر بھی کچھ کم نہیں دیکھتا تھا مگر دونوں کے سپنوں میں بڑا فرق ہے اس گھر کے سپنوں میں طلوع آفتاب کی سُرخی اور اُمیدوں کی کرنیں ہیں۔ ریکھا کی ساس سوچتی رہتی ہے میرے سبھی بیٹے کمائیں گے۔ میں نوکر رکھوں گی میرے گھر میں چاندی کے برتن اور چینی کے چائے کے سیٹ چمکتے نظر آئیں گے۔ مگر مورت جیسی بھیا کی بہو اسی بھی اس گھر میں بہت ہے۔

چندن کپڑے بدل کر کرسی پر آ بیٹھا۔ تو ماں بولی: "چندن، اب پاکستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ پاس پڑوس میں گنتی کے چند گھر ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔

چندن نجانے کن خیالات میں گم تھا۔

ماں پھر بولی: "ایسی پھول سی خوبصورت بہو لا کر دی پھر نجانے کیوں اتنے اُداس رہتے ہو؟"

چندن کی آنکھیں ایک بار ریکھا کے گلابی چہرے کی طرف اُٹھیں۔ پھر اُس نے ماں سے کہا۔

"ماں، اگر خوبصورت پھول میں خوشبو نہ ہو تو اُس کے پانے میں کونسی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟"

ماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چندن نے پھر کہا۔ اس دیش کو چھوڑنے کے لئے میرا جی نہیں کرتا۔ ماں! یہاں اتنی روپے کی نوکری بھی ہے اور رہنے کے لئے مکان بھی۔ اگر بزرگوں کا مکان چھوڑا تو مکان اور نوکری کے لئے بھٹکنا پڑے گا۔"

ماں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اپنی پونجی کا دھیان آتے ہی وہ چُپ رہ گئی۔

کھانا کھا کر سبھی اُٹھ گئے۔ ریکھا اپنے لئے اور کوئی جگہ نہ دیکھ کر ساس کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتی تھیں تو وہ اپنے ٹھکرائی ہوئی عزت کو دل سے لگا کر کروٹ بدل کر سو جاتی تھی صبح چوکے میں ہی ہوتی

سی کر چندن نوکری پر چلا جاتا تھا۔ گھر میں اکیلی ریکھا ساس اور اپنے دو چھوٹے دیوروں کے لئے کھلونا بن جاتی۔ چھوٹے گوپ اور شیام ریکھا کے گورے گورے مکھڑے کو بڑے چاؤ سے دیکھتے تھے۔ مگر ریشمی کپڑوں میں سمٹی ہوئی نئی دلہن کبھی کبھار ہی اپنی خوابوں کی دنیا سے آزاد ہو کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں اوپر اٹھاتی۔ اس وقت گوپ اور شیام تالیاں بجاتے ہوئے بہن جی، ماں جی کرتے ہوئے پلنگ کے پاس جا ماں سے لپٹ جاتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد چوکے سے باہر نکل کر کسی چارپائی کے پیچھے چھپ کر، ریکھا کے خوبصورت جسم کو دیکھتے رہتے تھے۔ ریکھا کی کالی کالی آنکھیں اوپر اٹھنے پر بچوں کے تن بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ ریکھا سوچتی، کاش اس کے حسن کا جادو چندن پر بھی ہو جاتا!

ریکھا ساس کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ گلاب کی ماں پہلے تو اسے بڑے لاڈ پیار سے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ صرف کھانا بنانے کے وقت ایک آدھ چھوٹا موٹا کام کرا لیتی مگر دھیرے دھیرے ریکھا کے روپ کا جادو کم ہونے لگا۔ وہ ڈرپوک ہرنی نہ لگ کر دوڑتی پھاندتی لومڑی سی لگنے لگی۔ اس نے جلدی ہی گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا شروع کر دیا۔ باورچی خانے میں رکھے اناج کے پیپے اور مسالے کی شیشیاں ریکھا کے ہاتھ لگنے سے جگ مگا اٹھیں۔ گھر کی تمام اشیا کہاں کہاں رکھی جانی چاہئیں۔ وہ کہاں اچھی لگیں گی اس کام میں ریکھا ساس سے بازی مارتی ہوئی جان پڑی۔ یہاں تک کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے، اس بارے میں گلاب کی ماں کو ریکھا سے ہی پوچھنا پڑتا۔ اب ساس ریکھا کی سمجھدار آنکھوں، سڈول بدن چمکدار رنگ اور پھڑکتے ہوئے کپڑوں میں سمٹے ہوئے حسن کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ریکھا سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی سی دکھائی دیتی رہی اور چپ چاپ مطمئن پالتو پرندے کی طرح کودتی پھاندتی رہی۔ انجانے میں کبھی منہ سے آہ نکل جاتی تو گوپ اور شیام گلے لگا کر من کو ڈھارس دے دیتے تھے!

ایک دن سونے سے پہلے گلاب کی ماں نے ریکھا کو اپنے پاس بٹھا کر چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا "گنگو کی ماں کے گھر گھڑوں پڑھا لکھا بھی نہ تھا لیکن بہوئیں ایسی ملیں کہ جہیز میں سات سات پیٹیاں اور ڈھیر سارے گہنے لیکر آئیں۔ آج تو گنگو کی ماں کا پاؤں دھرتی پر نہیں پڑتا۔ ولایت میں دکانیں کھول لیں اور دو نوکر رکھ لیے ہیں۔"

ریکھا ساس کے پاؤں دباتی ہوئی مسکراتی رہی۔ دل میں کوئی ناراض ہو کر کہہ رہا تھا۔ گنگو کی ماں کو میری جیسی خوبصورت بہوئیں تھوڑے ہی ملی ہیں۔ اگر حسن کی قدر ہو تو اس کی قیمت لگائی جائے ورنہ خوبصورتی کی قیمت ہی کیا؟

ریکھا کے چہرے پر دکھ کی لکیریں ابھر آئیں۔

"تم اسے تانا سمجھ بیٹھیں کیا؟ میں نے تمھیں تو نہیں کہا۔"

ریکھا باہر سے ہنس پڑی مگر دل اور بھی بے چین ہو اٹھا۔

"تو پھر اس مثال کی کیا ضرورت تھی ماں جی؟" تھوڑا ٹھہر کر ریکھا نے سوال کیا۔ اور دل ہی دل میں بڑھیا کی چالاکی پر ہنس دی۔

"بڑی سیانی ہو! اگر ایسا ہی سمجھتی ہو تو بھی میں نے کچھ غلط تو کہا نہیں۔

جن نے بھی بیٹے پیدا کئے اور پالے پوسے ہیں، انہیں سے اٹھا کر نورے نہیں آتی۔" گلاب کی ماں نے چوٹ لگائی۔

ریکھا سہم سی گئی۔

دوسرے دن ریکھا کے میکے سے چیزوں کا بھرا ہوا تھال آیا جس میں ڈبل روٹیاں گوشت اور کباب وغیرہ تھے، گلاب کی ماں پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر جب ساری چیزیں دیکھ چکیں تو جھنجھلا کر کہنے لگی: "رام کی ماں کو تو سمدھیوں نے ایک بڑا سا چاندی کا ٹفن بکس بھی کھانے کی چیزوں کے ساتھ دیا تھا۔"

رام کی ماں گلاب کی ماں کی چچیری بہن تھی۔ اس کے گھر میں نوکر تھے اور گھوڑا گاڑی بھی۔ ریکھا نے سوچا، وہ کہہ دے "ماں جی، رام کی ماں تو ٹھاٹ سے رہ رہی نہیں ہے پھر ان کی باتیں کیوں کرتی ہو" مگر اپنے پتا کی حالت کا دھیان آتے ہی چپ رہ گئی۔ اس نے سوچا اگر ساس کہہ بیٹھے کہ تمہارے ماں باپ ننگے رہتے ہیں تو پھر اس کے دل کا کیا حال ہوگا؟ اس نے چپ رہنا ہی ٹھیک سمجھا۔

اتنے میں دوسرا وار ہوا۔

گوشت کے ساتھ برانڈی کی ایک بوتل آنی چاہیئے تھی۔ اتنا کچھ پانے کے بھی ہم حق دار نہیں ہے؟

ریکھا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نہ جانے اور کون کون سی چیزیں آنی چاہیئے تھیں۔ اُس نے پتی کی طرف دیکھا تو وہ کھانا کھانے میں مگن تھا۔ گویا اس باتوں پر دھیان دینا اس کی عادت کے خلاف تھا۔ پتی کی اس لاپرواہی سے اُسے کچھ ڈھارس ملی۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

(۳)

شام کا وقت تھا۔ سارا آسمان شفق کی لالی سے گلابی ہو رہا تھا۔ گویا سینکڑوں حسیناؤں نے ہولی کھیل کر اپنے حُسن کا گلال آکاش کے آنگن میں بکھیر دیا ہو۔ ماٹونگا کی بستی سے کچھ ہی دُور ناریل کے پیڑوں کا چھوٹا سا جنگل ہے اس کے بعد ایک لمبی سڑک ہے۔ سڑک پار کر کے سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ریکھا سوچ رہی تھی۔ عرصے کے بعد اسے اس نیلے آسمان کے نیچے سانس لینے کا موقع ملا ہے جس کی وجہ سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج جی بھر کر اس شفق کی سُرخی کو دیکھتی رہے۔

جب سے پاکستان چھوڑا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنے کا موقع اُسے نہیں ملا تھا۔ ماٹونگا میں پگڑی دینے پر جو مکان انھیں ملا تھا اس میں صرف دو کمرے تھے۔ حیدرآباد والے لمبے چوڑے اور کھلے صحن والے مکان میں رہتے ہوئے ریکھا نے ایسے چھوٹے چھوٹے گھروں کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اُسے جب چھت کے اوپر جگمگاتا آسمان نظر آتا تو وہ کھو سی جاتی۔ آج پہلی بار گھر والوں سے پوچھے بنا اس پتھر پر آبیٹھی تھی۔

دھیرے دھیرے آسمان سے گلابی رنگ اُڑنے لگا۔ اور اُس پر سمندر جیسی گہری نیلاہٹ چھانے لگی تبھی دور سے کسی کی آہٹ سُن کر ریکھا سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھروں کے ڈھیر سے چندن ٹکرا گیا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ ریکھا۔ ریکھا نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اور جواب کا انتظار کیئے بغیر ہی دامن سے مٹی جھاڑنے لگی۔

چندن خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "تمھیں سیر سپاٹے کی تو ممانعت نہیں پھر گھر میں کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلے آنے اور خواہ مخواہ سب کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ریکھا کوئی جواب نہ دے کر چپ چاپ پتی کے ساتھ چلنے لگی۔

دہلیز پر گلاب کی ماں گنا چوس رہی تھیں۔ ریکھا کو دیکھتے ہی ادھ چوسا گنا ہاتھ میں لئے بولیں — "کیوں بہو جی گھر کاٹتا ہے کیا؟"

آنچل ٹھیک کرتے ہوئے ریکھا بولی۔ "ماں جی! آج گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔"

"واہ ری دنیا! گھر میں دل نہیں لگتا اور باہر پتھروں پر دل بہل رہا تھا۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ شیام اور گوپے نے بتایا کہ وہ بیچ پر پتنگ اُڑاتے رہے اور تم پتھروں پر بھاڑ جھونکتی رہیں۔" پھر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے گنا چوسنے لگیں۔

ریکھا کو گویا جی ملکا کرنے کا موقع مل گیا چندن تو دروازے سے ہی کسی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں کہکر چلا گیا تھا۔ ریکھا اپنے کمرے میں جا کر آنسوؤں سے اپنے من کی آگ کو بجھانے لگی تبھی اُسے محسوس ہوا کہ ساس پیچھے کھڑی ہے وہ سہم گئی۔

"میں نے ایسی کونسی جلی کٹی کہدی جو رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے جا رہی ہو؟ آجکل کی بہوؤں سے تو توبہ ہی بھلی۔"

ریکھا اور زور سے رو پڑی۔ ساس جل بھُن کر رہ گئی۔ ریکھا نے بہتیرا چاہا کہ کسی طرح آنسو تھم جائیں مگر آنسوؤں کا سیلاب روکے نہیں رکتا تھا۔

اُس رات چندن کافی دیر تک جاگتا رہا۔ ماں کے بکتے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ آجکل کی لڑکیاں کتنا تین پانچ سیکھ گئی ہیں، ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی مگر پتی کو دیکھتے ہی سب بند ہو گیا۔

چندن جتنا ہی اُن الفاظ کے متعلق سوچتا اُتنا ہی اس کے خیالات کا گھوڑا اُلجھنوں کے دوراہے پر رُک جاتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا چاہیئے؟ وہ خود کیوں نہیں دیکھتی کہ بمبئی کی زندگی کتنی کٹھن زندگی ہے۔ صرف جگہ لینے کے لئے ہی کتنی ہاتھا پائی کرنی پڑی۔ ڈیڑھ ہزار پگڑی دیکر یہ مکان ملا ہے۔ رات دن بھٹکنے کے بعد دو ایک چھوٹی موٹی نوکریاں ملی تھیں وہ بھی جاتی رہیں اب جا کر مسروان جی مل میں پیر جمے ہیں۔ بی اے کا امتحان دے کر یہ کلرکی قبول کرلی ہے۔ یہ لڑکی

ان سب پریشانیوں کی طرف آخر کیوں نہیں دیکھتیں؟

اس سے زیادہ اس موضوع پر سوچنے کے لئے چندن کے پاس وقت نہیں تھا۔ اُسے کتنے ہی مسائل پر سوچنا تھا۔ بمبئی کی گھٹن زندگی نے اس کے اُصولوں کی بنیاد کو ہلا دیا تھا۔ اس کے باوجود اُس کا راستہ الجھنے کی بجائے چوڑا ہوتا گیا۔ جن نئے سیاسی اور اقتصادی نظریات کو اُس نے اپنایا تھا اُن کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے اُس کے آگے کافی لمبا چوڑا میدان موجود تھا۔ اُس کی منزلِ مقصود پر کامیابی کے سینکڑوں دیپک چمکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور وہ آگے بڑھتا رہا۔

مل کے کارکنوں کی یونین سے ابھی معمولی سی واقفیت ہوئی تھی کہ اُسے یونین کا جوائنٹ سیکرٹری چن لیا گیا۔ مل میں جتنے پڑھے لکھے کارکن تھے، چندن اُنکے لئے سٹڈی سرکل چلاتا تھا۔ اسی سرکل میں دوسرے دن اُسے "سرمایہ اور محنت" پر تقریر کرنا تھی۔ اُس نے بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر نشان لگا کر رکھے تھے۔ بتی جلا کر روشنی میں پڑھنے بیٹھ گیا۔

بجلی کی روشنی سے ریکھا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چندن گزری ہوئی بھولی ہوئی بات یاد کرکے اُٹھ بیٹھا۔ بولا۔

"جب میں اپنے دوست کے ہاں گیا تھا، تب تم روئیں کیوں تھیں؟"

ریکھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چندن پھر بولا: "شاید تمہیں یہاں آرام نہیں ملتا، اور اچھے اچھے کپڑے بھی نہیں۔"

ریکھا کی پلکیں ذرا سی دیر کے لئے اُوپر اُٹھیں۔ چندن نے دیکھا اس میں دکھ نہیں توہین کی بُو آ رہی تھی۔ پہلے تو اُسے غصّہ نہیں آیا مگر جب بار ہا سوچنے کے باوجود بھی اُسے اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تو وہ جھنجھلا اُٹھا۔

سکول و کالج کا ہیرو چندن، دیش بھگت اور گمبھیر سے گمبھیر بین الاقوامی مسائل اور حالات کو سلجھانے والا چندن اپنی ریکھا رانی کے اِس راز کو نہ سمجھ سکا۔ شکست کے احساس اور غصّہ کو دبانے کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ ریکھا نے منہ پھیر لیا۔ وہ رو پڑی۔ بے چین دل سے وہ سوچتی رہی۔ اچھا لباس کون مانگتا ہے؟ ٹھاٹ باٹ کسے چاہئیں؟ جتنا وقت وہ گھر میں گزارتا ہے، اخباروں اور کتابوں کو لگا رہتا ہے۔ کالے کلوٹے جاہل اور گجراتی دوستوں کو ساتھ لے آتا ہے اُنکے ساتھ بیٹھ کر بحث مباحثہ کرتا ہے۔ بڑی دلچسپی سے اُنکے دکھ درد سُنتا ہے مگر میرے متعلق وہ اتنا بے پروا کیوں ہے؟ میں بدصورت یا لولی لنگڑی بھی نہیں ہوں پھر بھی پوچھتا تک نہیں۔ آخر اس آدمی کو کبھی پیار کرنے کی فرصت بھی ملے گی یا نہیں؟ پیار و محبت کی باتوں کو وہ بیکاروں کا کھیل سمجھتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ پاس پڑوس والے کیا کہتے ہیں۔ ریکھا کو یاد آیا۔ آج صبح ہی پڑوسن رادھا نے کہا تھا: "چھوٹی بہو، تمہارا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا مگر اپنے شوہر کا یہ کیا حال کر دیا ہے؟ مرہٹوں کی طرح شوٹ کے ساتھ چپل پہن کر آفس جاتے ہیں کندھوں پر کتابوں کا تھیلا لٹکتا رہتا ہے ..."

ریکھا کیا کہتی۔ اُس کی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔

مگر رادھا سے ریکھا کی اُداسی نہ دیکھی گئی۔ بولی۔ "بہو، ان کی کیا بات؟ تمہارے شوہر سیدھے سادے ہیں تو کیا ہوا، بہتوں سے اچھے ہیں۔ یہ تو تقاضا نہیں کرتے کہ ساس نے یہ نہیں بھیجا سُسر نے وہ نہیں بھیجا۔ آجکل کے لڑکے تو سُسرال کے پیسوں پر گلچھرے اُڑاتے پھرتے ہیں گھر میں چاہے پھوٹی کوڑی نہ ہو مگر نام کروڑپتی ہی ہوگا۔"

اس بات سے ریکھا کو کافی تسکین ملی۔ آج اُس نے نیلے آکاش کے نیچے بیٹھ کر سمندر کی چنچل لہروں کا لطف اُٹھایا تھا۔ وہ سوچنے لگی آخر اتنا فرق کیوں؟ جو منظر مجھے اتنا سہانا لگا کہ پتھروں سے ٹکرا کر میں قدرت سے باتیں کرنے لگی تھی چندن کو وہ ذرہ بھر بھی متاثر نہ کر سکا؟

کافی دیر تک یہ سوال اُس کے خیالات نما آسمان میں پرندے کی مانند پرواز کرتا رہا اور سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ریکھا صبح کو اُٹھی تو آفتاب آسمان پر ہنس رہا تھا۔ پڑوس کے مندر میں گھنٹے بج رہے تھے گھنٹوں کی آواز نے ریکھا کو بچپن کی یاد دلا دی اس وقت وہاں گیتا اور رکمنی کا پاٹھ ہوتا تھا۔

ریکھا اُٹھی تو اُس نے دیکھا چندن اور ایک نوجوان کچھ

کا منہ دیں۔ میاں سے دیکھ رہے تھے وہ منہ دھو کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُسے اپنی صورت پھیکی جان پڑی۔ اتنے میں چندن کمرے سے بولا۔

"ماں، بیرے کے لئے بھی چائے بھیجنا۔"

ریکھا چائے پینے گئی تو ساس بولیں "ابھی جاگ کھلی ہے رانی صاحبہ کی؟ دیکھو تو سہی کتنا دن چڑھ آیا ہے۔"

ریکھا بہت شرمندہ ہوئی اور چپ چاپ باہر چلی گئی۔ جب ریکھا نے چائے کا پیالہ بیرے کے سامنے رکھا تو اُسے دو خوبصورت اور سڈول آنکھیں تشکر آمیز جذبات کے ساتھ اپنی طرف اُٹھتی نظر آئیں۔ اس لڑکے کے کپڑے صاف دُھلے تھے جب وہ جانے لگا تو ریکھا کو اُس کی چال بھی اچھی لگی مگر پاؤں میں چپلیاں پُرانی تھیں۔

ریکھا ہنس پڑی، آخر دوست کس کا ہے۔

(۴)

گلاب کی ماں کے گھر آج مدت کے بعد چہل پہل دکھائی دی۔ لذیذ کھانے تیار کئے جا رہے تھے اور مصالحوں کی خوشبو سے تر چوکے میں بیٹھی ہوئی پلاؤ پر سے اُڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھتی ریکھا سوچ رہی تھی، آنے والے جیٹھ نجانے کس طرح کے ہوں گے اُسے ریکھا کا پکایا ہوا کھانا پسند بھی آئے گا یا نہیں کیا انہیں اتنی فرصت ملے گی کہ ریکھا کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کر کہیں کہ ریکھا، تم نے کھانا بہت بنایا ہے؟

تین نئے ٹرنک ایک ریڈیو اور چھ سات چھوٹے چھوٹے بنڈل آ پہنچے، گرمیوں کی کڑاکے دار دھوپ میں ٹیکسی سے اُتر کر گلاب نے ماتھے سے پسینے کی بوندیں پونچھ کر گھر کی طرف دیکھا، ریکھا کھڑکی کے کونے سے انہیں دیکھ رہی تھی، گلاب کی نگاہ اپنی طرف اُٹھتے دیکھ وہ کمرے میں چلی گئی۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے اوپر آ گئے "ماں، دادا آ گئے!"

ماں نے بیٹے کا ماتھا چوما اور گلے لگا کر بولی، "کاش آج تمھارے پتا ہوتے۔" پھر ریکھا کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں "گلاب، یہ ہے چندن کی بہو۔"

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔

ساس نے بڑی شان سے کہا "کیوں گلاب، چندن کے لئے بہو ڈھونڈی ہے نہ؟ اپنا کھانا دوسروں کے کھلانے سے پہلے کر دیا۔" فخر کے ساتھ بچے کا دل پھول اُٹھتا ہے، ویسا ہی فخریہ الفاظ کہتے وقت گلاب کی ماں کے دل میں تھا ساس کی طرف نگاہ، ہنستے ہوئے ہی، ریکھا نے دیکھ لیا کہ گلاب اُس کی خوبصورتی سے متاثر ہو چکا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ریکھا اب گلاب کے سامنے بھی آنے لگی تھی گلاب کے کپڑے دھو ڈالتی تھی، نئے نئے جوتے صاف کر کے تپائی پر رکھتی، نکٹائیاں اور رومال سمیٹتے وقت اُن میں سے نکلتی خوشبو سے مست ریکھا کے دل میں ایک خواہش سی اُبھرتی، کاش، چندن کو بھی ریشمی کپڑے پہننے اور عطر لگانے کا شوق ہوتا۔

"ریکھا، یہاں کیا کر رہی ہو، مجھے کل جیسی نمکین دال تو پکا دو!" گلاب چوکے کے قریب کھڑا ہو کر کہتا۔ ریکھا جھول جاتی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ جلدی ہی الماری بند کر کے چوکے میں چلی جاتی تھی۔

گلاب ولایت سے ریڈیو لایا تھا۔ گھر کو ریشمی پردوں سے سجایا گیا تھا۔ اس طرح گھر میں ایک نئی زندگی آ گئی تھی۔

گلاب کی ماں کہتیں "گلاب، اچھا کیا جو ریڈیو لے آئے۔ میں سوچتی تھی کہ کب ہمارے گھر میں ریڈیو کا گانا گونجے گا۔ ریکھا غسل خانے میں ریڈیو کے گانے گنگناتی تھی تو میں منع کرتی تھی۔"

"اچھا، تو ریکھا گانا بھی جانتی ہے؟ گلاب اُچھل پڑا۔ "میں آج تمھارا گانا ضرور سُنوں گا!"

ریکھا کا دل ناچ اُٹھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

ہنستی ہی رہو گی یا کچھ گاؤ گی بھی؟ گلاب کے الفاظ میں اصرار تھا مگر ماں نے منہ پھلا کر کہا "بس بھی کرو۔ بہت ہوا۔ میں ایسی دیسی باتیں اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری چاچی کتنی بڑی ہیں مگر اُن کی بہوئیں ایسی ڈھنگ سے چلتی ہیں کہ کیا کہنا۔

رات کو گوپ اور شیام جلدی ہی کھانا کھا کر سو گئے۔ ریکھا ساس اور گلاب کے لئے کھانا میز پر رکھ کر اپنے کمرے میں جا کر فلمی اخبار پڑھنے لگی۔

گلاب نے کہا "ماں، جسے خوبصورت اور پیار کرنے والی لائق بیوی ملتی ہے وہ بڑا خوش قسمت ہے۔

ماں نے جواب دیا تھا ہے تو ایسا ہی۔ مگر تمہیں کیا کم خوبصورت
بیوی ملی تھی؟ تم نے خود ہی تو جا کر بڑی دوروں سے کہہ کر لائی چاہیے
بہو بھی ہو مگر روپیہ بہت ملنا چاہیے۔

ہاں، آدمی دو کشتیوں پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ مگر میں بتاتا
تھا جو پونجی تھی اُس سے چھوٹا کر کے آیا ہوں۔ ولایت کا ایک دمڑا
نکالا تو تم سونے کی تھالیوں میں کھانا کھاؤ گی۔

ریکھا اُس وقت، پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے جیٹھ کے
چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی
جیٹھ کے پاس پیسہ ہے مگر آنکھ صرف روپے کے چکر میں جیتی
رہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر انہیں بھی خوبصورت اور قابل
بیوی ملتی۔

اتنے میں ساس ذرا چلا کر، ریکھا کو سنانے کی غرض سے بولی۔
"ہاں بیٹے، کمائی ہاتھ آنے والی لڑکیوں کو لا کر کیا سکھ ملتا
ہے۔ شوہر رات دن نوکری کرتا ہے پھر بھی اتنا نہیں بچتا کہ کہیں
سیر سپاٹا کر کے دل بہلائیں۔ ایسی خوبصورتی کس کام کی؟

ریکھا یہ سب کچھ سنتے ہوئے بھی اخبار کے ورق اُلٹتی رہی۔
آخر چھوٹو کو کیا حق ہے کہ وہ ساس اور جیٹھ کی باتوں میں دخل اندازی
کرے۔

مگر اُس کے دل میں ایک ایسی جلن پیدا ہو گئی کہ وہ وہاں بیٹھی نہ
رہ سکی اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

(۵)

اشٹمی کا دن تھا۔ گلاب کی ماں کے گھر آس پڑوس کی سبھی
لڑکیاں آ کر اکٹھی ہوئی تھیں۔ گلاب کی ماں اُن سب کے آگے
سفید چاولوں کے بھات کے اُوپر مٹھی بھر بھر چینی ڈالتی جا رہی تھی۔
پھر اُس نے تیل میں انگلی ڈبو ڈبو کر سب کے سر پر لگایا۔ ریکھا سے
بولی۔

"ریکھا بٹیا، پانی کے دو چار گلاس تو لانا۔ لڑکیاں اُن دھوئیں
کہیں"

لڑکیاں شبنم کی طرح شفاف ہنسی ہنس رہی تھیں۔ کچھ شرما رہی
تھیں۔ افریقہ میں سفر کے چھ سال گزارنے کے بعد آیا ہوا گلاب
سامنے کرسی پر بیٹھا بڑے چاؤ سے اِن گنوار لڑکیوں کو دیکھ
رہا تھا۔

لڑکیوں نے تھالی میں ہاتھ دھو کر اُس کے چاروں طرف پانی کے
چھینٹے دے کر جوٹھے پانی کی بوندیں اُڑاتے ہوئے کہا۔

اَن دے، دھن دے — ڈبیوں میں منڈے
کاکا کھائے گرگلے — بوجے چھوکرے
اوکھلی میں سُگمہ — کاکا کے آیا لگمہ
اوکھلی میں دھانیاں — جا کر بگیں کنواریاں

"سنتے ہو کیا کہہ رہی ہیں؟ بیوی بھی ملی اور بیٹا بھی ہوا۔ لاکھوں
کما کر لاتے ہو۔ سبھی لڑکیوں کو اکنی اکنی دو۔"

گلاب اکنی دیتے وقت اُداس ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ بیوی بھی
ملی۔ بیٹا بھی ہوا۔ مگر اس وقت دونوں کہاں ہیں؟ ساڑھے چھ برس
پہلے جب دیوی اس گھر میں آئی تھی تب بھی ماں نے لڑکیوں
کو کھلایا تھا مگر اُس وقت انہیں ایک ایک پیسہ دیا تھا پھر
جلدی ہی گلاب ولایت چلا گیا تھا۔ چھ ماہ کے بعد اس کی ماں
نے لکھا تھا۔ "بیٹے تم نے پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجی ہے یہاں
تمہاری بیوی نے جھگڑا شروع کر دیا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کو ذرا بھر
بھی کم ملتا ہے تو ساس کا سر پھوڑنے آتی ہیں۔ بات یہاں تک
بڑھ گئی کہ ایک دن خود دیوی کا باپ آیا۔ کہنے لگا، میں نے تمہیں
مہتوں سے لڑکی ہری بھری دی، پانچ ہزار نقد دئے پھر بھی تم لوگ
میری بیٹی کو دکھی رکھتے ہو۔ گھر میں نوکروں جیسا کام لیتے ہو۔ گھر میں
نہ پھل آتے ہیں نہ دودھ — میری بیٹی کو اندر ہی اندر ختم کرنے کی
ٹھانی ہے کیا؟" نکالو میرے پانچ ہزار روپے نہیں تو کورٹ میں
بلواؤں گا۔ تب میں نے غصے میں آ کر کہہ دیا تھا ذرا گریبان میں منہ
ڈال کر دیکھو، خونی ہم ہیں یا تم؟ آئے ہیں ہمیں عدالت کی دھمکی
دینے، لے جاؤ اپنی لاڈلی کو۔ ہماری یہاں بھوکوں مر رہی ہے نہ۔
دیکھیں تم کتنے دن اس کا پیٹ بھر سکتے ہو۔ تب دیوی کا باپ
اُسے کھینچتا ہوا لے گیا تھا اور دیوی بھی سب کے سامنے جوتے
کی ایڑی سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی جنگ میں جیتے ہوئے سپاہی کی
طرح چلی گئی تھی۔"

تین مہینے کے بعد ماں نے پھر لکھا تھا۔ بیٹے، مبارک ہو۔
تمہارے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ دیوی اپنے میکے میں ہے۔ اپنے پرتے

کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکی مگر میری برسوں کی آرزو پوری ہوئی کہ میں اب دادی بنی ہوں۔"

اُس وقت افریقہ کے جنگلوں میں بھرتی کرنے کے لئے گلاب نے کپڑے کو گٹھری اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی مگر خط پڑھنے کے بعد وہ بہت دیر تک آرام کرسی پر لیٹا رہا۔

وہ ایک سہانے تصور میں کھو سا گیا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گھوم گیا۔ اپنے دھوپ کے کھلائے ہوئے بدن کو دو نرم ہاتھوں کے چھونے کے احساس نے اُس کے دل میں گدگدی پیدا کر دی تھی۔ آج بھی لڑکیوں کا گایا ہوا، "پیری جسے چھو کرے"، مصرع سُن کر اس کے دل میں یاد کی ایک میٹھی سی ٹیس اُبھر آئی۔

رات کو بستر پر سوتے وقت گلاب نے ماں سے پوچھا۔
"ماں، کیا دیوی اب ہمیشہ کے لئے میکے میں رہے گی؟"

ماں کے چوٹ سی لگی۔ بولی۔
"بیٹے، چندن کی شادی پر اُسے ہاتھ جوڑ کر لوا لائی تھی۔ اگر اتنے دن میکے میں نہ رہتی تو گھر کا بھی کچھ نام ہوتا اور چندن کو بھی جہیز سے لدی ہوئی بہو ملتی۔

بھگوان کہے، ایسی بیوی کسی کو نہ ملے، اُسے اپنے پتا کی دولت پر اتنا غرور ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔"

"میں بھی پورے تیس ہزار لایا ہوں، جب نیا مکان بنواؤنگا تو دیکھنا کیسے آ کر پاؤں چومتی ہے۔"

ریکھا اُس وقت دودھ کا پیالہ لیکر پتی کے پاس جا رہی تھی۔ اُس کے دل میں دیوی کے خلاف بڑی نفرت تھی۔ شوہر کو ساری کہانی سُناتے ہوئے بولی۔

"دیوی اتنی پیچ کیسے ہے؟ جب پتی غریب تھا تو میکے چلی گئی اور اب وہ کما کر لایا ہے تو اس کے پیروں پر پڑے گی۔ دولتمند گھروں کی لڑکیاں کیا اتنی گری ہوئی ہوتی ہیں"!

چندن بولا۔ "عورت کو صدیوں سے اپنا پیٹ پالنے کے لئے مرد کا محتاج رہنا پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی فطرت ایسی ہو گئی ہے۔"

ریکھا اپنے متعلق سوچتی ہوئی بولی۔ "مگر سب عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔"

جن میں سمجھ بوجھ ہے وہ یقیناً ایسی نہیں ہوتیں۔"

ریکھا جیٹھ اور شوہر کی باتوں کے متعلق سوچتی ہوئی سو گئی۔ جب سویرے اُٹھی تو اُسے شور و غل سُنائی دیا۔ اُس نے سوچا نئی جگہ اور نیا فرنیچر خریدنے کے لئے ان بھائیوں میں بات چیت ہو رہی ہوگی کیونکہ پچھلے تین دن سے گھر میں یہی ہو رہا تھا۔ مگر اب تو ایک عورت کی آواز سُنائی پڑ رہی تھی۔ اُس نے باہر آ کر دیکھا تو سامنے دیوی چارپائی پر بیٹھی ہوئی زور زور سے تُو تُو، میں میں کر رہی تھی۔

ساس بولیں۔ "اُس وقت تو آپ بھاگ گئی تھیں جیسے پردی ہوئی روٹی کھانے جا رہی ہو۔ چندن کی شادی پر بلا لائی تو تین دن بھی پیر نہیں ٹکے۔ سمجھتی تھی غریب ہیں سو بدنامی کروا کر پھر دیکھی سے آؤ نہ اپنے باپ کو جو تمہیں لینے آئے تھے۔ آئیں تو ذرا اُس سے بھی سمجھ لوں"

دیوی روتی سی آواز میں بولی۔ "وہ تو بھرے بازار میں کہتے ہیں کہ اب تیرا شوہر کما کر لایا ہے جا کر اُسی کے پاس رہو میرے پاس اب تمہارے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے شہر بھر میں بدنامی ہو رہی ہے کہ شادی شدہ بیٹی کو گھر میں بٹھا لیا ہے۔"

"اب ہو رہی ہے بدنامی؟" ساس ان الفاظ کو زور سے دُہراتی ہوئی بولیں۔ "تو پہلے کیوں رعب سے بیٹھے آیا تھا؟ اوکھلی میں سر دیا جاتا ہے تو موسل سے نہیں ڈرا جاتا۔ کرو نہ اب بدنامی کا سامنا۔"

ریکھا نے دیکھا جیٹھ اپنی بیوی کے پیچھے کھڑے ہو کر ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگی آخر شوہر بیوی کی بُرائیوں پر پردہ نہ ڈالے گا تو اور کون ڈالے گا؟

اتنے میں گلاب کی ماں بولی۔ "اگر رہنا ہے تو اپنی تیس مار کر چھوڑنا ہوگا۔ شام کو جا کر میکے سے کپڑے وغیرہ لے آنا۔"

دیوی گھر میں آ کر رہنے لگی تو ایک مہینے کے اندر ہی اُس کے ٹھاٹھ بدل گئے۔ اب وہ بن ٹھن کر رہنے لگی۔ بنا بلائے میکے سے آنے کی بات وہ بھول چکی تھی اور شک شک کر گلاب کی ماں پر طعنوں کی بوچھاڑ کرتی تھی۔ گلاب کی ماں ویسے تو غرآتی شیرنی تھی مگر گلاب کا دبدبہ اور بے رُخی دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھتی تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ گوپ اور شیام کو آدھی پیالی دودھ بھی نہیں مل پاتا جبکہ چھوٹے سندر کو دیوی لبالب پیالا پلاتی

تھی۔ ایک دن دیوی کو جگانے کے لئے اس نے منہ کھولا ہی تھا دیوی بول اٹھی

"میرا کماؤ بیٹا ہے جو کما کر لاتا ہے ورنہ کیا یہاں سب دودھ پیتے بچے ہیں؟"

دیکھا جب دیوی کے اس طرح کے زہریلے جملے سنتی تھی تو سوچتی تھی کیا یہ بھی عورت کا ایک روپ ہے؟

آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا۔ گلاب دن بھر گھر میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ جاتا تھا اگر ایسے میں دیوی آ کر کچھ کہہ دیتی تو غصے میں اپنے ضمیر کو قابو میں رکھنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا۔

ایک دن دیوی پھٹکتے ہوئے پتی سے کہنے لگی "آپ اس گھر میں کبھی بھی مطمئن نہیں رہ سکتے۔ یہاں کبھی بھی کھانے کو نہیں ہے تو کبھی کچھ نہیں ہے اور آج پاپڑ نہیں ہیں" پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "دو پاپڑ تھے سندر نے، آگے تو میں نے سینک کر دیئے اب گوپ اور شیام بھی ضد کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی پاپڑ چاہئیں"

گلاب کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس نے بنا سوچے سمجھے گوپ اور شیام کو ایک ایک تھپڑ دے مارا۔

ماں بولی: "ہائے رام رے"

گلاب کا سر چکرا گیا۔ چڑ کر بولا "بڑھیا۔ تم نے ہائے رام کیوں کہا؟"

"بیٹا، ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سندر بڑی خوشی سے کھائے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں مگر گوپ اور شیام بھی تو کسی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اتنا سا سندر دو پاپڑ کھائے اور یہ دونوں دیکھتے رہیں کیوں؟" ماں اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولیں۔

"میں نہیں کہتی تھی کہ یہ میرے سندر کو کبھی دیکھ نہ سکے گی؟" دیوی کی طرح خوفناک شکل بناتے ہوئے دیوی بولی۔

"کل کی چھوکری، تو نے ہی تو سارا گھر بگاڑ رکھا ہے نہیں تو چھوٹے بھائیوں پر ہاتھ چلانے کی گلاب کو کیا مجال تھی؟ دن بھر پتی کے کان بھرتی رہتی ہے۔" گلاب کی ماں کے صبر کا پیالہ چھلک گیا۔

مگر گلاب پر اسکا الٹا اثر ہوا۔ بولا "تمہارا مطلب ہے کہ میں بیوی کے کہنے پر چلتا ہوں؟ اسی کے اشاروں پر ناچتا ہوں"

"اور نہیں تو کیا۔ ماں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں ورنہ میرے بچوں پر کیوں ہاتھ اٹھاتے، کیا میرے بچے ادھر اُدھر سے آئے ہیں،

میرے بچے، گلاب کا دل گیا ہتھوڑوں کی چوٹ سے کراہ اٹھا۔ میں کیا سہ رہی ہوں؟ — پھر وہ خاموش ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دوپہر کو کھانا بھی نہ پکا۔ ہمیشہ کی طرح آج دو ناشتہ بھی نہیں کھیلے جب چندن لوٹا ماں نے ساری کہانی تفصیل وار سنادی۔ چندن نے بھائی کے برتاؤ پر بے چینی ظاہر کرنے اور کچھ ماں کو صبر کا پیتے کے خیال سے کہا۔

"ماں، ضرورت سے زیادہ دولت آ جانے پر انسان کبھی کبھی اپنے ہوش گنوا بیٹھتا ہے"

چندن نے یہ الفاظ آہستہ سے کہے تھے مگر نجانے کس طرح اسکی بھنک گلاب کے کانوں میں پڑ گئی وہ اپنے کمرے سے ہی چیخ اٹھا

"اگر میرے ہوش ٹھکانے پر ہوتے تو اپنے پسینے کی کمائی یوں تم لوگوں پر کیوں لٹاتا، جب سے آیا ہوں، چھ سو روپے ختم ہو گئے"

چندن نے کہا، خواہ مخواہ جھگڑا بڑھے گا۔ اس نے بولا ہو سکتا ہے ماں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہو مگر تمہیں بھی اپنے پر قابو رکھنا چاہیئے تھا"

گلاب چپ رہنے والا نہیں تھا۔ بولا "جی ہاں، ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا مگر جب الگ مکان لیکر رہنے لگیں گے تو یہ تہذیب یافتہ نوجوان نجانے کیا کیا کہے گا۔ میں نے دیوی کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ اسکا کہنا لفظ بہ لفظ صحیح تھا میری دولت دیکھ کر تمہارے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ ہمت ہے تو کما کر دکھاؤ۔ دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلتے ہو؟"

ادھر ماں نے بھی منہ کھولا۔ بڑا شور مچ گیا گلاب سب کچھ جو منہ میں آیا، سناتا رہا آخر میں تھوکتے ہوئے بولا، "کنگال تھے۔ کنگال ہی رہو گے۔ اب تک اپنا پیسہ دیتا رہا مگر تم نے قدر نہ کی۔ اب خود ہی تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی"

دوسرے دن جب گلاب، سندر اور دیوی سچ مچ ہی ہوٹل میں جانے کی تیاری کرنے لگے تو گلاب کی ماں آٹھ آٹھ آنسو رونے لگیں۔ وہ سارا دن سسکتی رہیں "ساری عمر غریبی میں گزاری، پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ڈھکے رہے پیٹ پر پٹیاں باندھ کر گزارہ کرتے رہے اب جا کر بڑی مشکل سے بیٹے کی کمائی سے کچھ سکھ ملنے

لگا تھا تو ایشور سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔

"بھگوان سے نہیں دیکھا گیا یا اس کنگال چندن سے جو چلا ہے مذاق اُڑانے کو زیادہ دولت ہاتھ آنے کی وجہ سے میں اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں ؟"

ماں بولی: "اسی نے تو ستیاناس کیا ہے اگر یہ بھی جا کر کہیں سے کما کر لاتا تو یہ نوبت کیوں آتی ؟"

ریکھا نے پہلے ساس کی طرف دیکھا پھر جیٹھ کی طرف گھورتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔

"یہ اُس کی شوخی تو دیکھو ایسے گھورتی ہے جیسے میں نے اُس کے پیکے کی جائیداد چھین لی ہے۔"

ریکھا نے جاتے جاتے سب سن لیا وہ سوچنے لگی جھگڑا کہاں سے شروع ہوا کہاں جا پہنچا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چندن بھی تمام باتیں سن رہا ہے مگر تعجب کی بات دیکھو کہ اُس نے چوں تک نہیں کی۔ شوہر کے بس استقلال کو وہ دل ہی دل میں نمسکار کر کے رہ گئی۔

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ گلاب راے نے کولابا میں فلیٹ لے لیا۔ دو چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ ماں بھی اُنکے ساتھ جانے والی تھی۔ ریکھا کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے بڑی مدت سے روتی رہی ہو۔

جب دیواروں سے تصویریں اُتاری جا رہی تھیں تو وہ اس بات کی یاد دلا رہی تھیں کہ دو دنوں کے بعد یہ گھر سنسان کھنڈر سا ہو جائے گا۔ اتنا دُکھ ہوتے ہوئے بھی ریکھا بڑی احتیاط سے رو رہی تھی کہیں دیوی اُس کے آنسو نہ دیکھ لے۔ اُس کے سامنے رونا اُسے پسند نہیں تھا۔ برتن بانٹے گئے۔ اپنے حصے میں رکھے ہوئے دو چار چھوٹے موٹے برتنوں کو دیکھ کر ریکھا کا دل ٹوٹ گیا۔ دیوار سے گھڑی اُتارتے ہوئے کھڑکیوں سے ریشمی پردے کھولتے ہوئے دیوی ریکھا کی طرف دیکھ کر ساس بولی: "یہ سب سُندر کے دادا لائے تھے۔"

ریکھا کا اس طرف کوئی دھیان نہ تھا وہ تو جدائی کی آگ میں تڑپ رہی تھی۔ اچھے تھے یا بُرے تھے اپنے ہی تو تھے۔

ساس کے کپڑے ٹرنک میں رکھتے ہوئے ریکھا بولی: "ماں جی بھول مت جانا ہر روز آتی رہنا۔ اکیلا گھر تو مجھے کاٹ کھانے گا۔"

دیوی جو جلدی جلدی اپنے کپڑے ٹرنک میں [illegible] بھر رہی تھی بولی: "ہم تو جیسے گم میں بیکار ہیں جو یہ روز آتے رہیں گے اور تم چھ مہینوں [illegible] کے بعد بھی" ریگستان کی گرم لُو کی مانند ایک ایک لفظ جلانے والا تھا۔ ریکھا اور ساس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی خاموش ہو گئیں۔

دیوی پھر بولی: "ہاں جی، اس سے کہو خوش قسمت ہے۔ اکیلی تم رہو گی ہم کیوں یہاں آکر بھٹکیں گی ؟"

ریکھا نے چاہا کہ وہ بھی کہہ دے "دیوی، بغیر آگ کے جل بھن کر کوئلہ کیوں بنی جا رہی ہو ؟ گھر جانے ہوئے کو کیا کہے، وہ خاموش رہی آج دیوی کا پلڑا بھاری تھا ریکھا کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

جُدا ہوتے وقت گلاب کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا بہہ نکلا۔ ریکھا سے گلے ملتے بولیں۔

"تم جیسی کومل کلی کو چھوڑ کر جانے کو تو جی نہیں کرتا مگر کیا کروں کہیں گلاب بُرا نہ مان لے۔ ساری زندگی تو پریشانیوں میں گنوا دی اب باقی گھڑیاں تو کچھ آرام کروں۔"

شیام نئے مکان کے جانے کی خوشی میں اُچھل کود رہا تھا۔ مالی رُوپ کچھ اُداس تھا۔ دونوں کا ناتا چھوٹتے وقت بھی ریکھا نہ روئی وہ دونوں چلے گئے۔ دیوی تو اپنے چپل پھٹ پھٹاتی ہوئی رُعب جماتی جا رہی تھی۔ سارے گھر سے اچھی اچھی چیزیں چھننے سے ہی اُسے کہاں فرصت تھی اسی مستی میں "اچار ریکھا" کہہ کر مصالحے کی شیشیاں بالٹی میں ڈال کر چلتی بنی۔

چھوٹا سُندر بولا: "ریکھا کاکی تا . . . تا . . . ."

ریکھا نے جب اس چھوٹے شیطان کا مُنہ چوما تب گویا کسی ندی کا باندھ ٹوٹ گیا ہو گھائل سپاہی کی طرح وہ اوندھے مُنہ بستر پر جا گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تکیہ گیلا ہو گیا مگر دُکھ کم نہ ہوا۔

(۶)

رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ چندن ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ باہر ہوا گھوں گھوں کرتی پتیوں سے ٹکراتی ہوئی بوندوں کو اپنی گود میں لئے بہی جا رہی تھی۔ ریکھا اپنے گرم بدن پر ہوا کے ٹھنڈے احساس کی وجہ سے اور بے چینی سے سوچنے لگی ایسی سونی اور بھیانک راتوں کا خاتمہ کب ہو گا ؟

مر جیر ؟ اس خیال پر وہ کانپ اٹھی۔

نہیں، نہیں وہ ایسا کبھی نہ ہوگا ؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے ؟ جیسے جھڑ [illegible] ویران، اُجاڑ، سارا دن کام کی چکی میں پستے رہنا ... ریکھا [illegible] سمندر کی طرح خاموش رہنا ہے مگر وہ سمندر [illegible] کبھی [illegible] نہ آئے، طوفان نہ آئے ؟

رات کی تاریکی اور بھی گہری ہوتی گئی۔ ریکھا نے جمائی لی تو چھاتی کے دائیں طرف ہلکا سا درد ہونے لگا۔ وجہ معلوم کرنے کے لئے اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو دل نے صفائی میں ایک عجیب تصویر پیش کی۔

صبح جب وہ اپنے لمبے، گھنے اور کالے بالوں کو سنوارتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو اُس کے دل میں ایک خواہش جاگ اُٹھی تھی، جب سے اُس نے جوانی میں قدم رکھا تھا تب سے وہ چاہتی آرہی تھی کہ اپنے بالوں میں خوشبودار تیل لگائے تا کہ جب محبوب نزدیک آئے تو پیار سے اُنھیں چومے اور اپنے ہاتھوں سے اُنھیں سہلائے اور تب تک سہلاتا رہے جب تک اُس کے رگ رگ میں خوشی سرایت نہ کر جائے۔

مگر چندن کو فرصت کہاں ؟

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوارتی رہی جب بالوں میں ربن سے پھول بنا چکی تو اُس نے ایک چھوٹی سی ڈبیا اُٹھا کر اپنی مانگ میں سیندور لگایا اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکراہٹ کھِل اُٹھی اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی پھر یکایک وہ اُداس ہوگئی۔ آئینے سے ہٹ کر اُس نے ربن کے پھول اُتار کر پھینک دئے۔

اُسی وقت برآمدے میں کھنکھنانے کی آواز آئی۔ چندن خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے دھیمی چال چلتا ہوا اندر آیا۔ ریکھا اُس کے لئے کھانا پروسنے کے لئے چوکے میں جانے لگی تو چندن نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا ٹھہرو۔"

ریکھا شوہر کی طرف بغیر دیکھے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ اتنی غمگین تھی کہ اُسے اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ کتنی دیر سے چندن اُسکا چہرہ دیکھتا رہا ہے روشنی میں ریکھا کے بال اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ چندن کے دل میں ایک بار اپنی بیوی کے لئے پیار کی لہر سی اُٹھی مگر اُسے دوسری طرف دیکھتے پا کر وہ ٹھنڈی سانس لیکر بولا

"اچھا، جاؤ کھانا لے آؤ۔"

کھانا کھانے کے بعد ریکھا منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی۔ چندن تھوڑی دیر تو کمرے میں ٹہلتا رہا پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ پڑوس کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔

ریکھا کو نیند تو ابھی نہیں آئی تھی مگر جب چندن نے پوچھا سوگئی کیا ؟ تو جواب نہ دیا۔ چپ چاپ پڑی رہی۔ مگر یہ بچاؤ بہت دیر تک نہ سکا۔ جب چندن نے اُس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو اُس نے جھٹکے سے ہٹا دیا۔ چندن نے ایک گنہگار کی مانند یہ جرم قبول کر لیا پھر خود بھی پشیمان ہوتے ہوئے بولا "آج مجھے بہت دیر ہوگئی"۔ ریکھا خاموش رہی۔

"آج ایک مزدور کی بیوی مرگئی تھی اُس کے اگنی سنسکار کے لئے جانا پڑا۔ اس لئے دیر ہوگئی" چندن نے یہ الفاظ بالکل آہستہ سے کہے اور اُس کی آنکھوں کے آگے ناگو مزدور کا اُداس چہرہ سینما کی تصویر کی طرح اُبھر آیا۔ ناگو اپنی بیوی کی ارتھی کو اس طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے سارے سُکھ اس ارتھی کے ساتھ جا رہے ہوں۔

چندن کا دل بے چین ہو اُٹھا۔

اُس نے ریکھا کو کھینچ کر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ پہلے تو ریکھا بے جان مورتی کی طرح خاموش پڑی رہی مگر تھوڑی کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سسکنے لگی۔ چندن ریکھا کے اس برتاؤ سے حیران ہو گیا دھیمی آواز میں اُس نے پوچھا، تم رو رہی کیوں ہو ؟

ریکھا اور بھی زور سے رونے لگی۔ پہلے تو وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ وہ کیوں رو رہی ہے کس لیے رو رہی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کی دھڑکنیں اُسے کہنے لگیں۔ کاش چندن کی کاغذوں پر چلنے والی اُنگلیاں کبھی اُس کے بکھرے بالوں کو بھی سہلاتیں۔ وہ اُس کے خوبصورت چہرے کو اپنی چھاتی سے لگا کر کہتا ریکھا رانی، تم کتنی سُندر ہو ! تمھارا حُسن مجھے چکور کی طرح کھینچ لیتا ہے۔ مگر ریکھا اپنی زبان سے یہ سب کچھ کیسے کہے ؟ یہ باتیں بھی کیا شوہروں کو سمجھانی پڑتی ہیں ؟ —

چندن جھنجھلا کر بولا "آج تمھیں بتلانا ہی پڑے گا کہ تمھیں کیا چاہیے؟"

"کچھ نہیں" ریکھا نے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں سمجھتیں کہ تمھارے رونے سے مجھے کتنی تکلیف پہنچی ہے ؟"

ریکھا کا دل آج اتنا دُکھی تھا کہ اُس پر اس ہمدردی کا بھی کچھ اثر

نہ ہوا۔ اُلٹا اُسے مذاق سمجھنے لگی۔ اپنے کو شوہر کی آغوش سے چھڑا کر ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کا گھر اندھیرا دیکھ کر اُس کا دکھ اور بڑھ گیا۔ اُس کے دل میں ایک لہر سی اُٹھی، کاش چندن باہر آکر اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اندر لے جاتا۔

مگر چندن باہر نہیں آیا۔

وہ پتھر کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ بدن کا ایک ایک حصہ درد سے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے وہ غسل خانے تک جا پہنچی۔ اُس تنگ کوٹھڑی میں داخل ہوتے وقت اُس کا دل چیخ اُٹھا۔ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے ؟ ماں تم ہی بتاؤ کہ تم نے مجھے پھولوں کی طرح کیوں پالا ؟ مجھے کلیوں کی کومل پنکھڑیوں جیسا دل کیوں دیا ؟ کیا اس لیے کہ کانٹے اُسے چیر ڈالیں۔ دل پھٹا جا رہا ہے مگر خون کی ایک بوند بھی نہیں گرتی کہ دُنیا اُس کے دُکھ کا اندازہ کر سکے۔ ماں، تم ہی نے تو ایک دن کہا تھا، ریکھا میرے ایک سُہانے خواب کی تعبیر ہے، میں نے جس خوبصورتی کا تصور کیا تھا وہ ریکھا کے انگ انگ میں سمائی ہوئی ہے ماں، آکر دیکھو کہ کس طرح تمہارا خواب ٹوٹ رہا ہے۔۔

آسمان میں بجلی چمک اُٹھی۔

غسل خانے کے کواڑ کانپ اُٹھے۔ ریکھا کی سسکیاں سو گئیں گویا وہ چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ انسان کی شکل کی بجائے کچھ الفاظ ہوا سے ٹکراتے ہوئے اندر آ پہنچے۔ تم رو تی کیوں ہو ؟ تمہیں کیا چاہیئے ؟ مجھے محبت چاہیئے۔ ایسا پیار جس میں میں اور تم دونوں ایک ہو جائیں اور سب کچھ بھول جائیں بھول جائیں کہ اس دُنیا کا بھی کوئی وجود ہے ہمارے بدن پر خوبصورت، خوشبو سے پُر کپڑے ہوں چاروں طرف ماحول خوشی سے چمک رہا ہو۔ دنیا کی سماجی اور سیاسی سب تحریکوں سے دُور۔ تمہاری زندگی میرے لئے اور میری زندگی تمہارے لیے ہو۔

ہوا کے جھونکے کواڑوں سے ٹکراتے رہے۔

کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی ریکھا کو لوٹتے نہ دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے چندن کا دل کانپ اُٹھا۔ اتنی رات گئے وہ کہاں گئی ہوگی؟ آسمان گھنگھور گھٹاؤں سے گھرا ہوا تھا۔ جی لرزا دینے والی ٹھنڈی ہوا غمگین ماحول کو اور بھی ٹھنڈا بنا رہی تھی۔ چندن جھنجھلا کر باہر نکل آیا۔ پانی برسنا شروع ہو گیا۔

چندن کے سامنے ایک سال پہلے کی ریکھا کا کومل ڈالی کا سا بدن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھدکتے ہوئے گھوم رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے اُڑتی ہوئی چادروں کو ٹھیک کرتے ہوئے، کمرے میں جا کر میلے کپڑوں کی پوٹلی کو رکھتے ہوئے، بچوں کے کپڑے سیتے ہوئے، اس کے ہونٹوں پر ناچتے ہوئے فلمی گیتوں کے مصرعے گویا اب بھی چندن کے آس پاس گونج رہے تھے۔

اپنے خیالوں میں گم وہ جیسے ہی آگے بڑھا، ریکھا کی سسکیوں کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی گویا سخت گرمی سے تھکے ہوئے مسافر کو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا مل گیا ہو۔

چندن نے کواڑ کھول کر ریکھا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اُنکے سہارے اُٹھا کر بستر پر جا لٹایا۔ بہت دیر کے بعد ریکھا کے آنسو تھمے چندن نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

" تم روتی کیوں ہو ریکھا، تمہیں کیا چاہیئے ؟ اور اُس نے ریکھا کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"کچھ بھی نہیں" ریکھا نے اپنا سر شوہر کی گود میں چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

" اب اس کچھ نہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا" تھوڑی دیر کے بعد چندن بولا۔

" تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اچھے کپڑے، اچھا کھانا سبھی کچھ تو ہے"

"میں نے شادی صرف کھانے اور کپڑوں کے لئے نہیں کی۔ یہ تو مجھے میکے میں بھی مل رہے تھے"

ریکھا نے ہمت کر کے جواب دیا جیسے وہ آج کوئی فیصلہ کر کے ہی رہے گی۔

" تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تم نے شادی کیوں کی تھی ؟"

ریکھا پتی کی طرف گھورتی ہوئی بولی " بیاہ کا مطلب ہے سُکھ اور سُکھ وہاں ہے جہاں پیار ہے"

چندن نے کہا " تم کیسے سمجھتی کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتا ؟ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ میرا پیار صرف تم تک محدود نہیں ہے میرے پیار کا دائرہ وسیع ہے جس میں لاکھوں عورتیں بوڑھے اور بچے آ جاتے ہیں جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام کی چکی میں پس رہے

ہیں میں اس نظام کو مٹانے کے درپے ہوں اور میں نے اس انقلاب میں تبدیلی لانے کی راہ میں خود کو پھینک دیا ہے صرف تمہاری محبت کے لئے میں اپنے آدرشوں کی قربانی نہیں دے سکتا رکیھا جب تک محبت اور فرض کے درمیان ٹکر نہیں ہوتی تب تک میں دونوں کو نبھاتا رہوں گا محبت اور فرض ایک دوسرے کے راستے میں رکاوٹ بن کر نہیں آئیں تبھی ٹھیک ہے کیونکہ ٹکر ہو جانے پر ایک کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

رکیھا چونک اٹھی اور شوہر کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ چندن کو محسوس ہوا گویا وہ اپنی نگاہوں سے پوچھ رہی ہو، پھر میں کہاں جاؤں گی؟

چندن نے نرم لہجے میں کہا "کیوں نہ تم بھی شخصی محبت کو چھوڑ کر دیش کے بھوکے ننگے اور مظلوم عوام کو اپنا سمجھ کر انکی خدمت میں لگ جاؤ؟"

"ہم عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟ رکیھا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ہماری منزل شادی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اس منزل پر پہنچ کر میری زندگی چمک اٹھے گی مگر میرے ہاتھ میں صرف ناامیدی ہی آئی۔"

"مگر شادی کا مقصد صرف نفسانی محبت بھی تو نہیں ہے۔ شادی تو اس لئے کی جاتی ہے تاکہ مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھی بن کر انسان کی زندگی کو اور زیادہ خوشحال بنانے کی کوشش کریں اور اس راستے پر گامزن ہونے کے لئے شادی ایک ذریعہ ہے۔"

"میرے لئے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔ شادی شدہ عورت کے لئے اسکا مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں۔"

"تم ایسی ہی باتیں اس لئے کرتی ہو کیونکہ تمہارے دل میں بغیر مشقت کی اور عیش و عشرت کی زندگی بنانے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش ہی تمہیں بے حرکت بنائے ہوئے ہے ورنہ تم اپنی ترقی کا بوجھ مجھ پر نہ چھوڑتیں یہ صحیح ہے کہ آجکل ہمارے سماج میں ابھی محدود خیال کی بہتات ہے مگر اس خود غرضی کے تنگ ماحول سے باہر نکل کر عورتوں کو اپنی آزاد ہستی کا پھیلاؤ کرنا چاہئے انہیں اپنے علم کے دائرے کو وسیع کرنا چاہئے انہیں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے کہ دنیا کن انقلابات سے گذر رہی ہے اور انہیں اس میں کس طرح کا حصہ لینا ہے۔"

"آپ کی طرح اخباروں اور کتابوں کو گلے لگا کر دنیا کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اپنے گھر والوں کی خبر تک نہ لی جائے؟"

"رکیھا کیا تم مجھے اتنا لاپرواہ سمجھتی ہو؟ جو کتابوں کو پیار کرتا ہے کیا وہ انسانوں کو پیار نہیں کر سکتا۔ میری محبت کی وسعت نے کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے میں سما لیا ہے۔"

"جس کی محبت خود مجھے ہی مطمئن نہیں کر پائی، اس میں وسعت کہاں سے آئے گی؟"

"میری رکیھا رانی، میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہوں مگر اب کرنے میں کام کا وقت جاتا رہے گا اور یوں مجھے اپنے فرض سے منہ موڑنے کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔"

"اچھا اب میں کبھی کچھ نہیں کہوں گی، کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔"

"بحث کے دوران کچھ مسائل کو نہ سمجھ پانے پر خود کو چھوڑنے کی کوشش کرتی ہو رکیھا؟ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، قصور تو ہمارے سماج کا ہے جو..."

"اچھا جو جی میں آئے وہی سمجھ لیجئے۔" رکیھا زور سے بولی۔

چندن کو ایسا لگا گویا بڑی محنت کے بعد جس کشتی کو کنارے لانے کی اس نے کوشش کی تھی، تند و تیز لہروں نے اسے اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر ٹھیک منجدھار میں پہنچا دیا ہے۔ وہ مجبور، مجرم کی طرح اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا جس کی آنکھیں آنسو پی پی کر پھول گئی تھیں۔

آخر کار دونوں کو نیند آ گئی۔

(۷)

ساس کے الگ ہو جانے کے بعد رکیھا بالکل اداس رہنے لگی۔ چندن کی تنخواہ کے ایک سو پچیس روپوں میں سے چالیس روپے کرایہ دینا مشکل ہو گیا۔ خرچ بڑھ جانے اور تنہائی نے اس کی رہی سہی خوشی بھی چھین لی۔

کبھی کبھار کوئی پڑوسن آ جاتی تھی۔ رادھا سے اسکا خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چندن کے دوست بھی اسے بہن جی کہہ کر بلایا کرتے تھے مگر رکیھا کو وہ کسی الگ راستے کے راہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہیرا تھا جو اسے بھابھی کہہ کر پکارا کرتا تھا اور اپنے دیور ہونے کا

چڑھ جاتا تھا۔ ریکھا اُس سے چھوٹا موٹا کام بھی کروالیتی تھی۔ سکول کی نوکری سے چھٹی ہونے کے بعد ہیرے کا کافی وقت وہیں رہتا تھا جب ریکھا بیمار پڑی تو ہیرے نے ہی اُس کی دیکھ بھال کی تھی۔

ایک دن دوپہر کا وقت ڈھل چکا تھا اور کوئی چار بجے کو ہونگے ناٹو نگا کے علاقے کا ماحول خاموش تھا۔ کچھ بچوں کے گلی ڈنڈا کھیلنے کی آواز آرہی تھی ورنہ ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ اسی وقت تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہیرا آپہنچا۔

ریکھا بولی: "اچھا ہوا جو تم آگئے۔ میرا دل آج بڑا اُداس ہے۔"

ہیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بھابی آج کیا یہ اُداسی تو تمھارے پیچھے پرچھائیں کی طرح ہر وقت لگی رہتی ہے شاید تمھارے دل میں کوئی بات ہے جسے تم دبائے رہتی ہو"

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟" ریکھا حیران سی ہوگئی۔

"سچ سچ بتادوں؟"

"نہیں نہیں جھوٹ موٹ بتاؤ۔" ریکھا ہنسنے لگی۔

"ایک دن صبح سویرے جب میں تمھاری دوا لیکر آیا تھا تب تمھیں کافی تیز بخار چڑھ رہا تھا تم نے مجھے چندن سمجھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں تم نے کہا تھا "تم دیوتا ہو۔ مجھے ایک چھوٹی سی کومل ہستی چاہیئے . . . . ایک بچہ چاہیئے . . . وغیرہ۔

ریکھا کی نگاہیں جھک گئیں۔

"ایک بات پوچھوں بھابی؟ سچ سچ بتاؤگی نہ؟"

"پوچھو" ریکھا بولی: "جب اتنا کچھ جان لیا ہے تو باقی چھپانے سے کیا فائدہ؟"

"بیمار ہونے سے پیشتر کیا تمھارے اور چندن کے بیچ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

ریکھا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی: "گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھڑیاں لمبی ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً شام کے چھ بجے کے بعد جب دوسرے گھر جگمگا اُٹھتے ہیں تب تمھارا ساتھی مزدور یونین کے دفتر میں جاکر غریبوں کے دُکھ درد سنتا ہے۔ انھیں درخواستیں لکھ کر دیتا ہے . . . مگر اُس وقت گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا بچہ ہی میرے سامنے ہوتا تو میں اُسے گلے سے لگا کر ساری دُنیا کو بھول جاتی۔ کہتے ہیں کہ کسی کو جنم دے کر کیا اُسے بھکاری بنانا ہے؟ خیر تو دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہوں۔ دل پر چھتا ہے جس کی کوئی خواہش پوری ہو نہیں پاتی، خواہش اُس کے دل میں پیدا ہی کیوں ہوتی ہے؟ اس سوال نے مجھے اتنا بے چین کر دیا تھا کہ دل کرتا تھا دوسرے کمرے میں جاکر خوب چیخ چیخ کر روؤں تاکہ میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہو۔ ——— میں تمام رات آنسو بہاتی رہی یہاں تک کہ میرے سینے میں درد ہونے لگا۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہوگئی جب میرے ہوش ٹھکانے نہیں رہے ہوں گے تبھی بڑبڑا رہی ہوں گی اور تم نے سُن لیا ہوگا . . ."

ہیرا خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"مگر اس میں چندن نے تو کوئی غلطی نہیں کی بھابی!"

ریکھا نے گھبرا کر آنکھیں اُوپر اُٹھائیں: "تم بھی ایسا کہتے ہو؟ کیا غریبوں کے ہاں بچے نہیں ہوتے؟ یا صرف امیروں کے ہاں ہونے چاہئیں؟"

"دیکھو بھابی، سوال صرف بچے ہونے کا نہیں ہے اُنکی پرورش کا بھی ہے یہ سوال جس تنگی اور بھیانک شکل میں متوسط طبقے کے سامنے آتا ہے اتنا غریبوں اور امیروں کے سامنے نہیں آتا۔ دولتمند اپنے بچوں کی پرورش اچھی طرح کر سکتے ہیں اُنکے ہاں بچے ہونا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ غریبوں کی زندگی ہی نامرادیوں کی گندی نالیوں میں پلتی ہے۔ اونچے رہن سہن کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اُنکے بچے ہنگ مونگ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ اُنکے سامنے تعلیم کا کوئی مسئلہ ہی نہیں اُٹھتا۔ اَن پڑھ ہوتے ہوئے سات آٹھ برس کی عمر میں ہی کمانا شروع کر دیتے ہیں مگر تم متوسط طبقے کی عورت ہونے کے ناتے اپنے بچے کی خوراک اور تعلیم، کپڑوں وغیرہ میں ذرہ بھر کی کمی بھی برداشت نہیں کر سکوگی۔ تمھیں پندرہ بیس برس تک بچے کو پالنا ہوگا تب کہیں جاکر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا۔ چندن نے جس نے ایک عظیم کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، اُسے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس سے زیادہ کما سکے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ تو اپنے عظیم فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف رہتے ہیں اور اس چار دیواری کے اندر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

ریکھا بھابھی ایک تم ہی نہیں تم جیسی جتنی عورتیں ہیں ان کی پوری زندگیاں گھروں میں بیت جاتی ہیں مگر وہ اس چاردیواری سے ایسی چپکی رہتی ہیں جیسے کہ یہی اُن کی اپنی دولت ہے۔"

"تم تو عجیب باتیں کرتے ہو ہیرا۔ یہ چاردیواری ہی تو ہمیں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے ورنہ اس گھر کے باہر پاؤں رکھے نہیں کہ رشتہ داروں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگ جاتی ہیں۔ ویسے ہی ہمیں وہ نوکروں سے زیادہ نہیں سمجھتے اُنکی نگاہیں ہمارے وجود کی گہرائی تک نہیں پہنچتیں۔"

"مگر میں کہتا ہوں، تم جن لوگوں کی چمک دمک دیکھتی ہو وہ بھی اکثر تم جیسے ہی ہیں فرض اور رشتے داروں کے بوجھ کے نیچے وہ اتنے دبے ہوئے ہیں کہ اُنکی ترقی کا راستہ ہی مسدود ہو گیا ہے اگر وہ بھی حقیقت کو سمجھ کر چلنے کی کوشش کریں تو سماج کا کافی دکھ گھٹ سکتا ہے۔ ایسے کتنے گھر ہیں جہاں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنا سارا وقت بناؤ سنگار اور سیر سپاٹے میں گزار دیتی ہیں پھر بھی گھر کی بگڑی ہوئی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے آگے ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ پھر بھی کسی فن میں مہارت حاصل کر کے اس کا انسانی زندگی بھلائی کے لئے استعمال کرنا اُن میں ممکن نہیں۔ آج وہ وقت آگیا ہے جب عورتوں کو بیدار ہو کر اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر خود کو مرد کا سچا ساتھی ثابت کرنا چاہئے۔"

"ہمارے سماج میں عورت تب اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہے جب اس کا مرد کمانے سے معذور ہوتا ہے عورت کا اصلی کام تو تخلیق کرنا ہے۔"

"اگر اس فرض کو نبھانے کے لئے اُسے بھی کمانا پڑے تو اس میں بُرا ہی کیا ہے؟"

"میں جا کر کماؤں؟" "بس، بس تم نجانے اور کیا کیا کہو گے۔ کہاں ہمارا خاندان اور کہاں عورت کی کمائی! میں اپنے سسر کے خاندان کی لٹیا نہیں ڈبو سکتی۔"

"مگر اب تو زمانہ ایسا ہے کہ اگر انسان اپنے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گذارنا چاہے، کالے بازار اور بے ایمانی سے دور رہنا چاہے تو وہ اپنی ضروریات کے مطابق ہرگز کما نہیں سکیگا۔"

ریکھا نے گہری سانس لی اور بولی "ٹھیک ہے۔ جو ہے وہ اچھا ہی ہے۔ جہاں اور ساری تکلیفیں برداشت کر رہی ہوں ایک یہ بھی سہی۔"

ہیرا خاموش رہا۔ اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا "اوہ بہت دیر ہو گئی اور جلدی سے میز سے قمری کتاب اُٹھا کر تیزی سے باہر چلا گیا

ریکھا سوچنے لگی۔ آخر یہ انسان کونسی شئے ہے۔ یہ پرزے ہیں جو وقت بے وقت چلائے جاتے رہتے ہیں۔ اِدھر میں ہوں کہ کسی اچھائی کے سہارے باتیں کرتے ہوئے بنا جیے اپنی زندگی بسر کرنے کو تیار ہوں۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔

ریکھا دیکھ رہی تھی کہ سامنے والے گھروں میں آفسوں سے ——— لوگ کھانے کے خالی ٹفن اور تھیلیاں ہاتھوں میں لئے مسکراتے چلے آ رہے ہیں۔ ہیرا کا ایک جملہ کانوں کے پردوں سے گذرتا ہوا ریکھا کے کانوں تک آ پہنچا۔ اور کہتا گیا "ریکھا! اتنے لوگ تمہارے سامنے سے گذرتے رہتے ہیں پھر بھی تم اپنے کو اکیلا محسوس کرتی ہو؟"

(۸)

دوسرے دن ریکھا باہر آکر ڈیوڑھی میں بیٹھ گئی اتنے میں گوپی ترکاریوں کی پوٹلی سامنے والی ڈیوڑھی پر رکھ کر سستانے لگی۔ ریکھا کو سامنے بیٹھا دیکھ کر سستانا بھول کر بھاگنے سی لگی لیکن ریکھا نے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

گوپی اور ترکاری کی تھیلی؟ ریکھا کے لئے یہ ایک عجیب بات تھی۔ گوپی اُس کی دور کی رشتے دار تھی۔ حیدرآباد میں اُن کا اپنا ایک اچھا خاصا مکان تھا جس کے کرائے سے ہی گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ویسے تو ریکھا اُسے کبھی بازار میں دیکھتی تھی تو اُس سے آنکھ بچا کر نکل جاتی تھی مگر آج اُس کے دل میں نجانے کیوں انسان سے ایک قسم کا لگاؤ سا جاگ اُٹھا تھا۔ جو دن اُس نے بستر پر سو کر بتائے تھے اُن دنوں میں اس کی یہ خواہش بھڑک اُٹھی تھی۔ اس کا دل اتنا آرام پانے کے بعد نوزائیدہ بچے کے جسم کی طرح کومل ہو گیا تھا۔

ریکھا کے دل میں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا سوال اُٹھنا اب ناممکن تھا۔ اُس نے پورے زور سے آواز دی "گوپی"۔

گوپی رُک گئی مگر اُس نے ریکھا کی طرف نہ دیکھ کر پہلے ترکاری کی پوٹلی کو دیکھا پھر سر اُٹھا کر بولی "ریکھا بہن کیوں ٹھیک تو ہو نہ؟"

"آج تو ٹھیک ہوں مگر پڑوس میں رہ کر بھی تم نے یہ خبر نہ لی کہ میں کتنے دن بیمار رہی۔"

ریکھا نے دیکھا گوپی جھنجھلا رہی تھی۔ وہ جلدی میں ہوں کہہ کر چلتی بنی۔ ریکھا سوچنے لگی۔ گوپی مارکٹ میں اتنی ترکاریاں خریدنے

ست نہ شرمائی مگر مجھے دیکھتے ہی شرم میں ڈوب گئی۔ ہم متوسط طبقے کی عورتیں بھی کتنی عجیب ہیں، ایک دوسرے کو اپنی اصلی حالت دکھاتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں۔ گوپی تو پاکستان بننے کے بعد ہی اس قطار میں آگئی تھی۔ اُس کا شوہر جو وہاں بیکار رہ کر اپنی موروثی دولت کو عیش و عشرت میں لٹایا کرتا تھا۔ یہاں مجبور ہو کر سندھ ورقی ہو کر کام کر رہا تھا۔ تین بچوں کی ماں گوپی اس تیلی کی طرح، گھر کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے تھک گئی تھی۔

ریکھا کے دماغ میں پاس پڑوس کی کتنی ہی عورتیں گھومنے لگیں۔ بہت سے کی باتوں نے اسے متوسط طبقے کی عورتوں کی حالت پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگی، متوسط طبقے کی عورتیں کتنی دکھی ہیں۔ ہزاروں قسم کی پریشانیاں انہیں گھیرے رہتی ہیں۔ بہت مشکل سے اپنا گذارہ کر پاتی ہیں۔ باہری لین دین سے انہیں کبھی چھٹکارا نہیں ملتا اور ہمیشہ گھرے گھرے کھاتے۔ پانی میں کٹوتی کرنے کو سوچتی رہتی ہیں۔ پڑوسن رادھا کو ہی دیکھو، بیچاری کٹوتی کرتے وقت سوچتی ہے، بچوں کو کم دوں؟ پھر سوچتی ہے نہیں، یہی تو مستقبل کے سہارے ہیں انہیں کیسے کمزور رکھا جائے؟ شوہر کی آدھی پیالی دودھ بھی کم کرنے کو تیار نہیں۔ آخر وہی تو کولہو کے بیل کی طرح کما کر لاتے ہیں۔ گھر میں ساس ہے، نند ہے، ان کی کٹوتی کرنا اسے مناسب لگتا ہے مگر اس سے پہلے وہ اپنی تھالی پر ان کی شوخ نگاہیں ڈال کر کانپ اٹھتی ہے۔ سب سے زیادہ کام کرنے والی سب سے زیادہ فکریں جھیلنے والی عورت سب سے پہلے اپنی ہی تھالی میں کٹوتی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ آدھا پھل کا، کل دودھ کی اور پھر اچار پاپڑ۔۔۔۔۔

ہر روز نئی کٹوتی ہونے پر پرانی کٹوتی کا دائرہ شوہر، ساس، نند اور بچوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے تب بھی آسانی سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو پاتا۔

گھر میں کنواری لڑکی بیل کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی بیچاری عورت، گھر کی تمام پریشانیوں میں پسنے والی رات کو پتی کی باہوں میں تھوڑی دیر کے لیے سہارا ڈھونڈتی ہے مگر وہ دس بارہ گھنٹے کام کر کے لوٹتا ہے اُسے بھی تو آرام چاہیئے یہ سوچ کر شوہر کا جسم دبانے لگتی ہے۔ اس کا دل کتنی کہانیاں سنانا چاہتا ہے مگر جھلکے مانند شوہر کے آگے یہ کہانیاں منہ سے نکل نہیں پاتیں۔ اُس کا جسم ایک انوکھی آگ سے دہک اُٹھتا ہے اور وہ ایک مجبور سانس بھر کر رہ جاتی ہے۔ اُس کی پیاسی روح صبح کے کھلنے تک شوہر کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر تک ہاتھ اس کے سر پر ہوتا ہے گویا وہ دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے دیوی، تم واقعی ایک سب بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہو، تمہارے ہونٹ پیلے پڑ رہے ہیں

اور بال سفید ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں بھی تو خون پسینہ ایک کر کے چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں مگر۔۔۔۔ اچھا، اب کام پر جانے کے لئے دیر ہو رہی ہے اور وہ کروٹ بدل کر ناامید نگاہوں سے لوٹ آتی ہے۔

ریکھا کو محسوس ہوا جیسے ویسی ہی ناامیدی اُس کی آنکھوں میں گھر کئے بیٹھی ہے۔ پڑوس میں سبھی گھروں کی روشنیاں جل چکی تھیں سب سہاگنیں اپنے شوہروں کے لئے کھانا پروس رہی تھیں مگر چندن

ریکھا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دل کی گہرائی سے ایک چیخ سی نکل پڑی۔ وہ اپنے اندھیرے گھر میں داخل ہوئی۔ اُس تاریکی میں اُسے کوئی سایہ گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ ریکھا کچھ دیر کے لئے ہنس پڑی۔ عورتوں کا من بھی عجیب ہوتا ہے! دوسروں کا دکھ یاد آتے ہی اپنا دکھ بھول جاتی ہیں۔ اُسے وہ چار دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔ زندگی میں پہلی بار چندن نے دھمکی دیتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔ اگر گھر کی سبزی ترکاری اور اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں تم خود اپنے ہاتھ سے نہیں لائی تو وہ روٹی نہیں کھائیگا۔

اُس رات تو وہ غصے میں لال ہو کر بولی تھی "کسی کو اس بات کی ہوا لگے کہ کتنے ذلیل ہو کہ بیوی سے ترکاری لانے کو کہتے ہو۔۔۔ اس سے تو موت بھلی ہے۔"

مگر جب چندن سچ سچ ہی بنا کھائے جانے لگا تو وہ سارا غصہ آنسوؤں سے بہاتی ہوئی باہر نکل پڑی تھی۔ اُس کے تعجب کی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا اُس سے کم عمر والی لڑکیاں پنساری سے مول بھاؤ کر رہی تھیں۔ آگے جا کر اُسے رادھا ملی۔ ریکھا نے جھٹ سے سوال کیا۔

"تمہارے شوہر کہاں ہیں جو تم خود ترکاری لینے آئی ہو؟"

رادھا نے عام لہجے میں جواب دیا "مرد بیچارے سارا دن تو کام کرتے رہتے ہیں وہاں سے لوٹتے ہی ادھر ساگ سبزی لینے آئیں یہ اُن کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ لوکل گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اُن کی ہڈیاں دکھنے لگتی ہیں۔ ہم کیا چارپائیاں توڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں؟"

اُس وقت ریکھا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا۔ وہ چندن سے جا کر کہے گی، واہ رے بمبئی! یہاں تو گھر کی گاڑی کھینچنے کے لئے بھی دو بیل چاہئیں۔

ابھی یہ الفاظ اس کے دماغ میں آئے ہی تھے کہ چندن بن شاپ کی طرف دوڑتا دکھائی پڑا۔ وہ جیسے دھیرے دھیرے گھر لوٹ آئی گھر بازار کی چہل پہل، آدمیوں اور موٹروں کی تیز دوڑ دھوپ، دوڑ دوڑ کر بسوں کو پکڑنے کے تواتر آنکھ اسا میں گھوم رہے تھے گھر کی دیواروں کے اندر آتے زندگی نہ موسل تھما کی طرح گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آج بھی اندھیری کوٹھڑی میں جاتے وقت اُسکا دل اُداس ہو رہا تھا۔ اچانک گوپ اندر چلا آیا اور بولا "ریکھا بھابی یہ لو میرے کپڑے، اب میں تمہارے پاس ہی رہونگا، چاہے مری کیوں نہ جاؤں مگر گلاب دادا کے ساتھ کبھی نہیں رہونگا۔"

ریکھا نے جلدی ہی بتی جلائی اور گوپ کا سر چوم کر اسے گلے لگایا۔ بولی۔

"بہت دنوں کے بعد آئے ہو گوپو۔"

وہ محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اُسے دیکھ کر اُس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ گوپ کا دل بہت ہی بے چین دکھائی دے رہا تھا اُسکا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کسی نے بچے کا دل دُکھایا ہے۔

"پہلے یہ تو بتاؤ، تمہارا چہرہ رونانسا کیوں ہو رہا ہے؟"

گوپ نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں وہ ریکھا کے گلے میں بانہیں ڈال کر سسکنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں روتے رہے۔ جب گوپ کچھ چپ ہوا تو بولا۔

"بھابی، میں جیسے ہی شیام کو پکڑنے کے لئے دوڑنے لگا، شیشے کی میز سے ٹکرا گیا۔ میز گر پڑی۔ یہ دیکھو میری ٹانگ میں زخم ہو گیا ہے۔ ماں تو دیکھتے ہی ہوش گنوا بیٹھی۔ وہ دوڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی کہ کرسی سے ٹکرا گئی۔ کرسی جا کر شوکیس کو لگی اور اُسکا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بڑی بھابی چیخ کے آندھی کی طرح دوڑتی دوڑتی آئی اور شوکیس دیکھ کر بولی "جنگلیوں کو لا کر محلوں میں بٹھایا ہے! اندھی، ذرا آنکھیں پھاڑ کر تو چلا کر۔ تم سب جانور ہو جانور!" ماں نے چوں تک نہ کی۔ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے کپڑا پھاڑ کر میرے پاؤں پر باندھنے لگی مگر بڑی بھابی کا کلیجہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ہمیں کوسنے

بھی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے بھی کہہ دیا —

— مجھے کیا معلوم کہ یہ شیشہ اتنا کچا ہو گا۔ آئی ہے سیٹھانی چانٹا مارنے، بوڑھی بکے کے بچے، نہ یہ چیں چیں کی تو دانت توڑ دوں گی۔ اس گھر میں تیری ایک بھی نہ چلے گی۔ اس پر میں نے کہا کیا تیرے باپ کا گھر ہے؟ جس پر اُس نے جھٹ سے ایک تھپڑ دے مارا۔ اُدھر ماں بھی مجھے ڈانٹتی رہی۔ پروگریس بک پر دستخط کروانے کے لئے بھی ماں نے گلاب کے باپ کے پاس جانے کے لئے کہا ..... اب میں اُس گھر میں کبھی پاؤں بھی نہ رکھوں گا۔ بڑی بھابھی، گلاب دادا اور رشنا۔ جو چاہیں کھائیں مگر ہمیں مانگنے کا بھی حق نہیں۔ ہمیں ایسی گھٹیا نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے ہم بھکاری ہوں۔ ہم جنگلی ہوں چاہے جو کچھ بھی ہوں کو اُن کا کیا؟"

ریکھا اب ہنس پڑی۔ "تم جنگلی کا ہے کو ہو، جنگلی تو وہ ہیں جو تمہیں جنگلی کہتے ہیں۔"

گوپ کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

"جنگلی نہیں تو اور کیا ہیں۔ سارے دن دولت پکارتے رہتے ہیں اگر کوئی امیر آدمی گھر میں آتا ہے تو اس کی جوتیاں چاٹنے لگتے ہیں اور جب وہ باہر نکلتا ہے تو اُس کی بُرائی کرنے لگ جاتے ہیں۔ دادا کے دوست کیا ہیں پُورے گپی ہیں۔ کرائے کا مکان ہے لیکن کہیں گے ہماری بلڈنگ ہے۔ کسی سے ایک ہزار چھینیں گے تو بتائیں گے دس ہزار۔ دوسرا کہے گا، فلاں کو دیا تو بتایا کہ اب کورٹ میں نکلتا ہو گا۔ سارا دن لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں۔ بڑی بھابی تو ایسی ہیں جو ہمیں دیکھ کر جل اُٹھتی ہیں۔ ہمارے پیٹ سے نکال کر جانور کو دیتے خوش ہوتی ہے ایک دن بلی کے دودھ کی لٹیا گر گئی تو اُس نے ماں کا دودھ بلی کو دے دیا۔ ماں تو صبر کے گھونٹ پی گئی مگر میں دودھ پینا بچہ تھوڑے ہی ہوں۔ اُس دن سب مجھے اتنا دُکھ ہوا کہ میں نے دودھ پیا ہی نہیں۔ بھابی، بڑی بھابی جو ہمارے ساتھ اتنا بُرا برتاؤ کرتی ہیں

تو کیا اُسے اس کا اچھا پھل ملے گا؟ گلاب دادا

دوسروں کے گھر جاکر دو آنے کما لیتے رہتے ہیں اور بڑی بھابھی جل بھن کر رہ جاتی ہیں۔ ایک دن کافی رات گئے میں جاگ رہا تھا کہ دادا شراب پی کر آئے۔ بڑی بھابھی نے شور مچایا تو دادا لڑکھڑاتے ہوئے بولے "سشیلا تو مجھ سے نہیں لڑتی۔ جیجا تو تم سے بھی خوبصورت ہے اور سشیلا تو جیتی جاگتی شراب ہے" اُس دن بڑی بھابی اتنا روئی کہ ہچکیوں کے مارے گھر کانپ رہا تھا۔ صبح کو اُٹھی تو پھولوں کی طرح گرتی ہوئی۔

"اچھا، اچھا دوسری باتیں پھر بتانا۔ اُٹھو کپڑے بدل لو میں کھانا بناتی ہوں۔"

آج ریکھا کو محسوس ہوا کہ گھر کی دیواریں بھی باتیں کرنے لگی ہیں۔

(۹)

گوپ اب چندن کے گھر میں رہنے لگا۔ چندن نے دو تین روز تک تو کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب ریکھا نے تمام باتیں بتاتے ہوئے یہ کہا کہ گوپ بھی آپ کے ساتھ رہ کر آپ جیسا بننا چاہتا ہے تو وہ بہت ہی خوش ہو گیا تھا لیکن تیسرے دن رات کو کام سے لوٹتے ہی چندن نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر ریکھا کو دیا اور کہا۔ اب گوپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

ریکھا نے خط پڑھا تو اپنے کو روک نہ سکی اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا ابل نکلا وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور خط کو ہاتھوں میں مسل دیا۔ خط میں گلابرائے نے ویسے تو بہت سی اناپ شناپ باتیں لکھی تھیں مگر ساتھ میں یہ بھی لکھا تھا کہ گوپ چونکہ دو سال کے بعد کمانے لگ جائیگا اس لالچ میں پڑ کر تم لوگ اُسے ہم سے چھین کر لے گئے ہو۔ یہ بات دونوں کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً ریکھا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی کسی طرح من کو تھام کر وہ لیٹ گئی۔

دوسرے دن بڑی منت کر کے گوپ کو گھر لوٹ جانے کے لئے راضی کر سکی اور اس شرط پر کہ وہ بھی اُسی کے ساتھ جائیگی۔

ریکھا کے گلابرائے کے گھر پاؤں رکھتے ہی دیوی بولی "اچھا ہوا جو گوپ ہم سے جھگڑا کر کے گیا تمہیں دیکھنے کا موقع تو ملا۔ ہاں آپ لوگ ٹھہرے بڑے آدمی ہمارے گھر بھلا کیوں آنے لگے!"

ریکھا تو نخچرے سے زین گھر دیکھ کر لیپنے میں ہی سمٹی جا رہی تھی۔ مٹھائی کے روز نئے اشک سے رنگے چہرے کے مقابلے میں آہستہ اپنا چہرہ چھپانے لگا۔ سکیٹی کر بولی "ماتا جی اور چھوٹا کہاں ہیں؟"

"کیوں ری، ماں جی سے ہی خاص کام ہے کیا؟ اگر مجھ سے کے متعلق کچھ کہنا ہو تو مجھ سے کیوں نہیں کہ دیتیں۔ اس بارے میں ماں جی کر ہی کیا سکتی ہیں؟"

معلوم نہیں، ماتا جی کہاں سے آ پہنچیں۔ دودھ کا پیالہ دیوی کے سامنے رکھ کر سندر کو گود سے اتار کر بولیں "اس نے تو طوفان کر رکھا ہے کہتا ہے دودھ نہیں چاہئے پیو لگا۔"

ریکھا نے چھوٹے کو گود میں لے لیا اور دودھ کا پیالہ لے کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوئی۔ نیچے ایک چھوٹا پارک نظر آرہا تھا۔ ریکھا بولی "دیکھو تو میرے ہاتھ کا دودھ پی لے تو نیچے پارک میں چل کر جھولا جھولیں گے، آسمان تک پہنچ جائیں گے پھر وہاں سے تارے توڑ لائیں گے۔"

اور چھوٹا دودھ پینے لگا اُدھر دیوی گوپ کو کھری کھوٹی سنانے لگی۔

"میرے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہے جو دونوں بھائی آکر میرے سر پہ بیٹھے ہو اور ایک بھائی کا خون چوسنے پڑے ہو؟ اب کہتا ہے کہ چندن بھیا اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ بھلا کاہے کو رکھیں گا؟ کچھ دن رکھ کر دیکھنا تو اچھی طرح آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

"بیٹی، تم کیوں اس طرح بولنے لگی ہو۔ ممکن ہے ہمارے نصیب سے ہی گلاب کے پاس اتنی دولت آئی ہو۔ پالنا تو بھگوان کا کام ہے۔"

ماں جی، تم تو صرف باتیں بنانا جانتی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو کہ کیسے مکان گروی رکھ کر آپ لوگوں کو پال رہے ہیں اور کیسے سٹا کھیل رہے ہیں۔"

"ہمارا پیٹ بھی کیا کھاتا ہے یہی دو چار چپاتیاں۔ پھر ہمارے لئے ہی کیوں سٹا کھیلنے لگا۔ جو شراب پیتے ہونگے کھانے پہننے میں عیاشی کرتے ہونگے۔ اُنہیں کے لئے ہی سٹا کھیلتا ہوگا۔" کہتے کہتے ساس نے ریکھا کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دیوی، میری رانی کا ہاتھ پکڑ کر بولی "ریکھا تم نے، کیسے طعنے دیتی ہے۔ ہم لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھتی ہے تو جل جاتی ہے یہ اتنا قرضہ چڑھ چکا مگر ابھی تک اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔"

ریکھا کچھ نہیں بولی۔ ساس کے پیچھے چل دی۔ دیوی جل بھن کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بولی۔

"میں کبھی نہیں گوپ کو واپس لے جانا نہیں چاہتا تھا اس زبان
ماں کو یہاں ایک گھڑی بھی میں رہنے دونگی۔"
گوپ غصے سے بڑی بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔ رکھا اسے بچے کی
پاس کے کمرے میں لے گئی۔ سارے بھاسی طرح رکھا کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھے
رہے۔ بہتر دیکھنے کو اٹھا اور بولی۔
"مشتق ہو، کیا کہتی ہے۔ ایسی ہی بولنے سے گلاب کنوارا ہی
بیٹھا رہتا، اچھا تھا۔ گلاب کہتا ہے کہ اگلے مہینے میں موٹر لوں گا اور ماس
رانی صاحبہ کے باپ کا ہر روز دیوالہ نکل رہا ہے۔"
رکھا کو ساس اور بہو کے درمیان اتنی تلخی نا گوار گزری۔ ملتے ہیں
گلاب بھی ماں کے کمرے آ بیٹھا۔ ٹھٹھا مار کر گوپ سے بولا۔ "مجھے پہلے ہی
معلوم تھا کہ چند دن تمہیں تین دن بھی اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔"
اس طعنے پر رکھا چونک اٹھی۔ دیوی بھی اپنے شوہر کے پیچھے
کھڑی ہو کر تیکھے انداز میں بولی۔ "ایک بار جو ٹھیک زمین پر پھینک دیا گئی
ہے اسے پالنا نہیں ہوگا۔ ہمیں کوئی پرواہ نہیں اگر گوپ جا کر کمائے
اور ہمیں کھلائے۔"
رکھا گوپی کے اس تیر کو بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہوئے
بولی۔
"ابھی تو اس کے کمانے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس وقت
تو اس کی تعلیم کے لئے روپوں کی ضرورت ہے۔"
"واہ بڑے چالاک ہو تم لوگ جو گوپ کی کمائی کے لئے تو تیار بیٹھے
ہو لیکن ایک دو بیس اس کی تعلیم کے لئے پیسہ خرچ کرنے کے لئے سانپ
سونگھ جاتا ہے جیسے ایک ہی بھائی نے سب کو پالنے کا ٹھیکہ لے
رکھا ہے۔"
گلاب رائے بھی خاموش نہ رہ سکے بولے۔
"اچھا اچھا! اس کی ساری کمائی تم لے لینا۔ دو سال کے اندر
اندر میٹرک تو کر ہی لے گا پھر کام پر لگ جائے گا۔ ماں اور چھوٹے بھیا
کو کچھ دینے کی فکر تمہیں نہیں کرنی ہوگی۔"
رکھا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سب کچھ وہ کیسے برداشت کرتی
جا رہی ہے مگر گوپ تو اس کے سامنے گھر کا ایک لڑکا تھا کمانے نہ کمانے
کی ترازو میں اس کی قیمت کیوں لگائی جا رہی ہے؟ آخر بھپھکار کر بولی۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوپ کی آپ لوگوں کو بہت بے فکر
ہے تو پھر آپ اسے اپنے پاس ہی کیوں نہیں رکھ لیتے؟"
"نہ بابا۔" دیوی دونوں ہاتھ زور سے ہلا کر بولی۔ "ہمیں تو اپنی فکر ہی کافی ہے
اب اور مصیبت کون مول لے؟ کبھی سوٹ نہیں ہے تو کبھی بوٹ نہیں ہے
کبھی سکول کی فیس چاہیئے۔ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہی رہتی
ہے۔"
"اچھا اچھا، مت رکھنا۔ تیرے پاس رہتا ہی کون ہے۔ جہاں
اتنے لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ وہاں ایک میں بھی گزر کر لوں گا"
گوپ بولا۔
"اچھا یہ بات ہے؟ تین دن ٹھوکریں کھانے کے بعد
بھی تمہارا غرور نہیں ٹوٹا؟ اب فٹ پاتھ کی بھی ٹھوکریں کھا کر
دیکھو۔ تیرے جیسے بھائی کے بدلے اگر کسی جانور کو پالا جائے تو
کہیں بہتر ہے۔" گلاب غصے میں کانپتا ہوا بولا۔
اب ماں بھی ابل پڑیں: "بیٹا گلاب! ذرا زمین کی طرف دیکھ کر چلو
کیا معلوم ہمارے ہی نصیب سے تمہیں اتنی دولت ملی ہو۔ میرا کوئی اور ٹھکانہ
ہوتا تو اسی وقت بچوں کو گود میں چھپا کر چلی جاتی۔"
رکھا جانتی تھی کہ روز کی اس کھینچا تانی سے کیا نتیجے نکلتے ہیں۔
اس لئے اس نے گوپ کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کیا وہ اسے لیکر
گھر چلی آئی۔
گوپ بولا۔ "رکھا بھابی، کیسے ہیں یہ لوگ! تھوڑا سا روپیہ
اکٹھا کر لیا ہے تو چاہتے ہیں ہم لوگ ان کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر چلیں
اپنے اوپر تو قرضہ لیکر بھی روپیہ لٹاتے ہیں لیکن ہم ٹھہرے بیگانے
پھر بھلا ہماری تعلیم کے لئے وہ کیوں خرچ کرنے لگے۔"
رکھا دل ہی دل میں ہنس دی۔ وہ سوچنے لگی، کوئی بچے سے پیار
سے باتیں کرے تو کتنی سیانی باتیں کرتا ہے وہ گران دو برس کے اندر بیٹھ
کی نیت کتنی خراب ہو گئی ہے۔ اس کی حالت تو اس پیڑ کی مانند ہوتی
جا رہی ہے جس کی جڑیں تو کیڑے کھا گئے ہوں۔ مگر اوپر سے سوکھے تنوں
والی ڈالیاں سر اونچا کر کے آسمان کو چھونا چاہتی ہوں۔
گوپ کے آجانے سے رکھا کی تنہائی کافی دور ہو گئی۔ وہ جب اس
کے ساتھ بیٹھ کر سکول کی باتیں کرتا تو رکھا کو بھی اپنے طالب علمی کے زمانے
کی یاد آجاتی تھی اور وہ اپنی اس چھوٹی سی مگر بڑی لطیف زندگی کے متعلق
سوچتے سوچتے کھو سی جاتی تھی۔ مگر اس تفریح کے ساتھ ساتھ گھر کے

اخراجات کا مسئلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

ایک دن وہ گوتپ کا پھٹا پاجامہ سی رہی تھی اتنے میں گوتپ سکول سے لوٹ آیا اور اپنا جوتا ہاتھ میں اُٹھا کر بولا بھابی دیکھو یہ یہاں سے پھٹ گیا ہے۔

ریکھا نے دیکھا جوتے کا تلا گل گیا تھا اور اس تانبے کے پیسے کے برابر سوراخ ہو گیا تھا۔ گوتپ تھیلا رکھکر چارپائی پر لیٹ گیا۔

"کیوں، آتے ہو بے جی بھوگ لگانے کی جگہ کھٹیا پر براجمان ہو رہے ہیں؟"

ریکھا نے چڑانے کی غرض سے کہا۔

گوتپ نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھابی، مجھے نئی چھتری لیکر دو۔ بس چھتری کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہے لڑکے مجھے بوڑھا بوڑھا کہکر پکارتے ہیں۔ اور گوتپ کی آنکھیں بھر آئیں۔

ریکھا کے دل پہ چوٹ سی لگی۔ اُس نے اُٹھ کر گوتپ کو چوم لیا اُس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ گوتپ کو دلاسہ دینے کے خیال سے بولی۔

"دسویں جماعت میں پڑھتے ہو پھر بھی کبھی کبھی بچے بن جاتے ہو۔ آخر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

وہ گوتپ کے لئے تھالی میں کھانا لیکر آئی تو اُسے ہیرے سے کہے ہوئے اپنے الفاظ یاد آ گئے "نوکری کرکے خاندان کی نیّا تھوڑے ہی ڈبوؤنگی" وہ سوچنے لگی، اب تو خاندان کی لٹیا خود بخود ہی ڈوب رہی ہے۔ خاندان کے ہونہار اور لائق بچے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن گوتپ کو سکول روانہ کرکے وہ پھر خیالات کے سمندر میں ڈوب گئی اتنے میں ڈاکیے نے آکر ایک خط دیا جسے پڑھکر اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ پتھر کا بُت بنی بیٹھی رہی جب ہوا کے جھونکے سے خط اُڑنے لگا تب کہیں ہوش میں آئی خط کو مروڑتی اور بڑبڑاتی رہی۔ شیلو تو اب کیا کریگی؟ بیچاری اپنے بچوں کو تڑپتے کیسے دیکھ سکیگی؟ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں صرف شیلو ہی کیا جسے دیکھو وہ اِس قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے سب روپیوں کا راگ الاپ رہے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہر ایک اپنی سطح سے گرتا جا رہا ہے...

اگرچہ اس کی پیٹھ کواڑ کی طرف تھی پھر بھی کسی کے آنے کی آہٹ سُن کر اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتی ہوئی بولی "گوتپ، پانی کا گلاس تو دینا۔"

مگر جب چندن نے آکر اُسے پانی کا گلاس دیا تو اُس کی آنسو ڈالنے سے تر اور متعجب آنکھیں چندن کے چہرے پر جاکر اٹک گئیں۔ چندن نے دیکھا ریکھا کی آنکھیں کرب و درد سے پھٹ رہی تھیں چندن دل ہی دل میں ہنس دیا۔

یہ بدنصیب لڑکی کبھی دُکھ کا دامن چھوڑیگی بھی یا زندگی بھر آنسو بہاتی رہیگی۔

اتنے میں ہیرا بھی آ پہنچا اور بولا۔

"چندن، کل والی میٹنگ کس جگہ پر ہوگی؟ کوٹھاری تو اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ اُس کا مکان پانچ ہفتوں تک بند رہیگا۔"

"اب تو میرے ہاں کافی جگہ ہے۔"

تیز ہوا کی وجہ سے کھڑکیوں کے کواڑ کھٹکھٹا رہے تھے اور آسمان پر بادل چھاتے جا رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر میں بارش ہوگی۔ اس لئے چندن نے ہیرے کو ٹھہرا لیا۔

"چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو دامن سے پونچھتے ہوئے ریکھا بولی۔

"دُنیا میں یہ سب کیا ہوتا جا رہا ہے ہیرا؟ دو ایک رشتے داروں کے علاوہ باقی سب چوپٹ ہوئے جا رہے ہیں آخر ایسی ہوا چلنے کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟"

ہیرے نے دیکھا، ریکھا کی سوالیہ نگاہیں جواب سننے کے لئے بیتاب تھیں۔ چندن چپ کھڑا تھا۔ ہیرے کی نگاہوں نے گویا اشارے سے چندن کو کہہ دیا ہو کہ ریکھا اور تمہارے درمیان جو دیوار حائل ہے آج اُسے گرانے کا موقع ملا ہے۔

چندن نے نچلا ہونٹ گول کرکے اور مسکرا کر منہ پھیر لیا گویا ہیرے کی بات کا جواب اُس نے دیدیا ہو "جب وہ مجھے سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

ہیرے نے کہا بھابی تمہارے گھر میں تو گنگا بہہ رہی ہے، ایسے سوالات کا جواب میری نسبت چندن بہت اچھی طرح سے دے سکے گا۔"

یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا مگر کواڑ تک پہنچنے سے پہلے اُس نے ریکھا کو

۔ مجبور حالات سے کہتا تھا ان کے پاس میرے لئے فرصت کہاں ہے! انہیں کیا کیا شاید بھگوان کو بھی میری جان لینے کی فرصت نہیں۔ ہیر پھیر والے عالم میں سوچتا ہوں بار بار تم جیسی انجیلی لڑکی کو سمجھنے کے لئے اسے ایسے دیوتا کی ضرورت ہے۔"

بارش کا ایک نوٹنگا جھونکا آسمان کی تاریکی کو دھو کر وہ ڈپارٹمنٹ میں خاموش ہو گیا کمرہ پھر روشنی سے جگمگا اٹھا۔ چندن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگی۔ بولا۔

"سنا تم نے، آج تمہارے چندن کو راستے میں الجھی ہوئی اپنی ریکھا کو منزل تک پہنچانے کی فرصت مل گئی ہے۔"

ریکھا چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی جیسے اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کالی کالی گھٹاؤں میں بھی آفتاب چمک سکتا ہے۔ شکرگزار نگاہوں سے چندن کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ساحل کا سورج گھٹاؤں میں چھپ جائے اور راستے پر چلنے والے مسافر کا ہاتھ چھوڑ کر اسے وہیں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے۔"

"راستہ دکھانے والے کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اندھیرے میں بھی مسافر کو راہ دکھا سکے بشرطیکہ مسافر خود اپنا دامن نہ کھینچ لے۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ آج دنیا کے حالات سمجھنے کی فرصت تمہیں کہاں سے ملی؟"

ریکھا نے فوراً شیلونتی والا خط چندن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شیل نے لکھا تھا۔

"بہن! عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرے شوہر نے دو ہزار روپے لگا کر ریشم کے کپڑے کی گٹھڑی لی، لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی دکان۔ حیدرآباد میں جو دکان پانچ ہزار میں بیچ آئے تھے اس کی یاد آتے ہی منہ کو کلیجہ آجاتا ہے۔ مہینے دو مہینے کام چلا مگر اس سے آٹھ بچوں کی پرورش کہاں سے ہوتی! میں نے اپنے زیور گروی رکھ کر کچھ ادھر ادھر سے کر کے دو ہزار روپے اکٹھے کر کے دیئے تاکہ وہ دکان کے لئے ضروری مال لا سکیں۔ تین روز کے بعد جا کر دیکھا، بکس کا تالا ٹوٹا ہوا ہے دونوں کواڑ کھلے ہوئے ہیں اور سارا سامان غائب!"

"پھر کیا بتاؤں بہن، وہ کپڑے کا ٹھیلا چلانے لگے۔ جو حیدرآباد میں دکان پر بیٹھے بیٹھے مال کا آرڈر دیتے تھے وہ ٹھیلا کیا چلاتے! ٹھیلا چلانے سے ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اجمیر کی کڑی دھوپ میں بھٹکتے بھٹکتے ان کی گوری جلد سیاہ پڑ گئی ہے۔

چار پانچ دن ہوئے میں ان کے تھکے ماندے جسم کو دبا رہی تھی تو وہ بولے۔

"آج کندھوں میں بہت درد ہے۔"

میں نے کہا "شاید ٹھیلا چلانے سے ہوا ہو۔"

وہ بولے "پگلی، ٹھیلا کہاں سے آیا بچے کچھے کپڑے کی گٹھڑی بنا کر پھیری کرتا ہوں!"

یہ سن کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہ پھر بولے۔

"ابھی کیا ہوا ہے، ایسا برا وقت آ گیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ادھر ادھر مارے پھر رہے ہیں۔ ہم جیسے ان پڑھوں کے لئے تو مل میں کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ وہ بھی جب میاں بیوی دونوں مل کر کمائیں گے۔ تب جا کر گزارہ ہوگا۔ نہیں تو تم نے جو یہ چھوٹے چھوٹے پلے پال رکھے ہیں سب بھوکوں مر جائیں گے۔"

"بہن کیا بتلاؤں نہ جانے ان کی طبیعت میں اتنا چڑچڑاپن کہاں سے آ گیا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھی کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اتنے دنوں تک میں نے تمہیں اپنے دکھوں کی کہانی نہیں سنائی مگر آج صبر کا پیمانہ اپنی حدود پار کر گیا ہے۔ رو رو کر دل پھٹا جا رہا ہے۔ تم ہی بتلاؤ کیا سچ مچ ہی میرے دل کے ٹکڑے کتوں کی طرح میلے کچیلے ہو کر گلیوں کی خاک چھانتے پھریں گے اور ہم میاں بیوی اندھے بیلوں کی طرح مل میں کام کریں گے۔ بچوں کے پاس جوتے نہیں، کپڑے نہیں۔ وہ پڑھنے نہیں جا سکتے۔ دن بدن حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ چار دن سے اناج کے ڈبے خالی پڑے ہیں۔ میری دوسری پڑوسنوں کی حالت ہم سے بھی بدتر ہے۔ بتاؤں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔

تمہاری دکھیاری بہن

شیل۔

چندن کے لئے ایسی داستانیں سننا کوئی نئی بات نہیں تھی وہ مسکرا کر بولا۔

"تب تمہیں شیل ونتی نے ہی دنیا کی یاد دلائی ہے؟"

ریکھا اٹھ کھڑی ہوئی "بس، بس، مجھے اور کچھ نہیں سننا۔"

چندن کچھ دیر کے لئے گمبھیر ہو گیا۔ پھر مسکرا کر بولا "اچھا۔"

ریکھا دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چندن کتابوں کی الماری کی

طرف بڑھ گیا۔ ساری رات زبردست طوفان جاری رہا۔ رہ رہ کر بارش کی زوردار لہر آئی تھی اور پھر یکایک سناٹا چھا جاتا تھا دیواروں سے ٹپکتی ہوئی بارش کی بوندیں پانی کے گڑھوں میں گر رہی تھیں تمام رات ریکھا سسکتی رہی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تھی تو وہ انوکھے خواب دیکھنے لگ جاتی۔ کبھی وہ بڑے بڑے پہاڑ دیکھتی تو کبھی آگ کی چنگاریاں۔ کبھی دیکھتی کہ بارش کی بوندوں کو طوفان تیز رفتار میں اڑائے جا رہا ہے پھر جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلتی کھڑکیوں کی آواز سے اُس کا دل کانپ اُٹھتا تھا۔ اس کا دل بار بار اُس سے پوچھتا جو باتیں چندن سمجھ سکتا ہے، ہیرا سمجھ سکتا ہے اور گلیوں میں پھیری کرنے والا شیل کا بچہ سمجھ سکتا ہے وہ میری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟ آنکھ لگنے پر شیلو تی کو کہتے سنتی۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں... چار دن سے اناج کے ڈبے خالی پڑے ہیں...

صبح کو جب اُس کی آنکھ کھلی تو سامنے گوپ کی ٹوٹی ہوئی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

آج وہ روزانہ کے کاموں سے فارغ ہو کر چندن کی کتابوں کو دیکھنے لگی۔ اتنے دن وہ جن کتابوں کو کوڑا سمجھتی رہی تھی آج ان کو بڑے چاؤ سے پڑھنے لگی۔

چندن نہا دھو کر کمرے میں آیا۔ اُس کے بالوں میں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں انکو پونچھتے ہوئے بولا "کتابوں کی پوجا ہو رہی ہے یا اُنکا مطالعہ"؟

ریکھا ہاتھ والی کتاب الماری میں رکھکر اپنے آنچل سے الماری کی دھول اُڑاتی ہوئی چلی گئی۔ چندن اس کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنے بالوں کو پونچھنے لگا۔ مِل میں جانے سے پہلے وہ ریکھا سے بولا "آج چار بجے میرے دوست آئیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے، مگر ہونگے کتنے؟ اُن کے لئے...

ریکھا کے باپ بھی کبھی کبھی ایسا ہی کہتے تھے تو ریکھا کی ماں گھر میں سارا دن مصروف رہتی تھی۔ ریکھا دیکھتی تھی کہ محفل میں کس طرح گوشت کباب، برانڈی سوڈا اور سگریٹوں کا دور چلتا تھا۔

چندن بولا زیادہ دکھاوا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بارہ چودہ کپ چائے بنا دوگی تو بس کام چل جائیگا۔"

"میں ان کی خاطر تواضع بہت اچھی طرح کرونگی آپ بے فکر رہیں۔

مہمان روز روز تھوڑے ہی آتے ہیں۔"

میں نے کہا نہیں کہ خواہ مخواہ کے دکھاوے کی بالکل ضرورت نہیں تم عورتیں کبھی اپنے اصل حالات کے مطابق چل ہی نہیں سکتیں۔

ریکھا چڑ گئی۔

اتنے میں گوپ سکول کی کتابیں اُٹھائے منہ پھلا کر اس کے سامنے آکھڑا ہوگیا۔ بھابھی اور بھائی کی طرف دیکھتا ہوا بولا "مجھے چار کاپیاں چاہیں۔ میں نے پتنگیں بنا کر بیچیں تو دو کاپیوں کے دام نکل آئے باقی دو کاپیوں کے لئے پیسے چاہیئں۔"

ریکھا نے اُسے پیسے دے تو دئے مگر گھر کے خرچ کے لئے بقیہ پیسے دیکھکر اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالنا ہی ہوگا ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اس گھر کا بربادی کے گڑھے میں گرنا یقینی ہو جائے گا۔"

(۱۱)

دوسرے دن سکول میں ہیرے کے لئے وقت گذارنا مشکل ہوگیا۔ وہ بے چین ہو ہو اُٹھتا۔ رہ رہ کر ریکھا کی مایوس نگاہیں اُس سے پوچھ رہی تھیں، دُنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک دو کو چھوڑ کر سبھی رشتے دار کیوں گرتے جا رہے ہیں؟۔"

چھٹی کی گھنٹی بجنے پر وہ گھر نہ جا کر ریکھا کے پاس پہنچا۔ بولا "کس کی چٹھی تھی بھابھی؟"

شیلو تی کی۔ مگر صرف شیل وتی ہی تو نہیں ہے میں تو دیکھ رہی ہوں۔ کئی کھاتے پیتے گھر بھی چوپٹ ہوئے جا رہے ہیں اُس دن میری پھوپھی کی دیورانی آئی تھی۔ جبل پور سے لوٹ رہی تھی اُس نے بتایا کہ وہاں بھی لوگوں کا ایسا ہی بُرا حال ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں کے لڑکے بوجھ ڈھو رہے ہیں تو کچھ کے مٹھائیاں بیچ رہے ہیں اور کوئی قلی بن گئے ہیں۔ لکھنؤ، بمبئی کے حالات بھی یہی ہیں۔ یہاں بھی اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں پاپڑ اور بڑیاں بیچ رہی ہیں۔ پچھلے درجے کے لڑکے غبارے اور مٹھائیاں بیچتے پھرتے ہیں۔

"ریکھا بھابھی" ہیرا اچھی طرح آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس زمانے میں پیسہ ہی پیسے کو پیدا کرتا ہے۔ امیروں کی دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور غریبوں کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں وہ اپنی محنت بیچ کر روکھی سوکھی کھا رہے ہیں۔ سب سے بُرا حال

متوسط طبقہ کا بے عملی کی سطح سے نچلی سطح پر ختم ہوتی جارہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ طبقہ بھی آخر نچلے طبقے میں مل جائے گا۔"

زیکھا نے شک بھرے لہجے میں پوچھا "تو اس کا مطلب ہے میرے بھتیجے کہتے ہیں کہ انہیں مل میں ہی کام کرنا پڑے گا۔"

"ہاں یہی محنت اور مزدوری ہی نچلے طبقے کو زندہ رکھتی ہے ورنہ وہ کہیں کے نہ رہیں۔"

زیکھا نے جلدی سے سانس لیتے ہوئے کہا "بس بس۔ اور زیادہ کڑوی باتیں مت کرو۔"

ہیرا اسے سہمی ہوئی دیکھ کر چپ ہوگیا اور دل ہی دل میں بولا "بیچاری لاڈ پیار سے پلی ہوئی گول ڈالی!" پھر زیکھا سے مخاطب ہوکر بولا "جس حقیقت نے انسان کی زندگی کو زہر بنا کردیا ہے اس کو سننے میں بھی تم گھبرا رہی ہو؟"

زیکھا آنسوؤں سے تر آنکھوں سے ہیرے کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ ہیرے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"صرف ہم سندھی ہی نہیں، مراٹھوں، بنگالیوں اور گجراتیوں سبھی کی یہی حالت ہے۔ جن کے پاس پونجی ہے اور پیداوار کے ذرائع یعنی کھیت کارخانے خریدنے کی طاقت ہے ان کی دولت دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے اور جن کے پاس اتنی دولت نہیں وہ چاہے کتنی بھی کوشش کریں، کتنا ہی امیروں جیسا دکھاوا کریں مگر بڑھتی ہوئی بیکاری اور مہنگائی سے انکی اقتصادی حالت ڈانواڈول ہو جاتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"پیداوار کے طریقے ہی ایسے ہیں۔ جو چیز کارخانے میں انسان کی اجتماعی محنت سے پیدا ہوتی ہے اس کی بکری ہونے پر وصول شدہ نفع سب میں ٹھیک ڈھنگ سے تقسیم ہونے کے بجائے ایک دو یا کچھ ہی اشخاص کی جیبوں میں چلا جاتا ہے وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح محنت کشوں کو تھوڑی سے تھوڑی اجرت دیکر ان سے زیادہ کام لیا جائے اور پیدا شدہ اشیاء مہنگی بیچی جائیں انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ لوگ بیکار بھوکے اور ننگے رہتے ہیں تم جانتی ہو کہ امریکہ کے دولتمند ہر سال اناج کی کافی مقدار عوام میں تقسیم کرنے کی بجائے سمندر میں ڈبو دیا جا دنیا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ جنگ کا بھوت دکھا کر دنیا میں حالات کا ماحول پیدا کررہے ہیں اور اس بہانے سے اشیائے صرف کی بجائے جنگی ہتھیار اور اسلحہ جات بنارہے ہیں۔"

زیکھا مایوس ہوگئی۔ وہ بولی "ایسی سازشوں کا کبھی خاتمہ بھی ہوگا یا ایک دن یہ دنیا جہنم کے گڑھے میں جاگرے گی؟"

ہیرے نے کہا "انسان کی روح مردہ نہیں ہے۔ وہ تھوڑے وقت کے لئے مظالم برداشت کرسکتا ہے مگر ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں سہے گا۔ بھوک وہ آگ ہے۔ جو انسان کو کبھی خاموش نہیں رہنے دیتی آج غلام اور فاقہ زدہ محنت کش طبقہ جاگ اٹھا ہے اور وہ ایک ایسی آگ جلا رہا ہے جس کے شعلوں میں یہ گلا سڑا نظام جل بھن کر بھسم ہو جائے گا۔"

زیکھا کو ہیرے کی باتوں میں ایک روشن دنیا کی جھلک دکھائی دیتی تھی وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ ہیرا اب کافی دیر ہوچکی ہے کہکر چلا گیا۔

شام کے چار بجے کا وقت تھا۔ چندن کے سارے دوست ٹھیک وقت پر آپہنچے۔ زیکھا نے سوچا وقت کے اتنے پابند شاید کبھی کچھ رہتے ہوں۔ مگر پاس سے کوئی مرہٹہ لگ رہا تھا کوئی گجراتی اور کوئی مدراسی۔ وہ بہت سوچنے کے بعد بھی سمجھ نہ سکی کہ آخر ایسی کونسی بات ہے جو ان مختلف فرقوں کے لوگوں کو ایک جگہ پر منظم کررہی ہے؟

زیکھا جب چائے کی پیالیاں لیکر کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے ایک کو کہتے سنا "سوائے کچھ کلرکوں کے سبھی محنت کش ہڑتال میں حصہ لیں گے چونکہ ہم سب اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں اس لئے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد ہی ہمیں منظم کرتی ہے۔"

دوسری بار جب وہ اندر گئی تو کوئی کہہ رہا تھا "پچھلے سال مل کو اتنا فائدہ ہوا پھر بھی ہمیں بونس نہیں ملا۔ سارا منافع شیئر ہولڈروں میں بٹ گیا۔ مل کے ڈائرکٹر، منیجر اور افسر موٹی بڑی تنخواہیں لیکر چین کی بنسری بجاتے رہے مگر ہمیں پیٹ بھرنے تک کو مناسب تنخواہ نہیں ملتی، ہمیں ہڑتال کرنی چاہیئے۔"

تیسری بار کوئی کہہ رہا تھا ہمارے لئے ہڑتال کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ ہڑتال کے بغیر مالک ہماری مانگیں کبھی قبول نہیں کریں گے ہڑتال ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں کیونکہ ہڑتال کی حالت میں ان کا منافع رک جاتا ہے ہم محنت کشوں کی

حالت ویسے ہی کونسی اچھی ہے جو بعد میں خراب ہو جائیگی ہے"
ریکھا جب باہر نکلی تو اس کے دل میں سوال اُٹھا۔ وہ نڈر اور بہادر یہی لوگ تو ہیں جو اس نظام کو ختم کریں گے۔

(۱۴)

ساون کی بارش اپنے پورے جوبن پر تھی۔
ریکھا گاڑی سے اُترنے کے بعد ٹانگا سٹیشن کے شیڈ میں کھڑی ہو کر بارش کی طرف اور اُداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بارش کی بوندیں لہروں کی شکل میں زمین پر گر کر اپنا وجود کھو دیتی تھیں کچھ بوندیں پانی کے بلبلے بناتی تھیں جو فوراً ہی پانی میں مل جاتے تھے۔

بارش کی تیزی کے ساتھ ریکھا اپنے چھوٹے سے گھر اور دنیا کے اہم حصے کے متعلق جس میں اُس کے گھر جیسے کئی گھر شامل تھے سوچ رہی تھی۔ ریکھا کو ایک چھتری کی ضرورت تھی جس سے وہ بارش سے اپنا بچاؤ کرتی ہوئی گھر تک پہنچ سکے۔ اُس کے گھر کو ریکھا کی ملازمت کی ضرورت تھی۔ ایسے ہزاروں گھروں کی بیشمار ضروریات تھیں۔ ریکھا کو محسوس ہوا اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے انسان اپنی ضروریات زندگی پوری نہ کر پانے کی وجہ سے بارش کی بوندوں کی اِن لہروں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر بارش تھم گئی اور ریکھا نے گھر کی راہ لی۔ اُس کے پاؤں ایڑی تک پانی میں چل رہے تھے مگر وہ اپنے خیالات میں محو تھی آج اُس کے دل میں بڑی وسعت آگئی تھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اُسے اپنے پر تعجب ہوا کہ کس طرح وہ آج ایک افسر کو کھری کھری سُنا کر اپنی نوکری کو ٹھکرا چلی آئی ؟ اس بات کا اُسے کوئی رنج نہیں تھا کہ اُسے ملازمت نہیں ملی۔
اُس کا دل پتھریلی سڑک پر بہتے ہوئے تیز پانی کی مانند تکلیفوں سے آزاد ہو کر تصور کے سمندر میں بہا جا رہا تھا۔
رات کو چندن کے لئے کھانا پروستے وقت بولی "آج میں نوکری تلاش کرنے گئی تھی۔"
"تم ؟"
"ہاں میں۔"
"پھر کیا ہوا ؟"
"میرے سامنے ایک افسر انگریزی میں ایک مرہٹے سے کہہ رہا تھا"

سندھیوں کے آنے سے یہاں کے مقامی باشندوں میں بیکاری اور بڑھ گئی ہے ان سے کوئی پوچھے کہ انہیں پاکستان چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی ؟ سب کہتے ہیں ہم پاکستان میں ایسے تھے ویسے تھے۔ ہماری وہاں اتنی دوکانیں تھیں، اتنی زمین تھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان بزدلوں ڈرپوکوں کو یہاں رہنے دیکر مقامی باشندوں کو بیکار کر کے سرکار کو کیا ملا ہے ؟"
چندن کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ اُس کی باتوں کو غور سے سُن رہا تھا۔

ریکھا بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔
"میں سمجھ گئی کہ اشارہ کس کی طرف ہے لہٰذا میں نے بھی کہہ دیا یہاں شہیدوں کے خون سے ہندوستانی تواریخ کے ورق رنگے ہوئے ہیں اگر ہم انگریز دگت ٹھکر وہاں بیٹھے رہتے تو ہم بھی اپنی جان بچا کر یہاں نہ آسکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ بھی ہماری جگہ ہوتے تو ڈرپوکوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور یہاں ہندوستان کی بیروزگاری کے اسباب ہم سندھی ہرگز نہیں ہیں۔"
اتنا کہکر چندن کا فیصلہ سُننے کے لئے ریکھا خاموش ہو گئی۔
چندن اطمینان سے کھاتا رہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد آنگن میں اُگی ہوئی گھاس پر منہ صاف کرتے ہوئے بولا "پھر کیا کہا افسر نے ؟"
"بولا لڑکی ! تم یہاں نوکری تلاش کرنے آئی ہو یا لیکچر دینے۔"
چندن پھر چُپ ہو گیا۔
ہاں ریکھا چُپ نہ رہ سکی۔ مگر یہاں کے لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں ؟
ہم نے ان کا بگاڑا ہی کیا ہے ؟ سندھی بھی تو محنت کر کے کھاتے ہیں ؟"
چندن نے جواب دیا" اُن کا کچھ نہ کچھ تو ضرور بگڑا ہے سندھیوں کے آنے سے بیوپار میں نوکریوں میں اور مارکیٹ میں بلکہ جہاں بھی اُنہوں نے ہاتھ ڈالا ہے۔ مقامی لوگوں کی منافع خوری میں کمی واقع ہوئی ہے۔"
"مگر اس میں ہمارا کیا قصور ؟ ہمیں بھی تو جینا ہے ؟"
"ریکھا، ہمارا ڈھانچہ ہی ذاتی مفادات پر بنا ہوا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ کسی کی روٹی چھن جائے چاہے کوئی گر پڑے

نہ ہر ایک اپنا کندھا ملا کر آگے کو نکل جانے کی کوشش کرے گا۔ خود غرضی نے ہر انسانیت اور بھائی چارے کے جذبے پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ہم سنتے آئے ہیں مگر یہاں کے رہنے والے بھی آپس میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہے۔ ایک طرف ہزاروں گجراتی سیٹھ اور کنٹریکٹر وغیرہ عالیشان محلوں میں رہتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف انہیں کے بھائی فٹ پاتھ پر دن کاٹ رہے ہیں۔ اُن کی زندگی جانوروں سے بھی گئی گذری ہے۔ اس طرح تم دیکھو گی کہ حقیقی طور پر یہ فرق امیروں اور غریبوں کے درمیان ہے۔ لہٰذا ہم سندھیوں کو یہاں کے غریب لوگوں سے مل کر امیروں سے ٹکر لینی ہوگی۔ جب تک ایسا انتظام نہیں ہوتا کہ سرکار ہر ایک شہری کے اناج کپڑے اور مکان دینے کی ضمانت دے تب تک یہ حالات اور نفرت کی یہ دیواریں قائم رہیں گی۔"

چندن نے دیکھا۔ ریکھا کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے شاید اُس کا دھیان اس طرف نہ ہو۔ یہ خیال کر کے وہ بات بدلنے کے لئے بولا "اندھیری میں ایک سندھی نے بنیان اور سویٹر بنانے کی فیکٹری کھولی ہے۔ پچیس تاریخ تک درخواستیں طلب کی ہیں۔ تم بھی ایک بھیج دو نہ؟"

ریکھا پر بجلی سی گر پڑی۔ اُس نے ہاتھ کا کور تھالی میں رکھ دیا "میں نے کیا بنیان اور سویٹر بنانے کے لئے ہی میٹرک پاس کیا تھا؟ یہ کیسی زندگی ہے؟

میں کام کرنا چاہتی ہوں تو کوئی اچھا کام بھی نہیں ملتا۔ میں فیکٹری میں جا کر کیسے بنیان اور سویٹر بناؤنگی؟

گوپ بستر بچھاتے ہوئے کہنے لگا "بھابھی، اگر کل بھی آج جیسی بارش ہوئی تو میں سکول نہیں جا سکونگا۔ چھتری تو پہلے ہی پھٹی ہوئی تھی اُس پر آج کے طوفان نے تو اس کا کچومر ہی نکال دیا ہے اور پھر میری کل سکول جانے کے لئے قمیض بھی نہیں ہے۔"

ریکھا کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ ایک نادان سی بچی ہے جسے ماں نے کان پکڑ کر چانٹا رسید کر دیا ہو۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر ڈالا کہ وہ کوئی بھی نوکری کرے گی مگر گوپ کو ضرور پڑھائیگی۔

پچیس تاریخ میں ابھی دس دن باقی تھے۔ اتنے دن ریکھا بیکار نہ بیٹھی۔ نوکری کے لئے دفتروں کی خاک چھانتی رہی۔ مگر کہیں نوکری ہو تو ریکھا کو ملے۔ ملازمت کی جگہ ہر روز اُسے بیکاروں کے جھنڈ کے جھنڈ دکھائی دیتے۔ دل میں ان مجبور انسانوں کے لئے ہمدردی رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیکار پھر رہے ہیں اگر ان کی قوت کا بھی استعمال کیا جاتا تو ملک کتنا ترقی کر جاتا؟ گاڑی جب تیز رفتار سے چلتی تھی تو دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گھر اور پھوس کی جھونپڑیاں دیکھ کر اُس کی زبان پوچھ اُٹھتی کیا۔ ان سب کو مرین ڈرائیو اور چرچ گیٹ کے رہائشی بنگلوں میں بدلا نہیں جا سکتا؟

مہالکشمی کے پاس چھوٹے چھوٹے مکان بارش کے پانی کے نیچے ڈوب گئے تھے۔ اخبارات میں اُن کی تصویریں دیکھ کر ریکھا ایک دن وہاں اُتر پڑی۔ وہاں کا منظر دیکھ ریکھا کے ہوش اُڑ گئے۔ پیڑوں کے نیچے دھوپ میں کھڑے کالے انسانوں کے خاندان اپنی ڈوبتی ہوئی جھونپڑیوں کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کھانا پکا رہے تھے۔ ریکھا کی رگ رگ کانپ اُٹھی۔ اُس نے سوچا اگر اس ملک پہ حکومت کرنے والے خود بھگوان بھی ہوتے تو وہ بھی مجرم سمجھے جاتے۔ مگر اس سرکار کے خلاف لوگ بغاوت تک نہیں کرتے اندھوں اور بہروں کی طرح ہم یہ بدانتظامی اور مظالم چپ چاپ دیکھتے اور برداشت کرتے رہتے ہیں۔

وہ رات کو چندن سے کہنے لگی "آج جو کچھ دیکھ کر آئی ہوں اُس نے میرے دل کو سخت چوٹ پہنچائی ہے۔ جب انسان تڑپ تڑپ کر اپنے آشیانوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے ہیں تب ان امیروں اور وزیروں کی سمجھ اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر کے کہاں چرنے چلی جاتی ہے کیا؟"

"اور جس کی انسانیت جاگ اُٹھتی ہے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنے کو نبرد آزما کر لیتا ہے پھر اُسے اس کا خیال ہی نہیں رہتا کہ اُسے دوسروں کی زندگی سے کیا لینا دینا۔ ہر ایک اپنے اعمال کے بس ہوگئے۔"

یہ سوچ کر کہ آخری الفاظ ایک دن اُسی نے چندن سے کہے تھے وہ شرما گئی۔

چندن نے ریکھا کے جذباتی چہرے کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

ابھی کیا دیکھا ہے، بیچارے محنت کشوں کی زندگی کو قریب سے دیکھو گی تو تمہیں رونا آجائے گا۔

دوسرے دن ہیرا آیا تو ریکھا اُس سے بھی یہی باتیں کرنے لگی۔

"ہیرا! غریبی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سائنس نے جو اتنی ترقی کی ہے۔ وہ کیا صرف امیروں کے لئے جن کے پاس عیش و آرام کے سب ذرائع موجود ہیں۔ غریبوں کے لئے نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا۔ رہنے کی جھونپڑیاں بھی گندی گلیوں میں پہلے میں اُن کی عادتوں کو بُرا بھلا کہتی تھی مگر اب دیکھتی ہوں کہ یہ عادتیں بھی حالات کی پیداوار ہیں۔"

چندن بولا "ہیرا اب تمہاری بھابی آہستہ آہستہ سچائی کو پرکھنے اور سمجھنے لگ گئی ہے۔"

"مگر جیسے جیسے سچائی کھل کر میرے سامنے آتی جاتی ہے میں اور بھی اُداس ہوتی جاتی ہوں۔ زندگی کی ندی کو پہاڑوں کے آنچل سے کل کل کرتے بہتے زمین کو سرسبز اور شاداب بناتے ہوئے سمندر میں جا کر ملنے کی بجائے اُسے چھوٹی چھوٹی نالیوں اور گٹھ میں سڑتے دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔"

"ریکھا، سچائی کے راستے پر چلنے والا ہر ایک مسافر پہلے دُکھ کی آگ میں جلتا ہے لیکن اُسے چین تبھی نصیب ہوتا ہے جب وہ زندگی کے دریا کو میدانوں کی طرف موڑنے کے لئے خود کام کرنے لگتا ہے"

ریکھا نے ان الفاظ میں اتنی سچائی دیکھی کہ بہت دیر تک چندن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ چندن کے یہ الفاظ صرف الفاظ نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے ایک اٹل سچائی چھپی ہوئی تھی ریکھا نے اُسے کبھی ایک منٹ بھی بیکار ضائع کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ریکھا نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم کہ زندگی کی جن گھڑیوں کو میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے حاصل کرنے کے ارادے کر رہی تھی ان کا استعمال سماج کی بھلائی اور عوام کے سُکھ چین کے لئے ہو رہا ہے۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ریکھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی چارپائی کے پاس اُس پر جھکا ہوا ہے۔ اُس کی گرم سانس اُس کے چہرے کو چھو رہی ہے وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔ بتی جلائی تو دیکھا چندن اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا وہ اُس کے قریب گئی اور پھر بتی بجھا کر لیٹ گئی۔

وہ کافی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ چاہے کتنا بھی چھپائے مگر اُس کا چہرہ پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ یقیناً اُسے بہت چاہنے لگے ہیں۔ پھر یکایک اُسے خیال آیا۔ ابھی دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہے جس کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے "یہ کیسے ہوگا! یہ کیسے ہوگا؟

(۱۳)

چندن جس مل میں کام کرتا تھا اُس میں ہڑتال شروع ہوگئی تھی اور ہڑتال کو پورے سولہ دن ہو گئے تھے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی ہڑتال اکیس تاریخ کو شروع ہوئی تھی مہینے کے سات دن اور بیت گئے مگر تنخواہ نہیں ملی۔ پاؤڈر، صابن اور دہی وغیرہ منگوانا بند ہوگیا۔ اب اناج گھی اور تیل سلیٹ کی بھی تنگی ہونے لگی۔

ریکھا نے جھنجھلا کر شوہر سے کہا اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟"

چندن نے تیوری چڑھا کر کہا "تکلیف؟ تکلیف کا تو تمہیں ابھی علم ہی نہیں تکلیفیں تو حقیقی معنوں میں ہمارے مل کے مزدور اٹھا رہے ہیں ہم کلرکوں کو تو صرف تکلیف کی ہوا سی لگی ہے آج ہمارا جلسہ ہونے والا ہے چل کر دیکھو نا کہ مزدوروں کی بستی کی کیا حالت ہے؟"

ریکھا شام کو وہاں گئی۔ بستی کو دیکھ کر وہ سُن ہوگئی۔ مرجھائے چہروں والی عورتیں، کمر خمیدہ مرد، کالے کلوٹے اور ننگے ادھ ننگے بچے، اُداس اور مایوس چہرے، دُبلے پتلے اور دُبلے پنجرے سے ڈھانچے یہ سب دیکھ کر ریکھا کا دل کانپ اُٹھا۔

بستی کی ٹیٹوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا جنگل تھا اور اس کے پیچھے میدان۔ وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں جمع ہوئے تھے۔ شروع میں ایک لڑکی نے گیت گایا پھر کئی لوگوں نے تقریریں کیں۔

ریکھا جلسے سے لوٹی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان پر چھائی ہوئی بچی کھچی گھٹائیں بھی دور ہوگئی ہوں۔ دن کی صاف اور نرمل روشنی کو پا کر گلیاں اور کھڑکیاں۔ ۔ ۔ ۔ سبھی روشن ہو اُٹھی ہوں۔

ایک پتلی اور لمبی عورت نے کہا تھا۔ ہمیں یہ تکالیف صبر سے برداشت کرنی چاہئیں۔ چونکہ ہم سب سچائی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

ساری دھرتی ہاتھوں میں جھلکی ہماری سچائی سورج کی طرح روشن ہے یہ وہ لڑائی ہے جو کبھی پنجاب اور سب فرقوں کے لوگ مل کر لڑ رہے ہیں۔ مزدور کسان، دھوبی، موچی، بھنگی، ڈرائیور اور مچھیرا سب ہماری فوج کے سپاہی ہیں۔ ہم غریب ہیں مگر ہم کسی سے بھیک نہیں مانگتے۔ ہم کتے نہیں ہیں جنہیں ٹکڑا دے کر مطمئن کیا جا سکے ہم اپنی محنت کا جائز حق مانگتے ہیں۔ ہم دو ہاتھوں سے کام کرتے ہیں اسی لئے کہ ایک ہاتھ کی محنت سے اپنے پیٹ کا گذارہ کریں اور دوسرے ہاتھ کا پھل حاصل کر کے ہمارے بچے بوڑھے سب چین کی زندگی بسر کریں مگر حالت یہ ہے کہ ہم کو روکھا سوکھا تک کھانے کو نہیں ملتا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟"

ریکھا نے اچھی طرح دیکھا تھا اُس عورت کی پیشانی چمک رہی تھی۔ بھوک اُسے جلا نہیں پائی تھی بلکہ اُلٹے وہ خود جل کر اپنا شعلہ اس عورت کے چہرے پر پھیلا رہی تھی۔ جلسے والے گیت کے مصرعے بھی اُسے خوب یاد تھے:

آج چاروں اور ہی ہڑتال ہے۔
دُکھوں کی دھرتی پر اک بھونچال ہے۔
لڑ رہا مزدور بازی ہاتھ ہے
زندگی دھرتی نہیں وشواس ہے

دوسرے دن جلسے سے واپس آتے وقت چندن کو بہت دیر ہو گئی۔ چندن کپڑے بدل کر بیٹھا تو ریکھا اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو کر دوپٹے کا دامن انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "ایک خوشخبری سناؤں؟"

"سناؤ کونسی خوشخبری ہے جس سے تم اتنی خوش ہو رہی ہو!" اُس نے ریکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہی اُسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے کہ وہ اپنے دل کی بات ظاہر کر سکے مگر چندن کو اپنی طرف دیکھتے رہنے کی وجہ سے اُسے بولنا ہی پڑا۔

"مجھے اُس اندھیری والی فیکٹری میں نوّے روپے ماہوار کی نوکری مل گئی ہے۔"

چندن نے جلدی اُٹھ کر ریکھا کی ٹھوڑی اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "سچ؟"

ریکھا نے آنکھیں اوپر اُٹھا کر جواب دیا "ہاں سچ!"

چندن کو خوش دیکھ کر اُس کا دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ وہ دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور بار بار اپنی ٹھوڑی زور زور سے پونچھنے لگی۔

دوسرے دن وہ فیکٹری سے لوٹی تو چندن کو آنگن میں چکر لگاتے دیکھا۔ ریکھا جان بوجھ کر اس کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے سیدھے دوسرے کمرے میں چلی گئی اندر کتنے ہی اور جانے ان کہے کئی سوال تو حل کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ گئی جب ہیرا فارغ ہو کر آیا تو ریکھا بولی۔

"ہیرا! میں کل سے نوکری کرنے لگ گئی ہوں۔"

اس کے ہونٹوں پر فخر کی جھلک دیکھ کر ہیرے کو لگا جیسے پودے کو اتنے دن پانی دے کر سینچتا رہا ہے وہ آج پھولوں سے لہلہا رہا ہے۔

ریکھا بولی "مگر عورت نوکری کرے تو اس میں مرد کے لئے فخر کی کونسی بات ہے؟"

"کیوں نہیں؟ ایک عورت اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جب تک عورت کو اقتصادی آزادی نہیں ملتی تب تک وہ پوری طرح سے ترقی نہیں کر سکتی اور جب تک ترقی کی طرف نہیں بڑھتی تب تک وہ زندگی کا سچا ساتھی نہیں بن سکتی۔"

ریکھا تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں ڈوب گئی پھر اِٹھلاتے بچے کی طرح بولی۔

"ایسے جواب میرے دماغ میں کیوں نہیں آتے؟"

ہیرا ہنس پڑا اور بولا "ہر نئے راستے کے مسافر کو مشق کرنی پڑتی ہے تم جس نئی راہ پر گامزن ہو اس کے لئے بھی کافی مشق کی ضرورت ہے۔"

اتنے میں رادھا آ پہنچی کہنے لگی "ریکھا بیٹھی ہو؟ تین بار تمہارے لئے پوچھ گئی ہوں تمہارے بغیر تو پڑوس سونا ہو جاتا ہے مگر یہ تو بتلاؤ جس مل میں تمہارے پتی کام کرتے ہیں اس میں ہڑتال ختم ہو گئی یا نہیں؟"

ریکھا نے کرسی پر لیٹے جواب دیا "آج تو اخبار میں پڑھا تھا کہ کپڑے کی اور کئی ملوں کے مزدوروں نے بھی ہمدردی کے طور پر ایک دن کی ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

رادھا آنکھیں پھاڑ کر بولی "اتنی ملیں بند رہیں گی تو کیا کپڑا مہنگا نہ

ہو گیا؟

اِس سے تو ملک کا کافی نقصان ہو گا۔ مزدوروں کو صرف اپنی تنخواہ بھتّے کی لگی ہوئی ہے۔ اِنہیں اپنے ملک کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیئے۔"

ریکھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"دیدی، اب تو تم بڑی دیش بھگت بن گئی ہو مگر ذرا اس بات کا جواب تو دو کہ کیا صرف مزدوروں نے ہی حب الوطنی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ کیا سرکار اور سرمایہ دار جاہل اور عقل کے دیوالیئے ہیں۔ جو انہیں دیش کی آمدنی کا خیال نہیں رہتا اتنی ملیں بند رہنے کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اُس کو برداشت کرنے کے لئے وہ تیار ہیں مگر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کو پیٹ بھرنے تک کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتے؟"

رادھا لاجواب ہو گئی مگر یوں ہار ماننے کے لئے وہ تیار نہ تھی۔ بولی "ریکھا، جس آدمی کو خدا جس طبقے میں پیدا کرتا ہے اُسے اُس میں ہی صبر کر کے رہنا چاہیئے۔"

ایسی باتوں کے سلسلے میں پہلے ریکھا چپ ہو جاتی تھی مگر اب اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اُس کا شعور اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہر انسان کی اُمیدیں اور خواہشات اس کے جسم کا ایک حصّہ بن گئی تھیں۔ بولی۔

"دیدی ہم کتنے گر گئے ہیں! دوسروں میں اور اپنے میں کتنا فرق سمجھتے ہیں؟

کیا غریبوں اور مزدوروں میں ہماری جیسی جان نہیں ہے؟ ہمیں خدا کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی جبکہ ہم ایک دوسرے کو بھائی بھائی بھی نہیں سمجھتے۔ ہم مزدوروں کے دکھوں کو جانوروں کی مانند دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے نام پر کلنک نہیں؟" کہتے کہتے ریکھا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

رادھا نے کہا "بہو، تمہاری ایسی باتوں نے تو موہ لیا ہے۔ چاہتی ہوں جو وقت مندر میں جا کر کاٹتی ہوں وہ تمہارے پاس بیٹھ کر گذاروں۔"

چندن نے یہ ساری باتیں سُن لی تھیں [illegible] بولا "جب پھول میں خوبصورتی اور خوشبو دونوں آجاتی ہیں تو وہ کتنا پیارا لگتا ہے!" اور وہ لمبی سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیرا، رادھا اور ریکھا کو وہیں چھوڑ کر چندن کے پاس جا پہنچا۔ "کیوں جی! آج آسمان میں اتنی دلچسپی کیسی؟ خیر تو ہے؟"

چندن ...... بازو سے پکڑ کر اُس کو اندر لے گیا کافی دیر تک دونوں باتوں میں مشغول رہے۔ ریکھا وہاں آئی تو بولی۔

"ہم نے پڑوس میں گیت سکھانے کی ایک کلاس شروع کی ہے میرا خیال ہے وہاں وہی گیت سکھلائے جائیں جن میں نئے خیالات اور نئی اُمنگیں ہوں جو عام گیتوں کی طرح سُلا نہ دیں بلکہ بیداری کے جذبات پیدا کریں۔"

چندن نے جواب دیا "تمہارے جیسے ہی باہمت اور مشتاق لوگوں کی ایک سوسائٹی ہے جس کا نام انڈین پیپلز تھیٹرس ایسوسیشن ہے۔ وہ بمبئی میں ہی کام کرتی ہے۔ اُن کے گیتوں، ڈراموں اور ناچ میں فن کے ذریعے انسان ذات کی خدمت کرنے کا پیغام ہوتا ہے۔ کل چلو گی؟"

ہیرا سوچتا رہ گیا۔ "یہ چار دیواری سے باہر نکلی [illegible] نکلی۔"

(۱۴)

"ریکھا بہن! اُٹھ کر بتی تو جلاؤ۔ ایسے اندھیرے میں بھی کتاب منہ پر رکھے بیٹھی ہو؟"

ریکھا نے اُٹھ کر روشنی کی اور کہا: "دیدی، آج تو مجھے بتی کی روشنی بھی دھندلی معلوم ہو رہی ہے۔"

رادھا وہیں آنچل گلے میں ڈال کر سندھیا کرنے لگ گئی۔ ریکھا منڈراتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے صبح والا واقعہ ناچ رہا تھا۔ وہ نوکری پر جانے والی ہی تھی۔ رومال

ہوئے بھی وہ اُس وقت اُس نے محسوس کیا تھا کسی کی دو آنکھیں اُس سے گزرتے ہوئے واقعوں کو دیکھ رہی ہیں۔ اُن نگاہوں نے جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلا دی۔

اُس نے آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں کہ کسی نے باہر سے پکارا "مسٹر چندن!"

دو پولیس سپاہی اندر داخل ہوئے: "مسٹر چندن، شروان جی مل کا مزدور یونین کے جائنٹ سیکرٹری، آپ کو قانون کے خلاف ہڑتال کروانے اور مزدوروں کو بھڑکانے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے؟"

پاس پڑوس کے سبھی لوگ آ جمع ہوئے۔ ریکھا کچھ گھبرائی مگر چندن پر کوئی اثر نہ ہوا، سپاہیوں نے گھر کی تلاشی لی۔ الماری سے کتابیں نکال کر کمرے میں ڈھیر لگا دیا۔

گوپ نے بھرائی ہوئی آواز میں ریکھا سے کہا: "بھابھی، جن کتابوں کو بھیا جان کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں ان کو انھوں نے کتنی حیوانیت کے ساتھ پھینک دیا ہے۔"

رادھا سیدھے سپاہیوں کے سامنے جا کر کہنے لگی: "تم لوگ ان کو کیوں پکڑتے ہو یہ ایمان دار آدمی ہیں یہ کسی کی ہرگز تنگ نہیں کر سکتے۔"

چندن نے جاتے وقت ایک ایسی پیار بھری نگاہ سے ریکھا کی طرف دیکھا تھا جسے وہ ابھی تک آنکھوں میں سمائے پتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رادھا نے سندھیا ختم کر کے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارا شوہر تو اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جیل گیا ہے کوئی چوری تھوڑی ہی کی ہے آجکل تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی چنے اور مٹھائیاں بیچتے ہیں، دودو دن جیل میں رہ کر آتے ہیں دیکھنا میرا سندھیا کا مالک کس طرح دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرتا ہے۔"

ریکھا نے کہا: "ماں جی، تم تو جیسے میری بہن شیلوتی ہو، مجھے ان کے جیل جانے کی بالکل ہی فکر نہیں مگر نجانے کیوں ان کے بغیر یہ گھر سونا سونا سا لگ رہا ہے بھائی کیا اندر آتے جھجک رہی ہے۔"

"کبھی دیکھے نہیں ہیں ہوں اس لئے آج میں تمہارے ہاں آ کر سو رہی گی۔" رادھا دل سے ہنسنے لگی کہ باہر نکلی ہی تھی کہ گلاب اپنے بیوی

اور ماں کے ساتھ آ پہنچا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ دوسروں کے لئے مرنا چھوڑ دے۔ آجکل چور ہی دنیا کے مالک بنے بیٹھے ہیں اگر ہمیں بھی شکم سے جینا ہے تو چور ہی بننا پڑے گا۔ مگر وہ تو مجھے ہی قصوروار کہتا تھا۔ اُسے اپنا خیال نہیں تو نہ سہی مگر اپنی گوپ راج کا تو کچھ خیال کرنا چاہئے تھا۔" کہہ کر گلاب نے تیکھی نگاہوں سے ریکھا کی طرف دیکھا۔

ریکھا کا دل نفرت سے بھر اُٹھا۔ دیوی تو اپنی چمکتی ساڑھی کو ہی ٹھیک کرنے میں مصروف تھی۔ ماں نے کہا۔

"بیچارہ جیل میں کیسے رہے گا۔" پھر دامن میں گانٹھ باندھ کر بولی: "گرو مہاراج! میرے بچے کے بندھن کاٹ دو، پرساد چڑھاؤں گی! سچ کہتے ہیں ماں بچے کو تو جنم دیتی ہے مگر اُس کے ساتھ کی ساتھی نہیں۔" گلاب سے بولیں: "اب کسی نہ کسی طرح میرے چندن کو آزاد کرواؤ۔"

ریکھا درمیان میں ہی بولی: "ماں جی! وہ بہت دن تو جیل میں نہیں رہیں گے۔ دوسری ملوں نے بھی ہمدردی دکھانے کے لئے ہڑتال کر دی ہے مزدوروں کے اتحاد کے آگے مالکوں کو جھکنا ہی پڑے گا۔"

جب سب چلے گئے تو گوپ بولا: "بھابھی، دکھ تو انھیں ذرا بھی نہیں ہوا سب صرف دکھاوا ہی کر رہے تھے۔"

ریکھا نے گوپ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تم نہیں چاہتے کہ تمہارے پاس بھی خوبصورت کپڑے ہوں؟"

گوپ نے جواب دیا: "بڑھیا کپڑے کون نہیں چاہتا مگر ایسے بھی ہزاروں لوگ ہیں جو مجھ سے بھی بُرے کپڑے پہنتے ہیں، تو کیا کپڑوں کے لالچ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

ریکھا کو اپنی طرف ممتا بھری نگاہ سے دیکھتے پا کر وہ پھر بولا۔ "بھابھی، تم کیا مجھے دسویں جماعت کا بچہ ہی سمجھتی ہو؟ تمہارے لئے تو شاید میں کبھی بھی بڑا نہیں ہو پاؤں گا جو اچھے بُرے میں تمیز کر سکوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ بولی: "بڑے کیوں نہیں ہو گے! میری آشاؤں اور اُمیدوں کے چراغ تو تم ہی ہو۔" پھر خوش ہو کر اپنے کام

میں لگ گئی۔

رات کو ریکھا کتاب لیکر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی اُنکے جیل جانے کے تھوڑے دن پہلے میری زندگی میں ایک عجیب دلکشی پیدا ہونے لگی تھی۔ کئی بار انھوں نے بڑی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ایک بار نگاہ ملتے ہی گویا اُس کی آنکھیں بے چین ہوکر پوچھ رہی تھیں کہ اب بھی ہم اتنے دُور دُور کیوں؟ لیکن میرا دل یکایک ہول اُٹھا تھا، بس اتنی میں ہی سیر ہو گئی۔

وہ جلدی ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے اپنے سر کو اتنے زور سے جھنجھوڑا کہ اگر اُس پر روئی کے ذرے بھی ہوتے تو گر پڑتے پھر کتاب پڑھنے لگی۔

رادھا نے کہا" آج تو تمھاری آنکھ بھی نہیں لگ رہی۔ شاید شوہر سے کبھی الگ نہیں رہی مگر یونہی ساری رات جاگتی رہوگی؟"

"اور دیدی، تم بھی تو میرے پاس سوؤگی تب تو تمھیں نیند نہیں آئےگی۔" ریکھا ہنس پڑی۔

"نا۔ نا، میں نے تو سر تکیے پر رکھا نہیں کہ نیند آئی نہیں۔ ہاں انھیں ذرا دیر سے نیند آتی ہے"... کہتے کہتے رادھا شرا گئی۔

ریکھا نے اپنا منہ کتاب کی طرف پھیر لیا۔

(۱۵)

انگیٹھی سے لال انگاروں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چندن کھانے کے انتظار میں انگیٹھی سے ہاتھ سینک رہا تھا۔ ابھی سردیوں کا موسم شروع تو نہیں ہوا تھا مگر بارش کے آخری دنوں کے بعد جاڑا ہونے لگا تھا۔ چندن پورے ہفتے کے بعد جیل سے رہا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ ہڑتال کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی تھی مزدوروں کی بڑی بڑی مانگیں، مثلاً تنخواہ، بونس اور بھتے وغیرہ میں بڑھوتی قبول کرلی گئی تھی۔

ریکھا نے کھانے کی تھالی سامنے آکر رکھی تو چندن کو جیل کی موٹی روٹیاں یاد آگئیں۔ ساتھ ہی اُس کال کوٹھڑی کی یاد بھی جاگ اُٹھی۔ اُن یادوں کے اُفق پر لمبی لمبی اُنگلیوں والی دوشیزہ بھی اُبھری تھی۔ چندن نے پوچھا تھا تم کون ہو؟ اور اُس نے آسمان کے نیلے پردے پر لکھا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی ایک عورت! رات کے وقت وہ حسینہ اپنی کومل کومل جھکائے کتابوں پر پلکیں نچا رہی تھی۔ چندن نے پوچھا، تم کون؟ اُس نے رات کے سیاہ دامن پر لکھا، علم اور روشنی کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی عورت!

پربھات کی سنہری کرنیں جب جیل کی کھڑکیوں سے اندر آئیں تو چندن کی روپ رانی نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اُٹھا کر اپنے رس بھرے نین دکھائے تھے، چندن نے پھر پوچھا، تم کون؟ اُس نے شفق کے گلابی گالوں پر لکھا، اپنی زندگی کی قندیل سے اپنی قوم میں بیداری لانے والی عورت! اور تب چندن نے اُس چندر مکھی کے سامنے کو چوم کر قسم کھائی تھی کہ آزاد ہو کر اُسے باہوں میں لے کر کہے گا۔" اب دُور نہیں رہ سکیں گے میری رانی،"

ریکھا پانی کا گلاس لیکر کھڑی ہوئی تھی بولی"یہ کیا ابھی تک ویسے ہی بیٹھے ہو؟"

چندن اپنی خوابوں کی ریکھا کو سامنے دیکھ کر ہنس پڑا اور پھر سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

ریکھا بھی اپنے کو روک نہ سکی۔ ساڑھی کے چھور سے ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ کو چھپاتی ہوئی چوکے میں چلی گئی۔ چندن بھی کھانا ختم کرکے تھالی اُٹھا کر چوکے میں پہنچ گیا۔ گوپ اور ریکھا کو باتیں کرتے دیکھ کر وہ رُک سا گیا۔ ریکھا توے پر سے روٹی اُتارنے میں لگی ہوئی تھی اور گوپ کہہ رہا تھا" بھابھی تم نے جو یہاں سنگیت کی کلاس کھولی ہے اور اس میں جو گیت سکھاتے ہیں وہ لوگوں کو بہت پسند آئے ہیں۔ پڑوس کے سبھی گھروں میں وہ گیت گونج رہے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی تقریب کرنا چاہتے ہیں تم ایسے ہی کچھ نئے گیت مجھے سکھا دوگی؟

"کیوں نہیں" ریکھا نے جواب دیا۔

چندن نے سب کچھ سُنا۔ دل ہی دل میں بولا عورت ہر راہ پر دیر سے آتی ہے مگر جب آتی ہے تو بہت تیز رفتار سے چلتی ہے وہ چوکے میں تھالی رکھ کر بولا" آج میں جلدی سوؤں گا، اس لئے میرے لئے دودھ جلدی ہی میز پر رکھ دینا۔"

ریکھا بولی" اچھا"

"تم کتنے بجے سوؤگی؟"

"میں تو آج بارہ بجے سے پہلے نہ سو سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"کل ہم عورتوں کی سوسائٹی میں نئے سماج میں عورتوں کا مقام، پر بحث ہونے والی ہے کچھ تیاری کر لی ہے۔"

چندن جاکر اپنی میز پر اخباروں کو دیکھنے لگا۔ ریکھا بھی فارغ ہو کر چارپائی پر جا بیٹھی۔

پھر دس کے گھڑیال نے دس بجائے چندن بھی اٹھ کر اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔ ریکھا جمائی لیکر جھٹ کھڑی ہوئی۔ گرپ کا لحاف ٹھیک کر کے اس نے چندن کے لیے دودھ لا کر میز پر رکھ دیا۔ روشنی میں ریکھا کی نیند بھری آنکھوں کو چندن بہت غور سے دیکھ رہا تھا دیکھا کر محسوس ہوا، اس کی خوبصورتی کو آنکھوں میں پی جانے والی نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہے اُسے اپنے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے جان پڑے۔

تبھی کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دونوں چونک اٹھے۔ اس وقت کون ہوگا؟ ریکھا نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کون؟"

باہر کئی آدمیوں کی آہٹ سنائی دی مگر ایک ہلکی سی آواز آئی۔

"بھابھی، میں ہوں۔"

ریکھا اچھل پڑی۔ کواڑ کھول کر اس نے سُندر کو چھاتی سے لگا لیا۔ گلاب کی ماں چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "بیٹے! ستیاناس ہو گیا! دیکھو تو سہی، بھیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ریکھا بٹیا، گلاب کے لیے بستر تو بچھا دو۔ تمہیں کیا بتاؤں بچیا، میرا تو کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

ماں کو ہانپتے دیکھ کر چندن پانی کا گلاس بھر لایا۔ اس کے لئے جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی اُدھر ریکھا کے تو جیسے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے مشکل سے ایک چارپائی پر بستر بچھا کر وہ ساس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ گلاب دیوی کا سہارا لیکر آہستہ آہستہ بستر کی طرف بڑھنے لگا۔

ریکھا جیٹھ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسا تندرست گلاب اتنا کمزور کیسے ہو گیا کہ بغیر دوسرے کے سہارے کے بستر تک جا نہیں سکتا۔ اس کے پیلے پیلے ہاتھ اور دھوپ میں جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ گلاب راۓ بستر بیٹھ کر سسکتے ہوئے کہنے لگا۔

"چندن، کل ہی ضبطی کا آرڈر نکلے گا۔ میرے کولابے والے مکان کا سارا سامان کورٹ میں پہنچ جائے گا۔ پھر نیلام"۔۔۔۔ وہ زیادہ نہ بول سکا۔ پھر پانی کے لئے اشارہ کر کے لیٹ گیا۔

دیوی بھی آنسو بہاتی ہوئی بولی "دادا، ایک ہی چوٹ میں بھکاری بن گئے۔"

ماں آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "چندن، ریشم کے اُتار چڑھاؤ میں میرا گلاب پس گیا ہے۔ بھگوان اس کی عمر دراز کرے۔ ایسی حالت میں تمہارے یہاں نہ لاتی تو کہاں جاتی؟ پانچ روز بچارہ دھوپ دھوپ کرتا رہا ہے، آج شام تک سیٹھ ساہوکاروں کی خاک چھانتا رہا مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آکر اوندھے منہ بستر پر گر پڑا۔ اب تو بار بار پانی مانگتا رہتا ہے۔"

اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی رہی۔ گلاب کو سویا ہوا جان کر ماں نے کہا۔

"جاؤ، تم سب جاکر آرام کرو۔ میں جاگتی ہوں۔"

آدھی رات کو جب چندن کی آنکھ کھلی تو ماں کواڑ کھٹکھٹا کر پکار رہی تھی۔

"چندن بیٹا، جلدی اٹھو۔ یہاں آؤ۔ میرا تو کلیجہ بیٹھا جا رہا ہے۔"

چندن بھائی کے پاس آ بیٹھا۔ دیوی اور گلاب دونوں بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلک رہی تھیں گویا سخت جانفشانی کا کوئی کام کیا ہے۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ بھائی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر گلاب بولا۔

"چندن، میں نے ایسا بھیانک خواب زندگی بھر نہیں دیکھا۔"

ماں بیچ میں ہی بولی "ارے، یہ تو ایسا چلّایا کہ میری جان ہی نکل گئی۔"

"چندن، اگر اسمندر تھا جس کا نہ اور تھا نہ چھور۔ تیس تیس فٹ کی مچھلیاں تھیں انکے علاوہ چھوٹی مچھلیاں تو بے شمار کیا دیکھتا ہوں۔ میں دریائے قد کی مچھلی بن گیا تھا اور پانی پیتا جا رہا تھا۔

اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی نگلتا جا رہا تھا جو میرے پیٹ کے اندر تڑپ تڑپ کر خاموش ہوتی جا رہی تھیں۔ میری خواہش یہ تھی کہ میں بڑی سے بڑی مچھلی بن جاؤں اس لئے مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا اچانک ایک بڑی مچھلی میری طرف بڑھی۔ میں پیچھا چھڑاتا رہا مگر وہ برابر میرے پیچھے بھاگتی رہی۔ پھر وہ کئی مچھلیوں کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ جان بچانے کے لیے میں نے سمندر کا کونا کونا چھان مارا زوردار گرج کی آوازیں ہوتی رہیں اور لہریں تیزی سے آسمان کی طرف اٹھ کر پھر دھڑام سے پانی میں جاتی تھیں۔ مگر وہ برابر میرا پیچھا کیے رہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ہی چھلانگ میں میرے قریب پہنچ جاتیں۔ بہت دیر تک یہ مقابلہ جاری رہا۔ آخر کار ایک بڑی سی مچھلی میرے آدھے حصے کو نگل گئی۔ میں خوب چلایا۔ چھوٹی مچھلیوں کی قہقہے گونجنے لگے اور میں گرم لوہے کی مانند غصے میں پاگل ہو اٹھا۔ بڑی مچھلی کے دیکھتے ہوئے پیٹ میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میری رگ رگ کانپ اٹھی۔ موت سامنے تھی اور میں تڑپ رہا تھا کہ میری نیند کھل گئی۔"

ریکھا تولیہ لے آئی۔ چندن نے بھائی کا پسینہ پونچھ کر اُسے بستر پر لٹا دیا اور بولا: "بھیا، سرمایہ داری نظام کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ چھوٹے بیوپاری اپنی حفاظت کے لیے کتنی بھی کوشش کریں مگر انھیں بڑے لیڈروں کے پیٹ میں جانا ہی پڑتا ہے اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ چھوٹے بیوپاریوں کو بھی اس سماج کو بدلنے کے لئے مزدوروں، کلرکوں اور کسانوں کا ساتھ دینا چاہیے"

گلاب نے تج کیسے کر دیتا، اردگرد اپنے ساتھیوں کو۔ آج اُسے چندن کے الفاظ میں آنکھوں دیکھی حقیقت کی جھلک ملی تھی۔ ٹھنڈی سانس لیکر بولا "آگ لگے ایسے سرمایہ داری نظام کو! ساری زندگی داؤ پر لگا کر جس سیڑھی پر چڑھ رہا تھا وہ ایسی گری کہ میرے ہاتھ پاؤں ہی توڑ دئے۔" اور وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

سحر کی کرنوں نے بتی کی روشنی کو مدھم کر دیا۔

چندن نے کہا: "بھیا صبح ضرور آئے گی جیسے جیسے یہ امیر اور غریب کا فاصلہ بڑھتا جائے گا یعنی دولتمند تھوڑے اور غریب بہت ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ان حالات کا خاتمہ ہوتا جائے گا۔ اسکی کھوکھلی دیواریں ضرور گر پڑیں گی اور اُس کی جگہ ایک ایسا سماج تعمیر ہوگا جس میں ہر ایک انسان اپنی محنت کے عوض سکھ چین کی زندگی بسر کرے گا اُسکا مستقبل مکمل طور پر خوشحال ہوگا"

گلاب رائے ناریل کے پیڑوں کے پیچھے طلوع آفتاب کو دیکھ رہا تھا۔ بولا "تمھارا ایسا سماج بھگوان کرے جلدی ہی قائم ہو"

کچھ دیر کے بعد گلاب رائے پھر بستر پر لیٹ گیا اور چندن نے رضائی آہستہ آہستہ اُس کے کندھے تک سرکا دی۔

"یکایک گلاب نے پکارا "دیوی"

دیوی نے شوہر کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا "جی!"

گلاب نے اُسے ہاتھ سے کھینچ، بستر پر بٹھا اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ریکھا اور چندن اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کواڑ بند کر کے چندن چارپائی پر جا بیٹھا۔ ریکھا زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں غرق تھی۔ چندن نے پکارا "ادھر آکر بیٹھو"

ریکھا گویا کسی جادو کے بل پر کھنچ کر چندن کے بستر پر جا بیٹھی مگر ابھی تک وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ چندن نے پوچھا:

"کیا سوچ رہی ہو؟"

ریکھا نے سر اُٹھا کر لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میں اور گلاب دادا میں اتنا فرق کیوں ہے؟"

ریکھا، یہ ہمارے خاندان کی ایک دُکھ بھری کہانی ہے۔ سُنوگی تو تمھیں بھی دُکھ ہوگا۔

"انسان صرف خوشی کی کہانیاں سُننے کے لیے پیدا نہیں ہوا"

چندن اُداس ہو گیا۔ زمین کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بولا برسوں پہلے کی کہانی ہے۔ اُس وقت ہم بے حد غریب تھے۔ ماں بیچاری ہر دو دو برس کے بعد گھر کے آدمیوں اضافہ کرتی جاتی تھیں اور پتا جی لقوے کی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمانے سے معذور تھے۔ جب میں اور گلاب دنیا کو سمجھنے کے قابل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی ٹھکرا دیا جاتا تھا۔ جب ہمارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کھلونوں کے لئے اُوپر اُٹھتے تھے تو ماں بیچاری اپنے دامن میں بندھے پیسوں کو دیکھ کر رو پڑتی تھیں۔ ہم پاس پڑوس کے بچوں سے کھلونے چھینتے تھے تو خوب لڑائی ہوتی تھی۔ پورا کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے مُنہ سے روٹی چھینتے تھے اور آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے تھے مگر ایک

تنگوں وہ مجھ سے لیکر اسکول کی کتابوں تک کے لئے ہمیں لڑنا پڑتا تھا اور یہ چھینا جھپٹی ہماری نس نس میں سما گئی۔ اسکول کے زمانے میں اس مقابلے نے مختلف شکل اختیار کر لی۔ میں ہمیشہ سب سے اوّل آنے کے لئے کوشش کرتا تھا اور گلاب مجھ سے زیادہ طاقتور تھا لڑاکوں کا سردار بن گیا۔ اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے ہمارا رہا سہا بچپن بھی جاتا رہا۔"

چندن کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پرانی باتوں کو یاد کر کے اسکا دل دکھ درد کی گھٹاؤں میں گھر گیا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ایک دن ہمارے گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ بچا۔ ماں نے چاول اُدھار لے کر بھات پکایا۔ گلاب دوسرے دن چوکے میں کھانے کے لئے گیا تو اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ وہ مجھ سے جھگڑنے لگا کہ میں نے رات کا بچا ہوا بھات کیوں کھایا ہم دونوں کتوں کی طرح لڑے۔ گلاب کی قمیص پھٹ گئی۔ وہی قمیص تھی جسے پہن کر وہ سکول جاتا تھا۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور ناخنوں والی انگلیوں کو گول بنا کر مجھ پر جھپٹے پنجا گھمادر اوچھا پڑا آنکھوں کے نیچے کا یہ نشان یاد کے طور پر رہ گیا ہے۔"

رکھیا نے جھک کر دیکھا، چندن کی آنکھ کے نیچے گہرے پنجے کا نشان اب تک دکھائی دے رہا تھا۔

چندن بولا: "ہم دونوں ایک دوسرے کو ادھمرا بنانے کی کوشش کر رہے تھے حالانکہ بھوک ہمیں پہلے ہی ادھمرا بنا چکی تھی۔ چارپائی کے پاس ماں کا جسم تھوڑا سا ہلا اور میں اپنا زخم بھول گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ماں کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ ہمیں پتہ ہی نہ لگا تھا کہ کب ماں ہمیں چھڑاتے چھڑاتے ہماری چوٹ کا شکار ہو کر گر پڑی تھی۔ اس رات ماں کافی دیر تک بیہوش رہی۔ ہم دونوں بھی روتے رہے۔ علیحدگی میں روئے، ماں سے چپک کر روئے اور آخر کار دونوں گلے مل کر روئے۔ گلاب نے کہا "ماں اچھی ہو گئی تو میں تم سے کبھی نہیں لڑوں گا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم غریب ہیں اس لئے تو لڑتے ہیں۔"

وہ بولا: "اس کے بعد میں چوری کروں گا۔ ڈاکہ ڈالوں گا مگر غریب ہرگز نہ رہوں گا۔" اس نے پڑوس کے ایک ساہوکار کے بکری کے لئے ہاتھ پاؤں جوڑے جس نے اسے ملک سے باہر اپنی دوکان پہ بھیج دیا۔ وہاں اس کے مقابلے کا میدان اور بھی وسیع ہو گیا۔ وہ انسانوں سے ہی نہیں بلکہ روپے اور چاندی سونے جیسی مادی چیزوں سے ٹکر لینے لگا۔"

ماں کے تندرست ہو جانے کے بعد جب کبھی میں اپنا زخم دیکھتا تھا تو مجھے اس بربریت نما، قنوطیت کی یاد آ جاتی تھی۔ میں اپنے دل سے پوچھتا تھا، جو بھوک انسان کو جانور بنا دیتی ہے اسکا وجود اس دنیا سے کیوں نہیں مٹ جاتا؟ میری دوستی بھی ایسے لڑکوں سے ہونے لگی جن کے گھر میں بھوک تھی، جو پرانے کپڑے پہن کر سکول آتے تھے مگر ذہنی طور پر ہوشیار تھے۔ ان کے دلوں میں بھی شاید میرا سوال ہی اٹھتا تھا۔ ہم جب کالج میں گئے تو خوب کتابیں پڑھنے اور بحث مباحثے کرنے لگے۔ ہم نے فیس کم کروانے کے لئے ہڑتالیں کیں۔ اس وقت کانگریس برطانوی سامراج سے ٹکر لے رہی تھی اس لئے اسکا ہندوستانی عوام پر کافی گہرا اثر تھا۔ ہم نے گاندھی واد کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور انگریزوں کے خلاف ہلچل میں جیل ہو آئے۔ دیکھا ہم نے سوچا تھا کہ آزادی کے بعد ہماری حالت سدھر جائے گی مگر ہم نے اپنے سنہرے خوابوں کو مٹی میں ملتے دیکھا ہماری زندگی بگڑ دی گئی۔ روشنی سے جگمگاتے مکانوں کے بدلے کال کوٹھڑی نما بیرکوں میں رہنا پڑا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرنے کے بجائے اپنا پیٹ پالنے کی خاطر کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے پر مجبور ہوئے۔ ہزارہا لوگوں کی خوش حال زندگی کی آرزو بیکاری اور بیروزگاری کی چکی میں پسنے لگیں۔ ہزاروں مائیں اپنی ممتا کو باندھ کر آسمان کی طرف دیکھتی رہیں کہ وہ سنہری صبح کب آئے گی جب کوئی میٹھی اور توتلی زبان انکو نیند سے جگائے گی اور دو چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ انکی پیاسی چھاتی کو ڈھونڈیں گے۔ بوڑھی ماؤں کے لال کمزور ہوتے گئے۔ ان کی جوان لڑکیاں ہاتھوں میں مہندی لگانے سے محروم ہو کر سر پر گاگر یا اٹھا کمپوں کے نلوں پر قطاریں باندھنے لگیں۔ اچھے گھرانوں کے بوڑھے مرد

پلیٹ فارموں پر بستر اٹھانے کا کام کرنے لگے، خوانچے لے کر گلیوں میں پھرنے لگے اس طرح زندگی گھسٹتی اور پستی رہی تاوقتیکہ چین کے عوامی انقلاب نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہماری ٹولی کے ہر نوجوان نے قسم کھائی کہ اپنی زندگی انسان ذات کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے جب تک بھوک اور بیکاری دور نہیں ہوتی، جب تک جہالت اور بیماریوں سے چھٹکارا نہیں ملتا، یہ آزادی کس کام کی؟ اُن دنوں گلاب کا ایک خط آیا تھا۔ پڑھو گی؟"

چندن ٹوکری میں ایک پرانی فائل ڈھونڈنے لگا۔ ریکھا نے سوچا میں کیسی بیوقوف تھی! جس کی زندگی چین سے بالکل ہی محروم رہتی آئی ہے اُس سے آرام حاصل کرنے کی خواہش کر رہی تھی۔

چندن نے خط لا کر ریکھا کے ہاتھ میں دیا۔ خط کے آخری حصے میں لکھا تھا:۔

"چندن، تمہیں سمجھانے کے لئے ایک بار پھر لکھتا ہوں کہ تم جس راہ پر چل رہے ہو اُس سے گھر کی تباہی ہونا لازمی امر ہے کئی بار لکھ چکا ہوں کہ تم بھی میری تقلید کرو تو گھر کو سونے سے بھر دیں بھلے مانس! اس دنیا میں غریب کو کوئی نہیں پوچھتا، سب پیسوں کے ہی دوست ہیں۔ تم یہاں افریقہ آ جاؤ تو دونوں کما کر گھر کا نام روشن کریں گے۔ یہاں افریقہ میں تو چاندی ہی چاندی ہے۔

بیچارے دیہاتی پانچ گنا لگتے ہیں تو میں چار گنا دیتا ہوں کیونکہ وہ نرے بدھو ہیں۔ افریقہ تو جاہلوں کا ملک ہے۔ ہاں بیماریاں بہت ہیں مگر دو تین روپے ہر روز دوائیوں پر خرچ کر کے چین سے رہا جا سکتا ہے۔ بڑے بیوپاری تو ہوتے ہیں ہر وقت دوسروں کو ہڑپ کرنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کماتے ہیں پھر بھی پیٹ بھرے بیل کی طرح لاتیں مارتے رہتے ہیں۔ مگر میرا نام بھی گلاب ہے۔ دیکھنا پانچ چھ سال کے اندر کتنا کچھ کماتا ہوں! اگر اب بھی تم اخباروں، کتابوں، جماعتوں اور بحث مباحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہو گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ میں چاندی پر کھڑا ہوں گا اور تم بھکاری کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں نحیف بدن اور اداس آنکھیں لئے دوسروں کا منہ تاکتے رہ جاؤ گے۔"

خط پڑھ کر ریکھا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے مگر بے ساختہ ہنسی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلا، "بیچارا [illegible]!"

چندن نے پوچھا "تمہیں گلاب پر رحم آتا ہے نہ؟"

"نہیں، مجھے اپنے سماج پر رحم آتا ہے جس نے ترقی کے راستے اتنے تنگ کر دیئے ہیں اور لوگوں کا مستقبل اتنا غیر محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی بھی امن و چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔"

"جو سماج رحم کے قابل ہے۔۔۔"

"اُسے بدلنا ہی پڑے گا!" ریکھا نے چندن کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

چندن نے ریکھا کا گلابی ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ ریکھا سوچتی رہ گئی۔ جو سوال برسوں تک میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا، اُس کا جواب تو ماضی کے اوراق میں چھپا ہوا تھا۔

چندن نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ریکھا اُس کی گود میں منہ چھپاتی ہوئی بولی "میں نے تو سمجھا تھا، آپ کے پاس دل ہی نہیں ہے۔۔۔"

چندن ریکھا کا چہرہ اپنے ہتھیلیوں پر ٹکائے مسکراتا رہا۔ ریکھا شرماتی ہوئی بولی ـــ "مگر اب۔۔۔"

چندن نے پوچھا "مگر اب۔۔۔"

"مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے پاس بھی دل ہے۔ ایک خوبصورت اور جیتا جاگتا دل!"

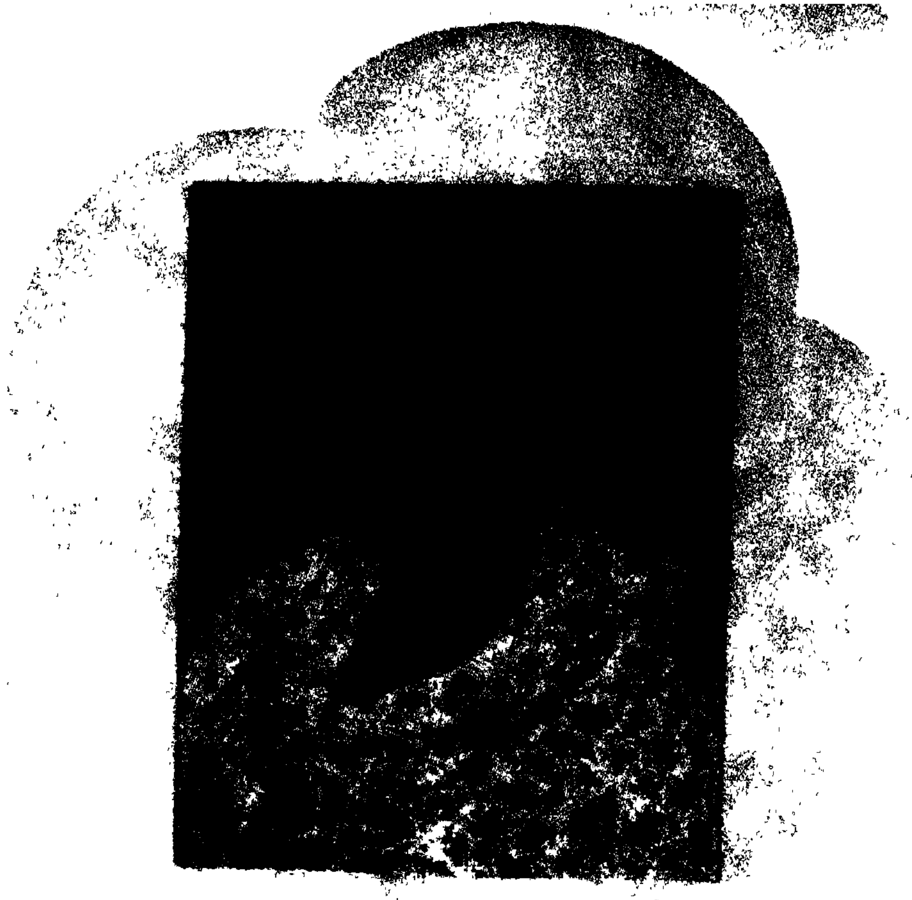
رجنی پنیکر

رجنی پنیکر نے لاہور کے ایک خوشحال پنجابی گھرانے میں جنم لیا۔ اس گھرانے کے افراد تعلیمی میدان میں بڑا نام پیدا کر چکے ہیں۔ علم و دانش کا بے پناہ سرمایہ رجنی کو ورثہ میں ملا۔ انھوں نے ہندی اور انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ آپ کا بچپن لاہور ہی میں گذرا جو ایک مدت سے پنجاب میں علم و ادب کا گہوارہ چلا آرہا تھا۔ بٹوارہ کے بعد آپ پنجاب سرکار کی طرف سے شائع کئے جانے ہندی کے رسالہ "پردیپ" کی مدیرہ رہیں اور ۱۹۵۰ء میں آپ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئیں۔ اس وقت آپ پروگرام ایگزیکیٹو ہیں۔ رجنی پنیکر کا رجحان ابتداء ہی سے علم و ادب کی طرف تھا لہٰذا انھیں ملازمت بھی اُن کی مرضی کے مطابق ملی۔

رجنی پنیکر نے اپنی مستقل مزاجی سے یہ ثابت کیا ہے کہ ریڈیو کے ماحول میں تخلیقی قوتیں سلب نہیں ہوتیں۔ اُردو کے بیشتر ادیبوں نے ریڈیو کی ملازمت کی۔ اور اکثر کا انھوں نے اُسے ترک کر دیا چونکہ اُن کا خیال تھا کہ ریڈیو کا ماحول اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لئے سازگار نہیں ہے مگر رجنی پنیکر نے اس خیال کو سراسر غلط ثابت کر دیا ہے۔ آپ نے ریڈیو کے ماحول میں رہتے ہوئے پانچ اچھے ناول لکھے ہیں۔ جو ہندی میں "ٹھوکر" "پانی کی دیوار" "موم کے موتی" "پیاسے بادل" اور "کالی لڑکی" کے نام سے چھپ کر بے حد مقبول ہوئے۔ ناول "پیاسے بادل" پر آپ کو یو۔پی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سگریٹ کے ٹکڑے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کہانیوں میں انھوں نے ہیئت اور موضوع کے دلآویز تجربے کئے ہیں۔ اُن کا ایک ناول "جاڑے کی دھوپ" زیر طبع ہے۔

رجنی پنیکر اونچے درمیانہ طبقہ کی عکاسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اونچا درمیانہ طبقہ یوں بھی ہمارے سماج کا ایک پُر لطف حصہ ہے۔ جو اونچے طبقہ میں شامل ہونے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ نقالی اور تصنع جس کی فطرت ثانی بن چکا ہے۔ اونچے طبقے میں جانے کی دوڑ دھوپ میں درمیانہ طبقہ جو قلابازیاں لگا رہا ہے وہ ناول کا نہایت ہی حسین موضوع بن سکتی ہیں۔ رجنی پنیکر چونکہ خود درمیانہ طبقے سے ہیں اس لئے وہ اس طبقہ کی رگ رگ سے آگاہ ہیں۔ اُن کا مشاہدہ نہایت پختہ ہے۔ وہ تمام اقتصادی، سیاسی اور سماجی حقائق سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کا مزاح ایک تیز مہک اور اُن کی طنز ایک تیز نشتر ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ایک منتظم پلاٹ کی قائل نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے تمام ناول دلچسپ ہیں۔ اور اُن میں لطف و مسرت کا عنصر بہت غالب ہے۔

رجنی پنیکر کا ناول "کالی لڑکی" کا موضوع بھی اچھوتا ہے۔۔ یہ ایک غم زدہ کالی لڑکی کی داستان ہے۔ جو ہمارے آج کے سماج میں اپنا مقام ڈھونڈتی ہے۔۔



رجنی پانیکر



پرکاش ٹنگاچ

رجنی پنیکر

پرکاش لکانچ

کالی لڑکی

میں اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر چکی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار ہی میری آنکھیں اشکبار ہوئی ہیں ۔ جب کبھی ایسے موقعے آتے جب کبھی آنسو بہانے کی خواہش بھی اٹھتی میں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتی ۔ آنکھوں سے خاموش آنسو جو برستے ان میں زخمی روح کا سرخ خون ہوتا ۔ سیاہ جلد کے نیچے بھی خون تو لال ہی رہتا ہے نہ ۔

اپنا افسانہ سنا کر میں آپ کی ہمدردی جگانا نہیں چاہتی ۔ ہمدردی اور رحم کے الفاظ سے مجھے سخت نفرت ہے ۔ اس دنیا میں کسی کے دل میں کسی کے لئے حقیقی معنے میں ہمدردی ہو سکتی ہے ؟ مجھے تو وہ صرف ایک دکھاوا جان پڑتی ہے . . . میں اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنا چاہتی ۔ انسانی جسم کے رنگ پر اس کے اعمال کی پاکیزگی منحصر نہیں ۔ اس پر غور کرنے کی فرصت کیسے ہے ۔

میں پیدائشی کالی ہوں ۔ ماں کا رنگ گورا ، پتا کا گندمی ، بہن گوری اور میں کالی ۔ میری بہن عمر میں مجھ سے چھ سال بڑی ہے ۔ وہ میرے ساتھ کبھی کھیل میں شریک نہیں ہوتی ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ جو آواز میرے کانوں نے سنی وہ یہ تھی کہ میں کالی ہوں ۔ سب مجھے کالی ، کالی کہہ کر پکارتے تھے ۔ ہمارے گھر میں ایک خادمہ تھی جسے میری پیدائش سے پیشتر ہی رکھا گیا تھا ۔ ماں کو مکمل یقین اور امید تھی کہ لڑکا پیدا ہوگا ۔ اور لڑکے کی پرورش میں امداد کرنے کے لئے ہی انہوں نے یہ خادمہ رکھی تھی ۔ لیکن لڑکے کے بجائے لڑکی پا کر اور وہ بھی کالی ماں پر بجلی گری ہوگی ۔ اس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے ۔

بچپن کے تمام واقعات تو میری یادداشت سے دور چلے گئے ہیں ۔ اور میں اس تلخ زندگی کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی ۔ چند دھندلی سی یادیں باقی ہیں ۔ ایک بات جو بچپن سے ہی مجھے اس کی طرح کھاتی رہی ہے ، وہ ہے میری جلد کا سیاہ رنگ

آپ فرمائیں گے ہندوستان جیسے ملک کی نصف آبادی سیاہ فام ہے ۔ یہ تو بحث کی بات ہے ۔ درمیانی درجے کے گھرانے میں جس میں سبھی گورے ہوں ، ایک لڑکی کا کالی ہونا گویا اس کی بدنصیبی کی پختہ دلیل ہے ۔ اس کے تاریک مستقبل کا روشن نشان ہے ۔ ممکن ہے میری ماں میرا رنگ دیکھ کر سکتے میں آ گئی ہوں گی ۔ انہوں نے بدنصیبی کے اس سایے کو ملائم کرنے کے لئے میرا نام رانی رکھ دیا اور جب میں راجہ رانیوں کے فسانے سننے اور سمجھنے کے لائق ہوئی تو مجھے یہ بات بار بار چبھتی کیا کبھی رانی کالی بھی ہوتی ہے ؟ رانی کو تو پریوں کی طرح گوری چٹی اور خوبصورت ہونا چاہیے ۔ میرا نام رانی کیوں رکھا گیا ؟

بڑی ہونے پر مجھے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا وہاں میں ایک شرارتی لڑکا مجھے دیکھ کر بول اٹھا تو اٹھا " تمہارا نام رانی نہیں کوئل ہونا چاہئے تھا " میرے معصوم اور نازک دل پر اس کے الفاظ چابک کی طرح لگے ۔ لیکن اس کی اس بات پر میں کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ میرا یہی ایک بات گویا سنجیدگی میں تبدیل ہو گیا سکول میں میرا یہ روز اول ہی تھا ۔ میرے دل میں ماں کے لئے سخت نفرت جاگ اٹھی ۔ اس وقت تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ صرف غصہ ہے لیکن درحقیقت وہ نفرت اور حقارت تھی ۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری ماں نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے ۔ اپنی خادمہ چاندنی پر بھی مجھے غصہ آیا ــــ چاندنی جب کبھی مجھے اپنی گود میں لیتی تو میرے معمولی بالوں کو سہلاتے ہوئے میری پیشانی چوم کر کہتی " رانی بیٹا کسی دن راجہ کی رانی بنے گی ۔ ان پر جذبات اور گہری گہری آنکھوں میں کون اپنا نصیب تلاش کرنا نہ چاہے گا "

اس وقت تو اس کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی ۔ کچھ عرصہ بعد

اپنی کالی صورت دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ واقعی میرے چہرے کے نقوش پر تماہیں۔ دیدی ہمیشہ گہرے رنگوں کی ساڑیاں پہنتی، ماں بھی تقریباً ایسی لباس پسند کرتی تھیں۔ مجھے گلی گزری سمجھ کر دیدی اور ماں کی اترن مجھے کو دے دی جاتی جنہیں کبھی کبھی میں چاندی کو دے ڈالتی لیکن مجبوراً جب کبھی مجھے پہنی پڑتی تو میرا سیاہ رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا۔

اسکول میں چند لڑکیاں مجھ سے دبتی تھیں۔ خوبصورت چہرہ اور گٹھا ہوا جسم پاکر بھی وہ گھر سے حساب کے سوالات حل کر کے نہیں لا سکتی تھیں۔ انہیں جغرافیہ پیچیدہ نظر آتا ـــ سائنس کے گھنٹے میں تو اکثر ان کا وقت سکول کے نل کے قریب یا کامن روم میں گزرتا ـــ ایسی لڑکیوں کو ہر وقت کسی کی امداد کی ضرورت ہوتی جو میں انہیں فوراً دیتی ـــ اس لئے ان لڑکیوں کو مجھے اپنے ساتھ شریک کرنے میں کبھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کانچ کی چوڑیاں اور ربن بطور تحفہ وہ مجھے دیتی رہتیں۔ دیدی کو ہمیشہ شکایت رہی کہ یہ خوبصورت لڑکیاں میری سہیلی کس طرح بن جاتی ہیں؟ انہیں لڑکیوں میں سے ایک سندری شرما کا میری زندگی سے خاص تعلق رہا۔

میری عمر اس وقت چودہ پندرہ سال کے درمیان ہو گی۔ اکثر دیدی کی شادی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ بی۔ اے۔ میں دو مرتبہ فیل ہو چکی تھیں۔ پڑھنے میں ان کا دل نہ لگتا تھا۔ ہر وقت آئینے کے سامنے بناؤ سنگار کرتی رہتیں ـــ ماں کے ساتھ محلے کی آنے جانے والی عورتوں کے ساتھ گپیں لڑاتیں یا تاش کھیلتیں۔ تاہم ان بیٹھکوں میں مجھے کبھی کسی نے شامل نہیں کیا گھر میں جب کبھی کوئی پارٹی یا رشتہ دار وغیرہ جمع ہو جاتے تو دیدی اور ماں کو میرا خیال اس وقت آتا جب کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کی ضرورت محسوس ہوتی اکثر چاندی میرے حصے کا کام بھی پورا کر دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ بن پرادم اور رام گندا ہوا تھا تیزی سے کام کرنے پندرہ کولہے موٹے موٹے گڑبڑے لٹکا کر ادریاں سے رنگے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے وہ کام ختم کر دیتی اور مجھے پڑھنے کے لئے بھیج دیتی۔

اس وقت بھی میں جانتی تھی کہ مجھے کمرے میں واپس کیوں بھیجا جا رہا ہے گو سب جانتے تھے کہ میں پڑھنے میں تیز ہوں ذہین ہوں چندروں کی توجہ دینے پر سب سے آگے ہو سکتی ہوں۔ پھر مجھے بار بار پڑھنے کے لئے مجبور کیوں کیا جاتا تھا؟ وجہ یہ تھی کہ ماں آنے جانے والوں اور رشتہ داروں کے اس طعنے سے بچنا چاہتی تھیں ”یہ تمہاری گوری! اپنی اس کالی لڑکی کی شادی کیسے کرو گی؟ اسے تو کوئی بھی قبول نہ کرے گا“ یا اسطرح گوری بی بی! تم نے شاید چاند اور سورج کے گہن لگتے وقت پرہیز نہیں کیا ہوگا ورنہ لڑکی اسقدر کالی نہ ہوتی“

اس طرح کی گفتگو کے وقت میں نے کئی بار چھپ کر ماں کے چہرے پر تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے جذبات دیکھے۔ میری ماں میری موجودگی میں تو صرف ایک سرد آہ بھر کر اتنا ہی کہتیں ـــ جہاں اس کی قسمت لے جائیگی وہیں شادی ہو گی ـــ لڑکیاں بھی کبھی کسی کی کنواری رہی ہیں ـــ لیکن جب میں ان کی نظروں سے پرے ہوتی تو وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتیں ـــ یہ بدنصیب ہے۔ نہ جانے پچھلے جنم میں کیسے کھوٹے کام کئے تھے کہ جن کا انجام اس زندگی میں بھوگتا پڑ رہا ہے۔ ہم لوگ معمولی حیثیت کے آدمی ٹھہرے، ایسی کالی لڑکی کی شادی تو تبھی ممکن ہے جب ہمارے پاس جہیز میں دینے کے لئے آٹھ، دس ہزار روپے ہوں۔ پتہ نہیں اتنی بڑی رقم کہاں سے آئیگی۔ بہن! جس دن سے پیدا ہوئی ہے فکر کی وجہ سے بھر پیٹ کھانا کھانا بھی حرام ہو گیا ہے۔ کندو کی بیل سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہیں یہ لڑکیاں“ یہ کہکر وہ ایک مرتبہ پھر اپنی پیشانی کو ٹھونکنے لگتیں۔

ایسے موقعوں پر اگر پتا جی موجود ہوتے تو فوراً کہہ دیتے ـــ لڑکی پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ کیا ہوا اگر ذرا سی سانولی ہے ہندوستان میں تو بہت سے آدمی اس سے بھی زیادہ کالے ہیں ـــ لیکن ماں کا دل اسقدر وسیع نہ تھا۔ پتا جی کی بات کا ماں فوراً جواب دیتیں ـــ کسی بڑے ہی سے ہو گی اس کی شادی ـــ اور بھلا اسے کون قبول کرے گا ـــ

پتا جی ماں کی بات کا جواب نہ دے کر سلسلۂ گفتگو تبدیل کر دیتے ـــ

اس طرح کی طعنہ زنی اور تلخ الفاظ برداشت کرنا میرا معمول بن گیا تھا دراصل میری زندگی میں کشمکش تو اسوقت پیدا ہوئی جب میری بہن کا دیری کی شادی ہو گئی۔ دودھ جیسے سفید اور چکنے جسم والی شانتا ایک بے ساختہ ہنسنے والی کا دیری کا اور

بیٹے کے [illegible] پسند [illegible] کی [illegible] تھی [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہوا [illegible] اور بڑی بڑی آنکھوں میں بھی [illegible] رنگ — روشن تھا وقت. سو پہلے [illegible] ان کا [illegible] معلوم نہیں اور کس طرح سب کچھ بتا دیتی۔

ہاں تو جس دن کمل بابو دیدی کو دیکھنے آئے مجھے اپنے کمرے سے باہر آنے کی سخت ممانعت کر دی گئی — ماں نہیں چاہتی تھیں کہ میرے سامنے کوئی کمل بابو دیکھ پائیں۔ انہیں شک تھا کہ کہیں کالی سیاہ کو دیکھ کر وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دیدی ماں کی لڑکی نہیں بلکہ کسی کالی ہوئی لڑکی ہے جو انہیں دکھائی گئی ہے۔

ماں کی سخت ہدایت اور بندشوں کے باوجود بھی میں نے کمل بابو کو ایک نظر دیکھ ہی لیا۔ مجھے کوئی خصوصیت اُن میں نظر نہ آئی۔ گندمی رنگ، درمیانی قد، محض معمولی۔ ان نے دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کیوں تجویز کیا ہے؟ اُنہیں کمل کیوں پسند ہے؟ ان میں کیا خوبی ہے؟ بے شمار سوالات یک بارگی میرے ذہن میں جاگ اٹھے۔ جب کمل بابو دیدی کو پسند کر کے رخصت ہو گئے تب میں نے موقع پا کر چاندی سے دریافت کیا چاندی ماں کو دیدی کے لئے یہ معمولی سا دولہا کس طرح پسند آ گیا؟

چاندی نے جواب دیا۔ "تم ابھی نادان ہو رانی بیٹا! کمل بابو کے پاس دولت ہے، وہ کا دیری بیٹا کو چاندی میں تول سکتے ہیں، سونے سے مونڈھ سکتے ہیں۔"

ان کے پاس اسقدر دولت کہاں سے آئی؟ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

کالے بازار سے بیٹیا!

غصے سے میرا چہرہ تمتما اٹھا — گو میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن مجھے کالے بازار کے معنی معلوم نہ تھے —— میرا دل چیخ اٹھا — لیکن حسب معمول یہ چیخیں بھی خاموش تھیں۔ چاندی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اپنی بات کا اثر جو میرے چہرے پر نمایاں ہوا اُٹھا تھا دیکھ پاتی — وہ مختصر سا جواب دیکر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

وہ رات میری زندگی کی ایک پر درد رات تھی —— ماہ آسمان کی گود میں چاند تاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا ہلکی ہلکی سی سردی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں اپنے پلنگ پر بیٹھی خود کو لعنت ملامت کرتی رہی میں اسقدر کیوں ہوں کہ مجھے اپنے ہونے والے جیجا کے سامنے بھی نہیں جانے دیا گیا۔ آخر وہ کیا کرتے؟ مجھے کیا جاتے؟ دیدی کو کس طرح کا منظور کر دیتے؟ میں کالی ہوں، میرا سایہ بھی دیدی پر نہیں پڑنا چاہئے۔ ورنہ اسطرح دیدی کا سفید رنگ سیاہ کس طرح ہو جائے گا۔

لیکن میرا درد سمجھنے والا تھا۔ وہ کون جس نے کبھی چوٹ ہی نہ کھائی ہو، وہ دوسرے کا درد کس طرح جان سکتا ہے۔

کمل بابو! اسی نام سے انہیں ہمارے گھر میں پکارا جاتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد ماں اور دیدی کافی رات گزرے تک بات چیت میں مشغول رہیں۔ دیدی اور میں ایک ہی کمرے میں سویا کرتی تھیں، ساڑھے گیارہ بجے تک دیدی کمرے میں نہیں آئیں تو میں نے روشنی گل کر دی — ماں بیٹی میں ہم جولیوں جیسا تعلق تھا — ماں دیدی سے صرف چودہ سال بڑی تھیں اور مجھ سے اکیس سال۔

میں بے چینی سے دیدی کا انتظار کرتی رہی۔

شادی دیدی کی ہو رہی تھی۔ لیکن دھڑکنیں میری تیز ہو رہی۔ بارہ بجے کے قریب دیدی جب کمرے میں داخل ہوئیں تو میں نے ایکدم سوال کیا —— دیدی تمہیں اپنے ہونے والے شوہر پسند ہیں؟

نہ معلوم دیدی اور ماں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ وہ فوراً بولیں اتنی گوری ہونے پر تو کمل بابو جیسا شوہر ملا ہے، اگر تمہاری جیسی ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا؟

دیدی کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بے تکلفی سے پھر سوال کیا۔ بتاؤ نہ دیدی! تمہیں پسند ہے؟

پسند کیوں نہیں رانی! تم تو جھوٹ موٹ کی رانی ہو اور میں در حقیقت رانی بننے جا رہی ہوں۔ جانتی ہو دہلی میں ان کا بڑا کاروبار ہے۔ لاکھوں کا لین دین ہے۔ چار مکان ہیں، دو کاریں ہیں اور اب میرے لئے ایک نئی کار خرید رہے ہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ـــــ دیدی، دیدی کے نئے دولہا کی موٹریں بھی دیکھی جاتی ہیں کیا ؟
ہاں ـــ اس کا سونا اور روپیہ پیسہ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
میں اس شادی پہ غور کرنے لگی جو دولت دیکھ کر کی جا رہی تھی دیدی کے ہر ایک جملے سے ماں کے اثرات کی بو آ رہی تھی ـــ ویسے بھی ماں اور دیدی ہم خیال تھیں۔ دیدی کی ان باتوں میں میں کچھ کھو گئی۔ قریب کے تھانے میں تین کا گھنٹہ بجا۔ بس اس کی آخری گونج ہی میں سن سکی اور پھر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

دیدی کی شادی ہو گئی۔ رخصتی کے وقت وہ اس قدر زار و قطار روئیں کہ پتا جی کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ میں نے پتا جی کو اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ تو دیدی کی رخصتی کے وقت اور دوسری دفعہ . . . . . پھر بتاؤں گی۔
ماں کی نظر میں میں کسی مشورہ کے قابل نہ تھی۔ دیدی کیلئے کپڑے اور زیورات بنوائے گئے۔ اس وقت بھی انہوں نے میرے مشورے کی قطعی ضرورت محسوس نہ کی۔ جس کا رنگ سیاہ ہو وہ بھلا کیا جانے کہ کسی ساڑی کے ساتھ کون سا ہار ڈیزائن خوشنما دکھائی دیگا ـــ
ماں کھلے ہاتھوں خرچ کر رہی تھیں۔ بوا نے ٹوکتے ہوئے کہا ـــ رانی کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ اسے کس طرح کرو گی؟ . . . کیا اسکی شادی میں خرچہ نہ کرو گی جو اسی شادی میں تمام رقم اڑائے دے رہی ہو؟
ماں نے نہایت افسردگی سے جواب دیا ـــ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے ـــ کوئی اسے اپنائے تو سمجھوں ـــ
واہ بھابی! واہ ـــ رانی کنواری ہی رہے گی؟ ہماری سبنا (بوا کی نند) تو رانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ سانولی ہے۔ پھر رانی کے نقوش تو نہایت دلکش اور خوبصورت ہیں۔ آنکھیں بھی بے حد خوبصورت ہیں۔
لیکن اسکے بعد ماں نے جو کچھ کہا اس نے میری جرح کو تلملا دیا
کیا کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے اس طرح کے لفظ استعمال کر سکتی ہے؟ میری پیدائش کے وقت کیا ماں نے تکلیف محسوس نہ کی تھی؟ ـــ ـــ
میں نے تو سنا تھا کہ ماں کو اپنے سبھی بچوں سے یکساں محبت ہوتی ہے۔ ان کے درمیان فرق تو صرف سماج کی نظر دیکھا کرتی ہے ـــ

ماں نے کہا ـــ کیا بوا جی آپ نے رانی کو کبھی غور کر دیکھا ہی نہیں ہے۔ جب کبھی دیکھا ہے محض سرسری نظر سے۔ بغور دیکھتے ہوئے میں خوف زدہ ہو اٹھتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ نہ جانے کس دیوی یا دیوتا کی بد دعاؤں سے ایسی لڑکی میری کوکھ سے پیدا ہوئی ـــ
بوا کی آنکھیں نم ہو اٹھیں کہنے لگیں ـــ رنجیدہ نہ ہو بھابی لڑکی پڑھنے میں ذہین ہے۔ کچھ نہ کچھ بن ہی جائیگی۔ تم اسے لیڈی ڈاکٹر بناؤ ـــ ڈاکٹری پڑھاؤ ـــ
اس پر ماں نے کہا ـــ نہیں جی جی! اول تو ہماری حیثیت اس قابل نہیں کہ ڈاکٹری پڑھا سکیں ـــ دوسرے۔ ڈاکٹر بن کر جب یہ اپنے کالے ہاتھوں سے بچے پیدا کرائے گی تو وہ بھی کالے ہو جائیں گے ـــ
ماں کی اس بات کا بوا نے کیا جواب دیا یہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی سو اور میں چھت پر چلی گئی ـــ میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اُف کیا ایک ماں اپنی بیٹی کے لئے اسقدر سخت اور بے رحم الفاظ استعمال کر سکتی ہے؟ یہ میرے یقین اور تخیل سے پرے کی بات تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ماں کی الفت اور ممتا مجھے نصیب نہیں ہوئی لیکن ماں کی ممتا اور محبت کیسی ہوتی ہے یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ ماں کے دل میں دیدی کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ میں نے کئی مرتبہ ماں کو دیدی کی طرف ممتا بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھا تھا۔ دیدی کی ناراضگی اور ضد پہ وہ کیا کیا نہیں کرتی تھیں؟ ایک مرتبہ شہر میں نمائش ہو رہی تھی ـــ دیدی نے اس میں ساٹھ روپیہ کی ایک ساڑھی دیکھی تو ان کا دل مچل اٹھا ـــ ساٹھ روپیہ کی ساڑی ماں کے پاس اتنے روپیہ نہیں تھے کہ وہ اسی وقت ساڑی دلوا دیتیں۔ پتا جی ایک معمولی بینک کے منیجر تھے۔ صرف چار سو روپیہ تنخواہ ـــ اس سے گھر کا خرچہ، ہماری تعلیم رشتہ داروں کی شادیاں وغیرہ سبھی کچھ تو کرنا ہوتا تھا۔ ساٹھ روپیہ کی ساڑی دیدی کے لئے اسی وقت کس طرح دلوا سکتی تھیں۔ گھر واپس جا کر دیدی نے کھانا نہیں کھایا ـــ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ دراصل محبت کی وجہ سے ماں سے بھی کھانا نہیں کھایا گیا۔ کافی رونا دھونا ہوا ـــ اس رات ماں دیدی کے ساتھ سوئیں۔

...سرے دن ساڑی خریدی گئی —
اماں کی ماں نے میرے لئے باپ کی اماں کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے تھے — میرا دل تڑپ اٹھا — جی چاہا کہ نیچے جا کر اپنی ...ن رکھالی تھیں جس میں اُنہوں نے مٹھائی رکھنے کے لئے گھی کھولا رکھا تھا ...یڈن — وہ جلن شاید اس جلن سے کہیں کم ہوگی جو دل کو اس طرح تڑپا رہی ہے —

لیکن میں ویسا نہ کرسکی — نصیب کا بدا ابھی بہت کچھ دکھانا باقی تھا — جب جب میں ماں کی ممتا کی کمی محسوس کرکے غم زدہ ہو جاتی تو مجھے پتا جی کا خیال آجاتا کتنے رحم دل ہیں وہ ؟ دیدی کے لئے گھڑی لائے تو میرے لئے بھی — ماں نے کہا۔ دیدی کی تو شادی ہے ، رانی کے لئے یہ فضول خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

پتا جی نے خاموشی سے جواب دیا — انٹر میں اوّل آئی ہے —— اُسے کالج جانا ہوگا — کالج میں گھڑی کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے

ماں خاموش رہیں — اس بات کا کوئی جواب انہوں نے نہیں دیا — مجھے پتا جی سے یہ تحفہ پاکر بے حد خوشی ہوئی — شروع سے ہی گھر بھر کی بے رخی اور لاپرواہی نے میرا دل نہایت نازک اور پُردرد بنا دیا تھا — چاندی کے اصرار پر ماں نے مجھے ہلکے رنگ کی دو ریشمی ساڑیاں دیدی کی شادی پر پہننے کے لئے دی تھیں لیکن میں نے انہیں نہیں پہنا — اس بھیڑ بھاڑ میں کسے فرصت تھی کہ میرے لباس کی طرف توجہ دیتا — کسے غرض پڑی تھی کہ غور کرتا کہ میں نے کیا پہنا ہے کیا نہیں —

جب دیدی کچھ دن سسرال میں رہ کر واپس گھر آئیں تو میں نے وہ ساڑیاں پہنیں تاکہ کمل بابو یہ نہ سمجھ سکیں کہ میرے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں — اُس واقعہ کی یاد آتے ہی میرا دل آج بھی درد سے چیخ اٹھتا ہے —

کمل بابو کو ہمارے گھر میں کسی راجہ مہاراجہ سے کم عزت نہیں دی جا رہی تھی — سب کے ساتھ دلچسپی سے گفتگو کرتے دیکھ میرے دل میں بھی خواہش ہوئی کہ میرے اکلوتے جیجا جی میرے ساتھ بھی اسی طرح پیش آئیں — شادی کے موقعے پر جب اُن سے میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے ایک مرتبہ میری طرف اپنی نگاہیں اٹھائیں اور پھر میرے قریب کھڑی ہوئی سندری شرما کو دیکھنے لگیں — سندری کا جیسا نام تھا ویسی ہی وہ خود بھی — وہ اپنی خوبصورتی کی اہمیت بھی جانتی تھی — اس نے کمل بابو کی نسبت کا جواب آنکھوں میں مسکراہٹ بھرتے ہوئے دیا — اسی لئے جب کمل بابو دیدی کو پہنچانے کے لئے آئے تو ان کی نگاہیں سندری کی متلاشی تھیں ، دیدی ، ماں یا مجھ سے انہوں نے کچھ بھی دریافت نہ کیا — لیکن چاندی نے اپنے موٹے موٹے سُرخ ہونٹوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے بتایا رانی بیٹا!
جانتی ہو جانی بابو سندری بی بی کو پوچھ رہے تھے ؟
تو تم نے انہیں بتایا کیوں نہیں کہ سندری پڑھنے کے لئے دلّی چلی گئی ہے —
ہوں مجھے کیا ضرورت تھی — چاندی ہنس کر بولی اور ایک طرف چلی گئی —

سسرال میں صرف ایک ہفتے کے قیام کے بعد دیدی کے دل میں میرے لئے نہ جانے کیوں بے حد محبت امڈ پڑی تھی — جیسے کوئی خاموش چشمہ ایک بارگی پھوٹ پڑا ہو — مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئیں اور بولیں —— رانی ! تیری بہت یاد آتی تھی — تیری خاموشی ، کبھی کبھی کہی ہوئی تیری مختصر باتیں اور کہنے کے بعد تیری آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو ، تیری سبھی باتیں مجھے یاد آتی تھیں —

دیدی کئی گھنٹے مجھ سے باتیں کرتی رہیں — انہوں نے اپنی سسرال کی باتیں سنائیں — بتایا کہ ان کی ساس کمل بابو کے بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہے — کیونکہ کمل بابو کی عادتیں انہیں پسند نہیں — وہ پرانے خیالات کی ہیں — انہیں گلیوں میں گھومنا پسند ہے — بیٹے کی شراب نوشی سے انہیں سخت نفرت ہے — کمل بابو کے شراب پینے کی بابت ہمیں دیدی کی شادی سے پیشتر معلوم ہو گیا تھا — ماں نے یہ کہہ کر درگزر کر دیا تھا کہ سبھی بڑے آدمی پیتے ہیں — کمل بابو بھی پیتے ہیں تو کیا غضب ہو گیا ! دیدی نے یہ بھی بتایا کہ کمل بابو کو شکار کا بھی شوق ہے — اور وہ ایک ہوشیار شکاری ہیں — ان کے مکان میں جگہ جگہ شیر کی کھالیں اور ہرن کے سینگ

لگے ہوئے ہیں ۔۔۔

دیدی کا رنگ تو پہلے ہی گورا تھا۔ اب ایسا دکھائی دیتا گویا کسی نے ان پر چندن پوت دیا ہو۔ باتیں وقت وہ مبہم مسرت نظر آرہی تھیں۔ بے ساختہ ہنسی اور قہقہے ان کی عادت میں شامل تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں گویا شمعیں روشن ہوگئی ہوں۔ ہونٹوں پر ایک دلکش اور مستقل تبسم تھا جو پیدا ہوگیا تھا۔ دیدی کے گھنگھریالے بالوں میں گویا ستارے ٹانک دیے گئے تھے۔ میں اپنی بہن کی خوبصورتی سے کافی حد تک متاثر ہو گئی تھی۔

ہمارے گھر کی چھوٹی سی دنیا میں دیدی اور کمل بابو کی آمد نے رونقیں جگا دیں۔ گھر کی دوسری منزل میں دو کمرے تھے اور نیچے تین۔ اوپر کے ایک کمرے میں میں اور دیدی رہتے تھے۔ دوسرے میں کچھ اسباب پڑا رہتا تھا۔ برسات میں ماں اور پتا جی وہاں سوتے تھے۔ نیچے والے کمروں میں ایک گول کمرہ تھا۔ دوسرے کمرے میں ماں اور پتا جی رہتے تھے۔ تیسرا کمرہ آنے جانے والے مہمانوں کے لئے تھا۔ اس کمرے میں گھر کا اسباب بھی رکھا ہوا تھا۔ شادی کے بعد جب دیدی کمل بابو کے ساتھ آئیں تو ماں نے ان کے رہنے کا انتظام میرے کمرے میں کیا۔ اور مجھے اپنے کمرے کے ساتھ لگی ہوئی پرچھتی میں پہنچا دیا گیا۔ اوپر نیچے آتے جاتے کمل بابو سے سامنا ہو جاتا۔ وہ دیکھتے ہی دوسری طرف منہ کو پھیر لیتے۔ دل ہی دل میں مجھے ان پر بہت غصہ آتا اور کچھ نہیں تو کم سے کم تہذیب کے لحاظ سے تو انہیں مجھ سے بات چیت کرنی چاہئے۔ یوں منہ پھیر لینے سے آخر فائدہ بھی کیا؟ شاید اسطرح کے سلوک سے وہ میرے لئے اپنے دل کی نفرت اور حقارت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے خود کو کیا تصور کرتے ہیں؟

جو چہل مذاق کمل بابو کی اپنی سالیوں کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں وہ ماں سے ہوتیں۔ ہماری ماں دیکھنے میں نہایت خوبصورت تھیں۔ گورا چٹا رنگ، چھریرہ جسم، چست گٹھن لمبے بال جن کی نمائش کرنا وہ پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں بھی نہ بھولتی تھیں۔ ماں نے پتا جی کے ساتھ رہ کر انگریزی بھی سیکھ لی تھی ۔۔۔ وہ ہماری طرح با آسانی انگریزی میں گفتگو کرتی تھیں۔ کمل بابو ان کے داماد تھے۔ لیکن ماں ان کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے پیش آتیں ۔۔۔ ماں، دیدی اور کمل بابو کبھی کبھی چاندنی میں گھنٹوں تاش کھیلتے۔ دیدی کی زبردست خواہش ہوتی کہ میں بھی شرکت کروں۔ لیکن میں کبھی تاش کھیلی ہی نہ تھی۔ نہ مجھے کھیل سے واقفیت تھی اور نہ دلچسپی ہی ۔۔۔

ماں جس طرح کمل بابو کی آرتی اتارتیں مجھے نہایت ناگوار گزرتا ۔۔۔ داماد سب کے ہوتے ہیں۔ سندری کی بھی دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس کے بہنوئی بھی سسرال آتے جاتے ہیں۔ سندری کے چھوٹے بہنوئی تو نہایت عاشق مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ سبھی لوگوں کو ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ نہایت ادب، محبت، تہذیب اور نرمی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی ساس بھی ان کی خاطر تواضع کرتی ہے۔ لیکن ہماری ماں کی طرح نہیں ۔۔۔

کمل بابو کی بات ہی دیگر تھی۔ وہ گھر کے پہلے داماد تو تھے ہی۔ ساتھ ہی گھر میں کوئی لڑکا نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے کی کمی پوری کرتے تھے ۔۔۔

پتا جی کی زبردست خواہش تھی کہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کروں۔ لیکن ماں رضامند نہ تھیں اور میں بھی اپنی طرف سے کوئی زور نہ دیتی تھی۔ کیونکہ رہ رہ کر مجھے ماں کے اس جملہ کا خیال آجاتا ۔۔۔ یہ ڈاکٹر بن کر کیا کرے گی۔ جو بچے اس کے ہاتھ سے پیدا ہوں گے وہ بھی سب کالے ہو جائیں گے"۔ میرا دل غصہ اور نفرت سے بھر جاتا ۔۔۔ میں نے تاریخ، موسیقی اور ہندی میں انٹر پاس کیا۔ بی۔ اے، میں ہندی اور موسیقی لی اور ایم۔ اے، میں صرف ہندی ۔۔۔

طالب علمی کے زمانے کے تلخ واقعات مجھے بھی اسی طرح عزیز لگتے ہیں جیسے اوروں کو ہوتے ہیں ۔۔۔ اس دور میں ماں کا طرز عمل میرے ساتھ کیسا رہا۔ یہ ایک دو جملوں میں تحریر کر کے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ماں کا تعلق تو بیٹی کے ساتھ زندگی کے ہر لمحہ میں ہوتا ہے۔ اور زندگی کے ہر لمحہ کے ساتھ، ہر اہم واقعہ کے ساتھ اس کی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتی جاؤں گی، ماں خود بخود میرے ساتھ ساتھ آتی رہیں گی ۔۔۔

کمل بابو نے میرے کالج میں داخل ہونے سے پیشتر ہی ظاہر کر دیا تھا کہ ان کی قطعی دلچسپی مجھ میں نہیں ہے۔ کہنے کو تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ میری بھی کوئی دلچسپی ان میں نہ تھی۔ لیکن یہ غلط بیانی ہوگی۔ کمل بابو میں دلچسپی تو میرے فسانے کا خاص عنصر ہے۔ اگر اسے باہر کر دوں تو باقی جو کچھ رہ جائیگا وہ فضول اور بدنما نظر آئے گا۔

اس دن بی۔ اے۔ کا نتیجہ سامنے آگیا تھا۔ ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوتا تو میرا ایک دستور سا بن گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی اور کالج میں اول آئی۔ گھر پر مبارکباد دینے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میری ہمجولیوں کے علاوہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر بھی آئے۔ جن میں عورت اور مرد، دونوں ہی شامل تھے۔ میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتی، پھر سر جھکا لیتی۔ ہر مرتبہ اول آنے کی وجہ سے مجھے اس اداکاری کی اچھی خاصی مشق ہوگئی تھی۔ ماں بھی آج کے دن مجھ سے نفرت نہ کر پائیں۔ آنے والوں سے میری تعریفیں بیان کرتیں۔ ایک ہی جملہ انہیں ہر مرتبہ بار بار دہرانا پڑتا۔ رانی کو بھگوان نے ذہن دیتے وقت کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس جملے میں میرے کالے پن کا کہیں ذکر نہ ہوتا۔ میں ان کے اس احسان کے بوجھ سے دب جاتی۔ یہی ایک دو دن ایسے آتے تھے جب میری قدر ہوتی تھی۔ میرے ستار کا گرد و غبار صاف کیا جاتا اور اسے گول کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ چاندی کے کپ بھی گول کمرے میں آراستہ کر دئے جاتے۔ آنے جانے والوں کے روبرو ہر چیز کی تاریخ دہرائی جاتی۔

بی۔ اے۔ کا نتیجہ میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک دو لڑکوں کو چھوڑ کر اور کوئی بھی ہمارے خاندان میں بی۔ اے۔ پاس نہ تھا۔ پتا جی البتہ ضرور بی۔ اے۔ تھے، لیکن وہ سیکنڈ ڈویژن میں بھی پاس نہیں ہوئے تھے۔ دیدی بھی بی۔ اے۔ پاس نہ کر سکی تھیں۔ ان دنوں وہ ہمارے پاس ہی تھیں۔ کیونکہ منا پیدا ہونے والا تھا۔ اور نتیجے والے دن وہ پندرہ دن کا ہو چکا تھا۔ دیدی کی شادی شدہ زندگی میں منا پہلی اولاد تھی۔ ماں کا اپنا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے منا کی پیدائش کمل بابو اور دیدی کے لئے ہی نہیں ماں کے لئے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ منا کی پیدائش کے بعد سے وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ ابھی تک دیدی کی شادی کا قرضہ بالکل نہ اترا تھا کہ ماں نے حلوائی، کپڑے والے اور سنار کا قرضہ اور چڑھا لیا۔

کاویری کو دینے کے لئے ہار اور ایک جوڑی کنگن بنے۔ منے کے ہاتھوں کے کڑے اور بٹن بنوائے گئے۔ یہ سب فضول خرچی دیکھ کر میں بے حد پریشان تھی کہ آخر پتا جی کس طرح روپیہ مہیا کریں گے اور اس قرض سے نجات پا سکیں گے؟

ماں کو برادری میں اپنی شان قائم رکھنی تھی۔ کمل بابو کی ماں کئی مرتبہ کہہ چکی تھیں کہ کمل بابو نے محض خوبصورتی کے چکر میں آکر اپنے سے کم حیثیت والوں کے ساتھ رشتہ کر لیا۔ انہیں کاویری کی فیشن پرستی بھی آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کاویری کو ماں سے تعلیم ملی تھی کہ گھر میں خواہ دھن دولت نہ ہو لیکن گھر کی عورت کے پاس بیش قیمتی پوشاکیں اور زیورات ہونا ضروری ہیں۔ ماں اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی تھیں اور شادی بھی ویسے ہی خاندان میں ہوئی تھی۔ انہیں یہی تعلیم ملی تھی کہ خاوند اس بی بی کے زیر رہتا ہے جو خرچیلی ہوتی ہے۔ ماں کا کہنا تھا کہ ہر شوہر کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بی بی خرچیلی ہو۔ ان کا خرچہ کرائے اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو خاوند بھی اس کی عزت نہیں کرتا۔ ماں کا خیال تھا کہ ایسی صورت میں خاوند موقع ملنے پر دوسرے مردوں کی بیویوں کے نہیں تو دوسری عورتوں کی ناز برداری کرنے لگتے ہیں۔ ماں کی دی ہوئی تعلیم پر بھلا دیدی کیوں نہ عمل کرتیں۔ دو چار مہینے سسرال میں رہنے کے بعد جب وہ واپس آتیں تو ہر مرتبہ نئی ساڑیاں، نئے زیورات، نئی سینڈلیں اور چپلیں لے کر آتیں۔ پرانی ساڑیاں مجھے دے ڈالتیں۔ میری موج ہوگئی تھی۔ جب سے دیدی کی شادی ہوئی تھی، میرے پاس بے شمار کپڑے ہوگئے تھے۔ پرانی ساڑیوں کے علاوہ نئی ساڑیاں اور کتابیں بھی دیتی رہتیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر ناول ہوتے ہندی اور انگریزی کے۔ دیدی کی رائے میں ناول کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ اکثر جاسوسی اور سستی محبت کے ناول ہوتے۔ جن میں مسوری کی کسی جھیل کا حال بیان کیا جاتا یا بے تکی داستانیں ہوتیں۔

ایسی داستانِ عشق جنھیں پڑھ کر ابکائی آجائے۔ دیدی یہ کتابیں مجھے دیتیں تو میں انکار کسطرح کر سکتی تھی۔ چپ چاپ انھیں اپنے پاس رکھ لیتی اور وقت ملتے پران کا مطالعہ کرتی ——

میں اپنے بی۔ اے۔ کے نتیجے والے دن کا ذکر کر رہی تھی۔ پتا جی دراصل بے حد خوش تھے۔ کسی بھی طرح اپنی خوشی پوشیدہ رکھ پاتے میں کامیاب نہ ہو پا رہے تھے۔ اس دن وہ اپنے دفتر بھی نہیں گئے۔

ماں نے کہا —— آج بینک نہیں جاؤ گے؟

نہیں، روزانہ تو ہماری بیٹی فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے۔ پاس نہیں کریگی۔ لوگ آئیں گے۔ مبارک باد دینگے۔ کوئی تو ان سے بات چیت کرنے والا ہونا چاہیئے ——

ماں نے کہا۔ کمل بابو جو ہیں —— وہ بات چیت کر لیں گے۔ تم بینک جانا چاہو تو چلے جاؤ ——

میں نے خفا خفا نظروں سے کمل بابو کی طرف دیکھا —— انہوں نے لاپرواہی سے کہا —— پتا جی درست فرماتے ہیں۔ میں کسی سے بھی گفتگو نہ کر پاؤنگا۔ اور پھر امتحان میں پاس کوئی ہوا ہے۔ فرسٹ کلاس کسی کا آیا ہے اور خوش کوئی ہو رہا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا ——

کمل بابو کے اس کورے جواب کو سن کر ماں تو مسکرا دیں —— گویا داماد نے کوئی بہت بڑی بات کہہ دی ہو —— کاویری حیرت سے اُنکا منہ دیکھنے لگی۔ پھر ذرا سا مسکرا دی —— مجھے معلوم نہ تھا تمہاری نظروں میں تعلیم اتنی اہمیت رکھتی؟ تم نے رانی کو مبارک باد دی؟

کمل بابو کی طرف دیکھنے کی ہمت تو مجھے ہوئی نہیں۔ لیکن ان کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ پہ ہنس رہے ہیں ——

کاویری میری کامیابی پہ بہت خوش تھی۔ اس نے پتا جی سے کہا —— پتا جی! رانی کو ایم۔ اے۔ تو دہلی سے کرنا چاہیئے ——

نہیں بیٹی! تم دہلی چلی جاتی ہو تو گھر سونا سونا نظر آتا ہے۔ رانی بھی چلی گئی تو گھر قطعی ویران ہو جائے گا ——

منا کو آپ لوگ اپنے پاس رکھ لیجئے۔ کاویری سے اس کی پرورش نہ ہو سکی گی۔ کمل بابو نے کہا ——

بیٹا! تم نے میرے منہ کی بات چھین لی —— میں جانتی ہوں کہ کاویری کی پرورش بڑے ناز نخرے سے ہوئی ہے۔ بچے کی —— دو سال بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ انھیں سالوں میں بچے کی پرورش پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ہمارے بھی تو کوئی نہیں۔ منا ہمارا بیٹا ہی تو ہے۔ کیوں جی؟

بیٹے کے نام سے پتا جی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت پھوٹ آئی۔ شاید وہ دل میں کسی ایسی خواہش کو پرورش دے رہے تھے کہ ... کوئی بیٹا ہو تو وہ لے گود لیں ——

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے فوراً کہا —— دیدی سے تو ... کر لیجئے ماں بولیں کہو منا کا دیدی؟

مجھے سخت تعجب ہوا، جب دیدی نے کمل بابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— جو ان کی مرضی۔ جو آپ لوگوں کی مرضی، میری بھی وہی ... ہے۔ میں آپ لوگوں سے باہر نہیں ہوں ——

دیدی! تم منا کو یہاں چھوڑ جاؤ گی؟

ہاں، تم میرے ساتھ چلو گی —— اور منا یہاں ماں کے پاس رہیگا۔ مجھے دہلی جانا چاہیئے یا نہیں، اس پر ماں نے ابھی کوئی رائے ظاہر نہ کی۔ ماں کی یہ خاموشی مجھے کھٹکی کہ شاید ماں مجھے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالنا چاہتی ہے۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے لیے اگر دیدی کے پاس جاؤنگی تو دلی میں کہیں نہ کہیں نوکری بھی تلاش کر لونگی ماں کی شاید یہی خواہش تھی ——

اس دن میرے پاس ہونے کی خوشی کو بھول کر ماں اور پتا جی منا کو قانوناً گود لینے کی تجویز میں مشغول ہو گئے۔ میں نے ایک مرتبہ منا کی دادی کا ذکر کیا تو ماں نے فوراً کہا —— منا پندرہ دن کا ہو گیا۔ دادی کے دل میں ایک دفعہ یہاں آکر پوتے کو دیکھنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ کچھ دینا لینا تو دور رہا ——

کمل بابو نے ماں کی بات کی تائید کی۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو بغیر کسی پس و پیش کسی دوسرے کو اس طرح دے سکتا ہے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی ——

کمل بابو ہماری مالی حالت سے بخوبی واقف تھے —— پھر ان کی اس دلچسپی کی وجہ کیا تھی؟ میں سمجھ نہ پائی ——

پتا جی بھی بیٹا گود لینے کی خوشی میں کچہری سے دستاویز وغیرہ لے آئے اور منا کو گود لے لیا گیا۔ کمل بابو نے لکھا پڑھی کر دی۔ دیدی نے بھی دستخط کر دئے۔ ساتھ ہی پتا جی اور ماں نے بھی ——

اس شام چار سال کے بعد پھر ہمارا گھر انگریزی باجوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ چار سال پیشتر دیدی کی شادی پر بھی ایسا ہی باجا بجا تھا ——

گزر سکے گا؟ یہی کہ زندگی بھر کر بچوں میں رہو اور اسپتال میں۔ مجھے نہیں معلوم کہ شاید یہ انسانوں والی تمام دنیا ہوتی ہے۔ جہاں دو سچے پیار ہی سب کو اپنا لیتے ہیں ـــ

کا دیر کا دیدی اور دھیریندا اکثر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو باتیں ہوتی رہتیں۔ کیونکہ دیدی فن، ادب، سیاست اور مذہب پر گفتگو کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ تو صرف زیورات، ساڑیوں اور بلاؤزوں پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی تھیں۔ فیشن طبیعت پر منحصر ہے اور طبیعت عادتوں پر دیدی کی ـــــ ماں کو سرچڑھا رکھا تھا۔ اور سسرال میں آکر کل باپو کی شرم تھی میں سارے بازار میں جو کچھ بھی ہو سب سے زیادہ قیمتی ہوتے خریدنا گویا ان کا فرض تھا۔ یہ فرض دہلی آکر اور بھی مضبوط اور ضروری ہو گیا تھا۔ کناٹ پلیس کی بڑی بڑی کپڑا فروشوں کی دکانوں پر جو بھی نیا کپڑا آتا دیدی ضرور خریدتی تھیں۔ خواہ وہ ان پر خوبصورت لگے یا نہ لگے۔ ـــ

میری موجودگی میں دھیریندر بھی خوب بڑھا چڑھا کر تعریف کیا کرتا۔ دیدی نے شاید اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہت کرتی ہیں۔ گھر بھر میں ہی ان کی عزیز ترین ہوں ـــ میرے بغیر رہ نہیں سکتیں اور اسی لئے مجھے لکھنؤ سے دہلی لے آئی ہیں ـــ دیدی نے شاید یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ میرے دہلی آنے پر ماں باپ نے سخت مخالفت کی تھی لیکن دیدی نے کسی بھی طرح ان کی مخالفت منظور نہ کی تھی۔ ممکن ہے دیدی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں گھی کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ لیکن غور کیجئے آج کل چراغ کہاں جلائے جاتے ہیں۔ آج کل تو بجلی کے ہزار کینڈل پاور کے ٹیوب روشن ہوتے ہیں۔ ہاں تو ایسی ہی کچھ باتیں دھیریندر سے دیدی نے کہہ رکھی تھیں۔ کیونکہ ایک دن دوران گفتگو دھیریندر نے مجھ سے کہا تھا "رانی! تمہیں بھابی اسقدر محبت کرتی ہیں کہ ہماری سسرال میں بھی، تمہارے بغیر نہ رہ سکیں ـــ آج کل جگ میں اسقدر محبت کرنے والی بہن خوش قسمتی سے ہی ملتی ہے۔"

"جی ہاں" میں نے مختصر سا جواب دیا، اور میری آنکھوں کے آگے بچپن کے تمام واقعات ایک ایک کر کے رقصاں ہو اٹھے ـــ میں بخوبی جانتی تھی کہ دیدی نے میرے ساتھ کس قدر با محبت اور ہمدردی کا سلوک کیا تھا ـــ اف! اس جملے پر کتنی مرتبہ میری آنکھیں اشکبار ہو اٹھی تھیں ـــ

اس وقت تک میری زندگی میں آنے والا صرف ایک ایسا شخص تھا جس نے پوشیدہ یا ظاہر ـــ کبھی مجھے حقارت سے نہیں دیکھا۔ یوں تو میرا دھیریندر لیمپ پوسٹ کی طرح ہمیشہ میرا رہنما تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا اور آج بھی ہے کہ میں کالی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی بھی ان اشتہاری دواؤں کو استعمال نہیں کیا جو کالے رنگ کو گورا بنا دیتی ہیں۔ نہ میں نے دودھ اور ابٹن کا استعمال کیا تھا ـــ جسے استعمال کرنے کے لئے میری بوا بار بار اصرار کرتی تھیں ـــ

لیمپ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ کس بابو نے اسے ایجاد کیا۔ ہمارا اور خیراندیش سمجھ کر دیدی اور مجھے اس کی زیر سرپرستی مسوری بھیجا تھا۔ مسوری پہنچ کر اس نے ہماری سرپرستی کی۔ ہمیں مکان وغیرہ تلاش کرنے میں بھی مدد دی تھی ـــ جو لیت دیکھ کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ میں مسوری پہلے بھی کئی مرتبہ گئی تھی۔ جبکہ پتا جی اور ماں جہاں تھے ـــ اس مرتبہ دیدی کے ساتھ جانا کچھ اور ہی اہمیت رکھتا تھا ـــ اس مرتبہ خاص بات یہ تھی کہ پہلے کی بہ نسبت میرا نظریہ قطعی تبدیل ہو گیا تھا۔ میرے دل میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی خواہش پیدا ہو اٹھی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس مرتبہ صرف دیدی کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں ہی اپنا وقت ضائع نہ کروں گی۔ اور وہی ہوا بھی ـــ میری خوش قسمتی سے ماں نے چاندی کو مسوری بھیج دیا تھا ـــ چاندی اس مرتبہ آئی تو پھر ماں کے پاس واپس ہی نہیں گئی ـــ آج اس واقعہ کو قریب آٹھ سال ہو چکے ہیں، چاندی میرے ساتھ ہی رہتی ہے ـــ اب وہ کافی بوڑھی ہو گئی ہے ـــ لیکن اب بھی گھر کا تمام کام کر لیتی ہے ـــ چاندی کے مسوری آجانے سے جو تھوڑا بہت کام میں کرتی تھی وہ بھی بند ہو گیا ـــ وہ ہمیں منہ اندھیرے پانچ بجے ہی چائے بنا کر دے دیتی، پھر ہمارے غسل کے لئے پانی گرم کرتی ـــ دھیریندر کو تو نو بجے سو کر اٹھنے کی عادت تھی ـــ وہ رات بھر گھومتا رہتا یا ڈھلتی رات تک تاش کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی دیدی بھی تاش کھیلتیں، چاندی کا ساتھ دیتی ـــ اس وقت مجھے بے حد ہنسی آتی جب دہل، چاندی فلش، اور بریج کھیلتی ـــ ان کھیلوں نے البتہ انگریزی کے چند الفاظ بھی اس نے سیکھ لئے تھے ـــ کھیل میں جیت ہو رہی ہے یا ہار، اسے بھی وہ بخوبی سمجھتی تھی ـــ میں دل ہی دل میں خیال کرتی ـــ "ہمارا گھر بھی کسی غیر ملکی گھر سے کم نہیں، ہم بھی نوکروں کو ساتھ بٹھا کر تاش کھیلتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کھانا ٹیبل میز پر ہیڈ کر دہ بلکہ ساتھ نہیں کھاتی ـــ

میں نے محسوس کیا گویا مسوری آکر ویدی اپنی پریشانیوں سے نجات پا چکی ہیں — وہ ایک آزادی محسوس کرنے لگی تھیں — ہم نے جو مکان کرائے پر لیا وہ لائبریری کے بائیں طرف گزرنے والی چھوٹی سی سڑک پر تھا — اس لئے مال روڈ ہمارے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی — لائبریری ٹاور بھی قریب ہی تھا — بڑے بڑے ہوٹل بھی قریب تھے — ویدی کی خرچیلی تو شروع سے ہی تھیں — اب کل بابو کا اثاثہ اڑانے سے انھیں روکنے والا کون تھا — ہماری سماجی زندگی میں سرگرمی آ گئی تھی — آئے دن یا تو ہم کسی کے یہاں کھانے پر مدعو ہوتے یا کوئی ہمارے یہاں — ان میں سے بعض ایسی بے کیف پارٹیاں ہوتیں جن سے نہ میزبان کو مسرت حاصل ہوتی اور نہ مہمان کو — زیادہ تر لوگ اس لئے نہیں آتے تھے کہ انہیں پارٹی ——— میں دلچسپی ہوتی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے ملازمین کو اس دن آرام مل جاتا تھا — بلانے والے بھی صرف پارٹی میں اسلئے بلاتے تھے کہ وہ اپنے مہمانوں کے گھر پہلے جا چکے ہوتے تھے — بدلے میں پارٹی دینا تو درمیانی، اونچے اور مالدار طبقے کا اصول ہے

ایسی پارٹیوں میں عورتیں سج دھج کر گڑیا سی بن کر آ جاتی ہیں اور کرسیوں پر خاموش بیٹھ جاتی کبھی آپس میں ایک آدھ بات کر لی تو غنیمت، ورنہ اکثر خاموش ہی رہتی ہیں — ہاں ایک دوسرے کے زیورات اور لباس خوب غور سے دیکھتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر دوسری عورت کے شوہر کی مالی حالت اور سماجی رتبہ کا بھی اندازہ کر لیتی ہیں —

ایسی پارٹیوں میں گفتگو کے موضوع بھی اکثر ایسے ہی ہوتے جن پر نہ کسی قسم کی بحث ہو سکے اور نہ فساد تو خیر بد تہذیبی کی آخری حد ہے۔ اس طبقے کے شخص اگر قتل ہو کر زندہ ہو جائیں تو اپنے قاتل کو بھی مسکرا کر جی کہہ کر پکاریں گے۔ دل میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن زبان شیریں ہونا ضروری ہے۔ آدمی تو پھر بھی شراب پی کر کچھ بات چیت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن عورتیں بت بن کر بیٹھی رہتی ہیں —

اس طرح کی پارٹیوں میں شامل ہو کر میں نے محسوس کیا کہ ماں خواہ گھر کرتی ہیں کسی بھی لڑکی کے لئے کالی ہونا گناہ نہیں ہے — شریمتی کھاستگیر، شریمتی گھوش اور شریمتی مین تو مجھ سے بھی کہیں زیادہ کالی ہیں — انھیں دیکھ کر میرے دل کو تسکین ملتی ہے۔ اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کسی سے کسی بھی صورت میں کم نہیں ہوں۔ گفتگو کا سلیقہ مجھے ان سے زیادہ آتا ہے — میں دنیاوی واقعات سے واقف ہوں — مردوں سے بھی ہم کلام ہو سکتی ہوں — کئی مرتبہ ان کے ساتھ خوب بات چیت کرتی بھی تھی — میں جانتی تھی کہ مردوں کو کن کن موضوعات پر گفتگو کرنی پسند ہے — میں ان مضامین کا بھی مطالعہ کرتی — جن طبقوں میں میں ویدی کے ساتھ ملتی جلتی تھی — ان طبقوں کی عورتیں اخبار گھر میں منگاتی ضرور ہیں — لیکن اس میں صرف سینما کے اشتہارات یا بڑی بڑی دکانوں کے اشتہارات ہی دیکھتی ہیں — انہیں سیاسی اور دنیاوی واقعات میں دلچسپی اسی وقت ہوتی ہے جب ان کے شوہر کا اس واقعہ سے قریب یا دور کا تعلق ہوتا ہے — لیکن میں ان اخبارات کو شروع سے لیکر آخیر تک خوب غور سے مطالعہ کرتی تھی — اور شائع شدہ واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھی —

ان پارٹیوں کی بات چند جملے کہے بغیر دل ہی نہیں مانتا — اس طبقے کے لوگ دوسروں کو اس وقت مدعو کرتے ہیں جب ان کا کوئی ذاتی فائدہ اور مطلب ہوتا ہے۔ اسکی تہہ میں پوشیدہ موقع پرستی ہوتی ہے۔ افسر کو دعوت دیتا ہے۔ اس کی بیوی افسر کی خوشامد کرتی ہے — مرد افسر کی بیوی کے حسن و شباب کی تعریف کرتا ہے۔ بغیر کسی واقفیت افسر کی بیوی کے والدین کی تعریفیں کرتا ہے — یا پھر پبلک سروس کمیشن بورڈ کے کسی سپرنٹنڈنٹ یا مرکزی سرکار کے کسی وزیر یا ڈپٹی منسٹر کو دی جاتی ہے — جس سے وہ کسی دن کام آ سکے۔ کام اس سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اسکے کام آنے کی امید تو ہوتی ہی ہے —

جس سے کوئی اس قسم کی امید نہ ہو یا محض دوستانہ تعلقات ہی ہوں اسے اس طبقے کو لوگ بہت کم دعوت دیتے ہیں۔ ہاں اگر ان کا کوئی دوست سماج میں غیر معمولی رتبہ رکھتا ہو یا مالدار ہو یا اسکے ذریعہ اپنا نہیں تو کسی رشتہ دار کا بھی کام نکلتا ہو تو اس رشتہ دار کو اپنے احسان سے دبانے کیلئے بھی یہ لوگ اس امیر دوست کو دعوت دیتے ہیں۔ زندگی کی اس دوڑ میں یہ سب ادھ با خوشی کرتے ہیں اور اسکے لئے انھیں روپیہ پھونکنا ناجائز محسوس نہیں ہوتا ہے —

یہاں مسوری میں پتہ چلا کہ ایک دوسرا گھرانہ ایک کنور صاحب کی خاطر خوشامد میں گزشتہ چھ سالوں سے لگا ہوا ہے۔ اس گھر کے لڑکے کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ ان کا خیال تھا اور اب تک بھی ہے کہ جس وقت ان کا لڑکا بیس سال کا ہوگا، کنور صاحب اس وقت تک وزیر کے عہدے پر پہنچ جائیں گے ورنہ اسوقت یکایک اپنی دلچسپی ظاہر کر کے انھیں اپنانا مشکل ہو جائیگا اسلئے سالوں پیشتر ہی خاطر خوشامد شروع کر دی گئی۔ مکمل طور پر تو مجھے معلوم نہیں لیکن شاید اب بھی وہ کنور صاحب کی خاطر خوشامد میں اسی طرح سے لگے ہوئے ہیں —

ان کی آمد، خوشامد، منت اور عاجزی کی داستان کہاں تک دہرائی جائے۔ یہ لوگ اپنے معصوم بچوں کا پیٹ کاٹ کر افسروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ جیسے ہزاروں روپے ماہوار کی منتھلی پانے کے لئے ضد کریں وہ اسی طرح سارے محلے کو کھلائیں گے اس افسر کے گھر پہنچا اور باورچی کی بیٹی کا منہ بھیجیں گے ——

سورج، شعلہ اور تپش کی زندگی میدانی شہروں کی زندگی سے قطعی مختلف ہے۔ یہاں آنے والے خود کو یہیں کی زندگی میں ڈھال لیتے ہیں۔ سیتی، دھیریندر اور کاویری دیدی کی باہم خوب پٹ رہی تھی — دیدی کو وہاں کی تعلیم ملی تھی کہ منہ میں پان دبا کر پلنگ یا صوفے پر بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کر لی جائیں — ہاتھ میں تاش کے پتے ہوں یا اون کی سلائیاں، ہاتھ خود بخود مشین کی طرح کام کرتے رہیں گے اور زبان اپنی جگہ کام کرتی رہے — ست معاملہ ملکتی۔ ہماری رشتہ دار عورتیں کچھ اور کرتی تھیں صرف چارپائی پر بیٹھ کر باتیں بناتی رہتی ہیں — انھیں دنیا کی کسی سیاست اور قتل واقعہ سے دلچسپی نہ رہتی۔ میں دیدی اور دھیریندر سے دور دور ہی رہتی، نہ جانے کیوں دیدی کو مجھے اپنے قریب دیکھ کر جھنجھلاہٹ سی ہوتی — میں کس طرح ان کی یہ جھنجھلاہٹ برداشت نہ کر پاتی — اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی سوتی رہتی — دل پیچ اُٹھتا ——

ایک دن مسلسل بارش کے بعد آسمان نکھر آیا تھا۔ اپریل کی آخری ——— سے سردی کچھ بڑھ گئی تھی — میں ہلکے دھانی رنگ کا شال اوڑھ کر باہر گھومنے نکل گئی — تمام راستہ یہی خیال میرے ذہن پر چھایا رہا کہ کیا مرد کی محبت صرف دیدی کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے؟ کیا محبت حاصل کرنے کیلئے گورا ہونا لازمی ہے؟

میرے قریب سے ہو کر ایک بچہ، بچی گزر گئے —— بچی کا رنگ سانولا تھا، منہ پر چیچک کے بدنما داغ بھی تھے — بچہ اس کے ساتھ نہایت خوش نظر آرہا تھا —— میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ محبت پانے کے لئے گورا ہونا قطعی ضروری نہیں — جہاں تک میں نے سنا تھا لیلیٰ بھی کالی ہی تھی۔

میں لائبریری سے دور بازار میں پہنچ گئی —— اور ایک چھوٹے سے کافی ہاؤس میں جا بیٹھی —— میرا دل اور دماغ بے سبب بے چین اور پریشان تھا — جسے میں کسی بھی طرح معلوم نہیں کر پا رہی تھی ——

میں نے کافی کا آرڈر دے دیا اور کرسی پر پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنے ناولوں کو دہرا ڈالا — لیکن کسی بھی ناول میں کالی لڑکی سے متعلق کوئی تذکرہ نہیں —— میرا دل مصنفوں کے خلاف سے بھرا تھا۔ سب ایک جیسے ہیں۔ کسی نے بھی یہ خیال نہیں کیا کالی لڑکی کو بھی کسی ناول کی ہیروئن بنایا جا سکتا ہے۔ شرت چندر نے اندھی لڑکی کو منتخب کیا، دھیریندر ناتھ ٹھاکر نے بے زبان لڑکی کو۔ لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی کالی لڑکی کو ہیروئن بنانے کی ضرورت نہ سمجھی۔

کافی کا ایک گھونٹ گلے سے اترنے کے بعد میرے ذہن نے دل سے کہا —— "تو خواہ مخواہ درد و غم سے شکستہ ہوا جا رہا ہے —— تجھے تو خوش اور مطمئن ہونا چاہئے — دیدی کی بھی کوئی زندگی ہے؟ بچپن سے دکھ دیا تو خاموشی سے برداشت کر لیا —— جیسا بھی ماحول ہوا اس نے خود کو ڈھال لیا — دل اُبلا تو اسے اُلجھنے دیا، اس کی بھاپ بھی کسی کو نکلنے نہ دی — آخر دیدی اور قدیم زمانہ کی عورتوں میں فرق ہی کیا ہے؟ خاوند کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کر رہی ہیں — دل ہی دل میں سسکتی ہیں — ظاہرہ کچھ نہیں کہتیں — گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلتی ہیں تو کیا؟ گھر میں ہی سے عزت ہی کہاں مل پاتی ہے — پہلے بھی عورت اسی طرح ٹھکرائی جاتی ہے — پہلے بھی اس کے جسم میں حسن کو تلاش کیا جاتا تھا — آج بھی اس کی شخصیت بے معنی ہے اور جسم بامعنی — جسم مرد کا دل بہلایا کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عورت آج بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے ——

پھر بھی دیدی دھیریندر جیسے آوارہ شخص سے اس قدر گھل مل کر گفتگو کس طرح کرتی ہیں ——

جس وقت میں نے کافی پینی شروع کی تھی میرا دل بے چینیوں اور پریشانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اوّل تو کافی ہی کڑوی تھی دوسرے منہ کا ذائقہ بھی تلخ تھا — باہر آسمان کچھ صاف ہو گیا تھا — میں نے کافی ہاؤس میں نگاہ دوڑائی — میرے قریب والی میز پر ایک مصور بیٹھا تھا۔ اور اس کی بغل میں اس کا ایک دوست مصور کے دوست نے تصویروں کی نمائش کا ایک اشتہار میری طرف بڑھا دیا۔ نمائش ایک ہفتہ سے شروع ہو گئی تھی — دوپہر کو گیارہ بجے سے ایک بجے تک اور شام کو تین بجے سے پانچ بجے تک کھلتی تھی — میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں دیکھا — دس بجے کا وقت تھا۔ مصور کے دوست نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا — "اگر آپ نمائش میں جانا چاہتی ہوں تو ہم بھی وہیں جا رہے ہیں — آپ ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں"

میں نے دیکھا مصور بہت کافی لمبا اور چھریرے جسم کا تھا۔ سانولا

پراپیگنڈا کرنے والا دوست نہایت شوخ اور باتونی نظر آرہا تھا۔ میں نے بیرا سے بل منگوایا تو وہ ان دونوں کا بل بھی لے آیا۔ میں نے ایک مرتبہ ان دونوں کی طرف دیکھا کہ کیا وہ اس قدر بے تکلف بھی ہو سکتے ہیں؟ خود ہی نمائش کا اشتہار دیا اور اب اپنی کافی کا بل بھی آگے بڑھا دیا۔ وہ شخص جس نے مجھے اشتہار دیا تھا، اس کا نام جیتن تھا۔ یہ اس نے بعد میں مجھے بتایا۔

جیتن نے آگے بڑھ کر ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے، نمائش کا ٹکٹ بھی تو ایک روپیہ ہے۔ وہ آپ نہ دیجئے گا۔ یہ بل چکا دیجئے۔ صرف بارہ آنے ہی تو ہیں۔ آپ کو چار آنے کی بچت ہو گئی۔"

میں حیران رہ گئی۔ کیسا شخص ہے، بالکل ہی ناواقف اور وہ بھی ایک عورت سے ایسی بات کرتا ہے۔ دل میں ایک آیا کہ اشتہار اس کے منہ پر دے ماروں اور اپنا بل ادا کر اپنی راہ لوں۔ لیکن نہ جانے دل کیوں کسی ایڈونچر کا متلاشی تھا، میں نے ان کا بل بھی ادا کر دیا۔

نمائش زیادہ دور نہ تھی۔ جس ریسٹوران میں ہم لوگ بیٹھے تھے اس سے صرف فرلانگ دو فرلانگ تھی۔ سمیر نے میرے ساتھ قطعی گفتگو نہ کی۔ وہ اپنا دبلا پتلا جسم لے کر آگے آگے چلنے لگا۔ اب تک وہ اسی طرح خاموش تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی خاموشی اور سنجیدگی پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ نمائش کے باہر کے دروازے پر ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص ٹکٹ فروخت کر رہا تھا۔ مجھے جیتن اور سمیر کے ساتھ آتے دیکھ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ہلکا سا غرور محسوس کیا۔ میری خودداری کچھ نرم ہو گئی۔ دل نے کہا۔ چلو یہاں تو کم از کم مجھ سے بے رخی اور نفرت، حقارت کرنے والا تو کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ گھر پر میرے ساتھ کس قدر لاپرواہی کا سلوک ہوتا ہے۔

نمائش ہال میں جا کر دیکھا تو دو غیر ملکی مرد اور عورت گھوم پھر کر نمائش دیکھ رہے تھے۔ ہندوستانی اس جگہ ہمارے سوائے اور کوئی نہ تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا کہ اس طرح کی فنی نمائشوں کو لوگ اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ کہیں کوئی سنیما ہو تو ہزاروں کی بھیڑ جمع ہو جائیگی۔

نمائش میں داخل ہوتے ہی سمیر کی سنجیدگی اور خاموشی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ وہ نہایت جوش و خروش اور خوشی سے مجھے ان تصویروں کی اہمیت سمجھانے لگا۔ وہ تصویریں نہ تو فوٹو تھے اور نہ کارٹون، جیومیٹری کی متوازی بے جوڑ لکیروں میں تقریباً سبھی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے سنا اور دیکھا تھا کہ اکثر موجودہ مصور قدیم قوموں کے قدیمی فن کو اپنانے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور تیز کاٹتی لکیروں کے ذریعہ جو کچھ نقش کرتے ہیں اس میں جذبات سے کہیں زیادہ اہمیت ٹکنیک اور مواد کو دیتے ہیں۔ کیوبزم کا مقصد ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ سمیر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "کیوبسٹ مصور چیزوں کو ان کا تجزیہ کر کے ان لکیروں یا زاویوں کو منتخب کر لیتا ہے جو اس چیز کی خصوصیت ظاہر کر سکے۔ پھر چیزوں کے نقوش اور خاکہ کی بجائے وہ لکیروں اور زاویوں ہی استعمال کرتا ہے۔"

پورے کمرے بھر میں صرف ایک ماں اور بچے کی تصویر کو چھوڑ کر اور کوئی بھی دوسری ایسی تصویر نہ تھی جسے سمجھا جا سکے۔ میں نے سوچا کون اس گورکھ دھندے کو دیکھنے آئے اور اپنا وقت فضول برباد کرے۔

سمیر کو امید تھی کہ میں تعریف میں چند الفاظ کہوں گی۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بہت پست ہو گیا۔ ہر تصویر پر قیمتیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کسی کی قیمت پانچ سو تھی، کسی کی دو سو۔ ان بے تکی تصویروں میں سے ایک خریدنے سے کیا ہوگا؟ کچھ خاص نہیں۔ شاید ان لوگوں کا چند دنوں کا کھانے کا ذریعہ بن جائیگا۔

میں نے سمیر دت کی طرف دیکھا۔ وہ میرے چہرے پر ہونے والی تبدیلیوں کو نہایت باریکی سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ آہستہ سے پوچھا۔ "آپ کل بابو کی بیٹی کی بہن ہیں نہ؟"

مجھے گویا کسی نے آسمان سے لا کر زمین پر پٹک دیا ہو۔ یہاں بھی دبلا کر میرا وجود گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ اور اگر کچھ ہے بھی تو کل بابو کی وجہ سے۔ میں اپنی ذاتی الجھنوں میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اس کے سوال کا جواب دینا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن جواب تو آخر دینا ہی تھا۔

"جی ہاں۔"

"تو ایک تصویر خرید لیجئے نہ۔" جیتن نے اپنا مشورہ پیش کیا۔

میرے پاس اتنی رقم کہاں تھی۔ میں نے محسوس کیا گویا یہ دونوں مل کر میرا مذاق بنا رہے تھے۔ میرے دل میں نشتر چبھو رہے تھے۔

میری سماجی کمزوری آج مجسم ہو کر مجھ پر ہنس رہی تھی۔ مجھے چوٹ سی لگی تھی۔ اپنی حیثیت سے اونچی سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے میں چھوئی موئی کی طرح مرجھائی جا رہی تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک میں زندگی کی حقیقی اہمیتوں سے قطعی ناواقف تھی۔ ظاہری عزت اور چمک دمک کی میری نظر میں بہت بڑی قیمت رکھتی تھیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لمحات میری زندگی سب سے زیادہ قیمتی لمحات تھے۔

[illegible] حاصل ہے
چیتن نے ... تصویر خرید لی ہے ...
... کل بھجوا دے میرے پاس خرید ...
... نہیں رہا ہے
... تصویر ... دیں گی وہ کل بابوجی لے کر ... قیمت ... آپ تصویر تو دیکھ لیں"

میں نے تصویر کو دیکھا میرے جسم میں خون کی رفتار تیز ہو گئی ہے ... نے بھی آگے جھک کر کہا "ہاں ہاں، آپ پہچان لیجئے نہ — نمائش میں ... تصویر پسند آئی تھی جس ... اپنے بچے کی طرح دیکھ رہی تھی ——"
میری ... اس تصویر کی طرف گئی تو وہ دونوں بھی اسی طرف دیکھنے لگے ——

چیتن نے مسکرا کر کہا "اس کی قیمت زیادہ نہیں صرف پانچ سو روپے ہے — پہلے آپ سے صرف چار سو ہی لیں گے — آپ ہاں کیجئے تو یہ آپ کے مکان پر پہنچا دی جائیگی — اور کل بابوجی کو ٹیلی گرام بھیج دیا جائیگا ——"

... بابوجی ... کی بات اس سے پیشتر میں نے کبھی نہیں کی تھی — میرا پیارا ہی موقعہ تھا — میرے جواب کا انتظار انہوں نے نہیں کیا — ایک شخص جو قریب ہی کھڑا تھا اُسے تصویر پیک کرنے کے لئے انہوں نے کہہ دیا — میں نے تو سنا تھا کہ نمائش میں جو تصویر خریدی جاتی ہے اسے نمائش ختم ہونے پر خریدار کے پاس پہنچایا جاتا ہے — لیکن یہاں کا طریقہ عجیب نظر آیا تھا — میں نے چند لمحوں میں گھر کا رخ کیا — وہ شخص جس نے تصویر پیک کی تھی میرے ساتھ تھا ——

پھر رات چیتن نے سوال کیا "کل کافی ہاؤس میں آپ ... تشریف لائیں گی نا؟"

میں نے سوال ان سنا کر دیا تھا ——

کیرت نے تصویر کے ساتھ اپنا ایک کارڈ بھی بھیجا تھا جس میں شائع نہیں ... شاید اپنے ... کی تصاویر جمع کرنے کے لئے ایسا کیا تھا — یا پھر کسی غیر ملکی مصور یا فنکار کی نقل کی تھی ——

وہ اتنا ساتھ میں ہونے سے حالات کچھ سدھر گئے — مجھے بہت سے سوالوں کے جواب نہیں دینے پڑے — کاویری نے تصویر دیکھی ... پوچھا

وہ پسند تعریف کرنے کا موقعہ تلاش رہا تھا — اس دفعہ ... اس نے تصویر کی، میری کیفیت اور تصویر بنانے والے کی تعریف کی۔
میں نے بھی تعریف کے چند الفاظ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیے تھے۔
میرا دل پریشان تھا کہ کل بابو جس وقت ان کے تار کا جواب پائیں گے تو دماغی تصویر دیکھنے آئیں گے — کاویری کو بھی علم ہو جائیگا کہ تصویر مجھے بطور تحفہ نہیں ملی ہے بلکہ خریدی گئی ہے — اور وہ بھی اس کے پیسے سے — کاویری ایسی فضول خرچی ہرگز برداشت نہ کر سکیگی ——

میرا دل دھڑکتا رہا — اور میں دو تین دن تک گم سم اپنے کمرے میں پڑی رہی ... تین چار دن گزر چکے تھے — ان دنوں بار بار دل میں خیال اٹھا کہ ... کو بتا دوں — ... سے گفتگو کرنے کا موقعہ تو مجھے ملا تھا لیکن ... کی موجودگی میں — ان کی غیر حاضری میں نہیں۔ میرے ... کے شکوک مجھے نہ جانے کہاں کہاں لے گئے تھے، میرے لئے آج یاد کرنا مشکل ہے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ حقیقت ظاہر ہوتے ہی ویدی ماں کو خفا کریں گی اور ماں اپنے نصیب کو برا بھلا کہتی ہوئی مجھے ... کے لئے خفا کریں گی یا پتا جی مجھے لینے آجائیں گے — ناگوار تو پتا جی کو بھی گزریگا ——

چاندی سے میری بے چینی پوشیدہ نہ رہ سکی — وہ ... بولی
"تائی بیٹا! کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی تو نہیں ——"
"مگر بابوجی کا کوئی خط نہیں آیا ہے"
"نہیں ——"
"تم ہی کیوں نہیں لکھتیں بیٹا! وہ اب بوڑھے ہو گئے ہیں تمہیں ہی لکھنا چاہئے ——"
"تم نہیں سمجھتی ہو چاندی! پتا جی کو بیٹا پانے کی تمنا تھی، وہ پوری ہو گئی ہے اور کوئی بات نہیں ہے — لڑکے کو پا کر وہ بھول گئے ہیں کہ لڑکی بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے — پھر کالی لڑکی ——"
چاندی بات کاٹ کر بولی — "تم پڑھ لکھ کر بن گئی ہو رانی — اب تمہیں کس چیز کی کمی ہے — تم جہاں چاہو جاؤ، جو چاہو کرو ——"
نہ جانے کیوں چاندی کے یہ الفاظ مجھے ناگوار گزرے — "تم جہاں چاہو جاؤ، جو چاہو کرو" — گھر میں آزادی کے نعرے بلند کرنا ... اچھا لگتا ہے جب کوئی روکنے ٹوکنے والا ہو — مخالفت کرنے والا ہو — جہاں آزادی ہی آزادی ہو، جہاں کسی دوسرے کی فکر نہ ہو، وہاں یہ آزادی ناگوار گزرتی ہے۔

یہ سوچا کہ میرا کوئی نہیں ہے جو ہر طرف ہو سکی۔ تمہاری وفا خالق جذبہ کو ٹھیس پہنچا رہی ہے اس وقت میں کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔

کاوری سے گھر لوٹی دیر سے شام ڈھل رہی تھی گھر سے نکل جاتیں آہستہ آہستہ وہ بیٹا کا سہارا لیکر۔ اور کبھی چاندی کا سہارا لیکر۔ مجھے ساتھ لیا گویا سہارا دے رہا تھا۔ میں نے گھر کے ساتھ کچھ خواہش کا ہر ایک کا اندر اظہار کیا۔ جب پیار کر کے بھی محبت کا جو طوفان آتا تھا وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ شاید ملنے والے بچے کے تصور میں زیادہ منہمک رہتی تھی۔ ملاقات نے پایا تھا۔ اس مرتبہ جو بچہ ہونے والا تھا ڈیڈی کا شاید خیال تھا کہ وہ ان کی تمام کمی پوری کر دیگا۔

میں نے تم، اسکا انتقام ذکر کرتے ہوئے دیا تھا۔ مجھے پاس ہو ہفتے امید تھی ـــ چاندی کی تسلی کا تیز بخش باتیں مجھے ناگوار گزرتیں میں محسوس کرتی کہ شاید چاندی دنیا میں مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ سے مذاق کرتی ہے۔

میرے دل کی حالت اس قدر نازک اور پُر درد ہو رہی تھی کہ میں نے چاندی سے یہ دریافت کیا۔ "کیا چاندی! تمہیں بھی افسوس نہ ہوگا اگر میں پاس ملا کروں؟ کیا تم بھی مجھے دور کرو گی؟"

چاندی کے سانولے چہرے پر ایک لمحے حیرت کے آثار ظاہر ہوئے لیکن پھر وہ خود کو قابو میں کرتے ہوئے بولی ـــ "رانی بیٹا! میں نے تمہیں اپنی بیٹی کی طرح پیار کیا ہے۔ میرے پیٹ کی بچی ہوتی تو بھی میں اس سے زیادہ طرح اس کی پرورش نہیں کر سکتی تھی۔ جیسی میں نے تمہاری کی ہے تم تعلیم یافتہ ہو۔ میری اور ان کا دیری بیٹا کی طرح جاہل نہیں ہو۔"

میں اپنی ہنسی روک نہ سکی ـــ "کاویری دیدی تو بی ملے، تک پڑھی ہوئی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ اپنا ضروری حساب کتاب کاپی پر لکھ لیتی ہیں ـــ میں اپنے مطلب کا حساب انگلیوں پر لکھ لیتی ہوں۔ صرف اتنا ہی فرق تو ہے نہ؟ اس سے میں اپنی کمی کبھی نہیں کہونگی ـــ وہ سارا دن بیکار باتوں میں ضائع کرتی ہے اور تم اس وقت دل لگا کر کتابیں پڑھتی ہو۔ تم کتاب اس وقت چھوڑتی ہو جب کوئی خاص کام آ پڑتا ہے کچھ دیر رک کر پھر اسے کہا ـــ ہاتھ میں ہر وقت کتاب لئے رہنے سے ہی کوئی عالم نہیں ہو جاتا ـــ اس کے لئے عقلمند ہونا بھی ضروری ہے۔"

لیکن وہ عقلمندی میں آج تک کچھ نہیں پائی ـــ

میں نہایت بے چینی سے کمل بابو کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ تین چار دن گزر جانے کے بعد بھی جب [illegible] تو مجھے کچھ تسلی ہوئی ـــ یکایک خیال آیا کہ وہ [illegible] اگر جانے میں دیر بھی ہو گئی تو اس کا کیا نقصان ہوتا ہے [illegible] تو مجھے کرنا ہی پڑیگا۔ لیکن مجھے کسی بھی طرح تسلی نہ ہو [illegible] کی؟ پوچھا گیا ہے تو انتظار کرنے کے علاوہ

کمل بابو کیا کہیں گے؟

دھیریندر کیا کہے گا؟

ڈیڈی کیا کہیں گے؟

چاندی کیا کہے گی؟

سب لوگ مل کر کیا کہیں گے؟ یہی سوال رہ رہ کر میرے سامنے خوفناک صورت اختیار کر لیتا۔ انہیں پریشان ہو کر [illegible] دماغ پر زور ڈالنے لگتی ـــ

انہیں پریشانیوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے میں گھر سے باہر بھی کم ہی نکلتی کبھی اٹھتی تو دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایک عورت کی زندگی میں دوسرے کی رائے کی بہت اہمیت ہے؟ لیکن ایسا صرف میرے ساتھ ہی نہیں گزر رہا، بہت عورتوں کے ساتھ گزر رہا ہے ـــ

ماں کو بلائی، پتا جی کو ہماری داری کی یہاں تک کہ دور کے رشتے میں میری موسی کی ساتھی بھی نظر اور فرصت ہو جاتی تھی۔ کاویری بھی ملازم ہے سکھی کو ثابت کرنے کیلئے اکثر اپنی ہی [illegible] جھوٹ بولتی تھی۔ میں بھی اگر دوسروں کی رائے کی ضرورت محسوس کروں تو کوئی ناجائز بات نہیں تھی ـــ

تین دن کے بعد [illegible] شام کو میں نے دیکھا ڈیڈی دھیریندر اور سندری بنگلے کی طرف چلے آ رہے ہیں ـــ

میں نے سوچا، شاید کمل بابو بھی سندری کے ساتھ آئے ہونگے لیکن قریب آنے پر معلوم ہوا سندری تنہا تھی۔ وہ پاس آئی تو میرے گلے سے لپٹ گئی۔ میرا اندر ہی اندر گویا کچھ سکڑ گیا شاید میری افسردگی اور سندری کی آزادانہ مسرت میں کہیں [illegible]

سندری نے بتایا کہ گذشتہ چار دن سے وہ مسوری میں ہی تھی۔ ہم لوگ اسے شام ہی [illegible] ہمارے گھر کا پتہ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ مجھے تعجب ہوا جب اس نے کہا کہ اسے ہمارے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا ـــ

"یہ کس طرح ممکن ہے، کمل بابو نے تمہیں پتہ ضرور بتایا ہوگا" میں نے کہا۔

"نہیں، میں نے معلوم کرنے کی کوشش تو کی تھی لیکن آج کل ان کے یہاں میرا آنا جانا کم ہے" سندری نے جواب دیا ـــ

اور میں اس سے زیادہ کچھ بھی دریافت نہ کر سکی۔ سندری کا خوبصورت

[illegible] سے کسی لڑکی کے لئے
ممکن نہ تھا —
[illegible] کو چھوڑ کر آ رہی تھی —
[illegible] دیکھ کر وہ مسوری کس لئے آئی
ہے ؟ اس [illegible] نے مجھے بھی حیران کر دیا۔

[illegible] بیوقوف نہیں ہوں ۔ میں جانتی تھی [illegible] تھا ۔ تم آج بھی سے گزشتہ [illegible] — بہت بڑے رئیس جیسے مکان کے [illegible] ؟ آٹھ مہینوں میں کم از کم چار ہزار روپے تو [illegible] کی صورت دیکھنے کے لئے میں خود [illegible] کے ہاتھوں فروخت کر رہی ہوں — تم وہ [illegible] ہو — ہم ساتھ کھیلیں — [illegible] نہیں تھی — مجھے بھی تمہارا اور کاویری دیدی کا خیال تھا — کہ تم [illegible] بہت تجھی ہو گی — کاویری کے دل میں بھی میرے [illegible] ۔ اس حالت سے پیشتر ہی میں نے خود کو سنبھال لیا — اور اگر یوں تم گر جاتی تو کہیں کی نہ رہتی —

میں بیوقوفوں کی طرح بیٹھی رہی کہ جس وقت کمل بابو کے ساتھ اسکی شادی تھی اس وقت یہ مجھ کو کچھ نہیں کہتی تھی — اور اس وقت مجھے اس سے جلن بھی ہوتی تھی — لیکن اب تو — حالت ہی بدل گئی تھی —

سندری نے بتایا کہ آج کل وہ ایک امیر گھرانے میں گورنیس کا کام کر رہی ہے وہاں اسے سگریٹ چوری چوری چھپ کر نہیں پینے پڑتے ۔ کیونکہ گھر کی دوسری عورتیں بھی سگریٹ کی شوقین ہیں ۔ سندری نے بتایا کہ گھر کی مالکن انگریزی نہیں جانتیں — [illegible] کے کسی معمولی زمیندار کی بیٹی ہیں — اور مالک یعنی اپنے پتی کے ساتھ وہ صرف — ایک ہفتہ کے لئے ولایت ہو آئی ہیں — بال انگریزی فیشن کے کٹوائے ہیں ، اور گھوڑے کی سواری بھی کرتی ہیں ۔ اپنے پتی اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتی ہیں — سندری کا کہنا تھا کہ وہ انگریزی نہیں جانتیں تو کوئی خاص بات نہیں ہے — لیکن وہ دنیا کو اچھی طرح سمجھتی ہیں [illegible] دنیا کو کھا جانے کی خوبی ہے —

میں دیکھ رہی تھی کہ سندری پہلے کی بہ نسبت اب کافی ہوشیار اور سمجھدار ہو گئی ہے ۔ حالانکہ اس کی اور میری عمر میں کوئی خاص فرق نہ تھا — بلکہ وہ چند مہینے مجھ سے چھوٹی ہی تھی —

کاویری کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر پیتے ہوئے سندری نے کہا
مہرانی! اب تو مجھے بھی تیز سگریٹ پینے کی عادت ہو گئی ہے — اب مجھے چارپائی پر بیٹھ کر

پڑھنا اچھا نہیں لگتا ۔ کرسی میز ہو تو بہتر ہے — اور اگر کرسی جھولنے والی ہو تو اور بھی آرام رہتا ہو — میرا خیال ہے کہ اب میں لکھنؤ کے اس چھوٹے سے [illegible] مکان میں واپس نہ جا سکوں گی ۔ وہاں میرا دم گھٹ جائے گا —

اس وقت میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا — ہمارا مکان اس قدر برا تو نہیں ہے — پتا جی اور ماں [illegible] کے ساتھ آرام سے رہتے ہیں —

میرا امتحان ختم ہوئے کافی دن گزر چکے تھے — پھر بھی پتا جی نے مجھے لکھنؤ آنے کے لئے نہیں کہا — سندری بھی چھٹیاں گزار کر آئی تھی ۔ لیکن ہم دونوں کے گھر چھوڑ کر آنے میں بہت فرق تھا ۔ کیونکہ میں گھر سے زبردستی بھیجی گئی تھی — اور سندری نے اپنی مرضی سے اپنا گھر چھوڑ رکھا تھا —

کہہ نہیں سکتی اگر میں سندری کی جگہ ہوتی تو شاید ہر وقت میرا [illegible] بحث کرتا رہتا — ممکن ہے میں خود کو معاف نہ کر پاتی ۔ ایسی صورت میں ماں اور پتا جی کو قصوروار کہتی ۔ انسان دوسروں کو قصوروار ٹھہرا کر جس قدر خوشی حاصل کرتا ہے اتنی اپنی غلطی پر نہیں —

اس رات جب سندری اپنے گھر واپس گئی تو مجھے کافی تسلی دے کر میرا دل مضبوط کر گئی — میں نے سوچا کہ سندری بھی تو بغیر کسی سہارے کے آگے بڑھ رہی ہے ، میں بھی کیوں نہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں ۔ لکھنؤ کی واپسی کا مطلب تو ماں اور پتا جی کی فکروں میں اور بھی اضافہ کرنا ہو گا ۔ میرے پہنچنے سے اس چھوٹے سے گھر میں ایک طوفان جاگ اٹھے گا — سندری بچاری کا بھی کیا قصور ہے ؟ وہ بچہ نہیں ہے ۔ ماں نے لاکھ شکر منایا ہو گا [illegible] آئی —

سندری سیتا اور ساوتری کی ہم قوم ثابت نہ ہو سکی تھی ۔ کیونکہ اسے رام اور ستیہ وان جیسے تو نہ ملے تھے ۔ سامنے تھے کمل بابو ۔ یہ ستیگ نہیں کل جگ ہے — والدین لڑکی کو تعلیم تو دلاتے ہیں ساتھ ہی اسے کافی عمر تک بغیر شادی کے بھی رکھتے ہیں ۔ لیکن اسے یہ تعلیم نہیں دیتے کہ وہ کہاں تک کیسا برتے اور خود کو زمانے اور وقت کی گردشوں میں کس طرح ہم وزن اور ثابت قدم قائم رکھے —

کاویری دیدی اس رات بہت بات پر ہنس رہی تھیں ۔ انہیں غم تھا کہ سندری اور کمل بابو کا ہم دوست ہیں ۔ اب جبکہ سندری کمل بابو سے تعلقات منقطع کر کے مسوری آ گئی تھی تو ان کی خوشی کا محدود ہو گئی تھی ۔ سارا کا کہنا تو خود بخود [illegible] ہو گیا تھا —

× ——— × ×

* سندری کی [illegible] نشہ کھو جانا ہی پڑا ، جہاں وہ ملازم تھی —

بالمثل ہو گئی تصویر خریدنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد مجھے کمل بابو کا ایک خط ملا۔
لکھا تھا:

"مجھے معلوم ہے کہ تم نے کوئی تصویر خریدی ہے — پانچ سو کا بل
مجھے مل گیا ہے — تم [illegible] ہو گئی ہو اور مجھے اس دل پسند اگر
خریدا ہے تو شوق سے کاویری سے [illegible] کے لئے کہنے کی
ضرورت نہیں ہے — تم مجھے کتنا ہی روپیہ [illegible] دوں گا —

تمہارا —

کمل"

مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ یہ خط کمل بابو کا ہی ہے — تحریر تو انہیں کی تھی — جب وہ یہاں سے پاس گئے تھے تو اکثر کمل بابو انہیں خط لکھا کرتے تھے — [illegible] ان کے دو چار خط دیوی کے نام آئے تھے — میں نے [illegible] کر خط کو دیکھا — [illegible] — خط پڑھ کر میں دیوانی ہو گئی — مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی — اور وہ بھی کمل بابو سے — دیوی کی شادی کو تقریباً چھ سال گزر چکے تھے ان چھ سالوں میں انہوں نے میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ جس وقت خط ملا کاویری اور دھیریندو تاش کھیلنے میں مشغول تھے — زبردست بارش ہو رہی تھی، ڈاک کا دونوں کو انتظار تھا — لیکن ڈاک میں ایک ہی خط آیا، اور وہ بھی کمل بابو کی تحریر میں ایسی صورت میں کاویری کو اگر یہ جاننے کی خواہش ہو کہ خط میں کیا لکھا ہوا ہے، اسے قصوروار نہیں کیا جا سکتا —

میرے لئے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ مجھے ان لوگوں کی موجودگی میں ہی خط کھولنا پڑا — اور کاویری کے مانگنے سے پیشتر ہی میں نے خط اس کی طرف بڑھا دیا — کاویری نے ایک سانس میں ہی خط پڑھ کر اور تاش کے پتے پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی —

میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی —

"[illegible]ری" نے چیخ کر پکارا —

"ہاں!" —

لیکن آواز سن کر میں جیسے ہی اس کی طرف مڑی کاویری نے اپنی ایڑیوں پر کھڑے ہو کر ایک طمانچہ میرے گال پر جڑ دیا —

"بے شرم! میرے گھر میں رہ کر یہ انعام دیگی مجھے؟ — میری موجودگی [illegible] تو گویا دونوں کی زبان کو تالے لگ جاتے ہیں — وہ تیری شکل و صورت اور رنگ کا مذاق اڑاتے ہیں، اور تو انہیں دیکھ کر دور ہٹ جاتی ہے — گویا کسی نیک کام میں راستہ کاٹ گئی ہو — کیا یہ دکھاوا صرف مجھے دکھانے کے لئے تھا؟ جواب دو بولتی کیوں نہیں؟ تم جیسی سادی پڑھائی لکھائی کی گئی ہو — عشق کا کاروبار چلانے کے لئے تجھے کوئی دوسرا نہیں ملا؟

میرا گال [illegible]
دیوی کا شور سن کر [illegible]

بالمثل ہو گئی کاویری کا [illegible] — [illegible]
[illegible] کرتا [illegible] نہیں رہا — [illegible]
تمہیں خواہ مخواہ شبہ ہو گیا ہے —"

کاویری کے [illegible] گزر جانے کے بعد مجھے جب کبھی اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے [illegible] — اس وقت میری عمر اکیس سال کی تھی — [illegible] محسوس کرتی تھی شروع سے ہی خود کو [illegible] کے طمانچے نے گویا میرے خون میں ابال لا دیا —

چاندی کی بات پر میری [illegible] انہوں نے چاندی کو [illegible] — ورنہ اس کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی تھی [illegible] — تم [illegible] میرے گھر سے اسی وقت نکل جاؤ — جہاں [illegible] — [illegible] لئے خادماؤں کی کمی نہیں ہے —"

کیونکہ دھیریندو نے [illegible] نگاہوں سے میری طرف دیکھا لیکن اس گھر کے ٹکڑوں پر پلنے والا، اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ بیوی کی بات کی مخالفت کرتا —

صرف پانچ سو روپیہ، جنہیں کاویری [illegible] ایک بار [illegible] تھی، آج انہیں روپیوں کے لئے مجھے [illegible] تھی — [illegible] مجھے بھی محسوس ہوا کہ دیوی نے [illegible] تمام [illegible] —

میں دیدی [illegible] — [illegible] اس وقت [illegible] — [illegible] — [illegible] — [illegible] — [illegible] سے ماں کی طرح میری پرورش کی تھی — دیدی نے [illegible] تھا — کاویری کے ہاتھ سے [illegible] چاندی کی کنپٹی پر لگا — جس سے [illegible] —

میرے [illegible] ایک بار [illegible]

نہ جانے کب تک [illegible] میں سو نہ سکی۔ مجھے منا سے
[illegible] ہو گئی تھی۔ [illegible] کو دے دینے کا خیال بھی
[illegible] کہ جیسے ختم ہو رہا ہے۔ مجھے
[illegible] بات نہیں کرتے۔ سارا سامان ہے،
[illegible] کسی کے سینے [illegible] کر سکیں گے؟ میری اپنی زندگی بھی
[illegible] زندگی ہو گی۔ [illegible] ہی میری طرف کوئی توجہ نہ تھی۔
[illegible] شاید وہ مصروف ہو جائیں گی۔ میری فکر [illegible]
[illegible] میں خود کو یتیم اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔
رات کو جب میں پلنگ پر سونے کے لئے گئی تو چاندنی وقت نکال کر میرے پاس آ بیٹھی۔

"بی بی بیٹا! تم بی۔ اے پاس ہو گئی ہو۔ اب تم کو کیا فکر ہے جب مرضی ہو نوکری کر سکتی ہو۔ یہ منا کو گود لیں یا اور کسی کو۔ [illegible]

تمہیں معلوم ہے چاندنی! ماں مجھے دلی کیوں بھیج رہی ہیں؟

نہیں بیٹا! میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ تمہیں دلی بھیج رہی ہیں۔ [illegible] بیٹا ہو چکی ہے [illegible] سوچتی کہ دلی میں تمہارے لئے کوئی لڑکا ضرور مل جائیگا۔ وہاں تم ایم۔ اے کی تعلیم بھی حاصل کر لو گی اور شادی کا انتظام بھی باسانی ہو جائیگا۔"

چاندنی کے یہ الفاظ مجھے بے حد ناگوار گزرے۔ دل نے چاہا کہ اُسے انکار کر دوں کہ مجھے دلی نہیں جانا ہے۔ لیکن میں بستر سے اٹھ نہ سکی۔ یونہی لیٹی رہی۔

نصیب میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ اسے کون درگزر کر سکتا تھا۔ بیس سال کی عمر ہو چکی تھی اور اب تک ایک ہموار سطح پر آہستہ آہستہ ایک پیالے سے گزر رہی تھی۔ گو کبھی کبھی چھوٹے موٹے طوفان آ جایا کرتے تھے لیکن اکثر ان کا تعلق میرے ذاتی جذبات اور خیالات سے ہوتا تھا۔ پھر بھی ان معمولی طوفانوں سے بھی میں بے حد پریشان ہو جاتی تھی۔

یکایک مجھے یاد آیا کہ میری سہیلی سندری شرما بھی دلی میں ہے۔ اپنی بڑی بہن کے پاس رہ کر پڑھ رہی ہے۔ اس کی یاد آتے ہی مجھے اس طرح تسلی ہو گئی جس طرح سوکھے کھیت کے مالک کسان کو بادلوں سے بھرے آسمان کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

کافی رات گئے تک میں انہیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ جب ہم اپنی حسب معمول زندگی تبدیل کرنے کو تیار ہوتے ہیں تو ان دونوں کی بہ نسبت حالات کہیں زیادہ پر درد اور نازک ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں کہ وہ کیسا ہو گا۔ موجودہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں لیکن ہم مستقبل کو ہمیشہ پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور پُر درد زندگی کے لئے بھی ہمارے دل میں محبت جاگ اٹھتی ہے۔

مجھے اپنے مستقبل پر ناامید نظریہ سے غور کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ میں ہر وقت محسوس کرتی کہ گویا تعلیم کے علاوہ میری زندگی میں اور کسی چیز کی گنجائش نہیں۔

انہیں خیالات میں کھوئے کھوئے یکایک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ڈیڈی سے کہہ کر چاندنی کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ منا کے لئے ماں کوئی دوسری تعلیم یافتہ آیا رکھ لیں گی۔

دوسرے روز کافی بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ کم از کم دو مہینے ڈیڈی لکھنؤ میں رہیں گی اور منا کو دودھ پلائیں گی۔ یہ فیصلہ کمل بابو کے مشورے کے خلاف ماں اور ڈیڈی نے کیا۔

جب میں دہلی پہنچی تب کاویری اور کمل بابو کا باہمی تناؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ناول میں پڑھا تھا کہ جب مرد عورت پر فتح حاصل کر لیتا ہے اور جب عورت اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اُس کی بن جاتی ہے تو مرد کو ایک عجیب و غریب تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ مرد کو عورت کی شکل میں ایک ایسا آئینہ مل جاتا ہے جس میں وہ اپنے جذبات اور خیالات کے عکس دیکھ پاتا ہے۔ عورت ایک ایسی مشین ہے جس میں مرد کی آواز کی گونج بھری ہوئی ہے جس قدر مرد اپنی آواز صرف کرتا ہے، جس قدر آواز بلند ہوتی ہے اُسی کے مطابق عورت کی طرف سے اُس کی گونج سن پاتا ہے۔

شادی شدہ زندگی کے ابتدائی دور میں مرد عورت کو دیوی کہہ کر پکارتا ہے تو عورت بھی اُسے دیوتا کہہ کر ہی پکارتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اور جب وہ دور گزر جاتا ہے تو مرد محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت اب صرف ایک ہم سفر بن کر رہ گئی ہے اس کے بعد ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ عورت نے اس کی سب سے زیادہ بیش بہا چیز چھین لی ہے۔ اس کی آزادی چھین لی ہے اور وہ عورت کی غلامی میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ صرف دو کام کرتا ہے۔ یا تو عورت کو فریب دیتا ہے یا ہر وقت

سنبھالا رہتا ہے۔

کمل بابو کے ساتھ ڈیڈی کی گفتگو چلتی رہتی مجھے تو وہ کبھی ہم کلام ہوتے ہی نہ تھے۔ میں خود بھی ان سے کچھ نہ کہہ پاتی تھی اور نہ میرا منہ کادیری کے سامنے کھل پاتا تھا۔

کبھی کبھی میں خود کو ایک مجرم سمجھنے لگتی۔ سندری شرمیلی تھی۔ دراصل میرے دہلی پہنچنے کے بعد ڈیڈی کے گھر یہ شروع ہوئی تھی۔ دہلی میں آکر سندری سا اپنا رہن سہن قطعی تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے گھنے اور لمبے بال لڑکوں کے بالوں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔ کسی دن وہ ساڑی میں ہوتی تو کسی دن اسکرٹ میں اور کئی مرتبہ تو وہ اونچی اونچی پتلونیں پہن کر بھی ہمارے گھر آتی تھی ساس کی پتلون ٹخنوں سے اوپر ہوتی۔ پتلون کے ساتھ وہ چھوٹا سا بلاؤز پہنتی تھی اور لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹ اسے کارٹون بنا دیتے۔ سندری کی نگاہیں گدھ کی نگاہوں کی طرح اپنے شکار کی فوراً شناخت کر لیتی تھیں۔ جب تک میں لکھنؤ میں تھی سندری ایک مرتبہ بھی ڈیڈی سے ملاقات کرنے نہیں آئی تھی۔ اب جب وہ آنے لگی تھی تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ کمل بابو اس سے متعارف نہ ہوتے۔

سندری میرے ساتھ ہی ایم۔ اے میں پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں کا مضمون ایک ہی تھا۔ سندری کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی ادب لے لیکن یہ خیال آنے پر کہ انگریزی کے نوٹس کون لکھے گا۔ اس نے انگریزی لینے کا خیال تبدیل کر کے ہندی لے لی۔ کیونکہ میرے ہندی کے نوٹس اس کے بھی کام آجائیں گے، بیکار تکلیف کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ایک دن سندری نے مجھے ایک مجلس ادب میں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ادب سے سندری کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس نے ایم اے میں صرف پڑھنے کے لئے یہ مضمون منتخب کیا ہے۔

مجھے سندری کے ساتھ جانے میں کچھ پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن باہر کی زندگی دیکھنے کی بھی مجھے خواہش تھی ڈیڈی کبھی کمل بابو کے ساتھ کبھی اپنی ساس اور کبھی ان کی بھابی کے ساتھ باہر چلی جاتیں۔ میرے ساتھ تو کبھی کبھی سینما دیکھنے ہی جایا کرتی تھیں۔ سینما دیکھنے کی خواہش بھی ڈیڈی کو اس وقت ہوتی تھی جب ساس کی یاد انہیں بے چین کر دیتی۔ اس دن وہ اپنے دل کی تمام ممتا جیسے وہ کسی بھی طرح روک نہ پاتیں مجھ پر انڈیل دیتی تھیں۔ اور اس دن مجھے سینما دیکھنا پڑتا تھا۔

کمل کا پہلا سال گزر چکا تھا۔ میں ایم۔ اے۔ کے آخری سال میں پہنچ چکی تھی۔ سندری ایم۔ اے کے پچھلے سال میں پہنچ گئی تھی یہ بات اس کے لئے محض معمولی سی تھی۔ وہ ہمیشہ ڈیڈی میں الجھی رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جس کسی کی زندگی میں بے اتنی بہن بھی ہے ... میری الجھن تھی کہ میں گھوم پھر کر زندگی کو دیکھوں اور بچپن سے پلی ہوئی گھر کی بے زاری اور نفرت کی آگ میرے دل میں اس وقت بھی بھڑک رہی تھی جب سے میں دہلی آئی تھی ماں کے صرف دو خط ملے تھے۔ ماں ڈیڈی کو ہر ہفتہ فرمائشی خط لکھتی تھیں۔ اس میں میرے لئے صرف چند سطریں ہوتیں۔ گرمیوں کی تعطیلوں میں لکھنؤ جانے کی خواہش تھی۔ لیکن ماں اور پتاجی مسوری چلے گئے۔ اس لئے میں اور ڈیڈی بھی چلے گئے۔ کمل بابو بھی چند دنوں کے لئے وہاں آگئے تھے۔

مسوری میں ماں ہمارے ساتھ دو گھنٹے بیٹھ رہا تھا۔ لوگ سارے دن اس کے ساتھ کھیلتیں بات چیت کرتیں۔ ڈیڈی تو ہر وقت اسی میں مصروف رہتی تھیں۔ میں تو پھر بھی کبھی کبھی اپنی کتابوں میں الجھ جاتی تھی۔

کادیری ڈیڈی کو کمل بابو نے خاص طور ایک موٹر دے دی تھی۔ جس میں وہ گھومنے جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ آج جب سندری نے مجھے مجلس ادب میں چلنے کے لئے کہا تو میں نے اسے صلاح دی کہ ڈیڈی سے موٹر مانگ لی جائے۔ لیکن اسے میری تجویز پسند نہ آئی۔ شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے اس نے کہا کہ کیوں خواہ مخواہ مزا کرکرا کرتی ہو۔ ہم اکیلے ہی چلیں گے، واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔

سندری نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز سے کہے کہ میرے دل میں بھی ہلکی سی گدگدی جاگ اٹھی۔ میں نے سندری سے پوچھا کہ میں کس لباس میں چلوں؟ تو وہ مسکرا کر بولی۔۔۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ کچھ ایسا پہنو جو تمہیں دوسروں سے مختلف ظاہر کرے۔

میں نے سوچا ادیبوں کی مجلس ہی میں تو جانا ہے۔ وہاں تو کچھ بھی پہن کر جا سکتے ہیں۔ خیر۔ میں نے ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی اور اس سے میل کھاتا ہوا بلاؤز پہنا۔ بلاؤز ایک ہوشیار درزی کا سلا ہوا تھا۔ کانپ رہی ہوں اس خیال سے میں سمٹی جا رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی تبھی سندری

[illegible] سے ایک سگریٹ نکال کر وہ پینے لگی۔ اس سے پہلے میں نے سگریٹ پیتے ہوئے کسی کو دیکھا نہ تھا۔ میں بت کی طرح اسے [illegible] دیکھتی رہ گئی۔

اس نے کہا کیوں [illegible] تم پیو گی؟ سندری نے سگریٹ کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں سگریٹ پیوں؟

کیوں اس میں کیا حرج ہے؟ یہ کہتے ہوئے [illegible] دیدی میرے کمرے میں آ گئیں

میرا کمرہ مکان کی پہلی منزل پر برآمدے کے ایک گوشے میں تھا۔ دوسری جانب پھر کمرہ دیدی کا دیوان خانہ تھا جہاں آنے جانے والی عورتوں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ گو کہ دیدی کی ساس یہاں آنے پر اسی کمرے میں رہتی تھی برآمدے میں جو دروازہ کھلتا تھا وہ میں نے مقفل کر رکھا تھا۔ پھر بھی نہ معلوم دیدی کو کس طرح ہمارے جانے کی بات معلوم ہو گئی تھی۔

دیدی ہم دونوں سے بڑی تھیں۔ میں انھیں دیکھ کر گھبرا گئی کہ نہ جانے وہ کیا کہیں گی لیکن جب دیدی نے خود سندری سے سگریٹ مانگی تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ سندری کو قطعی تعجب نہ ہوا۔ اس نے مسکرا کر دیدی کو سگریٹ پیش کی اور ماچس جلا کر اسے سلگا بھی دیا۔

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دیدی نے دریافت کیا۔ کہاں جا رہی ہو تم؟

کلب اور میں۔ سندری نے مردوں کی طرح دھوئیں کے بادل اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

تم وہاں کیا کرو گی؟ حیرت سے پوچھا دیدی نے۔

دوستوں اور ہم جولیوں سے ملوں گی۔ سندری نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ حالانکہ وہاں کوئی خاص مزا تو آتا نہیں لیکن وہاں جانے سے شام اچھی کٹ جائے گی۔ مفت میں سگریٹ ملے گی۔ اور اگر موقع ملا تو کسی نہ کسی کے ساتھ سنیما بھی جا سکوں گی۔

یہ سب سن کر میں حیرت سے سندری کا منہ تکنے لگی۔ میں ڈر رہی تھی کہ اتنا سب کچھ سن کر دیدی مجھے ہرگز وہاں جانے کی اجازت نہ دیں گی۔ نہ جانے اس کمبخت کو کیا سوجھ رہی ہے؟ آخر انھیں یہ سب بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن دیدی سندری کی باتیں سن کر خاموشی اور اطمینان سے سگریٹ پیتی ہوئی برآمدے میں چلی گئیں۔

دیدی کے جانے کے بعد سندری نے سوال کیا۔ سلی!

تمھاری بہن کے بچہ ہونے والا ہے؟

نہیں تو۔

تم بے وقوف ہو۔ تمھیں کچھ نہیں معلوم۔ دیکھ لینا میرا اندازہ درست نکلے گا۔

تمھیں ان سب باتوں کا علم کس طرح ہو جاتا ہے سندری؟

کیوں میرے آنکھیں نہیں ہیں؟

ہیں تو اور خوبصورت بھی۔

ہاں ماں کچھ آدمی بھی یہی کہتے ہیں۔ اور میں ان کے ان لفظوں کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہوں۔ تمھاری آنکھیں بھی تو حسین ہیں۔ لیکن تم نے ان سے کبھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔۔۔ بزدل کہیں کی۔

سندری کے لفظوں نے میرے دل میں نفرت بھر دی۔ میں اپنی تنہائی سے عاجز آ چکی تھی۔ اور پریشان تھی۔ میرا دل گھر کی چہار دیواری اور خاص طور پر دیدی کی ساس سے قطعی دب چکا تھا۔۔۔ وہی پرانی باتیں۔۔۔ بہو، تیرے سسر نے اتنا کمایا تھا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں روپیوں کو گننے کے بجائے تول کر رکھ دیتی تھی۔ لیکن میں تمام رقم ساڑیوں اور سینڈلوں پر ہی صرف نہ کرتی تھی ان کا سونا خرید لیتی تھی، اور یہ سونا ہی بعد میں میرے کام آیا۔

ہر مرتبہ ان لفظوں کو سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔

کبھی وہ دیدی سے ملنے آتیں، ان کے ہاتھوں میں سونے کی نئی چوڑیاں جھولتی ہوتیں، نئے ڈیزائن کے کپڑے جھلملاتے ہوتے۔ ساس عمر میں بھی وہ یہ سب پہننے سے باز نہ آتی تھیں۔ ماں کو گود نہ جانے کے وہ سخت خلاف اور خفا تھیں۔۔۔ پیار ہی لڑکا گود لے لیں، ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ ہوا کہ میری بچی کا کیا حال ہو گا۔ ساس کی گود سونی کر دی۔ وہ ماں کے بارے میں اکثر کہا کرتیں۔۔۔

دیدی کی بے رخی سے بھی میں کچھ اٹھی تھی۔ آخر یہ بے رخی کیوں؟ اسی لیے کہ میں ان کے گھر میں رہتی ہوں۔ بچپن سے اس دن تک کا ان کا سلوک مجھے یاد ہو آیا۔ دیدی کے خلاف ایک بغاوت کے جذبے سے میرا دل بھر آیا۔

کپڑے بدل کر میں نے آئینہ دیکھا۔ رنگ سانولا تھا۔۔۔ لیکن

چہرے پر ایک چمک اور کشش پیدا ہو گئی تھی۔ لکھنؤ کے مقابلہ میں دہلی کی میری زندگی پرسکون اور پرمسرت تھی۔

سندری کے ساتھ جب میں ادبی بیٹھک میں حصہ لینے ٹوٹی کورٹ پہنچی تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ کالج کی ڈیبیٹنگ کلب کی میں سیکریٹری رہ چکی تھی۔ کئی مرتبہ پانچ پانچ سو آدمیوں کے بیچ تقریر کر چکی تھی۔ وہاں کے حاضرین میری تعلیم اور ذہانت کا امتحان لیتے تھے۔ وہاں میرے رنگ روپ اور میرے لباس میں دلچسپی ظاہر نہ کی جاتی تھی۔ یہاں کی بابت میں سندری سے بہت کچھ سن چکی تھی۔

ٹوٹی کورٹ "سرکاری اعلیٰ افسروں اور بہت کچھ سفارشیوں کے رہنے کا ایک بورڈنگ ہاؤس جیسا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں سندری مجھے لے گئی۔ برآمدے سے ہی بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ زوردار بحث چل رہی تھی مجھے اطمینان ہوا چلو اچھا ہے لوگوں کو مجھ میں دلچسپی ظاہر کرنے کا وقت تو نہ ملے گا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی کمرے میں تیزی سے چلتی ہوئی بحث جہاں تھی وہیں رک گئی۔ ایک بارگی دل تیزی سے دھڑکا۔ پھر بھی میں نے ہمت سے کام لیا۔ سندری کے تعارف کرانے پر میں نے ہاتھ جوڑ کر سب کو نمستے کی۔ میں ہاتھ جوڑتی لیکن وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہاتھ ملانے کے لئے۔ مجبوراً مجھے بھی ہاتھ ملانا پڑا۔

ایک کونے میں ایک شخص کھادی کا کرتا اور پاجامہ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ دوسروں سے علاحدہ بیٹھا آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا۔ صرف اس نے ہاتھ نہیں ملایا جیوں ہی میں نے ہاتھ جوڑے اس نے بھی جواب میں نمستے کی۔

یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لڑکوں نے کھادی کی قمیص اور رنگ دار ڈھیلے ڈھالے پتلون پہن رکھی تھیں۔ ان کا برتاؤ، طور طریقہ، انداز گفتگو سب کچھ ماڈرن تھا۔ سب نے مسکرا کر اور پرخلوص جملوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ اس سے مجھے ہمت ملی کہ کسی نے میرا مذاق نہیں اڑایا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہائے رام! اس قدر کالی، اس کی شادی کس طرح ہوگی؟ لیکن ادیبوں کے اس اجلاس کا کیا تھا؟ چند اشخاص جام شراب لئے بیٹھے تھے۔ ایک دو لڑکیاں بھی شراب پی رہی تھیں۔ اور کچھ کافی پی رہی تھیں۔ ہر شخص کا حلیہ قابل دید تھا۔ کسی کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ تو کسی کی مونچھیں بے ترتیب تھیں۔

بال تو تقریباً سبھی کے بکھرے ہوئے تھے۔ کئی آدمیوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے کالے یا براؤن رنگ کے چمڑے کے بیگ تھے۔ جو کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے۔ شاید یہ لوگ یہ بیگ اس لئے لئے رہتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھ لیں کہ وہ کتنا کام کرتے ہیں۔ کتنا پڑھتے لکھتے ہیں۔

پندرہ سولہ سال سے لیکر چالیس سال تک کی عورتیں موجود تھیں۔ تقریباً سبھی اپنے کانوں میں نقلی سونے کی بالیاں پہنے تھیں۔ ان کی ساڑیاں پرانی ہو چکی تھیں۔ ان کے پیروں کی چپلیں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کسی کے بال بے تحاشہ کندھے پر جھول رہے تھے۔ تو کسی کے اتنے چھوٹے تھے کہ یہ شناخت کرنا مشکل تھا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بدسلیقہ لباس اور بے ترتیب بال رکھنا یہ سب جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ چند لڑکیاں لڑکوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی سگار پی رہی تھی۔ سگریٹ پیتے ہوئے تو میں بہت سی لڑکیوں کو دیکھ چکی تھی۔ لیکن سگار پیتے ہوئے آج پہلی مرتبہ ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکی دبلی پتلی اور مریل سی نظر آ رہی تھی۔ سندری نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ایک نوجوان کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ نہایت گندی ہنسی ہنس کر سستی پینٹ سے رنگے ہونٹوں کو ذرا سا خم دے کر اس نے گہرے لال رنگ سے رنگے لمبے لمبے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سندری کے منہ کے قریب منہ لاکر اس نے آہستہ سے کہا۔ "سندری! یہ نئی رنگ روٹ کہاں سے پکڑ لائی ہو؟"

سندری نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔

"ان کی تعریف تو سن لیجئے۔ اسطرح زور، زور سے بولنا بدتہذیبی ہے"

سندری کا اتنا کہنا تھا کہ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

"یہ سانولی ہیں۔ انٹیلیکچوئل ہیں، لکھنے کی شوقین ہیں۔ کمل بابو کی سالی ہیں؟"

"کون؟ وہ رئیس کمل؟" ایک لڑکا بولا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے کئی دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگا تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹ کر گر چکی تھی۔

"جی ہاں" سندری نے جواب دیا

وہ لڑکی جس سے میرا تعارف سندری نے کرایا تھا آگے بڑھ کر بولی۔ "سانولی! تم پریمانیو فیشن کارنر میں ڈیزائنر کا کام کرتی ہو نا؟"

پریما کی انگلیاں نکوٹین سے زرد پڑی ہوئی تھیں۔ سب جانتا تھا

کی ابھری ہوئی نسیں صاف چمک رہی تھیں۔ ناخون اسقدر بڑھے ہوئے تھے کہ ڈر لگا کہ کہیں میرے ہاتھ میں چبھ نہ جائیں۔ اور وہی ہوا۔ اپنے ہاتھ اس نے میرے ہاتھ سے ملایا کہ میری ہتھیلی میں اس کے ناخون چبھ گئے اور شاید اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔

سندری نے میرے تعارف میں کمل بابو کا نام کچھ اس انداز سے شامل کیا کہ بہت سے لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

پریا نے آہستہ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا "کیا پیو گی؟"

میرے بجائے سندری نے جواب دیا "کافی"۔

"اوہ! امیر آدمی کافی پیتے ہیں کہیں؟" پریا نے چوٹ کی

"نہیں یہ ذرا پرانے خیالات کی ہیں۔ پھر پہلی ہی مرتبہ باہر آئی ہیں۔ اسے تو آج کافی ہی دو"۔

وہ لڑکی میرے لئے کافی لے آئی۔ اس کے چہرے سے کچھ ایسے جذبات نمایاں ہو رہے تھے گویا میں قطعی انجان اور پچھڑی ہوئی ہوں۔ کافی دیتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی —— تمہارے جی جا جی بڑے دل والے ہیں۔ میں بھی چھ مہینے ان کے ساتھ رہ چکی ہوں۔ انہوں نے مجھے ریس ہوٹل میں رکھا تھا۔ چھ مہینے چٹکیوں میں ختم ہو گئے۔ آج کل میں ایک مسعود کے ساتھ ہوں۔ وہ موا میری آمدنی پر بھی ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔"

کمل بابو اس پریا کے ساتھ ہوٹل میں رہتے تھے؟ چھی! چھی!! یہ لڑکی تو نہایت ذلیل نظر آتی ہے۔ میرا جسم ضرور سیاہ ہے۔ لیکن میں اسقدر گئی گذری تو نہیں ہوں۔ بھگوان جانے وہ اس کے ساتھ کس طرح رہے ہوں گے؟

پریا اپنی کرسی کو اور بھی قریب کھسکاتے ہوئے بولی —— جانتی ہو رانی آج کل کمل بابو سندری کے ساتھ رہتے ہیں۔

گویا میں آسمان سے زمین پر آگری۔ وہ بغیر میری طرف دیکھے سگار کے دھوئیں کے مرغولے بناتی ہوئی —— اور آہستہ سے ہنستے ہوئے بولی —— لیکن وہ سندری کو ریس ہوٹل میں نہیں رکھتے —— بلکہ ہی وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے"۔

میں نے کسی طرح ہمت کر کے پوچھا "کہاں رہتی ہے یہ"

"یہ تین اور لڑکیوں کے ساتھ رہتی ہے انہوں نے کناٹ پلیس کے قریب ہی ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ کمل بابو اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ اس کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ہے"۔

"سندری کی بہن تو یہیں رہتی ہے نہ؟"

"ہاں لیکن اس نے دو سال ہوئے بہن کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا ہے۔ اور پھر بہن کا کام تو اسے دہلی میں لانا تھا۔ اب اسے آئے ہوئے چار سال سے زیادہ ہو گئے لیکن ابھی تک یہ اپنا سلسلہ تلاش نہیں کر سکی۔ یہ اس کی اپنی کمزوری ہے، بہن کی نہیں"۔

"سلسلہ" اور "کمزوری" کے لفظوں نے میرے دل پر ایک عجیب و غریب اثر ڈالا —— مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے منہ کا ذائقہ کافی سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا ہے —— میرے دماغ میں سب سے پہلا سوال اٹھا کہ کیا دیدی کو اس واقعے کا علم ہے؟ کیا انھیں معلوم ہے کہ اسکے شوہر کسی نہ کسی لڑکی کو ضرور رکھتے ہیں؟ کیا یہاں یہی فیشن ہے کہ امیر آدمی اپنی بیوی کے علاوہ ایک نہ ایک دوسری لڑکی کو بھی رکھیں کیا یہ سب کرنا تہذیب میں شامل ہے؟ میرے ذہن میں ایک بارگی کئی ایک سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ——

پریا کا سلسلہ گفتگو ابھی اور جاری رہتا کہ ڈاکٹر اندر دھنش آ گئے۔ سب کے سب مرد اور عورتیں ان کی پیشوائی میں کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر اندر دھنش یہی قریب پینتالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کے ہونگے۔ وہ بھی کھادی کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھے سنہری فریم کا موٹے شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا —— بال کھچڑی ہو گئے تھے —— ان کے ہونٹوں پر ایک پُرمعنی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جو ان کی شرافت میں شک پیدا ہونے کی گنجائش نہ ہونے دیتی تھی —— بلکہ دیکھنے والے کے اس خیال کو اور بھی مضبوط بنا دیتی تھی۔ پریا نے میرا تعارف ان سے کرایا —— اور گویا میرے قریب بیٹھنا ان کا مکمل حق ہو وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ بات چیت کرنے لگے —— میری تعلیم کی بابت دریافت کیا۔ مجھے کلام پڑھنے کے لئے اصرار کیا۔

دوران گفتگو انھوں نے کہا —— یہ ہندوستان ہے ورنہ مجھ جیسے ادیب اور مصنف کو کسی چیز کی کمی ہو سکتی تھی! میں نے چھ ناول لکھے۔ میرا سب سے پہلا ناول "کسوٹی" کئی ہزار کی تعداد میں بک چکا ہے "پریم کی پھلواری" کی تو امید ہے فلم بھی بن جائے"۔

میں نے ڈاکٹر اندر دھنش کی دو تین کتابیں پڑھی تھیں۔ مجھے ان کی ٹیکنک بے حد پسند تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نہایت مستقل مزاج

اور سنجیدہ مصنف ہونگے۔ وہ کھاوٹ اور بناوٹ کو ناپسند کرتے ہونگے۔ لیکن یہاں حالات ہی مختلف تھے۔ وہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ میرے یہ ظاہر کرنے پر کہ میں نے ان کی دو ایک کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ کچھ نا خوشی سے بولے "کل تم میرے گھر پر آؤ — میں تمہیں اپنی کتابوں کا مکمل مجموعہ دوں گا — پڑھ کر تم تنقید لکھو — تمہاری جیسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ادب کی دنیا میں آنا چاہئے۔ مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ تم کتنی اچھی ہو"

میں نے پیچھی نیچی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورتیں میری طرف معنی خیز نظروں سے تک رہے ہیں — اس روز بیٹھک کے بعد جب میں سندری کے ساتھ گھر واپس آئی تو راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ جب ڈاکٹر اندر دھنش کو ادب سے کوئی آمدنی نہیں ہوئی تو انھوں نے ہومیوپیتھی کی ڈگری لے لی۔ لیکن کبھی پریکٹس نہیں کی — اب ملک کی زبان ہندی ہونے سے وہ کافی مشہور ہو گئے ہیں — ان کی جو کتابیں ان کے گودام میں پڑی ہوئی تھیں، وہ آج اچھے اچھے گھروں کی الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں — سرکار کی طرف سے ان کو انعامات بھی مل چکے ہیں — سندری نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی انعامات دینے کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں ہوتے ہیں —

اسی بیٹھک میں ڈاکٹر اندر دھنش کے ذریعہ ایک ریزولیوشن رکھا گیا کہ مقامی ادیبوں کی طرف سے ایک ادبی رسالہ شائع کیا جائے جس کی ایڈیٹنگ ڈاکٹر اندر دھنش کریں اور ان کی امداد کے لئے دو تین نوجوان مقرر کئے جائیں۔ اس رسالے کے سرپرست کمل بابو ہونگے۔ مہمان سے روپیہ مانگنے کا کام میں اور سندری کریں گے۔

مجھے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ یہاں پر ہر شخص کمل بابو اور سندری کے باہمی تعلقات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر بھی کوئی انھیں نا جائز نہیں مانتا اور اس سلسلے میں انھوں نے اس طرح بات چیت کی گویا ان تعلقات کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو —

میرا یہ خیال کہ ادیبوں کی بیٹھک میں کچھ ادبی تذکرہ و تبصرہ ہوگا قطعی غلط نکلا — وہاں جو لوگ اکٹھے ہوئے تھے وہ ادب کے نام پر دوسرے لوگوں کو فریب دیکر روپیہ لوٹتے تھے — اور مل کر شراب پی جاتے تھے۔ جو عورتیں تھیں ان میں سے کچھ تو دوکانوں پر سیلس گرل کا کام کرتی تھیں اور دو ماسٹرنیاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک تھوڑی سی تک بندی کر لیتی تھی — سندری نے بتایا کہ اس لڑکی کے لئے ایک نیا شاعر لکھ دیتا ہے اور وہ اس لڑکی کے نام سے شائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لڑکی ہے —

ڈاکٹر اندر دھنش نے بھی کہا تھا کہ انھیں شاعروں سے سخت نفرت ہے۔ کیونکہ صرف ایک دو کو چھوڑ کر باقی ہوتے کچھ اور ہیں، خود کو کچھ اور ہی ظاہر کرتی ہیں اور خطرناک طریقے سے نازک مزاج ہوتی ہیں —

اس دن مجلس سے واپس آتے آتے نو بج چکے تھے — ممی اپنی ساس کے ساتھ سینما گئی ہوئی تھیں — اکیلے کمل بابو چپ چاپ کھا رہے تھے — مجھے اور سندری کو آتے دیکھ کر وہ ذرا حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے "آئیے، آپ لوگ بھی کھانا کھا لیجئے"

کمل بابو سے میں گزشتہ چھ سال سے واقف تھی — آج وہ مجھے پہلی مرتبہ اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دے رہے تھے — اور وہ بھی تنہائی میں نہیں سندری کی موجودگی میں — کچھ دیر پہلے ہی میں سندری اور ان کے متعلق سن کر آ رہی تھی میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھا لوں —

میں نے آہستہ سے سندری سے کہا — "تم کھانا کھا لو — مجھے بھوک نہیں ہے اور جی بھی نہیں چاہتا"

سندری کمل بابو کے پاس ہی اسی میز پر بیٹھ گئی — میں نے چھپ کر دیکھا چند لمحوں میں وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگے تھے۔ انھیں اس طرح بات چیت کرتے ہوئے دیکھ کر افسوس اور درد میری آنکھوں آنسو بن کر چھلک اٹھے۔

میں کافی دیر تک روتی رہی — دس بجے کے قریب جب ممی واپس آئیں تو سندری اور کمل بابو وہاں سے جا چکے تھے۔

میں اس رات ممی سے کچھ نہ کہہ سکی — کھانا بھی نہ کھا سکی — مجھے گویا کوئی کونے میں کھینچ کر جوانی میں لے آیا تھا۔ ممی نے کمل بابو کے متعلق کچھ بھی دریافت نہ کیا۔ صرف نوکر سے اتنا ہی پوچھا "صاحب نے کھانا کھا لیا؟"

ملازم کے ہاں کہنے پر وہ خود بھی کھانا کھانے بیٹھ گئیں۔ ملازم نے ممی سے کہا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ لیکن ممی نے نہ کھانے کی وجہ دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی — نہ انھیں یہ خیال ہوا کہ کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں۔ اس بے رخی نے میری دیوانگی میں اور بھی اضافہ کر دیا — میرے دل نے مجھے لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا — کب تک دوسروں کے سہارے پڑی رہو گی؟ اٹھو اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ!

وہ رات میری زندگی کی ایک اہم رات تھی — میں فیصلہ کرنے میں پوری

سر ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے شاوند کے سلوک سے خوش تھیں یا عادی ہو چکی تھیں اور شاوند سندری کے ساتھ نہ جانے کہاں قیام فرماتے۔ کبھی رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ کمل بابو اور سندری کا تعلق بی بی پر اتنا ظلم نہیں ہے جیسا اس پر سماں لپیٹا ہوا کہ نازک جذبات کے پھولوں میں تو تی رہی ہیں۔ وہ اس کے ستم کے نیچے وہ سسکیں بہاتی رہی ہیں۔۔۔ اس سے مجھے نفرت اور حقارت سے ملاقات رہی ہیں۔

بستر پر پڑے پڑے میرے دل و دماغ کی تاریکی گویا روشنی میں تبدیل ہو اٹھی۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

اور پہلے کر کے کہ صبح ہوتے ہی ماں کو ایک خط لکھ کر بتا دوں گی کہ ان کے عزیز ترین داماد کیا کیا گل کھلا رہے ہیں۔ میں سو گئی۔

غم کی تپش انسان کو کندن بنا دیتی ہے۔ ایسا عوام کا خیال ہے۔ ہو سکتا ہے صحیح ہو۔ لیکن کبھی کبھی یہ غلط بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ غم برداشت کرتے کرتے انسان زندگی سے مجبور ہو اٹھتا ہے۔ اس کی زندگی چڑچڑی بن جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی وہ نہایت گری گزری حرکات پر اتر آتا ہے۔ رنج و غم نہیں، خوشی انسان کو خوشحالی میں انسان اپنے دل سے دوسروں کے لئے دشمنی اور کدورت کے جذبات دھو ڈالتا ہے۔ کاویری دیدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں غمگین رہتی میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اکثر انھیں جھجک محسوس ہوتی۔ اپنے غم سے غم زدہ ہو کر انھوں نے سگریٹ پینی شروع کر دی تھیں۔ ابھی تک وہ اپنی ساس سے چوری چوری سگریٹ پیتی تھیں لیکن کمل بابو کو علم تھا۔ انھوں نے دیکھتے ہوئے بھی منع نہیں کیا۔ نہ انھوں نے یہ دریافت کیا کہ سگریٹ کیوں اور کیسے پینا شروع کیا؟ میں سمجھ گئی تھی کہ سندری نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوا اٹھتا کہ کیوں نہ دیدی پر ظاہر کر دوں کہ یہ گوری سی سندری دل کی بے حد کالی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے ارادہ کیا، لیکن نہ جانے کیوں ہر مرتبہ تہذیب نے میری زبان بند کر دی۔

کوشش کر کے بھی میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اپنی کتابوں کے بیچ وہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن ہزار چاہنے اور کوشش کرنے پر بھی میں تعلیم میں اپنی تمام طاقت صرف نہ کر پا رہی تھی۔ کچھ مصروفیت کے بہانے سندری کی آمد و رفت ہمارے گھر میں ہوتی تھی بلکہ وہ کبھی کمل بابو سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔

سندری اور میرے کہنے پر کمل بابو نے پانچ ہزار روپیہ ڈاکٹر وشش کو رسالہ نکالنے کے لئے دے دیئے تھے۔ میں خود تو کمل بابو سے صاف صاف کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ ہاں سندری کی کالا لیکر ہو، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اور وہ پیسے سندری نے ہی مانگے تھے۔ رسالے کا پہلا نمبر ابھی شائع نہیں ہوا تھا۔

جب کبھی سندری مجھ سے ملنے آتی ان ادیبوں کی سرگرمیاں اور نئی نئی خبریں بیان کرتی۔ اس کے بیانات ان میں میری دلچسپی بڑھا رہے تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کی باتیں آتی رہتی تھیں۔ میرا دل بھی تعلیم کو الوداع کہہ کر ادبی دنیا میں کود پڑنا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں جہاں سب کچھ عجیب و غریب ہے۔ اپنے گھر والوں کی طرف سے بھی میرا دل رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ پتا جی کے خطوط روز بروز مختصر ہوتے جا رہے تھے۔ اس ڈھلتی عمر میں انکے بیٹا پانے کی تمنا بر آئی تھی۔ اب انکے پاس اتنا وقت کہاں تھا وہ مجھے لمبے لمبے پیار بھرے خطوط لکھ پاتے۔ انھوں نے ایک خط میں بھی امتحان کے بعد لکھنؤ آنے کے لئے نہیں لکھا۔ ہمارا کنبہ صرف ہم دو بہنوں تک ہی محدود تھا۔ پھر بھی بیٹے کو پا کر ماں باپ کا رخ قطعی تبدیل ہو گیا تھا۔ گویا ایک کالی لڑکی کو گھر سے الوداع کہہ کر وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے تھے۔

کم از کم پتا جی سے مجھے ایسے سلوک کی امید نہ تھی۔ وہ بھی میرے لئے بالکل ماں جیسے بن گئے تھے۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ ساری دنیا میرے لئے غیر بن گئی ہے۔ جنھوں نے پیدا کیا جب وہی اپنے نہ رہے تو اور کون اپنا ہو سکے گا۔

شادی سے پیشتر دیدی کو ماں باپ کی تمام محبت ملی تھی۔ پانچ سال تک کمل بابو نے بھی دیدی کو نہایت محبت اور عزت کے ساتھ رکھا تھا۔ اب دوسرا۔ بچہ پیدا ہونے کا وقت دن بدن قریب آتا جا رہا تھا۔ کمل بابو سارا سارا دن اور ساری ساری رات گھر سے غیر حاضر رہتے تھے۔ اور جب واپس آتے تو بھی دیدی سے ان کا حال چال معلوم کرنے کی فرصت محسوس نہ کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں میں دیدی کے غم سے زیادہ اہمیت اپنے غم کو دیتی تھی۔ یہ کمزوری آج بھی مجھ میں اسی مقدار میں ہے جتنی پہلے تھی۔ میری کا بچپن کا برتاؤ آج بھی کھلتا ہے۔

ادیبوں کی اُس بیٹھک میں شامل ہونے کے بعد سے میں اپنی ذاتی شخصیت کو قطعی جداگانہ تصور کرنے لگی تھی — مجھے گھر میں وہ عزت نہیں مل پا رہی تھی جو کہ مجھے ملنی چاہئے تھی — اکثر ہر نوجوان لڑکی کی زندگی میں اس طرح کے لمحات آتے ہیں، جب وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی زندگی رائیگاں جا رہی ہے۔ اسے جس قدر عزت غیروں سے ملتی ہے اتنی اپنوں سے نہیں — میرے دل میں ابھی تک کوئی بات صاف ڈھکی تھی — آئندہ زندگی میں مجھے کیا کرنا ہے — میں ابھی تک طے نہ کر پائی تھی — انسانی منصوبہ تبدیل بھی ہوتے ہیں لیکن ہونا کچھ اور ہے — پہلے سے طے کر لینے سے بھی کیا ہوتا ہے؟ پتاجی جو اپنے سے قطعی غیر بن بیٹھے تھے — ڈیڈی کے خیالات خود اس قدر محدود رہتے کہ کچھ کہنا مناسب نظر نہ آتا تھا — تعلیم کسی طرح پوری کر کے لڑکھڑاتے ہوئے امتحان دیا۔ امتحان سے پیشتر میری دماغی پریشانیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ ساری رات آنکھوں میں گذر جاتی —

ڈیڈی کو دیکھنے ایک ڈاکٹرنی روز آتی تھی وہی میرا بھی جائزہ لیا کرتی۔ ڈاکٹرنی نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ مسوری چلے جائیں — وہاں مجھے پیدا ہوئیں بھی آسانی سے۔ دہلی میں گرمی بدن بڑھتی جا رہی تھی — سگریٹ پینے کی وجہ سے انھیں اور گرمی محسوس ہوتی تھی — ڈاکٹرنی کا کہنا تھا کہ میں بھی ڈیڈی کے ہمراہ مسوری چلی جاؤں تو میری دماغی اور جسمانی تھکان دور ہو جائیگی ڈیڈی کو ڈاکٹرنی کے اس مشورے سے اتفاق ہو گیا تھا — کمل بابو کی بے رخی سے وہ تنگ آ چکی تھیں۔ گو انھوں نے اس بے رخی کو ظاہرہ میں کبھی منظور نہ کیا تھا — مجھے سنانے کے لئے وہ نوکروں اور آیا سے بلند آواز میں کہا کرتیں — بے سنگھ تمہارے مالک کا کاروبار آجکل کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے ایک دو کان اور خرید لی ہے جس کی وجہ سے ان کی مصروفیت اور بھی بڑھ گئی ہے — بے سنگھ گھسو قدیمی نوکر تھا وہ کمل بابو کے رہنے سہنے سے بخوبی واقف تھا — ڈیڈی کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک پر معنی مسکراہٹ کھل جاتی — جس کے معنی صرف میں سمجھتی تھی — حالانکہ ڈیڈی کا خیال تھا کہ میں کمل بابو کے کارناموں سے قطعی ناواقف ہوں —

لیڈی ڈاکٹر کے مشورے کو عمل پہنچانے کیلئے ہم دونوں بہنوں کو آدھی رات تک جاگنا پڑا — کمل بابو تو خود ہی جلد از جلد دہلی سے دور کر دینا چاہتے تھے — لیکن کسی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے مجبور رہتے

لیڈی ڈاکٹر کی تجویز کی شکل میں کمل بابو کو منہ مانگی مراد مل گئی — انھوں نے ڈیڈی کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ مسوری میں رہنے کے لئے ایک بنگلہ کا بندوبست کر دیں گے — ان کی سامنے بھی یہی تھی کہ ہم دونوں بہنوں کو اپنی صحت کو بہ نظر رکھتے ہوئے جلد از جلد مسوری چلے جانا چاہئے — کمل بابو نے یہ دریافت کرنا ضروری نہ سمجھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی تجویز میں کہیں کوئی غلطی تو نہیں؟ ڈیڈی کے جسم میں خون کی تو کمی نہیں ہو گئی ہے؟

اگر دنیاوی آرام اور آسائشوں کا ذکر کروں تو وہ ڈیڈی ہی کے گھر بخوبی اور باآسانی مل رہے تھے — چونکہ بچپن کے گھر میں کبھی نصیب نہیں ہوئے تھے — پھر بھی میں اس فرق کو بھلا نہیں پاتی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میری وقعت ان نوکروں سے زیادہ نہ تھی جو گاہ بگاہ ڈیڈی کے گھر میں آتے اور مہینوں پڑے رہتے تھے ان کی خاطر بھی خوب اچھی طرح ہوتی — ملازم بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے — کمل بابو کے ایک دوست تھے کیپٹن دھیر بندر، وہ شاید کبھی کالج میں ہاکی ٹیم کے کیپٹن رہ چکے تھے — فوجی ملازمت تو انھوں نے ایک منٹ بھی نہ کی تھی — کالج کے وقت سے ہی انھیں کیپٹن کہہ کر پکارا جاتا تھا — دوسروں کی رقم پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی — کلکتہ سے دہلی آتے تو کمل بابو سے ہی سفر خرچ منگا لیتے تھے — ان کی صرف ایک ہی خوبی تھی — گھر کے مالک کو وہ ہمیشہ خوش رکھتے تھے — خوشامد کر کے، ہو کھیل کر، شطرنج کی بازی ہار کر، اڑتے پرندوں کا شکار کر کے یا گھر کے مالک کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزیں خریدنے میں امداد دے کر — کسی نہ کسی طرح وہ گھر کے مالک اور مالکن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے —

بدچلن اور بداخلاق انسانوں کا کوئی خاص درجہ نہیں ہوتا — وہ بھی شریف انسانوں کی طرح، فنکاروں کی طرح اپنی ذاتی خصوصیتوں کی بنیاد پر دنیا میں کھڑے ہونے کا دعوے کرتے ہیں —

دھیر بندر ڈیڈی کے گھر آ کر مہینوں رہتا — وہ کمل بابو کے ساتھ پڑھا کرتا تھا — ہاکی کی ٹیم میں بھی وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے اسی رشتہ کو لیکر اب بھی دہلی آ دھمکتا تھا — اور مہینوں رہتا — وہ بخوبی جانتا تھا کہ ڈیڈی کس بات سے خوش ہونگی — کمل بابو جب گھر پر نہ ہوتے تو وہ ڈیڈی کے حسن کی تعریفیں کیا کرتا — کمل بابو کے ساتھ طرح طرح کے سگریٹوں کی تعریف اور خوبیاں مزیدار الفاظ میں بیان کرتا — میں حیران تھی کہ اتنی بڑی عمر کا شخص اس طرح بہکی بہکی باتیں کس طرح کہہ جاتا ہے؟ اس وقت کمل بابو کی عمر قریب پچپن سال کی تھی — دھیر بندر کی عمر بھی اس سے کم نہ تھی — بہت ہی زیادہ شراب پینے، کبھی فاقہ کشی اور کبھی لذیذ کھانے نے اس کے جسم اور عمر کو بگاڑ ڈالا تھا — میں اکثر غور کیا کرتی کہ بغیر مقصد کی زندگی لیکر دھیر بندر کب تک اس طرح

گیا کہ کہا بہت ۔۔۔ اپنے کو تنہا کر یا حفاظت سے ڈبیا میں بند کرکے رکھو میرا وہ قلعہ سے مستقبل حسین ہوتے ہوئے بھی غیر عورتوں کے پیچھے دیوانہ وار گھومتے ہیں تم کیا بھی اپنے پاس رکھو ۔۔۔ جو تمہارے پیسے پر نہیں جیتے ۔ کیا وہ دنیا کا تندرستی سمجھتے ؟ ہم لوگ شاید تمہارا گھر خالی کر دیں گے "

میں چلتی کہا تو ہو کر اپنے کمرے میں لے گئی ۔ بہتا ہوا خون صاف کیا ، اس پہ بیس پٹی لگائی اور سامنے کمرے میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا ۔۔۔ وہ خاموش تھی ۔۔۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو رہی تھیں ۔۔۔

میں باہر کے کمرے میں بلند آوازیں اب شاید بجے جا رہی تھیں ۔۔۔ بہت سے لوگوں کی گرج دار آوازیں اور باتیں اچھی طرح مجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ جو کچھ بھی جتنا آواز میں کہہ رہی تھیں اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی ہوں ۔۔۔ مجھے دیری پر رعب دکھانے کی کوئی فرصت نہ تھی ۔ وہ خود ہی دیکھ رہی تھی کہ ان کا مکان چھوڑ دینے کے بعد مجھے کہیں جگہ ملتی ہے یا نہیں ۔۔۔ میں ماں کو بھی ایک خط لکھنا چاہتی تھی ، تاکہ وہ بھی اپنی چہیتی بیٹی کے کارنامے سے بخوبی واقف ہو جائیں ۔ اور اس لگاتار بارش میں میں "پالی ہٹ لاج" کی تلاش میں نکل پڑی ۔ اس دن سندری سے اس کا صحیح پتہ معلوم کرنا بھی میں بھول گئی تھی ۔۔۔

مرغ و غم میں انسان کی عقل بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے " وہ اتنے بڑے رئیس ہیں ان کے گھر میں ٹیلیفون کا ہونا لازمی اور ممکن ہے " مجھے اس وقت اس بات کا خیال بھی نہ آیا ۔۔۔ لگاتار بارش میں ہلکی سی برساتی اوڑھ کر میں نے دو تین میل کا سفر طے کرنا ۔ کافی پریشانی کے بعد ایک سکول سے پالی ہٹ لاج کا پتہ معلوم ہوا ۔۔۔ وہ ہمارے گھر سے صرف آدھ میل دور بھی نہ تھا ۔۔۔

سندری مجھے بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوئی ۔۔۔ پالی ہٹ لاج بہت بڑا بنگلہ نہ تھا ۔۔۔ یہی صرف چھ کمروں کی کاٹیج تھی ۔۔۔ جس کے ساتھ تین کمرے بھاڑے کے لئے شامل تھے جو بنگلے سے ہٹ کر بائیں طرف اور وٹ کے پیڑ کے ساتھ ملحقہ ہوئے تھے انہیں میں سے ایک کمرے میں سندری رہتی تھی ۔

سندری کو میں نے تمام واقعہ کہہ سنایا ۔ سندری نے کہا ۔۔۔ "کبھی کا یہ شور رشنا ہوتا آج نہیں تو چند دن بعد ضرور ہی ہوتا ۔ کیونکہ اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ کمل بابو تم سے دلچسپی لینے لگے ہیں ۔ چتنی کی بہن کو کوئی حق نہیں کہ وہ اسکی موجودگی میں یہ سب گل کھیلے ۔ تمہارے لئے اب وہ گھر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے ۔ اور پھر تم ایم ۔ اے ۔ تو ہو ہی جاؤ گی "

میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ میں کہاں جاؤں ؟ کیا کروں ؟ سندری نے کہا ۔۔۔ ایک ڈرامہ کرنا ہوگا ۔ میں کہوں گی کہ تم بغیر اطلاع دئے دلی سے چلی آئی ہو ۔۔۔ اسلئے تمہارے رہنے کا میں کوئی معقول انتظام نہیں کر سکی ۔۔۔ اب پردیس میں کہاں ٹھہراؤں ؟ اسلئے میں اپنے مکان مالک سے کہتی ہوں کہ وہ تمہارے یہاں رہنے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کریں ۔۔۔

سندری اپنے مالکان سے اجازت لینے گئی تو میں نے ان تمام دیوی ، دیوتاؤں کو دل ہی دل میں یاد کیا ، جن کے نام میں نے بچپن میں اپنے ماں باپ سے سنے تھے ۔ میں نے من ہی من میں ہر ایک دیوی دیوتا کو چڑھاوا چڑھانے کا ارادہ کر لیا ۔۔۔ اگر سندری کے پاس رہنے کو جگہ مل جائے تو میں دیکھوں گی کہ آگے چل کر کیا ہوتا ہے ۔ چاندنی کے لئے بھی میں نے سندری سے کہہ دیا تھا ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد سندری واپس آکر مجھے اپنے ہمراہ اپنے مالک مکان کے کمرے میں لے گئی ۔ اور میرا تعارف کرایا ۔۔۔ "یہ رانی ، میری سہیلی علم و ادب کی زندہ تصویر ہیں ۔۔۔ ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل ہے ۔ ہندی اور سنسکرت میں ایم ۔ اے ۔ کیا ہے ۔ ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ ۔ دہلی کے کمل بابو کرتی کی بہن ہیں ۔ انہیں معلوم تھا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہوں ۔ یہ بغیر اطلاع دئے چلی آئی ہیں ۔ ساتھ میں نوکرانی بھی ہے ۔ یوں تو یہ کسی بھی ہوٹل میں بڑے مزے سے ٹھہر سکتی ہیں ۔۔۔ لیکن میں نے اصرار کیا ہے کہ میرے پاس ہی رہیں ۔ یہ پرتی بالا کو ڈرامیٹک کلب میں بھی کام کر سکیں گی ۔ بڑے کام کی ہے ۔ صاف اور دلکش ہے اسلئے یہ شکنتلا کے رول کیلئے قطعی موزوں رہیں گی ۔ ان کے بال تو دیکھئے ، کس قدر خوبصورت اور لمبے ہیں ۔۔۔

اور میرا اُدھیلا سا جوڑا فوراً ہی سندری نے کھول دیا ۔ یہ نقلی نمائش مجھے بے حد عجیب معلوم ہو رہی تھی ۔ آخر یہ بھی کوئی بات ہے ؟ اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا ۔۔۔ "خاموش رہنا ، صرف ڈرامہ کر رہی ہوں "

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں باہر بارش میں بھیگتی رہوں ۔ مجھے سندری پر غصہ آ رہا تھا ۔۔۔

مکان مالک چالیس اور پچاس کے بیچ ہوں گے ۔ لیکن ان کی عمر کا صحیح اندازہ میں نہ کر سکی ۔۔۔ وہ کرسی پر بیٹھے سگار پی رہے تھے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اور بولے ۔۔۔ "ارے مس شرما یہ کیا کر رہی ہیں آپ ؟ مس رانی آپ کی سہیلی ہیں تو ہماری مہمان ہیں ۔۔۔ اپنے والد صاحب سے جا کر کہہ دیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ والا کمرہ مس رانی کے لئے خالی کروا دیں ، اور ان کی نوکرانی اپنی آیا کے کوارٹر میں رہیگی ،

میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا ۔ شری [illegible] نے کہا کہ وہ ادھر پر فون کرکے ہمارا سامان گھر منگا لیں گے ۔۔۔

سندری اسکا بھی خوب جانتی تھی ۔ فرمایا ۔۔ آپ تکلیف نہ کیجئے ۔ یہ شاید کوٹھی میں سامان رکھ کر آئی ہیں ۔۔ ابھی جا کے آئیں گی ۔۔ ورنہ ان کو نوکرانی نہ سمجھ پاتی کہ اسے کیا کرنا ہے ۔۔۔

ٹنڈن صاحب نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا ۔ شاید وہ میرا جائزہ لے رہے تھے ۔۔۔

× × ×

چاندی کو اور مجھے ٹنڈن صاحب کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ٹنڈن صاحب دلی چلے گئے ۔۔۔

میں جس دن چاندی کے ساتھ سامان لینے دیدی کے گھر گئی تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھی بڑبڑاتی رہیں ۔ ایک مرتبہ بھی مجھے ملنے کے لئے اپنے کمرے سے باہر نہ آئیں ۔ پورا سامان جب گاڑی میں رکھ دیا تو میں نے سوچا ایک دفعہ دیدی سے کہہ آؤں کہ ہم لوگ جا رہے ہیں ۔ گو چاندی مجھے روکتی ہی رہی ۔ لیکن پھر بھی میں دیدی کے کمرے میں چلی گئی ۔

"دیدی ہم لوگ جا رہے ہیں ۔۔۔"

لیکن بجائے کچھ کہنے کے وہ دیوار کی طرف دیکھتی رہیں ۔ شاید انہیں یہ ہرگز یقین نہ تھا کہ ہم کہیں جا بھی سکتے ہیں

بالسنٹ لاج میں مجھے سندری کے کمرے کی بغل والا کمرہ ملا ۔ کمرہ اچھا اور کھلا ہوا تھا ۔ چارپائی بچھی رہنے پر بھی دیوان بچھانے کی جگہ رہ جاتی تھی ۔۔ میں نے اپنے دو بکسوں کو ملا کر بیٹھنے کی جگہ بنالی ۔۔ ان لوگوں سے فرنیچر مانگنا تو برا معلوم دیتا تھا ۔

مالکن سے میرا تعارف کرایا گیا ۔ سلوچنا دیوی کی عمر تیس سال سے زیادہ ہی ہوگی ۔ وہ گورے رنگ اور چھوٹے قد کی خوبصورت ، دنیاداری میں ہوشیار خاتون تھیں ۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ شریمان کی طرح شریمتی جی کو جھوٹ بول کر اتنا سیدھا نہیں سمجھایا جا سکتا ۔ ان سے دو دن بات چیت کرنے کے بعد میں نے طے کر لیا کہ میں اپنا کھانا چاندی سے علاحدہ بنواؤں گی وہ گھر ہی کھا لے گی ۔ گو انہوں نے کھانے کی بابت مجھ سے کسی قسم کی بات چیت نہیں کی تھی ۔۔۔ اور کھانا کھانے کے وقت یا ناشتے کے وقت وہ مجھے بلا بھیجتی تھیں ۔ میں جب کھانے کی میز پر پہنچتی تو نہایت ۔۔۔ سے پیش آتیں ۔۔۔ حسب معمول مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رہتی ۔ لیکن اوپر والا ہونٹ کبھی کبھی اسی طرح دبا لیتی تھیں جس سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں کوئی گرہ دبے ہیں ۔۔ میری ہرگز خواہش نہ تھی کہ میں ان کی تکلیفوں میں اور بھی اضافہ کروں سندری ان کے بچوں کو پڑھاتی تھی ۔ ان کی ملازم تھی ۔۔ اسے کھانا دینا مناسب اور لازم تھا ۔ لیکن مجھے دینا قطعی ضروری نہ تھا ۔ تین چار دن میں ہی

جا چکے گھر کا حال مالی حالت اتنی بہتر نہیں ہے جتنی یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں ۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سندری کو ان کے گھر میں کسی طرح کام مل گیا ورنہ ان لوگوں کی حیثیت گورنیس رکھنے کے قابل نہ تھی ۔ اپنی پرانی شان و شوکت پر جو کہ قلعی کھنڈر بن چکی تھی اب وہ نئے محل تعمیر کئے جا رہے تھے جنہیں کھڑا کرنا ان کی طاقت اور ہمت سے باہر تھا ۔

اصل تو مسوری میں دودھ اچھا ملتا ہی نہیں ہے اور ٹنڈن صاحب کے گھر جو دودھ آتا اس میں اور بھی پانی ملا دیا جاتا ۔ گھر میں مالکن سلوچنا دیوی کی پرانی ساڑیوں پر نئے رنگ کرائے گئے تھے ۔۔ ان کے زیورات کی حالت بھی بہتر نہ تھی ۔ کسی زیور میں نگ نہ تھے اور کوئی سنہرا گھسا ہوا تھا کہ دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے وہ دس سال سے استعمال کر رہی ہیں ۔۔۔

دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے نوکروں کو بھرپیٹ کھانا بھی نہیں ملتا ۔۔ یہ سب چاندی نے مجھے بتایا ۔ چاندی نے یہ بھی بتایا کہ ملازموں کو جو چائے دی جاتی ہے اس میں دودھ نام کے لئے بھی نہیں ہوتا ہے ۔ سلوچنا دیوی کے چار بچے تھے ۔ جن میں بڑا لڑکا اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا ۔ جو کبھی گاہ بگاہ گھر آتا تھا ۔ چھوٹی تینوں ہی لڑکیاں تھیں جن کے لئے سندری کو رکھا گیا تھا ۔۔۔

سلوچنا دیوی میرے آنے کے پہلے دن سے ہی مجھے بڑی شکوک نگاہوں سے دیکھتی تھیں ۔ ان کے لئے میں انہیں قصوروار نہیں سمجھتی ۔ آخر وہ بیچاری کہاں سے لا لا کر روپیہ خرچ کریں ۔۔ گھر میں کمانے والے صرف ان کے پتی تھے ۔۔۔ مجھلا دیور وکالت پاس کر کے ڈرامہ کے پیچھے دیوانہ تھا ۔ میں نے سنا تھا کہ وہ دلی میں ایک ڈرامے کا ڈائرکشن کرا یا تھا ۔ جسے عوام نے پسند بھی کیا تھا ۔ اس کے ٹکٹ خوب فروخت ہوئے تھے ۔ جو روپیہ ملا اس سے وہ اور اس کے ساتھی ایک ہفتہ بمبئی کی سیر کر آئے تھے ۔ فلموں میں کیا کچھ ہوتا ہے یہی دیکھنے کیلئے ۔۔ اب وہ ان گرمیوں میں کالیداس کا امیر ڈرامہ شکنتلا پیش کرنا چاہتا تھا جس میں شکنتلا کے کردار کیلئے مجھے ٹیسٹ دینا تھا ۔۔

گھر میں دو نندیں بھی تھیں ۔ ایک تو سلوچنا دیوی کی ٹکر کی ہوگی ۔ اس نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنا مناسب نہیں سمجھا تھا ۔ ابھی تک اسکی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسکے لائق کوئی دولہا مل ہی نہیں سکتا تھا ۔ سارے دن وہ اپنے باپ کی دولت کی تعریف کرتی رہتی اور سلوچنا دیوی کے ہر کام میں خامیاں تلاش کرتی رہتی ۔۔

سلوچنا دیوی ہر وقت اسطرح بنی ہوئی رہتی گویا ابھی کسی اشنان کے لئے تیار ہو کر آئی ہو۔ تین چار دن رہنے کے بعد مجھے اس بات کا بھی پتہ چل گیا سلوچنا دیوی کو اپنی نند کے استعمال شدہ کپڑے بھی پہننے پڑتے ہیں سنترا کی چھوٹی بہن 'بیس بائیس سال کی مینا' اسی نام سے اسے پکارا جاتا تھا۔ سکول میں اس نے کبھی تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کوئی امتحان ہی پاس کیا تھا۔ لیکن ہندی، انگریزی اور فرنچ کا کام چلا لیتی تھی۔ مینا کا اصل نام کیا تھا یہ آج تک نہیں جان سکی۔

یہ سگریٹ پیتی، گھڑسواری کرتی۔ بھائی کی بچیوں کے بال کھینچتی اور انکے ساتھ کھیل کر ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھی ـــ نہ تو اسے کوئی گھر والا ہی ایسا کرنے سے روکتا تھا اور نہ وہ خود ہی خیال کرتی تھی کہ ایسا کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ شاید اسی لئے کہ بڑی بہن کی ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی۔

گھر کے مالک یعنی سلوچنا دیوی کے پتی اپنی چھٹیاں ختم کر کے دلی واپس چلے گئے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی انکی آواز کم ہی سنائی دیتی تھی۔ کسی کو برا بھلا وہ کہتے بھی نہیں سکتے پھر بھی سارے گھر پر ایک خوف طاری رہتا اور سبھی انکی عزت کرتے تھے۔

سنترا بھی بڑے بھائی سے ڈرتی تھی جس وقت وہ گھر میں رہتے انکی زبان خاموش رہتی تھی۔ بھابھی کو ڈانٹنا اور پتا کی امیری کے گیت گانا کم ہو جاتا ـــ سلوچنا دیوی سنترا سے ایک بات میں بڑھی رہتی تھیں کہ وہ اتنی تعلیم یافتہ نہیں تھیں جتنی سنترا تھی۔ گھر کی عورتوں میں سے سنترا کے علاوہ کسی نے بھی سکول کی شکل نہ دیکھی تھی۔ ملازمین جب سلوچنا دیوی سے پوچھتے کہ کھانے کے لئے کیا بنایا جائے؟ تو وہ یہی کہہ دیتیں کہ سنترا سے ہی پوچھ لیا جائے۔ سنترا جب میٹرک میں پڑھتی تھی جب بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ اس واقعے کو پندرہ سال گزر چکے تھے۔ پھر بھی سنترا کو سلوچنا دیوی اچھی طرح جان نہیں پائی تھیں۔ کیونکہ نند نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ بھابھی کے ہر کام میں 'نکتہ' اٹھاتے ہوئے کھانے کی چیزوں میں ضرور ہی خامیاں نکالیگی۔ بھابھی اگر بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو کیا؟ انہیں اتنی آزادی دی جائے کہ وہ اپنی نند کی رائے اور اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے کچھ کر لیں؟ سنترا کی ماں اگر زندہ ہوتیں تو شاید ان کی حکومت بھی اسقدر سخت نہ ہوتی۔ سنترا کا کہنا تھا کہ بڑے گھر کی بیٹی کو حکومت کرنے کا طریقہ جاننا نہایت ضروری ہے۔ پھر سسرال میں نہیں تو کم از کم پتا کے گھر میں تو عورت کی حکومت ہونی لازمی ہے ـــ

گھر کے مالک دہلی چلے گئے تو میں نے سوچا کہ اب کمل بابو کو خط لکھنا چاہئے ہو سکتا ہے کہ وہ [illegible]۔ تو ایسی صورت میں میری حالت کیا ہوگی؟ مجھے کم از کم اپنی صفائی تو دے دینی چاہئے ـــ

محض اسی خیال سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ میں ان کمل بابو کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی جو مجھ سے سخت نفرت کرتے تھے میرے جسم سے نفرت کرتے تھے، جنھیں میرے رنگ سے نفرت تھی ـــ جنھیں میرے ساتھ بات کرنا بھی ناگوار تھا۔ انہیں کمل بابو کو میں خط لکھنے بیٹھی۔ ان کے خط کا جواب تو دینا ضروری تھا۔ ان کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا

میں نے بہت کر کے خط لکھنے کی کوشش کی تو سندری تینوں بچیوں کو میرے پاس چھوڑ گئی۔ وہ کہیں گھومنے جانا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھومنا کسی اور کے ساتھ نہیں صرف ہیرالال بابو کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

اس وقت بھی میں خط نہ لکھ سکی۔ بچیوں کے ساتھ کھیلنا پڑا، پھر انہیں ناشتہ کرا کر بنگلے میں ادھر اُدھر گھمانے لے گئی۔ کئی بار خیال آیا کہ آخر انھیں خط کس القاب کیساتھ شروع کیا جائے؟ جی جاجی کے نام سے تو میں نے انھیں کبھی پکارا ہی نہیں "اور پکارنے کا موقعہ بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ اب اس نام سے پکارنا تو مشکل ہوگا۔ مجھے مسہری میں بیٹھے بیٹھے ہی اس بات پر شرم محسوس ہو رہی تھی ـــ

رات کو لکھنے بیٹھی تو بنگلے کے اندر سے سلوچنا دیوی کا پیغام آگیا کہ میں بچیوں کو کہانی سنا دوں۔ بچیاں مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سندری شاید انکو ادھر اُدھر کی باتیں کر کے ہی بہلا دیتی تھی ـــ خاص دلچسپی سے بچیوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ میری معمولی دلچسپی اور توجہ سے وہ کافی متاثر ہو چکی تھیں اور بار بار مجھے یاد کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کو دیکھتے ہی مجھے منا کی یاد آجاتی۔ وہ بھی دو سال کا ہو چکا تھا۔ وہ بھی اسی طرح تتلا تتلا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوگا جو ماں کے کانوں میں امرت برساتی ہوں گی ـــ

کھانا کھانے کے بعد جیسے ہی میں نے خط لکھنے کا ارادہ کیا کہ سلوچنا دیوی میرے پاس آ بیٹھیں۔ ان کے پتی کو دلی گئے ہوئے ابھی صرف دو ہی دن گزرے تھے شاید وہ تنہائی سے تنگ آ کر میرے پاس چلی آئی تھیں۔ وہ غم زدہ ہیں یہ تو میں اس گھر میں آتے ہی جان گئی تھی۔ اپنی زبان سے تو کبھی انھوں نے کچھ بھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن غم کے مارے لوگوں کی ایک اپنی خاص اور خاموش زبان ہوتی ہے۔ خاموش رہتے ہوئے بھی ایک کو دوسرے کے رنج و غم اور درد کا

اس ہو جاتا ہے۔ سلوچنا دیوی کے آتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ کسی خاص مطلب سے آئی ہیں۔

ماں جی! تم اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہو، پھر بھی تم نے میری بیٹی کو جس قدر محبت دی ہے، میں تو اسے دیکھ کر حیران ہو گئی ہوں" انھوں نے کہا۔

لیکن یکایک کسی خاموش رنج و غم سے ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے دل پر غم کا بہت بڑا بوجھ ہے، جسے ہٹانے میں ممکن ہے میری مدد سے کچھ ہو سکے۔ اور اس سے بہتر بات بھی میں اس وقت کیا کر سکتی تھی۔ مجھ ان کے پتی نے پناہ دی تھی۔ اپنی سگی بہن نے زبردست بارش میں گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ نہ جانے اسے دولت کا اتنا نشہ کیوں تھا، شاید ان سبھی لوگوں کو ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دولت کو دیکھا ہو۔

سلوچنا دیوی کافی رات گئے تک مجھ سے بات چیت کرتی رہیں۔ جب وہ اٹھ کر گئیں تو رات کے دو بج چکے تھے۔ سندری ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا سلوچنا دیوی اپنی نندوں سے بہت دکھی تھیں۔ سندا کی حکومت بہت سخت تھی۔ انکی ساس کا انتقال ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ انکی زندگی میں بھی سندا کی ہی حکمرانی تھی۔ سلوچنا دیوی کو شادی کے دو سال بعد ہی بچے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ انکی پرورش میں مصروف ہو گئی تھیں۔

گھر میں جیسا بھی سلوک انکے ساتھ ہو گیا وہ چپ چاپ برداشت کرتی گئیں اگر تب بھی اپنے پتی یا گھر میں کسی دوسرے سے انھوں نے ان زیادتیوں کا ذکر تک نہ کیا۔ گھر کے مالک کے خیال میں انکی بہن دیوی کا اوتار تھی۔ اس میں کوئی دوسری ہونا مشکل تھی۔ سلوچنا دیوی اپنے بچوں کو ساتھ لیکر اپنے میکے چلی جاتیں لیکن ادھر ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے وہ اب میکے نہ جا پاتی تھیں۔ بھابھیوں کے سر پر جا کر وہ مہینوں کس طرح پڑی رہ سکتی تھیں۔ سنندا کا ہاتھ اپنے اوپر خرچ کرنے میں بہت کھلا ہوا تھا۔ اور پیاں بابو کو بھی دونوں ہاتھوں روپے دیتی رہتی تھی۔

یہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی۔ لازم تھا کہ اس کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے۔ سلوچنا دیوی اگر کبھی بھول کر بھی یہ مشورہ دیتیں کہ سنندا ذرا کم خرچ کیا کرے تو وہ ناراض ہو کر کہہ دیتی "بھابھی اتم جو کبھی اپنے گھر دیکھ کر آئی ہو۔ وہ یہاں پر بھی کرنا چاہتی ہو؟ یہ تو ہمارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ پھر کب خرچ کرینگے؟"

سلوچنا دیوی نے تمام بندشیں خود پر ہی لگا رکھی تھیں۔ وہ اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیتیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا کوئی خضول خرچ نہ کرتیں۔

یوں تو سلوچنا دیوی کو زندگی میں کوئی بھی کمی نہ تھی۔ نہایت شریف اور ترقی پسند تھے۔ لیکن انھیں یہ ترقی پسند نہ بھی تھی جبکہ انھیں افسوس رہتا تھا۔ سنندا نے اپنی بھابھی کو اپنے گھریلو ماحول میں ڈھالنے کی از حد کوشش کی تھی جس میں اسے کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن موجودہ سوسائٹی کا پڑھا ہوا رنگ ویسا ہی تھا جس طرح چاندی کے زیورات پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے اور چند مہینے کے استعمال کے بعد چاندی پھر اپنی اصلی شکل میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان کے ہر کام سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ سب بناوٹ ہے۔ اور اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ وہ سگریٹ بھی پکڑتیں تو اس کے ہاتھ اسطرح معلوم ہوتے جس طرح سندری اور یہ سکے۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر مسکان بنائے رکھنے کی جو کوشش کرتی رہتیں اسکا بھی کھوکھلا پن دوسرے شخص پر ظاہر ہو جاتا۔ کیونکہ اس مسکراہٹ میں بناوٹ بہت زیادہ ہوتی۔ میں سوچنے لگی کہ کیا امیر گھرانوں کا یہی حال ہے۔ ہمارے والدین معمولی حیثیت کے ہیں لیکن خوشحال ہیں انھیں اس دکھاوے کی کوئی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اور اسی لئے وہ دوسروں کی بہ نسبت خوش ہیں۔ میرے خیال میں تو انسان کا اوچھا سکون یہ موجودہ ترقی پسندی لے جاتی ہے۔ دیکھا دیکھی اپنی حیثیت کے گھرانوں میں اپنی عزت اور اپنا مقام بنائے رکھنے کیلئے انھیں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سنندا کے گھرانے جیسی حالت اور بھی دوسرے گھرانوں کی ہوگی جہاں فرد رقوں کے بڑھنے کی گنجائش تو کافی ہوتی ہے لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بڑھتا گھر کا کوئی بھی شخص آمدنی بڑھانے میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ سبھی اپنے شوق پورے کرنا چاہتے ہیں اور جب کا شوق پورا نہیں ہوتا وہی گھر والوں کو بھلا برا کہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور دھتکار دیتا ہے۔

بیسویں صدی سائنس کی صدی ہے انسان کے عیش و آرام کیلئے سائنس نے سب کچھ سہولتیں دے رکھی ہیں لیکن انسان نے اپنی ضروریات میں اس قدر اضافہ خود ہی کیا ہے کہ اس میں سائنس کا کوئی ہاتھ ہے یہی سمجھ نہیں پاتی۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی لیکن کسی بھی طرح سائنس کو قصور وار ثابت نہ کر سکی۔ ہم لوگوں نے غیر ملکی تہذیب کو تو اپنا لیا لیکن اس تہذیب سے وابستہ باریکیوں کو اور دور اندیشیوں کو ہم نہیں اپنا سکے۔

سنندا ساڑیاں خوب خریدتی تھیں۔ خواہ وہ انھیں پہن سکتی خواہ نہیں لیکن وہ ترساڑیاں الماریوں کی رونق میں ہی اضافہ کرتی تھیں۔ سنندا سگریٹ پیتی تھیں دو دکانوں سے بال سنوروا تی۔ ہر دوسرے مہینے اسکے بالوں کی آرائش بدلتی تھی

پاپش سدھو کا تھوڑا تھا۔ اپنے ہاتھ سے وہ اتنا بھی کام نہ کرتی تھی کہ بستر پر سے کپڑا کر بھی سو جاتی۔ غیر ملکی عورتیں اگر اپنے بال بھی آ اگلی بہو بیٹی سے بنوانے کی آرزو کرتی ہیں تو وہ سب ہی کام وہ ایسے کرتی ہیں کہ وہ اپنے سنگار کے لئے بھی نہیں۔

میں انہیں خیالات میں کافی رات تک جاگتا رہا۔ جب سوئی تو شاید دن نکلنے والا تھا۔

× ×

سلو چنا دیوی کے مشورے اور اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بابو کو خط لکھنا شروع کیا۔ کافی دیر تک میں سوچتی رہی کہ خط شروع کس طرح کروں۔ کس القاب کیساتھ شروع کروں۔ جب سے دیدی کی شادی ہوئی تھی میں نے ان سے کبھی بات بھی نہ کی تھی۔ یہ خط لکھنا بھی میرے لئے ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔ اس خط میں میں نے جو کچھ لکھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔

کمل بابو!

آپکا خط مل گیا تھا۔ اُسکے لئے شکریہ۔ آپ نے اس تصویر کی قیمت ادا کر کے دراصل مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ اگر اس کی قیمت نہ ادا کرتے تو مجھے بہت سے آدمیوں کے روبرو ذلیل اور شرمسار ہونا پڑتا۔ دیدی نے ممکن ہے اُسکے بعد کا واقعہ آپ کو تحریر کیا ہوگا۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ اس نے کس صورت میں میرا جرم پیش کیا ہوگا۔

آپکا خط دیکھتے ہی وہ تلملا گئی تھی۔ انھیں شبہ ہو گیا تھا کہ میرا آپ سے کچھ ناجائز تعلق ہے اور دیدی کو خطا وار سمجھ کے اسکی موجودگی میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔

اس روز زبردست بارش ہو رہی تھی۔ چاندنی نے میری طرف داری کی تو دیدی اس سے بھی خفا ہو گئیں۔ اور اسے ایک طمانچہ مارا ۔۔۔ ہم لوگوں کو انھوں نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اب اس کے بعد ہماری غیرت گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ ہم اس گھر میں رہتیں۔

میں درحقیقت آپ لوگوں کی بے حد احسان مند ہوں، دیدی کی بھی احسان مند ہوں۔ اگر اس دن غصے میں آکر گھر سے باہر نہ کرتیں تو میری حالت ابھی تک ویسی ہی بنی رہتی، بلا وجہ دوسروں پر بار بنی رہتی۔ ابھی تک تو مجھے کوئی نوکری ملی نہیں ہے

لیکن میری کوشش جاری ہے۔ سنگیت سکھانے کا کام شاید مل جائے۔ میں فی الحال بالنٹ ولج میں ایمڈن فیملی کیساتھ رہ رہی ہوں۔ جہاں میری سہیلی سندری گورنس کا کام کرتی ہے۔ میرے آجانے سے سندری کو بھی سہولیت ہو گئی ہے۔ وہ بچے میرے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قطعی درست ہے۔ اس کا ہر لفظ سچا ہے۔ اس میں حقیقت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ میں آپ لوگوں کے احسانات کو بھول نہیں سکتی۔ پتا جی و ماں کو میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ انھوں نے بھی تو قریب چھ مہینے سے مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ آپ مناسب سمجھیں تو انھیں خط میں تحریر کر کے یا ملاقات ہونے پر سمجھا دیجئے۔"

رانی

یہ خط میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ میں نیچے جو کچھ لکھ سکی اور نہ شروع میں ہی کوئی القاب لکھ سکی۔ خط لکھ کر میں ڈاکخانے میں ڈالنے کیلئے گئی۔ سندری کے گھر آنے میں تقریباً دس بارہ دن گزر چکے تھے۔ لیکن اس دوران میں میں گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ سندری کے بار بار اصرار کرنے پر بھی میں گھومنے نہیں گئی۔ دھڑکتے دل سے میں نے خط لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ ان کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑا بار جو میرے سر پر تھا میں نے اُسے اُتار کر پھینک دیا ہے۔

میں اپنی دلی حالت پر خود ہی پریشان تھی۔ مجھے اس بات کا افسوس تو بہت زیادہ نہ تھا کہ میرا اپنے گھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ماں نے جس چاؤ کی مجھ کو نکالا تھا حیرت ناک بات تھی۔ ڈاکخانے سے گھر جاتے وقت مگر مجھے تعجب تھا تو صرف اس بات کا کہ کیا دوسری اور مائیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں؟ کیا انھیں بھی بچی اولاد سے محبت نہیں ہوتی؟ دیدی نے اپنا پہلا بچہ کسی بھی پیش ماں کو دے دیا تھا۔ میں بے جان، خاموش اور کھوئی کھوئی سی کس طرح بالنٹ ولج پہنچی

سلوچنا دیوی میرا بھی سے انتظار کر رہی تھیں۔ میرے گھر پہنچتے ہی انھوں نے پوچھا کہ میں نے سندری کو کہیں دیکھا ہے؟ میرے انکار نے ان کی فکر اور پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہ خوف سے لرز اٹھیں۔ پران بابو کے ساتھ اُسکا اُٹھنا بیٹھنا تیزی سے بڑھ رہا تھا شاید ان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ لیکن میں نے دل کی بات دل ہی میں رکھی

سلوچنا دیوی کسی کتاب کی طرح میرا مطالعہ کر رہی تھیں۔ "سندری اور پران بابو اکٹھے بھی تو جا سکتے ہیں۔ کیوں؟" میں نے جھجک اور شرم سے پانی پانی ہو اٹھی کسی طرح میں نے جواب دیا ہاں

”جب سے وہ (سلوچنا دیوی کی کرتی) وہ گھر میں اور دونوں کے باہمی تعلقات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مجھے اکثر شک ہوتا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ سالی بہن اور آپ کی سہیلی ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا“

لیکن مجھے اس وقت کچھ سوجھا ہی نہیں، حالانکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سہیلی کے ذکر کو چھوڑ کر میں نے فوراً ”کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں“

سلوچنا دیوی نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر بولیں ”آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے اسقدر حقیر نہ سمجھئے۔ آپکی سہیلی چلی گئی ہیں تو اسکے یہ معنی نہیں کہ بچیوں کی دیکھ بھال آپ کریں۔ یہ تو میں بھی کر لوں گی“

اسوقت نہ جانے تمام دنیا کی نرمی میری زبان پر کہاں سے آگئی تھی۔ میں نے پرخلوص انداز میں کہا ”نہیں جی جی! آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں آپکو چھوٹا نہیں بنا رہی ہوں میں تو محض انسانیت کے ناطے کہہ رہی ہوں کہ میں بھی بچیوں کی دیکھ بھال میں آپکا ہاتھ بٹا سکتی ہوں“

سلوچنا دیوی نے اتنی محبت اور ہمدردی سے پُر الفاظ شاید پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ ان کا دل بھر آیا۔

اس دن سے بچیوں کی دیکھ بھال میں کرنے لگی۔ سندری کا کوئی خط نہیں آیا۔ اسکے کمرے میں سوائے اُس فرنیچر کے جو سلوچنا دیوی کا دیا ہوا تھا سندری کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس لے گئی تھی یہاں تک کہ تیل صابن تک بھی وہاں نہ تھا۔

میں نے زندگی میں کبھی خیال بھی نہ کیا تھا کہ مجھے کسی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑیگی۔ چاندنی ان کاموں میں ماہر تھی۔ وہ بچیوں کو غسل کراتی، ان کے بال سنوارتی اور گھمانے لے جاتی۔ میں اپنا کھانا پکاتی، کمرہ صاف کرتی اور بچیوں کو سنگیت سکھاتی۔

سنتا دیوی کبھی کبھی بیچ بیچ کر کھڑکی کے آگے ——— کھڑی رہتیں۔ ہاتھ میں کوئی اردو کا غیر ملکی رسالہ ہوتا یا کسی غریب رشتہ دار کا خط رہتا جو اس نے کچھ روپیہ مانگنے کیلئے لکھا ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ سنتا کسی بھی خاص موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ اُسے مستقبل اور انجام کا خیال ہی نہیں رہتا۔ نہ فکر ہی رہتی ہے۔ اُسکا خیال تھا کہ دنیا میں ایسا کچھ باقی نہیں ہے جو اُسے سیکھنا ہے۔ دنیا کی تمام خوبیاں اور قابلیت اُس میں موجود ہے۔ میں سوچتی کہ اگر کبھی یہ قانون کے ہاتھ پڑ گئی تو ——— ؟ اور تبھی اسے جائز اور ناجائز کا احساس ہوگا۔ ورنہ شاید نہیں۔

جس دن سے سندری اور پران بابو گئے، سنتا دیوی سندری کو قصوروار کہتی رہتیں۔ انکا کہنا تھا کہ وہی انکے بھائی کو بہکا کر بھگا لے گئی۔ سندری وہ عیسائی تھی۔ یہ لڑکیاں دوسروں کے گھر رہتیں، ملازمت کرتیں۔ نوکری ہی انکی ذات ہے۔ اسکے علاوہ اور کیا امید کی جا سکتی ہے۔

یہ چوٹ مجھ پر کیا تھی۔ سنتا کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا، میری زندگی کسقدر بیکار ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندا۔ سارے دن بن ٹھن کر رہنا۔ اور محنت کش عورتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ ہفتہ میں تین چار دن سینما دیکھنا۔ جس سے چند لمحات کے لئے جذبات جاگ اٹھیں۔ سنتا کو بچہ کا دیری کی مورتی کی طرح پڑھنے لکھنے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھی کسی لائبریری سے کوئی ناول لے آتی یا خرید لیتی تو اسمیں سوائے معاشقوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ جن ناولوں کی ہیروئن چھوئی موئی کی طرح بات بات پہ بیہوش ہوجاتیں۔ جن میں ہیرو کے ایک اشارے پر گھوڑے دوڑتے۔ ہیروئن کو ہمیشہ دل کی بیماری لگی رہتی۔ وہ اشکباری کرتی اور اپنے   کی قسم اور وعدوں کو یاد کر کرکے انہیں بددعائیں دیتی رہتی۔ اور پھر عین موقعے پر ایک راجکمار نمودار ہوتا اور اس سے شادی کر لیتا

یہاں شادی کا لفظ آتے ہی اکثر میرے خیالات کی روانگی ٹھہر جاتی۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میری شادی نہیں ہوگی۔ مجھ سے کون شادی کریگا؟ میں اسقدر کالی ہوں۔ میری شادی کیلئے ماں کو از حد کوشش کرنی پڑیگی۔ جسے وہ ہرگز گوارہ نہ کرینگی۔ ممکن ہے مجھے اسی جگہ سلوچنا دیوی کی بچیوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی پڑے گی۔

میں نے اپنے مستقبل پر کبھی غور نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے اپنا موجودہ غم ہی پہاڑ جیسا نظر آتا تھا۔ اسلئے میں ہمیشہ اپنے حال کو ہی اہمیت دیتی تھی۔ کبھی میری زندگی میں بھی بہاریں آسکتی ہیں اسکا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میری زندگی کی حدود اسقدر محدود تھی کہ اسوقت میرے ذہن میں یہ خیال ہرگز نہ آتا تھا کہ ہر انسان کی زندگی اسی طرح محدود ہوتی ہے۔

ہر یگا اکثر میں اخروٹ کے درختوں کو دیکھتی۔ انہیں پھل لگ رہے تھے، چھوٹے چھوٹے اور ہرے ہرے۔ میں سوچتی ان اخروٹوں کے درختوں کی زندگی میری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ جنکے نام پر کم از کم اس گھر کا نام بالنٹ لاج ہے اور جنکے پھلوں کو سنتا کے طرح طرح کے کریم سے بھات کے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کی نرمی و گرمی نصیب ہے۔ میں بدنصیب کچھ بھی تو نہیں کر پاتی ہوں۔ میرا تو کام بھی چاندنی ہی کرتی ہے۔

اور اسی وقت ——— ؟ میری خاموش زندگی میں یکایک طوفان

بھی انتظار میں سب کچھ تبدیل کر دیا ——

صبح کے دس، ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔ آفتاب ابھی دھندلکوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کی سرخی جھلک رہی تھی — ٹھیک اسی طرح، جس طرح کوئی پہلے کی دوکان میں ستر برس کی ڈگری رکھی ہو — گھر سے تیار ہو کر میں نوکری کی تلاش میں باہر جانے کو ہی تھی کہ میں نے کمل بابو کو بانس والے لاج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا — دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا گویا میرے کانوں میں کوئی انجن چل رہا ہو — میرے پاؤں کانپ اٹھے۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ کمل بابو خود یہاں چلے آئیں گے۔ خط لکھے بھی صرف چار پانچ دن ہی گزرے تھے۔ میرے پیروں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا تھا — انھیں جا کر اپنے کمرے تک لے آنے کی طاقت بھی میرے پیروں میں باقی نہ تھی —

یکایک مجھے خیال آیا کہ یہ سندری سے ملنے آئے ہونگے۔ انھوں نے اس پر کافی روپیہ خرچ کیا تھا — ڈاکٹر اندر درشن والی رقم بھی ممکن ہے سندری اٹھائی ہو۔ اس نے شاید پیران بابو کو دیدی ہو — اب کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ بہت سے خیالات ایک ساتھ میرے ذہن میں جاگ اٹھے —

کمل بابو — ہاں، وہی میری طرح بغور دیکھ رہے تھے — ہماری جان پہچان کے اس طویل عرصے میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ مجھے اتنے قریب سے اور اس طرح دیکھ رہے تھے۔ مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے کہ میں نے خود کو سہارا دینے کیلئے برآمدے کی جھکی ہوئی چھت کا کھمبا پکڑ لیا تھا

اس سے پیشتر میں نے کبھی کمل بابو کو اچھی طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بھی دیکھا تھا، چوری چوری، چھپ چھپ کے دیکھا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ کمل بابو کی آنکھیں ایک ایسے جذبے سے دوسرے کو دیکھتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں۔ "ہم بھی دیکھیں کہ تم کیا ہو؟ کون ہو؟"

کمل بابو کے جسم کا رنگ گندمی، چہرے پر نہایت لاپرواہی سی، اور اس لاپرواہ انداز کو ظاہر کرتے ہوئے ماتھے پر گر گر آتے ہوئے بال اور بھی گہرا بنا جاتے —

وہ میرے قریب آگئے تو ایک لمحہ کیلئے میری آنکھیں بند سی ہو گئیں تھیں۔ پھر میں نے بہت ہمت کر کے اپنی آنکھیں کسی طرح کھولیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی — ویسی کی ویسی ہی تھی۔ میرا جسم سمٹ سکڑ کر بالکل چھوٹا سا ہو جانا چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں —

رانی! کمل بابو نے محبت آمیز آواز میں پکارا — رانی! تم اپنی بہن کے سلوک کا بدلہ کہیں مجھ سے تو نہیں لے رہی ہو؟

اس سوال کا جواب دینے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔ مجھے تو یہ سب ایک خواب جیسا نظر آ رہا تھا —

"کیا کہیں بٹھاؤ گی نہیں؟"

"جی — آئیے — یہ ہے میرا کمرہ —"

کمل بابو نے کمرے کا جائزہ کرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا —

"تو سندری باہر گئی ہے؟"

"جی میں یہاں بچیوں کو سکھاتی ہوں ——— سندری چلی گئی ہے۔ مجھے ابھی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں سندری یہاں سے چلی گئی ہے۔ میں نے اسے بمبئی کے ہوائی اڈے پر دیکھا تھا۔ [illegible] صاحب کا چھوٹا بھائی بھی ساتھ تھا۔ شاید دونوں ولایت جا رہے ہیں —"

کافی دیر تک [illegible] میں نے محسوس کیا گویا دنیا کی ہر چیز کی رفتار رک گئی ہو — سب کچھ بے جان ہو گیا تھا — کیونکہ اس وقت میرے دل کی رفتار بے حد تیز ہو گئی تھی خون کی روانی اسقدر آہستہ معلوم ہوتی تھی گویا رک گئی ہو — کافی دیر تک میں خاموشی کے عالم میں ڈوبی رہی —

"تو آپ جانتے ہیں کہ سندری یہاں نہیں ہے؟"

"ہاں تمہارا خط مجھے بعد میں ملا تھا — میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہیں سندری کو دیکھا — واپس دلی آنے پر تمہارا خط ملا —"

میں نے نگاہیں اٹھا کر کمل بابو کی طرف غور سے دیکھا — کون جانے پھر کبھی — نہیں دیکھنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے —

"رانی! اس دفعہ تمہارے امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں رہا —"

"نکل گیا؟"

"ہاں ——— تم اخبار نہیں پڑھتیں؟"

"تو ہفتوں چار دن سے نہیں پڑھا — کیا ہو فیل ہو گئی؟"

کمل بابو نے قہقہہ لگایا — میں نے محسوس کیا گویا میرے دل کی افسردگی اس قہقہے میں ڈھلتی جا رہی تھی —

"تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو کہ فیل ہو جاؤ۔ پاس ہو گئی ہو۔ لیکن اس بار فرسٹ ڈویژن میں نہیں، صرف پاس ہوئی تھی —"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بلا ٹلی۔ اس روز پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ لوگ پہلوانوں کے بجائے [illegible] ڈانٹ کھا کر اسے ذائقہ دار کیوں سمجھتے ہیں —

"کب نکلا نتیجہ؟"

"تمہاری دیدی بوسٹماتا جی کی طرف سے ولی آئی ہوئی ہیں۔ کادیری بھی دیں ہے نتیجہ دیکھ کر دونوں کو اس دن سخت افسوس ہوا۔"

اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں خود پر قابو نہ پا سکی اور بے ساختہ ہنسی پڑی۔

"تم! ـــ تم بہت آزاد ہوتی جا رہی ہو رانی!

"کیوں؟"

"بہن اور ماں کے افسوس کا تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا؟"

"خیر، دیدی وہاں پہنچ کیسے گئیں؟"

"تمہیں گھر سے علاحدہ کر کے وہ دھیریندر کے ساتھ تنہا کس طرح رہ سکتی تھیں۔ حالات سے مجبور ہو کر انہیں دوسرا ٹھکانا ڈھونڈنا پڑا۔ لیکن اس کے لئے انہیں قصوروار تو نہیں کیا جا سکتا۔"

رہ رہ کر خیال آتا کہ میں دریافت کروں کہ دیدی نے میری بابت کیا کیا کہا۔ لیکن میری حالت تو اس بھوکے انسان کی طرح ہو رہی تھی جسے بھرا ہوا تھال مل جائے۔ گھر چھوڑ دینے سے میری اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کمل بابو دلی سے ملنے آئے تھے ـــ

"کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"ہوٹل میں۔"

"کب آئے تھے؟"

"آج صبح۔"

"یعنی آپ کو مسوری آئے ہوئے صرف ایک ہی گھنٹہ ہوا ہے؟"

"جی ہاں آپ کا حساب درست ہے۔"

"چائے، ناشتہ ۔۔؟"

"دوسروں کے گھر کا کھاؤ گی؟"

نہیں، میرے کھانے پینے کا انتظام علاحدہ ہے۔ اس ساتھ والی کوٹھی میں چا کا پیالہ جا کر ابھی بنا دیتی ہوں۔"

کمل بابو نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے تو دیکھا ہے، لیکن کھانا پکاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔"

جی میں تو آیا کہ کہہ دوں کہ آپ نے مجھے پڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے مجھے آج سے پیشتر کبھی دیکھا ہی نہیں۔ یہ تو صرف میری دل لگی کیلئے آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں کچھ بھی کہہ نہ سکی ـــ

"چائے کا پانی تو رکھ آؤں؟"

"نہیں پھر تمہیں ہوٹل میں چائے پلاؤں گا۔"

"تھوڑی سی یہاں پی لیجئے۔ تھکے ہوں گے۔"

"نہیں۔"

آپ پہلے سے بھی اسی طرح انکار کیا کرتے تھے، لیکن وہ مانتی ہی کہاں تھیں جو انکی طبیعت چاہتی ہے وہی کرتی ہیں۔

"لیکن تمہیں تو باہر لے جاؤں گا۔"

"آپ گھر سے زیادہ اہمیت ہوٹل کو کیوں دیتے ہیں؟"

"یہ گھر تمہارا کہاں ہے؟"

"میں کام کرتی ہوں رہتی ہوں، مفت تو رہتی نہیں۔"

"کام کرنے کی تنخواہ بھی کچھ ملتی ہے؟"

"نہیں۔"

"صرف رہنے کو جگہ؟"

"جی!"

"بہت سستی آیا ہے۔"

"میں آیا تو نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو؟"

"صرف استانی۔"

"میں تو اسے آیا ہونا ہی سمجھتا ہوں۔"

شاید غصے سے میرا چہرا سرخ ہو گیا ـــ

"میں تمہیں ناراض کرنے کیلئے یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"... میں چائے کا پانی رکھ آؤں"

اگر تم نے اپنا خیال ابھی تک تبدیل نہ کیا ہو تو رکھ آؤ۔"

میں چائے کا پانی رکھنے گئی تو میں نے دیکھا ہیٹر پر پانی پہلے سے ہی رکھا ہوا تھا۔ میں اپنا ناشتہ بنانے کے لئے پانی رکھ گئی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ چائے بنائی، کچھ مٹھائی اور بسکٹ کے ساتھ انہیں ٹرے میں سجا کر کمرے میں واپس آئی تو دیکھا، سنتا دیوی رونق افروز ہیں۔ آج وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں تشریف لائی تھیں۔ شاید کمل بابو کی آمد انکے لئے کافی اہمیت رکھتی تھی۔

کافی عمر تک بغیر شادی شدہ لڑکیوں کے ذہنی حالات اور سوچنے کا رخ کچھ عجیب ہو جاتا ہے۔ انکے احساسات بھی عجیب و غریب ہو جاتے ہیں ان کی زندگی میں صرف مرد ہی ایک آورش بن جاتا ہے۔ اس سے گفتگو کرنا جس طرح ممکن ہو

لگتا تو یہ ہے بیٹا، ایسی ڈگریاں زندگی کے ضروری جز بن جاتے ہیں۔

"بڑی جلدی ہی چائے بنا لائی رانی؟" کمل بابو نے مسکرا کر کہا۔ یہ شکایت بھی تعریف بھی تھی۔ ان کے انداز سے میں نے محسوس کیا۔ ستا نے کمل بابو کو شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ گڑیا کی طرح سجی ہوئی تھی۔

"بھابی سے کہہ دیتیں رانی! وہ اندازے سے چائے بنوا کر بھجوا دیتیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔۔۔ آپ کا تعارف کرا دوں؟"

کمل بابو نے فوراً جواب دیا — "ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف ہو چکے ہیں۔"

"ستا جی! آپ کے لئے ایک پیالہ چائے لاؤں؟"

"نہیں، میں ابھی ابھی ناشتہ کر کے آ رہی ہوں۔"

"رانی! میں تمہیں بتا رہا تھا کہ کچھ بھائی پران بابو سے میری بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ سندری کے ساتھ ولایت جا رہے تھے۔"

کمل بابو مجھے پیشتر ہی بتا چکے تھے۔ لیکن دوسری مرتبہ پھر اسی بات کا ذکر کر کے وہ شاید ستا کے غرور پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔

کمل بابو کی عادت میں یہ تبدیلی ایک اہم تبدیلی تھی۔ ماں سے لے کر اور دوسری کوئی بھی عورت ان کی زندگی میں آتے ہوئے نہیں دیکھی گئی جس سے انھوں نے اس طرح گفتگو کی ہو۔ شروع ہی میں بے رخی اور رکھائی ظاہر کرنا اور بات ہے، لیکن دوران گفتگو اس طرح کچھ کہنا دیگر بات ہے پھر ستا دیوی اس سلوک کے قابل نہ تھیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ستا کی زبان سے جواب میں ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔ بولے تو کیا بولے؟ یوں تو انھوں نے ستا سے جو بھی کچھ کہا تھا کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ خود ایسی تھی کہ اس سے بھی زیادہ .... کہا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے کمل بابو پر تعجب ہو رہا تھا۔ جس وقت سندری کو لے کر گھومتے تھے تو کوئی بات نہ تھی، اور آج جب وہ کسی دوسرے کے ساتھ چلی گئی ہے اس کے متعلق باتیں بنانے لگے ہیں۔ شاید سبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کوئی نہیں دیکھتا کہ خود کیا ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ دوسروں کی خامیاں تلاش کر کے انھیں ظاہر کرنے میں ایسے شخصوں کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اس کے بعد مجھے خاموش ہو جانا پڑا، کیونکہ ستا کی تقریر شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گھڑسواری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ مسوری میں گرمیاں گزارنے والے راجہ، رانیوں کی داستانیں سناتی رہی۔ جن میں سے کچھ سے وہ خوب واقف تھی اور کچھ کو اس نے ادھر ادھر سے صرف نام ہی سن رکھا تھا۔ کمل بابو اس کی باتوں پر ہنسے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے مذاق بھی کرتے جاتے تھے۔ وہ مذاق کر رہے ہیں مجھے معلوم تھا۔

ستا شاید ساری دوپہر بات کرتی رہتی۔ لیکن اسی دوران سلوچنا دیوی کا بھائی آ گیا۔ وہ تجارت کرتا تھا۔ سلوچنا دیوی اسے اپنے گھر آنے پر کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھیں کیونکہ انھیں ستا اور اپنے بھائی کے باہمی تعلقات قطعی ناپسند تھے۔

ستا نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی کمل بابو سے معافی مانگ کر باہر چلی گئی۔

"اب کہو رانی! واپس کب چلو گی؟"

"میں کبھی نہیں!"

"تم اتنی نادان نہیں ہو۔"

"مجھے آپ کے ساتھ جانا ہوگا؟"

"ہاں، میں تمہیں ہی لینے آیا ہوں۔"

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا کیا جواب دوں۔

"بولو رانی جواب دو؟"

"میں اب وہاں جا کر کیا کروں گی؟"

"جو پہلے کرتی تھیں۔"

"پہلے تو میں پڑھتی تھی۔ لیکن اب تو پڑھائی ختم ہو گئی۔"

"تو کیا ہوا؟ آیا گیری کرنے کیلئے تم نے ایم اے پاس کیا ہے؟"

جب دوسری مرتبہ بھی انھوں نے ایک ہی بات کو دہرایا تو میں خود پر قابو نہ پا سکی۔ "جب کاویری نے گھر سے نکال دیا تھا تو میں کہاں جاتی۔۔۔ بتائیے؟"

کمل بابو پھر ہنسنے لگے۔ "کاویری تمہاری بہن ہے، اگر میں ایسی حرکت کرتا تو دنیا مجھے جینے نہ دیتی۔ . . . ہاں تو رانی! اسے کس بات کا شک تھا؟"

میں ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی، شرم و حیا نے میری زبان بند کر دی۔ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجھ میں ہمت باقی نہ تھی۔

"رانی!"

"جی!"

"مجھے معاف کر دو۔"

"اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

"میرا قصور تمہارے ماننے سے ہرگز کم نہیں ہو سکتا۔ میرے قصور کو یا تو تم محسوس نہیں کرتیں یا تم اس قدر با تہذیب اور رحم دل ہو کہ مجھ پر میرا جرم ظاہر نہیں کرنا چاہتیں

"میں بھی نہیں"

"تم مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، پھر بھی . . ."

"لیکن دنیاوی تجربات تو میری بہ نسبت آپ کے کہیں زیادہ ہیں۔"

"تمہاری خاموشی میرے جرم کی سنگینی کم نہیں کر سکتی۔ ۔ ۔ میں اس کا کفارہ ادا کرونگا۔ تم سامان باندھ لو اور تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ ڈھائی بجے چل دینگے۔"

"لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔"

"میں کوئی مخالفت نہیں چاہتا۔"

"لیکن میں جاؤنگی کہاں؟"

"گھر۔"

"نہیں، وہ ڈیڈی کا گھر ہے، اب میں جس گھر سے نکل آئی ہوں اس گھر میں نہیں جاؤنگی"

"لیکن جب تک تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا کام نہ ہو۔ ۔ تم یہاں بھی تو نہیں رہ سکتی ہو۔"

وہی کمل بابو جو میری طرف نگاہیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ کیوں مجھ میں اس قدر دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں جنم سے لیکر اس دن تک دنیا کی نظروں میں حقیر رہی تھی۔ مجھے کسی کی محبت حاصل نہ ہوئی تھی۔ سب کے سلوک سے چڑھ کر صرف پاپا ہی مجھے پیار کرتے تھے اور اب مجھ پر عاشقانہ محبت کی جا رہی تھی۔ میرا پیاسا دل اس قدر پر جذبات ہو اُٹھا تھا کہ میں بھرا اٹھی۔ میں دیوار پر بیٹھی ہوئی تھی پیچھے کی طرف کھسک کر میں نے اپنی پیٹھ دیوار سے لگا لی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھے جا رہے تھے۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن انکی نظریں میرے جسم کی باہری سطح کو پار کرتی ہوئیں دل کی گہرائیوں تک پہنچ رہی تھیں۔

"رانی میں نے سب کچھ سوچ سمجھنے کے بعد طے کر لیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلوگی، میں تمہارے رہنے کیلئے کوئی مکان ٹھیک کر دونگا اور نوکری کا بھی انتظام کر دونگا۔"

"سچ؟"

"ہاں رانی! میری معمولی غلطی نے تمہیں گھر سے علاحدہ کرا دیا۔"

"اُس میں آپکا قصور ہی کیا ہے؟"

"مجھے اُس خط میں یہ نہ لکھنا چاہیے تھا کہ تمہیں ڈیڈی سے پیسے مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"میں نے ڈیڈی سے کبھی پیسے مانگے ہی نہیں۔ وہ تو خود ہی دے دیا کرتی تھیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔"

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا۔ آجکل تم اپنا خرچ کس طرح چلا رہی ہو!"

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ چاندی کے چار کڑے جو اپنے ہاتھوں سے [illegible] کڑے بیچ ڈالے تھے اب صرف پندرہ روپے رہ گئے تھے۔ یہ اتنی بڑی بات تھی کہ مجھے اسکا ذکر کرنا بھی تکلیف دہ محسوس ہوا۔

کمل بابو نے میرے سامنے سو روپیہ کے نوٹ رکھتے ہوئے کہا "کسی کا بل وغیرہ ہو تو ادا کر دینا۔ تیار رہنا میں ٹھیک ڈھائی بجے لینے آؤں گا۔"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ چلے گئے۔

× × ×

کمل بابو کیساتھ مسوری سے آنیکے بعد دہلی کی دو سال کی زندگی [illegible] رہی۔ کوئی اچھی نوکری مجھے نہیں ملی اور نہ کوئی رہنے کے لائق اچھا مکان ہی ملا۔ کمل بابو کو بھی دہلی آکر محسوس ہوا کہ نوکری دلوانا اتنا آسان نہیں۔ جتنا کہ وہ مسوری میں سمجھ رہے تھے۔

۱۹۵۲ میں دہلی میں لڑکیوں کو بھی نوکری ملنی اتنی ہی مشکل تھی جتنی شاید ۱۹۳۱ میں لڑکوں کو۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ معمولی سی نوکری کیلئے بیسیوں ڈگریوں کی عرضیاں آتیں۔ اور لڑکیوں کی عرضیوں کے ساتھ میری عرضی بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی۔ کیونکہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی۔

میں دو تین مہینے کمل بابو کے ایک دوست کے گھر رہی۔ لیکن اس گھر کی ایک بزرگ عورت کو میرا اپنی ماں کا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھر رہنا ناگوار گزرا۔ اُسکا خیال تھا کہ میرے آزاد خیال گھر کی دوسری لڑکیوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ جو پہلے ہی گھر والوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لڑکیوں سے کبھی اچھی طرح گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ایک غیر شادی شدہ ایم اے پاس اور نوجوان لڑکی گھر اپنی خادمہ کو لیکر اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے گھومتی رہے تو ایسی صورت میں اگر لوگ اُس پر انگلیاں اٹھائیں تو انکا قصور ہی کیا؟

وہ گھر چھوڑنے کے بعد میں ایک ہوسٹل میں رہنے لگی۔ وہاں چاندی کو اپنے ساتھ رکھنا مشکل تھا۔ اسلئے مجبوراً مجھے چھوڑ دینی پڑی۔ ویسے تو ہوسٹل میں ہر طرح کا آرام تھا۔ علاحدہ کمرہ تو نہیں ملا۔ ایک دوسری لڑکی کیساتھ رہنا پڑتا تھا کسی بات کی فکر نہ تھی۔ [illegible] کرو، کیونکہ مہنگائی بڑھتے ہوئے بلوں کی تعداد کم کرو۔ ۔ ۔ مردوں کے آنے جانے پر بندش تھی۔ ہوسٹل صرف اسلئے میرے لئے موزوں نہ تھا کیونکہ مجھے سنگیت سکھانے کے لئے سیکھنے والوں کی سہولتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے سنگیت سکھانے کیلئے ایک دو ٹیوشن مل جاتے تھے۔ لیکن نوکری ملنی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ ایم اے میں میری ڈویژن اچھی نہیں آئی تھی۔ آخر ہوسٹل کو بھی خیرآباد کہہ دینا پڑا۔

میں نے اخبار کے ایک دفتر میں نوکری کی۔ وہ بڑی بھاگ دوڑ کا کام تھا اس لئے مجھ سے ہو نہ سکا۔ اور وہ نوکری چھوڑ دینی پڑی۔ پہلے ہی میں نے دنیا کی نفرت

استطاعت یہ معاشرت کی ترقی کیسی ہی آرام کی زندگی گزارنے کی عادی تھی آج بچے سے نیکر پانکو نہ چکنا ہوگا ہوسکا مجھے اب محسوس ہوا کہ محنت کی کمائی کی اہمیت کیا ہے ـــ

بیمارکی یا دکرتی تو دوسرا سامنے آجاتا ۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی کہ میں الگ ہوں ۔ کیوں نہ ماں کے پاس چلی جاؤں ؟ آخر اُن پر میرا بھی تو کوئی حق ہے ۔ دنیا کے پھندوں سے بہت کچھ فرح کیا ہے ۔ جب تک مجھے نوکری نہیں ملتی تب تک مجھے بھی ان کی امداد کی ضرورت تھی ۔

ایک دن ماں سے ملاقات کرنے گئی ۔ اُس وقت میں نہایت تنگی میں تھی ۔ جس مکان میں رہتی تھی اُسکا کئی مہینے کا کرایہ میں ادا نہیں کر سکی تھی مکان مالک نے دھمکی دی تھی کہ میں دوسرا مکان تلاش کرلوں ۔ انھیں کوئی ایسا کرائے دار مل رہا تھا جو تین سو کا کرایہ پیشگی دینے کو تیار تھا ۔ اور میں پچھلے تین مہینوں کا بھی کرایہ ادا نہ کر سکی تھی ۔ میرے پاس کوئی زیور بھی نہیں بچا تھا کہ اُسے ہی فروخت کر ڈالتی ـــ

میں طے ہی دل میں فیصلہ کرکے گئی تھی کہ ماں سے کچھ روپیہ مانگوں گی ـــ

ماں نے مجھے دیکھا تو انکی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ میں نے ہمت کرکے اُنکی خیریت دریافت کی تو وہ بولیں " تو باہر سے ہی کالی نہیں تیرا دل بھی کالا ہے ۔ رقم لوٹنے کیلئے کوئی اور نہیں ملا سوا اپنے بہنوئی کے "

ماں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کمل بابو کو برباد کرنا بند کردوں اور ان کے پیسے کا لالچ اپنے دل سے دور کردوں ـــ

ماں اسقدر بے رحمی سے پیش آئی تھیں کہ میں اُن سے کچھ نہ کہہ سکی میں نے منانے بولنے کی کوشش کی تو انھوں نے ڈانٹ دیا ۔ " تو موکھی ہے یا ڈائن ؟ کیوں اس بچارے کو نظر لگاتی ہے "

میں ماں کو قصور وار نہ کہہ کر حقیقت ہی بیان کر رہی ہوں بیسویں صدی میں پہنچ کر بھی ماں ایسی بھی ہوسکتی ہے ، ممکن ہے آپ کو یقین نہ ہوگا ۔ بھوک سے بیزار ماں نے اپنے پیٹ سے اپنے بچوں کو چہار سے میں کو ڈالنے ہو ۔ یا جانشاد کے سوال پر ماں بیٹی میں جھگڑا ہوگیا ہو ۔ ایسا تو میں نے سنا تھا ۔ اکثر اخباروں میں بھی ایسے واقعات پڑھے تھے ۔ لیکن بیٹی کا رنگ کالا ہونے کی وجہ سے بیسویں صدی کی ماں درمیانی طبقہ کی ایک ماں اُسے صرف تعلیم یافتہ بنا کر اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوجائیگی ، معمولی بہانے پر گھر سے علاحدہ دیگی ـ

ماں کے سلوک سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے ان سے قطعی تعلق نہ رکھنا چاہیے ۔ ان کی خواہش بھی وہی تھی جو کادمبری کی تھی ـ

میرا دل پاش پاش ہوگیا ۔ اکیس سال کی عمر میں میں گھر اور گھر والوں کے ہونے کے باوجود یتیم تھی ، بے گھر تھی ، بے سہارا تھی ـ

ایک دفعہ بھی ماں نے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں کہاں رہتی ہوں ، میرا گزارہ کس طرح ہوتا ہے ، مجھکو نوکری ملی یا نہیں ؟ ماں کو اتنا ممکن ہے میری بابت کچھ دریافت کرنیکے بعد میرا بار ان پر آپڑیگا ـ

کادمبری نے مجھے ماں کے پاس بیٹھے دیکھا تو منہ پھیر لیا ۔ اسکا خیال تھا کہ میں نے کمل بابو کو اُس سے چھین لیا ہے ۔۔

تب مجھے اپنی اصلی حالت کا احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں قطعی تنہا ہوں ، میرا کوئی بھی اپنا نہیں ہے ۔ گھر والے میرے سایہ سے بھی دور بھاگتے ہیں ـ

اُس دن کے بعد میں نہ تو ماں سے ملنے گئی اور نہ کادمبری کے دوسرے لڑکے کی پیدائش کے وقت ماں نے مجھے بلایا ۔ بھیا ، پتا جی کا خیال آتے ہی دل کچھ بوجھ سا ہوا تھا ۔ لیکن وہ بھی نہ مجھے کبھی خط لکھتے تھے نہ دہلی آنے پر مجھ سے کبھی ملتے تھے ۔ ماں اور کادمبری نے میری طرف سے انکے خیالات قطعی تبدیل کردئے تھے ـ

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا ۔ ماں ، پتا جی اور دوسرے آدمیوں کو بھی کہتے سنا تھا کہ اکثر ولایت میں ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کو تعلیم دلانے کے بعد والدین علاحدہ کردیتے ہیں ۔ اور والدین سے علاحدہ ہونیکے بعد بچوں کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چلیں جہاں رہیں ، ملازمت کریں ۔ اگر بیسویں صدی نصف گزر جانے کے بعد ہندوستانی والدین بھی ایسا ہی کریں تو ناجائز نہیں ہے ۔ ماں کی بے رحمی ، نفرت اور حقارت نے جہاں میرا دل پاش پاش کردیا تھا وہاں مجھے ایسی روحانی طاقت بھی بخشی تھی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکوں ۔ ہوسکتا ہے کہ اور لڑکیوں کی بھی حالت میری جیسی ہی ہوگی ۔ لیکن میں ان کی بابت بخوبی نہیں جانتی ـــ

آہستہ آہستہ میں نے بھلا دیا کہ والدین پر میرا بھی کچھ حق ہے ۔ اگر ہم دوسروں سے کسی طرح کی کوئی امید نہ رکھیں تو ہمیں کسی طرح کا کوئی دکھ نہ ہو ۔ کیونکہ اس میں ناامیدی کی گنجائش نہیں ہوتی ـــ

کبھی کبھی میری بوا کے خط آتے تھے ۔ لیکن ان کی ہمدردی سے دل دکھی ہوتا تھا ۔ ان کی اُس ہمدردی اور رحم کو حاصل کرکے میں خود کو حقیر سا نہیں پاسکتی ۔ وہ لکھتیں ـــ " رانی بیٹیا ! تمام دنیا ایک طرف اور تو میرے لئے ایک طرف ۔ بیٹیا ! میرا گھر تمہارا گھر ہے ۔ جس وقت مرضی ہو آسکتی ہو ـــ میں تمہاری آمد کی منتظر ہوں ۔ تمہارے آجانے سے گھر کی رونق دوبالا ہوجائیگی ۔ گوری بھابی کے تو شروع سے ہی ایسے ہی آثار نظر آتے تھے ۔ اس نے کبھی بھی تمھیں اپنی بیٹی کی طرح محبت نہ کی ۔ گوری اپنا گھر گھاٹ چھوڑ کر دہلی ، اپنی بیٹی کے پاس جا بیٹھی ہے ۔ بھلا ایسا بھی کوئی کرتا ہے ؟ وغیرہ ، وغیرہ ـــ ہر خط میں ایسا ہی کچھ تحریر ہوتا تھا ـــ

مجھے ماں کے دہلی آجانے پر قطعی تعجب نہیں ہوا ۔ ماں کی بڑی بیٹی خوبصورت ہے ۔

شادی کے بازار میں اسکی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ وہ اگر اپنے ایک منزلہ مکان اور لکھنؤ جیسے معمولی شہر کو چھوڑ کر دہلی آگئی ہیں تو اسمیں کسی کو حیران ہونیکی قطعی گنجائش نہیں۔ دہلی میں میں نے دیکھا ہے کہ جن عورتوں کی لڑکیاں خوبصورت ہیں، اور اگر حسین نہ بھی ہو کر صرف چست اور جوان ہی ہیں کیونکہ کام اتنے سے ہی چل جاتا ہے — ایسی لڑکیوں کی والدائیں اپنی بیٹیوں کی خداداد شکل وصورت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔

ایک شریمتی حکومت سنگھ تھیں۔ ان کی لڑکی دیکھنے میں گوری اور کالی کالی بڑی آنکھوں والی ہے۔ چھوٹی لڑکی کے ناک نقش بھی اچھے ہیں — بڑی لڑکی کے شوہر وہ بجلی واقعہ میں سال اپریل میں وہ کہیں نہ کہیں بڑی لڑکی کی سگائی کرنے لگتی ہیں تاکہ اس سال کے مئی اور جون کے مہینے ان کے گھر والوں کے کسی پہاڑ پر گزر جائیں۔ شادی کا وعدہ وہ ستمبر کے مہینے کا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے ہونے والے داماد کو لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کے خاندان بھر کو پہاڑ پر لے جائے۔ ستمبر آتے آتے وہ اپنی بیٹی کو کچھ اس قسم کی پٹی پڑھاتی ہیں کہ منگنی ٹوٹ جاتی ہے۔ شادی رک جاتی ہے اور شریمتی حکومت سنگھ کسی دوسرے شخص کی تلاش میں لگ جاتی ہیں۔ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ شریمتی حکومت سنگھ ہی کیوں اور بھی نہ جانے کتنی ہی ایسی ہیں جو مستقل طور پر کچھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ ہاں ہر ایک کا طریقہ جداگانہ ہوتا ہے۔ جو لڑکی کی ذاتی قابلیت حسن وشباب اور ماں کی ہوشیاری پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خوب تعلیم یافتہ ہو بس روزمرہ کام آنے والی انگریزی کی جانکاری ہی کافی ہوتی ہے تاکہ اس سے انہیں اچھے عہدے پر ملازم لڑکا تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اور آج جب میں اس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میری ماں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا اگر وہ اپنے داماد کے گھر آکر رہنے لگی ہیں۔ معمولی جیسے معمولی تنخواہ پانے والا اگر انہیں چالیس سال کی عمر میں لکھنؤ جیسے معمولی شہر میں باندھ کر نہ رہ سکا تو اس غریب کا کیا قصور؟ زندگی کے پچیس سال انہوں نے ایسے شوہر کے ساتھ گزارے تھے اور اب ان کی ویران زندگی میں کچھ بہار آگئی تھی تو دوسروں پر ناگوار گزرنے کی بات ہے؟ اور پھر زمانے ——— کے ساتھ ساتھ اگر انہوں نے خود کو تبدیل کر لیا تو ناجائز نہیں۔

جب کبھی کمل بابو سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتے "رانی! تم اسقدر سنجیدہ اور خاموش کیوں ہو؟ تمہاری ماں جب ہنستی ہیں تو میں انکی عمر بھول جاتا ہوں اور انکی اس ہنسی میں کھو جاتا ہوں جو ایک پندرہ سالہ لڑکی کی ہنسی جیسی دلکش اور شیریں ہوتی ہے۔ وہ اسی طرح کھل کھلا کر ہنستی ہیں جیسے ایک معصوم بچی"

شاید ہر عورت دل سے جوان رہتی ہے اور موقع پاکر اس کی جوانی لڑکی کی طرح بے قابو ہو کر آزاد ہو جاتی ہے۔

ہندوستان سے باہر کے ملک کی عورتیں تو دل جانے پہچانے بنا وقت گزارتی ہیں اور ہندوستانی عورتوں کی بابت عام روایت ہے کہ وہ جب نانی دادی بننے لگتی ہے تو خود بخود ضعیف ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری ماں اسکے برخلاف جب نانی کہلانے لگی تھیں تو بجائے بڑھاپا آنے کے انکی کھوئی ہوئی جوانی لوٹ آئی تھی۔ انکا لباس، رہن سہن اور انکی طبیعت سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا

گزشتہ دو سالوں نے میری عمر میں صرف دو سال ہی نہیں جوڑے بلکہ بے شمار تبدیلیاں دی تھیں۔ اکیلی لڑکی ایک خادمہ کیساتھ رہے خواہ وہ کالی ہی کیوں نہ ہو، مرد کی نگاہوں سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ اور دوسروں کو مکان کی تکلیف ہو سکتی ہے لیکن مجھ کو کمل بابو کی مہربانی سے کہیں نہ کہیں مکان مل ہی جاتا تھا۔ دو تین مقام تبدیل کرنیکے بعد میں کمل بابو کے ایک دوست کے مکان میں جو نارتھ ایونیو میں تھا رہنے لگی۔ ان کے یہ دوست پارلیامینٹ کے ممبر تھے۔ یہ کمل بابو کے کس قسم کے دوست تھے، میں اسکی تفصیل میں اس وقت نہ جاؤں گی۔ وہ کمل بابو کی قانونی اور غیر قانونی حرکات میں کہاں تک ساتھ دیتے تھے یہ بھی اس وقت بیان نہ کر سکوں گی وہ راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ انکا مستقبل آئندہ چھ سالوں کیلئے محفوظ تھا۔ اسلئے جب تک میں کوئی ناجائز کام نہ کروں میرے رہنے کا انتظام مستقل تھا پھر یہاں جو سب سے بڑی سہولیت تھی وہ یہ تھی کہ مکان کا کرایہ مجھے نہیں دینا ہوتا تھا۔ کمل بابو اسکا کرایہ بھیا جی کو کس صورت میں ادا کرتے تھے مجھے اسکا علم نہیں۔ اور نہ مجھے اسکی بابت معلوم کرنیکی ضرورت ہی تھی۔ کمل بابو بھی انہیں بھیا جی کہتے تھے۔ انکے ساتھ کام کرنے والے بھی انہیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ بھیا جی کے مکان نارتھ ایونیو میں اگر میری زندگی کے طوفانوں میں کچھ خاموشی آگئی

× ×

بھیا جی کے مکان میں رہتے ہوئے تقریباً چار مہینے گزر گئے تھے کمل بابو مجھ سے سوری سے ملنے کے بعد ہر پندرہ دنوں کے بعد آکر مل جاتے تھے — کبھی کبھی ہفتے میں دو تین مرتبہ بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ یہ ملاقاتیں ان کی سہولیتوں اور گھریلو حالات پر منحصر تھیں۔ میرا اصرار تو ہمیشہ خاموش ہی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زبان سے کبھی نہیں کہا کہ آپ آئیے یا آپ کو فرصت ہے — کبھی کبھی میرے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد کہہ دیتے "اچھا رانی! میں کل بھی آؤنگا" اور ان کے یہ الفاظ سن کر دل مسرت سے جھوم اٹھتا۔ اپنے گھر والوں میں صرف کمل بابو ہی تھے۔ جن سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میری آمد و رفت بھی کہیں نہ تھی۔

[illegible] اور شہر میں ہوتی جاری تھیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ میری [illegible] میں بھی لائے جاتے لیکن کھانا ہمیشہ گھر پر ہی کھاتے [illegible] پاس چھکا یا کرتے کبھی کبھی ہوٹل میں۔ ان کی کمر [illegible] گیا تھا۔ وہ میرے بدن کو ساتھ لیکر آباد کرتی تھی۔ [illegible] کرتے تو وہ سندری کا جواب دیکر ان کی زبان بند کر دیتی۔

[illegible] سی تہذیب اور ذہن سے سخت نفرت ہو چکی کیونکہ [illegible] کو برباد کر دیا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ کمل بابو [illegible] تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ میرے والدین کا گھر تو اُدھر اُدھر بکھر گیا [illegible] تہذیب اور رہن سہن کے نئے طریقوں نے ماں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔

لیکن میری حالت تھی جداگانہ تھی۔ گو مجھے آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے اپنی آزادی کا کبھی بھی غلط استعمال نہیں کیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اگر میں نے ایک مرتبہ بھی خود کو اس سیلاب کے دھارے پر اور رنگینیوں میں کھو دیا تو میرا انجام ونشان بھی تلاش کرنے پر نہ ملیگا۔ میری حالت بھی سندری شرما اور پریا جیسی ہو جائیگی۔ صرف چند سال جسم کی یہ خوبصورتی اور جوانی کارآمد ثابت ہوگی اور اس کے بعد دیوداسی کے کردار جیسی زندگی گزارنی پڑیگی۔

کمل بابو کیساتھ میرے تعلقات دن بدن گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم خود بخود ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھتے جا رہے تھے۔ کاویری مجھ لیکر کئی دن بہت زیادہ جھگڑنے لگی تھی۔ کمل بابو شراب کے تو شروع سے ہی شوقین تھے۔ لیکن اب معمولی جھگڑا ہوتے ہی اُسکی مقدار اور بھی بڑھا دیتے۔ بھیا جی منع کرتے۔ میں منع کرتی لیکن وہ کسی کی بھی نہ سنتے تھے۔ میں جب بہت کہتی تو ہنس کر کہتے "رانی! بھگوان تمہیں ان حالات سے الگ ہی رکھے جس سے گزر رہا ہوں۔"

میں خاموش ہو جاتی۔ زیادہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوتی کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑے تھے۔

لیکن جب کمل بابو آئے تو وہ روز مرہ سے زیادہ شراب پئے ہوئے تھے۔ گھر میں کاویری کا ان سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ آتے ہی بچوں کی طرح زار زار رونے لگے۔ پہلے تو ان کا رونا دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں عورت ہوتے ہوئے بھی رونے کے حق میں نہ تھی۔ اور فضول معمولی بات پر آنسو بہاتی بھی نہیں تھی۔ خواہ میرا دل کتنا بھی رنجیدہ کیوں نہ ہو۔

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس طرح انھیں تسلی دوں۔ بھیا جی گھر پر نہ تھے۔ چاچا جی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اور وہ اسپتال دوا لینے گئی ہوئی تھی دن کا تیسرا پہر تھا۔ بنگلہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور کمل بابو کی آواز ہر لمحہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے پیشتر کبھی کسی مرد کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا "آپ خاموش ہو جائیے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟"

لیکن ان کی آنکھوں کے آنسو اور بھی تیزی سے چل اُٹھے۔

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ تو بتائیے۔"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں دور کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُٹھ کر ان کے قریب صوفے پر جا بیٹھی۔ کمل بابو کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے میرا جی گھبرا اُٹھا۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔

کمل بابو کس قدر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ہر طرح میری امداد اور خبر گیری کرتے ہیں۔ اور آج وہ اس قدر رنج زدہ ہیں۔ ایسی صورت میں مجھے اُن سے بیگانگی نہیں برتنی چاہئے۔

وہ روئے جا رہے تھے۔ جب مجھ اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ آہستہ دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس دن میں نے کسی مرد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا گویا میری زندگی یکبارگی تبدیل ہونے لگی ہے۔ جیسے میں ——— ہوا میں پرواز کر رہی ہوں۔ گو وہ ہاتھ کوئی خوبصورت ہاتھ نہ تھا۔ کھردرا ہاتھ اور درمیان کی دو انگلیوں پر نکوٹین کے داغ پڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی مجھے ایک عجیب خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ان کا رونا کم ہو گیا۔ انھوں نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ وہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی سوتی ساڑی کے پلّے سے اُن کے آنسو پونچھے۔

"آپ کے لئے پانی لے آؤں؟"

"نہیں رانی! تم یہیں بیٹھو۔"

"پانی پینے سے طبیعت سنبھل جائیگی۔"

"نہیں رانی ——— " اور اُن کے آنسو پھر نکل آئے۔

میں نے ان کی آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹائے اپنے دامن سے ان کا منہ پونچھا۔ اس دن زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس دن کاویری کے بارے میں کمل بابو کے خیالات جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ کاویری ہمیشہ شروع سے ہی مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتی آئی تھی۔ اور اب مجھے اس سے انتقام لینے کا موقعہ ملا تھا۔

"آپ رو کیوں رہے تھے؟"

"میں بہت زیادہ دکھی ہوں رانی!"

"کیوں؟"

"کمزوری مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔ گھر میں گھستے ہی کمانے کو دوڑتی ہے"

"کیوں؟"

"اسکا خیال ہے کہ میرا تمہارے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ اور میں اپنی تمام آمدنی تم پر صرف کر رہا ہوں"

انکی بات سنکر میں تھرا گئی۔ لیکن میری تھرتھراہٹ ان آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔

"کیوں، بس ڈر گئیں؟"

"نہیں تو ——— میرا تو خیال ہے کہ اس میں رونے کی تو کوئی وجہ نہیں"

جب رنج و غم برداشت کی حد سے پرے ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان کے پاس رونے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہوتا"

"لیکن اب میں آپ کو ——— ہرگز نہ رونے دونگی"

"کیا تم میری قسمت تبدیل کر دوگی رانی؟"

"ہاں"

"سچ؟"

"یقین کیجئے"

"رانی ——— !" ان کا جسم تھرتھرا اٹھا۔ اور انھوں نے آہستہ سے اپنا سر میرے کندھے پر ڈال دیا۔ میں آہستہ آہستہ انکا سر سہلانے لگی۔

"رانی ——— ! کتنی ممتا ہے تمہارے دل میں"

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"تم دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے"

"ہاں کا دیدی میری بہ نسبت بہت خوبصورت ہے دراصل رانی تو اسی کا نام ہونا چاہیے تھا"

"نہیں، تم واقعی رانی ہو۔ ممتا کی رانی، پیار کی رانی۔ وہ ——— سنگ مرمر کی طرح گوری چٹی ہے۔ اس گورے جسم میں دل نہیں ہے، اور اگر دل ہے بھی تو اس میں دھڑکنیں نہیں، احساس نہیں"

"کیوں؟"

"اس نے تمہیں گھر سے بے گھر کیا۔ اور اس کے باوجود بھی تم سوال کرتی ہو کیوں" دن رات مجھے بھلا برا کہتی رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ماں بیٹی مجھ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

"اُف! آپ نے پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا!"

"میرا خیال تھا کہ یہ سب بتانے سے تم بھی پریشان [illegible] میرے دل میں اپنے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ جاگ [illegible] حد سے زیادہ ہو جاتا تھا تو شراب پینا چاہتا تھا۔ لیکن تمہارے [illegible] تمہارے پاس آکر مجھے سکون ملتا ہے۔ لیکن تم خود ہی تو [illegible] اور ڈالو مجھ سے سراسر زیادتی ہوگی۔ اور میری خود غرضی بھی"

"آپ نے ایسا سوچ کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے آپ صرف تنہائی کیا کرتے ہیں؟"

"نہیں رانی! میں تم سے بخوبی واقف ہوں اور اسی لئے تو تمہیں [illegible] چاہتا تھا کہ ظاہر ہو جانے پر تمہارے سکون میں اور بھی اضافہ ہو جائے"

"تو کیا ہوا، آپ کا جی تو ہلکا ہو جاتا"

"نہیں رانی! میں تمہیں کسی طرح کا آرام نہیں پہنچا سکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہیں کسی طرح کا آرام پہنچانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ ایسی صورت میں تمہیں پریشان کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں"

"اگر آپ خود ہی اپنے حقوق سے ناواقف رہیں اور انھیں نہ سمجھیں تو میرا کیا قصور ہے"

"رانی!"

"جی!"

"جانتی ہو تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو"

بخوبی جانتی ہوں۔ دل کی لگی صرف اپنوں پر ہی ظاہر کیا جا سکتی ہے" بیگانوں سے نہ تو کچھ کہا جا سکتا ہے اور انھیں دوسروں کا دکھ درد سننے کی فرصت ہی ہوتی ہے"

ہم اپنی باتوں میں اسقدر مشغول تھے کہ ہمیں چاندی کی آمد کی قطعی خبر نہ ہوئی کہ وہ ہمارے کمرے میں کس وقت آئی۔

"میں کافی کیلئے پانی رکھ آؤں"

میں جانتی تھی کہ کافی پینے سے شراب کا نشہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی وقت چاندی نے کہا ——— پانی میں رکھ دیتی ہوں بیٹیا! تم ذرا ڈھنگ سے بیٹھو"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جس طرح ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ غلط تھا۔ کمل بابو کا نشہ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ انھوں نے میرے کندھے سے اپنا سر اٹھا لیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

کمرے کی خاموش فضا میں چاندی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

چاندی نے کچھ مٹھائی اور نمکین لاکر چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ پھر کافی کے پیالے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی ——— جانی بابو! رانی بٹیا بڑی بھولی ہے"

کمل بابو نے ہنستے ہوئے کہا ——— ہاں چاندی! رانی کی آنکھیں بھی بہت بھولی ہیں"

[illegible] کہہ کر خوشی ہوئی کہ [illegible] تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ [illegible] تعریف کئے بغیر نہ رہیگا ــــــ کرن [illegible] بدنصیب کوشش کرنا چاہیگا کیونکہ تم اسی [illegible] تم مجھ سے کہو سراسر کرو اس ہے۔

[illegible] اپنی جسمانی خوبصورتی اور خصوصیت کی [illegible] عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی صورت نظر [illegible] کے سامنے اور اپنے ہاتھ سے کمل بابو کی نگاہیں اس وقت بھی میرے [illegible] تھیں۔

مانا [illegible] معلوم نہ تھا کہ کسی عورت کی خوبصورتی کا [illegible] پر قائم رہتی ہے۔ تم سانولی ہونے کے باوجود بھی اس قدر خوبصورت ہو میں حیران ہوں کہ آج تک میری نگاہیں تمہاری خوبصورتی سے بیگانی کیوں رہیں۔ شاید میں نے اس نظریہ سے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں ۔ ۔ ۔ تمہارے [illegible] میری رانی ــــ

بال سنوارتے ہوئے میرے ہاتھ ٹھہر گئے۔ کمل بابو کے لفظوں نے ان کی حرکت چھین لی تھی۔ میری چوٹی میرے ہاتھوں میں رہ گئی۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مرد کی زبان سے اپنے حسن کی تعریف سن رہی تھی۔ اور وہ مرد کوئی دوسرا نہیں ماں کے عزیز ترین بے مثال داماد کمل بابو۔ جن کے نزدیک ایک دن میری کوئی اہمیت نہ تھی۔ میرا کوئی وجود نہ تھا۔ جو ڈھائی سال پیشتر میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ مگر اس وقت میں دیوانی سی ہو جاتی تو دیوانگی کا قصور وار خود کو تصور نہ کرتی۔ نہ جانے کیسا جذبہ میرے دل اور نگاہوں میں جاگ اٹھا تھا۔ میری تشنگی میری پیاس بجھ گئی تھی۔

کمل بابو کا لہجہ حد سنجیدہ تھا۔ ورنہ انہوں نے گزشتہ دو ڈھائی سالوں میں کبھی مجھ سے اس طرح گفتگو نہ کی تھی۔ اور نہ کبھی میں نے ہی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ہم جس طرح بیٹھے ہوئے تھے وہ مناسب طریقہ نہ تھا۔

کمل بابو نہ جانے کس نامعلوم کشش سے کھنچ کر میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ مجھے آج صرف یہی یاد ہے کہ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ اور میری سانس گھٹتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے نکل کر آنسو ان کے کندھے کو تر کر رہے تھے۔ ان کا کانپتا ہوا ہاتھ میری پیٹھ سہلا رہا تھا۔ میری دونوں باہیں نے انہیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

ایسی حالت میں نہ جانے ہم کب تک کھڑے رہتے۔ لیکن اسی وقت

چاندنی نے آ کر کہا ــ "چالاک بابو کا نئی تشتری میں چائے ہے ـــــ اب تو رانی بیٹا جوان ہو گئی ہے۔ کہیں اس کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔"

کمل بابو چاندنی کی بات سن کر ایک دم چپ کر رہ گئے کہ چپ چاپ [illegible] میں اسٹیشن لگے۔ میں [illegible] اور گرم گرم کافی کی طرح میں محسوس کر رہی تھی کیا ہے کسی نے [illegible]۔ لیکن میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ گرفت جائز ہے یا ناجائز ــــ نہ تو میرے پاس اس کا کوئی جواب تھا۔ نہ غور کرنے کا وقت ہی۔

چاندنی نے میرے پاس آتے ہوئے آنسوؤں کو دامن میں چھپاتے ہوئے کہا ــــــ

"بی بی! [illegible] بیٹا! کیا تم روتی ہو؟ کبھی جانی بابو روتے ہیں۔ میں نے تو کبھی تمہیں روتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ پھر آج کیا بات ہے؟"

میں شرم سے پانی پانی ہوتی جا رہی تھی ــــ

چاندنی نے محبت سے ملتے ہوئے کہا۔ "چلو! چل کر ہاتھ منہ دھو لو" ــــ اور میں غسل خانے کو بھاگ گئی ــ

× ×

اس دن کے بعد کمل بابو تین دن تک نہیں آئے۔ ان تین دنوں کی یاد میرے دل پر تا عمر نقش رہیگی۔ آج میں کسی صورت میں بھلا نہ سکونگی۔ میری حالت ایسی ہو گئی تھی گویا کسی نے میرے جسم میں سے جان کھینچ لی ہو۔ تین دن تک متواتر میں انہیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ بار ہا کوششوں کے باوجود بھی میں کسی کام میں دل کو نہ لگا سکی۔ صرف ان کا خیال تھا۔ ان کے دل میں میرے لئے کس قدر محبت اور چاہت جاگ اٹھی تھی۔

"رانی! کتنی محبت اور چاہت تمہارے دل میں ـــــ؟ تم سانولی ہونے کے باوجود بھی کس قدر حسین ہو؟"

اور پھر ان کے بازوؤں کی گرفت اُن کے دل کی تیز دھڑکنیں، سب کچھ یاد آ رہی تھیں۔ میں گویا زمین پر جنت کا احساس کر چکی تھی۔ انہیں تین دنوں میں مجھے ستارہ میں حسن نظر آنے لگا تھا۔ گویا یہ ستارے آنکھیں پینا اور سے رہے تھے۔ ہوا کی خوشخبری سب رہ رہ کر گدگدا جاتی تھیں۔ کبھی میں بیٹھک میں جا بیٹھتی اور پھر آ کر اپنے پلنگ پر لیٹ جاتی۔ نہ جانے مجھ پر کیسا نشہ طاری تھا۔ ان تین دنوں میں کئی بار کھانا بھی نہ کھا سکی تھی۔

میں کمل بابو کی گزشتہ زندگی سے بخوبی واقف تھی۔ میں جانتی تھی کہ انہوں نے پہلا گھر ہوسٹل میں رکھا تھا۔ ستندر کو کرایہ پر فلیٹ لیکر دیا تھا۔ سلوچنا دیوی کی نند شماوتی سے ملنے وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ میری بڑی بہن کے شوہر تھے۔ ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود بھی میں اپنے دل پر قابو نہ پا رہی تھی۔ وہ بار بار انہیں کے تصور میں کھو جاتا تھا۔ بے شمار رنج و غم برداشت کرنے کے بعد گویا میں اس نئے درد کو اپنا چکی تھی ــ

دل نے کہا "سانی! خیال کرو کہ تم دونوں میں کتنا فرق ہے؟" لیکن یہ بات تسلیم کرنا بھی مشکل نظر آرہا تھا۔ وہ جیسے بھی ہوں پھر بھی میرے دل میں ان کے لئے عزت اور محبت تھی۔

اپنے دل سے بحث کرتے ہوئے میں نے کہا "تو نے آج سے پیشتر کسی مرد کو دیکھا ہی نہیں اسی لئے تو ایسا کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مرد دیکھا ہو تو ممکن ہے کمل بابو تجھے پسند نہ آتے" میں خود بخود اپنے دل کو برا بھلا کہتی رہی۔

زندگی کی چھوٹی چھوٹی ... انگڑائی لیکر جاگ اٹھیں۔ ... دھیریندر کو دیکھا تھا اور قریب سے دیکھا۔ ... ڈاکٹر اندر دھنش کو بخوبی پہچانا تھا۔ سبرت مجمدار کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ اور ان کے علاوہ کمل بابو کے دوست راکیش، ستیش وغیرہ کو بھی دیکھا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کی گہرائیوں کو چھو نہ سکا تھا اور نہ میرا دل ہی ان کے قریب پہنچ سکا تھا۔ کمل بابو نے گویا میرے جذبات کو پر لگا دیئے تھے۔ دل کی خاموش گہرائیاں کسی انجان نغمے سے گونج اٹھی تھیں۔ جن آنکھوں میں ناامیدیوں کی چاندنی رات بکھر کر رہ جاتی تھی ان میں سہانے حسین اور مدہوش خواب جھوم اٹھے تھے۔ میری نگاہوں میں کمل بابو کی پہلی ملاقات سے لیکر آج تک کی دھندلی یادیں تازہ ہو کر رقصاں ہو اٹھی تھیں۔

... دیدی کے ساتھ چپ چاپ شادی کے بعد پہلی مرتبہ لکھنؤ گئے تھے تو سندری کو پوچھا تھا۔ اور انکی اس بے رخی نے میرا دل پاش پاش کر دیا تھا۔ ...

... بی اے کا نتیجہ نکلنے پر مجھے مبارک باد بھی نہ دی تھی۔ اور انکی خاموشی نے میری خوشی کو آدھا کر دیا تھا۔ ...

میرے دہلی آجانے پر بھی وہ سندری کیلئے دلوانے تھے۔ انکی بے رخی کی وجہ سے میں اپنی تعلیم بھی ٹھیک طرح سے پوری نہ کر سکی تھی۔ اور ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے بجائے اس مرتبہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ کمل بابو کہتے تھے کہ انھوں نے زبردست گناہ کیا ہے شاید اسکا مطلب ...۔ لیکن میں نادان تھی۔ شروع سے ہی انکی بے رخی کے باوجود بھی انکی پرستش کرتی آرہی تھی۔ جس کا احساس مجھے نہ تھا۔

دل نے کہا "یہ سب گزشتہ دو سالوں کی ملاقاتوں کا انجام ہے"

تین دن تک میری حالت دیوانہ وار رہی۔ چاندی پوچھ پوچھ کر تھک گئی کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے؟ لیکن میں اسے بتاتی بھی کیا؟ اور اگر کچھ بتاتی بھی تو اسے سنکر چاندی کیا خیال کرتی۔

اُف! کیا کمل بابو کو محبت کرنا گناہ ہے؟ وہ بھی تو مجھے چاہتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اور اگر میرے لئے ان کے دل میں محبت نہیں بھی ہے تو صحیح ہی کیا ہے میں تو انھیں چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی محبت سے واسطہ ہے۔ ... لیکن وہ آئے کیوں نہیں؟

ذرا سی آہٹ سنائی دیتی تو دل کہہ اٹھتا "شاید وہ آگئے ہیں" ... لیکن کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انکا سایہ بھی نظر نہ آتا تو دل ناامیدیوں سے کراہ اٹھتا۔

پورے تین دن ... بجلی کی طرح چلتی ... آخر ... بیٹھی ہوئی تھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھ سکی ...

وہ مجھے ٹکٹکی باندھے بغور دیکھ رہے تھے۔

میں نے چھپی چھپی نظروں سے انکی طرف دیکھا۔ وہ کسی فکر اور پریشانی میں مبتلا نظر آرہے تھے۔

میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ کسی طرح ... میں نے سوال کیا "بہت متفکر نظر آرہے ہیں آپ؟"

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرا تو خیال تھا کہ تم گزشتہ تین دن تک نہ آنے کی وجہ دریافت کروگی"

انھوں نے ذرا سا ... کی طرف ...

"تم اتنی خفا کیوں ہو رانی؟"

ان کے اس عجیب و غریب سوال کا جواب میں نہ دے سکی۔

انھوں نے اپنے ہاتھوں سے میرا چہرا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "... کیا ان گزشتہ تین دنوں میں تم نے مجھے کبھی یاد کیا تھا؟"

میں کسی طرح سر ہلا کر صرف "ہاں" کہہ سکی۔

"تم ان دنوں سکول بھی نہیں گئیں۔ میں نے پرسوں بھی فون کیا تھا اور کل بھی"

"دل نہیں چاہتا جانے کو"

"کیوں؟"

"میں کیا جانوں"

"کیا کرتی رہیں؟"

"بیٹھی رہی ... لیٹی رہی ... خیالوں میں ڈوبی رہی"

"بس؟"

"جی!"

"یاد تو نہیں کیا؟"

خاموش ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل اٹھی۔ وہ کس چالاکی سے میرے دل کا راز جاننا چاہتے تھے۔

"رانی! جانتی ہو میں شرابی ہوں؟"

"جی ہاں"

"بہت برا ہوں"

"میں کیسے کہوں پاپا کہ نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ تمام دنیا سے اچھے ہیں۔"
"سنو شہزادی! تم کبھی کسی اور کی لڑکی سے بھی میرے تعلقات سمجھتی ہو؟"
"میں جانتی ہوں۔"
"پھر... پھر...؟"
"میں کہہ رہا ہوں..." انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں راحت محسوس کر رہی تھی۔
"رانی!"
میری سانس گھٹ رہی تھی۔ کوشش کرنے پر بھی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔
"رانی! میں تمہارے ان پاکیزہ جذبات کے قطعی قابل نہیں ہوں۔ جانتی ہو میں نے تمہاری ماں کے خوابیدہ جذبات میں طوفان جگا دئے ہیں۔ مگر عمر میں وہ مجھ سے عمر اور ... میں بڑی ہیں۔ لیکن بنیادی رشتے کی نظر سے وہ میری ماں کے برابر ہیں۔ میں نے انھیں پیسے والوں کی دنیا دکھائی۔ اب وہ موجودہ سوسائٹی کے رنگ میں اس قدر رنگی جا چکی ہیں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ غیر ممالک جا رہی ہیں۔ میں دونوں لڑکوں کا دیری اسراف کیلئے ہوائی جہاز میں سیٹیں بک کرا کر آ رہا ہوں۔"
"آپ بھی ـــــ؟"
انھوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں رانی! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے گذشتہ اڑتالیس گھنٹوں میں بہت کچھ غور کیا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں ان کے ساتھ نہ جا سکوں گا۔"
"آپ صرف میرے لئے ہی یہاں رک رہے ہیں؟"
"کیا تمہیں یہ وہم معمولی نظر آ رہی ہے؟"
میں جواب نہ دے سکی۔ وہ خود ہی کہتے چلے گئے۔ "آج تک کسی نے بھی میری لاتعلق محبت نہیں کی۔ سب کی محبت میری دولت سے تھی۔ رانی! میں جانتا ہوں، تم کس طرح اپنا خرچ چلاتی رہی ہو۔ تم نے کبھی مجھ سے پیسے کا سوال نہیں کیا۔ میں تمہاری روزمرہ کی زندگی میں تیزی سے ہوتی ہوئی تبدیلیوں کو غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ آج سے چھ مہینے پیشتر جب تم دونوں کے لئے کھانا بھی نہیں جٹا پاتی تھیں تو میرے بار بار دریافت کرنے پر تم نے کہا تھا کہ چاندی اب کافی بوڑھی ہو گئی ہے۔ اب میں اسے اور زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ وہ ایک ہی وقت کھانا بنا لیتی ہے۔ ہم دونوں وقت اسی سے گزارا کرتی ہیں۔ میں نے راشن بھجوایا تو تم نے دوسرے مہینے ہی راشن والے کو منع کر دیا کہ ابھی تو پچھلے مہینے کا راشن ہی رکھا ہوا ہے۔ یاد ہے، جب سردیوں میں تم بیمار تھیں اور تمہاری دوا چاندی خیراتی اسپتال سے لایا کرتی تھی۔ تمہاری بیماری کے ایک ہفتہ بعد مجھے خیراتی اسپتال سے دوا لاتی ہوئی چاندی مل گئی۔ میں اسے موٹر میں اپنے ساتھ لیکر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر وقت پر تمہارا علاج نہ ہوتا تو تمہیں ڈبل نمونیا ہو جاتا ـــ۔ اور اس دن میں نے تمہارے روحانی جلال اور طاقت کو سمجھا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ تمہاری ماں اور بہن کی طرح تمہیں پیسے کی طاقت سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ باتیں کر رہے تھے اور ان کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔
"وہ کب جا رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"ایک مہینے بعد۔"
"کیا ماں کچھ جلدی میں ہیں؟"
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"انگلستان سے کرپا جی خود انھیں ملاقات کرنے دہلی آئیں گے۔"
"پتا جی کو لکھ دیا ہے؟"
"نہیں جب تک سیٹیں بک نہ ہو جاتیں لکھنا بیکار تھا۔"
"ماں ایسی صورت میں باہر جا کر کیا کریں گی؟"
"اپنے داماد کے پیسے کو پر لگائیں گی۔"
"تین چار آدمیوں کے جانے میں خرچ تو کافی ہوگا؟"
"ہاں، تم کیوں فکر کرتی ہو۔ کسی طرح پورا ہو ہی جائے گا۔ میری بھی خواہش ہے دور کر دہ جائیں۔ مجھے بھی کچھ راحت حاصل ہوگی۔"
چند لمحات خاموش رہنے کے بعد انھوں نے سوال کیا۔ "رانی! تم اپنے تئیں صرف میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو؟"
"نہیں تو۔"
"تمہاری گفتگو میں اب وہ آزادانہ رنگ نہیں ہے۔"
میں کس طرح کہتی کہ آپ کی محبت نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ میری زندگی بدل ڈالی ہے ـــ
"تم ماں سے ملنے نہ جاؤ گی؟"
"کیا وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟"
"نہیں۔"
"میرے خیال میں تو انھیں میری صورت سے بھی نفرت ہے۔ چاندی کا کہنا ہے کہ انھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے اپنا دودھ بھی نہیں پلایا۔ کیونکہ میں کالی تھی۔ اور انھوں نے میری پیدائش کے بعد مجھے چاندی کے حوالے کر دیا تھا۔"
"بہت اچھا ہوا رانی! ورنہ تمہارے خون میں بھی وہی عادتیں پرورش پاتیں

نگاہ اس بچے نے بڑی حیرت میں ڈال دیا میں تعجب سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

بولے تعجب سے میری طرف کیوں دیکھ رہی ہو رانی! ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔

[illegible] باتیں بیچ کر کہاں سے لے آئی ہو رانی؟"

"اس لئے کہ آپ انھیں ہی قصوروار کیوں کہتے ہیں۔ تقریباً سبھی ایسے ہوتے ہیں؟"

"مجھے تعجب ہے کہ تمھیں اُن لوگوں سے سب فرق کیا، لیکن پھر بھی تم انہیں کی طرف داری کرتی ہو عجیب بات ہے؟"

دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ آپ نے بھی تو ایک مدت تک میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آپ کی بے رخی بھی میں نے برداشت کی ہے۔ پھر اتنی یہ تبدیلی کیوں؟

اُس دن کافی رات تک وہ میرے پاس ہی رہے۔ میں کھانا پکاتی رہی اور وہ میرے قریب بیٹھے رہے۔ انھوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

× × ×

کادیری نے دوسرے ملکوں کے شہروں میں اپنے نام کافی روپیہ جمع کر لیا تھا۔ اور جب کافی روپیہ جمع ہو گیا تو اُسے کمل بابو کے وجود سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ کمل بابو اب گھر جانے سے بھی گھبرانے لگے تھے۔ پہلے تو جھگڑا صرف زبان تک ہی محدود رہتا تھا۔ لیکن اب ہاتھا پائی بھی شروع ہو گئی تھی۔ دولت کے نشے میں چُور کادیری اکثر بازاروں میں گھومتی رہتیں۔ اپنے ساتھ لے جانے کیلئے سامان پیک کرتی رہتیں۔ کمل بابو میں ان کی دلچسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔

پتاجی گھر سے دلی نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ماں کو طلاق دے کر دوسرے ملکوں میں جانا قطعی نامناسب ہے۔ خط پڑھ کر ماں پر کوئی اثر نہ ہوا انہوں نے مسکراتے ہوئے وہ خط کمل بابو کو دے دیا۔ تاکہ وہ بھی جان جائیں کہ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کے آخری دور سے گزر رہے ہیں۔ ورنہ یہ سب کہنے کی کوئی تُک نہ تھی۔ ماں کوئی غیر تو نہیں، بلکہ اپنے جگر کا ٹکڑا اپنی بیٹی ہے وہ بھلا کس طرح غیر ہو سکتا ہے؟ کمل بابو نے بتایا کہ ماں نے کئی ایک ایسی مثالیں پیش کی تھیں جن میں والد نے سسر کو مکان بنوا کر دیا تھا۔ یا اُن کے چھوٹے بچوں کی پرورش کی تھی۔ اپنے تمام سب روپیے کے حق میں انھوں نے کئی ایک مثالیں دی تھیں۔

یہ جان کر کہ وہ اصل کمل بابو کے ساتھ نہیں جا رہے وہ خوشی میں دیوانی ہو اٹھی تھی۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ جب اس کے ہاتھ میں کمل بابو نے دیئے تو اُسے بالکل یقین ہو گیا۔ ماں نے کادیری کو خبر کیا کہ کمل بابو کا ہمارے ساتھ نہ جانا مناسب ہے؟ ماں کے کہنے پر کادیری نے کمل بابو کے ساتھ چھوٹی سی جنگ کر ڈالی جب کمل بابو نے کچھ کہا تو غصے کے مارے گلدان اُن کے سر پہ دے مارا۔ بلوری سر سے ٹکرا کے نیچے گر گئی اور ٹوٹ گئی۔ کادیری کو سخت افسوس اور ناامیدی ہوئی کہ اُس کا وار خالی

گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ بہت خون بہے گی۔ پھر تو [illegible]

اور وہ چونکہ کافی نا تجربہ کی طرح پھنکار اُٹھی لیکن کمل بابو جو [illegible]

اسکے بعد بہت سے عجیب و غریب واقعات ہوئے کادیری [illegible]

میرے ساتھ شروع سے ہی محبت نہ تھی۔ اُس نے مجھے ہمیشہ [illegible] نظر سے دیکھا۔ لیکن میں جب کبھی اُس کی کارگزاریاں سنتی تو میرا دل افسوس سے [illegible] سے بھر اُٹھتا۔ کاش! کادیری کے کارنامے عظمت پیشہ [illegible] میں چھپا لیا ہوتا۔ میں نے سنا تھا کہ میری نانی بھی جوان تھیں۔ انکی اس [illegible] اکثر یاں کیا کرتی تھیں۔ لیکن وہ اپنی اس شاندار عادت کے ساتھ [illegible] حسین تھی۔ اور اسلئے اُنکی یہ عادت قابلِ اعتراض نہ تھی [illegible] عادت کا اثر کہیں ہم دونوں بہنوں پر نہ پڑ جائے ہم دونوں بہنوں کو کمل بابو سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ کادیری کو روپے سے بے حد دلچسپی تھی۔

لیکن کمل بابو نے اگر بتایا کہ کادیری نے ایک کپڑے والے سے جس کی دکان میں کمل بابو بھی حصہ دار تھے، کچھ روپیہ مانگا۔ اُسی دن وہ مجھے بہت اصرار کے ساتھ اپنی پسند کی ایک ساڑی دلوانے بازار لے گئے۔ اُس دن میری سالگرہ تھی۔ شادی کے بعد تین سال تک کادیری نے میری سالگرہ پر مجھے تحفے بھیجے تھے۔ لیکن اس نے کمل بابو کو [illegible]

میں اس واقعے کے بعد پہلی مرتبہ انکے ساتھ گھر سے باہر نکلی تھی۔ میں اپنے دل کی خوشی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ایک مدت سے میں اس دھوپ کی منتظر تھی۔ جس وقت میں موٹر میں ان کے ساتھ بیٹھی تو میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھی کہ مجھے خود کا بھی ہوش نہ تھا۔

میرے دل میں گویا خوشی کی گرہیں خود بخود کھل رہی تھیں، الگ رہی تھیں۔

میں ساڑی نہ لینے کے بہانے کر رہی تھی۔ لیکن جب کمل بابو نے اپنی پسند کی ساڑی کی طرف اشارہ کیا تو مجھے بخش دیا۔ ساڑی کی قیمت ادا کرنے کیلئے جب ہم کاؤنٹر پر پہنچے تو دکاندار نے کمل بابو سے تنہائی میں کچھ کہنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں کادیری کے ساتھ کئی مرتبہ اس دوکان پر جا چکی تھی۔ دکاندار مجھ سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن اُس وقت اس کے چہرے پر نمودار نفرت اور حیرت کے ملے جلے آثار ظاہر کر رہے تھے کہ کمل بابو کے ساتھ میری آمد پر اسے سخت اعتراض ہے۔ میری عادت تھی کہ وہ سب کے جذبات جو اس کی صورت سے نمایاں ہو رہے تھے، میرے لئے جتنا بھی بہت تکلیف دہ تھے۔

تنہائی میں اس نے کمل بابو کو بتایا کہ کادیری نے اس سے چار ہزار روپے ادھار مانگے تھے۔ اس کے پاس اس وقت صرف تین ہزار تھے۔ وہ اس نے کادیری کو دیے اور دو تین جگہ اپنے رجسٹر میں اسکے دستخط کرا لئے۔

کمل بابو کا چہرہ اتر گیا۔ کادیری اس قدر کمینی حرکت بھی کر سکتی ہے اُن کا

[illegible] انھوں نے اسی وقت چیک بک نکال کر اس لڑکی
[illegible] جو بہت دستخط کر دیا تھا [illegible]
[illegible] اُن میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی [illegible]
[illegible] لیکن اس شام انھوں نے شراب نہیں پی۔
[illegible] تم کہاں [illegible] آج تمھاری سالگرہ ہے میں
[illegible] شراب نہیں پیونگا۔

"اتنی [illegible] نہ کہہ ڈالئے" میں نے کہا۔

"[illegible] رانی! جب میں تمھارے ساتھ ہوتا ہوں تو مجھے کبھی [illegible] نہیں چاہئے۔"

"سچ!"

"ہاں رانی!"

"تب میں اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔"

رانی! میرا تو خیال ہے کہ مجھ جیسے شرابی شراب پینا ترک کر سکتے ہیں اگر ان کی زندگی کی کوئی زبردست خامی پوری ہو جائے۔ میں خود بھی اس بات کی مثال ہوں میں اپنی زندگی میں شروع سے ہی محبت کی پیاس محسوس کرتا رہتا۔ ان کو میرے بجائے روپے اور سونے سے محبت تھی۔ میں کم سن تھا۔ میری پرورش اور تعلیم کا وقت آنے تک پاپا اچھے خاصے سرمایہ دار ہو گئے تھے۔ دولت کی گھر میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں ان کو روپیہ اور سونا رکھتے نکالتے ہوئے دیکھتا۔ مجھے دولت سے سخت نفرت ہو گئی۔ میں [illegible] دولت [illegible] آ رہا۔ لیکن میری نہ بجھنے والی پیاس نہ بجھتی تھی نہ بجھی [illegible] کہ میں جو کچھ پانا چاہتا ہوں وہ نہیں مل پاتا۔ خوبصورت لڑکی دیکھ کر میں نے شادی کی۔ اُسے خوش رکھنے کیلئے بے شمار روپیہ صرف کیا۔ لیکن پیاس پھر بھی نہ بجھ سکی۔ سچے دل پیار کیلئے تو دوست پالے۔۔۔ جو کہ نہیں رانی! دولت مند شخص یا سی ہے دوست پالتے ہیں کہ وہ پالتو کتوں کی طرح ان کے اشارے پر دُم ہلاتے رہیں۔ ہر وقت خوشامد کرتے رہیں۔ لیکن دوستوں سے بھی سکون نہ پا سکا۔ پہلے تو صرف کبھی کبھی شوقیا شراب پیتا تھا۔ پھر غم کو بھلانے کیلئے پینے لگا۔ میں جانتا ہوں کہ خود سے بھاگنے کیلئے صرف بزدل انسان ہی شراب کا سہارا لیتا ہے۔ زندگی کے تلخ [illegible] حقیقت کا مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں اسی لئے پیتا تھا۔ لیکن اب جس وقت تمھارے پاس ہوتا ہوں تو شراب کا خیال تک نہیں آتا۔"

میں نے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان میں مجھے خوبصورتی کا دیدار ہوا۔ اپنے محبوب کی معنوی خوبصورتی بھی نہ جانے کیوں دلکش اور دل فریب نظر آتی ہے۔ یہ میں نے اسی شام محسوس کیا۔ جب انھوں نے اپنی سب سے بڑی کمزوری سے نجات پانے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے دل میں ان کے [illegible] بھر آیا۔ میں شراب کو بُرا سمجھتی تھی لیکن انھیں بے حد پسند اور عزیز تھی۔ اور آج اُنھوں نے میری وجہ سے ترک کرنے کا عہد کر رہے ہیں۔ اس بات سے میرے دل کی گہرائیوں کو چھو لیا۔ میں نے عاجزی سے کہا آپ [illegible] کہ آپ آئندہ پینے کی کوشش نہ کریں۔"

"نہیں رانی! تمہارے لئے میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اپنے دل کی خلش مٹا رہا ہوں۔ تم نے میرے دل کو [illegible] ہو کہ کس وقت محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر مرد عورت سے اور چاہتا ہی کیا ہے؟ محبت ایک [illegible] خلوص جذبہ جس کا جسم سے قطعی تعلق نہیں [illegible] حدود میں باندھا نہیں جا سکتا۔ مرد کا دل اپنے [illegible] دوسرے دل کی تلاش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ مل جائے تو اُسے زندگی مل جاتی ہے۔ ورنہ ہمارے سماج میں اتنی بے معنی شادیاں عشق فیشن کے نام پر یا کسی دوسرے خوبصورت نام کا واسطہ دیکر نبھائی جاتی ہیں"

میرا دل کھو گیا تھا [illegible] تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ جو کچھ بھی میرے آس پاس ہے تو کن بابو کا حصہ ہے۔ لیکن جس پر میرا حق تھا وہ کہاں گم ہو گیا؟ کیا دل کی اسی حالت اور اسی جذبے کو محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے؟

کل بابو شراب نہ پینے کا عہد کر کے چلے گئے۔ دوسرے روز [illegible] تیسرا دن بھی گزر جانے پر میں نے سوچا ممکن ہے کاروباری الجھنوں کی وجہ سے مصروف ہوں [illegible] کے شکوک جاگ اُٹھتے تھے۔ میں نے چاندی سے ان کے گھر جا کر انہیں دیکھنے کیلئے کہا تو وہ [illegible] بار بار اصرار کرنے پر کہنے لگی [illegible] تم دیوانی ہو گئی ہو [illegible] تم سے دل بہلاؤ کرتے ہیں تو تمھارا دل [illegible] میں ہرگز نہیں جاؤنگی۔ تم خود جا کر ان کی خبر لے آؤ۔ ماں اور بہن سے بھی ملاقات ہو جائے گی [illegible] برداشت کر سکے۔

وہ چار دن کس طرح خیالات اور شکوک کی [illegible] میں ڈوبتے اُبھرتے گزر [illegible] ہسپتال سے ایک شخص نے اطلاع دی کہ کل بابو نے مجھے بلایا ہے اور وہ بہت زخمی ہوئے ہیں چوبیس گھنٹے انھیں ہوش نہیں آیا۔ پھر انھیں آرام پہنچانے کیلئے کچھ ایسی دوائیں دی گئی تھیں کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ اب وہ اس حالت میں تھے کہ کچھ منٹ بات چیت کر سکیں۔

میرے دریافت کرنے پر کہ وہ زخمی کس طرح ہوئے ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ شاید خود ہی آپ کو بتانا چاہیں گے کہ وہ کس طرح زخمی ہوئے۔

میری جو حالت اس خبر کو سننے کے بعد ہوئی اُسکی [illegible] یاد نہیں۔ میں نے محسوس کیا گویا میں جیتے جی ہی مر گئی ہوں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں ہسپتال کس طرح پہنچی تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب میں وہاں پہنچی تو پتہ چلا کہ میں نے جوتا نہیں پہنا تھا۔ ننگے پاؤں ہی چلی گئی تھی۔

میری آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اس وقت ہوش میں تھے۔ انھوں نے مجھے تسلی دی۔ نہایت آہستہ اور سنجیدہ انداز میں انھوں نے کہا تھا۔

راتوں کو بھی مروڑ تانہیں۔ تم کیوں رو رہے ہو۔ کاویری آزاد ہونا چاہتی تھی۔ وہ میری طرح خوش قسمت ہے۔ آزاد ہے۔ ملک جانے سے پیشتر میں نے نرگس کو بلوا کر اپنا بیان دے دیا تھا۔ جہاز میں سوار ہونے سے پیشتر وہ یہاں آئی تھی جن ملازموں کی موجودگی میں اس نے مجھ سے ان ملا تھا۔ وہ بھی آئے تھے۔ اسے اب میری ضرورت نہیں۔ ماں تیرے پاس اب اتنا پیسہ ہے کہ وہ سال دو سال تک آرام سے گزارہ کر سکتی ہیں۔

روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ دلاسا دینے لگے۔ وہ رات بھر معمول دو رات میں پرانی پلنگ کے پاس بیٹھی رہی۔ کاویری نے گوان کیوں مارا تھا یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں ہی رہی۔ میں نے ان کی حالت دیکھ کر پتا جی کو کر دینا تھا وہ سامنے ہی دہلی آگئے تھے۔ چار سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی اس دوران بہت سے واقعات گزر رہے تھے۔ پتا جی مجھے اپنے سینے سے لگا کر بے ساختہ رو پڑے تھے۔ لیکن انھیں ان کے بدیس جانے اور کاویری کو ساتھ لے جانے کا کوئی علم نہ تھا

کل بابو کی صحت کچھ درست ہونے پر پتا جی نے اُن سے اصرار کیا کہ بتائیں کہ کاویری نے گوان کیوں مارا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جب کپڑے والے نے انھیں کاویری کی قرض لینے والی بات بتائی تو دوسرے دن وہ بینک میں زیورات دیکھنے گئے۔ تمام زیور بھی نادارد تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کاویری کے دل میں کوئی راز ہے کیونکہ اس کی ضرورتوں کیلئے تو انھوں نے تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ پھر چوری چوری روپیہ جمع کیوں کر رہی تھی مگر پیچھے ہی انھیں اپنی میز کے ساتھ دھیریندر کا خط ملا جو اس نے جہاز پر سے لکھا تھا۔ کاویری نے ہی دھیریندر کو روپیہ دیا ہوگا ورنہ وہ پیسے پیسے کا محتاج بدیس کس طرح جاتا۔ کارڈ میں دھیریندر خیریت لکھنے کے ساتھ کاویری کو یاد دلایا تھا کہ وہ بیتاب نہ ہووے۔ [illegible] آتے رہیں سے وہ جلد کہیں [illegible] بلا لیگا۔

کل بابو نے بتایا کہ انھیں غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اسے کسی طرح ضبط کر گئے۔ کاویری سے انھوں نے صرف یہی کہا کہ دھیریندر مکار ہے۔ اس کاویری کو اس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہئے۔ یہ سن کر کاویری نے کل بابو کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ کل بابو نے آخر میں اس سے کہا تھا کاویری! اگر تمھارے دل میں اپنی آئندہ زندگی کا کوئی منصوبہ بند ہو تو بتا کر جانا۔

کاویری کی میز کے پاس کرسی تھی۔ اس پر ایک نرم بھور دان رکھا ہوا تھا۔ وہی اس نے کل بابو کے سر پر دے مارا۔ گھر کا پرانا نوکر قریب ہی پردے کی آڑ میں ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے کل بابو کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ورنہ شاید وہ اور بھی زیادہ زخمی ہو جاتے۔

پتا جی کاویری کے کارنامے پر سخت پشیمان تھے۔ نادم تھے۔ لیکن کیا کرتے۔ لکھنؤ روانہ ہونے سے پیشتر وہ ندرت ایوینیو آئے اور لکھنؤ کے مکان کی وصیت میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے۔ ماتی! تمھاری ماں کی فضول خرچی نے اور تو کوئی پونجی میرے پاس رہنے نہیں دی۔ میری پنشن میں تین مہینے اور باقی ہیں۔ میں اب اس مکان کی [illegible] ہردوار اپنے سوامی جی کے آشرم میں چلا جاؤں گا۔ بیٹا! اپنے بوڑھے باپ کو معاف کر دینا کہ وہ تمہارے لئے کچھ کرنے میں خود کو مجبور پا رہا ہے۔

پتا جی بھی روئے، میں بھی روئی۔ لگتا تھا جیسے [illegible] ہر احساس لکھنؤ سے دہلی آتے وقت ہوا تھا لیکن کل بابو سے جب کچھ باتیں ہوئیں تو نئی تسلی اور نئی امیدیں دیتے ہوئے کہنے لگے۔ رانی! میں نے تمھارے ساتھ ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھا ہے۔ مجھے پوری طرح تندرست ہو جانے دو۔ میں ان گنت گھڑیوں کا قرضہ چکاؤں گا جن میں تم نے میری بیماری اور دکھ برداشت کئے ہیں۔

میں۔۔۔ میں سوچتی کہ میں اتنی خوش نصیب کہاں ہوں۔

× × ×

اب ہم لوگ لکھنؤ کے اُس چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ کل کسی ضروری کام سے لکھنؤ گئے ہیں۔ مجھے پھر اُس حماقت اور دکھ کی یاد آ رہی ہے جو میں نے بچپن میں برداشت کیا ہے۔ میں تنہا ہوں۔ آنکھیں مجھے کاویری کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ کہیں ماں کا کہنا یہ تو کافی ہے۔

چاندنی اب کافی بوڑھی ہو گئی ہے۔ وہ صرف چارپائی پر بیٹھ کر رام رام جپتی ہے اس سے گفتگو کر کے دل نہیں بہلایا جا سکتا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ گویا یہ سب خاموش دیواریں ملکر میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ کل ایک ہفتہ کیلئے گئے ہیں۔ گزشتہ ایک سال سے ہم دونوں ایک دن کیلئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ پہلی بار از حد کام سے گئے ہیں۔

تنہائی کے سکوت سے نجات پانے کیلئے میں کوئی ذریعہ تلاش کر رہی تھی کہ پتا جی کا خط مجھے ملا۔ ماں نے انھیں لکھا تھا کہ وہ طلاق چاہتی ہیں۔ کیونکہ انھیں وہاں کوئی دولت مند شخص مل گیا تھا جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ پتا جی نے لکھا تھا کہ انھوں نے ماں کو آزاد کر دیا ہے۔

کاویری تو اسی ارادے سے ملک سے باہر گئی تھی کہ ماں بھی؟

پتا جی کے خط کو پڑھنے والے کے خاموش تار دل میں پھر وہی سوئی ہوئی یادیں بیدار ہوا تھیں۔ اپنی روحانی جدوجہد میں یہ داستان لکھنے پر مجبور ہو گئی۔ میں داستان لکھتی رہی۔ ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ بس کل صبح وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کا تار آ گیا ہے۔

میں آنیوالی صبح کے انتظار میں ہوں۔

شری پات شیورام آپا چوگلے

شری پات شیورام آپا چوگلے ۱۸ مئی ۱۹۰۸ء میں اچل کرنجی ضلع کولہاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم سانگلی، پونا اور بمبئی میں ہوئی تھی۔ ایک سال تک انھوں نے ایڈنبرا میں رہ کر بھی مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ مختلف تعلیمی اداروں کے صدر رہے اور اب کستوربا تیجپز کالج سانگلی کے پرنسپل ہیں۔

ان کی واحد تصنیف "پاٹلاچی پور" (زمیندار کی بیٹی) مراٹھی زبان میں بہت مشہور ہے۔ اور جس طرح اردو میں پطرس بہت ہی قلیل ادبی سرمایہ کے باوجود مقبول اور مشہور ہوئے اسی طرح چوگلے بھی صرف اسی ناول کی بدولت مراٹھی ادیبوں کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔

اس ناول میں انھوں نے دیہی ماحول کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی غلاظت، جہالت، ان کا بھولا پن اور سادگی کی عکاسی میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اس ناول کا ہیرو دیال ایک اچھوت خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنی محنت و جانفشانی کی بدولت وہ مناسب تعلیم حاصل کرکے گاؤں کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنایا جاتا ہے اور وہاں اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دیتا ہے اسی کا حصہ ہے۔ ہیروئن کنول جو ایک زمیندار کی بیٹی ہے اور مذہب کے لحاظ سے جینی ہے اپنی تمام تنگ نظری ترک کر کے زندگی کا صحیح نصب العین طے کرتی ہے۔ اور اپنی تعلیم اور تجربہ سے گاؤں کے ان پڑھ لوگوں کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اٹھاتی ہے۔ اور اپنی تمام زندگی اسی خدمت کے لئے وقف کردیتی ہے۔ یہ ہے ناول کا روشن پہلو لیکن گاؤں میں برائیاں بھی ہوتی ہیں۔ بھولے اور سیدھے دیہاتیوں کو لوٹنے کھسوٹنے والا گروہ پنت اور اس کے ساتھی بھی اس ناول کے کردار ہیں جنھوں نے اپنی ذلیل حرکتوں سے گاؤں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔ لیکن مصنف نے ان متضاد کرداروں کو پیش کرکے ان کی کشمکش دکھا کر باطل پر حق کی فتح دکھائی ہے۔

یہ ناول مراٹھی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔



شری پاٹ شیورایا چوگلے
مترجم:۔ نور نبی عباسی

زمیندار کی بیٹی

پوں ... پوں ... پوں

دور سے موٹر کی آواز آئی۔ اسے سنتے ہی مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ سبھی لوگ فرطِ خوشی سے چلا پڑے "آگئے۔ آگئے!"

ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ سامنے کی قطاروں میں بیٹھے ہوئے بچے اٹھ پڑے۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی خواتین بھی اپنے ننھے منے بچوں کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سب کی نظریں دور سے آتی ہوئی موٹر پر جم گئیں۔ اسی وقت ایک شخص نے باآوازِ بلند ایک نعرہ لگایا اور سب لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

"جٹا شنکر مہاراج کی ....."

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی ....."

"جے!"

"جٹا شنکر مہاراج کی ....."

"جے!"

مگر لوگوں کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ موٹر جب قریب آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر نہیں ہے۔ بلکہ سانگلی جانے والا مال کا ایک ٹرک ہے۔ تب تو سبھی ہنس پڑے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے۔ کسی قدر خاموشی ہونے کے بعد بچوں کے کھیل کود اور موسیقی کا پروگرام دوبارہ شروع ہو گیا۔ جس سے کہ مہرشی جٹا شنکر کے آنے تک جلسہ میں مجمع لوگوں کی تفریح ہوتی رہے۔

عوام اپنی تفریح میں محو تھے۔ مہرشی ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں۔ تب تک چلئے میں اپنے قصبہ سے آپ کو متعارف کروا دوں۔

یہ دھرم پور ہے، میرا گاؤں ہے۔ پارس کے چھونے سے تو صرف لوہا ہی سونا ہوتا ہے، مگر لفظ "میرا" جس چیز کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے وہ سونے سے بھی زیادہ خوبصورت اور قیمتی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لوگ جس بچہ کو کالا کلوٹا اور گندہ سمجھنے لگتے ہیں وہی بچہ اپنی ماں کو پھول ایسا خوبصورت نظر آتا ہے اور وہ اسے "میرا بیٹا" کہہ کر بڑے پیار سے خوب چومتی رہتی ہے۔ اس کے بچہ کو دیکھ کر دوسرے لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر لفظ "میرا" کی وجہ سے وہ ماں ان بوسوں میں بھی لطف محسوس کرتی ہے۔

میری بھی یہی کیفیت ہے۔ دھرم پور کے لئے میرے دل میں عزت ہے۔ محبت ہے اور اس پر ناز بھی۔ یہ ایک نہایت قدیم مقام ہے اور اس کے پیچھے ایک ہزار سال کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہاں کی صاف فضا، ہاضم پانی اور دلکش قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھ کر کولہا پور کے شلاہار خاندان کے ایک جینی راجہ کی رانی نے اس جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں بسانے کی ضد کی تھی اور اپنی محبوب رانی کی ضد پوری کرنے کیلئے اس راجہ نے نویں عیسوی صدی میں یہ دھرم پور گاؤں بسایا تھا۔ رانی نہایت مذہبی تھی۔ اس کے روزمرہ کے پوجا پاٹھ کے لئے راجہ نے ایک عالیشان جین مندر بھی بنوا دیا جو آج تک اس میدان کے قریب واقع ہے جہاں جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ اس جین مندر میں کانڈی زبان میں لکھے ہوئے جو متعدد شلالیکھ ہیں وہ آج بھی اس تاریخ کی شہادت دے رہے ہیں۔ جین مندر کے گنبد دیکھئے گویا وہ اس کا ہاتھ ہے جسے اوپر فلک کی جانب اٹھا کر اس تاریخ کی شہادت دیتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ "میں نے متعدد انقلابات دیکھے ہیں۔ کئی انسانی پیڑھیاں آئیں اور چلی گئیں۔ سب کا انجام موت ہوتا ہے"

دھرم پور میں جینیوں کی ہی آبادی زیادہ ہے اور اس قدیم جینی مندر کے آس پاس ہی ان کے مکانات واقع ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں جینیوں کا خاص پیشہ کاشتکاری ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہ لوگ دھرتی ماتا کی خدمت بڑے خلوص اور ایمانداری سے کرتے آ رہے ہیں۔ اور یہ بار بھی ان پر ہمیشہ سے زیادہ ہی بڑھا رہا ہے۔ آپ ان محنتی کسانوں کو

صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دکھیں گے۔ چاہے تیوہار ہو، چھٹی ہو ـــــ کچھ بھی ہو کسانوں کی یہ خدمت بند نہیں ہوتی۔ اس خدمت میں کوئی کمی نہ ہو اس لئے بعض لوگوں نے تو اپنے رہنے کے مکان بھی کھیتوں اور باغیچوں میں ہی بنا لئے ہیں۔ یہ کالی ماتا جب تک یہ نہیں دیکھ لیتی کہ اس کے بیٹے نے اس کی خدمت انجام دینے میں اپنے خون کا پسینہ کر ڈالا ہے، تب تک وہ خوش نہیں ہوتی اور نہ ہی موتی کے مانند اناج کے دانے دیتی ہے۔ میرے گاؤں کے تمام کسان اپنی کالی ماں کی خدمت میں اپنے خون کا پسینہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے خوش رہتی ہے، اور انھیں پیار کرتی ہے۔ یہاں کے جینیوں کے بارے میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کھیتی جینی ہی کرتے ہیں اور پھر سونے سے اپنی تجوری بھرتے ہیں۔ اور یہ مثل بالکل سچ ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ محنتی اور دبنگ ہیں۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی کرنا، دریا سے پانی لانا، دودھ دوہنا، گایوں کی خدمت کرنا، کھانا پکانا، کھیتوں پر کھانا پہونچانا، دریا پر کپڑے دھونا، بعض اوقات کھیتوں پر کام کرنے بھی جانا ـــــ فصلوں کو پانی دینا، بازار ہاٹ کرنا، شام کے وقت جین مندر میں جاکر "پُران" سننا اور بچوں کو سنبھالنا وغیرہ متعدد کام وہ کس طرح کر لیتی ہیں یہ دیکھی جائیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے ان سب کاموں میں تنظیم، صفائی اور خلوص خصوصاً پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانگلی کے بازار میں دھرم پور کی چیزوں کو ـــــ خصوصیت سے مکھن کو دو پیسے زائد میں خریدا جاتا ہے۔

جینی بیواؤں کے کام تو بالخصوص قابلِ ذکر ہیں ـــــ گھر گرہستی کو کفایت شعاری سے چلانے میں یہ مہارت رکھتی ہیں۔ یہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی ہیں اور ان کی ازدواجی کاموں میں سرگرمی سے امداد کرتی ہیں۔ ان کے جسم پر ایک صاف سفید کپڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں چاندی کے کنگن ہوتے ہیں۔ اس قسم کا جذبۂ ایثار رکھ کر خدمت کرنا انہیں کا حق ہے۔ جینیوں کی اصل تہذیب اپنی خواتین کی وجہ سے جن میں ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، قائم ہے، پوجا پاٹھ۔ اپواس برت، پُران کی سماعت اور مختلف مذہبی رسومات وغیرہ اگر کوئی سچے دل اور خلوص سے ادا کرتا ہے تو وہ جینی بیوائیں ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ ان سب بانوں کا مقصد ہوتا ہے ـــــ ایثار، خدمت اور عبادت۔

ایشور نے دھرم پور کو جو ایک خاص عطیہ دیا ہے وہ ہے دریائے کرشنا۔ ہندوستان میں متعدد مرتبہ متعدد مقامات پر پھیلا۔ کئی مرتبہ پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض خوفناک طریقہ پر جانی بربادی کے باعث بنے۔ لیکن میرا دھرم پور ان سب غیبی تباہیوں سے آج تک بالکل اچھوتا رہا ہے۔ حالات جس طرح بدلتے گئے اس کے مطابق ہی یہاں کے جینی کسانوں نے دریائے کرشنا کے ساحل پر جگہ جگہ انجن اور پمپ لگا کر اپنی فصلوں کی آب پاشی کا بندوبست کر لیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اناج کے علاوہ وہ بڑھیا سے بڑھیا گڑ، ہلدی، مرچ اور جنا کو بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا سارا مال سانگلی کے بازار میں پہونچتا ہے اور اس پر گاہک ٹوٹ پڑتے ہیں۔

کیا گرمی، کیا برسات، کیا خزاں اور کیا سردی سبھی موسموں میں دھرم پور کے قرب و جوار کے علاقہ میں ہمیشہ ہریالی چھائی رہتی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بڑے بڑے آم کے درختوں اور اونچے اونچے ناریل کے پیڑوں نے اس گاؤں پر ہری مخمل کا خوبصورت شامیانہ تان دیا ہے۔ اس گھنی ہریالی میں سے اوپر اٹھتی ہوئی یہاں کے قدیم جین مندر کی محراب بہت دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ گاؤں کے مغرب میں بہنے والا دریائے کرشنا، اس کا خوبصورت اور شاندار پانی اور اس پانی میں متواتر اپنے قدم دھوتا ہوا لمبا چوڑا اور مرد عورتوں نیز بچوں سے بھرا پورا گھاٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اسے ایک ناقابلِ بیان اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکون و اطمینان مہابلیشور اور شملہ ایسے ٹھنڈی آب و ہوا والے مقامات پر بھی میسر نہ ہوگا۔

تیرنے کے لئے پانی اور کشتیاں لڑنے کے لئے ریتیلا کنارہ دیکھ یہاں کے باشندوں کو کھلاڑی بنا دیا ہے۔ ملک میں ایسا کوئی بھی تیرنے کا مقابلہ یا کشتیوں کے دنگل نہیں ہوتے جس میں دھرم پور کے نوجوان جوش و خروش سے حصہ نہ لیتے ہوں۔ اگر میں کہہ دوں کہ ۴۲ء کے انقلاب میں حصہ لینے والے زیادہ سے زیادہ انقلابی ہیرو یہیں کے تھے تو میں سمجھتی ہوں اپنے گاؤں کے نوجوانوں کی بہادری کی مزید تعریف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

دھرم پور کے خاص رہنما ـــــ نہیں کہنا چاہئے دیوتا یہاں کے زمیندار شری سیوک رام جی ہیں جنہیں لوگ محبت اور عزت سے داداجی

لگتے ہیں۔ دادا جی کی عمر تریسٹھ برس کی ہو چکی ہے۔ مگر اس عمر میں بھی وہ ایک پچیس سال کے نوجوان کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کا گورا رنگ، شاندار چہرہ، سیدھی ناک اور گٹھا ہوا بدن دیکھ کر نوجوان بھی ان پر رشک کر سکتے ہیں۔ دادا جی کی پوشاک بالکل معمولی ہوتی ہے ——— سر پر سفید پگڑی، بند کالر کا لمبا کوٹ، اس کے نیچے جنبھوں سے ٹخنے والا زیبوں کا کُھلا، سفید اور صاف دھوتی، پیروں میں بوٹ، کندھے پر دوپٹہ اور ہاتھ میں ایک سونٹا۔ اس طرح کی پوشاک میں سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور کاندھے پر پڑے ہوئے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے جب وہ پنچایت گھر کی جانب جاتے ہیں تو راستہ میں آنے جانے والی عورتیں دُور جب تک نکل جائیں، تب تک ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور آنے جانے والے مرد اپنی جگہ پر ایک لحظہ کے لئے رک کر انہیں ادب کے ساتھ سلام کرتے ہیں۔ بازار کے چوراہے پر مچی ہوئی دھوم ایک دم خاموش ہو جاتی ہے اور پنچایت گھر میں بیٹھے ہوئے سب لوگ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ دادا جی کا سلوک بہت سخت اور صاف ہوتا ہے۔ وہ کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں چھوتے۔ خوش نصیبی سے انہیں اپنی جائداد سے بیس ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ وہ کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں چھوتے۔ انہیں کوئی لت نہیں ہے۔ وہ مذہبی رسوم کے پابند ہیں۔ روز صبح سویرے غسل کرنے کے بعد وہ پہلے جینی مندر میں درشن کے لئے جاتے ہیں، اور پھر اپنے دوسرے کام شروع کرتے ہیں۔ سرکاری حکام بھی انکی تعظیم کرتے ہیں اور دادا جی کہتے ہیں۔ دھرم پور میں سرکار کے کام کے لئے معمولی سپاہی سے لے کر صوبے کے بڑے سے بڑے افسر دورہ پر آیا کرتے ہیں۔ دادا جی ان سب کی حسب مراتب خاطر مدارات کرتے ہیں۔ سرکاری کام کو انصاف کے ساتھ کرنے میں وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ رشوت تو وہ کبھی لیتے نہیں ہیں اور نہ کوئی انہیں کچھ لالچ دینے کی جرأت کر سکتا ہے۔ گاؤں کے گوپال ایسے چوٹی کے بدمعاش کو اور اس کے ساتھی شنکر، بالو، گنپت، بھیکو، پیلا، ملا اور کلا وغیرہ غنڈوں کو ناکوں چنے چبا کر ہمیشہ کے لئے خاموش بٹھا دینا صرف دادا جی ہی کا حق تھا۔

ان کا عام طور پر طریقہ اور سلوک بھی محبت اور سخاوت سے پُر ہے۔ غریبوں کا دکھ دور کرنے میں وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کسی کی بیماری کے لئے، کسی کو شادی کے لئے، کسی کو تعلیم کے لئے آج تک نہ جانے کتنے غرباء کو ان کی امداد حاصل ہوئی ہے۔ ایسے کاموں میں وہ ذات پات اور مذہب کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ صرف انسانیت کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق کام کرنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں صحیح راہ دکھلانے میں دادا جی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

گاؤں میں جا بجا آپ جو اکھاڑے دیکھ رہے ہیں ان کی تعمیر میں دادا جی کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ یہ انہیں کی ترغیب کا نتیجہ ہے کہ گاؤں کے کاشتکاروں نے اپنی فصل کی سینچائی کے لئے دریائے کرشنا کے پانی کا استعمال کیا ہے۔ گاؤں میں تیل کی گھانیاں اور دال کی ملوں کے قیام کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے گاؤں کی سماجی، مذہبی، صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لئے وہ دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ سنہ ۴۲ء کے انقلاب میں سرکار اور عوام دونوں کو دادا جی کس طرح مطمئن رکھ سکے یہ وہ ہی جانیں۔

دادا جی کا حافظہ نہایت قوی ہے ——— گاؤں میں کن کن لوگوں کے ہاں کون کون مہمان آتے ہیں، کس کی بیٹی کہاں بیاہی ہے، کس کی لڑکی کس لڑکے سے بیاہ کر اپنے گاؤں میں آئی ہے وغیرہ کئی قسم کی معلومات ہر وقت انہیں رہتی ہے۔ لوگوں کے گھریلو جھگڑوں کا وہ چند منٹوں میں ہی فیصلہ کر دیتے ہیں اور دونوں فریقین کو خوش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آس پاس ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا سا رہتا ہے۔

جینی سماج میں دادا جی کا بڑا اثر ہے۔ اس سماج کے لئے انہوں نے اپنی نجی جائداد میں سے پچاس ہزار سے بھی زیادہ روپے خرچ کر ڈالے ہیں۔ گاؤں کے جینی ان کی بے حد تکریم کرتے ہیں۔ دیگر ذاتوں کے لوگ بھی ان کی بات کو سو فیصدی صحیح جانتے ہیں۔ کوئی بھی لیڈر، انقلابی یا محب وطن بغیر ان کے مشورہ کے کسی بھی کام کو شروع نہیں کرتا۔

انہیں دادا جی زمیندار کی میں بیٹی ہوں۔ میرے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لئے میں ان کی اکلوتی اور بڑی لاڈلی بیٹی ہو گئی ہوں۔ ارے مگر یہ کیا؟ میں نے تو درمیان میں ہی اپنی کہانی شروع کر دی۔

میری ماں کا نام رتنا دیوی ہے۔ وہ میرے والد کے مقصد، مزاج اور طور طریقوں سے بالکل ہم آہنگ ہو کر سب کچھ کرتی ہیں۔ مرد چاہے نہ مانے مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس کی خواہش، اس کے کارنامے اور اس کا رعب اس کی بیوی پر ہی منحصر ہے۔ بیوی شوہر کی امنگوں کا سرچشمہ ہے۔ والد کے سبھی مقدس کاموں میں میری ماں نے صلاح دی ہے۔ ان کی

حوصلہ افزائی کی ہے اور ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔

گاؤں کے سبھی لوگ میری ماں کو ماتا جی کہتے ہیں ــــ گورا رنگ، اکہرا سڈول جسم، پیشانی پر کم کم کی بندیا، گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھ میں سونے کے کنگن اور قیمتی، خوبصورت، ریشمی ساڑی میں ملبوس، ہاتھ میں چاندی کا برتن لے کر جب وہ مندر میں جاتی ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکشمی دیوی خود ہی دیو لوک سے اتر کر ہمارے گاؤں میں نازل ہو گئی ہیں۔ اسے دیکھ کر گنہگاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور شرم سے ان کا سر جھک جاتا ہے۔

میری ماں نیک دل اور مذہب کی پابند ہے۔ گذشتہ بیس تیس برسوں میں یہاں کے قدیمی جین مندر میں متعدد جشن کرائے ہیں۔ مہاویر جینتی اور دیگر تیوہاروں کے موقع پر جشن جتنے ٹھاٹھ باٹ سے ہمارے گاؤں میں ہوئے ہیں ویسے دوسری جگہ شاید ہی کہیں ہوتے ہوں۔ جین مندر میں اگر کبھی کسی چیز کی کمی ہوتی ہے اور پجاری اگر اس طرف میری ماں کو متوجہ کر دیتا ہے تو دوسرے ہی روز کمی پوری ہو جاتی ہے۔ جین مندر میں دگمبر منی، جیرد، کشا وا چک، بھجن منڈلی وغیرہ کوئی نہ کوئی ہمیشہ آتے رہتے ہیں اور میری ماں ان سب کے ٹھہرنے، کھانے اور دیگر پروگراموں کا موزوں و مناسب انتظام کرتی ہیں اور ان کے رخصت ہوتے وقت انہیں مناسب رخصتی تحفے بھی دیتی ہیں۔ جب تک منی کا کھانا نہیں ہو جاتا تب تک وہ خود پانی بھی نہیں پیتیں۔ سخت سے سخت برت اور اپواس کرنا کوئی میری ماں سے سیکھ لے۔ ایشور، دھرم شاستر وغیرہ میں جتنا ایمان میری ماں رکھتی ہیں اتنا شاید ہی کوئی رکھ سکتا ہو۔ آبو، گرنار، شکھر جی وغیرہ ہندوستان کے مقدس مقامات کی اس نے زیارت کی ہے۔

میری ماں ایسی اناج کی خیرات دینے والی شاید ہی کہیں ہوں۔ بھادوں مہینہ کی پونم کو ہر سال جین مندر سے پالکی نکلا کرتی ہے۔ اس جلوس میں جینیوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سبھی ذاتوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ کوئی ڈھائی تین سو آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے جس میں ہریجن بھی شامل رہتے ہیں۔ جلوس میں شامل سبھی لوگوں کو ماں گھر لے آتی ہیں اور انہیں مٹھائی کھلاتی ہیں۔ جب کوئی ہریجن بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کے گھر والے اچار مانگنے ماں کے پاس آتے ہیں۔ تب انہیں اچار تو ملتا ہی ہے، ساتھ میں دو روٹیاں بھی مل جاتی ہیں۔ دسہرے کے دن شمالی ہندوستان میں شام کو نیل کنٹھ کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ درخت

کی پوجا کرتے ہیں اور اس کی پتیاں لا کر بڑی عزت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ یہ پتیاں سونا کہلاتی ہیں۔ ہر سال دسہرے کے روز گاؤں کے سب لوگ ماں کو سونے کا پتا دینے کے لئے گھر آتے ہیں، جن میں ہریجن بھی ہوتے ہیں۔ ماں ان سب کے ہاتھوں سے وہ پتا بڑے پیار سے قبول کرتی ہیں اور سب کو مٹھائی کھلاتی ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو تو اس روز وہ اپنے ہاں سے بغیر کھانا کھلائے جانے ہی نہیں دیتیں۔ اس طرح ہمارے گھر کو دھرم پور کا سدا ورت ہی سمجھئے۔

میری ماں بڑی رکھ رکھاؤ والی ہیں۔ سویرے بہت جلدی اٹھ جاتی ہیں اور رات کو قریب گیارہ بجے سوتی ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک وہ کام میں لگی رہتی ہیں۔ گھر کے سب کاموں پر اور نوکر نوکرانیوں پر ان کی سخت نگرانی رہتی ہے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں پھر بھی سب کا حساب وہ رکھتی ہیں۔ زمین سے کتنی پیداوار ہوئی اور کتنا خرچ ہوا یہ دیکھ کر ہی ان کے کام کاج ہوا کرتے ہیں۔

ان کے سارے کاروبار نقد ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی کبھی ہمارے گھر اپنا قرض وصول کرنے آیا ہو یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ قرض لینا تو وہ جانتی ہی نہیں ہیں۔ کسی ملازم یا ملازمہ سے غلطی ہو جانے پر اسے معاف نہیں کرتیں۔ پھر بھی انہوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنی امیری کی شیخی نہیں بگھاری۔ غریبوں کی وہ ماں ہیں۔ ان کے لئے سایہ ہیں۔

میرے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میں ہی ان کی پہلی اور آخری اولاد ہوں۔ پھر بھی اس کی وجہ سے وہ کبھی مغموم نہیں ہوئیں۔ نہ ہی انہوں نے کبھی شکایت کی۔ بچہ حاصل کرنے کے لئے بیتاب دوسری عورتیں جس طرح نجومیوں، ویدوں اور سادھوؤں وغیرہ کے پیچھے چکر کاٹا کرتی ہیں اس طرح میری ماں نے کبھی نہیں کیا۔ وہ اپنی ہمسایوں سے اس سلسلہ میں اپنا جو خیال ظاہر کرتی تھیں اُسے میں نے کئی مرتبہ سُنا ہے۔ وہ کہتیں "ہماری پڑھی لکھی منی تو ہمیں بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ کسی غریب کو گھر داماد بنا کر لے آئیں گے تو بیٹے کی کمی دور ہو جائے گی۔"

میں منی ہوں۔ مجھے گاؤں کے لوگ منی کہتے ہیں۔ جس طرح میری ماں سارے گاؤں کی ماتا جی ہیں اسی طرح میں گاؤں بھر کی منی ہوں۔ میرا اصل نام کنول ہے، مگر وہ صرف لکھنے کے لئے ہی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب ایک روز میں نے بھولے پن سے اپنی ماں سے پوچھا تھا ــــ

"ماں۔ تم نے میرا نام کنول کیوں رکھا؟"

تب انہوں نے ہنس کر کہا تھا ـــــ

"اس لئے کہ جس طرح پانی میں رہتے ہوئے بھی کنول پانی سے بے نیاز رہتا ہے اسی طرح تو بھی ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوتا ہے ماں؟" میں نے دوبارہ استفسار کیا۔

ماں نے جواب دیا ـــــ "دنیا میں رہتے ہوئے بھی تجھے ایثار کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔"

"تمہیں یہ نام کیسے سوجھا؟" میں نے پوچھا۔

"پرانوں میں میں نے سنا تھا" انہوں نے جواب دیا۔

"اور کیا میرا نام کنول رکھنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں کنول کی مانند حسین ہوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

انہوں نے ہنس کر کہا ـــ "سچ مچ تو کنول کی طرح خوبصورت ہے اسی لئے تیرا نام کنول رکھا ہے۔"

تیئیس سال پہلے میرا جنم ہوا تھا۔ یہاں کے جین مندر کے مغرب میں راستہ کے اس پار جو بڑا مکان ہے وہ ہمارا ہے میں اس مکان میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ ماں اور باپ کی شادی کے نویں سال بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی پہلی اولاد ہونے کے باعث میری پیدائش کی خوشی میں ـــ میرے لڑکی ہونے کے باوجود خوشیاں اسی دھوم دھام سے منائی گئیں جس طرح لڑکے کی پیدائش پر منائی جاتی ہیں۔ لوگ مجھ سے بڑی امید کے ساتھ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ جیسے لڈو میری پیدائش کے وقت کھانے کو ملے تھے ویسے ہی اب تیری شادی کے موقع پر ہی ملیں گے۔

ایسا بھی نہیں کہ میں آہو چشم ہوں، اور نہ میری آنکھوں میں شراب کی مستی ہے۔ میرا چہرہ کنول سا بھی نہیں۔ اور نہ میرے چہرے کو چاند سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اہلیہ، دروپدی، تارا اور مندودری جیسی عورتوں کے جو "پرانوں" میں مشہور ہیں مانند میں خوبصورت نہیں ہوں۔ سنسکرت یا پراکرت زبانوں کے ادب میں شاعروں نے خوبصورت عورت کا جو بیان کیا ہے اس کا مجھ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ میں تو صرف اپنی ماں کا عکس ہوں ـــ اندر اور باہر سے بالکل ماں کی طرح۔ میری ماں نے اپنی خوبصورتی، عادات اور جذبات مجھے عطا کئے ہیں۔ ماں کی نرمی اور والد کی سختی کا امتزاج مجھے وراثت میں ملا ہے۔ ہمارے خاندان کی نرم دلی، ایثار، محنت، باقاعدگی اور علمی دغیرہ اوصاف مجھ میں آگئے ہیں۔ میں ایک معزز خاندان کے زمیندار کی بیٹی ہوں۔

میرا بچپن لاڈ پیار میں گذرا۔ دولو اور اس کی بیوی بائیجا یہ دونوں ملازم میری دیکھ ریکھ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ مجھے دودھ پلانے کے لئے ایک گائے خریدی گئی۔ والد صاحب نے میری پرورش میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ میرے کپڑوں پر توجہ دیتے تھے، میرے کھلونوں میں دلچسپی لیتے تھے اور میں کیا کھاتی پیتی تھی اس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اگر مجھے ذرا کھانسی ہو جاتی یا کچھ سردی ہو جاتی یا جسم میں کچھ حرارت معلوم ہوتی تو سانگلی کا مشہور ڈاکٹر فوراً بلوایا جاتا تھا جب والد صاحب کسی کام کے سلسلہ میں سانگلی، پونہ یا بمبئی جاتے تو میرے لئے ضروری چیزوں کی ایک فہرست تیار کر لیتے اور واپسی پر ان چیزوں کو اپنے ساتھ لانا نہیں بھولتے تھے۔

بچپن سے ہی میں اپنی ماں کے ساتھ روزانہ بلاناغہ جین مندر جایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے دل پر مذہبی رسومات کا جو اثر پڑا وہ اب تک قائم ہے۔ بچپن میں لاعلمی کے باعث میں اپنی ماں کی نقل کیا کرتی تھی۔ بھگوان کے قدموں میں ماں سرنگوں ہوتی تو میں بھی سرنگوں ہو جاتی تھی۔ آنکھیں موند کر ماں جپ کرتی تو میں بھی اس کے قریب بیٹھ کر اپنی آنکھیں موند لیتی تھی۔ مندر میں درشن کے لئے آنے والے دوسرے لوگ میری بھگتی کو دیکھ کر ہنس پڑتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بیٹی اپنے ماں باپ کے بالکل موافق ہے۔

جب میں چھ سال کی ہوئی تو پڑھنے کے لئے اسکول جانے لگی۔ مدرسہ کے ابتدائی دنوں کی یاد میرے دل و دماغ پر آج تک قائم ہے۔ پہلے روز جب میں اسکول گئی تو میرے ساتھ مجھے اسکول پہنچانے کے لئے دولو بھی گیا تھا اور بائیجا بھی گئی تھی۔ مگر اسکول میں داخل ہونے کے وقت میں نے خوف سے رونا شروع کر دیا جو لوٹ کر گھر آنے پر ہی بند ہوا۔ اس کے بعد والد صاحب نے مجھے گھر پر ہی پڑھانا شروع کیا۔ دیش پانڈے نام کے ایک ماسٹر صاحب مجھے گھر آکر پڑھانے لگے۔ دیش پانڈے ماسٹر بہت خوش مزاج شخص تھے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے میرے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جو آگے چل کر اس قدر بڑھا کہ بعض اوقات تو اسکول چھوڑ کر مجھے گھر آنے کی خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ دیش پانڈے ماسٹر فن تعلیم میں ماہر تھے۔ وہ دقیق سے دقیق مضمون کو اتنی اچھی طرح سمجھاتے تھے کہ طلبا کو اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ لگتا تھا اور وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔ یہ خوبی بہت کم استادوں میں پائی جاتی ہے۔

میں خوب دل لگا کر مطالعہ کرنے لگی۔ جماعت میں میرا پہلا نمبر آنے لگا۔ گو وہ مدرسہ لڑکوں کا تھا پھر بھی وہاں کے سکریٹری کا کام میرے سپرد تھا۔ اس لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر درسی کاموں میں بھی میں تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ اسکول میں کسی مہمان کا استقبال کرنا ہو، کوئی جلسہ منعقد کرنا ہو یا کوئی جشن منانا ہو تو ان سب کا انتظام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں میں نے مراٹھی کی ساتویں جماعت پاس کر لی۔ میں سارے سینٹر میں اول آئی تھی۔ مجھے اکیاسی فیصدی نمبر ملے تھے۔

اس غیر معمولی کامیابی کے باعث ہمارے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ والد صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے بینڈ بجواتے ہوئے تمام گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ اسکول کی جانب سے میرے اعزاز کے لئے سارا گاؤں امڈ پڑا تھا۔ اس موقع پر کئی لوگوں نے مجھے انعامات دیئے اور تحائف بھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سمجھ رہے تھے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔

ماں نے جین مندر میں پانچ روز تک پوجا کرائی۔ چھٹے روز گاؤں کے تقریباً دو سو معزز حضرات نے ہمارے گھر کھانا کھایا۔

مراٹھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری دلیپ پانڈے نے، جین مندر کے پجاری نے اور گاؤں کے چند ممتاز شخصوں نے مل کر میری والدہ اور والد صاحب سے مجھے آگے پڑھانے کی درخواست کی۔ وہ کہنے لگے ”منی کو پڑھنے کے لئے سانگلی کے ونیتا آشرم میں بھیج دیجئے۔“ آگے پڑھنے کے لئے میں بھی بیتاب تھی لیکن میرے والدین مجھے آنکھوں سے دور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ اُن کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے مجھے آگے پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔

دھرم پور سے سانگلی صرف دس میل دور ہے۔ میری ماں والد صاحب کے ساتھ سانگلی جا کر وہاں کے ونیتا آشرم کا انتظام وغیرہ دیکھ آئی تھیں، اور دونوں نے اسے پسند کیا تھا۔ میری آئندہ تعلیم سانگلی میں شروع ہو گئی۔ جس روز میں دھرم پور سے پہلی مرتبہ رخصت ہوئی تھی اس روز میری ماں کو، میرے والد کو اور مجھے بھی جو ملال ہوا تھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔

میری زندگی کے آئندہ دس گیارہ برس بڑی سرعت سے گذر گئے۔ میں تعلیم یافتہ ہو گئی۔ بالغ ہو گئی۔ میٹرک کے امتحان میں میں اوّل نمبر پاس ہوئی۔ کالج کے ہر امتحان میں میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھی۔ بی۔ اے ہوئی اور پھر ایم۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

ہر امتحان ختم ہونے کے بعد میں دھرم پور آجایا کرتی تھی۔ نتیجہ گاؤں میں ہی آجاتا تھا۔ اور ہر نتیجہ کے وقت گاؤں کے لوگ میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کیا کرتے تھے جن سے ان کی خوشی اور جوش ظاہر ہوتا تھا۔ سانگلی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے میں صرف لمبی چھٹیوں میں ہی دھرم پور آیا کرتی تھی۔ درمیان میں میرے والدین سانگلی آکر مجھ سے مل آیا کرتے تھے۔

میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اردو، ماگدھی اور مراٹھی مضامین لئے تھے۔ دلیپ پانڈے ماسٹر کی وجہ سے مجھے مراٹھی سے محبت تھی جب میں مراٹھی مدرسہ میں تھی تبھی میں نے مدرسہ کی لائبریری کی، اور دلیپ پانڈے ماسٹر صاحب کے گھر کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ میری ماں کی سنگت کی بدولت جین مذہب، جین فلسفہ اور جینی ادب سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مراٹھی اسکول میں پڑھتے ہوئے ہی میں نے متعدد مذہبی کتب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ ان کے علاوہ جین مذہب کی چھوٹی بڑی کئی کتابیں میں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ میرا یہ شوق رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا۔

بچپن سے ہی مجھے چونکہ شہرت اور وقار حاصل ہو گیا تھا اس لئے میرے مزاج میں کسی قدر سنجیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کے علاوہ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے کہ وہ لوگ جو میری عزت کرتے ہیں مایوس ہو جائیں، یا میرے متعلق وہ کوئی غلط رائے قائم کر لیں، چنانچہ اس سلسلہ میں میں بہت محتاط رہتی آئی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب کئی مرتبہ مجھے کہا کرتے تھے۔ ”منی تو حسب منشا جتنا چاہے پڑھ، کچھ بھی کر، کہیں بھی رہ مگر کبھی کوئی ایسا کام نہ کر جس سے تیرے خاندان، ذات اور مذہب پر داغ نہ لگے۔“ تعطیلات میں جب میں گھر جاتی تو میری ماں بڑی سخت نظر سے دیکھتی رہتیں کہ کالج کی ہوا کے باعث میری چال میں، گفتگو میں، طور طریقہ اور عادات میں کہیں کوئی نامناسب بات تو نہیں آگئی ہے۔ مگر مجھ میں کوئی بات انہیں نہ ملی جس پر کہ وہ نکتہ چینی کر سکیں۔

جب میں ہائی اسکول اور کالج میں تھی تو بعض لڑکے مجھے اپنی بہنیں کہا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے مجھے اس خطاب سے کیوں سرفراز کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی نظر میں میں اپنی بہنیں کی طرح قبیل

دوست پوچھا کرتی تھیں ۔ کالج کی میری سہیلیاں مجھے "سادھوی" اور دقیانوسی کہا کرتی تھیں ۔ پھر بھی میں نے کسی کی چنداں پرواہ کئے بغیر اپنی حد سے باہر نہ گئی ۔ اصلاح کے نام پر وہ جو چھچھوراپن کیا کرتی تھیں ، وہ مجھے بالکل ناپسند تھا ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ میں ہمیشہ پرانی باتوں کی لکیر پیٹتی رہتی تھی ۔ پرانی بات اگر حقیقتاً پرانی اور بے سبب ہو گئی ہے تو اسے ترک کرنے کے لئے میں ہر وقت تیار رہتی تھی ۔ مگر میرا یہ عقیدہ تھا کہ اس کی جگہ جو نئی بات لائی جائے وہ موزوں و مناسب ہونی چاہئے ۔

جینی سماج میں اتنی پڑھی لکھی میں ہی پہلی لڑکی ہوں ۔ دھرم پور کی میری عمر کی کئی جینی لڑکیاں آٹھ چار پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہیں ۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ میں ابھی تک بن بیاہی ہوں ۔

ویسے دیکھا جائے تو میرے والدین نے میری شادی کرنے کا کئی مرتبہ ارادہ کیا تھا ۔ جب کبھی کسی اچھے معزز گھرانے کا کوئی لڑکا مل جاتا تو میری ماں تو بس یہی چاہتی تھیں کہ میری شادی کر دیں ۔ مگر میں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ جین مندر میں قسم کھائی ہے کہ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی نہیں کروں گی ۔

" آخر اتنا پڑھ کر تو کرے گی کیا ؟ " یہ سوال صرف میری ماں یا والد ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کئی لوگ مجھ سے کیا کرتے تھے اور میں انہیں یہ جواب دیا کرتی تھی ـــــ

" ابھی پڑھائی تو مکمل ہو جانے دیجئے ۔ پھر آگے کیا کرنا ہے اس بات پر بھی غور کر لوں گی ۔ " دراصل آئندہ کیا کرنا ہے ، یہ میں خود طے نہیں کر پائی تھی ، چنانچہ انہیں کیا جواب دیتی ۔

لیکن ایم ۔ اے پاس ہو جانے کے بعد دھرم پور کے عوام نے میرے اعزاز میں جو تقریب کی تھی اس میں تقریر کرتے وقت میں نے اپنا مقصد واضح الفاظ میں رکھ دیا ۔ میں نے کہا ـــــ

" میں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل نہیں کی ہے ۔ میں اس لئے بھی نہیں پڑھی ہوں کہ اپنی گرہستی کے جنجال میں پوری طرح پھنس کر جو کچھ میں نے پڑھا ہے اسے بھلا دوں ۔ میں لوگوں کو یہ دکھا دینا چاہتی ہوں کہ اگر موقع دیا جائے تو گاؤں کے لڑکے لڑکیاں بھی پڑھ سکتے ہیں ۔ فہم و فراست کا ٹھیکہ صرف شہر والوں کو ہی ہمیشہ کیلئے نہیں دے دیا گیا ہے ۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ دھرم پور میں ایک ہائی اسکول کھولوں اور اس ہائی اسکول میں میں خود تعلیم دوں ۔ آپ لوگ آج تک میری جو عزت افزائی کرتے آرہے ہیں اس کے صلے میں میں آپ کے لڑکے لڑکیوں کی حتی الوسع خدمت کروں گی ۔ زندگی عیاشی کے لئے نہیں ایثار و قربانی کے لئے ہے ..... "

اس کے بعد میں تارہ پور کے مہرشی جٹا شنکر کے پاس گئی جو ایک عظیم و مشہور شخصیت ہیں ۔ گاؤں کے بعض معزز لوگ اور میرے والد صاحب بھی میرے ساتھ تھے ۔ والد صاحب میرے اس خیال سے متفق تھے ۔ ہم لوگوں کی درخواست پر دھرم پور میں ہائی اسکول قائم کرنے کے لئے مہرشی آج یہاں تشریف لا رہے ہیں ۔ جین مندر کے سامنے کھلی جگہ پر جو جم غفیر اُمڈا پڑتا ہے وہ انہیں کا انتظار کر رہا ہے ۔

قارئین ! میں نے دھرم پور سے آپ کا کافی تعارف کرا دیا ہے ۔ آپ یہاں کے خاص مقامات اور شخصیتوں سے واقف ہو گئے ہیں ۔ پلیٹ فارم پر تشریف فرما میرے والد صاحب کو جنہیں سب لوگ دادا جی کہتے ہیں اور خواتین میں بیٹھی ہوئی میری ماں اور سب کی ماتا جی کو آپ پہچان لیں گے نہ ؟

ہاں ، پر ادھر دیکھئے ۔ مہرشی جٹا شنکر کی موٹر آ گئی ہے ۔

" مہرشی جٹا شنکر کی ..... "

" جے ! "

" مہرشی جٹا شنکر کی ..... "

" جے ! "

۲

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بلند ہونے والے نعروں کی طرح ساری فضا میں گونج پیدا کر کے جلسہ میں جمع لوگوں نے سارے دھرم پور کو ہلا دیا ۔ مہرشی جٹا شنکر موٹر سے نیچے اُترے ۔ میں نے انہیں مجمع سے لا کر پلیٹ فارم پر بٹھا دیا ۔ لوگ انہیں سلام کر رہے تھے ۔ ان کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ سے ساری فضا گونج اٹھی ۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے ۔ مہرشی جٹا شنکر کی شخصیت بہت عظیم ہے ۔ ان کا شاندار جسم ، سفید داڑھی ، بڑی بڑی آنکھیں ، لمبے بال ، بلند اور صاف آواز نیز ان کا سفید کرتا اور دھوتی دیکھ کر عوام فوراً ان سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔

پہلے مدرسہ کے بچے بچیوں نے دعا کی اور پھر استقبالیہ نغمہ ہوا ۔ آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں شخص گاؤں بھر میں دادا جی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا ۔ دادا جی سے درخواست کی گئی تھی مگر جلسہ میں ایک عظیم شخصیت

کے موجود ہونے کے باعث وہ کچھ جھجکے اور انہوں نے صدارت کی کرسی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے میں نے مہرشی کو پہلے سے ہی لے جاکر صدر کی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کی بائیں جانب ایک گورے رنگ کا کھدر میں ملبوس نوجوان بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ داہنی طرف دادا جی بیٹھے تھے۔ میں مہرشی کو سامعین سے متعارف کرانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ میں نے تقریر شروع کی —

"مہرشی جٹا شنکر، مکرمی دادا جی، بہنو اور بھائیو!

مراٹھی زبان میں ایک ضرب المثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عظیم انسانوں کی آمد سے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ دیوالی دسہرے پر ہوتی ہے۔ مگر میں کہوں گی کہ بڑے لوگوں کی آمد سے ہمارا نصیب جاگ جاتا ہے، یعنی جن لوگوں کے گھر میں سادھو سنت آتے ہیں ان کا نصیب جاگ جاتا ہے۔

آج ہمارے لئے بڑا مبارک دن ہے کہ مہرشی جٹا شنکر نے اپنی آمد مبارک سے ہمارے گاؤں کی سرزمین کو شرف بخشا ہے۔ قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ مہرشی یہاں کیوں تشریف لائے ہیں۔ میں یہ بتلا دینا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہیں۔ ہم سب نے ان کا نام سنا ہے، اخباروں میں ان کی تصاویر دیکھی ہیں اور ان کے کارناموں کے متعلق پڑھا اور سنا ہے۔

مہرشی جٹا شنکر ایک معمولی کسان خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ نے کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری حاصل نہیں کی ہے، مگر آپ نے اپنی کاوشوں سے کئی نوجوانوں کو سند یافتہ بنا دیا ہے۔ سمندر کو متھکر دیوتاؤں نے صرف چودہ جواہرات ہی نکال کر دنیا کی دولت میں اضافہ کیا تھا۔ لیکن آپ نے عوام کے بحر بیکراں کو متھکر اس میں سے متعدد ہیرے نکالے ہیں، جو آج بھی ان کے عوامی تعلیمی ادارہ میں اور دوسرے مقاموں پہ جلوہ گر ہیں۔

مہرشی نے اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ ملازمت کی۔ چند دنوں تک آپ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیتے رہے۔ مگر آپ کو اس سے پورا اطمینان نہ ہوا۔ اس کے ذریعہ وہ عوام الناس کی جس طرح خدمت کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ان کو یقین کامل ہو گیا کہ تمام اصولوں کی جڑ تعلیم ہے۔ لہٰذا جب تک اس ضمن میں مناسب کام نہ کیا جائے گا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ وہ اس جڑ کو مضبوط کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ یہ کام معمولی نہ تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے۔ نہ سرمایہ تھا، نہ کچھ خاص قابلیت تھی اور نہ ہی ان کا کوئی پیرو تھا۔ تاہم انہیں اپنے جذبۂ ایثار، خلوص، لگن، خود کفالت اور سخت محنت پر پورا اعتماد تھا اور آپ نے اپنی انہیں خوبیوں کی بدولت مخالف حالات سے استقلال کے ساتھ مقابلہ کر کے ایک بہترین تعلیمی ادارہ قائم کر دیا۔ آپ کے اس ادارے کا نام ہے "عوامی تعلیمی ادارہ"۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام کئی پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور مختلف قسم کے دیگر اسکول چل رہے ہیں۔ اور ان میں پچاس ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔

آپ کے ادارہ میں ذات، مذہب اونچ نیچ کا کوئی لحاظ نہیں۔ وہاں امیر، غریب، ہندو، مسلمان، ہریجن وغیرہ سب ایک ہیں۔ ان کی تعلیم کا اصول ہے —— سب یہاں آؤ، کام کرو، خود کفیل بنو، کاہلی کو چھوڑو، تعلیم یافتہ بنو، انسانیت کو نہ چھوڑو۔ جب پوری طرح سے تعلیم حاصل کر لو تو یہاں سے جاؤ اور دوسروں کو تعلیم دو۔ مہاتما گاندھی سے لے کر تقریباً سبھی ذاتوں اور نظریہ کے لوگوں نے آپ کے اس تعلیمی ادارے کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ جینی انہیں مہاویر کا اوتار مانتے ہیں۔ "لنگایت" انہیں ہیرو سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے آپ پیر ہیں اور دوسرے لوگ آپ کو بدھ، عیسیٰ مسیح اور بھگوان کرشن کی طرح انسانیت کا پرستار سمجھتے ہیں۔

آپ نے ہر ممکن کوشش کر کے علم کا دریا عام عوام میں بہایا ہے اور اس کی نہریں اور دھارے وادیوں، جنگلوں اور گاؤں تک پہنچا دیئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علم کے اس دریا کا ایک دھارا یہاں بھی بہے اسلئے ہماری درخواست پر آپ آج یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کے ادارے کی ایک شاخ ہمارے گاؤں میں بھی قائم کر دی جائے۔ ہم لوگ آپ کی ہر طرح سے امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں خود اس اسکول میں بغیر معاوضہ کے پڑھانے کے لئے تیار ہوں۔ حضرات! تعلیم ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان کو انسانیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ تعلیم بہت گراں ہو گئی ہے۔ جہالت، غربت اور روز افزوں گرانی کے باعث معاشرہ کی نچلی تہہ تک یہ پہنچتی ہی نہیں ہے۔ آج ہم آزاد ہیں مگر عدم تعلیم کے سبب ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ آزادی کیا چیز ہے اور اس کی کیا قیمت ہے۔

حضرات! آپ سب لوگوں کی طرف سے میں مہرشی سے ایک مرتبہ پھر یہ گذارش کرتی ہوں کہ وہ اپنے ادارے کے زیر اہتمام ہمارے دھرم پور میں

ایک ہائی اسکول جلد از جلد قائم کر کے ہمیں ممنون فرمائیں۔ آپ لوگ مہرشی کے تجربات اور ان کے ہمت افزا الفاظ سننے کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میں مہرشی سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ ہم لوگوں کو اپنی تقریر سے محظوظ فرمائیں۔"

اتنا کہہ کر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ غالباً وہ ایک دوسرے سے اپنے گاؤں کی قابلِ فخر چیزیں بیان کر رہے تھے۔ کہ ان کے گاؤں کے جلسے میں تقریر کرنے والے صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہیں۔ مگر مہرشی جٹا شنکر کے کھڑے ہوتے ہی یہ سرگوشیاں بند ہو گئیں تقریر سے پہلے اس عظیم الشان ہستی کو دیکھ کر سامعین نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اور پھر خاموش ہو کر یکسوئی سے اُن کی تقریر سننے لگے۔ مہرشی نے کہا۔

"دھرم پور کے ہوش مند دادا جی، ان کی صاحبزادی، بہنو اور بھائیو! میں آپ کے پاس ووٹ کی بھیک مانگنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں سیاسیات میں حصہ لینے والا محب وطن نہیں ہوں۔ میں کوئی سرکاری افسر بھی نہیں کہ آپ کے پاس زیادہ اناج پیدا کرنے کا یا زیادہ لیوی (ٹیکس) دینے کا کوئی حکم یا پیغام لے کر نہیں آیا ہوں ـــــ میں یہاں حاضر ہوا ہوں صرف آپ کی خدمت کرنے کے لئے۔ میں تو عوام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔

دادا جی میرے بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ جب جب مجھے جیسی کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے، تب تب میں دادا جی کے گھر آیا ہوں۔ ان کی اہلیہ رتنا دیوی سے میں بخوبی واقف ہوں۔ دادا جی کی اکلوتی تعلیم یافتہ بیٹی مجھے بچپن سے پہچانتی ہے۔ بچپن میں وہ میری داڑھی دیکھ کر ڈرتی تھی۔ لیکن آج صرف مجھے ہی نہیں بلکہ گاؤں کے کسی بھی مرد سے نہ ڈر کر اس نے آپ لوگوں سے مجھے متعارف کرا دیا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں مجھ سے یہ گذارش کی ہے کہ میں اپنے ادارے کے زیرِ اہتمام دھرم پور میں ایک ہائی اسکول قائم کر دوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں آپ جیسے جوشیلے اور سچے کارکن موجود ہوں وہاں ایک کیا میں دس ہائی اسکول کھول دوں گا۔

حضرات! ہمارے گاؤں گاؤں ہی رہے اور شہروں نے سرعت سے ترقی کر لی۔ شہر بجلی کی روشنی سے جگمگانے لگے، مگر دیہات میں تاریکی ہی رہی۔ شہر کے لوگوں نے کارخانے کھول دیئے اور گاؤں کے لوگ مزدور ہی بنے رہے۔ شہر کے لوگ وکیل، ڈاکٹر اور تاجر بنے اور ان کے مؤکل، مریض اور گاہک ہونا گاؤں والوں کی قسمت میں بدا ہے۔ شہریوں نے تعلیم حاصل کی تو دیہاتی بے پڑھے ہی رہے۔ اس لئے شہریوں نے گاؤں والوں کی جہالت سے فائدہ اٹھایا اور وہ رئیس ہو گئے۔ جبکہ گاؤں کے لوگ غربت کے غار میں ہی دبے رہے۔ گاؤں کے کسان سال بھر سخت مشقت کرنے کے باوجود بھوکے رہتے ہیں۔ یہ حالت ہو گئی ہے۔ جب تک ہماری جہالت دور نہیں ہوتی تب تک ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ اس لئے میرے خیال سے ملک کے سامنے آج پہلا اور اہم سوال تعلیم کا ہے۔ ہمارے ملک میں نوے فیصدی لوگ جاہل ہیں۔ ان سب کو تعلیم دینا حکومت کا اور عوام کا اولین فرض ہے۔ سوراج کا آفتاب طلوع ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارا یہ اندھا سماج اس کی روشنی کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کہتے ہیں گاؤں میں چلو۔ میں کہتا ہوں گاؤں میں ہی رہو۔ گاؤں کے لوگوں کو گاؤں میں ہی پڑھنا چاہیے۔ گاؤں میں ہی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہیے اور وہیں رہنا چاہیے۔ اگر گاؤں کے دانشور ـــ باہر شہر میں چلے جائیں تو گاؤں کی نشوونما کیسے ہوگی۔ شہر میں ہونے والے سدھار گاؤں تک کیسے پہنچیں گے۔ شہر میں ہونے والی اصلاحات کسی قانون کے ذریعہ گاؤں میں نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ سرکار ہی یہ کام کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ گاؤں والوں کا ہے اور انہیں ہی اسے حل کرنا پڑے گا۔ دادا جی زمیندار نے اپنے گاؤں میں اکھاڑے کھولے ہیں۔ تیل کی گھانیاں قائم کی ہیں۔ دال کی ملیں کھولی ہیں۔ زراعت کو فروغ دیا ہے اور آج یہاں ایک ہائی اسکول کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ اس اسکول کو میں یہاں کے نہایت مقبول رہنما دادا جی کا ہی نام دینے والا ہوں۔ دھرم پور کا ہائی اسکول دادا جی ہائی اسکول کہلائے گا۔

صاحبان! ایسے ہائی اسکول گاؤں گاؤں میں قائم ہونے چاہئیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے لئے ہی اور گاؤں کے لوگوں کے ذریعہ چلائے جانے چاہئیں۔ ان مدرسوں کے ذریعہ گاؤں کی مذہبی، صنعتی اور سماجی باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ زندگی اور تعلیم کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس کام کے لئے کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جوش و خروش اور جذبۂ ایثار کے ساتھ کمربستہ رہنا چاہیے تبھی ہمارے ملک کا نصیب جاگ سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ہمارا ادارہ گذشتہ پچیس تیس برس سے عوام کو تعلیم دینے کا کام

کر رہا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اور گاؤں میں رہنے والے کسی بھی ذات کے لڑکے لڑکیاں بھی اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کامیاب طلبا کی فہرست میں انہیں رول نمبر بھی مل سکتا ہے۔ ہمارے ادارہ کے کئی طلبا آج انگلستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ادارہ کی تیرہ شاخوں میں آج پچاس ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ اور ہمارا سالانہ بجٹ پندرہ لاکھ روپے ہے۔ ویسے ہمیں سرکار سے کچھ امداد مل جاتی ہے۔ لیکن ہمارا سارا دار و مدار خاص طور پر خود کفالت پر ہے۔

میرے نزدیک بیٹھا ہوا نوجوان میرا ایک محبوب طالب علم ہے۔ اس کا نام ہے اندرجیت دیال، یہ ہریجن ہے۔ بچپن سے ہی اس نے ہمارے اسکول میں تعلیم پائی ہے اور ہمارے ہی اسکول سے وہ بی۔اے۔ بی۔ٹی ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ادارہ میں چار پانچ سال تک ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ایک سال تک آپکے دھرم پور ہائی اسکول کے یہی ہیڈ ماسٹر رہیں گے اور آپکی منّی دیوی ان کی معاون رہیں گی۔ ایک سال کے بعد دیال جی مزید تعلیم کے لئے ولایت روانہ ہو جائیں گے تب منّی دیوی ہی آپکے اسکول کی ہیڈ مسٹریس بن جائیں گی۔

حضرات! آپ لوگوں نے مجھے اپنی خدمت کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آج سے ایک مہینے کے اندر یعنی مارچ کے مہینے سے آپکے ہائی اسکول کا کام شروع ہو جائے گا۔ ہائی اسکول آپکا ہے، آپ ہی اس کے مالک ہوں گے۔ آپ ہی کے لڑکے اس میں پڑھیں گے۔ آپ کو اپنے لڑکے لڑکیوں کو اسکول میں بھیجنا ہوگا۔ اسکول کا سارا خرچ بھی آپ ہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس گاؤں میں جینیوں کی تعداد زیادہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ بہت امیر ہیں۔ انہیں اپنی اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، مگر انہیں خیال کرنا چاہئے کہ اولاد کے لئے دولت جمع کرنے کے بجائے اسے ان کی تعلیم پر خرچ کر کے انہیں زیادہ دولت کمانے کے قابل بنانا کہیں بہتر ہے۔ اس لئے تعلیم ایسے مقدس اور نیک کام کے لئے انہیں نہایت فیاضی کے ساتھ مالی امداد دینی چاہئے۔ مجھے پورا امید ہے کہ دھرم پور کے جینی اور دوسرے معزز حضرات اسوقت زرِ تھیلی کا منہ پورا کھول دیں گے۔ آپ لوگوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کر کے میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔"

مہرشی جٹا شنکر کی زوردار تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی تقریر کے درمیان میں سامعین نے کئی مرتبہ تالیاں بجائی تھیں۔ کئی مرتبہ وہ ہنسے تھے اور کئی مرتبہ سنجیدہ بھی ہو گئے تھے۔ تقریر ختم ہونے کے بعد چندہ دینے والوں کی فہرست تیار ہونے لگی۔ اور کئی لوگ اپنے اپنے چندہ کی رقوم لکھانے لگے — کسی نے ہزار، کسی نے پانچ سو، کسی نے سو، کسی نے پچاس۔ اس طرح سب نے اپنی اپنی رقمیں لکھوا دیں اور چندہ کے اعداد تھوڑی دیر میں چالیس ہزار تک پہنچ گئے۔ آخر میں والد صاحب نے مہرشی جٹا شنکر کا شکریہ ادا کیا اور اپنی طرف سے ہائی اسکول کے لئے دس ہزار نقد اور اپنا ایک بڑا مکان وقف کرنے کا اعلان کیا۔ اس طرح جلسہ کی کارروائی ختم ہوئی۔ لوگ ہائی اسکول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مہرشی، میں، والد صاحب اور دیال موٹر سے ہمارے گھر آ گئے۔

مہرشی کو ایک ضروری کام کے لئے فوراً تارہ پور واپس جانا تھا۔ چنانچہ جب میری ماں نے ان سے کھانے کے لئے درخواست کی تو انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا — "اب تو ہم اپنا اسکول بھی یہاں کھول رہے ہیں۔ اس لئے میں تو اب ہر روز ہی یہاں کھانا کھایا کروں گا۔ صرف آج کیلئے معاف کر دیجئے۔"

میں، مہرشی، دیال، والد صاحب اور گاؤں کے چند معزز لوگ ہمارے گھر میں میرے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ نوکر چائے لے آیا۔ بائیجانے میز پر ناشتہ پہلے سے ہی سجا کر قاعدے سے رکھ دیا تھا۔ میں نے بھی کئی مرتبہ اس کی ٹریننگ دے رکھی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مہرشی نے کہا —

"دیال، تمہاری اسسٹنٹ تم سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔" دیال نے کہا۔

نہایت سادگی کے ساتھ دیال شیلف پر رکھے ہوئے اخباروں کے ان شماروں کو دیکھنے لگا جن میں میرے مضامین شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے الماریوں کے شیشے میں سے میری کتابوں کے ذخیرہ پر نظر ڈالی۔ پھر مہرشی سے کہا — "گروجی، ہمارے اسکول کی لائبریری تو پہلے سے ہی تیار ہے۔"

"آپ کے اسکول کے لئے والد صاحب نے دس ہزار روپے دیئے، ایک مکان دیا، گاؤں والوں نے چالیس ہزار روپے دیئے اور میں نے بغیر معاوضہ کے کام کرنا منظور کر لیا اور اس کے اوپر آپ کی نظر میری لائبریری پر بھی ہے۔ میں اسے نہیں دوں گی۔ وہ تو عورت کی دولت ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔

اس کے بعد مہرشی نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب آپ ہمیں رخصت کیجئے۔ تین چار روز کے بعد دیال یہاں رہنے کے لئے آجائیں گے۔ تب تک آپ اسکول کی عمارت کو ٹھیک کرا دیجئے گا۔ رقم جمع کر لی جائے۔ اسکول کے لئے ضروری فرنیچر خرید لیجئے اور اسی سے کام شروع کر دیجئے۔"

سب لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو دیال" مہرشی نے کہا۔

مہرشی اور دیال موٹر میں بیٹھے۔ ہم لوگ انہیں رخصت کرنے کے لئے گھر کے باہر کھڑی ہوئی ان کی موٹر تک گئے۔ موٹر کے ارد گرد لوگوں کی کافی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ہم سب نے مہرشی کو سلام کیا اور مہرشی نے اس کا جواب دیا۔

میں نے دیال کی طرف دیکھا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں دل ہی دل میں ہنس پڑے۔ موٹر اسٹارٹ ہو گئی، ہم لوگ واپس آ گئے۔

رات کے نو بجے تھے۔ باہر سفید چاندنی چھٹک رہی تھی — میں دوسری منزل پر اپنے مطالعہ کے کمرے میں آئی اور بیٹھ کر اخباروں کے لئے آج کے جلسہ کی رپورٹ لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ کھڑکی سے میں نے یونہی باہر جھانک کر دیکھا اور گیلری میں چلی گئی۔

باہر بڑا خوبصورت منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا پہاڑ، درخت اور مکانات چاندنی میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہوا ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ مغرب میں دریائے کرشنا کا ساحل درختوں سے ڈھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مشرق کی جانب ہری فصلیں ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ادھر میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے سنی ہوئی مہرشی کی تقریر بڑی تیزی سے ہلچل مچا رہی تھی۔ گاؤں کی یہ خوبصورتی آج تک مجھے اتنی دلکش کبھی نہ معلوم ہوئی تھی۔ میں اس گاؤں میں چھوٹی سے بڑی ہوئی، سانگلی میں پڑھی اور کئی مرتبہ اس گاؤں میں آئی۔ مگر بہت زیادہ پہچان ہونے کی وجہ سے مجھے گاؤں کا یہ حسن کبھی نظر نہ آیا۔ اس کی قیمت کا میں اندازہ نہ لگا سکی۔ کیونکہ اس سے پہلے مہرشی ایسے کسی عظیم شخص نے میرے کان میں یہ بات بھی کہہ دی تھی کہ شہر کی نسبت گاؤں قدرتی طور پر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور انہیں ہر طرح سے خوبصورت بنانا چاہیے۔"

بہت دیر تک گیلری میں کھڑی ہوئی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ خیالات کا تسلسل برابر جاری تھا۔ اسی وقت صحن میں ایک کتا رونے لگا۔ دو لو نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میں کمرہ میں آئی اور رپورٹ لکھنے لگی۔ لیکن رہ رہ کر ایک خیال میرے دل میں جھانک جھانک تھا کہ قدرتی مناظر کی خوبصورتی کو دیکھنا چھوڑ کر کتا رو کیوں رہا تھا؟

آدھی رات گذر جانے کے بعد میں اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ میرے دل میں یکے بعد دیگرے خیالات ابھرنے لگے — کبھی اپنے بارے میں خیالات اٹھتے، کبھی دیال کے بارے میں اور کبھی مہرشی کے متعلق۔ اسوقت میرا دل خیالات کی لہروں میں غوطے لگا رہا تھا۔ بادِ نسیم چلی، اور میری آنکھ کب لگ گئی اس کا مجھے پتہ تک نہ چلا۔

دن پر دن بیتے جا رہے تھے۔ اسکول کا کام سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ والد صاحب نے مزدور لگا کر اسکول کی عمارت کی مرمت، صفائی اور روغن و سفیدی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ سانگلی جا کر مدرسہ کے لئے ضروری فرنیچر کا وہ آرڈر بھی دے آئے تھے۔ معمولی طور پر سو لڑکوں کے بیٹھنے کا بندوبست تو ہو گیا تھا۔ میں، والد صاحب اور گاؤں کے دو معزز صاحبان لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔

چار روز کے بعد اندرجیت دیال ایک صندوق میں اپنا سامان لے کر پہنچے۔ اس وقت والد صاحب گھر میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے چند لوگوں کے جھگڑے فیصل کر رہے تھے۔ میں اٹاری پر اپنے کمرہ میں تھی۔ والد صاحب نے اندرجیت کا خیر مقدم کیا، اور مجھے آواز دی — "ممتی، ممتی!" میں نیچے آئی اور دیکھا تو دیال سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا کر ہاتھ جوڑے۔

میں نے ان سے کہا — "آیئے اوپر میرے کمرہ میں چلئے۔"

انہوں نے کہا — "نہیں، میں اسکول میں ہی رہوں گا۔"

میں نے اور والد صاحب نے اصرار کیا کہ وہ ہمارے گھر پر ہی قیام کریں، مگر وہ نہ مانے۔ آخرکار دو لو انہیں اسکول لے گیا۔ تین چار روز تک ہم اپنے گھر سے ہی انہیں کھانا بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنا کھانا خود تیار کرنے لگے۔ ہمارے گھر کھانا کھانے کے لئے وہ کبھی نہ آئے۔ ہمارے گھر کبھی نہ آیا کرتے تھے۔ بعض اوقات میں ہی اسکول میں ان کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ انہوں نے ایک کمرہ میں اپنا آفس سجا لیا تھا اور

دوسرے کمرہ میں اپنے رہنے، سونے اور کھانا پکانے کا انتظام کر لیا تھا۔

ہم دونوں کبھی کبھی چندہ وصول کرنے ساتھ ساتھ جاتے۔ لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ ویسے بظاہر تو وہ لوگ اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کو اس طرح ساتھ ساتھ رہتے ہوئے دیکھ کر خوش نہ تھے۔ جب ہم لوگ چندہ مانگتے تو بعض لوگ طرح طرح کے عذر پیش کرتے۔ کچھ لوگ آج دیں گے، کل دیں گے، کہہ کر ٹال دیتے۔ اور بعض لوگوں سے ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ کچھ لوگ آدھی ہی رقم دیتے اور باقی پھر دینے کا وعدہ کر دیتے۔ بعض لوگ ایسے بھی ملتے جو جاتے ہی پوری رقم دے دیتے تھے۔ اس سے مجھے اور دیال کو پورا تجربہ ہو گیا کہ سماجی کام میں کتنی محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسکول میں کبھی کبھی گاؤں کے لوگ بھی جا کر بیٹھ جاتے اور اس کے بارے میں کئی قسم کے استفسارات کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ وہاں بیٹھے بیٹھے پان اور تمباکو کھایا کرتے اور بیڑی پیا کرتے تھے۔ بعض لوگ محض گپ لڑانے کے لئے ہی آ جاتے تھے۔ گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں مجھے اور دیال کو گھیر لیتے اور کہتے —— "ہم بھی تمہارے اسکول میں پڑھنے کیلئے آئیں گے۔"

دیال کا روزانہ کا پروگرام گھڑی کی طرح وقت پر ہوا کرتا تھا۔ پو پھٹتے ہی وہ جاگ جاتے۔ دریا پر جا کر نہاتے اور اس کے بعد اپنا کھانا تیار کرتے اور اس کے بعد اسکول کا کام کرتے تھے۔ کتابیں اور اخبارات پڑھتے رہتے تھے۔ اور جب شام ہوتی تو گاؤں کے باہر ٹہلنے نکل جاتے۔ واپسی پر جین مندر میں جاتے اور دور کھڑے ہو کر درشن کرتے تھے۔ ان کی زبان بہت شیریں تھی جو دوسروں کو قابو میں کرنے کا کام کرتی تھی۔ سب سے ان کا سلوک محبت اور احترام کا تھا۔ اس لئے ذات کے اچھوت ہونے کے باوجود لوگوں کے خیالات ان کے لئے اچھے ہوتے گئے۔ "ماسٹر بھلا ہے، کوئی ذات ہو ہمیں اس سے کیا سروکار، ہم تو اتنا چاہتے ہیں کہ وہ لڑکوں کو اچھی طرح پڑھاتا رہے۔" اس طرح لوگ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔

ایک روز میں اسکول گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ڈاکیا آ کر اسکول کی ڈاک دے گیا تھا۔ اور دیال اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا جو کہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر سے خط نکالا اور پڑھنے لگی۔ وہ خط مندرجہ ذیل تھا ——

تارہ پور

۱۰ فروری ۱۹۴۸ء

پیارے دیال، دعائیں

دھرم پور سے واپس آتے وقت موٹر میں میں نے تمہیں اپنے کام اور ذمہ داری کا صحیح نقشہ بتا دیا تھا۔ پونہ سے یہاں واپس آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور پہنچ گئے ہو۔ یہ مناسب ہی ہوا۔ جاتے وقت میں تمہیں کچھ اور بھی باتیں بتانا چاہتا تھا۔ ویسے تو تم خود ہی عقلمند اور سمجھدار ہو۔ پھر بھی میں نے خیال کیا کہ ایک خط لکھ ہی دوں اور تمہیں صورت حال سے آگاہ کر دوں تاکہ تم اپنا کام زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکو۔ میری خواہش ہے کہ تم اس خط پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

دھرم پور کے جلسہ میں تم خود بھی موجود تھے اور تم نے وہاں کے لوگوں کے جوش و خروش کو دیکھا تھا، پھر بھی تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھلے کے ساتھ برا بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔ نیک اور بد کی جنگ شروع ہوتی ہے اور جو زبردست ہوتا ہے اسی کی فتح ہوا کرتی ہے۔ ہم نے اسکول قائم کر دیا ہے لیکن ہم اگر اپنے فرض اور ذمہ داری سے ذرا بھی ہٹے تو آئندہ کیا نتیجہ برآمد ہوگا اس کے متعلق آج ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لوگوں کو شک کے لئے ذرا بھی موقع نہ ملنا چاہئے۔ گاؤں کے لوگ پتھر کو دیوتا کہیں گے اور اس کی پرستش کریں گے۔ مگر جب ایک بار اس کے اوپر سے ان کا ایمان اٹھ جاتا ہے تو وہ اس دیوتا کو بھی پتھر سمجھ کر توڑ ڈالتے ہیں۔

دیال تم پر مجھے پورا اعتماد ہے اور اسی لئے دھرم پور کے نئے اسکول کا کام چلانے کے لئے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ تم سے میں بڑی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہوں۔ میں اس غم میں گھلتا رہتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے بلکہ میری تو شب و روز یہی دعا ہے کہ تمہاری دن بدن ترقی ہو۔

دھرم پور میں سناتنی جینیوں کی کثیر تعداد ہے۔ ان جیسے پاک صاف لوگ تمہیں دوسری ذاتوں میں کم ملیں گے۔ تم یہ نہ بھولنا کہ ہریجن ہو، اچھوت ہو۔ ہم مساوات کا خواہ کتنا ہی پروپیگنڈہ کیوں نہ کریں پھر بھی جاہل ہونے کی وجہ سے گاؤں والے اس جذبہ کو جلد نہیں سمجھ پاتے اور نہ ہی اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اصلاح کا کام چیونٹی کی چال

کی آمد نہایت سست رفتاری سے ہوا کرتا ہے۔ بلا وجہ تم کہیں نہ جایا کرو، تمہارے جانے سے اگر کسی کے جذبات برہم ہوگئے ہیں تو تم اس کے گھر ہرگز نہ جایا کرو۔ صورت حال دیکھ کر کام کرنا سیکھو۔

تم نے جین مذہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ روز جین مندر میں جاکر درشن کر لیا کرو۔ جینیوں کے تیوہار پر انہیں چھوئے بغیر ان کے سامنے جین مذہب کے اوصاف بیان کرکے انہیں اپنے مذہب سے واقف کرایا کرو۔ بعد ازاں وہ تمہارا احترام کرنے لگیں گے اور پھر تمہیں جین سمجھنے لگیں گے۔

ایک اور اہم بات تمہیں تحریر کر دینا چاہتا ہوں ـــــ تم غیر شادی شدہ ہو۔ تمہاری معاون کنول بھی کنواری ہے۔ چنانچہ تمہیں ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔ تاکہ تم پر کوئی کسی قسم کا شک نہ کرے۔ تم چاہو تو یہ خط کنول کو بھی دکھا سکتے ہو۔ بس کنول تمہاری مددگار رہے پھر بھی کسی طرح اسے تکلیف نہ دینا۔ وہ ایک ہونہار لڑکی ہے۔ معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہے یہ نہ بھولنا۔ اس کی رائے کے مطابق سب کام کرتے رہو۔

دادا جی کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان سے بھی بعض اوقات مل کر صلاح مشورہ لے لیا کرو۔ حلیمی اور اخلاق سے پیش آیا کرو۔ تم عقلمند اور سمجھدار ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ وہی کرو گے جو مناسب ہوگا۔ پھر بھی میں نے تمہیں یہ خط لکھ دیا ہے تاکہ نئے کام کے جوش میں تم اپنے فرض کو نہ بھول جاؤ۔ دادا جی کو میرا سلام اور کنول کو دعا۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ خط لکھ کر اسکول کی ترقی کی خبر دیتے رہا کرو گے۔

تمہارا
جٹا شنکر

خط پڑھ کر میں نے دیال کو واپس دیدیا۔ وہ دوسرے خط پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "سیٹھ جی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے"۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی اسکول کا فرنیچر آگیا ـــ بنچ، کرسیاں، سیاہ تختے، میزیں وغیرہ۔ سامان دو کمروں میں قاعدے سے رکھ دیا گیا۔ فی الحال دو جماعتوں کا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی میری کچھ الماریاں بھی اسکول کی لائبریری کے لئے ایک کمرہ میں باقاعدہ رکھ دی گئی تھیں۔ سائنس پڑھانے کے لئے ضروری ساز و سامان بھی منگوا لیا گیا تھا۔ اب تک آٹھویں جماعت کے لئے سو طلباء کے نام درج ہو چکے تھے۔ پہلے تو ایک ہی جماعت رکھنے کا خیال تھا مگر طلباء کی تعداد بڑھ جانے کے سبب سے اس کے دو سیکشن کرنے پڑ گئے۔ پرائمری اسکول کے چند اساتذہ نے ہائی اسکول کی جماعت میں کچھ بعض مضامین پڑھانے کا بیڑہ اٹھا لیا۔

درمیان میں ایک روز میں نے دیال کو اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کا مطلب میں سمجھ گئی۔ اور میں نے انہیں راضی کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر اس میں مجھے کامیابی نہ ہوئی۔

اب تک چندے کی نصف سے زیادہ رقم وصول ہو چکی تھی۔ والد صاحب نے فرنیچر اور سائنس کے آلات وغیرہ دے کر اپنے چندے کے دس ہزار روپے پورے کر دیئے تھے۔

ماں اور دھرم پور کی دوسری جین خواتین کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ ان کے ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک اچھوت ہو۔ مگر اس امید پر کہ ایک برس بعد اس کا تبادلہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا کوئی اچھی ذات کا آدمی آجائے گا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص تنقید نہیں کی۔

اسکول کا کام شروع ہونے کے لئے صرف تین روز باقی رہ گئے تھے۔ میں اسکول گئی تھی۔ دیال اسکول کا ٹائم ٹیبل بنانے میں مصروف تھے۔ جب وہ مکمل ہو گیا تو اسے میری طرف بڑھا کر انہوں نے مجھ سے کہا۔ "دیکھئے تو آپ کو یہ پسند ہے یا نہیں؟"

"جو ہیڈ ماسٹر کو پسند ہے وہ نائب مدرس کو بھی پسند ہے"۔ میں نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد لائبریری سے دو کتابیں لے کر میں گھر جانے کے لئے آفس سے باہر نکل رہی تھی کہ دفتری ڈاکخانہ سے گھر کی ڈاک لے کر وہاں آگیا۔ اسکول کی ڈاک میں نے دیال کو دیدی اور اپنی ڈاک دیکھنے لگی ـــــ دو خطوط تو میری سہیلیوں کے تھے جنہوں نے اخباروں میں دھرم پور کے جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر مجھے مبارکباد دی تھی۔ تین خط ایڈیٹروں کے تھے جنہوں نے اپنے اخباروں کے لئے مضامین بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ دو ہفتہ وار اخبار تھے اور تین ماہنامے تھے۔ ان کے ساتھ دو لفافے اور تھے۔ پتہ نہ چلا کہ وہ کس نے بھیجے تھے۔ میں نے انہیں

کھول کر دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ مگر وہاں پاس ہی کئی بیٹھے تھے اسلئے منہ کچھ نہ بولی اور میں نے اپنے چہرے پر خوف کے کوئی بھی تاثرات پیدا نہیں ہونے دیئے۔ میں فوراً گھر کی جانب چل پڑی ـــــ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی میں گھر پہنچی۔ اپنے کمرے میں جاکر میں نے ساری ڈاک میز پر پھینک دی اور دھم سے چارپائی پر پڑ گئی۔

۳

اس روز رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ درمیان میں کئی مرتبہ جاگ کر میں گھڑی کی طرف دیکھتی تھی۔ نیم بیداری اور متعدد خیالات کے باعث میرا سر چکرا رہا تھا۔ کئی مرتبہ معمولی بات جو ہمارے روزمرہ کے مطلب کی ہوتی ہے ہمیں خاص اہم نہیں معلوم ہوتی مگر جب اس کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ ہمیں بہت کھٹکنے لگتی ہے اور ہم اس کی اہمیت کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اس روز نیند کے متعلق میرا کچھ یہی حال تھا۔ چنانچہ میں نے نیند کی اہمیت کو منظور کر لیا۔ مریض کے لئے جس طرح دوا ہوتی ہے اسی طرح ہر جاندار کے لئے نیند ایک ایسی ہی قدرتی دوا یا معجون ہے۔

سویرا ہوا۔ مرغ نے بانگ دی۔ چکیاں پیسنے والی عورتوں کے سریلے گیت کان میں پڑنے لگے۔ گاؤں کے مویشی دریا اور کھیتوں کی جانب روانہ ہونے لگے۔ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی میٹھی آواز سنائی دینے لگی۔ دریائے کرشنا میں نہانے والی اور پانی بھرنے والی لڑکیوں کی باتیں سنائی پڑنے لگیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہو گئی۔ غرضیکہ حضرت شمس نے سب کو بیدار کر دیا اور کہا۔ اٹھو، ہماری فکر کرو، لگو اپنے کام میں۔

میری آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ میں نے منہ دھویا۔ اسٹو پر خود چائے تیار کر کے پی لی۔ قریب ہی میز پر پڑے ہوئے گمنام خطوں پر دوبارہ میری نظر پڑی۔ کل سے میں نے انہیں کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ پھر بھی میں نے انہیں ایک مرتبہ اور پڑھا۔ دونوں خطوں کا مضمون ایک ہی تھا کہ ہمارے گاؤں سے اس چمار کو جلد بھگا دو۔ اگر تم یہ نہ کرو گی تو ہم وہی سمجھیں گے جو عموماً ہمیں سمجھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ ہم ایک دن تمہارے اسکول کو......

توقع کیوں کروں؟ آگے کے الفاظ تھے۔ آگ لگا دیں گے۔ یہ خطوط کسی ایسے آدمی نے لکھے ہوں گے جسے دوسروں کے "بنتے" ہوئے کام کو بگاڑنے میں لطف آتا ہوگا۔ ان کے ساتھی بھی ضرور ہوں گے۔ کل سے میرے دل میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اوپر سے خاموش نظر آنے والے سمندر میں آگ چھپی ہوتی ہے۔ یہ بیان بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اگر کل نہ ہوتا تو جلسہ میں بیٹھ کر بلند آواز سے نعرے لگا کر اور دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر ہمارے مقدس کام کی تعریف کرنے والے لوگوں سے ایسے خطوط مجھے کبھی وصول نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ میرا جی چاہا کہ یہ خطوط والد صاحب کو دکھادوں، مگر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب جیسے ہاتھ ملانے والے شخص کو دنیا کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنا میں سکھا دوں۔ یہ مناسب نہیں۔ ان کے جوش کو ختم کرنا مجھے کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ شنکر جی نے جس طرح زہر خود ہی پی لیا تھا میں بھی اسی طرح یہ زہر پی کر ہضم کر لوں گی۔

ویسے تو اس خط کے بارے میں ایک لفظ کہنا بھی مناسب نہ ہوگا۔ بعض معمولی باتیں ناقابلِ توجہ ہوتی ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر کئے بغیر ہی انہیں ختم کر دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی ان خطوط کے متعلق یہی فیصلہ کیا۔ لیکن مجھے یہ خیال بار بار پریشان کر دیتا تھا۔ کہ زہر کی ایک بوند اور آگ کی ایک چنگاری بھی بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ ایک طرح سے میری سادہ لوحِ زندگی کا پہلا موڑ تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسے ہی کئی موڑ میری زندگی میں آئیں گے اور مجھے ان کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

میرا خیال تھا کہ ان خطوط کو ضائع کر دوں پھر میں نے سوچا کہ انہیں کسی محفوظ جگہ کیوں نہ رکھ دوں۔ اگر ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں تو دنیا تھوڑی اپنی آنکھیں موند لے گی۔ تو کیا پھر ہمیں بھی اپنی آنکھیں کھول کر چلنا چاہیئے۔ بالآخر میں نے ان خطوط کو ایک مضبوط صندوق میں رکھ کر اس میں ایک ڈبل تالا ڈال دیا اور تہیہ کر لیا کہ اب نہ کبھی ان خطوں کو نکالوں گی، نہ پڑھوں گی اور نہ کسی کو دکھاؤں گی۔ مگر ہاں خطوط کو تالے میں بند کرنے سے پہلے میں نے کئی مرتبہ انہیں پڑھ لیا۔

اطلاع گذشتہ کے مطابق ہمارا اسکول یکم مارچ کو شروع ہو گیا تھا۔ آٹھویں جماعت کے دو سیکشن تھے۔ دونوں درجوں کو میں اور دیال صاحب گیارہ بجے سے لے کر شام کے ساڑھے چار بجے تک باری باری سے پڑھاتے تھے۔ درمیان وقفہ کو چھوڑ کر مجھے یا دیال کو ان اوقات میں آرام بالکل نہ ملتا تھا۔

[illegible] سے پڑھاتے تھے اس لئے طلباء بہت خوش [illegible]

[illegible] اسکول میں صرف نصاب ہی کی تو تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ پورا نصب العین یہ تھا کہ طلباء کی ہر طرح سے ترقی ہو۔ یہاں صرف ہمارے گاؤں کے [illegible] نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسرے گاؤں سے آکر بھی چند لڑکے [illegible] تھے۔ ایسے لڑکوں کے لئے اسکول کی عمارت کے ایک حصہ میں بورڈنگ [illegible] گیا تھا۔ جہاں ان کے رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ اسکول میں پڑھائی مختلف موضوعات پر دلچسپ اور مفید تقریروں کے علاوہ کبھی جلسے، کبھی تفریح کی دوسری تقریبات، کبھی پکنک اور کبھی کبھی جشن وغیرہ بھی منائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلباء کو کبھی اسکول سے اکتاہٹ نہ ہوتی تھی۔

اسکول میں بے غرض کام کرنے کے باعث دیال کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اہمیت حاصل ہو گئی۔

دیال ہر مذہب کا احترام کرتے تھے اور جب کبھی کوئی تیوہار ہوتا تو وہ اس تیوہار کی اہمیت پر تقریر کرنے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کی تقریر سن کر سبھی سامعین متاثر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاویر جینتی کے موقع پر انہوں نے جو تقریر کی تو اس جلسہ کے مقرر خاص نے ان کا شکریہ ادا کرتے وقت یہاں تک کہہ ڈالا کہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جین مذہب کے متعلق ایسی تفصیلی، مناسب اور خوبصورت معلومات دینے والے آپ کے مقرر سچے جینی ہیں اور محض جینی کہلانے والے جینی ——— ہم لوگ اچھوت ہیں۔

دراصل دیال ہر لحاظ سے ایک عام جینی سے ہزار گنا بڑھ کر جینی تھے۔ مگر وہ جینی خاندان میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ اور اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

اور اگر ان کا جینی خاندان سے تعلق ہوتا تو . . . .

تو کیا؟ میری ماں کی ہوس پوری ہو جاتی۔ انہیں حسب منشا ایک گھر جمائی مل جاتا۔ کون سی کمی ہے دیال میں؟ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے اور ذہین ہے۔ موجودہ پڑھے لکھے لوگوں کی مانند وہ محض تعلیمیافتہ نہیں بلکہ ان کا دل تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گیا ہے۔ بس وہ پیدا چمار کے خاندان میں ہوئے ہیں یہی ان کا عیب ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرے سنہرے سپنے ٹوٹ جاتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا دل پر لگا کر جانے کتنی بلندی پر اڑتا رہتا۔ میں ان سے شادی کر لیتی۔ وہ گھر داماد ہو جاتے۔ والد صاحب بڑی خوشی سے انہیں دھرم پور کی زمینداری سونپ دیتے۔ ان کے ساتھ رہ کر مجھے کس قدر لطف آتا۔ میری آئندہ پشت کس قدر ذہین، خوبصورت اور مہذب ہوتی۔ مگر راون سیتا کو اغوا کرتے وقت جس طرح جٹایو کے پر توڑ کر سیتا کو لے کر بھاگ گیا تھا اسی طرح پر کٹے جٹایو کی مانند لاچار ہو کر تخیل کی پرواز سے میں نیچے گر پڑتی اور میرے خیالات و احساسات جانے کہاں غائب ہو گئے۔

وقت پرواز کر رہا تھا۔ اسکول کا کام باقاعدگی سے ہو رہا تھا۔ گاؤں والوں نے اسکول کی اہمیت قبول کر کے اپنے اپنے چندے کی بقیہ رقمیں ادا کر دی تھیں۔

دیال ہمارے گھر بہت کم آیا کرتے تھے اور جب آتے تو والد صاحب سے مل کر چلے جاتے۔ میرے پاس آنے سے وہ گریز کرتے۔ میں بھی اسکول کے وقت پر اسکول جاتی اور چھٹی ہوتے ہی گھر واپس آجاتی۔ وقفہ کے دوران یونہی کسی اخبار کی خبروں یا رسالے کے مضمونوں پر معمولی سی گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات اخباروں میں میرے مضمونوں، نظموں یا افسانوں پر دیال اپنی رائے ظاہر کیا کرتے تھے۔ کبھی میں ان سے اتفاق کرتی اور کبھی ان کی مخالفت کرتی تھی لیکن بلاشبہ مجھے ان کی قابلیت کی داد دینا پڑتی تھی۔ جب وہ میری کسی تصنیف کی تعریف کرتے تو مجھے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی ہو جانے پر ہم سب لڑکوں کو لے کر دریا پہ گئے تھے۔ لڑکے کھیل کود کے پروگرام میں مصروف تھے اور ہم دونوں گفتگو میں مصروف تھے۔ ہماری گپیں ہولا ہل کی طرح تھیں جن میں جس طرف جو چاہیں بھر دیتے ہیں اسی طرح جب گپیں ایک بار شروع ہو جاتی ہیں تو پھر یہ خیال نہیں رہتا کہ ان میں کون کون سے موضوعات شامل ہوں گے اور وہ کس طرف بہالے جائیں گے۔ ہماری باتیں جاری تھیں کہ لڑکوں کے کھیل ختم ہو گئے اور وہ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ناظرین بھی منتشر ہو گئے۔ مگر ہم دونوں ساحل کی ریت پر اپنی گفتگو میں محو بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک عرصے تک ساتھ رہنے اور وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیالات کی بدولت ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ دونوں کا مذاق ایک تھا اور مزاج میں بھی یکسانیت۔ دیال سے باتیں کرنے کے لئے میں قبل از وقت ہی اسکول پہنچ جایا کرتی تھی مگر ایک بات یہاں بتلا دینا

[illegible] کہ ہم دونوں کی دوستی کا معیار بلند تھا اس میں عریانی یا فحاشی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

سورج غروب ہو گیا تھا ہر گھر میں چراغ جل گئے تھے۔ میں نے دیال سے کہا۔

"چلیے اب [illegible] کا وقت ہو گیا۔ [illegible] سب چلے گئے۔"

"ہاں [illegible] اب ہمیں بھی چل دینا چاہیے" دیال نے کہا۔

"ہاں ورنہ لوگوں کو انگشت نمائی کا یہ سنہری موقع مل جائے گا۔

[illegible] دیال بابو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے" میں نے پوچھا۔

دیال کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ غالباً انہوں نے میری بات کا کوئی غلط مطلب سمجھا لیکن وہ خود کو سنبھال کر بولے۔

"میری شادی۔۔۔؟"

"جی ہاں، اب شادی کر لینے میں کیا حرج ہے؟ اب تو آپ کمانے بھی لگے ہیں نا؟" میں نے کہا۔

دیال اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"ابھی ولایت جانا ہے نا؟ سمیدرا کے لئے ارجن کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی تھی۔"

میں بھی اٹھی اور گھر کی طرف چلتے ہوئے میں نے سوال کر دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کی سمیدرا ولایت سے ہی آنے والی ہیں؟"

دیال نے ہنس کر کہا ـــ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہر شخص کو اپنی حالت دیکھ کر ہی کام کرنا چاہیے۔"

دونوں گھر کی جانب چل دیئے۔

میں نے سوچا اگر وہ مجھ سے شادی کے بارے میں سوال کر بیٹھتے تو میں کیا جواب دیتی۔

اب ہم گاؤں میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگ ہماری طرف ٹیڑھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور دیال کو یہ اچھا نہیں لگا۔ اسی وقت مجھے کسی نے پکارا۔

"منی! او منی!"

میں ٹھہر گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک دور کی رشتہ دار بڑھیا تھی۔ دیال کو میں نے رخصت کیا اور بڑھیا سے کہا۔

"کہیے کیا حال ہے چچا [illegible]؟"

"[illegible] تم نے اپنی شادی [illegible] اس طرح غیروں کے ساتھ گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب [illegible] ہے۔ تیرے باپ نے اور رشتے کئی روز سے [illegible] لڑکی کو اتنا پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت ہے؟ [illegible] شادی کر دو اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ۔ پر میری [illegible] اب تو بڑی ہو گئی ہے جلد کسی سے اپنی شادی کر لے۔ [illegible] بدنام کر رہے ہیں۔" آخری بات اس نے اپنے [illegible]۔

"لوگوں کا منہ کون بند کر سکتا ہے چچی [illegible] نہیں۔ اس طرح [illegible] کیسے کام چلے گا؟" [illegible] کہا۔

"دیکھ بیٹی، تو ہی جانے" بڑھیا نے کہا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

گھر آ کر میں اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لینے لگی ـــ کیا مجھ سے کوئی بھول ہو رہی ہے ـــ میں اسکول کا کام کرتی ہوں اس لئے دیال سے ملنا لازمی ہے۔ جب میں اپنے نزدیک [illegible] اس قدر صاف اور پاک ہوں تب بھلا لوگوں کو مجھ پر کیوں شبہ ہوتا ہے؟ میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں اور اس لئے میں اپنی ذمہ داری سے بھی پوری واقف ہوں۔ میری شادی ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ لوگوں کو اس میں دخل اندازی کرنے کی یا اس کے بارے میں متفکر ہونے کی کیا ضرورت؟

مگر دوسرے ہی لمحہ میرا دل مجھ سے کہتا ـــ "منی تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟ لوگ تو ایسی باتیں چراغ لے کر تلاش کرتے رہتے ہیں۔ تیرے گاؤں کے لوگ تو خیر جاہل اور گنوار ہیں لیکن شہر کے تعلیم یافتہ کہلانے والے لوگ بھی اسی طرح بہائی بہنوں کے متعلق [illegible] باتیں کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ سانگلی میں جب تو زیر تعلیم تھی تو کیا تجھے یہ تجربہ نہیں ہوا؟ تجھے نہ ہی تیری کسی سہیلی کو تو البتہ ہوا ہی ہوگا۔

لیکن ایسی بیہودہ باتوں سے انسان کا دل [illegible] ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ وہ اس قدامت پرست معاشرہ کا مقابلہ کرے۔

چند روز سے اسی قسم کے خیالات نے میرے [illegible] حرام کر دی تھی [illegible] کتنی سوئی تھی۔ ماں کہا کرتی تھیں ـــ "منی تو بہت [illegible] [illegible]"

[illegible] ہے [illegible] صاف [illegible] گیا یہ سب ہی کیں اسے [illegible] آئیں ؟ یہ سب تو میرے لئے ناقابل [illegible] میری [illegible] ذات [illegible]۔

[illegible] وہ کر لوگوں کے [illegible] ہیں جو کچھ آتے ہیں بک دیتے ہیں۔ [illegible] شادی کر لوں تو کیا ہوگا؟ لوگ کیا کریں گے، کیا [illegible] صاحب چاہیں کا کیا اثر پڑے گا؟ اس سے [illegible] جائے گی۔ اسی قسم کے خیالات میں محو میں سو گئی۔

سویرے میری جو آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہوں کہ بابتیجا صبح کی چاسٹے لئے کھڑی ہے۔ رات کو میں نے جو ایک حسین خواب دیکھا تھا اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ میں جان بھی نہ سکی تھی کہ بابتیجا نے مجھے اٹھا دیا اور میں اپنی مُنّا بھیہ نظروں سے اسے دیکھ کر یہی سوچتی رہ گئی کہ آخر میں خواب کی دنیا سے اس حقیقت کی دنیا میں کیوں آ گئی۔ کاش میں اسی میں ختم ہو جاتی ......

۴

ہمارے سماج میں جو تنوع نظر آتا ہے، جس قدر مختلف و متضاد کردار ہمیں یہاں دکھائی دیتے ہیں اس کا صحیح علم مجھے ان خبروں سے ہو گیا تھا جو بابتیجا نے مجھ تک پہنچائی تھیں۔ مجھے پورا پورا احساس تھا کہ اس دنیا میں تصنع، بناوٹ، فریب اور ڈھونگ اپنی پوری خوفناکی کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے وہ ڈھونگی لوگ جو لمبے لمبے تلک لگاتے ہیں، جسم پر خاک ملتے ہیں اور لمبے لمبے بال رکھتے ہیں وہ اپنے بھائیوں کا گلا بڑی آسانی اور مہارت کے ساتھ کاٹ دیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ بعض اوقات یہ لوگ تہذیب اور کلچر کا خون پیتے کھلے بندوں گھومتے ہیں اور کبھی ٹھگ، چور اور لٹیروں کی شکل میں سماج کو دھوکہ دیتے ہیں، اسے لوٹتے ہیں۔ اپنی خامیاں انہیں نہیں دکھائی دیتیں، دوسروں میں کیڑے نکالنے میں انہیں لطف آتا ہے۔ اگر دوسروں کی بھلائی ہو تو ان کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور اگر کسی کا نقصان ہو جائے تو یہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ہر گاؤں میں کچھ خبیث رہتے ہی ہیں۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ دھرم پور میں بھی ایسے کچھ لوگ ہیں تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوا۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دھرم پور میں اس ذہنیت کے لوگ محدودے چند ہی نہیں بلکہ ان مفسد پو من شیطانوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس میں متعدد لوگ ہیں جو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سازش کرتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کے گناہ کرنے کے باوجود وہ بگلا بھگت بنے رہتے ہیں۔

ہمارے گاؤں کا پٹواری گوپال راؤ کلکرنی اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی عمر تک بھگ پچاس سال کی تھی۔ وہ سانولے رنگ کا دبلا پتلا شخص تھا جسے کوئی معمولی سا کٹا آدمی ایک طمانچہ مار کر زمین سنگھا سکتا تھا۔ مگر اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ ہر قسم کے دھوکے فریب میں وہ ماہر تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگ پنت کہا کرتے تھے۔ پنت ہر فن مولا تھا۔ دنیا کا کوئی عیب ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہوتا۔ وہ گانجا پیتا تھا، شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا اور رنڈی باز بھی تھا اور موقع آنے پر وہ خون کرنے میں بھی نہ چوکتا تھا۔

گاؤں میں کہیں معمولی جھگڑا ہو، کوئی مار پیٹ ہو جائے یا کوئی مقدمہ ہو تو پنت کسی نہ کسی فریق کی طرفداری ضرور کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جس کام کو وہ ہاتھ میں لیتا تھا پھر وہ خواہ سچا ہو یا جھوٹا، کسی نہ کسی طرح اسے پورا کرتا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کر لیتا تھا۔ اس لئے اسے اپنی طرف کرنے اور اس کی امداد حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں اکثر کشمکش رہتی تھی۔

اس نے سینکڑوں گھروں میں زراعت کے بیج بوئے تھے، مقدمہ بازی کرائی تھی۔ کئی لوگوں کو اس نے فقیر بنا دیا تھا اور کئی گداگروں کو اس نے اتنی دولت دلوا دی تھی کہ وہ انہیں کئی پشتوں کے لئے کافی تھی۔ انہیں ذلیل حرکات سے اس نے بھی کافی پیسہ کمایا تھا مگر وہ اس کے پاس بچا نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو اس میں بُری عادتیں بے شمار تھیں۔ دوسرے وہ خرچیلا بھی بہت تھا۔ اس کی ذہانت، بُری عادت اور خرچیلے پن کے باعث اسے کئی ساتھی مل گئے تھے اور اس طرح اس کا ایک اچھا خاصا گروہ بن گیا تھا۔

جب پنت کبھی کسی میلے، سنیما یا ڈرامہ وغیرہ دیکھنے جاتا تو اس کے ساتھ اس کے گروہ کے پندرہ بیس شخص ضرور رہا کرتے تھے اور ان سب کے کھانے پینے، آنے جانے وغیرہ کا پورا خرچ وہ خود ہی برداشت کرتا تھا۔ پھر ایسے موقع پر اگر اس کے پچاس روپے بھی خرچ ہو جاتے تو وہ اس کی

پیدا و ... کرتا تھا۔

اس گروہ میں گاؤں کے کئی لوگ شامل تھے اور مذہب و ملت کا فرق ختم کر کے وہ سب متحد ہو کر اپنا کام کیا کرتے تھے۔ گروہ کے لوگوں کا پورا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ گروہ کے اندر وہ اپنی عرفیت سے ہی پکارے جاتے تھے۔ مثلاً حسینیا حسینی خاں کے لئے، شنکریا شنکر لال کے لئے اور بابیا بابو لال کے لئے وغیرہ۔ اس گروہ میں ہزمتیا، گنگو، بھیکیا، باہیا، ملیا، کلیا وغیرہ نام کے جاتے، مسلمان، دھوبی، درزی، بڑھئی، سنار، سیقی، چمار وغیرہ کئی ذاتوں اور مذہب اور پیشے کے لوگ شامل تھے۔

پنت کے مشیر خاص اور اصل میں اس کی قوت بیلیا، ملیا اور کلیا تھے۔ وہ بڑے لحیم شحیم اور طاقت ور تھے اور پنت نے بڑی چالاکی سے انہیں اپنی خدمت میں رکھ لیا تھا۔

ان کا خاص کام چوری اور لوٹ مار تھا۔ یہ چوری کر کے زیورات لاتے اور پنت کے حوالے کر دیتے تھے، پھر پنت انہیں گنگو سنار سے راتوں رات گلوا کر سکھو سیٹھ کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس میں ان تینوں کا آدھا حصہ ہوتا تھا۔ کچھ حصہ گنگو کو مل جاتا تھا، کچھ سکھو کو اور بیشتر حصہ پنت خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ حصہ سب کو دے دیتا تھا اس لئے کبھی کسی کو کوئی شکایت نہ ہوتی تھی۔ اس گروہ کے ممبروں کے پاس پستول، بلم، تلواریں وغیرہ سبھی ہتھیار موجود تھے۔ دن کے وقت تو ان ہتھیاروں کو کوئی نہ دیکھتا تھا لیکن رات کو نہ جانے کیسے نکل آتے تھے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب میں بیلیا، ملیا اور کلیا کو سنہری موقع مل گیا تھا۔ وہ وقت تھا جب انہیں اپنے جوہر دکھلانے تھے۔ انہوں نے کئی ڈاکخانے، ریلوے اسٹیشن اور سرکاری عمارتیں ایک رات میں ہی پھونک دی تھیں۔ ریل کے پل مسمار کر دیئے تھے۔ بینکوں پر ڈاکے ڈالے تھے۔ ریل گاڑیاں الٹ دی تھیں۔ جو شجاعت کبھی شیواجی کے پیروؤں نے بھی نہ دکھائی، وہ ان تینوں نے دن دہاڑے، رات میں اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دکھائی تھی۔ لوٹ مار تو بے شمار کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ یہ تینوں تین بورے نوٹ بھر کر لے آئے تھے۔

ان کاموں میں انہیں پنت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ پنت نے یہ سب ذلیل کام کئے تھے اور اسے ان پر کبھی افسوس نہ ہوا تھا۔ کسی کو اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ سب اپنے اپنے حصوں سے مطمئن تھے۔ پنت نے اس کا انتظام پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر کر دیا تھا تاکہ شکایت کا کسی کو موقع نہ ملے۔ سب خوش رہیں۔ اور کوئی بھی شکایت نہ کر سکے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب میں جو لوٹ مار ہوئی تھی اس میں پنت نے اگرچہ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن ہر کام اسی کی رائے سے ہوا کرتا تھا۔ ہر کام وہ انہیں بتایا کرتا تھا۔ اس گروہ کے کئی لوگوں کو جنگ آزادی میں جوش آیا تھا اور اس جوش سے مغلوب ہو کر انہوں نے بڑے جوش و ولولے سے اس جنگ میں پورا تعاون کیا تھا۔ مگر بیچارے بھولے بھالے لوگ کیسے جان سکتے تھے کہ اس خدمت ملک کے پس پردہ ان کی کتنی خوفناک خود غرضی اور ظلم پرستی چھپی ہوئی تھی۔

دھرم پور میں کئی انقلابی روپوش ہو کے لئے آئے تھے اور پنت نے ان کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اس لئے متعدد انقلابی پنت اور اس کے گروہ کے لوگوں سے بہت خوش ہو گئے تھے۔

پنت اس گاؤں کا پٹواری تھا۔ اس لئے اس نے گاؤں کے سرکاری ملازموں سے کہہ کر کئی مرتبہ ان انقلابیوں کا تحفظ کیا تھا۔

دادا جی دھرم پور کے سب لوگوں کو نہایت نیک اور مخلص سمجھتے تھے۔ گہرائی میں جا کر لوگوں کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اسلئے پنت جو کچھ کہتا تھا دادا جی اس کی حمایت کرتے تھے اور اسی لئے اگر کسی قسم کی تفتیش کے موقع پر کوئی سرکاری افسر کبھی آتا بھی تو وہ معمولی جانچ پڑتال کر کے اور کسی بھی گاؤں والے کو پریشان کئے بغیر اپنے ہیڈ کوارٹر کو واپس چلا جایا کرتا تھا۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور آزادی مل جانے پر دھرم پور میں انقلابیوں کا استقبال کرنے کے لئے ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے کئی انقلابیوں نے پنت اور ان کے ساتھیوں کی بہت تعریف کی تھی۔

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد جنوبی ہند میں جو بلوے اور فساد ہوئے تھے ان سے دھرم پور بالکل پاک تھا کیونکہ پنت کے حکم کے بغیر آگے کون بڑھتا؟ پنت نے اس وقت کوئی دلچسپی نہ لی تھی کیونکہ اپنے ہی ذات والوں کے خلاف وہ کیسے کھڑے ہو جاتے؟

شراب بندی قانون کے بعد بیلیا، ملیا اور کلیا نے دھرم پور کے جنگلوں، پہاڑوں اور ترائیوں میں شراب کشید کرنے کی کئی بھٹیاں کھول کر کافی روپیہ کمایا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے سبھی کاموں میں انہیں پنت کا تعاون ضرور مل جاتا تھا۔ دھرم پور کے

[illegible] جنگل میں پنت اور اس کے گروہ کے جیسے کا اڈہ تھا جہاں [illegible] گاؤں کے لوگ بھی اپنی قسمت آزمانے آجایا کرتے تھے۔ [illegible] بیا، ملیا اور کلیا بندوق اور تلوار سے لیس [illegible] نہیں تھے۔ جواریوں کو ہار جیت کچھ [illegible] پہرہ داروں کو پنت مٹھی بھر بھر کر پیسے ضرور [illegible]

گاؤں کے مشرق میں ایک چھوٹی پہاڑی پر ہنومان جی کا مندر ہے جس کے سامنے بہت جگہ خالی پڑی ہے۔ جنگل کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس طرف لوگوں کی زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی تھی۔ اس مندر میں پنت اور اس کے ساتھی کبھی کبھی تفریح کے لئے رقص و موسیقی کے پروگرام کرایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار فرش پر نوٹوں کو بچھا کر ان لوگوں نے اس پر ایک طوائف کا ننگا ناچ کرایا تھا۔

پنت اپنے بدمعاش ساتھیوں کے درمیان اسی طرح رہتا تھا جس طرح پانی میں کنول رہتا ہے۔ قرب و جوار کے علاقے میں بلیا اور اس کے ساتھیوں نے نقب لگا کر کئی چوریاں کی تھیں۔ مہو میا درزی نے اپنی پہلی بیوی کو پاگل قرار دے کر چھوڑ دیا اور بڑے ٹھاٹ باٹ سے دوسری شادی کرلی تھی۔ بالو یا جنیا جانے کہاں سے ایک نوجوان مرہٹی لڑکی بھگا لایا اور اس سے شادی کرلی۔ اس میں پنت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ گھیسو نے پنت کے مشورہ سے ایک بیوہ سنارن کی گود میں زبردستی اپنا بچہ دیدیا اور اس کی ساری جائداد ہڑپ کرلی۔ پنت کے اشارہ پر بلیا نے ایک مارواڑی کا قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں اس کی صلاح سے اس مارواڑی کی لاش کھیت میں پڑے ہوئے گھاس کے ڈھیر کے اندر رکھ کر راتوں رات پھونک دی تھی۔ ملیا چمار نے ایک ساہوکار کی ناک ہی کاٹ ڈالی تھی۔ پنت کے کہنے سے کلیا نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس طرح سیکڑوں بے گناہ لوگوں کے خون ان بدمعاشوں کی گردن پر تھے۔

بظاہر پنت بڑا سیدھا اور معصوم دکھائی دیتا تھا۔ کھادی بھی پہنتا تھا، مگر اندر سے وہ کیا تھا اس کا شاید اسے بھی علم نہ تھا۔ اس کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ تینوں لڑکیوں کی اس نے شادی بڑے ٹھاٹھ باٹ سے کی تھی۔ دو تو صاحب اولاد بھی ہوگئی تھیں۔ دونوں لڑکے سانگلی کے کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس کی بیوی بڑی سیدھی سادی عورت تھی۔ دونوں اپنے کردار کے لحاظ سے بالکل مختلف اور متضاد تھے۔

گھر میں اس کا بڑا رعب تھا۔ کسی کو چوں چرا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس کی داشتہ کا نام چندرا تھا۔ وہ دھرم پور کے ایک غریب مالی کے خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ تھی بہت خوبصورت۔ رنگ گورا اور جسم متناسب تھا۔ بچپن ہی میں گاؤں کے ایک مالی لڑکے سے اس کی شادی ہوچکی تھی۔ لڑکی بھولی بھالی تھی مگر اس کی ساس اور خسر نے اسے بہت تنگ کرنا شروع کردیا۔ ان لوگوں نے اس نوجوان لڑکی کے سر پر گھر کا کام اور گاؤں میں نوکری کا بوجھ لاد دیا۔ وہ بیچاری بکری کی طرح تھک جاتی تھی۔ اس کا شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ اس لئے یہ دیکھنے کے باوجود کہ اس کی بیوی کو پریشان کیا جارہا ہے وہ کبھی بھی اس کی طرفداری نہیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اسے ضرورت پڑنے پر مارپیٹ کیا کرتا تھا۔ اس کے ساس سسر ہمیشہ اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ میکے جاکر روپے اور کپڑے لائے۔ اور اگر وہ اس میں ناکام رہتی تو وہ اسے اور پریشان کرنے لگتے تھے۔

بیچارے ماں باپ کہاں تک دیتے رہتے؟ کوئی سیٹھ ساہوکار تو تھے نہیں۔ مزدور تھے۔ انہیں تو دو وقت روٹی بھی میسر نہ تھی۔ پھر بھی بیٹی کی تکلیف دیکھ کر انہوں نے دو ایک بار قرض لے کر اس کی ساس سسر کو خوش کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ چندرا کی تکالیف میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد چندرا کے والدین انتقال کر گئے۔ اس کے ساس اور سسر بھی مر گئے۔ لیکن شوہر شرابی ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس کی مصائب میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ وہ سبزی بیچ کر اپنی روزی چلاتی تھی اور ان سب کے باوجود وہ پاکدامن بنی رہی۔ گاؤں اور گرد و نواح کے منچلے لوگوں نے اسے خراب کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ان کے چنگل میں نہ پھنسی۔ گاہک عموماً اس کی سبزی نہ دیکھ کر اس کی صورت دیکھ کر سبزی خریدا کرتے تھے۔

پنت کے گھر بھی وہی سبزی دینے آیا کرتی تھی۔ پنت کی نظر بد اس پر پڑی اور اس نے اپنی شیریں زبان اور عیاری سے چندرا کو اپنے دام فریب میں پھنسا لیا اور اس طرح کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکی۔

پنت سے چندرا کے تعلقات بڑھتے گئے اور نتیجتاً پنت کی ہی ہو رہی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ پنت نے اس کے تکلیف دینے والے شوہر کو اسی کے ہاتھوں مروا ڈالا۔

ایک مرتبہ چندرا کا شوہر بیمار میں مبتلا تھا اور پنت کے کہنے سے چندرا نے دوا میں زہر ملا کر اسے پلا دیا اور اس نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ اس نے راتوں رات اپنے شوہر کی لاش پھنکوا دی۔ پنت کے ساتھی ماتم پرسی کے لئے اس کے ہاں گئے اور سارے گاؤں میں یہ مشہور کر دیا کہ چندرا سے انہیں پوری ہمدردی ہے اور یہ کہ بیچاری پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔

چندرا اب مکمل طور پر پنت کی ہو گئی تھی۔ پنت کے گروہ میں اس کا بڑا اہم مقام تھا۔ وہ ترکاری بیچنے کی غرض سے گھر گھر جایا کرتی تھی اور وہاں کی ساری خبریں پنت کو لا کر دیتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ قرب و جوار کے علاقہ میں سبزی ترکاری بیچنے کے بہانے سے جا کر کہاں کس طرح چوری یا لوٹ مار کی جا سکتی ہے اس کا بھی پتہ وہ پنت، ملیا، ملیا اور کلیا کو دیتی تھی۔ اس گروہ کے دو شعبے —— پروپیگنڈہ اور جاسوسی اس نے سنبھال لئے تھے اور وہ یہ دونوں کام بطریق احسن انجام دے رہی تھی۔

سینے میں تنگ چولی، جسم پر سفید چھپی ہوئی ساڑی، سر پر ترکاری کا ڈلیا، منہ میں پان اور کمر میں بٹوا دبائے جب وہ چپلیں چٹخاتی ہوئی اور عالم شباب میں اٹھلاتی ہوئی یہ مالن جب بھری جوانی اور ترکاری کی ڈلیا کا بوجھ لے کر نکلتی تھی تو مڑ کے اس کی طرف نہ دیکھ کر آگے بڑھ جانے والا شاید ہی کوئی ہوتا ہو۔

چندرا نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورتیں کسی بھی کام میں مردوں کی برابری کر سکتی ہیں۔ وہ پنت کے ساتھ گانجا پیتی، شراب پیتی، جوا کھیلتی اور عریاں سے عریاں رقص دیکھنے کے لئے بھی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی اور......

جب پنت کسی میلے میں یا ڈرامہ یا سینما دیکھنے سانگلی جاتا تو اپنے ساتھ چندرا کو ضرور لے جاتا تھا۔ چندرا کے ساتھ ہونے سے پنت اور اس کے ساتھیوں کو کافی سہولت ہو جاتی تھی۔ کیونکہ ایسے موقع پر پنت دل کھول کر خرچ کرتا تھا، چنانچہ اس کے پیرو کہا کرتے تھے ——

"چندرا کے بغیر رات سونی رہتی ہے"

چندرا کی اہمیت کو محسوس کر کے پنت نے اس کی ہر ایک خواہش پوری کی تھی۔ جتنا خیال وہ چندرا کا رکھتا تھا اتنا اس نے کبھی اپنے گھر کا بھی نہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہنستا اور اسی کے ساتھ روتا تھا۔ اپنی قانونی بیوی کے سر پر جوتے مارنے والا مرد داشتہ کے جوتے اپنے

سر پر رکھنے کے لئے کیسے تیار ہو جاتا ہے [illegible] بہت تھا۔

تاریک شب میں بجلی کی روشنی کی جس طرح [illegible] ثابت ہوتی ہے اسی طرح بائیجا کی یہ تمام باتیں [illegible] غائب ہو گئی۔ بائیجا نے میرے تاریک دماغ کو روشنی [illegible] دیوالی اس دنیا کو بہشت اور اس دنیا کے انسانوں کو [illegible] اور اس کے مطابق عمل کر رہی تھی۔

بائیجا نے مزید کہا۔

"مکتی بیبی! کل میں ندی پر کپڑے دھونے گئی تھی۔ میں اپنا کام جلدی ختم کرنا چاہتی تھی اس لئے دوسری عورتوں کی طرف میں نے دیکھا تک نہیں۔ میں سر نیچا کئے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھی کہ تھوڑی دیر میں ایک عورت گھٹنوں تک ساڑی چڑھائے ہوئے میرے پاس آئی اور بولی۔

"بائیجا کیا تیری مکتی بیبی دیال ماسٹر سے شادی....؟"

"کون بکتا ہے؟" میں نے غضبناک ہو کر کہا۔

"سارا گاؤں چہ میگوئیاں کر رہا ہے" اس نے کہا۔

"گاؤں کو دوسرا کام ہی کیا ہے" میں نے کہا۔

"کیوں اڑتی ہو۔ بنا آگ کے بھی کہیں دھواں اٹھتا ہے" اس نے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"رسی کو سانپ سمجھ کر مار رہے ہیں سب لوگ۔ اس کے علاوہ کیا کہا جائے؟" میں نے کہا۔

"کس نے دی ہے تجھے یہ خبر؟" میں نے پھر اس سے دریافت کیا۔

"چندرا مالن نے"

"اس مکتی کے پاس اور کام ہی کیا ہے۔ اس گاؤں کی گوری کی بات کا کیا اعتبار۔ وہ تو سمجھتی ہے کہ سب عورتیں اسی کی طرح ہیں"

بائیجا نے کہا کہ ایک روز وہ پنت بھیا [illegible] گئی تھی اور اس سے چند عورتوں نے ٹھیک یہی سوال دوہرایا تھا۔ اور اس نے بڑے وثوق کے ساتھ اس افواہ کو بے بنیاد اور جھوٹ بتا دیا تھا۔ جب اس نے ان عورتوں سے اس خبر کے بارے میں دریافت کیا کہ انہیں کیسے معلوم ہوا تو انہوں نے بھی چندرا مالن کا ہی نام لیا تھا۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ پنت کے گروہ نے اور خصوصاً چندرا مالن نے

[illegible] کس طرح منہ چھپانا شروع کر دیا ہے۔ میں اب [illegible] کام غلطیوں کو میں نے اپنے صندوق میں محفوظ [illegible] ہیں۔

اب [illegible] مدت قبل ماں نے مجھے جو لمبا سا [illegible] اس وقت دوپہر کو ماں اپنی بیٹھک میں آرام کر رہی تھیں۔ [illegible] دور ہی ایک طرف بابا بیٹھی تھی اور دوسری طرف [illegible] صاف کر رہی تھیں۔ اسکول کی [illegible] میں بھی گھر پر ہی تھی۔ چونکہ میں کچھ تکان محسوس کر رہی تھی [illegible] اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں آ گئی۔ میں چاہتی تھی کہ ماں کے پاس بیٹھوں کہ اتنے میں ماں نے کہا۔

"[illegible] ادھر آؤ۔"

"[illegible] کہئے" یہ کہہ کر میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ماں نے کہا۔

"اب میں تجھے کیا کہوں؟ جب تو چھوٹی تھی تب میں نے تجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ لڑکیوں کو کس طرح رہنا چاہئے اور کس قسم کا سلوک کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں میں نے تجھے اس وقت بتلائی تھیں اور اب تو بڑی ہو گئی ہے، تعلیم یافتہ ہو گئی ہے۔ ساری باتیں اب تجھے اپنے آپ سمجھ میں آ جائیں گی۔"

میں نے درمیان میں ٹوک کر کہا ... "ہاں ماں، یہ تو ٹھیک بات۔"

ماں نے جواب دیا ... "تو تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ لوگ تیرے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ تو وہاں ماسٹر سے زیادہ قریب نہ رہ سکے۔ اس کے ساتھ تنہا گھومنے نہ جایا کر۔"

"اس سب کا کیا مطلب ہے ماں؟ کیا میں اسکول نہ جایا کروں؟ ایک ہی مدرسہ کے استاد اگر آپس میں گفتگو نہ کریں گے تو وہاں کا کام کس طرح چلے گا؟ اسکول کے اوقات کے علاوہ کیا میں دیال کے پاس جاتی ہوں؟ کب اس کے ساتھ گھومنے جاتی ہوں؟ لوگوں کو بدنام کرنے میں کیا لگتا ہے [illegible] سکتے ہیں۔ یہاں تک چھوٹی سے بڑی ہوئی۔ دوسرے [illegible] کہ میں نے تعلیم حاصل کی۔ کیا کبھی تمہیں میرا سلوک نامناسب معلوم ہوا تھا؟ آج ...."

[illegible] کہ ماں نے کہا ... "یہ بات نہیں ہے [illegible] جانتی ہوں۔ مگر لوگوں کو باتیں کرنے سے بھی [illegible] جا سکتا ہے؟"

"لوگوں کی تو یہ عادت ہے۔ وہ ہمیشہ بدنام ہی کریں گے۔ میں اسکول جاؤں گی تو بھی اور گھر پر رہوں گی تب بھی۔ پڑھے اور ان کے عیب کا قصہ تم نے نہیں سنا کیا؟" میں نے ذرا چڑھ کر کہا۔

"اس طرح چڑھو نہیں منی۔ ابھی تیری شادی ہونی ہے۔ کنواری لڑکیوں کو بدنامی سے بچنا چاہئے۔ جب تیرے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے تو پھر تجھے بدنام کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے گا۔ ابھی تو کنواری ہے۔ اگر لوگوں کی باتوں کی طرف توجہ نہ دے گی تو کام نہیں چلے گا۔ نہیں تو تیری شادی...."

"نہیں ہوگی۔ یہی نا؟ کوئی حرج نہیں۔ میں پجارن ہو کر کسی مندر میں بیٹھ جاؤں گی۔" میں نے ماں کا فقرہ پورا کیا۔

"اسے مذاق نہ سمجھو بیٹی" ماں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر، نہ سہی تو بتلائیے کیا کروں؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہی جو میں کہہ رہی ہوں" انہوں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں اپنی ذمہ داری کو بخوبی جانتی ہوں۔ آج تک میں جس طرح رہتی آئی ہوں اسی طرح اب بھی اپنا کام کئے جاؤں گی۔ لوگ اگر کچھ بکتے ہیں تو بکنے دیجئے انہیں۔ ان کی زبان پکڑنے سے تو رہی۔ سیتا ایسی پاکدامن کو بھی جب لوگوں نے بدنام کرنے سے نہ چھوڑا۔ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں تمہیں مجھ پر تو اطمینان ہے نا؟"

"یہ بات نہیں منی تمہارے والد صاحب کا خیال ہے کہ آئندہ بیساکھ میں تمہاری شادی کر دی جائے۔ وہ تمہارے لئے موزوں شوہر کی تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس سلسلہ میں تم سے بھی گفتگو کریں اور تمہارا مشورہ لیں۔ اسلئے کہتی ہوں کہ کچھ احتیاط رکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تو بہت احتیاط برتتی ہوں۔" میں نے انہیں یقین دلایا۔

اسی وقت والد صاحب باہر سے آئے۔ اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے کپڑے اتارے اور ماں کے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے فرمایا۔

"کیوں منی، آج کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟"

"اب منی کے بیاہ کے علاوہ کیا باتیں ہوں گی؟" ماں نے جواب دیا۔

"یہی تو معلوم کر رہا تھا۔" والد صاحب نے کہا۔

"کیوں، مل رہا ہے کیا کوئی موزوں بر؟" ماں نے استفسار کیا۔

"[illegible] کیوں نہیں؟ بروں کی کیا کمی ہے؟" والد صاحب نے جواب دیا۔

"آئندہ بیساکھ میں اس کے ہاتھ پیلے کر ہی دینے چاہئیں۔" ماں بولیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" والد صاحب نے اتفاق کیا۔

"ممی کیا ہے؟" میں نے پر دھلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ میری شادی ہو گی۔ میں سسرال جاؤں گی تو ......" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، ہم تو دولہا ہی کی تلاش میں ہیں۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟" ماں نے والد صاحب کی رائے طلب کی۔

"ہاں ہاں!" والد صاحب نے گردن ہلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

ماں اور والد صاحب کو ہنستا ہوا چھوڑ کر میں بھاگ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

میں نے کمرہ میں اپنے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کی، مگر میرا دل اس میں نہ لگا۔ میں تو اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بنانے میں محو ہو گئی۔ شادی، برات، خاوند، سسرال وغیرہ متعدد مناظر میرے سامنے فلم کی مانند آ جا رہے تھے۔

بائیجا نے آج جو باتیں مجھے بتائیں ان کو سن کر میری سمجھ میں آگیا کہ ماں اور والد صاحب میری شادی کی اس قدر کیوں جلدی کر رہے ہیں۔ پنت اور اس کے گروہ پر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔

تقریباً آٹھ دن کے بعد پنت، بھیکم سیٹھ اور گنپت راؤ ستار دادا جی سے ملنے آئے۔ دوسری باتوں کے ساتھ پنت نے کہا "دادا جی منی کی شادی اس سال کر دیجئے۔"

"ہاں کرنا ہے تو پنت، مگر کوئی موزوں دولہا تو ملے" والد صاحب نے کہا۔

"دولہوں کی کیا کمی؟" پنت گنپت راؤ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پر تلاش کرنا پڑے گا" گنپت راؤ نے کہا۔

"دو جوان معلم ایک ہی اسکول میں ہیں، کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" سیٹھ نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔

"اس روز ہم نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ کہیں کی کسی شہزادی نے اپنے موٹر ڈرائیور سے ہی شادی کر لی ہے۔ کیوں پنت تمہیں یاد ہے نا؟" گنپت راؤ نے پنت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں" پنت نے جواب دیا۔

"ہماری منی اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔" والد صاحب نے کہا۔

"ایسا نہ کہئے دادا جی۔ عورت کے .... بھگوان کو بھی نہیں ہوتا۔" پنت نے کہا۔

"اور پھر آج کل لوگ بھی ......" گنپت راؤ نے ......

"بدنام کرتے ہیں" سیٹھ نے لقمہ دیا۔

"دادا جی ہم لوگوں کے گاؤں کے آپ زمیندار ہیں .... ہیں۔ ہمیں آپ پر بڑا ناز ہے۔ ہم جب ایسی باتیں سنتے ہیں تو ......"

"اس لئے ہماری التجا ہے کہ منی بی بی کی شادی جتنی جلد ہو سکے کر ڈالیے" یہ سیٹھ جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سال ہم اس کی کر ڈالیں گے۔" والد صاحب نے وعدہ کیا۔

"خوب شان و شوکت کے ساتھ ہونا چاہئے دادا جی" ستار بولا۔

"پانچ گاؤں کے لوگوں کو لڈو کھلانا چاہئے سرکار" سیٹھ جی بولے۔

"ابھی کئی سال سے اس گھر میں کوئی تقریب ہی نہیں ہوئی ہے۔ اب موقع آیا ہے۔" پنت بولا۔

"ہاں ہاں سب ہو جائے گا۔ کیا میں تنہا یہ سب کچھ کر سکوں گا۔ تم سب لوگ مدد کرو گے تو یہ سب کام ٹھاٹ باٹھ سے ہو جائے گا۔ تمہاری مدد اشد ضروری ہے" والد صاحب نے کہا۔

"بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے دادا جی؟ ہم کیا کبھی آپ کے حکم کی عدولی کر سکتے ہیں؟" پنت نے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مگر پہلے سے ہی کہہ دینا بہتر ہے۔"

پھر ادھر ادھر کی کچھ بات چیت کے بعد چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ رخصت ہوئے۔

یہ سب باتیں بائیجا نے اپنی زبان میں مجھ سے اختصار کے ساتھ کہی تھیں۔ ماں کے آواز دینے پر میں کسی کام کے لئے نیچے اتری۔

آج اتوار تھا اور اسکول کی چھٹی تھی۔ پچھلے کے دن میرے سب کام بڑی کامیابی سے ہوا کرتے تھے۔ اور اس روز مجھے اس کا پورا احساس ہو گیا کہ خواب کی دنیا کی نسبت بائیجا کی بتائی ہوئی حقیقت کی دنیا کتنی خوفناک ہے۔

اس روز ماں نے میرے لئے شیریں کھنڈ اور پوریاں پکائی تھیں۔ انہیں کھا کر میں حسب معمول سونے کے لئے لیٹی لیکن آج مجھے نیند نہ آئی۔

پڑ سکے میں کی دل نہیں لگا ۔ قریب تین چار بجے میرا جی متلایا اور مجھے قے ہو گئی ۔ تھوڑی دیر کے بعد تھرتھری کے ساتھ بخار آ گیا ۔

گھر میں دوڑ دھوپ شروع ہو گئی ۔ دیال کے پاس مہرشی جٹا شنکر کا ایک خط آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحب کو نیا اسکول دکھانے کے لئے کل ان کے ساتھ دھرم پور پہنچ رہے ہیں ۔ یہی اطلاع دینے وہ فوراً ہمارے گھر آئے تھے ۔ مگر ہمارے گھر آ کر انہوں نے دیکھا کہ سب طرف دوڑ دھوپ ہو رہی ہے ۔ انہیں دیکھ کر گھبرا کر والد صاحب نے کہا ——

" ماسٹر صاحب ! سانگلی جا کر ڈاکٹر سیٹھی کو فوراً لے آئیے ۔ منی کی حالت ٹھیک نہیں ہے ۔ حسین کی کار لے جائیے اور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر جلد واپس آئیے ۔ خرچ کیلئے یہ روپے رکھ لیجئے " یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دیال کو دیدیئے ۔

جس کام کے لئے دیال آئے تھے اسے کسی کو بتائے بغیر ہی وہ کار لیکر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے سانگلی کے لئے روانہ ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو دیکھنے باہر گئے ہوئے تھے ۔ اس لئے انہیں دھرم پور پہنچنے میں بہت دیر لگی ۔

میرا بخار بڑھ رہا تھا ۔ آس پڑوس کے لوگ خیریت معلوم کرنے اور میری عیادت کے لئے آنے لگے تھے ۔ ماں اور والد صاحب کی ہمت ٹوٹ رہی تھی ۔ سب کی آنکھیں ڈاکٹر —— کا انتظار کر رہی تھیں ۔ پنڈت اور اس کی چنڈال چوکڑی کے ارکین کو بھی میری علالت کا پتہ چلا اور انہوں نے میری قے اور بیماری کا کچھ اور ہی مطلب . . . . .

۵

دوسرے روز محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کو ساتھ لے کر مہرشی جٹا شنکر دھرم پور تشریف لائے ۔ اسکول کی تنظیم اور وہاں کی صفائی دیکھ کر اور طلبا سے کئے گئے سوالوں کے اطمینان بخش جوابات پا کر وہ بڑے متاثر ہوئے ۔ لڑکوں نے تاریخ ، جغرافیہ اور سائنس کے کمروں میں جو چیزیں جمع کر رکھی تھیں اور اسکول کے سامنے جو باغیچہ لگایا تھا اس میں پیدا ہونے والی مختلف قسم کی سبزیاں دیکھ کر بھی وہ بڑے خوش ہوئے ۔

پچھلے دن دیال کو رات بھر سونے کا موقع نہ ملا تھا ۔ سانگلی سے ڈاکٹر لے کر وہ ایک بجے رات کو واپس آئے تھے ۔ اس کے بعد وہ سوئے ہی نہیں —— وہ ڈائرکٹر صاحب کے استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے ۔ راتوں رات انہوں نے لڑکوں کی مدد سے جھنڈیوں سے اسکول کی ساری عمارت سجا دی تھی ۔ گاؤں کی چند ممتاز ہستیوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا تھا جو ڈائرکٹر صاحب کے معائنے کے وقت اسکول میں موجود تھے —— معائنہ ہو جانے کے بعد ڈائرکٹر صاحب نے مدعو صاحبان اور لڑکوں کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں تھوڑے سے عرصہ میں اسکول نے جو ترقی کی تھی اس پر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور دونوں معلموں نیز گاؤں کے ان لوگوں کا جنہیں اسکول سے دلچسپی تھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا ، اور یہ امید ظاہر کی کہ دوسرے گاؤں والے بھی اگر دھرم پور کی تقلید کریں تو ہندوستان کی قسمت جلد جاگ جائے ۔

میری طبیعت ناساز ہونے کے باعث میں اس روز اسکول نہ جا سکی تھی ۔ مگر والد صاحب کا یہ معمول تھا کہ گاؤں میں آنے والے سرکاری افسر کو اپنے ہاں چائے پر ضرور مدعو کیا کرتے تھے ۔ لہٰذا انہوں نے ڈائرکٹر صاحب کو بھی اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا ۔ طبیعت علیل ہونے کے باوجود میں ان سے اپنے گھر ملی تھی ۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے میری تعریف کی جس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی ۔

اپریل کا نصف مہینہ گذر گیا ۔ اسکول کا کام باقاعدگی سے جاری تھا ۔ میرا اور دیال کا قرب بڑھتا جا رہا تھا ۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور ہمدردی کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ۔ اب تو ایک دوسرے کے بغیر بمشکل دل لگتا تھا ۔ دن میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے ۔ اس لئے یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ دن کب ختم ہو گیا ۔ مگر چھٹی کے دن چونکہ ایک دوسرے سے ملاقات ناممکن تھی اس لئے وہ دن بڑی مشکل سے کٹتا تھا ۔

ادھر گھر میں شادی کی فضا تیار ہو رہی تھی ۔ والدین اور پنڈت سبھی میرے لئے موزوں شوہر تلاش کر رہے تھے اس سلسلہ میں والد صاحب پنڈت سے ہی مدد لیتے تھے ۔ جس لڑکے کو دیکھنے بھی وہی جایا کرتا تھا ۔ والد صاحب کی بیٹھک میں آجکل گفتگو کا موضوع میری شادی ہی ہوتا تھا ۔ ماں کے پاس بھی پڑوس کی عورتیں آتیں تو اسی پر بات چیت کرتیں ۔

اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ہمارے سماج کے رسم و رواج کے تحت مجھے اس لڑکے کو اپنا شوہر بنا لینا پڑے گا جس کو میرے والدین نے میرے لئے پسند کر لیا ہے ۔ اور میرے ہونے والے شوہر محترم اگر میرے مزاج کے

مطابق ہوئے تو ٹھیک ہے ورنہ۔ کہتے ہیں کہ لکشمی[1] اور سرسوتی[2] کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، کیا اس کا اطلاق مجھ پر بھی ہوگا؟ اگر میری سسرال کے لوگ جاہل ہوئے تو؟ اسی قسم کے خیالات میرے دماغ کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔

مجھے دیکھنے کے لئے سب سے پہلے جو صاحب تشریف لائے تھے وہ نوجوان تھے اور پولیس ٹریننگ اسکول سے پچھلے سال ہی پاس کرکے نکلے تھے۔ وہ کسی تحصیل میں حال ہی میں تھانیدار کے عہدے پر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ مرد اور چار پانچ عورتیں تھیں۔ رواج کے مطابق وہ مجھے دیکھنے کے لئے والد صاحب کے کمرے میں بیٹھے۔ میرے بیٹھنے کے لئے ایک پیڑھی رکھدی گئی تھی۔ چنانچہ میں جاکر اس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ گو میں ایک جاہل لڑکی کی طرح گردن نیچی کرکے نہیں بیٹھی تھی پھر بھی اس خیال سے کہ سب لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں میں کچھ شرما ضرور گئی تھی۔

ان مہمانوں میں ایک بزرگ بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوالات کئے اور میں نے ان کے اطمینان بخش جوابات دیدئے۔ آج تک میں نے متعدد امتحانات دیئے تھے۔ میرے ممتحن مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہوا کرتے تھے مگر آج......

اس کے بعد لڑکے والوں میں سے ایک عورت نے ناریل، کیلے اور مصری سے میری گود بھری اور میں سب کو سلام کرکے اندر چلی گئی۔ گھر میں لڑکے کی طرف سے آئی ہوئی جو عورتیں بیٹھی تھیں انہوں نے بھی مجھ سے طرح طرح کے استفسارات کرکے مجھے پریشان کیا، مگر میں لاچار تھی۔ ایک نے پوچھا ــــ

"کیا تو کھانا پکا سکتی ہے؟"

"ہاں۔"

"بیٹی تجھے ماہواری کتنے سال سے ہو رہی ہے؟"

"یہی کوئی آٹھ دس سال سے۔"

"تب تو تیری عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی؟"

"ہاں۔"

قصہ مختصر یہ کہ اس لڑکے کے ساتھ شادی نہ ہوسکی۔ اول تو والد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کا داماد تھانیدار ہو۔ کیونکہ آجتک تھانیداروں کا ان کا جو تجربہ تھا وہ کچھ اچھا نہ تھا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اکثر تھانیدار شرابی، بدکار اور رشوت خور ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس لڑکے کے بارے میں کافی تحقیقات بھی کی تھیں۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ محض نام کا ہی جینی ہے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کوئی پرہیز نہ کرتا تھا۔ اور......

جب والد صاحب نے ہی اس بر کو پسند نہیں کیا تو پھر دوسروں کی رائے کا سوال ہی نہیں اٹھا۔

اس روز میں نے دیال کو ایک خط لکھ کر مطلع کردیا تھا کہ آج مجھے اسکول پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ خوب ڈٹکر چائے اور ناشتہ کھاکر مہمان لوگ "سوچیں گے" یہ کہہ کر چلے گئے اور میں ان کی واپسی کے فوراً بعد ہی اسکول چلی گئی۔ دیال کو ان کی آمد کی اطلاع تھی۔

"کیوں طے ہوا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی دلی دور ہے۔" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"یہ ہمارے یہاں شادی کا کیسا غلط قاعدہ ہے۔ کیا تم اس کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پسند نہ بھی ہو تو بھی چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہ اس غلط رسم کو توڑا جائے؟" دیال نے کہا۔

"باتیں کرنا بہت آسان ہے، مگر اس خیال کو عملی جامہ پہنانا اتنا ہی مشکل۔" میں نے کہا۔

"جب تم جیسی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی یہی کہنے لگیں تب تو کسی رسم کو توڑا یا بدلا نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جب تک ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کی جاتی تب تک شادی کی رسوم میں بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سارے سماج کو تو سدھارنے میں کئی برس لگ جائیں گے تو کیا تب تک.....؟"

"اور اگر اس میں تبدیلی کر دی گئی تو.....؟" دیال کا یہ فقرہ بھی میں نے ہی مکمل کیا۔

"تو پھر تکلیف، رنج و غم۔"

"تمہارا مطلب ہے زندگی ان رسومات کے بغیر بے کیف و ناخوشگوار رہے گی؟"

۱؎ دولت کی دیوی۔ ۲؎ علم کی دیوی۔

اپریل کا مہینہ ختم ہوگیا۔ مئی کا مہینہ شروع ہوا تو گرمیوں کی تعطیلات ہوگئیں۔ دو ماہ کی چھٹی میں مہرشی نے دیال کو تارہ پور بلا لیا۔ اس لئے اسکول بند کرکے وہ مجھ سے اور والد صاحب سے رخصت لینے کے لئے ہمارے گھر آئے۔ والد صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میں اپنے کمرہ میں تھی۔ ان کے آنے کے بعد والد صاحب نے مجھے بھی آواز دی ــــ "منی!"

میں بھی آگئی۔ دیال نے والد صاحب کے قدم چھوئے اور چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار کرکے مجھ سے اور ان سے رخصت چاہی۔ میں نے بابا کو چائے لانے کے لئے کہا۔ دیال نے چائے پی۔ اسی اثنا میں وہ اندر جاکر ماں کے بھی قدم چھو آئے۔ تمام چھٹیاں وہ تلوہ پور میں ہی گذارنے والے تھے۔ جب وہ جانے لگے تو والد صاحب نے کہا۔

"ماسٹر صاحب، ان چھٹیوں میں آپکی اسسٹنٹ کی شادی کر رہا ہوں۔ اگر طے ہو جائے تو ضرور تشریف لائیے گا۔ بھولئے گا نہیں۔"

"ضرور حاضر ہوں گا۔" دیال نے وعدہ کیا اور مڑ کر میری طرف ایک نظر دیکھا، اور چل دیئے۔ لیکن.....

مجھے محسوس ہوا گویا میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں واپس آگئی۔ اور شیشے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ میرا دل مجھ سے دریافت کر رہا تھا "کیوں اتنی ملول ہے تو؟ کیا اس لئے کہ لوگوں نے ایک افواہ اڑا دی۔ دیال سے تو محبت کرتی ہے؟ لیکن وہ خواہ کتنا ہی خوبصورت، ذہین اور قابل ہو مگر ہے تو اچھوت۔ اور تو جینی ہے۔ کیا تو اس سے شادی کرنے کی جرأت کرسکے گی؟ یہ تیرا ڈھونگ ہے۔ بیچارہ دیال! اس کو ابھی تیرے دل کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کے سر پر مہرشی، داداجی، اس کی ذات اور سماج میں ہونے والی بدنامی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ وہ غریب بے دست و پا ہے۔ وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرسکتا۔ تجھے اپنے راستہ پر چلنا ہوگا۔ اور اس کو اپنے۔ یہی تمہاری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد اگر تم ایک دوسرے سے ملے تو.....!"

میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بیساکھ کا مہینہ آگیا تھا۔ اور اسی مہینے میں میری شادی کرنے کا والد صاحب تہیہ کرچکے تھے۔ لڑکے والوں کی یورش دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔

فصل کے کٹ جانے کے بعد بوائی ہونے تک کاشتکار خالی رہتے ہیں۔ یہ وقت وہ کہیں جمع ہوکر گپ بازی میں گذار دیتے ہیں۔ کہیں آس پاس کے دیہات میں بھی اگر کسی کے ہاں شادی بیاہ ہو تو وہ ضرور شریک ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر میں مہمانوں کی یہ آمد و رفت دیکھ کر کئی گاؤں والے اس موقعے سے فائدہ اٹھاکر ہمارے گھر آجاتے اور چائے پانی کرکے اپنا دن خوشی خوشی بسر کر لیتے تھے۔

لڑکے والوں کی آمد ہمارے ہاں کا معمول سا بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے مناسب و نامناسب سوالات کرتے اور مجھے مجبوراً انہیں جواب دینے پڑتے۔ پھر وہ سب چائے پانی اڑا کر "دیکھیں گے" کہہ کر یہ جا وہ جا۔ کوئی جاکر جواب بھیج دیتا۔ والد صاحب استفسارات کرتے اور.....

آخر راد ہی کیا ہے بتا رہی دیتی ہوں

تقا نیبار کے بعد ایک وکیل صاحب پہلے بر کی حیثیت سے آئے۔ وہ بھی جوان تھے۔ حال ہی میں بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہوئے تھے۔ ابھی تک وکالت شروع نہیں کی تھی۔ دنیا کا کچھ خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ خود کو بہت ذہین اور چالاک جانتے تھے۔ رنگ سانولا تھا اور دنیا کو کج نگاہی سے دیکھنے کے قائل تھے۔ مجھ سے شادی کرنے کی ان کی شرائط مختصراً یہ تھیں۔

خسر شادی طے کر دے۔ پھر اگر بیرسٹری پڑھنے ولایت جائے تو اس کا تمام صرفہ بھی برداشت کرے۔ وکالت پاس کرنے کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو شادی کر دی جائے۔

والد صاحب نے یہ شرائط اسلئے نامنظور نہیں کیں کہ انہیں بیرسٹری کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا بلکہ اس لئے کہ اس کا مطالبہ عام رواج کے مطابق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ لڑکا کالا سا اور بد دماغ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔

ان وکیل صاحب کے بعد جو حضرت تشریف لائے وہ ڈاکٹر تھے۔ مگر والد صاحب کو ان کا خاندان پسند نہ تھا۔ لہٰذا وہ بھی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب میں نقص یہ تھا کہ ان کے باپ نے انٹر کاسٹ میرج کی تھی۔ یعنی باپ جینی تھا اور ماں مرا ٹھن۔

چوتھے صاحب جو آئے وہ ایک پروفیسر تھے۔ بظاہر وہ ٹھیک تھے اور ممکن تھا والد صاحب کو پسند بھی ہوتے مگر وہ عمر میں مجھ سے دو چار برس چھوٹے تھے۔ ویسے تھے ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ان کے والد کسی پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی پڑھائی بہت کمسنی میں ہی شروع کر دی تھی اور دن رات پڑھائی میں مشغول رہنے کے باعث ان کی صحت کی طرف بالکل توجہ نہ دی گئی تھی۔ اس لئے وہ دکھائی

دینے میں بالکل معاف تھے ۔ دُبلے پتلے اور ناٹے ۔ مجھ سے بھی قد میں کچھ نیچے ہی تھے، اسلئے وہ بھی ناپسند ہو گئے ۔

بالآخر والد صاحب کو ایک بَر پسند آیا ۔

یہ ایک بڑے کاشتکار کا گھرانا تھا ۔ گھر میں بہت بڑی زمین تھی ——— بھینسیں اور بیل اس قدر کثیر تعداد میں تھے کہ ان کے لئے جگہ کم پڑتی تھی ۔ گھر میں اتنے آدمی اور نوکر چاکر تھے کہ انہیں روز کھانے کا انتظام کرنے میں گھر کی عورتیں رو دیتی تھیں ۔ پیسے سے کپڑے دھونے تک سبھی کام گھر کی عورتیں ہی کرتی تھیں ۔

گھر کے لوگ صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے اور خوب اناج پیدا کرتے تھے ۔ بہت محنتی، جاہل اور مذہبی تھے ۔ گھر کے چھوٹے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا لیکن ان کے والد تین چار جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکے تھے ۔

بَر کی عمر تیس برس کی تھی ۔ میٹرک تک تعلیم پائی تھی ۔ گھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سارا کاروبار وہی سنبھالتے تھے ۔ ماں باپ، چچا چچی تمام لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے تھے ۔ حالانکہ کاشت وغیرہ میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے تھے ۔ لیکن گھر کے کاروبار کے منیجر ہونے کی حیثیت دیگر کئی کام انہیں کو کرنے پڑتے تھے ۔

سر پر صافہ، جسم پر گرم کوٹ، ریشمی کرتا، سفید دھوتی اور اچھا سا خوبصورت چپل یہی ان کی پوشاک تھی ۔ رنگے ہوئے دانتوں اور ہونٹوں کو دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ پان کھانے کی ان کو عادت ہے ۔ ان کی کوٹ کی جیب بھی پھولی ہوئی دکھائی دیتی تھی ۔ غالباً اس میں گلوریوں سے بھری ہوئی چاندی کی ڈبیا رکھی رہتی ہوگی ۔

رنگ تو ان کا ٹھیک تھا، ناک، آنکھوں، چہرے اور جسم کی بناوٹ میں کوئی خصوصیت نہیں تھی ۔ تعلیم کے سلسلہ میں وہ چار پانچ برس کسی شہر میں رہ آئے تھے اس لئے خاص تعلیم نہ ہونے پر بھی شہری طور طریقوں اور وہاں کی رفتار سے بخوبی واقف تھے ۔ ان کے ملنے والے احباب میں کمہار، دھوبی، بڑھئی، لہار اور چمار وغیرہ کئی پیشے اور ذاتوں کے لوگ تھے جو انہیں کو زیب دیتے تھے ۔

وہ بھی اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے چنانچہ اس بہانے ڈراسے میں مجھے ایک مرتبہ پھر حصہ لینا پڑا ۔ چائے ناشتہ وغیرہ کے بعد مہمان رخصت ہو گئے ۔

بعد ازاں پنت اور گاؤں کے چند معزز لوگ بَر کے گاؤں گئے اور ان کا کاروبار دیکھ آئے ۔ اسی طرح بَر کے کچھ رشتہ دار بھی ہمارے گھر آئے اور ہماری زمینداری، مکان، آمدنی وغیرہ دیکھ گئے ۔ والد صاحب نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ لڑکے کو گھر جوائی بنائیں گے ۔ گھر جوائی ہونے کی حیثیت سے ساری زمینداری اور آمدنی لڑکے کے ہاتھ میں آ جائے گی ۔ ادھر ان لوگوں نے مجھے پسند کر لیا تھا اور جہیز میں والد صاحب سے صرف دس ہزار کا مطالبہ کیا تھا ۔ غرض یہ کہ ان کی نظر ہماری زمینداری اور جہیز پر تھی ۔ ایسی صورت میں اگر کوئی کالی اور بدشکل لڑکی بھی ہوتی تو وہ بھی انہیں پسند آ جاتی ۔

ہماری طرف والوں نے لڑکے کی عمر اور اس کی آمدنی دیکھ کر اُسے پسند کیا تھا ۔ لڑکا زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا ۔ لیکن انہوں نے سوچا اس میں حرج بھی کیا ہے ۔ لڑکی ایم ۔ اے بھی ہو تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے ؟ آخر وہ ہے تو لڑکی ہی ۔ کافی عمر ہونے کے بعد اسے کوئی ملازمت تھوڑی کرنی ہے ۔ بس اسی قسم کی باتیں کر کے انہوں نے اس لڑکے سے میری شادی کی بات پکی کر لی ۔

ایک روز دوپہر کو ماں اور والد صاحب ایک کمرہ میں بیٹھے ہوئے یونہی باتیں کر رہے تھے ۔ ظاہر ہے کہ باتیں میری شادی سے متعلق ہی تھیں ۔ اب وہ مجھ سے بھی رائے لینا چاہتے تھے ۔ لہٰذا انہوں نے مجھے پکارا ۔

"منی !"

"آئی پتاجی !" یہ کہہ کر میں ان کے کمرے میں گئی اور انہیں کے پاس جا کر بیٹھ گئی ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ۔

"کیا کر رہی تھی ؟"

"کچھ نہیں ۔ ایک کتاب پڑھ رہی تھی ۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا ۔ تو جانتی ہے کہ تیرے لئے کئی بَر آئے اور چلے گئے ۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص تھا یہ بھی تجھے معلوم ہے ۔ آجکل اچھے لڑکے ملنا بہت مشکل ہے ۔ دانت ہیں تو چنے نہیں ہیں ۔ اور چنے ہیں تو دانت نہیں ہیں بس یہی عالم ہے ۔ اگر ہم آنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کریں تو لوگ اس کا کچھ اور ہی مطلب لگا لیں گے اور پھر آگے بَر ملنا دوبھر ہو جائے گا ۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کے بعد بہتر لڑکا نہ ملے ۔ دراصل شادی میں عزت لڑکے والوں کی ہوتی ہے، لڑکی والوں کی نہیں ۔ اس لئے آخر میں ہم نے سب کچھ سوچ بچار کر تیرے لئے جو بَر پسند کیا ہے ۔ وہ تجھے بھی پسند ہے نا ؟ اس میں تو شک نہیں کہ تو اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہے لیکن

اس کا کمد ولا کالی ہو۔ اگر کم پڑھا لکھا ہے تو کیا حرج ہے؟ کمائی میں وہ اچھے پڑھے لکھوں سے بھی لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ہاں تو بتا اس لڑکے سے شادی کرنے کی تیار ہے یا نہیں؟" والد صاحب نے پوچھا۔

"وہ اپنی عمر مدد تھوڑی ہی کرے گی؟ ہم لوگ اس کے دشمن تو ہیں نہیں۔ جسے ہم پسند ہوگا وہی اس کو بھی پسند ہوگا۔ کیوں صحیح ہے نہ منی؟" ماں نے کہا۔

"جی ہاں بجا ہے" میں نے جواب دیا۔

اس وقت کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے اثبات میں جواب دینا پڑا۔ میں نے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کو دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے والدین کے لئے ایک بوجھ بنتی جا رہی ہوں۔ مجھے گاؤں والے بدنام کر رہے تھے۔ تعلیم یافتہ لڑکوں کے الٹے سیدھے مطالبات دیال اور میرے درمیان رخنہ اڑانے والے ذات پات کے خیالات وغیرہ پر غور کر کے میں نے ہاں کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی تیار تھی کہ جو کچھ ہو دیکھا جائے گا۔ میری ہاں معلوم کر کے میرے والدین بہت خوش ہوئے۔

چند روز بعد لڑکے والے کچھ لوگ شادی سے متعلق باتیں طے کرنے کے لئے ہمارے گھر آئے۔ پتا جی نے ان کے سب مطالبات منظور کر لئے۔ ان کے مطالبات کے مطابق برات لانے کے لئے سو بیل گاڑیاں، دس موٹریں اور دولہا راجہ کے لئے ایک اسپیشل ٹورنگ کار کا بندوبست کرنا تھا۔ میرٹھ سے اسپیشل بینڈ اور کولہاپور سے ہاتھی بلانا تھا۔ شادی کا یہ سارا صرفہ دادا جی کو ہی کرنا تھا۔ اوپر سے دس ہزار روپے نقد جہیز میں دینا اور "کنیا دان" کرنا تھا۔ میرے آرام کے لئے دادا جی نے یہ سب قربانیاں دینا قبول کر لیا تھا۔ مئی کی پچیس تاریخ شادی کے لئے متعین ہو گئی۔ لیکن...

کیا میں شادماں تھی کہ میری شادی ہو رہی ہے؟ میں، میرا حسن، میری تعلیم اور میری آزادی کو کیا اس رسمی شادی میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل ہو رہی تھی؟ کیا میری تمنائیں اور میرے ارمان نہیں کچلے جا رہے تھے؟ مگر میں کرتی کیا؟ میری آئندہ زندگی میں مجھ پر کون کون سی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ کن کن الجھنوں کا مجھے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ سب اندیشے مجھے پریشان کئے دے رہے تھے۔

اسکول کی چھٹیاں ہو جانے کے بعد تقریباً دس دن تک میں گھر سے باہر بھی نہ نکل پائی تھی۔ میری شادی کی خبر سارے گاؤں میں بجلی کی طرح پھیل گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر راہ چلنے والی عورتیں آپس میں کانا پھوسی کرنے لگتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے چندا مالن کو دیکھا۔ میں نے سوچا اب وہ کیا افواہیں اڑاتی ہوگی۔ یہی کہتی ہوگی ـــــ طے ہو گئی شادی، اچھا ہوا چھوٹا اس چمرے سے......

شادی کی خبر سب کے لئے باعث خوشی ثابت ہوئی۔ سبھی اس خیال سے مسرور تھے کہ میری شادی سے ان کے کھانے پینے کا موقع مل جائے گا۔ دعوت نامے چھپ چکے تھے۔ ایک دعوت نامہ اور اس کے ساتھ ایک طویل خط میں نے دیال کو بھی بھیج دیا۔ خط میں میں نے اپنے ہونے والے شوہر اور سسرال کے بارے میں سب کچھ سچ سچ لکھ دیا۔ مگر سانحہ تھی ان کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ بس ان سے شادی میں شریک ہونے کی درخواست کی تھی۔ تین روز بعد ان کا جواب موصول ہوا۔

خط میں انہوں نے دعوت کے شکریہ کے بعد لکھا تھا کہ میں ہی ولایت جانے کی تیاری میں ہوں۔ شادی میں شریک نہ ہونے کی معذرت چاہتا ہوں اور شادی کے مبارک موقع پر ایک چاندی کی ڈبیا انہوں نے تحفتاً ارسال کی تھی۔ خط پڑھ کر ان کے دستخط دیکھے تو میری نظر کے سامنے دیال کا مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا......

میری آنکھوں سے آنسو اس خط پر گر پڑے اور ان کے دستخط کچھ پھیل گئے۔

شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ دادا جی نے سارے گاؤں کو شادی میں مدعو کیا تھا۔ گاؤں کے تمام مندروں میں پوجا ہو رہی تھی۔ سارے مندر، مکان اور دکانیں سجائی گئی تھیں۔ گاؤں میں ہر طرف صفائی ہوئی تھی۔ لوگ خوش تھے اور سارا گاؤں خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آج برات آنے والی تھی، اس لئے گاؤں کے مرد عورتیں اور بچے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس گاؤں کی سرحد پر برات کے خیر مقدم کے لئے شام سے ہی جمع ہونے لگے تھے۔

رات کے آٹھ بجے پنچایت کے چوکیدار نے سائکل سے آکر خبر دی کہ برات آ رہی ہے اور بیل گاڑیاں گاؤں کے بہت قریب آ گئی ہیں۔

دیکھتے دیکھتے رات کے دس بج گئے۔ برات کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ دادا جی نے ایک آدمی کو پھر سائکل پر دوڑایا۔ وہ آدھے گھنٹے میں واپس آیا اور اس نے کہا ـــــ "برات آ گئی"۔

بیل گاڑیوں میں جو براتی آئے تھے ان کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہوگی۔

گیارہ بجے کے قریب موٹریں بھی آگئیں ان میں بھی کوئی تین سو سے کم آدمی نہ ہوں گے۔ اور ابھی تو دولہا کی ٹورنگ کار پیچھے ہی تھی۔ لڑکے والوں میں سے چند ذمہ دار اشخاص نے رات جلتے دیکھ کر دادا جی کو پیغام بھجوایا کہ وہ بڑھیں۔ دولہا کی کار بھی آتی ہی ہو گی۔ یہ پیغام سن کر دادا جی گاؤں کے بڑے بڑے لوگوں کو لے کر برات کے استقبال کے لئے گاؤں کی سرحد کی جانب چل پڑے۔

آگے آگے میرٹھ کا مشہور بینڈ بج رہا تھا۔ شہنائیوں کے سُر درمیان میں سنائی دے رہے تھے۔ ہر طرف آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ دولہا کو لانے کے لئے جلوس کے درمیان میں سجا ہوا ہاتھی چل رہا تھا۔ تین سو گیسوں کی روشنی چاندنی کی مانند پھیل گئی تھی۔

ابھی تک دولہا کا پتہ نہ تھا۔ آئے ہوئے براتی اور لڑکے والے اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ دولہا کے آنے کے پہلے دوسرے لوگ گاؤں میں کیسے جا سکتے تھے اور اس طرح ٹھہرتے بھی کب تک۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

بالآخر بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد والد صاحب نے کچھ لوگوں کو تبر کو لانے کے لئے اس کے گاؤں کی جانب موٹر میں روانہ کیا۔ رات کا ایک بجا چاہتا تھا اور دولہا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی تلاش میں گئی ہوئی موٹر بھی واپس نہ آئی تھی۔ لوگ اکتا گئے۔ آخر کار لوگ تھک ہار کر گھروں کو واپس جانے لگے اور دولہا کو قصور وار ٹھہرا کر کہتے گئے — عجیب آدمی ہے، وقت کا اسے کوئی خیال ہی نہیں کوئی کہہ رہا تھا — کیا دولہا راجہ شادی سے پہلے ہی روٹھ گئے!

اور ادھر اس قسم کی غیر متوقع تاخیر کی وجہ سے والد صاحب کی طبیعت مکدر سی ہو رہی تھی۔ براتی بار بار یہی کہہ کر دلاسا دیتے کہ بس اب کار آتی ہی ہو گی۔ لڑکی والوں نے براتیوں سے کہا۔

"دولہا کو پیچھے چھوڑ کر آپ لوگ کیسے بڑھ آئے؟"

دو بج گئے۔ سب پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح کب تک جاگتے رہیں گے۔ اور یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دولہا کی تلاش میں بھیجی گئی موٹر واپس آ گئی۔ اس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے بڑی افسردگی سے لکنت بھرے لہجے میں کہا — "ٹورنگ کار راستہ میں الٹ گئی۔ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ دولہا کو میرٹھ کے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔"

ہو چکا۔ سب کے چہرے مرجھا گئے۔ آئے ہوئے براتی انہیں موٹروں اور بیل گاڑیوں میں مغموم و ملول چہرے لئے ہوئے اپنے گاؤں کی جانب لوٹ گئے۔ دادا جی پر بجلی گر پڑی۔ شادی میں ایسے ناگہاں حادثہ کی خبر سن کر وہ دھم سے نیچے بیٹھ گئے۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ اور میں جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹاری پر کھڑی ہوئی اپنے ہونے والے شوہر کو چھپ کر دیکھنا چاہتی تھی، یہ خبر سن کر بیہوش ہو گئی۔

٦

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نیکی کی نسبت بدی کی طرف جلد رجوع کرتا ہے۔ اچھی باتیں اتنی سرعت سے لوگوں تک نہیں پہنچتیں جتنی کہ بری افواہیں۔ میری شادی کے رکنے، برات کے واپس چلے جانے اور دولہا کے حادثہ کے شکار ہونے کی خبر آگ کی طرح ایک لحظہ میں سب طرف پھیل گئی۔ قرب و جوار کے گاؤں میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ اخبار والوں نے بھی اس خبر کو عجیب عجیب عنوانوں اور سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

دادا جی نے آج تک عوام کی جو خدمت کی تھی، جو نام اور شہرت انہیں ملی تھی وہ سب ذرا سی دیر میں دھول میں مل گئی۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا لیکن وہ ایسے کمزور دل کے نہ تھے۔ اس حادثہ سے وہ ذرا نہ گھبرائے اور اس خبر کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ایک اسپیشل کار میں گاؤں کے دو اشخاص کو لے کر تبر کو دیکھنے میرٹھ کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے گھر جو مہمان آئے تھے اور بینڈ، ہاتھی وغیرہ کو رکنے کا حکم انہوں نے دیدیا تھا۔ چنانچہ سب ٹھہرے رہے۔

پہلے تو وہ میرٹھ کے ہسپتال میں پہنچے۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس دن کے حادثہ کا کوئی بھی کیس ہسپتال میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اب وہ تاڑ گئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حادثہ کی بات بالکل جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے۔ لڑکے والوں نے یا لڑکے نے خود ہی یہ دھوکا دیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ذرا ہراساں نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی کار تبر کے گاؤں کی طرف بڑھا دی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بے خوف و خطر تبر کے مکان کے اندر چلے گئے اس طرح جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں۔

ہونے والا داماد اندر ایک کمرے میں دری پر تکئے سے ٹیک کر بیٹھا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا ایشٹرے رکھا تھا جس میں بیڑیوں اور ماچس کی تیلیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ دوسری طرف ایک پاندان رکھا تھا۔ اس کے اردگرد اس کے دوست احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ براتی بھی جو ابھی آئے

تھے وہیں بیٹھے تھے۔ دولہا سب کو تسلی دے رہے تھے اور صورت حال سمجھا رہے تھے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے بیڑیوں کے کش کھینچ رہے تھے۔ کوئی پان، تمباکو کھا کر باہر صحن میں پیک تھوک

دادا جی کو دیکھتے ہی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بَر کو اور موجودہ حضرات کو سلام کیا اور بَر کے قریب جا کر اپنی برابری والے لوگوں کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے دولہے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ آئے کیوں نہیں؟"

ہونے والے داماد نے ہنس کر کہا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے کچھ دیر سے روانہ ہوا تھا۔ آپ کے گاؤں کے نزدیک ہم لوگ پہنچا ہی چاہتے تھے کہ اچانک میرے دل میں زبردست تکلیف ہوئی۔ ایسی کہ میں کچھ بول بھی نہ سکا۔ وہ تو یہ کہیے کہ خوش قسمتی سے میرے چند احباب ساتھ تھے ورنہ شاید دم ہی ختم ہو جاتا کیونکہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ لوگ مجھے میرٹھ کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ وہاں مجھے دس انجکشن دیئے گئے تب جا کر کہیں میری جان بچی۔ ہم لوگ ابھی بیس منٹ پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ میرے دوستوں نے آپ کو خبر تو پہنچا دی تھی نا؟"

"اچھا اب تو آپ کی طبیعت ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ہمارا سب انتظام تیار ہے۔ آپ ابھی چلیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" دادا جی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔" بَر نے عذر پیش کیا۔

"ہم آپ کو پھول کی طرح لے چلیں گے۔ تب تو کوئی حرج نہیں۔" دادا جی نے پھر درخواست کی۔

"جی نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا۔" داماد کے لہجے میں یقین تھا۔

اس کے بعد والد صاحب نے بَر کے اور دیگر اعزا سے استدعا کی کہ اس خوشگوار موقع کو اس طرح ناشگفتہ اور بدمزہ نہ کریں۔ اور ان سے دولہا کو منانے کی التجا کی مگر سب بیکار رہا۔ سب نے لڑکے کی طرف انگلی اٹھا دی۔

اس کے پہلے والد صاحب نے زندگی میں کبھی کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹی کی شادی کا نازک معاملہ تھا۔ بیچارے کرتے بھی کیا۔ انہوں نے کہا۔

"مگر اس مہورت پر نہیں تو اگلے کسی موقع پر سہی۔" اس سوال کے ذریعے وہ لڑکے والوں کے دل کی تھاہ لینا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے یہ تجویز بھی رد کر دی۔ بَر نے بھی کہا ـــــ "اب تو ہمیں معاف ہی کر دیجئے دادا جی، ہم مجبور ہیں۔"

دوسروں نے بھی اسی بے رخی سے جواب دیئے۔ دادا جی عجیب کشمکش و پیچ میں تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ ایک مرتبہ شادی طے ہو جانے کے بعد اس کے منقطع ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ بالآخر انہوں نے ایک ترکیب سوچی۔

بَر کے ایک دوست کو انہوں نے آہستہ سے اپنے پاس بلایا۔ بیٹے بھیا، دادا سے مخاطب کیا اور اس سے سچی سچی باتیں نکلوائیں۔ دوست نے کہا۔

"لڑکے کے دل میں نہ کوئی درد ہوا نہ ہم کسی ڈاکٹر کے ہاں گئے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ کی بدنامی سے بچنے کے لئے ہم نے یہ خبر اڑا دی تھی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ ہم لوگ کار سے آپ کے گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ آپ کے گاؤں سے دو میل دور ایک بس اسٹاپ ہے۔ وہاں ہم نے اپنی کار تھوڑی دیر کے لئے روک لی اور ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے۔ ہوٹل ایک عورت کا ہے۔ ہم لوگ چائے اور کچھ کھانے کی چیزوں کا آرڈر دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کے پاس ایک نوجوان بیوہ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ان کی آپس میں بہت بے تکلفی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ اسی وقت بیوہ بولی ـــــ شادی کیلئے جا رہے ہیں آپ لوگ؟"

"ہاں!" ہم میں سے ایک نے کہا۔

"مہمان ہیں آپ؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں ہم لوگ براتی ہیں۔ یہ دولہا ہیں" میں نے بَر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اوہ! یہ بات ہے!" اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں ذرا دیر ہو گئی ہے، دوسرے لوگ آگے چلے گئے ہیں۔" ہم میں سے کسی اور نے کہا۔

"کیا آپ کو کوئی اچھی لڑکی نہیں ملی؟ معاف کیجئے گا آپ لوگ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس لئے دریافت کر رہی ہوں۔" اس بیوہ نے کہا۔

"یعنی تمہارا مطلب کیا ہے؟" ہم میں سے ایک نے پوچھا اور ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"اب کہنے سے کیا فائدہ آپ کی شادی پہلے ہو چکی ہے۔ جاؤ اور شادی کر لو۔ اب بھلا اس سیدھے سے حاصل بھی کیا؟" اس نے کہا۔

"نہیں نہیں، جو سچ بات ہے اُسے تو کہہ ڈالو۔ ابھی تو بھانڈا پڑنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اجی بابو صاحب، کیا دادا جی کبھی انہیں دس ہزار روپے جہیز میں دیتے۔ مگر کیا کریں بیچارے۔ بیٹی پھنس گئی تھی اسکول کے اچھوت ماسٹر سے۔ اور......" اس نے اپنی زبان چبالی۔

"سچ کہتی ہو؟" دولہا نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے سر کی قسم! بالکل سچ ہے۔ جھوٹ بولنے سے مجھے کیا فائدہ؟" اس نے اپنے سر کو ہاتھ لگا کر کہا۔

بس ہو گیا۔ دولہا بدک گیا اور انہوں نے موٹر اپنے گھر کی طرف لوٹا دی۔ ہم نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے ایک نہ مانی۔ بڑا ہیکڑ باز ہے۔ اب وہ آپ کی بیٹی سے ہرگز شادی نہ کرے گا۔ چنانچہ میرا تو یہی خیال ہے کہ اب اس مسئلہ کو مزید طول دیئے بغیر آپ خاموشی سے واپس چلے جائیے۔ اس سے کوئی توقع رکھنا بے سود ہے۔"

یہ سب قصہ سُنا کر وہ دوست پھر اپنے ساتھیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔

دادا جی نے ایک لمبی آہ سرد بھری۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر انہوں نے انہیں راضی کرنے کی ناکام کوشش کی اور موٹر دھرم پور کو روانہ ہو گئی۔

اس خبر کو سُن کر پتا جی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کے ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ دوسرا بر فوراً تلاش کر کے شادی کر دی جائے۔ لیکن وہ اس کے لئے رضامند نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرا اچھا بر فوراً ملنا بہت محال ہے بلکہ ملنا ناممکن ہے۔ کسی سے بھی اس کی شادی کر دینے کی بجائے وہ مجھے لڑکا سمجھ کر گھر میں ہی رکھنا بہتر سمجھتے تھے۔ آخر میرے لئے اس کے علاوہ ہے بھی کون؟ دوسرے یہ کہ اتنی عجلت کرنے سے لوگوں کو بیکار کا شبہ ہو جائے گا۔

گھر آ کر جس سے جو طے ہوا تھا ادا کر کے چلتا کر دیا۔ ہاتھی اور بینڈ والے سب چلے گئے۔ براتیوں کی دعوت کے لئے جو لڈو تیار ہوئے تھے وہ غریب غرباء کو تقسیم کر دیئے گئے۔

شادی کا یہ گرینڈ ریہرسل ہو گیا۔

"اچھا ہی ہوا، دولہا دل کا مریض ہے۔ اس لئے وہ واپس چلا گیا۔ قسمت اچھی ہے ہماری ورنہ شادی کے بعد اگر یہ راز فاش ہوتا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ بھگوان نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔" پتا جی نے سب سے یہی کہنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو اس کی بات پر یقین کر لیتے تھے لیکن کچھ ذلیل لوگ اسے بھی دادا جی کی چالبازی سمجھتے تھے۔ شادی کے اس طرح ٹوٹ جانے سے پتا جی کا کافی صرفہ ہوا۔ صرف جہیز کی رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی مگر انہوں نے کسی سے اس بات کی شکایت نہ کی تھی۔ انہیں تو صرف یہی ایک فکر کھا رہی تھی کہ وہ جھوٹی افواہ اُڑانے والی رنگیلی جوان بیوہ کون ہو گی؟ اگر کھلے طور پر اس کی جانچ کرتے ہیں تو بھی آفت اور نہیں کرتے تو بھی مشکل۔ بس اسی پس و پیش میں وہ پڑے ہوئے تھے۔

مجھ سے اور ماں سے بھی والد صاحب نے یہی کہا تھا جو وہ اور لوگوں سے کہہ رہے تھے: "ہماری تو تقدیر اچھی تھی جو ہماری بیٹی بچ گئی۔ ورنہ اگر اس دل کے مریض کے ساتھ بندھ گئی ہوتی تو؟ اس کی زندگی کا کیا اعتبار؟"

اس طرح وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر سب طرف پروپیگنڈہ تو کر رہے تھے، مگر دل ہی دل میں وہ گھلتے جا رہے تھے۔ میں اور ماں دونوں مشوش تھے۔ تمام گھر میں افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تینوں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے۔ میں کسی ضروری کام سے نیچے آ جایا کرتی تھی۔ ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی تھی۔ بابیجا، دولو اور ہماری ہمسایہ آ کر میرے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتیں اور دادا جی کو بھی دم دلاسا دیتی تھیں۔

چار پانچ روز کے بعد ایک دن پتا جی اور ماں دونوں میرے کمرے میں آئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے شادی کے منقطع ہو جانے کا اصل سبب مجھے بتا دیا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میں نے درمیان ہی میں انکی بات کاٹ کر کہا۔

"وہ رنگیلی، نوجوان بیوہ ہمارے گاؤں کی چندرا مالن ہی ہوگی۔ پتا جی اس گاؤں میں دیوی دیوتاؤں کا سا لباس پہن کر دیو لوگ اور چڑیلیں بستی ہیں۔ جانتے ہیں آپ؟"

"تو مجھے سکھا رہی ہے۔ میں نے اس گاؤں کی زمینداری میں ہی اپنے بال سفید کئے ہیں" دادا جی نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ نے ان بدمعاشوں کو کیوں چھوٹ دے رکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس جھگڑے میں پڑ کر کہیں گاؤں میں پھوٹ نہ ہو جائے۔ میں نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن آپ کی یہ بے توجہی آپ ہی کے لئے نقصان کا باعث بن

"ہے" میں نے کہا۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ ہونے دو میرا نقصان۔ ایک بار تیری شادی کر دوں پھر دیکھتا ہوں ان لوگوں کو۔" انہوں نے کچھ چڑھ کر کہا، ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میری شادی! اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر میں نے سنجیدگی سے غور کیا ہے پتا جی۔ آپ بھی اپنے سماج سے اب اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ خود کو محفوظ سمجھنے والے کتنے جاہل اور گنوار ہوتے ہیں۔ اور دولت کے بل پہ ناچنے والے گنوار کتنے بے وقوف ہوتے ہیں۔ گاؤں کی ایک طوائف کی بات پر یقین کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز کئے بغیر وہ لڑکا شادی کے لئے آتا ہوا بھی واپس چلا گیا۔ کیا معنی ہیں اس بات کے؟ میں تو اسی لئے اس نادیہ بیل سے بیاہی جانے کو راضی ہو گئی تھی کہ آپ دونوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اور اب جبکہ یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے تو میرے خیال میں تو بہت عمدہ ہوا ہے۔ اس سے میری زندگی میں آنے والے مصائب ٹل گئے۔ نہ معلوم میرے ساتھ سسرال میں کیا سلوک ہوتا۔ میری ہر بات معیوب سمجھی جاتی اور میری ہر نقل و حرکت پر وہ لوگ اعتراض کیا کرتے۔ اب تو آپ میری شادی کا خیال ہی ترک کر دیجئے۔ میں خود اپنا بیاہ رچا لوں گی، ورنہ کنواری ہی رہوں گی۔ جی چاہا تو بچارن ہو جاؤں گی، ورنہ تا زیست استانی بنی رہوں گی۔

"پتا جی آپ کے قدموں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرا اور دیال کا تعلق بالکل پاک صاف ہے۔ گاؤں کی چنڈال چوکڑی نے یہ ہنگامہ کھڑا کر کے میری زندگی سے کھلواڑ کی ہے۔ وہ ذلیل لوگ کیا جانیں کہ یہ آپکے لئے کس قدر مہلک ثابت ہوا ہے۔ ہجوم کا دل ہلکا ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ سنتا ہے اسے فوراً قبول کر لیتا ہے۔ اس میں نیک و بد کی تمیز کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ واقعہ رونما ہوا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اب آپ اس معاملہ کو مزید الجھانے کی کوشش نہ کریں۔" میرے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ میری پلکیں بھیگ گئی تھیں اور آواز درمیان میں بھرا جاتی تھی۔

"کیوں اتنی تعلیم دی تھی کو ہم نے؟ اگر بچپن ہی میں اس کی شادی کر دیتے تو بہتر تھا۔" ماں نے والد صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ تو منی آری کا سے پوچھو۔" انہوں نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "آپ سچ کہتی ہیں ماں۔ ہمارے سماج میں لڑکے جتنے تعلیم یافتہ ہونے چاہئیں اتنے ابھی تک نہیں ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکیاں زیادہ پڑھ لیں گی تو یہی حشر ہوگا۔"

"خیر جب تک تیری شادی نہ ہو جائے تب تک تو اگر اسکول میں نہ جائے تو کیا حرج ہے۔" والد صاحب نے مجھے مشورہ دیا۔

"کیا حرج ہے؟ لوگوں کا شبہ اور بڑھے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم جو کہتے تھے وہ سچ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عام جلسہ میں استانی کا کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اب اس کا کیا ہوگا؟ مہرشی جتنا شنکر کا ہم پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو سچ کہتی ہے تو۔" پتا جی بولے۔

اسی وقت دیوار پر ٹنگے ٹائم پیس نے گھر گھر ٹن کر کے رات کے دو بجائے۔

"چلو اب سو جائیں۔ رات بہت جا چکی ہے۔" ماں نے کہا۔

"ہاں ہو تو گئی۔" یہ کہتے ہوئے پتا جی بھی اٹھے۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی، مگر نیند نہ آئی۔ اب تک جو واقعات ہو چکے تھے سب کے سب فلم کی طرح میرے دماغ میں آنے لگے۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اگر شادی کروں گی تو دیال ہی سے کروں گی۔ اس فیصلہ میں دیال سے محبت کے ساتھ ہی گاؤں والوں سے انتقام کا جذبہ بھی مضمر تھا۔ سماج اور گاؤں والوں نے میرا اب تک جو نقصان کیا تھا اس سے زیادہ وہ اب کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح میرا اور دیال کا رشتہ بھی جوڑ ہی دیا تھا۔ پھر اب کس بات کا ڈر تھا۔ مگر کیا دیال یہ اقدام کر سکیں گے؟

ہاں میں یہی کروں گی۔ وہ تعلیم کے لئے ولایت جلدی رہے ہیں۔ ان کے وہاں پہنچنے پر میں بھی کسی مضمون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلی جاؤں گی۔ وہاں ہم دونوں ساتھ رہیں گے اور کورس پورا ہونے پر شادی کر لیں گے۔ اگر جی چاہا تو ہندوستان واپس آئیں گے ورنہ وہیں رہنے لگیں گے۔ وہاں ہمارے تعلقات پر نکتہ چینی کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔

لیکن ابھی دیال سے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہئے۔ ولایت ہی میں اگر یہ باتیں ہوں تو اچھا ہے۔ اگر کسی وجہ سے میں وہاں نہ جا سکی تو اس کے بارے میں بعد میں غور کر لیا جائے گا۔ مگر میرے لئے ولایت جانا ناممکن کیوں ہے؟ صرف ایک ہی تو بات ہے کہ ماں باپ میری جدائی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر میری شادی ہو جاتی تو کیا مجھے سسرال نہ جانا پڑتا؟ بس یہی بات ہے جس سے وہ دونوں راضی کئے جا سکتے ہیں۔

اور اسی قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی میں صبح کے وقت نہ جانے کب سو گئی۔

جولائی کا مہینہ آگیا۔ اسکول کے کھلنے کے پہلے ہی دیال دھرم پور آگئے۔ میری شادی کے ٹوٹنے کی خبر وہ اخباروں میں پڑھ ہی چکے تھے۔ اس لئے دھرم پور آتے ہی انہوں نے مجھے تسلی و تشفی دی۔ ہمارے اسکول کا کام باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ اب میں حسب معمول اسکول جانے لگی تھی۔

ایک دن میں نے ان سے کہا۔

"میں بھی انگلستان جا رہی ہوں۔"

"سچ؟"

"ہاں۔"

"تو میرے ساتھ ہی چلو نہ۔"

"نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ آپ وہاں پہنچ جایئے اور وہاں سے کسی کورس کے بارے میں تفصیل سے مجھے لکھئے، تب میں آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، یہی سہی۔" دیال نے کہا۔

"گذرے ہوئے واقعات کو بھلا دینے کی مجھے ایک ہی ترکیب سجھائی دے رہی ہے۔ آپ کو پسند ہے یہ خیال؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں خیال تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات ہے۔ جس طرح آپ کی بدولت میری شادی ٹوٹ گئی اسی طرح آپ کی وجہ سے کہیں میرا ولایت جانا نہ رک جائے۔" میں نے کہا۔

"کیا کہا؟ میری وجہ سے تمہاری شادی ٹوٹ گئی؟" دیال نے حیرت سے پوچھا۔

"لوگوں نے ہم دونوں کا رشتہ جوڑ دیا۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ کتنے ذلیل ہیں۔ انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ تم کس قدر پاکیزہ جذبات کے ساتھ اسکول میں کام کرتی ہو۔ اچھا تو میں ہی ولایت چلا جاتا ہوں تاکہ ان کا منہ بند ہو جائے۔ دراصل دقت یہ ہے کہ ابھی تک پورے خرچ کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ اور جب تک وہ نہیں ہو جاتا مجھے یہیں رکنا پڑے گا۔ تمہارا باہر جانے کا خیال بہت مستحسن ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔ میں وہاں پہنچتے ہی تمہارے لئے جو مناسب مضمون ہوگا اس کے کورس وغیرہ میں تمہیں ارسال کر دوں گا۔" دیال نے بے چارگی سے کہا۔

"دیکھوں آپ کیا کرتے ہیں؟" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور ہم اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

چھٹی کا گھنٹہ تھا۔ دن بھر لڑکوں کو پڑھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر اپنا کام مکمل کر کے جب استاد گھر کو واپس ہوتے ہیں تو کچھ ہلکا پن محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اسی خیال میں منہمک چلی جا رہی تھی کہ ایک لڑکے نے آکر کہا۔

"آپ کو ماسٹر جی بلا رہے ہیں۔" اور میں اس کے ساتھ ہو لی۔

دیال [illegible] پڑھا کر ابھی لوٹے تھے۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہئے کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں ایک گذارش ہے منی جی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے پہلے ایک درخواست میری ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"آج سے آپ مجھے منی نہ کہا کریں۔ میرا نام کمل ہے۔ مجھے اسی نام سے پکارا کیجئے۔"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی یوں۔"

"بہت بہتر۔" اور یہ کہہ کر وہ ہنس دیئے۔

"آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"ہاں کیوں بلایا کیوں تھا میں نے؟" پھر سر کھجا کر وہ یاد کرنے لگے۔

اسی وقت ڈاکخانہ سے تار لے کر چپراسی آیا۔ "تار ہے صاحب" اس نے کہا۔

"کس کا تار؟" دیال نے پوچھا۔

"آپ کا۔" اس نے جواب دیا۔

دیال نے دستخط کئے اور تار وصول کیا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہم چلے انگلینڈ دسہرے پر۔ جہاز میں سیٹ مل گئی ہے۔ تاریخ جانے کی کا ہے۔ اب ضروری کپڑے بنوانے اور کچھ سامان وغیرہ خریدنے کے لئے مجھے ایک مرتبہ بمبئی جانا پڑے گا۔" انہوں نے کہا۔

"مبارک ہو۔"

"شکریہ۔"

اسی وقت ایک لڑکا دوڑتا ہوا وہاں آیا۔ اس نے دیال کو اشارے سے بلایا اور اس سے کان میں کچھ کہا۔ میں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔

"تو میں چلتا ہوں۔" میں نے اس سے رخصت لینا چاہی۔

"جائیے۔ کل ذرا جلدی آجایئے گا۔"

"بہت بہتر۔ آج آپ انگلستان جانے کے خواب دیکھیے۔" اور میں وہاں سے چل دیا۔ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا تو دیال کی نگاہیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔

۷

بدمعاشوں اور مفسدوں کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ ان کی اصلاح کرنے کی اگر کوشش کی جائے تو انسان خود بیوقوف بن سکتا ہے۔ یا اس کا نتیجہ خلاف امید برعکس بھی نکل سکتا ہے اور وہی لوگ ناقابل اصلاح بھی بن سکتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں پنت اور اس کا گروہ کبھی بے بس سے رہ رہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ اس عرصہ میں کیا تھا اسے دہرانا بیکار ہے۔ مگر ان کی بداعمالیوں کو روکنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہ کرتا تھا۔ داداجی نے بھی کسی نہ کسی وجہ سے اس کی طرف سے بے توجہی برتی تھی۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ اس گروہ نے میری شادی کا رشتہ منقطع کرایا ہے تو اس طرف انہوں نے رجوع کیا۔ بظاہر تو ان کے پنت کی طرف سے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن درپردہ وہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اور کسی موزوں گھڑی کے منتظر تھے۔ جب دل میں انتقام کی آگ کا دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ بیتاب ہو کر قبل از وقت ہی اپنا وجود ظاہر کر دیتی ہے۔ والد صاحب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

والد صاحب نے گاؤں کے کچھ لوگوں کے سامنے واضح طور پر یہ الزام لگایا کہ میری شادی میں رخنہ چندرا نے ہی ڈالا ہے۔ اور صرف الزام لگا کر ہی وہ خاموش نہیں ہو گئے بلکہ انہوں نے کچھ بھلا برا بھی پنت اور اس کے گروہ والوں کو کہا۔ اس کی خبر پنت اور چندرا کو لگی۔ پھر کیا کہنا تھا۔ والد صاحب نے ناگ اور ناگن کے بل میں صرف ہاتھ ہی ڈالا تھا کہ اس سانپ کی جوڑی نے ہمیشہ کے لئے انہیں اپنا دشمن بنا لیا۔

آج تک داداجی نے پنت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ اور ادھر پنت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ داداجی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہیں اور وہ انہیں حسب منشا نچا سکتا ہے۔ چونکہ اب تک اسے اپنے ہر ناپاک ارادہ میں کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے اس پر کچھ نشہ سا چڑھ گیا تھا۔ حال ہی کے دو ایک معاملات میں پنت کی جھوٹی رپورٹ پر داداجی نے اپنے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسے مجبوراً سچی رپورٹ لکھنا پڑی تھی۔ نتیجے کے طور پر اس نے جو رشوت لی تھی اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور جن لوگوں نے اسے رشوت دی تھی وہ کھلم کھلا اسے گالیاں دینے لگے۔

ایک بات اور ہو گئی تھی۔ پنت اور اس کے گروہ کی کرتوتوں کا علم جب دیال کو ہوا تو انہوں نے فرصت کے وقت گاؤں کے لوگوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو مناسب صلاح دیتے۔ ان کے باہمی جھگڑے نپٹاتے اور کچہری میں جانے والے معاملوں کا آپس میں سمجھوتہ کرا دیتے تھے۔ ان کے فیصلے سے دونوں فریقین مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس طرح دیال کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی، اور پنت کی آمدنی گھٹتی جا رہی تھی لہذا پنت دیال سے حسد رکھنے لگا تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ گاؤں میں ہر سو تاریکی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دھرم پور گاؤں کالی کملی اوڑھ کر گہری نیند سو رہا ہے۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے درخت بھی ساکت تھے۔ کتوں کا بھونکنا بند تھا۔ رات کے کیڑوں کی کرّ کرّ آواز آ رہی تھی۔ دور کہیں کسی درخت پر الو چیخ رہا تھا۔ گاؤں میں صرف گشت والے گھوم رہے تھے اور گاؤں کے باہر......

تین میل دور جنگل میں ایک پہاڑی پر ہنومان جی کے پرانے مندر میں بڑی چہل پہل تھی پنت اور اس کے گروہ کے لوگ حسب معمول وہاں جمع تھے۔ آج ناچ گانے کا پروگرام نہ تھا۔ درمیان میں قالین پر پنت بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں اس کی داشتہ چندرا جو زرق برق ساڑی اور سونے کے زیورات سے آراستہ تھی، بیٹھی ہوئی تھی۔ ارد گرد اس کے گروہ کے لوگ بیٹھے تھے۔ آج ان کا کھانا پنت کی طرف سے تھا۔ خود چندرا نے سارا انتظام کیا تھا۔ کھانا ابھی ابھی ختم ہوا تھا اس لئے لوگ پان تمباکو کھاتے ہوئے بیڑی اور سگریٹ کے کش کھینچ رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور گپوں کا بازار گرم تھا۔ بعض لوگوں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ ملا کر کوئی تیس آدمی تھے۔

"چندرا آج میٹھا تو ہو گیا۔ اب ایک دن نمکین بھی ہو جائے" ملیا نے کہا۔

"وہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن ....." چندرا نے کہا۔

"ہمارے ہوتے ہوئے تمہارے لیکن کا مطلب؟" ملیا نے سوال کیا۔

"راشننگ کا زمانہ ہے نہ؟ کہیں پتہ لگ گیا تو؟" چندرا نے جواب دیا۔

"بس اتنی سی بات؟ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ ہمارے کس کام کا پتہ لگا ہے آج تک؟" کلیا نے کہا۔

"مگر اب حالات بدل گئے ہیں، اس لئے ......" پنت نے کہا۔

"آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے جناب؟ اس طرح مایوس ہونے کی وجہ؟" شنکریہ نے پوچھا۔

"آخر ایسی کون سی صورت پیدا ہو گئی ہے اب کچھ بتاؤ بھی تو؟" گیوسنار نے پنت سے پوچھا۔

"وہی اب میں کہہ رہا ہوں" پنت نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر کہئے؟" ہنومنت درزی نے بے چین ہو کر کہا۔

"اچھا تو سب کو خاموش کرو اور سنو" پنت نے کہا۔

"بھائیو سنو! پنت کچھ کہہ رہے ہیں۔ چپ ہو جاؤ، سنو سنو" کلیا چلایا۔

سب لوگ اٹھ کر قاعدے سے بیٹھ گئے۔ شور و غل بند ہو گیا۔ پنت کی تقریر سننے کے لئے سب لوگ اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھ جلی بیڑی اور سگریٹ کے ٹوٹے لوگوں نے باہر پھینک دیئے۔ بعض لوگوں نے پان بھی تھوک دیئے۔ سب لوگ پنت اور چندرا کو گھیر کر ایک غول میں بیٹھ گئے۔

"ہاں کہئے، اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" چندرا نے پنت سے کہا۔

پنت کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے کہا ــــــ

"بھائیو! ہم لوگ اپنی دنیاوی تکالیف کو فراموش کرنے کے لئے اکٹھے بیٹھتے اور اپنا دل بہلاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دوسروں کا کلیجہ کیوں پھٹتا ہے؟ گذشتہ کئی برس ہم نے بڑے اطمینان اور خوشی سے بسر کئے ہیں۔ مگر اس سال سے گاؤں کی فضا کچھ مکدر ہو گئی ہے۔ جب سے اپنا اسکول کھلا ہے اور وہ دیال ماسٹر آیا ہے تب سے اس نے رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ ماسٹری کرنا چھوڑ کر وہ گاؤں کے معاملوں میں بھی مخل ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے اور تم سب لوگوں کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ یہ تو تم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ... زمیندار کی بیوی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اس چھوکری کی برات گاؤں میں آکر واپس ہو گئی تھی۔ اگر ایسی گندی باتیں ہم اپنے گاؤں میں ہونے دیں گے تو ہمارے لئے بہت شرم کی بات ہے۔ داداجی زمیندار جیسا بدھو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کا اپنا لونڈیا پر کوئی زور نہیں اور اوپر سے بکتا پھرتا ہے کہ چندرا نے اس کی بیٹی کی شادی توڑ دی۔ گویا ہماری چندرا کو دنیا کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

"آج تک میں نے اس کا ساتھ دیا۔ میری بدولت ہی وہ زمینداری بھی کر سکا، اگر میں اس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر آج وہ ان تمام احسانوں کو فراموش کر رہا ہے۔ وہ بوڑھا شیطان بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ میری با... تو چھوڑو، وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، مگر تم لوگ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ اس کی بیٹی کی شادی کا رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ سارے گاؤں پر خار کھائے بیٹھا ہے۔ لیکن کیا اس کی یہ بوکھلاہٹ نامناسب نہیں؟ اگر اس کا سکہ کھوٹا ہے تو گاؤں والوں کا اس میں کیا قصور؟ اس کے لئے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ سنو اور بتاؤ تمہیں پسند ہے یا نہیں؟"

"بتلایئے بتلایئے وہ کون سی ترکیب ہے؟" سب لوگ ایکدم چلا پڑے۔

"دیال ماسٹر کو گاؤں سے نکال دینا چاہیئے۔" پنت نے آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، ضرور نکال دینا چاہیئے۔" سب نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

"بلیا، ملیا، کلیا!" پنت نے بآواز بلند ان تینوں کو للکارا۔

"جی!" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تمہیں کو یہ کام کرنا پڑے گا۔" اس نے "تمہیں" پر زور دیا۔

"کل ہی نکالے دیتے ہیں یہ کون بڑی بات ہے۔" کلیا نے کہا۔

"کیا کرو گے تم ؟" پنت سے کڑک کر کہا۔

" اسے اٹھا کر گاؤں کے باہر لے جائیں گے۔ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیں گے اور کہیں گے کہ گاؤں سے چپ چاپ بھاگ جانا ورنہ تیری خیر نہیں ۔ اگر زیادہ گڑبڑ کرے گا تو وہیں ختم کر دیں گے ؟" بلیا نے کہا۔

پنت نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ "نہیں، یہ کافی نہیں۔ کل رات اسکول میں آگ لگا دو۔ اس سے دو کام ہو جائیں گے۔ ایک تو زمیندار کی کوٹھی جل کر خاک ہو جائے گی۔ اور دوسرے اسکول بند ہو جائے گا۔ اور پھر ماسٹر خود ہی چلا جائے گا ۔"

" ٹھیک ہے ۔ کل رات ہی اسکول میں آگ لگا دیں گے۔ صبح آپکو اس جگہ راکھ کا ڈھیر ملے گا ۔" کلیا نے کہا۔

" ہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ـــــ تم میں سے کئی کے لڑکے رات کو اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں اور وہیں سوتے ہیں کسی بہانے انہیں کل رات کو اسکول میں نہ جانے دینا۔ اور اگر جائیں تو کبھی کم از کم انہیں وہاں سونے نہ دینا ۔" پنت نے کہا۔

" میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں سے اس کے متعلق کچھ بھی نہ کہا جائے تو بہتر ہے ۔ اگر ہم نے لڑکوں کو پہلے سے ہی متنبہ کر دیا، تو ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے ۔ لڑکوں کو وہاں حسب معمول جانے دیا جائے، مگر آگ لگانے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ سب لڑکے باہر نکل آئے ہیں یا نہیں ۔ اور جب وہ سب کے سب باہر نکل آئیں تب آگ لگا دی جائے ۔" گروہ کے ایک ممبر نے صلاح دی ۔

" ہاں ہاں ایسا بھی کر سکتے ہو ۔ کچھ بھی کرو، یہ کام ہونا چاہیئے ۔" چندرا نے کہا ۔

" اب رات بہت ہو گئی ہے ۔ تمہیں کام بتلا دیا گیا ہے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کام بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نیز خفیہ طور پر کیا جائے ۔ سب کام اس خوبصورتی سے ہو کہ اسکول میں کب آگ لگی ؟ کس نے لگائی ؟ کس طرح لگائی ؟ اس کا کسی کو سراغ نہ ملے ۔ اگر ذرا بھی پتہ چل گیا تو آفت آجائے گی ۔ سمجھے ؟" پنت نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اور سب لوگ اپنے اپنے ہتھیار لے کر اٹھ گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے ۔

پنت نے چندرا کی طرف اور چندرا نے پنت کی طرف اطمینان کی نظروں سے دیکھا ۔

دوسرے دن سورج نکلا ۔ اسکول حسب معمول کھلا اور بند ہوا ۔

انگلینڈ کی تاریخ میں پارلیمنٹ اڑا دینے کی ایک سازش مشہور ہے ۔ ایک گروہ نے یہ سازش کی تھی اور اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی تھی ۔ لیکن اس گروہ کے ایک شخص نے اپنے ایک عزیز کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی تھی کہ فلاں دن تم پارلیمنٹ میں حاضر نہ ہونا۔ اور اسی بے احتیاطی سے اس سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا ۔ سچ ہے محبت پاگل ہوتی ہے ۔

پنت کے گروہ کے ان لوگوں نے جن کے لڑکے اسکول میں رات کو پڑھنے اور سونے آیا کرتے تھے، اپنے لڑکوں کو مختلف طریقوں سے آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا تھا ۔ بعض لوگوں نے تو اپنے لڑکوں کو اس رات اسکول میں سونے سے منع کر دیا تھا ۔ چند لوگوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنے لڑکوں کو اسکول نہ بھیجنے کا ہی انتظام کر لیا تھا ۔ کسی نے یہ کہہ کر اپنے بچوں کو چیتاونی دی تھی کہ دیکھو سنبھل کر رہنا آج رات تمہارے اسکول میں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے ۔

ان اطلاعات کا مطلب لڑکے نہ سمجھ پائے تھے ۔ کیونکہ وہ انہیں یوں ہی روا روی میں دی گئی تھیں ۔ اس کے باوجود چند لڑکے گھر والوں کی آنکھ بچا کر رات کو ہمیشہ کی طرح پڑھنے اور سونے چلے آئے تھے ۔ بعض لڑکوں نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کی تھی اور ان کی چیتاونی پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا ۔ پھر بھی روز کی بہ نسبت آج لڑکوں کی تعداد کم تھی ۔ روزانہ کی بہ نسبت لڑکوں کی تعداد کم دیکھ کر دیال نے یوں ہی دریافت کیا ۔

" کیوں بھئی آج لڑکے بہت غیر حاضر ہیں ۔ کیا بات ہے ؟ کیا گاؤں میں کوئی سینما یا سرکس آیا ہے ؟ "

" نہیں سر ۔ بلکہ . . . . ." ایک لڑکے نے کہا ۔

" بلکہ کیا ؟" دیال نے پوچھا ۔

" آج کچھ . . . . ." لڑکا کہتے کہتے رک گیا ۔

" کیا کہہ رہے ہو ؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے ؟ کیا بات ہے ؟" دیال نے چڑھ کر پوچھا ۔

" آج کچھ ہنگامہ ہونے والا ہے سر ۔" لڑکے نے کہا ۔

"کہاں ؟" دیال نے پوچھا۔

"یہیں ہمارے اسکول میں سر۔" جواب ملا۔

"کیوں جی یہ کیا کہہ رہا ہے ؟" دیال نے سب لڑکوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں سر" سب نے ایکدم کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے ؟"
دیال نے سب لڑکوں سے دریافت کیا۔

"ہمارے گھر والوں نے ہمیں اطلاع دی ہے" مدھوکر سنار نے کہا۔

"سچ ہے ؟"

"جی ہاں سر" ہر لڑکے نے جواب دیا۔

پہلے تو دیال کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ ان کے خلاف کون سی سازش کی گئی ہے۔ مگر وہ پسپٹ اور اس کے گروہ کی کرتوتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کس وقت کیا کر بیٹھیں گے اس کا پتہ نہیں۔ اس لئے انہیں آنے والی مصیبت کا کچھ اندازہ ہوگیا۔ پھر بھی وہ ذرا نہ گھبرائے اور انہوں نے سب طلبا سے کہا ــــ

"تم لوگ بکواس کر رہے ہو۔ کیا تم اسے ممکن سمجھتے ہو ؟ پڑھو اور بےخوف سو جاؤ" دیال کا حکم سن کر لڑکے اپنی کتابوں میں منہ چھپا کر آپس میں کچھ سرگوشیاں کرتے رہے۔ دیال بھی اپنے کمرہ میں جا کر انہیں خیالات میں منہمک ہوگئے۔

لڑکے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو یا جھوٹ لیکن مجھے اس کے لئے محتاط رہنا چاہئے۔ جاہل لوگوں کا کیا بھروسہ ؟ آج جس کے نام کے نعرے لگا رہے ہیں اسی کا کل قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔ مہاتما گاندھی جیسے قابل پرستش ہستی کا بھی انہوں نے خون کر دیا تھا ....

دیال اٹھے انہوں نے دو خط جلدی جلدی لکھے۔ پھر دو لڑکوں کو بلایا اور انہیں خط دیکر کہا ــــ "بالکل خفیہ طریقے سے پہنچا آؤ۔ دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے" لڑکے خط لے کر دوڑتے چلے گئے۔

سنگرو کے انقلاب میں گاؤں کے متعدد غنڈوں نے بڑا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اسوقت گاؤں کے تحفظ کے لئے دھرم پور کے چند نوجوانوں نے رضاکار پارٹی قائم کی تھی۔ اس پارٹی کے لیڈر دیال کے گہرے دوست تھے۔ اور انہیں بہت چاہتے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھ

دیال نے انہیں لوگوں کو رقعے بھیجے تھے۔ انہوں نے ان میں انہیں اسکول پر آنے والی مصیبت سے آگاہ کیا تھا۔ اور ان سے امداد طلب کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد لڑکے ان خطوں کو لیکر دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ ان لوگوں نے دیال کو صرف مدد دینے کا ہی وعدہ نہیں کیا بلکہ رات بھر اسکول کی نگرانی کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔

دس بجے حسب معمول دعا ہوئی اور دیال نے سب لڑکوں کو سونے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے بستر پر آکر لیٹ گئے۔

ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے ــــ میں اچھوت ہوں کیا اسی لئے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن میری تقریروں میں تو آجتک کسی نے گڑبڑ نہیں کی۔ پھر کیا کنول سے میرا رشتہ جوڑ کر لوگ مجھ سے انتقام لے رہے ہیں ؟ مگر گاؤں کے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں میں کتنا محتاط ہوں۔ کہیں پنڈت اور اس کی ٹولی کا تو ناپاک ارادہ نہیں ؟ لیکن میں نے ان کی کھلم کھلا کبھی مخالفت نہیں کی۔ کہیں، وہ واجی تو مجھے بھگانے کے فراق میں نہیں ہیں۔ لیکن ان جیسا نیک آدمی ایسا تو نہیں کر سکتا۔ خیر مجھے جرأت سے کام لینا چاہئے اور جو کچھ ہو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔

نیم بیداری کے عالم میں وہ انہیں متفرق باتوں پر غور کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی ــــ

"ماسٹر صاحب! او دیال ماسٹر صاحب !"

دیال نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ماسٹر! دیال ماسٹر!" یہ چلاتے ہوئے کسی شخص نے دروازے کی کنڈی کو زور زور سے بجانا شروع کیا۔ الماری کی کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے دیال نے پوچھا ــــ

"کون ہے ؟"

"میں ہوں، ہنومنت راؤ دیرزی"

"کہئے ہنومنت راؤ جی اتنی رات گئے کیسے ؟" دیال نے بڑی نرمی سے دریافت کیا۔

"پہلے دروازہ تو کھولئے، پھر بتاتا ہوں" اس نے جواب دیا۔

"کئی دروازوں میں تالے پڑے ہیں۔ آپ بتلائیے تو سہی آخر چاہتے کیا ہیں ؟"

"وہ بچارا تاسو گھر سے روٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ اسے نیچے لے آئیے۔" ہنومنت نے اصرار کیا۔

"بہت اچھا ذرا ٹھہریئے۔" دیال نے کہا۔

دیال نے تام دیو کو جگایا اور اس سے معلوم کیا — "کیا تو روٹھ کر گھر سے آیا ہے؟"

"نہیں سر۔"

"تیرے چاچا جی تو کہہ رہے ہیں۔" دیال نے ڈانٹا۔

"کہاں ہیں چاچا جی؟" تام دیو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"نیچے کھڑے ہیں۔"

"آپ کی قسم سر میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ روٹھا ہوا تھا نہیں ہوں۔" تام دیو نے کہا۔

"تمہیں مجھے یقین نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ چل نیچے اپنے باپ کے پاس۔"

"چلئے سر ابھی آپ کو یقین آجائے گا۔" تام دیو نے نڈر ہو کر کہا۔

دیال اور تام دیو نیچے آئے۔ دیال نے دروازہ کھولا اور ہاتھ سے لالٹین کو سامنے بڑھا کر ہنومنت سے مخاطب ہوئے — "آپ کا تاسو تو کہہ رہا ہے کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے۔"

ہنومنت نے تام دیو کا کان پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گھر لے گیا۔ تھوڑی دور جانے پر اس نے اس سے کہا — "ابے گدھے میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟ کیوں آیا تھا یہاں مرنے؟"

دیال کے کانوں نے یہ الفاظ سنے اور ان کا دماغ روشن ہو گیا۔ ہنومنت جھوٹ بولا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا لڑکا کسی طرح اسکول میں نہ رہے۔ خیر۔ انہوں نے کواڑ بند کئے اور اس واقعہ پر غور کرتے ہوئے لیٹ گئے۔ اسی وقت نیند میں ایک لڑکا چیخ اٹھا۔

"سر دروازہ نہ کھولئے۔ ٹھہریئے، ٹھہریئے۔"

وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ دیال نے اسے تھپک کر سلا دیا۔

دیال کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ کروٹیں بدل رہے تھے کہ رات کے دو بج گئے اور...... اسکول کے سامنے انہیں کچھ شور و غوغا سنائی دیا۔

"ماسٹر دروازہ کھولو۔"

دیال نے اٹاری کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر گھنا اندھیرا ہونے کی وجہ سے دس پندرہ مشعلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں — ان مشعلوں کی روشنی میں بھالے، تلوار، پستول اور بندوق وغیرہ ہتھیار چمک رہے تھے۔ ان ہتھیاروں سے لیس کوئی دس پندرہ آدمی کالے نقاب اوڑھ کر اسکول کے صدر دروازہ کو بھڑ بھڑا رہے تھے۔ اب دیال کو آنے والی مصیبت کا علم ہو گیا۔ انہوں نے آہستہ سے دو لڑکوں کو جگایا اور انہیں عقبی دروازے سے رضاکاروں کو بلانے کیلئے بھیج دیا۔

دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ دیال نے سوچا اب ڈرنے سے کام نہ چلے گا۔ اس مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ دیال نے لالٹین روشن کی اور سب لڑکوں کو بیدار کر دیا۔ لڑکے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ دیال نے ان سے کہا —

"چلو جلدی کرو، ورنہ جل مروگے۔" سب لڑکے دروازے کے پاس آئے۔ دیال نے کواڑ کھول دیئے اور وہاں کھڑے ہو گئے۔ دیال نے لڑکوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا — "لڑکو! ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کوئی بھی ہوں مگر ایک بات یقینی ہے کہ یہ تمہارے اسکول میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم پڑھ لکھ کر قابل بنو۔" پھر انہوں نے نقاب پوشوں سے خطاب کیا —

"بھائیو! ان معصوم بچوں نے آپ کا کون سا نقصان کیا ہے۔ ان کے قصور کی آپ لوگ مجھے سزا دیجئے، اور اگر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو بھی ہر قسم کی سزا کے لئے تیار ہوں، مگر اس اسکول کو۔ لڑکوں کے اس مدرسہ کو نہ جلایئے۔"

"سب لڑکے باہر آگئے؟" نقاب پوشوں میں سے ایک نے گرج کر کہا۔

"نہیں ابھی سب باہر نہیں آئے ہیں۔ ابھی بھی کچھ بچے اندر سوئے ہوئے ہیں۔" دیال نے کہا۔

"ابے او ماسٹر کے بچے! نکال انہیں باہر۔ کھڑا کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟" ان میں سے کسی نے کہا۔

لڑکے گھبرا گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ دیال اسکول کے اندر گئے اور یہ دیکھ کر کہ کوئی وہاں سوتا ہوا تو نہیں رہ گیا ہے۔ نیچے آگئے۔

"چل دور ہو یہاں سے، سنبھال اپنے لونڈوں کو۔" یہ کہہ کر نقاب پوش اپنی اپنی مشعلیں لے کر اسکول کی جانب بڑھنے لگے۔ اسی

وقت سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور ٹارچ کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ رضاکاروں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا مدد کے لئے آرہا تھا اور ادھر لڑکوں نے نقاب پوشوں پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر حملہ آوروں نے انہیں پولیس کی ٹولی سمجھا اور وہ ڈر کر اپنی اپنی مشعل وہیں پھینک کر اندھیرے میں بھاگ گئے۔

دیال نے رضاکاروں کی بروقت آمد کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اسکول کی عمارت بچ گئی۔

پنت اور اس کے گروہ کے ناپاک ارادے خاک میں مل گئے۔

۸

جب خوشی اور غم کا احساس بیک وقت ہونے لگتا ہے تو دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی عالم دیال کا بھی تھا۔ گزشتہ واقعات کو یاد کرکے وہ بے حد مغموم و ملول ہو جاتے تھے اور جب ولایت جانے کا خیال آتا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک روز اسکول میں جب باتیں ہوئیں تو بےساختہ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے گاؤں سے تو اب میرا دل بالکل اکتا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی یہاں سے جا بھی سکوں گا یا نہیں؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"لوگ سب کچھ کر چکے۔ اب کرنے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"بس؟ آپ اتنے سے ہی گھبرا گئے؟ زندگی میں خوشی و غم تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ جہاز پر قدم رکھتے ہی آپ یہ سب بھول جائیں گے۔" میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم کہتی تو سچ ہو۔ میں ولایت جا رہا ہوں۔ پھر بھلا وہاں سے واپسی کی کیا امید؟"

"جی ہاں کیوں نہ ہو؟ آپ مرد جو ٹھہرے۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن میں؟" میں نے کہا۔

"تمہیں کس بات کی تکلیف ہے؟"

"لوگ پرائے دکھ کو ہمیشہ ایسا ہی سمجھا کرتے ہیں۔ خود کو نہیں دیکھتے؟ لوگوں نے اسکول کے بارے میں تھوڑی سی گڑبڑ کر دی اور اتنے ہی آپ اس قدر بے چین ہو گئے کہ اتنے جلدی گاؤں چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ذرا میری طرف تو دیکھئے کہ میرے ہاتھ پیلے ہونے سے پہلے ہی گاؤں والوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کس قدر کوفت ہوئی ہوگی مجھے؟ کیا آپ میری تکلیف کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ بتلائیے کہاں جاؤں میں، کیا کروں؟ ایسی صورت میں گاؤں میں ہی پڑے رہنے کے علاوہ میرے پاس چارہ کار ہی کیا ہے؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم بھی تو انگلینڈ آ رہی ہو نہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو تبھی ممکن ہے جب آپ وہاں سے مجھے کورس بھیجیں گے، اور دادا جی مجھے ولایت جانے کی اجازت دے دیں گے۔" یہ کہہ کر میں رک گئی۔

"تم ضرور آؤ گی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ تو تعلیم ختم کرنے کے بعد وہاں سے واپس نہیں آئیں گے لیکن میں کیا واپس آجاؤں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"تم بھی وہیں رہ جانا، تمہیں روکتا کون ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سوٹ نہ کپاس اور......" میں نے کہا۔

کسی کام سے دیال وہاں سے چلے گئے اور میں بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد میں گھر واپس آئی۔ ماں جلد ہی جین مندر سے واپس آئی تھیں انہوں نے مجھے بلا کر کہا ـــــ "منی تو آجکل جین مندر میں نہیں جاتی کیا بات ہے؟"

"کس طرح جاؤں، اسکول میں پڑھانے کے بعد اس قابل ہی نہیں رہتی کہ کہیں جاؤں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک روز کی چھٹی لے کر ہی آجا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت اچھا، کل آؤں گی۔" زیادہ بحث سے بہتر میں نے ان سے وعدہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

رات کو اپنے کمرے میں میں لڑکوں کی کاپیاں جانچ رہی تھی۔ ماں جلدی سو گئی تھیں۔ تقریباً دس بجے مجھے پتا جی نے بلایا۔ میں ان کے کمرے میں گئی۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ آج کوئی خاص بات ہوگی۔ انہوں نے کہنا شروع کیا ـــــ

"کیا تو جانتی ہے کہ تیرے پیروں تلے کیا جل رہا ہے؟ لوگ تیرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟"

مجھے کیسے اس کا علم ہو سکتا ہے، اسکول اور گھر کے علاوہ میں گاؤں میں جاتی ہی کہاں ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"[illegible] تو کیوں کہے گی"

"اگر لوگ میرے متعلق غلط باتیں کرتے پھرتے ہیں تو میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں" میں نے سوال کیا۔

"اب اسکول جانا بند کر دے" دادا جی نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے گستاخی سے کہا۔

"اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ تو وہاں اپنے اچھوت کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر کے ہمارے خاندان کے منہ پر کالک پوتنا چاہتی ہے۔"

"کیا آپ سے کسی نے کہہ دیا؟"

"کہتا کون؟ لوگ کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ سب جھوٹ بولتے ہیں؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ لوگوں نے ہی میری شادی کا رشتہ توڑا اور آج جب وہ میرے متعلق یہ افواہ اڑا رہے ہیں تو آپ نے اس پر یقین کر لیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں سب جھوٹے ہیں، ایک تو ہی سچائی کی دیوی ہے اس دنیا میں"

"اگر مجھے دیال سے شادی کرنا ہوتی تو جس سے آپ نے میرا رشتہ طے کیا تھا اس سے شادی کرنے کے لئے میں کیوں تیار ہو جاتی۔ مگر میں نے آپ سے کبھی اس کے بارے میں کچھ کہا؟"

"دیال ہی کی وجہ سے تیرا وہ رشتہ منقطع ہوا۔ اسی کی وجہ سے اسکول میں آگ لگنے کی سازش ہوئی۔ لیکن اب وہ بھی یہاں سے جانے کیلئے تیار نہیں۔ آخر کیوں رکا ہوا ہے وہ؟"

"وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ اگر فوراً چلے جاتے تب بھی لوگوں کا شبہ قائم رہتا۔ دوسرے ماسٹر جی نے خود انہیں یہاں چند روز ٹھہرنے کے لئے کہا ہے" میں نے کہا۔

"زہر کی زیادہ جانچ سے حاصل؟ بہتر تو یہی ہے کہ اسکول جانا فوراً بند کر دے" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"اگر آپ کا یہی حکم ہے تو میں اسکول نہ جاؤں گی۔ لیکن وہ تو اب جانے والے ہی ہیں۔ اس [illegible] کچھ عرصہ کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے تو لوگوں کو مجھے بدنام کرنے کا اور موقع ملے گا"

"کچھ بھی ہو اس سے کہہ دو کہ وہ جلد منہ کالا کرے" دادا صاحب نے حقارت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، انہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہ آفت جلد از جلد یہاں سے ٹل جائے اسی لئے اس داڑھی والے کو مجھے پانچ ہزار روپے دینے پڑے" انہوں نے خشمناک ہو کر کہا۔

"آپ کو چاہیے تھا کہ نہ دیتے"

"تیری خاطر ہی مجھے ایسا کرنا پڑا"

"اچھا ہوا"

"اچھا ہوا نا؟ کسی سے کہنا مت۔ جا اب جا کر سو جا"

میں اٹھی اور جا کر اپنے کمرے میں سو گئی۔

صبح اسکول پہنچی تو معلوم ہوا کہ دیال جانے والے ہیں اور ان کی جگہ میں ہیڈ مسٹریس مقرر کر دی گئی ہوں۔ ساتھ ہی میری مدد کے لئے ایک اور خاتون کا تقرر بھی ہو گیا ہے۔

دیال کے دھرم پور سے چلے جانے کے بعد گاؤں میں فتنہ و فساد کرنے والوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہمارے اسکول کا کام بھی بڑی باقاعدگی سے چلتا رہا۔ ماں اور دادا جی بھی اب بہت خوش تھے۔

ایک روز شام کو ماں کو کچھ حرارت سی ہو گئی۔ ہم سمجھے کہ یہ سب تھکاوٹ اور اپواس (روزہ) رکھنے کی وجہ سے ہوا ہے لیکن وہ تو تین چار روز تک باقی رہا۔ پہلے تو ان کا علاج گاؤں کے وید نے کیا۔ لیکن جب اس سے ماں کو کوئی افاقہ نہ ہوا تو دادا جی نے سانگلی سے ڈاکٹر بلایا۔

ڈاکٹر روزانہ سانگلی سے دھرم پور آتا تھا اور ماں کو انجکشن اور دوا دے کر واپس ہو جاتا تھا۔

پندرہ روز گذر گئے مگر ماں کا بخار نہ اترا۔ آج سولھویں رات تھی۔ باہر اندھیری رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایسے سکوت کے وقت کہیں سے الو کے بولنے کی آواز آئی اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ماں نے بڑے نحیف لہجہ میں کہا — "بیٹی تو الو کی آواز سے ڈرتی ہے"

"نہیں تو ماں" میں نے جواب دیا۔

ماں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ——

"منی بٹیا! اب میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں نے حتی الوسع اپنے خاندان کی خدمت کی۔ اور میں ایشور کی کرپا سے آج تک سکھی رہی۔ اب مجھے فکر ہے تو صرف تیری۔ اگر میری زندگی میں ہی تیرے ہاتھ رنگ جاتے تو....." اور پھر انہیں ہچکیاں آنے لگیں۔ اور انہیں ہچکیوں کے درمیان انہوں نے نقاہت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"انہیں تو بتا....."

میں نے گھبرا کر والد صاحب کو جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور ماں کے بستر کے پاس آئے تو ماں.....

ماں ہمیں چھوڑ کر ملک عدم کو جا چکی تھیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کی جدائی کا غم سہنا پڑا۔ ماں اس دنیا سے کیا گئیں میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا اور میں دن رات حزن و ملال میں کاٹتی رہی۔

اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا جس سے کہ دھرم پور کے لوگ میری ماں کی موت کو بھول گئے۔ وہ تھا بھی اسی قدر اہم۔ وہ تھا——

پنت کا قتل۔

۹

پنت کے قتل کی خبر پاتے ہی گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہنومان جی کے مندر پہ لوگوں کا جم غفیر اُمڈ پڑا۔ واردات کے مقام پہ ہر آدمی پہنچنا چاہتا تھا۔ مندر کے اندرونی حصہ میں پنت کی لاش پڑی تھی جس کے ہاتھ پیر کٹے ہوئے تھے اور دھڑ سر سے غائب تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ اور اس کا کٹا ہوا سر مندر کے دروازہ پہ لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ منظر بہت ہی بھیانک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

خون کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ ان سوالوں کے جوابات لوگ اپنی اپنی عقل کے مطابق خود دے رہے تھے۔ بعض لوگوں کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ کئی خون اور چوریاں ہضم کرنے والے شخص کا یہ انجام کیسے ہوا۔ پنت نے جن لوگوں کی مدد کی تھی، خواہ وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہو، وہ اس کے اس دردناک قتل پر افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ اور جن لوگوں کو اس نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی یا پہنچایا تھا وہ اسکی موت پر شادماں تھے اور کہہ رہے تھے——"ایسے شخصوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔"

سارا گاؤں وہاں ٹوٹ پڑا تھا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ پنت کے گروہ کا ایک بھی رکن وہاں موجود نہ تھا۔ گویا اپنی عدم موجودگی سے لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ان کا پنت کے قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور نہ ہی وہ اس حادثہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس خوفناک حادثہ کے رونما ہونے کے پہلے ہی چندرا کسی دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔

داداجی نے اس قتل کی رپورٹ فوراً پولیس کو دیدی۔ اور خبر پاتے ہی تھانیدار اور پولیس کے چند سپاہی موٹر سے دھرم پور آ گئے۔ انہوں نے اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ پنت کی بیوی کا بیان ہوا۔ وہ بیچاری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے منہ سے ٹھیک طرح الفاظ بھی ادا نہ ہو پاتے تھے۔ تین روز تک تفتیش ہوتی رہی۔ اور آخرکار پولیس نے محض شبہ پر پنت کے تمام ساتھیوں کو حراست میں لے لیا۔ تیس مجرموں پہ خون اور چوری کے الزامات لگا کر پولیس نے انہیں مجسٹریٹ کے سامنے عدالت میں پیش کیا اور پھر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔

پولیس نے گنپت سنار کو سرکاری گواہ بنا لیا اور اس نے عدالت کے سامنے جو بیان دیا اس میں پنت اور اس کے گروہ کی ساری پول کھل گئی۔ بیان مندرجہ ذیل تھا——

"ہمارا گروہ گذشتہ تیس سال سے دھرم پور میں کام کر رہا ہے۔ مجرم ۱ سے لے کر مجرم ۳۰ تک سب لوگ ہمارے گروہ کے اراکین تھے۔ پنت اس گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس نے سینکڑوں چوریاں اور متعدد خون ہضم کر لئے تھے۔ کئی مرتبہ موٹی موٹی رشوتیں لی تھیں۔ بلیا، ملیا اور کلیا نے کئی جگہ ڈاکے ڈالے ہیں اور لوٹ مار کی ہے۔ لوٹ مار میں جو زیورات حاصل ہوتے تھے وہ گلانے کے لئے مجھے دیئے جاتے تھے۔ اور اس کام کیلئے مجھے مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی لوٹ کا حصہ بھی ملتا تھا۔ گلا ہوا سونا، چاندی بھیکو بنیا بیچا کرتا تھا۔ چونکہ لوٹ میں سب کو مناسب حصہ مل جایا کرتا تھا اس لئے کسی کو کوئی شکایت پنت سے نہ تھی اور ہم سب لوگ ایک کنبہ کی طرح رہتے تھے۔

چندرا مالن ایک عرصے سے پنت کی داشتہ ہے۔ ادھر چند دنوں سے پنت اور چندرا میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ بلیا، ملیا اور کلیا کو پنت نے

دھرم پور کے اسکول کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ اس کام میں ناکام رہے۔ چنانچہ پنت ان پر بہت بگڑا اور اس نے ان کو بہت مغلظات گالیاں دیں۔ ایک چوری کے معاملے میں بھی یلیا، ملیا اور کلیا کو پنت نے بہت پریشان کیا اور ان کا سارا حصہ وہ خود ہی ہڑپ کر گیا۔ لہٰذا یہ تینوں اس پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے اس سے انتقام لینے کی ٹھانی — وہ موقع کے منتظر تھے۔ چندرا مالن کو اب بوڑھے پنت سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا تعلق یلیا، ملیا اور کلیا سے قائم کر رہی تھی اور وہ اس طرح کہ ان تینوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا تعلق دوسرے سے ہے۔ پنت کے قتل کی سازش کا منصوبہ تیار کرنے والی بھی یہی مالن تھی کیونکہ وہ ان تینوں کے ساتھ نڈر ہو کر اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ دادا جی مینداری کی بیٹی کی شادی کا رشتہ بھی اسی نے توڑا تھا۔ یہ بات اس نے ہمارے گروہ میں کئی مرتبہ کہی تھی اور نہایت فخریہ انداز میں۔

پنت کے قتل کی سازش بنا کر چندرا دوسرے گاؤں کو چلی گئی تھی۔

جس روز قتل ہوا اس روز ہم سب حسب معمول ہنومان جی کے مندر میں جمع ہوئے تھے۔ جب پنت بلاتا تھا تو ہم اسی طرح مندر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ہر ماہ کم از کم ایک مرتبہ یہ پروگرام ضرور ہوتا تھا۔

اس روز پنت نشے میں مست تھا اور اس نے ہم سب کو اور خصوصاً یلیا، ملیا اور کلیا کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا، ایسی گندی گندی گالیاں سنائیں کہ وہ آگ بگولا ہو گئے اور ان کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ انہوں نے ہم سب کے سامنے ہی پنت کو پکڑ لیا اور بڑی بے دردی سے اس کا قتل کر دیا۔ ہم سب خوفزدہ ہو کر اپنی اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

اور بھی کئی لوگوں کی شہادتیں ہوئیں۔ بہت سے ثبوت پیش کئے گئے۔ اور آخر میں فیصلہ سنا دیا گیا۔ یلیا، ملیا اور کلیا اور چندرا کو پھانسی کی سزائیں ہوئیں۔ دوسروں کو بھی لمبی لمبی سزائیں ہوئیں۔ اور اس طرح گاؤں میں غلاظت پھیلانے والا یہ گروہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور گاؤں پاک ہو گیا۔

پنت کے قتل کے بعد وہ ساری باتیں جن کے بارے میں لوگ تاریکی میں تھے یا غلط فہمی میں مبتلا تھے واضح طور پر سامنے آ گئیں — دیال جا چکا تھا اس لئے دادا جی بھی اب خوش تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک دن ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ ہی گئی۔

"پتا جی، ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"پوچھو۔"

"آپ اجازت دیں گے؟"

"اگر اجازت دینے کے قابل بات ہوگی تو ضرور دوں گا۔"

"ویسے اجازت کے قابل تو نہیں ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے؟ آخر سنوں تو۔" ان کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"بات یہ ....." میں کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو نہ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں انگلینڈ جانا چاہتی ہوں۔"

"کس لئے؟"

"اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔"

"تو جتنا پڑھ چکی ہے، وہی بہت کافی ہے۔ جیبی ملک تک تیرے برابر پڑھی لکھی لڑکیاں کہاں ہیں؟ اب اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تجھے کیا کرنا ہے؟ کہیں ملازمت نوکری نہیں ہے تجھے۔ تیری ماں کہتی تھی کہ جتنا تو پڑھ چکی ہے وہ بہت ہے اور مجھے بھی اب محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں پہلے ہی تیری شادی کر دیتا تو بہتر ہوتا۔ ایک تو اب تیری عمر کافی ہو چکی ہے دوسرے ایک بار تیری برات گھر آ کر واپس جا چکی ہے۔ اس لئے اب تیری شادی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ تاہم میں کوشاں ہوں۔ شادی کے بعد دولہا دلہن دونوں اگر انگلینڈ چلے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، میں بڑی خوشی سے اجازت دے دوں گا۔ ہمارے سماج کی حالت تجھ پر عیاں ہے۔ جہاں لڑکے نہیں پڑھ سکتے وہاں لڑکیاں کیا پڑھیں گی۔ کوئی ایک آدھ اگر اتفاق سے پڑھ گئی تو لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر حال ہی میں تیری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ تو بھی اگر ولایت چلی جائے گی تو میرا کیا ہوگا؟ میں تنہا کیسے جیوں گا۔ پھر غیر ملک میں تجھے وہ کھانا کھانا پڑے گا جو ہمارے مذہب کی رو سے ممنوع ہے۔ کیا تو وہاں جا کر اپنے مذہب اور ذات کو ترک کر دینا چاہتی ہے؟ دیال بھی انگلینڈ میں ہی ہے۔ تو خواہ کتنے ہی پاک ارادے سے وہاں جائے لیکن لوگ کیا سمجھیں گے؟ اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ اس غلط خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔"

"پتا جی فضول شک میں پڑنے سے کیا فائدہ؟ مجھے آپ اجازت

سے دیکھئے میں ایک سال میں ہی واپس آجاؤں گی۔"

"تو یہاں جو چاہے کر سکتی ہے۔ اگر چاہے تو ایک اسکول اور قائم کر لے۔ میں روپیہ دوں گا، اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا، مگر ولایت جانے کا خیال ترک کر دے۔"

"میں، تو جاؤں گی۔ آپ دو چار دن اور غور کر لیجئے۔" یہ کہتی ہوئی میں کمرے سے چل دی۔

پتا جی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی زینے طے کر کے اپنے کمرے میں آئی اور پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے دن جب صبح کی چائے آئی تو دیکھا کہ روزانہ سویرے اٹھ جانے والے پتا جی ابھی تک بستر پر لیٹے ہیں۔ میں ان کے پاس گئی اور پوچھا۔

"پتا جی، آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟"

"ہاں، کل رات نیند ہی نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تو ولایت جا رہی ہے۔"

"تو کیا رات بھر آپ میرے متعلق ہی سوچتے رہے تھے؟"

"اور کیا؟"

"تو آخر کیا طے کیا آپ نے؟"

"یہی کہ ولایت جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"یہ فیصلہ کرنے کیلئے آپ رات بھر جاگتے رہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا تو اب اٹھئے۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔"

"میرا جسم کچھ بھاری ہے، شاید بخار بھی ہو۔" والد صاحب نے بمشکل کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

میں نے ان کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ انہیں بخار بہت تیز تھا۔ میں نے انہیں بستر پر ہی اٹھا کر بٹھایا اور منہ دھونے کے لئے بائیجا سے گرم پانی لانے کے لئے کہا۔ پتا جی نے منہ دھو کر چائے پی۔

دولو وید کو بلانے کیلئے گیا۔

ڈاکٹر آ کر انجکشن دے گئے۔ ڈاکٹر کی آمد کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ سارا گاؤں عیادت کو آیا۔ میں اسکول میں ہی تھی کہ ملازم نے آ کر خبر دی کہ والد صاحب پر بخار کی شدت کی وجہ سے ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میں فوراً گھر آئی تو دیکھا کہ وہ بار بار [illegible] کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے ـــ میں چلائی مجھے تم سے [illegible] مجھ کو کوئی سروکار نہیں۔

پڑوس کے دو آدمی جن کو دولو [illegible] پتا جی کو پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر کو لانے کے لئے ایک آدمی اسپیشل کار سے سانگلی بھیجا اور خود ان کے پاس بیٹھ گئی۔ پتا جی کی وہی حالت جاری تھی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں اور بائیجا انہیں پکڑ کر لٹا دیتی تھیں۔

میں اور بائیجا ساری رات ان کے پاس بیٹھے رہے۔ باہر دولو اور دوسرے ملازم بیٹھے تھے۔ پتا جی کا بڑھتا ہوا بخار اور ان کی [illegible] میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر رہی تھی۔ بائیجا کے کندھے پر سر رکھ کر میں دو تین بار روئی بھی۔ وہ بیچاری مجھے بار بار دم دلاسا دیتی رہتی۔ رات جیسے تیسے گزری۔ دوسرے دن ڈاکٹر پھر آئے اور انجکشن لگا کر چلے گئے۔

شام کو بخار کی شدت قدرے کم ہوئی اور اس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر رات کے بارہ بجے کے بعد بخار پھر تیز ہو گیا۔ اور وہ پہلے کی طرح پھر بڑبڑانے لگے۔ میں یہ خیال کر کے کہ کیا ماں کی طرح پتا جی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر تھوڑی راکھ لے آئی۔ پھر برآمدے میں گئی، جہاں ماں کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی، اس کے سامنے میں دوزانو ہوئی، اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ـــــ

"ماں تم تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں لیکن پتا جی کو تو کچھ دن میرے پاس رہنے دو۔ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گی۔ جب سے میں نے ان سے ولایت جانے کی بات کہی ہے تبھی سے ان کا یہ حال ہے۔ انہیں جلدی اچھا کر دو۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے وہ راکھ لا کر پتا جی کو لگا دی اور دوسرے روز سے وہ اچھے ہونے لگے۔

وقت بڑی سرعت سے گزرتا جا رہا تھا۔ ایک روز میں اٹاری پر اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک ماہنامہ کے ورق الٹ رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک نظم پر پڑی اور میں اسے پڑھنے لگی۔ نظم پڑھ کر میں بہت متاثر ہوئی۔ یکایک میرے ذہن میں یہ منحوس خیال پیدا ہوا کہ اگر والد

صاحب نے مجھے انگلینڈ جانے کی اجازت نہ دی تو؟

میں نے وہ مطالعہ پھینک دیا اور ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ کو دیکھنے لگی۔ ابھی سرخیاں ہی پڑھ رہی تھی کہ میری نظر ایک خبر پر پڑی اور میں اسے شروع سے آخر تک پڑھ گئی۔ پڑھتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ پرچہ میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑا ہے۔ اس خبر کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا اور آخر میں اپنا سر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خبر تھی ——

ہیون جہاز کا حادثہ

"کل قریب دو بجے رات کو انگلینڈ جانے والا پی۔ اینڈ او۔ کمپنی کا ہیون نامی جہاز بسکے کی خلیج میں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا اور غرقاب ہو گیا۔ بروقت امداد نہ پہنچنے کی وجہ سے جہاز کے سارے مسافر پانی میں ڈوب کر مر گئے۔"

اس خبر کے آخر میں مسافروں کی فہرست تھی۔ جس کے آخر میں لکھا تھا۔

اندر جیت دیال۔

۱۰

دیال کے انتقال پُر ملال کی خبر پڑھ کر مجھے جو صدمہ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ میں گھنٹوں تنہائی میں بیٹھی ہوئی روتی رہتی تھی۔ میرے اس غم میں نہ کوئی شریک ہو سکتا تھا اور نہ ہی میں اس کا اظہار کسی دوسرے سے کر کے دل کو ہلکا کر سکتی تھی۔ وہ میرا پوشیدہ غم تھا۔ اندر ہی اندر اسے برداشت کرنا تھا۔

اس دردناک خبر نے مہرشی جیا شنکر کے دل کو بہت بھاری ٹھیس پہنچائی تھی۔ میں نے انہیں خط لکھ کر تسلی دی۔ انہوں نے بھی مجھے ایک خط لکھا اور ہدایت کی کہ جس اسکول کی بنیاد دیال نے رکھی تھی اسے جاری رکھنا اور ترقی دینا ہی دیال کی روح کو ثواب پہنچانا ہے۔

میں اسکول باقاعدگی سے جاتی تھی۔ سارے کام صحیح ہو رہے تھے لیکن میرا دل اداس تھا۔ بظاہر میں ہنسنے کی کوشش کرتی لیکن اندر ایک طرح کی آگ سی لگی ہوئی تھی۔ دیال کی موت پہ اسکول میں ایک تعزیتی جلسہ بھی ہوا اور اس میں جو تجویز پاس کی گئی وہ مہرشی کو بھیج دی گئی اور ایک دن کے لئے اسکول بھی بند رکھا گیا۔

میں کبھی کبھی رات کو جاگ اٹھتی تھی۔ روشنی تیز کر کے گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ کئی راتیں تو میں نے اسی طرح آنکھوں میں کاٹ دیں۔ دیال کا چہرہ میں اپنے تصور کے سامنے رکھ کر جب بہت دیر تک آنسو بہا لیتی تب کہیں میرا دل ہلکا ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد مہاجرین کی جو حالت ہوئی تھی ٹھیک ویسی ہی اس وقت میری تھی۔ میرے سارے ارمان معدوم ہو گئے تھے۔ اب تو میری زندگی کا کوئی مقصد باقی نہ رہا تھا۔ دیال نے اپنے آخری خط میں مجھے اپنا دل کھول کر دکھا دیا تھا۔ لیکن وہ خط بھی میں نے پھاڑ دیا تھا۔ مجھے اپنا دل کھول کر دکھانے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اس موقع کے انتظار میں رہی تھی مگر میری مراد بر آنے سے پہلے ہی سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ساحل کے پہنچتے ہی قسمت نے ہمیں آن ڈبو دیا۔

سماج اور سماج کے رسم و رواج ہی کے باعث میری زندگی تباہ ہوئی تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ تو میرے جی میں آیا کہ اب اس دنیا کا منہ پھونک دوں۔ لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کر کے مجھے کیا ملے گا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ خود غرضی چھوڑ کر میں اجتماعی مفاد کو اہمیت دوں اور اسی کے لئے زندگی وقف کر دوں۔

اب میں سوچنے لگی کہ اگر ہمیں موزوں نظام قائم کرنا ہے، سماج کو بدلنا ہے تو یہ تبھی ممکن ہے جبکہ ہم بچپن سے ہی بچوں کے دل و دماغ میں صحیح قسم کی باتیں پیدا کریں۔ اونچ نیچ، چھوت اچھوت وغیرہ کا فرق دور کرنے کے لئے بچوں کو بچپن ہی میں مناسب تعلیم دینی شروع کر دینی چاہیے۔ بچہ اس نازک بیل کی مانند ہوتا ہے جسے ابتدا میں حسب منشا گھمایا جا سکتا ہے۔ بڑا ہو جانے پر اس میں پختگی آ جاتی ہے اور تب اسے ڈھالنے میں دقت ہوتی ہے۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جس سماج کے رسوم و قیود کی بدولت میری زندگی کا چمن تباہ و برباد ہوا، میرے ارمان معدوم ہوئے، اس سماج کے نظام کو بدلنے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرنے سے زیادہ بہتر اور ضروری کچھ چیز معلوم ہوتی ہے اور میں وہی کروں گی۔

میرے دل و دماغ کے سامنے دھرم پور کا اسکول تھا۔ جس دیال سے میں خفیہ محبت کرتی تھی اور جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے یہ اسکول ان کی یادگار ہے۔ ہم دونوں سماج سے پچاس برس آگے ——— بڑھ کر

موجودہ حالات کو بدلنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے متعدد قیود ہمارے راستہ میں روڑہ بن کر سامنے آئے۔ کم از کم آنے والی پُشت کو اس زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے میں بھی جان سے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کروں گی۔ دیہاں یہ کام میرے سپرد کر کے گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بچپن میں مناسب تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے کس طرح بدمعاشوں کے گروہ تیار ہو جاتے ہیں۔ دھرم پور کے بدمعاشوں نے میرے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ لیکن میں نے وسیع النظر بن کر انہیں کے بچوں کو اسکول میں اچھی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ جلا ہے کا غصہ داڑھی پر اتارنے سے کیا فائدہ؟ ان چھوٹے چھوٹے، معصوم بچوں نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ میں انہیں صحیح تعلیم دے کر اچھے شہری بناؤں گی۔ آگے چل کر جب ان کے باپ سزائیں کاٹ کر واپس آئیں گے تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے میرے لئے کیا کیا تھا اور میں نے ان کا بدلہ کس طرح اتارا ہے۔ شاید میرے احسان کے بوجھ سے وہ شرمندہ ہوں۔

میں نے دھرم پور کے مدرسہ کے لئے اپنا تمام وقت دے دیا تھا۔ روز صبح اٹھتے ہی میرا پروگرام گھڑی کی طرح شروع ہو جاتا۔ اب تو روزانہ دو تین لڑکوں کے گھر جا کر میں ان کی جانچ کرنے لگی۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ وہ کب سو کر اٹھتے ہیں، کب اور کس طرح پڑھتے ہیں، نہاتے ہیں، ان کے گھر میں کس قسم کی مشکلات درپیش ہیں، رات کو وہ وقت پہ سوتے ہیں یا نہیں۔ ان کے والدین یا سرپرستوں کی کون سی بُری عادتیں ہیں جو ان کو لگ سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ سینکڑوں باتوں کی میں تحقیق کرتی اور بڑی خوش مزاجی اور محبت کے ساتھ انہیں صحیح راستہ دکھاتی تھی۔ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ میری اس قدر بے غرض اور قابلِ قدر محبت دیکھ کر وہ لوگ میری عزت کرنے لگے۔

اسکول کے ہر ایک طالب علم کو میں نے اندر باہر سے بخوبی پہچان لیا تھا۔ عقلمند لڑکوں کو میں زیادہ کام دیتی تھی۔ متوسط قسم کے لڑکوں کی میں حوصلہ افزائی کرتی رہتی اور غبی الذہن لڑکوں پہ کبھی ناراض نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس انہیں پیار محبت سے سب کچھ سمجھایا کرتی تھی۔ ہر لڑکے کا رجحان کس طرف ہے، یہ میں نے ایک رجسٹر میں نوٹ کر لیا تھا اور اسی کے بموجب میں انہیں مختلف قسم کے کام دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے بڑی تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگے۔

گاؤں والے بھی اب اسکول کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے اور ہر کام میں ہمیں ان کا تعاون ملنے لگا۔

صوبائی سرکار کے محکمۂ تعلیم نے اسکول کا معائنہ کر کے اسکو منظوری اور مالی امداد دیدی تھی۔ معائنہ کرنے والوں نے اسکول کو مثالی ادارہ کہا تھا اور اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس موقع پر اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر اندرجیت دیال کی تصویر کی نقاب کشائی بھی ہوئی یہ تصویر گاؤں کے ہی ایک معزز شخص نے اسکول کو نذر کی تھی۔

اسی دوران دھرم پور میں ہیضہ کی بیماری پھیل گئی۔ اسوقت میں نے، میری اسسٹنٹ اور اسکول کے طلبا نے گاؤں والوں کی جو خدمت کی وہ بے مثال تھی۔ دو چار کیس ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں نے اپنی کوششوں سے اس بیماری کو ہمیشہ کے لئے گاؤں سے ختم کر دیا۔ گاؤں والوں نے ہماری بڑی عزت افزائی کی اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔

بونے کے وقت کئی کاشتکار مسلسل بارش ہونے کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ بہت سے رقبہ میں بونے کو باقی تھا۔ وقت کم تھا اور ان کے پاس مزدوروں کی کمی تھی۔ اسوقت بھی اسکول کے طلبا نے ان کی مدد کی تھی۔

گاؤں کے اسی قسم کے متعدد کاموں میں مدد کر کے ہم نے مقبولیت حاصل کی۔

سالانہ امتحان ہوا۔ اکثر طالب علم کامیاب ہو کر آگے کی جماعت میں پہنچ گئے۔ محکمۂ تعلیم نے نویں جماعت کھولنے کی اجازت دے دی۔ آٹھویں جماعت میں داخل ہونے کے لئے طالب علموں کی بھیڑ لگ گئی چنانچہ آٹھویں میں دو سیکشن اور نویں میں دو سیکشن کھولنے پڑے۔ اس طرح دو جماعتوں میں پانچ سیکشن ہو گئے اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اب اسکول میں جلد دسویں جماعت کھل جائے گی۔ پانچ سیکشن ہوتے ہی مہرشی نے چار اُستاد اور مقرر کر کے بھیج دیئے۔

والد صاحب پھر میرے لئے بر تلاش کرنے لگے تھے۔ ایک روز کھانے کے بعد انہوں نے مجھے یہ بتایا تو میں نے ان سے کہہ دیا ــــ

"پتا جی، اب آپ میری شادی کی فکر نہ کریں۔ اب میں شادی کرنا نہیں چاہتی ہوں"

"کیا مطلب؟ کیا تو عمر بھر کنواری ہی رہے گی؟"

"جی ہاں"

"پھر اتنی بڑی جائداد کا کیا ہوگا؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پتاجی اگر میری شادی ہو جاتی اور میں صاحبِ اولاد ہوتی تو آپ کی اس جائداد سے ان کو فیض پہنچتا۔ لیکن یہ فیض محدود ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ اس جائداد کے مالک ہیں، مگر در اصل یہ تمام جائداد دھرم پورے گاؤں والوں کی ہے۔ غریب کسانوں کی سخت محنت و مشقت کی ہی بدولت ہمیں ہر سال لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ ان غریبوں کی حالت ہم پر ظاہر ہی ہے۔ وہ بھوکے ہیں، ننگے ہیں اور بے گھر و بے در ہیں۔ ان کی اولاد کی تعلیم کا کوئی موزوں بندوبست نہیں ہے۔ دھرم پورے اسکول کو آپ ہی کا نام دیا گیا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ آپ اپنی ساری دولت "عوامی تعلیمی ادارہ" کے لئے وقف کر دیں تاکہ آپ کا نام ہو، شہرت ہو اور آپ کی اس سخاوت سے تمام گاؤں والوں کا بھلا ہو۔ آج کل کا زمانہ یہ نہیں کہ پڑوسی بھوکوں مرے اور ایک شخص پیٹ بھر کر کھائے۔ اگر آج آپ خود ایسا نہیں کریں گے تو کل جب لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے اس نظریہ کو نیست و نابود کر دیں گے۔

گاؤں والوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی غرض سے ہی آپ نے اسکول قائم کیا ہے۔ اس کا نام بھی آپ پر ہی رکھا گیا ہے۔ آپ کی بیٹی ہی اس کو چلاتی ہے۔ اور ادھر آپ کی دولت و جائداد کا کوئی صحیح وارث بھی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں عوام کو ہی اس کا وارث سمجھ کر ان کے مفاد کے لئے اپنی ساری جائداد وقف کر دینے میں کیا حرج ہے؟ آج تک آپ نے نہ جانے کتنے اداروں کو پیسہ دیا ہے۔ آپ ہی کے پیسے کے بل پر متعدد ادارے اب تک زندہ ہیں۔ اس لئے آپ کے لئے ایسا کرنا ہی بہتر ہے۔"

پتاجی بڑے سخی تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انہیں میری رائے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ پھر بھی مجھے تسلی دینے کے لئے انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے جو کچھ مناسب معلوم ہوگا کروں گا۔"

میں نے تو اپنی شادی سے انکار کر کے والد صاحب کو ایثار کا راستہ بتایا تھا۔ مگر وہ انہیں اچھا نہیں لگا۔ وہ حسب معمول اپنا کام کاج تو کرتے تھے لیکن ان کا چہرہ افسردہ رہتا تھا۔ اب ان کا رجحان مذہبی چیزوں کی طرف پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اکثر کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔

ماں کے انتقال کے بعد سے ان کی صحت بھی گرنے لگی تھی ـــــ کبھی کھانسی، کبھی ٹھنڈ، کبھی جسم میں درد تو کبھی ہلکا سا بخار۔ اب انہیں کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہی تھی۔ اور ایک روز.....

میں اسکول میں تھی۔ والد صاحب میرے اسکول جانے سے پہلے ہی پنچایت گھر چلے گئے تھے۔ میں آفس میں بیٹھی ہوئی اسکول سے متعلق خط و کتابت کر رہی تھی۔ اسی وقت دونو دوڑتا ہوا آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو کر سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں اپنے کام میں محو تھی۔ دونو کب آیا اور وہ کیوں رو رہا تھا؟ یہ میری ذرا سمجھ میں نہ آیا۔ میں ایک دم گھبرا اٹھی اور اسکے چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ کہنے لگا ـــــ

"مس جی، داداجی چل بسے....."

مجھے ایکدم دھکا سا لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہونٹ لرزنے لگے سینہ دھڑکنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر میں رونے لگی۔

دوسرے استاد بھی وہاں آن پہنچے۔ اسکول کے طلباء نے مجھے گھیر لیا۔ دوسرے استادوں نے بچوں کو چھٹی دیدی۔ ہم سب لوگ پنچایت گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی اور آنسو بہاتی ہوئی میں پتاجی کی لاش کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پنچایت گھر کے سامنے اسکول کے تمام طالب علم جمع ہو گئے۔ والد صاحب کی حرکتِ قلب رک جانے سے ان کا انتقال ہوا تھا۔

سب طرف بذریعہ تار یہ خبر پہنچا دی گئی۔ ہم پتاجی کی لاش کو اپنے گھر لے آئے۔ گھر کے صحن میں لوگوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ دو تین گھنٹے میں ہی کئی موٹریں مکان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں جن میں ہمارے رشتہ دار، ہمدرد اور والد صاحب کے دوست احباب تھے۔ مہرشی جٹا شنکر بھی فوراً کاشی سے آگئے۔

دریائے کرشنا کے ساحل پر ٹھیک اسی جگہ جہاں میری ماں کو جلایا گیا تھا وہیں پتاجی کو بھی جلایا گیا۔ سب لوگ مجھے تسلی و تشفی دینے کی کوشش کر رہے تھے، پھر بھی اس صدمہ سے میں بیمار ہو گئی۔ میرے دوسرے

عزیزوں نے پتاجی کی آخری رسوم ادا کیں۔ میرا بھی علاج شروع ہوا۔ دس پندرہ روز بعد مجھے افاقہ ہونے لگا لیکن پھر بھی دل اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ والد صاحب کا خیال آتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی پرسانِ حال نہ رہا تھا۔ میں یتیم ہو گئی تھی اور اسی کا غم مجھے بار بار ستاتا تھا۔

ایک روز میں نے ان کی تجوری کھولی تو سامنے ہی ایک لمبا سا بند لفافہ دکھائی دیا۔ اس پر بڑے حرفوں میں لکھا تھا ــــ

میرا وصیت نامہ۔

میں نے وہ لفافہ کھولا اور اندر سے کاغذ نکال کر اسے تمام کی جلدی پڑھ ڈالا۔ اس کی کچھ اہم باتیں یہ تھیں ــــ

میری موت کے بعد میری جائداد کو مندرجہ ذیل طریقے سے وقف کر دیا جائے . . . . .

۱۔ دھرم پور کے اسکول کے سائنسی ساز و سامان کے لئے پانچ ہزار روپے نقد۔

۲۔ دھرم پور میں ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کیا جائے جس میں غریبوں کا علاج مفت ہو۔ دتّہ مندر کے پاس واقع مکان میں اس ہسپتال کے لئے وقف کرتا ہوں۔ ہسپتال کے اخراجات کے لئے میری جائداد میں سے پچاس ہزار روپے لئے جائیں۔

۳۔ میری اکلوتی بیٹی کنول کے لئے گاؤں کے نزدیک والے دو کھیت اور ایک باغیچہ اسے دیدئے جائیں۔ میرے رہنے کا مکان بھی اسے ہی دیا جائے۔

۴۔ میری بیوی کی بیوہ بہن کے خرچ کے لئے دو ہزار روپے دیئے جائیں

۵۔ سانگلی کے ونتا آشرم کو میری بیوی کے نام پر پانچ ہزار روپے دیئے جائیں۔ ان روپوں کا خرچ کسی طرح بھی ہو مگر اس کے ساتھ میری بیوی کا نام ضرور وابستہ ہونا چاہیئے۔

۶۔ دھرم پور کے قدیم جین مندر کو دو ہزار روپے دیئے جائیں۔

۷۔ گھر کی تمام چیزوں اور زیورات پر میری بیٹی کا حق ہے "

۸۔ بابا اور رولو نے ہمارے خاندان کی خدمت کی ہے چنانچہ ــــ ہماری زمین میں سے انہیں کاشت کے لئے چار ایکڑ زمین مفت میں دیدی جائے۔

۹۔ دیگر چھوٹے بڑے اداروں کے لئے میری جائداد میں سے دس ہزار روپے علیحدہ رکھ دیئے جائیں۔ کس ادارہ کو کتنی رقم دی جائے اس کا فیصلہ میری بیٹی کنول کرے گی۔

۱۰۔ مہرشی جتا شنکر نے جذبۂ ایثار کے ساتھ عوام کی خدمت کی ہے، لہٰذا میری بقیہ تمام جائداد ان کے تعلیمی ادارہ کو دیدی جائے اور اسی جائداد کی آمدنی سے دھرم پور کا اسکول چلایا جائے۔ اس اسکول میں کم از کم ایک ہزار طلباء ہوں۔ وہاں کے ہونہار طالب علموں کو اسی فنڈ میں سے ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دیئے جائیں۔ ولایت جانے والے طلباء کو بھی اسی فنڈ میں سے مدد دی جائے۔ وظیفے دیتے وقت طالب علموں کی قابلیت مدنظر ہو۔ ذات پات، مذہب یا خاندان کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

× × ×

والد صاحب کی اس قربانی کو دیکھ کر مجھے ان کی یاد آ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

میں نے وصیت نامہ کے مطابق کارروائی شروع کر دی۔ جن اشخاص اور اداروں کو جو دینا تھا دے دیا اور بقیہ ساری جائداد مہرشی جتا شنکر کو دھرم پور بلا کر ان کے حوالے کر دی۔ اخبارات میں اس کی تفصیل شائع ہوئی اور ان کی خوب تعریف کی گئی۔ مہرشی نے دھرم پور میں ایک جلسہ منعقد کروایا اور اس میں جو تقریر کی اس میں والد صاحب کی سخاوت اور عظمت پر بہت کچھ کہا۔ اسی ضمن میں میری تعریف کر کے انہوں نے میری بھی حوصلہ افزائی کی۔

مہرشی نے مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے اپنی بیٹی کی طرح گلے سے لگایا اور اپنا سارا پیار مجھ پر انڈیل دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ بہتری ہوتی ہے۔ تیری ماں چلی گئی۔ پتاجی بھی چل بسے۔ اب تو یتیم ہو گئی ہے۔ لیکن تو اس قدر سمجھدار ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ تو اس غم کو بھول کر اپنا کام مستعدی سے کرتی رہ۔ تیرا مستقبل شاندار ہے"

مجھے پتاجی یاد آ رہے تھے اور میری آنکھیں پرنم تھیں۔ مہرشی نے مجھے دلاسا دیا اور چلے گئے۔

ہمیشہ کی طرح اسکول کا کام شروع ہو گیا۔ جیسا کہ مہرشی نے اپنی تقریر میں کہا تھا گاؤں کے لوگ مجھے دیوی سمجھنے لگے۔ مردوں کی نسبت عورتیں جذباتی ہوتی ہیں چنانچہ ایک روز میں اسکول سے واپس آ رہی تھی کہ راستہ میں ایک عورت دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی ــــ

"سنئیے، ذرا ٹھہریئے"

"کیوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"[illegible]"

"[illegible]"

پھر اس نے مجھے روک لیا اور میرے پیروں کے دونوں انگوٹھوں [illegible] نکال کر اسے ایک کٹوری میں رکھ لیا۔

"اس کا کیا کرو گی؟" میں نے استفسار کیا۔

"میری بہو بڑی تکلیف میں ہے۔ بچہ نہیں ہوتا ہے" اس نے جواب دیا۔

اتفاق دیکھیے کہ اس کی بہو کے بچہ بآسانی ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے اسی عورت نے مجھے دو پیڑے لا کر دیئے، جس سے مجھے اس کا اندازہ ہوا۔

ایک سال میں میرے اوپر کیا گذری اور میری زندگی کہاں سے کہاں پہنچی اس کی ایک دھندلی سی تصویر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ عظیم شخصوں کے تجربات بھی بڑے مفید ہوتے ہیں۔

میں عظیم نہیں ہوں۔ میں تو ایک ادنیٰ سی عورت ہوں۔ میں سمجھتی ہوں میرے ان تجربات سے مجھ جیسے چھوٹے کئی لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ غلط بھی ہو مگر کم از کم یہ تو ضرور ماننا پڑے گا کہ آج میری طرح کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو گاؤں میں بس کر تعلیم کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ پہلے پہلے گاؤں کے لوگ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مذاق بھی اڑانے لگتے ہیں لیکن جب کوئی بات انہیں جنچ جاتی ہے تو وہ ہماری تقلید بھی کرنے لگتے ہیں۔

ہمارا ملک آزاد ہو گیا ہے لیکن جب تک ہندوستان کا بچہ بچہ تعلیم یافتہ اور نیک سیرت نہیں ہو جاتا تب تک ملک کی صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ہم میں سے مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگ یہاں کا نظام باقاعدگی سے چلائیں گے اور اس سوراج کو قائم رکھ سکیں گے تو یہ آپکا محض خیال خام ہے۔

متفرق قسم کے مذہبوں اور ملتوں کے باعث ہمارے ملک کا جو نقصان ہو سکتا تھا، ہو چکا ہے۔ آج ہمیں جو تنازعہ دکھائی دے رہا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہونے والا نظام لڑکھڑا کر گر جائے گا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی شاہد ہماری تاریخ ہے۔

سماجی، مذہبی اور دوسرے رسوم و قیود توڑ کر جب مجھ جیسی لڑکی دیال جیسے نوجوان سے شادی کر سکے گی تبھی ہم کہیں گے کہ سیکولر ریاست قائم ہو گئی ہے۔

وقت کا پلٹتا دھارا دیکھ کر ہر ایک کو پہلے اپنے ملک پر نظر ڈالنی چاہیئے اور پھر اپنی طرف۔ قومی مفاد کے آگے ذاتی مفاد کو بہتر سمجھنے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔

سچا قومی سوراج تبھی وجود میں آئے گا جبکہ جہالت، غریبی اور بیماریوں سے محفوظ ہو کر ہم سب اپنے اور سب کے مفاد کو پہچان سکیں گے۔

آپ کبھی دھرم پور تشریف لائیں تو مجھ سے ضرور ملئے گا۔ میں آپ کا دل سے خیر مقدم کروں گی۔ اپنا اسکول دکھلاؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ میرا اسکول دیکھ کر آپ کو انتہائی مسرت ہوگی۔

میں جو کہنا چاہتی تھی کہہ چکی۔ اسے پڑھ کر کچھ ظریف نقاد کہیں گے کہ یہ ناول نہیں سوانح ہے اور کچھ کہیں گے سوانح نہیں ناول ہے۔ اس لئے میں آخر میں ایک مختصر سی کہانی اور سنا دوں۔

ایک جگہ ایک ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف سونا چڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف چاندی۔ دونوں طرف سے دو بہادر آئے اور آپس میں لڑنے لگے ــــ ایک کہتا تھا کہ ڈھال سونے کی ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ چاندی کی۔ بہت دیر تک یہ لڑائی ہوتی رہی حتیٰ کہ دونوں نے نیام سے تلواریں نکال لیں۔ اور لڑنے لگے۔ اگر کچھ دیر اور لڑتے رہتے تو دونوں کام آجاتے لیکن خوش قسمتی سے ایک تیسرا شخص جو بہت سمجھدار تھا وہاں آن پہنچا۔ اس نے لڑائی کا سبب پوچھا۔ جب اسے سبب معلوم ہوا تو اس نے ڈھال کو دونوں طرف سے گھما کر دکھا دیا۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ یہ ناول ہو یا سوانح۔ اس میں زندگی ہے۔ تجربہ ہے۔ میری زندگی میں متعدد واقعات رونما ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہو گیا ہے اور اسی عالم میں میں نے اپنی زندگی کی یہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں، دل پریشان ہے اور دماغ بالکل مفلوج سا ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں میں نے جو اپنی زندگی کی یہ جھلک پیش کی ہے اس کی وجہ ہے میری زندگی کا ادھورا پن۔ میری طرح دوسروں کی زندگی بھی ادھوری نہ رہ جائے اس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ آپ تو مجھ سے ہمدردی ظاہر کریں گے ہی، بس یہی میری تمنا بھی ہے۔

ایلنگوواڈیگل

تامل زبان کا یہ رزمیہ آج سے سترہ سو سال پہلے (تقریباً سنہ ۲۰۰ء میں) لکھا گیا تھا۔ ادب دنیا کی بہت کم ترقی یافتہ زبانیں ایسی ہوں گی جس میں اس کا ترجمہ نہ ہو چکا ہو۔

رزمیہ کا مصنف ایلنگو واڈیگل جنوبی ہند کی حکومت چیرا کے بادشاہ شیرالادن کا چھوٹا بھائی تھا چونکہ وہ حکومت کا جائز وارث تھا۔ اس لئے چھوٹے بھائی اس سے حسد کرتے تھے۔ ایلنگو واڈیگل کو حکومت اور اس کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی پوری زندگی نے موسیقی اور شاعری میں گذری تھی۔ وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور جنگلوں میں رہنے لگا۔ وہیں کچھ ایسے لوگوں نے اُسے یہ کہانی سُنائی جنھوں نے اس کہانی کی ہیروئن کناگی کو دیکھا تھا۔ کہتے ہیں ایلنگو واڈیگل کناگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے برسوں سفر کرتا رہا۔

یہ ناولٹ ایک عظیم ترین کارنامہ ہے جس پر ان سترہ سو سالوں نے اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا۔ آج بھی اس میں تازگی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ناول اتنی مدت پہلے لکھا گیا تھا۔ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اتنی مدت میں سماجی اور سیاسی شعور کوئی ترقی نہیں کر سکا۔

ایلنگو واڈیگل کو انسانی نفسیات پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس کے کردار ترقی پسند نظریات رکھتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ان کا ایمان ہے لیکن اُن میں تمام انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔

تامل میں اس رزمیہ کا نام "سلاپادھی کارم" یعنی "ایک پائل کی خاطر" ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "کوون اور کناگی" کے نام سے اے۔ ایس۔ پی آئیر صاحب نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔ جہاں دیوی اور دیوتاؤں کا بہت ذکر ہے۔ ان حصوں کو دانستہ طور پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہ نام ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔

اس رزمیہ کا ایک اور انگریزی ترجمہ "سلاپادھی کارم" کے نام سے سری رام چندر دکشتر نے کیا ہے۔

ہم نے اینگو وادیگل کی تصویر حاصل کرنے کی
پوری کوشش کی. مگر بے سود ..... بسنلےء سے
ایک مصنف کی تصویر دستیاب بھی کیسے ہو سکتی ہے
تامل انسائیکلو پیڈیا کا بیان ہے کہ مصنف کی دنیا
میں کوئی تصویر موجود نہیں ہے۔



[illegible]

الینگو دانیل

مترجم خلیق انجم

لاکھ بلائیں ایک نشیمن

اٹھارہ سو سال پہلے چولا کے عظیم اور طاقتور بادشاہ کا دارالخلافہ پوہر تھا جو خود کو سورج اور شیو کی نسل سے بتاتا تھا۔ اسی بادشاہ کے محل پر خوفناک شیر کی تصویر والا جھنڈا ہوتا تھا۔

پوہر کا یہ خوبصورت شہر دریائے کیوری کے دہانے پر آباد تھا اور اس کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں غرض ہر طرف تجارتی تعلقات تھے۔ پوری مملکت چولا کے لئے یہ شہر تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس چولا کوئی چھوٹی سی حکومت نہیں تھی۔ شمال میں تیروپتی کے پہاڑوں سے لیکر جنوب میں دریائے ویلر تک اور مشرق میں بنگال سے لیکر حکومت چیرا کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

کاریکلا نام کے بادشاہ نے اس شہر کی شہرت اور خوبصورتی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے عالیشان محلات اور مندر تعمیر کرائے جن کے ساتھ عجیب و غریب باغات بھی تھے۔ دریائے کیوری کی طغیانی کو روکنے کیلئے اس نے ایک بہت بڑا ڈیم بھی بنوایا۔ آبپاشی کے لئے بہت سی نہریں بھی نکالی تھیں۔ اس کی تعمیر میں اس کی رعیت کے مزدور بھی تھے اور بارہ ہزار وہ قیدی بھی تھے جو سیلون کی لڑائی میں اس کے ہاتھ آئے تھے۔ ان نہروں کی وجہ سے تنجور جنوب کا سب سے بڑا غلہ برآمد کرنے والا صوبہ اور پوہر سب سے بڑی بندرگاہ بن گئی۔ موتی اور مونگے کی تجارت کیلئے تو یہ شہر پہلے ہی سے مشہور تھا۔

یہی وہ بادشاہ تھا جو کوہ ہمالہ پر گیا تھا اور جہاں اس نے ایک چٹان پر اپنے جھنڈے کی نشانی شیر کھدوائی تھی۔ اس نے ناگا قبیلے کو شکست دے کر نیگاپٹم کا الحاق اپنے ملک سے کر لیا تھا وینی کی لڑائی میں چیرا کے بادشاہ کو شکست دی تھی اور سیلون پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔

اندوا کا تہوار تو پہلے ہی منایا جاتا تھا۔ اس نے کچھ اور تہوار منانے شروع کئے جس سے پوہر میں اور بھی زندگی آ گئی۔ پوہر شہر تین میل چوڑا تھا اور دو بڑے حصوں میں تقسیم تھا ایک تو مارو وپکم ..... جو ساحل سے ملا ہوا تھا۔ جہاں غیر ملکیوں کے عالیشان مکانات، گودام اور ایسے بازار تھے جن میں ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ یہاں بہت دُور دُور کے ممالک کے ملاح دکھائی دیتے تھے۔ اس بازار میں سلک، مونگے، موتی، سونا، جواہرات، صندل، وغیرہ بھرا پڑا تھا۔ اور گندم کی خرید و فروخت الگ تھی جو اشارہ قسم کا تھا۔

دھوبی، بڑھئی، لوہار، کمہار، جوہری، شراب فروش، مچھلی والے، موچی، درزی، موسیقار، نمک فروش، گوشت، تیل، پیتل، اور کپڑا بیچنے والے سب کے بازار الگ الگ تھے۔ اور خوانچہ فروش، پھول، خوشبوئیں، وغیرہ بیچتے ہوئے ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔

شہر کا دوسرا حصہ پٹینا پاکم تھا ایک کھلے میدان نے اسے دوسرے سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس میدان میں روز ایک بازار لگتا تھا پٹینا پاکم میں بادشاہ کا محل تھا اسی حصے میں تجارت کرنے والے شہزادے اپنے عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ برہمن، کھتری، جیوتشی، وید، جواہرات کا کام کرنے والے، مشہور درباری اور رقص کرنے والے وغیرہ بھی یہیں رہتے تھے۔

شہر کے وسط میں بڑے چوراہے پر ویمن کا مندر تھا جس کے متعلق لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ رات کو دھاڑتا ہے جو آواز مندر سے دس میل دور تک سنی جا سکتی ہے۔ اور اپنے رستے سے تمام چوروں، اچکوں اور بدمعاشوں کو باندھ لیتا ہے۔

کھلے بازار میں سامان کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ بس ہر چیز پر اس کا وزن اور مالک کا نام لکھا رہتا تھا۔ اس قیمتی سامان کیلئے کوئی چوکیدار تھا نہ کوئی تالا ..... لوگوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی چور وہاں سے کوئی سامان اٹھاتا تو ویمن اسے اپنی طاقت سے رات بھر وہیں گھماتا رہتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو جاتی اور بادشاہ کے آدمی چور کو گرفتار کر کے جان سے

مار دیتے۔ شہر میں اور بھی مندر تھے۔ ان میں سے ایک وشنو کا مندر تھا۔ جس میں وشنو کو کہکشاں کے سانپ پر ایک خاص رومانی انداز سے سو رہے تھے۔ باقی مندر شیو جی، اندرا اور گنیش کی دیوی کو رادی کے نام سے تھے۔

اس شہر میں ایک بہت مشہور تجارت کرنے والا شہزادہ مینا کن رہتا تھا۔ اس کے تمام جہاز اور سامان فروخت سمندر میں تھے۔ اسے حکومت کی طرف سے بے انتہا نوازشیں ملی ہوئی تھیں۔

مینا کن اور اس کی بیوی اندرا عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ مدتوں سے انہیں صرف ایک بچے کی آرزو تھی۔ لکشمی دیوی کی بے انتہا پوجا اور بہت کچھ نذر پیش کرنے کے بعد ان کے ہاں ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام کنا کی رکھا گیا۔ وہ چودہ سال ہی کی تھی کہ ہر شخص کے ہونٹوں پر اس کا نام رہنے لگا۔

کنا کی اس قدر خوبصورت اور حسین دوشیزہ تھی کہ تمام دنیا کے لوگ اسے لکشمی دیوی کہا کرتے۔

پوہر شہر میں ایک اور دولت مند تاجر سادھون رہتا تھا۔ جس کے کاروباری قافلے ہر طرف جایا کرتے تھے۔ آبپاشی کی نہریں بننے سے پہلے ایک دفعہ زبردست قحط پڑا تھا۔ اور ہزاروں غریب بھوکے مرنے لگے تھے۔ مگر سادھون نے ان غریب لوگوں کی مدد کی اور انہیں موت کے چنگل سے آزاد کیا۔ اسی لئے بادشاہ کی نظر میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اور دربار کے شرفا میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا ایک حسین لڑکا کوولن تھا۔ جو ابھی سولہ سال کا ہی تھا۔ شہر کے لوگ اس خوبصورت نوجوان کو شیو کا لڑکا کہا کرتے تھے۔

عام طور پر لوگوں کی یہ پیشین گوئی تھی کہ کنا کی اور کوولن کی شادی ہو جائے گی۔ ایک دن کوولن کے ایک دوست نے کنا کی کے حسن کی داستان سنائی اور بتایا کہ صرف یہی ایک ایسی لڑکی ہے جو اس کیلئے مناسب ہے۔ اور اسی طرح کنا کی کی سہیلی نے کوولن کی خوبصورتی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ پوہر میں صرف یہی وہ لڑکا ہے جس سے وہ شادی کر سکتی ہے۔

فطری طور پر دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا ایک دن دونوں ایک تہوار منانے میں شریک تھے۔ کہ دونوں نے چند لمحوں کیلئے ایک دوسرے کو دیکھا اور کیوپڈ نے فوراً دونوں کو شکار کر لیا

دونوں مجبور تھے اور اپنے والدین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔

کنا کی کا چودھواں سال پورا ہونے والا تھا۔ اب اس کی شادی لازمی کرنی تھی۔ اس کی ماں اندل بہت پریشان تھی۔ وہ اپنی پریشانی کو سینے میں چھپائے رہتی۔ اور کبھی شوہر سے نہ کہتی کیونکہ کنا کی کی شادی کی قطعی پرواہ نہ تھی۔

اندل کے شوہر نے ایک دن پوچھا

"اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہو؟"

"لیکن میرے خوشی سے ناچنے گانے کی بھی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

شوہر کو غصہ آ گیا۔

"کیا تم میں عقل نہیں ہے؟ دیوتاؤں نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا پھر بھی تم ناشکر گزار ہو۔"

نوکروں کے سامنے اپنی بے عزتی دیکھ کر اندل غصہ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مینا کن رات کا کھانا کھا کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک اندل کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی۔ آخر اس نے ملازمہ کو بھیج کر بلایا۔ حقیقت یہ تھی کہ مینا کن بھی اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کافی پریشان تھا۔ اور اسی سلسلہ میں اپنی بیوی سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" اندل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"بقول آپ کے مجھ میں تو عقل ہی نہیں ہے پھر مجھ سے مشورہ کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ارے غصہ مت ہو۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ کنا کی کی شادی کے سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کنا کی کی شادی۔" اندل نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی تو مسئلہ ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

"ارے بیوقوف" مینا کن نے کہا۔ "تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے خیال سے کیا میں پریشان نہیں ہوں۔"

"آج شام ہی کو سادھون مجھے ملا تھا۔ گفتگو کے دوران میں

اس نے اشارتاً یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی ہماری لڑکی سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیتا بھی کیسے؟ تم سے مشورہ تو کیا نہیں تھا۔ اس کا لڑکا کوولن معقول لڑکا ہے اور میرے خیال سے تو بہت اچھا جوڑا رہے گا۔"

"واقعی بہت ہی خوب رہے گا یہ رشتہ فوراً طے کر دیجئے" اندن نے بڑی بے قراری سے کہا۔ "بس وقت مت ضائع کیجئے یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی آپ کو جواب دے دینا چاہیئے تھا۔"

"نہیں نہیں میں تم سے پوچھے بغیر کیسے ہامی بھر لیتا؟ اور ہاں اپنی طرف سے اس لڑکے میں خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے — ٹھیک ہے کوولن بہت اچھا داماد رہے گا۔ لیکن ہماری لڑکی یقیناً اس سے اچھی بہو رہے گی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے لیکن کل جب آپ مسادھون سے ملیں تو یہ رشتہ طے ہی کر دیں۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

اور پھر رات بھر یہ لوگ اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی کے مستقبل کے پروگرام بناتے رہے۔ صبح سے تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں سو گئے۔

دوسرے روز ضیاکن نے مسادھون کو بلایا اور شادی کی تجویز پیش کر دی۔

مسادھون تو اس پیشکش سے اچھل پڑا۔ مگر اس نے تجویز پیش کی "پہلے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔ تاکہ ان دونوں کی مرضی پہ رشتہ طے کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کی مرضی نہ ہو تو خیر — کم سے کم اعتراض بھی تو نہ ہو۔"

"تم جانتے ہو" مسادھون نے کہا۔ "ان معاملات میں ان دونوں کا مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔ مجھے تو لڑکی کے باپ کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

کوولن اور کناکی کو بلایا گیا۔ وہ دونوں عجیب کشمکش میں تھے اگرچہ انھوں نے والدین کو نہیں بتایا تھا لیکن وہ تو بہت پہلے یہ رشتہ طے کر چکے تھے۔ اس وقت ان میں کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ اب ان کا رشتہ کسی کے ساتھ طے ہونے والا ہے۔ لیکن جب انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ان کی خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ دونوں کی نگاہیں سے چھلکتی ہوئی خوشی سے مسادھون اور ضیاکن کو بالکل حیرت نہیں ہوئی ان کا خیال تھا کہ یہ رشتہ تھا ہی اتنا مناسب۔ غرض رشتہ طے ہو گیا اور بہت ہی تھوڑی مدت بعد شادی قرار پائی۔

خوبصورت خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر شہر کے تمام معززین کو مدعو کرنے گئیں

دولہا اور دلہن کا بہت شاندار جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں موسیقی کا پورا انتظام تھا۔ ہر لوگ سفید ریشمین چھتریاں لگائے ہوئے تھے یہ پرشکوہ جلوس شہر کی تمام بڑی سڑکوں سے گذرا۔

شام کے وقت یہ سب لوگ ایک میدان میں گئے جو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جگہ جگہ کے شامیانے میں ہیرے اور جواہرات آویزاں تھے۔ شامیانے کے کھمبے خوبصورت پھولوں کے ہاروں اور قیمتی جواہرات سے سجے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پریوں کے دیس میں آ گئے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد ان دونوں کو ستاپتی کیلئے منڈپ میں لیا گیا دولہا نے بادشاہ اور تمام معزز شہریوں کے سامنے دلہن کو ہار پہنایا۔ اس ہار کو عام طور پر "تالی" کہا جاتا ہے۔ کچھ حسین دوشیزاؤں نے رومانی گیت گانے شروع کئے اور کچھ صندل، پان، عنبر اور پھول تقسیم کر رہی تھیں۔

نوجوان لڑکیاں تھالیوں میں چراغ جلائے دولہا دلہن کے گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہی تھیں۔ اے خدا اس جوڑے کو ہمیشہ ہمیشہ سلامت رکھیو۔ یہ دونوں ہمیشہ خوش و خرم زندگی گذاریں۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔

ان تمام رسوم کی ادائیگی کے بعد دولہا دلہن کو حجلۂ عروسی میں میں بھیجا گیا۔ جسے آج غیر معمولی طور پر سجایا گیا تھا۔

حجلۂ عروسی میں کوولن اور کناکی ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کوولن یاسمین کے پھولوں کا ایک ہار پہنے ہوئے تھا اور کناکی کزوتی کے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کوولن نے اپنے گلے سے ہار اتار کر کناکی کو پہنا دیا۔ وہ ایک گیت گنگنا رہا تھا۔

میرے محبوب آ! کہ چاند چمک رہا ہے۔
مجھ سے عشق پیچاں کی بیل کی طرح چمٹ جا۔ تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے میں سما جائیں۔
مجھے زیادہ پریشان نہ کر۔۔۔
کوولن نے کناکی کو اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔
کناکی بھی جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی گیت تھا۔

"میں بہت پہلے تم سے ملی تھی
اور میں ہمیشہ سے تمہاری محبت میں غرق رہی ہوں
میرا دل درد و غم میں ڈوبا ہوا تھا
اور زندگی جہنم تھی
مگر اب جبکہ تم میرے پاس ہو، مجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے
میرے تمام خوف دور ہو چکے ہیں۔
میری پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں
تم سدا میرے دل میں رہے ہو
میرے سینے میں رہے ہو
خدا کرے ہم کبھی جدا نہ ہوں!"

۔آمین!۔ کوولن نے کہا مجھے بھینچ لو۔ میں تمہارے بوسوں کیلئے اتنا بے قرار ہوں جیسے کوئی بدمست شرابی شراب کا متمنی ہوتا ہے۔ کتنے شیریں ہیں یہ بوسے جیسے محبت کے پیالے میں شہد اور دودھ ملا دیا ہو۔

اف کتنی حسین ہے یہ دنیا۔۔۔ کیا محبوب کی آغوش سے زیادہ وشنو کی جنت ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر کی خوشی تم میں سما کر رہ گئی ہے۔ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کیا محبت کا دیوتا کما اپنی رتی سے جدا ہو سکتا ہے۔

پھر دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ کوولن نے کناکی کے شانوں پر صندل سے محبت کی دیوی کی تصویر بنائی۔

میری زندگی۔۔۔ کوولن نے اسے بری طرح بھینچتے ہوئے کہا۔ تمام دیوی اور دیوتاؤں نے تم کو حسین بننے میں مدد دی ہے — تمہاری موجودگی سے تو مور شرما جائے۔ سفید خوبصورت بطخ تمہارے حسن سے نادم ہو جائے گی۔ کس قدر میٹھی ہے تمہاری آواز۔ کوئل تمہارے سامنے کوا معلوم ہوتی ہے۔

تمہارے اس تابناک حسن کو کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں خوشبو کی ضرورت ہی کیا ہے تم میں سے تو خود خوشبو پھوٹتی ہے۔ یہ ہیرے اور جواہرات تمہارے حسن میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں تم پاروتی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ لکشمی دیوی بھی تمہارے آگے کچھ نہیں ہے۔ کناکی مجھے اپنے نرم و نازک بازوؤں کی گرفت میں لے لو۔

کناکی نے اپنی باہیں اس کے گرد حائل کر دیں — یہ دونوں ایکدوسرے میں اس طرح کھوئے کہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا بھی انہیں خیال نہیں رہا۔

دوسرا باب

کناکی اور کوولن مسادھون کے گھر میں انتہائی خوشی اور مسرت کے دن گذار رہے تھے۔ کوولن کی ماں نے اس نئے جوڑے کی رہائش کا انتظام ایک علیحدہ محل میں کر دیا تھا۔ جسے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے نوکر اور خادم ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے۔ تاکہ کناکی اور اپنے عزیز، رشتہ دار، اور مہمانوں کی تواضع اچھی طرح کر سکتی۔

کوولن کی ماں بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نیا شادی شدہ جوڑا الگ ہی رہے تو اچھا ہے تاکہ ان کے بڑے مداخلت نہ کر سکیں۔

وقت تیزی سے بھاگتا رہا اسی طرح مسرتوں اور خوشیوں میں تین سال بیت گئے۔ اس عرصے میں وہ محبت کے دیوتا کما اور رتی دیوی کی طرح ایک دوسرے کی محبت میں غرق رہے۔ کناکی نے اس سلیقہ سے گھر کا کاروبار سنبھالا کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ بحیثیت بیوی، میزبان اور غریب پرور کے وہ تمام شہر میں مشہور ہو گئی۔

کوولن کو بھی شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ وہ عوام میں دلچسپی لیتا تھا۔ فنکاروں کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا۔ خاص طور پر اسے موسیقی اور رقص میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی وینا اور بنسری کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بلکہ موسیقی کا ایک ماہر نقاد بھی تھا۔ رقص میں بھی اسے کچھ کم مہارت نہیں تھی۔ شہر میں کہیں بھی محفل رقص و سرود ہو۔ وہ ضرور اس محفل میں شریک ہوتا۔

اس زمانے میں چترا پتی نامی ایک حسینہ اپنے گانوں اور رقص کی

وجہ سے پورے شہر میں بہت مشہور تھی۔ جس محفل میں وہ ہوتی شائقین کا بے پناہ ہجوم ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ بادشاہ اور شہزادے بھی اس کے شائقین میں سے تھے۔

چتراپتی کی ایک بہت خوبصورت لڑکی مادھوی تھی۔ جسے رقص وسرود پر غیر معمولی مہارت تھی۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جنت میں رہنے والی اُروسی تھی۔ جسے اگستیا نے بد دعا دی تھی کہ وہ زمین پر تناسخ ہی کر جائے۔ ہوا یہ تھا کہ اندر کی محفل میں اُروسی اور نرادا اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اگستیا نے دیکھا کہ نرادا وینا ٹھیک سے نہیں بجا رہے اور اندرا کے لڑکے جینتا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ نرادا کی وجہ سے اُروسی کا رقص بھی خراب ہو گیا۔

یہی وہ اُروسی ہے جو پوہر میں مادھوی کے نام سے پیدا ہوئی۔ وہ سولہ سال کی ہوئی تو اس فن میں کوئی اس کا مقابل نہیں رہا۔ وہ جب سات سال کی تھی تو اس کی ماں نے اس میں تمام صلاحیتیں دیکھ لی تھیں۔ اسے لئے شہر کے سب سے بڑے استاد کو اس کی تعلیم پر مامور کیا تھا۔

اور چودہ سال کی عمر تک وہ اس فن کی ماہر ہو چکی تھی۔

خوبصورتی، رقص اور سرود میں تمام حکومت میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں تھا۔ اسے دیسی اور مارگی دونوں طرح کے ناچ پر پورا عبور حاصل تھا۔ بلکہ وہ فن رقص پر پوری طرح حاوی تھی۔

کوولن جب چتراپتی کے گھر ناچ اور گانے کے لئے جاتے تو مادھوی سے گانا ضرور سنتا اور اس کا رقص بھی دیکھتا۔ مادھوی نے اسے اچھا خاصا متاثر کر رکھا تھا۔ وہ سوچتا کاش کنا کی کو بھی اس کی طرح رقص وسرود پر مہارت حاصل ہوتی۔ اسے اپنے ملک پر غصہ آتا جہاں ایسے فنون کو گھر کی بہو بیٹیوں کے لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر کنا کی مادھوی کی طرح ناچنا گانا جانتی تو اس کی دلکشی میں کتنا اضافہ ہو جاتا۔ ابتدا میں تو وہ مادھوی سے صرف ایک فنکار کی حیثیت سے ملتا تھا اس کے جذبات اس قدر معصوم تھے کہ ایک دن وہ مادھوی کو اپنے گھر لے آیا تاکہ کنا کی کو اس کا فن دکھا سکے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حسن میں بھی مادھوی، کنا کی سے کسی طرح کم نہ تھی اور فن کار کی حیثیت سے تو خیر وہ بے مثال تھی ہی۔

مادھوی نے جب پہلی بار کوولن کو دیکھا تھا تو نجانے اس پر کیا جادو سا ہو گیا تھا اور تب سے وہ کوولن کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش کرتی رہی اور آج تو خلاف معمول اس کی ہر حرکت پر کوولن اسے ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

کنا کی نے سب کچھ غور سے دیکھا اور اسے پہلی بار خطرہ محسوس ہوا۔ لیکن فوراً کنا کی نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوولن کو کنا کی کے فن سے محبت ہے اور بس۔ اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ جب کسی اور نے کوولن پر شک نہیں کیا تو پھر میں کیوں کروں۔

مادھوی رقص کر رہی تھی۔ مگر یہ رقص کنا کی کے لئے ایک ذہنی کرب بن کر رہ گیا۔ رقص ختم ہونے پر اس نے ایک سرد آہ لی جیسے مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔

کوولن نے چتراپتی اور مادھوی کو بہت قیمتی جواہرات کے نیکلس تحفتاً دئے اور وہ دونوں اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

رات کو جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو کنا کی نے کوولن کو پان بنا کر دیا۔ لیکن کوولن نے بہت لاپرواہی سے پان لیا۔ جیسے وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ" کنا کی نے پوچھا۔

"اوہ! کچھ بھی تو نہیں" اس نے جواب دیا اور بڑی گرمجوشی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ہمارے خواب بہت جلد پورے ہو جائیں گے" کنا کی نے کہا۔

"خواب... کیسے خواب" کوولن نے پوچھا۔

کنا کی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"میں بھی کتنا بیوقوف ہوں" کوولن نے کہا۔ "خدارا مت رو، تمہارا مطلب ایک خوبصورت بچے ہی سے تھا نا! کتنی پرانی بات ہے۔"

"مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو" کنا کی نے کہا۔

زندگی میں آتے ہوئے اس نئے طوفان پر قابو پانے کی کنا کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میرا اس دنیا میں سوائے آپ کے کوئی نہیں ہے" کنا کی نے

کہا۔ میرا سب کچھ آپ ہی ہیں۔ میرے باپ، ماں، بھائی، شوہر غرض ہر چیز آپ ہی ہیں۔

کودلن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کا چہرہ اپنے چہرے سے قریب کرلیا۔ وہ کنا کی کی معصوم اور محبت سے لبریز آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کنا کی کے ہونٹوں پر خشک آنسوؤں کے نشان تھے۔ جن پر کودلن نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے

تم رو رہی ہو۔ مگر کیوں؟

میں خوشی میں رو رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

نہیں ان آنسوؤں میں نمک بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں میری جان مجھے معاف کردو۔ واقعی آج شام کے رقص نے بہت زیادہ متاثر کر رکھا تھا۔ اور اسی لیئے میں تھوڑی بہت سرد مہری سے پیش آیا تھا۔ مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے رقص اور سرود سے کتنی محبت ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ کاش میرے دل میں یہ محبت نہ ہوتی۔

مگر اس محبت میں خرابی کیا ہے۔ کنا کی نے کہا۔ مجھے کوئی حسد نہیں ہے۔ آپ مادھوی کے ناچ اور گانے سے جتنا بھی چاہیں لطف اندوز ہوسکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری تمنا صرف یہ ہے کہ آپ خوش رہیں۔

میری زندگی۔ کودلن نے کہا تم کس قدر نیک اور شریف ہو۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ خود کو تمہاری محبت کے قابل بنا سکوں۔ اس نے ایک بار پھر کنا کی کو سینے سے لگا لیا۔ کنا کی کے پیروں میں پڑی ہوئی پائل ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج اٹھیں۔

کتنی خوبصورت ہیں تمہاری پائل۔ ان کی قیمت کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

یہ پائل مجھے ماتاجی نے دیئے تھے۔ کنا کی نے کہا وہ کہتی تھیں کہ انھیں کسی بادشاہ نے تحفہ میں دیئے تھے۔ ان پائلوں میں ایسے جواہرات لگے ہوئے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔ ماتاجی کہتی تھیں کہ دنیا میں ان پائلوں کی کوئی مثال نہیں کوئی ایسے پائل بنا ہی نہ سکا۔

کیا وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ تم جیسی خوبصورت اور حسین کنا کی دنیا میں صرف ایک ہے۔ کودلن نے اسے ایک طویل بوسا دیتے ہوئے کہا۔

لیکن ذہنی اعتبار سے وہ اب مادھوی کے گھر میں تھا۔ کئی ماہ تک وہ چترا پتی کے گھر نہ گیا۔ بلکہ اس راستے سے بھی نہ گزرتا جہاں وہ رہتی تھی۔ کنا کی سے اس کے تعلقات ہمیشہ کی طرح خوشگوار تھے۔

دن تیزی سے گذرتے رہے۔ کنا کی تو اس خطرے کو بھول بھی گئی جو مادھوی کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

ماسادھوان اور اس کی بیوی دن بھر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھے وہ اس نوجوان جوڑے کو ظاہرانہ محبت سے تکتے رہتے تھے۔

وہ بے صبری سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جب خدا ان کو پوتا یا پوتی دے گا۔ جنہیں وہ اپنے گھر لے جاسکیں گے تاکہ انہیں بے کاری سے نجات مل جائے۔

تیسرا باب

ابھی چھ ماہ بھی نہ بیتے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک خوفناک طوفان آگیا۔

اندرا کا تہوار آرہا تھا مادھوی پہلی بار اس تہوار میں ایک رقاصہ کی حیثیت سے حصہ لے رہی تھی۔ رقص کے اس مظاہرے کے بعد اسے ایک باقاعدہ پیشہ ور رقاصہ کی زندگی شروع کرنی تھی۔ کسی بڑے آدمی کا انتخاب کرنا تھا۔ جو اس کی سرپرستی کرسکے۔

تمام شہر کے لوگ بے چینی سے اس تہوار کا انتظار کر رہے تھے۔ جوان، بوڑھے، عورتیں غرض ہر ایک کے منہ پر مادھوی کا نام تھا۔

اس محفل میں بادشاہ کو بھی آنا تھا۔ اسی لیئے کودلن کو سرکاری طور پر حکم دیا گیا کہ وہ شرکت کرے۔ اس کے سب دوست پہلے ہی جارہے۔ لیکن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ شریک نہ ہوگا۔ اسے ڈر تھا کہ مادھوی کی محبت کی آگ پھر سے نہ سلگ اٹھے۔ لیکن اب تو وہ مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اگر نہ گیا تو لوگ نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ مادھوی کی دلکش آواز اور خوبصورت رقص اس کا دامن دل کھینچے جارہا تھا۔

کنا کی بھی اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کرسکی وہ تو دل اور جان سے چاہتی تھی کہ اب کودلن اس محفل میں شریک ہو تاکہ کچھ لطف

جا سکے۔ کنا کی کا خیال تھا کہ اب کودلن کے دل میں مصادوی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے پچھلے چھ ماہ میں کودلن کے رویے نے اس کے دل سے تمام خوف دور کر دیئے تھے۔

کنا کی اپنے معصوم انداز میں سوچتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کودلن کا یہ پیار، یہ خلوص کبھی بھی ایک رقاصہ کیلئے نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاید کنا کی نے خوبصورت آم نہیں دیکھے جو باہر سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اندر سے خراب ہوتے ہیں۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ کودلن نے کبھی اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ اس تمام عرصے میں اس کے دل میں مادھوی کی محبت کی چنگاری سلگتی رہی ہے۔

جوں جوں تہوار قریب آ رہا تھا کودلن کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ تہوار کا دن قریب آتا گیا اور اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اس نئی الجھن کا کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا خدا! میں بھی کتنا بدنصیب انسان ہوں۔ میرے قدموں میں جنت ہے۔ کنا کی جیسی محبت کرنے والی عورت جنت سے کم نہیں ہے۔ مگر میں مادھوی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آخر رقص و سرود میں کیا ہے جو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اس کے فرض کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مادھوی کے اس رقص کو نہ دیکھوں۔ مگر حالات بھی کتنے ناسازگار ہیں۔ خود میری پیاری کنا کی چاہتی ہے کہ میں اس محفل میں شریک ہوں۔

میری وجہ سے کنا کی کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔ اے خدا اس سے پہلے مجھے موت دے دے۔ مگر کیا کروں۔ جب میں مادھوی کا رقص دیکھتا ہوں مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ میں اس کا غلام ہوں۔ مگر اے خدا میں کیا کروں۔ میری حالت اس شرابی کی سی ہے جو ہوش میں ہونے پر شراب کو برا بھلا کہتا ہے۔ لیکن شراب اس کے قریب آتی ہے تو وہ خود کو روک نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ مادھوی کی ایک ہی مسکراہٹ مجھے تباہ کر دے گی۔ میں خود کو بالکل بھول جاؤں گا۔

رقص کے دوران میں اس کے ہاتھ پاؤں کی جنبشیں مجھے لوٹ لیں گی۔ اے خدا کیا کروں۔

وہ یونہی باغ میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جسے ایک سپاہی جان سے مار رہا تھا۔ اس پہ الزام یہ تھا کہ اس نے جھوٹی گواہی دی تھی۔ اس کی بیوی قریب ہی کھڑی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔

اسے اسے مت مارو۔ اس کے بعد میرے اس بچے کی پرورش کون کرے گا۔ عورت آہ و زاری کرتی رہی۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر کودلن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے سوچا میری پریشانی کا حل نکل آیا۔

اسے مت مارئے۔ اس نے افسر سے کہا۔ میں خود کو اس کی جگہ پیش کرتا ہوں۔ کودلن نے آگے بڑھ کر سپاہیوں کے افسر سے کہا۔

کیا دماغ خراب ہے تمہارا۔ افسر نے حیرت سے کودلن کی طرف دیکھا۔

مگر جب افسر نے کودلن کو غور سے دیکھا تو اس کا قیمتی لباس اور چہرہ دیکھ کر اسے یہ تو یقین ہو گیا کہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس نے مؤدبانہ سلام کیا۔ معاف کیجئے۔ جناب میں نے گستاخی کی۔ دراصل میں نے آج سے پہلے کبھی ایسی پیشکش نہیں سنی تھی۔

کوئی بات نہیں کودلن نے کہا۔ مگر منظور ہے آپ کو۔

ہرگز نہیں جناب۔ افسر نے جواب دیا۔ کیا میں اپنے ملک کے ایک نیک شہری کو قتل کر سکتا ہوں۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے بدلے میں جو بادشاہ کے دربار میں جھوٹ بولتا ہے۔ اور پھر کیا آپ کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔ میں نے بیس سال تک بادشاہ کی وفاداری سے خدمت کی ہے۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ۔

اسے جان سے مار دو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا

ایک دردانگیز آواز بلند ہوئی اور سپاہیوں نے اپنا کام کر دیا! مرنے والے کی بیوی بے ہوش ہو کر گر گئی۔ کودلن اسے ہوش میں لایا۔ کودلن نے اسے سو اشرفیوں کی ایک تھیلی دی تاکہ وہ آرام سے زندگی گزار سکے۔ اور اس کا پتہ لکھ لیا تاکہ ایک ہزار اشرفیاں اور بھیج سکے۔

غریب عورت اس فیاضی کو دیکھ کر پھر رونے لگی۔

آپ نے میرے بچے کو بھوکے مرنے سے بچا لیا۔ عورت نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو اس کی جزا میں ایک خوبصورت

بچہ دے۔

افسر خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جناب مجھے کوئی انعام نہیں۔ افسر نے کہا۔ میں نے بھی تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

نہیں آج میں کچھ نہیں دے سکتا۔ کودلن نے کہا میرا بھی ایک بچہ ہے جناب۔ اور غریب آدمی ہوں ہنس کے کہا اچھا اپنے بچے کیلئے یہ لے جاؤ اور اس نے دس اشرفیاں دے دیں۔

افسر کو کودلن کی اس فیاضی پر خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔

دنیا واقعی اتنی بری نہیں ہے جتنی میں اب تک سمجھتا آیا تھا۔ آپ یقیناً ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو جسمانی طور پر جنت میں جائیں گے۔ خدا کرے لوگ ہزاروں سال تک آپ کو یاد رکھیں۔

اندرا کا تہوار بڑی دھوم سے شروع ہوا۔ تماشائیوں سے سڑکیں بھری ہوئی تھیں۔ اور لوگوں کا سب سے بڑا ہجوم تو اس ہال کے قریب تھا جس میں مادھوی کا رقص ہونے والا تھا۔ سٹیج بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ پلیٹ فارم بہت بڑا تھا۔ جو شیشے کی طرح چمکتے ہوئے لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اور سٹیج پر عبادت اور روحانی فیض کیلئے تصویریں رکھی تھیں شمعیں اس طرح رکھی گئی تھیں کہ کھمبوں کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔ اور سلک کے شاندار شامیانے پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

بادشاہ کا جلوس بہت ہی پر شکوہ تھا۔ بادشاہ اور اس کے وزیر رتھ پر سوار تھے۔ ہاتھیوں پر سوار موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ رتھ اور ہاتھی پورے شہر کا چکر لگا کر اس ہال میں آئے۔

تمام موسیقار ساز لیکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آج مادھوی نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم پر سجے ہوئے جواہرات چمک رہے تھے۔ وہ ہال میں داخل ہوئی اور رسم کے مطابق ایک کھمبے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کی ماں چترا پتی اور باقی دوسرے کھمبے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

دستور کے مطابق پہلے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا لوگوں کو نیکی دے اور برائیوں سے بچائے۔ دعا کے بعد تمام ساز ایک ساتھ بجائے گئے۔ تمام سازوں کی دھن میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔

مادھوی نے پہلے دیسی رقص پیش کیا۔ اور اس رقص کیساتھ ایک گانا گایا گیا۔ اس کے بعد وہ دوکا رقص شروع ہوا۔ جو سنسکرت کا کلاسکی رقص تھا۔

وہ اتنی تیزی سے رقص کر رہی تھی جیسے عشق پیچاں کی بیل میں زندگی آگئی ہو۔ آج اس کا فن اپنے عروج پر تھا۔ بادشاہ اس رقص سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مادھوی کے گلے میں سبز پتوں کا ہار ڈالا۔ جس کا رواج تھا۔ اور ایک ہزار آٹھ اشرفیاں دیں۔ اس کے بعد بادشاہ اپنے محل کو واپس چلا گیا۔

مادھوی ماں کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی۔

گھر پہنچ کر اس نے گلے کا ہار اتارا اور اپنی ملازمہ چیلم کو دیدیا۔ یہ رسم تھی کہ بادشاہ کا دیا ہوا ہار نیلام کیا جاتا اور جو کوئی اسے خرید لیتا وہ رقاصہ کا عاشق قرار پاتا۔

مادھوی کے گھر کے باہر شہر کے تمام سوداگر، زمیندار اور شرفاء کھڑے تھے۔

چیلم وہ ہار لیکر آئی اور بلند آواز سے کہا۔

یہ ہار ایک ہزار آٹھ اشرفیوں میں برائے فروخت ہے جو کوئی یہ ہار خریدے گا وہ خوبصورت مادھوی کا عاشق ہوگا۔

مادھوی کو امید تھی کہ کودلن یہ ہار خریدے گا۔ بلکہ چترا پتی کا تو خیال تھا کہ کودلن یہ ہار خریدنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیگا۔

کودلن نے جب سے مادھوی کا رقص دیکھا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی محبت کے جن جذبات پر اب تک اس نے قابو پائے رکھا تھا۔ آج انہیں جذبات نے اسے اپنے قابو میں لے لیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ سوائے مادھوی کے اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مادھوی کے عاشق ہونے کی سعادت وہی حاصل کرے گا۔ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں۔ جونہی اس نے چیلم کی آواز سنی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہار لے لیا چیلم کودلن کو مادھوی کے شبستان میں لے گئی۔

مادھوی اپنے بستر پر نیم دراز تھی۔ جس پر پھول بچھے ہوئے تھے وہ بہت ہی باریک ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا خوبصورت جسم جھلک رہا تھا۔ کودلن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔ پوہر کا مشہور اور خوبصورت نوجوان کودلن آج اس

سے محبت مانگنے آیا تھا۔ وہ کوولن کو دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ کوولن نے اسے گلے میں بانہیں ڈال دیا۔ اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کوولن اس وقت خود کو جنت میں محسوس کر رہا تھا۔ آج مادھوی نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اپنا گھر اور اپنی وفادار بیوی تک کو فراموش کر بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ مادھوی کا ساتھ دے گا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے گھر واپس نہیں گیا بلکہ اس نے اپنے ایک خالی مکان میں رہائش کا انتظام کر لیا۔

مادھوی اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ سوتے، جاگتے، کھاتے، پیتے ہر وقت اس کا تصور رہتا۔ بیوی، کاروبار اور والدین وغیرہ کو بالکل بھول گیا۔

دن بھر وہ تھا اور مادھوی ....

چوتھا باب

کوولن اور مادھوی کو ساتھ رہتے ہوئے تین ماہ گذر چکے تھے۔ اور اب تو ان کی خوشی کی انتہا ہی نہیں تھی کہ مادھوی بہت جلد ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ لیکن چترا پتی کو اس بچے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مادھوی ابھی بہت کم عمر ہے اور پھر بچے کی پیدائش کے بعد اس کی خوبصورتی کم ہو جائے گی۔ وہ پھر ایسا رقص بھی نہ کر سکے گی۔ پھر ماں کی خوبصورتی اور جوانی تو جڑوں کے لئے کھاد ہوتا ہے۔

لیکن پھر کیا کیا جائے؟ مادھوی کی ملازمہ وسنت مالا نے پوچھا۔ اگر بچے کی پیدائش کے وقت ہم مدھاوی کی ہر ممکن حفاظت کریں تو اس کی صحت پر کم سے کم اثر ہوگا۔

یہی میرا خیال ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں میرا ذاتی تجربہ ہے۔ جب مدھاوی پیدا ہوئی تھی تو میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ مادھوی کی پیدائش کے بعد میرے رقص میں پہلی سی بات نہ رہی۔

لیکن اس سلسلے میں تو کوسیکر کا خیال بھی بڑا عجیب ہے وسنت مالا نے کہا وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سب بڑی جسمانی، تہذیبی، ادبی، اور فنی بد اخلاقی ہے کہ ہم زندگی کی شمع آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دنیا کے اور سب نظریات محض بکواس ہیں۔

ممکن ہے یہ ٹھیک ہو۔ اور کوسیکر کا یہ نظریہ تو اس لئے ہے کہ وہ خود میری فنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی وجہ سے میں ایک ماہر رقاصہ نہ رہ سکی۔ کتنی مضحکہ خیز ہیں یہ باتیں۔ انسان اپنی ناکامیوں کو چھپانے کیلئے مختلف نظریات کے شیش محل میں پناہ لے لیتا ہے۔ چترا پتی بولے ہی جا رہی تھی۔ مگر وہ آدمی سمجھدار ہے اس سے پوچھیں گے کہ اس وقت مادھوی کی تیمارداری کس طرح کی جائے۔ اور اسے کیا خوراک دی جائے۔

اسی لمحے کوسیکر گھر میں داخل ہوا۔ وہ پینتالیس سال کا ایک برہمن تھا۔ چہرے سے مہذب انسان معلوم ہوتا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے جسم اور لباس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی صحت کا ہر ممکن خیال رکھتا ہے۔ اس وقت وہ پان کھا رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔

ارے آپ نے خود ہی پان کھا لیا۔ ابھی انتظار نہ کیا کہ چترا پتی آپ کو پان بنا کر دیں وسنت مالا نے کوسیکر سے کہا۔

لیکن دوسرے پان سے بھی مجھے انکار نہیں کوسیکر نے جواب دیا۔ ہاں مادھوی کا کیا حال ہے۔

اف یہ مرد کیسے ظالم ہوتے ہیں چترا پتی نے تنک کر کہا۔ آپ میری صحت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتے۔ یہ تو پرانی ریت ہے۔ جب ہم عورتیں ایک خاص عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو مرد ہمارے لئے پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔

نہیں بھئی۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ تم اچھی خاصی بیٹھی ہو۔ پھر میں کیا پوچھوں۔ مادھوی اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

کیا صرف شکل سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کتنی الجھنیں ہیں جنہوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے چترا پتی نے کہا۔

تمہارا خیال ہے۔ آدمی کی ذہنی پریشانیاں صرف چہرے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا چہرہ دل و دماغ کا آئینہ ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ ایسی بھی پریشانیاں ہوتی ہیں جو مگر مچھ کا

طرح ہمیشہ پانی کی اندرونی سطح پر رہتی ہیں۔ جنہیں پانی سے باہر آنے کا کبھی موقعہ نہیں ملتا۔ وسنت مالا ان دونوں کے بیچ میں بول پڑی۔

میں پچھلے بیس سال سے چترا پتی کے ساتھ ہوں۔ اس لئے پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے کوسیکر نے جواب دیا۔

یہ تو خیر مجھے معلوم تھا کہ یہ ایسی باتیں کریں گے۔ چترا پتی نے وسنت مالا سے کہا۔ مگر مجھے تم سے ایک بہت اہم مشورہ لینا ہے۔ چترا پتی کوسیکر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تم جانتے ہو مادھوی ماں بننے والی ہے۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ پچھلی دفعہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو اس کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ ماں بننے والی ہے۔

بس آپ تو بہت بڑے وید ہیں چترا پتی نے کہا۔

تم یقین کرو کہ میں سمجھ گیا تھا۔ کوسیکر نے کہا دیکھو تم جانتی نہیں۔ ایسے موقعہ پر عورت میں بہت سی جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

ہم نہیں جانتے۔ آپ کے اس خیال کا بھی جواب نہیں ہے۔ حضور ہم لوگ براہ راست ان تجربوں سے گذرتے ہیں۔ ہماری معلومات تجربہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ آپ کی طرح نہیں کہ کرم خوردہ کاغذوں پر لکھے ہوئے پچھلی نسلوں کے تجربات پڑھ لئے اور وید بن بیٹھے۔

تم بھی مذاق کر رہی ہو مریض اپنے مرض کو وید سے بہتر نہیں جانتا۔ اگر تمہارا خیال ٹھیک ہوتا تو پھر وید کی ضرورت نہ رہتی ہر مریض اپنا علاج آپ کر لیتا۔

تو کیا ماں بننے کی تیاری کرنا کوئی مرض ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

نہیں میں نے کب کہا کہ یہ کوئی مرض ہے۔ میں نے تو صرف ایک مثال دی تھی۔ ورنہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ صحت مند چیز ہے۔ اگر مادھوی ایسے وقت میں کھانے اور پینے کی پابندی کرے تو خطرہ ہو۔

یہی تو میرا بھی مطلب ہے۔ ذرا یہ بتاؤ کہ اسے کھانے کو کیا دیا جائے۔ جس سے اس کی صحت برقرار رہے اور بچے کی پیدائش سے اس پر کوئی اثر نہ پڑے۔

اس وقت اسے اپنا ذہن تمام اُلجھنوں سے دُور رکھنا چاہیئے اور اس سے کہنا کہ روز دو گلاس دودھ اور چار گلاس تازہ پانی پیئے

اتنا پانی کیوں؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

اپنے لئے اور اس بچے کے لئے۔ اس نے جواب دیا۔

بچے کیلئے۔ ابھی تو وہ دو ماہ کا بھی نہیں ہے۔

ہاں! لیکن اتنی مدت میں بچہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ کوسیکر نے ہاتھ کا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی بن جاتے ہیں۔ بلکہ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بھی بن جاتی ہیں۔

کیا مطلب؟ اس انکشاف نے دونوں عورتوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

ہاں جناب ابھی تو وہ باتیں ہیں۔ جو آپ عورتیں نہیں جانتیں۔ حالانکہ آپ سب ماں بنتی ہیں۔ کوسیکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن اتنا چھوٹا بچہ غذا کیسے کھا سکتا ہے۔ وسنت مالا کی حیرت ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔

خدا نے ایسے ذرائع پیدا کر دئے ہیں کہ بچہ خود غذا لیتا رہتا ہے تم نے وہ نال تو دیکھی ہوگی جو ماں اور بچے کو ایک کر دیتی ہے۔ بس اسی نال سے بچے کو بہترین غذا اور ہوا ملتی رہتی ہے۔ کوسیکر نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

کتنی عجیب بات ہے؟

اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ چھ ماہ سے پہلے بچے میں حرکت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور پھر بھی غذا لیتا رہتا ہے۔ پانی، کھانا اور ہوا سب کچھ اسے ملتا رہتا ہے۔

کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ بچے کی جنس کیا ہے وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوسیکر نے کہا۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد سب زور سے ہنس پڑے۔

لیکن کچھ جیوتش تو بالکل ٹھیک پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وسنت مالا نے پوچھا۔ انھیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔

یہ تو ایک طرح کا جوا ہے۔ بالکل ایک کاروبار ہے جس میں پچاس فیصدی نفع کی امید ہوتی ہے اور پچاس فیصدی نقصان کی۔

کیا مطلب یہ نفع نقصان کیا ہے۔ وسنت مالا نے پوچھا۔

ایک دفعہ ایک جیوتشی صاحب قبلہ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک صاحب کے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور واقعی لڑکا ہوا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی میں ان کے پاس گیا۔ بڑی منت اور سماجت سے انہوں نے راز بتایا اور راز صرف یہ تھا کہ وہ ایک پرچی پر لڑکی لکھ دیتے اور دوسری پر لڑکا دونوں کو بند کر کے ایک اٹھا لیتے اور پیشین گوئی فرما دیتے۔ مگر میری

کچھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس لئے میں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔

اچھا ایک بات اور بتایئے۔ وسنت مالا نے پوچھا ہم نے سُنا ہے قوتِ ارادی سے بچے کی جنس بدل جا سکتی ہے کیا یہ ممکن ہو؟

ہاں ممکن ہے ؟ مگر صرف دیوتاؤں کیلئے : انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اچھا مادھوی کے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی ؟ چترا پتی نے پوچھا۔

میرا خیال ہے لڑکی ہوگی۔ کوسیکر نے کہا۔ کیونکہ مادھوی زیادہ طاقتور ہے۔

طاقت کا کیا تعلق ؟

جنسی اعتبار سے جو بھی طاقتور ہو بچہ اس کی جنس پر ہوگا۔

تو اس کا مطلب ہے کہ چترا پتی آپ سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہاں بھی تو لڑکی ہوئی تھی۔

بالکل اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں طاقتور ہوتا تو دوسری شادی کر کے باقاعدہ گھریلو زندگی نہ گذارتا۔ کوسیکر نے کہا۔

آپ کا شکریہ ! مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ چترا پتی نے کہا۔

اب ہم دونوں اس عمر سے گذر چکے ہیں جب اپنی تعریف سے ہمیں شرم آتی تھی۔ اب تو ہم سچی بات کہہ سکتے ہیں۔

اچھا اور بتاؤ مادھوی کو کیا غذا دی جائے چترا پتی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

اس کو جتنے پھل اور ترکاری دے سکتے ہو دو۔ شراب اور گوشت بالکل مت دینا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہی ہدایات تم نے مجھے بھی دی تھیں۔ چترا پتی نے کہا۔

اور ہماری ہدایات پر عمل کر کے تم کتنے خوبصورت بچے کی ماں بنیں۔

لیکن میں ماں بننے کے بعد پہلی سی فنکار تو نہ رہی۔

تمہارا خیال غلط ہے۔ تمہارے فن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تم بہت عرصے تک پورے شہر کی واحد رقاصہ رہی ہو۔ کسی نے بھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب مادھوی نے اپنے فن کا چراغ جلایا تو تمہارا چراغ مدھم پڑ گیا۔ تمہیں مادھوی کے فن سے نقصان پہونچا ہے۔ اس کی پیدائش سے نہیں۔۔۔۔

اچھا مادھوی کیلئے کوئی اور ہدایات۔ چترا پتی نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

کچھ ماہ کے بعد مادھوی کو اپنے کمرے میں سلانا۔ اس کے بعد کوولن کو صرف باتیں کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خیر کچھ کروں گی۔ مگر جناب یہ بالکل نئی ہدایت ہے میری دفعہ آپ نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چترا پتی نے مسکرا کر کہا۔

ہاں بڑی عجیب بات ہے لیکن اگر وید خود کوئی دوا استعمال نہ کریں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوا خراب ہے۔

ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ کچھ اور ؟ چترا پتی نے پوچھا۔

اب کچھ بات صرف تم سے کہنے کی ہے ذرا ادھر آؤ۔ اور کوسیکر چترا پتی کو ایک طرف لے گیا۔

دیکھو ایک بات کا خیال رکھنا۔ کوولن کو مجبور کر کے بچے اور اس کی ماں کے اخراجات کیلئے کچھ جائداد ان کے نام کرا لینا تاکہ یہ دونوں آرام سے زندگی گذار سکیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بچہ ہونے کے بعد مرد کی توجہ اور اس کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ دوسری خوبصورت عورت کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ کوسیکر نے کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے تھوڑا بہت تو کر لیا ہے۔ لیکن باقی انتظام بھی کر دوں گی۔ مگر ایک بات تو بتاؤ تم کوولن سے کیوں خائف ہو مادھوی کی پیدائش کے بعد تم نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔

ہاں میں نے ایسی حرکت نہیں کی معلوم ہے کیوں ؟ میرے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کوولن کے پاس ہے۔ اور پھر کسی عورت نے ہمیں حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جبکہ کوولن اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہے۔

تمہارا اپنے بارے میں اندازہ غلط ہے۔ تم بہت زیادہ قیمتی چیز ہو۔ چترا پتی نے کہا۔

آج بس زندگی میں پہلی بار اپنے بارے میں یہ الفاظ سن رہا ہوں۔ دونوں پھر وہیں آ گئے جہاں وسنت مالا بیٹھی ہوئی تھی۔

اچھا ایک بات اور بتایئے۔ بچہ کو جسمانی طور پر اپنے والدین سے کیا ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ ماں سے کیا لیتا ہے اور باپ

کیا ؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

گوشت، خون اور جسم کی کھال بچے کو ماں سے ملتی ہے۔ ہڈیاں۔ اس کا مغز اور طاقت باپ سے۔ کوسیکر نے کہا۔

لیکن دوران حمل میں عورتوں کو طرح طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ وسنت مالا نے پوچھا۔

ہاں ایسے موقع پر عورتوں کی خاص عادتیں اور خواہشیں ابھر آتی ہیں۔ بعض عورتیں کچے چاول کھانا پسند کرتی ہیں۔ بعض عورتیں ایسے پھل مانگتی ہیں جن کا فراہم کرنا مشکل ہو۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر ہر وقت ان کے پاس ہی بیٹھے رہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کی خواہش پوری کر دینی چاہیئے کیونکہ عورت اور بچے کی ناامیدی نقصان دہ ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مادھوی آگئی۔

کیا باتیں ہو رہی ہیں مدھادوی نے پوچھا۔

ارے کیا تم ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔ کوسیکر نے پوچھا۔

میں نے آپ لوگوں کی تمام باتیں سُنی ہیں۔ البتہ وہ باتیں نہیں سُن سکی جو آپ نے ماتاجی کو الگ لے جا کر کی ہیں۔

چلو اچھا ہوا تم نے خود سب کچھ سُن لیا۔ میری آدھی مشکل تو حل ہو گئی۔ چتراپتی نے کہا

لیکن ایک بات بتائیے کیا بچہ صرف انگوٹھے کے برابر ہے اور ابھی حرکت بھی نہیں کر سکتا مادھوی نے کوسیکر سے پوچھا۔

بالکل۔ کوسیکر نے جواب دیا۔

بڑی عجیب بات ہے۔ مادھوی نے کہا۔

تم کو کیا بڑے بڑے عالموں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ جبھی تو ان کا خیال ہے کہ ہم دلیتا انگوٹھے برابر ہے اور ہمارے جسم میں حرکت نہیں کرتا۔ کوسیکر نے کہا۔

اچھا! وہ جو تم ایک بھجن سناتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے چتراپتی نے کہا۔

اور کیا ؟ کوسیکر نے کہا۔

میں اب جا رہا ہوں مجھے ایک ضروری کام ہے۔ دیکھو مادھوی میں نے جتنی ہدایات دی ہیں ان پر عمل کرنا۔ ہماری زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہمیں آنے والی نسل پر ہماری خواہش قربان کر لی پڑتی ہیں۔

اور کوسیکر چلا گیا۔

مادھوی نے تمام باتیں کوولن سے کہہ دیں۔ خاص طور پر اس نے بچے کے انگوٹھے کے برابر ہونے پر زور دیا۔ اور کوولن کو بتایا کہ بچے کو غذا۔ اور ہوا کس طرح ملتی ہے۔ کوولن کو خود ان باتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔

کناکی کے ساتھ اتنے عرصے رہنے کے بعد اسے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ آج باپ بننے کے خیال سے اس کو خود پر فخر ہو رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوسیکر کی تمام ہدایات پر عمل کریگا جب تک وہ باتیں کرتے رہے ان کا موضوع اکثر بچہ ہی تھا۔

چھ ماہ بعد بچہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا مادھوی نے کوولن کو بچے کے دل کی دھڑکنیں سنائیں۔ جو اس وقت اس کے جسم کا ایک حصہ تھا۔ اور کوولن کو بچے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ ہر وقت اس بچے کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کرتا رہتا تھا۔

یہ دنیا کتنی پراسرار ہے۔ کوولن نے کہا۔ دیکھو یہ بچہ کس طرح حرکت کر رہا ہے۔

مادھوی دن رات بچے کی ان حرکتوں کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔

جوں جوں دن گذر رہے تھے۔ کوولن کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ بچہ جلد از جلد اس دنیا میں آ جائے۔

اسی دوران میں اس نے اپنی آدھی سے زیادہ جائداد مادھوی اور بچے کے نام کر دی تھی۔ گھر کا کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جسے اس نے بیش بہا تحفے نہ دیے ہوں۔ مندروں میں بار بار اس نے دعائیں مانگیں کہ مادھوی محفوظ رہے۔ اس نے غریبوں اور ضرورت مندوں کو بے انتہا خیرات دی۔ کوسیکر کی کوئی ہدایت ایسی نہ تھی جس پر اس نے سختی سے عمل نہ کیا ہو۔ بلکہ اس سختی سے تو مادھوی بھی اکتا گئی تھی۔

کوولن اپنی خواہشات سے زیادہ مادھوی اور بچے کا خیال تھا۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا کوولن صاحب کو بے انتہا انتظار تھا شہر کی ماہر نرسوں کو بلایا گیا۔ تمام گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کوولن دن بھر کمرے کے باہر بیٹھا رہتا۔ ممکن ہے کسی چیز کی ضرورت

پڑے۔ بیچارے کو پورے دو دن بے حس و حرکت کمرے کے باہر پڑا رہنا پڑا۔

اچانک بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ نرسوں نے بچے کو نہلایا اور بچہ پہلے سے بھی زیادہ رونے لگا۔ نہلانے کے بعد بچے کو ایک خوبصورت کپڑے میں لپیٹ کر باپ کو دکھایا گیا۔ کتنا خوبصورت تھا بچہ! تمام نرسیں بچے کو پیار کر رہی تھیں۔ ماں اور باپ تو خوشی سے دیوانے ہوتے جا رہے تھے۔

اس نو وارد کی خوشی میں باپ نے برہمنوں رشتہ داروں اور غریبوں کو کھانے پینے کا بے انتہا سامان اور بے شمار سونا تقسیم کیا۔

اس خوبصورت لڑکی کا نام کیا رکھا جائے۔ کودلن نے مینی میکھلائی تجویز کیا۔ اس نام کے پیچھے ایک کہانی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ کودلن کے آباؤ اجداد میں سے ایک صاحب پانی کے جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ اچانک جہاز ٹوٹ گیا۔ دو دن تک وہ پانی پر ایک تختے کے سہارے تیرتے رہے۔ آخر مینی میکھلائی دیوی کی مدد سے وہ ساحل پر پہنچے۔ اس وقت بھی کودلن کا خیال تھا کہ مینی میکھلائی دیوی نے اس کی مدد کی ہے۔ اور دو دن کے بعد اس ننھی سی بچی کو مصیبت سے نجات دلائی۔

چھ دن گذر گئے۔ اور کودلن دنیا کی ہر شے سے بے خبر مینی میکھلائی میں کھویا رہا۔ مگر ساتویں دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بچے کے سینے پر ایک سرخ رنگ کا داغ دکھائی دیا۔ جو پہلے نہیں تھا۔ کودلن اور مادھوی بڑی بے قراری سے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

رات اندھیری تھی۔ کودلن کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے مخاطب ہے۔

میں مینی میکھلائی دیوی ہوں۔ تم نے اس بچے کا نام میرے نام پر رکھا ہے۔ اس لئے اسے میری طرح نیک اور مقدس ہونا چاہیئے۔ اسے کنا کی کے پاس لے جاؤ۔ اگر بچے کو اپنی گود میں لیکر پیار کریگی۔ تو بچہ ہر خطرے سے دور ہو جائے گا۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آواز بند ہو گئی۔

ورنہ ۔ ورنہ کیا ہوگا۔ کودلن کا ذہنی توازن خراب ہوتا جا رہا تھا۔

کیا کودلن اس بچے کو گود میں لے لیگی۔ اپنی دشمن کے بچے کو۔ مگر وہ ایک نیک اور شریف عورت ہے۔ کودلن کو خیال آیا۔ اس نے فوراً ایک آدمی کو کنا کی کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ کنا کی کو سب کچھ بتا دے۔

کنا کی خاموش کھڑی سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی خادماؤں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ آخر ہے تو اس کی دشمن کا بچہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر بچہ کو گود میں لے بھی تو اس شرط پر کہ کودلن مادھوی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر گھر واپس آ جائے گا۔

کنا کی سب کچھ سنتی رہی۔

کیا تم لوگ مجھے اتنا ذلیل سمجھتی ہو کہ میں ایک بچے کی جان بچانے کیلئے اس قسم کی شرائط پیش کروں گی۔ اگر میرے شوہر کو واپس آنا ہے تو وہ اپنی مرضی سے آجائیں گے۔ جاؤ بچے کو لے آؤ۔ وہ آدھا میرا ہے۔ میرے آقا میرے مالک کا خون اس کی رگوں میں ہے۔ مجھے اس بچے سے محبت ہے۔ کاش میرے آقا مجھے اجازت دے دیں کہ میں اس بچے کو اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ بچہ میرے لئے دنیا کا سب سے اچھا تحفہ ہے۔

کودلن نے بچہ بھیج دیا۔

کنا کی اس کی خوبصورتی دیکھ کر متحیر ہو گئی۔ اس نے بچہ کو بڑی محبت سے اپنی گود میں لے لیا اور اس کے پھول جیسے رخساروں کو بوسہ دیا۔

بچہ کنا کی کی گود میں ہمک رہا تھا۔

دیکھو۔ کیسا خوش ہے یہ بچہ۔ تم کیسے کہتی ہو کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے؟ اس کے خد و خال تو دیکھو۔ بالکل میرے آقا جیسے۔

واقعی بچہ تو بہت خوبصورت ہے۔ ایک خادمہ نے کہا۔ مگر ذرا جانتی ہو کہ اس بچہ کا مستقبل کیا ہوگا؟

میں جانتی ہوں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بچہ دنیا والوں کیلئے ایک نعمت ہوگا۔ اس کی پاکیزگی اور تقدس دنیا کے لئے روشنی بن جائے گا۔

کنا کی کی باتوں نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔

بچہ واپس کر دیا گیا۔ چلتے ہوئے کنا کی نے کودلن کو یہ پیغام بھی بھیج دیا۔ اگر ممکن ہو تو اس بچے کو دن میں ایک دفعہ ضرور بھیج دیا کرنا۔

مینی سیکھلائی اسی دن تندرست ہوگئی۔ جب مادھوی اور چتراتی نے پوری داستان سُنی تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب بچے کو کبھی کنا کی کے پاس نہیں بھیجا جائے گا۔

ان کا خیال تھا کہ اگر بچے کی پرورش کنا کی کے گھر میں ہوئی تو ان کا بڑا سخت نقصان ہوگا۔ اس بچے کو ان کے فن کا وارث ہونا ہے۔ ایک ماہر رقاصہ بننا ہے۔ اسے بڑا ہوکر شہزادوں کے دل پر فتح پانی ہے۔ اگر کنا کی کا اس پر اثر ہوگیا تو یہ بھی ایک ایسا خوبصورت پھول بن کر رہ جائے گی۔ جو گھروں میں کھلتے ہیں۔ اور دنیا کو اپنی خوبصورتی دکھلائے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔

کنا کی نے ایک دو دفعہ بچے کو منگایا بھی۔ مگر ان لوگوں نے صفائی سے انکار کردیا۔

کنا کی اس انکار سے اداس ہوگئی۔ مگر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔ آخر میرا اپنا بچہ تو ہے نہیں۔ میرا اس پر حق ہی کیا ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ ورنہ خدا ان تین سالوں میں مجھے بھی ایک خوبصورت بچہ دے سکتا تھا۔ اب میری زندگی اس پودے کی طرح ہے جو ایک اجاڑ اور ویران گھر میں ہو جس کے مقدر میں سوائے تنہائی کے کچھ نہ ہو۔ انسان کا دل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذہنی اور حد تو یہ ہے روحانی تسکین کیلئے بھی دنیا کے دوسرے لوگوں اور چیزوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے کتنی پُراسرار ہے یہ دنیا؟ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ میری ہی وجہ سے مادھوی اور کوولن میں یہ تعلقات پیدا ہوئے اور میں ان دونوں کے تعلقات کے غم میں سلگتی رہی۔ اور آج مجھے ہی ان دونوں کے بچے کو دیکھنے کی اتنی تمنا ہے۔ کاش یہ میرا اپنا بچہ ہوتا۔

قسمت کے مذاق بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ مادھوی نے مجھ سے میرے آقا کو چھین لیا۔ اور اب میرے آقا کے بچے کو بھی دیکھنے نہیں دیتی۔ اے خدا اس بچے پر اپنا کرم کیجئو۔ اسے ایک شمع بنائیو کہ اس کی روشنی تمام دنیا میں اُجالا ہوجائے۔

پانچواں باب

کنا کی کی زندگی آلام و مصائب کی نذر ہوگئی۔ اس کا غم اور مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ کوولن ہی تو اس کا سب کچھ تھا۔ اس کا شوہر۔ اس کا آقا۔ اس کا مالک۔ اس کا تو سب کچھ کوولن ہی تھا۔ اب اس کی زندگی میں تھا ہی کیا؟

کوولن۔ مادھوی اور بچے میں اس طرح گم ہوا کہ اسے دنیا کی پرواہ نہ رہی۔ اسے بھول کر بھی کنا کی کا خیال نہ آیا۔ اس نے مینی میکھلائی کو بلایا تھا۔ مگر اتنے عرصہ بیت چکا تھا۔ انہوں نے کبھی بچے کو نہ بھیجا۔ البتہ کوولن روپے منگانے کیلئے اکثر آدمی بھیجتا رہا۔

کنا کی غم میں سلگتی رہی۔ اس کے پھول جیسے رخساروں میں خون کا نام بھی نہ رہا۔ اب اس کے چہرے پر کبھی مسرت کی لہریں نہ دوڑتیں اس کی زندگی کو خزاں نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ بہاروں کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھی۔

اکثر مہمان آتے۔ مگر نہ جانے اسے کیا ہوگیا کہ وہ ان کی تواضع بھی نہ کرپاتی۔ کرتی بھی کیسے؟ قسمت نے زندگی کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی تھیں۔

ایک دن وہ بہت اداس تھی۔

جانے مجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ محبت اور نا امیدیاں مجھے ختم کردیں گی۔ اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔

مالکہ اس غم نے آپ کی کمر دوہری کردی ہے۔ ملازمہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کیا کروں۔ اس غم پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ مگر جتنا ضبط کرتی ہوں اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔ میں بے بس ہوں۔ تم سے اپنا غم نہیں چھپا سکتی۔ لیکن میں ان مصیبتوں کا ذکر اپنے آقا سے نہیں کرسکتی۔ ایک وفا شعار بیوی کبھی بھی اپنے شوہر سے اس کی بے اعتنائی کی شکایت نہیں کرسکتی۔ میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اپنی مصیبتوں کا ذکر والدین سے بھی کروں۔ اور فائدہ بھی کیا۔ ہم اپنے مصائب کی وجہ سے دوسروں کو کیوں پریشان کریں۔

کنا کی نے ہمیشہ صبر و استقلال سے کام لیا۔ اس نے کوولن کو کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی خادمہ کو اپنی مالکہ کی حالت دیکھ کر اتنی جرأت ہوگئی تھی کہ وہ کبھی کبھی کوولن کو برا بھلا کہہ دیتی۔

ایسی عقل، ایسے فن، دولت اور خوبصورتی سے کیا فائدہ جب انسان اپنے ان عزیز دل کو بھول جائے جو اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہوں۔ جو ہر حالت میں اس کے لئے دست بدعا ہوں

کیا یہ فن اور یہ دولت شیر کی خوبصورت کھال اور دانتوں کی طرح نہیں ہے۔ جو آپ جیسی معصوم کو موت کا شکار کردیتی ہیں۔ آج خادمہ کو دلن پر بہت غصہ آرہا تھا۔

اچھا خاموش رہو۔ کناکی نے کہا۔ انھیں کچھ مت کہو۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔

لیکن میری مالکہ آپ برباد ہوتی جارہی ہیں صرف ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے۔ خادمہ نے کہا۔

نہیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ میں نے یقیناً پچھلے جنم میں کچھ ایسے ہی گناہ کئے تھے۔ جن کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ اور جن کی وجہ سے مجھے دنیا کی تمام خوشیوں سے محروم کردیا گیا ہے۔ کناکی نے کہا۔ پھر میں اپنی بدنصیبی کیلئے اپنے آقا کو کیوں الزام دوں۔ میرے دل میں ان کی محبت بدستور ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ بلکہ یہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ وہ اگر مادھوی سے محبت کرتے ہیں تو کیا ہوا۔ کنول کا پھول کیچڑ میں ہو یا صاف اور شفاف پانی پر۔۔۔۔۔ اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں نے آپ کو اکثر ان کے لئے پریشان تو دیکھا ہے۔ اگر آپ کو کسی بات کا خیال نہیں ہے تو پھر کیوں اتنی اداس رہتی ہیں۔ خادمہ نے پوچھا۔

میں کیوں پریشان ہوتی ہوں۔ صرف اس لئے کہ وہ ایک ایسی عورت سے محبت کرتے ہیں جو صرف ان کی دولت سے محبت کرتی ہے۔ اسے ان کی محبت۔ ان کی انسانی خوبیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن بھی ان کے پاس دولت ختم ہو جائے گی۔ اس کی محبت بھی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے آقا اس بازاری عورت پر کتنی دولت تباہ کرتے ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ اتنی دولت اور محبت ملنے کے باوجود ایسی عورتیں محبت کے سچے جذبات سے محروم رہتی ہیں۔

یہ تو عام بات ہے۔ مقناطیس صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سونے اور دوسری قیمتی دھاتوں کو نہیں۔ ایک رقاصہ کیلئے دولت سب کچھ ہے وہ انسان کی ذاتی خوبیوں سے کیا دلچسپی رکھ سکتی ہے۔ محبت، نیکی اور انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کے لئے بے معنی چیزیں ہیں۔

آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں۔ خادمہ نے کہا۔ مگر آپ یہ سب باتیں ہمارے آقا کو کیوں نہیں سمجھاتیں

وہ تو خود ہی اس حقیقت کو سمجھ لیں گے۔ وہ اس ہاتھی کی طرح جال میں گرفتار ہیں جو اپنی گرفتاری کو بھول کر گنے کھانے میں مشغول ہوگیا ہو۔ وقت گزرنے دو۔ ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہے۔

لیکن کون جانے یہ سب کتنے عرصے میں ہو۔ خادمہ نے کہا میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ سب ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ میری زندگی میں اس جال سے چھٹکارا پا بھی سکیں گے۔ سب قسمت کا کھیل ہے۔

میری مالکہ۔ ایک اور خادمہ بولی جو اب تک خاموشی سے سب گفتگو سن رہی تھی۔ مجھے یقین ہے یہ ڈرامہ چند سالوں میں ختم ہو جائے گا۔ جس طرح یہ دولت لٹائی جارہی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو۔ مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ خدا میرے آقا کو ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔ کناکی نے کہا۔

آپ نے مندر بھی تو جانا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی سہیلیاں آتی ہیں۔ مگر آپ پہلے کی طرح ان کی تواضع ہی نہیں کرتیں۔ آپ مصیبت میں زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اس مصیبت کے دینے والے کو دعا دے رہی ہیں۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں سکی۔ ایک خادمہ نے کہا۔

یہ تو بالکل سمجھنے والی بات ہے۔ اگر عورت میں ایک اچھی بیوی کی خوبیاں نہیں ہیں تو وہ عورت کچھ بھی نہیں ہے۔ عورت کیلئے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے پاکدامن ہو۔ تم نے تو سنا ہوگا۔ جو عورت دیوتاؤں کے بجائے اپنے شوہر کی پوجا کرتی ہے۔ اسے فطرت پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ بادلوں پر اپنا حکم چلا سکتی ہے۔

اگر یہ ٹھیک ہے تو مجھے اُمید ہے کہ ایک دن آپ ہمارے آقا کو واپس بلانے پر بھی قدرت حاصل کرلیں گی۔

مجھے بھی یہی اُمید ہے کناکی نے کہا۔

کتنا اچھا وقت ہوگا وہ جب آپ دونوں ایک بار پھر ملیں گے۔ ایک خادمہ نے کہا۔

اس میں کیا شک ہے۔ کل ساری رات میں ان کے آغوش میں رہی بگر کم بخت صبح ہو گئی۔ اور سپنا ٹوٹ گیا۔ لیکن مجھے تو

سپنا ہی یاد کر کے کتنی مسرت ہوتی ۔۔۔
اس سے زیادہ دنیا میں کون بدنصیب ہوگا ۔ جو محبت کیلئے ترستا ہو ۔ اور اس سے زیادہ کون غریب ہوگا ۔ جس کے ہاتھوں سے امید کا دامن ہی چھوٹ گیا ہو ۔ اسی لئے میں اس امید میں زندہ ہوں کہ ایک دن وہ ضرور واپس آئیں گے ۔ اس وقت ان کا دل ٹوٹا ہوا ہوگا ۔ انہیں پھر تسلی کون دے گا ۔ صرف اسی امید پر زندہ ہوں ۔ ورنہ میں کبھی کی موت کی آغوش میں پناہ لے لیتی ۔

سب خاموش ہو گئے ۔ تھوڑی دیر بعد کنا کی نے ہلکے سروں میں ایک گیت چھیڑ دیا

صرف وہ ہی میرا محبوب ہے •
میں ہمیشہ اس سے محبت کرتی رہی ہوں ۔
اسکے ساتھ زندگی کتنی خوبصورت تھی ۔
کاش وہ واپس آجائے
اور اپنے ساتھ میری خوشیاں بھی لے آئے ۔
جو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا ۔

پھر پریشان مت ہوئیے آپ کو امید تو ہے کہ وہ واپس آئیں گے ۔ ایک خادمہ نے کہا

صرف اپنے آقا ہی کا غم نہیں ہے مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میرے آقا نے مجھے اپنی کوئی نشانی نہیں دی ۔ کاش میں ان کے بچے کی ماں ہوتی ۔ اس بچے کو دیکھ کر کتنا سکون ملتا مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ اس تاریک زندگی کو کچھ تو روشنی مل جاتی ۔ بچہ دنیا کی سب بڑی نعمت ہے ۔ عالم کہا کرتے ہیں ۔ جس عورت کی گود میں لڑکا ہو ۔ اس کا رتبہ کسی دیوی سے کم نہیں ہوتا ۔

ایک باعزت گھرانا خدا کی دین ہے لیکن اس گھر میں ایک خوبصورت بچہ اس گھر کا تاج ہے ۔

بچہ ہماری سب سے بڑی دولت ہے ۔ بچے کو گود میں لیکر کیسا روحانی سکون ملتا ہے ۔ بنسری کی آواز کتنی دلکش ہوتی ہے مگر بچہ کی آواز اس سے بھی زیادہ شیریں ہوتی ہے ۔

مگر میں کیسی بدنصیب ہوں ۔ مجھے خدا نے کوئی بچہ نہیں دیا ۔ ان کے بچے کو صرف ایک نظر دیکھا تھا ۔ الیسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی تصویر دیکھ رہی ہوں ۔۔۔ اب زندگی میں سوائے ان کی محبت اور کچھ نہیں ہے ۔

میں تو آپ سے چھوٹی کہوں گی ۔ ایسے ظالم سے محبت کرنا بے کار ہے ۔ ایک خادمہ نے کہا ۔

ایسا مت کہو ۔ زندگی محبت کا دوسرا نام ہے ۔ محبت کے بغیر انسان گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہے جسے کھال کی ایک تھیلی سے بھر دیا گیا ہو ۔ جو لوگ محبت نہیں کرتے وہ اس دنیا میں صرف اپنے لئے رہتے ہیں ۔ اور جو لوگ محبت کرتے ہیں ان کا سب کچھ دوسروں کے لئے ہوتا ہے ۔۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ انسان صرف ایسے لوگوں سے محبت کرے جو محبت کا جواب دیتے ہیں ۔ اس طرح محبت جیسی نایاب شے ایک معمولی سی چیز بن کر رہ جائے گی ۔ جو بازاروں میں کوڑیوں کے دام بکتی ہے ۔

جس نے اپنے دل سے محبت نکال پھینکی ۔ اسے زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکتا ۔ وہ کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ۔

مہینے گذرتے رہے ۔ کوولن کے بھیجے ہوئے آدمی پہلے سے بھی زیادہ آنے لگے ۔ روپیہ اور بھی تیزی سے خرچ کیا جانے لگا ۔

کنا کی تھوڑا تھوڑا کر کے ساری دولت دیتی رہی ۔ کوولن کی اپنی پوری دولت ختم ہو گئی ۔ لیکن کنا کی نے روپیہ دینا بند نہ کیا ۔ اسے بھی تو اپنے میکے سے بہت کچھ ملا تھا ۔ اس نے وہ روپیہ بھی دینا شروع کر دیا ۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام قیمتی جواہرات بیچنے شروع کر دئے ۔

مینی میکھلائی کی پیدائش کو تین سال بیت چکے تھے ۔ کنا کی کے پاس روپیہ تقریباً ختم ہو چکا تھا ۔ کفایت کے خیال سے اس نے خادماؤں کو الگ کر دیا ۔ خادمائیں اس کی خدمت مفت کرنے کیلئے تیار تھیں مگر وہ نہ مانی ۔

تم لوگ میری وجہ سے کیوں تکلیف اٹھاؤ ۔ جاؤ خدا تمہاری حفاظت کرے گا ۔

نہیں یہ تکلیف نہیں ہے ۔ ایک خادمہ نے کہا ۔ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ کی خدمت کریں ۔ ہم نے آپ کے ہاں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا ۔ بہت دولت حاصل کی ہے اور اب اگر بغیر مزدوری کے تھوڑا سا کام کر دیں گے تو کیا حرج ہے ۔ کنا کی اس پیشکش پر قطعی راضی نہ ہوئی ۔ اور ان کو بھیج دیا ۔

انہوں نے چلتے ہوئے کنا کی سے درخواست کی کہ دن میں ایک دفعہ تو انھیں آنے کی اجازت دیجائے۔ مگر کنا کی نے صاف انکار کردیا۔

میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں تم لوگ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ میری مصیبت دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوگی۔ اور میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ کنا کی نے کہا۔ اس لئے جب تک تم لوگ یہ نہ سن لو کہ میرے آقا واپس آگئے ہیں ہرگز نہ آنا۔

خادماؤں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اب وہ جانے پر مجبور تھیں۔

اب کنا کی بالکل تنہا رہتی تھی۔ اس کے جسم پر پُرانی اور پھٹی ہوئی ساڑی ہوتی۔ زیورات میں سوائے چوڑیوں اور پائل کے سب کچھ بک چکا تھا۔ وہ خود سارے گھر کا کام کرتی خود ہی کھانا پکاتی۔

اتنے سادہ کپڑے اور اتنا معمولی کھانا صرف اس لئے کھاتی کہ وہ اپنے آقا کا انتظار کر رہی تھی۔ اب بھی وہ کوولن کی مالی ضروریات پوری کرتی رہتی۔

دس سال اور بیت گئے۔ اداس بغم زدہ۔ یہ دس سال صدیوں سے کم نہیں تھے۔ مگر کوولن اب بھی واپس نہ آیا۔

کچھ دن سے وہ سُن رہی تھی کہ چترا پتی اور اس کی خادمائیں کوولن کی بے عزتی کرتی ہیں۔ مگر وہ بے چاری کرتی بھی کیا۔ صرف خدا سے دعا کرسکتی تھی کہ اس کے شوہر کی عزت برقرار رہے۔

کوولن شاید اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب خود مادھوی بھی اس کی بے عزتی کرے۔ اتنے طویل عرصے تک وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر اب نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا اس کی اُمید کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا۔ اسے یقین سا ہو رہا تھا جیسے اب کوولن کبھی واپس نہ آسکے گا۔

چھٹا باب

مادھوی کے ساتھ ابتدائی سالوں میں تو کوولن مادھوی کو بیش قیمت تحائف دیتا رہا اور ان تحائف کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔ بیش قیمت ریشمی ساڑھیاں۔ موتی جواہرات اس کے لئے تلاش کرکے لائے جاتے۔ طرح طرح کی شربتیں اور پھل اس کے لئے فراہم کئے جاتے۔ جبکہ غریب۔ مصیبت کی ماری کنا کی تنہا مصیبت میں گرفتار زندگی کے خارزاروں سے گذر رہی تھی۔ کنا کی کی زندگی کا مقصد صرف اپنے شوہر کے لئے خدا سے دعا مانگنا تھا۔

دس سال بعد کوولن کو تحائف کا یہ سلسلہ ذرا ہلکا کرنا پڑا۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا کہ وہ مادھوی کے ہاں خالی ہاتھ جاتا تو وہ چترا پتی کو گھر کے باہر دیکھتا۔ جو اسے باہر ہی سے بتا تی کہ مادھوی کو کل کے رقص کیلئے کن کن ساڑھیوں اور جواہرات کی ضرورت ہے وہ بے چارہ اپنے گھر واپس جاتا اسی گھر میں جہاں دس سال سے تنہا رہ رہا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کا انتظام کرکے لاتا۔

تم نے ان چیزوں کی فرمائش کل کیوں نہیں کی۔ کوولن مادھوی سے پوچھتا۔

میں کیسے فرمائش کرتی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ محبت اور کاروبار کو دو مختلف چیزیں سمجھتی ہوں۔

کوولن خوشی سے جھوم اٹھتا۔ پھر مادھوی اسے اپنے سینے سے لگالیتی۔ میرے آقا۔ میرے شوہر۔ . . . . پھر کچھ دیر رُک کر وہ کہتی۔ مگر دنیا میں صرف کنا کی کو یہ الفاظ کہنے کا حق ہے۔ مجھے یہ حق نہیں ہے۔

پاگل مت بنو۔ تم میری سب کچھ ہو۔ کنا کی تو صرف بھولا ہوا افسانہ ہے۔

مگر اب تو کوولن کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے اس کی تمام جمع کی ہوئی دولت ختم ہو چکی تھی۔ اور اب دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ایک پیسہ بھی قرض دے سکتا۔ اس لئے تحفے دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

وہ کچھ دن سے محسوس کر رہا تھا کہ اب چترا پتی اور خادمہ اس کی پہلی سی عزت نہیں کرتیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے بے عزت کر دیتی تھیں۔ اور اب تو وہ مادھوی کے چہرے پر اسی قسم کے اثرات دیکھ رہا تھا۔

چترا پتی کچھ دن سے مادھوی کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ

کوولن سے نجات پالے جو ایک مصیبت بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کسی اور دولت مند سوداگر کی باری تھی۔

موتی کا خوبصورت ہار صرف خوبصورت گردنوں کیلئے ہوتا ہے۔ یہی حال رقاصہ کا ہے۔ اس کی زندگی فقیروں کے لئے نہیں، دولت مندوں کے لئے ہوتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

ماں۔ دیکھو تو اس نے ہمیں کیا کیا دیا ہے۔ ہمارے پاس جتنی بھی دولت ہے اسی کی دی ہوئی ہے۔ اس نے تمام جائیداد ہمارے نام کر دی ہے۔ ہمارے پاس اس سے پہلے تھا کیا۔ اور اس سب سے بڑھکر تو یہ بات ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اور مینی میکھلائی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے میں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔

تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ایمانداری سے پیش آرہا ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں نے سنا ہے اس نے بہت سی دولت اپنے دوستوں اور خود کنا کی سے بھی چھپا رکھی ہے۔ وہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس سب کے علاوہ وہ سختی سے مخالفت کر رہا ہے کہ ہم مینی میکھلائی کو اپنے آبائی پیشہ پر نہ لگائیں۔ ذرا سوچو تو اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو کیا ہوگا؟

چترا پتی اور مادھوی کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہیگا۔ شاہی رقاصہ کے خاندان کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔

ماں کچھ بھی ہو۔ میں کوولن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی میں اس غم سے مر جاؤں گی۔

تم نہیں مرو گی۔۔ میری بیٹی۔ کناکی تو گھر کی شریف بہو ہے۔ وہ تک نہ مری۔۔۔۔۔ ایک ہفتہ اس کے بغیر رہ کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم پھر زندگی بھر کے لئے اس سے نجات پالوگی۔

اچھا اگر فرض کرو ایک ہفتہ بعد تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی کیا مجھے اس کے ساتھ زندگی بھر رہنے کی اجازت ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس طرح ماں کے دباؤ سے نجات مل جائے گی۔ اور وہ اس ایک ہفتہ میں خود اپنی محبت کا بھی امتحان کر سکے گی۔ ایک دفعہ کوولن سو رہا تھا۔ وہ خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

کتنی خوبصورت ہے میری بیوی۔ چاند کی طرح۔ مگر میں اسے چھوڑ کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔

کوولن کے یہ الفاظ مادھوی کو یاد آرہے تھے۔

چترا پتی مادھوی کو یہی مشورہ دیتی رہی کہ وہ اپنے کسی اور عاشق کی تلاش کرے۔

قطعی نہیں۔۔۔۔ اتنا تو ظلم نہ کرو۔ اگر جانور کا ساتھی مرتا ہے تو دوسرے کو ساتھی بنانے میں وہ بھی کچھ دیر لگاتے ہیں۔

رقاصہ ایسا نہیں کر سکتی۔ چترا پتی نے کہا۔

اس کا مطلب ہے تم لوگ کتنے ذلیل ہوگئے ہیں۔ مادھوی نے غصّہ سے کہا۔

ایسی باتیں مینی میکھلائی بہت کرتی ہے۔ چترا پتی نے کہا۔

اس میں کیا بات ہے۔ وہ میری ہی تو لڑکی ہے۔

تمہارا کوولن سے کوئی محبت کا رشتہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا آدمی بھی اس ہار کو خرید سکتا تھا۔ آج کوولن کی جگہ وہ آدمی ہوتا۔

نہیں۔ مجھے ہار بیچتے وقت پورا یقین تھا کہ کوولن ہر قیمت پر ہار خریدے گا۔ اور ایسے بھی ایک شخص کو اس لئے تو معاف کیا جاسکتا ہے کہ اس نے سورج نکلنے سے پہلے چراغ جلایا لیکن اگر کوئی سورج نکلنے کے بعد چراغ جلائے تو کیا اسے معاف کیا جاسکتا ہے؟

ہمیں اس معاملے میں بحث نہیں کرنی چاہیئے چترا پتی نے کہا۔ یہ تو صرف ایک ہفتہ کا وقفہ ہے۔ ایک مناسب عاشق کی تلاش کیلئے کافی عرصہ چاہیئے۔ اور کھیتی کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ کھیت کو بالکل صاف کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ کس چیز کی کھیتی کی جائے۔ تو اب تم اندرا کے تہوار کے آخری دن سے کوولن سے نجات پالو۔

لیکن ماں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اس سے کس طرح کہوں گی کہ چونکہ تم غریب ہوگئے یا تمہارے پاس چھپی ہوئی دولت ہے۔ اس لئے میں تم سے نہیں مل سکتی۔

مجھ پر اس کے دیئے ہوئے تحائف کا کتنا بڑا احسان ہے۔ ذرا سوچو۔۔۔۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔

اس سے چھٹکارا پانا تو بہت آسان کام ہے۔ چترا پتی نے کہا۔ میں جانتی ہوں وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا خیال ہے

نہ اس کی ذات سے نہیں اس کی دولت سے محبت کرتی ہو۔

لیکن میں اس کی دولت سے نہیں اس کی ذات سے محبت کرتی ہوں۔ مادھوی نے کہا۔

آخر اس میں خوبی کیا ہے۔ چترا پتی نے پوچھا۔ یہ وہی شخص ہے نا جس نے تمہاری خاطر اپنی تجارت پر لات مار دی جس نے وفادار اور نیک بیوی کو ٹھکرا دیا۔ اور سب محض تمہاری وجہ سے۔

ہاں۔۔ مادھوری نے کہا۔ مگر یہ سب کچھ تو میری وجہ سے ہوا ہے۔ اس سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

اگر خود کوولن میں خرابی نہ ہوتی تو تم جیسی دس اور خوبصورت عورتیں بھی زور لگا لیتیں۔ تب بھی اس کے پاؤں کو جنبش نہ ہوتی۔ دیکھو منا کن اور مسادھون جیسے لوگ مضبوط کردار کے ہوتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو آزمایا ہے۔ تم خود بھی انھیں آزما سکتی ہو۔ اگر پتھر ایک جھٹکے میں لوٹ جائے تو پتھر کا قصور ہے آدمی کا نہیں۔

خیر چھوڑو اس ذکر کو! میں ایک ہفتہ کیلئے کوولن کو چھوڑ دوں گی۔ کم سے کم وہ کناکی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی تو کر سکے گا۔ اپنی تجارت کو پھر شروع کر سکے گا اب وہ خاص ترکیب بتایئے جس سے میں علیحدگی حاصل کروں۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب تم کوولن کے ساتھ باہر جاؤ گی تو چیلم ایک گیت گائے گی۔ (وہی گیت رقاصہ اور اس کا مفلس عاشق) وہی گیت ہے نا۔

جاؤ میرے پیارے مفلس عاشق خدا حافظ!
شاید تم ہم لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتے
ہم رقص کرنے والے لوگ ہیں۔
ہمارا دل ہمیشہ بکا ہوا رہتا ہے۔
اور جانتے ہو اس کا خریدار کون ہوتا ہے؟
جس کے پاس زیادہ سے زیادہ پیسہ ہو۔

یہ گیت سن کر مجھے یقین ہے کہ کوولن ایک لمحہ کو بھی یہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کرے گا۔

"ہاں آپ کو غلط فہمی ہے" مادھوی نے کہا۔ وہ کمبخت میری خاطر اپنی بے عزتی بھی گوارا کر لے گا۔"

"ہرگز نہیں" یہاں ایک سیکنڈ کو نہیں ٹھہرے گا وہ تو یہاں سے اس کتے کی طرح بھاگے گا جس کے پیچھے کوئی آدمی ہتھ لے کر دوڑ رہا ہو۔"

"اچھا وقت آنے پر ہم خود ہی سب کچھ دیکھ لیں گے۔" مادھوی نے کہا۔

اچھا اگر وہ نہ جائے تو تم ایک کام اور کرنا۔ اس کے سامنے وہ گیت گانا جو ایک محبوبہ سمندر کے کنارے اپنے غیر ملکی عاشق کی یاد میں گاتی ہے۔ جو ایک چاندنی رات میں تنہا اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ مگر ایک بات کا تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم یہ گانا بالکل اس انداز میں گاؤ گی کہ تصنع اور بناوٹ کا نام بھی نہ ہو۔ اور جیسے واقعی تم اپنے کھوئے ہوئے عاشق کی یاد میں تڑپ رہی ہو۔"

"خیر ٹھیک ہے۔ مت گھبراؤ میں یہ ایکٹنگ بڑی مہارت سے کروں گی۔ اور مجھے امید ہے ایک ہفتہ کی جدائی میں کوولن مر تو نہیں جائے گا۔"

اندرلے کے تہوار کا آخری دن تھا۔ تمام شہر کی سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے قیمتی ترین لباس پہنے ہوئے تھے۔ ناچتے گاتے سڑکوں سے گذر رہے تھے۔

آج صبح ہی جب کوولن کی آنکھ کھلی۔ تو آج پہلی بار اسے سخت ذہنی تکلیف ہو رہی تھی۔ آج اس کی زندگی کا پہلا دن تھا جبکہ وہ مادھوی کو تحفہ پیش کرنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ آج کا دن تو تحفہ دینے ہی کا تھا۔ لیکن وہ اپنی محبت کو کیا کرتا۔ اسے یقین تھا کہ مادھوی بھی اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ صرف اسی خیال سے اسے کچھ سکون ہو گیا۔ دوپہر کو وہ حسب معمول مادھوی کے گھر گیا تاکہ اس کے ساتھ سمندر کے ساحل پر جا سکے جہاں آج سارا شہر غسل کرنے کیلئے جمع ہوتا ہے وہ ابھی گھر میں بھی گھسنے نہ پایا تھا کہ چیلم نے اسے روک لیا۔

"کہیئے آج مادھوی کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟" کوولن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ چترا پتی کی آواز نے اس کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دئے۔ "آج کا دن تو تحفے دینے کا ہے اور آج تم اس لئے آئے ہو کہ شہر کی سب سے حسین عورت کو اپنے ساتھ

ملک کے سب سے بڑے میلے میں لے جاؤ گے۔ آج وہ اس میلے میں کیا پرانے کپڑوں سے جائے گی؟ کودلن کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ اگر مادھوی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یقیناً اتنی بے عزتی برداشت نہ کرسکتا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے مادھوی کے کمرے میں چلا گیا اسے حیرت ہوئی کہ مادھوی نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے تھے۔

"مجھے معاف کردو مادھوی میں آج تمہارے لئے ساڑھی نہیں لا سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" مادھوی نے آج غیر معمولی طور پر سرد مہری سے جواب دیا۔

"آپ دوسرے کمرے میں میرا انتظار کیجئے میں ذرا کپڑے بدل لوں۔" مادھوی کے کمرے میں خوبصورت ساڑھیاں اور بیش بہا زیورات بکھرے پڑے تھے لیکن یہ سب چیزیں وہ تھیں جو دوسرے لوگوں نے اسے دی تھیں۔ کودلن نے اسے لاکھوں روپوں کے تحفے دئے تھے۔ لیکن یہاں ان میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ یہ آج پہلا اتفاق تھا کہ کودلن سے دوسرے کمرے میں بیٹھنے کیلئے کہا گیا تھا۔ ورنہ ہمیشہ مادھوی اس کی موجودگی ہی میں لباس تبدیل کرتی تھی۔ یہ سب کچھ چترا پتی کے حکم سے ہوا تھا۔ اور کودلن کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ برابر کمرے میں منہ لٹکائے مادھوی کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اسے شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسکا ذہن پچھلے دس سال کی زندگی کے اوراق الٹ رہا تھا۔ کتنے عجیب تھے وہ دن۔ اسے وہ لمحات یاد آرہے تھے جب مادھوی اس کے سینہ سے لگ کر کہا کرتی تھی۔ "میرے آقا دنیا میں میرے لئے تمہیں سب کچھ ہو۔"

آج کودلن پہلی بار یہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ شاعر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ دولت مند لوگ ہی شریف تعلیم یافتہ نیک پارسا، مہذب اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہر چیز کا انحصار دولت پر ہے۔

"میں کتنا بے وقوف رہا ہوں اس زندگی میں میں نے کبھی اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔" وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چیلم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے مجروح جذبات پر ایک اور ٹھیس لگائی۔

"آج آپ کا میلے کا لباس کہاں ہے شاید آپ وہ قیمتی جواہرات پہننا بھی بھول گئے۔ اس لباس میں میری ملکہ آپ کے ساتھ کیسے جاسکیں گی؟" اب انتہا ہو چکی تھی لیکن کودلن اس بے عزتی کو برداشت کرنے پر بھی مجبور تھا۔

"مادھوی کو اس کا کوئی خیال نہیں وہ میرے کپڑوں سے نہیں میری ذات سے محبت کرتی ہے۔"

چیلم زور سے ہنس پڑی۔

واقعی! اس نے کودلن کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کو اور ہوا دیدی۔ اسی لمحہ چترا پتی بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ انتظار کرتے ہوئے تھک گئے ہوں گے۔ کوئی گانا ہی سناؤ انہیں۔" چترا پتی نے کہا۔

چیلم نے پروگرام کے مطابق وہ گانا سنایا۔ اس گیت کے پردے میں جو کچھ مفلس عاشق سے کہا گیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ کودلن کے دل پر تیر کی طرح لگ رہا تھا۔ چترا پتی اور چیلم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ کودلن اس ذہنی تکلیف سے تلملا رہا ہے چیلم زور سے ہنسی۔ "کیا پرانا گیت مزیدار نہیں ہے؟"

"ہاں مزیدار بھی ہے اور حقیقت بھی؟" ابھی یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ مادھوی کمرے میں داخل ہوئی اور وہ دونوں چلی گئیں۔

ساتواں باب

مادھوی بہت ہی حسین لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ریشمی بالوں کو بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا۔ بیش قیمت ساڑھی اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس کی خوبصورت گردن میں ایک موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ ناک میں جگمگاتے ہوئے ہیرے کی تنمنہ تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی خوبصورت چوڑیاں — انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں۔ کانوں میں ہیرے کی بالیاں تھیں۔ کمر کے گرد موتیوں اور سونے کی پیٹی تھی اور پیروں میں سونے کی پائل تھی۔ کودلن نے مادھوی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اس کی پیش کی ہوئی ایک چیز بھی اس نے نہیں پہنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ جان بوجھ کر

دوسروں کی دکھائی ہوئی چیزیں پہنی گئی ہیں۔ شرم اور روحانی کرب کی وجہ سے اس نے گردن جھکالی۔ چلتے مادھوی نے کہا میں نے ساحل پر ایک جگہ ریزرو کرائی ہے۔ ہم لوگ رات کافی دیر تک وہیں رہیں گے۔

کوولن اپنے خچر پہ بیٹھ گیا مادھوی اور وسنت مالا رتھ پر سوار ہوگئیں۔ رتھ تیزی سے ساحل کی طرف دوڑ رہا تھا اور کوولن پیچھے پیچھے اپنا خچر دوڑا رہا تھا۔ وہ شہر کے بڑے بازاروں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور آخر وہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری سمندر سے ملتا تھا۔ جو لوگ اس جگہ پر نہاتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنے محبوب سے ایک کو جدا نہ ہو سکے۔ کوولن آج اس جگہ پر نہانا چاہتا تھا تاکہ وہ مادھوی سے کبھی جدا نہ ہو سکے۔ لیکن مادھوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنے ہجوم میں نہانا کچھ اچھا نہیں لگتا اور وہ کوولن کو اس جگہ پر لے گئی جو پہلے ہی سے ریزرو کرا رکھی تھی۔ وہاں پر پہنچ کر جب وہ لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو مادھوی نے کوولن کو بانسری دیتے ہوئے کہا تو ایک گیت سناؤ۔"

کوولن نے بانسری لے لی اور ایک انتہائی درد بھرا گیت چھیڑ دیا۔ وہ گیت دریائے کیوری کی شان میں گایا گیا تھا۔ کچھ اس قسم کا تھا۔

"اے دریائے کیوری تجھ پر خدا کی سلامتی ہو۔ تو ہمارے ملک اور بادشاہ کی عزت ہے۔ تو ایک وفادار بیوی ہے جس کی محبت میں کبھی فرق نہیں آتا۔ تو کسانوں کے گیت سنتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ تو ہر سال اس تہوار کے موقع پر ہزاروں لوگوں سے اپنی تعریف سُنتا ہے۔"

گیت ختم کرنے کے بعد کوولن نے مادھوی سے گیت سنانے کو کہا۔ مادھوی نے گیت شروع کیا۔

"اے سمندروں کے خدا ہم ان عاشقوں کے دلوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو دور دراز جگہوں سے سفر کر کے اس ساحل پر آتے ہیں جن کے ہاتھ میں تحفے ہوتے ہیں۔ اور جو یہاں ریت کے گھروندے بناتے ہیں۔ لیکن ہمیں غصہ آتا ہے اور ہم اپنے گلوں سے ہار توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تو وہ لوگ ان ہاروں کے پھولوں کو سینہ سے لگا لیتے ہیں۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بیماری کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے ہم آغوش ہوں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ یہ درد تمہارا دیا ہوا ہے اس کا علاج بھی تمہیں کرو۔ اے سمندر کے خدا ہم کیا کریں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ساحل کی یہ پر لطف فضائیں اس پر چمکتا ہوا ریت۔ سمندر کی تیز موجیں آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور دل کو لبھانے والی مست ہوائیں ان سب چیزوں نے ان کے خلاف سازش کی ہے۔ ان کو بیمار ڈالا ہے وہ ہم سے التجا کرتے ہیں اپنی ان خوبصورت آنکھوں سے ہم پر ظلم نہ کرو۔ اور اس کا علاج کرو۔"

گیت ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اور مادھوی نے پھر ایک گیت اور چھیڑ دیا۔

"اے سمندر کے دیوتا لوگ ہمارے پاس موتی لیکر آتے ہیں اور معاوضہ میں ہمارے گلابی ہونٹ مانگتے ہیں۔ وہ ہم سے شادی کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کھوٹے سونے کی بالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے شراب مہیا کرتے ہیں۔ ان کی باتیں شراب سے کہیں زیادہ نشہ آور ہوتی ہیں۔ اور جب وہ ہمارے جسم کو حاصل کر لیتے ہیں تو پھر کبھی واپس نہ آنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ میرا عاشق جو ایک دفعہ مجھے اس ساحل پر ملا تھا مجھے ہنستا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اے دیوتا وہ مجھے بھول گیا ہے۔ لیکن میں اسے کیسے بھولوں۔ اے درخت کے پتو تمہیں یاد ہوگا۔ تمہارے ہی سایہ میں تو ہم دونوں ملے تھے۔ تمہیں ہماری جدائی کا کوئی افسوس نہیں۔ تمہارے چہرے پہ تو آج بھی وہی خوشی ہے۔ تم تو آج بھی خوشی سے جھوم رہے ہو۔ اف سمندر کی لہرو تم مرے درد کو کیا سمجھو گی۔ تم نے تو اپنے سینے سے اس کی کشتی کے نشان بھی مٹا دیے اے پانی میں تیرتی ہوئی بطخوں تم ہی جا کر میرے عاشق کو سمجھاؤ۔ رات کی تاریکی ہر طرف بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ لو سورج بھی ڈوب گیا۔ چاند آہستہ آہستہ آسمان پر ابھر رہا ہے چاند کی یہ روشنی مجھے دیوانہ کر دے گی۔ پرندوں نے بھی تو چہچہانا بند کر دیا۔ یہ کیا ہوا سمندر کی لہرو تم کیوں خاموش ہو گئیں۔ تم سب نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ یہی تو وہ چاند رات ہے جس میں میرا عاشق مجھ سے۔

چھا ہوا تھا۔ اور پھر وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اے سمندر کے دیوتا اس کے جھوٹے وعدے کو معاف کر دے۔ اس کے دل میں میری یاد پھر پیدا کر دے تاکہ پھر وہ مجھ تک آسکے۔"

کودلن خاموشی سے بیٹھا اس کا گانا سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا میں نے تو ایسا گیت نہیں گایا تھا جس میں کچھ معنی چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ لالچی عورت میرے سامنے ہی کسی اور کے گیت گا رہی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مجھے چھوڑ کر پھر اسے حاصل کر لے میں اب سمجھا کہ میرے خلاف اس سازش میں چترا پتی اور چیلم ہی نہیں بلکہ خود مادھوی بھی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اس نے مادھوی کے شانوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ اب گھر چلنا چاہیئے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مادھوی بدستور بیٹھی رہی۔ وہ تیزی سے اپنی گھوڑی پر چڑھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد مادھوی خاموش اور افسردہ رتھ میں آکر بیٹھ گئی اور پچھلے دس برس میں یہ پہلا دن تھا جب کہ وہ اپنے عاشق کے بغیر تہوار سے لوٹ رہی تھی۔

آٹھواں باب

کودلن شہر کی طرف تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ آج کے واقعہ نے اس کے ذہنی توازن کو کھو دیا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ آج وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا۔ آج پہلی بار اسے حماقتوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ کاش ایک رقاصہ کی خاطر وہ اپنی نیک اور وفادار بیوی کو نہ چھوڑتا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد جب وہ ایک مندر کے قریب سے گزرا تو خود بخود رک گیا وہ گھوڑے سے اترا اور مندر میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیو جی کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بھجن شروع کیا۔

"اف میں کتنا بدنصیب ہوں۔
کیا میری قسمت میں صرف سرد آہیں ہیں۔
میں دعا نہیں جانتا۔ مجھے کوئی بھجن نہیں آتا۔
شیو جی! میں بچوں کی طرح تمہارے پاس آیا ہوں۔
جو اپنی ماں کی آغوش میں سکون حاصل کرنے آتا ہے۔
مجھے عہد گذشتہ پر افسوس ہے۔
مجھے برا مت سمجھو۔ میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔
میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔
یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔
میں اس دنیا میں لذت کا شکار ہو گیا تھا۔
دیوتاؤں کے دیوتا مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔
مجھے بچا لو۔ میں ان طوفانوں میں بری طرح گھر رہا ہوں۔
میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھے بچا لو۔"

بھجن کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل ہلکا ہو گیا ہو۔ اسے واقعی بچے کی طرح سکون مل گیا۔ جیسے ہچکیاں لیتا ہوا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں آ گیا ہو۔ پوجا کے بعد وہ مندر کے صحن میں بیٹھ گیا۔ جہاں کچھ لوگ بھجن گا رہے تھے۔

ایک پنڈت جھوم جھوم کے گا رہا تھا۔

جو عورت اپنا جسم فروخت کرتی ہو۔ اسے سینے سے لگانا ایسا ہے جیسے کسی مردہ لاش کو سینے سے لگا لیا ہو۔

کتنی سچی بات ہے۔ کودلن کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

جو عورت اپنی حفاظت کرتی ہے اور جو اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اور جو اپنے وعدہ کی پکی ہوتی ہے۔ جو کسی دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ حقیقت میں وہی بیوی کہلانے کی مستحق ہے۔

ٹھیک ہے۔ کنا کی واقعی ایسی ہی عورت ہے۔ کودلن بڑبڑایا۔

ایک ہی وقت میں دو مالک تدبہ سے تعلق رکھنا۔ شراب اور گناہوں میں ڈوبنا یہ سب خدا کی لعنت ہے۔

اف میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ یا خدا مجھے معاف کر دے کودلن نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

مٹی کے برتن میں سادہ پانی اس شراب سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ جو انسان نے خود کمائی ہو۔

کودلن کی پھر ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں کتنا بد نصیب ہوں۔ میں نے بھی تو اپنی تجارت پھیلا کر بہت دولت اکٹھا کی ہے۔

پنڈت کچھ سوچے جا رہا تھا۔

اگر آدمی غریب ہو تو دنیا میں کوئی اس کا نہیں۔ اگر وہ دولت مند ہو تو دنیا کا ہر آدمی اس کا ہے۔

میری تقدیر میں بھی یہی بربادی لکھی تھی۔ کودلن اس طرح بڑبڑایا کہ پنڈت نے بھی اس کے الفاظ سن لئے۔

قسمت کو برا بھلا کہنا اپنی ناکامیوں کو چھپانا ہے۔ انسان خود ناکام ہوتا ہے۔ خود محنت سے جی چراتا ہے اور تقدیر کو برا کہتا ہے۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔

کودلن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ناکامی دور کر کے رہیگا۔ وہ اپنی بدقسمتی ختم کر دے گا۔ وہ محنت کرے گا۔

جس انسان کی بیوی نیک ہو۔ اسے اور کیا چاہیئے۔ اور جس کی بیوی بدچلن ہو اس کے پاس دنیا میں کیا ہے۔

میری بیوی نیک ہے۔ پھر مجھے اور کیا چاہیئے؟ لیکن کیا کنتا کی مجھے معاف کر دے گی۔ میں کس طرح اس سے معافی مانگوں گا معافی مانگنا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ اور پھر ان لوگوں سے جنہوں نے خواب میں بھی کسی کو معاف کرنے سے انکار نہ کیا ہو۔

کودلن خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اور مندر کے باہر آگیا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کنتا کی کے پاس جا کر معافی مانگے گا۔

وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ جہاں وہ برسوں سے تنہا رہتا تھا۔ وہاں وسنت مالا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک یاسمین کے پھولوں کا ہار تھا جس پر لال رنگ کی لاکھ سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً یہ مادھوی کا پیغام تھا جو اس نے کودلن کے نام بھیجا تھا۔ پیغام کی عبارت یہ تھی۔

"موسم بہار دو محبت بھرے دلوں کو یکجا کرتا ہے اور یہی موسم بہار انہیں جدا بھی کر دیتا ہے۔ پھر اگر ایک محبت بھرا دل کوئی غلطی کر بیٹھے۔ تو کیا اس کی سزا یہی ہے کہ دوسرا انسان غصہ میں ناراض ہو کر چلا جائے۔ چاند کی حسین کرنیں ہی اس درد بھرے دل کو سزا دینے کیلئے کیا کم ہیں۔"

وسنت مالا ہار سامنے لئے ہوئے کھڑی تھی اور کودلن وہ پیغام پڑھ رہا تھا۔

"مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لے جاؤ میرے سامنے سے یہ ہار۔ مادھوی سے کہہ دینا تم ایک حسین رقاصہ ہو۔ تم اپنی آنکھوں میں دوسروں کیلئے جھوٹی محبت پیدا کر سکتی ہو۔ تمہاری آنکھیں ہر انسان کو دھوکا دے سکتی ہیں۔ تمہاری دلفریب مسکراہٹ پتھر کا جگر چیر سکتی ہے۔ پھر تمہیں میری کیا ضرورت ہے؟"

وسنت مالا خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اور اس نے کودلن کے تمام الفاظ مادھوی کے سامنے دہرا دئے۔

"تو کیا وہ نہیں آئے؟" مادھوی نے حیرت سے پوچھا۔

"خیر کوئی بات نہیں! محبت میں ایسی لڑائیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اگر وہ آج رات نہیں آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کل ضرور آجائیں گے۔ تم جاؤ آرام کرو" اور اس نے وسنت مالا کو بھیج دیا۔

وسنت مالا کے جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل غم سے بوجھل تھا۔ اس کے بستر پر بچھے ہوئے پھولوں کا حسن اور ان کی خوشبو آج اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ ساری رات وہ سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ مگر نیند تو جیسے اس سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔

اسی شام دیوندی نامی ایک عورت کنتاکی سے ملنے آئی۔ دیوندی شہر کے باہر ایک مندر کی پجارن تھی۔ اس کی زندگی بھی بڑی عجیب تھی۔ ایک برہمن عورت مالتی تھی جس کا بچہ پیدا ہوتے ہی مرگیا تھا۔ اور وہ سوکن کے لڑکے کو اپنے بچے کی طرح پالتی رہی۔ ایک دن وہ اپنی چھاتی سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ بچے کو ہچکی لگی اور وہ مرگیا۔ مالتی خوف سے لرزنے لگی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ لوگ اس پر الزام لگائیں گے۔ کہ اس نے اپنی سوکن کے بچے کو لاپرواہی کی وجہ سے مارا ہے۔ مالتی اس بچے کو سینہ سے لگائے شہر کے ایک مندر میں گئی دیوتاؤں کے قدموں پہ سر رکھا انکے آگے روئی گڑگڑائی۔ مگر کوئی بھی دیوتا اس مردہ بچے میں جان نہ ڈال سکا۔ پھر وہ تنگ آکر شہر کے باہر اس مندر میں آگئی جہاں ایک خوبصورت عورت ظاہر ہوئی۔ جسے اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لاؤ بچہ مجھے دو۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ خدا تم پر ضرور کرم کرے گا۔" وہ عورت بچے کو مرگھٹ پر لے گئی۔ مالتی اسکے پیچھے پیچھے تھی اور عورت نے اس بچے کا کریا کرم کردیا۔ مالتی کی دلدوز چیخوں سے فضا گونجنے لگی۔

"مت رو! بس مت رو!! دیکھو تمہیں اپنا زندہ بچہ مل جائے گا۔"

وہ عورت غائب ہوگئی۔ اور اس نے اس بچہ کا روپ بدل لیا۔ مالتی نے خوشی سے دیوانہ وار ہوکر بچہ کو گود میں لیا اور اس کی ماں کو واپس کردیا۔ یہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی شادی دیونندی سے کردی گئی۔ وہ کچھ دن تو دیونندی کے ساتھ رہا۔ لیکن ایک دن اس نے دیونندی کو اپنا راز بتایا اور غائب ہوگیا۔ اور اس سے کہا کہ تم شہر سے باہر اس مندر میں پوجا کرنا اور لوگوں سے کہدینا کہ تمہارا شوہر بنارس یاترا کیلئے گیا ہے۔

یہ تھی وہ دیونندی جو آج کناکی سے ملنے آئی تھی۔ وہ کناکی سے ہمیشہ متاثر رہی تھی۔ اسے کناکی کی اس بدنصیبی پر بے انتہا افسوس تھا۔ اس دن اس نے پوجا کی اور اس کے بعد دعا کی اے خدا اس کے شوہر کو واپس کردے۔

"لیکن اگر وہ واپس آ بھی گئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں گی۔ میرا دل میرا ساتھ نہیں دے رہا۔" کناکی نے کہا۔

"میں نے کل بڑا عجیب خواب دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اور کوولن ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی شہر میں گئے ہیں۔ نجانے کیا ہوا کچھ لوگوں نے کوولن پر کسی جرم کا الزام لگایا اور اسے پکڑ لیا۔ میں اس ظلم سے تڑپ اٹھی اور بادشاہ کے سامنے پہنچ گئی۔ اور پھر وہ تمام شہری اور بادشاہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔"

"میری پیاری!" دیونندی نے کہا۔ "ابھی تک تمہارے شوہر نے تمہیں بالکل نہیں چھوڑا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔ یہ سب تمہارے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ہے۔ اگر تم دریائے کیوری اور سمندر کے سنگم پر غسل کرلو تو تمہارا شوہر واپس آجائے گا۔"

"نہیں نہیں! یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ میرا دیوتا صرف میرا شوہر ہے۔ میں کسی اور کے آگے دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا پسند نہیں کرتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں ایک ایسے انعام کے لئے کسی کا احسان اٹھاؤں۔" کناکی نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیونندی واپس چلی گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کناکی اندر گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کوولن اور اس خواب کو یاد کرکے پریشان ہورہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کناکی نے دروازہ کھولا۔ کوولن سامنے کھڑا تھا۔ کناکی اس کے قدموں میں گر گئی۔ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ کوولن کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ کناکی ان برے حالوں میں ہوگی۔ اس نے کناکی کی دونوں باہیں پکڑیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم نے ہر جھوٹی بات کو سچا کرکے دکھا دیا اور مجھ کمبخت نے اپنے باپ دادا کی تمام دولت لٹا دی اور خود تمہاری بھی۔ اب میرے پاس سوائے بے عزتی کے اور ہے کیا؟" کوولن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" کناکی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ بیش قیمت پائل حاضر ہیں انہیں بیچ دیجئے۔ آپ کے پاس اتنی دولت ضرور ہوجائے گی کہ لوگ آپ کی عزت کرنے لگیں۔"

کوولن نے اپنا چہرہ کناکی کے کندھوں پر رکھ دیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ "میری جان میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں مادھوی کو چھوڑ چکا ہوں۔ میں اپنے ماضی سے دامن چھڑا کر آیا ہوں۔ میری کناکی مجھے معاف کردو۔ میں تمہاری آغوش میں پناہ لینے آیا ہوں۔ تم دھرتی ماتا ہو۔ جو ہر ایک کو معاف کردیتی ہے۔ تم اس نیک اور شریف درخت کی طرح ہو جو اس انسان کو سایہ دیتا ہے جو اس کی جڑیں کاٹتا ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رہے۔ اور روتے رہے۔

"دروازہ کھلا ہے بند کردوں۔" کوولن نے پوچھا۔

"نہیں نہیں آج تمام دنیا کو دیکھ لینے دو کہ ہم ایک بار پھر مل گئے ہیں۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ مل کر پھر زندگی کی اسی شاہراہ پر چلیں گے جہاں سے ہم جدا ہوگئے تھے۔"

"میں اس شہر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایسے شہر میں جہاں

یہاں بے عزتی کی گئی ہے۔ جہاں مجھے یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ میں ایک مفلس اور لاچار آدمی ہوں۔ میں یہاں سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں۔ میں ماوراء شہر جانا چاہتا ہوں جہاں کسی شخص کو نہیں معلوم کہ مجھے اس طرح سے بے عزت کیا گیا ہے۔ میں وہاں پھر تجارت شروع کروں گا اور جب تک معقول دولت نہ کما لوں گا واپس نہ آؤں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سرمایہ کہاں سے لاؤں۔ خیر تم فکر مت کرو۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"آپ سرمایہ کیلئے کیوں پریشان ہوتے ہیں۔" میں نے کہا تھا "آپ میرے پائل بیچ دیجئے آپ کو بہت معقول رقم مل جائے گی۔"

کودلن نے کہا "نہیں میں تجارت کیلئے تمہارے آخری جواہرات بیچنا نہیں چاہتا۔ میں کچھ اور بندوبست کر لوں گا۔"

"کیا آپ کوئی اور انتظام کر لیں گے؟ کیا آپ صرف اس لئے واپس آئے ہیں کہ مجھ پر طنز کریں میری بے بسی کا مذاق اڑائیں کیا آج دنیا میں کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جو میری نہ ہو آپ کی ہو۔ یا آپ کی ہو میری نہ ہو۔" اور کناکی پھر رونے لگی۔

"تمہیں خدا کی قسم ہے مت رو کناکی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو میں وہی کروں گا۔" کودلن نے اس کے رخساروں پہ بہتے ہوئے آنسوؤں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ماوراء جانے کی اجازت دے دو میں ایک سال میں لوٹ آؤں گا۔"

"میں آپ کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ لیکن میری پیاری تم اتنی زیادہ چلنے کی عادی بھی تو نہیں ہو۔ سفر طویل ہے۔ اور پھر راستے میں پہاڑ دریا اور جنگل بھی ہیں۔ اور ان سب سے بڑھکر جنگلی جانور اور وحشی انسان بھی ہیں۔"

"یہ خطرات میرے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ضرور چلوں گی۔" کناکی نے کہا۔

"اچھا تو پھر آج رات ہی ہم لوگ چلے جائیں گے۔ یعنی چاند نکلنے کے بعد اور سورج ڈوبنے سے پہلے تاکہ کسی کو بھی اس بات کا علم نہ ہو۔"

نواں باب

رات کی تاریکی میں کودلن اور کناکی شہر سے نکل گئے۔ وہ شہر کی تمام سڑکوں سے گذرتے ہوئے جا رہے تھے۔ جنگل و دریا پار کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔ آخر وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہوئے جہاں ایک جینی پجاری رہتا تھا اور جس کا نام کاوندی تھا۔ "اب ماوراء کتنی دور رہ گیا؟" کناکی نے پوچھا کیونکہ وہ پیدل چلنے کی بالکل عادی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔

"بس تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے۔ ہاں کوئی ستر اسی میل ہوگا۔" دونوں پجاری کے پاس گئے اور اسے نمستے کیا۔ پجاری نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔

"تم لوگ کسی شریف خاندان سے معلوم ہوتے ہو۔ اور شاید تمہیں اتنا زیادہ چلنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ پھر تم اتنا لمبا سفر کیوں طے کر رہے ہو؟"

"ہم لوگ ماوراء جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہاں اپنی قسمت آزما سکیں۔"

"لیکن اس خوبصورت لڑکی کے نازک پاؤں راستہ کے مصائب اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر میرے ان الفاظ کا تم پر اثر کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔ میں تو خود کافی عرصہ سے ماوراء جانا چاہتا تھا۔ چلو اچھا ہوا تم لوگوں کا ساتھ ہو جائے گا۔" پجاری نے کہا۔

"بڑی خوشی سے مجھے بھی اس لڑکی کی پریشانی سے تھوڑی بہت نجات مل جائے گی۔" کودلن نے جواب دیا۔

"ہمیں جانا کس راستے سے چاہیئے۔" کاوندی نے کہا۔ "اگر ہم ایک سایہ دار راستہ انتخاب کرتے ہیں تو جنگلی جانوروں کا خوف ہے اور دوسرا راستہ اس قابل نہیں ہے کہ یہ نازک سی لڑکی اسے آسانی سے طے کر سکے۔ راستہ میں طرح طرح کے جانور ملیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ خدا ہمارا محافظ ہے۔" کاوندی نے اپنا کاسہ اٹھایا گلے میں جھولا ڈالا اور ہاتھ میں مورچھل لیکر تیار ہو گیا۔ اور وہ تینوں روانہ ہو گئے۔

تینوں دریائے کیوری کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ وہ مختلف گاؤں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ دن میں تین میل سے زیادہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ کئی دن لگاتار سفر کرتے رہنے کے بعد دوسری زنگم پہنچ گئے۔ جہاں دریائے کیوری شہر میں چھپ جاتا ہے۔ تینوں ایک جین مندر میں گئے۔ جہاں بڑے پجاری نے ان کا استقبال کیا۔ کاوندی اور اس کے ساتھی پجاری کے قدموں میں گر گئے۔ اے خدا تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے کاوندی نے دعا مانگی۔

"تم تینوں کہاں جا رہے ہو؟" اس پجاری نے پوچھا۔ وہ ایک پہنچا ہوا پجاری تھا۔ جو ہر انسان کے ماضی اور مستقبل سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مادورا میں کونسی مصیبت کوولن اور کناکی کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر اس کے لئے خوشی اور غم کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس لئے اس نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی۔ صرف اتنا کہا۔ آدمی کو اپنے کئے کا پھل بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کی نصیحتیں اور کوششیں بے سود ہوتی ہیں۔ زندگی تیز اور تند طوفانوں میں ایک شمع کی طرح ہے جو آسانی سے بجھ سکتی ہے۔ کوشش کرو کہ خدا تک پہنچ سکو۔ بس یہی میری نصیحت ہے۔ کاوندی اور اس کے ساتھی ایک کشتی میں سوار ہو کر دریائے کیوری کے پار چلے گئے۔ اور پھر وہ درانم شہر میں داخل ہو گئے۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس شہر کا نام درانم کیوں رکھا گیا؟" کاوندی نے پوچھا۔

"نہیں" کوولن نے جواب دیا۔ "بتائیے یہ نام کیوں رکھا گیا۔" کوولن نے کہا۔

"بڑی عجیب کہانی ہے" پجاری نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ ایک ظالم پرندے نے یہاں ایک ہاتھی کو مار دیا تھا۔ دراصل پہلے یہ شہر ایک جنگل تھا۔ جہاں ایک بڑے درخت پر دو پرندے رہتے تھے۔ ان میں سے مادہ نے انڈے دیئے ہی تھے کہ اتفاق سے دوسرے دن ایک ہاتھی اس درخت کے نیچے سے گذرا۔ اور جلتی ہوئی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے اس درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے ہاتھی نے اس شاخ کو اپنی سونڈ میں لیکر توڑ دیا جس پر پرندے کا گھونسلہ تھا انڈے زمین پر گر کر چور چور ہو گئے۔ مادہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا جن میں ایک شہد کی مکھی اور ایک مینڈک تھا۔ ان سب نے ہاتھی کو قتل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ان میں ایک ہدہد بھی تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر تینوں نے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ شہد کی مکھی نے ہاتھی کی ایک آنکھ پر کاٹا پھر دوسری پر۔ ہاتھی بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔ ہدہد نے ہاتھی کی ایک ایک کر کے دونوں آنکھیں نکال لیں۔ ہاتھی بری طرح سے بھاگ رہا تھا کہ ایک چٹان پر مینڈک چیخا۔ ہاتھی سمجھا کہ کوئی تالاب ہے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کافی بلندی سے زمین پر آ رہا۔ جب سے اس جگہ کو درانم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے چولا بادشاہ نے اس جگہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

دسواں باب

کاوندی ایک درخت کے نیچے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ اپنا پورا دن وہاں گذارنے کے بعد وہ کوولن اور کناکی کے ساتھ مادورا کے لئے روانہ ہو گیا۔ سورج نکلنے کے بعد وہ مانا پٹم پہنچ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات ایک برہمن سے ہوئی۔

"یہاں سے پانڈیا شہر کتنی دور ہے؟" کاوندی نے سوال کیا۔ ابھی برہمن جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ کوولن نے پوچھا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں بہت سے مقامات کی یاترا کیلئے گھر سے نکلا ہوں۔ فی الحال میں مادورا سے آ رہا ہوں"

کوولن نے اس سے مادورا پوچھا۔

"میرا خیال ہے سب سے اچھا راستہ کھیتوں اور جنگلوں سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ بہتر ہے آپ اسی راستہ سے چلے جائیے۔ کاوندی اور اس کے ساتھی پھر سفر کو روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کاوندی اور کناکی بری طرح تھک گئے انھیں اس وقت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ اس لئے وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کوولن قریب ہی ایک نہر پر گیا اس نے خود پانی پیا اور ان دونوں کیلئے پانی لیکر واپس ہوا۔ ابھی تھوڑی دور ہی

چلا تھا کہ وسنت مالا اچانک اس کے سامنے آ گئی اور اس کے قدموں میں گر گئی۔ راستے میں ایک برہمن کو دلن کو بتا دیا تھا کہ کال کی دیوی تمہارے عزیز اور رشتہ داروں کا بھیس بدل کر تمہیں ستانے آئے گی۔ مگر ہوشیار رہنا۔ اس لئے کو دلن خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وسنت مالا بری طرح سے رو رہی تھی۔

"کو دلن خدا کیلئے واپس چلو۔ مادھوی کا بہت برا حال ہے۔ وہ تمہارے غم میں پاگل ہو جائے گی۔ کو دلن خدا کیلئے مان جاؤ۔ مادھوی بے ہوش پڑی ہے۔"

"پہلے اس نے مجھے ذلیل کیا اور جب میں وہاں سے چلا آیا تو وہ جھوٹے آنسو بہا رہی ہے۔" مگر اسے پھر برہمن کی نصیحتوں کا خیال آگیا۔ اور اس نے کچھ دعائیں پڑھیں۔ اور اچانک جنگل کی دیوی نے اپنا بھیس بدل کر اصلی روپ میں آگئی۔ اور کو دلن سے معافی مانگی۔ اس نے کو دلن سے وعدہ کیا کہ وہ اس واقعہ کے بارے میں کنا کی اور کاوندی سے کچھ نہیں کہے گا۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ کو دلن پانی لیکر کنا کی اور کاوندی کے پاس لوٹ آیا۔ قریب ہی کالی ماتا کا مندر تھا۔ انہوں نے سوچا کہ سفر کی تکان اتارنے کیلئے تھوڑی دیر اس مندر میں آرام کرلیں۔

جوں ہی تاریکی ہوئی مندر میں ایک لڑکی نے کالی مائی کا روپ بھر کر رقص شروع کیا۔ وہ شیر کی کھال پہنے ہوئے تھی اور اس کے سر پر بارہ سنگھے کا سر رکھا ہوا تھا۔۔۔ اور گلے میں شیر کے دانتوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ وہ رقص کر رہی تھی اور لوگ مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ یہی وہ مندر تھا جہاں وہ ہر سال کسی نہ کسی آدمی کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ غرض آدھی رات تک وہ رقص ختم ہوا اور کو دلن نے کاوندی سے کہا اگر ہم اس وقت اپنا سفر شروع کر دیں تو صبح کو سورج کی گرمی سے بچ جائیں گے۔ اور وہ تینوں پھر سفر کو روانہ ہوگئے۔

وہ برابر سفر کرتے جا رہے تھے۔ اب تو مادورا بہت قریب رہ گیا تھا۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچے جہاں برہمن رہتے تھے۔ تینوں ایک برہمن کے ہاں ٹھہر گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کو دلن گاؤں میں ٹہلنے نکل گیا۔ وہ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ اس کی نظر کوسیکر پر پڑی۔

"ارے تم کہاں؟" کو دلن نے حیرت سے پوچھا۔

"آپکو تلاش کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہوں۔" کوسیکر نے جواب دیا۔ اتنے طویل سفر کی وجہ سے بُری طرح تھکا ہوا تھا۔

"مگر مجھے تلاش کرنے کی اب کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے مادھوی نے بھیجا ہے۔ آپ کے والدین کی بہت بُری حالت ہے۔ آپ کے سب رشتہ دار پریشان ہیں۔" کوسیکر نے کہا۔

"ہوں"۔۔۔ کوسیکر نے غور سے اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔ آپ کے والد نے ہر طرف آدمی بھیج رکھے ہیں تاکہ وہ آپ کو تلاش کر کے لائیں۔

آپ کی لڑکی مینی میکھلائی کی بھی بہت بری حالت ہے اس نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے ـــــ! خدا کیلئے واپس آجائیے میں دیوتا کی طرح آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اگر میری ماں سے کوئی غلطی کی تھی تو اس کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے۔ آپ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا کیلئے واپس آجائیے۔ اب ہم سب اکٹھے رہیں گے۔ ہم کنا کی کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں۔

کو دلن خاموش کھڑا یہ پیغام سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"مینی میکھلائی خیریت سے تو ہے۔" کو دلن نے پوچھا۔

"ہاں خیریت سے ہے۔ مگر آپ کے چلے آنے سے اس معصوم کا دل ٹوٹ گیا ہے۔" کوسیکر نے جواب دیا۔ "اور مادھوری کی حالت تو بہت خراب ہے۔ میں نے زندگی بھر کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی۔ جس نے شوہر کی جدائی میں اپنی حالت ایسی کرلی ہو۔ لیجئے یہ مادھوی کا خط ہے۔" کوسیکر نے ایک خط دیتے ہوئے کہا۔

مادھوی کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ کو دلن کو یاد آ رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا۔

میری زندگی کے مالک۔ مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی تو جگہ دے دو۔ خدا را وہ باتیں بھول جاؤ جو میں نے صرف مذاق میں کہی تھیں۔ اور جن باتوں نے تم کو مجبور کر دیا تھا کہ تم مجھے اپنے والدین اور اس شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تم جنگلوں میں مارے مارے

پھر سے جو۔ اپنے ساتھ کنا کی جیسی شریف اور نیک عورت کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ۔

تمہاری بدنصیب

مادھوی

کوولن نے پورا خط پڑھا۔ وہ واقعی غلطی پر نہیں تھی یہ خط لے جاؤ۔ اور میرے والدین کو دے دینا۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ مادھوی بے قصور ہے۔ میں کسی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے مادورا میں رہ کر تجارت کرنی ہے۔ مادھوی اور مینی میکھلائی سے صرف اتنا کہہ دینا کہ میں چاہتا ہوں میری لڑکی ایک شریف عورت بنے رقاصہ نہیں۔ اچھا اب تم جاؤ۔

کوسیکر نے بہت اصرار کیا۔ مگر کوولن نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ آخر مجبور ہو کر کوسیکر واپس چلا گیا۔

کوولن کناکی کے پاس آیا۔ اور وہ تینوں پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان کے کانوں میں انتہائی شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑے بڑے نقارے بجائے جا رہے تھے۔ شیوجی کے مندر میں بھجن گائے جا رہے تھے۔ شاہی اصطبل سے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ پیدل سپاہیوں کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ دریائے ویگی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

تینوں دریا پر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھی، شیر اور گھوڑے کی شکل کی کشتیاں مسافروں کو دریا پار کرا رہی تھیں۔ یہ تینوں بھی ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے گئے۔

آخر وہ مادورا پہنچ گئے۔

آپ کناکی کے ساتھ رہیں۔ میں رہنے کیلئے کسی جگہ کا انتظام کرلاؤں کوولن نے کاوندی سے کہا۔

کوولن صدر دروازے سے شہر میں داخل ہو گیا۔ جس پر سپاہی تلواریں لئے حفاظت کیلئے کھڑے تھے۔ وہ کئی گھنٹے تک شہر میں گھومتا رہا مگر ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ آخر شام ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک باغ میں شہر کی خوبصورت رقاصائیں اپنے دولت مند عاشقوں کے ساتھ آرہی ہیں۔ چونکہ باغ میں ہر طرف قمقمے جل رہے تھے اس لئے کوولن کو یہ منظر دیکھنے میں آسانی ہوئی۔ اس نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔

بازاروں میں بہت بھیڑ تھی۔ دوکانوں پر سونا، موتی، ہیرے جواہرات اور اسی قسم کی چیزیں بھری پڑی ہوئی تھیں۔ سناروں اور ساہوکاروں کا اپنا الگ بازار تھا۔

کوولن واپس آگیا۔ اس نے شہر میں جو کچھ دیکھا تھا سب کچھ کناکی اور کاوندی کو بتایا۔

اتفاق سے اسی وقت ایک برہمن سامنے سے گذرا۔ وہ کوولن کو پہچان گیا۔

میں مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ برہمن نے کہا۔ اور آپ کو تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ آپ جیسے مشہور تاجر کو کون نہیں جانتا۔ مجھے وہ واقعہ بھی معلوم ہے جب آپ نے اپنی لڑکی کا نام مینی میکھلائی رکھا تھا۔ اور ایک دن جب آپ نے اس ضعیف برہمن کو مست ہاتھی کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ تو میں وہاں موجود تھا۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب ایک برہمن نے ایک بچے کو جان سے مار دیا تھا۔ اور پھر شرم کے مارے اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تو آپ اس برہمن کو واپس لائے تھے۔ اور اسے بہت سا انعام و اکرام بھی دیا تھا۔ حضور آپ جیسے شریف انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب جھوٹی گواہی دینے پر ایک برہمن کو قتل کیا جا رہا تھا۔ تو آپ نے خود کو اس کی جگہ پیش کیا تھا۔ اور بعد میں اس کی بیوی کو بہت سی دولت دی تھی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ملنے والی ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو کوولن نے کہا۔ میں نے بھی خواب میں دیکھا ہے کہ ایک نیچی ذات کے آدمی نے بادشاہ کے حکم سے مجھے لمبے لمبے سینگوں والے بھینسے پر بٹھا دیا ہے۔

میں بھینسے پر بیٹھا ہوا ہوں اور کناکی بُری طرح رو رہی ہے۔ اور نہ جانے کیا ہوا۔ کہ جن لوگوں نے مجھے سزا دی تھی وہ سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔

آپ لوگ بہتر ہے شہر میں رہیں۔ یہاں صرف پجاری رہتے ہیں۔

پر چھوڑ دیا
کا فیصلہ سنا کر پھر مشورہ دیا۔ اچانک کوندن کا ایک پیر پھسل گیا۔ اور کاشتکاری نے ان دونوں کو ماں باپ کے سپرد کر دیا۔

اور وہ ان دونوں کو اپنے گھر لے گئی۔

نئے گھر پہنچ کر ان دونوں نے غسل لیا۔ کوندن کی نے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد کوندن چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔

کوندن میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ پھر ایک ایسے انسان کی تقدیر میں کیا کچھ نہ ہوگا جس نے زندگی ایک مقصد کے ساتھ گزاری ہو۔ اور جس نے اپنے ضعیف والدین کی بھی خدمت کی ہو میں نے تم کو بھی تکلیف دی ہے۔ تم عمر میں چھوٹی ضرور ہو مگر عقل کے اعتبار سے تمہاری عمر بہت بڑی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو اتنے لمبے سفر کی تکلیف نہ دوں۔ مگر کر نہ سکا۔ تم میں ہمت کتنی ہے؟ اور اس سب سے بڑھ کر تم نے مجھ جیسے انسان پر بھروسہ کیا۔

میں جانتی تھی کہ آپ میں تبدیلی آگئی ہے۔ کوندی نے کہا۔

تم نے میری خاطر اپنے والدین کو، رشتہ داروں، نوکروں اور اپنے تمام آسائش کو چھوڑ دیا۔ تم نے اس صبر و استقلال سے میری کتنی ہمت بڑھائی ہے۔

میں اب تمہاری خاطر کاروبار شروع کروں گا۔

کوندن نے ایک پائل لی اور شہر میں فروخت کرنے چلا گیا۔

اس نے چلتے ہوئے لاجو کو سینے سے لگا کر بوسہ دیا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر پورا قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ تو امنڈے چلے آ رہے تھے۔

کوندن گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک بہت بڑا بیل دوسری سمت کو روانہ ہو گیا۔ کوندن کو خیال بھی نہ آیا کہ یہ برا شگون ہے۔ وہ سیدھا ساہوکاروں کے بازار چلا گیا۔ سب سے بڑا ساہوکار بازار میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور بہت سے ساہوکار رہتے۔

دیکھئے میرے پاس یہ بیش قیمت پائل ہے۔ کوندن نے ساہوکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کیا آپ اس کی قیمت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ملکہ کیلئے یہ بہت مناسب رہے گا۔

ساہوکار نے پائل بڑی غور سے دیکھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

پچھلے ہفتے ملکہ نے اسے اپنے جواہرات کا ڈبہ دیا تھا تاکہ وہ ان کی پالش کیلئے کچھ جواہرات چن لے۔ ساہوکار نے ملکہ کی نگاہ بچا کر بیش قیمت پائل چرا لی۔

دوسرے دن یہ پائل ایک ایسے مسافر کے ہاتھ بیچ دی تھی جو اسی دن کندن کے راستے دوسرے ملک جا رہا تھا۔

ملکہ کو اس چوری کا علم دو دن بعد ہوا۔ اس نے بادشاہ سے شکایت کی۔ اگرچہ ساہوکار بادشاہ کی نظر میں بے قصور تھا۔

چور کی بے انتہا تلاش کی گئی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بادشاہ کو ساہوکار پر شبہ تھا۔

ایک ہفتے میں چور کا پتہ چل جانے دو ورنہ اچھا نہ ہوگا مجھے تم پر شبہ ہے۔ ایک ہفتہ بعد میں یہ معاملہ شہر کوتوال کے سپرد کر دوں گا۔ پھر تم جانتے ہو کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ بادشاہ نے ساہوکار سے کہا۔

ساہوکار کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ وہ ہر وقت خدا سے دعا کرتا رہتا تھا کہ اے خدا اس مصیبت سے نجات دو۔

آج خدا نے اس کی سن لی تھی۔ کوندن کے ہاتھ میں پائل بالکل ویسی ہی تھی جیسی ملکہ کی کھوئی تھی۔

اس بے ایمان ساہوکار نے سوچا اس آدمی کو میں اپنے گھر بٹھا دوں اور بادشاہ کو اطلاع دے دوں کہ ان کا گم شدہ مال چور سے مل گیا ہے۔ بادشاہ اپنے سپاہی میرے ساتھ کر دے گا یہ چور اور مال پکڑا جائے گا۔ اور مجھے مصیبت سے نجات مل جائے گی۔

میرے عزیز اس پائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی خریدار صرف ملکہ ہو سکتی ہے۔ میں ابھی بادشاہ کو جا کر اطلاع کر دیتا ہوں۔ تب تک آپ میرے غریب خانے پر تشریف رکھیں۔

ساہوکار نے پائل احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ کر کوندن کو واپس کر دی اور کوندن کو اپنے گھر لے گیا۔

ساہوکار کوندن کو گھر میں بٹھا کر بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

اس کی ان نوازشوں سے کوندن بہت خوش تھا۔

اسی دن ملکہ کی بادشاہ سے اس بات پر جھڑپ ہو چکی تھی۔ کہ اتنے دن گزر گئے اور ابھی تک پائل کا چور نہیں پکڑا گیا۔ دراصل ملکہ کو یہ خوف تھا کہ بادشاہ ایک رقاصہ سے بہت دلچسپی رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ پائل اس کے پاؤں کی زینت بنا ہو۔ اس جھڑپ کے بعد بادشاہ ملکہ کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ ساہوکار بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔

حضور میں نے چور پکڑ لیا ہے۔ ساہوکار نے کہا۔

کیسے پکڑا؟ بادشاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

حضور وہ پائل لیکر میرے پاس آیا تھا۔ اور آدھی قیمت پر اسے فروخت کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہے کہاں؟

میرے گھر میں بیٹھا ہے۔ پائل بھی اس کے پاس ہے۔

بادشاہ پائل کے ملنے سے بہت خوش تھا۔ وہ ملکہ کو خوش کرنے کیلئے چور کو فوراً سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ملک کا یہ قانون بھول گیا۔ کہ باقاعدہ مقدمہ چلائے کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس نے فوراً تین سپاہیوں کو بلایا۔

ساہوکار کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم ملکہ کی پائل چور کے قبضے میں دیکھو تو اسے فوراً جان سے مار دینا۔ اور وہ پائل لے آنا۔ بادشاہ نے کہا۔ اور تم ملکہ کی پائل پہچانتے ہو نا!

جی حضور ہم پہچانتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

ساہوکار اور سپاہی محل سے روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچ کر ساہوکار نے کوولن سے کہا۔ یہ سپاہی بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہیں پائل دکھا دو۔

سپاہیوں نے پائل دیکھی۔ وہ پہچان گئے۔ یہ تو واقعی ملکہ کی پائل تھی۔

وہ سپاہی غور سے کوولن کو دیکھ رہے تھے۔

مگر یہ شخص چور نہیں معلوم ہوتا۔ ایک سپاہی نے ساہوکار کے کان میں کہا۔

تم لوگ بے وقوف ہو۔ تم چور کے بارے میں جانتے کیا ہو۔ ساہوکار نے جواب دیا۔ تم کو یقین ہے کہ یہ پائل ملکہ کی ہے؟

ہاں پائل تو ملکہ کی ہے۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

تمہیں وہ چور یاد ہے جو سنیاسی کا بھیس بدل کر آیا تھا۔ اصالت کو ہیروں کا ہار چرا کر لے گیا تھا۔ کیا تمہارا مطلب ہے وہ چور شکل سے بھی چور معلوم ہوتا؟ اس فن پر تمہیں کوئی باقاعدہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ اگر [illegible] ہو گیا تو غائب ہو جائے گا۔

ایک سپاہی آگے بڑھا۔ تلوار سے اس نے کوولن [illegible] پر وار کیا۔ کوولن زمین پر گر گیا۔ اور اس کی گردن سے [illegible] پھوٹ نکلا۔۔

سپاہی پائل لیکر واپس چلے گئے۔

بادشاہ نے پائل دیکھی۔ پائل واقعی ملکہ کی تھی۔ وہ پائل لیکر ملکہ کے پاس گیا۔ ملکہ پائل دیکھ کر خوش ہو گئی۔

تم اس کے گم ہونے کا مجھے الزام دے رہی تھیں۔ بادشاہ نے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اور پھر بادشاہ ملکہ کے کمرے سے باہر آ گیا

بارھواں باب

کوولن کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا کناکی سخت پریشان بیٹھی تھی۔ نجانے انہیں کیا ہو گیا میرا دل خوف سے لرز رہا ہے میرے آقا ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔ انہیں کیا ہوا!

مادری مندر سے واپس آئی۔ تو وہ کناکی کے پاس خاموش کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

مادری۔ کناکی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خدا کیلئے بتاؤ تو۔ میں تو اپنے آقا کیلئے پریشان بیٹھی ہوں۔ کیا ان کے بارے میں کوئی خبر دینا چاہتی ہو۔ کیا ہوا؟!

کوولن کو بادشاہ کے سپاہیوں نے جان سے مار دیا۔ مادری نے بمشکل تمام الفاظ ادا کئے۔

مگر کیوں؟

اس پر الزام تھا کہ اس نے ملکہ کی پائل چرائی ہے۔

یہ ظلم ہے۔ یہ ناانصافی ہے۔ کناکی غصہ سے سرخ ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہاں ہو میرے آقا تمہار
ہر وہ سسکتی ہوئی بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو غصے سے تمہارے
وہ کیا کیا کہنے لگی۔

کیا میں زندگی بھر اسی طرح بیوہ رہوں گی کہ میرا شوہر بادشاہ
کی ناانصافی کی نذر ہو گیا ہے؟

دھن کی پکی وقت دیر ہو کیا میں نے اتنا طویل سفر صرف
اس لئے کیا تھا کہ یہاں آکر بادشاہ کی ناانصافی کی شکار ہو کر
بیوہ ہو جاؤں؟

اسے سوچنا تو یہ چاہئیے تھا میرے آقا معصوم نہیں تھے؟ کیا
انہوں نے چوری کی تھی؟

میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس پورے شہر میں آگ لگ جائیگی۔

کناکی نے اپنی دوسری پائل اٹھائی۔ محلے کی دوسری عورتیں
اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

شریف عورتو۔ واقعی تم قابل داد ہو جو ایسے ظالم بادشاہ
کے ملک میں رہتی ہو۔ بادشاہ میرے پائل کی قیمت ادا نہیں کرسکتا
تھا اس لئے اس نے بہانہ بنا کر میرے آقا کو قتل کرا دیا تاکہ وہ پائل
حاصل کرسکے۔

اگر میں نیک عورت ہوں تو تم لوگ دیکھنا کہ میرے آقا
مرنے کے بعد بھی بولیں گے۔

کناکی مادری کے ساتھ شہر چلی گئی۔ مادری اسے سابرگور
کے گھیرے لے گئی۔ جہاں کوولن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

کناکی نے کوولن کو دیکھا۔ مگر کوولن اس کو نہ دیکھ سکتا تھا۔
سورج غروب ہوچکا تھا۔ شہر میں سناٹا تھا۔ اس لئے کناکی کے
رونے کی آواز پر تمام شہر جمع ہو گیا تھا۔ آج صبح ہی تو کناکی کوولن
کی آغوش میں تھی۔ اور آج ہی شام کو اس کی لاش خاک و خون میں
لتھڑی پڑی تھی۔

کناکی کوولن سے چمٹ گئی۔ اس نے اپنے آنسوؤں سے خون
کے دھبے دھوئے۔

کیا تمہارا خوبصورت جسم اس طرح خاک اور خون میں لتھڑنے
کیلئے تھا۔ میرے آقا۔ کچھ تو بولو۔ کیا اس شہر میں ایک بھی آدمی
کے دامن میں انصاف نہیں۔ کیا کوئی عورت اس ظلم کے خلاف آواز
نہیں اٹھا سکتی۔ کیا اس شہر میں کوئی خدا نہیں ہے۔ جو مظلوموں کو
بادشاہ کی تیز تلوار سے بچا سکے۔ میرے آقا صرف ایک دفعہ
تو بول دو۔ صرف ایک دفعہ۔۔

کوولن کو ہوش آگیا۔ میری محبوبہ کا چاند سا چہرہ میری
نظروں سے غائب ہو رہا ہے۔ کوولن نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔
کناکی نے کوولن کے پاؤں پکڑ لئے۔

میری پیاری تم کہیں مت جانا۔ بس یہیں رہنا۔ کوولن نے
پھر آہستگی سے کہا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

کیا میرے آقا واقعی بولے تھے۔ یا مجھے دھوکا ہوا تھا۔
کناکی نے سوچا۔

اے خدا میں کہاں جاؤں؟ کس سے فریاد کروں؟ اچھا پہلے
بادشاہ کے پاس جاتی ہوں۔ اسے بتاتی ہوں کہ وہ کس قدر ظالم ہے
میرے آقا کی لاش تنہا نہیں جلیگی اس کے ساتھ اس شہر کو بھی جلنا پڑیگا۔

کناکی کو وہ خواب یاد آرہا تھا۔ جو اس نے دیونندی کو سنایا
تھا۔ کتنا سچا تھا وہ خواب۔ کناکی وہاں سے کھڑی ہوگئی اور بادشاہ
کے محل کی طرف چل گئی۔

تھوڑی دیر پہلے ملکہ نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ وہ
بادشاہ کے پاس بھاگی ہوئی آئی اور اسے پورا خواب سنایا۔

میں نے خواب دیکھا ہے۔ آپ کا تاج گر گیا ہے۔ کوئی فریادی
محل کے باہر کھڑے ہوئے گھنٹے کو برابر بجائے جا رہا ہے۔ شاید آپ سے
کوئی بے انصافی ہو گئی ہے۔ ملکہ نے کہا۔

خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

ٹھیک ایسا ہی خواب آپ کے آبا و اجداد نے بھی دیکھا تھا۔
جب آپ کے خاندان کے ایک بزرگ "اگر" سمندر پر اپنا نیزہ
پھینکا تھا۔ اور سمندر کے دیوتا نے غصے میں ان کا پورا ملک نگل لیا تھا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ محل کا ایک سپاہی آیا۔

حضور ایک عورت آئی ہے۔ سپاہی نے کہا۔

کون ہے وہ عورت؟ بادشاہ نے پوچھا۔

حضور شکل سے تو وہ کوئی دیوی معلوم ہوتی ہے۔

وہ عورت کیا چاہتی ہے؟

وہ غصہ میں سرخ ہے۔ کالی ماتا کی طرح غضب ناک ہے آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

بھیج دو اندر۔ بادشاہ نے کہا

سپاہی کناکی کو بادشاہ کے سامنے لے آئے۔

تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا تمہیں؟ بادشاہ نے پوچھا۔

میں پوہر کے شہر سے آئی ہوں۔ جہاں کے بادشاہ نے ایک فاختہ کی جان بچانے کیلئے باز کو اپنے جسم کا گوشت کھلایا تھا۔ اور جہاں کے ایک بادشاہ نے اپنے عزیز بیٹے کی جان کی پرواہ نہ کی اور اسے اپنی رتھ کے پہیوں سے کچلتا ہوا چلا گیا۔ تاکہ اس گھنٹے تک پہنچ سکے جو محل کے دروازے پر لٹکا ہوا، انصاف کا گھنٹہ بجا رہی تھی۔

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ بادشاہ نے کہا۔

اُس شہر سے کوولن نامی ایک سوداگر یہاں آیا تھا۔ اور آپ کے حکم سے اُسے قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ ایک پائل بیچنا چاہتا تھا۔

میں اسی بدنصیب کی بیوی کناکی ہوں۔

نیک خاتون میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ چور کو موت کی سزا کے علاوہ اور کیا سزا دی جا سکتی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔

ایک بے گناہ کو قتل کرنا انصاف نہیں ہے۔ آپ نے اسے قتل کرایا ہے۔ انصاف نہیں کیا۔

تم اس کی بیوی ہو۔ اس لئے یہی کہو گی کہ وہ بے گناہ تھا لیکن وہ چوری کے مال کے ساتھ پکڑا گیا۔

کون سا چوری کا مال اس کے پاس تھا؟

ملکہ کی پائل۔

پائل کا چور وہ نہیں تھا آپ ہیں۔ آپ بادشاہ ہیں۔ اس لئے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اگر ملکہ کی پائل کھو گئی تو اس میں بدحواس ہونے کی کیا بات ہے۔ اور پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس پائل کے لئے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا جائے۔ کیا آپ کو ایسی بے انصافی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔

بکواس بند کرو۔ تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے بادشاہ نے غصے سے کہا۔

اس لئے کہ یہ سب سچ ہے اور میرے پاس ان سب باتوں کا ثبوت موجود ہے۔

ثابت کرو کہ جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے۔ بادشاہ غصہ سے لرز رہا تھا۔ لو یہ ہے وہ پائل جو تمہارے شوہر کے پاس سے نکلی ہے۔ بادشاہ نے پائل کناکی کو دے دی۔

کناکی نے پائل غور سے دیکھی۔ یہ اس کی اپنی پائل تھی

آپ بتا سکتے ہیں کہ ملکہ کی پائل میں کیا بھرا ہوا تھا؟ کناکی نے پوچھا۔

اس میں سچے موتی تھے۔ بادشاہ نے کہا۔

اور میرے پائل میں جواہرات تھے۔ دیکھئے اس کے اندر کیا ہے اور کناکی نے پائل زور سے زمین پر دے ماری۔ پائل کے ٹکڑے ہو گئے۔ خوبصورت اور چمکدار جواہرات فرش پر بکھر گئے۔

اُف یہ کیا ہوا؟ میں کیسا بادشاہ ہوں۔ ایک بدمعاش ساہوکار کی باتوں میں آکر میں نے اتنا بڑا گناہ کر دیا۔

میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مروا دیا۔ چور میں ہوں۔ میں انصاف نہیں کر سکا۔

"اے خدا میں نے جو کچھ کیا جلدی میں کیا،
میں نے ایک بے گناہ کو جان سے مار دیا۔
مجھے معاف کر دیجئو اے خدا۔
مجھے معاف کر دیجئو۔

بادشاہ نے خنجر نکالا۔ اور اپنے سینے پر مار لیا۔

بادشاہ کی لاش تڑپ رہی تھی۔ ملکہ بادشاہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے آقا میں اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ میرے آقا میں آ رہی ہوں۔

ملکہ۔ کناکی نے کہا۔ میں بدنصیب قسمت کی ستائی ہوں۔ میں ایک جاہل عورت ہوں۔ لیکن صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر کوئی انسان کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اسے اس کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ اور اگر عورت نیک ہو تو عام زندگی میں خواہ کتنی ہی بھولی بھالی اور مجبور ہو مگر اسے پوری فطرت پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ میں آج اس قوت کو ثابت کر کے دکھا دوں گی۔ میں آج تمام دنیا کو ایک سبق دوں گی تم دیکھو گی کہ یہ پورا شہر آگ کے شعلوں کی نذر ہو جائیگا۔

کنگا نے گنگا کو دیکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ پھر اس نے پورے شہر کو دیکھا [illegible]۔

"اے خدا میری تپسیا کی لاج رکھ لے۔
آج اس شہر کو آگ کی نذر کر دے۔
تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے
یہ ناانصافی کا بدلہ ہے۔
اے خدا صرف نیک لوگ اور برہمنوں کو چھوڑ دے
اے خدا صرف نیک عورتوں۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دے۔
اس پورے شہر کو اس کے بادشاہ کی کرتوتوں کی سزا دے
جس نے مجھے ماں بننے سے محروم کر دیا۔
اے خدا اس شہر کو آگ لگا دے
اے خدا آج میری لاج رکھ لے۔"

اچانک اگنی دیوی کنگا کے سامنے ایک برہمن کے روپ میں ظاہر ہوئی۔

"میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔" دیوی نے کہا

دیوی نے اپنا منہ کھولا۔ آگ کا ایک شعلہ نکلا۔ اور سارا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا۔ آگ کے خوفناک شعلوں نے تمام شہر خاک کر دیا۔ رقاصائیں اپنے حسین اور قیمتی لباسوں میں، سپاہی اپنی وردیوں میں۔ سوداگر اپنی دکانوں میں۔ غرض سب اس آگ کی لپیٹ میں آگئے۔

لوگوں نے آگ سے بچنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پورا شہر جل کر خاک ہو چکا تھا۔ کنگا شہر کی ایک سڑک سے گذر رہی تھی۔

"میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔

"تم کون ہو؟" کنگا نے پوچھا۔

"میں اس شہر کی دیوی مادھوراتی ہوں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تمہارے شوہر کو پچھلے جنم کی سزا ملی ہے۔ پچھلے جنم میں تمہارے شوہر کا نام بھارت تھا۔ وہ بادشاہ کا سب سے بڑا پولیس افسر تھا۔ ایک دفعہ اس شہر میں سنگاماتا کا نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی بیوی کا نام ... ہاں یاد آگیا "نیلی" تھا۔ نوجوان بہت سا تجارتی مال لے کر واپس جا رہا تھا۔ بھارت کو چونکہ اس پر شبہ ہوا کہ وہ غیر ملک کا جاسوس ہے۔ اس بے گناہ کو جان سے مروا دیا۔

نیلی بادشاہ کے پاس فریاد لیکر گئی مگر کچھ نہ ہوا۔ چودہ دن تک اس نے انتظار کیا۔ اور آخر اس نے ایک پہاڑ سے کود کر خودکشی کرلی۔ مرتے وقت اس نے خدا سے دعا کی تھی۔

اے خدا جس طرح بھارت نے میرے شوہر کو بے گناہ مارا ہے۔ اسی طرح اگلے جنم میں اسے بے گناہ جان سے مروائیو۔ تو یہ بھارت کے پچھلے جنم کی سزا ہے۔"

کنگا خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اور شہر کے باہر انہیں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئی جہاں نیلی نے خودکشی کی تھی۔

تیرہ دن تک وہ انتظار کرتی رہی اور چودھویں دن اندرا دیوتا اپنا تخت لیکر آئے اور کنگا کو اپنے ساتھ آسمان پر لے گئے جہاں کوولن اس کا انتظار کر رہا تھا۔

پنا لال پٹیل

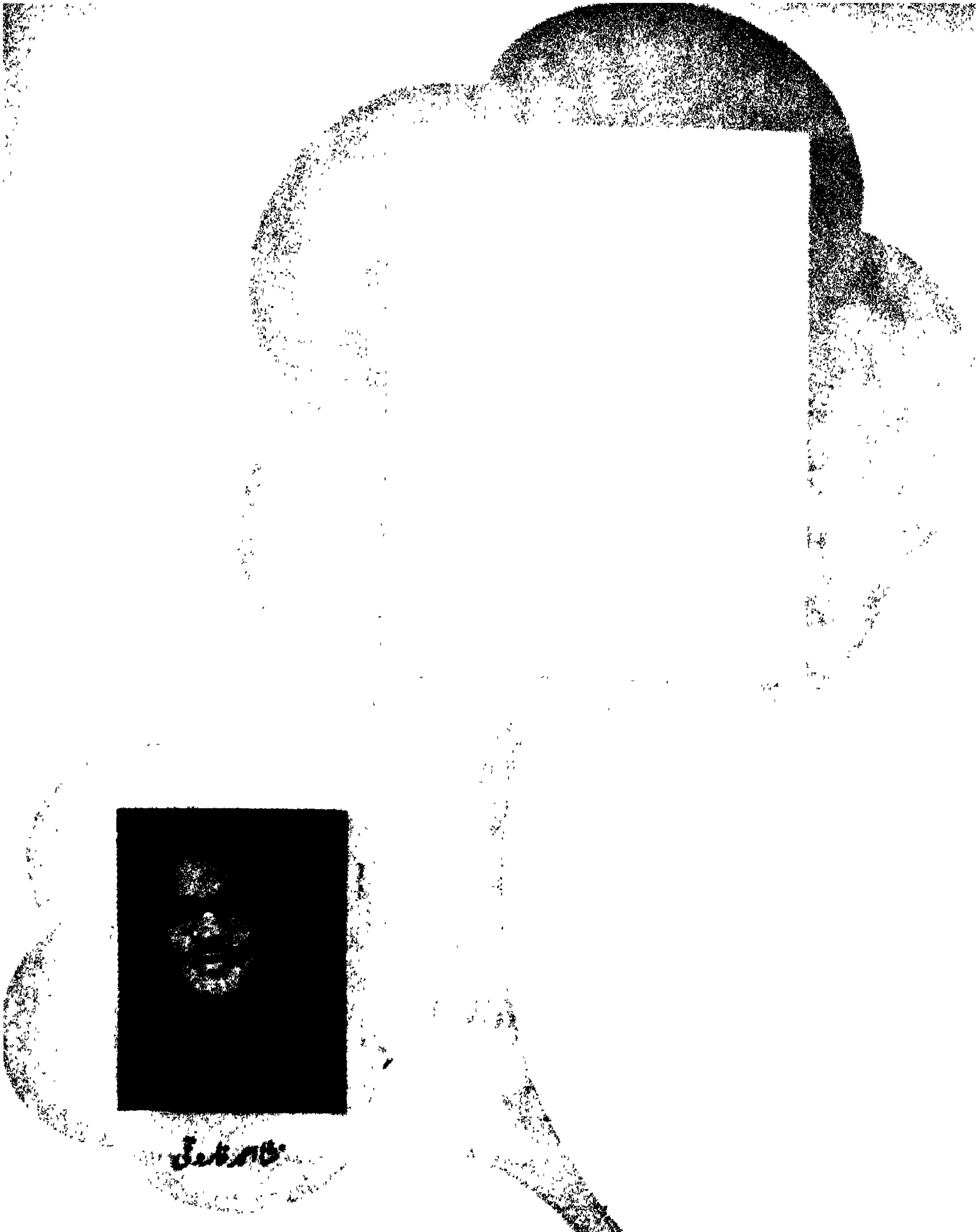
ہندوستانی زبانوں کے ناولوں میں گجراتی کے ناول دیہاتی سماج کی اچھی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جن کو دراصل گجراتی زبان کا ایک نمائندہ ناول ہے جس کے مصنف پنا لال پٹیل دیہاتی زندگی کی مرقع کشی اور منظر نگاری میں آپ اپنی مثال ہیں۔ زیر نظر ناول میں کئی وصف ہیں۔ اس میں گاؤں کی روح بول رہی ہے۔ گاؤں کی مزدوریں، جھگڑے، قصے، ناول مسائل، معمولات، پنچایت اور بہار وغیرہ کی تصویر یوں دکھائی گئی ہے کہ قاری اسی ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ پٹیل نے اس بھرپور ناول میں قصے کی ترتیب کا التزام رکھا ہے۔ ان کا قلم بہکتا نہیں، صرف ایک جملے کے گرد پورا ناول چکر لگاتا ہے لیکن ہر سطر پڑھنے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور آخری باب تک پہنچتے پہنچتے بھی SUSPENSE باقی رہتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو دراصل مزدور ہے۔ اس کا بھرپور نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی شخص کے اندر کا "انسان" مرتا نہیں، سوتا ہے۔ اور جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو انسان اپنے عیب کا خود ہی احتساب بھی کر سکتا ہے۔ اور خود ہی کفارہ بھی ادا کر سکتا ہے!

تاثیر اور تاثر کے اعتبار سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ اس میں ابتدا کا وہ تمام حصہ جو جھگڑو کے مہتو کے پیچھے جا کر بیٹھنے سے لے کر حور آباد میں اس کی واپسی کے لئے بہلانے تک ہے جگہ جگہ بڑے دلنشیں تاثر پیش کرتا ہے۔ مثلاً جھگڑو اپنے گاؤں سے چلتے ہوئے ان درختوں کی طرف نظر ڈالتا ہے جو اس کے جلتے پھلنے پھولنے میں جہاں وہ بچپن میں کھیلا ہے اور جن کے سائے میں اس کا بچپن گزرا ہے۔ انھیں دیکھ کر اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اب وہ کبھی ان درختوں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کی حسرت بھری آنکھیں ان درختوں سے کہہ رہی ہیں کہ "میری ماں اگر ادھر سے گزرتی ہوئی آئے تو تم انھیں بتا دینا کہ ہم نے جھگڑو کو دیکھا تھا اور وہ اس طرف گیا ہے!" ایسے جذبات نگاری نے ناول میں بڑے خوش نما اور دیرپا رنگ بھر دیئے ہیں!

یہ ناول ہندی کے واسطے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہندی کے مترجم نے اس کی زبان صاف نہیں رکھی۔ اسے ترجمے نے کہیں کہیں سنوار دیا ہے لیکن مکالموں میں زیادہ تر آسان ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ ناول چونکہ ہمارے دیہاتی ماحول کا ترجمان ہے اور جانے پہچانے کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے پڑھنے والوں کو اصل ہی معلوم ہوگا۔ اور اس سے بڑی حد تک یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجراتی زبان میں ناولوں نے کہاں تک ترقی کی ہے۔

اس کا مصنف پنا لال پٹیل خود دیہاتی زندگی میں پلا بڑھا اور کھیلا کودا ہے، وہ دیہاتی زندگی کے حسن کا پوری طرح سے رمز شناس ہے اور اسے پیش کرنے میں بھی فن کارانہ مہارت رکھتا ہے۔ قصے میں شروع سے آخر تک ربط و تسلسل موجود ہے۔ لیکن جزئیات نگاری میں پٹیل کا قلم تو بڑے حسن و اعتدال سے چلتا ہے۔ اس کے چیتھڑے ہوئے کردار اور ان کا ماحول موثر ہو اٹھتا ہے۔



پنجابی ادب

مترجم: نثار احمد فاروقی

کاہے کو بیاہی بدیس....

جاڑے کے دن تھے۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہوں گے
سردی اتنی شدید تھی کہ سب اپنے اپنے گھروں میں گھس کر بیٹھ
گئے تھے۔ صرف الاؤ کے پاس دو ایک بوڑھے سامنے بیٹھے
الاؤ تاپ رہے تھے۔ کھیتوں کے رکھوالے بھی پیال کی جھونپڑیوں میں
سمٹ گئے تھے۔ گاؤں کی عورتوں کے گھریلو کام پورے نہیں ہوئے
تھے کیونکہ کسی گھر سے آٹا پیسنے کی آواز گھرر گھرر آ رہی
تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے بچے ماں کی گود کے بجائے اس کی
ساڑی میں لپٹ کر گودڑی میں سمٹ کر سو گئے تھے۔

گاؤں بھر میں دیر سے پیار کرنے والے منوروا کو ابھی بیمار کر کے
آئے تھے۔ اپنے ہاتھ کو رگڑتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھے
اور اپنی گھر والی سے، جو کام کر رہی تھی، پوچھا:

"کہاں گیا کلوا ..... میرا حقہ تو دو.....!"

"یہاں کلوا کہاں ہے۔ وہ تو بیالو کر کے کھیت پر چلا گیا۔ یہ کہہ گیا
ہے کہ حقے میں پانی ڈال دیا ہے تمباکو رکھ دیا ہے، بس آگ رکھنے
کی کسر ہے یہ ذرا سا کام خود کر لو!"

چاہے حقہ مختصر کرنے کے لیے، خواہ گھر والی کی روزانہ ایک
ہی مطلب کی بات سننے سے بچنے کے لیے، چوپال کی طرف چلے
گئے اور وہاں سلگتے ہوئے الاؤ کی آگ سے چلم بھرنے چلے آئے۔
پلنگ پر دراز ہو کر نیچے منہ میں لگانے والے ہی تھے کہ چوپال کی
دیوار پر کسی کے آنے کی آہٹ دیکھ کر ہانک لگائی۔

"کون ہے وے؟"

"میں ہوں موتیاں، منور کاکا، تم سے ایک کام ہے اگر گھر
تک چلو تو اچھا ہو۔"

اتنی سردی میں وہ اسے ایسا کیا کام ہے جو ... کر منوروا
نے حقے کے دو تین کش لگائے اور موتی کی طرف دیکھتے ہوئے
جو الاؤ کے پاس پڑی گٹھری تھا

"کاکا۔ بڑا ضروری کام ہے، ذرا کمبل اوڑھ کر چلے آؤ۔" منوروا
کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا "شباو اسے مرے بھائی کو بلا کر
میں ابھی آیا!" "لیکن کام کا کچھ نام بھی تو ہو؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موتی کسی کشمکش میں ہے۔ اس نے
منوروا کے آگے جھک کر آہستہ سے کہا "تم تو جانو کاکا۔
مجھے خود اچھی طرح علم نہیں۔ نہ جانے میری ان کہار سے
کیا جھگڑا ہے؟"

منوروا نے اپنا سر اٹھایا جو پتلی سی گردن پر بوجھ سا لگتا تھا وہ
آہستہ سے کچھ سوچ کر بولا "اچھا..."

"اچھا تو میں ابھی آیا۔" پھر وہ پلنگ پر ہی بیٹھ گیا اور حقہ
پیتا رہا۔

موتی نے جانے سے پہلے پھر کہا "تم گھر جا کر بیٹھو، میں
ابھی گیا اور ابھی آیا۔" وہ قدم بڑھا تھا کہ پھر پلٹ

"اس نے کہا تھا کہ کاکا سو بھی رہے ہوں تو جگا کر بھیج دینا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" حقے کے دو چار کش جلدی
جلدی کھینچ کر اسے دیوار سے لگا کر رکھتے ہوئے منوروا نے کہا
"نہ جانے اس وقت کیا کام پڑ گیا اسے ... بھگو!"

"ایک بار تم گھر تو چلو پھر ....." کہتا ہوا موتی چلا گیا۔

منوروا کا دبلا پتلا مگر مضبوط جسم بڑھاپے کے باوجود اس وقت
پھرتیلا ہو گیا۔ اس نے سرہانے رکھا ہوا انگرکھا پہن کر کھونٹی سے
اتار کر صافہ لپیٹا اور کمری بھی پہن لی۔ پھر ایک ہاتھ میں لکڑی
اور دوسرے میں حقہ لے کر باہر آیا۔ چوپال سے اترتے ہی کوئی
بات یاد آئی اور گھر میں گھستے ہوئے بولے

"مہمان گئیں — میں گاؤں میں جا رہا ہوں ذرا باہر کا خیال رکھنا۔ آگ نہ آئے۔" یہ کہہ کر مڑے۔ گھر والی نے کوئی سوال کیا لیکن اس وقت منورما نے قصداً اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ جاری تھی اور منورما چلے جا رہے تھے کچھ دور چل کر پھر رخ بدل گیا پار کر کے ایک چھور پر آئے۔ وہاں ایک دروازے کی کنڈی کھول کر بلی کے سے دبے دبے پاؤں صحن پار کرتے ہوئے اندر آئے آہستہ سے کن سوئیاں لیں کہ کیا مسکوٹ ہو رہی ہے دو چار اُٹھتے سے لفظ اُن کے کان میں پڑے۔

"مہمان جانا ہو چلی جائے ..... نکال دے گھر سے ....." یہ الفاظ سن کر منورما کے چہرے کا رنگ کھل گیا گویا اُن کا جو قیاس تھا وہ ٹھیک ہی نکلا!

"مجھے اس کا اندازہ بھی کیا ہوا ہے!" اگر شاباشی کے لئے اپنی ہی پیٹھ ٹھونکی جا سکتی تو منورما اس وقت یہ بھی کر گزرتا۔ سا ہو کاروں والی فتنہ بازی سے پہلا نمبر لے رہے ہی میں جھوٹے والے ایک سوال کا جواب بھی خود ہی دے لیا" ارے ہاں یہ بھی ہو جائے گا۔ کوئی بڑھیا مل جائے گا ایک بار اس پھندے میں سے تو چھوٹنے دے" یہ سوچتے سوچتے منورما کھنکارا اور گلا صاف صاف کرتے ہوئے لپکے کو ما جیسے بجلی کا تڑاقا۔

"ارے بھئی کوئی ہے گھر میں؟"

"کون؟ منورما کا —!" آواز کے ساتھ ہی بوڑھے والا جوان چوپال کے کنارے تک آگیا۔

دعا سلام کرنے میں ہی منورما نے لالٹین کی دھیمی روشنی سے یہ تاڑ لیا کہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بھیکو کی ماں رو ہانسی ہو رہی ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر جو بھیکو کی گھر والی بیٹھی تھی اسے دیکھ کر بھی بھانپ گئے۔ منورما لالٹین کی طرف منہ کر کے پلنگ پر پیر لٹکائے ہوئے بیٹھ گئے۔ پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے تمباکو کے ڈبے میں سے تھوڑا سا لے کر ہتھیلی پر ملتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ کاکا تمباکو بھولو؟" منورما نے کہا۔

"ارے تمباکو گیا بھاڑ میں!" اور یہ تینوں سہم گئے۔ منورما نے دھیمی مگر گمبھیر آواز میں کہا "تم نے آخر ٹھانی کیا ہے مجھے تو بتاؤ؟"

معنوں ماں بیٹے بہو چونک ہو کر ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے اور بھیکو کی بیوی نے اپنا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

منورما نے پھر حقے کے دو تین کش لگا کر [illegible] ہوئے کہا۔

"تم نے وہ کہاوت سنی ہے، تیری ماں نے خصم کیا برا تو کیا پر چھوڑ دیا برا یہ اس سے زیادہ برا کیا۔ بس یہ معاملہ بھی ایسا ہی ہے" پھر ایک لمحے انتظار کرنے کے بعد سب کو خاموش دیکھ کر بولے "تم سمجھتے ہوں گے کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، مگر تمہارا دھن گھر جانے کی سازش کر رہے ہو۔"

بھیکو کی ماں گھبرا کر بولی "لیکن اب ہم کیا کریں؟ اس بدنصیب نے یہ نکر سی کام کر دیا آخر اب اس کا علاج کیا ہو سیٹ چانی ہے یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ تو گھر سے ....."

بھیکو نے جھنجھلا کر بات بیچ میں اٹھا دیا "بس چلو چلا جو۔ آگئی بڑی بیٹی والی۔ اسی طرح تو تو نے اُسے سر چڑھایا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ بھاڑ میں جائیں ایسے پیسے۔ نہ لیں تو کیا ہے۔ لیکن اُس بڑھوا کی کا پیسا ....."

منورما نے بات کاٹی "بھیکو سن۔ اگر اب بھی میرا کہنا مانے تو اسے گھر سے نکال دے ورنہ ابھی تو دشمن سوتیاں آتا ہوگا۔ اور گھر جو اس کے ہاتھ لگ گئی۔ تو صبح ہونے تک خدا جانے اس لڑکی کا کیا حشر ہو گا اُس کا شوہر اس تاک میں ہے کہ کتنے چوٹے اور ناک کان کاٹ لوں۔ یہ معنی کی ماں کے تو دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ اُدھر داماد کی اور تجھ سے پیر ملے گی۔" ذرا ٹھٹک کر پھر بولے "تمہارا تو اس میں کیا بھی کیا ہے؟ تمہارے سگے سنبندھی کا یا جات برادری کا معاملہ تو ہے نہیں۔ مگر مجھے یہ فکر ہے کہ گاؤں میں ناک کٹ جائے گی۔ اگر تمہاں ہاتھ لگ گیا، تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کر دے گی۔ بس تمہاری گرفت کے لئے یہی سوال کافی ہے کہ تم نے اُسے گھر میں رکھا تو کس کے حکم سے؟"

"برادری تو سب سے پہلے دیکھے گی" بھیکو کہتے کہتے رکا لیکن سالا اس کی کوئی سبیل بتاؤ؟" پھر غصے سے دانت پیس کر آہستہ سے بولا۔ "اس جنم کی بیری پر ایسا غصہ آ رہا ہے جی چاہتا ہے اپنے ہاتھوں ناک کاٹ لوں اس کی ....."

"بس اب خاموش ہو جا" اپنے ہاتھوں پر حرکت نہ کرا" منورما نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ معنی کے کہنے کو غیر شائستہ اور بدتمیزی بھی کہو لیکن کچھ دیر بعد میاں تماشا شاذ ہی بے سُد ہوا ہے۔ تینوں جا اس

کے تئیں [illegible] نہیں ہو [illegible]
ہی [illegible]

"[illegible] کے [illegible] پر [illegible] ..."

[illegible] !!"

[illegible] مشکل سے [illegible]

... [illegible] ... کہا "[illegible]

[illegible] کہیں کنوئیں ہی نہ [illegible]

اس [illegible] ... تو ... کہتا ہی کیا تھا۔ لیکن ان آنکھوں کے آگے ...."

منورما نے [illegible] ہوئے کہا "منا بھابھی تم اس سے کہہ دینا کہ اس [illegible] کے [illegible] آج رات [illegible] کے [illegible] کے [illegible]" پھر [illegible] آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگے۔ "[illegible] کا [illegible] کہ [illegible] گا اگر اس بات کو راز ہی رکھنا ..."

[illegible] ورنہ [illegible] اپنے ہاتھوں اسے [illegible] [illegible] کیا کہیں ہوش ہو سکے [illegible] [illegible] نہیں [illegible] اس [illegible] کو [illegible] کی تکلیف ہوگی۔" [illegible] کی طرف دیکھ کر بولے "اور دیکھنا۔ تم کہیں ساتھ مت جانا اگر [illegible] دیکھ کر شبہ میں پڑ گئے تو اور بھی آفت آ جائے گی "چلتے چلتے پھر" میں اُسے اچھا ٹھکانہ ڈھونڈ دوں گا۔"!

منورما کا آخری جملہ سُن کر [illegible] کانپ گئی اِس نے سوچا۔ کہیں میری بیٹی کا خواب تو نہیں کر دے گا"؟ اس کے ساتھ ہی اُسے وہ چار ایسے واقعات یاد آ گئے جن میں منورما نے پہلے شوہر سے [illegible] سے شادی کرانے میں مدد دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بخود بڑبڑانے لگی۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اِس غریب نے تو آن دُکھیاروں کو مصیبت سے نکالا تھا آن کا بھلا کیا تھا۔ پہلے ہی تھوڑے بہت روپے ہضم کر لے لیکن بیٹی کو ٹھکانے لگا دے تو اچھا ہو ۔۔۔"

x x x x x

دوسرے منورما نے دیکھا تو چار پانچ آدمی موتی کی چوپال میں تھے اور چوکھٹ سے لگی ہوئی لالٹین کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی، عجب انداز سے۔ اس طرح کہ اس کے داہنے پیر کا پنجہ [illegible]

سے [illegible] تھا اور دونوں [illegible] لگے ہوئے تھے [illegible] رہتے سے [illegible] لگی ہوئی تھی۔ منورما ہی کیا گاؤں کا چھوٹا بچہ بھی پہچان سکتا تھا کہ یہ موتی کی [illegible] ہے [illegible] گھونگھٹ کے آگے [illegible] اس کی [illegible] شخصیت معلوم ہوتی تھی پھر بھی [illegible] پر رکھا تھا، [illegible] تھا۔

منورما نے اِشا کی خفت آمیز خاموشی اور [illegible] آنکھوں [illegible] دیتے ہوئے چوپال میں داخل ہوتے [illegible] کہا۔

"[illegible] اور تل [illegible] کے [illegible] بھابھی؟"

اور موتی کی طرف بغیر دیکھے اُسے حقہ تھماتے ہوئے بولے۔

"لے [illegible] اس میں تمباکو رکھ دے۔"

ایک لمحے کے لئے اِشا کی چمکتی ہوئی آنکھیں منورما پر جم گئیں پھر اس نے شرما کر منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے!"

"اِشا بھابھی۔ تمہاری [illegible] کے [illegible] گئے۔ مگر تم نہیں بدلیں۔" منورما اِشا کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ خالی پڑی ہوئی کھٹیا کے سرہانے بیٹھے ہوئے بولے۔

"وہی تمہارا روٹھنا" اور وہی بولنا۔ ایک دن بھی تم مجھے طعنے دیئے بغیر ...."

"طعنے کیوں نہ دوں؟ کتنی دیر ہوئی جب موتی کو بھیجا تھا تمہیں بلانے کے لئے۔ اور اب آتے ہو۔"

"یہ غنیمت جانو کہ آ گیا۔ اگر کسی دوسرے کا کام ہوتا تو ایسی سردی میں ...."

پھر اِشا کی طرف دیکھ کر "سچ کہتا ہوں اِشا بھابھی اب تم پہلے سے کس بل نہیں رہے۔"

اِشا نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر میں تم سے بھی تھوڑا سا پسوا رہی تھی!"

"اِشا بھابھی ذرا یاد کرو۔ تمہارے گھر تو بہنے ہی کیا ہے۔"

اگر اس وقت اِشا کا دماغ ٹھکانے ہوتا تو اپنے لڑکے کی اور ماں وہ چار کی پروا کئے بغیر کہہ دیتی "غرض کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرتا۔" اور پھر شاید اُن وہ [illegible] کے [illegible] کے نام بھی گنا دیتی جو سارے کام کاج چھوڑ کر، [illegible] بیٹھ کر پروانوں کی طرح جان نچھاور کرتے تھے اُس سے عشق

رلا سکتے تھے تو اس میں تعجب کی بات ذرا بھی نہ تھی۔ بچپن میں
کی دوستوں میں کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ امبا کو بڑھی کہہ سکے۔
امبا نے بیرو کو دیکھ کر نگاہیں اور ذرا سر کایا۔ پھر وہ
سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔
"یہ سب فرصت میں یاد کرنا۔ لیکن اس وقت جو کام آپڑا
ہے اس کے لیے کچھ کرو نا؟"
"کیا ہے کام؟ کچھ کہو گی بھی یا بس یوں ہی" یہ کہہ کر منوروا نے
حقہ سنبھالا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ویرا پٹیل کی طرف
دیکھا۔ ویرا نے آہستہ سے کہا "وہ بیچاری بڑھی کی بہن جھمکو ہے نا؟
وہ بیچاری پہلے ...!"
"ہاں، ہاں۔ ارے حرام زادی نے سارے گاؤں کی
کریا خراب کر دی۔ لیکن اب کیا گل کھلایا ہے اس نے؟"
منوروا نے ایسے پوچھا گویا اسے کچھ خبر نہیں۔
اس کے بعد ویرا نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ابھی
کچھ دیر پہلے امبا کو کسی نے یہ خبر دی کہ ایک عورت کو بیچر کے
بارشے میں دبکتے ہوئے دیکھا گیا اور یہ یقین ہے کہ وہ عورت
جھمکو کے سوا دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔
اس کے بعد امبا نے اس شبہے کو ثابت کرنے کے لیے
یہ بھی کہا کہ جھمکو کا اقرار کرنے والے پٹواری کا حقہ پانی
برادری نے بند کر دیا ہے اور اس کے گھر والے اسے گاؤں
سے نکال رہے ہیں۔ پھر کہنے لگی۔
"مجھے تو یقین ہے منوروا ــــ کہ اس بامن نے رانڈ
کو نکال ہی دیا ہے۔" اور دانت کچکچا کر بولی "کب میرے
ہاتھ لگے اور میں اس بیچریا کا تماشا دیکھوں!"
ابھی تو بھیا صاحب بڑا دھرم چلا سا بنائے پھرتے ہیں
اس سے کچھ بولتی نہیں۔ لیکن ایک بار یہ جھمکو میرے ہتھے
چڑھ جائے پھر دیکھو ..."
منوروا نے امبا کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا: "اگر یہ
بات ہے تو چلو بیچریا کے گھر کی تلاشی لے لیں ..."
امبا کا کلیجہ یہ سن کر ذرا ٹھنڈا ہوا وہ بولی "اسی لیے تو
تمہیں بلایا تھا!"

منوروا ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا "اچھی بات ہے۔
اٹھ ویرا۔
موتی تو بھی چل۔" اور پھر امبا سے پوچھا "اس سے پہلے
تو کسی سے یہ بات نہیں کی ہے؟"
"میں بات کہوں گی؟ میں نے تو موتیا کو بھی نہیں بتایا تھا
جب اسے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا ورنہ کہہ دیتی کہ ایسا
ایسا واقعہ ہو گیا ہے!"
"بس ٹھیک ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کسی نے رسی کا سانپ
بنا دیا ہو؟"
"نہیں ایسا نہیں۔ جس نے مجھ سے کہا تھا وہ کبھی جھوٹ
نہیں بول سکتا۔" امبا نے کہا۔
"کون ہے وہ؟" منوروا نے قریب آکر پوچھا اور جب
امبا نے آہستہ سے نام بتایا تو منوروا نے کہا "ہو سکتا ہے وہ
اندھیرے میں اچھی طرح نہ پہچان سکا ہو۔"
"ارے پہچانا کیسا۔ میں تو تمہارے روبرو کہلوا دیتی مگر اب
وہ کھیت پر رکھوالی کے لیے جا چکا ہو گا۔"
"اگر وہی تھی۔ تو سمجھ لو کہ آسے باندھ دیا" کہتے ہوئے منوروا
آگے بڑھے تو ان کے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے کہ امبا
کو یقین ہو گیا: "اب تو بندھ گئی رانڈ!" اور اب تو یہ انتظار
تھا کہ کب وہ نکلے اور بڑھیوں کی پنچایت ڈیرہ کر برادری سے
خارج کرے۔ پھر دل ہی میں اسے وہ جھگڑے والا دن بھی
یاد آیا جب جھمکو کا شوہر اسے مارتا تھا تب وہ میکے بھاگ
آئی تھی۔ ایسا دو تین مرتبہ ہو چکا تھا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں
ہونے لگی تھیں کہ جھمکو ضرور دوسرا شوہر کرے گی۔ امبا کو بھی
اس کا یقین آگیا تھا۔ جھمکو کی سسرال میں بس اس کا
پیہر تھا۔ وہاں بھی روز روز کے جھگڑے سے تنگ آئے ہوئے
بڑے بوڑھوں کی زبان سے ایک دو بار اڑتی سی سنی تھی کہ
"کم بخت۔ رانڈ کہیں کالا منہ ہی کرے تو اچھا ہو۔"
یہ سارا قضیہ اپنے بیٹے موتی کے لیے مفید ہو گا یہ احساس
کرتے ہی امبا نے چپ چاپ بیچرے بات شروع کر دی
تھی۔ بیچرے نے سخت الفاظ میں جواب دے دیا اور یہ طعنہ

میں پیار کا تو تصور ہی محال ہے۔ اگر تو نچھر کا بیٹا نادان ہے تو اس کی عمر و عقل بھی ہے۔ انشاء اللہ اب ابا جان سے بھی ملنی تھی پر کا چھوٹا سا سپاہی ہے کہ ابھی اور بچپن ہیں، بچپن نہیں ہے، ابھی بچکو کامل ٹھیک ہو رہی ہے، بچو چھوڑی سے لگ گیا اور ایک دن ابا نے بھی ہیلا مودوں بھاگ رہے ہیں مگر اب بھی ابا کا کچھ شکوا نہیں تھا۔ بچپن کے آگے پھر بولا "اللہ میں کیا جانوں وہ جانے اور اس کے تشمیل والے میرے گھر سے تو اسے ہی بھاگی ہے۔
بچپن کے ہاتھوں سے بچے اُٹھ گئے۔ بچو پگلی کس کا تھی اسی پر ابا کر سپاہی لیکن آج جب سے معلوم ہوا کہ نچھر بیماری کے چکر میں پھنس گیا ہے تو وہ خوشی سے آج اٹھل کر لے بچوں کے بیچ کیسے کیسے تصور سے گی ابھی سے دل ہی دل میں دُہرانے لگی۔
ابا کے پاس سے نکلتے وقت منوروا کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے مگر کچھ دُور چل کر دھیمے ہو گئے۔ دوسرے گلیارے کا موڑ آتے ہی وہ رُک گئے۔ پیچھے چلنے والے تینوں آدمیوں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "تم لوگ تو ابا کر، نچھر کے پچھلے دروازے پر جا کر چھپ جاؤ۔ ایسا نہ ہو وہ کہیں رُو چکر ہو جائے۔"
منور کاکا کی اس قدر دُور اندیشی پر سوتی بہت خوش ہوا کہنے لگا۔
"اور ہمیں ایک ایک کر کے جانا چاہیے دیرا۔ ایسا کر، تو پہلے جا۔ ایک دم بٹ پڑنے میں بات نہیں بنے گی۔"
وہ لگ بھگ دس پندرہ گز کا فاصلہ رکھ کر دونوں دیرا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ منوروا سیدھے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دیرا کو دیکھ کر "کیوں دیرا کاکا اس وقت کیسے آنا ہوا، آؤ بیٹھو" کہتے ہوئے نچھر نے کہا "ارے نچھر ذرا دروازہ تو کھول دے۔"
نچھر نے دو آوازیں دے کر ماں کو جگایا اور دروازہ کھلوا دیا۔ سب اندر گھس پڑے اور دروازہ بند کرا دیا۔ بازو والے چولہے میں آگ سُلگ رہی تھی۔
منوروا نے حکم دیا "ذرا چراغ جلا لے اور تھوڑی سی کڑاہی لا۔"
"انھوں نے نچھر سے یہ سب کیا ہے کاکا" ایسے سوال کی اُمید کسی ہو گی۔ لیکن وہ کم عقل کچھ پوچھے تب نا" آخر وہ چیخ اُٹھے۔
"تیری طرف کیا دیکھتا ہے ابھی معلوم ہو جائے گا! کمبخت بڑھتی

کا بچہ ہے۔ اسے کیا کرنا ہے میں چوہا ساوت دیکھ کر بولے۔" دیکھ تو دیا بھلا ابن کر مجھ سے پوچھ، دیکھ کیا کا کا۔ چوہی کیا گل کھلا کے آئی ہے اور اسے گھر میں رکھ لیا!"
نچھر کی ان بولی "ان کا باپ ابھی سے یہ بات تماشا ہو گی۔ چاہے مر بھی جائے، وہ اُنہیں گھر میں رکھنا دُنیا میں سکتے بھی نہ دیکھیں!"
"نچھر ولا" یقین نہ ہو تو دیکھ لے رہا ہے!"
اور منوروا نے گائیوں کی پچھاڑی میں تلاشی شروع کر دی۔ انھوں نے بڑی محنت سے کونا کونا چھان مارا، ساری گھر میں پلنگوں کے نیچے گھاس کی کوٹھری میں سب جگہ ڈھونڈھا لیکن گھر میں جو تو لے!
تھک کر پاکر پر بیٹھا اور پھر سے تلاش کیا۔ چلتے چلتے سارہ تھکیار بولے "وہ تو بچے مرنے والے نچھر کے باپ کا خیال ہو آ رہا ہے نہیں تو دن دہاڑے پولیس سے خانہ تلاشی کراتا۔ ابھی بد تو بچ گئے لیکن اب اگر پچھنے اور اس دھرم کے بازی کا بدلہ دیا تو تیرا کام چل دیا" اور یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔
انھیں چوپال سے آتا دیکھ کر نچھر نے کہا "منور کاکا تو دُبلا بچہ" منوروا نے بات کاٹ کر گُڑک دیا "مجھے تو شرم نہیں آتی لیکن مجھے آتی ہے۔ میرا منہ بے مت کا کر بیٹے گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔
راستے میں چلتے ہوئے وہ چپ شاہ کا روزہ توڑا۔ اب کی آواز میں نرمی تھی۔
دیرا! یہ تو ٹھیک ہے کہ گاؤں میں کوئی نہیں جانتا اور اپنوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو بات پھیلائے، نہیں تو سوچ کر کوئی سنے گا تو ہم سے کیا کہے گا، میرے لیے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہو گا!"
منوروا کے ساتھ پنچایت میں کھڑے رہنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھنے والے اور اپنی کم عقلی سے واقف دیرا نے اتنے ہی نرم اور اُداس لہجے میں جواب دیا۔
"سچ کہتے ہو منور بھیا مجھے تو یاد نہیں کہ آج تک تم کہیں سے کبھی اس طرح خالی ہاتھ لوٹے ہوں!"

پھر رُک کر منورما سے پوچھا "ویرا تو مجھے تو پہلے سے معلوم تھا کہ اس بات میں جان نہیں ہے۔ ہمیں خود ہی سوچنا چاہیئے کہ سب کی ناک کٹنے والے کو کوئی گھر میں قدم رکھنے بھی دے گا؟ اور دیکھو نا خود بھی یہ سوچا تھا کہ جس نے سات پشتوں کی عزت پر پانی پھیر دیا وہ بہن کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر انکار کروں گا تو آپ بھائی ناراض ہو جائیں گی اور عمر بھر کے لئے میرے سر پر اس کے احسنوں کا بوجھ رہے گا۔"

"ہاں جی ٹھیک ہے!" ویرا بولا۔

میں تو موتیاں سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو ہوا سو ہوا لیکن اب سوچ سمجھ کر کام کیا کرو۔ لوگ باگ تو ایسی ایسی باتیں اُڑائیں گے جو کبھی کسی نے سنی نہ ہوں گی۔ ابھی ذرا سنتے جاؤ۔"

موکا نے تائید کی "منورما ٹھیک کہتے ہیں۔ جب جگو گھر سے بھاگ گئی تھی تب بھی ایسی ہی باتیں آ رہی تھیں کوئی کہتا تھا کہ ماما جی کی ٹیکری پہ دیکھا۔ کوئی کہتا کہ پرستی کے گھر رمضو کے پہلے دیکھ کر آیا تھا حالانکہ وہ بیٹھی تھی گھر سے پندرہ کوس دور۔

منورما بڑبڑائے "اگر انھوں نے کل کو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی ہے تو میں بھی دیکھتا ہوں کہ آخر وہ جائیں گی کہاں، سویرا ہوتے ہوتے انگنائی میں باندھ دوں گا۔"

دیکھنا — ہاں موتیاں پڑ بڑ مت کرنا اپنی اس سے کہہ دینا۔ دیکھ لو سیانے کوتے میلا کھاتے ہیں۔

پھر منورما حکومت کے قاعدے قانون کی باتیں بھی بتائیں۔ ویرا اور موکا بچے اور رتے کے ہی اُٹھ بیٹھنا کا کا "کہتے ہوئے چلے گئے۔

منورما دل ہی دل میں ہنسے "جلدی کیا خاک اُٹھو گے! رات بھر سونا بھی شاید ہی نصیب ہو۔"

× × × × × × ×

منورما گھر والی کو جگایا جو اس کے پلنگ کی حفاظت کر رہی تھی۔ گھر والی نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا "کہاں تھے اب تک؟"

منورما نے الاؤ میں چلم بھرتے ہوئے کہا "جہاں گیا تھا وہاں ٹھیک ہی گیا تھا۔"

الاؤ کی دھندلی روشنی میں ان کا چہرہ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے جلی فکر میں ہوں۔

"پھر بھی؟" — گھر والی نے پوچھا۔

منورما اپنی تکا دس میں بولے "ابھی تک تو معاملہ بڑا ہی سادہ آگے کی سوچنی ہے۔"

پھر چلم میں آگ رکھنے لگے۔

گھر والی نے اُٹھ بیٹھی اور جھنجھلا کر بولی "جو لے میں جائیں تمہارے ڈھنگ۔ کبھی جو سیدھی بات بتائی ہو۔"

"تیرے پلے کیا پڑے گا۔" لیکن حقہ گڑگڑانے لگے پھر بھی بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر انہیں سب کچھ بتانا ہی پڑا۔ انھوں نے ٹھاکر کی شروع سے لیکر آخر تک پوری کتھا سنا ڈالی۔ پھر کچھ رُک کر بولے "وہاں تھا تو ویسا ہے لیکن اب کیا کروں؟ پانچ دس روپے ضرور مل جائے مگر یہ تو سالا عمر بھر کا معاملہ ہے!"

"پانچ دس روپے؟" گھر والی نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ پھر منہ بنا کر بولی۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک سونے کے ڈھیر لگ جاتے سمجھ کے؟"

پھر منورما کو چپ دیکھ کر بولی "آئے بڑے سیانے — دیکھا اُس جگو بڈھے کو؟

صرف دس برس تک ٹکھیا گیری کی لیکن اتنا کما لیا کہ سات پشتیں گھر بیٹھے کھائیں گی۔ اسے کہتے ہیں ٹکھیا!"

پہلے ہی گھر والی آہستہ بول رہی تھی پھر بھی منورما نے دھیرے بولنے کا اشارہ کیا اور حقے کا کش لگا کر بولے "تجھے خبر ہے جگو نے یہ سب کیسے اکٹھا کیا؟"

پھر کچھ رُک کر بولے "لوگوں کی چار چار لڑکیاں بیچ کر کھا گیا۔ کہیں کمانے کے لئے تھوڑا ہی گیا تھا۔"

لیکن یہ فن بھی تو آتا ہو، جب نا۔ تمہاری جگہ اگر وہ ہوتا تو اس جیسی بات کے تھیلی بھر روپے مارتا۔"

منورما چپ ہو گئے اور الاؤ کی طرف دیکھنے لگے جس کی آگ اب خاکستر بنتی جا رہی تھی اور اپنا حقہ گڑگڑاتے رہے۔

گھر والی پھر بولی۔ "دو برس سے تم ہی تو اس کی جگہ ٹکھیا بنے ہوئے ہو۔ تم نے کیا کمایا؟ اُلٹے اپنے باپ دادا کے زمانے کے زیور بیچ کر بیٹھ گئے!"

منورما سر اُٹھائے بغیر ہی بولے "زندہ رہیں گے تو پھر بنا لیں گے۔"

ان کے اس سرد جواب سے گھر والی اداس ہو اُٹھی۔ اس طرح تھوڑے

[illegible] منورما کا سنگھار ہے۔ منورما کے پاس جیتر [illegible] اسے پکوانوں میں [illegible] پا سکتے، دیہاتی سورت تو دیکھو [illegible] کہ آنے والے بھی شرماتے ہوں۔ ایک [illegible] تو کیا ہوا جب روشنی کو منورما نے غصے میں آ کر [illegible] ... جب سے گلی یا نہیں؟ اور پھر غصے سے

گھروالی [illegible] ۔ تم کیا جانو۔ لیکن جو پھر بعد لوگوں کو چپ کر دیتا تب میں کھری [illegible] جلدی ہو بھی ایسی [illegible] جگہ سے پھر [illegible] کی بات نہیں" مگر منورما کچھ نہ بولے۔

—— گھروالی پھر [illegible] جب دیکھو بس حقہ اور خواہ مخواہ کی [illegible] دیکھتے رہنا اور نہ گھر کی کوئی سمجھ، دن بھر [illegible] کر ...

منورما کھنکار کر بولے۔ "اب گھر میں چائے ہے کہ نہیں؟"

پھر ذرا اٹھ کر بولے۔

"کوئی کام سے گو آئے تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

"لوگ تو بیٹھ گئے ہیں۔ تمہارے کیا باپ دادے کہہ گئے ہیں کہ بیٹا اپنی گرہ سے کھانا اور ٹھلوؤں کے ساتھ ....."

"اپنی گرہ کا کیسے؟" اور پھر گھروالی کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔ "جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی؟ کس دن خالی ہاتھ لوٹا ہوں؟ زیادہ نہیں تو بھی ...."

"اور جو ہو کبھی دو چار، وہ بھی لے آئے ہوں گے، اسی میں نہال ہو گئے!" منورما نے جھنجھلا کر کہا "تم کیا جانو باپ نے کہیں گاڑ دیئے ہیں جو تمہیں اٹھا لاؤں۔"

"باپ تو بہت کچھ چھوڑ مرا تھا لیکن تم نے اسی پنچایت بازی میں پھونک دیا۔ جیسے آئے تھے [illegible] جگ کے .... ہنہہ"

"لیکن کچھ کہوگی بھی کہ کیسی پنچایت کرانا چاہتی ہے" میری نوجوان کمائی" گھروالی رٹ ہی لگائے جا رہی تھی۔ ان آنا باپ کا تھا سو مجھے ایسی جگہ پھینک دیا کہ وہاں نہ تو خوشی سے پہننے اوڑھنے کو ملا اور نہ آرام سے کھانے کو ملا۔"

منورما بولے اور پھر بولے "تے اٹھ اب سو جا، وقت آنے پر بھگوان کرے گا تو سب کچھ مل جائے گا۔"

گھروالی پھر بڑبڑانے لگی سے بولی اور اس کی آواز میں نمکینی تھی "اب کیا ملے گا۔ پچپن کے دن ہی جب بیت گئے تو کیا فائدہ ہے!

لیکن وہ تو . . .

"کیوں نہیں ملے گا۔ دے گی تو۔" منورما سوچتے سوچتے بول اٹھے۔ منورما کو افسوس ہوا کہ وہ کس طرح غصے میں آ گئے تھے۔ سچ بھی ہے بیچاری کی کیا، کہیں کچھ نہ تھی۔

"نہ بے چاری کا زیور رہا۔ وہ تو آیا۔۔" گھروالی بھرائی آواز سے "ماتھے کا پھول تک نہ رہا۔"

منورما نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ارے تو فکر مت کر، تو دیکھتی تو رہ، ٹھہر تو کچھ بس ذرا دیکھ . . ."

گھروالی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اس گھر میں آ کے میری تو آنکھیں پھوٹ گئیں، دیکھا کچھ نہیں، بیچ کچھ اٹھنے کی۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اس کے جیتے جی پہلے پہر اٹھاؤ تو بھی بہت ہے"

"اور تیرے لئے سونے کی ہنسلی" منورما نے بات شروع کیا۔

گھروالی نے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "وہ دن اب کہاں جب میاں سے بیر کی جوتی . . ."

منورما ہنستے ہوئے محبت آمیز لہجے میں بولے "تو راضی تو بھی۔ خود" گھروالی اس چہرے کے ساتھ قدرے غصے میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی "اگر تم جگو کی بہو جیسی سونے کی ہنسلی بنوا دو تو کیا دے گی؟"

منورما کی صورت اور گھروالی طرف جمی ہوئی نگاہیں تیز ان کے جذبات دیکھ کر یہ فوراً احساس ہوتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو وہ بیوی سے ایک زہر خند کی توقع کئے ہوئے ہیں۔ لیکن آج گھروالی نے ان کی امید کے ساتھ ان کی خوشی کا بھی خون کر دیا وہ بڑے غصے بھرے تیوروں میں بولی "دوسری بات تو خیر کیا ہوگی ۔ تم اس کے جوتے میں پیر ڈالنے کے قابل بھی ہو؟" یہ کہہ کر منہ چڑاتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔

منورما کو بھی یہ بات شاید سچ نظر آئی، مگر کہتے کیا؟

انہوں نے حقہ بھر بھرا اور لیے گڑ گڑ کرنے لگے جیسے "بے جان" بیٹھے ہوں۔ آدھ گھنٹہ بعد حقے کو ایک طرف رکھ کر، بلکہ چھپا کر تھوڑا سا گوڑ پلنگ پر ایسے رکھ دیا جیسے کوئی آدمی پڑا ہو۔ اپنا بھیس بدلا، لاٹھی سنبھالی اور پیچھے سے نکل گئے۔

مہوے کے پاس پہنچ کر دیکھا تو کوئی پیڑ کے تنے سے دبکا بیٹھا تھا

"کون؟ جھمکو!"

"ہاں کاکا ۔۔۔!" آواز اگرچہ بہت دھیمی اور سہمی سی تھی لیکن اس میں شکوک کی آمیزش بھی تھی۔

"چل اُٹھ۔ اس باڑی کے کنارے کنارے آگے چل ۔۔۔ میں تیرے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔"

"کہاں چلو گے منورو کاکا؟"

"کہاں؟ ۔۔۔ جہنم میں ۔۔۔ مہادیو کی طرف، ڈوکری نے کام سونپا اس لئے کرنا ہی پڑے گا! جوانی کے جوش میں اندھی ہو کر من مانی کی اور اب سب کو دکھ میں مبتلا کر رکھا ہے۔" پھر کمبل کو ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے بولے "دل تو یہ کہتا تھا آج تجھے مار ہی دوں۔ خیر، چل آگے آگے۔"

جھمکو آگے آگے اوٹ میں چلنے لگی۔ بیس پچیس قدم کا فاصلہ چھوڑ کر منورو کاکا پیچھے پیچھے ہو لیے۔

ہلکی ہلکی مگر بہت خنک ہوا چل رہی تھی جس کا خاموش بہاؤ جذبات کو ابھار رہا تھا۔ چاروں طرف کھڑی ہوئی فصلیں بھی گویا سردی سے کانپ رہی تھیں۔ جو اہلکار کھیت کی رکھوالی کے لئے جاگ رہے تھے۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے لکڑیاں لیکر الاؤ میں ڈال رہے تھے اور ہاتھ سینک رہے تھے۔ کسی کسی کٹیا سے دانت بجنے کی اور سردی میں "ای-ای-ای" کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ جنگل بالکل سنسان پڑا تھا۔ کسی جانور یا پرندے کی آہٹ بھی نہیں تھی۔ کبھی لمحہ بھر کے لئے گہرا سناٹا ہو جاتا، اور پھر اس سناٹے سے ایسی آوازیں، دھیمے دھیمے سُروں میں پھوٹتی تھیں جیسے کوئی خاموشی کا دریا بغیر رُکے مسلسل بہہ رہا ہو۔ رات کی گھٹا ٹوپ سیاہی میں ستارے بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مبہوت ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ستارا ٹوٹتا تو ایسا نظر آتا گویا اس ظلمت کو توڑنے کی سعی کر رہا ہو لیکن بالآخر تاریکی کے بھیانک ہاتھ اُسے مسل دیتے تھے!

ایک کے بعد دوسرے کھیت کو پار کرتے ہوئے جھمکو چل رہی تھی، ناگاہ ایک آواز گونجی۔

"اے ۔۔۔ کھڑی رہ!"

جھمکو وہیں ٹھٹھک گئی اور سہمی ہوئی نگاہوں سے پیچھے دیکھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر منورو نیچے جھکنے کے بعد پھر چلتے آرہے تھے۔ رکھوالے نے دوسری ہانک لگائی۔

"کھڑی رہ۔ تو یہاں کہاں سے آئی ہے؟" منورو نے کچھ ہمت سے کام لیا لیکن جھمکو ڈر گئی: "اب کیا ہوگا؟" منورو نے جھمکو کے قریب آکر ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"ارے تو چلتی رہ۔ گھبرا نہیں، وہ تو تجھے گائے بکری سمجھ رہا ہے۔ تیز تیز قدم اٹھا۔"

جھمکو کے پیروں میں پھرتی آگئی۔ منورو کی اشارے پر وہ کھیت کے کنارے چلنے لگی۔ کبھی کبھی اس کی ساڑی کانٹوں میں الجھ جاتی تھی لیکن وہ ساڑی پھٹنے کی پرواہ کئے بغیر اُسے تیزی سے کھینچ کر پھر آگے بڑھ جاتی تھی۔

کھیت ختم ہو گئے۔ ندی آگئی۔ جھمکو کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ منورو نے کہا: "کھڑی رہ۔ میں ذرا ..." آگے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر! پہلے کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے ندی کا جائزہ لیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پانی پینے کے لیے آنے والے باگھ بھیڑیوں کی جگہ ہے۔ پھر دونوں ڈھلان پر اُترنے لگے منورو نے کہا۔

"اب ساتھ ساتھ چل۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔" جھمکو کو ڈر لگا۔ وہ بولی "کاکا اگر کوئی جانور پانی پینے کے لیے ...."

"تو میرے ساتھ ساتھ چل ۔۔۔ میں ہوں تو گھبرانے کی کیا بات ہو؟"

اگر اس وقت منورو اور جھمکو میں سے کوئی بھی ذرا سا غور کرتا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ انسان اگر کسی چیز سے ڈر سکتا ہے یا اگر انسان کو کوئی چیز ڈرا سکتی ہے تو وہ انسان ہی ہے!

ندی کا چڑھاؤ چڑھنے کے بعد وہ گھور جنگل میں گھس چکے تھے مگر اُن کی رفتار یہ بتا رہی تھی کہ وہ گویا گھاٹی پھلانگ کر کسی گاؤں کے قریب آ چکے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد دور سے الاؤ کی لپٹیں نظر آنے لگیں اب منورو نے قفلِ سکوت توڑا۔

"چھوری۔ تجھے دو چار دن یہاں مہادیو کے مندر میں

بیٹھا رہوں گا۔ جب گاؤں میں بات آئی گئی ہو جائے گی تو میں اسے لے جاؤں گا!"

جھنکو نے سنوروا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں — کاکا؟"

"کہیں بھی تجھے ٹھکانے تو لگانا ہی پڑے گا۔ جب شنڈی نکلی ہے تو شنڈا ابھی ہے۔"

بچاری جھنکو خاموش ہو گئی۔

ذرا دیر رُک کر پھر سنوروا نے کہا: "لیکن دیکھ یہاں تجھے بہت ہی سنبھل کر رہنا پڑے گا۔ اگر ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو پھر ہم زندہ نہ رہیں، تو مرے اور تیرا وہ مقصد بھی، گھر والی!"

پھر سنوروا نے گول مول لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ دو چار دن میں ہی جھنکو کے گھر کا ٹھکانا ہو جائے گا۔ جھنکو نے بھی یہ محسوس کیا، سنورکا کسی اچھے گھر میں اس کا ٹھکانا کر دیں گے۔

اس پیڑ سنوروا کے پاس کوئی فقیر بیٹھا اندر تپسیا کے لئے بیٹھا تھا۔ سنوروا نے آہستہ سے جھنکو سے "تو ذرا یہاں پیڑ کے پاس بیٹھ۔ میں ذرا بابا کو باتوں میں لگا کر راضی کروں۔"

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے سنورکا کہنے۔

"کون ہے؟" تقریباً ۵۰ برس کے ایک سادھو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور دھونی کی روشنی ہی میں آنکھیں گڑا کر دیکھ کر پہچان لیا۔ "سنور کھیا! تم اس وقت کیسے؟" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر "کیا اکیلا ہے؟" سنور کھیا دھونی کے پاس بیٹھ گئے اور ہاتھ لمبا کر کے تاپتے ہوئے بولے۔

"تمھارے پاس آ کر جھوٹ نہیں بولوں گا مہاراج ——— لیکن" یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

"یہاں آیا ہے تو بات بھی بتانی ہی پڑے گی۔" مہاراج ہنسے، بغل میں پڑا ہوا تمباکو کا بٹوا دیتے ہوئے بولے۔

"لے ذرا سلفہ بھر، کچھ گرمی آئے گی، پھر سب کچھ تو کہہ دینا۔"

سنوروا نے چلم بھر کر پہلے مہاراج کو دی پھر خود پینے لگے۔ دھوئیں کے بادلوں میں چھپی ہوئی نظروں سے مہاراج کی طرف دیکھا۔ عمر تو مہاراج کی سنوروا کے برابر ہی ہو گی لیکن سفید داڑھی اور جٹاؤں سے تقریباً ڈیوڑھی نظر آتی تھی۔ اُن کی گہری اور چمکتی ہوئی آنکھیں دھونی کی طرف لگی تھیں۔ اس لئے سنوروا زیادہ دیر نہ دیکھ سکے۔ یوں تو اُس سے پہلے مہاراج کو کئی بار دیکھا تھا، باتیں بھی خوب کی تھیں۔ مہاراج بھی جب کبھی سنوروا کے گاؤں میں آتے تو سنوروا سے ضرور مل کر جاتے تھے۔ اتنی شناسائی ہونے پر بھی سنوروا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی نظریں آج مہاراج سے کیوں نہیں مل رہی تھیں۔

سنوروا نے چلم ڈالی۔ مہاراج نے پوچھا "کہیں بات تو نہیں کوئی بگڑ گئی؟" اور پھر پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے "اب بتاؤ کیا بات ہے؟" اور پھر ایسی ہنسی اُن کے ہونٹوں پر کھل گئی جس میں یقین بھرا ہوا تھا۔

سنوروا کھسک کر ذرا قریب آ گئے۔ "بات یہ ہے مہاراج ..." کہہ کر بات چھیڑ دی پھر یہ بتایا کہ کبھی کبھی سرکاری کام کے سلسلے میں جو پٹواری گاؤں میں آتا تھا کس طرح اُس سے جھنکو کی آشنائی ہوئی اور پھر وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ ان واقعات کا تذکرہ کر کے جھنکو کے شوہر کی بے رحمی اور مصائب کا قصہ بھی سنایا پھر یہ بھی کہا جھنکو کی ماں اور اس کے بھائی نے تو اسے میرے سپرد کر کے کسی ٹھکانے لگانے کی التجا کی ہے اور دوسری طرف تینوں گاؤں کی پنچایت بڑھیوں کی برادری سب کے سب اس پر ہنگامہ کر رہے ہیں۔

"آپ کہتے ہیں مہاراج کہ کھیا کیسے آیا؟ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟ اگر کچہری میں جاتا ہوں تو عدالت پھر اسی کی تصدیق کر دے گی اور بالفرض اُس کا شوہر دوبارہ اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو گیا تو کیا وہ اسے جینے دے گا؟ یہ کسی بڑھئی کے گھر میں بیٹھی ہوتی تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ لیکن یہ، پتا ہے کتنی ہی اونچی برادری ہو، ہے تو پرائی جات!"

مہاراج بھی اُداس دکھائی دیتے تھے، بولے "یہ ذات پات کے جھگڑے بڑے ہیں۔" پھر کھیا کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے "اب وہ لڑکی ہے کہاں؟"

"یہیں ہے مہاراج!" کہتے ہوئے سنوروا چلے اور لڑکی کو بلا لائے۔

"ارے رے، تم نے بچاری کو ایسی سردی میں ٹھہرا رکھا تھا؟ بیٹھ جا بیٹا۔ آ، اِدھر آ کر ہاتھ تاپ لے۔"

جھکو دھونی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ مہاراج برابر اس سے قریب آنے کو کہتے رہے مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ مہاراج نے پیار بھری مگر ترش آواز میں کہا: "اری بدبخت، سردی میں ٹھٹھر کے کیوں مر رہی ہے؟" اور پھر خلا میں دیکھتے رہے۔

جھکو کی آنکھوں میں شاید آنسو تو ختم ہو چکے تھے لیکن آنسوؤں کی دھار کے نشان اور سرخی اس کے چہرے پر صاف آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج نے پوچھا۔

"ہاں تو پھر اس کا کیا کیا ہے؟ اسے یہاں کیوں لائے کھیا؟"

"میں تو آپ کے حوالے کرنے آیا۔ اب آپ جانیں اور یہ جانے!"

مہاراج کچھ ہنسے۔ "تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں نا؟ میں اس کا کیا کروں!"

"اور کیا کرتے۔ اسے جہاں مناسب سمجھیں ٹھکانے لگا دیں۔ مجھے تو اس سے زیادہ فکر گاؤں کے کنوئیں کی ہے۔"

"گاؤں کے کنوئیں بچانے تھے، پہلے اسے اِدھر لائے ہو کیا؟ مگر کل کلاں کو گاؤں کے لوگوں کو پتہ لگے کہ تم یہاں آؤ گے اور اس پر اسے مندر کو پھونک ڈالو گے! یہ بھی سوچا۔"

اور پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولے: "کیا اسے اتنی دور بھی چین نہیں لینے دو گے؟"

"تو پھر اس کا کیا کیا جائے مہاراج؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو کھیا؟" پھر کچھ سوچ کر بولے: "اس بیچاری کو کوئی اچھا سا ٹھکانا دیکھ کر لگا دو۔ کسی بھی ذات کا اچھا آدمی مل جائے۔ تم تو ضلع بھر کے ایک ایک گھر سے واقف ہو!"

"یہی تو مصیبت ہے مہاراج۔ اگر ضلع میں کوئی مل جاتا تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مگر ایک تو خوف سرکار کا۔ پھر آپس میں کٹا چھنی ہوتی ہے، پرائی برادری کو گھر میں بٹھانے کے لیے کون تیار ہو گا۔"

"یہ تو اب تم جانو کھیا۔" اور جھکو کی طرف ایک نظر ڈال کر پھر بڑبڑانے لگے: "ہمارے پاس یہ علت کہاں سے آ گئی؟"

کھیا بولے: "ٹھکانا تو میں لگا دوں گا مہاراج۔ ہماری طرف کے ایک سیٹھ احمد آباد میں رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں ہمارے علاقے کا ایک پٹیل کال کے دانے سے رہتا ہے اسکا نام چھمنیا ہے۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکا ہوا۔ وہ پٹیل تو اب مر چکا ہے مگر اس کا لڑکا دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے اور عمر کا بھی پختہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سیٹھ ہمارے ہاں آئے تھے تو ذکر کرتے تھے کہ اس لڑکے کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈیں، انہیں ذات پات کی فکر نہیں۔ لیکن مہاراج . . ."

"تو پھر اسے کیوں نہیں دیتے؟" مہاراج نے پوچھا۔

"لیکن وہ بھی وقت میسر ہو گا مہاراج۔ آج کل تو میں گاؤں سے باہر نکل نہیں سکتا۔ لوگوں کو وہم نہ ہوتا ہو گا تو بھی ہو جائے گا۔ دو چار دن کے بعد دیکھیں گے جب بات ذرا ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

آخرکار منوردا چار پانچ دن کے لیے جھکو کی رکھوالی کا فرض مہاراج کے سپرد کر کے کھڑے ہو گئے۔ ابھی چبوترے سے اتر رہے تھے کہ کچھ یاد آیا اور مہاراج کے پاس آ کر بولے: "لیکن مہاراج، اس بات کا پتا کسی کو نہ چلے مائی باپ! اگر وہ چار سال کے بعد بھی سرکار کو معلوم ہو گیا کہ جھکو فلانے ٹھکانے پر ہے تو دکھڑوں کی آفت تو آ ہی جائے گی، مجھے بھی تارے نظر آ جائیں گے۔ مجھے تو صرف اتنا ڈر ہے کہ کہیں نیکی کر کے دھکے نہ کھانے پڑیں!"

مہاراج کچھ ہنسے اور بولے: "بھروسا نہیں تھا تو اسے یہاں لائے کیوں؟" اور پھر کہنے لگے۔

"تم اپنی زبان قبضے میں رکھو تو بہت ہے۔" اتنے میں مہاراج کی نظر جھکو کے پھٹے کپڑوں پر پڑی، دیکھ کر بولے: "بیچاری کے کپڑے بھی کیسے پھٹے ہوئے ہیں!"

"وہ تو میں لیتا آؤں گا اس کی ماں سے۔ جب آؤں گا!"

منوردا نے جھکو کو تسلی دی اور ہوشیاری کے ساتھ رہنے کا مشورہ دے کر چل دیئے۔

چبوترے کی سیڑھیوں سے اترتے وقت محسوس ہو رہا تھا جیسے آس پاس بسنے والے لوگوں کے گھروں سے جو مرغوں کی بانگ آ رہی ہے وہ منوردا کے قلب کی دھڑکن کی صدا ہے، ککڑوں۔کوں!

خانہ تلاشی لے کر واپس آنے کے بعد موتی نے اپنی ماں سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا! ماں تو نے جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔"

"ارے چاچا! افضل نے تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک دی" ابا نے کہا۔

"تو بھی کیا بات کرتی ہے۔ منورما کو بھلا کون ٹھگ سکتا ہے؟ وہ ایک گرکشیر سے لے کر گھاس کے تنکے تک کھول کر دیکھ لیتے، پچھلے دروازے پر تو تالا لگوا کر رکھا تھا۔ بلا وجہ بیچاری کی عزت خراب کی، اس کی ماں کو جو گھر کے کونے میں بیٹھی تھی ڈانٹ پھٹکار دیا۔ لیکن وہ گھر میں ہوتی تو ملتی!"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" ماں کو کچھ کچھ اطمینان ہوا۔

لیکن موتی نے کچھ چڑ کر کہا۔ "ارے کیا سچ کہنا ہے؟ منورما کا تو بڑے بڑے بیٹھے بٹھائے نکال دیتی ہے ان تو دشمنی ہی ازلی ہو رہی ہے لیکن تو بھی بالکل بے وقوف ہے۔ دیا کاکا سے کہنے لگا، زندگی میں آج پہلی بار آنکھ نیچی کر کے لوٹ رہا ہوں، یہ تو میری بھی چپ اور تیری بھی چپ۔ والی بات ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی بات اڑ گئی اور راجا کو معلوم ہو گئی تو ہم دونوں پھنس جائیں گے کسی کے گھر کی خواہ مخواہ تلاشی لے لینا مذاق نہیں ہے۔" کہتے ہوئے موتی کھٹیا پر لیٹ گیا اور بولا "ابھی تو کل صبح وہ مجھ سے لڑنے کے لیے آنے والے ہیں۔" اس آخری جملے سے ابا کے چہرے پر طمانیت و سکون کے جذبات نمایاں ہو گئے۔

اور صبح ہوتے ہی منورما پیچ پیچ آدھمکے۔ ابا کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے بولے، "دیکھو اب اس مجرے کی مت پوچھنا کہ تو نے پیچ بیچ دیکھا تھا یا نہیں یہ تو تمہیں خود ہی سوچنا چاہیے کہ شاید اسے پاس سے گھر سے نکال ہی دیا ہو گا، تب بھی کوئی اپنے گاؤں میں کیا منہ دکھانے آئے گا۔؟" اور اٹھتے اٹھتے کہا: "میں نے اس بیچر کو دبا دیا ہے نہیں تو سرکار میں رپورٹ کر دیتا تو نکالی بکری، گھس گیا اونٹ، والی بات ہو جاتی۔ اس لیے یاد رکھو اب کسی کی بات پر کان نہ دھرنا آج کل تو اپنی آنکھوں دیکھی بات بھی جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے۔" اور جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے کہ یہ تو میں نے تمہاری صورت دیکھ کر کہہ دیا، ابھی کیا ہے ابھی تو لوگوں کی افواہیں سنتی جاؤ۔ کوئی کہے گا کھلیان میں دیکھا تھا کوئی یہ جبر چھوڑ کے ندی کے کنارے دیکھا تھا۔ تم کس کس کا کہا سچ جانو گی۔"؟

ابا نے بھی تسلیم کر لیا کہ منورما کی بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس نے بات کرنے والے کو اس سوال پر "کہیں منا چاچی کل کی بات کا کچھ پتا لگا یا نہیں؟"

نہ تو کسی بات کی امید تھی اسے جھوٹ بولنے کا الزام یا مقصد ہی۔

"مرنے دے میاں، بھاگ ہی آئے گی تو چھپے گی کہاں؟ اور نہ آئے گی تو ہمیں کیا مطلب۔ جو گئی سو گئی!" اور کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنے میکے گئی تو اس وقت بھی لوگوں نے کہا۔

"بہن سنا ہے کہ اس نے انکار تو بھگا دیا! لیکن پتا نہیں کہاں گئی۔ کیا تمہارے گاؤں میں آئی ہے؟" ان خبروں کا یا سوالوں کا جواب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں دیا کہ۔

"ایک بار بتا دینے کے بعد بہن اس کی بات کرنے سے کیا فائدہ" چونکہ گاؤں میں بھی کچھ کچھ بات پھیل گئی تھی کسی کھیت کے رکھوالے نے کہا کہ میں نے رات کو ایک عورت کو کسی شخص کے ساتھ اتر کی طرف جاتے دیکھا تھا اور دوسرے نے اس کی ماں جیسا لگا تھا لیکن تیسرے دن پن گھٹ پر بات کا یہ نتیجہ نکل آیا۔

"کچھ نہیں بہن، نہ تو ابا کو کچھ جانتی ہیں اور نہ منورما کا نے بیچر کے گھر کی تلاشی لی ہے یہ تو سب افواہیں ہیں یہی غنیمت تھا کہ بات اڑانے والے کا نام نہیں لیا تھا ورنہ اس بیچارے کی کھال کچن کی بات یاد دلا کر کہتی" وہ تو بچپن سے ہی جھوٹا پیالا ہوا ہے!"

چوتھے دن تو گاؤں میں ایسا لگتا تھا جیسے جھکو کے آنے کی کوئی افواہ اڑی ہی نہیں تھی۔

اگرچہ اس حادثے کو دوسرے سینکڑوں حادثات کی طرح لوگ بھول گئے لیکن ایک شخص اس کو نہ بھول سکا اور غالباً اپنی زندگی بھر بھولے گا بھی نہیں، اور وہ تھی جھکو کی ماں!

یا تو اس نے جھکو کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا تھا یا آج اتنی بڑی دنیا میں جھکو کے لیے کوئی جگہ نہیں! اگر ماں کا بس چلتا تو پھر وہ جھکو کو اپنے پیٹ میں چھپا لیتی۔ لیکن اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟ جھکو کی ماں کے منہ میں ایک لقمہ نہیں چلتا تھا لیکن لڑکے اور بہو کے ڈر سے زہر مار کر لیتی تھی اور وہی لوگوں کے سامنے بناوٹی ہنسی ہنسنا بھی پڑتا تھا۔ اس نے اس عالم میں دو دن تو گزار دیے لیکن تیسرا دن کاٹنا دوبھر ہو گیا، سارے دن وہ منورما کی اور ان کے گھر والوں کی چوکسی کرتی رہی کہ کب منورما چاچی اکیلے ہوں اور وہ اس سے جھکو کی خبر پوچھے۔

آخر دوپہر کے بعد ایک موقع مل گیا۔ جمنا نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ سویرے ہی ڈھور نکلنے سے پہلے منورما کا لڑکا کلو کھیت پر چلا گیا تھا اور ابھی ابھی دوپہر کا کھانا لے کر اس کی گھر والی بھی نکل گئی تھی۔

جمنا مٹھے کی ہانڈی لے کر باہر نکل گئی راستے میں ایک دو گھروں کے پھیرے لگا کر وہ سیدھی منورما کی چوپال میں آئی۔ اور اس طرح چاروں طرف دیکھا جیسے کہ چوری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے پھر ایک ٹوٹی ہوئی رسی کو گرہ دینے کے بہانے منورما کے پاس آ گئی۔

منورما نے اس کی طرف دیکھا، جمنا وہاں سے نیچے دیکھتی رہی۔ کیا بولیں یا کیا پوچھیں۔

یہ طے کرنے سے پہلے ہی منورما بول پڑے۔

"تم مٹھا لینے آئی ہو جمنا بھابی! لیکن یہاں کوئی ہے نہیں، تھوڑی دیر بعد آتا تو......"

جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جمنا نے ایک دم پوچھا۔

"ایں، منور لالا وہ بھاگوں جلی کہاں ہے؟ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا...؟"

منورما نے قدرے جھلاہٹ سے کہا۔

"بھاڑ میں پڑی ہے اور کہاں....؟" پھر آنکھیں نکال کر بولے "مہربانی کر کے تم چلی جاؤ کسی کو شک نہ ہوتا ہو تو بھی....."

نہایت کوشش کرنے پر بھی جمنا اپنے آنسو نہ پی سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسو اس طرح بہہ نکلے جیسے کسی دوسرے کی آنکھوں سے نکل رہے ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی۔

"اتنا تو بتلا دو منور لالا، وہ زندہ ہے یا..." اور باقی الفاظ سسکیوں میں کھو گئے۔ منورما کے چہرے پر جذبات کی پرچھائیاں اس وقت دیکھنے کے لائق تھیں، وہ کہنے لگے کہ بولے۔

"یہ تو ناداں کی دوستی جی کا جنجال ہو گیا۔" اور کواڑ کھول کر اندر جانے لگے۔

جمنا نے مٹھا لینے کے بہانے رسوئی گھر میں جاتے ہوئے منورما سے پھر پوچھا۔

"ایں، منور لالا...... وہ ہے تو...... زندہ یا... نا؟"

منورما جھلا اٹھے "ایک بار کہہ تو دیا کہ مر گئی۔!" پھر بڑے تیکھے لہجے میں چمک کر بولے۔

اس کلموہی کی خبر پوچھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ تمہاری زبان کیسے کھل جاتی ہے" اور رسوئی گھر میں جاتے ہوئے بولے "اللہ جیسی اس بہو کی تو کیسی سالگرہ گھونٹ دیا ہوتا!"

پھر مٹھا لے کر باہر نکلے۔ اس کی ہانڈی میں مٹھا ڈالتے ہوئے جمنا کی طرف دیکھے بغیر، جو آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی، انہوں نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ۔ پوچھنا ہی ہے تو دو دن بعد آنا۔" پھر ایسے کچھ کہنے لگا خود بخود بات کر رہے ہیں، "میری عقل ساری کیا ماری گئی جو اس جھگڑے میں کود پڑا۔"

"لیکن مجھے اس کی کوئی خبر......"

منورما آپے سے باہر ہو گئے "کہہ تو دیا ابھی فضیحت کیا چاہیے، اب لو کرے گی!" پھر کچھ ساجت کے انداز میں بولے "معگوں کے لئے تم چلی جاؤ۔" اور برتن رکھنے کے لئے اندر جاتے ہوئے "لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ باپ جیسا بیٹا اور ماں جیسی بیٹی ——— مجھے تو یہ حیرت ہے کہ اسے لڑکی کہنے کے لئے اس کی زبان کیسے کھلتی ہے۔"

جمنا نے بڑی مشکل سے سسکیوں پر قابو پایا پھر بولی "جانے جو کچھ ہو..... پھر بھی تو بیٹی...... پیٹ میں رکھا ہے...... کیسے بھول جاؤں؟"

"اس کی جگہ اگر پتھر رکھا ہوتا تو اچھا تھا کہ سکم ہمارے تمہارے کپڑے دھونے کے کام ہی آ جاتا" پھر کواڑ بند کرنے کے لئے اٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"اچھا اب چلی دو۔ کواڑ لگانے دو۔ کوئی سن لے گا تو پھر...."

"جمنا نے مٹھے کی ہانڈی اٹھاتے ہوئے پھر ہمت کر کے کہا"

"اتنا تو بتا دو منور لالا وہ ہے تو یہیں آس پاس نا؟"

"جہنم میں گئی منور لالا" یہ کہہ کر کواڑ لگائے بغیر ہی چوپال میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھنے کے لئے مڑے "ایسے ہی لاڈ چاؤ سے تو لڑکی کو خراب کر دیا۔ اب کچھ کمی رہ گئی ہو تو زیادہ چاؤ چونچلے کر کے غریب بچاری کے بچوں کو بھی بگاڑ دو۔ تو کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔!" پھر رستی بٹنے کا شغل کرنے لگے ——— باہر نکلنے لگی تو جمنا کے کانوں میں آواز آئی۔ اتنا فضیحت ہونے پر بھی ماں کو شرم نہیں آتی۔ پھر لڑکے کا تو کہنا ہی کیا" دوسرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنائی نہ دیئے پھر بھی جمنا سمجھ گئی کہ کچھ بھی کرو، آخر ذات کے کمین ہو کمین جمنا کا یہ حال یہ حال تھا کہ جو کسی ماں کو شی میں منہ دے کر رو دے وہ کتنی ہی بھولی اور بردبار سہی "ماں جیسی بیٹی" والے طعنے پر تو بپھر ہی اٹھتی لیکن اس وقت وہ مجبور تھی چوپال سے اترتے وقت اس نے

جنتا کے آنسو سوکھ گئے تھے تو اس کی سانس بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ وہ بولی "کیسا بھولا بالا صرف سمجھتا ہے بیٹا۔ جب تا آگ کی تو نہ دیر تب تجھے پتا، بھلے ہی لوگ نے کسی دشمن کے ہاتھ بیچ دیا..."

بچھڑا ایک دم اس طرح ہوا جیسے وہ تنگ آگیا ہو۔ "ماں، کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہے، گھر سے باہر جانے دے..."

"میرا بیٹا۔ ہر دھوں سنبھلو، باتوں بھلو۔" اس کی آواز میں تلخی لیے غصہ شامل تھا کچھ بے نیازی بھی شامل ہو گئی "میرا بیٹا۔ شکر ہے میرا اب بھی اگر کوئی الجھن ہے تو میں بھی تمہارا رستہ الگ ڈھونڈ لوں گی۔

پھر......"

"ماں...... تجھے کس نے جلایا ہے؟ تیرے پیر پڑتا ہوں، تو اٹھ جا یہاں سے۔ میں کل پوچھ آؤں گا لیکن اس وقت چلی جا۔ ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں..."

"کس نے میرے بچے ......"

"کل کیوں پرسوں جانا؟" طنز، نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جنتا نے کہا۔ "تو، تو ضرور پوچھنے جائے گا! تیری شکل ہی کہہ رہی ہے!" پھر کھڑے ہو کر کہنے لگی "میں خود ہی جاتی ہوں، دیکھوں آج وہ کیسے جواب نہیں دیتا۔"

ماں کے الفاظ سے زیادہ اس کی صورت دیکھ کر بچھڑ گھبرا گیا۔ وہ کھڑا ہو کر بولا۔

"تو فکر کیوں کرتی ہے ماں؟ میں ضرور پوچھ آؤں گا!"

ماں کچھ رک کر بولی "پھر کب؟ جب وہ کہیں ٹھکانے لگ جائے گی تب؟" یہ کہکر چلنے لگی۔ بچھڑے نے سامنے آکر راستہ روک لیا۔ "یہ کوئی پوچھنے کا طریقہ ہے ماں؟" اس نے دیکھا کہ ماں نے اس کے احتجاج کا مطلق اثر نہیں لیا اور چلنے لگی بچھڑے نے کہا "سچ کہتا ہوں ماں کہ میں گھر میں آگ لگا کر نکل جاؤں گا۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کر کبھی!"

اسی وقت دھڑ سے گھر کے کواڑ کھلنے کی آواز آئی۔ شاید بچھڑ کی گھر والی یہ سب سن رہی ہوگی وہ ان دونوں کے سامنے آکر بولی "کیوں اپنے ہاتھوں اپنا مذاق اڑواتے ہیں؟" اور ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی "بٹیا نے تو نیند حرام کر لیا ہے تم اور ڈھول پیٹنے والیں! اوہو، ہو۔ بٹیا کے بغیر تو جیسے سورج ہی نہیں نکلے گا! ۔ چلو، سو جاؤ۔"

"چپ چاپ......!" اور گھر کے کواڑ بند کر دیئے۔ بچہ ماں ماں پکارتے

بچھڑ گی پھر کی بیوی نے اسے اچھی طرح پیٹ کر کھاٹ پر لٹا دی۔ ساس کو سنانے کے لئے یہ بھی کہا "لاڈ کرنے والے اور بھولی بنا کر بٹیا کو پڑھاؤ گی ۔۔۔ ہاں!"

لیکن اس وقت جنتا کا دھیان بہو کی باتوں میں یا بچے کے رونے میں نہیں تھا۔ وہ تو دنیا کے کسی نامعلوم گوشے میں اپنی آنسو بہاتی ہوئی بٹیا کا تصور کر رہی تھی آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسوؤں کی دھار کا بھی شاید دھیان نہ ہوگا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کیسے سوا سیر گھیسے جا کر خوب بھلا بُرا کہہ ڈالیں۔ لوگوں کی پرواہ کئے بغیر وہ کے جواب دینے والے سورما کو وہ کوستی کاٹتی رہی۔

x x x x x x x

کا بجے اور جنتا مکھیا کے گھر بھی پہنچی۔ لیکن وہ گھر نہیں تھے۔ ان کی گھر والی نے کہا "جنتا بھابی وہ تو کل شام سے شہر گئے ہیں" جنتا کے قدم جیسے وہیں گڑ گئے ہوں۔ اس کے بدن سے جیسے جان نکلنے لگی ہو اس نے پوچھا۔

"واپس کب آئیں گے؟"

مکھیا کی گھر والی نے پان کی ڈبیہ جنتا کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ خبر نہیں بھابی۔ کہتے تھے کہ شاید دیوان صاحب کے پاس بھی جانا پڑے۔ نہ کی مرضی وہ بے کی جھگڑا پڑا ہوا ہے ۔۔۔ تم بیٹھو تو سہی!"

"نہیں اب تو جاؤں گی۔" جنتا مشکل سے کہہ پائی لیکن چلتے چلتے پھر پوچھا۔

"کب تک لوٹیں گے؟"

"کیا بتاؤں بھابی۔ شاید دو دن میں آجائیں۔ اور نہ آئے تو پانچ دن نہ آئے۔ سرکاری کام کا کوئی ٹھکانا تھوڑا ہی ہوتا ہے!"

جاتے ہوئے بھی جنتا نے پوچھا۔ "اکیلے ہی گئے ہیں یا گاؤں کا کوئی دوسرا آدمی بھی ساتھ تھا؟"

"کیا کہتی ہو ۔۔۔" مکھیا کی گھر والی نے ڈبیہ سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کل ہی چوپال میں گاؤں کے آٹھ دس آدمی جمع تھے، اس وقت انھوں نے بہتیرا کہا کہ ۔۔۔ ارے بھیا ایک آدھ تو ساتھ چلو، لیکن سب ہی چپ سادھ گئے ۔۔۔ دیر ابھائی سے تو بہت کچھ کہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کون اپنے گھر کام چھوڑ کر جانے کو

ایک لمبی سانس بھر کر خون کا سا گھونٹ پی لیا۔ آنکھیں پونچھ کر چہرے پر مصنوعی ہنسی بکھیر لی اور سر جھکا کر آہستہ سے گلیارے سے گزر گئی۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو پھر آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور مٹھے کی ہانڈی رکھتے رکھتے دل بھر آیا۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی، ایک ہی خیال ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ میں چل رہا تھا اور برچھے کی طرح دل چھید رہا تھا حرام زادے نے لڑکی کو نہ جانے کہاں غائب کر دیا۔ کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا...."

اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا اس لئے جی بھر کر روئی۔ رونے سے کچھ تو ڈھور باندھے، بھوکے ڈر سے تھوڑا سا کھانا حلق سے اتارا اور سیہال میں اللاؤ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو بچھیرے بولی

"بھیا تو سوروں کا تاسے پوچھ تو دیکھ ـ"

"کیا پوچھوں"؟ بچھیرے نے لیسے رنگ کے انداز میں کہا جیسے وہ خود سمجھ رہا ہے کہ میرا یہ سوال فضول ہے۔

جمنا نے سوچ سوچ کر کہا۔ "یہی کہ وہ بھاگوں جلی ہے کہاں؟ زندہ ہے یا ـ ہے"

"مر گئی ہوگی تو کیا بگڑ جائے گا۔" پھر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے پوری طاقت سے سانس کھینچ کر کہا "مر گئی ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا!

پر تو ذرا پوچھ کے تو دیکھ"

"یہ آخر تو کیا سوچ کر کہہ رہی ہے ماں؟" پھر آنکھیں چمکا کے بولا "میں کیا منہ لے کر پوچھنے جاؤں"!

ماں بڑے تھکے اور مایوسانہ لہجے میں بولی "ہائے رام ـ تو ایسی بات کیوں کہتا ہے۔

بچھیرا ـ ذرا سوچ تو سہی کیسی بھی ہو آخر ہے تو تیری سگی بہن۔ جب تو بھی....."

بچھیرا بگڑ گیا "بہن؟ کیسی بہن؟ جب تھی، تب تھی، اب اس سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں کان کھول کے سن لے ـــ "

ماں ناک صاف کرتی ہوئی بولی "بھاڑ میں گیا رشتہ ناتا ـ ناتا نہیں رکھتا مت رکھ مگر اتنا تو پوچھ سکے ....." وہ رونے لگی۔

بچھیرے کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا "تجھے غرض ہو تو پوچھ آ ـــ بڑا بہن نے نیک کام کیا ہے جس پر پوچھنے جاؤں۔" پھر ماں کی طرف ہاتھ اٹھا کر نفرت آمیز لہجے میں کہا: "تجھے ذرا سی بھی غیرت ہو تو اب کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لانا!"

"کیوں نہیں لاؤں۔ ضرور لاؤں گی۔ آخر وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کی...."

بچھیرے کی رگ رگ میں جیسے زہر گھول دیا گیا ہو۔ وہ دانت پیس کر بولا "غصہ تو اتنا آتا ہے کہ ماں بیٹی دونوں کو.... لیکن کیا کروں۔ سوچ کے رہ جاتا ہوں۔"

"تیرے بھاؤں تو وہ مر گئی۔ لیکن نہ جانے بیچاری کہاں.... کس کے پاس...."

ماں کی ان باتوں سے بچھیرے کا رتاب کھا رہا تھا غصے سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ دانت پیس کر بولا۔ سامنے سے چلی جا کہیں جا کر وہ بسر جس سے تجھے چین تو آ جائے۔"

کچھ توقف کر کے بولا "سچ پوچھو تو تو نے ہی اسے بگاڑا تھا۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ ماں رہنے دے ہمیں یہ دو دن روز نہیں چاہئیں لیکن تو مانے تب نا؟ میں جانتا تھا کہ تو میرے منہ پر کلنک لگوا کے رہے گی۔" پھر سانس لینے کے لئے رکا اور ماں کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو یہاں گھر میں بیٹھنا ہوتا ہے اس لئے اپنی پٹیا دو سر پر چھوڑ کے گئیں تو باگ پنچوں میں جا کر بیٹھتا ہوں، جو بات ہوتی ہے، سب وہی چلتا ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اور کیا کیا انگلیاں اٹھتی ہیں؟ مجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں تو انگلیاں آپ ہی اٹھیں گی۔

کون سا ہے وہ دنیا کا دھویا راجا کا بیٹا....؟"

"سب چمار ہیں! لیکن اس سے کچھ کیا؟" پھر تن کر بولا "تجھے خبر ہے اب تک پنچوں میں بچھیرے کی چلتی تھی سب اس کی بات مانتے تھے ذرا سی بات ہو تو پنچ پوچھنے آتے تھے لیکن...." دانت پیس پیس کر وہ آگ اگلنے لگا "لیکن تیری لاڈلی نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا مگر مجھے منہ دکھانے قابل نہیں رکھا۔ تو بیٹا بیٹا کیا کرتی ہو؟

اس نے تو میری سات سات پیڑھی کی کمائی...." اور غصے میں بات نگل لی "جانے کیا کرتا۔

...." پھر کچھ ٹھنڈا ہو کر آپ ہی بولا "ہنھ ـــ اگر میں اس بیرن کی خبر لینے جاؤں تو لعنت ہے۔

مجھ پر ـــ!"

[illegible] ہم لوگ کیا غریب اس علاقے تک اسے جانا ہی تھا کیا پھر کس کا سہارا لے کر جیتی۔" وہ چیخ رہی تھی۔ "آخر کیا حیثیت تھی ابھی میری۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ [illegible] ہے کہ رات میں اس سہارے کا ساتھ ہو گیا اس لئے......"

جتنے منہ تھے سب ہی رات کو میں بولا پڑی۔ "جھوٹ سب جھوٹ کہہ گا۔"

پھر کچھ رک کر بولی۔ "اچھا میں جاتی ہوں" اور چل کھڑی ہوئی۔

× × × × × × × × ×

ماں کو چوپال میں آتے دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھا۔ "کہاں ماں؟"

"گھر بیٹے یہیں ہی ماں!" بڑی مشکل سے بول سکی۔

"ارے ہاں وہ تو جانتے ہو گئے مجھے بھی ساتھ......"

وہ بیٹے کو بھی دیکھتے رہتے جتنا کہ کہ زندہ گیا۔ تیرا باپ تھا نے نہیں گیا۔ اس کے منہ سے ایک سسکی نکلی اور جھک کے پاس بیٹھ کے رونے لگی۔ "بیٹے دکھ تم کو خبر بھی نہیں ملے گی۔" کہ سکتہ سا ہو گیا اس کے دل سے آواز نکل رہی تھی...... تھوڑا سی دیر سامنے دیکھ کر بیٹھ دیا...... یہ سوچتے سوچتے وہ زمین پر گر پڑی۔

زمین پر پڑی ہوئی ماں کو منہ ڈھانپ کر روتے دیکھا تو چپ چاپ وہاں سے ہی پلٹ گیا۔ اور بڑبڑایا "میں تو کہتا ہوں کہ تو بھی مر جاتی تو جھگڑا ہی ٹک جاتے۔ دو چار دن کے لئے برادری سے باہر بھی ہو جاتا ہوں تو کیا بگڑ جائے گا۔ تم سب مل کر میری جان کھائے لیتے ہو۔"

اور وہ دور رکتی ہوئی جھکتا گیا — شاید ابھی جینا تھا اسے۔ اس کو خیال ہوا۔ "شاید بتلانے ہی گئے ہوں گے!" صاف صاف انکار کرتے ہوئے تو وہ جھجک رہی تھی لیکن ابھی سے اس کی آنکھیں سامنے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں جیسے کسی بھید کا انکشاف ہونے والا ہے۔

ہاں اسے کسی کے آنے کی خبر ملتی تو اس سے پوچھتی۔

"کیوں بھیا، منورا لالہ تھے؟" لیکن وہ آدمی انہیں کہاں دیکھ لیتا۔ منورا تو کل شام ہی گاؤں کی سرحد سے نکل کر اپنی طرف مڑے تھے۔ راستہ کچھ لمبا ضرور تھا۔ لیکن خیالات کی ادھیڑ بن میں پتا بھی نہیں چلا۔ رات کو قریب ۹ بجے وہ مہاراج کی دھونی کے سامنے جا کھڑے ہو گئے۔

"کون ہے رے؟ اوہو! منورا کیا؟" اور منورا اسے کی طرف

سر کو کے آواز دی۔

"ارے پگلا! کہاں گئی تھی اکیلی ہے یا نہیں" اسی اثر سے منکسر ہو جانے کی نظر سے بولے۔

"یہ منورا ۲۲ آیا ہے منصب دار تو آ... مہاراج جھکو سے بات کرتے وقت 'ہے' کو 'ہے' کہہ کر بات کرنے میں بے حد کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے منورا سے کہا، رات کو بھی باہر نہیں نکلو۔ بڑی مشکل سے تو زیادہ پڑھتا ہے۔"

جھکو دلیزہ کی کرتی رہی۔ مہاراج کے منہ کچھ کہنے سے پہلے منورا بولے۔

"یہیں کھڑی ہے دیکھو۔" اور بغل میں سے ایک پوٹلی نکال کر اس کی طرف سرکاتے ہوئے بولے۔

"لے — یہ کپڑے تیری ماں نے دیئے ہیں!"

جھکو نے دھونی کی دھندلی روشنی میں ان کپڑوں کو ایک آدھ بار الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اس سے باقی روشنی نہ ہونے کے کارن کہ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اچھی طرح دیکھا جا سکے۔ بہرحال مہاراج نے پوچھا۔

"اس میں کیا دیکھتی ہے؟ تیری ماں نے ہی تو بھیجے ہیں" مسکرا کے بولے۔

"پہلے تیرے نہیں ہوں لیکن اب تو تیرے ہی ہیں نا؟" پھر منورا کی طرف تائید طلب لہجے میں بولے "کیوں منورا؟"

منورا ایسے چونکے جیسے ابھی کسی خواب سے جاگے ہوں۔ ہکلاتے ہوئے بولے۔

"ایں، ایں، ہاں۔ ہاں اسی کے تو ہیں!" پھر ایک گہری سانس بھری۔ لیکن جھکو اتنا تو جانتی ہی تھی کہ یہ کپڑے دوسرے کسی کے بھی ہوں اس کے یا اس کی ماں کے ہرگز نہیں۔ اس نے اپنے دل سے نکلتی ہوئی آہ کو بھی کپڑوں کے ساتھ ہی لپیٹ لیا اور اندھیرے کی طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

مہاراج کے منہ سے بھی ایک گہری سانس نکل گئی۔ منورا کو ایک دم تمباکو کا خیال آ گیا اور بھرنے لگے۔ ان کے چہرے پر تاثرات کی جو الجھنیں نمایاں تھیں ان کا سلجھنا مشکل تھا اگر مہاراج اپنے دھیان میں مست نہ ہوتے تو وہ بھی یہ دیکھ کر چاہے دریافت

نہ کرتے لیکن کسی خیال میں ضرور کھو جاتے۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج پھر بولے "بڑی سیدھی لڑکی ہے" اتنا کہہ کر منورما کی دی ہوئی چلم منہ سے لگالی، اور جیسے کوئی انجن آرام سے کھڑا ہوا تھوڑا تھوڑا دھواں نکالتا رہتا ہے اس طرح وہ چلم پیتے رہے۔ پھر منورما سے یہ تذکرہ چھیڑا کہ وہ کب اور کہاں جانے والے ہیں۔ انھوں نے جھمکو کے لئے کچھ ہدایتیں اور مشورے دیئے

جھمکو نے ان چار دن کے قیام میں ہی مہاراج کے دل میں گھر کر لیا تھا اور مہاراج کو بھی اپنی بیٹی کی طرح بلکہ اس سے بھی شاید کچھ زیادہ اس کی فکر رہنے لگی تھی۔

جھمکو کی بے سہارا زندگی دیکھ کر ان کا اور بھگوان کا ناتا کچھ ڈھیلا پڑنے لگا تھا دنیا کی ہر نیکی اور بدی کا تعلق براہ راست بھگوان سے سمجھنے والے مہاراج کو بھگوان کی یہ بے رحمی نظر آئی تھی اور وہ دل ہی دل میں سارا غصہ سماج پر اتارتے تھے۔ آخر میں وہ بھگوان سے بھی بیزار ہونے لگے۔ "سمجھ میں نہیں آتا بھگوان! کہ یہ سماج کتنا بڑا شیطان ہے، انسان اس سے ڈرتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنے بچوں کو تباہ کر دیتے ہیں، مگر کیا تو بھی اس سے ڈرتا ہے؟" ایسے ایسے کتنے ہی خیال ان کے دل میں آتے تھے۔

مہاراج نے کمبیا کو چلم دیتے ہوئے کہا "تم سو جاؤ کمبیا میں مرغ کی پہلی بانگ پر ہی جگا دوں گا۔" اور پھر خود بھی لیٹ گئے۔ آنکھیں تو بند کر لیں مگر دل ان کا بے چین تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے برسوں کے بعد بھی ان کا دل کوئی سکون کا گوشہ تلاش کر رہا ہو، کسی گرم آغوش کی تمنا یا زندگی کا کیف برساتی ہوئی کسی کی آنکھوں کو یاد کر رہا ہو۔

کمبل اوڑھے مہادیو کی بغل میں لیٹی تھی۔ اسے خود بھی شاید یہ خبر نہ ہوگی کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے، لیکن بے قراری جاگ رہی تھی۔ "اب مرغا بولے گا، اب اٹھ کر چلنا پڑے گا۔" جھمکو اک دم چونک کر اٹھ بیٹھی اور دوبارہ آواز سننے کے لئے کان لگا کر بیٹھی رہی جب کوئی آواز نہیں آئی تو اضطراب کچھ کم ہوا۔

پھر۔۔۔ جیسے دور سے آتے ہوئے کسی شخص کی راہ دیکھ رہی ہو۔ مرغے کی آواز پر کان لگے ہوئے تھے۔ "وہ بولا۔۔۔!"

اور پھر تو سچ مچ مرغے کی بانگ سنائی دینے لگی، پہلی، دوسری پھر تیسری۔۔۔ اس نے آوازیں گن بھی لیں۔۔۔ اگرچہ جھمکو کچھ بولی نہیں لیکن تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مرغے سے کچھ کہہ رہی ہو،

"ہٹ حرامزادے۔۔۔ بولا، تو خیر کر تھوڑی دیر پہلے بولا تھا نا۔" مرغے کی آواز نے، جو ارتھی کے بلاوے کی طرح معلوم ہوتی تھی، جھمکو کو مایوس اور بے طاقت کر دیا۔

مہاراج سے پہلے ہی منورما کی آنکھ کھل گئی اور جلدی سے جھمکو کو بھی جگا دیا۔ باہر نکلتے ہوئے بولے "ذرا جلدی کر، منہ دھو، ہاتھ دھو کر تیار ہو جا۔

بس جلدی چل۔ کپڑے نہ بدلے ہوں تو کوئی بات نہیں۔ دھرم شالہ میں تو پرانے ہی چلیں گے۔" اور پھر جہاں سوتے تھے وہاں سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی اٹھا کر دیتے ہوئے بولے "لے سنبھال لینا۔ چل، جلدی کر۔ ذرا ٹھہر میں دیا جلا لوں"

دھونی میں سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اٹھا کر دیا جلایا اور جھمکو کو دے دیا۔

مہاراج بھی جاگ کر تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ منورما کی بھری ہوئی چلم کا دم لگاتے ہوئے دروازے میں کھڑی جھمکو کی طرف دیکھ کر بولے

"ارے، تو نے کپڑے نہیں بدلے؟ ایسے کپڑے پہن کر راستے میں کیسے جائے گی! جا بدل لے۔"

منورما کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ جھمکو کو اندر جاتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جھمکو کپڑے بدل کر آ گئی۔

منورما کی نظر اس پر پڑی، مگر ایسے ہو گئے گویا دیکھا ہی نہیں اور لکڑی سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ "اب چلوں مہاراج!"

دنیا میں ایسی بھی محبت ہوتی ہے جسے نہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے نہ آبیاری کی۔ اور نہ کوئی دوسری پروان چڑھانے والی چیز درکار ہوتی ہے۔ انھیں زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کی بھی پروا نہیں ہوتی وہ تو جب اور جہاں چاہیں پھوٹ نکلتے ہیں اور لمحہ بھر میں اچھا خاصا تناور درخت بن جاتے ہیں۔ جھمکو کے معاملے میں مہاراج کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ دنیا کی مایا سے بے تعلق رہنے کے لئے جنگل میں قیام کرنے والے اس ویراگی کے دل میں مایا کا بیج پھوٹتے ہی وہ وارفتہ ہو گئے۔ انھوں نے آنسو بہاتی ہوئی جھمکو کو سینے سے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تھا جیسے وہ ان آنکھوں کے دو چھلکتے آنسوؤں کو اپنے سر پر جھکا
سے ہوئے جھمکو سسکیاں بھرنے لگی۔ ظاہر میں یہ منظر ایسا لگ
تھا جیسے ... باپ والے باپ کو رخصت کر رہی ہو لیکن
اس کا طور پر بہت فرق تھا۔ جھمکو تو اپنے بزرگوں سے اپنی
سہیلیوں سے اور دوسری چیزوں سے دوبارہ ملنے کی اُمید بھی تھی
امکان بھی تھا۔ احساس سے کچھ اطمینان بھی ہوگا لیکن جھمکو کے لئے
تو ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ گاؤں کی سہیلیوں نے تو ایک طرح اُسے
دھتکار ہی دیا تھا اور آئندہ اُن کے ملنے یا اُنہیں منانے کی کوئی اُمید
بھی نہیں تھی۔ جب وہ گھاس لینے آتی تب ان درختوں پر چڑھتی
تھی کھیل کود کرتی تھی۔ وہ کبھی کبھی یہاں سکھیوں کے ساتھ گاتی بھی
تھی اس جنگل کو اور اس نو نور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی
اب تو اس علاقے میں آ کر جھانکنا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس
کے تمام روابط اور تعلقات یہاں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہے تھے!
پھر آس پاس پھیلے ہوئے چھپڑوں سے مرغوں کی بانگ سنائی
دی کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے منوروا نے کہا:
"مہاراج اب اٹھیے راؤ دو۔ ہم چلیں!"
جھمکو کو چھوڑتے ہوئے مہاراج بولے "میں کیا اٹھیں راؤ دوں کمینا!
یہ جو کچھ ہے ٹھیو لو کہہ رہے یہ آنسو ایسی جگت بہہ رہے ہیں کہ یہ آنسو
ہی اپنی مصیبتوں کو دھو دیں گے" کچھ رک کر بولے "اور اگر نہ دھو سکے تو..."
آگے نہ بول سکے یا بولنا مناسب نہ سمجھا تو وہ چپ ہو گئے۔
منوروا ان باتوں کا مطلب سمجھے بھی یا نہیں یہ تو کون جانے لیکن قدم
اُٹھانے سے پہلے بولے "ٹھیک ہے مہاراج! اور پھر ہاتھ اُٹھا کر اچھا تو
نارائن مہاراج" کہتے ہوئے چلنے لگے۔
مہاراج جھمکو کو سینے سے ہٹا کر مشکل سے کہہ سکے۔
"جا بیٹی۔۔۔ بھگوان پر بھروسا رکھنا وہی سنبھالے گا۔"
"میری ماں سے۔۔۔۔"
جھمکو آگے نہ بول سکی اس نے پیٹھ پھیر لی، مہاراج نے کہا "اچھا اچھا
تو جا۔ وہ تو میں اُسے سمجھا دوں گا سب بات کر دوں گا!" پھر منوروا سے کچھ
سفارش کر کے جھمکو کو بھی نصیحت کی۔
"بیٹی پردیس میں جا کر ایسا کچھ نہ کرنا جس سے لوگ تماشا دیکھیں
فکر نہ کرنا منوروا تیرے باپ جیسا، تیرے ساتھ وہ خود بھی تیرا

ابھی طرح خیال رکھے گا۔ جا بھگوان تیرا بھلا کرے!"
اگرچہ ابھی دیر بھی نہیں ہوئی تھی پھر بھی نہ جانے کیوں منوروا کے
دل میں ... ہو رہی تھی۔ مٹھی بی، منوروا نے مہاراج کو پھر سے
پرنام کر کے چلنا شروع کر دیا۔
جھمکو پیچھے پیچھے چلنے لگی۔
جب تک وہ دونوں جھاڑیوں کی اوٹ میں اوجھل نہ ہو گئے مہاراج
کھڑے کھڑے اُن کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک لمبی سانس بھر کر
سوچنے لگے۔
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ قدرت کے ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ بھلا ہے"
اُن کے چہرے پر عجیب تاثرات پیدا ہونے لگے۔ جن میں شکوے کے
خطوط بھی شامل تھے۔ اسی لئے تو اس میں اتنا مزہ ہے لیکن
پھر انہیں سے جھمکو کی یاد آئی اور دل میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ٹھنڈی
سانس بھر کر رہ گئے۔
اور جنگل پار کرتے، گھر چھوڑ کے جانے والی جھمکو کی آنکھوں
کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔ پچھلی رات کا چاند جو کچھ ہی دیر پہلے طلوع
ہوا تھا اب اپنی دھندلی روشنی بانٹتی ہوئی جھمکو کی پشت پر چمک
رہا تھا لیکن جھمکو کا راستہ اس کی اپنی ہی پرچھائی سے تاریک ہو گیا تھا
چونکہ جھمکو کی زندگی کے جذباتی سفر کا راستہ اس سے زیادہ تاریک تھا
اس لئے وہ اس وقت راستے کی تاریکی پر فکر مند نہیں تھی۔ آنکھوں
سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی دھار کا بھی اُسے خیال نہیں تھا صرف
ایک بات کی فکر اور خیال تھا اور وہ یہ کہ ۔۔۔ ہر ہر قدم وہ اپنے وطن
سے دور ہوتی جا رہی ہے، بے تعلق ہوتی جا رہی ہے!
سکھ دکھ کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں جن
باتوں کا اُسے کبھی دھیان بھی نہ آیا تھا ان کی حقیقت اس وقت معلوم
ہو رہی تھی۔ سارا جنگل اس کے درخت۔ یہ پگڈنڈیاں، یہ سب
کچھ ابھی تک تو اس کے تھے لیکن اب یہ دیکھنے کو بھی نہیں ملیں گے۔
اپنی مادرِ وطن کی محبت کا صحیح اندازہ تو وہی کر سکتا ہے۔ جو کبھی وطن سے
دور رہا ہو۔۔۔ یا ہمیشہ کے لئے اُسے جدا ہونا پڑ رہا ہو۔ آنسوؤں
سے قیمت ادا کرنے والی جھمکو، اپنے گمبھیر چہرے سے، اور گہری محبت
بھری آنکھوں سے اُن درختوں کو دیکھتی اور نگاہوں کی زبان سے
کہہ رہی تھی ۔۔۔ التجا کر رہی تھی!

"اگر میری ماں کبھی دن ادھر آئے تو کہہ دینا کہ جھمکو کو ہم نے دیکھا تھا وہ اسی راستے سے گئی ہے"۔۔۔

تقریباً چھ برس فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ دونوں ندی کنارے آکر ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ منوردا نے ماچس جلا کر چلم سلگائی۔ اُن سے ذرا فاصلے پر، ایک پتھر پر پاؤں سمیٹے ہوئے، ایک ہاتھ ٹیکے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں لی ہوئی ٹہنی سے پتھر پر لکیریں کھینچتی ہوئی جھمکو بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر جذبات اُمڈ رہے تھے۔ منوردا چلم کا کش لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ دیر بعد بولے:

"دیکھ بٹیا، میں تیرے ساتھ تو آ رہا ہوں، لیکن پردیس میں فضیحت نہ کرانا، اگر ایسی بات ہو تو پہلے سے ہی کہہ دینا، کبھی مجھے نیکی کر کے جوتے کھانے پڑیں!"

"ماں کچھ کہتی تھی منوڈا کا؟" جھمکو نے سر اُٹھائے بغیر ہی پوچھا۔

"اور تو وہ بے چاری کیا کہتی، کہنے لگی، تم کسی بھی طرح اس کا راستہ نکالو نہیں تو اس کے ساتھ ہماری بھی رسوائی ہوگی، یہ کہہ کر خوب روئی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے گاؤں کا رہنے والا ایک چھیل تھا، اس کا لڑکا ہے، تو بے چاری خوشی سے پھولی نہ سمائی۔"

"ایک بار مجھ سے۔۔۔ ملنے بھی۔۔۔ نہ آئی!" کہتے ہی جھمکو کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

"اری پگلی۔ وہ تو آنے کے لئے بلک رہی تھی، مگر آتی کیسے؟ اگر کسی کو شبہ بھی ہو گیا تو تم لوگوں پر آفت آ جائے گی۔" پھر چلم کا دھواں کھینچ کر بولے، "اور ابھی تو یہ نیا نیا قصہ ہے، ابھی تو مل نہیں سکتی، ہاں ایک آدھ برس بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تب اگر کبھی آ کر مل جائے گی تو کون جان سکتا ہے؟ ہماری ذات کی موندی بڑھیا ڈاکور جی جانے کے بہلنے اپنی بیٹی سے مل ہی آتی ہے!"

پھر چلم اُنڈیل کر بولے "یہ تو میں سب انتظام کر دوں گا۔ چل اُٹھ اب موٹر کا وقت ہو گیا۔" اور دونوں اُٹھ کر چلنے لگے پھر جھمکو کچھ نہ بولی۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو زندگی میں پہلی بار موٹر میں بیٹھنے کی خوشی میں وہ آپے سے باہر ہو جاتی وہ خود ناچنے کودنے لگتی لیکن اس کا دل تو ضرور زبان اُٹھتا اور اس کی آنکھوں میں مسرت بہا جاتی۔ منہ سے سرسوتی بہنے لگتی: "اوہو، ہو۔ کیسا دھڑ دھڑ کھاتا مزہ آتا ہے، جیسے اُدپر اُڑ رہے ہوں۔ وہ پہاڑیاں دیکھو، وہ اپنا گاؤں وہ نکل آ رہا ہے، اپنے گاؤں کا پہاڑ کتنا چھوٹا سا لگتا ہے" وہ ایسی ویسی تو ہزاروں باتیں کرتی۔ لیکن آہ۔۔۔ اس وقت تو وہ کھڑکی سے سر نکال کر ان پہاڑیوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھی وہ گویا سر اُٹھا اُٹھا کر اُسے دیکھ رہے تھے!۔ موٹر کی سمت جلد جلد فاصلہ بڑھ جانے سے۔۔۔ یہ بات جھمکو نہ سمجھ سکی۔ لیکن اب وہ پہاڑیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ادھر اُدھر دیکھتے دیکھتے جھمکو تھک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو چار آنسو گرے جو اُڑتی ہوئی دھول میں مل کر نہ جانے کہاں رہ گئے۔

x x x x x x

دوپہر ڈھل رہی تھی جب موٹر نے ایک اسٹیشن پر لا کر اُتار دیا۔

"چل اس پیپل کے نیچے" کہتے ہوئے منوردا آگے آگے ہو لئے۔ وہ دونوں بیٹھ گئے کبھی جھمکو کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے مال گاڑی کے ڈبوں کی طرف جاتی تھی اور کبھی پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے مال پر پڑتی تھی کبھی موٹروں اور بیل گاڑیوں پر جاتی تھی اور کبھی دور تک پھیلی ہوئی ریل کی پٹڑیوں پر اس طرح پڑتی تھی جیسے ان کی جڑیں اور کنارے تلاش کر رہی ہو۔ منوردا نے کچھ بیڑیاں اور ماچس خرید کر ایک بیڑی سلگائی اور منہ سے پیچ دیتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس کے پھیرے کھینچنے لگے۔ پھر بولے:

"اُٹھ بٹیا۔ چل تھوڑا سا کھا لیں!"

"بھوک نہیں ہے کاکا۔ تم کھا لو۔" کہہ کر جھمکو پوٹلی کھولنے لگی۔

"ارے وہ کیا رکھا اللہ میری دھوتی میں بندھا ہوا ہے چل ایک ایک ٹکڑا۔"

"لیکن مجھے بالکل بھوک نہیں ہے کاکا! کھانا ہی ہوتا تو یہ مرچ مسالے کی روٹی بھی موجود ہے۔" اور منوردا کے آگے روٹی کی پوٹلی کھولتے ہوئے بولی۔ "تو کاکا۔ اس میں کوئی چھوت نہیں لگے گی۔ یہ تو دودھ میں آٹا گوندھ کر بنائی ہے۔"

"اور وہ دودھ میں نہ گوندھا ہو تو بھی یہاں پردیس میں کیا بگڑ جائے گا!

لیکن تو تھوڑا سا لڈو تو کھا لے بے چاری تیری ماں نے کتنے پیار سے۔۔۔"

"کہ کیسے ہو کاکا؟ میری ماں نے رکھا ہے یہ؟ تم نے تو مجھے یہ بات بتائی ہی نہیں" جھمکو کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے کھل اُٹھا۔

"اس میں کیا گیا تھا۔ چلو۔" یہ کہتے ہوئے منورما نے جھمکو کے پاس پڑی ہوئی نئی گٹھری اٹھاتے ہوئے نل کا رخ کیا۔

"میں ذرا پانی لے آؤں۔"

"نہیں کاکا — تم کھاؤ۔ پانی میں لے کر آتی ہوں" اور منورما کے منع کرنے پر بھی وہ لوٹا لے کر چل دی۔

جھمکو نل کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور للچائی نظروں سے نل کی طرف دیکھتی رہی۔ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ دیکھ کر جیسے ہی پانی جوان تیزی سے نکلنے لگی۔ لوٹے کا منہ پانی بھرنے میں ذرا مڑ آیا تھا جس کو ٹھیک دھنسنے کے بجائے بھری ہوئی دیا دی پھر بھرا اور آس پاس دیکھ کر پھر ٹھیک کیا تیسری بار بھی گیا لیکن چوتھی بار اٹھنے کی ہمت نہ ہو گی ایک مسافر کو نل کی طرف آتے دیکھ کر وہ بھری لوٹا لیے جھٹ وہاں سے چل دی اور منورما کو پانی پلا کر پھر سے بھر لائی۔ بہت اصرار کر کے منورما نے اسے کھانے بٹھایا۔

اتنے میں بہت دور سے جھمکو کے کانوں میں ریل کی سیٹی سنائی دی۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں بڑے کاکا؟ ریل کا ٹھک بولی!"

جھمکو کی آنکھیں اسی طرف منڈلانے لگیں جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہ ایک ہاتھی جیسے ڈیل کو سامنے سے آتے دیکھ کر اور اسٹیشن پر مسافروں میں شور غل اور کھلبلی دیکھ کر جلدی جلدی پوٹلی باندھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اٹھو کاکا — گاڑی آ گئی — جلدی...."

"ارے پگلی، کھانا تو کھا لینے دے — یہ تو دوسری گاڑی ہے۔ اپنی گاڑی کو تو ابھی بہت دیر ہے۔ وہ تو ادھر سے آئے گی۔" آرام سے بیٹھے ہوئے منورما نے لڈو کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہوئے ریل گاڑی نے ایک اور سیٹی دی جھمکو کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے گاڑی کے انجن اور ڈبوں کو دیکھتی رہی۔ مسافروں کی بھاگ دوڑ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ کوئی بچے کو کھینچتا تھا تو کوئی بچے کے باپ کو ڈھونڈتا تھا کوئی گاڑی میں جگہ پر قبضہ کرنے چلا آتا تھا۔

"ادھر آؤ — ادھر.... میں تو یہاں ہوں —" اور اس سے بھی زیادہ گڑبڑ اور دھکا پیل گاڑی اترنے والوں کی تھی۔ کوئی پیٹی سنبھالتا تھا تو کوئی پلیٹ فارم کے باہر کھڑی ہوئی موٹر میں جگہ نہ ملنے کے خوف سے اپنے گھر والوں کے سر پر ایک کے اوپر دوسرا سامان لاد رہا تھا۔ جھمکو نے تو قدر سے ایک مرد اور ایک عورت کو لڑتے ہوئے بھی دیکھا۔ موٹر روڈ کے پاس بھی شور غل اور دھکم دھکا ہو رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی اور یہ شور غل کم ہو گیا نہیں تو بے چاری جھمکو ان باتوں سے پریشان ہو کر شاید رو پڑتی۔

جھمکو کی نظریں اور موٹر کی طرف اٹھنے لگیں۔

منورما بولے "کسی دن تو کون نہیں؟ کیا دیکھتی ہے؟" جھمکو نے اس بات کا جواب نہ دیتے ہوئے پوچھا "یہ کاکا جو اپنی والی موٹر میں بیٹھے ہیں وہ سب اپنی طرف کے ہیں؟"

منورما لڈو کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے بے سوچے سمجھے ہی بول پڑے۔

"ہاں ہاں" اور ہاتھ دھونے میں لگ گئے۔

جھمکو نے تھوڑی دیر رک کر پھر پوچھا "یہ بند بس میں گئے ہوتے کیوں؟"

بیڑی سلگاتے ہوئے منورما نے سر ہلا کر "ہاں" کہا۔

"کسی روز ہم بھی تو چلیں کاکا۔"

منورما نے تنگ آ کر کہا "ارے چپ رہ۔ تجھے کیا کرنا ہے بیٹھ کر۔"

جھمکو کی زبان تو رک گئی لیکن آنکھیں موٹر بس ڈھونڈتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں پھاڑے ہوئے جھمکو نے آہستہ سے کہا۔

"ابی کاکا — چھوٹا سا ایک بھی گھر نہیں۔"

منورما کچھ بھڑک اٹھے۔ لیکن پھر نرم لہجے میں بولے۔

"ارے پاگل تو نہیں ہو گئی۔ ابھی احمد آباد تو پہنچنے دے!" پھر کچھ رک کر بولے

"ایک بار احمد آباد دیکھ تو سہی!"

"چولہے میں جائے۔ مجھے نہیں دیکھنا ہے" آواز کچھ روہانسی تھی۔

اب کی منورما ذرا کڑی آواز میں بولے۔

"چل چل — پاگل مت بن — ذرا آگے کا بھی سوچ لے۔" منہ تنگ کر کہا۔

"اب تک گھر ہی تو تھی!"

جھمکو کچھ نہ بولی — اب بھی اس کی آنکھیں موٹر پر لگی تھیں۔ موٹر چل دی تو اس کا سلسلۂ خیال ٹوٹنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"دیکھنا بٹیا۔ میں ذرا ٹکٹ لے لوں۔" منوردا کی آواز سن کر وہ کچھ چونکی ایک دم چوکنا ہو کر اس نے جنکاری بھری، اور پوٹلی، ٹھیلا وغیرہ، سامان کو اپنے پاس کھینچ کر رکھ لیا۔ اور پھر اس کی نظر دھول اُڑاتی ہوئی موٹر کا پیچھا کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد موٹر ظاہرا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کے دل کی اندرونی آنکھیں اب بھی آگے کسی گاؤں میں سڑک کے کنارے ہوٹل کے پاس ٹھیرتے ہوئے تالاب کے باندھ سے گزرتے ہوئے، ندی کا پُل پار کرتے ہوئے، جنگلوں میں گھستے ہوئے، دیکھ رہی تھیں گاؤں کے پاس والا کھنڈا پہاڑ آنے ہی والا تھا کہ اس کا سلسلۂ تصور ٹوٹ گیا۔

"چل آ۔ پوٹلی لے لے، اندر جا کر بیٹھیں" کہتے ہوئے منوردا کا ہاتھ جیب کی تہ تک جا کر ٹکٹوں کو ٹٹولنے لگا۔ جھکو کو آگے بڑھتا دیکھ کر بولے:

"کیوں یہ ٹھیلا نہیں لینا ہے؟" جھکو نے پلٹ کر ٹھیلا اُٹھالی۔ پلیٹ فارم پر بیٹھتے ہوئے جھکو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کیوں کاکا، اب موٹر آدھی دُور تو ...."

منوردا کو غصہ آ گیا، تو بھی تب سے ایک ہی بات کے پیچھے پڑی ہے۔ میری تو ناک میں دم آ گیا! پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولے:

"مجھے تو ایسا لگتا ہے بٹیا کہ احمد آباد دیکھتے ہی تو بکی رہ جائے گی! وہاں موٹریں ہی موٹریں ہیں۔ چلنے کے لئے راستہ بھی نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے تو بھی دیکھ کر پاگل ہو جائے گی!" کہتے ہوئے کچھ مسکرائے۔ لیکن جھکو پر ان باتوں کا ذرا سا اثر بھی نہیں ہوا۔ پھر منوردا بھی کچھ نہ بولے لیکن ان کی طرف سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر لمحہ گاڑی آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک آدمی سے پوچھ کر انھوں نے پورے پانچ بج جانے کا یقین کر لیا۔ اتنے میں سیٹی سنائی دی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جھکو پر کیا گذر رہی تھی۔ یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا۔ گاڑی آتے ہی وہ منوردا کے ساتھ ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ انجن کی سیٹی سنتے ہی جھکو نے ایک آہِ سرد کھینچی اور سر نیچے کئے ہوئے ہونٹ چباتی رہی۔ سر پہ ساڑی کا پلّو کچھ آگے سرکا لیا!

تقریباً آٹھ برس پہلے منوردا نے وہ آنے کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھنے کا شوق پورا کیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ گاڑی میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ جھکو کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت پوچھنے لگی۔

"کون گاؤں کی ہو بہن جی؟"

جھکو سے پہلے ہی منوردا بول اُٹھے: "ہم تو [illegible] میں رہتے ہیں" شاید جھکو کا گھونگھٹ دیکھ کر اس عورت نے پوچھا:

"یہ بائی تمھاری کون ...."

"میری بٹیا ہے!" منوردا بیچ میں ہی بول اُٹھے۔ لیکن بڑھیا کے ایک دو سوالوں کے بعد ان میں ضبط نہ رہا۔ انھوں نے یہ دائرہ کیا کہ خود ہی بڑھیا سے سوال کرنے لگے۔

لیکن جھکو کا دھیان ان سوالوں کی طرف نہ تھا۔ وہ اسٹیشن نکل جانے کے بعد اس نے منوردا سے پوچھا:

"ایں کاکا۔ ابھی کتنی دُور ہے؟"

"ابھی تو پندرہ دو ٹیشن (اسٹیشن) ہیں۔ تیسرا ٹیشن احمد آباد کا آئے گا!" کہتے ہوئے منوردا نے آس پاس دیکھ کر چپکے سے جھکو کو سمجھا دیا کہ اگر کوئی کچھ پوچھے تو وہ کیا جواب دے۔ پھر شاید اُسے خوش کرنے کے خیال سے بولے۔

"دیکھا، کیسی گاڑی ہے؟ ہوا کی طرح جاتی ہے نا؟"

جھکو نے سر ہلا کر "ہاں" کر دی، اور کوشش کر کے کچھ ہنسی بھی۔ اب منوردا کو بھی کچھ اطمینان ہوا اور بیڑی سلگا کر پینے لگے۔ جھکو کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی گاڑی اُسے دھرتی کے کسی دور دراز گوشے میں جا پھینکے گی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی لیکن اُسے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں رہا تھا۔ بات عقل میں نہیں آتی تھی پھر بھی وہ کھنڈا پہاڑ دیکھنے کے لئے بار بار آنکھیں پھاڑتی تھی۔ کھڑکی سے سورج ڈوبتا ہوا سورج دکھائی دے رہا تھا پھر بھی وہ اُسے پچھم نہیں مان سکتی تھی۔ بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ اگر وہ سورج کو بھی بدلا ہوا مان لے تو اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا؟ اگر منوردا پاس نہ بیٹھے ہوتے تو وہ یقیناً سسک سسک کر رونے لگتی۔

دُور، بہت دور ملوں کی کالی کالی چمنیاں دکھائی دینے لگیں۔ منوردا نے کہا۔

"دیکھ جھکو۔ احمد آباد دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھنا! اب جو آ رہا ہے وہی احمد آباد کا ٹیشن ہے!"

اسٹیشن بھی آگیا۔ اترنے سے پہلے ہی ڈبے میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر جھکو کو بڑی حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے غم میں سوچ میں ڈوب گئی۔

اسٹیشن پہ اترتے ہی منورداسنے کہا: "دیکھ جھکو، دیکھا ادھر اُدھر کیسی بجلی کی بتیاں ہیں، دن سا معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن رات کو دن بنا دینے والی بجلی کی بتیاں وہ ج طرح کے بھونپو بجاکر دوڑتی ہوئی موٹریں، سائیکلیں، تانگے، بڑے بڑے مکان اور رنگی ہی دکانیں، ان میں کوئی بھی چیز جھکو کے بے کشش پیدا نہ کرسکی۔ ابھی تک سنا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ زمین پر بچ بچ "کچھ" ہے! اُسے اس بات کا بھی احساس نہ ہوا۔ اس کا اضطراب اور بے کلی بڑھتی ہی گئی!

منورداس جھکو کو نئی نئی چیزیں دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دھرم شالے میں جاکر اپنا آٹا بکھوایا اور اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اپنا ڈیرہ جمالیا۔ کرائے پر رضائیاں اور گدے بھی لے لیے۔ جب دھرم شالا کا جمعدار منورداس کو بجلی کی بتی وغیرہ کے بارے میں بتا رہا تھا اس وقت جھکو گدے پر پڑی پڑی بے چین ہو رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر آسانی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔

کچھ دیر بعد منورداس نے جھکو سے ناشتہ نکالنے کے لیے کہا اور خود جاکر پانی بھر لائے۔ اس کے منہ میں ٹھوکا دیتے ہوئے بولے:

"بیٹی کس لیے ہے، کھا، نا؟"

"تم کھاؤ کاکا، مجھے کھانا نہیں!"

منورداس نے آنکھیں نکال کر پوچھا: "کیوں؟"

"بھوک نہ ہو تو کیسے کھاؤں۔" کہتے کہتے جھکو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"لیکن بھوک نہ لگنے کا کارن؟ چل کھانا شروع کر دے،

نہیں تو جانتی ہے ...."

"لیکن مجھے ..." جھکو آگے نہ بول سکی۔

اب منورداس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اونچی آواز میں بولے "رونا دھونا بند کر نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"ہاں ... جب یہ یہیں ہیں میری رسوائی کرائے گی؟" کہتے ہوئے اٹھے اور موری کے پاس جاکر ہاتھ دھو لیے۔ پھر سامنے پڑے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے

"نہ جانے کہاں سے یہ بے وقوفی سوجھی جو دوسرے کے پاپ میں شامل ہوا!"

جھکو "دوسرے کے پاپ" کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اور اسی لیے شاید اس نے رونا دھونا بند کر دیا۔

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ بتی بجھا کر سو گئے۔ کب سوئے اس کی شاید انھیں بھی خبر نہیں تھی۔ لیکن جب جاگے تو معلوم ہوا کہ سورج کافی چڑھ چکا ہے۔

دوسرے روز گھنٹہ گھر کے پیچھے کے کٹہرے پر جھک کر کھڑی ہوئی جھکو سے منورداس نے آس پاس کے مناظر کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا: "جھکو، وہ مزار جیسا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھا؟ نہیں دیکھنا، وہ بیچ میں پہیے جیسا گول گول ..."

"ہاں ہاں۔ وہ کیا ہے کاکا؟ بیچ میں تو کچھ بیل بوٹے بنے ہیں۔" جھکو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں وہی! ... اس کا نام جانتی ہے تو؟ ..."

اور جیسے چھوٹے سے بچے کی طرف دیکھ رہے ہوں اس طرح جھکو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

"وہ گھنٹہ گھر ہے، گھنٹہ گھر! ..."

"او باپ رے ... اتنا بڑا" اور ایک لمحہ رک کر پوچھا:

"ایسی کاکا، یہ کیوں بنایا ہوگا؟ ...."

"کیوں؟ ... سب کے ٹیم دیکھنے کے لیے! ... تو جانتی ہے جھکو، شہر کے لوگوں کو اسی سے دن نکل آنے اور ڈوبنے کی خبر ہوتی ہے۔ سمجھی!"

اور پھر منوروا آکاش سے باتیں کرتے ہوئے آس پاس کے مکان، دور دھوئیں چھوڑتی ہوئی ملوں کی چمنیاں۔ ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی موٹریں وغیرہ دکھانے لگے۔ جھمکو طرح طرح کی باتیں پوچھتی تھی۔ منوروا جھمکو کو خوش کرنے کے لئے ابھی نہ جانے کیا کیا بتاتے لیکن یکایک انہیں کچھ یاد آگیا ـــ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پھر رکھ کر بولے،

"چل تھوڑا سا کھا لیں۔"

جھمکو کا ارادہ تو انکار کرنے کا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ بول نہ سکی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی "ہاں ـ بالکل تھوڑا سا کھاؤں گی کاکا!"

"اچھا۔ تو چل" کہتے ہوئے منوروا آگے بڑھے۔ واقعی جھمکی نے بہت تھوڑا سا کھایا۔

لوٹتے وقت منوروا نے طنزاً کہا "پگلی! اس میں تھا ہی کتنا سا کھانا۔ اس میں سے بھی تو نے آدھا ... یوں ہی تین پیسے بگاڑے!"

"میں نے کہا تو تھا"

"کہا تھا تیرا سر!" منوروا چپ ہو گئے۔

کمرے میں آنے کے بعد منوروا نے صافہ باندھا۔ کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے اور کمری پیچھے ہوتے بولے:

"میں ذرا باہر جاتا ہوں ـــ تو یہیں کوٹھری ...."

"نہیں کاکا ـــ میں اکیلی نہیں رہوں گی" جھمکی نے پیار سے بھرے لہجے میں گھبرا کر کہا۔

"میں ابھی واپس آیا ـــ تو اتنے سے جا گنڈی لگا لے۔ اس بھری بستی میں ڈر کاہے کا!"

اگر منوروا ذرا بھی غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ جھمکی کو سارا ڈر تو بھری بستی کا ہی تھا۔ اسے سمجھا بجھا کر وہ باہر نکل گئے۔

دھرم شالا کے دروازے پر آتے ہی جیب میں رکھا ہوا کاغذ دکھا کر لوگوں سے پوچھنے لگے:

"ذرا دیکھو دو صاحب، یہ امر سنگھ کہاں ملے گا؟"

اور جس طرح فٹ بال ادھر ادھر ٹکراتی ہوئی آخرکار گول تک جا ہی پہنچتی ہے اسی طرح منوروا بھٹک بھٹکا کر ایک مل کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ پہرے والے سے پوچھا:

"اے جمعدار صاحب، امر سنگھ کہاں ملے گا؟"

پہرے والے نے پہلے گاؤں اور برادری کا نام پوچھا پھر کہا: "تم ادھر بیٹھو، میں ابھی بلا لاتا ہوں" اور ایک آدمی کے ہاتھ سندیسہ بھیج دیا۔

منوروا نے تقریباً ۳۰ برس کے ایک جوان کو مونچھوں پر تاؤ دیتے اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً پہچان گئے۔ دور سے منوروا کو دیکھتے ہی وہ بولا: "ارے، ہو ہو، منوروا کاکا!"

رام رام کرنے کے بعد پوچھا "کیوں کاکا، تم یہاں کیسے راستہ بھول گئے؟"

"بھولا نہیں امر بھیا۔ خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں" منوروا ہنسنے لگے۔

"اچھا۔ چلو گھر چلیں" کہتا ہوا امر سنگھ آگے آگے ہو لیا۔ راستے میں اس نے منوروا سے پوچھا "کون کون آیا ہے۔ کیسے ہو۔ کب آئے۔ کہاں ٹھہرے ہو" ایسے کتنے ہی سوال پوچھ ڈالے۔

ان میں منوروا نے کچھ کا ٹھیک جواب دیا اور "کون کون آیا ہے" کا جواب ایسا ہی گول مول دے دیا۔

اتنے میں گھر آگیا۔ امر سنگھ ایک مضبوط ہتھوں والی کرسی سرکا کر بولے:

"بیٹھو کاکا ـــ"

"ارے نہیں بھیا، اپنے رام تو ...."

"ارے ایسی کیا بات کرتے ہو؟ آرام سے بیٹھو!" امر سنگھ نے کہا۔

منوروا کبھی کبھی ہوٹل میں یا کسی اور جگہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ لیکن آرام سے نہیں۔ آج وہ پیر پر پیر رکھ کر آرام سے بیٹھے! چائے، ناشتے کا آرڈر بھجوا کر امر سنگھ بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے گاؤں اور آس پاس کی خیر سلا پوچھ کر بولا:

"کاکی کو بھی لے آنا تھا کاکا!"

"کہاں؟ احمد آباد میں ـــ؟" اور امر سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں! ہاں!"

منوروا کھیتی باڑی اور ڈھور ڈنگر کا حال چال سنا رہے تھے کہ اتنے میں چائے وغیرہ آگئی اور دونوں نے نیچے بیٹھ کر چائے پی۔ ناشتہ کیا۔

"جا رے۔ کھانے میں ڈلوا دینا" کہہ کر امر سنگھ نے ہوٹل کے لڑکے کو روانہ کر دیا لیکن ایک دم کچھ یاد آیا اور بولا: "لے اور لونڈے۔ دو پان اور دو چائے چھاپ لے آ، پر پیالے یہیں رکھ جا، دوڑ

کرتا ہوں؟"

[illegible] آیا۔ بہت اصرار اور تکلف کے بعد منورما [illegible] منہ [illegible] سگریٹ سلگا لیا۔

"ارے — یہ آج امر سنگھ کا یک کیوں یاد آ گیا؟" امر سنگھ نے ہنستے ہوئے منورما کی طرف دیکھا۔

"بغیر کام کے کون آتا ہے امر بھیا۔" پھر باہر دیکھتے ہوئے بولے "لیکن بات ایسا ..."

امر سنگھ کمرہ [illegible] دیوار پر ایک [illegible] [illegible] دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ منورما دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سامنے امر سنگھ پاؤں موڑے اور ہاتھ ٹکائے جاتے سے بیٹھا تھا۔

اس نے پوچھا! "ہاں تو اب بتاؤ!" منورما کچھ ہچکچا رہے تھے، اس نے پھر کہا۔

"تم میری عادت جانتے ہو کاکا — چاہے کیسی ہی بات ہو، سر کٹنے کی کیوں نہ ہو، لیکن جیسی سُنی ویسی ہی زمین کا زور سگریٹ کا کش لگا کر بولا... "اس بات سے تم بے فکر رہو...."

سگریٹ کے لگاتار تین چار کش لے کر منورما نے بات شروع کی۔

"پارسال تم نے جو بات کی تھی وہ یاد ہے؟"

دیکھا کر امر سنگھ کچھ سوچنے لگا تو بولے "یاد نہیں؟ جب لکھا پنیلی کی لڑکی کنوئیں میں گر کر مر گئی تھی اُسی دن تم نے...."

"ارے — ہاں ہاں! ٹھیک ہے، اب یاد آیا...."

"یاد ہے اس دن تم نے اپنے اور آبادی بلسنوں کی دوسری باتیں بھی کی تھیں....؟"

"ہاں ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن پنچایت پوری ہونے کے بعد تم رات کو بیٹھے تھے اور آدھی رات تک ہم باتیں کرتے رہے تھے۔" یہ کہہ کر امر سنگھ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ منورما کو خاموش دیکھ کر پھر بولا۔ "وہ تو میں سمجھ گیا کاکا، مگر وہ ہے کہاں کی؟"

منورما نے جھمکو کی کہانی شروع سے آخر تک کہہ سُنائی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے واقعات کا بھی تذکرہ کیا۔ آخر میں بولے "جس طرح بھی ہو، لیکن مجھے ذرا جلدی چھٹی دے دینا۔ امر بھیا!"

"ارے بھگوان نے چاہا تو کل اسی وقت تک تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!" امر سنگھ کی آنکھیں ہی نہیں سارا جسم چمک اُٹھا تھا۔

"بس بس بیٹا۔" اور جیب سے بیڑی نکالتے ہوئے بولے: "ذرا ٹھہرو۔ اب اپنا کام کرو۔"

"اچھی بات ہے، لیکن ایک بار میں اسے دیکھ تو لوں؟" کہتے ہوئے امر سنگھ اُٹھا۔ آئینے میں دیکھ کر صافہ ٹھیک کیا۔ دھوتی کو کھینچ کر نیچے سرکایا۔ کرتا پہنا اور ہاتھ میں بیسے کی [illegible] والی چھڑی سے سنڈاسی بیدے کر بولا: "تو چلو!"

[illegible] کر دونوں سڑک پر آ گئے۔ بس اسٹینڈ پر کچھ دیر ٹھہرنا پڑا۔ امر سنگھ کے ایک ہاتھ کی انگلیاں مونچھوں سے کھیل رہی تھیں۔ [illegible] کی چھاتی جیسی اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک تھی۔ امر سنگھ نے دور سے بس کو آتے دیکھ لیا اور کنڈکٹر کی آواز "دو آدمی!" سنتے ہی دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ منورما کو چڑھا کر خود اندر گھسا۔ دو جوان جو بیت دیسے کھڑے تھے ان میں سے ایک جلیبیاں بیچتے ہوئے بولا۔

"دیکھا، ٹھاکر کا رعب! کرو کیا ہے کہ ذرا چوری [illegible] ہو گئی؟"

دوسرے نے منہ چڑھا کر جواب دیا۔ "ذرا چوری تو راز نہیں ہوئی۔ لیکن بیچارہ ذرا چوپٹ رنڈوا ہو گیا ہے!"

چلتی ہوئی بس میں امر سنگھ نے ان دونوں کی طرف تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اور وہ کٹ گئے۔

دروازے میں کھٹ کھٹ ہوئی تو جھمکو اُٹھی اور منورما کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

"ذرا پانی تو بھر لا بٹیا۔" منورما نے اندر گھستے ہوئے کہا۔

مٹکیا لے کر باہر نکلتے ہوئے جھمکو کی نظر امر سنگھ پر پڑی اور اس کا دل کانپ اٹھا۔ نہ جانے کیوں، مگر مٹیا لے کر آتے اور جاتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن جائے بغیر چارا بھی نہیں تھا!

جھمکو پانی پلا کر دوبارہ مٹیا بھرنے گئی۔ امر سنگھ نے کہا۔

"ہے تو بلبل جیسی، کاکا، ایسی خوبصورتی تو...."

منورما بیچ ہی بول پڑے: "خوبصورت ہے اسی لیے تو...."

امر سنگھ نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا: "بھگوان چاہے تو کل ہی تم فارغ ہو جاؤ گے کاکا!"

پھر ذرا سوچ کر بولا: "کیا بتاؤں اگر تم نے مجھے دو چار دن پہلے خبر دی ہوتی۔" "جو ہوا سو ٹھیک ہی ہوا، لیکن تم ذرا جلدی سے طے کرا دو تو اچھا ہے۔"

منوردا نے کہا۔ ان کا دل ٹھکانے نہیں تھا۔

"ارے یوں!" کہتے ہوئے امر سنگھ نے چٹکی بجائی۔ سردی کا زمانہ تھا، پھر بھی اُسے دوبارہ پیاس لگی۔ "لا... کہاں گئی؟ کیا نام ہے اسکا؟ جھکو، ذرا پانی تو لا۔" جھکو کے ہاتھ سے لٹیا لیتے ہوئے امر سنگھ اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پانی پینے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے، کھڑا ہو گیا۔ منوردا اُسے نیچے تک پہنچانے آئے۔ جاتے ہوئے امر سنگھ نے کہا "ہو سکا، تو آج ہی شام کو آؤں گا۔ کاکا!"

"ہو کیا سکتا ہے، ہونا ہی چاہیے امر بھیا!" کہتے ہوئے منوردا واپس آ گئے، آ کر دیکھا تو جھکو گدے پر پڑی تھی۔ منوردا بیٹھ گئے تو بولی:

"کاکا، گھر کب چلو گے؟" اور حسرت آمیز نگاہوں سے منوردا کی طرف دیکھنے لگی۔

منوردا بولے "پاگل ہو رہی ہو گئی بٹیا۔ گھر کس کے پاس جانا ہے؟"

جھکو جواب کیا دیتی؟ منوردا کی طرف اسے دیکھنے لگی جیسے آر پار دیکھ رہی ہو۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے!

منوردا ذرا مڑ کر بولے: "گھر رہنے کے قابل رکھا ہوتا تو میرے سر پر یہ آفت ہی کیوں آتی!"

"کچھ بھی ہو ـــ یہاں نہیں رہنا ہے" کہتے کہتے جھکو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منوردا آپے سے باہر ہو گئے "تو یہاں کیا جھک مارنے آئی تھی؟ کیا مجھے یہاں کا ڈر لگتا ہے؟ کیوں؟"

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بکھرے ہو کر بولے: "مجھے کیا کرنا ہے! جھگڑا تو ہے تو میں لے چلوں گا لیکن جب آئے ہیں تو ذرا شہر تو دیکھ لیں۔ یا یوں ہی، چلو! چلو!..." اور بیڑی سلگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جب شام کو منوردا واپس آئے تو جھکو ساڑی کا کونا منہ میں دبائے پلنگ پر پڑی تھی۔ منوردا بولے: "چل، اُٹھ، کچھ کھا پی لے!"

جھکو کے منہ سے نکلا "مجھے بھوک نہیں لگی" لیکن منوردا کے ڈر سے وہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی کھانا کھا کر واپس آتے ہوئے منوردا جھکو کو شہر کی چہل پہل اور رنگینیاں دکھانے لگے۔

سامنے والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منوردا نے کہا: "انھیں دیکھا جھکو؟ کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر جا رہے ہیں، دونوں میاں بیوی ہیں! یہاں

کسی کو گھونگھٹ وگھٹ نکالنا نہیں پڑتا۔ سب اپنے اپنے کام کاج کرتے ہیں۔"

"آگ لگے ایسے جیون میں!" جھکو نے منہ بنا کر کہا۔ گھر سے نکلنے کے بعد جب منوردا کو خوش خوش دیکھا تو جھکو بولی: "اچھا، تو دیکھ لیا کاکا! چلو کل گھر چلیں!" "ابھی کل تو ہو سکتا ہے۔"

کچھ دیر بعد جھکو نے پھر پوچھا، "گاڑی تو رات کو بھی جاتی ہوگی؟ کیوں کاکا؟"

منوردا کچھ دیر اس کی طرف گھورتے رہے۔ جھکو نے دیکھا یا نہ دیکھا یہ تو وہی جانتی ہوگی، لیکن ان کی آنکھ میں غصے کی ایک ہلکی سی لہر ضرور آئی تھی جو جلد ہی دور ہو گئی۔ کچھ گمبھیر آواز میں بولے:

"دیکھ جھکو۔ تو بچوں کی طرح نخرے کرتی ہے، یہ مجھے پسند نہیں۔ اسی لیے تو میں نے وہیں سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تھا نہیں تو..."

جھکو نے بات کاٹ کر پوچھا: "کیوں کاکا، میری ماں کو معلوم ہے کہ میں یہاں آئی ہوں؟"

"اری پگلی۔" منوردا نے ایک لمحہ کے لیے جھکو کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر "ایک بار کہہ تو دیا، اسی نے تو اتنی منت سماجت کی ہے، نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی؟" جھکو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ جی ہی جی میں کہنے لگی "ماں مجھ سے ملے بھی نہ آئی؟"

منوردا اداس ہو کر بولے۔ "اری کم عقل، ... کس کی ماں اور کس کی بیٹی! یہ اپنی خوش نصیبی جان کہ تیری ماں اتنی بھلی نکلی... اور مجھے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔" اور پھر منوردا نے خوب نمک مرچ لگا کر ساری باتیں کہہ سنائیں کہ تیری ماں رات کو میرے گھر آ کر کس طرح گڑگڑائی، کتنی روئی بلکتی رہی، اور جب میں نے بٹیا کو ٹھکانے لگانے کا وعدہ کر لیا تب آرام کر گئی! ساتھ ہی جھکو کو میکے سسرال اور رشتے ناتے والوں کی مخالفت کا خوف دلا کر بیوہ ماں کی نصیحت کی اور ہمت بندھائی۔ شہر میں جو سکھ ہے اس پر بھی لکچر دیا۔ نتیجہ مگر وہی ڈھاک کے تین پات!

جھکو بولی، "بھاڑ میں جائیں، نہیں رکھیں گے تو کنواں تو ہے؟ لیکن واپس لوٹ چلو کاکا۔ میں تمہارے پیر چھوتی ہوں!" اور سچ مچ وہ منوردا کے پیروں پر گر پڑی۔ منوردا ایک دم آگ بگولا ہو گئے، "اُٹھ، یہاں سے!" ان کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں، بہت تنگ آ گیا ہوں میں اس سالی کمین کی ذات جو ٹھہری! ذرا نرمی سے کہا تو سر پر چڑھی جاتی ہے... یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا، پھر رو تی پھرنا اپنے باپ کو..." اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور منوردا ایک دم چپ ہو گئے۔

[illegible] سکتے!

* * * * *

[illegible]

[illegible] کہا۔"

[illegible] نے اُسے آنکھ مار کے چپ کرا دیا۔ خاموشی [illegible] کر جھمکو کو چلایا لیکن جواب ندارد۔ امر سنگھ کو [illegible] نے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

امر سنگھ [illegible] ایک بار خرید کر رکھا [illegible] لیکن یہاں [illegible] سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"آ سے یہاں کیسے آیا جائے؟ اگر کوئی ....!"

"یہاں تو بیسیوں لوگ آتے جاتے ہیں، اس میں کیا بات ہے!" منورما نے فوراً کہا۔

"امر سنگھ بھیا اسی لیے" ذرا بات نوٹس لو، ہندو ہو مسلمان آگر آ جائے تو یہ بات کچھ حرج نہیں لیکن اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو جائے تو آفت آ جائے گی۔"

پھر منورما کے چہرے پر عجیب تاثرات کا اُتار چڑھاؤ بھانپ کر بولا۔ "پورے چھ سو مل سکتے ہیں کاکا!"

"اچھا!" منورما بولے۔ امر سنگھ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ غور کر رہے ہیں لیکن اس کی پروا کیے بغیر جھمکو کی طرف آنکھیں پھیرا نے جیسے [illegible]

"مال تو اصلی ہے اس لئے جھٹ پٹ کلدار گن لینا! کچھ وقت کے بعد لینا۔"

"لیکن سوچتے کیا ہو؟ اسے میرے گھر لے چلو وہ پہلے ہی تمہیں پیشگی مل جائے گی بعد میں بھی ...."

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، اس کام سے جتنی جلدی چھٹکارا ملے اتنا ہی اچھا ہے" منورما دل ہی دل میں کہنے لگے۔ چہرے کے تاثرات بھی بدلے جا رہے تھے۔ امر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھمکو کو جاگتا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ منورما نے [illegible] جھمکو سے کہا

"جا، جا کر منہ دھو لے!" جھمکو ہاتھ منہ دھونے چلی گئی [illegible] اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ امر سنگھ کہنے لگا [illegible]

[illegible] کو بیچا جائے کہیں سودا طے ہو جائے لیکن [illegible] معاملہ اس کی بالکل عادت نہیں تھا۔

"کہاں گئی وہ؟ کیوں تاخیر ہو رہی ہے؟"

منورما کو اس ماں ہو کیا [illegible] تو پہلے ہی [illegible] کہ لڑکی کے پاس مکی کی کلائی ہے۔

انھوں نے امر سنگھ کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"اچھا تو پھر جلدی چلئے" امر سنگھ نے پر کاٹا لیا۔

"ہاں ماسٹر جی!" کہہ کر منورما اُٹھے لیکن دروازے کے پاس سے ہی واپس آگئے۔ منورما کے اس برتاؤ سے یا ان کے چہرے کے تاثرات نے امر سنگھ کو تعجب میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے سوال [illegible] کے قریب کھسک کر بیٹھتے ہوئے امر سنگھ سے کہا۔

"کیا مسلمان کے سوا کوئی دوسرا۔ اچھی ذات کا خریدار نہیں مل سکتا؟"

"اسے اس میں کیا رکھا ہے۔ رام ہو یا رحیم بھگوان تو ایک ہی ہے کاکا!"

"بات تو ٹھیک ہے بھیا! لیکن ہندو لڑکی ہندو کے گھر جاتی تو اچھا تھا"

اگر چہ چھوت کا اشارہ دے کر امر سنگھ نے مسلمان کا کہہ کر بہت تعریف کی لیکن کوئی بات منورما کے دل کو نہیں لگی۔

"ایک سکھ بھی ہے لیکن وہ دام بہت کم دے گا"

"آخر کتنے؟"

"اس سے آدھے!"

منورما ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے: "ٹھیک بھیا! آدھے ہی سہی لیکن دھرم تو بچ جائے گا!"

امر سنگھ نے یہ دھرم کرم کی بحث چھوڑ کر بات کا رخ بدل دیا اور منورما کے مذہبی عقیدے اور احترام کی تعریف کی۔ لگتا تھا جیسے [illegible] ایک دم یاد آ گیا ہو۔

اس طرح ہوا، میری سمجھ میں تو کاکا۔ پہلے اپنا حصہ .... اس سے آگے بات گھما کر روپے پیسے کے بارے میں مزید وضاحت اور میں جن کے تعلقات پر اور ہماری موضوع پر تھوڑا سا لیکچر دینے لگا۔ منورما ہنس کر بولے۔

"تم خود ہی کہہ دو نہ بھیا!"

"میں کیا کہوں کاکا؟ تم خود ہی دیکھ لو کہ میں کتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی امر سنگھ نے ہاں کی طرف [illegible] میں آنے

جانے کے معاوضے کا تذکرہ بھی کر دیا۔

منور دا بولے۔ "ابھی معاملے تو ہم نے دو پھر طے ہو جائیں گے" لیکن امر سنگھ نے پہلے معاملے کو لینے پر زور دیا اور فداوی کے بعد کا تیسرے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ پھر منور دا کو کچھ متفق سا دیکھ کر بولا۔

"بتاؤں سا ایک ہی بار کا کام ہے کاکا؟

اگر تمہیں یہ زیادہ لگیں تو کچھ کم سے دو بلے" اور ذرا توقف کے بعد بولا "اب کی تم اچانک آ پہنچے، اس لئے یہ بات ہے سب تنگ کبھی آؤ گے تو تو بس پہلی تیلی ہی سمجھ لینا!" اور جب دیکھا کہ منور دا پوری طرح شیشے میں اُتر چکے ہیں تو اس نے اس دھندے کے بارے میں کچھ مزید باتیں بتائیں مثلاً کیسی ہوشیاری سے کام لیں۔ اور وہ خود یہاں کیسے کیسے آدمیوں کی کمروں میں رہے گا، وغیرہ۔ ابھی وہ سلسلہ کلام جاری رکھتا لیکن منور دا کچھ اُداس دیکھ کر بولا: "طبیعت تو ٹھیک ہے نا کاکا؟" منور دا نے بات کہی تو کچھ سوچ کر پھر بولا: "کہاں ہے وہ، ذرا دیکھ تو لیں، شاکر کے گھر تک بھی گئی یا نہیں۔"

"وہ کوٹھری ہے باہر صرف دو تا ــ اس میں دیکھنا ہی کیا ہے ویسے تو پاس، شاکر بھی کے کمروں میں چھپ سکتی ہے۔"

امر سنگھ معنوی ہنسی ہنس کر بولا: "ٹھیک کاکا، اب تو شام کو ملوں گا" اور کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹا، صبح شام کیا کرتے ہو بس جھگڑا ختم کرو تا سے چار کم یا زیادہ ــ میں تو اب تھک گیا!"

امر سنگھ اسی طرح کھڑا رہا جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ پھر بولا "اچھا اگر میں دوپہر کو آ جاؤں تو؟"

"تو؟ تو پوچھنا ہی کیا!"

"اچھا" کہکر امر سنگھ باہر نکل گیا۔ جھکو پر نظر ڈالی لیکن وہ دوسری سمت منہ کئے کھڑی تھی۔ ادھر سے منور دا بھی نکلے اور باہر چلے گئے۔ شاید شہر دیکھنے نکلے ہوں لیکن اُن کی نظروں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہ بہت گھومنے گھومنے سے چل رہے تھے اور نشے والے پہ چلنے کے باوجود جب موٹر کا ہارن سنتے تو اُچک پڑتے پھر ادھر اُدھر دیکھ کر راستہ طے کرنے لگتے کچھ دور جانے کے بعد انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں راستہ نہ بھول جائیں ورنہ دوبارہ شالا ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو جائیں گے۔ اس لئے واپس آ گئے۔ وہ واپس تو آ گئے لیکن

اپنے کمرے میں نہیں گئے بلکہ باہر ہی ادھر [illegible] رہے۔ ایک ڈھابے والے سے کہا: "۲۲۰ [illegible]"

"نہیں بھیا نہیں!" پھر منور دا [illegible] والے اس ڈھابے کے لڑکے دستانے پہنے ہوئے [illegible] جان کیسے کہتے ہیں، چلو کھانا ہو تو" [illegible]

منور دا جھنجھلا کر آنکھیں دکھاتے ہوئے [illegible] کچھ دیر کے بعد وہ آ پہنچے۔ جھکو نے جب کوٹھری کی طرف دیکھا تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چل چھوکری ــ کھانا کھا آئیں"

جھکو خاموش کھڑی رہی۔

منور دا نے جھنجھلا کر کہا: "اس طرح لکڑی کیوں بن رہی ہے؟ کوٹھری سے کود پڑو تو جھگڑا مٹے!"

جھکو دروازہ پکڑے ہوئے باہر دیکھتی رہی، منور دا نے پھر کہا: "میں کہتا ہوں کوٹھری کوٹھری آ کر کیا یہاں بھی ہے؟ ادھر آ کر رہتا!" اور پھر خود ہی دو دوڑنے لگے، "سالی بیگم کہاں سے مول لیا!"

جھکو نے سسکتے ہوئے کہا: "چلو تا، میں نہ کھانے کو ہٹ کیا ہے" منور دا دھرے پر بیٹھ گئے تو انھوں نے بھی جھکو کی آنسو ڈوبی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے دیکھے اور اپنا پرانا روزمرہ کا فقرہ دہرایا: "مر جا ــ یہ جھگڑا تو مٹے!"

کالی دریک کمرے میں بھیانک سناٹا سا چھایا رہا۔ کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ شاید دونوں طرف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹروں اور گاڑیوں کا غل غپاڑا ان کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہا ہے۔ منور دا نے بیڑی سلگائی اور ایک دو کش لے کر بولے: "اُٹھ! اُٹھ، بیٹھی کیوں ہے؟ جا کر منہ دھو لے" ان کی آواز میں کچھ رنگ کا پن تھا۔

منور دا نے جھکو کے چہرے سے نظر ہٹا لی جو نیا انداز اختیار کر رہی تھی جیسے ہی وہ بیمار ہو کر اُٹھی ہے۔ لیکن اُن کی نظر اب اس کا تعاقب کرنے لگی وہ منہ دھونے جا رہی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو منور دا بڑبڑائے "شاید یوں ہی مر جائے گی!" اور بیڑی پھینکتے ہوئے سر جھٹکنے پر بولے بھی صبح شام تک کا سال رہا ہے! یہ تو ہوا کہ تم میں آ گئی کیوں ہو" اتنے میں جھکو آ گئی اور وہ دونوں ڈھابے میں کھانا کھانے چلے گئے۔

[illegible] کے بعد چھیدا لگے غلط [illegible] ایک
[illegible] پر اتار ا جما! کچھ نہیں [illegible]
[illegible] ایکا [illegible] آئی کیوں تھی؟
پھر ایک خیال آیا ابھی جھکو [illegible] کی زد میں نہ آجائے
تو اچھا نہ ہو گا۔

"چل ـــ آگے ہو جا!"
جھکو آگے آگے چل دی۔

دھرم شالے کے دروازے پر پہنچ کر سوردا نے پھر حکم دیا
"جا۔ تو جھگی میں کواڑ بند کر کے بیٹھ، میں ابھی آتا ہوں..."

جھکو کے جانے کے بعد سوردا اندر آئے، کواڑ بند کرتے ہوئے [illegible] باہر جا کر [illegible] راستے پر [illegible] ہوتی نگاہ [illegible] یہ تھیں کہ وہ امر سنگھ کا انتظار کر رہے ہیں اور حسن اتفاق، کچھ ہی فاصلے پر امر سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک آدمی اور اس کے ساتھ تھا۔

"کیوں کا کا۔ کیا کرتے، انتظار [illegible] رہے تھے؟ چلو جلدی اوپر [illegible]" امر سنگھ آگے آگے ہو لیے۔

سوردا اپنا سونٹا لیتے ہوئے اس طرح پیچھے پیچھے چلنے لگے جیسے [illegible] ہو رہا ہو۔ زینے کے پاس آ کر آہستہ سے امر سنگھ سے بولے "تم نے بڑی دیر..." لیکن باقی الفاظ "تو چلو ـــ" کہہ کر دبا دیے!

کرسی پر بیٹھ کر امر سنگھ سوردا سے پہلے ہی جھکو سے کہنے لگا۔ "جا، پھر سے پان لے آ۔" اور اس کے چلے جانے کے بعد سوردا سے کہا:

"دیکھا صاحب، ہو نا [illegible]؟"

پھر سوردا کو آواز دینے لگا: "ارے کیوں کھڑے ہو؟ آ جاؤ [illegible] سگریٹ لو!"

[illegible] سگریٹ نکال کر سوردا کی طرف بڑھا دیا۔

امر سنگھ پان چباتا ہوا لگا اور اپنے ساتھی سے سوردا کی تعریفیں کرنے لگا۔ "یہ بڑے دیکھنے میں سیدھے سادے ہیں، لیکن کتنی ہی لڑکیوں کی زندگی بنائی ہے صاحب! اور اپنی برادری میں تو انھوں نے کئی کنواریوں کے گھر بسا دیے جن میں عورت ذرکیا، عورت کا کپڑا بھی نے کو نہیں ملتا تھا۔" کہہ کر امر سنگھ نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیا اور "پھو۔۔ او" کر کے دھواں اڑا دیا! پھر کہنے لگا۔

"ارے راجا، تمھیں بھی بہت پہلے گرم چپاتیاں نے لگتیں لیکن کا کا اب سرچھا..." شاید اپنا یہ تجارت سوردا کو جیلس کے بیوپاریوں کا سا لگا، اس لیے بیچ میں ہی بول پڑے "اچھا امر سنگھ۔ اب یہ سب چھوڑو، مطلب کی بات کرو۔" ان کے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے آثار اتنے صاف تھے کہ امر سنگھ شپٹا گیا۔

جھکو پان دینے کے بعد دروازے کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور کچھ دیر بعد وہاں سے ہٹ کر کوٹھری میں پہنچ گئی۔ سوردا نے امر سنگھ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"تو ختم کرو اب!"

"تو پھر دیکھو یا تمھارے بھیا..." امر سنگھ آنکھیں مٹکا کر بولا۔ اور ستمبر بھیا کی مسکراتی ہوئی شکل دیکھ کر بولا۔ "میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں کچھ [illegible]؟"

اور کھڑے ہوتے ہوئے کہنے لگا: "اچھا تو چلو" سوردا کی طرف دیکھ کر "میں ذرا انھیں پہنچا دوں، آدھ گھنٹے میں آتا ہوں!" دونوں چلے گئے۔

ذرا دیر بعد سوردا نے جھکو کو بلایا۔ ان کی آواز میں پیار اور نرمی شامل تھی۔ "جھکو، یہاں تو آ۔ بیٹیا، کواڑ لگا دے" اور جھکو کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ سوردا نے جیسے ہی اس کی کمر پر ہاتھ رکھا وہ رو پڑی۔ سسکیوں میں کانپتے ہوئے جسم کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کا انگ انگ رو رہا ہے۔ شاید سوردا کے ہاتھ میں، جو وہ اس کی کمر پر پھیر رہے تھے کوئی جادو کا اثر تھا کہ اس سے جھکو کی آنکھوں میں اشکوں کا طوفان امڈا آ رہا تھا، لیکن یہ طوفان اور اس کی لہریں ظاہرا اتنی معلوم نہ ہوتی تھیں۔

کچھ دیر تو سوردا نے اسے رونے دیا، پھر بولے:

"دیکھ پگلی! اس طرح رونے سے کیا ہو گا؟ میری بات تو سن۔ ابھی جو سیٹھ آئے تھے انھیں دیکھا؟ بڑی جو ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے گھر موٹر نہیں تو بگھی ضرور ہی ہو گی۔ ایسا ٹھکانا تو اسی کو ملتا ہے جس نے ہزاروں گنڈ ڈن

کا دل کیا ہو گئی ؟ اور آدمی بھی کیسا شریف اور سنجیدہ ہے۔ امر سنگھ بڑبڑا کے گیا لیکن ، ، بھلا ایک لفظ بھی بولا ؟ چپ ہو جا بیٹیا!" پھر ذرا متفکر ہو کر بولے ، "آج تو آنسو بہا رہی ہے لیکن جب سکھ چین سے گا تو سورکا کاکا کو بچانے کی بھی نہیں!"

"بھاڑ میں جائے وہ سکھ!" جھکو آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی۔

"کیوں ؟" کہتے ہوئے سنورداکی شکل دیکھنے کے قابل تھی۔

"یہاں نہ تو کوئی اپنا رشتے دار ہے اور نہ دکھ سکھ کی خبر لینے والا!" جھکو سسک سسک کر رونے لگی۔

سنوردا بگڑ گئے: "یہ راندہ کیا بولتی ہے ؟" اور جھکو کی طرف گھور کر بولے:

"تجھے سمبندھیوں نے رکھا ہوا تو میرے سر پہ بلا ہی کیوں آتی ؟" آگے کچھ اور کہتے کہ راستے میں کراڑوں میں کھٹکا ہوا اور سنوردا کے منھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ امر سنگھ کو دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔

کیا یہ دن بھر روتی رہتی ہے کاکا ؟ "یہاں اسے تکلیف دینے والے تھوڑا ہی ہے"

امر سنگھ نے جھکو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو بھتیا!" سنوردا کھڑے ہو کر بولے "چلو رونے دو راندہ کو ، بھلے رو رو کر مر جائے" کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

جھکو ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی ، وہ کہہ رہی تھی :

"لیکن میری بات تو ۔ ۔ ۔"

سنوردا اچانک دروازے کے پاس سے پلٹے اور آنکھیں نکال کر دھمکاتے ہوئے بولے :

"بیٹھ وہاں ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن تم مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ چھوڑ کر ۔ ۔ ۔"

اب کی سنوردا کے بجائے امر سنگھ بولا: "اری تجھے چھوڑ کر کیسے جائیں گے۔ میں کس لیے آیا ہوں ؟ لے کر جائیں گے لے کر۔ بیٹھ ، میں تیرے لیے تانگہ لے آؤں!" امر سنگھ یہ کہتا ہوا اور ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

"کواڑ بند کر لے" سنوردا نے کہا۔ امر سنگھ سنوردا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آہستہ سے بولا : "[illegible] پڑے گا کاکا!"

"اسی لیے تو میں تم سے جلدی کرنے کو کہتا ہوں"

"لیکن کاکا ، یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے ؟"

سنوردا کو پریشان سا دیکھ کر امر سنگھ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا :

"دیر تو ہو گی کاکا۔ اس سے جاسے کہ تین سو روپیہ کا انتظام کرنا ہے نا ؟"

سنوردا ذرا سوچ کر بولے : "کیا کہا ، اس بیٹے کے پاس پیسا نہیں ؟"

"ارے چلو ، کاکا ذرا ہوٹل میں بیٹھیں" سنوردا کی صورت دیکھ کر راستے میں باتیں کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے امر سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

اور ایک ہوٹل کے کمرے میں ایک میز بھی مل گئی جو اکیلی پڑی سی پڑی تھی جیسے دوپہر میں جمائیاں لے رہی ہو۔

امر سنگھ نے بتایا کہ وہ آدمی کون ہے اور اسے کس طرح روپے لینے ہیں نیز یہ کہ روپے لینے میں دو ایک دن کی دیر ہو گی۔

"تم تو کہتے تھے امر سنگھ ، کہ شاکروں کے پاس دولت مال کی ہے مگر عورت نہیں ملتی!" یہ کہتے ہوئے سنوردا نے غصیلی آلود نگاہوں سے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم تو اچانک گھوڑے پہ سوار ہو کر آ گئے۔ کیا کیا جائے کاکا ؟"

پھر چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے بولا :

"اب کی بار دیکھنا ! بس ذرا ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے بھلے آدمی ! جو موجود ہے اس کا تو کچھ کر نہیں سکتے اور دوسرے پھیرے کی بات کرتے ہو!"

سنوردا الشتری میں چائے انڈیلتے ہوئے "میں تو سمجھتا تھا کہ تم آج مجھے چھٹی دے دو گے۔ میں نے تو گاڑی جانے کا ٹائم بھی پوچھ لیا تھا!" سنوردا کے چہرے پر اداسی اور اضطراب کے خطوط ابھر رہے تھے! [illegible] ہوئے میں ہی طشتری خالی کرتے ہوئے بولے :

"یہ دو دن میں نکالوں کیسے ؟" پھر ذرا سوچ کر بولے "اگر اچھا

[illegible] کہ یا بھیتم اس لڑکی کو میرے [illegible] سنگھ سے بچاؤ۔"

[illegible] کہیں جاؤ گے؟ اور آئے کہیں پیسے بھی نہیں ..."

[illegible] ایک بار کو کٹھڑی میں جگہ نہیں ہے؛ [illegible] کو بھی کی ضرورت ہے!" پھر جیسے کہ [illegible] کتنی بہت بل جائیں گی!"

سندر داس کا چہرہ اک بار بدل رہا تھا۔ غصے میں سے [illegible] ہو کر بولے: "چلو، اٹھو یہاں سے"

سرم شالہ کے قریب آ کر امر سنگھ نے کہا: "اچھا میں جا کر آتا ہوں" اور چل پڑا۔ سندر داس نے آ سے روکتے ہوئے کہا: ذرا [illegible] آدمی!" اور پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا: "وہ تمہارے گھر جانا پسند نہیں کرے گی" پھر گلی حل [illegible] میں۔ اس طرح کہ امر سنگھ کر تہا نہ لگے یہ بھی بتا دیا کہ وہ یہاں نہ آسکے گا اور جب روپوں کا انتظام ہو جائے تو اسے یہیں آ کر لے جائے۔ امر سنگھ کچھ اداس ہو گئے۔

امر سنگھ نے جھک کر لوٹ جانے کے لئے سندر داس کو بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ راضی نہ ہوئے بولے: "تم لوگ کہاں رہو گے، کہاں کا چلن؟ گھر جانے سے پہلے ایک بار پورا شہر دیکھ لیں۔ اس بہانے شہر میں گھوما اور ہوں گا۔ شہر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی ہے!"

امر سنگھ نے ہنس کر بات ٹال دی، لیکن اس ہنسی میں آنسوؤں کی کتنی آمیزش تھی یہ اس وقت اندازہ ہوا جب سندر داس نے امر سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا ہوا [illegible] سر رہے کی نقدی کے دل رکھنے زیادہ کوشش اوپر کے [illegible] کی بات [illegible] امر سنگھ [illegible] پر کچھ [illegible] بات نہیں جب [illegible] سندر داس [illegible] اب ہی [illegible] بھلا کر دیا: "اچھا، میں جاؤں گا کا؟" کہہ کر چلا گیا۔

"چلو!" سندر داس اسے جاتا ہوا دیکھ کر سوچنے لگے۔ اس کا تعاقب کرتی ہوئی ننھا بھری نگاہیں گڑیا کہہ رہی تھیں: "یہ تو سالا بڑا حرام زادہ ہے" وہ دل میں سوچنے لگے۔ "کچھ بھی ہو۔ اس وقت تو وہ میری لڑکی کی طرح سے خود ہی بڑھانے لگے۔ میرے سامنے پڑتے ہوئے اسے شرم بھی نہیں آتی!" اتنے میں دیکھا امر سنگھ واپس آ رہا تھا تو پوچھنے لگے: "کیوں، واپس کیوں آ گئے؟"

"میں یہ کہتا ہوں" امر سنگھ قریب آ گیا اور دھیرے سے بولا "اگر تمہیں جانے کی جلدی ہو تو میں ایک اور راستہ نکالوں، اس سے کہوں گا کہ جاؤ تم کسی بھی طرح شام تک کچھ روپوں کا انتظام کر دے، اور اگر وہ ڈیڑھ سو ایک روپوں کا انتظام کر دے تو تم لے کر آج شام کی یا کل صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤ۔ باقی پچاس، میں دیپ چند سیٹھ کے نام سے منی آرڈر کر دوں گا!" سندر داس خاموش رہے، امر سنگھ پھر بولا:

"اگر تمہیں پسند ہو تو! مجھے تو کوئی جلدی نہیں۔ بلکہ مجھے تو تمہارے رہنے سے ..."

"نہیں بیٹا نہیں، کہاں رہنے کی فرصت ہے" پھر ذرا سوچ کر بولے۔

"ایسا ہی کرو امر سنگھ۔ باقی پیسے تم بھیج دینا۔ میں چلا ہی جاؤں ....."

"تو پھر میں جلدی سے جلدی آتا ہوں آپ سے لے کر۔ تھوڑی دیر خالی ہو جائے لیکن کام ہو ہی جائے گا۔ تب تک اگر تمہیں کچھ خریدنا ہو تو تیار رہنا جس سے ..."

"ارے بیٹا، کچھ نہیں لینا ہے۔ تم جلدی خالی کر دو تو سب کچھ لینا دینا ہو ہے!"

"جلدی سے پلٹ کر آؤ تو سندر داس کا ..." امر سنگھ کہتا ہوا چلا گیا [illegible] اس کے دل میں یہ سوال آ رہا کہ یہ جانا اتنی جلدی کیوں کر رہا ہے۔ جب سندر داس اوپر چلے گئے اور ایک کو سویرے کی طرف کر جھک کے بولے: "چلو بیٹیا ذرا بازار میں گھوم لیں —"

"میں تو نہیں جاتی کاکا — تم گھوم آؤ —" کہتے ہوئے جھمکو نے سر جھکا لیا وہ سوچتی تھی کہ شاید فوراً منورما جھنجھلا اٹھیں گے لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ منورما نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "ارے تجھے چھوڑ کر میں کیسے جاؤں؟ چل اُٹھ، پھر گاڑی کا ٹائم ہو رہا ہے۔ گھر نہیں چلے گی؟ یہاں تک آئے ہیں تو کچھ لیتے بھی چلیں!"

جھمکو نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن اس کی آنکھیں سوالی تھیں: "کیا کہتے ہو کاکا؟"

"چل اُٹھ — میں ہنسی تھوڑی کر رہا ہوں۔ آج رات کی گاڑی میں چل دیں۔ اُٹھ ہاتھ منہ دھو لے —" منورما نے پھر کہا۔

جھمکو جھپاک سے کھڑی ہو گئی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں منورما نے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری۔

جھمکو نے اپنی ساڑھی ٹھیک کیا اور کنگھا ہاتھ میں لیتی ہوئی کہنے لگی۔ "تم منہ ہاتھ دھو کاکا۔ میں ابھی آئی —"

"میرے لئے بھی بھر لانا —"

جھمکو نے ہنس کر لٹیا جس ہاتھ میں تھی اُسے ہلاتے ہوئے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔

"اسی لئے تو لٹیا لے جا رہی ہوں!" اور ایک دم نکل گئی۔

منورما اچھی طرح جانتے تھے کہ جھمکو میں اچانک اتنی پھرتی، آنکھوں میں وہی پرانی شوخی اور چہرے کو گلنار کر دینے والی مسرت کیوں آ گئی؟ کہاں سے آ گئی؟ انھوں نے ہر چند ضبط کیا، ایک آہ سرد پھر بھی نکل گئی۔

"اس کی تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہوگا" بڑبڑاتے ہوئے اپنا صافہ ٹھیک سے باندھ رہے تھے کہ جھمکو آ پہنچی۔ بولی: "لو منہ دھو کر باندھو کاکا!"

"اچھی بات ہے — لا!"

اور خالی لٹیا لے کر جھمکو پھر بھرنے چل دی۔ منورما نے بہتیرا کہا "بس کیوں پریشان ہوتی ہے، راستے میں پی لوں گا" لیکن وہ نہ مانی اور چلی گئی۔

کوٹھری بند کر کے دونوں نیچے اُترے۔ راستے میں چلتے ہوئے جھمکو کے قدم، زبان، اور نظریں برابر چلتی رہیں۔ کئی بار منورما کو ہدایت کرنی پڑی کہ وہ راستے کا دھیان رکھے اور زیادہ بولے نہیں۔

"تجھے کچھ لینا ہے؟" منورما نے پوچھا۔

"اونہوں — مجھے تو کچھ نہیں لینا۔ لیکن تم کچھ نہیں [illegible] میں میا تو چاہیے بیٹا، بلکہ [illegible] کا کرایہ بھی مشکل سے پورا ہوگا۔"

"تو پھر بازار میں کیا دیکھنے چلے؟" جھمکو بس ایک دکان پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"کاکا، دیکھو کتنی اچھی ساڑی ہے، اتو بھیا کی بہو کے لئے ایک لے لو نا! ساکی بھی پہن سکتی ہیں!"

"لیکن پیسے تو ہوں گے!" پھر ذرا رک کر بولے: "تجھے لینا ہے؟ اگر تو لینا چاہے تو لے دوں!"

"کیسی باتیں کرتے ہو کاکا، جب گھر والوں کے لئے پیسے نہیں ہیں تو میرے لئے کہاں سے نکالو گے؟" پھر منہ بنا کر بولی "تم نہیں لو گے تو میں لے لوں گی!"

"پیسے کہاں سے لائے گی؟" بات پوری کہہ بھی نہ پائے تھے کہ منورما نے جھمکو کو ساڑی کا پلو کھولتے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی "ساڑی کے زیادہ سے زیادہ دو روپے لگیں گے وہ پورے ہیں!"

"تیرے پاس کہاں سے ...؟"

"مہاراج نے دیئے تھے کاکا..." کہتے ہوئے جھمکو دکان کی طرف مڑ گئی۔ لیکن منورما نے اُسے روکتے ہوئے کہا کہ "اس وقت گھر میں ساڑی کی ضرورت نہیں۔ یہ پیسے اپنے پاس پڑے رہنے دے!"

اس وقت تو جھمکو نے مان لیا لیکن کھلونوں کی دکان آئی تو اس نے ایک نہ سنی اور بگڑ گئی:

"نہیں کاکا۔ للو بھیا کے لئے ایک کھلونا ضرور لوں گی اور ایک اپنے بھیا کے چھوٹے کے لئے ..." اور منورما کے بڑبڑانے کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے دو کھلونے خرید ہی لئے!

"چل چل — جلدی!" منورما نے کچھ کھسیا کر کہا۔

تمام راستے جھمکو بولتی رہی لیکن منورما چپ تھے۔ جب دھرم شالا میں پہنچے تو سورج بلند عمارتوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ جھمکو کوٹھری میں گھستے ہی کپڑوں کی تہ ٹھیک کرنے لگی۔ منورما نے اپنی دھوتی تہ کرتے ہوئے دیکھا تو بولے "کیا کر رہی ہے بیٹا؟ چل پہلے کھا آئیں۔ جلدی کیا ہے؟ کپڑے آ کر باندھ لیں گے!"

منورما جھک کر ... کا بازو پکڑ کر کھینچا ... پھر گاڑی کا انجن
... سیٹی دیتے ہوئے جھگو نے جواب دیا۔
"... گاڑی جانے کو ہے۔ چل! اتنی دیر میں کیا کر رہی تھی! ...
... بیٹھی ... تو بھگ گئے!"
آنکھیں ... پونچھتے ہوئے جھگو نے بڑے
بھولے پن سے کہا۔
"منگو کی کتنی پوریاں ... مجھے بالکل بھوک نہیں! چلا تم کھا آؤ۔" پھر
... منورما بھڑک اٹھیں:
لیکن منورما نے کوئی ... نہیں دی۔ شاید یہ خیال کرتے کہ جھگو
کے ساتھ ... گھڑیاں ہیں، دھیمے لہجے میں بولے "تو جا میں
جانے سے تجھے بھی نہیں کھانا ہے!"
آخر جھگو کو جانا ہی پڑا۔
واقعی وہ کچھ نہ کھا سکی۔ آج زندگی میں پہلی بار پوری کھانے کو
ملی تھی مگر اسے خوشی سے کھا نہ سکی۔ وہ ہاتھ دھو کر بار بار ہی تھالی کی
طرف دیکھ رہی تھی۔ منورما بولے۔
"ابھی ... گھنٹے کی دیر ہے۔ جھوٹ ہو تو مہاراج سے پوچھ لے!"
جھگو نے کسی سے پوچھا نہ اس کی بے صبری کم ہوئی۔ دونوں واپس
آ گئے۔ منورما دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ جھگو سے کہہ دیا۔
"تو جا! میں آتا ہوں!"
"تو میں پوٹلی باندھ لوں کاکا؟"
"ہاں ہاں جا! سر کیوں کھاتی ہے!"
منورما کی آواز میں تردد تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو جھگو کے دل کی
دھڑکن رک گئی۔
لیکن "یہ تو میں بار بار پوچھتی ہوں اس لئے...." اپنے دل کو اس
طرح سمجھا کر وہ مطمئن ہو گئی۔
کچھ دیر بعد جھگو پوٹلی لئے ہوئے نیچے آئی اور بولی: "لو چلو کاکا
سب سامان گن گن کر باندھ لیا ہے۔"
"لیکن تجھ سے یہ عقلمندی کرنے کو کہا کس نے؟ چل اوپر جا!"
منورما چڑ گئے۔ ان کی آنکھیں پھر اسٹیشن کے راستے پر منڈلانے لگیں۔
جھگو ویسے ہی نرم لہجے میں بولی "رات تو ہو گئی۔ اب چلو نا!"
"یہ لڑکی کچھ سمجھتی نہیں ہے اور...." کہتے ہوئے منورما آگے آ گئے

ہو گئے۔ چل اوپر چل!"
جھگو بڑی لاچاری کے ساتھ پیچھے لوٹی اور سیڑھیوں پر اس طرح
بادل ناخواستہ چڑھ رہی تھی جیسے موت کے منہ میں جا رہی ہو۔
منورما نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن جھگو ابھی ایک دفعہ پھر کھڑکی کے
پاس کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شاید اس نے گاڑی کی سیٹی سنی اس لئے
دوبارہ ... گرم ہو گئی اور ... بولی "چلو کاکا ... نہیں تو
نکل جائے۔"
"اس نے تو جان کھا لی۔ نہ جانے کچھ ... بات سو گئی جو اس سے
بات کی!" منورما جھگو کی طرف ... نظر سے دیکھتے ہوئے بولے "ابھی
سے ... کون تیرا باپ ... بیٹھا ہے؟"
"پر گاڑی نکل جائے گی تو؟" جھگو نے ... آواز میں پوچھا۔
"نکل جائے گی تو کیا سویرے دوسری نہیں ملے گی؟"
روتے روتے جھگو مشکل سے بول سکی "میں سمجھ گئی.... دیا کاکا
مجھے.... ... رہے ہو!"
اور پھر سسکنے لگی۔
"کیا تو میرا فضیحتہ کرانا چاہتی ہے؟ یہاں جم کر رو لے جتنا رونا
ہو سکتی ہے یا نہیں...؟"
جھگو بستر میں لیٹ گئی۔ منورما کمرے کے کواڑ بند کرتے ہوئے بولے
"اب رو جتنا رونا ہے۔" اور جھگو بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"چپ! مر۔ نہیں تو گلا دبا دوں گا! کمبخت!...."
جھگو نے رونے پر قابو پانے کی کوشش تو کی لیکن اس کا سارا جسم
اس طرح کانپنے لگا جیسے آواز دبانے سے جسم میں طوفان برپا ہو گیا
ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں زور سے سسکی بھی نکل جاتی تھی۔ منورما کہنے لگے
"گھر جا کر کون سے اپنے ملنے کی بے قراری ہے؟ وہاں قدم رکھنے
کا منہ تو ہے نہیں!"
"ہو یا نہ ہو لیکن میں یہاں نہیں رہوں گی۔" پھر رونے لگی۔ کچھ
دیر بعد منورما کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولی "کاکا مجھے
گاڑی میں اکیلا بٹھا دینا بس...."
"اتنی بہادر ہے تو جا نا!.... کاکا کی کیا ضرورت ہے؟ پیسے تو
تیرے پاس ہیں ہی!...." اور جھگو کی طرف عجیب انداز سے گھورتے
ہوئے بات جاری رکھی۔

"جاؤ جاؤ اُٹھو۔!!" جمکو ڈرتے ڈرتے [illegible] سنبھلی اور [illegible] جب آنسو سے بھرے گلاس کی طرف کھسکا کر پوچھا

"تو چائے لاؤں؟"

"کہاں... ؟" کہتے ہوئے منور دادا نے ہونٹ بھینچ لیے [illegible] کی طرح ان کی گردن سی ہو گئی۔ وہ [illegible] جھک [illegible] ہوئے [illegible] گھونٹ دو دوں گا۔ بکی!"

پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں اس طرح کہنے لگے "یہاں بھی کھاتے ہوئے بڑی تکلیف ہوتی ہے جو یہاں کو دواں [illegible] چلی!"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے جمکو بھی آنسو بہا بہا کر خاموش ہو گئی تھی منور دادا اُٹھ کر باہر چلے گئے اور ایک آواز سے پوچھا "کیا بجا ہو گا بیٹا؟"

"سات!" منور دادا پس آ کر کوٹھری میں قدم رکھتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

"یہ گھنٹہ بھی سالا کتنا لمبا بنایا ہے" جمکو اپنے دونوں ہاتھ پیروں سے لپٹے ہوئے اور اپنے گھٹنے پر گال ٹیکے بے خبری بیٹھی تھی۔ بکل کہتی تھی تو اس کے گالوں پر کبھی رُکنے اور پھر بہنے والے آنسوؤں کی دھار چمک جاتی تھی۔ دبے ہوئے گریے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے حلق سے اس طرح نکل پڑتی تھی جیسے وہ ہچکیاں لے رہی ہو!

جس طرح شام کے وقت آسمان ہر ہر لحظہ رنگ تبدیل ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سامنے بیٹھے ہوئے منور دادا کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا کچھ دیر بعد انہوں نے جمکو سے کہا "اب چپ ہو جا اُٹھ مجھے ذرا پانی پلا دے۔" اُن کی آواز میں غصے کی بجائے محبت کی آمیزش تھی۔

ایک بار تو اُن کی آواز سے جمکو بے اختیار رو پڑی لیکن فوراً ہی اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے لپٹ منہ سے آنسوؤں کو پونچھا اور [illegible] کر باہر نکل گئی۔ پانی بھر کر لے آئی۔ منور دادا نے اس سے پاس بیٹھنے کو کہا گلاس خالی کر کے اپنے پاس ہی رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"دیکھو بکی، تو ذرا سوچ تو سہی! میرا کیا بگڑتا ہے میں تو تجھ کو بھی وہیں لے چلوں لیکن شہر جیسا مزے سے گھومنا پھرنا، موج اُڑانا، طرح طرح کے کپڑے پہننا یہ سب تجھے وہاں نصیب نہیں ہو گا! اور پھر بات تو یہ ہے کہ تو جا کر رہے گی کہاں؟ یہ بھی تو سوچ لے۔ [illegible] تک تو میرا ساتھ ہے... لیکن پھر کیا کرے گی؟"

جمکو کی آنکھیں [illegible]
ہم یہاں جانا ہو گا [illegible] جاؤں گی!"

"اُس باڑے کے پاس؟"

"نہیں... " اور پھر [illegible]

"[illegible] ہے! [illegible]" [illegible]

جمکو کے منہ سے روتے روتے [illegible]

[illegible] ... نہاں چاہے [illegible]! [illegible] اور [illegible] جمکو [illegible] تم [illegible] آ جکل [illegible] جائے گے..."

اور پھر [illegible] سانس [illegible] شانی [illegible] آنسو [illegible] منور دادا ت پیس رہے تھے آنکھیں [illegible] تھی جیسے ابھی جمکو کو بھسم کر دے گی [illegible] سے پہلے وہ اکڑ کر کھڑے ہو گئے اور جمکو کا ہاتھ پکڑ کر [illegible] کی طرف کھینچتے ہوئے بولے

"اُٹھا پوٹلی۔" جمکو سہم کر پوٹلی اُٹھانے لگی منور دادا پھر گرجے "سٹیشن یاد رکھ اگر گاڑی سے نہ چوکنا [illegible] بل [illegible]"
جمکو ان کی خوفناک نگاہوں سے ڈر کر [illegible] اُٹھاتی ہوئی بولی "اور [illegible] سامان؟"

منور دادا ہاتھ میں صافہ اُٹھاتے ہوئے بولے "[illegible] کی طرح یاد رکھنا" لیکن جمکو آگے بڑھ کر زینے تک جا چکی تھی۔

x x x x x

چلتے چلتے منور دادا آفس کی کھڑکی کے پاس ٹھہر گئے اور [illegible] بولے۔

"ہم جا رہے ہیں صاحب۔ اپنی رضائیاں سنبھال لینا" یہ کہہ کر مڑے ہی تھے کہ کمرے کی آواز کان میں آئی "کہو دادا چلے؟ ٹائم ٹیبل کا ردیپہ نہیں لے گئے؟"

"بس دو گھنٹہ یہاں — لیکن گاڑی کا علم ہو جانا ہو صاحب۔ آٹھ بجے کی دیر ہے؟"

"ابھی تو بڑی دیر ہے۔ تو یہاں انگوٹھا لگا دو۔" کمرے [illegible] منور دادا کر [illegible] انگوٹھا لگا کر باتیں کرنے اور [illegible] میں [illegible] دیر ہو گئی تھی لیکن [illegible] دیر سے وہ [illegible]۔

وہ منورما کے محلے میں رہنے لگی تھی تو جل جل جھلکی تھی۔ اس
کا بھولا پن بہت سال تک ویسا ہی تھا۔ ایسا
جھلکی کو کیسے بھاتا۔ منورما کو بھی کیسے لگتا آہستہ آہستہ
جھلکی وہ پہلی سی جھلکی نہیں رہی منورما آگے آگے بھاگتا اور
جھلکی پیچھے پیچھے چلی جاتی کیا ایک منورما نے اس سے مذاق
بھی کیا تھا "دیکھ لیکن غصہ بہت بھیجیں گے"

"اگر وہاں جاکر تو نے کبھی منہ چلایا تو زبان کھینچ لوں گا!"

جھلکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بات بدل دی۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد منورما کا غصہ کچھ دھیما ہو گیا۔

"چل - کچھ بھوک تو نہیں آئی؟"

بھوک چلتی ہوئی جھلکی نے سر ہلاکر انکار کیا لیکن شاید منورما
نہیں سکے اس لیے پیچھے مڑ کر پھر کہا "کیوں؟"

"نہیں! سب کچھ گانٹھ باندھا ہے!"

"وہ کھانے کے لیے؟"

"ہاں!" "پھر ذرا ٹھیک کر لو" "بیکو سر پر صافہ تو باندھ لو!"
بغل میں سے صافہ نکال کر منورما باندھنے لگے

"بہت تیرے کی۔ تب سے کس نے منہ پکڑ رکھا تھا۔ لے
ذرا میں لپیٹ دوں!"

اور کھڑے ہو گئے۔

"چلو! اب گاڑی میں ہی باندھ لینا" نہ جانے کیوں منورما کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولے "تیری ماں ناک نہیں جانے گی، لے پکڑ، ابھی تو بہت دیر ہے!"

اور صافہ باندھ لیا۔

ٹکٹ لینے کے بعد ٹکٹ چیکر نے جو سمت بتائی تھی ادھر دونوں چلنے لگے جھلکو منورما سے بھی تیز تیز چل رہی تھی۔ وہ چاروں طرف دیکھتی جاتی تھی پہلا ہی ڈبہ جو سامنے آیا اس میں گھسنے لگی تو منورما بولے:

"آگے چل یہاں تو بھیڑ ہے۔"

جھلکو خوشی سے پھول رہی تھی اور منورما کی بات پر دھیان دیے بغیر شیشوں سے جھانکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ڈبہ کا اس میں دو آدمیوں کی جگہ تو تھی؟"

"آج اب بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دم کھٹکا ہو، کا خیال ٹوٹ جائے۔"

جھلکو کا پورا اطمینان اس وقت ہوا جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور جب گاڑی سیٹی دے کر چھک چھک کرتی ہوئی چلنے لگی تب تو اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے پایاں مسرت کی جھلک دیکھ کر منورما بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے "خوش ہو گئی۔ ہے نا؟"

جھلکو کی آنکھوں میں فرط خوشی سے آنسو آ گئے۔ منورما اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے گفتگو کرنے لگے مگر ان کی بیچ جھلکو احمد آباد میں آ کر کتنی پریشان رہتی تھی۔ جھلکو کھڑکی سے سر نکال کر سامنے نظر آنے والی ملوں کی کالی کالی چمنیاں اور دھواں اگلتی دیکھ رہی تھی!

* * * * * *

گاڑی کا سفر بھی ختم ہو گیا۔ اسٹیشن کے پاس ایک دھرم شالہ میں رات بھی گزر گئی اور اب موٹر کا انتظار ہو رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بظاہر منورما کسی گہری فکر میں نظر آتے تھے لیکن جھلکو تین دن کے بہائے ہوئے آنسوؤں کی قیمت ہنس ہنس کر وصول کر رہی تھی۔ لیکن یہ بھی آخر کب تک؟ وہ موٹر میں بیٹھ گئی، آدھا راستہ بھی کٹ گیا اور اب اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ کہیں موٹر ٹھہرتی اور منورما اس سے کھانے پینے کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے پوچھتے تو وہ ڈھنگ سے جواب بھی نہ دے پاتی تھی۔

اب موٹر ایک پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ جھلکو کھڑکی سے لگے بیٹھی تھی مگر آگے چھ سات کوس کے فاصلے پر کھاندا ایسا صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پہاڑی کی گود میں بسا ہوا اس کا اپنا گاؤں تو آگے نظر آنے لگا سامنے ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ویسے ہی لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور سب کچھ دھندلا گیا۔

منورما بھی کسی گہری الجھن میں تھے۔ جب موٹر ان کے گاؤں کو جانے والی پگڈنڈی بھی پار کر گئی تب انہیں یکایک خیال آیا اور موٹر رکوائی۔ دونوں مسافروں کو اتار کر موٹر آگے چلی گئی۔

"کیوں جھمکو اب کیا ارادہ ہے؟" پوچھتے ہوئے منوردا مسکرائے۔ جھمکو کے گلابی چہرے پر لمحہ بھر کے لیے بے بسی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس وقت رونہ جیسی سکتی تھی نہ رو سکتی تھی۔ منوردا پھر بولے۔

"کنوئیں سے نکل کر کھائی میں پڑی۔ اس سے کیا مل گیا؟" اور غصے کے ساتھ کہا "بہت اں، ہاں، بھائی بھاؤ کر تی تھی اب دیکھتا ہوں"

جھمکو کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر پوٹلی کھولنے لگی۔

"پوٹلی کس لیے کھولتی ہے؟"

"تمہارے کپڑے اور دوسری چیزیں نکال دوں!"

"پھر کہاں جائے گی؟" منوردا نے پوچھا اور تیکھی نظروں سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کچھ گمبھیر ہو کر کہا: "اس بٹیا، وہ بچاری تجھے کیوں لے گیا تھا؟ اور پھر کیوں بھگا دیا؟"

جھمکو خاموش رہی۔ منوردا پھر بولے "مجھ سے بات نہ کر، اس نے تجھے نکال کیوں دیا؟"

"انھوں نے کہاں نکالا؟"

"تو کیا تو اپنے آپ بھاگ آئی؟"

جھمکو روتے ہوئے بولی: "نہیں ان کے گھر والوں نے نکال دیا۔ وہ تو گھر تھے ہی نہیں!" اس نے ہر چند ضبط کیا مگر آنسو بہہ ہی نکلے۔

"کہاں گیا تھا وہ؟"

"کوئی بلانے گیا تھا — وہاں سے پھر واپس ہی نہیں آئے۔"

جھمکو آنسو پونچھنے لگی۔

"تجھے بھی اچھی گھر آنے کی سوجھی!"

جھمکو کچھ نہ بولی۔ شاید منوردا بھی اس بات کے جواب کی توقع نہیں رکھتے یا پھر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ یہ لڑکی اپنی برادری کی بے رحمانہ سزا سے واقف نہیں تھی۔

"چل اٹھ!" منوردا نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اپنے بعض خیالات کا جواب سوچ چکے ہوں:

"تو ایک بار یہاں سے چل تو سہی پھر جیا جائے گا!" پھر ذرا توقف کر کے بولے۔

"چل، چل، باندھ لے پوٹلی!"

ان کے چہرے پر کسی مستحکم فیصلے کے آثار نمایاں تھے۔

منوردا آگے تھے اور جھمکو ان کے پیچھے چل رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور یہ دونوں گاؤں کو بائیں طرف چھوڑ کر آہستہ آہستہ دائیں طرف جا رہے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد منوردا نے جھمکو کو کچھ سمجھایا۔ اگر کوئی پوچھے کہ کہاں گئی تھی؟ منو رکا کہاں مل گئے؟ تو وہ کیا جواب دے یہ سب کچھ سکھلا دیا۔

ذرا دیر کے بعد — شاید اس سوال نے الجھن پیدا کر دیا ہوگا، اس لیے جھمکو سے راز دارانہ انداز میں پوچھنے لگے: "کیوں بٹیا اگر میں تجھے موڑ سے اتر کے اکیلا چھوڑ دیتا تو کہاں جاتی؟"

"کون جانے کاکا؟" جھمکو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"پھر بھی؟ اب اگر میں چلا جاؤں تو؟"

جھمکو کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس بات سے جھمکو ڈر جائے گی لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ اس نے بڑے مایوس لہجے میں جواب دیا: "مہاراج کے پاس جاؤں گی... دوسرا کون ہے؟"

دو چار لمحے بعد منوردا خود بخود جیسے اپنے ہی سوالوں کا جواب دے رہے ہوں۔ اس طرح بولے:

"مہاراج بیچارے کیا کر سکتے ہیں؟"

ایک دل بے پناہ غم و اندوہ میں اور دوسرا اپنے خیالات کی الجھنوں میں، اس طرح گھومتے تھے کہ آس پاس کی جھاڑیوں میں ہونے والی کھڑ کھڑاہٹ،

لہلہاتے کھیتوں میں گھومنا، تالاب کے پاس ریت میں مسلسل ...
... بیٹھے رہنا اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے کسی نہ کسی کی
... ۔ کبھی کبھی آوازیں اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں
جو اسے پہلے بے شمار سنائی دیتی تھیں۔ لیکن ان درختوں
سے رخصت ہوتے وقت اسے جتنا دکھ ہوا تھا، شاید اس کا
... بھی احساس ... نہیں ہو رہی تھی۔ سامنے
... آنکھوں ... اللہ رکھا
... تھی خود
سنسان تھا۔ ... سب
ہی کہیں بھاگ گئے ہیں۔

بڑی مشکل ... اور ... تھا۔ ...
قسمت والوں نے ایک بھی نہیں دیکھی۔ ... ذرا سوچ کر اب چپ
ہو جا۔ رونق کیوں ہے؟ بہار کی نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں ...
تو ... ! اور جب ... تو بھی ... کیا کرتے؟ ہاں دو دن
آرام سے رکھتے خود۔ لیکن دوسری شکلیں تو مجھے ہی سمجھانا پڑیں؟"

منورما تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بیڑی کا ٹوٹا ایک طرف پھینکتے
ہوئے اٹھ بیٹھے۔ تن کر بیٹھ گئے اور جیسے کوئی خیال دل میں جم گیا
ہو اس طرح بولے: "اری پگلی۔ ایسی تو کئی گتھیاں تیرے منور کا
نے سلجھائی ہیں۔ وہ میرے سامنے کیا بات کریں گے! چل اٹھ کھڑی
ہو جا۔" اور دونوں اٹھ کر گاؤں کی سمت چلنے لگے۔ منورما کی اس بات
نے اور جگمگاتے ہوئے تاروں کی نہایت دلکش روشنی نے آنے
والے ان گنت ... نے جھمکو کی ہمت مضبوط کر دی۔

وہی باڑیاں، وہی کھیت، انھیں آوازوں، اور ڈنڈر چلتے
ہوئے اللہ کو پار کرتے ہوئے دونوں اسی مہوے کے نیچے آکر رک
گئے!

"یہاں بیٹھنا بیٹا۔ میں ابھی جاکر تیری ماں کو بھیجتا ہوں۔ اگر کوئی
نہیں آیا تو پھر میں خود آتا ہوں۔" جھمکو کو ڈھارس دے کر منورما
چلے گئے۔

× × × × ×

گاؤں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کتے بھی کبھی کبھار بھونکنے کے
بعد ... "کون ہے" کر کے چپ ہو جاتے تھے۔ منورما پھر
... کھول کر محل میں آئے اور جھپٹ کر اسے جگایا۔

"اجو ... کون، منورما؟ تم؟ اس وقت کہاں
سے؟" ... آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا ... سمجھ
گیا "حقہ ... نہیں لائے؟"

"... تیرا حقہ ... کی ماں
باہر آئی۔ حیران ہو کر پوچھنے لگی "کون؟ منورما! آپ آئے؟ ابھی
تھوڑی دیر پہلے تو میں ... تھا ..."

"میں تو ... چلا آرہا ہوں۔ غرض تو سب راضی خوشی
ہے؟"

"سب اچھے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہاں سے آئی ہوں۔" پھر
... پوچھا "اس منورما؟ ... وہ جھمکو ...؟"

منورما ... "چولہے میں گئے تمہارے منورما مجھ سے کیا پوچھتی
ہو؟ پوچھو اپنی لڑکی سے؟ جس کی خبر لینے گیا تھا؟"

"لیکن ... تھیں تو ..."

منورما نے جھنجھلا کر بات کاٹ دی "بیٹھ بیٹھ آئی بڑا ہوشیار ..."
پھر ایک دم ٹھنڈے ہو کر بولے "ارے ... جس کے لئے تو لوگ حسرت
کرتے ہیں حسرت۔"

"ارے اللہ میں نے تو بہت کہا کہ تو ذرا کاش تو کرے ..."

منورما نے بات کاٹی "ارے تیری بہن نے ایسا کیا پاپ کر ڈالا
ہے؟ تو کہے تو تیری برادری میں ایک ایک کا کان پکڑ کر کہلوا دوں کہ
... پاک ہے ..."

"ٹھیک ہے کاکا۔ لیکن جب ساری برادری ہی پیچھے پڑ گئی ہو
تو..."

"تجھ میں دم ہوتا تو کیسے پیچھے پڑ جاتی؟" پھر کچھ سوچ کر بولے
"کہاوت ہے نا کہ "دبو ... اُدھار!" ذرا دبانا بھی آنا
چاہیے!"

شاید ماں کی بے صبری کچھ بڑھ گئی ہوگی، بول پڑی "لیکن اب
وہ کہاں ہے منورما؟"

"وہ تو بیٹھی ہے اس مہوے کے نیچے۔ بیچاری ٹھنڈ میں ٹھٹھر رہی ہے۔
جلدی جاکر لے آؤ۔"

"لیکن اتنے دن کہاں تھی؟" ... نے پوچھا

جتنا جب شفقت کے انتظار میں کھڑی رہی، منورا نے سوچا کہ وہ بہرحال واقعی قول کے پکے تھے اور انھوں نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا یہ سوچ کر انھیں ذرا اطمینان ہوا، کہنے لگے "سال میں تھی! وہ تو مجھے ایک کام سے دیوان صاحب کے پاس جانا پڑا اور یہ راستے میں مل گئی نہیں تو اب تک تیری بہن بیٹھی ہوتی کسی میاں کے گھر!" ذرا رک کر پھر بولے۔

"اس دن جب مجھے نیچے نہیں ملی تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ضرور کسی ندی کنویں میں ڈوب مری۔ کمبخت نے ایسا ہی کیا ہوتا تو اچھا تھا!" پھر لمبی سانس لے کر بولے۔

"یوں کہو کہ لوٹ آئی اور رستے میں ہی جلوں نے تیرے باپ کی عزت بچالی۔ نہیں تو تیری کیا تیرے سارے گاؤں اور ساری برادری کی ناک کٹ جاتی!" جتنا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تو جانے دے آؤ اسے!" اور کھڑے ہو کر پیچھے سے بولے "دیکھو بیچھریا ابھی یہ بات چھپی رہے تو اچھا ہے، کل تک تو کہیں تیری برادری میں ہی ٹھکانا کر دوں گا۔" پھر دھیرے سے بولے "ارے پاگل اگر عقل نہ ہو تو کسی سے لے لینا چاہیے۔ مجھ جیسا کون نکھٹو ہو گا جو گھر کا کام چھوڑ کر تیرے پاس دوڑ آئے گا۔"

یہ کہہ کر منورا اٹھنے لگے۔

"لیکن کاکا، جب معاملہ ہاتھ میں لیا ہے تو اسے سلجھا ہی دینا تھا" بیچھریا بھی کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ منورا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا "اگر میری بہن کو کہیں ٹھکانے لگا دو تو میں بھی پگڑی..."

منورا کچھ ہنس کر بولے "یہ تو میں جانتا ہوں کہ اب تو تو پگڑی بھی دے گا اور دوشالا بھی۔ لیکن پہلے کچھ نہ سوچا! اچھا جا آرام سے سو۔ بھگوان مالک ہے!" منورا اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔

× × × × ×

جتنا چپکے سے جھک کر گھر آ گئی، بیچھری کی بہو کو ان سب باتوں کا پتا چل گیا۔ مگر کسی نے کوئی تعجب نہیں نکالی۔ لیکن منورا جیسے جیسے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے ان کی بے چینی بڑھ رہی تھی شاید دل میں یہی سوچ رہے ہوں گے کہ "کیا حماقت ہوئی جو میں نے یہ سب کیا" اور کیا ہی تھا تو پورا کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ تو لینے گئی تھی بہت کوئی

ختم، دلالت ہو گئی۔ دل ہی دل میں خوش [illegible] سب کی چاہی منت میں لگ گئی۔ [illegible] دور رہی یہ تو عجب ہے الٹے خرچ ہو گئے!"

کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہے تب گھر والی کی آواز [illegible] کون ہے، اتنی رات گئے؟"

منورا کے منہ سے پورا جملہ بھی نہ نکلا تھا... [illegible] کھل گیا۔ گھر والی نے فوراً سوال کیا "آج رات گئے کہاں سے...؟" [illegible] دیا روشن کرنے لگی۔ منورا نے کچھ جواب نہ دیا، [illegible] چارپائی سے سرہانے پڑی ہوئی گمچھا اٹھا کر ایک طرف رکھا اور انگرکھا بھی اتار کر ہاتھ منہ دھونے کے لیے پانی لینے نکلے۔ دھوتی کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے گھر میں آ کے پوچھنے لگے۔

"تب کچھ کھانے کو...؟"

"روٹیاں ہیں جوار کی! مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی رات کو آؤ گے، نہیں تو پھلوں کو کبھی نہ جلاتی۔"

"اچھا، جوار کی ہے تو وہی سہی! اب تو دودھ بھی کہاں بچا ہو گا؟"

"کیا دیکھ کر کہہ رہے ہو؟ پوچھتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی" گھر والی بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی، وہاں سے روٹیاں نکالیں، پاس کے چولھے میں دبے ہوئے انگاروں پر نہیں سینکے تھے، ان پر تھوڑا سا گھی مل کر لہسن کی چٹنی بھی رکھ لائی۔

منورا نے ابھی آدھی بھوک بھی نہیں کھائی تھی کہ گھر والی نے پوچھا:

"کیا کر کے آئے؟"

"کر کیا آئے۔ تو پیچھے پڑی تھی اس لئے جو آیا وہ کیا!" منورا سر جھکائے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے بولے۔ کچھ دیر خاموش رہے لیکن گھر والی سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"کتنے ملے؟"

"بہت سارے!"

"پھر بھی؟"

منورا نے ہاتھ دھوتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے گھر کی طرف دیکھ کر کہا، "اس کی کوئی قیمت ہوتی ہے پگلی!" پھر خود ہی ہنسے اور بولے "تم ذرا انصاف کرلو۔ نہ تو حقہ ملنے سے خستہ پریشان ہو گیا!" اور سچ مچ بہانا ڈالنے

[illegible] ہو گی۔

گھروالی [illegible] اس کال [illegible] ہو سکا۔ وہ [illegible] لے کر [illegible] سے [illegible] آئے [illegible] ہی کی [illegible] [illegible] ہو گیا۔

[illegible] ہی ہے؟

کان ہی ہیں نے سوچا کہ ہو کر ٹھکانے ۔ ۔ ۔ ۔

حسرت ناکی کی پہلے ۲ سال [illegible] صبر کا تو [illegible] ۔ ۔ پھر حصہ بھرنے میں وہ وقت ہو گئے گھروالی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہ کتنا ہاتھ ہی منورما نے ہنستے ہنستے کی، چھٹی پوری بات خوش ہوتی کہاں ہوا کہ کہاں کہاں گئے تھے کیا کیا کرنے لیکن تو لڑکی ایک دم [illegible] بحث نے نہیں کی۔ [illegible] منورما کی [illegible] کہ ان کے سامنے بیٹھ گئی:

مسکرا رہی؟ [illegible] آنکھوں کو منورما نے بچا دیا تھا مگر اس وقت ان کے سامنے بیٹھی ہوئی ان کی گھروالی نے ان کی عقل گم کر دی۔ [illegible] شکل نظر آیا تھا۔ وہ دونوں گھٹنوں کے درمیان میں ٹھوڑی رکھ کر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے رہے۔ [illegible] رہے اور مسکراتے رہے!

"بولو، کیا کر آئے؟" گھروالی نے پوچھا۔

"خاک کر آئے۔ گھروالا پہاڑ اور جنگل [illegible] بیٹا! اور کیا؟" "اور کیا؟" کہہ کر پھر اطمینان سے مسکرانے لگے۔ منورما کے چہرے پر [illegible] ہوئی [illegible] دیکھ کر گھروالی کو غصہ تو نہیں آیا لیکن اس نے ذرا چڑ کر کہا:

"احمد آباد گئے تھے یا نہیں؟ صاف صاف بات کرو جس سے کچھ سمجھ میں آسکے!"

منورما اب بھی چپ رہے تو اس نے پھر کہا: "یا پھر وہ چڑیل کہیں بھاگ گئی؟"

"بھاگ گئی ہوتی تو بھی اچھا تھا!" منورما نے کچھ اداس لہجے میں کہا۔

اب گھروالی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا: "آگ لگے تمہاری اس عادت کو۔ سیدھی بات بھی نہیں کرتے!" اور منہ چڑاتی ہوئی، [illegible] لے کر کھڑی ہو گئی۔

منورما جیسے گھروالی کے غصے کا نوٹس ہی نہیں لیا اس طرح بولے!

"الجھن [illegible] آدمی [illegible] ہی نے قصہ [illegible] کرکے گئے تھے [illegible] نہیں ہو سکتیں! اور دقت آئی کہ یہی کس طرح بند ہو جاتا۔ [illegible] بتا تو مشکل ہے کہ [illegible] سب [illegible] عجیب تھے، [illegible] تھی۔ [illegible] جھگڑے والی آجانے کی [illegible] ضرورت سے زیادہ [illegible] چاہتے تھے۔ اس نے جلد رخصت ختم ہونے کی آگے دن تک گھروالی کا ذہن [illegible] بھی ہو گھروالی سے کوئی نہیں، وہ ایک مستقل [illegible] اگر آپ [illegible] ہو گئی اور [illegible] لگانے کا معاملہ [illegible] جائے گا۔

گھروالی نے سمجھا [illegible] گئے تھے بڑی کمائی کرنے۔ [illegible] آدمی۔ [illegible] آئے [illegible] بڑی لڑکی بھی [illegible] اس وقت [illegible] بھی [illegible] کی آفت آئے گی اور [illegible] ہوئے کہنے لگے: [illegible] عزت سے گھر واپس آگیا!

"نہیں تو؟"

"نہیں تو [illegible] بیٹھا ہوا چپ چاپ رہ جاتا!" منورما نے [illegible] شروع کیا۔ گھروالی بھی ایک دم ایسے ٹھنڈی ہو گئی جیسے کسی نے [illegible] غوطہ کھا رہا ہو۔

"آخر ہوا کیا؟ ۔ ۔ ۔ کچھ بات بھی؟"

"بات تو کروں گا ہی! لیکن اس وقت تو ہی بس ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہو جانے دے پھر آرام سے سب بتا دوں گا!!"

نتیجہ منورما کی منشا کے مطابق ہی نکلا گھروالی نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا ابھی کوئی ڈر رہے؟" منورما نے صبر دلاتے ہوئے کہا

"ایسا تو نہیں، پھر بھی چوکنا رہنا بھی ضروری ہے۔ اور بات تو تمہارے سوا کسی کو بتانا ہی نہیں!"

اگرچہ اس سے گھروالی کو ذرا ڈھارس ہوئی لیکن ساتھ ہی الجھن بھی پیدا ہو گئی۔ وہ معاملے کی وضاحت کے لئے کوئی

سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ منوروا نے پھر ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے کہا:

"جا سو جا، ذرا رضائی کو پیروں کے نیچے دباتی جا۔"

اگر گھر والی اس وقت الجھن میں پڑی ہوئی نہ ہوتی تو رضائی دباتے ہوئے یہ ضرور کہتی کہ تم سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا!

گھر کے کواڑ بند ہونے کی آواز کانوں میں آئی تو منوروا کو اتنا اطمینان تو ضرور ہوا کہ روز کا جھگڑا ٹھنڈا ہو جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا! لیکن اس اطمینان کے بعد بھی نیند کے آثار کوسوں دور تھے! جھگڑے کا سوال برابر ذہن میں گھوم رہا تھا۔ اور اُسے حل کئے بغیر نیند کیسے آسکتی تھی؟

منوروا کی گھر والی بھی شاید سو گئی ہوگی۔ گاؤں اور گلیارا سب سنسان تھا۔ کبھی کبھی جاڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے کسی کتے کی کنکناہٹ یا کھیتوں کے کسی رکھوالے کی ہانک ضرور سنائی دیتی تھی لیکن وہ بھی رات کی اتھاہ تاریکیوں میں کہیں گم ہو جاتی تھی!

"اوہو، ہو ہو۔ میں بھی گھر چھوڑ کر جنگل میں بھٹکنے گیا تھا" بڑبڑاتے ہوئے منوروا اُٹھ بیٹھے جیسے کسی ناقابل بیان طمانیت نے اُنہیں اندرونی گرمی پہنچا دی ہو۔

اس طرح سردی سے بے پروا ہو کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے، پاؤں لٹکائے اور آگ کی طرف ہاتھ کر کے سینکنے لگے جو لوکی رضائی اوڑھے الاؤ میں پڑی تھی!

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے —

جب وہ حقہ بھرنے کے لئے اٹھے تو الاؤ کی مدھم آنچ سے نظر آنے والے اُن کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کسی بڑی مشکل کا حل تلاش کر کے سکون حاصل کر چکے ہوں! حقہ بھی بڑے سکون سے پیا — پھر رضائی اوڑھتے ہوئے بولے: "سب برابر ہے — اب تو جھک رہے گی!"

کچھ ہی دیر بعد نیند کا غلبہ ہو گیا اور خراٹے بولنے لگے "گھر وار — ہے — گھر وار۔"

× × × ×

علی الصباح جب منوروا چوپال کے چبوترے پر بیٹھے دتون کر رہے تھے۔ اس وقت پنڈال کی مستی سے بھرپور زندگی کا لطف اٹھاتے ہوئے کبوتر سامنے والے [illegible] بیٹھے اپنے پر پھلا کر سردی بھگا رہے تھے۔

گاؤں میں ابھی چائے کا رواج نہیں تھا [illegible] شہر سے بنائی جاتی تھی۔ منوروا کو آج یہ شوق کرنے کی [illegible] ہیں شکر تو ہوتی ہے کچھ حرج نہیں۔ گڑ سے بھی کام چل جاتا [illegible] کی پڑیا اور بارہ پیسے کے خرچ کا حساب لگا کر [illegible] دودھ کی کمی۔ سو گھر کی گائے بھینس تھی کسی سے مانگنے [illegible] تو ابھی کھیت سے نہیں آیا تھا اور [illegible] رہتا تھا۔ اس لئے منوروا کو خود ہی پتیلی چڑھانی پڑی۔ چائے میں ڈالنے کے لئے ادرک چھیل رہے تھے کہ اسی وقت ودیا اور ایک پڑوسی آ پہنچا۔ ودیا نے چائے کا "چارج" سنبھال لیا۔ ابھی چھان ہی رہا تھا کہ دو آدمی اور آ پہنچے۔

چائے کی کٹوریاں بھرتے ہوئے ودیا نے کہا:

"کٹوری کی جگہ آدمی کٹوری نہیں گے؟" چائے ایسے مزے سے پی جا رہی تھی کہ راستہ چلنے والا بغیر دیکھے ہی جان جائے کہ آج منوروا کاکا کے گھر چائے بنی ہے۔

اُن کی فرمائش سے پہلے ہی حسب معمول منوروا نے خود ہی چلم اٹھائی۔ اس کا خواہ صاف کیا، آگ ڈالی اور تمباکو رکھ کر چلم بھر لی۔ اب حقہ تیار تھا۔

تمباکو جل گیا، تو دوسری چلم بھری گئی۔ کسی نے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ منوروا نے اسکول کے بارے میں سوالوں کے مناسب جواب دے کر گاؤں کی باتیں شروع کر دیں۔ آخر انہیں کہنا ہی پڑا۔ ایک پڑوسی جوان سے بولے:

"ارے شنکر! ذرا اپنا حقہ تو اٹھا لا، مجھے گاؤں میں..."

لیکن اس سے پہلے کہ اُن کے منہ سے "جانا ہے" نکلے، ودیا بول پڑا: "ارے تمہیں کہاں فرصت؟ ہم بھی اپنا کچھ کام کاج دیکھیں گے!"

منوروا نے بیٹھنے پر اصرار کیا، وہ چار چلموں کی تعداد بتا کر بھی الاؤ کے پاس رکھ دیا لیکن کوئی بیٹھا نہیں۔ منوروا نے بھی گرم پگڑی اور اپنا حقہ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ گھومتے پھرتے اسپا پڑھنن کے گھر آگئے۔

ابا نے [illegible] کر شوروا کی طرف دیکھا اور ہولے سے بولے
انہیں [illegible] اچھا لگا۔ ابھی سے ہے، پہلے کا [illegible]
کرے ہے
ابا [illegible] آنکھوں سے گھور کر انہوں نے خود
نے کہا:
"ابا [illegible] ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے؟"
بس یہ سن کر ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرے پر
[illegible] چھا گئی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں، "چل ہری۔
[illegible] اٹھا دے" اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی [illegible]
[illegible] باڑے میں [illegible]
جلدی جلدی [illegible] پانی کا گھڑا لے کر چل دی۔ شوروا
نے کہا:
"کیا اماں ہر گھڑی جلتی رہتی ہیں! [illegible] سے باتیں کر بیٹھیں
پھر ہری کی طرف دیکھ کر بولے، "کیوں رے ہریا! تجھ سے کوئی
[illegible] بھی نہیں ہو جاتا؟ اتنی سی [illegible] بے چاری بڑھیا کتنا کام
کرے گی؟"
ہری گھڑا بھر کر لوٹا۔ ماں نے تب [illegible] پھر اس کی طرف
بڑھا کر کہا: "لا، میں بھر لاؤں، کھیت بھی دیکھتا آؤں؟"
"لے جا!" [illegible] کہتے ہوئے اماں نے پانی کا
گھڑا ہری کو دے دیا۔ [illegible] آنگن میں بندھے ہوئے بچھڑے کو کھول
کر گھر کے پچھواڑے باندھنے گئی۔ واپس آ کر شوروا کے پاس بیٹھ گئی۔ شوروا
نے پھر وہی سوال کیا:
"اماں آپ کیوں دکھی ہو رہی ہو؟ آخر کیا بات ہے، کچھ بتاؤ
تو؟"
"کیا دیکھ کر پوچھتے ہو؟" اماں نے ذرا ناراض ہو کر کہا۔
"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے بیچارے مجھے اچھی لگتی ہے!"
"تو پھر اور کیا؟" شوروا نے اماں کی طرف دیکھا جو انہیں غصہ
بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی پروا کیے بغیر کہنے لگے،
"وہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں لیکن دو
برس بعد یہ سب کچھ کون سنبھالے گا؟ کیا تم زندگی بھر ہری کا ساتھ
دے سکو گی؟"

"بہو آتی ہے تو گھر کا [illegible] اور سب کچھ [illegible] سنبھالے
میں تھوڑی دیکھ آؤں گی؟"
شوروا اداس ہو کر، "تم نے ایسی ایسی باتیں کر کے کا [illegible]
ہے نہیں تو ..."
"بس چپ بیٹھے رہو ..." پھر اماں نے سر جھکایا اور کہنے
لگیں، "نہیں تو میرے منہ سے [illegible] نکل جائے گا۔" پھر شوروا کی طرف
دیکھ کر پوچھنے لگی،
"تم نے کیا کر کے بگاڑا ہے؟ بولو ... جیسے [illegible]
الٹ پلٹ ہے؟"
اماں کے ناراض ہونے کی پروا کیے بغیر شوروا نے پھر کہا،
"تم نے نہیں تو کیا کسی نے بگاڑا ہے؟"
پھر ذرا توقف کر کے بولے، "[illegible] کی بیٹا ہو تو [illegible] ہی ہے
[illegible] ہے کہہ کر [illegible] اور [illegible] والے [illegible] بہت سے [illegible]
جانے کب [illegible] اوپر کی [illegible] گئی [illegible]
[illegible] اس طرح [illegible] ہو [illegible] بتاؤ کون
تم سے وعدہ [illegible]؟"
"نہیں آئے تو جانے دو [illegible]!" اماں کہتے ہوئے کچھ تنک
اور ذرا ٹھنڈی ہو کر بولی،
"میں تو اپنے لڑکے کو ایک بار اچھی طرح بیاہتی ہوں" ایک
ٹھنڈی سانس زور سے بھر کر بات جاری رکھی، "لیکن [illegible] کچھ
اور ہی کرنا تھا۔ اس کی تقدیر میں ہو گی تو دوسری مل جائے گی۔
نہیں تو ..."
"اس طرح تو ضرور مل گئی!" شوروا کا چہرہ کچھ سخت ہو گیا۔
اماں کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ اسے روک کر بولے، "تمہاری ان باتوں
نے ہی تو سب کچھ بگاڑا ہے۔ میرا جیسا کوئی بات لائے بھی تو کیسے لائے؟
کوئی کچھ نہیں ملاتا" [illegible] اماں نے کہا "سب کرو، کچھ لیا سب
میٹھی میٹھی باتیں بناتے ہیں!"
شوروا تن کر بولے، "یہ بات ہے؟ دیکھتا ہے؟" اور کچھ رک کر
بولے، "تو آج رات میری [illegible] کو [illegible] کرا دوں؟ ہے منظور؟"
ہوشیار اماں شاید کچھ گئی ہو گی، بے آواز سا قہقہہ مار کر بولی:
"ہو گی کوئی جس کا کہیں ٹھور ٹھکانہ نہ ہو گا!"

منور روا، اسما کی طرف دیکھ کر ہنسے اور کہنے لگے "اگر کسی کا کسی پر یقین ہی نہ ہو تو اس کا کیا علاج؟" اسما خاموش رہی۔ تو منور روا نے پھر کہا "موتیاں سے جتنا مجھے پیار ہے۔ اتنا ہوں گا اس سے کچھ ہی کم مجھے بھی پیار ہو گا، اسما! تو شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں سب بھول گیا ہوں، لیکن۔۔۔"

منور روا کی اس "تڑپ" میں اور ان گول گول باتوں میں، نیز دل کی گہرائی سے نکلے والی آواز میں، اسما کی کوئی مبہم یا دبی ہوئی سسکی تھی۔ اسما نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "اسی لئے تو موتیاں کی اتنی فکر رکھتے ہو!"

منور روا اس طنز کو سمجھ گئے۔ بولے "جی تو بہت چاہتا ہے لیکن قبضہ بھی نہیں کیا جا سکتا!" اور مسکرانے لگے!

منور روا نے اسما کی ترچھی نظروں میں کچھ دیکھا اور پہچان لیا! اُن آنکھوں میں بڑا لطیف طنز چھپا تھا۔ شرم و حیا کے گہرے بادلوں میں محبت کی سی کا پھندا چھپا ہوا تھا۔ منور روا کی آنکھوں میں ان کی پرچھائیں اُتر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے ٹھنڈی سانسیں یوں نکلنے لگیں جیسے وہ اس نیچے جھکتی ہوئی چار نگاہوں سے نکل رہی ہوں۔

اتنے میں موتی پان لے کر آ گیا اور ماں سے پوچھ کر پھر گھوڑا لے کر چلا گیا۔ منور روا نے بھی حقہ ایک طرف سرکا دیا۔ منور روا اب تو لگاتار بات کرنے لگے:

"تو سمجھ تو گئی ہو گی کہ میں جگنو کی بات کر رہا ہوں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ اس بے چاری کا ایسا کرن جیٹھ ہے جو مجھے بھیجا؛ بھلائی بھاوج کو تو جانتی ہے اور یہاں بیچاری کو تو رہنے کے بھی لالے پڑے ہیں!"

اسما کا چہرہ پھر بدل گیا۔ غصے میں بولی "یہ کہو کہ کوئی نہیں ملا۔ اس لئے موتیاں یاد آیا!"

منور روا کا چہرہ بھی کچھ سخت ہو گیا: "تو یہ سمجھتی ہو کہ منور جیب ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور کوئی نہ ملے۔ اس سے پہلے کیا مریا کی بہن کو ٹھکانے نہیں لگایا؟" کچھ توقف کر کے "اور تمہاری اسی بات کے ڈر سے تو آنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ سوچا کہ تم لاکھ کوشش کرو، پھر بھی ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔ ذرا دیکھوں موتیاں کی قسمت زور مارتی ہے یا نہیں — اور چلا آیا — ایسی چھوری کو ٹھکانے لگانا کچھ مشکل بات نہیں ہے تم کہو تو ٹھکانے گن کر بتا دوں!" پھر منور روا نے ادھر اُدھر گاؤں کے دو چار بڈھیوں کے نام گنوا دیئے اور بولے "تم ہی بتلاؤ ان میں سے کون سا بڈھی

بیکار کر دے گا؟"

اسما کسی سوچ میں پڑ گئی۔ منور روا نے پھر کہنا شروع کیا "تو کیا چلا۔ اسما بھابی، ایسی اچھی لڑکی دوسری نہیں ملے گی!"

"ابھی تھی اسی لئے تو راتوں رات ڈنکا کر دیا تماشا دکھایا!"

"اسی لئے نہیں، یوں کہو کہ بیچاری قسمت میں آگئی ہال اس کا نصیب اچھا ہے تو کیوں بیچاری کا راستہ خیر سے سسرال میں گھر والا اور ساس سب نے۔ کچھ چرچا ہی تھا اور دیکھے ہی ایسی بھاوج کی بھاوج ملی! اس نئے غریب چاروں طرف سے پریشان ہو گئی اور کسی نے نہ اس کا ساتھ دیا آخر اڑ گئی — بھائی تھا اس نے منہ کالا کیا — پھر تو بھاگ ہی جاتی ہو؟"

اور پھر منور روا نے لگ بھگ سارے بڈھوں کو گنا کر چلا دیا۔ بولے "اسما بھابی، یہ تو وہ مرغی نہ تھی جس کا بچھڑا ہو! پھر ایک لڑکی ہر ایک کو مل جاتی؟ ہم نے کہا ہم نے ایسی بات کوئی برادری میں کبھی نہیں جانی!"

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

"نہیں اس سے کیا؟ — وہ یہیں ہے میرے گھر میں، یہ تو اتفاق کی بات ہے ورنہ اگلے بیس برس تک مسلمان کے گھر میں ہوتی" منور روا کے اس جملے نے سامنے دیکھتی ہوئی اسما کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ اس نے دو چار سوال پوچھے جن کے جواب منور روا نے سوچ کر دیئے، اور پھر کہنے لگے "ہاں تو پھر کیا ارادہ ہے بولو؟ کہو تو آج کا دن بھی اچھا ہے۔ آج ہی رات کو۔۔۔؟"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن بیٹے والوں سے جو دشمنی۔۔۔؟"

منور روا نے در گزر کیا بولے "تبھی تو پار سال جب بیمار پڑی تو بھائی دو بجا جو ان نے دیکھ لیکھ کی تھی: یوں ہی بیکار بیکار نے جاتی ہو۔ اور یہ روپی تمہاری اکلوتی بچی بہت تھوڑی ہے۔ اور یہ بھی، تو مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ دوسرا اُڑا لے جائے، اس سے اپنا موتیاں کیا برا ہے؟"

اتنا سمجھانے پر بھی اسما جیل کی طرح عقر تی رہی تو منور روا نے طعنہ دیا، "میکے کی محبت تھی اسی لئے تو جو چھپنے پائے اسے گھر میں بٹھانے کو تیار ہو گئی تھیں!" اسما اس طعنے سے سٹپٹائی تو بولے "تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ ساری باتیں مجھ سے چھپی ہوئی ہیں۔ بیجمرا کے ساتھ تمہاری دشمنی تو جب سے ہی ہوئی ہے نا؟"

علاوہ سب بہانہ ہے" منورما مسکرا اٹھی۔ اسا بہن کی بات
ان کے بعد اس نے چاروں طرف سے چہرہ گھما کر بول
"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے" پھوپھا
بہت ملک کہتی ہیں موتیاں کو نکال کر لے جانے میں کیا جھوٹ ہے
تو ٹھیک! لیکن برادری مجھے چھوڑ سکتی کیا!

لیکن یہ بات کو تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ تو بس دو دن کی باتیں بنائیں گے
پھر سب اپنے کاموں میں لگ جائیں گے" مسکرا کر کہنے لگی "نہیں بالا نہیں ایسے
بالکل پاگل کی طرح سے رہے لیکن ۔۔۔"

منورما نے "برادری کی بات میں سمجھتی ہوں!" اور اسما کی طرف ذرا
دیکھ کر کہا۔

"تم دس بیس کو بھی بیٹھے تیار ہو نا؟ پھر اس سے زیادہ کیا کہیں گے
تم سمجھتی ہو کہ وہ جرمانہ مانگیں گے لیکن برادری کا ذمہ لیتا ہوں"
اسما کی طرف ذرا جھک کر کہا

"تم دس بیس کو بھی بیٹھے کو تیار ہو نا؟ پھر اس سے زیادہ کیا کہیں
گے؟ تم سمجھتی ہو گی کہ وہ جرمانہ مانگیں گے لیکن برادری کے
ساتھ سے زیادہ دینا پڑا تو میں اپنے پاس سے دوں گا اور کیا؟ اب بھی
کوئی خطرہ ہو تو دل سے نکال دو!"

اسما چار سو بیس ہو کر بولی "کیوں لالہ کیسے جھمیلے میں پھنستے ہو؟ ایک
پاس کے بھائی جیسے ہی ہیں ان پہ ۔۔۔۔۔۔"

"تبھی تو تم نے اس دن ساری رات ہماری نیند حرام کر دی تھی۔ میں
نے تو اسی دن سمجھ لیا تھا کہ یہ سب کچھ اسما بہن اپنے دالان کے لئے نہیں
بلکہ پرائے دشمنی میں کر رہی ہیں!" منورما کہہ رہے تھے۔ پھر بولے "لیکن
بیا سکو تو خوشی ہو گی اور اگر نہ ہوئی تو میں بیٹھا ہوں، تم فکر کیوں کرو
نہیں کیا فکر ۔۔۔؟"

"مجھے کیا فکر؟ اچھی بات ہے، اتنے برس بعد موتیاں کے باپ بن
رہے ہو تو کرو سب کچھ!" اور منورما کی طرف دیکھ کر شوخی سے بولی
"میں ایک پیسہ نہیں دوں گی!"

"تم نے آج سے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے! میرا وقت ہوتا تو یہ بھی کر کے دکھا
دیتا۔"

اسما خاموش تھی۔ منورما اس کی طرف دیکھتے رہے دونوں کی
نظروں میں اور پھر جھک گئیں!

منورما نے بھی کچھ سمجھ لیا "اسما بہن! وہ دن نہیں بھولتے" اسما
کو منورما کی آنکھوں میں کوئی جانے پہچانے جذبات تڑپتے ہوئے سے
لگے۔ یا پھر اُن دنوں کی یاد کے ناقابل برداشت ہو جانے کا ڈر تھا
خواہ خاص بات کہہ دی، جانے کا خطرہ ہو۔ پھر جانا اس نے
جھک کر کہا "مجھ سے بھی ان باتوں کو۔۔۔ سب یہ باتیں کیوں نکال سے ہو،
خاص بات کہو نا؟"

منورما نے کہا "اب بات میں باقی کیا ہے! شاید اسی وقت موتی
بابا کا گھوڑا لئے ہوئے اندر آیا۔ اُسے دیکھ کر منورما نے کہا "میں موتیاں
کو جلد کی بھی بابا بنا رہی ہوں" اور کہا "۔۔۔ لیکن" اسما نے "لیکن"
کی تشفی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ وہ تو تمہاری جیسی بہو
کی تعریف کرتے اب تک رہے تھے۔

اسما نے بھی اقرار کیا "کیا میں نے جانتی نہیں؟ یوں تو وہ لڑکی
ایسی ہے کہ دشمن کو بھی پیاری ہے۔"

"اور پھر تو تو اس کی ساس بننے والی ہے تجھے کیسے پیاری نہیں
لگے گی؟" کہہ کر منورما اُٹھے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے "تو پھر بات پکی رہی
نا؟ آج رات کو ۔۔۔۔"

"جب تم سارا بوجھ اپنے سر لینے کو تیار ہو تو میں کیوں انکار کروں
لیکن ذرا موتیاں سے پوچھ تو لو ۔۔۔"

"اس سے کیا پوچھنا ہے؟" پھر ہنس کر کہا "ہاں اگر اس کے
کانوں میں یہ بات ڈال دی جائے تو چھپنے ۔۔۔" پھر اسما کی طرف دیکھا
"نہیں تو اچانک جھمکو کو دیکھ کر پاگل ہو جائے گا!"

پھر ہنسنے لگے۔

"اچھا اب چپ چاپ گھر چلے جاؤ، نہیں تو میرے منہ سے کچھ
نکل جائے گا!"

لیکن شاید منورما کو یہ کچھ "سننے کی خواہش تھی، یا اور کوئی بات ہو گی
وہ اسما کو دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔ اسما کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "سچ کہا ہے
کہ بندر بوڑھا ہو جائے مگر قلابازی نہیں بھولتا!" منورما دل ہی دل میں خوش ہوتے
رہے کچھ خیال آتے ہی حقہ سنبھالا اور اسما کو رات کے لئے سب تیاریاں کر رکھنے
کی ہدایت دے کر باہر آ گئے۔ اُن کے چہرے پر طمانیت اور بشاشت کے آثار تھے

× × × × × × ×

کھانا کھانے کے بعد فوراً ہی پھر سے گھر پہنچے اور گھر کے اندر جا کر جھمکو کا

نام لے کر زور سے آواز دی۔ جھکو کسمساتی اس طرح اتری جیسے آسمان سے بادل اتر رہا ہو۔ پھر کچھ شکایت بھرے لہجے میں بولی: "آج خیریت سے ہو کا کا؟"

"لو بولو — ارے تیرے لئے تو ہم کا ٹھیک رہا تھا۔ ورنہ تو پوچھ" جسنا بیچ ہی میں بول پڑی: "کچھ ٹھکانا ہوا؟ کون سے گاؤں گئے تھے؟"

"بچھڑا کہاں گیا؟ وہ آجائے تو تیلوں لگا!" پھر جھکو کی طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"بٹیا تو کس کے کوٹھے پر چڑھی تھی؟ خیر اب بہت دنوں چڑھنا نہیں پڑے گا!" پھر آس پاس دیکھنے لگے۔ جسنا شاید بچھڑا کو ہی باندھنے گئی تھی۔ منورد نے چپکے سے جھکو سے پوچھا:

"اری جھکو! اگر تیرے کپڑے گاؤں میں پہنوا دیں تو؟"

جھکو نے شاید اسے مذاق سمجھا ہو اس نے منہ پھلا کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا:

"ہونہہ! گاؤں میں کہاں؟"

"یہاں پڑھے دس پانچ سات گھر تو ہیں نہیں؟ جو تو پوچھ رہی ہے!"

جھکو کے چہرے پر جو سرخی دوڑ گئی اسے تو منوردا اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکے لیکن اس کی آنکھوں کی چمک انہیں ضرور نظر آگئی۔ ان آنکھوں میں جو قلبی طمانیت، شرم و حیا اور حیلے سے پیدا ہونے والی ادا تھی وہ منوردا نے بھانپ لی۔ جھکو کچھ ٹھنک کر بولی:

"جاؤ جاؤ کاکا! میری ہنسی اڑاتے ہو؟" اس کی آواز دھاڑ مدھی ہوئی تھی لیکن منوردا کو اس میں بڑا مزا آیا۔ وہ پیٹھ پھیر کر بولے:

"لے تو میں چلا! مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا، ماننا نہ ماننا تیرا کام ہے" اور باہر نکل آئے۔ جھکو نے ایک دم آنکھیں پونچھ لیں اور کھٹیا کے پاس سے اس طرح بار بار گردن اٹھا اٹھا کر جھانکنے لگی جیسے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ وہ دراصل باہر ہونے والی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منوردا پھر اندر آئے اور جھکو سے کہنے لگے:

"یقین نہیں آتا تو اپنی ماں سے پوچھ لے!"

"اچھی بات ہے" جھکو نے کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور ساڑی کا پلو چبانے لگی۔ منوردا ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

× × × × × × ×

اور گاؤں والوں کے حیرت و استعجاب کے درمیان ہی اسی رات جھکو کا بیاہ مسلی سے کرا دیا گیا کسی نے تو جھکو کی تعریف کی جو دولہا اور دلہن دونوں کے باپ بنے پھر رہے تھے اور کوئی یہ کہہ کر ہجو بیان کر رہا تھا کہ "منور کاکا بڑے خلیق آدمی ہیں، اپنی ذات کے پکے نکلے نہ جانے جھکو کو کہاں سے پکڑ لائے۔" کھیتی کا زمانہ تو تھا نہیں اس لئے گاؤں کی جوانیاں مستی بھری آوازوں سے اپنے اپنے آنگنوں میں میٹھی سریلے گیت گا رہی تھیں۔ کوئی مبارک باد دینے آ رہا تھا اور کوئی جلے دل سے شادی کی مٹھائی لے کر چلا جا رہا تھا۔ برادری میں جو چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں: "موتیاں نے یہ جھگڑا اپنے گھر میں بٹھا کر کچھ اچھا نہیں کیا! پکی بات ہے تماشا تو ساری پنچایت کا ہے" وغیرہ۔

سب سے پیچھے منوردا بھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے نکلے اور گھر آ کر کھٹیا پر لیٹ گئے۔ ان پر پنچایت کی ایسی فکر سوار تھی جیسے وہ گھوڑوں پر چڑھی بھاگی چلی آ رہی ہو۔ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے خراٹے بھرنے لگے لیکن خواب میں بھی بڑھیوں کی پنچایت ہی نظر آ رہی تھی چونکہ عالم بیداری میں تھی وہی خواب میں بھی سوار رہی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ بھی سہی لیکن آخر معاملہ پنچایت کا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنچایت جھکو کو واپس کرا دے!

× × × ×

صبح نکلی تو منوردا پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلا سوال تو ان کی بیوی نے ہی کیا۔ منوردا نے گھر والی کا منہ دیکھا تو پھول کر کپا ہو گئے۔ اس نے چائے کے لئے دودھ دیتے ہوئے پوچھا: "بتاؤ تو سہی کہ آخر اتنے دن کہاں رہے؟ اور خالی ہاتھوں کیوں واپس آئے، آخر کیا بھید ہے؟ لوگ تو کہتے ہیں تم جھکو کو کسی مسلمان کے پاس سے چھڑا کر لائے ہو۔ یہ سب گپیں کیا اڑ رہی ہیں کچھ بولو تو ....."

منوردا انٹ سنٹ ہانکنے لگے: "یہ تو کہوں گا ہی! ذرا صبر تو کر۔ پہلے گھر کے کام کاج تو نمٹا لے۔"

گھر والی غصے میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی کہنے لگی، "صبر گیا کرتا تمہارا سر؟ محصول کے روپے تھے وہ بھی اڑا کر آ گئے۔ چار دن

بتا تو بیٹا! کیا جواب دو گے؟ . . .

تبھی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور گھر والی وہاں سے سرک گئی۔ لیکن بڑبڑاتی جا رہی تھی: "میں تو پریشان ہو گئی ہوں اس چھوکری سے . . . بھگوان موت دے دے تو میں اس آفت سے چھوٹ جاؤں!"

"کیا ہے بھابی؟ کیسے اتنی گرم ہو رہی ہو؟" کہتا ہوا ویرا اندر آگیا۔ اس وقت سنوروا نے اس کے چہرے پر ایسی ہی خوشی محسوس کی جیسے مہمان آ گئے ہوں!

بھابی نے تو دالان میں سے ہی جواب دیا: "یہ لو بن گئی تمہاری چائے بھیا۔" سنوروا نے چائے کا پیالہ ویرا کے سپرد کرتے ہوئے کہا: "عادت پڑ رہی ہے بڑبڑانے کی عادت ہے وہ تو مرنے پر ہی چھوٹے گی۔" لیکن ویرا نے چائے پیتے ہوئے پھر سوال کیا تو دی۔ "لیکن سنور بھیا، یہ لڑکی تمہارے ہاتھ لگی کیسے؟"

سنوروا تاڑ گئے کہ ویرا کے اس سوال میں بات "نفع" کی چھپی ہوئی ہے۔ خیال تو آیا کہ کہہ دیں "شاید اس میں دو چار آنے کا منافع ہوگا مگر بھیا اس سودے میں تو اُلٹا گرہ سے دینا پڑتا ہے!" مگر انھوں نے اتنا ہی کہا: "ہاں بتاؤں گا! مگر ذرا یہ برتن اٹھا کر رکھ دے۔" پھر حقہ بھرنے میں لگ گئے۔

یہ دونوں وہاں سے اٹھ کر چوپال میں گئے ہی تھے کہ اتنے میں جھکو کی ماں اور بچہ بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد اور بھی دو چار اکٹھے ہو گئے۔ کلو بھی کھیت سے آگیا تھا وہ بھی سنوروا سے کیے جانے والے سوال جواب سننے کو وہیں بیٹھ گیا۔

"ہاں سنور کاکا، کچھ بتاؤ تو کہ جھکو کا ہوا کیا تھا؟ ہم نے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے چھڑا لائے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"کہتا ہوں بھیا کہتا ہوں۔ ذرا حقہ تو پینے دو۔" سنوروا حقہ پینے لگے۔

ایک عورت نے جھکو کی ماں سے پوچھا "جھکو کب آئی تھی اور یہ لاگ کس نے لگا دی؟" مگر جھکو کی ماں کیا جواب دیتی اس نے خود ہی جھکو کو بہلا پھسلا کر باتیں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے بے سر و پا قصے سنانے شروع کر دیے تھے!

"میں اس دن رات کو وہاں بھوسے کے نیچے نہیں بیٹھی تھی؟ وہاں سے میں نے مہاراج کے مندر کا راستہ پکڑا۔ مندر کے پاس پہنچتے ہی انھوں نے مجھے بلایا۔ تین دن تک تو اپنی سگی بیٹی کی طرح رکھا لیکن مجھے یہ ڈر لگا کہ کہیں آنہ جائے گا اس لیے وہاں سے بھاگ نکلی۔ راستے میں ایک مسلمان ملا وہ مجھے چکنی چپڑی باتوں میں لگا کر لے جا رہا تھا کہ راستے میں سنوروا مل گئے اور گھر واپس لے آئے۔" جھکو ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں بکتی رہی کہ جیسے سنوروا صاحب کے بیٹے کچھ پوچھو تو بتانے کی بجائے شرمانے لگی اور تے سنتی رہی۔ "سب جل گئیں میری چوڑیاں" کہا تھا۔ پھر گھر والے بھی سوال کرنے بند کر دیے لیکن جھکو کی ماں لوگوں کو سارا قصہ کیسے سنا سکتی تھی، گاؤں والے تو فقط اتنا جانتے تھے کہ جھکو پٹواری کے ساتھ بھاگ گئی کے بعد آج پہلی بار گھر واپس آئی ہے۔

اور اب سنوروا نے بات شروع کی: "یہ تو اچھا ہوا بھیا۔ کہیں راستے میں مل گیا۔ گاؤں کی تو خیر لیکن دھرم کی عزت بچ گئی۔ نہیں تو . . ."

"کیسے سنور بھیا . . . پوری بات بتاؤ جب ہی تو سمجھ میں آئے نا۔" سمجھتے ہوئے ویرا سبب جاننے کے لیے چوکنا ہو گیا۔

سنوروا کو پوری بات کرنے میں کیا دیر لگتی؟ کہنے لگے: "میں دوپہر کو ویل صاحب کی کچہری سے فارغ ہوا اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ کھانڈا پہاڑ کے پاس آیا تو سوچ دیر چپکے لگے ایک تو میں اکیلا پھر کھانڈا پہاڑ کا راستہ۔ میں نے لمبی لمبی ڈگیں بھرنا شروع کیں۔ ابھی گھاٹی میں گھسا ہی نہیں تھا کہ کچھ فاصلے پر کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ دیر ہو رہی تھی لیکن میں نے سوچا کہ دیکھ تو لوں کون ہے؟ کہیں یہ دھینگا مشتی کر رہا ہے یہ سوچ کر دبے پاؤں آگے بڑھا اور جھاڑیوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر دیکھا تو جھکو! ایک سپاہی جیسا آدمی کہہ رہا تھا: "چل چل، میں تجھے پٹواری کے پاس پہنچا دوں گا۔" جھکو انکار کر رہی تھی۔ وہ سپاہی پھر سمجھانے لگا لیکن جھکو اتنا تو جانتی تھی کہ یہ راستہ بیسوں کے جھونپڑوں کی طرف جاتا ہے۔ اس نے کہا: "لیکن ادھر تم کہاں جا رہے ہو؟" پھر کچھ سوچ کر بولی "نہیں، نہیں! تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔"

اتنا کہہ کر سنوروا نے ذرا دم لیا اور پھر قصہ شروع کر دیا۔ "لیکن بھیا اس سپاہی نے تو اس خوبی سے بات کی کہ جھکو کو اطمینان سا ہو گیا کہ وہ پٹواری ضرور وہاں زمین ناپنے آیا ہوگا۔ وہ تو جانے کو تیار ہو گئی لیکن میں اس میاں کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ سالا غنڈوں کا سردار ہے اور تمھیں تو معلوم ہے کہ ادھر کی زمین پارسال ناپی جا چکی ہے۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور اس مسلے کو للکارا "ٹھہر جا رے!" پھر ایک دم اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور لٹھ کندھے پر رکھ کر اس سے کہا: "کیوں میاں جی؟ لڑکیوں کو بہکانے کا کام کرتے ہو؟"

اتنے میں جھگڑو "ارے کاکا!" کہہ کر بھیرو کے پیروں سے لپٹ گئی۔"

منوروا نے ویرا کے ہاتھ سے حقہ سنبھال لیا جو باتوں کی دھن میں اُسے پینا ہی بھول گیا تھا۔ اس وقت چوپال میں اتنا سناٹا تھا کہ اگر سوئی گرتی تو اس کی آواز بھی سنائی دے جاتی! ابھی تک لوگوں کے چہروں پر تحیر و تعجب کے آثار تھے۔ ایک نے پوچھا:

"پھر کیا ہوا منورا کاکا؟"

منوروا دوسرے کو حقہ تھماتے ہوئے بولے: "پھر کیا بیٹا! میاں کو میں ایسا سبق سکھاتا کہ جنم بھر یاد رہے لیکن بیٹا وہاں کھڑا رہتا تب نا؟ میں جھگڑو کو گھر لانے میں لگا کہ اتنے میں دم دبا کر نو دو گیارہ ہو گیا......"

"پہچان تو لیا ہو گا منورا بیٹا؟" ویرا نے لقمہ دیا۔

"کچھ اندھیرا سا تھا اس لئے اچھی طرح پہچان نہیں سکا لیکن خیال ہے کہ کہیں کے کنسٹراکشن کا کوئی سپاہی ہو گا۔ اپنے علاقے میں تو ایسا کوئی میں نے دیکھا نہیں!"

بات پوری ہو جانے پر بھی سب کو کچھ ادھوری سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک اور شخص نے پوچھا: "پھر منورا کاکا؟"

"پھر کیا بیٹا؟ میں تو وہیں کھڑا رہا اور دانت پیس پیس کر گالیاں دیتا رہا لیکن جب وہ مسلمان آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تب دیکھا کہ جھگڑو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے!" اپنے چہرے کے جذبات پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے منوروا نے کہا:

"جتنا میں اُسے دلاسا دیتا اتنا ہی وہ اور روتی تھی" ویرا کی طرف دیکھ کر کہنے لگے: "میں تجھے کیا بتاؤں ویرا! کتنا رو رہی تھی وہ؟ پہلی بار سسرال جانے پر وداع ہوتے وقت جو لڑکی روتی ہے وہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں!" پھر بڑے زور سے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے: "میری آنکھیں بھی اس وقت ڈبڈبا آئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُسے چپ کر سکا۔ چپ تو وہ ہو گئی لیکن کہنے لگی: 'چاہے کچھ ہو لیکن گھر نہیں جاؤں گی۔' میں نے سوچا کہ لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر چلوں تو یہ کسی کنوئیں باؤلی میں گر جائے گی یا پھر جیسا یہ ہوا تھا ویسا ہی کوئی مسلمان اُڑا لے جائے گا" آخر اُسے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا۔" اب منوروا بات کو سمیٹتے ہوئے بولے: "ماتاؤں کی اور دھرم کی لاج رہ گئی۔ اگلے جنم میں پاپ کرتے ہوئے ہچکچائی ہو گی اسی کا یہ پھل تھا جو بھگتنے لگ گئی۔" قصہ ختم کر کے منوروا حقہ پینے لگے۔

ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا: "یہ تو سب منورا کاکا کی ہی بھلمنساہت کی بات ہے۔ تو بیچ الگ کی تو بیٹیاں کسی کے بس کی ہوں، کچھ بھی ہو آخر ذات ترکینوں کی ٹھہری!"

"ارے بیٹا یہ تو ہونا ہی چاہئے! اس ہمارے لوگ کے تو اُسے کوئی نہیں چھوڑے گا" اور پھر اٹھتے ہوئے بولے: "اب تم جاؤ اور میں جاؤں۔ دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے؟" اور لکڑی کندھے پہ ڈال کر دوسرے لوگوں کے ساتھ منوروا بھی گھر سے نکل پڑے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی خیال آیا کہ جیب میں تمباکو نہیں لیکن واپس لوٹنے کی ہمت نہ کر سکے کیونکہ گھر سے نکلتے وقت ہی بہت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ لڑکی کی شرم اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر منوروا نے اُس کی آنکھیں دیکھ کر پڑھ لیا تھا جیسے کہہ رہی ہو: "دیکھ لو اس بڈھے کو، رنگیلی باتیں بنا کے گھر کے بدھوا جیسے مردوے کا پانی کر آیا؟ اس کی تو بات نہیں کرتا اور اُدھر سے مسلمان کی باتیں بنا رہا ہے!"

منوروا نے دوپہر کا کھانا تلو کے ہاتھ منگا کر کھیت پر ہی کھا لیا اور پھر سارا دن اس طرح گزار دیا کہ کبھی گھر سے ویرا کے یہاں اور ویرا کے گھر سے بھولے کے یہاں! آخر کھانا کھانے کے لئے تو گھر آنا ہی پڑتا لیکن اس وقت انھوں نے ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ "تجھے کیا پتا کہ سب روپے ختم ہو گئے ہیں! محصول ادا کرنے کا ہے یا اور کچھ؟"

"اگر اس وقت بھر نہ دوں تو کہنا! میری تو جان کھا لی!"

"اس وقت رونا منہ ڈھک کر! مجھے کیا کرنا ہے۔" گھر والی نے کھاٹ پر گوڈریاں پھینکتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔ منوروا نے ذرا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی:

"اب ذرا سمجھی! بیچاری جلاتی رہتی ہے اپنا"

جواب تو اس کا منوروا آگ بگولا ہو کر دیتا تھا لیکن وہ چپ ہو رہے اور گھر والی بھی کواڑ لگا کر گھر میں اپنی بھڑاس نکالتی رہی!

× × × × ×

دوسرے دن صبح ڈھوروں کے کھلتے ہی موتی کے آنگن میں برادری کی پنچایت اس طرح جمع ہو گئی جیسے گھونٹوں پہ چڑھ کر آئی ہو۔ تالکا سا وجوں کی طرح ان کا ایک ہی سوال تھا۔

[illegible] ہمیں سونپ دے نہیں تو ہم [illegible]

[illegible]

لیکن کسی نے کوئی جواب دینے کی کوشش [illegible] کیا [illegible] جواب [illegible] گیا ہے [illegible] ایک ایک [illegible] بچے ہے آخر [illegible] قدم اٹھاتے ہوئے آ پہنچے پنچایت والے انہیں [illegible] دیتے ہوئے بولے

"بولو آج سنو بھیا!" رام رام کرتے ہوئے منورا ایک کھاٹ کے سرہانے بیٹھ گئے۔ شاید جھگڑو کو سارا [illegible] معلوم ہو چکا تھا اس لئے جھگڑو کی پہلی سسرال والوں نے منورا کا نام تو نہیں لیا لیکن گھما گھما کر منورا کو طعنے دیئے اور گالیاں بھی دیتے رہے لیکن منورا آنکھیں جھکائے بیٹھے رہے۔

آخر وہ چار آدمیوں نے انہیں ٹھنڈا کیا اور مقدمہ پیش کرتے ہوئے بولے

"ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ ہمارا آدمی ہمیں سونپ دو، بس ہم چلے جائیں!" یہی ایک بات تھی جسے چار پانچ آدمیوں نے الگ الگ چار پانچ بار رٹ رٹ کر کہا ہوگا۔ اچھا خاصا کہرام مچ گیا۔

اب منورا سے نہ رہا گیا کچھ تن کر بولے "اگر تمہارا آدمی تمہارا ہے تو کہاں سو رہے تھے؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ جاؤ اس بامن کے پاس! جتنا میں خاموش ہوں اتنا ہی سر پہ چڑھے آ رہے ہو!"

ایک آواز آئی: "بامن نے تو نکال دیا تھا پگلے۔ لیکن تم نے زبردستی کر کے اس کے کپڑے بدلوائے ہیں کیا ہم جانتے نہیں؟"

"کپڑے نہ بدلواتا تو کیا کرتا؟ مسلمان ہو جانے دیتا کیوں؟"

"ویسا ہی اس کا خیال تھا تو اپنے لڑکے کے ساتھ پہناتے تب جانتا!" جھگڑو کی پہلی سسرال والوں میں سے ایک نے اکڑ کر کہا۔

منورا نے جواب دیا: "میری برادری کی ہوتی تو یہ بھی کرتا!" اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دو چار پنچوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "تمہیں کہو بھیا برادری کی لڑکی، غیر برادری میں دی جاتی ہے؟" پنچوں نے زمین کی طرف نظر رکھے ہوئے آہستہ سے سر ہلا دیا!

مثل: "کتا بھی اپنے محلے میں شیر ہو جاتا ہے۔" اس کہاوت کے

[illegible] پھر اس کے [illegible] پنچایت [illegible] نہیں تو [illegible]

"ایک دم [illegible]" کہتے ہوئے منورا نے [illegible] اٹھا کر [illegible] بولے [illegible] ایک [illegible] ہو تو منور کھیا [illegible] دیکھتا ہوں تم بھی کس طرح [illegible] اپنا آدمی لے کر جاتے ہو!" کہتے کہتے منورا ایک دم کھڑے ہو گئے۔

[illegible] منورا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "بیٹھو بیٹھو بھیا یہ تو لڑنے کی بات نہیں ہے [illegible] دینا چاہیے۔" اور پھر چار [illegible] کو چپ کرا دیا۔

منورا بیٹھ گئے اور [illegible] سے بات کرو۔ پہلے [illegible] کیا ہے؟ تم لوگ اس طرح بات کرتے ہو جیسے [illegible] لینے آئے ہو۔ یہ کوئی بات کرنے کا ڈھنگ ہے [illegible] اور اگر سب ایک ساتھ بولے تو کیا پنچایت نہیں ہوگی؟ یہ سب جو بڑے بوڑھے ہیں وہ کیا نہیں سمجھتے تم بولو گے تبھی پنچایت ہوگی؟" یہ [illegible] سن کر سب کے کان ڈھلک گئے۔ سکوت ہو گیا۔

منورا کی چار پائی پر پنچوں کے چار پانچ ہوشیار بچے جلنے والے پنچ آ کر بیٹھ گئے۔ منورا نے کہا: "بولو اگر تم کہو تو تمہارا آدمی تمہیں سونپ دوں؟ نہیں تو تمہارا خرچ واپس لوٹا دوں؟"

ایک جھگڑو کا سسر اور ایک دوسرا آدمی دونوں ایک ساتھ بول اٹھے "نہیں نہیں ہمیں تو اپنے آدمی سے مطلب ہے خرچ نہیں چاہیے۔" ساتھ ہی ساتھ ایک دو اور بول اٹھے۔ "ہاں ہاں ہمیں اور کچھ لینی دینی نہیں کرنا ہے ہمارا آدمی ہمیں دے دو۔ چلے جائیں۔"

اتنے میں جھگڑو کا گھر والا بول اٹھا: "سیدھی طرح سے نہیں دوگے تو پھر تماشا دیکھ لینا۔ اگر اس [illegible] کی چوٹی پکڑ کر بھرے گاؤں سے نہ لے جاؤں تو اپنے ماں باپ سے پیدا نہیں!"

پانچ سات آدمیوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی: "اور کیا؟ یہ تو ہو گا ہی! ہم بھی دیکھیں کس کی ماں نے سوا سیر سونٹھ کھائی ہے جو بیچ میں پڑتا ہے!" کہتے ہوئے ایک آدمی کھڑا ہو گیا تو کوئی جھنجھلا کر دانت پیسنے لگا۔ ان لوگوں کا غصہ دیکھ کر تو ایک لمحے کے لیے منورا کی خود اعتمادی بھی ڈگمگانے لگی تھی دل میں سوچنے

گئے تو لوگ کیا کہہ رہے ہیں!" اور ایک جملہ تو زور سے ہی بڑبڑا گئے:
"بھیلن رنڈی گر بیکا بیٹی، اور جن بیٹی بات!" اس وقت ان لوگوں کی شکلیں بھی بھیلوں کی سی ہو رہی تھیں۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اُن کی خود اعتمادی نے سہارا دیا اور کہنے لگے: "ارے ان کی تو ہمت ہی کیا ہے!" یہ سوچ کر تن کر بیٹھ گئے۔ اس وقت بلا بھی ذرا کم ہو رہا تھا۔ منور دا نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے، مادھو بڑھئی سے پوچھا: "پھر لے جا کر کیا کرو گے مادھو؟"

مادھو بڑھئی کے بدلے اس کا بھتیجا بول اٹھا: "جو کرنا ہوگا سو کریں گے، تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

منور دا نے نرمی سے جواب دیا: "مطلب ہے بھیا! تبھی تو پوچھتا ہوں۔ میں اسے مسلمان کے ہاتھ سے بچا کر لایا ہوں اس لیے مجھے جاننا تو چاہیے نا؟"

"بس جان لیا۔ اگر میرے سامنے آئے تو یہیں پنچوں کے سامنے رانڈ کی ناک کاٹ دوں!"

دیکھتا ہوں پھر کون آتا ہے سامنے..." کہہ کر سانس لینے کے لئے رُکا۔ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے سے کوئی بات کہے منور دا بولے:

"سُن لیا مادھو؟" پھر ذرا رُک کر بولے: "بول لے جانے دوں گے بہو کو؟" پھر پنچوں کی طرف غور سے تکنے لگے: "یہ تو تم چار بڑے بوڑھوں کا لحاظ کر رہا ہوں نہیں تو اس کو حوالات میں بند کرا دوں۔ تم سرکاری قاعدے قانون نہیں جانتے!"

"ارے منور بھیا! تم بھی لڑکوں کی باتوں پر دھیان دیتے ہو۔ نہ تو ہمیں ناک کاٹنا ہے نہ اُسے مارنا ہے۔ ہمارا آدمی ہے اس لیے لینے آئے ہیں، ورنہ تو ہم اپنا راستہ لیں۔"

جھگڑو کا پہلا خسر مادھو بولا۔

منور دا نے ہنس کر آہستہ سے کہا: "یہ بات کیسی کہہ رہے ہو بھیا؟" پھر ذرا رُک کر: "تمھیں سے میں پوچھتا ہوں کہ اگر تمھارے گاؤں میں کسی کی عورت اس طرح آئی ہو تو کیا تم اُسے لوٹا دو گے؟..."

"ہاں ہاں ضرور!" مادھو بڑھئی بولا۔

دوسرے پنچوں کی طرف دیکھ کر منور دا بولے: "سُن لیا بھیا؟ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ ایمان سے کہنا!"

تین پنچوں میں سے ایک نے کہا: "جھوٹ کیوں بولیں۔ اسے سکھی کر تو کوئی نہیں سونپ سکتا..." یہ سنتے ہی مادھو بڑھئی چلا اٹھا: "تو پھر یہاں کیا جھک مارنے آئے ہو؟" پھر انگلی نچا کر کہنے لگا: "پنچایت کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرو۔ نہیں تو بہت برا کوئی نہ ہوگا!"

منور دا تعجب سے پنچوں کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ ایک بولا: "دھونس دے کر پنچایت کرانا ہے تو کسی اور کو دیکھو۔ ہم کسی کا دیا ہوا نہیں کھاتے جو تمھاری دھونس میں آ جائیں!"

"اور تم بھی کہاں کے راجا ہو جو ہم دب جائیں۔ پنچ کے کرسی پر تم کیا پنچایت کرو گے؟" مادھو نے جواب دیا۔

برادری کا اگوا دھنّا اب تک چپ بیٹھا تھا، وہ بڈھا بھی اس بار آنکھیں نکال کر دھنّا کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا: "تو پھر یہاں کیا جھک مارنے کو بلایا تھا؟"

اگرچہ آپس کی اس جنگ میں منور دا کا تو فائدہ ہی تھا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو اکسایا ہو لیکن انھوں نے اپنی ہمدردی ظاہر کی:

"ارے بھیا۔ یہ تو وہ بات ہو گئی کہ سانڈ سانڈ لڑیں اور باڑی کے بھکے اڑیں! بیچارا موتیاں ناحق مارا جائے گا!" پھر دھنّا سے کہنے لگے: "دیکھو یہ معاملہ تو دھنّا کا۔ پھر بعد میں لڑتے رہنا!"

دھنّا نے صاف صاف بات کہہ دی: "دیکھو مادھو، میں تو یہ کہتا ہوں اگر تم اُسے لے جانا ہی چاہتے ہو تو تم جاؤ اور تمھاری پنچایت جائے، میں تو اس پاپ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہاں اگر کچھ جرمانہ کر کے رفع دفع کرنا ہے تو سب مل کے ابھی طے کر لیں۔"

اگرچہ ذرا دیر کے لیے پھر ہنگامہ بڑھ گیا کیوں کہ کچھ لوگوں نے دھنّا کی تائید کی اور کچھ نے مخالفت بھی کی، لیکن ان سب کو چپ ہو گئے والے پانچ پنچوں نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد یہ سمجھوتا کیا کہ فی الحال ترمنی کو برادری سے نکال دیا جائے پھر اگر پنچوں کی مرضی ہو تو پانچ یا پانسو کا جرمانہ کر کے برادری میں واپس لے لیں گے۔ مادھو بڑھئی نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا: "ہاں ٹھیک ہے! ایک بار تو برادری میں اس کا حقہ پانی بند ہونا ہی چاہیے۔"

ابھی تک منور دا چپ بیٹھے تھے لیکن اب اُن سے نہ رہا گیا

تو بابا کا سر آنکھوں پر رکھا۔ پھر ذرا کھسیر ہو کر بولے:
دھنا کاکا مرتیاں سے برادری کا کیا ناتا ہے؟ سمجھا دو
ہے؟"

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر مرتیاں اُسے رکھنے پر آمادہ ہو
تو وہ سسرال ہی جاتا۔ ورنہ لٹا تو پھر جہاں سے بھی اُسے
تھا وہیں چھوڑنے پر مجبور ہوتا۔ اگر میں اُسے چھوڑ آؤں
وہ کسی کا بیٹا تھی میں بھاگے تو پکڑ کس کے سر؟ اور
بڑھئی کا گھر بسایا اس میں مجھے کیا اچھا تھا؟ اور کبھی دن
کا نام کرے گی تو تمہیں رہے گی! ایک گھر بسا تو تمہاری
برادری میں بسا۔ اب تمہیں کہو کہ اس میں مجھے کیا نتیجہ ہوا؟" یہ
منوا چپ ہو گئے۔ چہروں کی صورت سے ایسا معلوم ہوا
لیکن وہ منوا کی بات کا مطلب سمجھے ہی نہیں اُن کی آنکھیں
سوال کر رہی تھیں۔

– لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

آخر دھنا بول پڑا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا منوا بھیا!" یہ موقع تھا
منوا نے اپنی پرانی بات دہرائی، جو گاؤں والوں سے پہلے
شا قصہ بیان کر چکے تھے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے
لے:

" اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ماؤ تو نا! لیکن قصور میرا ہی ہے اس میں
پھر غریب کو کیوں ستاتے ہو؟ بے وقوف تو میں تھا جو دھرم
کے جھنجھٹ میں پڑا!" یہ کہہ کر بڑی مایوس نگاہوں سے پنچ کے
اور ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ذرا دیر بعد اس طرح
جیسے خود سے کہہ رہے ہوں!" اس میں بے چاری مرتیاں
قصور کیا؟"

" تم بھی کیسی بات کرتے ہو منوا بھیا! مرتیاں کا قصور کیوں
نہیں؟ جو دنیا میں بھٹک کر آئی ہے اُسے گھر میں بٹھاتے وقت
پہلے سے پوچھنا تو چاہیے تھا؟" دھنا نے کہا۔

" بات ٹھیک ہے دھنا بھیا! لیکن ذرا سوچو گے تو تمہاری سمجھ
میں آ جائے گی" دھنا بڑھئی کی طرف دیکھتے ہوئے منوا نے کہنا
شروع کیا: " دھنا بھائی ... جات تو ٹھگ کہلاتی ہے
گا!"

پھر دوسری طرف دیکھا: " اگر ایسا نہ ہوتا تو جب کوئی بڑی تقریب تھی
ہے اُس وقت گاؤں کی عورتیں چہل ... کر پکا کیوں دیتیں وہ بات
تو دھرتی پیمائی پڑا ہے!" پھر ذرا رک کے وہ لوگوں نے "پکی بات
ہے" کہہ کر سر ہلا دیا۔ منوا نے آگے بات شروع کیا:

" یہ لڑکی غیر برادری میں گئی تھی یہ ٹھیک ہے لیکن یہ تو سب کو معلوم
ہے کہ وہ ابھی نام ... گئی تھی؟"

مادھو بڑھئی وہ ... بیچ اٹھے: " اس سے کیا ہوا بھئی
برادری میں کوئی ایک ... بات سے بڑی ہو گئی؟ یہ سب ہوشیاری
یہاں نہیں چلے گی منوا بھیا! ..."

" ... بھلے آدمی! ... کون نہیں جانتا؟ لیکن یہ تو وہ کہاوت
ہوئی کہ "قصور کیا بھینسے نے، ... دیا ... کو" اگر سزا دینی
ہے تو لڑکی کو دو جس سے پھر دوسرا کوئی ایسا کرنے کی ہمت
نہ کر سکے" پھر دھنا بڑھئی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے:

" کیوں دھنا کاکا! کیا میں غلط کہتا ہوں؟" سب
خاموش رہے۔ منوا نے پھر بات جاری رکھی: " یہ
تو ٹھیک ہے رجو بھیا، لیکن چھپنیا میں تو، تم سب جانتے
ہی ہو، کیوں دھنا بھیا، لیکن چھپنیا میں تو، تم سب جانتے
ہی ہو، کیوں دھنا بھیا! — جو کاچھیوں اور دھیمروں
کے گھر میں رہ کر پلے تھے اُنھیں بھی برادری میں شامل کر لیا۔
ابھی تو ہماری ہی برادری میں اُن میں کے کئی زندہ ہیں کہو تو نام
بتاؤں؟"

" ارے ہماری برادری میں کہاں کمی ہے منوا بھیا!" کہتے ہوئے
دھنا نے مادھو بڑھئی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ منوا
نے مادھو سے کہا:

" میں تو اسی سے کہتا ہوں مادھو بھیا! کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب
ان لوگوں کے سر سے بوجھ ہلکا کر کے جاؤ تو اچھا ہے۔ اپنی برادری
میں تو ایسے جھگڑے بارہ مہینے میں بارہ ہی بار ہوتے ہیں! اگر انھیں
اسی طرح بڑھاتے رہیں تو کیسے کام بنے؟"

دھنا نے کہا: " ٹھیک ہے، اگر پنچوں کی سمجھ میں آتی ہو تو لڑکی
کو سزا دو اور مرتیاں کو بھی۔"

پنچایت میں سے دو چار آوازیں اُٹھیں: " ہاں بھیا ہاں،

یہ جھگڑا ختم کرو۔"

ایک بولا: "یوں کیسے نپٹ سکتا ہے ابھی تو نہ جانے کیا کیا ہوگا۔"

بہت کچھ رگڑے جھگڑے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ موتی پنچایت کے رواج کے مطابق جرمانہ ادا کرے، یعنی دو دعوتیں کھلائے اور تیسری شرط جو جھکو کی سسرال والوں نے پیش کی وہ یہ تھی کہ جھکو دانتوں میں تنکا دبا کر پنچایت کے سامنے کھڑی ہو۔"

منور دا نے ایک مرتبہ تو یہ تسلیم کر لیا لیکن بعد میں برادری کے پانچ اگرؤں کو ایک طرف علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے :

ادھو بھیا یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے خاندان کی عزت بڑھے گی اور نہ پنچوں کی ; فقط ایک کہاوت رہ جائے گی۔ ہاں ایک بار ضرور تمہارے نام کا ڈنکا بج جائے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ بعد میں تمہارے لڑکے لڑکیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ پھر ادھو بڑھئی کو غور سے دیکھتے ہوئے سمجھانے لگے: "بعد میں تمہارے ہی آدمی کہیں گے کہ، دیکھ لیا آپ! ادھو کا خاندان بڑا بھاری خاندان ہے، جھکو کی جو حالت کی تھی ویسی ہی اپنی لڑکیوں کی کرے گا تو ؟ اور سچ کہتا ہوں ادھو بھیا! لوگ تو دونوں طرف ڈھنڈورا پیٹتے ہی ہیں!"

دھنا بڑھئی کسی سوچ میں غرق تھا منور دا نے ذرا دم لے کر اس کی طرف دیکھا: "اور دھنا کاکا! اس میں پنچوں کی کچھ عزت نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے کیا؟ میں تو اس لڑکی سے تنکا چھوڑ پورا تیلا اٹھوا دوں! لیکن اس میں ہم سب کی کیا شان ہوگی؟ ہاں اگر کسی مرد سے تنکا دبواؤ تو بات بھی ہے! لیکن ایک عورت سے.... مجھے تو یہ ٹھیک لگتا!"

منور دا نے اتنا کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولے "میرے تو بال سفید ہو گئے لیکن ایسی سزا دنیا میں آج تک نہ دیکھی دشمنی!"

آخر لوگوں نے وہ شرط واپس لے لی۔ لیکن اب ادھو بڑھئی نے ایک شرط اور رکھ دی۔

"لڑکی یعنی اس کے میکے والے بیس برہمنوں کو بھوجن کرائیں!"

اسے سب نے منظور کر لیا۔

منور دا دل ہی دل میں ہنسنے لگے یہ سوچ کر کہ [illegible] تک ایک برہمن کو بھوجن کرایا تھا اس کا تو یہ نتیجہ [illegible] کے سر پر لشکر چڑھ آیا ہے! اور اب بیس کو....."

* * * * *

اگرچہ موتی کا گھر والا کوئی نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کے کرائے تو لگے تھے گاؤں کے پٹیلوں نے چوپال میں بیٹھ کر [illegible] چڑھا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چورا اور دال بھات تیار ہو گیا۔ بڑھئیوں کی پنچایت اور گاؤں کے دوسرے پٹیلوں کو کھلانے کے بعد منور دا بھی کھانے بیٹھ گئے۔

شام کو حقہ ڈکا پلانے کے بعد منور دا نے اُن پانچ اگرؤں کو ایک طرف کرنے میں لے جا کر رواج کے مطابق دو سو روپے گن کر دیئے۔ پانچوں کو "سروپا" کے پانچ پانچ انگ دیئے اور [illegible] پر دستخط کرا کر جیب میں رکھ لی۔

ایک دعوت کھا کر اور دوسری بقایا چھوڑ کر شام کو سب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ کہیں سے بچھڑا آ پہنچا اور چھ سات آدمیوں کو اپنے گھر لے گیا، صرف حقہ تمباکو کے لیے ہی نہیں بلکہ رات بھر پڑنے کے لیے ــــ لیکن ان میں جھکو کی سسرال والا کوئی نہیں تھا۔ بچھڑ نے اُن سے اصرار بھی نہیں کیا تھا اور نہ اصرار کرنا مناسب [illegible]

شام ہونے پر امبا اور جھکو منور دا کے گھر سے آ گئیں اور موتی بھی کہیں سے آ پہنچا۔ "کھا لو جلدی! ڈھوروں کی بیر ہو گئی!" چوپال میں بیٹھے ہوئے منور دا نے کہا۔

امبا نے پہلے تو کھانے سے انکار کیا لیکن منور دا کے بیٹے [illegible] اور جھکو کے محبت بھرے اصرار سے مجبور ہو کر تھوڑی دیر میں کھانے پر آمادہ ہو گئی۔ موتی اور جھکو سے کھانا کھانے کے لیے کہہ کر خود منور دا کے پاس آ بیٹھی۔

منور دا نے پنچایت کی ساری باتوں کا خلاصہ سنا دیا اور ڈھائی سو روپے جو بچھڑے کے گھر سے لائے تھے ان کا حساب بھی دے دیا۔ پانچ روپے بچے تھے وہ امبا کو دیتے ہوئے بولے :

"یہ باقی بچے ہیں!"

"کہاں گیا؟"

"ہاں؟"

"ان کی فکر مت کیجیے۔" اماں نے ہنس کر کہا۔ منوروا کا لڑکا
پنشن کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ ملا تو پتہ نہیں ہوگا تو وہ یہاں سے
کہیں نہیں جانے کا۔ وہ یہیں کوئی [illegible] کرنے کی سوچ
رہا ہے:" پھر اماں نظروں سے منوروا کو دیکھنے لگی۔

منوروا کو جیسے ان نظروں میں کوئی جواب مل گیا ہو۔ اس طرح
بولے: "جب تک ... اور یہ بھی نہیں ہوا
رہتا ہے؟" پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جھمکو
کو کہا۔ جھمکو دوڑ کر آ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر نکال کر پوچھا: "کیا
ہے؟"

منوروا کے چہرے پہ ہنسی اور آنکھوں میں ہدایت تھی۔ ہنس
کر کہا: "وہاں ادھر بھی کیا گڑبڑ ہے۔" جھمکو ذرا تیز گھبرا کر
[illegible] اگر ساس کے پاس گڑبڑ ہوگی تو ساس کا ہی چھینے گی۔

"دیکھو بیٹا۔ اب تو سسرال میں ہے۔ اس طرح بات کا
جانا نہیں چاہیے کبھی!"

پھر ذرا دیر تک سامنے دیکھتے رہے اور بولے "اور دیکھو تیری
ساس کا مزاج ذرا تیز ہے۔ اگر وہ کچھ کہے تو خیال نہ کرنا بھی بیٹا!" اور
دیکھو تیری ساس کا مزاج ذرا تیز ہے اگر وہ کچھ کہے تو خیال نہ کرنا۔ پھر
اسی کی طرف دیکھتے ہوئے جھمکو سے کہنے لگے۔

"اگر زیادہ گڑبڑ کریں تو مجھ سے کہنا میں ان کی خبر لوں گا!"

جھمکو نے کچھ کہا سنا تو نہیں لیکن گردن جھکا کر منوروا کی طرف دیکھا
اور پھر جانے کے لیے مڑی۔

"چلی کہاں؟ ایک بار اپنے کاکا کو حقہ تو بھر دے!" جھمکو واپس
آنے لگی تو منوروا نے پھر کہا: "کیوں بھر دے گی نا؟"

اماں نے کہا: "کیوں نہ بھرے گی، جنم بھر بھرتی رہے تو بھی کم ہے"
جھمکو حقے میں پانی بھر کر لے آئی۔ منوروا نے کہا: "نہیں بیٹا۔ مجھے زندگی
بھر حقہ نہیں بھروانے ہیں۔ بس آج ہی سب وصول ہو گیا۔!"

چہرے پر جھوٹا غصہ ظاہر کر کے جھمکو نے منوروا کی طرف دیکھا۔

"تم بھی کاکا ...... !" اور اندر چلی گئی۔

منوروا بھی اٹھے اور حقہ گڑگڑاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیے۔

اب ہنسی میں بھی گھبراہٹ تھی۔ مگر ان کے چہرے پر کسی فکر
کا نشان بھی نہ تھا۔

جس طرح بھاپ بن کر پانی ہوا میں ملتا ہے یہ حال تھا
کہ جھمکو نے کہا ہوگا۔ جس دن منوروا آئے تو ہاتھ میں آئے
کی ... تھی۔ پاس آ کر بیٹھا، ذرا سی سیدھی عزت
کے ساتھ گھر گیا۔ اندر دیکھ کر کو صرف جھمکو کو بلانی تھی
تھی لیکن گزشتہ رات کو معلوم نہیں پھر اب کیا!" وہی بات سے
نے کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ اور اس سے یہ سوچ کر پہلے تو سمجھا
یا تھا کہ زیادہ نہیں سے گا تو جیسے ہیں جائے گا لیکن جتنے جتن ہوتے
تھے لیکن ہی آئیں گے! اسی لیے کچھ دن بول نہیں سکے اور کیا سمجھا
کو یوں ہی چھوڑ دیں گے۔"

× × × ×

جھمکو کا پھر ہوا حقہ گڑگڑاتے ہوئے جب منوروا گھر آئے تو گھر
والی جھنس دکھ رہی تھی۔ گھر میں آتے ہی جھمکو کو پکارا لیکن جواب نہ
ملا تو سمجھ گئے۔ نہ کھیت پر چلا گیا ہوگا۔

منوروا نے چوپال میں آ کر اماں کے پاس بیٹھتے ہی کہا: "تم کیا نہیں
کہتی تھیں:

اتنی بہو نے گھر سے باہر ہی جواب دیا: "اور کیا میں تو جانتی
تھی کہ آج لڑکا آئے ہیں، پھر گھر کی رات کیسے بھائے گی؟" بات تو یہی
تھی لیکن کہنے کے انداز میں برسوں پہلے کی شوخی کی آمیزش تھی جو منوروا
نے پہچان لی۔ لیکن اس وقت وہ جیسا غصہ ظاہر کیا کرتے تھے آج نہ
کر سکے۔ بلکہ دیکھو اچھا ہی لگتا تھا اسی سے بات کو ذرا سی بھلائے انھوں
نے اور ہوا دی۔ خوش ہو کر بولے: "دوسرے کے گھر کے لڈو اپنے
گھر کی روٹی کی برابری نہیں کر سکتے!"

"یہ تو کچھ برس پہلے اپنے دل سے ہی پوچھ لیتے!" کہتے کہتے گھر والی
گھر سے باہر آئی اور منوروا کی طرف آنکھیں مٹکاتی ہوئی بولی:
ارے اب تم ذرا شرماؤ! لڑکوں کے بھی لڑکے ہو گئے۔ لیکن تمہیں شرم
نہیں آتی۔ ہمارا تو کچھ نہیں لیکن لوگوں کا تو لحاظ کرو۔"

"ذرا ادھر تو آ۔" بات ذرا ایسی ہی تھی منوروا نے گھر والی کو پیار
اپنے قریب بلایا وہ آئی اور کپڑے سمیٹ کر ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"کیا کہتے ہو بولو؟"

منورما نے پوچھا: "اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو گاؤں والوں سے!"

"پھر بھی"

"لوگ تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں کاکا نے تو آج اپنے دوسرے رشتے سے لڑکے کو بھی ٹھکانے لگوا دیا!" منورما کو بھی یہ احساس اسی وقت ہوا کہ معاملہ ایک چھوٹا دکھاوا ساہو گیا ہے۔

"لوگ بھی بیٹھے کیسی کیسی باتیں بنا لیتے ہیں" یہ کہکر منورما ہنسنے لگے۔

"بس تم سے اور آتا ہی کیا ہے؟ ہنس ہنس کر ہی تو سب کچھ بگاڑ لیا ہے۔" گھر والی نے کہتے ہوئے منہ بنایا۔

منورما ذرا سنجیدہ ہو کر بولے: "اچھا میں تجھ سے اپنے دل کی بات کہوں!" اور ذرا تن کر بیٹھ گئے حقے کو اپنی بغل میں رکھکر کش لگاتے ہوئے بولے: "لڑکے کو تو نہیں لیکن لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے، یہ بات سچ ہے!"

"چپ چاپ بیٹھے رہو، کیوں پاپ میں گرتے ہو۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟"

یہ کہکر گھر والی نے منورما کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور بولی: "اسی لئے تو.... بھگوان جانے کہاں اتنے دن لگا دیئے۔ لڑکا رنڈوا نہ رہ جائے اسی لئے اُسے گھر واپس لے آئے۔" پھر ایک دم منورما کی طرف دیکھکر ہاتھ ملتے ہوئے بولی: "بال سفید ہو گئے سفید! اب تو بھگوان کو سر پہ رکھکر بولو۔" منورما چپ چاپ بیٹھے مسکراتے رہے یہ دیکھکر گھر والی کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ بولی: "ایک کا گھر بھر دیا اور دوسرے کو بھکاری بنا دیا۔

—— لاؤ کہاں ہیں وہ روپے جو تم کہتے تھے؟ زیادہ تو گئے بھاڑ میں مگر جو گھر سے لئے تھے وہ تو دو!" اس کے بعد بس گھر والی روپوں اور زیوروں کا رونا ہی روتی رہی۔

"میری بات تو سُن! پہلے تو پوچھا ہوتا کہ کہاں گیا تھا؟ اور کیا کر آیا۔ پھر اگر چاہے تو لڑتی رہنا!" یہ کہکر منورما نے جیب سے روپوں کی ایک تھیلی نکالی اور اُسے گھر والی کے سامنے رکھکر کہنے لگے: "لے اب تو مانے گی کہ میں نے لڑکے کو کیسا ٹھکانے لگایا ہے!" روپے دیکھتے ہی گھر والی کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ دیکھکر منورما اُسے بہلانے لگے "میری جا پگلی یہ ایا کرتا تو پھر [illegible] میں تجھے ابھی ہی مثال دوں۔"

جب میرے دادا جیتے تھے تو گھر میں گمی پالاکی طرح بہتا تھا اور بیٹے کے گھر میں پانچ بیسی روپے بھی پڑے رہتے تھے لیکن آج تو ہی دیکھ رہی ہے کیا حال ہے اُن کا؟" پھر ذرا رک کر بولے: "اور کسی کے یہاں ہوگا بھی تو اس میں سے کچھ ساتھ نہیں جائے گا، فقط اپنے کرم دھرم ساتھ جائیں گے!" یہ کہکر منورما نے زور سے سانس لی اور اس طرح بولنے لگے جیسے خود سے ہی کہہ رہے ہوں: "احمد آباد جاتے ہوئے اس دن رات کو جو بات مہاراج نے کہی تھی وہ سچ ہی تھی.... پھر گھر والی کی طرف دیکھکر ہنسی آتی ہوا سے راون کی اولاد بچا چاہئے ابھگوان بھی...؟"

"تو کیا تم احمد آباد تک ہو آئے؟" گھر والی نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

"ہو کیا آیا؟ دو راتوں رہ کر بھی آیا!"

گھر والی نے منورما کے چہرے کی طرف دیکھا، لیکن وہ غصہ نہ کر سکی۔ پھر اس سے بغیر کہے رہا نہ گیا: "جب گئے تھے تو کام بھی کر آتے یہ کھٹکی تو یہاں سے نکل جاتی! پھر اگر سادھو بن جاتے تو کون منع کرتا تھا۔" پھر کچھ رُک کر کہنے لگی: "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تم سے کچھ نہیں ہوگا!"

منورما مایوسی کے ساتھ اتنا ہی بولے: "سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن نہیں کیا، یہ بات بھی سچ ہے!" پھر ذرا دیر خاموش رہے اور خود بخود کہنے لگے۔

"نہیں، نہیں! اچھا ہی ہوا، بھگوان نے مجھے بچا لیا۔"

گھر والی نے ذرا گھبرا کر پوچھا: "کیوں کیا پولس کو خبر ہو گئی تھی؟"

منورما نے ہنس کر جواب دیا: "یہ بات ہوتی تب بھی کچھ ایسا بُرا نہ تھا!"

"کچھ سیدھی بات تو کہو!"

"کہوں گا بھی تو کوئی نہیں مانے گا۔ اور تو تو مجھے بالکل پاگل ہی سمجھے گی!" یہ کہکر منورما خاموش ہو گئے۔ گھر والی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا: "میں تجھے کیا بتلاؤں؟

[illegible] منور [illegible] آ گیا۔ [illegible]
[illegible] تھی۔

[illegible] سے کہا تھا منور [illegible]
[illegible] اس کی وجہ سے [illegible] اور سب [illegible]
[illegible] بہت [illegible] عمر [illegible] ہے۔
[illegible] ہے کہ [illegible] نہیں لگتا تھا۔

گھر والی [illegible] اس سے [illegible] بالکل نا تھی [illegible] ہے۔ منورد نے آگے کہنا شروع کیا۔ پہلی بار [illegible] سنا اور میں نے سب کچھ طے کر ہی لیا تھا لیکن آخر میں سالا گیا۔ [illegible] کتنی روتی تھی وہ لڑکی کتنی روتی تھی! مجھے اس وقت اپنے پرسسرال جاتی ہوئی نانی کی یاد آگئی!

بالکل [illegible] کی طرح روتی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی، "ابا جب تم بھی سسرال چلے جاؤ گے۔ تب کون میری مدد کرے گا؟" منورد نے [illegible] گھر کے کونے صاف کئے۔

گھر والی بھی کھنکارتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ بولی "مجھے یقین نہ آئے تو غور سے سنا مجھ کو کہ بہت کی آواز بھی بالکل نانی سی لگتی ہے۔!"

گھر والی نے آنسو پونچھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگی "میں کیا جانتی نہیں! جب نانی اور یہ دونوں مل کر گیت گاتی تھیں تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ دو گا رہی ہیں؟"

کچھ دیر منورد کی بیوی خاموش رہی، پھر بولی "تم وہاں سے اُسے واپس لے آئے تو اچھا کیا لیکن یہاں جو تم نے اس کے لئے [illegible] کھپایا اس کے روپے تو خوب وصول کرتا ہے! جو چلی گئی اس سے تو وہاں..... " آسمان کی طرف اشارہ کر کے... "میری بٹیا اب کہاں ملے گی؟

لوگ تو کہتے ہیں کہ کمہیا نے اسا اور بھیا دولوں کی ایسی بنا دی بلکہ اگر وہ لوں بیس بیس روپے نذرانہ بھی دیں تو کم ہے، اس کی [illegible]....."

منورما نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن جو مل گیا اچھا!! میرا ارادہ تو ایک کوڑی لینے کا بھی نہیں تھا۔ اب بھی دل

[illegible] ہے لیکن میں نے سوچا کہ جو خرچ ہو گئے تھے [illegible] میں ہرج نہیں۔ باقی میں [illegible] کی بات کہوں؟"

اور پھر گھر والی کی طرف جھک کر آہستہ سے بولے "روپے تو [illegible] اور سب کچھ ہوتا۔ میں نے سوچا کہ [illegible] لوگ [illegible] کے نام پر سوا رست کرتے ہیں۔ اپنے [illegible] کے نام پہ [illegible] نہیں؟ جب یہ لوگ اتنا اتنا خرچ کر ڈالتے ہیں تو مجھے تو فقط زبان ہلانا تھی۔ میں بھی لوں گا [illegible] بیٹا کے نام پہ ایک غریب لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا۔

گھر والی کی بھی سمجھ میں آنے لگی۔ وہ بولی "ہاں جی۔ بیا میں جانے ہماری نانی زندہ ہوتی تو اس کے لئے بھی آخر کچھ [illegible] کا خرچ تو ہوتا ہی، ہم کہیں سے کر۔

"اتنا ثواب تو کاشی کی یاترا کرنے سے بھی نہیں ملے گا۔ [illegible]!" منورد نے گھر والی کی طرف دیکھ کر کہا جو خاموش بیٹھی تھی۔

"سچی بات ہے" گھر والی نے سر ہلا کر کہا۔

منورما پھر بولے "جن کے بیٹی نہیں ہوتی وہ حسرت کرتے ہیں بیٹی کے لئے۔ ہمیں بھگوان نے بیٹی دی تھی لیکن اس کی مرضی کہ پھر واپس لے لی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی نے مجھ سے یہ [illegible] کچھ رنگ دھرم کی بیٹیا......"

"بنا ہی لیتے ہیں!" کہتے ہوئے اُن کی گھر والی نے جملہ پورا کر دیا اور اُن کے قریب آ کر بولی، "جب تم بھگوان کی بات کرتے ہو، تو میں بھی کہتی ہوں کہ اُس دن جب تم نے ایک جوڑی کپڑے مانگے تھے تو مجھے خیال آیا کہ اپنے کپڑے دینے کی بجائے مرنے والی کا ایک جوڑا اسے دوں، اُن کا پہننے والا اب کون ہے! یہ سوچ کر صندوق کھول تو لیا، لیکن کپڑے نکالتے وقت میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے بہتیرا دبایا مگر کپکپی رکی نہیں!"

پھر خود ہی کہنے لگی "کیا یہ ماتا جی کی ہما نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں اُنہیں کی!!" کہتے ہوئے منورما نے حقہ ہاتھ میں اُٹھا لیا۔"

یہ کہہ کر کہ بھگوان نے عزت بچا لی اور سب اچھا ہو گیا" پھر [illegible] کی راکھ نکالتے ہوئے کہنے لگے "[illegible] تھوڑا اچھا کر دے۔ تیرے ڈر

کے ارے تو دن سے اچھی طرح تمہارا بھی نہیں پی سکا۔"

"لیکن مجھے فکر کیا تھی! آخر تم نے بات تو بتائی ہوتی!"

گھروالی کھڑی ہو گئی۔ منوردا بولے: "میں نے سوچا کہ سارا کام نمٹا کر ہی کہوں تو اچھا ہے ورنہ ادھر اُدھر بات پھیلی تو تیرے پڑے گی، مجھے کیا پتا تھا کہ تو سیدھی طرح مان جائے گی!"

گھروالی نے کٹھیا سے تمباکو اُتار کر منوردا کو دیتے ہوئے کہا: "میں ایسے کام میں کیا بولتی؟"

پھر نیچے بیٹھ کر بولی: "یہ خبر ہوتی تو جھکو کے کپڑے ملیا کے گھر میں کیوں پہنانا پڑتے؟ کیا اپنا گھر نہیں تھا؟ تمہیں اتنا بھی نہیں سوجھا!"

"لیکن اب کیا، اب تو وقت نکل گیا۔ اچھا دن دیکھ کر جھکو کا نیوتہ کر لے۔ اور بیاہ کرنے کی تجھے خواہش ہو تو بھی منع نہیں کرتا۔ بُرا کام دوبارہ مت کرو لیکن اچھا کام سو مرتبہ کرو تو کون روک سکتا ہے؟" منوردا سکون کے ساتھ حقہ پینے لگے۔

دیر تک گھروالی سوچتی رہی اور آخر بول اُٹھی:

تم ہو تو ناتھی کے دو جوڑے ایک وہ کمخواب کا، دوسرا ریشمی رکھے ہیں، اب اُنھیں کون پہنے گا!...

"کون کیا، جھکو پہنے گی!" پھر ہنس کر کہنے لگے: "اری پگلی اس میں مجھ سے پوچھنا ہی کیا!" پھر کھڑے ہو گئے۔ "چل اُٹھ: کھٹیا بچھا دے۔" کہا اور باہر نکلے: "اور تجھے خبر ہے، جھکو تو اپنے بھتیجے، کلوا کے بچے کے لئے اچھا سا کھلونا لائی ہے! تو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔" چلتے چلتے کہنے لگے: "کل تو دیکھنا تو سہی!"

"ضرور لائی ہو گی۔ پھوپھی نہ لاتی تو دوسرا کون لانے والا تھا؟" گھروالی بھی یہ کہہ کر اپنے کاموں میں لگ گئی۔ کام ختم کر کے باہر آئی تو منوردا پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئی: "میں نے ہی احمدآباد بھیج دیا تھا، بھگوان جانے کیا کیا مصیبت اُٹھائی ہو گی۔ اتنے دنوں بعد آج ذرا آرام سے نیند آئی ہے!" پھر پانی کا لوٹا بھر کر کھٹیا کے نیچے رکھا، لحاف اچھی طرح اُڑھا دی، اور خود بھی سونے کے لئے چلی گئی۔

رات کو خواب میں بھی دیکھا تو جھکو اور ناتھی ساتھ ہی نظر آئیں کبھی کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی، کبھی کنڈے تھاپتی ہوئی۔ نیند پوری ہونے پر کروٹ بدلی تو اب خواب میں بھی جھکو کے مستقبل کا پروگرام بن رہا تھا۔ جھکو کو اچھی طرح کھلا پلا کر کپڑے دیئے۔ سُنہری پھولوں والا کمخواب، گلابی ریشمی ساڑی اور اصلی زردی کا دوپٹہ —— ناتھی کے جتنے بھی کپڑے تھے وہ سب جھکو کو پہنا کر بیاہ کیا۔ لوگوں نے پوچھا، "کیا ہو رہا ہے آج پھر!" تو اس نے جواب دیا۔ "اس دن تو گھبراہٹ میں جیسا تیسا کر دیا تھا، اصل بیاہ تو آج ہی ہے!! اب تو ہمیں ہی اس کی ساری رسمیں پوری کرنی ہیں!" اس میں بڑا مزا آ رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی!! خواب یاد کر کے منوردا کی گھروالی خوش ہونے لگی۔

اور خود بخود بولی،

"بڑا ثواب کرنا ہے!!"

باہر نکل کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی، شفق کی اداسی کا گہرا رنگ ہلکے گلابی رنگ میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ گھروالی نے دیکھا کہ روز سویرے اُٹھ جانے والا منوردا ابھی تک خراٹے لے رہا ہے۔ وہ خود بخود بڑبڑانے لگی۔

"ابھی تک سو رہے ہیں!" یہ کہتی ہوئی وہ چلی ہی تھی کہ سامنے سے کسی آنے والے پر جھکو کا دھوکا ہوا۔ وہ قریب آئی تو اس نے پوچھا "اتنے سویرے کیسے آنا ہوا بٹیا؟"

"میری ساس نے کہلا کر بھیجا ہے کہ منوردا کا اس وقت میکے والوں کے ساتھ چائے پینے کے لئے آ دیں۔" اور منوردا کو سوتے ہوئے دیکھ کر "تم کہہ دینا کاکی" یہ کہتی ہوئی واپس ہونے لگی۔

یہ آواز سُن کر منوروا کی آنکھ کھل گئی۔ اُنھوں نے اُٹھتے ہی جھمکو کو آواز دی لیکن وہ گھیارا پار کر کے نکل چکی تھی۔

گھروالی نے منوروا کی طرف دیکھا اور پھر جانے ہوئے کہنے لگی:

"بالکل پگلی ہے!"

گھروالی کے اس پیار بھرے جملے میں منوروا کو کتنا لطف آیا اس کا اندازہ اتنا چہرے سے نہیں ہو سکتا جتنا اُن کا دل دیکھ کر ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔

اور گھر سارا کرتے ہوئے اُن کی بیوی بھی دل ہی دل میں چالی کا پروگرام بنا رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

× × × × × ×

تیسرے ہی دن جھمکو کو کھلا پلا کر اور نئے کپڑے پہنا کر سسرال بھیج دی گئی۔ لوگ طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے جن کا ایک ہی جواب منوروا کی بیوی سب کو دے رہی تھی: "اس دن تو جلدی جلدی میں رسم پوری کر دی تھی۔ باقی جو کچھ کرنا تھا وہ آج کر رہے ہیں!" اور پھر بھی لوگوں نے یہ تو نہیں کہا کہ "یہ سب کچھ تو پہلا کو کرنا چاہیے تھا تم کیوں کر رہی ہو" مگر منوروا کی گھروالی اس طرح کہتی جیسے وہ ان کے دل کا چور پکڑ رہی ہے: "اب تو جھمکو کی ساری رسمیں یہیں ہی کرنا ہیں بہن!" پھر اس کی آواز بھرّانے لگی اور وہ بمشکل پوری بات کر پائی۔

"اس کا بھائی تو اس سے بولتا بھی نہیں!" — جھمکو پھر بھی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس جملے نے اُسے جھنجھوڑ دیا اور رونے لگی۔ دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ منوروا جو ترسے بیٹھے حقہ پی رہے تھے اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

ایک عورت نے جھمکو کو دلاسہ دی: "ارے چپ ہو جا بیٹیا! وہ بولتا نہیں تو کیا بھائی نہیں رہے گا بالکل بہن بہن کرتا ہوا آئے گا۔"

جھمکو کے رونے کی آواز گھیارے کے باہر نکڑ والے گھر کے آنگن میں کھڑی ہوئی ایک عورت کے دل میں اُتری جا رہی تھی وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی گھر میں چلی گئی!

منوروا کی گھروالی نے گلا صاف کر کے اور آنکھیں پونچھتے ہوئے جھمکو کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اسی طرح کچھ دیر کھڑی رہی۔ اس وقت اس نے وہ الفاظ ادا کر دیئے جو منوروا کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

"چپ ہو جا بیٹیا، چپ ہو جا! جب تک ہم زندہ ہیں تب تک تجھے کس بات کی فکر ہے؟"

ایک طرف تو عورتوں سے بھرے ہوئے آنگن میں آنسو بہاتی ہوئی جھمکو کو سسرال کے لئے وداع کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف دو چار مردوں کے جمگھٹ میں خاموش کھڑے ہوئے منوروا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔!!


عالمی ادب کے ناولٹ

پرل ایس بک

پرل سیڈنسٹرکر بک بمقام ہلس بورو مغربی ورجینا میں بتاریخ ۲۶ جون ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئیں۔ والدین عیسائیت کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے چین سے دوسرے ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے۔ مگر جلد واپس آکر چین میں مستقل بس گئے۔

اس کے اپنے الفاظ میں "اُس نے یانگ سی دریا کے قریب ایک پہاڑی پر بنے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں بڑے سکون و اطمینان کی فضا میں اپنا بچپن گذارا"۔ انھوں نے انگریزی سے پہلے چینی زبان سیکھی۔ اُن کی چینی نرس نے اُن پر سب سے زیادہ اپنا اثر چھوڑا۔ اور انھوں نے سب سے پہلے اسی کے ذریعہ وہاں کے عوام کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کے پاس پرل کے لئے جادو وغیرہ کے قصے کہانیوں کا لامحدود خزانہ اک انتہائی لطیف و خوشی کا ذریعہ تھی۔

پرل پر اپنی ماں کا بہت بڑا اثر پڑا "میری ماں نے مجھے سب کچھ سکھایا۔ خاص طور پر الفاظ اور ان کے معنیٰ کا حسن۔ اُس نے بچپن ہی میں مجھے حسن کو پہچاننا اور احساسات و مشاہدات کو قلمبند کرنا سکھا دیا تھا"۔ پہلے شنگھائی میں تعلیم حاصل کی اور امریکہ میں اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

شمالی چین میں ۵ سال شادی کے بعد گذارے۔ جہاں چینیوں کی قریب ترین دوست بن گئی۔ اور چینی بھی اس کے قریب آگئے۔

۱۹۳۲ء میں مسز پرل نے اپنا شہرۂ آفاق ناول "دی گڈ ارتھ" لکھا۔ جس پر انھیں پلٹزر انعام ملا۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اُن کے قلم سے بہت سے عظیم ناول نکلے جن میں 'دی مدر'، 'دی پیٹریاٹ'، اور 'ڈریگن سیڈ' بہت مشہور ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں اُنھیں ادبیات کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلی امریکن عورت ہیں۔ جنھیں یہ اعزاز ملا۔

ناول نگاری بقول خود اُن کے اُن کی زندگی کا ایسا مقصد ہے جس کو پورا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لئے اُن کے ناول زندگی کے حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ پورا پورا خلوص برتا ہو۔



پرل ایس بک



م۔ قاسم صدیقی

پرل ایس بک

مترجم محمد قاسم صدیقی

سفرحیات

تو ہم کا سفر ہو چکا اور وہ ویران تھا۔ تاہم نیلے آسمان کے نیچے نشیبی ہوتا جنہیں صدیوں کی ہواؤں کے تھپیڑوں نے گھس کر نرم چٹانوں میں تبدیل کر دیا تھا، دھوپ کے سبب سنہری دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے چہرے کو سرو رنگ کے سائے ڈھلوان چٹانوں پر پڑتے جاتے تھے۔ لیکن اس خاکدار وادی میں واقع یہ ہرا شہر جس میں سے دفتر تاریخ جہاں سے سب سے ... اس شہر کا مرکزی نقطہ تھا۔

"یہ سب خوشنما ہے" اس نے خیال کیا، "یہ سب مردہ ہے" لیکن اس مدت سے جو کہ سال بھر سے زیادہ ہو گیا اس کے نزدیک موت و حیات میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا۔

اسے یاد تھا کہ گلینڈرز کس طرح اس کے اس نئے دفتر میں آئی تھی جس پر اسے اس قدر فخر تھا۔ وہ دفتر اس سنگ ہال میں ہیڈ کوارٹر کے دفتر کے پاس تھا وہ اس کا پہلا دفتر تھا کہ جہاں ڈاکٹر ہیلنگز نے سن لیا ہے وہ حضر یاد آیا جو اسے پہلی مرتبہ ملنے پر آیا تھا۔ اب تو اس لڑکی کا نام گلینڈرز جس نے اسے چڑھایا تھا اسے اچانک نظر آیا پھر بھی پہلی بہار میں جو اب اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صدیوں پہلے آئی تھی اس نے سوچا تھا کہ اس کا چنچل اور خوشنما مزاج اس لڑکی کے لئے موزوں تھا مگر اب اسے اپنے اس خیال پر بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا اسے پہلے کبھی محبت نہیں ہوئی تھی۔ "نہیں" وہ آج بھی یہی کہہ سکتا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت وہ جو کچھ ان کے بارے میں سوچ رہا تھا اسے محبت جیسے الفاظ سے آراستہ کرنا بے ہودہ ہے وہ ان اصل میں ... تھی اور اسے بے حد احساس ہوا کہ گلینڈرز کے لئے اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ محبت ہرگز نہیں تھی جب کوئی شخص کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے تو یوں ہی اس کو بے خوف ہو کر ملتے رہنے کی کوشش نہیں کرتا ہے اور جب وہ گلینڈرز کے ساتھ تھا یا جب کبھی وہ اس کے متعلق سوچتا تھا تب بھی اس کا یہی عالم ہوتا تھا۔ اسے گلینڈرز کی کوفت آور انداز سے بالوں کا ضرورت سے زیادہ زرد رنگ گو پسند تھا پھر بھی وہ اسے نظر انداز کرتا تھا اور خود کو مجبور کرتا تھا کہ اس کے ان ... بچوں جیسے کا خیال کرتا رہے۔

وہ آکسفورڈ کے زمانے میں دوسرے پروفیسر کا بیٹا تھا اور لڑکیوں کے متعلق اسے کوئی علم نہ تھا کیونکہ اس کی ماں بہت شرمیلی عورت تھی اور آکسفورڈ کی طالبات سخت طالبات تھیں ان کو کبھی عورتوں کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا پھر بھی اس کا خیال تھا کہ اپنے گزرے ہوئے زمانے کو محض تعظیم کے ساتھ یاد کرتا ہے حالانکہ وہ اس یاد کو کبھی دوبارہ کریدا کرتا تھا۔

اور پھر وہ حق رجب ہوں کے جشن میں ایک دن صبح جب آسمان صاف تھا گلینڈرز اس کے دفتر میں آکر کہا کہ میرے پیٹ میں شدید تکلیف ہے تو وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ خوف و ہراس اور حوالی کے بعد ... سے مغلوب ہو کر اس نے اس کی خبر پر یقین کر لیا تھا اسے یہ خیال "یا بیماری" کہیں لاحق کا گلینڈرز سے ذکر کیا ہے وہ کسی دوا سے آرام ہو سکتی ہے، اس نے یاد کیا۔ وہ ایک تیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا در اصل ابھی کچھ عرصہ پیشتر ہی اس کی اس سے ملاقات ہوئی تھی ایک میخانہ میں اس سے اس کی یوں ہی جان پہچان ہو گئی تھی اس کے ساتھی نے بہت زیادہ وہاں لی تھی اور وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اسے گھر پہنچا سکے اور ڈرونلڈ نے اسے گھر تک پہنچانے میں مدد کی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا اسے اس سے رخصت ہوتے وقت یہ محسوس ہوا کہ اس سے اگلے روز پھر ملے اور اس نے فوراً معلوم کیا۔

"کیا آپ کا ساتھی اس پر معترض نہ ہوگا؟"

"کون ہنری؟" گلینڈرز اس کے اس سوال پر اس طرح ہنسی گویا اس نے کوئی مضحکہ خیز بات پوچھ لی ہو اور پھر اس نے سرکشانہ لہجہ میں کہا۔ "ہنری گرین میرا عاشق نہیں ہے اس سے تو بس یونہی سلام دعا ہے"

اور یہ تھا آغاز۔ اس کا خیال پھر دفتر کی طرف گیا یہ ماضی کا واقعہ ایک لمحہ اس کے ذہن میں آیا اب جسے وہ اس کے لئے اپنی کچی محبت سمجھتا تھا بالکل ختم ہو گئی اور تنفر و حقارت کا جذبہ اس پر حاوی ہو گیا۔ اسے یاد آیا جبکہ وہ اس گہری خاموشی میں کھویا سا بیٹھا ہوا اس کو گھور رہا تھا

اور وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

"او وہ میں کچھ نہیں بتا سکتی" اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ "میں ابھی بہت کمسن ہوں" اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"تم نے مجھے مار ڈالا" اس نے ڈرامائی انداز میں روتے ہوئے کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا۔ "خاموش" رونیلڈ نے ایسے لہجے میں کہا کہ سے خود پتہ نہیں چل سکا کہ وہ آواز اسی کی تھی یا کسی اور کی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بیچ مٹھیاں باندھے کھڑا رہا۔ خاموش خاموش، وہ بڑبڑاتا رہا اور بالآخر اس کے ان غضبناک الفاظ سے خوفزدہ ہو کر گلیڈیز کا رونا رفتہ رفتہ سکون میں بدل گیا۔ "رات کو یہاں آجانا" رونیلڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں خود تمہاری دیکھ بھال کروں گا"

لیکن اسی رات اس چھوٹے تنہا آپریٹنگ روم میں جبکہ وہ لیٹی تھی کسی نے دروازہ کی کنڈی کھول لی۔ اس نے تاریکی کے پردہ کو چھوڑ دیا اور خاموش کھڑا اس شخص کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دروازہ میں ہر رات کو قفل لگا دیا جاتا تھا لیکن اس نے تو اندر سے بھی کنڈی لگا دی تھی۔ پھر اس نے کوارٹر کے تالے میں چابی کے گھمانے کی آواز سنی اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر ہینشنگز ہی ہے کیونکہ اس تالے کی کنجیاں اس کے اور ڈاکٹر ہینشنگز کے ہی پاس تھیں۔

"مجھے اندر داخل ہونے دو رونیلڈ"۔ اس نے ڈاکٹر ہینشنگز کو کہتے سنا۔ اس نے فوراً سمجھ لیا کہ چھپا نا بے سود ہے۔ کیونکہ جب تک اس بوڑھے کو اندر نہ آنے دیا گیا وہ دروازہ پر ہی کھڑا رہے گا۔ لہٰذا وہ دروازہ پر گیا اور اسے کھول دیا۔

"اندر آئیے" اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ایک ضروری کام آ گیا"

"مس بیل کہاں ہے" ڈاکٹر ہینشنگز نے کمرہ کے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ مس بیل وہاں نرس تھی۔

"وہ مجھے نہ مل سکی"

لیکن بوڑھے کو حقیقت معلوم کرنے میں زرا دیر نہ لگی۔ اس نے نیچے دراز عورت کی طرف دیکھا جس کا چھوٹا سا چہرہ سفید اور رستا ہوا تھا پھر اس نے ایتھر کی خالی شیشی۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے" اس نے چیخ کر کہا "تم نرے پاگل ہو"

رونیلڈ نیچے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا وہ جھوٹ بولنے میں کمزور تھا کیونکہ اس نے کبھی جھوٹ بولنا سیکھا ہی نہ

تھا ڈاکٹر ایک لمبے لمبے کمرہ میں خاموش ٹہلتا رہا پھر بولا "غیر بہت جلد ہوش میں آ جائے گی۔ جب تک وہ ہوش میں آئے تم میرے دفتر میں چلو"

اس نے پھر گلیڈیز کی جانب نہیں دیکھا اور ڈاکٹر ہینشنگز کے پیچھے پیچھے دفتر میں چلا گیا۔ بوڑھے آدمی نے بڑی احتیاط سے کواڑ بند کر دئے۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے نرمی سے کہا اور خود بھی اپنی بڑی میز کے پیچھے کی بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آؤ اب کوئی ترکیب سوچیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ کس کر بھینچ لئے۔ "اگر تمہارے دل کی یہی کیفیت رہی تو وہ تمہیں فوج میں نہیں گھسنے دیں گے"

"تمہی کی بیماری رونیلڈ پہ طاری ہو گئی۔ اس نے سوچا اگر اس کے دل کی یہ کیفیت نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کب سے فوج میں بھرتی ہو چکا ہوتا اور گلیڈیز سے اس کی ملاقات بھی نہ ہوئی ہوتی لیکن یہ کوئی سنگین بات نہ تھی صرف اس کو اپنے میدان میں کام سے باز رکھتی تھی۔ اس نے انھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم محاذ پر زیادہ کارگر ثابت ہو گے اور اس نے اپنا سر ہلا دیا تھا

اسے اب یقین ہوا کہ اس شکست کے احساس نے اس کی افادیت کو نقصان پہنچایا ہے اور یک بیک یہ بات بھی واضح طور پر اس کے ذہن میں آئی کہ یہی احساس شکست اس کی جذباتی پریشانی کا باعث تھا جس نے چاہے براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی اسے گڑھے میں ڈال دیا اور ساتھ ہی اسے اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی کہ اب وہ اپنے ملک کے لئے کسی اور کے لئے یا اپنے ہی لئے کس مصرف کا رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر ہینشنگز اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے ان کے ہاتھ کوٹ کے پیچھے جاکٹ میں چھپے ہوئے تھے اور وہ انھیارے کے پردے کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ "یہ تو واضح ہے" انھوں نے کہا "کہ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے وہ لڑکی" انھوں نے کچھ نفرت آمیز تاثر سے اپنا منہ بنایا۔ "وہ لڑکیا تم کو تباہ کر ڈالے گی"۔ وہ اچانک گھومے اور انھوں نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر اگر تم اس جھمیلے میں پھنسے تو پہلے سے کہیں ابتر حالت ہو جائے گی۔ وہ تمہیں تباہی کی اس منزل پر لے جا کر چھوڑتی جہاں وہ تم کو لے جانا چاہتی تھی۔ اور تم ان لوگوں میں سے ہو جو محض اس سے مطمئن نہ ہوتے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز تمہارے حق میں نہیں ہے۔ کیا تم نے کبھی بلیک میل کا نام سنا؟ اب بوڑھے کی آواز میں قدرے سختی آ گئی تھی "تمہاری زندگی تباہ و برباد ہو جاتی۔ ویسے ابھی ہی تمہارا عہدہ کونسا اونچا ہے" اور اب وہ کچھ نرم ہو گئے "میرا خیال ہے اس کا کچھ انتظام کر دوں گا"

رونیلڈ لڑکی کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا کہ کچھ کہنے والا تھا لیکن ڈاکٹر ہشنگر نے کہا: باقاعدہ لڑکی سے میں لڑکی کو جانتا ہوں۔ اس کے سارے خاندان سے واقف ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم جو کسی شخص کو گرفتار نہیں کر سکے ہو یہی وجہ ہے کہ تم وہ طرح اس لڑکی سے شادی کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اب تم کو اس کے گھر والوں سے دور رہنا ہوگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اسی تنفر سے سنبھالا: اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں رہو اور پھر جاؤ۔ اور اگر تم یہاں سے چلے گئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی اور کو بھی لے جائیں اگر تم یہاں رک گئے۔ ڈاکٹر ہشنگر نے اس نوجوان کی طرف ہمدردی سے دیکھا: رونیلڈ میں اس کا انتظام کر دوں گا میں وعدہ کرتا ہوں، تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور وہاں جا کر کسی دور دراز مقام پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کرو۔ اگر کوئی ایسی جگہ انتخاب کرو جہاں جانے سے تم اس الجھن سے نکل سکو تو تمہیں وہاں چلے جاؤ۔

ایک لمحے کے لئے رونیلڈ خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے لہجے میں کہا

”لیکن میں اس طرح سے جا کر سارا معاملہ آپ پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”میں سب ٹھیک کر دوں گا“ ڈاکٹر ہشنگر نے کہا: ”میں کسی نہ کسی طرح اسے سنبھال لوں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم آج رات کی گاڑی سے لندن چلے جاؤ۔ وہاں جا کر تم اپنے والدین کو بھی اس روانگی کی اطلاع دے دینا۔ آج کل بچے کیسے ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔“

ڈاکٹر ہشنگر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ”اچھا رونیلڈ خدا تمہیں کامیاب کرے۔“

رونیلڈ کا شکر ادا ہوا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ دو ہفتے بعد وہ رونیلڈ اس کے لئے چین کو روانہ ہو گیا مگر ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے اپنی خدمات محض ٹرک ڈرائیور کے لئے پیش کی تھیں۔

اب وہ اپنی پرانی ٹرک ایک طویل سفر دینے والی تباہ و برباد شہر کی سڑک پر سے لے جا کر ٹرک گیا وہ جنوب میں اس بات کے لئے گیا ہوا تھا جہاں میں دوائیاں ختم ہو چکی تھیں لیکن وہ خالی ہاتھ واپس آیا اور پھر اسی احساس شکست نے اسے آگھیرا۔

بعض اوقات اسے خیال ہوتا تھا کہ اس کا اصل محرک ٹوٹ گیا ہو اور غالباً یہ اسی روز ٹوٹ گیا تھا جس دن آدھی رات کو ڈاکٹر ہشنگر کے دفتر میں اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔

اس نے اداسی سے سڑک کے آگے پیچھے دیکھا جہاں سڑک پر بمباری ہوئی تھی جس سے سڑک کے سرے کو ہموار کر دیا تھا۔ اگر جاپانی بمبار نشانہ بناتے تو جیتال کو بھی پامال کر دیتے۔ اس نے اپنے لب بھینچے اب تو اس کے سامنے یہ امکان کہ وہ دریں مشکل ہوگا کہ وہ دوبارہ دیکھ سکے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔

اس نے کبھی کوئی چینی شہر پورا نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ یہاں اپنا پرانا ٹرک لے کر آیا تھا تو قدیم شاندار شہر کا کوئی بھی حصہ ثابت نہیں بچا تھا سوائے ان اینٹوں سے ڈھیر پڑے تھے۔ اس کے بعد شہر پر کتنی بار بمباری ہو چکی تھی۔ اور وہ بچی ہوئی گندی ہوئی شے سے بنائی گئی تھیں روز بروز ٹوٹ ٹوٹ کر خاک میں ملتی جا رہی تھیں۔ سڑکوں پر ویران عمارتیں تھیں لوگ پہاڑوں کے غاروں میں چھپنے پھر رہے تھے۔

گرانے ویرانی اور دھماکوں کی عادت تھی۔ آٹھ گاڑیاں خالی ہوتے ہی دیگر سڑکوں کا سے گھیر رہا تھا۔

ڈرائیور منظر کی تنہائی پر اس خوبصورتی کا ایک جز تھا کہ اس شہر میں کچھ لوگ ایسے گزر رہے تھے جب وہاں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی حتیٰ کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہ ٹرک سے نیچے اترا۔ عرصے سے اس کا کوارٹر ٹوٹ کر گر پڑا تھا اور اسی طرح ٹرک کی ہر ایک چیز ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ اس نے انگڑائی لی اور اس کے کپڑوں سے ذرد گرد کا بادل اٹھا ہوا جیسے سخت چمکیلی دھوپ میں دھواں اٹھنے لگے اسے اپنے انگریزی اور آئرش ماں سے ورثے میں تاریکی ملی تھی اور اس کی آنکھیں بھی بچوں کی طرح اندر ہی اندر جلتی ہوئی کسی رنگ کی تھیں۔ گرد و غبار نے اس کی جلد پر ایک پھیکا زرد رنگ بکھیر دیا اور اس کے بالوں کو گندمی بنا دیا اس نے منہ پھیر کر گرد صاف کی۔ ٹوپی کو دائیں آنکھ کی طرف ترچھی کر کے سر پر جمایا تاکہ اس میں کچھ بہتر پیدا ہو جائے اور ساتھ کھنڈروں میں واقع تنہا عمارت میں داخل ہو گیا۔

اندر ایک چست کھائی دینے والا چینی نوجوان ایک میز پر بیٹھا ہوا کسی کتاب میں کچھ نام لکھ رہا تھا۔ برش نما قلم سے بڑی احتیاط کے ساتھ وہ ایسے معمولی فوجیوں کے نام لکھ رہا تھا جیسے یانگ، سو، پان وغیرہ

”ہیلو“ شان!“ رونیلڈ نے کہا۔

نوجوان چینی نے اپنا برش دوات کے کنارے پر رکھ دیا۔ اور بڑی مسرت سے کہا: ”مسٹر فارسول“ اس کا طالبعلمانہ چہرہ مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا۔ اور اس کی خوشگوار آنکھیں عینک کے پیچھے چمک اٹھیں: ”کیا آپ

کو روکا رہے آئے

روشیلڈ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں لا سکا" اس نے مختصر جواب دیا۔ "تیج کہاں ہے۔" وہ ہمیشہ تیج کے بارے میں معلوم کیا کرتا تھا۔ اگر سال بھر پہلے کوئی کہتا کہ اس کی سب سے زیادہ قربت کسی نوجوان ہندوستانی سرجن سے ہو گی تو وہ اس پر یقین کیے بغیر مسکرا دیتا۔

"اس وقت ڈاکٹر ہسکر شگافتہ کر رہے ہیں" شان نے جواب دیا۔ اس کے چہرے کی چمک غائب ہو گئی تھی۔ اس نے آہستگی سے کہا "آج ہم پر بمباری ہوئی ہے۔ ہسپتال لڑیں ہر جگہ تکلیف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب تو کوئی امید رہتی ہی نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے" روشیلڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے اپنی کرسی پر خود کو کوسا اور کمرے سے گذر کر خاموشی سے اس نے کواڑ کھولے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہو گا۔ خالی کمرہ میں عارضی آپریٹنگ میز پر تیج اپنا پرانا مگر صاف ستھرا کوٹ پہنے ہوئے کام میں مصروف تھا۔ اس کی پیشانی پر لگے ہوئے شیشے سے دھوپ کا عکس کھڑکی میں ہوتا ہوا نوجوان فوجی کے پیٹ پر پڑ رہا تھا مریض کی آنکھیں بند اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ تیج کا خوبصورت سیاہ چہرہ پسینے سے شرابور تھا اس کے نحیف کالے ہاتھ پھرتی سے نزاکت کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ لاں لی اس کے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھوں میں اوزاروں کی ٹرے تھی۔ اس کی آنکھیں روشیلڈ سے چار ہوئیں اور وہ مسکرا دی لیکن وہ وہاں سے ہلی نہیں۔

نہ معلوم روشیلڈ کی شکل میں جو احترام تھا وہ اس کو جان سکی یا نہیں کیونکہ آج تک اس نے کوئی اظہار نہیں کیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ جو لگاوٹ میں اس سے رکھتا ہوں وہ اسے جانتی بھی ہے یا نہیں۔ یہ وہ لگاوٹ تھی جو اتنی ہی اتھاہ تھی جتنی اس کی گلیڈ نیز سے محبت۔ مگر گلیڈ نیز اور اس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس کے چمکتے بکھرے کالے بال لمبی آنکھیں حسن کے معیار پر پورا اترنے والا چہرہ، آواز اور آداب و اطوار میں نزاکت، ادائیں، خاموشی۔ بھلا یہ خصوصیات کسی عورت میں موجود ہوں اور اس سے محبت نہ کی جائے لیکن اس نے اپنی بیوقوفی کو اپنے دماغی قید خانے سے فرار نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اس کے عزیز ترین دوست تیج کی محبوبہ تھی۔ جس کی جان و جسم اور خوبصورتی سب کچھ تیج کے لئے وقف تھیں۔ اس سب کے علاوہ وہ چینی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہر نقل و حرکت۔ جب وہ اوزار جو تیج استعمال کرنے کے بعد کہہ دیتا تھا اٹھاتی اور اسے دیکھتے ہوئے انگاروں پر رکھ کے ابالتی

میں ڈالتی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

"میں آ گیا ہوں تیج" بالآخر اس نے آہستہ سے کہا۔

تیج نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اس نے اپنے اسی خاص انگریزی لہجہ میں کہا "کیا فوراً ٹھیک کرنے والی دوا کا استعمال کر سکتا ہوں۔"

"میں وہ دوا نہیں لا سکا" روشیلڈ نے جواب دیا

تیج کے چہرے پر مایوسیاں اترنے لگیں مگر اس نے ایک لمحے کے لئے بھی کام کی رفتار دھیمی نہیں کی۔ مگر اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

"کیا میں اب جاؤں؟" روشیلڈ نے دریافت کیا۔

"نہیں" میں تقریباً کام ختم کر چکا ہوں۔ تیج نے جواب دیا اور روشیلڈ انتظار کرنے لگا۔ وہ تیج کو دیکھتا رہا۔ اس نے ناقابل یقین مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسپنج نکالے اور انہیں خاموشی سے شمار کرنا شروع کیا اور اس کے بعد اس نے زخم میں ٹانکے لگانا شروع کر دیئے۔ اب بھی روشیلڈ اسے غور سے گھور رہا تھا وہ موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ خون، اجڑا ہوا گوشت اور درد کی تکلیف یہ سب دیکھ کر اور اس قابل تعریف جوڑے کی طرف دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر اس کی تعریف کر رہا تھا وہ نوجوان چینی سپاہی جو درد و تکلیف کے رو نہیں رہا تھا اور وہ نوجوان ہندوستانی سرجن جو سرجری کے فن میں کمال رکھتا تھا۔

"تم چین کیوں چلے آئے" اس نے ایک مرتبہ تیج سے دریافت کیا تھا

"کیونکہ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں" تیج نے جواب دیا۔

"ہائے رے میری ماں" اب سپاہی بے ہوشی کے عالم میں کراہا۔

"ذرا تمہارے زخموں کو سی لوں۔ بس ایک اور برداشت کر لو" تیج نے آہستہ سے کہا "تم نے بڑی ہمت اور بہادری کا ثبوت دیا ہے۔"

سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اوپر کی وسیع چھت کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تیج لاں لی کی جانب مڑا "اب اس شخص کو یہاں سے جا سکتی ہو" اس نے کہا۔ وہ دروازہ تک گئی۔ دو اردلی آ گئے انہوں نے ٹیبل کے تختے کو اسٹریچر کی طرح اٹھایا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی جوں ہی وہ روشیلڈ کے قریب سے گذری مسکرا دی

"او منحوس خبر لانے والے۔ آج دوپہر کو ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ" وہ سرگوشی کے لہجہ میں بولی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دھیما سا مسکرا دیا اس کی مسکراہٹ میں جھجک مضمر تھی کہ کہیں لاں لی اسے بیوقوف نہ سمجھ

[illegible] وہ اس قدر حسین تھی جیسے وہ اس کے قریب سے گزری ہو تو اس نے اس کی [illegible] کو غور سے دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی، اس کی [illegible] ایک زبردست کشش تھی لیکن وہ اکثر بیمار رہتی تھی۔ جب [illegible] ان دواؤں کی کھیپ کے ساتھ پیکنگ سے آئی تھی اور اس نے [illegible] کے سامنے کچھ ایسے ڈرامے کئے تھے تب ہی تیج کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ تیجن کے بعد ان کی شادی ہو گئی اور اس نے ان دونوں ہاتھوں کو [illegible] کی طرف متوجہ کر لیا جس سے تیج کو نفرت سی ہو گئی تھی [illegible] اس سے تیج کے ساتھ پیش آنے لگا اور وان لی نے اس کی اس تیج کی شادی کے ساتھ [illegible] اور اس کی شادی رونیالڈ کو بڑی پُرکشش اور دلفریب معلوم ہوئی

اس نے اپنے اور تیج کے درمیان دروازہ پر پردہ ڈال دیا اور اس نے غور سے تیج کو دیکھا جو بڑی احتیاط سے پلاسٹک کے تھیلے میں سے نکال کر گلاس سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس کا رنگ ملائی کا بنا ہوا ہوتا تھا جیسے ہوئے [illegible] رنگ کا یا پھیکے کتھئی رنگ کا، اور ہونٹوں کی جھلک لئے ہوئے ہوتا تھا۔

"تم کہیں سے بھی زخمی تو نہیں ہو" تیج نے پوچھا۔ اس نے رونالڈ کے ہاتھ کو غور سے دیکھا اس کے ہاتھ پر خون کی ایک پتلی سرخ لکیر بنی ہوئی تھی۔

"تم نے تو اپنا ہاتھ کاٹ لیا" رونیالڈ نے متحیر ہو کر کہا۔ بھلا وہ تیج کو ناکہ بندی کے بارے میں کیا بتاتا؟

"نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں ہے" تیج نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کی پتلی کلائی اور انگلی [illegible] جو خون بہہ رہا تھا تیج نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی چکنی سیاہ جلد پر ہلکا سرخ خون بہت زیادہ نمایاں اور چمکدار تھا۔

"تمہاری کلائی سے تو خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے" رونیالڈ نے کہا۔

"خون کا اخراج میرے لئے مفید ہے" تیج نے خاموش لہجے میں کہا۔ سپاہی کے ناسور تھا میں کلوروفارم کا انتظار کرنا چاہتا تھا اور اگر اسے بچانا تھا تو انتظار ممکن نہیں تھا۔

"کیا تمہارے پاس دستانے نہیں تھے" رونیالڈ نے معلوم کیا۔

"نہیں۔ ایسا آخری جوڑا کوئی دس روز ہوئے پھاڑ ڈالا تھا" تیج نے جواب دیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کتھئی بوتل لی اور اس کا [illegible] زخم میں ڈال دیا۔ پھر اس نے [illegible] ہتھیلی پر ایک پٹی باندھ دی "آؤ چلیں" اس نے کہا "کھانے کا وقت ہو گیا۔"

اس نے سرجن کا کوٹ اتار دیا کوٹ کے نیچے ایک بوسیدہ سوٹ ایک [illegible] سفید سوتی کپڑے کا لباس جو گردن تک بند تھا اور جس میں بٹن لگے ہوئے تھے۔ وہ لباس بالکل ویسا ہی تھا جو عام طور پر چینی فوجی پہنتے تھے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ رونیالڈ کے کندھے پر رکھا اور وہ دونوں باہر نکلے۔

"ناکہ بندی" اس نے رونیالڈ کو یاد دلایا۔

"پہلے سے کہیں بدتر ہے" رونیالڈ نے مستقل مزاجی سے کہا "ہم نے اپنی سب ہوائی جہازوں کا کام جاری رکھا، مگر تمام راستہ ناکہ بندی کی وجہ سے بند ہے۔"

"تعجب کی بات ہے کہ تمہیں کوئی ایسا ذریعہ ملا جو ناکہ بندی توڑنے میں تمہاری مدد کرتا"

"جی اب تو صورت حال پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔ حکومت شمال مغرب پر بالکل اعتبار نہیں کرتی۔ تمہیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ انہوں نے کمیونسٹوں سے جنگ کی اور جاپانیوں کے خلاف کئی برس پہلے انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ لیکن بیکار ہے کہ جاپانی اب سب کے سب کمیونسٹ نہیں ہیں وہ سارے شمال مغرب پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انہیں رسد بہم پہنچائی جائے۔

تیج کے چہرے پر اداسی کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس کی گہری آنکھوں میں جلن ہونے لگی "کیا تم کسی سپہ سالار جیسے بوڑھے کو رشوت دے سکتے تھے؟"

"نہیں بوڑھے سپہ سالار اس بات پر یقین ہی نہیں کرتے کہ یہ پہاڑی گوریلے دشمن سے جنگ لڑ رہے ہیں" رونیالڈ نے کہا "انہیں اپنی جان کی پڑی ہے میں نے فانی کو بوڑھے کے پاس بھیجا تھا اور کہلوایا تھا کہ میں اس سے ملاقات کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ وہ آخرکار سمجھ گیا کہ میرا مقصد کیا ہے اس نے مجھے بلا بھیجا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ ایک قدیم لوٹس کی مانند بیٹھا ہوا تھا۔ موٹا، بھدا اور بے ڈھنگا سا میں نے اس سے ان دواؤں کے بارے میں دریافت کیا جو ہمارے لئے امریکہ سے بھیجی گئی تھیں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہ ان دواؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جب میں نے اسے بتایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو اس نے بتایا کہ امریکہ سے آئی ہوئی تمام ادویات حب الوطن چینی دستوں کے لئے استعمال ہو گئیں

"لن تان کے پہاڑیوں نے تین روز پہلے کوئی ایک ہزار جاپانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا" تیج نے کہا۔ "ہاں جب کپڑا زخمیوں کو لایا تھا تو اس نے مجھے یہی اطلاع دی تھی۔"

"میں نے واپسی میں اس کے متعلق کچھ افواہیں سنی تھیں" رونیالڈ نے جواب دیا

یہ اس زندگی کے عقب کا ایک حصہ تھا۔ انھوں نے کبھی لن تان کو نہیں دیکھا تھا صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ اجاڑ پہاڑیوں میں کہیں پہاڑ پہاڑوں کا سردار رہتا تھا اور چپ خفیہ گروہ سے اس نے اپنے علاقے کے دس ہزار کسان سپاہیوں کی رہنمائی کی تھی۔ اس میں حکایت اور حقیقت کا امتزاج تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس کچھ بیرونی ملکوں کی اسناد ہیں جن کی رو سے وہ جو زبان چاہے بول سکتا ہے۔ اس کا قد سات فیٹ اونچا ہے۔ لوگوں میں ایک روسی بیوی یا ہاتھوں میں دو دو انگوٹھے یہ خصوصیات بھی اسی کی تھیں۔

یہ سب سن کر رونیلڈ نے کہا "دو انگوٹھوں کی بات تو میں یہ کر سکتا ہوں، لیکن چاہے قابل یقین ہو یا نہ ہو یہ حقیقت تھی کہ لن تان نے گزشتہ ماہ میں دشمن کی فوجوں کو کرنی سیسل پیچھے دھکیل دیا تھا۔

میں نے بوڑھے سے کہا کہ لن تان نے کسی بھی چینی فوج کے جرنیل سے زیادہ جاپانیوں کو مارا ہے" رونیلڈ نے جاری کیا "لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اس بیان سے وہ لن تان اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔"

خرابے کے ڈھیر کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر کچھ دور تک وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"مجھے افسوس ہے" رونیلڈ نے بالآخر کہا "میں کچھ تو جانتا ہوں کہ آخر بغیر دواؤں کے آپریشن کرنے میں کیا مشکلیں پیش آتی ہیں۔ یہ تو یقین ہے کہ یہ نہ کچھ اس ضمن میں ضرور ہونا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے!"

"چونکہ ہم پر باقاعدگی سے بمباری ہو رہی ہے اس لئے یہ تو ظاہر ہے کہ زخمیت پر تو بھاری ہوگی" تیج نے کہا

انھوں نے ایک تباہ شدہ صحن طے کیا اور ایک دروازہ میں سے ہو کر جس میں کواڑ نہیں تھے وہ لوگ سامنے گئے۔ ایک خالی کمرے میں لاں لی ہلکے نیلے رنگ کے سوتی گاؤن میں ملبوس میز پر پیالے اور رکابیاں سجا رہی تھی اس کا سرخ منہ بالکل ٹیڑھا ہو گیا۔

"میں جانتی تھی تم آج یہاں آؤ گے" اس نے رونیلڈ سے کہا۔ "آج صبح ایک بوڑھی عورت دیہات سے جیب میں انڈے رکھ کر لائی تو میں نے سوچا۔ رونیلڈ آنے کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ خدا نے تمہیں کچھ نصیب کیا ہے۔ رونیلڈ میں نے بارہا یہ دیکھا ہے۔ جب تم چلے جاتے ہو تو ہفتوں ہم باجرہ اور گوبھی پر گزارتے ہیں اور پھر اچانک کوئی مچھلی پکڑ لاتا ہے اور تیج کو دے دیتا ہے اور میں خود سے کہتی ہوں۔ آہ اب تو رونیلڈ آنے والے ہوں گے کیونکہ ان کی تقدیر سے خدا نے آج مچھلی بھیجی ہے اور شام ہونے نہیں پائی کہ تم یہاں موجود ہوتے ہو۔"

رونیلڈ نے اس کے حسین چہرہ کو جی بھر کے دیکھا اور مسکرا دیا [illegible] ہوئے لاں لی کی سیاہ آنکھیں مسرور ہو گئیں۔ لیکن تیج نے اس کی گفتگو کی طرف توجہ دیے بغیر رونیلڈ سے سنجیدہ لہجہ میں اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اور اسپیشل رسد کے چھ ٹن جو بھیجے تھے جنھیں ناکہ بندی کے حکام نے گزرنے نہیں دیا۔ کیا وہ مرحلہ میں جن کا ذکر بوڑھے نے کیا تھا؟"

"وہ وہی ہوں گے" رونیلڈ نے جواب دیا "برما سڑک کے ختم ہونے کے پہلے ہی امریکہ سے آخری جہاز آیا تھا۔"

"جلدی سے ہاتھ منہ دھو لو" لاں لی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "انڈے تیار ہیں۔"

اس نے ایک چھوٹی تانبے کی کیتلی میں سے گرم پانی مٹی کے برتن میں ڈالا اور رونیلڈ کو ایک صاف ستھری تولیہ تھما دی۔ اور اس لمحہ اس کی نظر تیج کے زخمی ہاتھ پر پڑی۔

"تیج" وہ چیخ پڑی۔ "یہ تم نے کیا کر لیا؟"

"میں نے اپنے ہاتھ کو کاٹ لیا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن اب میں نے تو دیکھا نہیں۔"

"میرے خیال سے یہ اس وقت ہوا جب رونیلڈ نے آکر کہا کہ بیہوش کرنے کی دوا نہیں ملی۔ میں کلوروفارم پہنچانے گئے بیٹھا تھا۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

اس نے تیج کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے نہایت نزاکت سے سنبھال کر بیٹھی۔ "لیکن یہ تو بڑا کاری گھاؤ ہے"

اس نے متحیر ہو کر کہا "یہ بہت گہرا زخم ہے۔ تمھیں چاہئے تھا کہ وہیں رک جاتے اور اپنا ہاتھ کسی چیز میں ڈبو لیتے۔"

"میں ایک سیکنڈ بھی نہیں رک سکتا تھا" اس نے جواب دیا۔ "مجھے اس شخص کو زندہ رکھنا تھا" ان دونوں میں ایک دوسرے کے لئے جو گہری محبت تھی اسے دیکھ کر رونیلڈ کو رشک ہوا۔ تیج نے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا مگر اس کی آنکھیں جو لاں لی کو گھور رہی تھیں، محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ اور لاں لی اپنی آنکھیں اوپر کئے ہوئے پرشوق انداز میں تیج کو دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا
مجھے تمہاری قابلیت سے اس کے بغیر رہنا ہوگا۔
رونیلڈ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ہٹا لیا اور اس کا شانہ تھپتھپا کر
اور اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔
"میرا خیال نہ کرو"
"تمہیں ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے کہ ہم دونوں
الگ ہو گئے" اور اس کی آنکھ تیج پر ٹک گئی۔
"بیٹھ جاؤ" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "رونیلڈ تم یہاں پہلو میں بیٹھو
بیٹھو میں اسٹول کے قریب بیٹھوں گی۔ اور دیکھو جب تک ہم کھا رہے تھے ہم
تم سیاسی باتیں مت کرنا" ... "وہ تیج کے ساتھ
رونیلڈ کے واسطے"
"اور آپ لاما تھا انہیں" رونیلڈ نے کہا۔
لاں لی نے منہ بنایا۔ "مجھے لاماؤں سے نفرت ہے" اس نے گویا طے کرتے ہوئے
کہا: "ہاں مجھے لاماؤں سے سخت نفرت ہے۔"
"عجیب لڑکی ہو" رونیلڈ نے مسکراتے ہوئے کہا
"کھانا کھاؤ" اس نے حکم دیا: "کھانے میں جتے رہو۔ بکواس نہ کرو۔ کھانا
ٹھنڈا ہو رہا ہے"
لیکن تیج نے چینی کا چمچ اٹھایا اور اس کے پیالے میں جو شوربا تھا اس میں
سے تھوڑا سا حصہ لیا اور لاں لی کے ہونٹوں تک لے گیا۔ "میں تمہیں حکم
دیتا ہوں" اس نے سختی سے کہا
اس نے اپنے سرخ لبوں کو بھینچا۔ پھر یکایک کھولا اور شوربا نگل گئی۔ اور
بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا
یہاں بمباری کی کئی ہوئی اس عمارت کے خالی کمرہ میں بیٹھ کر رونیلڈ کو بڑی
زندگی اور تازگی محسوس ہوئی۔ دیواروں پر جو بمباری ہوئی تھی اس کے باعث
کھڑکیوں کے کواڑ دیواروں سے الگ ہو گئے تھے اور وہ تینوں صاف دھوپ
میں بیٹھے ہوئے تھے جو سوراخوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی رونیلڈ تھوڑی
دیر کے لیے خود بخود چلنے والی مشین بن گیا تھا اور ان برباد مقاموں میں سنسان
سڑکوں پر سے اپنی ننھی ٹرک کو دھکیلتے چلا جا رہا تھا۔
"مجھے بھوک لگی ہے" اس نے کہا
"اور یہی میرا خیال ہے" لاں لی نے کہا
مگر تیج جو کہ سادھوؤں کے سے خواص رکھتا تھا مسکراتا رہا اس نے بھوک

کی شدت تو ہو ... پہلے ہی ... وہ اس کے ... رستے میں سب ...
تو ... قبول کر لیا۔ وہ سب ... تھے ... رونیلڈ کے ان ... اس
موقع پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دو ... ہم ... اس ...
زندگی میں ایک ... کرنے کے ... رونیلڈ کو ... سب ... ہوا کہ وہ اور
تیج دونوں اس ... سے محبت کرتے ہیں
لیکن تیج اپنی زندگی ... موت سے ... نہ کر سکا اور موت اس کے
انتہائی قریب ... رہ گئی
"اس کا مطلب یہ ہوا" اس نے کھانا کھاتے ہوئے رونیلڈ سے پوچھا کہ
"تمہارے دشمن کی صورت سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت سپہ سالار
کی گرفت سے نکلنے کے میرے ... پیلس سے ہے۔"
رونیلڈ نے اس بات پر غور کیا "ممکن ہے" اس نے جواب دیا۔
"تمہارے آنے سے پہلے پیلس میں بہت دوائیں تھیں۔" تیج نے کہنا
شروع کیا۔ "یہ صحیح ہے کہ چوری چھپے دوائیں نکال لینا سہل نہیں لیکن ایسا ممکن
ضرور تھا۔ دشمن کو تو رشوت دے کر بھی پیچھا چھڑا لیا جا سکتا تھا اور پھر یہاں
ایک اور سہولت یہ بھی ہے کہ پیلے پہاڑی لوگ تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔
بس تم صرف ان سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔"
"ہاں" رونیلڈ نے متشبہ لہجے میں کہا یکایک وہ اس خیال سے کانپ
گیا کہ اب اسے اس فردوس کی جنت چھوڑ کر اس قسم کے سفر پر جانا پڑے گا اور اگر
ایسا ہوا تو وہ اس کے لیے ناقابل اعتبار طور پر مشکل ہوگا اور خطرناک بھی
ثابت ہوگا۔ لاں لی نے اپنے چاپ اسٹک رکھ دیے اور دونوں کے چہروں
کی طرف دیکھنے لگی۔ "تیج تم رونیلڈ کو اس قدر غیر سنجیدہ لہجہ میں زندگی بسر کرنے
کو کہہ رہے ہو۔" اس نے اب کہا
"کوئی بات نہیں۔" رونیلڈ نے مداخلت کی۔ اپنی موجودہ زندگی کے بارے
میں جھوٹ بولنا اب سیکھ لیا تھا۔ "ہر وقت کوئی نہ کوئی ملازم میری خدمت
کو تیار رہتا ہے۔" اس نے اپنی ماں کو خط میں لکھا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ
لاں لی ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اگر وہ کسی چینی گاؤں
میں اچانک مر جائے یا کسی پہاڑی راستے پر اسے کوئی گولی مار دے تو اس
کی اہمیت نہیں۔ وہ تو درحقیقت اس کے تمام نرسیوں کا اختتام ہوگا جو ...
سے متعلق ہوں گے۔
تیج کی اور اس آنکھیں اور گڑ گئیں: "رونیلڈ کو یہ معلوم ہے کہ میں اس سے
وہی کام کرنے کو کہتا ہوں جو کرنے کے لیے میں خود بھی تیار ہوں۔" اس نے

جواب دیا۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کو نرمی سے سہلاتے ہوئے اٹھا۔

"مجھے اب جانا ہے" اس نے کہا "۔ سات آدمیوں کا آج رات آپریشن کرنا ہے"

"اور تمہارا ہاتھ" رونیلڈ نے دریافت کیا۔

"اس کا چنداں خیال نہ کرو" تیج نے جواب دیا

لالی میز سے رکابیاں اٹھانے کے لیے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک تانبے کی کیتلی کے گرم پانی سے انہیں دھو دیا۔ اور مٹی کے چولہے کے کنارے سوکھنے رکھ دیا۔

جب تیج کمرے سے باہر گیا تو وہ بھی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے ساتھ صحن تک گئی۔ صحن اب زخمی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب کے سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں اس طرح گھور رہے تھے دیکھ کر وہ ایک سمجھدار چینی بیوی کی طرح اپنے شوہر کے احترام کے لئے اس کے پیچھے چلنے لگی۔ رونیلڈ نے جو تیج کی دوسری جانب چل رہا تھا اس کی طرف دیکھا اور اس نے شرارتاً ہاتھ ہلا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ تیج گھوما وہ فوراً اسے رخصتی سلام کر کے مسکرایا اور لالی کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ آپریشن کے کمرہ کے دروازے سے رونیلڈ نے دیکھا کہ تیج نے جونہی اپنا کام شروع کیا اس کے چہرہ پر دبی دبی کشیدگی سی آگئی اور رونیلڈ نے ایک لمحہ کے لئے جائزہ لیا کہ کیا میں نے وہ سب کام خلوص سے انجام دیا جو کہ میں پورے کے ساتھ دے سکتا تھا۔

لیکن تو جیسے سخت بوڑھے کو جتانا کس کے بس کی بات تھی جب اس نے اس سے کہا تھا کہ سینکڑوں سپاہی بغیر ہمدرد خادم کے آپریشن کروانے پر مجبور ہیں تو وہ سپہ سالار بجائے متاثر ہونے کے خلا میں دیکھتا رہا اور اپنے چاندی کے خلال سے دانت کریدنے لگا۔ کسی کے مصائب کی اسے قطعی پروا نہ تھی۔ خصوصاً نوجوان لوگوں سے اس کو کسی قسم کا لگاؤ کبھی نہ تھا کیونکہ وہ ان سب کو نہیں تو ان میں سے اکثر کو سرکش سمجھتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ یہ لوگ اس وقت جاپانیوں سے جنگ کر رہے تھے لیکن وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہی لوگ مجھ جیسے سپہ سالاروں سے جنگ کریں گے اس لئے ان میں سے جتنے بھی آج لڑتے لڑتے کام آجائیں تو کل اس کے حق میں اچھا ہی ہوگا۔

"میرے پاس بحث کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے" اس نے بلند آواز میں دانت چوستے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے اور بھی بہت سے اہم کام انجام دینے ہیں"

رونیلڈ نے یہ سب کچھ سوچ کر آہ بھری اور [illegible] افسوس ہے"۔ اس نے کہا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

یکایک لالی اور تیج کے چلے جانے کے بعد اسے کچھ تنہائی محسوس ہوئی۔ گذشتہ سال سے تین دن اور راتیں اس کو ٹرک چلاتے گذر چکی تھیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالے اور آہستہ آہستہ کچی سڑک پر نکل گیا۔ وہاں اس کا ٹرک سڑک پر تھی جو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے انجن کھٹکھٹایا اور پھر کراہتا ہوا بیٹھا۔ ٹرک اس قدر ناقص تھا کہ انجن اسٹارٹ ہوا ٹرک چلنے لگتی تھی اور اسے ہر مرتبہ دوڑ کر اس کو پکڑنا پڑتا تھا۔

اس سنسان سڑک پر وہ ٹرک کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلا کر ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف لے گیا جو چند سڑکوں کے بعد کچھ فاصلہ پر واقع تھی یہاں وہ اور فائی اپنی پھیریوں کے درمیان قیام کرتے تھے مگر اسے اب یہ علم نہ تھا کہ وہ جھونپڑی موجود بھی ہے یا نہیں اس نے بریک دبائے اور ٹرک چوں چوں کی آواز کے ساتھ رک گیا۔ اس نے سفید رنگ کے سوتی پردے کو جو دروازے پر پڑا ہوا تھا اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا یہ کمرہ خالی تھا وہاں صرف ایک بستر بچھا اور دو اسٹول رکھے ہوئے تھے فائی جو اس کا معاون تھا چٹائی پر گٹھڑی بنا ہوا پڑا خراٹے لے رہا تھا وہ شاید کچھ دیر پہلے ہی وہاں آیا تھا۔ مگر اس کی ٹرک کا کہیں پتہ نہ تھا رونیلڈ کے داخلہ پر فائی چونک اٹھا وہ جمائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

تمہارا ٹرک کہاں ہے رونیلڈ نے پوچھا

پچھلے قصبہ میں جو لوہار ہے جب ہم اس سے گذرے تو اس کو دے آیا تھا وہ دو دن کے بعد دے گا فائی نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے خمار آلود تھیں۔ میں نے پیدل کھیتوں کو پار کیا اور ایک گھنٹہ ہوا یہاں پہنچا ہوں۔

فائی پھر اپنی چٹائی پر لیٹ گیا اور رونیلڈ نے اپنے جوتے کے تسمے کھولے اور دو اسٹول کے درمیان گھسا ڈال کر لیٹ رہا اس کا تمام بدن درد کر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کی خشک ہواؤں نے اس کے لئے شراب کا کام کیا یہاں تک کہ وہ بیمار نظر آنے لگا۔ آج رات اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ اس لئے کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو چکا تھا۔

اسے فائی نے جگا دیا جس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس نے

[illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible] فوراً [illegible] پاس ہے فاں نے کہا۔ وہ اپنے گھر
گیا اور [illegible] تلاش کرنے لگا۔ اس نے جلدی سے جوتے پہنے۔

"[illegible] جلدی چلو" اس نے غور کیا۔

وہ [illegible] دروازے سے نکل گیا۔ وہ گلی [illegible] سے سوچتا ہوا
رہا [illegible] کے راستے صاف کر رہا تھا [illegible]
[illegible] سے جا رہا ہو۔

[illegible] پہاڑ [illegible] میں [illegible] نہیں معلوم ہو۔ [illegible] خوابوں
کی طرح [illegible] اس نے [illegible] دیکھا [illegible] بس [illegible] سپتال
[illegible] رہا تھا۔

وہ وہاں پہنچ گیا۔ لاؤ لی کی انگلی سے دیکھتے ہی [illegible] پوچھا کہ
[illegible] اس نے کہا تیج ابھی ابھی سو رہا ہے تم کہاں تھے۔

سو رہا تھا۔ تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہیں بتایا۔ اس نے کب بلایا تھا
[illegible] گھنٹوں گزر گئے جب بھی تھا اور اسے سب
بتلا رہا تھا۔

"معاش" اس نے کہا۔ اس نے مجھے نہیں اٹھایا۔

"اچھا" اس نے کہا کہ تم دوسرے گاؤں گئے ہو اور صبح تک واپس
نہ ہو سکے گی۔

تم ٹھہرو میں اسے دیکھ لوں۔ مگر تیج کیسا ہے۔ رونیلڈ نے کہا۔

"اس کا ہاتھ" اس نے خود ہی اپنے ہاتھ کا آپریشن کر لیا اس سے اسکو
بہت تکلیف ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا بخار بڑھ رہا ہے۔ مگر وہ ٹھہر کر لیٹنے
نہیں دیتا اور ابھی لن تان نے پیغام بھیجا ہے کہ دشمن کا دستہ جنوب کی طرف
سے حملہ کر رہا ہے تب ہی فاں نے مجھے بلایا ہے۔ میں نے سوچا "تمہیں لن تان
کی بات کا تو خیال کرنا ہی چاہیے تھا۔ رونیلڈ نے غصہ سے کہا۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ تیج کے سونے کے کمرہ میں گیا۔ وہ تیج کی شادی
کے بعد سے اس میں جاتا ہوا شرماتا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ ساتھ ساتھ رہتے
تھے۔ اس نے کھڑکی میں سر ڈالا اور اندر داخل ہو گیا۔

تیج بستر پر تھا۔

یہ پلنگ لاؤ لی کے پلنگ جیسا تھا لاؤ لی نے پلنگ کے لئے ایک
چارستہ [illegible] تھی [illegible] ہوئی تھی۔ تیج کے [illegible] پاس فرش پر ایک آتش دان
[illegible] جب [illegible] بیٹھا ہوا تھا اس کے گرد [illegible]
[illegible] رونیلڈ نے اس کو [illegible] لیکن [illegible]
جواب [illegible] اور اس کی جگہ [illegible] اب جب رونیلڈ بستر پر بیٹھنے لگا
تو [illegible] آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔

تیج آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کا سر ایک تکیہ پر تھا اس
کا زخمی ہاتھ پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اور اس کی بغل میں رکھا تھا
رونیلڈ نے دیکھا کہ اس کا خوبصورت چہرہ بخار سے تمتما رہا ہے۔
[illegible] اور [illegible] ہو گئے ہیں۔ رونیلڈ نے اس کے
ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آگ پر رکھ دیا
ہو۔ تیج نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھا۔

رونیلڈ۔ اس نے [illegible] سے پکارا۔

تیج تم کیسے ہو رونیلڈ نے آہستہ سے پوچھا۔

ٹھیک نہیں ہوں رونیلڈ اس نے [illegible] آواز سے کہا۔

تیج کی پلکیں رفتہ رفتہ بند ہو گئیں اس نے بیہوشی میں کہنا شروع
کیا۔ لن تان [illegible] لن تان کہتا ہے وہ بڑھ رہے ہیں دشمن۔ تیار ہو جاؤ
ہماری طرف آ رہے ہیں۔ تیاری کرو۔

رونیلڈ اس انداز سے خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے کہا تیج میں وعدہ
کرتا ہوں۔

مگر تیج اس کا جواب نہ دے سکا وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

لاؤ لی نے بہت سختی سے کہا رونیلڈ تم جانتے ہو یہ کتنا بیمار ہے۔

ہاں رونیلڈ نے کہا یہ بہت بیمار ہے اسے سلفا ملنا چاہیئے۔

اور ہمارے پاس سلفا نہیں آؤ دیکھو تو اگر تمہیں یقین نہ ہو۔ ہمارے
پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے رونیلڈ۔

اس نے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کو اسٹور روم میں لے گئی تمام
شیلف خالی پڑی تھیں کچھ بوتلیں سینے کے لئے دو کوٹن کے بکس اور
کچھ خالی کیسوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تیج کے لئے وہاں کچھ نہ تھا۔

اور رونیلڈ، اس نے اس کا بازو پکڑ کر لیا اور وہ خاموشی سے ان
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو تیج سے محبت کرتے تھے۔

اگر میں پیکنگ بھی گیا تو میں اسے بچانے کے لئے وقت پر نہیں پہنچ سکتا
ہاتھوں نے اس کے بازو کو چھوڑ دیا وہ خوش تھا اس لئے کہ اس خیال

کی دنیا سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا جس میں اس نے لاں لی کو تنہا اور بے بس بھٹکنے ہمیشہ پایا تھا۔ اس نے زور دے کر کہا لیکن میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا اور جتنی جلدی ہو سکے گا آنے کی کوشش کروں گا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور رک رک کر کہا اگر ایسا ہے تو تم رک جاؤ اور اسے زندہ رکھنے میں میری مدد کرو۔

وہ کمرہ سے تیزی سے نکل گئی۔ اس کے قدم تیزی سے تیج کے کمرہ کی طرف بڑھنے لگے وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا

لاں لی تیج پر جھکی ہوئی اس کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کبڑا خاموشی سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

جب رونیلڈ داخل ہوا تو لاں لی اس سے مخاطب ہوئی: تم ڈاکٹر ہو کیا تم اسے راز رکھ سکتے ہو کیا دنیا بھر کے لالچ تمھیں ثابت قدم رکھ سکیں گے لیکن یہ کہتے کہتے اس کی آواز تیز ہو گئی۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے، تمھیں اس کی امداد کرنی چاہیے۔

رونیلڈ اسے گھورتا رہا۔

تم اس کے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتے، اس نے پھر دہرایا۔ تم دواؤں کے علاوہ بھی سب کچھ کر سکتے ہو تم ڈاکٹر ہو۔

کچھ سیکنڈ وہ اسے گھورتے رہے جیسے اسے سب کچھ پتہ چل گیا ہو سب کچھ۔ جیسے وہ اس راز سے آگاہ ہو چکا ہو۔ اسے خود اعتمادی حاصل ہو گئی۔ وہ اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکی ہے۔

میں انتہائی کوشش کروں گا اس نے خاموشی سے کہا اور اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

جتنا پانی تم کیتلی میں گرم کر سکتی ہو کرو۔ بھگو بھگو کر پٹیاں مجھے دیتی رہو۔ اور کسی کو مدد کرنے کے لیے پکار لو۔ اس نے لاں لی سے کہا۔

وہ چپکے سے کمرہ سے نکل گئی اور تیز قدموں سے تیج کے کمرہ میں پہنچی۔ تیج کا بازو چھوڑا۔ اس کا بازو ڈنڈے سے جکڑا ہوا تھا اور پورا بازو خون سے تر تھا اس نے دھیرے سے پٹیاں کھولنی شروع کیں لیکن جیسے ہی اس نے شانے کی پٹی کھولی تیج بیہوشی میں چلایا۔

کمرے کے کونے میں کبڑے نے زور سے آہ کھینچی اور رونیلڈ آواز سن کر چونکا۔ جیسے اسے بڈھے کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ پھر اس نے اپنے مریض کو دیکھنا شروع کیا۔ اسے اس کو دیکھتے ہوئے ایک قسم کی تکلیف سی محسوس ہوئی اس نے ایک عرصہ سے کسی مریض کو نہیں چھوا تھا۔ مگر وہ اپنے کام کا ماہر تھا اس نے بڑی مہارت اور خود اعتمادی کے ساتھ کام کو شروع کیا۔ بازو اب ننگا تھا مگر اسے اس تکلیف کا احساس تھا جس سے تیج گذر رہا تھا۔ تیج ابھی تک بیہوش تھا اور اس کی بیہوشی تکلیف کی حد تک بڑھ چکی تھی۔

رونیلڈ نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ لاں لی اور خانساماں گرم پانی کا پتیلا لا رہے تھے اس نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

خوش قسمتی سے مل گیا وہ لوگ کھانا پکا رہے تھے میں نے ان سے مانگ لیا۔ یہ پٹیاں ہیں میں انھیں تم کو دیتی رہوں گی پانی خوب کھول رہا ہے۔

اس نے جلدی جلدی پٹی پھاڑی اور جیسے ہی اس کی نظر تیج کے بازو پر پڑی بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ مگر اس نے آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔

آؤ جلدی کرو رونیلڈ جلدی' وہ چلائی۔

اس وقت صبح صادق کا وقت تھا جب وہ اپنے کام سے نمٹے۔ خانساماں بھر بھر کر گرم پانی کی بالٹیاں لاتا رہا اور پتیلے کو بھرتا رہا۔ لاں لی اور رونیلڈ کے ہاتھ برابر کام کرتے رہے۔ مگر تیج کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اب دیر ہو چکی ہے لیکن انھوں نے اپنا کام جاری رکھا

چار بجے کے قریب تیج نے آنکھیں کھولیں اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ رونیلڈ تم اپنا وقت بیکار کر رہے ہو اب دیر ہو چکی ہے۔

ایسی بات نہ کہو دوست تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔

لاں لی یہ کام کرے گی رونیلڈ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دواؤں کا استعمال کرو گے۔ تیج آہستہ سے بولا مگر یکایک وہ اٹھ بیٹھا اور رونیلڈ چلانے لگا۔ میں کہتا ہوں دشمن یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں تم آگے بڑھو۔ یہاں ہزاروں آدمی زخمی پڑے ہیں مجھے چھوڑ دو۔ ایک کے مرنے سے کام بند نہیں ہو سکتا۔

لاں لی خوف سے کانپنے لگی۔ تیج میرے تیج۔

فرش پر سے کبڑا بولا۔ خدا رحم کرے۔ تمھیں جانا ہی پڑے گا رونیلڈ۔

تیج نے بڑی مشکل سے کہا سب کچھ تم پر ہی منحصر ہے۔

رونیلڈ بستر سے اٹھ گیا اور کہنے لگا اچھا تیج میں جاتا ہوں۔

تم وعدہ کرو۔ تیج نے کہا۔ اس کی آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں۔

میں وعدہ کرتا ہوں رونیلڈ نے آہستہ سے کہا اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

رونیلڈ جب دوبارہ وادی آیا تو اپنے ٹرک میں بیٹھ کر سیٹنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے اس کا یقین تھا کہ شیخ مر چکا ہو گا۔ اسے اس خیال سے بڑی تکلیف ملتی۔ اسے اس کا افسوس تھا کہ اسے پہلے سے خبر لیتی۔ ورنہ شاید وہ کچھ کر سکتا۔ مگر اب تو صرف یہی تھا کہ وہ اپنے دوست کو قرض سے نجات دے سکتی۔ پھر اس نے کہا اگر وہ شیخ بھی ہوتا تو وہ کیا کام کرتا۔ وہ سچ تھا۔ اس کی سمجھ میں آگئی اس کے تصور میں اس ایک مکان کی جو شیخ نے بنایا تھا کہ اس کی سمجھ کا تھا کہ وہ شیخ کی یاد میں زندگی گزار دے گی اور اس نے کام کو پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے لئے اب شیخ کے کام کے علاوہ کسی میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

اس نے اپنی طرف دیکھا وہ شیخ کے کپڑوں میں تھا۔ اس نے فانی سے جب اس کے بارے میں کہا تو اس نے اپنی اسی زندہ دلی سے مسکرا کر جواب دیا کیونکہ یہاں آج کل شیطان کی حکومت ہے وہ کسی سفید آدمی کو پسند نہیں کرتے اور تمہیں بھی مار دیں گے۔

رونیلڈ نے اس پر اپنے کندھے جھٹکے اور فانی حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

تمہارا قد بھی تو ہمارے جیسا ہے اس لئے تم اس کے کپڑے بدل لو اس کے بکس میں ہندوستانی کپڑے ہیں وہی کپڑے جنہیں پہن کر وہ یہاں آیا تھا۔ میں انہیں ڈھونڈ لوں گا۔ میں ایک مرہم بھی لے آؤں گا جو تمہاری کھال کو کالا کر دے۔ اور تمہیں ہم ایک ہندوستانی سمجھ اگر کہہ سکیں گے۔ شیطان ہندوستانی کو نہیں مارتے وہ انہیں اپنا دوست جانتے ہیں۔ وہ تمہیں شہر میں بھی داخل ہونے دیں گے۔

رونیلڈ نے ٹرک میں پیٹرول ڈلوایا اور ریڈیو ٹھیک کیا اتنے میں فانی شیخ کے کپڑے لے آیا۔ اس لباس نے اس پر بھاری ذمہ داری سونپ دی تھی اور وہ خود اعتمادی جو اس کے اندر ایک عرصے سے پیدا نہ ہو سکی تھی اچانک پیدا ہو گئی اور وہ سوچنے لگا کہ میں یہ کام خوب کر سکتا ہوں اور اسے خود اپنی اس بات پر تعجب ہوا۔

فانی ٹرک چلا رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا اور ٹرک جھٹکے کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ فانی دیکھو ہم کو بہت دور جانا ہے

کچھ پروا نہیں۔ فانی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ٹرک میرا پرانا ساتھی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ ٹرک جانتا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے چلنے سے پہلے اس سے کہہ دیا تھا۔ اگر کوئی بات ہوئی تو دوسرے لوگ بھی ہماری مدد کو آجائیں گے

یہ کہہ کر وہ نہیں بولا جب تک اس نے ... لوگ ہیں آدمی پیچھے ہوئے اور ... ایک ساتھ ... کے کنارے پر ایک مکان کا کونہ تھا۔ اس کا ذکر ... زندگی کے آخر تک نہیں تھے۔

لیکن ... ایک ... گاڑی پاس آ کر ... ایک ... دوسری چیز نظر آئی۔ اور ... پاس ... آ...

خدا کی زمین ... کے لئے

خدا کی زمین ... جب

آدھی رات ہو گئی ہو گی ... رونیلڈ ... اس وقت دو بجے ہوں گے۔ دیکھا ایک دو سائے ٹرک کے سامنے آ کر بڑھے۔

ٹرک چلاؤ وہ چلائے۔ اور فانی نے ... اور ایک جھٹکے کے ساتھ ٹرک رک گیا

تم کہاں جاتے ہو؟ وہ آدمی چیخا۔ ہم تم کو بتا کر ... سے ... ہو۔ اچھا تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

فانی ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ تم یہ بھول گئے ہو کہ دنیا کے سب آدمی ایک ہی خاندان سے ہیں اور سب بھائی ہیں اس نے کہا۔

وہ آدمی دانت پیسنے لگا۔ ... اور ... اس ... بیٹھ جاؤ جلدی چلو

لیکن ٹرک کا کیا ہو گا فانی ... سے بولا۔ بہت قیمتی چیز ہے اسے نہیں چھوڑ دو۔ دوسرے نے کہا ہم اسے تمہیں واپس کر دیں گے جب تم واپس آؤ گے وہ چلا یا اور کھجور کے درخت کے پیچھے سے ایک ... آگے بڑھی وہ اس میں سوار ہو گئے۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف فضا میں خاموشی تو خاموشی تھی۔ وہ پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ آگے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ لوگ بھی بہت خاموش تھے اور اس خاموشی کو توڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب فانی بولا تو انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ دوسری مرتبہ جب رونیلڈ کو کھانسی کا دورہ ہوا تو وہ اس پر چلانے لگے۔

جب وہ لوگ رکے تو قریب قریب صبح ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ مشرق کی طرف چار میل اور چلنا ہے تم ایک ویران مندر پر پہنچو گے۔ جلدی چلو کیونکہ تم دشمنوں کے احاطے میں ہو۔ تم آج رات وہاں

پچھوڑے یہاں کا پاس ہو رہا ہے بھائی

میں نے بھی لیا اور اگروں روینلڈ نے پوچھا اور جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔
انھوں نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔ ہم سب جانتے ہیں اس نے کہا اور
جدھر سے آئے تھے ادھر روانہ ہو گئے۔

دو روز کے بعد فالی اور روینلڈ پینگ کے قریب دکھائی دیتے تھے۔ وہ
بس میں سوار ہو گئے۔ بس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ تیز رو بارش کی وجہ سے
بارش سے سڑک پر کیچڑ بھر رہا تھا۔ بس بھری ہوئی تھی اور ہر مسافر کچھ نہ کچھ
کھا رہا تھا۔ ان کی باتوں اور ہنسی سے بس میں شور ہو رہا تھا۔

روینلڈ کے پاس اپنے سامان کا ایک بنڈل تھا اس میں لباس تھا جس
کے کپڑے بالکل ویسے ہی تھے جیسے وہ پہنے ہوئے تھا تاکہ اگر اس کی تلاشی
ہو تو وہ پکڑا نہ جا سکے فالی اس سے زیادہ چالاک تھا کیونکہ وہ تیج کے بکس
میں سے بہت سے فاسٹو کپڑے رکھ لایا تھا ان میں ایک چیز ایسی تھی
جس میں کچھ سکے تھے۔ اس کا برتن تھا ایک مسافر تھا ہر چیز دشمن کو سونے کی سمجھ
کر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس نے جوتے کے بائیں تلے میں ایک ہزار پونڈ کے امریکن
کرنسی کے نوٹ رکھے تھے تاکہ وہ اس سے دوائیں خرید سکے امریکن روپیہ چین
میں کم تھا لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کر لیا تھا۔ وہ
ایک پیر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر دکھنے لگے تھے کیونکہ وہ میلوں پیدل چل
کر یہاں پہنچے تھے۔ اس کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک
گئی اور شہر کا دروازہ ان کے سامنے تھا

نیچے اتر جاؤ ڈرائیور نے چلا کر کہا وہ ایک نوجوان فوجی تھا جس
کا بایاں ہاتھ بیکار ہو چکا تھا وہ اتر پڑے جاپانی سپاہی انھیں گھورنے
لگے

روینلڈ نے کہا ہم لائن کے درمیان میں رہیں گے تاکہ سپاہی جلدی جلدی
دیکھ کر چھوڑ دیں وہ اس کام سے اس وقت تک تھک چکے ہیں گے اور جلد
سے جلد چھٹکارا پانا چاہیں گے۔ تم بہت زیادہ چالاک ہو فالی نے کہا
یہ پینگ تھا اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا بہت کچھ پڑھا
تھا اور اب وہ خود اس کے دروازہ پر موجود تھا آسمان گہرا نیلا تھا لیکن
دروازہ کا رنگ آسمان سے زیادہ گہرا تھا دروازہ پر چاروں طرف بیلیں
پھیلی ہوئی تھیں۔ آدمی اس دروازہ سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے وہ ایک
مفتوحہ شہر کے شہری تھے۔ وہ سب یہاں ایک کھیل کھیل رہے تھے سب اپنے
اپنے حصہ کا کام تیزی سے کر رہے تھے اور وہ بھی ایک پرزہ تھا وہ بھی اپنے
حصہ کا کام کر رہا تھا وہ اپنی آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کو چھپانے کے لئے
مجبور تھا۔ سورج نکلنے لگے وہ اپنے جیب میں نے کی طرف سے فالی پر نظر
نظر آنے لگے وہ محافظ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں لباس کا
بنڈل تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس کے دل میں ایک شبہ
جاگزین ہوا۔ کیا یہ مجھ پر شبہ کریں گے

فالی اس وقت بالکل اس کے پیچھے تھا وہ بہت دور کھڑا تھا۔ بات
گیا ہیں دکھ گیا۔ پانچ منٹ تمام روپیہ چلا گیا اس نے اپنی کمر پر جو پٹی بندھی
تھی اس کو پھاڑ ڈالا اور سپاہی کو تلاش کرنے لگا جیسے اس میں سے کچھ نکل
آئے گا اور ایک لڑکی دیر کئے ہوئے وہ اس کسان پر گری۔ فرانسیسی اس کے
پیچھے تھا اور اس پر برس پڑا۔ میرا روپیہ دو۔ تم نے یہاں جو میرا مال
لیا ہے دو۔

گارڈ فالی پر جھپٹے اور اس کے روکا۔ ہالا دیتے ہوا تھک کر وہ ڈھیر
ہو گیا۔ اس کسان نے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا کہ اس کے پاس
سوائے خود اپنے ڈالروں کے کچھ نہیں ہے

سات! میں نہیں جانتا ہوں جب تم چلے تھے تو تمھارے پاس
صرف دو ڈالر تھے وہ میرے پاس آئے تھے۔ یہ میرے ہیں اس جھگڑے میں ان
محافظوں نے جلدی جلدی آدمیوں کو جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ اور وہ
سات ڈالر فالی اور اس کسان کے درمیان بانٹ دیے گئے اور اس
کے بعد ہر ایک سے ایک ڈالر اپنے انعام کے طور پر وصول کیا۔ اس درمیان
میں سب دروازہ سے گذر چکے تھے وہ ان محافظوں سے بہت دور نکل آئے
کسان ابھی تک فالی سے ناراض تھا وہ فالی سے انصاف کی بھیک مانگنے
ہی والا تھا جب فالی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ روپے نکال کر
اس بھولے بھالے آدمی کے حوالے کر دیے۔

کسان حیران تھا وہ ایک لمحہ تک کبھی روپیہ کو اور کبھی اس آدمی کو
دیکھ رہا تھا جس نے اتنے لڑ کر اس سے روپیہ وصول کیا تھا اور پھر
آسانی سے اسے واپس کر دیا۔

اس میں بھی ایک بات تھی فالی نے اسے مطمئن کرنا چاہا اور اس نے
جلدی سے روپیہ اس کی جیب میں رکھ دیا کہ کہیں کوئی اور نہ دیکھ لے

روینلڈ آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور دل ہی دل میں اسے اس ترکیب
پر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر فالی سے کہا ہمیں کسی ہوٹل میں چلنا چاہیئے
تم میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گے اور میری دیکھ بھال کرنا

تھا وہ بچ گیا۔ اس طرح کام آسانی سے ہو جاتا گو کہ اگر یہ ایک اجنبی ملک میں تھا اس کی حیثیت سے داخل ہوں گا۔ اگر تم دیکھتے ہو پناہ گاہ
یہ جگہ محفوظ ہے تو ہم بالکل محفوظ رہیں گے۔

بڑا وہ اچانک آدمی تھا۔ جس کا اپنا بیٹا ہوں وہ لی
سمت کو سفر کر گیا۔

وہ بیٹھے سوچا، وقت آدمی سے کیا کیا کرتا ہے۔ [illegible] زندگی
جس کے لئے بسر کرتی ہے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کے
سامنے وہ تمام لوگ تھے جنہیں اس کی ضرورت تھی۔ اس کے سامنے اس کا
مشن تھا۔ دشمن کا احساس تھا۔ جو اس زمین کے چپے چپے پر موجود تھے۔
[illegible] باشاں کی بیدا۔ [illegible] اس نے دشمن کے شمال سے حملہ کی
[illegible] اس سے پہلے بچا۔ سب کچھ کرتا تھا۔ خال نے اسے ایک نقشہ دیا
تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن وہاں پہنچنے کے لئے کم سے کم جو وقت لگیں گے اور
اس کو سب کام اس سے پہلے کرنا تھا۔

اس نے سوچا کہ اس کے بعد خراب کرنے کے لئے بالکل وقت نہیں کہ
وہ کام کی اہمیت سے اور اس کے فرض نے اس کو کوئی تقویت بخشی۔ اس کا
احساس شکست خوردگی اس سے دور ہٹنے لگا اور اسے ایک بہت محسوس
ہوئی۔

جنگ نے پوری دنیا کو اب اسٹیج بنا دیا تھا۔ اس اسٹیج پر آدمی مردہ دل
ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے گذرتے ہوئے دیکھنا شروع
کیا تو اسے ہر ایک کے چہرے پر ایک سے جذبات نظر آئے۔ ہر آدمی اس کی
طرح سے خوفزدہ تھا جیسے مرد اور عورتیں بازاروں سے اس طرح گذر رہے تھے
جیسے وہ ہمیشہ سے ہی جاپانیوں کی غلامی رہتے آئے ہوں مگر وہ یہ بھی جانتا تھا
کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ جب تک کوئی اس کھیل میں بازی نہ ہار جائے
اس نے سوچا اگر زندگی رہی تو پھر جب یہ اپنی حقیقی زندگی شروع کریں گے
تب پھر ان سے ملوں گا۔ اسی طرح کے کچھ اور چینی تھے اور اس کے علاوہ
باقی سب جاپانی تھے وہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں کے کلرک سے کسی خالی کمرہ
کے بارے میں پوچھا۔ کلرک نے جو صورت سے مغرور دکھائی دیتا تھا بغیر
اس کی طرف دیکھے ہوئے رجسٹر دیکھنا شروع کیا۔ ایک دبلے پتلے چینی لڑکے
نے اس کا سامان اس سے لے لیا۔ وہ دونوں افیون کھانے والے تھے زیادہ تر
چینی جو اس برآمدہ میں تھے۔ افیون کے عادی معلوم ہوتے تھے اس کے
برخلاف جاپانی چست و چالاک نظر آتے تھے افیون ان کا سب سے

[illegible] تھا جس کو [illegible] پیدا کرنا ہو، کہ یہ چینی لوگ جب
[illegible] سب کیوں۔

جب وہ ہوٹل سے دو میل پیچھے تو [illegible] انہیں یہ یہاں معلوم ہوا پہنچنا
سا کر وہ بیٹھ گئے تھے۔ تمہاری جیب خالی ہو تو اب بالکل شکستہ ہو چکا تھا بستی
کی آبادی بہت گھنی ہوئی تھی۔ [illegible] ہوئی تھی۔ [illegible] معلوم ہوتا
تھا جیسے اس کے جانے کا ان کے لیے [illegible] اس کے رد میں جگہ جگہ خالی
[illegible] موجود تھے

اس نے کہا۔ سنا ہے جاپانیوں کی قوت شاید بہت تیز ہوتی ہے۔ دو
[illegible] سوچ لیتے ہیں۔ چلو جلدی یہ جگہ ہم باہر کی نسبت زیادہ
محفوظ ہیں۔

[illegible] وہ [illegible] نے مختصر جواب دیا۔ وہ سڑکوں پر
[illegible] دیکھتی [illegible] انہیں نظر آئیں وہ دکانوں
سے گذرتے رہے۔ اس نے [illegible] چپ چاپ اپنا رسیور تسلیم کر لیا اور اس کے
پیچھے پیچھے [illegible] اس دکان کی تلاش کرتا رہا اور
جیسے [illegible] دکان نظر آئی وہ اس کے اندر چلا گیا۔ دکان کے اندر دو
آدمی تھے جو سودا دیکھ کر دوائیں باندھ رہے تھے اور دکان کا مالک دوسری
طرف کام میں مشغول تھا۔

[illegible] رونیلڈ نے اس سے آہستہ سے کہا۔ اس وقت تک کچھ نہ
کہنا جب تک ایک ایک آدمی دکان سے نکل جائے۔ وہ آدمیوں
کے جانے کا انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں دو آدمی اور آ گئے جب سب
چلے گئے تو رونیلڈ دکاندار کے پاس پہنچا۔
ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ہم اپنے ساتھ کچھ دوائیں لے جانا
چاہتے ہیں۔
دکاندار نے اپنا سر ہلایا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اس کی ناک بہت لمبی
تھی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس نے کہا ہم بغیر پرمٹ کے کچھ
نہیں بیچ سکتے۔
تمہیں کس نے منع کیا ہے [illegible] نے پوچھا۔
درندوں نے اس نے سادگی سے جواب دیا۔
رونیلڈ نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور کہا مگر ہم شمال مغرب سے آئے
ہیں۔
اس آدمی نے پھر اسی طرح سر ہلا دیا۔ میرے بھی بچے ہیں اور ایسے زمانے

میں بہر حال اپنے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔

ہمیں کہیں اور دیکھنا چاہئے رونیلڈ نے کہا۔ اور وہ اس دوکان سے دوسری دکان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور پھر دوسری سے تیسری اور چوتھی گھومتے رہے لیکن کہیں بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ انہیں ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جواب کے ساتھ ساتھ انکی صورتیں بھی ایک ہی جیسی ہو گئی ہیں۔ وہ سب چھوٹے اور کم ہمت تھے۔ پانچ جگہ جانے کے بعد رونیلڈ نے بے چینی کا اظہار کیا اور فالی سے کہنے لگا۔ اب ہم جب تک کسی دوکان میں نہیں جائیں گے جب وہاں کے آدمی کی شکل ان سے بدلی ہوئی نظر نہ آئے۔ یہ سب بزدل ہیں انہیں صرف اپنی زندگی سے پیار ہے ہوں۔ تو یہ شیطان درحقیقت کام کر چکے ہیں۔ اچھا ہم کھانا کھالیں اور پھر دیکھیں گے۔ فالی نے سادگی سے کہا۔ میں ایک ریستوران کو جانتا ہوں جس کا مالک مسلمان ہے اس نے یہاں بہترین گوشت ملتا ہے۔

وہ ایک خالی ریستوران کی طرف بڑھا اور جاتے ہی چلا یا۔ لیٹ چلا آدمی آگے بڑھا اور فالی کو گھورنے لگا۔

تم جانتے ہو میں نے کتنی مرتبہ یہاں کھانا کھایا ہے بڑے میاں مگر ان دنوں میں تم پہلے سے بھی زیادہ موٹے تھے۔ جاؤ یہاں کا بہترین گوشت لے آؤ۔

گوشت نہیں ہے اس نے رو ہانسا ہو کر کہا۔ ہمارے پاس تھوڑا سا ھا تا ہے۔ وہ افسردہ ہو اکھڑا رہا۔ وہاں ایک چھوٹے لڑکے کے علاوہ اس کی مدد کے لئے کوئی بھی نہ تھا۔ تم کسی بھی مسلمان ہوٹل میں اس کے علاوہ کچھ حاصل نہ کر سکو گے۔ بوڑھے نے کہا۔ بدروحوں نے ہر چیز اپنے لئے چھین لی ہے۔

فالی رونیلڈ کی طرف مڑ گیا۔ اب ہمیں یقین ہے شہر ہمارے ہاتھ سے گیا۔ بیکنگ میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ شہر وہی ہے یہاں کی جگہ وہی ہے مگر نہ وہ باتیں ہیں سب چیزیں بدل گئیں۔ سب چیزیں بدل گئیں۔

خدا کے لئے خاموش رہو میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں بوڑھا گڑگڑانے لگا۔ کیوں میری مٹی خراب کرتے ہو۔

ہم وہی کھائیں گے جو تمہارے پاس ہے۔ رونیلڈ بول اٹھا۔

خاموشی سے انھوں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اگلی صبح سڑکوں پر ہر طرف خاموشی تھی۔ سوائے دو چار عورتوں کے جو گھر کو صاف کر رہی تھیں یا کچھ چائے کے لئے گرم پانی لا رہی تھیں جب وہ رونیلڈ اور فالی کے پاس سے گذریں تو انھوں نے ان کو گھورا۔

ہمیں دیر نہ کرنی چاہئے فالی نے کہا۔ یہ شیطان اس سے زیادہ چالاک ہیں جیسا دکھائی دیتے ہیں۔ آج جب میں منہ دھو رہا تھا تو ان میں سے ایک میرے پاس آکر میرے بارے میں سوال کرنے لگا کہاں سے آئے ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔

ہم سلک کی دکان پر کیوں نہ چلیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک انگلستانی سلک کا سوداگر ہوں۔ اگر جاسوسوں نے دیکھا بھی تو کچھ خیال نہ کریں گے

تم ضرورت سے زیادہ چالاک ہو فالی نے کہا۔

ہو سکتا ہے اچھا تم مجھے سلک کی دکان پر لے جاؤ۔

فالی چپ چاپ چلنے لگا۔ وہ آدھے دن تک وہ سلک کی ایک دکان سے دوسری دکان دیکھتے ہوئے پھرے۔ انہیں یہ دیکھنا تھا کہ کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح دن گذر گیا اور رونیلڈ پریشان ہو گیا کہ کیا ترکیب کی جائے آخر کار وہ سلک کی آخری دکان پر گئے۔

اچانک کسی نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ اس نے دیکھا ایک بوڑھا آدمی جو کافی لمبا تھا۔ اس کا کالا چغہ پہنے کھڑا تھا۔ یہ وہی دکاندار تھا جس سے یہ ابھی دو منٹ پہلے بات کر کے انھوں نے اس کی بات پوری طرح سنی بھی نہ تھی کیونکہ اس کی دوکان تو بہت بڑی تھی مگر سٹی لٹی سی تھی اور وہ خود بھی تھکا ہوا سا ایک کونے میں بیٹھا تھا

اب کیا ہے رونیلڈ نے سوال کیا۔

میرے پاس سلک کا ایک نوجوان ٹکڑا ہے جو تمہیں نہیں دکھایا تھا بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ میرا سب سے بہترین سلک ہے اسے میں نے ہی لگا لا تھا۔

شکریہ مجھے نہیں چاہئے رونیلڈ نے جواب دیا۔

مگر اس بوڑھے نے اس کے کوٹ کو زور سے پکڑ کر کھینچا اور زور سے کہا۔ آؤ میں نے اسے چھپا کر رکھا ہے یہ جنگ سے پہلے کا ہے میں نے سوچا تھا کہ کسی شیطان کو اسے نہیں دوں گا میں تمہیں سستا دے دوں گا۔ تاکہ وہ شہر سے باہر چلا جائے۔

وہ اتنی جلدی مچائے ہوئے تھا کہ رونیلڈ ایک لمحہ کے لئے جھجکا مگر فالی نے کہا کہ یہ بوڑھا آدمی ہے چلو اس پر یہ احسان کر دو۔ فالی کے اس طرح کے جواب نے رونیلڈ کے دماغ میں فوراً ایک نئی چیز پیدا کر دی وہ بوڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دکان پر کوئی نہیں تھا مگر پھر بھی بوڑھا

اس شہر میں بہت عرصے سے رہ رہا تھا جیسے ہزاروں جاسوس اس دکان کی بابت میں موجود تھے۔ دکان میں کلرک اس سے ناواقف تھے۔ مگر کاؤنٹر پر روشن تھا۔

یہ سنہرا سنگ ماؤ زے نے لگا ہوا اسے انسان میں کہا میں نے چھپایا تھا۔ یہ خزانہ چھپا نہ ایک شہزادہ ہی اسے پہن سکتا ہے مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر تم اسے اس ملک میں لے جاؤ گے۔ اب ملک میں ان ملکوں کے علاوہ یہ انگوٹھی اور نہیں پہن سکتا۔ بہت ہاتھ بنا کر سنگ انہیں پہننے کا اہل ہے۔

اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک بند جا جو اپنے پاس رکھا اور سامان کو کھولنے لگا۔ یہ بڑی خوبصورت سنگ تھی جس پر جگہ جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

رونیلڈ نے سنگ کو دیکھا۔ یہ بہت خوبصورت اور بہت اچھی ہے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

بوڑھے نے اسی جلد بازی کے ساتھ کہا یہ کبھی نہیں چلے گی تم اسے محفوظ رکھنا۔ یہ آج تک نہیں بکتا اور نہ یہ تمہیں کہیں اور ملے گا۔

میں نے ایسا سنگ کبھی نہیں دیکھا۔ رونیلڈ کا جواب مختصر تھا۔

خالی دروازے سے لگا کھڑا کبھی باہر اور کبھی اندر کی طرف دیکھ رہا تھا بوڑھے نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے بلانا چاہتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا۔

کیا قیمت ہے اس کی رونیلڈ نے سوال کیا۔

بوڑھے نے اس کے ہاتھ پکڑے اور کہا میں اس کی کوئی قیمت نہیں لوں گا۔ تم اسے میری طرف سے لے جاؤ۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں سے یہ نکل جائے اور ان درندوں کے ہاتھ نہ پڑ سکے۔

کون کسی اجنبی کو بغیر کسی وجہ کے تحفہ دیتا ہے خالی پوچھ بیٹھا۔

بوڑھے کا رنگ زرد ہو گیا اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ تحفہ بغیر کسی وجہ کے نہیں دیے جاتے۔

خالی ہنسا اپنے ہاتھ اپنے سر پر پھیرنے لگا اور چپکے سے دوکان سے باہر ہو گیا لیکن رونیلڈ نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا کہ یہی وہ آدمی ہے جس سے کام چل سکے گا۔ وہ ٹہلتا ہوا پھر اندر آ گیا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ہر آدمی اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ خالی نے کندھے ہلا کر کہا۔

بوڑھے نے خالی کو گھورا اور رونیلڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا یہ تمہارا نوکر کیسا ہے جس کی زبان قابو میں نہیں ہے۔

رونیلڈ نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کا ذہن پھسل گیا۔ اس نے دھیرے سے بوڑھے سے کہا کیا تم اپنے وطن سے محبت کرتے ہو۔

جان سے بھی زیادہ بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔

کیا مجھے تم سے کچھ بات کرنی چاہیے رونیلڈ نے اس سے کہا۔ ایسا لگتا ہے کہ دو تین ایک [illegible] لوگوں [illegible] سے گذر گئی۔ مجھے بھی بہت محبت ہے [illegible] یہاں ایک [illegible] سے ہوں [illegible] شمال مغرب سے۔ مجھے یہاں سے دوائیں خریدنی ہیں۔ شمال مغرب [illegible] ان کے پاس دوائیں ختم ہو گئی ہیں وہ زخموں سے چور ہیں اور مر رہے ہیں [illegible] ان کے زخم پر مرہم رکھنے [illegible] نہیں۔ یہ ہے میرا اصل کام تو میں ابھی تک اسے انجام نہیں دے سکا دوائیں دکانوں میں بند کر دی گئی ہیں۔ اور کوئی بھی بغیر پرمٹ کے نہیں دے سکتا۔

خدا نے کیا مہربانی کی جو تمہیں یہاں بھیجا۔ اس نے دھیرے سے کہا اگر تم [illegible] مدد کرو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ اس لئے خالی کو دروازے پر بھیج دو تاکہ وہ وہاں کی نگرانی کرتا رہے۔ وہ اس وقت تک محفوظ ہے جس وقت تک خالی دروازہ پر رہے گا۔

بوڑھے دوکاندار کے چہرے پر ایک عزم جھلکنے لگا۔ اس نے کہا میرا نام لنگ ہے اور مجھے شہر میں سب جانتے ہیں حالانکہ سب سے دشمن ہو گئے ہیں۔ میں مچھلی کی طرح بند ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں نے کوشش کی پر اس سے قدم نہیں نکالا کہ کہیں میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ کیونکہ میں ان آدمیوں میں سے ہوں جنہوں نے انگریز حاکموں کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ یہ عرصہ ہوا جب کی بات ہے۔ لیکن درندے اسے کبھی نہ بھول سکیں گے ہمارے گروہ کا لیڈر مر گیا تھا۔

رونیلڈ اپنا نام بتاتے ہوئے جھجکا۔

لنگ کو جیسے اس کے دل کی بات معلوم ہو گئی ہو۔ مجھے اپنا نام نہ بتاؤ یہی بہتر ہو گا۔ اگر میں تمہارے بارے میں نہ جانوں۔ میں تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ میرا خاندانی ڈاکٹر ٹینگ ہے بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے میں اسے اپنے گھر بلاؤں گا۔ اور تمام باتیں بتاؤں گا۔ کے بعد ہم اس کے کہنے پر عمل کریں گے۔ اس کا جو مشورہ ہوگا۔

تمہیں میرا صرف اتنا کام کرنا ہے کہ جب شہر سے جاؤ تو ایک عورت

کو اپنے ساتھ لیتے جاتا۔

رونیلڈ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

ایک عورت کنگ نے دوبارہ کہا۔ وہ جوان ہے وہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہاں درندوں کے ہاتھوں مر گیا تھا جب یہ شہر میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کی لڑکی میرے ساتھ ہے وہ اس وقت سے میرے گھر میں چھپی ہوئی ہے۔

لیکن کیا یہ کام آسانی سے ہو سکے گا۔ اسے اس میں شک تھا۔ کیا وہ اسے محفوظ لے جا سکتا ہے۔

وہ ایک چینی کے مقابلہ میں تمہارے پاس زیادہ محفوظ رہے گی۔ کنگ نے وسوسے سے کہا میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں اس کا بھیس بدل دوں گا۔ تم آسانی سے اسے اپنا رشتہ دار بنا سکو گے میں تمہارے ساتھ اسے ایک ہندوستانی بنا دوں گا۔

رونیلڈ نے دیکھا کہ بڈھا اس کی آنکھوں کو گھور رہا ہے اس نے فوراً کہا تم جانتے ہو کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔

میں تمہیں ہندوستانی سمجھ سکتا ہوں کنگ نے علمیت کا اظہار کیا وہ ایک لمحہ رکا اور اس کے بعد کہنے لگا کیا تم میرے گھر آنا پسند کرو گے میں کسی کو ڈرائیور کو بلانے بھیجتا ہوں۔

اس کا گھر اس کی دکان کے بالکل پیچھے تھا۔ الماری کے درمیان سے گھر کے لئے راستہ تھا۔ کنگ نے دروازہ کھولا اور وہ صحن میں پہنچ گئے۔ ایک جوان آدمی کرسی پہ بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ کنگ نے فخر سے کہا رونلڈ اٹھو یہ ایک ہمارا دوست ہے۔

ایک نوجوان آدمی اس کے سامنے تھا وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر جھکا کر سلام کیا۔ سگریٹ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ سگریٹ جاپانی تھا۔ وہ غور سے رونیلڈ کو دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی آنکھوں سے کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ رونیلڈ نے سر کے اشارہ سے سلام کا جواب دیا آؤ یہاں انتظار کرو کنگ نے کہا۔

رونیلڈ نے اس کا ساتھ دیا اور وہ جوان آدمی پھر کرسی میں دھنس گیا۔ رونیلڈ اس کے نئے جوتے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ اس بوڑھے کا بیٹا کس طرح ہے جس کا کوٹ پھٹا ہوا ہے وہ اندر تک بڑھ گئے۔ نوجوان ان کے ساتھ نہ تھا۔

یہاں بیٹھئے مہربان کنگ نے کہا اور خود میز کی طرف بڑھ گیا معاف کیجئے میں ایک آدمی کو ڈاکٹر بلانے کے لئے بھیجوں۔ اس کے کچن کی چائے ابھی تک گرم تھی۔ برتن لینے کے لئے دوسرے کمرہ کی طرف چلا گیا رونیلڈ کمرہ میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے کمرہ کا جائزہ لیا یہ ایک معمولی کمرہ تھا ہاں کسی زمانہ میں خوبصورت رہا ہوگا کمرہ میں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑھیا بیسکی تھیں جن کا بید اب پرانا ہو چکا تھا کچھ معمولی لکڑی کی تھیں۔ تمام کرسیوں اور کمرہ کی اور چیزوں پر دھول ہی دھول جمی ہوئی تھی۔

ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا معنگی کے بارے میں سوچ رہا تھا آگے کیا ہوتا ہے وہ خطرہ کو بہت جلدی سونگھ لیا کرتا تھا۔ قالی ابھی تک دروازہ کی پہرہ داری کر رہا تھا۔ اس نے بجھنے سے پہلے شروع کر دیا۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھا نوجوان ابھی تک ویسے ہی کرسی پر لیٹا تھا وہ ویسے ہی کھڑا رہا سگریٹ کے دو چار کش مارے اور پھینک دیا۔

رونیلڈ نے پیروں کی چاپ سنی اور دروازہ کی طرف مڑا۔ دروازہ پہ پڑا ہوا پردہ ہٹا اور ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ عورت اسے غور سے دیکھنے لگی

اس نے بھی اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ عورت دیکھنے میں چینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ لباس ضرور پہنے ہوئے تھی۔ اس کی صاف شفاف آنکھوں نے لمبے سنہرے بالوں نے اسے بہت متاثر کیا۔

میں کہتا ہوں مجھے معاف کر دیجئے اس نے ہکلاتے ہوئے کہا مجھے اس کی امید نہ تھی لیکن اس نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اچانک اس کے چہرہ پر ناگواری کے آثار نظر آئے اس نے بڑھ کر باہر کی طرف جھانکا کہ اس نے کھڑکی میں سے کیا دیکھا۔

نوجوان نے اسے دیکھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ نوجوان داخل ہو اس نے دروازہ کا پردہ گرا دیا اور رونیلڈ اس کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔

کون تھا اس نے پوچھا۔

کون' چینی نے سوال کیا۔

وہ سفید عورت' رونیلڈ نے زور دے کر کہا۔

نوجوان نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ کہا؟ سفید عورت؟ گھر میں

[illegible]

[illegible] ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے [illegible] وہاں [illegible] کر دیا۔ وہ اس وقت غیر شعوری طور پر [illegible] انگریزی میں جواب دے [illegible]

[illegible] میں ضرور دیکھوں گا۔ لیکن تم اس کے لئے [illegible] تم اندر نہیں جا سکتے۔ اندر کسی اجنبی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

جواب [illegible] نے اس آدمی کو ایک طرف کر دیا۔ اور اس کے دوسرے [illegible] داخل ہوا اور اس نے رونگ کے اس [illegible] پر اعتماد کیا۔

یہ [illegible] مجھے [illegible] ہو۔ اندر جانا چاہتا ہے۔ رونگ غصے سے [illegible]

رونگ اس کی طرف مڑ گیا اور کہنے لگا کہ اس نے ابھی ایک سفید فام عورت [illegible] میں دیکھی ہے۔

لیکن یہ تو وہی ہے۔ جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا۔

کنگ، اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھو۔ تمہارا اپنا بیٹا ان کا ذکر [illegible] میں کوئی صورت ہی نہیں۔

تم نے مجھے خود کیوں نہیں بتایا کہ وہ سفید فام ہے [illegible] نے شکایت کی۔

مجھے ڈر تھا کہ تم انہیں سفید فام کا سن کر ذمہ داری لینے سے انکار کر دو۔ اور میں اسے کسی اور طرح یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ اس کا باپ میرا گہرا دوست تھا۔ میں اس کو تب سے جانتا ہوں جب کہ وہ خام مال امریکہ کو بھیجنے کے لئے خرید کرتا تھا۔ اس کی بیوی بھی دوسری مر چکی تھی اسے اپنی بچی کی بہت فکر تھی۔ اور میں نے ہی اسے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا چنانچہ وہ اسے لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایرا کافی بڑی ہے وہ میرے لڑکے اور لڑکی جو مر گئی اس کے ساتھ اکثر کھیلا کرتی تھی جب دشمن شہر میں آئے تو اس نے اسے میرے سپرد کر دیا۔

رونگ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے ایک اجنبی کو یہ سب کچھ بتا دیا۔ اس نے غصہ میں اپنا سر ہلایا اور چلا گیا۔

کوئی [illegible] آگئی" تم جانتے ہو" اس نے پاس انگریزی لہجہ میں کہا۔

"اس خوبصورت لڑکی کو میں اپنی حفاظت کے لئے بھی گھر سے نکال نہیں سکتا۔ میرے لڑکے کی ماں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ ہمارا لڑکا اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس کی شادی کر دیں۔ اور مجھے خوف ہے کہ وہ میرا طرف [illegible] اگر دشمنوں کا ملانا کسی قسم کا [illegible] ضرورت ہے [illegible] اور قدرت نے جس کو بھر کر دیا [illegible] کو انہیں ملانا نہیں چاہئے۔"

"میں تم سے پورا اتفاق کرتا ہوں" سدانالڈ نے تھکی سے کہا۔ "اب تمہیں جلدی کرنا چاہئے۔"

"ہاں ہاں" کنگ نے کہا۔ "ہم جلدی چلتے ہیں۔ ڈاکٹر کسی لمحہ آتا ہے۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ ہر چیز تیار ہے یا نہیں۔ اچھا! اجازت۔"

ایرا [illegible] میں جس [illegible] باتیں سن رہی تھی۔ وہ دور زینے سے زنانخانہ میں چھپ کر رونگ کی نظروں سے بچ رہی تھی۔ آخر وہ رونگ کی ماں کے ساتھ [illegible] محفوظ تھی، مگر اس غیر ملکی کی بات اس کے لئے کتنی پرکشش تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ غیر ملکی سفید فام ہے یا شاید امریکی۔ اگر وہ اس سے بات کر سکتی تو ممکن تھا کہ اس شہر سے نکلنے کی کوئی راہ نکل آتی۔ اس جذبے کے ساتھ وہ تیزی سے [illegible] کی طرف گئی تھی۔ مگر وہ غیر ملکی ایک ہندوستانی تاجر تھا اور وہ اس کے لئے کیا کر سکتا! اسی لمحہ رونگ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ مڑ کر اس ہی سیدھی لائبریری کی طرف بھاگی کہ حسب معمول کنگ وہاں ہوگا مگر کمرہ خالی تھا۔ اب رونگ کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے سمجھ لیا کہ اس سے بچنا مشکل ہے تیزی سے الماری سے ایک کتاب نکال کر اپنے سرخ ہونٹوں کو بھینچ کر بیٹھ گئی۔

دوسرے لمحہ وہ وہاں تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کی کالی اور جواب طلب آنکھوں میں کچھ دیکھا۔

"ایرا" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم ان دو دنوں میں مجھ سے دور دور کیوں رہیں؟"

"تم جانتے ہو کیوں" اس نے جواب دیا۔ اس کے باپ کی موت تک ایرا محفوظ تھی گو اس وقت بھی اسے معلوم تھا کہ رونگ اس کا طالب ہے ان دنوں وہ اس پر ہنس سکتی تھی۔ مگر اب جبکہ وہ اس کے باپ کے گھر میں تھی۔ ہنسنے کے لئے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے خائف تھی۔ وہ اٹھی اور بظاہری بے تعلقی سے کتاب واپس رکھتے ہوئے دروازہ کی طرف بڑھی۔

"ایرا تم ابھی نہیں جاؤ گی۔" وہ چیخا "اس وقت تک نہیں جب تک یہ ..."

"تمھاری ماں بیرا انتظار کر رہی ہے" اس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا
خوفناک خوف کا احساس شدید ہو گیا۔ وہ اب وہ ... کا نشانہ تھا جس کے ساتھ
وہ پکڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک اجنبی تھا جنگ نے اسے بدل دیا تھا مگر
جنگ نے تو ہر چیز بدل دی تھی۔ وہ بڑا پر امن شہر جہاں وہ خوش خوش اپنے
باپ کے ساتھ رہتی تھی اب اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے بیگانہ بن گیا
تھا اور روفانگ اس کا دشمن تھا۔

اس پر خوف چھانے لگا اور کتاب گرا کر وہ آنکھ بند کر کے کمرے سے نکل کر تنگ راہ داری پر دوڑنے لگی۔ مگر اینٹ کی طرح سخت اور سرد ہی وہ ٹیسل اور دو مضبوط بازوؤں میں خود کو محسوس کیا۔ پھر اس نے ہیٹ کی کگر کی پتلی سیاہ فام چہرہ دیکھا۔

"اوہ" وہ چیخ پڑی اور خود کو چھڑا لیا۔ روفنگ جس نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا

"آ" مسٹر کنگ نے تیزی سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ تم یہاں بہری تلاش کرتے کرتے آ گئی رہا تھا۔ یہ ہیں مسٹر..... مسٹر.....

"سنگھ" رونالڈ نے آہستہ سے کہا

"یہ ہے وہ لڑکی" کنگ نے جلدی سے کہا "ایرا" "یہ میری کہانی طرح ریشم کے تاجر ہیں جلد ہی شمال کی طرف سفر کریں گے۔ میری بچی! میری خواہش ہے کہ اب میں تمہیں یہاں سے بھیج دوں۔ کہیں دشمنوں کو تمہاری خبر نہ ہو جائے یاد رکھو کہ جاپانیوں اور امریکیوں میں جنگ ہو رہی ہے اور تم امریکی ہو۔ میں مجبور ہوں جیسا کہ ہم سب مجبور ہیں۔ اگر انھوں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا تو کیا میں تمہیں بچا سکوں گا؟ نہیں۔ اور یہ بھی کیسے یقین کر لوں کہ کوئی لاپروا نوکر یا مہمان تمہیں دیکھ کر نہ کہے کہ تم یہاں ہو۔ امریکہ کے اعلان جنگ سے پیشتر ہی مجھے اندیشہ تھا اور اب تو ہر ساعت خطرناک ہے۔ یہ شیطان تمام امریکیوں کی تلاش میں ہیں"

کیا امریکیوں نے لڑائی کا اعلان کر دیا ہے۔ ایرا نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ اس نے اس ویرانی میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سنا تھا۔ نہ کسی نے کچھ بتایا اور نہ یہاں اخبار پڑھنے کو مل سکا۔

یقیناً انھیں تو معلوم ہو گا روفنگ کہ یہ تمہیں لڑائی چھڑ چکی ہے۔ اس نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں ایسی گہری تشویش پائی کہ یہ اب جانتی ہے۔ اگر اسے جواب دینا نہیں ہے تو نہ دے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے سنجیدگی سے کہا "اب یہ بات ضروری ہو گئی ہے کہ اب یہاں رہ کر تم سب کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اگر تم مجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤ تو میں چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں میں اپنے آپ کو چھپا لوں گی۔ اور یقین ہے کہ میں نہیں سکتی یہ بالکل ٹھیک ہے۔

وہ چینی میں گفتگو کر رہے تھے لیکن اب رونالڈ نے انگریزی میں کہا میں تمہیں خطرہ سے نکالنے کے لئے جو کچھ کر سکوں گا بڑی خوشی سے کروں گا: اچانک ایرا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی بات پر ایک تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی۔ جسے روفنگ نے دور کیا: "معاف کیجئے گا۔ ابا جان ضعیف کنگ کے سامنے وہ جھک کر ادب سے جھکا اور پھر کچھ کہے بغیر وہ راہ داری سے گزر گیا اور اس کے ساتھ وہ تمام باتیں دور ہو گئیں جن سے وہ پریشان تھے۔

ایرا ہیجانی انداز میں رونالڈ کی طرف مڑی اور کہا: "تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ میں جانا چاہتی ہوں" اس نے انگریزی میں کہا جو کنگ کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ ان کا منہ تکنے لگا۔

"میں انگریز ہوں" رونالڈ نے اچانک کہا اور وہ حیرت زدہ ہو گئی "میں شمال مغربی علاقوں کے لئے دوا لینے آیا ہوں۔ ہسپتال میں میرا ایک ہندوستانی دوست سرجن ہے اور اس نے مجھے یہ لباس دیئے تاکہ میں محفوظ رہوں۔ میرا خیال ہے یہ بہتر ہے اگر تم تمام باتیں سمجھ لو۔

سچ کہ نہ کہنے نے اسے لاؤ لی کی یاد دلا دی۔ اس نے اسے ذہن سے نکال دیا تھا جب اسے اپنے مرتے ہوئے شوہر کے پاس چھوڑا تھا کیونکہ اس کے خیال سے اسے شرم آتی تھی۔ اب ایسا کر دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اب وہ لاؤ لی کے بارے میں صحیح طور پر سوچ سکے گی۔ اس واقعے اسے حیرت اور تسکین ہو رہی تھی۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے دوست کی بیوی تمہارا استقبال کرے گی۔ میرا مطلب ہے تم صرف مردوں کے ساتھ نہیں رہو گی۔"

"اوہ" اس نے ایک طویل سانس لیا "ضرور! تم کنگ سے کہو اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اگر یہاں لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا:"

"اپنے والد کی طرح" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ کنگ کی طرف مڑی اور نرم چینی زبان میں جو کچھ رونالڈ نے کہا تھا کہہ دیا۔

کنگ نے حیرت سے منہ پھاڑے ہوئے سنا "ائی یا" رونالڈ کی طرف تکتے ہوئے اس کے منہ سے نکل پڑا۔ "انگریز؟" میں خود ڈاکٹر کو لانے جا رہا ہوں

[illegible] اس نے تیزی سے پردہ جسم پر سے ہٹا کر کیا اس وقت [illegible] ساکت تھے۔ وہ تو اس [illegible] دیکھنے لگے۔ وینڈی کی سانس حلق میں پھنسنے لگی [illegible] تصورات کی اس ترا ت سے مختلف تھیں [illegible] اس کے احساسات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ ایسا تو [illegible] قریب پڑ کرنے کی وہ رحشانہ طریقہ سے چونے کی خواہش [illegible] جذبات کی شدت سے سکتہ کا اظہار کیا [illegible] دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اس نے سب کچھ دیکھ [illegible] کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"[illegible] تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی" اس نے کہا۔

"قطعی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے [illegible] میں اپنی طرح اپنی حفاظت کر لوں گی [illegible] سے عاری ہو چکی ہوں وحشیوں کے ملک میں سفر کرتے ہوئے بس تنہا نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں سمجھتا ہوں" اس نے جواب دیا

وینڈی نے بمشکل کوئی بات سنی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بہت [illegible] سڈول تھے۔ ایرا! یہ نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

"کیا ہم فوراً ہی جا سکتے ہیں" ایرا نے دریافت کیا۔

"ہاں فوراً جانا چاہیے" اس نے احتیاط کہا "مگر میں اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک میں جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ پورا نہ ہو جائے۔ وہ یہ کہ [illegible] جانا ممکن ہو مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیے۔"

"[illegible]" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"جو چاہو کہہ لو" اس نے جواب دیا۔

کنگ کو دوبارہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور وہ ایک شخص کی آستین پکڑے ہوئے لا رہا تھا۔ وینڈی نے اتنا مختصر [illegible] والا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا وہ چھوٹا سا انسان قدرے جھکا اس کی چھوٹی آنکھیں پرانے انداز کے بڑے سینگ نما چشمے کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ کنگ نے اس کی آستین پکڑے ہوئے کہا "یہ ہے ڈاکٹر ینگ [illegible] جس نے اس کو تمام باتیں بتا دی ہیں۔ تمہارے لئے دواؤں کا انتظام کر دے گا۔"

کنگ نے اس مختصر آدمی کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا "کیا میں اس سے بیان کر دوں؟"

"ہاں" "بہت زیادہ گہرائی میں جھانکتے" ڈاکٹر نے کہا "اس کے لئے یہ میری قابل اعتبار ہونے کا ثبوت ہوگا۔"

کنگ نے وینڈی سے کہا "اس کی دوا تمام ان وحشیوں کے ہاتھ میں پڑ گئی۔ [illegible] ہمیں معلوم ہوا اس نے میری کہانی نہیں دیکھا۔ وہ بہت چھوٹی اور بے حد حسین لڑکی تھی۔ تم سب کے چہرے کی طرح [illegible] نہیں سوچتا۔ مجھے مدد کرنے میں اسے بڑی خوشی تھی۔"

اس نے [illegible] آنکھوں سے سنا: "مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ساتھ سامنے نہیں آیا۔ اور ڈاکٹر ینگ"

پھر ڈاکٹر نے پوچھا "[illegible]" اپنا ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور ایرا پرنم آنکھوں سے خاموش کھڑی رہی۔

"کیا تم یہاں تک جا سکتے ہو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کی آواز [illegible] سے رکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کی تمام رگیں لرز رہی ہیں "میرا ایک دوست ہے —— وہ ......"

جو میری ہی طرح وحشیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ ان کی دوا کی دکانیں ہیں۔ فطری طور پر میرے دوستوں کو دوا فروش ہونا چاہیے تاکہ ان سے میں کھل کر بات کر سکوں۔ وہ سب ڈاکٹر ہے مجھے محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں وہ میرا راز نہ معلوم کرے۔ میرے یہ دوست مجھے دعائیں دیں گے جب انہیں معلوم ہوگا کہ یہ بیمار آدمیوں کے لئے ہے پہلے وہ غیر قانونی طور سے بیچا کرتے تھے مگر جب سے چند دوا فروش پکڑے گئے اور ان کو موت کی سزا دی گئی۔ ان لوگوں نے بند کر دیا۔ اب یہ شیطان بہت سخت ہو گئے ہیں۔ اب ان کو حاصل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان دواؤں کی جگہ اسی قسم کی دوسری چیزیں رکھ دوں۔ آج رات سے پہلے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔"

کنگ کے چہرے پر مسکراہٹیں چھائی ہوئی تھیں "یہ شخص دواؤں کا جادوگر ہے۔ اس نے میرے والد کو ایک خفیہ دوا کے ذریعہ دس سال تک زندہ رکھا جب کہ دوسروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ یہ شخص!" کنگ ہنسا "یہ انسان کے پھیپھڑے کے کسی غیر ضروری جز کو جس کی وجہ سے موت واقع ہو سکتی ہے ہٹا کر اس کے بازوؤں میں لگا سکتا ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔"

ایک غم انگیز مسکراہٹ ڈاکٹر کے چہرے پر بمشکل پیدا ہوئی "اگر کافی

پیسے ہیں تو میں اسے درخت پر بھی لٹکا دوں۔" اس نے کہا۔

کنگ بولا۔ "ہاں! یہ اب یہی کر سکتا ہے۔ وہ جس کام کے کرنے کا تہیہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ یہ تمہیں دوا ضرور لا کر دے گا۔ اب کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔" کنگ نے چٹخارہ لیا اور ہاتھ ملنے لگا۔ پھر ایرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہر کیف! تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے روزینلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں ڈرتی۔"

"اندر داخل ہو۔" جاپانی گارڈ نے کہا۔

روفنگ باغ کے سامنے دروازے سے اندر گیا۔ جہاں بچپن میں وہ ایرا کے ساتھ کھیلا تھا جب اس کا باپ جان میک لین سے ملنے آیا تھا۔ وہ خوشگوار جذبات سے خالی نہیں تھا اس لئے اس کے ذہن میں وہ چھوٹی لڑکی اپنے زرد لباس اور سیدھے بالوں کے ساتھ ابھر آئی جس کی اپنی خوشبو اس کے لئے کس قدر دلکش تھی۔ اس کی جوانی کے ساتھ ساتھ ایرا کا خیال اپنے دامن میں لاانتہا گہرا رومان ہمیشہ لایا تھا جس کے سائے میں وہ اپنے باپ کے مکان اور دکان کی حقیقتوں سے مفرور ہو کر پناہ لے سکتا تھا۔ جان میک لین نے ہمیشہ اس خوبرو چینی لڑکے کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا جو اس کے دوست کا لڑکا تھا۔ روفنگ اس گھر کی آراستگی اور حسن سے محظوظ ہوتے ہوئے گھر اور غیر ملکی سامان دہ کرسیوں پر آرام سے بیٹھنے، مرسلے دیکھنے اور ایرا کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے لئے بڑی خوشی سے داخل ہوا تھا۔ اس گھر میں ایرا کے حسن شادمانی کا راج تھا۔

روفنگ کئی وجوہات کی بنا پر جاپانیوں سے متنفر تھا جن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ میک لین کے گھر پر قابض ہو گئے تھے۔ مگر اس نفرت سے بھی شدید تر جذبہ اس کے اندر کار فرما تھا۔

جو زینے برآمدے کی طرف جاتی ہوئی ٹائیلوں کی سڑک پر وہ چلنے لگا اور پھر پتھروں پر سے سامنے کے دروازے پر جا پہنچا۔ گارڈ کے علاوہ وہ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسا کہ اسے یاد تھا۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ میک لین اسے کہیں سے دیکھ رہا ہے۔

"اندر داخل ہو۔" دوسرے گارڈ نے پہلے کی سی آواز میں کہا۔ اور روفنگ ہال میں داخل ہوا۔ دائیں طرف لائبریری تھی جہاں اکثر میک لین کا سفید سر بھاری بھاری کتابوں والی میز پر جھکا رہتا تھا جہاں وہ ان دنوں کتابیں لکھتا تھا جب اس نے امریکہ جانا چھوڑ دیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح شیلف پر سیاہ اور سنہری جلدوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر میک لین کی میز پر ایک جاپانی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ روفنگ کے داخل ہونے پر اس نے [illegible] ڈالی۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں وہ جگہ [illegible] دی ہماری تھی۔" روفنگ نے کہا۔

"جو کچھ تم دیکھو گے مجھ سے کہنے کے لئے؟" افسر نے کہا۔

"ظاہر ہے۔"

افسر نے میز پر رکھا ہوا چار بجائی اور کلرک اندر داخل ہوا۔ افسر نے کہا: "یہ شخص ملازم ہو رہا ہے۔ اس کی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار ین اور خصوصی علامت کا نشان اسے ابھی دے دو۔"

کلرک نے کان پر اٹکا ہوا قلم نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا اور واپس چلا گیا۔ وہ دوسرے لمحے لوٹا اور ایک پیتل کا بیج جس پر طلوع ہوتے سورج کا نشان تھا اور جاپانی دستاویزوں کا پلندہ اسے دیا۔

"اگر تم نے اچھی طرح کام کیا" جاپانی افسر نے بلند آواز میں کہا "تو جلد ہی تمہاری ترقی ہو جائے گی۔ شہری حکومت میں تمہیں کسی اعلیٰ عہدے پر بھی فائز کیا جا سکتا ہے۔" اس نے ایک سگار سلگایا اور دھوئیں کے مرغولوں میں اس کی آواز تیرتی رہی۔ "تم چینیوں کو یہ جاننا چاہیے کہ ہم تمہارے دشمن نہیں بلکہ تمہارے دوست ہیں، ہم دونوں کی ترقی۔۔۔۔۔۔"

مگر روفنگ نے کچھ نہیں سنا۔ افسر کی تنی ہوئی [illegible] چھوٹی سی ناک اور موٹے موٹے ہونٹوں سے اسے کراہت ہونے لگی۔ پھر اس کی کراہت پر تاریک ناامیدی چھا گئی جو اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ پانچ سال پہلے کالج کا ایک جوشیلا طالب العلم تھا اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی جانے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ ریشم کی بنائی کے شعبے میں کام کرنے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ "چین کو اپنی دولت کی حفاظت کرنی چاہیے۔" وہ اکثر اپنے دوستوں کے مختصر حلقے میں کہا کرتا۔

اور پھر سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرح لوگ اچانک سیاہ بادل کی طرح ان کے اور سورج کے درمیان چھا گئے۔ قدیم اور تجارتی شہر ویران ہو گئے۔ فتح کرتے ہوئے یہ لوگ مشرقی چین کے خوشحال علاقے کے [illegible] پر چھا گئے اور روفنگ ان کی آسان فتوحات کو دیکھ کر ناامید ہو گیا۔ غدار مغربی لوگوں کی کمزور پالیسی کو وہ نفرت سے دیکھنے لگا [illegible] کے طریقوں سے آراستہ جاپانیوں کے خلاف کسانوں کا [illegible]

[illegible] پہنچ گئی [illegible] کی
[illegible] محبت
[illegible] دیکھا کرتا تھا۔ وہ
[illegible] تھا" ہم لوگ [illegible]
[illegible] ہو جاتے ......

[illegible] مشورہ دیا تھا [illegible] اس سال تک اس
[illegible] سال [illegible] گزار سکتی ہیں۔ میرے بیٹے!
ہم لوگ [illegible]۔"

"[illegible] ہم پر قابض ہو گئے" وونگ نے [illegible]
میں جواب دیا تھا۔

اور اب وہ [illegible] ہو گیا تھا [illegible] تھا کیونکہ وہ
[illegible] صاحب اس کا باپ [illegible] گھر سے آیا تھا
[illegible] یاد تھی جب [illegible] شوہر نے [illegible] سے اس کی
[illegible]۔ اس کے باپ [illegible] ہو رہی تھی۔

"تمہیں اس کو بچانا ہے"

"[illegible] اس کی ذمہ دار رہوں گی" اس کی
ماں نے جواب دیا تھا۔

یہ جان کر کہ وہ [illegible] ہے وہ فوراً بستر سے اچھل پڑا تھا۔ یہاں میں دو
اس ضعیف شخص [illegible] جو اس کو نکال لایا تھا۔

"میرے والد نے مجھے یہاں آنے کو کہا تھا۔ مگر وہ اس کو [illegible] نہ جانے
کہاں" اس نے [illegible] سے کہا۔

پھر اس نے وونگ کو دیکھا جو اس کی موجودگی سے خوش ہو کر [illegible] رہا
تھا وہ یہاں [illegible] اس لئے کہ وہ اپنے [illegible] بات کو چھپا سکتا
[illegible]۔ وونگ نے اس کی ناگواری محسوس کر لی۔ وہ [illegible]
[illegible] کہ اس کی محبت [illegible] ناگوار گزر رہی ہے [illegible]
[illegible]۔ اب صرف اسے غصہ آ رہا تھا اس نے
فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے [illegible] جانے دے گا

[illegible] کی بے پناہ قوت کے تحت اس نے [illegible]
[illegible] ایک ہندوستانی تاجر
[illegible] تاجر ہے اور [illegible] ہندوستانی۔"

[illegible] پھر [illegible] اس نے پوچھا "وہ کہاں

[illegible] ہے؟"

[illegible] جلدی سے جواب دیا "یہاں ایک [illegible]
[illegible] شخص [illegible] بہت زیادہ [illegible]
[illegible]؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible] ہے تو [illegible] کافی ہے"

[illegible]
[illegible] میں نے [illegible]۔

[illegible] سامنے [illegible]
سے نکلے اور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا۔ سڑک پر بیٹھے ہوئے فقیر سے [illegible]
میں اپنے بچے ہوئے گوشت [illegible]۔ اس نے پوچھا یہ [illegible]
شخص کون ہے؟"

فقیر نے اوپر دیکھا۔ "وہ [illegible] خاندان کا [illegible]
میں [illegible] مجھے [illegible] میری [illegible]
دیتا ہے اور [illegible]
مجبور کر دی ہے۔ مگر اس [illegible]"

خالی [illegible] ہوئے [illegible] کی طرف دیکھتا رہا اور [illegible] "مجھے [illegible]
[illegible] تلاش کرتا ہوں"

وہ [illegible] چلتے ہوئے ایک [illegible] کی طرف مڑ گیا۔ [illegible]
وہ وونگ کے پیچھے خاموشی سے چل رہا تھا۔ [illegible]
[illegible] دیکھا [illegible]
[illegible] خواہش ہوئی کہ وہ پڑھ سکتا [illegible]
سامنے تابوت کی دکان پر گیا اور اس کے مالک سے جو اندر بیٹھا ہوا تھا
دریافت کیا۔

اس نے جواب دیا "ایک امریکی یہاں رہا کرتا تھا مگر اب وہ مر چکا ہے۔
میں نے ہی اس کا تابوت بنایا تھا۔ اس کی لڑکی غائب ہو گئی ہے پتہ نہیں کہاں۔
ممکن ہے دشمنوں کے پاس ہو۔ مکان پر دشمنوں کا قبضہ ہے اور کون جانے وہ [illegible]
اندر کیا کرتے رہتے ہیں۔ مگر اکثر وہ [illegible] باہر نکلتے ہیں اور [illegible]

پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اور پھر وہ کبھی نظر نہیں آتے۔ یہ کس قسم کا قید خانہ ہے۔"

خالد نے جماہی لی جیسے کسی خبر اس کے لیے بڑا اہم تھی اور آگے بڑھ گیا۔ چند قدم آگے ایک چائے کی دکان میں ایک میز پر بیٹھ گیا اور ایک کپ چائے کی قیمت دے دی۔ دوسرا نے پھاٹک کی جانب دیکھتا رہا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے رونلڈ کو نکل کر گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ رونلڈ نکلا ہی تھا کہ دشمنوں کے سپاہی تیزی سے اپنے چھپنے کی جگہ سے نکل پڑے اور سخت پاؤں کے ساتھ صف باندھ کے نکلے۔

"چائے والے لڑکے نے کہا "کوئی دوسرا بدقسمت آج مرنے والا ہے۔"

اس پر خالد نے پیسے دیے اور سپاہیوں کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ گو وہ جلدی جلدی بڑھ رہے تھے۔ درحقیقت وہ زیادہ تیز نہیں چل رہے تھے۔ اس نے بظاہر بے کار چلتے ہوئے بھی ان لوگوں کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ہوٹل کی طرف گئے اور وہ ان لوگوں کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے ان کو پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ذہن اور بھی تیزی سے کام کرنے لگا اور فوراً اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ کنگ کے لڑکے نے اس کے مالک کے بارے میں دشمنوں کو سب کچھ بتا دیا ہے اور یہ لوگ اس کے مالک کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔

وہ مڑا اور چالاکی سے تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلنے لگا۔ مگر معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ سانس وہ دوڑنے لگا اور جب وہ تیزی سے دکان پر پہنچا تو ہانپ رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سانس کی رفتار ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ جب دکان پر نہیں ہے تو اس کا مالک ضرور گھر پر ہوگا۔ وہ دکان سے پھر دوڑا۔ رونلڈ کنگ اور ڈاکٹر گھر سے نکل رہے تھے ان کے ساتھ ایک سفید فام خاتون کو دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر اس کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ رونلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ چلایا "بھاگ جائیں! دشمن جانتے ہیں کہ آپ اس شہر میں ہیں اور دشمن ہوٹل میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ واپس مت جائیے بلکہ کہیں چھپ جائیے۔"

"آں..... ں..... " کنگ نے چیخ ماری اور پیچھے ہٹ گیا! ڈاکٹر کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اچھے دوست! اب ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔ دونوں چینیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ فیصلہ کرتے ہوئے کنگ نے رونلڈ سے آہستہ کہا "بس تمہیں چھپ جانا چاہیے۔"

"لیکن مجھے یہ لازم نہیں ہے کہ..... " رونلڈ نے احتجاج کیا مگر ان کی آنکھوں میں خوف کے آثار دیکھ کر وہ رک گیا اور فیصلہ کن انداز میں کہا

"مجھے چھپا کر کیوں کہیں لے کر نکلنا ہے۔"

جاپانی افسر کو خبر دے کر وہ خاموشی سے شان کے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ اسے امید تھی کہ اب تک وہ اجنبی ہوٹل واپس آ گیا ہوگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب تک اس کے باپ کے گھر پر موجود ہوتا اسے بتاتا [illegible] اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ بلکہ وہ صحن کی طرف خاموشی سے [illegible] باغ کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے ان لوگوں کو [illegible] باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ [illegible] حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اجنبی جو کچھ کہہ رہا تھا [illegible] رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس نے ایسا کو بچپن کے بعد سے [illegible] صاحب وہ اس کے لیے طرح طرح کے کھلونے بنایا کرتا تھا۔ بچپن کی تمام یادیں جو ان دونوں سے متعلق تھیں اس کے ذہن میں سمٹ آئیں اور اب وہ اس کی جوانی کا اور بھی حاسد ہو گیا اور ان لوگوں کو ساتھ اندر کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ اب وہ اجنبی جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد ہوٹل پہنچ جائے گا جہاں جاپانی سپاہی اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے ایک جماہی لی اور ان لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اطمینان کا سانس لے کر اپنے کمرے میں گیا اور کئی جام [illegible] بعد دیگرے سلگاتا رہا۔ جن سے کبھی اس کو تشفی نہیں ہوتی تھی مگر ان کے پینے کے بعد ہمیشہ اسے نیند کی آمد ہوتی تھی اور اب نیند کا خمار محسوس کرتا ہوا وہ بستر پر دراز ہو گیا اور دیر تک گہری نیند میں سوتا رہا۔

جب وہ اٹھا تو اس نے گھر میں اجنبی آوازیں سنیں۔ عام طور سے وہاں خاموشی رہتی تھی لیکن اس وقت تیز قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی ماں کی تیز آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ بہت مشکل تھا اور وہ تھوڑی دیر تک پڑا ہوا اٹھنے کی جدوجہد کرتا رہا اور پھر وہ یکایک اٹھ بیٹھا اور اس نے اپنی جیکٹ پہن لی جسے اس وقت وہ اتار کر سو گیا تھا وہ ابھی بہت دیر تک سوتا [illegible] ابھی اندھیرا تھا اور جب اس نے [illegible] گھڑی کی طرف دیکھا تو اسے بڑا تعجب ہوا کہ ابھی صرف آدھی رات گزری ہے اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور چائے کے دو گھونٹ پیے جو ہر وقت میز پر تیار رہتی تھی۔

رفتہ رفتہ اسے دن کی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ اس وقت وہ غیر ملکی جیل میں ہوگا اس نے سوچا یا شاید مر چکا ہو۔ ان خیالات سے کچھ [illegible] اسی لمحہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کسی نے اسے پکارا۔

[illegible] سے سوال کیا [illegible] باہر [illegible] کی طرف متوجہ ہو گئے اور [illegible] گئے [illegible] کر گیا۔

یہ صرف [illegible] ہے۔ اس نے کہا۔

[illegible] تب اس نے [illegible] رہی۔ [illegible] وہ [illegible] گیا۔ [illegible]

مگر [illegible] ایسا ہوں مجھے [illegible] لیا ہو [illegible] اور [illegible] اس کے [illegible] کی کوشش کی۔

اس کے باپ نے [illegible] کہ شیطانوں نے کس طرح پتہ لگایا [illegible] یہاں [illegible] اور [illegible] ساتھ بدلنے میں مدد دے [illegible] وہ [illegible] جا سکیں [illegible] ان کا بھیس بدل دیں۔

وہ کہاں جائیں گے، رونگ نے کہا۔

[illegible] ہمارے آدمی انہیں پہاڑی تک پہنچنے میں مدد دیں گے۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔

یہ اچھی ترکیب ہے۔ رونگ نے خاموشی سے کہا۔ وہ اپنی کرسی دروازہ سے [illegible] کھڑا ہوا خاموشی سے [illegible] گھورتا رہا۔

تمام وقت رونیلڈ خالی کی طرف سے پریشان رہا۔ جو کبھی کھانستا تھا کبھی [illegible] مگر وہ اسے خاموشی سے برداشت کرتا رہا کہ کس طرح یہاں سے نکل جائیں۔

خالی کی قوت برداشت جواب دے گئی وہ رونیلڈ کو زبردستی صحن میں لے گئی اور اس سے خاموشی سے چاروں طرف چوروں کے انداز سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

ہم بری طرح پکڑے گئے۔ اس لڑکے نے ہمیں دھوکا دیا۔

اب ہم کس طرح فرار ہو سکتے ہیں۔

لڑکے سے، رونیلڈ نے سوال کیا۔

میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ خالی نے کہا۔ وہ دشمن کے خیمہ میں گیا تھا جب وہ باہر آیا تو اس کے ساتھ سپاہی بھی تھے۔

یہ تو [illegible] اور [illegible] مسز کنگ [illegible] ان کے [illegible] جب خالی کو اس نے [illegible] دیکھا تو [illegible] ساتھ ہو گئی [illegible] سے ان کی باتوں پر کان لگا دے [illegible] وہ صرف [illegible] پائی تھی [illegible] اور دشمن [illegible] مگر اس نے [illegible] بال [illegible] اور اس نے [illegible] ہیں [illegible] چاہیے اور ایسا بنانا چاہیے کہ جیسے ہم [illegible] نہیں۔ ہم اس کے باپ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ [illegible] پر ہو اس نے کہا۔

میں [illegible] نہیں ہوں خالی [illegible] بات [illegible] مگر یہ بات [illegible] ہم کچھ نہیں بول سکتے۔ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ [illegible] سے ان کے ساتھ ساتھ بھاگی اور اسی لمحہ [illegible] جب وہ [illegible] خالی نے [illegible] کی طرف شبہ کی نظر سے دیکھا۔ اس نے جلدی سے [illegible] نکالا اور مسز کنگ سے کہنے لگی کہ آپ کے چہرے پر نشان [illegible] ہے۔ تب اس کو [illegible] میں رومال کی تلاش میں [illegible] گئی تھی۔

خالی نے دوبارہ اسے دیکھا اسے کچھ اطمینان ہوا اور اس کی نگاہیں نوجوان کو تلاش کرنے لگیں

ہمیں جلدی کرنا چاہیے، رونیلڈ نے مسز کنگ سے کہا: بالکل ٹھیک [illegible] نے جواب دیا۔ یہ کچھ کپڑے ہیں تم انہیں بدل لو۔ دشمن تمہیں پہچان لیا ہو کہ تم ہندوستانی سوداگر نہیں ہو۔

اس نے کچھ کپڑے نکالے اور ایک جوتا اور اسے رونیلڈ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس کے بالکل ٹھیک ہے اس پر بوڑھے نے پہلے ہی سے تیل کی مالش کر لی تھی اب وہ بالکل نرم ہو چکا تھا۔

لیکن رونیلڈ کی طرف سے وہ بوڑھا ابھی تک مطمئن نہ تھا۔ قدرت نے تمہیں کالی آنکھیں کالے بال دئے ہیں مگر یہ تاکہ تم کس طرح چھپا سکتے ہو۔ یہ تمہاری چغلی کر رہی ہے اس نے رونے والے انداز میں کہا۔

اور اس لڑکی کی نیلی آنکھوں کا کیا ہو گا مسز کنگ نے ایرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایرا چینی لباس میں تھی اور اس کی کھال بھی پیلی تھی اس کے کالے بال کر دئے گئے تھے۔ میں جانتی ہوں کیا کرنا چاہیے اس نے کہا میں اپنی آنکھیں بند رکھ سکتی ہوں اور اس طرح اندھی بن سکتی ہوں۔

مگر خوفزدہ ہو رہے ہو کہ تم اپنی آنکھیں کھول سکتی ہو مسز کنگ نے اعتراض

ہ مشکل پڑتی۔ مگر اس کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

مجھے معلوم کرنی ہے وہ۔ اب کوئی اس کے علاوہ چارہ نہیں کہ میں اس کی ان مدد کروں۔ اس نے باندی کو حکم دیا اور پھر مڑ کر ایرا سے کہنے لگی تمہیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ضرورت پڑے تو تیز گرم پانی سے انھیں لینا بھول نہ جانا۔

میں اسے یاد رکھوں گی ایرا نے جواب دیا۔

جب باندی جانے لگی تو اس نے جاتے جاتے رونگ کو آہستہ سے بلا کر مخاطب کیا۔ وہ تھوڑی دیر رکا اس کے بعد کمرے سے باہر جا نکلا بیٹے کہاں جا رہے ہو کنگ نے اسے پکارا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔

میں ایک منٹ میں آتا ہوں رونگ نے جاتے جاتے دروازہ سے جواب دیا۔

رونیلڈ نے یہ سب دیکھا اور وہ اپنی جگہ پریشان نظر آنے لگا اگر نگ فوراً نہیں آتا تو انھیں فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس نے ت سے لمحات اسی بے چینی میں گزار دیے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ رونگ داخل ہو رہا ہے۔ کم از کم ان لمحات میں تو اس نے دھوکا نہیں ۔ مگر اس سے کچھ بعید نہیں تھا مگر وہ اس وقت تک کچھ کر بھی نہیں ہے تھے۔ جب تک ایرا تیار نہ ہو جاتی۔

باندی مرہم لے کر داخل ہوئی اور اس نے اسے مسز کنگ کو دے ۔ اس نے رونگ کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اس نے خالی کو کہتے ہوئے تھا۔

رونگ نے سب کچھ سن لیا مگر کوئی جواب نہ دیا اسے باندی پر پورا را اعتماد تھا مگر اس نے اس وقت اپنی اپنے خاندان کی اور باپ کی حفاظت خیال سے کچھ نہیں کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن یہاں آئے۔ اور رہا ایرا سوال تو وہ اسے یہاں روکنا چاہتا تھا۔ وہ اسے ضرور روکے گا اور دشمن کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اس نے گردن ہلائی اور فوراً کمرے ر داخل ہو گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کا دماغ برابر مصروف رہا اسی وقت مسز کنگ نے مرہم کو لگانا شروع کیا اس نے کنگ ے ایک برش کو میز پر سے اٹھایا اور ایرا کے پپوٹوں پر پھیرنے لگی ایرا نے آنکھیں بند کر لیں

اب میں بالکل اندھی ہوں اور یقیناً میں کچھ خوفزدہ بھی ہوں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

خوفزدہ ہونے کی بات نہیں رونیلڈ نے جواب دیا۔ مسز کنگ اب وہاں آنکھوں پہ برش پھیرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] لمبی ہیں۔ اس نے قینچی سے تھوڑی پلکیں کتر دیں۔ اب تو [illegible] معلوم ہوتی ہے خوش قسمتی سے تمہاری ناک بھی لمبی نہیں ہے۔ کنگ عجیب سا لگ رہا ہے۔ اے اجنبی لڑکی میں تمہاری مدد کروں گا۔ رونیلڈ نے کہا اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور جلد ہی وقت سے اس کے ہاتھ کی گرمی کا احساس ہوا۔

تمہارا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے۔ اس نے رونیلڈ سے تعجب سے کہا میں ان آدمیوں میں سے ہوں جن کے ہاتھ ہمیشہ ٹھنڈے رہتے ہیں اس نے وثوق سے کہا۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مسز کنگ نے اسے غور سے کہا اور پھر آہستہ سے کہا کہ اگر راستے میں کوئی وقت آئے تو وہ اپنے آپ کو میاں بیوی بھی بتا سکتے ہیں۔

یقیناً بوڑھے نے کہا اب انھیں ہر کوئی چینی ہی کہہ سکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو یہاں چینی ہی ظاہر کرنا۔

کنگ نے رونیلڈ کو ہدایت کی تاکہ لوگ انھیں اجنبی نہ کہہ سکیں۔

رونیلڈ کہنے سے پہلے کچھ جھجکا اور پھر اس نے ایرا سے پوچھا کہ اسے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس نے بغیر کسی توقف کے کہا مگر وہ رونگ کی طرف سے بہت خوفزدہ تھی۔ اب رخصت کا وقت آ گیا تھا۔ بوڑھے کنگ نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک کھردرا نقشہ نکالا اور اسے گھورتے ہوئے رونیلڈ کو سمجھانے لگا۔

تم صرف میرے خاندانی گاؤں تک پہنچ سکتے ہو۔ وہاں دو بھائی ہیں جب تم وہاں پہنچو گے تو صبح ہو چکی ہوگی میرے سب سے بڑے بھائی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے اور وہ تمہارا استقبال کریں گے۔ تم وہاں رات تک آرام سے سو سکو گے۔ باہر مت نکلنا۔ اندھیرا ہونے تک اندر رہنا۔ میرا بھائی تمہیں آگے راستہ دکھائے گا۔ اس سے کچھ نہ کہنا تمہاری سمجھ میں بات بھی آ گئی یا نہیں۔

ٹھیک ہے رونیلڈ نے کہا۔

میں یہ سب اس لیے کہا کہ جب ہم گھر سے باہر قدم رکھیں گے تو پھر ہم

[illegible] کی کمک سے وہ بچ گیا۔

[illegible] بہت مشکل میں تھا اس کے لئے یقین [illegible] کے سامنے رو رہے تھے۔ اس نے جیسوں [illegible] سب خیال کی بات تھی۔ ایسا لگ رہا تھا [illegible] مسز لنگ کی آنکھیں بھیگ گئیں وہ آہستہ آہستہ [illegible] کر الگ ہوئی۔ اب یہ تنہا رہ گیا تھا جب وہ [illegible] بات کرتے چلی جائے۔ اس نے آہستہ سے بتایا کہ وہ دیکھنے سے بالکل مجبور تھی۔

خدا حافظ روفنگ

خدا حافظ روفنگ نے جواب دیا۔ وہ چند سفر کر کے وہ مسکرایا۔

وہ دونوں صحن سے باہر آئے جہاں سلسلہ گاڑیاں اس کا انتظار کر رہی تھیں اور اس کے اندر قیمتی دعائیں موجود تھیں نوکروں نے ان گانٹھوں کو بیل گاڑی پر لادا اور وہ سب گاڑی پر سوار ہو گئے۔ لنگ ان کے ساتھ تھا یہاں تک کہ وہ شہر کے دروازہ پر آ گئے۔ سڑک پر بالکل خاموشی تھی وہ بھی اس خاموشی میں اضافہ کرتے رہے صرف گاڑی کے چلنے کی آواز یہ ضرور سنائی دے رہی تھی۔

روفنگ ان کے جانے کے بعد سوچتا رہا کہ بغیر اپنے باپ اور بیرا پیاچانگ کے ہوتے اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو کس طرح باہر جانے سے روکے اس نے اس لڑکے کو ساتھ مل کر دوسرے لوگوں سے اس کے باپ کی شناسائی ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو روک تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے دروازے کے سپاہیوں کو ہوشیار کرنا تھا مگر یہ سب کیسے کیا جا سکتا تھا جبکہ اس کا باپ ان کا برابر شریک تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کے اوپر کوئی مصیبت آئے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ پھر اس افسر کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ وہ غیر ملکی بھاگ رہا ہے۔

جتنی اسے امید تھی سپاہیوں سے مدد لینی چاہیے اس نے طے کیا اور وہ شہر کے مغربی دروازہ کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔

وہ لوگ گاڑی سے آ رہے تھے اس کو پیدل چلنا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کسی قریبی راستے سے جائے تو ان سے پہلے پہنچ سکتا ہے۔ اس نے انھیں اپنے سے قریب ہی پایا اور وہ تیز دوڑنے لگا اس کے جوتے بے آواز تھے اس لئے اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ ان سے پہلے دروازہ پر پہنچ گیا۔ سپاہیوں کو اطلاع ایک طرف لے گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا جب اس کی نظر سپاہیوں کے خوفناک چہرے پر گئی جو اسے بالکل نہیں بھاتے تھے تو اس نے اپنی ہمت اکٹھی کی اور ساری بات کر انھیں وہ خفیہ جگہ بتلائی جس نے انھیں حیرت میں ڈال دیا اور وہ انتظار کرنے لگے کہ یہ لڑکا ان سے کیا کہتا ہے۔ جب اس نے انھیں سمجھانا شروع کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس زبان کو سمجھتے نہیں۔ نہ وہ چینی زبان جانتے تھے اور نہ انگریزی وہ جاپانی لوگ تھے وہ صرف اپنے علاقائی زبان سمجھ سکتے تھے۔ وہ قیمتی لمحات گزر رہے تھے اور اس نے دیکھا کہ گاڑی قریب آ گئی ہے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ سمجھانا چاہا مگر بات صاف نہ ہو سکی وہ گاڑی کی طرف اشارہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ اس نے اس پر اپنے باپ کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنے باپ سے ڈرتا تھا اگر اس کا باپ نہ ہوتا تو اس نے اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو گرفتار کروا دیا ہوتا اور خود اس کو بھی [illegible] ہو گیا ہوتا۔ مگر اب سوال باپ کا تھا اب صرف یہ کر سکتا تھا کہ وہ ان سپاہیوں کے گروہ میں چلا جائے جو ان کے آرام کے لئے بنا ہوا تھا اور وہاں پر خاموش رہے۔

سپاہی اس کو بھول کر گاڑی کی طرف بھاگے تاکہ اس کو روک سکیں اور معلوم کر سکیں کہ وہ شہر سے کہاں جا رہی ہے اور کیوں۔ روفنگ نے اس جگہ سے جہاں وہ پوشیدہ تھا جھانک کر دیکھا کہ اس کا باپ ان سپاہیوں کے سامنے روپیہ کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

شروع میں تو سپاہیوں نے روپیہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ان کے افسر نے گاڑی کا پردہ ایک طرف کھینچا تاکہ دیکھے کہ کیا ہے۔ مگر وہاں پر صرف گانٹھیں تھیں کیونکہ جو لوگ شہر سے بھاگ رہے تھے وہ ان گانٹھوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ اس نے پردہ پھر گرا دیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچیں مسٹر لنگ نے اپنی جیب سے اور روپے نکال لئے۔ سپاہیوں نے انکار کیا مگر لنگ نے روپیہ ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور شہر کا دروازہ ان کے لئے کھل گیا تاکہ گاڑی آسانی سے نکل سکے۔

جب گاڑی دروازہ سے گذرنے لگی تو روفنگ کو اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا محسوس ہوا۔ اس گاڑی میں وہ چھپی تھی ایرا اس سے جس کی [illegible] تھی۔ ایسا لگا کہ ڈرا کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہوا کہ وقت نے اسے قید

کرچکا ہے۔ اس کے لئے آزادی اور خوشی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ وہ ایرا کے سامنے اپنے کو آزاد سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ اسے اپنے آپ سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ ایک نشان تھی آزادی کا۔ آزاد دنیا کا جہاں خوشیاں ہوں۔ آزادی ہے۔ بہاریں ہیں روپیہ ہے اس دنیا کا جس سے اُسے حسد تھا۔ اس لئے کہ اس دنیا میں روپیہ تھا تسکین تھی جس نے زندگی کو راحت بخشی تھی۔ یہاں غریبی اور بھوک مٹ چکی تھی۔ اس نے کبھی سفید فام کو بھیک مانگتے نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی کوئی غریب نظر آیا وہ سمجھتا تھا کہ سب سفید فام امیر ہوتے ہیں۔ آزاد ہوتے ہیں اور یہ ایرا اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ اس کی آرزوئیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

وہ کمرے سے نکل کر بھاگا سپاہی اس کو دیکھ کر مسکرا دینے لگے۔ وہ ایک سڑک پر مڑ گیا۔ اب اس کے لئے صرف ایک راستہ باقی تھا اور وہ راستہ گاؤں کا تھا لیکن وہ اسے اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اس لئے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ یہ تو طے تھا کہ اسے ہر حالت میں انھیں روکنا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس غیر ملکی اور اس کے نوکر کو کسی طرح جاپانیوں کے حوالے کر دے۔ ایرا کو وہ کسی نہ کسی طرح واپس لے ہی لے گا۔ وہ شمال کی طرف مڑ کر وہ جون ملک لین کے گھر کی طرف دوڑنے لگا تاکہ جاپانی افسر جو جون کے گھر آرام کر رہا ہے، اس سے کچھ مدد حاصل کر سکے۔

گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ پہیوں کی گھڑ گھڑ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اب کافی اندھیرا پھیل گیا تھا فالی باہر بیٹھا ہوا تھا اور ایرا اور رونیلڈ اندر۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک مرتبہ جب گاڑی کا پہیہ گڈھے میں گرا تو ایرا اچھل پڑی۔ رونیلڈ نے اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرنے سے بچا لیا۔

ارے معاف کرنا۔ اس نے آہستہ سے کہا مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور کہنے لگا کہ کتنا بُرا ہے کہ میں یہاں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں اور تم بالکل معذور ہو۔

ہاں اس نے مجھے بالکل معذور بنا دیا ہے۔

وہ خاموشی سے بیٹھے رہے مگر رونیلڈ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا وہ اس کو اپنی زندگی سے زیادہ چاہنے لگا۔ اس کا اندازہ اسے اب ہوا۔ اب اس لمحہ جب وہ اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا اور ان میں بات چیت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ تو صرف یہ ہاتھ ہی ان دونوں کے پیغام کا واحد ذریعہ تھا اور ایسے میں وہ صرف اس کے ہی متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کے بال، اس کی چال ڈھال، چلنے کا انداز، سر جھکانے کی ادا، اس کے ہونٹوں کی تراش اور چہرہ معصوم آنکھیں جو بہت سادگی اور نرمی کے ساتھ جھک جاتی تھیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ وہ اس وقت اس سے لال لی اور تیج کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا وہ اسے بہت بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح اس نے نا امیدی کے ساتھ انگلینڈ چھوڑا اور کس طرح اپنی زندگی کو کارآمد بنایا۔ وہ اسے لن تان اور دشمن کے بارے میں بھی بتانا چاہتا تھا جو جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر وہ یہ سب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ سب خطرناک تھا۔ چین کی گاڑی میں انگریزی میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے صرف اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔

ایرا کا دماغ بالکل صاف تھا اسے یہ سفر دلچسپ اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے رونیلڈ پر اعتبار کرتی تھی۔ رونیلڈ کے ساتھ نے اس کے اندر ایک اور عزم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جب ایرا خیند میں جھومنے لگی تو اس نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور سونے کی کوشش شروع کر دی گھنٹے منٹوں میں گذر گئے۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک گاؤں میں داخل ہوئی۔

گاڑی بان نے انکی طرف مخاطب ہو کر بتایا کہ نوجوانوں کا گاؤں آ گیا۔ فالی فوراً کود پڑا۔ رونیلڈ نے ایرا کو جگایا اور اسے اتارنے میں مدد دینے لگا۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انھیں پہلے ہی سے گاڑی کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

رونیلڈ جلدی سے ایرا سے مخاطب ہوا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ابھی اور اسی وقت۔ میں تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے پاگل سمجھو مگر کیا کروں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ میں تو اسی وقت تم سے محبت کرنے لگا تھا جب میں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

گاؤں والے ان کی بات نہ سمجھ سکے مگر فالی بہت زور سے ہنس پڑا اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی ایک بوڑھا آدمی نیلا کوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا اور انھیں راستہ بتانے لگا۔ آپ اس طرف چلیں گے اور میری بیوی عورت کو لے جائے گی۔

میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے یاد رکھنا ابھی مجھے تم سے اور بہت کچھ کہنا ہے۔ رونیلڈ نے جلدی جلدی کہا۔

اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے ہلے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک

خوبصورتی کی مت ہے اگر اس کی [illegible] ہو سکی گیا۔

[illegible]

تم علم ہوا ہے کہا پڑا تم اسے یقین نہ کر سکو [illegible]
کوئی بات ہو تو [illegible] یہاں ساتھ ہوں گا۔ میں بالکل [illegible]
تم جاؤ۔ اس نے کہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

وہ اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظروں سے دور ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد اسے افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نہ تھا اس کی دنیا بھی چلی گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس نے خالی کیا ہوا بستر [illegible] گر گیا۔

وہ ضرور کچھ گڑبڑ ہی خدشہ تھا۔ اس نے اس کو بھی خبردار کر دیا۔ بجلی کی چاندنی کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ اس نے اس طرف سے باہر کی طرف جھانکا جہاں سے چاندنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا صحن میں باپا کے سپاہی داخل ہو رہے ہیں۔

جاپان۔ رونلڈ نے حیران ہو کر کہا۔ انھیں [illegible]

رونگ نے بھی دھوکہ دیا صحن کی دیوار سے کودنا چاہتا تھا۔ سپاہیوں کی ترش اور تیز آواز سن رہا تھا۔ جو چیخ پکار رہی [illegible] مگر وہ ان کی بولی سمجھنے سے معذور رہے۔

اس لمحے ایک درخت کی آڑ سے ایک صورت نظر آئی اور فالی چلایا وہ دیکھو حرامزادہ دوڑ رہا

یہ رونگ تھا۔ وہ وہاں خاموش کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا۔ سامنے ہی گاؤں کا سردار کھڑا تھا جو اس کا چچا بھی تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

بھتیجے یہ سب کیا ہے؟

رونگ نے اسے سلام کیا اور کہا کہ آپ مجھ سے یہاں آنے کا سبب نہ پوچھئے۔ آپ میرے باپ کی زندگی کے بچانے کے لیے ان دو آدمیوں کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔

نہیں۔ ہم نے تمھارے باپ کے حکم کے بموجب انھیں پناہ دی ہے۔ ہم انھیں تمھارے حوالے نہیں کر سکتے۔

میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ انھیں ہمیں دے دیں۔

بوڑھا غصے میں دیوانہ ہو گیا۔ کون ایسا بیٹا ہے جو اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہو۔

تم بالآخر انھیں دے دو ورنہ تو تمھاری جان کی خیر ہے [illegible] [illegible] پکڑ لیا تو [illegible] آگے نہ بڑھ سکے گر [illegible] آپ لوگ [illegible]

مجھے ہونے دو۔ اس نے کہا۔

کس لیے تم یہاں آ گئے ہو۔ فالی نے اس سے پوچھا۔

میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اس نے جواب دیا

تم جس کے پاس بندوق بھی نہیں۔ وہ مارنے جا رہا ہے۔ وہاں دس سپاہی ہیں۔ فالی نے [illegible] اور مضبوط [illegible]

رونلڈ آگے بڑھ گیا۔ فالی اس کے ساتھ [illegible] مگر اس نے رونلڈ کو چھوڑ دیا۔

جانے دو۔ رونلڈ نے کہا۔

ذرا وقت کا انتظار کرو موقع آنے دو چلے جانا۔

وہ رکے ہوئے باہر کے لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔

رونگ ان سے سودا کر رہا تھا۔ دیکھو عورت تو تم دیکھ لو مگر ان آدمیوں کو دے دو۔ مجھے وقت نہ دو۔ میں بالکل مجبور ہوں۔ ان دونوں کو پتہ معلوم ہو گیا اور باپ کی غیر موجودگی میں انھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہاں آؤں اور ان کی مدد کروں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ میرے باپ کی خطا بخش دیں گے اگر میں انھیں ان آدمیوں کو واپس دلا دوں گا۔

اگر تم سچ بولو تو میں خود ان آدمیوں کو تمھارے حوالے کر دوں گا وہ پلٹا اور چلا کر بولا۔ ان آدمیوں کو لے آؤ۔

اسی لمحہ رونلڈ نے دیکھا کہ بوڑھی عورت ایمرا کو لئے آ رہی ہے۔ وہ اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ خطرہ کا لمحہ آ پہنچا ہے۔

واپس چلی جاؤ۔ واپس چلی جاؤ۔ وہ چلایا۔ وہ فالی کی گرفت سے نکل کر تیزی سے صحن کی طرف بھاگنے لگا۔

توبہ۔ فالی کے منہ سے نکلا۔

میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔ رونلڈ نے رونگ سے کہا

رونگ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور ہنسنے لگا۔

ایمرا نے اس ہنسی کو سنا اور وہ سمجھ گئی کہ یہ رونگ ہے۔ اس نے تیز آواز میں کہنا شروع کیا۔ وہ چینی بھی اتنی ہی آسانی اور تیزی سے بول

سکوں جتنی کہ انگریزی۔

بھائیو اور بہنو! تم اپنے اس بھائی کی کسی بات کا یقین مت کرو۔ اگر یہ اپنے ساتھ دشمن کے آدمیوں کو لایا ہے تو یہ غدار ہے۔ اس نے غداری کی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے رونیلڈ سے انگریزی میں کہا تم مجھے واپس جانے کے لئے مت کہو میں اس شخص سے نفرت کرتی ہوں۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ اجنبی روفنگ کے اوپر جھپٹ پڑا اور اس کو زمین پر دے پٹخا۔

فالی یہ دیکھ کر چیخ اٹھا ہم سب کو مل کر ان دشمنوں کو بھگا دینا چاہیے فالی کے ساتھ وہ تمام سپاہیوں پر جھپٹ پڑے۔ مگر وہ کیسے ان سپاہیوں سے لڑیں گے جو مسلح ہیں مگر اسی وقت دوسرے لوگ وہ لاٹھیاں اور دوسری چیزیں لے کر آگئے اور ان لڑنے والوں کی مدد کرنے لگے۔

مجھے بھی دیکھنا چاہیئے ایرا نے سوچا۔ بہن ذرا گرم پانی لا دو۔ اس نے پاس کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت سے کہا

بوڑھی عورت اسے باورچی خانہ میں لے گئی۔ ایرا نے گرم پانی سے اپنی آنکھیں دھونی شروع کیں۔ گرم پانی نے اس مرہم کو پگھلا دیا۔ اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ مگر وہ کچھ نہ دیکھ سکی سوائے اس کے کہ آدمی ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ دو مرتبہ اس نے سنگین آدمی کے سینے کے پار ہوتے دیکھی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اس کی آنکھیں رونیلڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اسے نہ دیکھ سکی وہ اسے تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس نے اسے پالیا وہ ان لڑتے ہوئے آدمیوں کے درمیان روفنگ کا گلا پکڑے ہوئے اسے گھسیٹ رہا تھا۔

وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ کیا تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ وہ اس پر چلایا۔ میں تمہیں مار ڈالتا۔ مگر تمہارے باپ کی وجہ سے چھوڑے دیتا ہوں۔

گاؤں کے لوگوں نے یہ الفاظ سنے اور وہ اس کی تعریف کرنے لگے۔ باپ کی شرافت نے بیٹے کی جان بچالی۔ وہ کہنے لگے۔ اور پھر سپاہیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

سپاہیوں کو ان کے افسر نے روفنگ کے ہر حکم کو ماننے کا حکم دے دیا تھا۔ اور وہ اب تک اس کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اب گولی چلانے کا حکم دے گا مگر روفنگ کس طرح یہ حکم دے سکتا تھا۔ اسکے خاندان کے دو آدمی خاک و خون میں لتھڑے ہوئے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور اس چیز نے اسے بہت خوفزدہ کر رکھا تھا اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ وہ کس طرح اب گھر جائے گا اور اس کے چچا ان کا تو کیا ان کے سامنے بھی جا سکتا تھا یہ صرف کافی نہیں تھا جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو وہاں ایرا کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور اس جھلک رہا تھا وہ کچھ نہیں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکے گی کیونکہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو ان لوگوں سے نکال لیا اور سپاہیوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ سپاہی فوراً اس کا حکم مانتے ہوئے اپنی کاروں کی طرف بڑھ گئے اور وہ بغیر ایرا کی طرف دیکھے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ سب اسے گھورتے رہے۔ گاؤں والے ایرا، رونیلڈ اور نانی۔ سب نے دیکھا کہ سپاہیوں نے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا اور وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا۔ کار جلدی اور کچھ ہی دیر میں سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ سب جانتے تھے کہ اب وہ کبھی دکھائی نہ دے گا۔

گھر میں رونے کی آواز آرہی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے جسم کو لئے اس سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ان کا باپ گھر کے اندر نہ گیا اس نے رونیلڈ سے کہا کہ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مجھے صرف اپنے بھتیجے کی طرف سے معافی مانگنی ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔ اب تم چلے جاؤ میرا بھائی تمہیں بہم تک لے جائے گا اور تمہیں پہاڑیوں کے پاس پہنچا دے گا۔ وہ سب جانتے ہیں

رونیلڈ بہت غمگین تھا۔ اس نے کہا میں کیا کہہ سکتا ہوں ہماری وجہ سے ہی تمہارے بیٹے کی جان گئی۔

نہیں یہ بات نہیں۔ یہ وقت کی بات ہے وقت انسان کا صحیح امتحان ہے کچھ امتحان میں پورے اترتے ہیں اور کچھ ناکامیاب۔ میرا بھتیجا اس میں ناکامیاب ہو گیا۔ وہ غدار نکل گیا اور اب اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بوڑھے نے بڑے وقار سے کہا۔

اس نے نوکرانی کو کچھ پکانے کے لئے پکارا مگر وہ پھر بھی گھر کے اندر نہ گیا اور اس وقت تک جب تک کہ یہ لوگ تیار ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہو کر روانہ نہ ہو گئے وہ وہیں رہا اور ان کے جانے کے بعد وہ بہت آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لئے چلا۔

رونیلڈ اور ایرا نے گاڑی میں اپنی جگہ لے لی اور سفر شروع ہو گیا

اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کیا تم بالکل ٹھیک ہو۔ اس نے اس سے پوچھا۔

[illegible] سب تھا۔ مگر اس کی عادت پیچھے کی۔ [illegible] حرف [illegible] بالکل آ جاتی۔ اس نے خالی کو [illegible] سب بار آئی۔ اس وقت [illegible] ہوتا۔ [illegible] بہت [illegible]۔ خالی کے سے پوچھا ہوا تھا اور گاؤں [illegible] سے [illegible] جاتا تھا۔ وہ بہت باتونی تھا۔ دونوں طرف گاؤں [illegible] ساتھ چل رہے تھے۔ اس کے گاؤں والوں کو باری باری [illegible] اور خود پیدل چلتا تھا۔ وہ بالکل خاموش رہے۔ انھوں نے خود [illegible] سے کوئی بات نہیں کی جب تک کہ وہ خود [illegible]۔ یوں کبھی [illegible] صحبت کرنا ان کی تہذیب کے خلاف تھا۔

وہ راتوں کو سفر کرتے رہے اور [illegible] گاؤں میں رکتے رہے۔ ہر گاؤں [illegible] دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ مرد، مردوں میں اور عورتیں عورتوں میں۔

کیا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہی رہیں۔ اس نے ایک دفعہ پوچھا۔

یہ ضروری ہے اس نے جواب دیا۔ اس لئے کہ ہم ایک دوسرے ملک میں ہیں اور یہاں زندگی خطرے میں ہے۔

وہ عجیب تھی [illegible] کے [illegible] کی سی بات تھی۔ جس سے [illegible] اور [illegible] کی طرح جس کے اندر زہر بھی [illegible] تھا۔ [illegible] سادگی بھی دنیاداری بھی تھی اور اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ جہاں جہاں وہ گئی اس نے اس جگہ سے لطف لیا۔ خوب کھایا پیا اور دل کھول کر ہنسی۔ وہ زیورات پہنے ہوئے تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کے لئے ہی بنے [illegible] وہ ہر آدمی سے محبت سے پیش آتی تھی اور ہر آدمی سے ایسے ملتی تھی کہ [illegible] وہ اس کی بہت ہی اچھی دوست ہو۔ اور اسی لئے بعض لوگ اس کے سامنے بولتے ہوئے جھجکتے تھے۔

وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گذرتے رہے اور ہر قسم کے آدمی ملتے رہے۔ خالی ان کی خدمت کرتا رہا۔ اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ وہ ایک مالک اور ایک مالکن رکھتا ہے جن کی خدمت اس کا فرض ہے۔ وہ اس سے گھنٹوں باتیں کرتا اور وہ اس سے طرح طرح کے سوالات کرتی۔ خالی سے اسے پتہ چلا کہ رونیلڈ شمال مغرب سے ایک سال ہوئے آیا تھا اور وہاں سے دوائیں لایا تھا۔ مگر اب دشمن ان لوگوں پر اعتماد نہ کرتا تھا اور یہ کہ ہندوستانی ڈاکٹر سخت بیمار تھا اور شاید مر بھی چکا تھا اور سب سے ضروری [illegible] بتائیں اس کے [illegible] کہ وقت پر ہسپتال پہنچ جاتا [illegible] تاکہ مرنے سے پہلے [illegible] سمجھا دیا تھا۔ اور اس طرح [illegible] کے بارے میں سب کچھ جان لیا۔ خالی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا جو وہ جانتا تھا وہ بھی اور باقی [illegible]۔ [illegible] جب وہ ایک گاؤں میں ٹھہرے [illegible] بیٹھے [illegible] جیسے [illegible] اس نے اپنے اس [illegible] سے [illegible] لیا۔ تم بہت کم بات کرتے ہو اس [illegible] کو سمجھنا آسان بات ہے۔ اس کا اپنا موڈ ہے جو اس پر طاری رہتا ہے [illegible] سے [illegible] زندگی [illegible] کے لئے بہت ہی [illegible] میں سے ایک بیوی [illegible] عورت ہے جو اس کا خیال رکھے۔ مگر ہم کہاں سے اس کے لئے تلاش کریں۔

[illegible] یقیناً [illegible] کی مصروفیت ہے کہا کہ خالی کو [illegible] سخت [illegible] ہوئی وہ سوچنے لگا کیا اس نے عورت کو کبھی [illegible] مگر جب اس نے اس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا [illegible] اس نے اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

انگریز عام طور سے تیز مزاج کے ہوتے ہیں۔ خالی نے کہا۔ حالانکہ اس نے صرف رونیلڈ کو دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں [illegible] رکھتے ہیں اور ہم چینیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونے کی بجائے چیزوں سے ناامید ہوتے ہیں اور پھر انھیں اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی انگریز بھی میری ذات سے کوئی امید نہ رکھے گا۔ اس نے کہا۔

خالی پھر سوچنے لگا۔ اس عورت کے بارے میں، اپنے مالک کے بارے میں۔

اب انھیں چلتے چلتے چار دن ہو گئے تھے جو ہے [illegible] جب وہ دشمن کی سرحد کے بالکل آخر میں پہنچ گئے تھے۔ گاؤں کا سردار جو ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا رونیلڈ کے پاس آیا اور اسے ایک طرف بلا کر کہنے لگا کہ اب ہم خطرہ میں ہیں۔ آج کی رات سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اب تک ہم کسی نہ کسی طرح سے بچتے رہے مگر اب ہمیں دشمن کے دو دستوں سے بچ کر نکلنا ہوگا اور وہ جگہ جگہ ہمیں روک کر ہماری تلاشیاں لیں گے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اور وہ عورت ایک لفظ بھی نہ بولنا ہم تمھارے لئے جگہ بنائے دیتے ہیں تم وہاں خاموشی سے لیٹ جانا۔ اس نے اپنی جیب سے دشمنوں کے کچھ کاغذات نکال کر اسے رکھنے کے لئے دئے۔ ہم ان کپڑوں کو

بچنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں اور یہ سب دشمن کا کیمپ ہے۔ اگر تمہاری آوازیں انھوں نے سن لیں تو ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ایک لفظ بھی نہ بولیں گے۔

انھوں نے ان بے شمار کی گٹھڑیوں کو اس طرح لگایا کہ ان کے درمیان ایک خلا بن گیا۔ اور اس میں رونیلڈ اور ایرا داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ان گاؤں والوں نے اس خلا کو پھر چاروں طرف سے ڈھکا دیا۔

ایرا جیسے کر پوچھنے لگی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو کہہ دو اس لئے کہ اب ہم کئی گھنٹے تک کوئی بات نہ کر سکیں گے۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے مگر وقت آنے پر کہوں گا۔

جب سفر ختم ہو جائے تب کہنا۔ ایرا نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ دو میل سے کم فاصلہ ہوتا تھا جب وہ دشمن کے سامنے ہوتے گئے۔

اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور ایرا کو ہاتھ پر اٹھا لیا۔ اس نے اس کے رخساروں کو آہستہ سے چھوا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ رونیلڈ کو وقت کا پتہ بھی نہ چلا گھنٹے منٹوں میں گذرتے معلوم ہوئے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ابھی چلا تھا۔ اس نے مختلف آوازیں سنیں جو ادھر ادھر شور مچا رہی تھیں۔ اس نے اندازہ لگا لیا وہ لوگ گٹھڑیوں کو ٹٹول رہے تھے ایک مرتبہ تو ایک سنگین رونیلڈ کے کندھے کو چھوتی ہوئی گذری وہ سانس روکے پڑے رہے۔

آوازیں برابر آتی رہیں۔ بہت دیر کے بعد گاڑی پھر چلنے لگی۔

وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح خاموش پڑے ہوئے گاڑی کے گھسٹنے کی آواز سنتے رہے۔ موت اور زندگی میں ایک قدم سے بھی کم کا فاصلہ تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے حصہ میں کونسا قدم آتا ہے۔ موت اور زندگی ان دو الفاظ نے اسے تیج کی یاد دلا دی۔ اسے بھی وہ اسی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے سامنے بھی موت اور زندگی میں فاصلہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ تیج نے اس سے کہا بھی تھا کہ موت اور زندگی ہم سے اتنی قریب ہیں کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کب کونسی راہ ہمیں مل جائے۔ یہ جسے ہم زندگی کہتے ہیں یہی ایک دن موت میں بدل جائے گی۔ کیونکہ حقیقی زندگی تو موت کے بعد ہی ملتی ہے۔

میں نہیں سمجھا۔ رونیلڈ نے اس سے کہا تھا۔ مگر تیج کہتا رہا تھا جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ موت کے منہ میں ہوتا ہے مگر وہ اس کے خلاف لڑتا ہے اور پیدا ہو جاتا ہے تو یہی موت زندگی میں بدل جاتی ہے۔

آخر کار گاڑی رک گئی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں وہ سنتے رہے۔ یہ آوازیں خوش و خرم لوگوں کی تھیں۔ انھوں نے فالی کی آواز سنی جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

نکل آؤ۔ باہر نکل آؤ۔

لوگوں نے جلدی جلدی گٹھڑیاں ہٹائیں اور سورج کی کرنیں ان کے منہ پر پڑنے لگیں۔ انھوں نے سب سے پہلے فالی کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھا نکل آؤ اور زمین پر آ جاؤ۔

اس سے پہلے کہ وہ اترا ایک تیز آواز اس کے پیچھے سنائی دی۔ جلدی کرو ہم نے بازی جیت لی ہے۔ یہ وہی کھڑا تھا رونیلڈ نے دیکھا اس کا اپنا ٹرک وہیں کھڑا ہے۔ جہاں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔

جلدی کرو جلدی کرو۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں گاڑیاں سب بڑھا دی گئیں۔

وہ کود پڑا اور اس نے اپنا ہاتھ ایرا کی طرف بڑھا دیا۔ آؤ ٹرک کے اندر آ جاؤ۔

اس نے اسے سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ اسکے بیٹھتے ہی ٹرک چل پڑا چھ گھنٹے کے مستقل سفر کے بعد وہ ہسپتال کے سامنے تھے۔ اس درمیان میں وہ ایک جگہ چائے پینے کو ضرور رکے تھے ورنہ چلتے رہے تھے اس کے دماغ میں ہزاروں سوال آ رہے تھے اس نے فالی سے کہا کہ وہ کسی سے پوچھے کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔

جنوب میں یہ اور تیز ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہسپتال کے متعلق معلوم کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ٹھیکیدار ان کے آنے کے اگلے روز مر گیا تھا مگر اس کی بیوی ہسپتال چلا رہی ہے اور وہ اس کی منتظر ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ہسپتال کے سامنے وہ ٹرک سے کود پڑا۔ اس نے بڑھ کر ایرا کو اتارا اور وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صحن کی طرف بڑھا۔

آؤ لاں لی سے ملو۔ اس نے کہا۔

اس نے لاں لی کو آپریشن روم میں پایا۔ وہ تیج کی جگہ کھڑی ہوئی تیج کا چوغہ پہنے ہوئے اس کا کام انجام دے رہی تھی وہ ایک سپاہی کے زخم

[illegible] دوسری نرس [illegible]
[illegible] سے گئی۔
[illegible] رونیلڈ پر گہری نظر [illegible] گئے۔ [illegible]
ہے [illegible]
میں اسے [illegible] آیا ہوں۔ ابھی لاتا ہوں۔ رونیلڈ نے جواب دیا۔ اس نے [illegible] اور تیزی سے [illegible] ہو گئی۔ وہ سب سے [illegible] اچھا تھا۔

یہ شان کا کیا حال ہے۔ رونیلڈ نے پوچھا۔

ٹھیک ہوں کیا تم وہ [illegible] لے آئے۔ شان نے پوچھا۔

ہاں [illegible] میری مدد کرو۔ وہ اس کی مدد کرنے لگا۔

رونیلڈ ڈاکٹر [illegible] کے مرنے سے [illegible] اس [illegible] بیٹھ گیا۔ [illegible] اور وہ ایک کاغذ کھولنے لگا جس [illegible] جب وہ [illegible] ایک خط اس کے پاس آیا [illegible] ایک پیغام ہے۔ تمھارے [illegible] نے [illegible] بھیجا تھا۔

رونیلڈ کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ ڈاکٹر [illegible] کا تھا [illegible] پہلی [illegible] وہ جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ شروع [illegible] اور خط کا [illegible] لکھا [illegible] کا جواب اس نے نہیں دیا تھا۔ آگے ڈاکٹر نے لکھا تھا۔

"تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب [illegible] کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اس نے اب ہنری گرین نامی شخص سے شادی کر لی ہے میں نے اس سے بات کی اور پھر اس بات پہ [illegible] وہ سچ بولے اور اس نے اقرار کیا کہ تم اس کے بچے کے [illegible] اس نے تم پہ اس لئے الزام رکھا تھا کہ اس کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا [illegible] کی بیوی کی حیثیت سے کوئی اسے اس حال میں زندہ نہ رہنے دیتا [illegible] مسئلہ [illegible] حل [illegible] اس لئے اس نے [illegible] دونوں بہت خوش ہیں"

اس خبر نے رونیلڈ کو مطمئن کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اوپر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔

وہ آگے پڑھنے لگا لکھا تھا: "ڈاکٹروں کی یہاں سخت ضرورت ہے اگر تم یہیں چھوڑ کر یہاں آجاؤ تو کیسا اچھا ہو مگر تم خود بہتر سمجھ سکتے ہو کہ تمھاری کہاں ضرورت ہے۔"

[illegible] کی جلدی کر رہی تھی اس نے خط جیب میں ڈال لیا اور [illegible] کی طرف دوڑا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُرنم تھیں۔

میں گولی نہیں پا سکی اس نے کہا یہ جگر کے قریب ہے لیکن یہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے تو ابھی تم سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔

[illegible] گولی [illegible] رفتار دو۔ اس نے [illegible] کو [illegible] ہدایت [illegible] اس نے [illegible] لال لی کے ہاتھوں [illegible] چاقو [illegible] بڑی تیزی سے [illegible] کرتا تھا۔

ابھی چند [illegible] نے ایک سوال کیا۔

[illegible]

[illegible] ہے [illegible]

وہ [illegible] تمھارے لئے بہت اچھا ہو گا

[illegible] ہے؟

[illegible]

[illegible] سے جھگڑا۔ اس نے پوچھا۔

ہاں [illegible] اس نے [illegible] دیا ہے۔

ٹھیک ہے۔ [illegible] ٹھیک ہے [illegible] کام بہت [illegible] زخمی کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور وہ پٹی کرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس وقت تک کام کرتی رہوں جب تک کہ تم نہ آجاؤ اور پھر سب کچھ تمھارے سپرد کر دوں۔

کیا اسے مجھ پر اعتبار تھا۔ اس نے پوچھا اور [illegible] لگا۔

ہاں اس نے کہا تھا کہ تم یہ کام بہت اچھی طرح کر سکتے ہو۔

[illegible] کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس نے اسے محبت بھری نگاہ سے دیکھا

اچھا ہوا [illegible] تمھارے آنے سے پہلے ہی گولی [illegible] دیکھ کر [illegible] ہاتھ اس تیزی سے شاید کام نہ کرتے اس نے [illegible] اس سے کہا۔

تم نے گولی نکال لی۔ اس نے پوچھا۔ میں جانتی تھی کہ تم کر سکتے ہو اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

تم جانتی تھیں تو ٹھیک ہے۔ وہ پھر [illegible] میں مشغول ہو گیا۔

[illegible] رفتار [illegible] لال لی سے کہا اور وہ اپنے چہرے [illegible] اس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی حسین تھیں مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے کتنی مختلف تھیں۔

[illegible] میں [illegible] اس نے حکم دیا۔ لال لی تم اسے سکھا دو کہ کیسے کام ہو گا ÷

جان اسٹین بیک

جان اسٹین بیک کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہے۔ اس نے اپنے شباب کے ایام کیلیفورنیا میں گذارے۔ اسے کیلیفورنیا کی فضا اتنی عزیز ہے کہ وہ دور دراز ملکوں میں برسوں رہ کر بھی کیلیفورنیا لوٹ آتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران وہ برطانیہ میں رہا۔ چند برس ہوئے اس نے روس کا دورہ کیا۔ اس کا ذہنی جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے لئے نچلے طبقے کے کردار منتخب کرتا ہے۔ سماج کی خرابیوں کو اجاگر کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انسان کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے قلم سے بجلیاں ٹوٹنے لگتی ہیں

جان اسٹین بیک ایک ہنگامہ پسند مزاج رکھتا ہے۔ اپنی اسی ہنگامہ پروری کی بدولت اس نے اپنی زندگی کے لئے کئی راستے تراشے اور وہ کہیں بھی جم کر نہ بیٹھ سکا۔ اس نے بڑی تیز رفتاری سے ایک کام کے بعد دوسرا کام اپنایا۔ سب سے پہلے اس نے ایک گوالے کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر وہ ایک بڑھئی کا شاگرد رہا۔ اس کام سے وہ جلد اکتا گیا۔ اور ایک مصور کا شاگرد بن گیا۔ اس کی چنچل طبیعت نے اسے بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ایک ادویات فروش کے یہاں ملازم ہو گیا پھر مزدوری کرنے لگا۔ طبیعت یہاں بھی گھبرا گئی اور اخبار بیچنے لگا۔ آخرکار اسے ایک جاگیر کا نگراں بنا دیا گیا جہاں سال میں آٹھ مہینے برف پڑتی تھی۔ یہیں اس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

اس نے اب تک ایک درجن ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کے بیشتر ناول فلمائے جا چکے ہیں۔ اس کی طرزِ تحریر اتنی شگفتہ اور رنگین ہے کہ ایک معمولی واقعہ بھی قاری کو انتہائی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مکالمہ نویسی میں اس کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جان اسٹین بیک معمولی انسانوں کے معمولی جذبات کا عکاس ہے مگر وہ اپنے مشاہدے اور زندگی کے بھرپور تجربے سے ان میں اتنی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتا ہے۔ کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

جان اسٹین بیک کا یہ ناولٹ اس کے تمام فنی محاسن کا حامل ہے۔ یہ ایک بستی کی کہانی نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری دنیا کی کہانی ہے۔ اس کے تمام کردار مثالی کردار ہیں۔ جو انسانی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔



جان اشٹین بیک



لطیف اکمل

جان سٹین بیک

مترجم عبداللطیف اعظمی

یہ گلیاں یہ کوچے

لی چانگ کی پرچون کی دوکان اگرچہ بہت زیادہ صاف ستھری نہیں تھی، مگر سامان کے لحاظ سے عجیب و غریب تھی۔ دوکان بہت مختصر تھی، مگر اس کے باوجود ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز مل سکتی تھی مثلاً مختلف قسم اور سائز کے لباس، کھانے کی تازہ اور ڈبے کی چیزیں، شراب، تمباکو، مچھلی کے شکار کا سامان، کل پرزے، جوتے، رسے، ٹوپیاں، غرض اس قصبے کی روزمرہ کی سبھی چیزیں مل جاتی تھیں۔

یہ دوکان صبح سویرے کھلتی اور رات گئے بند ہوتی۔ لی چانگ لالچی نہیں تھا، لیکن اگر کوئی روپیہ خرچ کرے تو وہ اسے منع بھی نہ کرتا۔ اسے اپنی برادری میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ کنری رو میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو لی چانگ کا مقروض نہ ہو۔ اس کا اصول تھا کہ جب کسی کا بقایا بہت بڑھ جاتا تو اس کے پیچھے دوڑنے کے بجائے، ادھار دینا بند کر دیتا۔ اس کے اسی معقول رویے کی بنا پر عام طور پر لوگ بقایا ادا کر دیتے یا کم سے کم ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

لی کا چہرہ آفتابی تھا اور خوش اخلاقی میں اپنی آپ مثال تھا۔ وہ انگریزی بہت اچھی بولتا تھا اور بولنے کا انداز اور لہجہ بہت ہی شاندار تھا۔ کیلیفورنیا میں جب زبان کے مسئلے پر جنگ چھڑی تو لی کی گرفتاری پر انعام مقرر تھا۔ مگر یہ چھپ کر سان فرانسسکو چلا گیا اور جب تک یہ ہنگامہ ختم نہ ہوا وہ ایک ہسپتال میں مقیم رہا۔ فرار کے وقت وہ اپنے روپے ساتھ لے جا سکا یا نہیں، اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ شاید وہ نہ لے جا سکا یا شاید اس کا کل سرمایہ ناقابل وصول بلوں کی صورت میں تھا بہرحال یہ واقعہ تھا کہ وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا اور اڑوس پڑوس کے لوگ اس کی بیحد عزت کرتے تھے۔ وہ اپنے گاہکوں پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ اس کا یہ اعتماد اسوقت تک قائم رہتا، جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ مزید اعتماد کرنا حماقت ہے۔ کبھی کبھی وہ کاروبار میں غلطیاں بھی کر گزرتا، مگر ایسی صورت میں بھی وہ فائدے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیتا، کچھ

اور نہیں تو نیک خواہی کی شکل میں۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ فلوپ ہاؤس اینڈ گرل کا تھا۔ دوسرے لوگ چاہے اس کو خسارہ ہی خسارہ کہیں، مگر لی چانگ ایسا نہیں سمجھتا۔

لی چانگ اپنی دوکان میں سگار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے بائیں جانب کیش رجسٹر رکھا رہتا اور داہنے جانب قیمت کا حساب کرنے کے لئے، گنتی گننے کا فریم تھا۔ شیشے کے کیس میں سگار، سگریٹ اور مختلف قسم کی دوائیں تھیں اور اس کی پشت پر دیوار سے لگا ہوا ریک تھا۔ جس میں چند عمدہ قسم کی شرابیں تھیں۔ لی چانگ شراب کے گاہکوں کے معاملے میں ذرا بھی مداخلت نہ کرتا۔ سوائے اس کے کہ سا خلت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔ سگار کیس کا شیشہ لی چانگ کی ڈسک کا کام دیتا۔ اس کے موٹے ہاتھ ہمیشہ اس پر پڑے رہتے اور انگلیاں ہمیشہ حرکت میں رہتیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی تھی، جس سے وہ شیشہ کے تختہ پر کھٹکھٹایا کرتا۔ نصف شیشے کی عینک استعمال کرتا اور چونکہ وہ چیزوں کو ان کے اندر سے دیکھنے کا عادی تھا، اس لئے جب کبھی دور کی چیز دیکھنی ہوتی تو گردن کو پیچھے جھکانا پڑتا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے، جو ہر وقت دوکان کا جائزہ لیتی رہتی تھیں، محبت اور دوستی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کے چمکیلے دانت ہر گاہک کو دیکھ کر نکل پڑتے۔

ایک شام کو وہ پیروں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لئے اخباروں کی گڈی پر پیر رکھ کر کھڑا تھا تو اسی حالت میں مذاق ہی مذاق میں ایک بہت بڑا سودا ہو گیا۔ لی چانگ کی دوکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک عمارت تھی، جو ایک طویل عرصے تک مچھلیوں کے چارے کے گودام کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ یہ ایک پریشان حال شخص ہورس ابی ویلے کی ملکیت تھی۔ ہورس کے دو بیویاں تھیں اور چھ بچے تھے۔ تمرنی تاکانی ہونے کی بنا پر اس پر قرض برابر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ ماں بچوں کا میں سب سے زیادہ وہی مقروض تھا۔ اس شام کو لی چانگ کی دوکان پر وہی ہورس آیا۔

تھا۔ اس کی حساس اور نازک طبیعت نے لی کے چہرے کی ناخوشی کو فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے کہا: "غالباً میں آپ کا بہت مقروض ہو گیا ہوں۔" لی کے لئے یہ سوال خلاف توقع تھا۔ حسب عادت اس کے دانت نکل پڑے، مگر اس نے اثبات میں صرف گردن ہلانے پر اکتفا کی اور اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔ ہورس نے زبان سے اپنے لب تر کئے پھر کہا: "میں نہیں چاہتا کہ میری اولاد اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پڑے۔ تم میرے مکان سے واقف ہو جو مچھلیوں کے چارہ کا گودام ہے۔ اگر میں یہ مکان تم کو دیدوں تو کیا میرا حساب بے باق ہو جائے گا؟" لی چانگ ذرا پیچھے جھکا اور عینک کے نصف شیشوں میں سے ہورس کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں اس کا ذہن بہی کھاتے کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا اور اس کا داہنا ہاتھ قیمت جوڑنے والے فریم پر حرکت کرنے لگا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے جواب دیا: "ہاں حساب صاف ہو جائے گا۔" "اچھا حساب تیار کر لو۔ میں اس مکان کا بیع نامہ لکھے دیتا ہوں۔" ہورس نے بہ عجلت جواب دیا۔ "حساب کتاب کی ضرورت نہیں۔ میں بے باقی کا پرچہ لکھ دیتا ہوں۔" اس طرح مختصر سے وقفے میں یہ سودا ہو گیا۔ لی چانگ فوراً شراب کے پیگ میں غرق ہو گیا۔ اور ہورس سیدھا گھر واپس آیا اور آتے ہی خودکشی کر لی۔ لی چانگ کو اس پر افسوس ہوا، اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اس مصیبت زدہ خاندان کو کھانے پینے کے سامان کی ایک ٹوکری بھیج دی۔

لی چانگ اب ہورس کے گھر کا مالک تھا۔ اس عمارت کی چھت اور فرش بہت عمدہ تھے۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور ایک دروازہ۔ اس نے سب سے پہلے اس کو گودام بنانے کو سوچا، مگر فوراً اس خیال کی تردید کر دی۔ کیونکہ دوکان سے یہ عمارت فاصلے پر تھی اور کوئی شخص بھی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی سونے کی انگوٹھی سے کھٹ کھٹاتا رہا اور ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں مشغول رہا۔ اسی حالت میں میک اندر داخل ہوا۔ میک عمر میں بڑا تھا، اس علاقے کا لیڈر تھا، تجربہ کار اور بھروسہ کا مشیر تھا اور ایک حد تک ایک چھوٹے سے گروہ کا سرغنہ تھا جس کے افراد مختلف خاندان کے تھے۔ جن کے پاس روپے نہ تھے اور جن کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت اور آسودہ خاطری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ایسے لوگ زیادہ تر عیش و عشرت کی خاطر اپنے کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتے ہیں، مگر میک اور اس کے ساتھی ان سے مختلف تھے۔ وہ عیش کی سرحدیں اچانک اور بہت خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مقصد پورا کر لیتے۔ میک اور ہیزل نوجوان اور طاقتور تھے، [illegible] ایڈی ایک شراب خانہ میں آب دار [illegible] اور جونس جو وقتاً فوقتاً سائنس کے ایک تجربہ گاہ کے لئے مینڈک اور چوہے بیچا کرتے۔ یہ سب فی الحال لی چانگ کے قریب ہی زنگ آلود بڑے بڑے پائپ میں رہتے تھے۔ جب موسم خراب ہوتا تو ان پائپ میں رہتے اور جب موسم اچھا ہوتا، تو سرو کے ان درختوں کے نیچے رہتے جو نسبتاً اونچائی پر تھے اور جن کی شاخیں کچھ اس طرح جھک کر آپس میں مل گئی تھیں کہ ان سے ایک منڈپ کی سی شکل بن گئی تھی۔ جہاں سے ایک شخص بہت آسانی سے کینری رو کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

لی چانگ کے چہرے پر میک کی آمد سے ذرا سختی پیدا ہوئی اور یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ اس کے ساتھی ایڈی، ہیزل، ہیوز اور جونس تو نہیں ہیں، اس نے اسٹور پر ایک نظر ڈالی۔ میک نے آتے کے ساتھ ہی اپنا مدعا بیان کیا۔ "لی! میں نے اور ایڈی اور دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہوا ہے کہ ہورس کا مکان تم نے خرید لیا ہے؟" لی چانگ نے اثبات میں سر ہلایا اور مزید استفسار کا منتظر رہا۔ "ہم اور میرے دوست چاہتے ہیں کہ تم ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیدو، ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔" اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی: "ہم کسی کو اندر گھسنے نہ دیں گے، نہ کسی چیز کا نقصان ہونے دیں گے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ لونڈے کتنے شریر ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ کھڑکیاں توڑ دیں۔" میک نے مشورہ دیا۔ "اگر کوئی شخص اس پر نگاہ نہ رکھے گا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی آگ لگا دے۔"

لی کی آنکھیں میک کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ اور اس کے خیالات گہرے ہوتے گئے، اس کی انگلیوں کی کھٹ کھٹاہٹ کمزور پڑتی گئی۔ میک کی آنکھوں میں خلوص، محبت اور انسانی دوستی جھلک رہی تھی، مگر لی چانگ شک اور شبہے کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھا اور اس کی یہ خیالی دنیا آہستہ آہستہ حقیقت بنتی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے میک کی درخواست کو ٹھکرا دیا ہے اور کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو گئے ہیں۔ میک نے مکان کی حفاظت کی دوبارہ پیشکش کی ہے اور اس مرتبہ بھی انکار کر دینے پر لی نے مکان سے دھواں نکلتے دیکھا، جسے میک اور اس کے ساتھیوں نے بجھایا۔ لی کی انگلیاں رک گئیں اور اس نے اپنے کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ بالآخر لی نے جواب دیا: "تم چاہو تو مکان کو کرایہ پر لے سکتے ہو۔" میک کی خوشی سے باچھیں

کو کتنی ادا کر سکتے ہیں؟ "پانچ ڈالر فی ہفتہ" لی نے جواب دیا "بہت اچھا، میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں گا۔" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا: "کیا چار ڈالر فی ہفتہ نہیں ہو سکتے؟" "پانچ ڈالر" لی نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔ "بہت اچھا، دیکھو میرے ساتھی کیا کہتے ہیں۔" جیک کا جواب تھا۔

اس کے بعد معاملہ طے پا گیا۔ پھر دونوں پارٹیاں اس پر خوش تھیں — دوسروں کی نگاہ میں چاہے اس سودے میں لی چانگ کا نقصان ہی نقصان تھا، مگر خود اس کا خیال اس سے مختلف تھا۔ کیونکہ کھڑکیاں محفوظ تھیں اور آگ کے شعلے کبھی نہیں بھڑکتے۔ اگرچہ مکان کا کرایہ کبھی وصول نہیں ہوا، مگر کرایہ داروں کو جب بھی پیسے ملتے — اور اکثر ملا کرتے — تو وہ صرف لی چانگ کی دوکان ہی پر خرچ ہوتے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ لی چانگ کو ایک مختصر مگر سرگرم گروہ مل گیا تھا جو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اگر کوئی شرابی کبھی دوکان میں دنگا فساد کر بیٹھتا یا نیو مانیٹری کے سپاہی غنڈہ گردی کر بیٹھتے تو لی چانگ کی صرف ایک آواز پر اس کے کرایہ دار اس کی مدد کو آ پہنچتے۔ علاوہ ازیں لی چانگ کی اب ہر چیز محفوظ تھی۔ اس کی وجہ سے اس کو جتنا فائدہ پہنچتا تھا، وہ مکان کے کرایہ سے کہیں زیادہ تھا۔

بہرحال جیک اور اس کے ساتھی اس مکان میں منتقل ہو گئے اور مچھلیوں کا چارہ وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سے اس مکان کا نام "فلاپ ہاؤس گرل محل" مشہور ہو گیا۔ اس کے رہنے والوں کی پچھلی زندگی ہر قسم کے فرنیچر سے بے نیاز تھی۔ مگر موجودہ حالات میں فرنیچر کا اضافہ، جدید تہذیب و تمدن کی نشانی ہے، ناگزیر تھا۔ چنانچہ میز، کرسی اور چارپائی سے ان خانہ بدوشوں کی زندگی روشناس ہوئی اور فلاپ ہاؤس گرل محل میں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ اس کے مکین دروازے کے سامنے بیٹھ کر زندگی کا نظارہ کرتے، رات میں سائنس کے تجربہ گاہ کے گانوں سے محظوظ ہوتے اور جب ڈاک لی چانگ کی دوکان پہ شراب پینے جاتا تو ان کی آنکھیں اس کا تعاقب کئے بنا نہ رہتیں۔ ویسے موقع پہ میک کہا کرتا "ڈاک بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔"

لی چانگ کی دوکان کھلے میدان کے دائیں جانب تھی (دیکھئے اس کو کھلا میدان کیوں کہتے تھے، حالانکہ اس پر پرانی بھٹیوں، زنگ آلود پائپ بیکار شہتیر اور ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے)۔ اس خالی میدان کی پشت پر ریلوے لائن اور فلاپ ہاؤس گرل محل تھا اور میدان کے بائیں کنارے پر ڈورا فلڈ کا شاندار قحبہ خانہ تھا، جو صفائی ستھرائی اور ایمانداری کے لحاظ سے اچھی شہرت کا حامل تھا۔ جو بھی وہاں جاتا سکون اور اطمینان قلب محسوس کرتا۔ کوئی سستے قسم کا قحبہ خانہ نہیں تھا، جہاں چند منچلے وقتی تفریح کے لئے آ جاتے تھے۔ اس کا معیار بڑا اونچا تھا اور اس کے رہنے والے اچھے کردار کے حامل تھے اور ڈورا جیسی شخصیت اس کی انتظام و انصرام کی ذمہ دار تھی، جس نے سالہا سال کی محنت، مصلحت بینی، حقیقت پسندی اور ایمانداری سے ایک خاص شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی، جس کی ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ بڑی قدر کرتا تھا، مگر اس کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جو انہیں خوبیوں کی بنا پر اس سے نفرت کرتا تھا۔

ڈورا بڑی عظیم اور شاندار عورت تھی، اس کے بال شوخ سنہرے رنگ کے تھے اور اسے شام کا لباس گہرے ہرے رنگ کا بہت مرغوب تھا۔ اس کے یہاں مول بھاؤ نہیں ہوتا تھا، اس کے یہاں شور مچانے والوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، شور اور بیہودہ گوئی کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی لڑکیوں میں بعض کافی بوڑھی ہو چکی تھیں، مگر ڈورا کی شرافت نے ان کو الگ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ خود کہا کرتی تھی کہ ان میں سے بعض لڑکیاں ایسی ہیں کہ مہینے میں تین گاہک بھی وصول نہیں کر سکتیں، مگر وہ روزانہ پابندی سے تین مرتبہ کھانا کھاتی ہیں۔ ڈورا نے اپنی اس جگہ کا نام بیئر فلیگ ریسٹورانٹ رکھا تھا۔ اس میں بارہ لڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک یونانی باورچی اور ایک چوکیدار بھی تھا، جو چوکیداری کے علاوہ بعض " سے نازک اور خطرناک امور بھی انجام دیا کرتا۔ اگر کوئی لڑائی کر بیٹھتے تو اس کی گوشمالی کرنا، مست شرابیوں کو باہر نکالنا، ہسٹریا کے مریضوں کو ہوش میں لانا، درد سر کا علاج کرنا اور شراب خانے کی نگرانی کرنا، یہ تمام ذمہ داریاں اسی کو انجام دینی پڑتیں۔ اس سے پہلے جو شخص اس جگہ کام کرتا تھا، وہ ذرا غیر متوازن قسم کا تھا اور اس کا خاتمہ ایسے حالات میں ہوا تھا کہ ڈورا کی شخصیت داغدار ہو سکتی تھی، مگر الفریڈ نے آتے ہی صورت حالات پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ کس قسم کے لوگوں کو وہاں آنا چاہئے اور کس قسم کے لوگوں کو نہیں۔ نیز وہ مانیٹری کے باشندوں کی

گھریلو زندگی سے پوری طرح واقف تھا۔

ڈورا کا پیشہ ایسا نازک تھا کہ اسے بڑی احتیاط کرنی پڑتی۔ خلاف قانون ہونے کی بنا پر دوسروں کے مقابلے میں ان کی ذمہ داریاں دہری تھیں۔ کوئی خرابی بدمست ہو کر ہنگامہ نہ کرے، دنگا فساد نہ ہو، بدتمیزی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اسے خرچ بھی کافی کرنا پڑتا۔ ہر شخص کی نگاہ اس پر تھی۔ اگر پولیس کو اپنی پنشن کے فنڈ کے لئے رقص و سرود کی محفل سجانی ہوتی تو اس کے لئے دوسرے ایک ڈالر چندہ دیتے تو ڈورا کو پچاس ڈالر دینے پڑتے۔ چیمبر آف کامرس کو اپنے لان کو بہتر بنانے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی تو عام تاجر اگر پانچ ڈالر دیتے تو ڈورا سے سو ڈالر طلب کیا جاتا اور اسے دینا پڑتا۔ غرض کہ ریڈ کراس کمیونٹی کے مشترک فنڈ، بوائے اسکاؤٹس وغیرہ کے لئے جس قدر عطیے حاصل کئے جاتے ان میں ڈورا کی گناہ کی کمائی کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی۔ لیکن سب سے زیادہ ڈورا کو اس وقت خرچ کرنا پڑا جب کنسری رو میں کاروبار مندا پڑ گیا تھا اور ہر طرف بیکاری اور غربت پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت معمول کے چندوں کے ساتھ ساتھ ڈورا نے بھوکے بچوں، بے کار والدین اور پریشان حال عورتوں کی کافی خبرگیری کی اور ان کے کھانے پینے کے بلوں کی کوئی دو سال تک ادائیگی کرتی رہی۔ ڈورا کی لڑکیاں بڑی تربیت یافتہ اور خوش اخلاق تھیں۔ وہ راستہ میں کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتیں، چاہے وہ کیوں نہ ہو جس کے ساتھ گذشتہ رات بسر کی گئی ہو۔

موجودہ چوکیدار الفریڈ کے آنے سے قبل بیرفلیگ ریسٹورانٹ میں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ سابق چوکیدار ولیم تنہائی پسند تھا، دن کے وقت جبکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہوتی تھیں، عورتوں کی صحبت سے الگ تھلگ رہتا۔ کھڑکیوں سے ہیک اور اس کے ساتھیوں کو خالی میدان میں نلوں پر بے فکری کے ساتھ گپ کرتے اور شراب پیتے دیکھتا تو ان کی زندگی پر رشک کرتا۔ بالآخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا اور وہ ان کی مجلس میں شریک ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ہر ایک اس طرح خاموش ہو گیا، جس سے اس کے دلی اضطراب اور غصے کا اظہار ہوتا تھا۔ ولیم مایوس ہو کر بیرفلیگ واپس آگیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ گفتگو پھر جاری ہو گئی ہے تو اس کا غم دوچند ہو گیا۔ دوسرے روز ولیم پھر گیا اور اس مرتبہ اس نے وہاں بیٹھ کر شراب بھی پی۔ مگر اس مرتبہ ہیک اور اس کے ساتھیوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور جب تک وہ [illegible] رہے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ولیم تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ بیرفلیگ پہنچا تو اس کو ہیک کی اونچی آواز سنائی دی: "خدا اس کو جہنم رسید کرے، مجھے اس دلال سے سخت نفرت ہے۔" گو یہ الزام صحیح نہیں تھا، مگر ولیم کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اسی وقت ہیٹ پہنا اور سمندر کی طرف چل دیا اور اس خاموش اور پرسکون فضا میں اپنے بارے میں سوچنے لگا، ساحل کا دلکش نظارہ بھی اسے بُرے اور خطرناک خیالات سے جو اس وقت اس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے، روک نہ سکا۔ اسے دکھ تھا کہ دنیا میں کوئی نہیں جو اس سے محبت کرے، کسی کو اس کی پرواہ نہیں، وہ چوکیدار ہے، مگر دنیا اسے دلال سمجھتی ہے ——— گناہ کا دلال، دنیا کا ذلیل ترین انسان۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیا اسے شرافت کی اور خوشی کی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں ہے۔ ضرور ہے۔ وہ انتہائی غصے کی حالت میں واپس آیا، مگر بیرفلیگ پہنچتے ہی اس کا غصہ جاتا رہا۔ اس وقت "موسم خزاں کا ماہ کامل" (ہارویسٹ مون) کی دھن فضا میں مرتعش تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کی پہلی محبوبہ کو یہ دھن کس قدر پسند تھی۔ اس خیال نے اس کا غم دوچند ہو گیا۔ اس وقت ڈورا اپنی خلوت کی نشست گاہ میں چائے پی رہی تھی۔ اس نے ولیم کا چہرہ دیکھ کر تعجب سے پوچھا: "معاملہ کیا ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟" "نہیں"۔ ولیم نے جواب دیا: "تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سر ٹکرا کر جان دے دوں۔" ڈورا کو اپنی زندگی میں اس قسم کے اعصابی مریضوں سے کافی سابقہ پڑا تھا۔ وہ ایسوں سے ہمیشہ بچوں کا سا سلوک کرتی اور ان کی باتوں پر کبھی سنجیدگی سے دھیان نہ دیتی۔ "ضرور جان دے دو، مگر خدا کے لئے میرا فرش خراب نہ کرنا۔" ڈورا نے جواب دیا۔

ولیم کے دل پر گہرے بادل چھا گئے۔ وہاں سے خاموشی کے ساتھ نکلا۔ اور ایوا فلیشگن کے دروازے پر دستک دی۔ ایوا کے بال سرخ تھے اور وہ ہر ہفتہ اعتراف گناہ کے لئے چرچ جایا کرتی۔ بڑی مذہبی تھی، مگر شراب کی بڑی دلدادہ تھی اور غیر معمولی بناؤ سنگار سے اپنے حسن رفتہ کی تلافی کی کوشش کیا کرتی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بھدی ہو گئی تھی اور ولیم کو معلوم تھا کہ ڈورا بھدی اور بے ڈول جسم کی عورت کو اپنے یہاں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ اس وقت ایوا غصہ میں بھری بیٹھی تھی۔ ولیم کو دیکھ کر تیز لہجے میں بولی: "تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟" ولیم کو بھی غصہ آگیا۔

[illegible] پاس پہنچا [illegible] اس نے کوئی جواب دیا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بیٹھے ہوئے [illegible] [illegible] بیت [illegible] بہت ہی [illegible] ہو [illegible] [illegible] بہت [illegible] تک پہنچنے [illegible] دیکھ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ [illegible] بہت [illegible] [illegible] ولیم [illegible] سے کافی بیزار تھا۔ اس نے [illegible] [illegible] [illegible] رہا گیا۔ [illegible] [illegible] یونانی کے پاس بیٹھ کر سکون ملتا تھا۔

یونانی اس وقت [illegible] چھوٹے سے بڑے تھیلیوں میں گوشت کے [illegible] رہا تھا اور بہت کٹنے کی چھری سے انہیں الٹ پلٹ رہا تھا۔

"ہیلو دوست، کیا حال ہے؟" ولیم کو دیکھ کر سوال کیا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم" ولیم نے بیزاری سے جواب دیا۔ "کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنا گلا کاٹ لوں"۔ یونانی نے چھری چولہے پر رکھی اور آستین اوپر چڑھا [illegible] "آخر تم کہہ کیا رہے ہو؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ ولیم نے ہاتھ [illegible] چھری اٹھا لی۔ اور یونانی کی سیاہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ یونانی کی آنکھوں سے پریشانی ظاہر تھی۔ ولیم اس کی دلی کیفیت کو [illegible] گیا اور قبل اس کے کہ یونانی اس کے ہاتھ سے چھری چھینے، ولیم کے [illegible] میں پیوست ہو چکی تھی۔ الفریڈ نے ولیم کی طرف [illegible]۔ ہر شخص اس کو پسند کرتا تھا اور یہ ہیک کے ساتھ اکثر پائپ پر بھی جیف کرتا اور کبھی کبھار [illegible] ہاؤس گرل محل میں بھی جایا کرتا۔

ڈاکٹر گریٹ تائمز پول سے، جو جزیرہ نما کے سرے پر واقع تھا سمندری جانور بیچا کرتا تھا۔ جگہ اس قدر عجیب و غریب تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ جب جوار بھاٹا آتا تو گودی پر موجیں اس قدر شدت سے شروع کرتیں کہ ہر طرف کریم رنگ کی جھاگ ہی جھاگ ہوتی۔ اور یہ بیقرار موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں تو ہر طرف سیٹی سی بجتی۔ لیکن جب سمندر اتر جاتا تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور منظر انتہائی خوبصورت ہو جاتا۔ سمندر کا پانی اس قدر صاف شفاف ہو جاتا کہ تہہ کی تمام چیزیں دکھلائی دیتیں۔ مچھلیاں چلتی پھرتی اور لڑتی بھڑتی نظر آتیں۔ قسم قسم کے دوسرے جانور چہلیں کرتے اور کلیلیں کرتے دکھائی دیتے۔ غرض یہ منظر عجیب و غریب ہوتا۔

پول پر ڈاکٹر اور ہیزل دونوں ساتھ مل کر شکار کھیلتے۔ ہیزل فلاپ ہاؤس محل میں میک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کا یہ نام محض اتفاق سے رکھا گیا تھا۔ اس کی پریشان حال ماں کے آٹھ سال میں سات بچے ہوئے، ہیزل آٹھواں تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو اس کی جنس مشتبہ تھی۔ اس کی ماں سات بچوں اور ان کے باپ کو کھو کے بیٹھی اور ان کے کچھ ہی عرصے انتقام کی کافی پریشان اور مصروف ہو گئی۔ وہ روپے کمانے کے لئے بہت جتن کرتی تھی۔ اس کا خاوند گھر میں بیٹھا صرف مشورے دیا کرتا۔ کوشش کرتا اور تنقید ہی کیا کرتا۔ ہیزل کی ماں کے ایک چچا تھے، جن کا نام ہیزل تھا اور وہ لائف انشورنس کا کام کرتے تھے۔ آٹھویں بچے کا نام ان کے نام پر اس وقت ہیزل رکھا گیا تھا جب پہلے نہیں تھا کہ یہ لڑکا ہے، بعد میں اس کی ماں نے نام بدلنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ ہیزل بڑا ہوا تو چار سال گرامر اسکول میں گذارے اور چار سال ریفارم اسکول میں۔ مگر ان میں سے کسی سے بھی کچھ حاصل نہ کر سکا۔ ریفارم اسکول میں رنا ہے کہ برعکس بدخصلتی اور معصیت سکھلائی جاتی ہے، مگر ہیزل نے اس طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہ نتیجہ جب ریفارم اسکول سے نکلا تو اتنا ہی معصوم تھا جتنا ضرب، تقسیم کے علم سے محروم۔ ہیزل کو گفتگو سننے کا بہت شوق تھا، مگر الفاظ پر کبھی غور نہ کرتا، وہ طرح طرح کے سوالات کیا کرتا، مگر جواب معلوم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض گفتگو کی خاطر۔ اس کی عمر ۲۶ سال تھی، بال سیاہ تھے، خوش رو، توانا، رضامند اور وفادار تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ڈاکٹر کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتا، مگر ڈاکٹر کو کسی موقع پر بھی اس سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔ اور سخت سے سخت پھسلن پر بھی اس کے قدم مضبوطی سے جم جاتے اور ان میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوتی۔ وہ شکار کا انتہائی عاشق تھا۔ ڈاکٹر شکار کے وقت برساتی ٹوپی اور گم بوٹ استعمال کیا کرتا، مگر ہیزل کیلئے ٹینس شو اور معمولی کپڑا ہی کافی تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر کو تارا مچھلی کے لئے تین سو کا آرڈر ملا تھا اور دونوں تارا مچھلی پکڑنے میں مشغول تھے۔

ہیزل نے ایک عمدہ قسم کی ارغوانی مائل کی تارا مچھلی پکڑی۔ اس کو اپنے بورے میں جو قریب قریب بھر چکا تھا، جلدی سے ڈالتے ہوئے سوال کیا: "میں حیران ہوں کہ آخر اس کو کرتے کیا ہیں؟"

"تم کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"تارا مچھلی" ہیزل نے جواب دیا۔ "تم ان کو بیچ دیتے ہو۔ تم ان کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بھیجتے ہو۔ آخر لوگ ان کو کرتے کیا ہیں۔ تم کھاتے تو ہو نہیں؟"

"وہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں" ڈاکٹر نے انتہائی تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ اس کو یہ بھی یاد آ گیا کہ اس سے قبل وہ ہیزل کو اسی سوال کا جواب متعدد مرتبہ دے چکا ہے مگر ڈاکٹر میں ایک خوبی تھی کہ اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ جب کوئی شخص کوئی بات پوچھتا ہے تو وہ اس کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، خود ڈاکٹر کا اصول یہی تھا کہ وہ اسی وقت کوئی سوال کرتا تھا، جب اس کو سچ مچ کوئی بات معلوم کرنی ہوتی تھی۔ لیکن ہیزل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ محض گفتگو کی خاطر سوال کرتا اور ایسا طریقہ اختیار کرتا کہ اس کا جواب دوسرے سوال کی بنیاد بن جاتا، تاکہ گفتگو کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

"مشاہدہ کرنے سے ان کو ملتا ہی کیا ہے؟" ہیزل نے گفتگو جاری رکھی۔ "یہ تو محض تارا مچھلی ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ میں تم کو لاکھوں کی تعداد میں پکڑ کر دے سکتا ہوں۔"

"ان میں بہت سی چیزیں سمجھنے کی ہیں اور دلچسپ بھی ہیں" ڈاکٹر نے مدافعانہ انداز میں جواب دیا۔ "اس کے علاوہ ان کو مڈل ایسٹ اور نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی بھیجا جاتا ہے۔"

ہیزل نے اپنے معمول کا طریقہ اختیار کیا: "کیا وہاں تارا مچھلی نہیں ہوتی؟"

"وہاں کوئی سمندر نہیں ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"اوہ!" ہیزل نے کہا۔ حسب عادت وہ چاہتا نہیں تھا کہ اس طرح گفتگو ختم ہو جائے۔ وہ کوئی سوال کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر ایک سوال کر بیٹھا۔ ہیزل کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کیونکہ اس کو جواب دینے کے لئے اپنے دماغ کو کام میں لانا پڑتا اور یہ چیز اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ ہیزل کا دماغ ایک اجاڑ میوزیم کی طرح تھا، اس میں بہت سی چیزیں تھیں۔ مگر تمام چیزیں غیر مرتب حالت میں تھیں۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اسے کوئی بات بھولتی نہیں مگر وہ کبھی انہیں ترتیب دینے کی زحمت نہ اٹھاتا۔ اس کے ذہن میں تمام باتیں اور معلومات اس طرح گڈمڈ اور رلی ملی تھیں جس طرح کسی کشتی کی تہہ میں طرح طرح کی مچھلیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دی جائیں۔

ڈاکٹر نے سوال کیا: "حمل کا کیا حال ہے؟"

ہیزل نے اپنے سیاہ بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "بہت اچھا"

کچھ وقفے کے بعد اس نے مزید کہا: "تم کو کیا، اب ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی بیوی نے اس کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ جاگتے میں اسے مارا جائے تو اسے کوئی غم نہیں ہوتا مگر اس کی بیوی تو یہ فرض منصبی اس وقت ادا کرتی ہے، جب وہ سو رہا ہوتا ہے۔ تم کو اس کی یہی ادا پسند نہیں ہے۔ یہ لڑائی اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہے، اس لئے بیچارہ ہمارے یہاں چلا آیا ہے۔"

"تمہاری بات سمجھا" ڈاکٹر نے کہا: "اس کی بیوی گرفتاری اور جیل کی دھمکی دیا کرتی ہے۔"

"اوہو" ہیزل نے کہا "یہ اس وقت کی بات ہے جب نئی جیل کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ تم کو تیس روز پرانے جیل خانے میں رہ کر اس سے نکلنے کے لئے انتہائی بے چین تھا، مگر نئے جیل میں رہا ہے، آرام وہ پا رہا ہے۔ وہاں افسر اعلیٰ بہت شریف اور نیک ہے، اسلئے ہیزل کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس لئے اب اس کی بیوی جیل بھیجنے کی دھمکی نہیں دیا کرتی اور نہ اس کو سوتے میں مارتی ہے۔ مگر تم کو معلوم ہے کہ تم کو یہ مار پیٹ بالکل پسند نہیں ہے اور وہ اس سے تنگ آ چکا ہے، اسلئے ہمارے یہاں چلا آیا اور میرا قیاس ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔"

ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ گریٹ ٹائڈ پول ہیرے پر موجیں بڑھنا شروع ہو گئی تھیں اور پہاڑیوں سے سیٹی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ غرض جوار بھاٹا سے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے برساتی ٹوپی ذرا پیچھے کر لی "تارا مچھلیاں کافی ہو گئی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا "ہاں سنو ہیزل! تمہاری بالٹی کی تہہ میں چھ سات چھوٹے سائز کے سیپ ہیں۔ اگر اتفاق سے ہم پکڑے جائیں اور انسپکٹر ہم سے پوچھے تو تم کہنا کہ انہیں تم نے اپنے پرمٹ پر پکڑا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بہت اچھا" ہیزل نے کہا۔

"دیکھو!" ڈاکٹر نے نرم لہجہ میں کہا "فرض کرو مجھے سیپ کا آرڈر ملتا ہے، تو انسپکٹر سمجھے گا کہ میں اپنا پرمٹ اکثر استعمال کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ وہ سوچے کہ میں اس کو کھاتا ہوں۔"

"ٹھیک" ہیزل نے کہا۔

"یہی حال انڈسٹریل الکوحل بورڈ کا ہے۔ یہ ہر شخص پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ میں الکوحل پیتا ہوں۔ وہ ہر شخص کے بارے

ڈاکٹر کی مسکراہٹ [illegible] ہونے لگی اور اس کی آنکھیں تنگ ہو گئیں ۔ اسے کچھ وہ بات دکھائی دی ۔ "کیوں ڈاکٹر! کیا مسکراہٹ بھی زہریلی ہو سکتی ہے؟"

"بیوقوفیاں بھی، ہر وہ چیز جو انسان کے منہ سے نکلے اس میں زہر ہوتا ہے ـــ" ڈاکٹر نے جواب دیا ـــ "اس نے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟"

"وہ شخص جو بیٹھا تھا، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے" جیک نے جواب دیا۔

"اس کے لئے صفائی کی کوئی دوا لئے جا!" ڈاکٹر نے کہا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس کے آنے کا کوئی اور مقصد ہے، اس لئے منتظر رہا کہ وہ اصل منشا بیان کرے۔ جیک بھی سمجھ گیا کہ وہ تاڑ گیا ہے۔ اس نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے "ڈاکٹر! اس وقت تم کو کس قسم کے جانوروں کی ضرورت ہے؟" جیک نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "کیوں؟"

"ابھی عرض کرتا ہوں" جیک نے جواب دیا "دراصل مجھے اور میرے ساتھیوں کو روپے کی ضرورت ہے ـــ ایک اچھے کام کے لئے، ایک نیک مقصد کیلئے"۔

"کیا سیر سپاٹے کے لئے گرم جیب کرنے کے لئے؟"

جیک کو اپنے مقصد کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اچھا موقع مل گیا "نہیں، ایسا نہیں ہے" اس نے کہا "بہت اہم مقصد کے لئے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے سوچا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم اس کو مہیا کر دیں۔ اس طرح ہم کو کچھ روپے مل جائیں گے اور آپ کا کام ہو جائے گا"۔

ڈاکٹر نے چند مچھلیاں اور بوری سے نکالیں۔ پھر جیک سے مخاطب ہوا "مجھے کوئی تین چار سو مینڈکوں کی ضرورت ہے۔ میں خود انتظام کر لیتا، مگر مجھے لاجولا جانا ہے۔ کل بہت اچھا جوار بھاٹا آنے کی امید ہے۔ مجھے خاص قسم کے کچھ سیپ کی ضرورت ہے"۔

"کیا مینڈکوں کی وہی قیمت ہے؟" جیک نے سوال کیا "فی مینڈک پانچ سنٹ؟"

"ہاں وہی قیمت ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

جیک کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا "ڈاکٹر! تم مینڈکوں کی ذرا بھی فکر نہ کرو" اس نے کہا "تمہیں جس قدر ضرورت ہے ہم مہیا کر دیں گے"۔

"بہت اچھا" ڈاکٹر نے جواب دیا "تم کو جس قدر ملیں گے میں لے لوں گا۔ مگر مجھے تقریباً تین سو کی ضرورت ہے"۔

"پچاس نہیں، ڈاکٹر! اگر تم کو سات آٹھ سو کی ضرورت ہو تو وہ بھی ہم پوری کر دیں گے" جیک کے چہرے پر بادل سا آ گیا۔ ڈاکٹر اس نے کہا ـــ "کیا وادی تک جانے کے لئے تمہاری کار مل سکے گی؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے بغیر کسی تکلف کے جواب دیا "میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ کل مجھے جوار بھاٹے سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجھ کو لاجولا جانا ہے"۔

"ٹھیک ہے" جیک کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی "خیر اس کا فکر نہ کرو ڈاکٹر! شاید لی چانگ کا پرانا ٹرک ہمیں مل جائے" جیک کا چہرہ اور اتر گیا "ڈاکٹر!" اس نے دوسری درخواست کی "اتنے بڑے کاروبار کے لئے کیا تم کچھ پیشگی رقم دے سکو گے، کم از کم پٹرول کے خرچ کے لئے؟ مجھے یقین ہے کہ لی چانگ پٹرول نہیں دے گا"۔

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "اس سے پہلے تم کو رقم دے کر نقصان اٹھا چکا ہوں"۔

"پھر شاید ہم نہ جا سکیں" جیک نے جواب دیا۔ اسکے لہجے میں غم اور درد تھا۔ ڈاکٹر کو واقعی مینڈکوں کی سخت ضرورت تھی۔ اسلئے اسے اپنے رویے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

"میں ایک اور ترکیب کر سکتا ہوں۔ میں ایک پرچہ لکھے دیتا ہوں، تم پٹرول اسٹیشن سے دس گیلن میرے حساب میں لے لو۔ کہو ٹھیک رہے گا؟"

جیک مسکرایا "بہت اچھا" جیک نے رضامندی ظاہر کی۔ "میں اور میرے ساتھی کل صبح سویرے روانہ ہو جائیں گے اور جب تم جنوب سے واپس آؤ گے تو اتنے مینڈک پاؤ گے، جتنے کبھی تم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ہوں گے"۔

ڈاکٹر نے اسی وقت دس گیلن پٹرول کے لئے پرچہ لکھ دیا۔ جیک نے مینڈکوں کا مزید اطمینان دلایا اور پرچہ لے کر واپس لوٹا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

اس لئے کہ جیک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ سودا کرنے میں شاید اسے بھی فائدہ ہوا ہو۔ جیک تجربہ کار سے سیدھا لی چانگ کی دوکان پر گیا۔ لی چانگ حسب معمول سگار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ جیک داخل ہوا تو اس کی انگلیاں ذرا تیزی سے کھٹکھٹانے لگیں۔ جیک نے بغیر کسی تمہید کے، مدعا بیان کیا: "لی! ڈاکٹر کو نیویارک میوزیم سے مینڈکوں کے لئے ایک بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ ڈاکٹر کو جنوب جانا ہے۔ اس لئے ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوست کو دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہئے، خصوصاً ڈاکٹر جیسے مخلص دوست کی ——— کیوں سالہا سال ڈاکٹر تو وہ تمہاری دوکان پر خرچ کرتا رہا ہوگا؟" لی چانگ بدستور خاموش رہا۔ جیک نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "کیا تم وادی کی زمین تک جانے کے لئے، ڈاکٹر کی خاطر اپنا ٹرک دے سکو گے؟"

لی چانگ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فتح مندی تھی: "ٹرک ٹھیک نہیں ہے" اس نے کہا: "ٹرک خراب ہو گیا ہے۔" اس جواب نے جیک کو چکرا دیا، مگر جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا: سگار کاؤنٹر پر پٹرول کا پرچہ دکھا کر اس سے مخاطب ہوا: "دیکھو، ڈاکٹر کو مینڈکوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پٹرول کیلئے یہ پرچہ لکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹر کا نقصان کسی حالت میں گوارا نہیں۔ گے بہت اچھا مستری ہے۔ اگر وہ تمہارا ٹرک ٹھیک کر دے تو کیا دے سکو گے؟"

لی نے پیچھے جھک کر اپنی عینک کے نصف شیشوں سے اسکو غور سے دیکھنے لگا۔ ٹرک واقعی خراب تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ گے بہت اچھا مستری تھا: "کب تک واپس آؤ گے؟" لی نے سوال کیا۔

"غالباً دوپہر تک، یا ممکن ہے کہ پورا دن صرف ہو جائے۔" جیک نے اطمینان دلایا: "بس جونہی ضرورت بھر مینڈک مل جائیں گے ہم واپس آ جائیں گے۔"

لی پریشان تھا، مگر انکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے حامی بھرنی پڑی: "بہت خوب۔" جیک نے خوش ہو کر کہا: "مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کو تم پر کس قدر بھروسہ ہے۔ میں ابھی گے کو بھیجتا ہوں۔" وہ واپسی کے لئے مڑا: "ہاں!" اس نے رک کر کہا: "ڈاکٹر تمہیں فی مینڈک پانچ سنٹ ادا کرے گا، ہم کوئی سات آٹھ سو مینڈک حاصل کریں گے، تم جانو کتنا بڑا سودا ہے۔ کچھ مینڈک تمہیں بھی دے جائیں گے، پیسے ملنے پر قیمت ادا کر دوں گا۔"

"نہیں" لی نے صاف انکار کر دیا۔

لی چانگ کا ٹرک فورڈ ماڈل ٹی تھا۔ اس سے پہلے مختلف لوگوں کے پاس اس قدر استعمال ہو چکا تھا کہ اب اسکی قریب قریب عمر ختم ہو چکی تھی۔ لی چانگ کو ایک بل کی ادائیگی کے سلسلے ہی ملا تھا۔ اس کو کام میں لانے کے لئے بہت احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی اور چونکہ لی کے یہاں اس قدر توجہ نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے اکثر بیکار پڑا رہتا تھا۔

فلاپ ہاؤس کا ہر شخص ٹرک کو ٹھیک کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، کیونکہ ہر شخص عملاً مستری تھا، مگر گے ان سب میں ماہر تھا۔ یہ سب صبح سویرے لی چانگ کے ٹرک کو درست کرنے میں لگ گئے۔ اس میں کافی وقت لگا۔ مشکلات بھی بہت سی پیش آئیں۔ گے ہی کی کوشش سے ٹرک چلنے کے قابل ہو گیا۔ دو قانونی زحمتیں بھی پیش آئیں۔ ٹرک کے لائسنس کی تجدید نہیں کرائی گئی تھی، دوسرے لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ لائٹ کا مسئلہ تو خیر رات میں پیش آتا، مگر لائسنس کا معاملہ ذرا اہم تھا، اس لئے پیچھے مستقل طور پر کپڑا باندھ دیا گیا اور اس کا ایک حصہ نمبر کی پلیٹ پر اس طرح گرا دیا جس سے پلیٹ ڈھک جائے اور دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اتفاقی طور پر پلیٹ چھپ گئی ہے اور سامنے کی پلیٹ پر اس طرح کیچڑ لگا دی گئی کہ نمبر پڑھے ہی نہ جا سکیں۔ اس کے بعد ٹرک وہاں سے روانہ ہوا۔ پٹرول اسٹیشن پر پٹرول کے لئے رکا۔ جیک نے ایڈولیم کو پرچہ دیا اور اس سے کہا: "ڈاکٹر کے پاس پیسے کچھ کم تھے، اس لئے اگر آپ پانچ گیلن ٹرک میں ڈال دیں اور پانچ گیلن کی نقد قیمت مجھے دیدیں تو عنایت ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جنوب گیا ہے۔ جاتے وقت اس نے یہ بات زبانی کہی تھی۔"

ایڈ بڑی خوش اخلاقی سے مسکرایا: "تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر بہت محتاط آدمی ہے۔" اس نے کہا: "اگر کسی گڑبڑ کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو

[illegible] ملاقات ایک بار ہو۔ پچھلی بار تمہارے ساتھ پیش آئی اس نے [illegible] کر دیا تھا۔"
"سو چالیس ڈالر دیجئے۔" میک نے کہا۔ "شکریہ۔"
"اچھا! چالیس ڈالر میں ڈلوا دیجئے اور پانچ گیلن الگ دے دیجئے۔"

سب ٹرک منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے عام سڑک کے بجائے سنسان سڑک، جس پر کم ٹریفک ہو، سڑک پر تو ٹرک بغیر کسی دشواری کے چلتا رہا، مگر جب پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوئی تو اس کی رفتار کافی سست ہو گئی اور کچھ عرصے میں ریڈی ایٹر کافی گرم ہو گیا۔ مگر یہ کوئی اہم بات نہیں تھی کیونکہ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ ماڈل ٹی کا انجن ریڈی ایٹر کے گرم ہونے کے بعد ہی اچھا کام کرتا ہے، مگر ایسا ہوا نہیں۔ ریڈی ایٹر جب بہت گرم ہو گیا تو ٹرک یکایک رک گیا۔ "کیا ہوا؟" میک نے گھبرا کر سوال کیا۔ "غالباً کاربوریٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔" ٹگے نے جواب دیا۔ "ماڈل ٹی کا کاربوریٹر کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتا، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام پرزے ٹھیک ہوں۔ اگر ذرا بھی خرابی ہوئی تو کاربوریٹر کام نہیں کرے گا۔" ٹگے نے انجن کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کاربوریٹر کی نیڈل والو کا پوائنٹ ٹوٹ گیا ہے۔ "کیا تم ٹھیک کر سکو گے؟" میک نے سوال کیا۔ "نہیں۔" ٹگے نے جواب دیا۔ "دوسری خریدنی پڑے گی۔"
"کتنے میں ملے گی؟"
"نئی کوئی ایک ڈالر میں اور پرانی چوتھائی ڈالر میں۔"
"تمہارے پاس ایک ڈالر ہے؟"
"ہاں۔"
"اچھا تو فوراً واپس جاؤ۔ تمہارے آنے تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔"
ٹگے نے یکے بعد دیگرے تین کاروں کو روکنے کی کوشش کی، مگر کسی نے اخلاق برتنا مناسب نہیں سمجھا۔ چوتھی کار رکی اور اس نے بٹھا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے کار کو رکتے اور اس کو بیٹھتے دیکھا، مگر اس کے بعد ۱۸۰ دن کے بعد اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔
ٹگے کار میں بیٹھنے کے بعد مطمئن ہو گیا، مگر بدقسمتی یہاں بھی ساتھ تھی۔ مانیٹرو پہنچنے سے پہلے ہی کار خراب ہو گئی۔ چونکہ ٹگے ایک ماہر مستری تھا۔ اس لئے اس کی کوششوں سے کار پھر چلنے کے قابل ہو گئی۔ اس کی اس خدمت سے مالک کار بہت خوش تھا۔ اس لئے اس نے شراب پینے کی دعوت دی۔ ٹگے کے لئے آج کا دن ہی کچھ منحوس تھا۔ بار میں چند لوگوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ٹگے کے دوست نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اس سے ایک شخص زخمی ہو گیا۔ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ پولیس پہنچی تو بیچارے ٹگے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

جب اندھیرا ہونے لگا اور سردی بڑھنے لگی تو میک اور اس کے ساتھی صنوبر کی پتیوں پر گھس کر بیٹھ گئے اور ٹگے کی مشکلات کا ذکر کر کے وقت گزارنے لگے۔ "ہم میں سے کسی اور کو بھی اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔" میک نے اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ کوئی دس بجے ایڈی اٹھا۔ "سامنے کی پہاڑی پر کسی ٹھیکیدار کا کیمپ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں، شاید ان کے یہاں کوئی ماڈل ٹی ہو۔"

میک اور اس کے ساتھی بڑے آرام سے صنوبر کی پتیوں پر سوئے۔ دن نکلنے سے کچھ پہلے ایڈی واپس آیا۔ اس کو کافی دوڑ دھوپ کے بعد ماڈل ٹی ملا۔ پہلے اس نے سوچا کہ صرف نیڈل والو نکال لے مگر پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کہ وہ فٹ نہ ہو سکے، اس لئے پورا کاربوریٹر نکال لایا۔ ویسے بھی تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ صنوبر کے درختوں کے نیچے سو رہا۔ دن نکلا تو سب ناشتے میں مشغول ہو گئے اور ایڈی کاربوریٹر فٹ کرنے لگا اور جب ٹرک ٹھیک ہو گیا، تو سب منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ایڈی ٹرک چلا رہا تھا۔
یہ لوگ دریا پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ ایک خوبصورت مقام پر ان لوگوں نے ڈیرا ڈال دیا۔ "اگر یہاں مینڈک مل سکیں گے، تو اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہے۔" میک نے کہا۔ "مینڈکوں کے پکڑنے کا بہترین وقت رات ہے، اس لئے باری باری سے ہمیں جاگنا ہو گا۔"
رات میں ابھی دیر تھی، اس لئے وقت گزاری کے لئے یہ لوگ شراب اور گپ میں مشغول ہو گئے۔
"مجھے تعجب ہے، آخر ٹگے کو کیا ہوا ہے؟" ایڈی نے سب کی توجہ اس طرف منعطف کرائی۔
یہ پہلا موقع تھا جب ٹگے کے جانے کے بعد ان لوگوں نے اس کا ذکر

کیا

"خود میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" ہیک نے کہا "شادی شدہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے وہ اپنی بیوی سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرے، مگر جائے گا اسی کے پاس۔ خود گے کی مثال لے لو۔ اس کی بیوی اکثر گوشمالی کرتی ہے مگر آخر میں گے ہی کو معذرت کرنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد دوسرے موضوعات چھڑ گئے۔ ڈاکٹر کی پارٹی کا بھی ذکر کیا اور اس کی تفصیلات پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ یہ باتیں جاری تھیں کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ ایک لمبا چوڑا آدمی بندوق کاندھے پر ڈالے کھڑا تھا "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو" اس نے رعب دار آواز میں سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں" ہیک نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ فوجی علاقہ ہے۔ یہاں شکار کھیلنے یا کیمپ لگانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اپنا بوریہ بستر اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً چلدو۔"

ہیک بہت ہی خاکساری کے ساتھ کھڑا ہو گیا "ہمیں اس کا بالکل علم نہیں تھا کیپٹن!" ہیک نے عاجزی سے کہا "بہرحال ہمیں بے حد افسوس ہے" کچھ توقف کے بعد اور اس کے بیج کو غور سے دیکھتے ہوئے ہیک نے کچھ کہنے کی جرأت کی "آپ فوجی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ فوجی آدمی کی سج دھج ایک عام آدمی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، میں فوج میں ایک عرصے تک رہا ہوں۔"

"میں اپنی زمین پر آگ جلانے کی اجازت نہیں دے سکتا" اس نے ہیک کی خوشامد سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"ہمیں سخت افسوس ہے" ہیک نے دوبارہ معذرت کی "ہم ابھی صاف کئے دیتے ہیں ـــــ ہم کچھ سائنسدانوں کے لئے کام کرتے ہیں۔ ہم مینڈک پکڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ وہ لوگ کینسر پر ریسرچ کر رہے ہیں اور ہم ان کو مینڈک مہیا کر کے ان کی مدد کرتے ہیں۔"

"وہ مینڈک کیا کریں گے؟" اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ ان کو کینسر کا انجکشن دیتے ہیں" ہیک نے سمجھانے کی کوشش کی "اور اس کا ردِ عمل دیکھتے ہیں ـــــ لیکن کیپٹن! اگر آپ نہیں چاہتے کہ ہم یہاں ٹھہریں، تو ہم ابھی چلے جاتے ہیں"

یکایک ہیک نے کتیا کی طرف دیکھا، جو فوجی کے ساتھ تھی اور کچھ ایسے انداز سے گویا ابھی اس پر نگاہ پڑی ہو "خدا کی قسم بہت عمدہ ہے" اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا "یہ تو بالکل نیلا کی طرح ہو، جس نے پچھلے سال ارجینا میں انعام حاصل کیا تھا۔ کیا یہ اسی نسل کی ہے، کیپٹن؟"

"ہاں" تھوڑے سے تامل کے بعد وہ کچھ بولا "ابھی کچھ دن ہوئے، اس کے کاندھے پر ایک زخم ہو گیا ہے"

"کیپٹن! ذرا مجھے دیکھنے دو" ہیک نے بڑی مستعدی دکھلائی۔

"اوپر کے حصے میں ہے، جہاں وہ چاٹ نہیں سکتی"

"میرے پاس بھی ایک کتیا تھی، اسی قسم کا ایک زخم ہو گیا تھا، وہ مر گئی"

"میں تو آیوڈین لگا تا ہوں"

"بیکار ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا"

"کیا آپکے یہاں ایپسن سالٹ ہے؟"

"کیوں نہیں، ایک بوتل ہے"

"آپ ایپسن سالٹ کی گرم پلٹس بنا کر اس پر روزانہ رکھئے۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے کیپٹن! اگر آپ اجازت دیں تو میں خود اس کی دیکھ بھال کروں گا۔"

کیپٹن نے کتیا کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "میرے مکان کے پاس ایک تالاب ہے، اس میں بے شمار مینڈک ہیں۔ رات بھر سونے نہیں دیتے۔ کیوں نہ تم وہاں آجاتے۔ تمہیں مینڈک مل جائیں گے اور مجھے ان سے نجات مل جائے گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے" ہیک نے کہا "سائنسداں آپ کے بہت ممنون ہوں گے۔ مگر مجھے تو فی الحال پلٹس کی فکر ہے" اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "تم لوگ آگ بجھادو۔ دیکھنا کوئی چنگاری رہ نہ جائے۔ میں کیپٹن کے ساتھ جاتا ہوں اور کتیا کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ تم لوگ بھی جلد آجاؤ۔"

ہیک اور کیپٹن ایک ساتھ چل دیئے۔

ہیزل نے آگ پر ریت ڈالتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے اگر ہیک چاہتا تو امریکہ کا صدر بن جاتا۔"

"مگر بن جاتا تو کیا کر لیتا؟" جونس نے سوال کیا۔

"پھر نہ کچھ تو مزہ آتا ہی"

[illegible]

[illegible]؟"

"نہیں تو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس میں جو چیز دلچسپ ہے وہ پھر وہی ہے۔ اندر اس کو دوبارہ صاف کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔"

"کیا ایسا ہو گا، نہیں ہے؟" ہیزل نے جواب دیا۔ "ابھی حال ہی میں نے دو دیکھے ہیں۔ اس میں حرج کیا ہے؟"

ڈاکٹر جواب دینے والا تھا کہ اس کو خیال آگیا کہ ہیزل اپنی عادت کے مطابق بلا وجہ سوالات کر رہا ہے۔ "چلو چلیں۔" اس نے کہا۔ اس نے تمام گفتگو کا پورا انتظار کا اندازہ لگا اور یہ سمجھ گیا کہ ہیزل کی باتیں سب بے مقصد ہیں۔ ہیزل اس کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلتا رہا، گرتا پڑتا۔

"وہ پینٹر محل میں واپس آگیا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں تو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ اس نے تمام تصویریں پھر سے بنائی ہیں۔ اب کہتا ہے کہ انہیں جوڑ کے کھلکے سے دوبارہ بنائے گا۔"

ڈاکٹر نے تمسخر کے ساتھ پوچھا "کیا وہ اب بھی کشتی بنا رہا ہے؟"

"یقیناً" ہیزل نے جواب دیا۔ "اس نے یکسر بدل دیا ہے بالکل نئے قسم کی کشتی ہے۔ میرے خیال میں ایک ایک حصہ لیتا جائے گا اور جوڑتا جائے گا۔ کیوں ڈاکٹر؟ کیا وہ نمائشی آدمی ہے؟"

ڈاکٹر نے اپنی بھاری بوری اتار کر زمین پر رکھ دی "یہ نمائشی؟" اس نے سوال کیا۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے، مگر اسی قدر نمائشی ہے، جس قدر ہم سب ہیں، بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا مختلف طریقے سے اس کا اظہار کرتا ہے۔"

ہیزل کے لئے یہ جواب خلاف توقع تھا۔ اسے غصہ آگیا "لیکن کشتی...." اس کی آواز ذرا سخت اور بلند تھی "سات سال سے کشتی بنا رہا ہے، جب وہ ختم کے قریب ہوتی ہے تو بدل دیتا ہے اور از سر نو شروع کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف نمود و نمائش کے جذبے کے تحت ایسا کرتا ہے۔ سات سال ایک کشتی پر!!"

ڈاکٹر زمین پر بیٹھا گم بوٹ نکال رہا تھا "تم سمجھے نہیں" اس نے بڑی نرمی سے کہا "ہنری کشتیاں پسند کرتا ہے مگر سمندر سے ڈرتا ہے۔"

"پھر وہ کشتی کیا کرے گا؟" ہیزل نے توضیح چاہی۔

"اسے کشتیاں پسند ہیں" ڈاکٹر نے کہا "لیکن فرض کرو اگر وہ اپنی کشتی مکمل کرلے تو لوگ اس سے کہیں گے کہ اس کو پانی میں کیوں نہیں ڈالتے۔ اگر وہ پانی میں ڈالتا ہے تو اس کو پانی میں جانا پڑے گا اور اسے پانی سے نفرت ہے۔ اس لئے وہ کشتی کو مکمل نہیں کرتا۔ تاکہ نہ مکمل ہو اور نہ پانی میں ڈالنے کا امکان پیدا ہو۔"

تھوڑی دیر تک ہیزل نے بحث کی، مگر جلد ہی اسے بند کر دی اور گفتگو کے لئے کوئی دوسرا موضوع تلاش کرنے لگا "میرا تو خیال یہی ہے کہ وہ نمائشی آدمی ہے" اس نے ڈاکٹر کی دلیل سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

زمین پر سینکڑوں کی تعداد میں بدبودار کیڑے رینگ رہے تھے اور ان میں سے زیادہ تر اپنی دم اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ "ذرا ان بدبودار کیڑوں کو دیکھنا" ہیزل کو ان کیڑوں کی وجہ سے موضوع بدلنے کا موقع مل گیا۔

"بہت دلچسپ ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"آخر یہ احمق اپنی دمیں اوپر کیوں اٹھائے رہتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے اپنے اونی موزے لپیٹ کر گم بوٹ میں رکھ لئے اور جیب سے دوسرے خشک موزے اور ہرن کی کھال کے ہلکے جوتے نکال کر پہنے "یہ عام کیڑے ہیں اور ان کی سب سے عام خصوصیت یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی دم اٹھائے رہتے ہیں۔ مجھے کسی کتاب میں اس کی وجہ لکھی ہوئی نہیں ملی۔"

ہیزل نے اپنے بھیگے ہوئے ٹینس شو کی نوک سے ایک کیڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا "تمہارا کیا خیال ہے، ایسا وہ کیوں کرتے ہیں؟"

"میرے خیال میں یہ دعا کرتے ہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کیا؟" ہیزل کو سخت تعجب ہوا۔

"غیر معمولی بات یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی دم اوپر اٹھائے رہتے ہیں" ڈاکٹر نے کہا "دراصل حیرت ناک غیر معمولی بات یہ ہے کہ ہم اس کو غیر معمولی بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہماری حیثیت ایک کیڑے سے زیادہ نہیں۔ ہم نے اگر کوئی ناقابل توجیہ اور عجیب و غریب بات کی ہے تو وہ ہمارا طریقۂ دعا ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ وہ دعا کر رہے ہوں۔"

"چلو یہاں سے نکل چلیں۔" ہیزل نے کہا۔

جیک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں منتقل ہو گئے، تو ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ابتدا میں وہ اس سے زیادہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ بارش اور ہوا سے ان کو نجات مل جائے۔ محل میں صرف ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس کی دیواریں نقش و نگار سے خالی تھیں اور صرف دو کھڑکیاں تھیں، جن سے مدھم سی روشنی آتی تھی، اس کے علاوہ کمرہ میں مچھلی کے چارے کی سخت تکلیف دہ بُو پھیلی ہوئی تھی۔ جیک اور اس کے ساتھیوں کو ان خرابیوں کا احساس تھا، مگر اس کی اصلاح کے لئے تنظیم کی ضرورت تھی، اور وقت درکار تھا۔ جیک نے فی الحال یہ کیا کہ زمین پر پانچ مستطیل لکیریں کھینچ دیں۔ ہر خانہ سات فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس نے ہر خانے میں ایک ایک نام لکھ دیا اور تمام ساتھیوں سے کہہ دیا کہ جس میں جس کا نام ہے، وہ اس کی ملکیت ہے۔ اگر کوئی ساتھی دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کرے گا، تو باقاعدہ کارروائی کی جائے گی۔ کمرہ کی بقیہ جگہ مشترک ملکیت ہے۔

اس حالت پر یہ لوگ قانع اور مطمئن تھے۔ دن میں زمین پر بیٹھے تاش کھیلتے، گپیں کرتے اور رات میں ہارڈ بورڈ پر سو رہتے۔ شاید اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی، مگر ایک مرتبہ خلاف معمول بڑی شدید بارش ہوئی اور ایک ماہ سے زیادہ جاری رہی۔ اس کی وجہ سے موجودہ صورت حالات میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ اتنے طویل عرصے تک مسلسل زمین پر پڑے رہنے سے یہ لوگ اکتا گئے۔ بے رنگ دیواریں آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور اس مصیبت نے مکان کی حیثیت اور قیمت کو ان کی نگاہوں میں کئی گنا بڑھا دیا۔ لی چانگ نے کبھی مکان کا کرایہ طلب نہیں کیا تھا، اس لئے مالک مکان کے قبضہ کا بھی ان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو مکان کی درستگی اور ساز و سامان کی فکر ہوئی۔ ایک روز سہ پہر ہیوگ ایک پرانی چارپائی کہیں سے لایا۔ جس کے نواڑ جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کو سی سلا کر سونے کے قابل بنایا۔ رات بھر وہ بڑے آرام سے گہری نیند سویا۔ اس کے دوسرے ساتھی رشک سے اس کو دیکھتے رہے اور رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ دوسرے روز جیک کسی لوہے کے بیکار ڈھیر سے زنگ آلود اسپرنگ اٹھا لایا۔ اس طرح فلاپ ہاؤس کے فرنیچر میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا۔ ایک پرانا قالین فرش پر بچھا ہوا تھا، ٹوٹی پھوٹی کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ میزیں اور بغیر ڈائل کی ایک دیوار گھڑی لٹکی تھی۔ ان کو درست کرایا گیا۔ سفیدی کرائی گئی، جس سے کمرہ نسبتاً روشن ہو گیا۔ دیواروں پر آہستہ آہستہ تصویروں کا اضافہ ہونے لگا، لیکن زیادہ تر کیلنڈروں کی تصویریں تھیں، جو بہت سستے قسم کی غیر حقیقی تصویریں ہوتی ہیں، جن کے [illegible] ہوتی ہیں۔ ہنری نے ڈیپارٹمنٹ کی ہوئی چند تصویروں سے کمرہ کی زینت میں مزید اضافہ کیا۔

آخر میں ایک بہترین اسٹو کا اضافہ ہوا۔ انہیں ایک اسٹو کی عرصہ سے تلاش تھی اور جب ان کی منشا کے مطابق ملا تھا تو مول بھاؤ میں کافی دن لگ گئے۔ مالک ڈیڑھ ڈالر سے کم میں بیچنے کے لئے تیار نہیں تھا اور یہ لوگ اسی سینٹ سے زیادہ دینے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ بالآخر بڑی جدوجہد کے بعد یہ سودا طے پایا۔ اسٹو کا وزن کوئی تین سو پونڈ تھا، اس لئے اس کو گھسیٹ کر محل تک لانے میں پورے تین دن صرف ہوئے، حالانکہ صرف پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اسٹو بہت شاندار اور خوبصورت تھا۔ فلاپ محل میں اس کے لگ جانے سے چار چاند لگ گئے اور جیک اور اس کے ساتھی اب اس محل کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔ ایڈی نے دروازے پر چڑھانے کے لئے بیل کا درخت لا کر لگایا۔ ہیوگ نے ایک مخصوص قسم کا پھول کا درخت کسی طرح حاصل کیا۔ کبھی کبھی صفائی بھی کی جانے لگی۔ یہ لوگ جو کچھ ہی عرصہ پہلے بے گھر تھے اب بے گھروں کی ہنسی اڑانے لگے اور فخر و تکبر کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے وقتاً فوقتاً مہمان بلا لاتے اور انکو دو چار روز ٹھہرانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے۔

ایڈی، لاؤ ایڈا کے شراب خانے میں قائم مقام آبدار تھا۔ مستقل آبدار وائٹی جب کبھی بیمار پڑتا یا کسی اور کام سے رخصت پر ہوتا، تو ہمیشہ ایڈی کا ہی اس کی جگہ پر کام کرتا۔ یہ جب بھی قائم مقامی کرتا تو چند بوتلیں ضرور غائب ہو جاتیں، مگر اس کے باوجود وائٹی محض اس لئے اس کو پسند کرتا کہ اسے یقین تھا کہ ایڈی مستقل طور پر اس کی ملازمت کو حاصل کرنے کے لئے کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ ایڈی شراب ضرور چراتا مگر اتنی ہی کہ ہضم ہو سکے۔ وہ ایک گیلن کا جگ شراب خانے کے کسی کونے میں رکھ دیتا اور گلاسوں میں پینے سے جو شراب بچ رہتی، اس کو اپنے جگ میں ڈال لیتا اور جب کبھی کچھ شرابی کسی بحث میں الجھ پڑتے یا بدمست ہو کر بہک جاتے تو ایسے مواقع پر وہ فائدہ اٹھانے سے کبھی نہ چوکتا۔ کبھی نصف، کبھی دو تہائی گلاس، جیسا موقع ہوتا، اپنے جگ میں انڈیل لیتا۔ اس طرح مختلف قسم کی شرابوں کا جو مکسچر تیار ہوتا وہ بڑا پر سرور اور مزیدار ہوتا۔ اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب کبھی اچھے قسم کی شراب کا

۔ شاہزادے [illegible] قبل [illegible] بہت مزہ [illegible] جگہ ہی ڈال ہے۔ اس [illegible] کے ساتھ [illegible] اٹھانے۔ اس لئے فلاپ ہاؤس میں [illegible] بہت پسند کیا جاتا۔ اکثر جب وہ بعض مزدوروں سے بات کرتا، بلکہ کبھی کبھی ان کے بعض کام بھی انجام دیئے جاتے۔

ایک دفعہ جب دوپہر ہیزل، ڈاکٹر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کے لئے چلا گیا اور دوسرے ساتھی محل میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اور [illegible] سر تھے جو اس وقت موجود تھے۔ ایڈی نے ایک خاص انداز سے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور اس کا مزہ لیتے ہوئے کہا: "تم بھی عجیب ہو۔ ان جیسے [illegible] کو [illegible] ہو؟ کس بات کی بات ہے۔ کوئی دس دن رہ [illegible] گے۔ انہوں نے سب سے تیز شراب پی۔ تم تو جیسے ہی [illegible] شراب پی کر دیکھو گے۔ در اصل ایک خاص قسم کا شربت ہوتا ہے، جس کی [illegible] سے اس کا مزہ کئی گنا بہتر ہو جاتا ہے۔"

جیک نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور اپنے گلاس میں مزید شراب ڈالتے ہوئے [illegible] انداز میں کہا: "ہاں، معمولی چیزیں کبھی بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں۔" پھر کر اپنے ساتھیوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی کہ اس کی اس بات کا دوسروں پر کس قدر اثر ہوا۔ صرف [illegible] مرعوب دکھائی دیتا تھا۔ "یقیناً" اس نے کہا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر جیک نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا: "ہیزل کہاں ہے؟"

- "ہیزل ڈاکٹر کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا ہے" جونس نے جواب دیا۔

جیک نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلایا: "ڈاکٹر بہت [illegible] دوست ہے" جیک نے رائے زنی کی۔ دوسرے ساتھیوں نے بالاتفاق اس کی تائید کی۔ "میں عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے کوئی اچھی سی چیز، کوئی ایسی چیز جو اس کو پسند ہو" جیک نے مزید کہا۔

- "اس کو ایک عورت بہت پسند ہے" ہیوئی نے اطلاع دی۔

- "اس کی تو تین چار محبوبائیں ہیں" جونس نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔ جیک نے ہیوئی سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: "محض اس لئے کہ وہ سڑکوں پر دن کی روشنی میں لڑکیوں کے ساتھ گھوما نہیں کرتا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ بہت پارسا ہے؟"

- "پارسا کیا بلا ہے؟" ایڈی نے سوال کیا۔

- "یہی اگر تم کو کوئی عورت نہ ملے تو تم پارسا ٹھہرے" جیک نے جواب دیا۔

- "میرے خیال میں اس کو کوئی اچھی سی پارٹی دی جانی چاہئے" جیک نے اصل مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا ـــ جیک کرسے [illegible] کر رہا ہو گیا۔ سب کی نگاہیں جیک پر تھیں۔ جیک کچھ سوچ رہا تھا۔

- "ڈاکٹر کو کس قسم کی پارٹی پسند ہے؟" ایڈی نے سوال کیا۔

- "کس قسم کی پارٹیاں دی جا سکتی ہیں؟" ہیوئی نے توضیح طلب کی۔

- "ڈاکٹر، جگ والی شراب پسند نہیں کرے گا" جیک نے محرومیت کے عالم میں جواب دیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" ہیوئی نے سوال کیا: "تم نے تو کبھی نہیں پیش کی"

- "مجھے اچھی طرح معلوم ہے" جیک نے جواب دیا: "وہ [illegible] میں رہ چکا ہے"

- "نہیں، تم نے کبھی پیش نہیں کی" اس نے دوبارہ گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

- "تیسرے گلاس کے بعد اس کا مزہ بہت خوب ہو جاتا ہے" ہیوئی نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

- "نہیں" جیک نے اصرار کیا: "ڈاکٹر کے لئے یہ شراب موزوں نہیں۔ اس کیلئے اچھے قسم کی وہسکی چاہئے"

- "اسے بیئر پسند ہے" جونس نے جواب دیا: "وہ لی کے یہاں سے ہمیشہ بیئر خریدتا ہے۔ اس کے لئے اگر اس کو رات میں جانا پڑے، تب [illegible]"

- "میرے نزدیک تو بیئر پر پیسے صرف کرنا حماقت ہے۔ ۹۰ فیصدی تو اس میں پانی، رنگ، حباب اور اسی قسم کی دوسری چیزیں شامل ہوتی ہیں"

- "ایڈی!" اس نے مزید کہا: "اگلی مرتبہ [illegible] کے موقع پر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم وہسکی کی چار پانچ بوتلیں اڑا دو"

- "یقیناً" ایڈی نے جواب دیا: "میں ضرور حاصل کر دوں گا۔ مگر یہ آخری ہوں گی۔ اس کے بعد ناممکن ہے۔ میرے خیال میں [illegible] کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ پچھلی مرتبہ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ بچا کر بھاگ سکا"

- "دیکھو یہ کام تم سے نکلنے نہ پائے" جونس نے مشورہ دیا: "اگر

دھاگے بیمار پڑ جائے یا کسی اور وجہ سے چھٹی لے تو تم کسی نہ کسی طرح اس کی جگہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کے لئے ضرور پہنچ جاتا۔ اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو وہسکی ضرور خریدنی پڑے گی ـــــ ایک گیلن وہسکی کتنے میں ملتی ہے ؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" ہیوئی نے جواب دیا۔ "میں نے ایک وقت میں گلاس آدھے گلاس سے زیادہ کبھی نہیں خریدی۔"

"اگر ڈاکٹر کو پارٹی دی گئی تو پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔" میک نے سب سے اہم معاملہ کی طرف توجہ دلائی ـــــ "پارٹی بہت عمدہ ہونی چاہئے ـــــ بہت شاندار..... کسی کو اس کا یوم پیدائش معلوم ہے ؟"

"پارٹی کے لئے یوم پیدائش کی ضرورت نہیں۔" جونس نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ضرورت تو نہیں ہے، اگر بہتر ہے۔" میک نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں ڈاکٹر کی پارٹی کے لئے بہت کافی روپے کی ضرورت پڑے گی۔"

ہر ایک، ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ہیوئی نے مشورہ دیا۔ "ہیڈی ونڈو کنری میں کام بندی کھلی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔" میک نے فوراً مخالفت کی۔ "لوگوں کی نظر میں ہماری بڑی عزت ہے۔ اس کو کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم میں سے ہر ایک مہینے سوا مہینے کے لئے کام سے لگا ہوا ہے۔ ہم میں سے کسی کو جب بھی کام کی ضرورت ہوتی ہے، تو فوراً ہی مل جاتا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص کبھی بیکار نہیں رہا۔ پھر ہم اپنا وقار خطرے میں کیوں ڈالیں۔"

اس خیال کی سب نے بالاتفاق تائید کی۔ "اگر پارٹی کرنی ہے تو کرسمس کے قریب و جوار میں روپے جمع ہو جانے چاہئیں۔" جونس نے تجویز پیش کی۔ "اس مرتبہ مرغ پکنا چاہئے۔"

"خدا کی قسم ضرور پکے گا۔" میک نے یقین دلایا۔ "کارمیل کی وادی میں میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں، جہاں مرغ کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے ہیں۔"

"اس وادی سے میں بھی واقف ہوں۔" ہیوئی نے کہا۔ "اس سے میں ڈاکٹر کے لئے کچھوے، جھینگے کی مچھلی اور مینڈک پکڑ کر لایا کرتا تھا، پانچ مینڈک پانچ سینٹ میں مجھے ملتے تھے۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔" جونس نے کہا۔ "ایک موقع پر مجھے پانچ سو مینڈک۔ مجھے"

"ڈاکٹر کو اگر مینڈک کی ضرورت ہو تو پھر [illegible]" میک نے کہا۔ "ایک پنتھ دو کاج۔ دریا کا [illegible] تفریح بھی کر لیں گے۔ مگر سنو، ڈاکٹر کو اس کی خبر [illegible] اس کے لئے کو کہاں فراہم کریں گے ـــــ بس اس کے بعد [illegible] دے دیں گے۔"

اس فیصلے پر فلاپ ہاؤس محل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی [illegible]۔ میک نے کہا۔ "ذرا دیکھنا ڈاکٹر کی کار تو نہیں آ رہی ہے؟" جونس نے میک اتار کر دیکھا ـــــ "ابھی تک نہیں۔" اس نے اطلاع دی۔

"بس اتنا کافی ہو گا۔" میک نے کہا۔ "اطمینان رکھو، ہمارا اسکیم مکمل ہو چکی ہے۔"

ڈاکٹر کی کار جب سائنس کی تجربہ گاہ پر آ کر رکی تو میک اور اس کے ساتھی چھپ کر دیکھنے لگے کہ وہ کیا لایا ہے۔ ڈاکٹر اور ہیزل کاسے اترے اور مچھلی کی بوریاں اتار کر تجربہ گاہ میں لے گئے۔ اس سے فارغ ہو کر ہیزل فلاپ ہاؤس محل واپس آ گیا۔ اس کے جوتے اور کپڑے پانی میں تر ہو رہے تھے۔ میک نے پوچھا۔ "ڈاکٹر کا کیا حال ہے؟" "بہت اچھا۔" ہیزل نے جواب دیا۔ "دوستی کا موڈ بھی ہے۔" میک نے پھر سوال کیا۔

"یقیناً۔" ہیزل نے جواب دیا۔ "ہمیں کوئی دو تین سو مچھلیاں ملی ہیں اس وقت اس کا موڈ بہت اچھا ہے۔"

"کیا یہ بہتر رہے گا کہ ہم سب اکٹھا اس کے پاس چلیں۔" میک نے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "نہیں، بہتر ہے میں اکیلا ہی جاؤں۔ ہم سب کے ایک ساتھ جانے میں ممکن ہے وہ گڑبڑا جائے۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟" ہیزل نے سوال کیا۔ "ہم نے ایک اسکیم تیار کی ہے۔" میک نے کہا۔ "میں ڈاکٹر کے یہاں جا رہا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

میک تجربہ گاہ میں داخل ہوا تو ڈاکٹر بوریوں سے مچھلیاں نکالنے میں مشغول تھا۔ میک کو دیکھ کر ذرا گھبرایا۔ اس لئے کہ میک کے ساتھ کچھ مسائل بھی آ جاتے ہیں۔ "کہو کیا حال ہے؟" میک نے بڑے خلوص سے حال دریافت کیا۔ "ٹھیک ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ "تم نے یہ دلچسپ خبر بھی سنی کہ پچھلے ہفتے سینیٹ میں ایک بدمست شرابی کو ٹھکانے کر دو۔ اس کا گھونسا بیٹھا"

چھ سنت بالا لاؤ ڈرگ کیبی روپے کا تھا، اور
لی پنگ کو سکنے کے پیچھے مستقل طور پر گھر کا ۔ ہیکسے نے اس کی
بات کی ۔ اگلے ہی ہیک کے سامنے ریک تھالی، گلین کی پانچ تھیلیں
پیالی سے اس قدر بھری ہوا تھا، اس کو نچوڑ کر نکالا اور مینڈکوں کو
سے ادرک کے ساتھ فلاپ ہاؤس کے کمروں پر لے گئے ۔ ہیکسے نے پہلے تو
نوعیت کا شکریہ ادا کیا اور بہت فخر کے ساتھ جلد کسی قدر ساتھ کے
ساتھ اپنی کامیابی کا ذکر کیا۔ تو اس پر مسکرایا، مگر اس کی مسکراہٹ میں
کچھ عجیب سی ہی شامل تھی ۔ "اس وقت ہم بڑے خوش قسمت ہیں" ہیک
نے جوش کے ساتھ کہا "ڈاکٹر ہمیں پانچ سنٹ فی مینڈک کے حساب سے
ادا کرے گا اور ہمارے پاس کوئی ایک ہزار مینڈک ہیں" تو نے اس کی
تائید کی۔

"ڈاکٹر آج کل باہر گیا ہوا ہے" ہیک نے کہا "جب واپس آئیگا
تو نئے مینڈک دیکھ کر بڑا خوش ہوگا" تو نے دوبارہ تائید کی۔
"مگر ابھی اس وقت ہمارے پاس پیسوں کی کمی ہے" ہیک نے
بالآخر دل کی بات کہی۔
"وہسکی نہیں ہے" تو چانگ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"ہم وہسکی کیا کریں گے" ہیک کو تاؤ آگیا "ہمارے پاس عمدہ
ترین وہسکی ہے ۔ ایسی کہ تم کو پینے کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ دراصل
میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ماحضر تناول کرو۔"
تو خوشی سے مسکرایا۔

"میں اور میرے ساتھی آجکل بہت تنگ دست ہیں اور اس وقت
سخت بھوک لگی ہے" ہیک نے توضیح کرنے کی کوشش کی "تم کو مینڈکوں
کی قیمت معلوم ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل ڈاکٹر باہر گیا ہوا ہے
اور ہمیں اس وقت کھانے کی شدید ضرورت ہے، اس لئے ہم نے سوچا کہ
تم کو ایک ڈالر میں پچیس مینڈک دیں گے ۔ اس طرح تم کو پانچ مینڈک
نفع میں مل جائیں گے"

"نہیں" لی نے جواب دیا "اس وقت پیسے نہیں ہیں"
"مگر ہم پیسے کب مانگ رہے ہیں ۔ ہمیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں چاہئیں۔
ڈاکٹر کو اس کی واپسی پر ایک مختصر سی پارٹی دینے کا ارادہ ہے ۔ سوچو تو
ڈاکٹر کتنا بھلا آدمی ہے"
ہیک جانتا تھا کہ لی، ڈاکٹر کا بہت کافی مقروض ہے مگر لی سوچتا
تھا کہ اس کی وجہ سے ہیک کیوں فائدہ اٹھائے ۔
"ہم ادھار کچھ نہیں چاہتے" ہیک نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔
"ڈالر میں ایک ڈالر کی چیزوں پر ۲۵ مینڈک تم کو ادا کریں گے ۔ اس کے
علاوہ تم کو پارٹی میں بھی مدعو کریں گے"
لی کو اس سودے میں کچھ خرابی نظر نہیں آئی۔ ہر چیز واضح بعد
تھی ڈاکٹر کی وجہ سے مینڈکوں کی حیثیت نقدی سے کسی طرح کم نہیں
تھی ۔ قیمت میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا ۔ علاوہ ازیں لی کو دہرا فائدہ
تھا ۔ ایک طرف فی ڈالر پانچ مینڈکوں کا فائدہ تھا ۔ دوسرے اسکی وجہ
سے اس کی دوکان کی چیزیں بکیں گی، جس کا نفع اس کے علاوہ ہوگا ۔
"پہلے مینڈک دیکھنے کے بعد کچھ کہہ سکتا ہوں" بالآخر لی نے
جواب دیا

لی اور ہیک فلاپ ہاؤس کل آئے ۔ وسکی پی اور مینڈکوں کو
دیکھا اور اس شرط پر معاملہ کر لیا کہ کوئی مردہ مینڈک وہ نہیں خریدے گا ۔
سیاہ نے پچاس مینڈک گن کر بالٹی میں رکھے اور لی چانگ کے ساتھ دوکان
واپس آیا اور ان کے بدلے میں دو ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں جیسے گوشت،
انڈے اور روٹی خرید کر لایا ۔
لی کا اندازہ تھا کہ یہ کاروبار بہت کامیاب رہے گا ۔ ایک بڑا
پیکنگ کیس نکال کر لایا اور اس میں پچاسوں مینڈک رکھ کر اس پر بھیگا
ہوا بورا ڈال دیا تاکہ ان مینڈکوں کو کچھ نہ کچھ تری ملتی رہے ۔
لی چانگ کا خیال واقعی صحیح نکلا ۔ ان مینڈکوں کی وجہ سے اس کا
کاروبار بہت بڑھ گیا اور ہر چیز کے دام کافی چڑھ گئے ۔ ایڈی نے
دو مینڈکوں میں پی درہم شراب خریدی تھی اور جب جونس کوکا کولا خریدنے
گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی قیمت ایک مینڈک سے دو مینڈک ہوگئی ہے ۔
جوں جوں دن گذرتا گیا، قیمتیں بڑھتی گئیں ۔ مثلاً گوشت اور مچھلی کے
ٹکڑے ہوں یا تسلوں کی قیمت زیادہ سے زیادہ دس مینڈک فی پونڈ
ہونی چاہئے تھی، مگر ساڑھے بارہ میں بک رہے تھے ۔ ڈبے کے شفتالو
کی قیمت سب سے زیادہ بڑھی تھی ۔ نمبر ۲ کا ٹین آٹھ مینڈک میں بکتا
تھا ۔ اس اندھا دھند اضافے سے لوگ کافی بے چین اور پریشان تھے ۔
اس کی وجہ سے عام تلخی پیدا ہوگئی تھی ۔ یہ تلخی اس وقت اور بڑھ گئی،
جب ہیزل نے سلک کا ایک جوڑا کالر خریدنا چاہا تو اس سے کہا گیا کہ
اگر وہ ۳۵۰ مینڈک ادا نہیں کر سکتا تو کہیں اور سے خریدے ۔ کاروبار

ملنے میں اس کی وجہ سے تلخی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، تحریک کے پیکنگ کیس میں میندک بھی بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

یہ اضطراب اور تلخی میک اور اس کے ساتھیوں میں زیادہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ کاروباری تھے، نہ اپنی مسرت کو جھوٹی ہوئی قیمتوں سے ناپتے تھے۔ نہ بنک بیلنس کی فکر تھی اور نہ خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے۔ اگر وہ کچھ برہم تھے تو اس پر کرلی کی وجہ سے وہ کفایت پر مجبور ہو گئے تھے، مگر پھر بھی دو ڈالر کے گوشت اور انڈے ان کے پیٹ میں پڑے رہتے تھے، وسکی اس کے علاوہ تھی۔ اسی طرح ناشتے کے بعد بچا بچا کے وسکی پینے کو مل رہی تھی۔ علاوہ ازیں وہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے، اپنے مکان میں رہتے اور بے فکری کے ساتھ ڈارلنگ کو دودھ پیتے دیکھتے، جو ڈبے کا دودھ پینا ابھی سیکھ رہی تھی۔ ڈارلنگ بہت ہی خوش قسمت کتیا تھی۔ میک اور اس کے ساتھی اس کو بہترین ٹریننگ دینا چاہتے تھے، مگر چونکہ پانچوں ساتھیوں کے ٹریننگ کے اصولوں میں بنیادی اختلاف تھا، اس لئے ڈارلنگ کو کسی قسم کی ٹریننگ دی ہی نہ جا سکی۔ کبھی کبھی پانچوں ساتھیوں کا اس بات پر اتفاق ہو جاتا کہ موجودہ صورت حال نامناسب ہے اور ڈارلنگ کو ٹریننگ ضرور دی جانی چاہیے، مگر ہر مرتبہ ٹریننگ کے طریقے پر بحث اتنی طویل ہو جاتی کہ ان کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ کر دوسری طرف مرکوز ہو جاتی۔

سہ پہر کو یہ لوگ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کھانا ہضم کر رہے تھے۔ سوچ بچار کر رہے تھے اور کبھی کبھار جگ میں سے شراب لے کر پی لیا کرتے اور ہر مرتبہ ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے کہ یہ ڈاکٹر کے لئے ہے۔ ہمیں خرچ میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ بات یہ لوگ ایک منٹ کے لئے بھی نہ بھولتے۔

"تمہارا اندازہ کیا ہے؟ ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟" ایڈی نے سوال کیا۔

"عام طور پر آٹھ نو بجے واپس آتا ہے" میک نے جواب دیا۔

"اس کو پارٹی کب دی جائے؟ میرے خیال میں آج ہی رات میں دینا مناسب رہے گا"

"یقیناً" سب نے اتفاق کیا۔

"ممکن ہے وہ تھکا ہوا ہو" ہیزل نے مشورہ دیا "بہت لمبا سفر ہے"

"کیا کہہ رہے ہو" جونس نے اپنا تجربہ بتایا "تھکن تو صرف پارٹی دیتی ہے۔ میں ایک مرتبہ بہت سخت تھک گیا تھا۔ پیر اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے بعد ایک پارٹی میں شریک ہوا تو تمام تکلیف دور ہو گئی اور طبیعت تر و تازہ ہو گئی۔"

"آؤ ہم بیٹھ کر سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں" میک نے تبصرہ کیا: "پارٹی دی کہاں جائے، یہاں؟"

"ڈاکٹر کو اپنے ریکارڈ بہت پسند ہیں، پارٹی کے موقع پر اپنا فونوگرام ضرور بجاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم خود اس کے یہاں دیں تو وہ بہت خوش ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" میک نے تائید کی "مگر میرے خیال میں اس سے پہلے سے پارٹی کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس کو یکایک معلوم ہوگا تو بڑا لطف آئے گا۔ اس کو شراب پلانے کے بہانے سے لائیں۔"

"سجاوٹ کس قسم کی ہو؟" ہیوئی نے تجویز پیش کی: "چار تھی جولائی کی طرح یا ہیلووین کی طرح؟"

میک کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔

"ہیوئی" اس نے کہا "تم نے بڑے پتے کی بات کہی۔ میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا کی قسم تم نے بڑی اونچی بات سوچی" اس کی آواز مدھم ہو گئی اور اس کی نگاہیں مستقبل کا جائزہ لینے لگیں "جیسے میں واقعی دیکھ رہا ہوں" اس نے کہا "ڈاکٹر واپس آتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ اس کا مکان روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ تجربہ گاہ میں کوئی گھس آیا ہے۔ زینے کے اوپر چڑھتا ہے اور اوپر کے حصے کی سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ وہاں کھانے پینے کی مختلف چیزیں دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ کسی پارٹی کا انتظام ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے چھپ جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر یہ سب کس نے کیا ہے۔ اس وقت ہم یکایک اس کے سامنے آ جاتے ہیں — کیا اس کا چہرہ دیکھ رہے ہو؟ — خدا کی قسم، ہیوئی! میں حیران ہوں کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیونکر؟"

اس غیر معمولی تعریف سے ہیوئی شرما گیا۔ اس نے دراصل کوئی نئی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کے ذہن میں سالِ نو کی پارٹی تھی جو لا ایڈا میں دی گئی تھی۔ اس لئے اس نے صفائی کے ساتھ کہا "بس یونہی ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ اس طرح اچھی رہے گی۔"

"پھر تو بہت اچھا خیال ہے" جیک نے کہا: "ڈاکٹر جب پارٹی کی تفصیلات بتلاؤ جائیں گی تو اسوقت سب کو بتلاؤں گا کہ یہ خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا تھا"

اس کامیاب پلان کے بعد لطف اٹھانے کے لئے شراب کا دور چلا۔

لوچانگ کا اسٹور اس علاقے کا بہترین اسٹور تھا۔ اس میں ضرورت کی سبھی چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ کبھی جس کا موسم نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی شاندار پارٹی کرنی ہو تو لوچانگ کی دوکان ہی سے سامان مل سکتا ہے۔ اس لئے شام ہی سے اس کے یہاں سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ جلد ہی ایک بوری کے مینڈک ختم ہو گئے اور لوچانگ کے پیکنگ کیس میں جگہ باقی نہ رہی۔ جو بچا تک ایک گیلن وسکی ختم ہو چکی تھی اور دوسری دوکان سے خرید کر پی جانے لگی تھی۔

"ڈاکٹر کو وسکی بہت پسند ہے" جیک نے کہا: "میرا خیال ہے کہ وہ اس کو وسکی سے بھی زیادہ پسند کرتا ہے"

ڈاکٹر کبھی تجربہ گاہ میں تالا نہیں لگاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص واقعی اندر داخل ہونا چاہے تو قفل اس کو نہیں روک سکتا۔ اس کا یہ بھی ایمان تھا کہ لوگ بنیادی طور پر ایماندار ہیں اور ان کی بھاری اکثریت چوری پسند نہیں کرتی تھی۔ وہاں جو کتابیں، ریکارڈ، سرجری کے اوزار، عینک کے شیشے اور ایسی چیزیں تھیں جن پر ایک مشاق چور کبھی نگاہ ڈالنا بھی پسند نہ کرے گا۔ اس لئے چوروں، اچکوں اور ڈاکوؤں کے لئے تو یہ نظریہ ٹھیک تھا، مگر دوستوں کے لئے یہ قطعی بے اثر تھا۔ اکثر کتابیں مستعار لی جاتیں اور کبھی واپس نہ کی جاتیں۔ اس کی غیر حاضری میں لوبیا کا ٹین ہمیشہ غائب ہو جاتا اور اکثر اوقات جب وہ رات گئے واپس آتا تو اسے اپنے بستر پر کوئی مہمان سوتا ہوا ملتا۔

جیک کے ساتھی آرائش کا سامان سامنے کے کمرہ میں جمع کر رہے تھے۔ یکایک جیک نے انہیں روک دیا "ڈاکٹر کو سب سے زیادہ کیا چیز خوش کرے گی۔" اس نے سوال کیا۔

"پارٹی" ہیزل نے جواب دیا۔

"نہیں" جیک نے کہا۔

"آرائش" ہیوگی نے مشورہ دیا۔

"نہیں" جیک نے کہا "مینڈک سب سے زیادہ مسرت اسکو نہیں دے ہوگی۔ مگر ہم نے کہا کہ ایک ہی ۔۔۔

نہیں ہے ہوگی۔ مگر جو ہمیں کرنے کے لئے لوچانگ اپنی دوکان بند کر دے۔ ایسی صورت میں وہ کل سے قبل اپنے مینڈکوں کو نہ دیکھ سکے گا۔ لہٰذا ان کو کسی کمرہ میں نہایت نمایاں جگہ پر رکھو اور ایک کارڈ پر لکھ کر لگا دو: "ڈاکٹر کا خیر مقدم"

سارے منصوبے کے لئے ڈی کے پاس جو وفد گیا تھا، اس کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام کوششیں اس کے خدشات کو دور کرنے سے قاصر رہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ تم خود بھی پارٹی میں شریک ہو رہے ہو۔ مگر کوئی شخص نہایت سامان کو خرد برد کرنے کی کوشش کرے گا تو تم کو معلوم ہو جائے گا۔ کسے نے تحریری ضمانت دی کہ اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کے معاوضے میں بینک ادا کئے جائیں گے۔ بالآخر بڑی مشکلوں سے لو چیانگ راضی ہو سکے۔

سہ پہر کی تیز کسی تجربہ گاہ کو سجانے کا کام شروع ہوا۔ اس وقت تک وسکی ختم ہو چکی تھی اور لوگوں میں پارٹی کا موڈ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سے راہگیر بھی پارٹی میں شریک ہو گئے۔ سب سے زیادہ رش شراب پر تھا۔ لوچانگ صرف تھوڑی دیر کے لئے پارٹی میں شریک ہو سکا۔ وہ معدے کا پرانا مریض تھا اس لئے جلد ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ گھر واپس آ گیا۔ گیارہ بجے گوشت اور مچھلی کے قتلے تلے گئے اور خوب لطف لے کر کھائے گئے۔ گراموفون ریکارڈ اور شریک ہونے والوں کا شور دور دور تک سنائی دیتا تھا، اس سے بیر فلیگ کے مالک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ویسٹرن بایولاجیکل (تجربہ گاہ) میں بیر فلیگ کے مقابلہ میں دوسرا ریسٹورانٹ کھول دیا گیا ہے۔ اس کی بنا پر ان میں غصے اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی، مگر اسوقت یہ غلط فہمی دور ہو گئی جب طویل خوشی اور مسرت کے بعد جیک کے سامنے سخت لڑائی ہو گئی، جس میں دو کھڑکیاں بالکل ٹوٹ گئیں اور شیشے کے مرتبان چکنا چور ہو گئے۔ ہیزل باورچیانے سے ہو کر غسلخانے جا رہا تھا۔ اسی ہڑبونگ میں اس سے فرائی پان کو ٹھوکر لگ گئی اور گرم گرم گھی اس کے اوپر آ گرا اور وہ بری طرح جل گیا۔

ڈیڑھ بجے ایک شخص شراب میں مخمور اندر داخل ہوا اور ڈاکٹر پر ایک جملہ چست کر دیا۔ اس کے دوستوں کو یہ توہین برداشت نہیں ہوئی۔ جیک نے ایک اوزار اٹھا کر دے مارا۔ وہ مینڈکوں کے پیکنگ کیس کو گراتا تو ڑتا نکل بھاگا۔ ایک صاحب اسوقت ریکارڈ بدل رہے تھے، وہ ایسا بوکھلائے کہ ان کے ساتھ گراموفون کا ساؤنڈ بکس نیچے گر گیا

اور بلوری شیشہ پاش پاش ہو گیا۔ ہنگامہ فرد ہوا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور اپنے پیچھے ایک لاش چھوڑ گئے۔

صبح کی روشنی تجربہ گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کا پھاٹک ٹوٹا ہوا تھا، اس کے فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشوں کا ڈھیر تھا۔ فونوگراف کے کچھ ریکارڈ ٹوٹے ہوئے اور کچھ کور کے باہر بکھرے ہوئے تھے، گوشت کے ٹکڑوں کے بچے کھچے حصے پلیٹوں میں پڑے ہوئے تھے اور جما ہوا گھی زمین پر گرا ہوا تھا، کسی نے کتابوں کی الماری پر چڑھنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے بہت سی کتابیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ فرش پر خراب و خستہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔

بینگ کیس کے ٹوٹے ہوئے حصے سے ایک مینڈک باہر نکل کر ٹرانے لگا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ فرحت بخش اور ٹھنڈی ہوا جو دروازے اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے آ رہی تھی، محسوس کی۔ یہ ان میں سے ایک "ڈاکٹر کا خیر مقدم" پر اچک کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دونوں ڈرتے ڈرتے دروازے کے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مینڈکوں کا ایک سیلاب آ گیا، جو کبیزی روڈ کی سڑکوں پر ہر طرف پھیل گیا۔ ایک ٹیکسی کو رات کے آخری حصے میں بیر فلیٹ کے ایک گاہک کو لے کر آئی۔ اس سے کئی مینڈک کچل کر شہید ہو گئے۔ لیکن دن نکلنے سے قبل سب کے سب جا چکے تھے۔ کچھ گندے نالوں میں چلے گئے۔ کچھ نے پہاڑی پر چڑھ کر ریزروائر میں پناہ لی، کچھ زمین دوز نالیوں میں جا گھسے اور کچھ کھلے میدان کے گھاس پھونس میں چھپ رہے۔

غرض صبح کی روشنی ایک ایسی تجربہ گاہ میں پھیلی، جو اجڑ چکا تھا، تباہ ہو چکا تھا۔

تجربہ گاہ کے عقبی کمرے میں سفید چوہے اپنے پنجروں میں دوڑ رہے تھے اور چوں چوں کر رہے تھے ـــــ ایک الگ پنجرے کے کونے میں ایک چوہیا اپنے اندھے بچوں کے جھنڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے اندھے اور ننگے بچے اس کا دودھ چوس رہے تھے اور چوہیا خوف سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

سانپوں کے پنجرے میں سانپ اپنے پیچ و خم پر اپنی ٹھوڑیاں رکھے اپنے گرد آلود اور سیاہ آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت ایک موٹر کار کبیزی روڈ میں داخل ہوا اور ڈاکٹر اپنی تجربہ گاہ کے آگے آ کر رکا۔ تھکن سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ موٹر کار کے رکنے پر بھی وہ اپنی نشست پر کچھ دیر تک بیٹھا رہا تاکہ راستے میں سڑک پر اس نے جو جھٹکے کھائے تھے ان کا اثر زائل ہو جائے۔ اس کے بعد اچھل کر وہ اپنی کار میں سے باہر نکلا۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو سانپ اپنی زبانیں باہر نکال کر آہٹ سننے لگے۔ چوہوں نے پنجروں میں دوڑ لگانی شروع کر دی۔ ڈاکٹر سیڑھیاں چڑھ گیا تو اس نے جھولتے ہوئے دروازہ پر اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ اس کی تھکن جیسے کافور ہو گئی۔ وہ تیزی سے تجربہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ اس نے جھک کر گراموفون کا ایک شکستہ ریکارڈ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

باورچی خانہ میں لڑھکا ہوا گھی فرش پر جم کے سفید ہو گیا تھا۔ برہمی کے عالم میں ڈاکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے عظیم گراموفون کو چابی دی اور اس پر ایک ریکارڈ رکھ دیا۔ لاؤڈ اسپیکر سے صرف ایک بھنبھناتی ہوئی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا بازو اٹھا کر گراموفون کے چکے کو بند کر دیا اور دوبارہ صوفہ پر آ بیٹھا۔

سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز پیدا ہوئی اور دوسرے لمحہ دروازے میں سے میک نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ کمرے کے وسط میں گھبرایا ہوا کھڑا تھا "ڈاکٹر" وہ بولا "میں نے اور لڑکوں نے ....."

ایک لمحہ کے لئے ڈاکٹر اسے دیکھ نہ پایا۔ پھر وہ لپک کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میک ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کیا یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔ میں نے اور لڑکوں نے ...."

ڈاکٹر نے اپنی مٹھی باندھ کر میک کے منہ پر زور سے مکہ مارا۔ اس وقت ڈاکٹر کی آنکھیں ایک درندہ کی طرح شعلہ گوں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے مکہ کی ضرب کڑی اور مضبوط تھی۔ میک کے ہونٹ پھٹ گئے اور اس کا سامنے کا ایک دانت پیچھے کی طرف مڑ گیا "اٹھو" ڈاکٹر

سے ملتے جلتے لہجے میں کہا۔

میک لڑکھڑاتا ہوا اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بازو اس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کے ایک اور ٹکر مارا۔ میک کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ خون اس کی ٹھوڑی تک بہہ آیا اور میک نے اپنے ہونٹوں سے خون چوسنے کی کوشش کی۔

"دیکھ کیا رہا ہے کتیا کے بچے ــــ لڑتا کیوں نہیں۔" ڈاکٹر نے اس کے ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے دانت ٹوٹنے کی آواز سنی۔

میک کے سر نے صرف ایک جھٹکا سا کھایا، مگر وہ اپنی جگہ پہ جما رہا۔ اس کے دونوں بازو اس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹکے رہے اور "مارو ڈاکٹر" وہ بولا ــــ "یہ سب میرا قصور ہے۔"

آخر ڈاکٹر نے ہار مان لی اور بولا "کتیا کے ذلیل بچے" اس کے بعد ڈاکٹر اپنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میک ایک کرسی پر بیٹھ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ میک کی آنکھوں سے کرب و اضطراب پیدا تھا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی پہ بہتا ہوا خون بھی نہیں پونچھا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا "جاؤ اور جا کر اپنا منہ دھوؤ۔" ڈاکٹر سیڑھیوں سے اتر کر لی چانگ کی دوکان کی طرف چل پڑا۔ اس نے لی چانگ سے بیئر کی دو بوتلیں طلب کیں۔ برف کے بکس میں بیئر کی بوتلیں نکالتے ہوئے لی چانگ نے ڈاکٹر کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملائیں۔ ڈاکٹر سے رقم لیتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی۔ ڈاکٹر بیئر کی بوتلیں لے کر سڑک پر آ گیا۔

میک غسل خانہ میں اپنا خون آلود منہ دھو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بیئر کی ایک بوتل آہستہ سے کھولی اور ایک گلاس میں انڈیل دی۔ اس نے بیئر سے ایک اور گلاس بھرا۔ ڈاکٹر وہ دونوں گلاس اٹھا کر اگلے کمرہ میں آ گیا۔ میک غسل خانے سے اپنا منہ پونچھتا ہوا نکلا۔ ڈاکٹر نے اپنے سر کی جنبش سے بیئر کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ میک نے منہ کھولا اور بیئر کا آدھا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔ اس نے سرد آہ بھری اور پھر وہ بیئر کی طرف گھورنے لگا۔ ڈاکٹر اپنا گلاس ختم کر چکا تھا۔ ڈاکٹر دوسری بوتل بھی لے آیا۔ اور اس نے ایک دفعہ پھر دونوں گلاس بھر دیئے۔ ڈاکٹر صوفے پہ بیٹھ گیا اور اس نے پوچھا "یہ کیا ہوا تھا؟"

میک نے فرش کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ کر بیئر میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنے ہونٹوں کا خون پونچھا اور بولا "میں اور میرے ساتھی آپ کو ایک دعوت دینا چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ کل رات گھر آ جائیں گے۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔"

"ڈاکٹر میں ساری عمر کف افسوس ملتا رہا۔ ہاں یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ میرے ساتھ یونہی ہوتا رہا ہے۔" میک نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "میری ایک بیوی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جو کچھ بھی کرتا اس کا الٹا نتیجہ نکلتا۔ وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ اگر کوئی اچھی بات بھی کرتا تو اس میں کیڑے پڑ جاتے۔ اگر میں اسے کوئی تحفہ دیتا تو کوئی نہ کوئی غلط بات ہو جاتی ــــ وہ بیزار ہو گئی۔ جب میں نے ایک مسخرے کی حیثیت سے اداکاری شروع کی تو اس وقت بھی یونہی ہوا ــــ تب سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ میں نے اسے بھی ترک کر دیا۔ اب میں لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ہمہ تن گوش ہو کر میک کی باتیں سن رہا ہو۔ "میں جانتا ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔

"آہ جب تم نے مجھے پیٹا تو میں خوش تھا" میک نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا شاید اس طرح مجھے سبق مل جائے۔ شاید میں اس بات کو ساری عمر یاد رکھوں لیکن مجھ کمبخت کو کچھ بھی تو یاد نہیں رہے گا۔ میں کبھی کوئی سبق حاصل نہیں کر سکوں گا۔ کل کی بات ہی لو ــــ ہم خوش تھے کہ تمہیں پارٹی دے رہے ہیں اور پارٹی بھی کیا پارٹی تھی ــــ" میک نے فرش پر بکھری ہوئی شکستہ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن انجام نہایت برا ہوا۔"

ڈاکٹر نے مزید بیئر گلاسوں میں انڈیل دی۔

"ڈاکٹر! میں اور میرے ساتھی سب کچھ صاف کر دیں گے اور جو چیزیں ٹوٹ گئی ہیں ہم ان کے دام بھی ادا کر دیں گے۔ ہمیں چاہے پانچ برس تک کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم ان چیزوں کے دام ادا کر کے رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی مونچھوں پر سے بیئر کی جھاگ پونچھی۔

"نہیں۔ یہ چیزیں میں خود صاف کروں گا۔"

"ڈاکٹر ہم ان چیزوں کے دام ادا کر دیں گے۔"
"نہیں میک۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم دام ادا کرنے کی بات سوچتے رہوگے، پریشان ہوتے رہوگے اور ایک کوڑی ادا نہیں کروگے۔ یہ شیشہ جو تم نے توڑ دیا ہے، یہ تین سو ڈالر کا تھا۔ تم اس کی قیمت نہیں ادا کر پاؤگے۔"
"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میں کیا کروں۔"
"میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہے" ڈاکٹر نے کہا "اب اس بات کو بھلا دو۔"
میک نے اپنی بیئر ختم کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا تو ڈاکٹر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ — ہاں یہ تو کہو۔ تمہاری بیوی کا کیا ہوا؟"
"میں خود نہیں جانتا" میک نے کہا "وہ چلی گئی۔"
میک سیڑھیوں پر نہایت بھدے انداز سے اترا اور فلاپ ہاؤس محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھاڑو اٹھایا اور دن بھر کوڑا صاف کرتا رہا۔

میک فلاپ ہاؤس محل میں داخل ہوا تو اس کے ہونٹ کٹے ہوئے تھے اور اس کے دانت ٹوٹ رہے تھے۔ تاسف کے طور پر اس نے اپنا منہ صاف نہ کیا۔ وہ سیدھا اپنے پلنگ کی طرف گیا۔ اپنے سر پر کمبل اوڑھ کر بستر پہ دراز ہو گیا اور دن بھر نہ اٹھا۔ اس کے منہ کی طرح اس کا دل بھی گھائل تھا۔ اس نے زندگی میں جتنے برے کام کئے تھے ان کو ایک ایک کرکے یاد کیا — وہ بہت اداس تھا۔
ہیوئی اور جونس تھوڑی دیر تک خلا میں جھانکتے رہے اور اس کے بعد وہ بھی ملول و افسردہ باہر نکل گئے اور انہوں نے ہیئر پائنڈو کنری جا کے ملازمت کی درخواست دی جو انہیں مل گئی۔
ہیزل کی طبیعت بہت ہی خراب تھی۔ وہ موٹر یری پہنچا۔ وہاں ایک فوجی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا اور جان بوجھ کر مار کھائی۔ ایسا کرنے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا۔ حالانکہ وہ ذرا سی بھی کوشش کرتا تو اس فوجی کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔
صرف کتیا ڈارلنگ ہی خوش تھی۔ وہ میک کے پلنگ کے نیچے بیٹھی ہوئی اس کے بوٹ چباتی رہی تھی۔ میک نے تنہائی سے تنگ آکر پلنگ کے نیچے ہاتھ لٹکا کر دو مرتبہ اسے اپنے ساتھ سلانے کی کوشش کی، مگر کتیا بار بار نیچے اتر جاتی اور بوٹ کا چمڑا چبانے لگتی۔ میک اور اس کے ساتھی رفیق جانتے تھے کہ ان کا ستارہ گردش میں ہے۔ وہ سماجی طور پر اچھوت ہو گئے تھے۔ ان کے نیک ارادوں کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ ان کے اس جھگڑے کے متعلق کچھ اور ہی کہانی مشہور ہو گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ انہوں نے روپیہ اور شراب چرائی۔ جس ارادے سے وہ تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ محض اپنی خباثت اور کینہ توزی کی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر کے گھر کے شیشے اور کھڑکیاں توڑ دیں — "لا ایڈا" ریسٹوران کے کچھ شرابی ڈاکٹر کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والوں کو کس طرح پیٹنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔
رسوائی کے متعلق میک کی سوجھ بوجھ نے ان کو تباہی سے بچا لیا۔ سماج جب کسی فرد کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس پر دو طرح کے ردعمل ہوتے ہیں۔ یا تو اس کی بدکاری بڑھ جاتی ہے۔ وہ تمام دنیا سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ برے کام کرتا ہے۔ یا پھر اپنی اصلاح کر کے زیادہ پاکیزہ اور مہربان ہو جاتا ہے۔
میک اور اس کے ساتھی نیک و بد کے ترازو میں کبھی ایک طرف جھک جاتے تھے اور کبھی دوسری طرف — انہی دنوں ڈاکٹر نے ایک بات دریافت کی۔ ۶ر جولائی کا دن تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ فراسٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا بیئر پی رہا تھا۔ گراموفون پر ہینڈل کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ تجربہ گاہ کے سامنے فلاپ ہاؤس محل تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا شہتیر پڑا تھا۔ میک اور اس کے ساتھی اس پر دھوپ میں بیٹھے تھے۔
ڈاکٹر نے کہا — "ذرا ان کی طرف دیکھو۔ میرا خیال ہے تمہارے سچے فلاسفر یہی لوگ ہیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو دنیا کی ہر ایک بات معلوم ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اس دنیا میں زیادہ اچھی طرح رہیں گے۔ جس وقت لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنے تکڑے اڑا رہے ہوتے ہیں یہ لوگ آرام کرتے ہیں۔ ہمارے تمام کامیاب لوگ بیمار ہیں۔ ان کے معدے خراب ہیں۔ ان کی روحیں مستعفن ہیں لیکن میک اور اس کے ساتھی صحت مند اور پاکیزہ ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"
رچرڈ فراسٹ نے کہا "مجھے تو وہ دوسروں کی طرح نظر آتے

کی دولت کے پاس بھی روپیہ نہیں۔"

"روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی تباہ کر کے روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ میک بہت ذہین ہے۔ وہ سب بہت ہوشیار ہیں۔" ڈاکٹر آہستہ آہستہ بیئر گلاس میں بیئر ڈال رہا تھا "تم چاہو تو ہی ثبوت بھی مہیا کر سکتا ہوں۔ تمہیں انہیں اس طرف سڑک کے بیٹا ہوا دیکھ رہے ہو۔ آدھے گھنٹے تک ابھی ادھر سے ایک پریڈ گزرے گی۔ پریڈ گزرتی ہے تو لوگ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات پریڈ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں تم سے دو بوتل بیئر کی شرط لگاتا ہوں یہ پریڈ کو مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔"

"اگر وہ اس پریڈ کو مڑ کر نہیں دیکھیں گے تو اس سے ثابت کیا ہوگا؟" رچرڈ فراسٹ نے پوچھا۔

"ثابت کیا ہوگا؟" ڈاکٹر نے بلند آواز سے کہا "ثابت یہ ہوگا کہ ان کو معلوم ہے کہ پریڈ میں کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ پریڈ کئی مرتبہ دیکھی ہے اور اب اسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"جو لوگ یہ پریڈ نہیں دیکھتے وہ زندہ نہیں رہتے۔" رچرڈ فراسٹ بولا۔

"تو پھر شرط رہی؟"

"رہی۔"

"مجھے موجودہ نظام میں ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "مہربانی، سخاوت، فراخدلی، ایمانداری اس نظام میں ناکامی کا باعث ہوتے ہیں۔ تیز فہمی، چالاکی، لالچ، کمینگی، زنا اور خود غرضی کامیابی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اور انسان ہیں کہ اول الذکر صفات کی تعریف کرتے ہیں اور مؤخر الذکر کے اوصاف کے نتائج کو محبت کرتے ہیں۔"

"لوگ بھوکے رہیں تو نیک رہنے کا خیال کیسے پیدا ہوتا ہے۔" رچرڈ فراسٹ نے کہا۔

"یہ بھوک کا سوال نہیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں نے مجھے دعوت دینا چاہی، لیکن حالات بگڑ گئے۔ مگر انہوں نے مجھے دعوت دینے کی خواہش تو کی تھی۔"

اتنے میں بینڈ کی آواز سنائی دی۔ میک اور اس کے ساتھی بے خبر پڑے اداس بیٹھے تھے۔ بینڈ باجے کی آواز قریب آ گئی۔ پھر جلوس بھی نزدیک آ گیا۔ میک اور اس کے ساتھیوں نے ان جلوس کو اپنی گردن تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوئی، اور جلوس ان کے سامنے سے گزر گیا۔

رچرڈ فراسٹ دروازے کی طرف بڑھا اور بولا "میں نے ہار گیا۔ میں تمہارے لئے بیئر لاتا ہوں۔ تم لوگ کون سی بیئر لو گے؟"

"جو پچھلی لائی تھی۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر دراصل میک اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

انہی دنوں ایک لہر چلی کہ ڈورا کا قحبہ خانہ بند ہو جانا چاہئے۔ ڈورا نے خاص طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ ڈورا نے بیئر فلیگ ریسٹورنٹ ایک ہفتہ کیلئے بند کر دیا۔ اس کے بعد مصائب کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ میک کی کتیا ڈارلنگ بیمار ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد اس کی حالت اتنی لاغر کر دیا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگی۔

ڈارلنگ فلاپ ہاؤس محل میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ فلاپ ہاؤس محل میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ آخر کار ہیزل اور جونس کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا کہ وہ ڈاکٹر سے ملیں اور اس سے کتیا کا علاج کروائیں۔

ڈاکٹر نے ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

"ڈارلنگ بیمار ہے۔" ان دونوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں مویشیوں کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔" ڈاکٹر بولا "مجھے ان کے علاج کی کوئی خبر نہیں۔"

"کیا آپ اسے ایک نظر دیکھ نہیں سکتے؟" ہیزل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کتیا کا معائنہ کیا۔ وہ سب ڈاکٹر کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے رہے۔ ڈاکٹر نے کتیا کی زبان اور اس کے کان دیکھے اور پھر پوچھا "یہ کتیا کھانا نہیں کھاتی؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو اسے زبردستی کچھ کھلا دو۔ شوربہ، انڈے اور مچھلی کا تیل۔"

میک اور اس کے ساتھیوں نے شوربہ ابالا۔ نہایت گاڑھا اور تیز شوربہ جب انہوں نے مچھلی کا تیل پلایا۔ پھر اس کا منہ کھول کر یہ شوربہ زبردستی اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ میک ساری رات جاگتا رہا۔ صبح کو کتیا نے پانی پیا اور زمین پر لوٹنے لگی۔ میک خوشی سے چلایا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دیا۔ لیکن جب کہ ان کا غرور

سنا تو اسے خیال ہوا کہ وہ سب دعوت اڑا رہے ہیں۔ ۹ بجے تک ڈارلنگ نے ایک انڈا کھایا اور دودھ پیا ـــــ دوپہر تک وہ بالکل تندرست ہو گئی۔

کتیا ڈارلنگ کیا ٹھیک ہوئی دوسرے حالات بھی معمول پر آگئے۔ ڈورا کو بھی یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ اپنا ریسٹوران کھول سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ میں رات گئے تک گراموفون بجتا رہا۔ اور پھر نہ جانے لی چانگ کو کیا خیال آیا اس نے مینڈکوں کے سلسلے میں میک اور اس کے ساتھیوں کا قرضہ معاف کر دیا اور ان کو ربڑ کے جوتوں کا تحفہ دیا۔ ڈارلنگ کی بیماری نے ان لوگوں پر جو تباہ کن اثر کیا تھا وہ دور ہو چکا تھا۔ جس وقت لی چانگ ربڑ کے جوتے لے کر آیا اس وقت ڈارلنگ ہیزل کے جوتے سے کھیل رہی تھی اور وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔

میک بھی بیر فلیگ ریسٹوران میں نہیں گیا تھا۔ ایک روز جب وہ بیر فلیگ ریسٹوران کے دروازہ پر نمودار ہوا تو سب کو یہ خیال گذرا کہ وہ بیئر پینے آیا ہے۔ مگر وہ الفریڈ کے سامنے جا کر رکا اور اس نے پوچھا "کیا ڈورا اندر ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا چاہیے؟" الفریڈ نے پوچھا۔

"میں اس سے کچھ پوچھنے آیا ہوں"

"کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں" میک نے درشت لہجہ میں کہا۔

"بہت اچھا ـــــ ٹھہرو ذرا میں پتہ کر آؤں کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے کہ نہیں"

ایک لمحہ کے بعد وہ میک کو ڈورا کے کمرے میں لے گیا۔ ڈورا اپنی میز کے سامنے حساب کی کتابوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گلابی رنگ کا ایک شاندار لباس پہن رکھا تھا۔ جس وقت میک کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ رلیفرڈ دروازے میں کھڑا رہا۔ جب تک رلیفرڈ دروازہ بند کر کے چلا نہیں گیا میک اسوقت تک خاموش کھڑا رہا۔ رلیفرڈ کے جانے کے بعد ڈورا نے میک کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر اس نے پوچھا "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مادام آپ شاید وہ قصہ سن چکی ہیں کہ ہم نے چند روز ہوئے ڈاکٹر کے مکان میں کیا کچھ کیا تھا۔"

"ہاں سنا تو ہے"

"مادام شاید آپ اعتبار نہ کریں۔ ہم ڈاکٹر کو دعوت دینا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر وقت پر گھر نہ آیا اور دعوت کو ہمارے سنبھالنا مشکل ہو گیا"

"ہاں میں نے یہی سنا ہے ـــ خیر ـــ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بات یہ ہے مادام ـــ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ آپ سے مشورہ لیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم ڈاکٹر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں مشورہ دیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے تاکہ ہم ڈاکٹر کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے سکیں"

"اونہہ" ڈورا نے گھومنے والی کرسی میں ایک چکر کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بولی "تم نے ڈاکٹر کو ایک دعوت دینا چاہی لیکن وہ اس دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ یہی بات ہے نا؟ اب ڈاکٹر کو ایک ایسی دعوت دو جس میں وہ ضرور شریک ہو سکے"

"اوہ! میرے خدا" بعد میں میک نے لڑکوں کو بتایا "یہ کتنی سیدھی سادی بات تھی۔ بلا کی ذہین عورت ہے۔ لوگ اسے مادام کہتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ـــــ خدا کی قسم کیا عورت ہے!"

سارے کا سارا کینری روڈ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک بھاری تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ قسمت اور شگون پر یقین نہ رکھنا ایک اچھی بات ہے۔ دراصل ان پر کوئی یقین رکھتا بھی نہیں ہے لیکن ان کے سلسلے میں لاپروائی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کینری روڈ دوسرے مقامات کی طرح توہم پرست نہیں ہے اس کے باوجود یہاں کوئی سیڑھی کے نیچے نہیں چلتا۔ اور گھر کے اندر کوئی چھتری نہیں کھولتا۔ ڈاکٹر تو ایک خالص سائنسدان تھا۔ وہ تو توہم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی جب کبھی وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور اپنی کھڑکی کی چوکھٹ پر سفید پھول پڑے پاتا تھا تو اسے بہت برا وقت دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کینری روڈ کے بیشتر لوگ توہمات پر

بتیاں بھی جلا گئے تھے۔

جیسے میک کو ضرور اس بات کا یقین تھا کہ فلاپ ہاؤس میں بھی کوئی مسئلہ ہے۔ اس نے گزشتہ دعوت کے متعلق تمام حالات کا جائزہ لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ فلاپ ہاؤس کو کسی طرح بھی بد قسمتی نے ڈیرہ جما لیا ہے۔ میک کا یہ بھی خیال تھا کہ جب کوئی مصیبت آ جائے تو سوچنا چاہیے تاکہ یہ مصیبت گذر جائے۔ میک کا یہ خیال ضرور تھا لیکن وہ توہم پرست نہیں تھا۔

پھر کارو میں پھر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ فلاپ ہاؤس میں کی کتیا بھی اچھلنے اور کودنے لگی تھی۔ اب وہ گھر کے اندر نہیں رہتی تھی۔ باہر بھی نکل جایا کرتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈارلنگ بچہ ہو کر ایک اچھی کتیا ثابت ہو گی۔

مسرت کی لہر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ کتنے زور زور سے بھونکتے۔ اسکول جاتی ہوئی لڑکیاں دفعتاً رک جاتیں اور اپنی نگاہیں اوپر اٹھا کر قہقہے سر کرتیں۔ میک اور اس کے ساتھیوں میں بھی سعادت کی تبدیلی آ گئی تھی۔ جونس کرسی سے اٹھ کر رقص کرنے لگتا تھا اور دوبارہ اچھل کر کرسی پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہیزل خواہ مخواہ مسکراتا رہتا تھا۔ ایڈی نہ جانے کس مقصد کے لئے شراب جمع کر رہا تھا۔ اب وہ شراب کے جگ میں بیئر بھی نہیں ملا رہا تھا۔ خالص وسکی جمع کر رہا تھا۔ سیم سولے نے گھر میں کچھ پودے لگائے تھے اور وہ ان کی آبیاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی صبح سے شام تک چادر پر کشیدہ کاری میں مصروف رہتی تھی۔ مسرت کی لہر بیئر فائیک تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کاروبار بہت اچھا تھا۔ فلیس ے کی ٹانگ اچھی ہو گئی تھی اور اب وہ دوبارہ اپنے کام پر جانے والی تھی۔ ایوا فلینگن ایسٹ سینٹ لوئس سے لوٹ آئی تھی اور وہ وہاں سے واپس آ کر بہت خوش تھی۔

ڈاکٹر کو جو پارٹی دی جانے والی تھی اس کی بات چل نکلی تھی۔ میک نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”پچھلی مرتبہ تو ہم نے زبردستی کی۔ پارٹی اس طرح نہیں دی جاتی۔ دعوت کو پہلے اپنے ذہن پر پوری طرح سوار کر لینا چاہیے۔“

”خیر اب دعوت کب ہو رہی ہے؟“ جونس نے بیقرار ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے اس کی کوئی خبر نہیں!“ میک نے جواب دیا۔

”کیوں کیا اسے بھی اچانک کوئی دعوت دی جا رہی ہے؟“

”ہاں چھوٹا تو ہوا کہیں چاہیے“ میک بولا۔

ڈارلنگ اس وقت ایک گیند سے کھیل رہی تھی۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر کا جنم دن کب ہے تو ہم اس کے جنم دن پر دعوت دیتے“ ہیزل نے کہا۔

حیرت سے میک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہیزل نے یہ شیشت میں ڈال دیا گیا تھا۔ ”خدا کی قسم ہیزل۔ تم بات ہمیشہ پتے کی کہتے ہو۔ اب تو ہمیں کوشش کرکے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر کا جنم دن کون سا ہے؟“

”یہ تو بہت ہی آسان بات ہے“ ہیزل نے کہا ”ڈاکٹر سے پوچھ کیوں نہ لیا جائے؟“

”پھر تو سارا بھید کھل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاؤں اور پتہ چلانے کی کوشش کروں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں“ ہیزل بولا۔

”نہیں ——— ہم دونوں گئے تو وہ بھانپ جائے گا کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔“

”دیکھو۔ بات تو تمہیں میں نے سمجھائی ہے۔“

”میں جانتا ہوں“ میک بولا ——— ”اگر دعوت ہوئی تو میں ڈاکٹر کو بتا دوں گا کہ یہ تمہارا خیال تھا۔ لیکن اس کے پاس مجھے اس وقت تنہا ہی جانا چاہیے۔“

”ویسے ڈاکٹر کا حال کیا ہے۔ کیا وہ ہماری طرف دوستانہ رویہ رکھتا ہے؟“ ہیزل نے پوچھا۔

”ہاں“

میک نے ڈاکٹر کو تجربہ گاہ کے عقب میں مصروف پایا۔ اس نے ربڑ کا انگرکھا پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے تھے۔ وہ ایک مچھلی کی شریانوں میں کسی رنگ دار چیز کا انجکشن لگا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے ہاتھ بڑی پھرتی سے کام کر رہے تھے ———

”ڈاکٹر۔ کیا اتنے ہی مصروف ہو؟“ میک نے پوچھا۔

”ہاں ——— کہو ڈارلنگ کا کیا حال ہے؟“

"بہت اچھا ہے۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو وہ مر جاتی۔"

ایک لمحے کے لئے ڈاکٹر ٹھٹک گیا کہ میک اس کی خوشامد کر رہا ہے۔ لیکن جلد ہی ڈاکٹر کا یہ وہم دور ہو گیا۔ ڈاکٹر خوشامد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ میک کو ایک مدت سے جانتا تھا — آج میک کے لہجے میں تشکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ میک کو اپنی کتیا کتنی پیاری ہے۔

"کہو فلاپ ہاؤس میں وقت کیسے گزر رہا ہے؟"

"اچھا ہی گزر رہا ہے۔ ہم دو نئی کرسیاں لے آئے ہیں۔ کاش آپ کسی وقت آ کر دیکھتے۔"

"میں ضرور آؤں گا — کیا ایڈی اب بھی شراب کے جگ لے آتا ہے؟"

"ہاں — اب تو وہ شراب میں بیئر بھی نہیں ملاتا۔ اب شراب کا مزہ اچھا ہو گیا ہے۔ اس کا نشہ بھی تیز ہے۔"

میک انتظار کرتا رہا کہ کوئی ایسی بات چھڑے جس سے اسکو گویا مقصد ہاتھ آ جائے۔

"بہت دنوں سے ہیزل کو نہیں دیکھا — وہ بیمار تو نہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں —" اس کے بعد میک نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ "ہیزل اچھا ہے۔ آج کل ہیزل اور ہیوئی میں ایک ہفتے سے جنگ ہو رہی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جھگڑا ایک ایسی بات پر ہو رہا ہے جس کے متعلق دونوں کچھ نہیں جانتے۔ میں کوئی دخل نہیں دے رہا ہوں۔ چونکہ اس بات کے متعلق مجھے بھی کچھ علم نہیں ہے۔"

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ہیزل ان دنوں قسمت کا حال بتلانے والے نقشے خرید رہا ہے اور ہیوئی کہتا ہے کہ یہ نقشے بالکل بے معنی اور بیکار ہوتے ہیں۔ ہیوئی کہتا ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آدمی کب پیدا ہوا تھا تب تک اس کے متعلق کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر؟"

"میں بھی ہیوئی سے متفق ہوں۔" ڈاکٹر نے سرکہ میں لال دوا بھرتے ہوئے کہا۔

"کل رات تو ان میں خوب گرما گرمی ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ ۱۲ اپریل کو ہوا تھا۔ ہیزل وہ نقشہ خرید لایا اور مجھے میری قسمت کا حال بتلانے لگا — کہیں کہیں تو نقشے میں باتیں بالکل ٹھیک تھیں مگر زیادہ تر باتیں اچھے مستقبل سے متعلق تھیں۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے متعلق اچھی باتوں پر ایمان لے آتا ہے — اس نقشے میں لکھا تھا۔ میں بہادر ہوں۔ چالاک ہوں۔ ہوشیار رہوں۔ ہیزل کہتا تھا کہ اس نقشے کی میرے متعلق ہر بات ٹھیک ہے — ڈاکٹر آپ کا جنم دن کیا ہے؟" میک نے دفعتاً سوال کیا۔

ڈاکٹر میک کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ لہٰذا میک کے اس اچانک سوال پر ڈاکٹر ذرا چونکا۔ ڈاکٹر کا جنم دن ۱۸ دسمبر کا دن تھا لیکن اس نے بتایا "۲۷ اکتوبر"۔ اور پھر ڈاکٹر نے میک سے کہا: "ہیزل سے پوچھنا میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

"میں تو سمجھتا ہوں یہ سب بکواس ہے لیکن ہیزل بضد ہے کہ ان نقشوں کی باتیں سچ ہوتی ہیں۔ بہرحال میں ہیزل سے کہوں گا کہ وہ آپ کی قسمت کا حال بتائے۔"

جب میک چلا گیا تو ڈاکٹر سوچتا رہا کہ میک نے یہ کہانی کیوں گھڑی تھی۔ میک نے جان بوجھ کر یہ باتیں چھیڑی تھیں اور ڈاکٹر کو میک کی تکنیک کا علم تھا — وہ اس کے انداز کو خوب سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر دیر تک سوچتا رہا کہ میک کا آخر مقصد کیا تھا۔ بعد میں جب یہ افواہ اڑی کہ وہ لوگ اسے دعوت دینے والے ہیں تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔

میک اور اس کے ساتھی — ہم اوصاف اور ہم جنس — وہ فلاپ ہاؤس محل میں بیٹھے تھے لیکن وہ تالاب میں پھینکے جانے والے کنکر تھے جن سے تالاب میں لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ گہری رہی ہیں نہیں مونٹری اور پیسیفک گروو میں بھی حرکت پیدا کر دیتے تھے۔ وہ حرکت اور پیش قدمی کے جنم داتا تھے۔

"اس دفعہ ہمیں یقین کے ساتھ ڈاکٹر کو دعوت میں شامل کرنا ہے۔ ڈاکٹر نہیں آئے گا تو دعوت بھی نہیں دی جائے گی۔" میک نے کہا۔

"مگر یہ پارٹی کہاں دی جائے گی؟" جونس نے پوچھا۔

پھسے ڈاکٹر کے بارے سے متعلق ہوئے کہا "میں اس کے متعلق بہت سوچتا رہا ہوں۔ دعوت تو ہم ڈاکٹر کو یہاں بھی دے سکتے ہیں لیکن یہاں ڈاکٹر کو ایسا محسوس نہیں ہوگا۔ ایک بات اور کہ ڈاکٹر کو یہ جگہ بہت پسند ہے۔ اس کے پاس وہاں یادیں ہیں۔"

سم نے پھسے سے کہا اور پوچھا "مجھے فخر نہیں ہے کہ پہلی مرتبہ کسی نے ڈاکٹر کا گراموفون توڑا تھا۔ اب اگر کسی نے گراموفون کو چھیڑا تو میں اس کا بھرکس نکال دوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر کو اس کے مکان پر پارٹی دی جائے۔"

یہ طے ہوا۔ لوگوں کو یہ خبر دی گئی تھی کہ ڈاکٹر کو دعوت دی جا رہی ہے مگر وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر کو پارٹی دی جا رہی ہے۔ کسی کو اس پارٹی میں شریک ہونے کا بلاوا نہیں دیا گیا تھا پھر بھی ہر کوئی اس دعوت میں شریک ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

۲۷ اکتوبر کی تاریخ کے گرد سب نے ایک سرخ حلقہ بنا دیا تھا تاکہ یہ دن بھول نہ پائے ۔۔۔ چونکہ یہ جنم دن کی دعوت تھی اس لئے ہر کوئی تحفہ خریدنے کی فکر میں مبتلا تھا۔

ڈورا کے ریسٹوران کی لڑکیاں ڈاکٹر سے اپنی بیماریوں کے متعلق مشورہ کرنے آتیں۔ ان کی نگاہ ڈاکٹر کے پلنگ پر پڑتی۔ اس کے بستر پر گھسا ہوا کمبل۔ لومڑی کا سمور اور ریت پڑی رہتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے سفر سے لوٹتا تھا تو یہ چیزیں ساتھ لے آتا تھا۔ اس کے پاس روپیہ ہوتا تھا تو وہ اپنی تجربہ گاہ کا سامان خرید لیتا تھا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اسے کوئی نیا کمبل خریدنا چاہیے۔ ڈورا کے ریسٹوران کی لڑکیاں ڈاکٹر کے لئے کمبل تیار کر رہی تھیں۔ اس کمبل کے کنارے ریشم کے تھے۔ یہ ریشم شام کے ملبوسات اور زیر جاموں سے حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہ کمبل مختلف رنگوں کا مرقع تھا۔

لیجا کم نے آتش بازی اور رنگین قمقمے جمع کئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان چیزوں سے دعوت کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔

سیم موسے قدیم اشیاء کا شیدائی تھا۔ وہ ان نادر اشیاء کو دیر سے جمع کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ایک دن یہ نادر الوجود اشیاء اس کو مالا مال کر دیں گی۔ اس نے پرانی موٹروں کے پرزے بھی جمع کئے تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر کو تحفہ دینے کے لئے کئی دن تک سوچتا رہا تھا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک پرانی موٹر کا پرزہ ڈاکٹر کو بطور تحفہ دیگا۔

میک اور اس کے ساتھی بھی اس مسئلہ پر دماغ سوزی کر رہے تھے۔ آخر کار کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ڈاکٹر کو بلیاں بہت پسند ہیں۔ ڈاکٹر کو بلیاں حاصل کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے اس لئے کیوں نہ ڈاکٹر کو بلیوں کا تحفہ دیا جائے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا پنجرہ بنایا اور روز بروز اس پنجرے میں خوبصورت بلیوں کا اضافہ ہونے لگا۔ میک کا خیال تھا کہ یہ بلیاں ڈاکٹر کے لئے ایک نہایت موزوں تحفہ ہوگا ۔۔۔ "اب کے کوئی سجاوٹ نہیں کی جائے گی۔ سیدھی سادی پارٹی ہوگی۔ البتہ شراب کافی مقدار میں ہوگی۔"

اس پارٹی کی اطلاع جیل میں بھی پہنچ گئی۔ "ہنری" نے داروغہ سے مل کر یہ انتظام کر لیا کہ وہ اس رات کو تاریکی میں نکل جائیگا اور دعوت میں شرکت کے بعد دوبارہ جیل میں آ جائے گا۔ ہنری نے ڈاکٹر کے لئے ایک ریشمی گدی تیار کی تھی۔

ہنری کا دوست ایک نائی تھا جس کا نام ایرک تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فصل کی کٹائی کی مشین دینے کا فیصلہ کیا۔

دعوت کی افواہ چار سو زور و شور سے پھیل گئی۔ آمد و رفت جاری ہو گئی۔ تحائف پر بحث ہونے لگی۔ اس بات کی احتیاط رکھی گئی کہ ڈاکٹر کو کسی بات کا پتہ نہ چلنے پائے۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ ہر کوئی اس سے بات کرتے ہوئے راز داری سے کام لیتا تھا۔ بہت سے لوگ اس سے سوالات کرتے کہ وہ ۲۷ اکتوبر کو کہیں باہر تو نہیں جائے گا۔ ۲۷ اکتوبر کو اُسے کوئی کام تو نہیں ہے ۔۔۔ ان سوالات سے ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ میک نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی قسمت کا حال ہیزل سے پوچھ کر آئے گا۔ میک نے نہ صرف اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے متعلق کوئی ذکر تک نہیں چھیڑا تھا۔

ایک دن وہ ہاٹ ویسے ہاؤس میں بیئر پینے کے لئے رک گیا۔ بیئر کا اُسے مزہ آیا تو وہ وہیں بیٹھ کر بیئر پینے لگا۔ دفعتاً اس نے ایک شرابی کو شراب خانہ کے مالک سے کہتے ہوئے سنا "کیا تم دعوت میں شریک ہوگے؟"

"کون سی دعوت؟" شراب خانہ کے مالک نے پوچھا۔

"تم کنری رو کے ڈاکٹر کو جانتے ہو؟"

"ہاں"

"کچھ لوگ اس کے مجموں پر اُسے دعوت دے رہے ہیں۔"
"کون دعوت دے رہا ہے؟"
"یہ دعوت سب کی طرف سے ہوگی۔"

ڈاکٹر نے اس شرابی کی طرف دیکھا۔ وہ اس شرابی کو جانتا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کو اس بات پر خوشی ہوئی کہ اُسے دعوت دی جا رہی ہے لیکن جب اُسے گزشتہ دعوت کا خیال آیا تو وہ اُداس ہو گیا۔

دوسرے دن ہی ڈاکٹر نے دعوت کے لئے خود بھی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے گراموفون کے بہترین ریکارڈ صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ جو چیزیں ٹوٹنے والی تھیں انہیں سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مہمان بھوکے ہوں گے۔ وہ شراب جلد پی جائیں گے اور پھر انہیں بھوک ستائے گی۔ لہٰذا ڈاکٹر نے منڈی میں جاکر ۱۵ پونڈ گوشت کا آرڈر دیا۔ وہ شراب بھی لایا۔ اس نے کھانے کے لئے دوسری چیزوں کا انتظام بھی کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ مہینے کی ابتدا میں اسے تکلیف ہوگی۔ بینک میں روپیہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کوئی پروا نہ کی۔

کنری رو میں دعوت کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شراب جمع کی جا رہی تھی۔ تحائف کا انبار لگ رہا تھا۔ شراب خانوں میں مسلسل اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دعوت کے دن کون سا لباس پہنا جائے۔ ڈورا کے یہاں جو لڑکیاں تھیں وہ شہرہ عورتوں کا لباس پہننے پر بضد تھیں۔ انہوں نے دعوت کے روز اپنے کام کی تقسیم کا پروگرام بھی پہلے بنا لیا تھا ـــــ وہ جو کمبل تیار کر رہی تھیں وہ بھی اب مکمل ہونے والا تھا۔ میک نے جو بلیاں جمع کی تھیں وہ رات کو میاؤں میاؤں کرتی رہتیں اور ڈارلنگ کو ان سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

۲۷ اکتوبر کو ڈاکٹر نے جیلی فش کے آخری ڈھیر کو بوتلوں میں بھرنے کا کام ختم کیا۔ جگ کو دھویا، زمبور کو صاف کیا اور رینچ کے دستانوں کو نکال کر احتیاط سے رکھا اور زینے کے اوپر جاکر چوہوں کو کھلایا اور کچھ بہترین ریکارڈ اور خورد بین پچھلے کمرے میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ یہ پارٹی جہاں تک ہو سکے تکلیف وہ ثابت نہ ہو۔ اس لئے تیاری کے وقت تمام احتیاطیں اور پیش بندیاں کر لینا ضروری سمجھتا تھا۔

کافی کے لئے پانی چولہے پر رکھ کر اور گراموفون پر ایک پسند کا ریکارڈ شروع کر کے غسل کرنے لگا۔ اس نے ان کاموں کی انجام دہی میں انتہائی عجلت اور پھرتی سے کام لیا۔ چنانچہ میوزک ختم ہونے سے قبل اس نے صاف ستھرے کپڑے بدل لئے اور کافی کی ایک پیالی ختم کر لی۔

اس نے کھڑکی سے میدان پر پھر گلی پر نظر ڈالی، مگر کوئی شخص آتا ہوا نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر کو معلوم نہیں تھا کہ کون لوگ اور کتنی تعداد میں اس پارٹی میں شریک ہو رہے ہیں۔ دن بھر وہ پارٹی ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے سوچا کہ روزمرہ کے کام کرنے چاہئیں۔

وہ سیدھا لی چانگ کی دوکان پر گیا اور بیئر کے دو کوارٹ خریدے۔ وہاں اس نے دبا ہوا جوش محسوس کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لوگ بھی آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر تجربہ گاہ واپس آیا۔ اسے سخت پیاس لگی تھی اس لئے بیئر کا ایک گلاس تو اسی وقت پی گیا، البتہ دوسرا گلاس مزے لیکر دیر تک پیتا رہا۔ میدان اور گلی اب بھی لوگوں کی آمد و رفت سے خالی تھے۔

میک اور اس کے ساتھی فلاپ ہاؤس محل میں تھے اور اس کا دروازہ بند تھا، دوپہر کے بعد سے اسٹوو برابر جلتا رہا اور نہانے کے لئے پانی گرم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈارلنگ نے بھی غسل کیا اور اپنے گلے میں سرخ رنگ کا نیا فیتہ پہن کر پارٹی کے لئے تیار ہو گئی۔

"ہمیں کس وقت وہاں پہنچنا چاہئے؟" ہیزل نے سوال کیا۔
"میرے خیال میں آٹھ بجے سے پہلے نہیں۔" میک نے جواب دیا۔ کیوں نہ جب تک اپنے کو گرم کر لیں۔"
"ڈاکٹر اپنے کو کیسے گرم رکھے گا۔" ہیوئی نے سوال کیا۔ "کیوں نہ اس کے لئے بھی ایک بوتل خرید لیں۔"
"نہیں" میک نے کہا۔ "ڈاکٹر ابھی ابھی لی کے یہاں سے بیئر لے گیا ہے۔"
"کیا اس کو کسی قسم کا شبہ ہے؟" جونس نے سوال کیا۔
"اسے کیونکر ہوگا؟" میک نے سوال کیا۔

کونے کے کٹہرے میں دو بلیاں لڑ پڑے اور ان کی غراہٹ سے پورا کٹہرہ گونج اٹھا۔ وہاں کوئی اکیس بلیاں تھیں۔

"مگر بلیاں وہاں جائیں گی کیسے؟" ہیرلڈ نے سر جھٹک کر کہا۔ "اتنا بڑا جلوس وہاں سے لے جانا تو ناممکن ہے۔"

"ہم ایسا نہیں کریں گے۔" میک نے طمانیت والے انداز سے یاد کر پیدائش کے سلسلے میں کیا ترکیب کی تھی۔ "اس وقت ہم ڈاکٹر کو اس کے جلسے میں صرف اطلاع کر رہے گے اس کے بعد چھپے جائیں گے۔" میک نے ڈاکٹر ہڈی کا ایک جگ منگوا کر شراب پی۔ "ذرا گرمی پیدا کریں" اس نے کہا۔

بیر فلیگ کی لڑکیاں تیاری اور بناؤ سنگار میں مشغول تھیں۔ ڈورا کا نکھار دیکھنے کے قابل تھا ـــ بالوں کو اس نے نارنجی رنگ سے رنگا گیا۔ بالوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ گھونگر پیدا کئے گئے۔ شادی کی انگوٹھی پہن لی گئی اور سینے کو الماس کے بروچ سے زینت دی گئی ـــ

دوسری لڑکیاں بھی، جن کو پارٹی میں جانا تھا، تیار ہو چکی تھیں اور وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ چوکیدار منہ لٹکائے بڑبڑا رہا تھا۔ اس لئے کہ اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ پارٹی میں نہ جا سکے گا، اسے مکان کی دیکھ بھال کرنا ہے۔

ڈورا نے بڑے آئینے میں اپنے سنگار کا دوبارہ جائزہ لیا اور بالوں کو دوبارہ درست کر کے بار میں آئی۔ الفریڈ چوکیدار اداس اور آزردہ تھا۔ ڈورا نے بے پروائی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ "کیا کچھ گڑبڑ کا خطرہ ہے؟"

"نہیں" الفریڈ نے جواب دیا۔ "نہیں، سب ٹھیک ہے۔"

ڈورا نے اس کے جملے کو دہرایا۔ "سب ٹھیک ہے۔ واقعی؟ ـــ دیکھو مسٹر! تمہارے سپرد ایک کام کیا گیا ہے۔ تم اس کو کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" الفریڈ نے روکھے پن سے جواب دیا۔ بار پر کہنی ٹیک کر اس نے دیوار کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ "تم جاؤ اور لطف اٹھاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں یہاں ہر چیز کا خیال رکھوں گا۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ڈورا کا مزاج نرم پڑ گیا۔ "دیکھو" اس نے کہا۔ "ایک مرد کا یہاں ہر وقت ہونا بہت ضروری ہے۔ کوئی شرابی کسی وقت بھی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ لڑکیاں اس پر نہیں قابو حاصل کر سکتیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد تم وہاں آ سکتے ہو اور کھڑکیوں سے تم اس جگہ پر کڑی نگاہ رکھ سکتے ہو۔ پہرہ کیسا رہے گا؟ اگر کوئی بات ہوئی تو تم وہاں پر دیکھ سکو گے۔"

"بہت اچھا" الفریڈ نے جواب دیا۔ "[illegible]"

اس کی اجازت سے وہ نرم پڑ گیا۔ "بس دو ایک منٹ کے لئے بعد میں آ جاؤں گا۔ گزشتہ رات لوگوں نے شراب پی کر بڑی دھماچوکڑی کی تھی۔ ڈورا! اعصاب اب پہلے جیسا مضبوط نہیں رہا۔ اس دن جب ایک شخص کو زبردستی نکالنا پڑا اس وقت سے میرے اعصاب بہت کمزور پڑ گئے ہیں۔"

"تم کو آرام کی ضرورت ہے۔" ڈورا نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ میں میک کو تمہاری جگہ کام کرنے پر راضی کر لوں گی۔ اس وقت تم چند ہفتوں کی چھٹی پر جا سکتے ہو۔"

تجربہ گاہ میں ڈاکٹر نے بیئر کے بعد تھوڑی سی وہسکی پی، جس سے سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ خیال دل میں چٹکیاں لے رہا تھا کہ اس کو پارٹی دی جا رہی ہے۔ اس نے اپنا پسندیدہ ریکارڈ بجایا، جس سے جذبات اندر ابھر آئے اور طبیعت کچھ غمزدہ سی ہو گئی۔ طبیعت کو بہلانے کے لئے اس نے ایک کتاب اٹھائی، اس کے ایک باب پڑھنے لگا جس نے اس کے ذہن کو ایک اور جگہ پہنچا دیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد وسکی کا ایک اور گلاس لیا۔ اس کو [illegible] کی قمیص کی بتی جھلملاتی ہوئی دکھائی دی اور پھر بیر فلیگ کے سامنے سڑک پر بتیاں روشن ہو گئیں۔

فلاپ ہاؤس میں کل کے مکین بڑی بے چینی سے کلاک کی طرف بار بار دیکھتے تھے۔

کینری رو کے ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ اس پارٹی میں حسب معمول بڑا شور اور ہنگامہ ہو گا، مگر ان کی توقع اور امید کے خلاف اس کی شروعات اس طرح کی نہیں ہوئی۔ ٹھیک آٹھ بجے میک اور اس کے ساتھی اپنے تحفوں سمیت ویسٹرن بایولاجیکل پہنچے۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا اور میک نے ایک مختصر سی تقریر کی ـــ "آج تمہارا یوم پیدائش ہے۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ آج کے مبارک موقع پر تحفہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے ہم نے اکیس بلیاں حاصل کی ہیں۔" وہ رک گیا۔ اس کے ساتھی

خاموشی سے سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔

"اندر آؤ —" ڈاکٹر نے کہا "کیوں — مجھ — مجھے تعجب ہے — مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ آج میرا یوم پیدائش ہے۔"

"سب بچے ہیں" ہیزن نے کہا "ہم ان کو ساتھ نہیں لائے ہیں۔"

وہ سب کے ساتھ قاعدے کے مطابق کمرہ میں بائیں طرف بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی "اچھا" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیوں نہ تھوڑی دیر شراب سے لطف اٹھایا جائے۔"

میک نے کہا "ہم تھوڑی سی 'اسٹورٹ' اپنے ساتھ لائے ہیں" اور اس نے تینوں جگوں کی طرف اشارہ کیا "ایڈی بہت دنوں سے جمع کر رہا تھا"

ڈاکٹر نے اپنی شام کی خاموشی اور مزاحمت پر پردہ ڈالا — "نہیں" اس نے انکار کیا "تم لوگوں کو میرے ساتھ پینی ہوگی — اتفاق سے میرے پاس کچھ وسکی ہے۔"

یہ لوگ وسکی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ڈورا اور دوسری لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے گلدستہ پیش کیا۔ ڈاکٹر نے چارپائی پر بچھایا تو بہت خوبصورت تھا۔ انہوں نے بھی شراب میں ساتھ دیا۔

اس کے بعد لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ ہنری نے پیشکش پیش کیا۔ کوئی تین فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا۔ وہ اپنے آرٹ کے بارے میں تقریر کرنے جا رہا تھا کہ اس درمیان میں باقاعدگی اور ترتیب جاتی رہی۔ مسٹر اور مسز گے داخل ہوئے۔ لی چانگ نے بھی چند عمدہ چیزیں پیش کیں۔ لا ایڈا کے کچھ ایسے لوگ بھی پارٹی میں شریک ہو گئے، جو نسبتاً اجنبی تھے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا۔ پارٹی کا ضابطہ تیزی سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈورا اس پارٹی میں سب سے شاندار لگتی تھی۔ وہ ایک خاص انداز میں اپنی خوبصورت انگلیوں سے وسکی کا گلاس پکڑے ہوئے تھی اور کن انکھیوں سے وہ لڑکیوں کی بھی نگرانی کرتی رہتی۔ ڈاکٹر نے رقص کے میوزک کا ریکارڈ فونوگراف پر رکھ کر باورچیخانے میں چلا گیا اور گوشت کے قتلے تلنے لگا۔

پہلی لڑائی کچھ زیادہ بری نہیں تھی۔ لا ایڈا کے ایک منچلے نوجوان نے ڈورا کی لڑکیوں سے نامناسب خواہش ظاہر کی۔ میک اور اس کے ساتھیوں کو اس پر غصہ آگیا اور انہوں نے بغیر کسی چیز کو نقصان پہنچائے اس کو معقول سزا دیدی۔

ڈاکٹر باورچیخانے میں تین پتیلیوں میں گوشت کے قتلے تل رہا تھا اور ٹماٹر کاٹ کر سلائس پر رکھتا جا رہا تھا۔ میک نے فونوگراف کا چارج خود اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رقص شروع ہو چکا تھا اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ایڈی نے ٹاپ ڈانس پیش کیا۔ ڈاکٹر نے جب گوشت کے قتلے پیش کئے تو سب کو تعجب ہوا۔ کھانے کی گرانی نے سرور میں کمی پیدا کر دی — وسکی ختم ہو گئی تو ڈاکٹر کئی گیلن وائن نکال لایا۔

ڈورا نے ڈاکٹر سے اپنے ایک پسندیدہ میوزک کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر نے فوراً تعمیل کی۔ تمام مہمان خاموش ہو گئے، اور پوری محفل پر مکمل سکوت چھا گیا۔ دو نئے اشخاص سیڑھیوں پر ظاہر ہوئے اور چپکے سے محفل میں شریک ہو گئے۔ میوزک ختم ہوا، تو ہر شخص خاموش اور متاثر تھا۔ ڈاکٹر ایک کتاب اٹھا لایا اور صاف اور پُر اثر آواز میں پڑھنا شروع کیا:۔

آج بھی
اگر اپنی روح کی گہرائیوں میں مجھے وہ حسینہ نظر آجاتی ہے۔
اس کا سنہرا رنگ اسی طرح برقرار اور اس کا چہرہ ستارہ ہلالِ شب کے مانند
برگشتہ، اس کا تن نازنین محبت کے شعلوں کا گہوارہ۔
اور خنجر عشق سے زخمی
اس کی نوخیز جوانی میری پہلی محبوب
تو میرا دل برف کی سیلوں میں زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

آج بھی
اگر میری محبوبہ اپنی کنول جیسی آنکھوں سمیت آجائے۔
وہ آنکھیں جو جوانی کی محبت کے شبِ بیداری کی وجہ سے تھکی تھکی ہیں۔
تو میری آغوش بیتاب ایک بار پھر اسے اپنے میں سمو لے۔
اور اس کے دہن شیریں سے میں ایک بار پھر بادہ کشی کروں۔
پُرسکون شور میں جیسے مگس آوارہ
رہزن شہد و شکر چوگل نیلوفر کی

آج بھی
اگر میں اسے اس طرح دراز دیکھوں کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں
اور کاجل نے بہہ کر اس کے خط رخسار کو
اس کے چمکدار کان اور زرد رخسار تک پہنچا دیا ہو
مرے فراق میں بے تاب و بے قرار ہو وہ
تو میری محبت اس کے لئے کمند گل بن جائے اور شب
دن کے سینہ پہ جو پھیلائے ہوئے زلف سیاہ

آج بھی
میری آنکھیں کہ ہیں دیدار سے یکسر مایوس
اس کی صورت کی بناتی ہیں حسیں تصویریں
اُف وہ آئینہ وہ رخسار سے مس ہیمہ
ہائے وہ مصحف رخسار کہ جس پر میں نے
لب بے مردمے لکھی ہے بوسوں کی
وہ غزل بن گئی جو آخری تخلیق مری

آج بھی
یاد آتے ہیں تری چشم غزالیں کے ہیولے بوجھل
اور ترنم کا طلب گار وہ ترا جسم نزار
نقب وصل کا انجام مسرت کا شکار
مری دنیائے سکوں تیری جوانی کا ابھار
اور میرے درد محبت کے لئے وجہ قرار
ترے یاقوت کے ترشے ہوئے ہونٹوں کا نکھار

آج بھی
سرگیں چشم کا وہ ریشمی آغوش مجھے یاد ہے دوست
مسکراتی ہوئی غمگیں وہ پلکیں تیری
بند ہوتی تھیں تو انداز عجب ہوتا تھا
یہ بھی جیسے کوئی انداز نظر ہو تیرا
وہ لب تازہ ترے جیسے معطر کلیاں
دو دو پیچاں کی طرح گیسوئے شب رنگ کا خم

اور وہ انگلیاں وہ گوہر دندوں کی ہنسی

آج بھی
ہے مجھے یاد ترا ہائے وہ خاموش حجاب
تذکرہ رونق کی دوست کا با انداز حسیں
آتشیں یادے لب مثل خط ساغر سے
چند قطرات میں " رقص" کی پیاس کا ثبت سے عرق
جس کا انجام ہو قندیل حلاوت کی ضیا
اور کسی کمی کے قالین پہ خواب شیریں

ڈاکٹر یہاں تک پڑھنے کے بعد رکا تو مجمع کے تاثر کا عجب عالم تھا۔ بچے بس بری طرح رو رہی تھی اور ڈھوا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ہیزل الفاظ کی آواز بک میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اس کو معانی پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بہرحال ہر شخص نظم سے متاثر تھا اور اپنی گذشتہ محبت کو یاد کر رہا تھا۔

میک نے تبصرہ کیا " بہت خوب۔ اس نے ایک محبوبہ کی یاد تازہ کر دی " انہوں نے اپنے گلاسوں میں وائن انڈیلی اور سب خاموش ہو گئے۔ محفل آہستہ آہستہ برخواست ہو رہی تھی۔ لوگ غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے۔ لیڈی نے ٹاپ ڈانس پیش کیا اور واپس آکر بیٹھ رہا۔ مجمع اٹھنے والا ہی تھا کہ سیڑھیوں پر قدم کی آواز سنائی دی اور ایک گرجدار آواز سنائی دی " لڑکیاں کہاں ہیں؟ "

میک ہنستا ہوا اٹھا اور بڑھ کر دروازے پر پہنچا۔ جونس اور ہیوی کے چہرے پر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی " یہ کن لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو " میک نے نرمی سے دریافت کیا۔

" کیا یہ قحبہ خانہ نہیں ہے؟ " کوجوان نے معلوم کیا۔

" تم غلط سمجھے، مسٹر! " میک کے لہجے میں خوشی تھی۔

" اور یہ عورتیں یہاں کیوں ہیں؟ "

اس کے بعد لڑائی شروع ہو گئی اور لوگ گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑائی بہت زبردست تھی۔ بالآخر نئے آنے والے پسپا ہونے لگے پہلے انہوں نے کتابوں کی آڑ لی مگر وہاں بھی زیادہ دیر تک جم نہ سکے۔ سامنے کی دونوں کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ اچانک الفریڈ نے، جس کو ہنگامے

کی اطلاع مل گئی تھی، پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اب لڑائی مکان سے نکل کر سڑک پر آ پہنچی اور پھر کھلے میدان میں۔ پھاٹک کا دروازہ ٹوٹ کر اس بار بھی قلابہ پر لٹکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی قمیض پھٹ گئی تھی اور کندھے پر زخم آ جانے سے خون بہہ رہا تھا۔ دشمن نصف میدان تک پسپا کئے جا چکے تھے کہ سائرن سنائی دیا۔ پارٹی کے منتظمین کو بمشکل اتنا وقت ملا کہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے وہ تجربہ گاہ میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر سکیں اور روشنی بجھا سکیں۔ سپاہی ناکام واپس گئے۔ مگر پارٹی کے لوگ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے اور وائن پی رہے تھے۔ اس کے بعد بیرفلیگ کی

باری آئی۔ ایک تازہ دم جماعت نے اپنی پوری قوت سے حملہ کیا۔ پارٹی کے لوگوں کو ان کی امداد کے لئے جانا پڑا۔ سپاہی واپس آئے۔ اندر دیکھا، اپنی زبانوں سے چخ کی آواز پیدا کی اور اس میں شریک ہو گئے۔ میک اور اس کے ساتھی اسکوئڈ کار پر بیٹھ کر جمی بروشیا کی دوکان پر گئے اور مزید وائن خرید کر لائے۔ خود جمی بھی ان کے ساتھ واپس آیا۔ پارٹی کا شور کینری روکے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دیتا تھا۔ سان پڈرو کشتی کے ملاح بھی پارٹی میں شریک ہوئے، جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک خاتون نے شور و ہنگامہ سے تنگ آ کر کوتوالی کو فون کیا، مگر وہاں کوئی نہیں ملا۔ خود پولیس کو رپٹ لکھانی پڑی کہ اس کی کار چوری ہو گئی، جو بعد میں ساحل پر ملی۔ ڈاکٹر ٹانگ پر ٹانگ رکھے میز پر بیٹھا ہوا تھا اور خوشی سے اپنے گھٹنے پر انگلیاں تھپتھپا رہا تھا۔ میک اور پھے لس نے زمین پر ہندوستانی کشتی لڑ رہے تھے اور خلیج کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی۔ اس وقت کسی شخص نے کوڑے کی ۲۵ فٹ لمبی ڈوری میں آگ لگا دی۔

ڈاکٹر بڑی سستی اور بے ڈھنگے پن سے، جس طرح ایک موٹا آدمی تیرنے کے حوض سے نکلتا ہے، اپنے بستر سے نکلا۔ اس نے پہلے ایک آنکھ کھولی۔ کمرے کا بہترین رنگ دیکھ کر پھر بند کر لی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اس نے آنکھ کھولی۔ اس کی آنکھ گدے سے گذر کر فرش پر پڑی۔ کونے میں پلیٹیں ٹوٹی ہوئی تھیں، میزیں زمین پر الٹی ہوئی تھیں، وائن اور کتابیں زمین پر بکھری پڑی تھیں، باورچی خانے کے دروازے سے گوشت کی پلیٹوں کے انبار اور گھی میں لت پت چپٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ سگریٹ کے سیکڑوں ٹکڑے فرش پر مسلے ہوئے پڑے تھے۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کے لئے بیر پر رکی، جو فرش کے بیچ میں کافی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور ایک کہنی پر ٹیک دے کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کینری رو میں ہر طرف خاموشی تھی اور دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ فلاپ ہاؤس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا، کھلے میدان میں ایک شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ بیرفلیگ کا دروازہ بند تھا۔

ڈاکٹر اٹھا، باورچی خانہ میں جا کر گیس کے ہیٹر کو جلایا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ پہاڑی کے اوپر سے چرچ کے گھنٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پانی پکنے لگا تو اس نے غسل کیا اور نیلی پتلون اور فلالین کی قمیض پہنی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ کھولا تو لی چانگ تھا۔ رفریجریٹر سے بیر لایا اور بغیر طلب کے اس کو پیش کی۔

"اچھا وقت؟" لی نے سوال کیا۔ اس کی بھوری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اچھا وقت" ڈاکٹر نے جواب دیا اور وہ اپنی ٹھنڈی بیر لے کر تجربہ گاہ میں چلا گیا اور بیر کے ساتھ کھانے کے لئے کچھ سینڈوچ تیار کئے۔ اس وقت گلی میں مکمل سکوت تھا۔ سینڈوچ اور بیئر سے فارغ ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور نان دانی سے گندی پلیٹیں نکالیں اور ان میں گرم پانی ڈال کر صابن کا پاؤڈر ملا دیا۔ تاکہ ان کی چکنائی آسانی سے صاف ہو جائے۔ اس کے بعد جو گلاس ٹوٹنے سے بچ رہے تھے، ان کو جمع کیا اور صابن کے گرم پانی میں ان کو بھی ڈال دیا۔ چولہے پر گوشت کی پلیٹوں کے ڈھیر تھے۔ یہ سب چکنائی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک میز کا کچھ حصہ صاف کیا اور گلاس دھو کر وہاں رکھتا گیا۔ اس کے بعد پچھلے کمرے کا تالا کھول کر اپنا ایک پسندیدہ ریکارڈ نکال لایا اور اس کو گراموفون پر لگا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ گلاس بھی دھوتا رہا، مگر بڑی احتیاط کے ساتھ تاکہ میوزک میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ ریکارڈ ختم ہوا تو ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ پونچھے اور



سید شہیر الدین اشرفی
(ناظم شاہراہ)



محمد اسمٰعیل
(جامعہ آرٹسٹ)

ہوں گا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ ایک کتاب پر پڑی، جو شعلہ
[illegible] تھی۔ اس کو اٹھایا اور بستر پر بیٹھ
گیا۔ تھوڑی دیر تک دل ہی دل میں پڑھتا رہا، اگر شعلے
[illegible] کے سب بجھ گئے اور پھر اس کے بعد وہ بلند آواز سے
پڑھنے لگا:-

آگاہی

جب تم نے مجھ سے محل سے لوٹتے اور وہاں کی باتیں کرتے تو
میں غور سے سنتا
وہ کہانیاں جو انہوں نے اپنی جوشیلی مسلسل آنکھ میں ختم کر دیں
میں یہ سب کچھ سنتا رہا، لیکن اگر مجھے سنتا تو اپنے محبوب
کی سرگوشی کو
ہماری وہ مبہم گفتگو جب ہم پر نیند طاری ہو رہی تھی
وہ اس کے عقل و تدبر سے بھرپور مختصر الفاظ
پانی کی طرح بے پروا اور شیرینی کی طرح پُر اشتیاق

آگاہی

مجھے یاد ہے کہ گلاب کے پھولوں اور سرو کے درختوں سے
مجھے کتنا پیار تھا
مجھے کتنا پیار تھا عظیم نیلے پہاڑوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری
پہاڑیوں سے
سمندر کے شور سے اور بار بار
خلا میں نظر آنے والے عجیب آنکھوں اور تتلی کے جیسے
بازوؤں سے

کس طرح میری نگاہ قطرہ کو بھی شب سے معروف ہو جاتی
ہو سکتے
اور پتے جھڑتے تھے چشموں میں غسل کرتے تھے

تاکہ شہزادے نے کتاب بند کر دی۔ چاندنی کے ذخیرے میں جو موجیں اٹھ رہی تھیں وہ [illegible] رہی تھیں۔ اسی طرح جال کے اندر جو ہرن کی [illegible] آنکھیں جس کے ساتھ [illegible] رہی تھی۔ وہ باہر [illegible] میں گیا تو اندر سے پانی نکل آیا تھا، اس نے گرم پانی ملایا۔ اس نے بلند آواز میں تانسے گفتگو کی، پھولوں سے باتیں کیں اور اپنے سے خطاب کیا۔-

آگاہی

جبکہ میں شریف زندگی کو اچھی طرح چکھ چکا ہوں
ہم جہاں کی زہر کے ساغر کو اٹھا چکا اور جس نے
ذہن کو

ایک اور صرف ایک ہی لمحہ کے لئے
اپنی محبوبہ کے طفیل میں میں نے آنکھیں بھر کے دیکھا ہے
اس بال سو نور کو جس میں ابدیت کی جھلکیاں تھیں
اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔
سفید چوہے جالی کے کٹہرے میں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور نکلنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ جی صاحب گلاس کے پیچھے اب بھی بیٹھا ہوا تھا اور اپنی گرد آلود اور تھکی آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔

دیگر اداروں کی کتب

ادب:-

تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	۱۰/-
تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسن	۴/-
اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	۲/۸
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۶/۸
اردو ہندی ہندوستانی	سجاد ظہیر	-/۱۲/-
مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	۲/-
تاریخ ریختی	دیوان جان صاحب	۲/-
نثر کا بہترین ادب	مکتبہ شاہراہ	۵/۸
شعر 〃 〃	〃	۵/۸
منتخب ادب	احتشام حسین	۶/-
تاریخ ادبیات ایران	مترجمہ مبارز الدین احمد	۳/-
روسی ادب مکمل	پروفیسر محمد مجیب	۸/-
ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین	۲/۸
ادب اور سماج	احتشام حسین	۲/۱۲
نیرنگِ خیال مکمل	محمد حسین آزاد	۱/۸
ایک مشرقی کتب خانہ	مبارز الدین	۳/-
احوالِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	۵/-
نقدِ غالب	〃	۲/-
میر تقی میر	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۲/-
مطالعہ حالی	شجاعت علی سندیلوی	۲/۸
مطالعہ شبلی	〃	۳/۸
ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۳/۸
ادب کیا ہے	ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی	۲/-
اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر عزیز	۵/۸
بیانِ غالب	باقر	۵/-

مقالاتِ نادر بیانیں	ہندوستانی اکیڈمی	۲/۴
فلسفۂ کلامِ غالب	شوکت سبزواری	۳/۴
ہم عصر شعراء کے خطوط	ضیاء الاسلام	۵/۸
انشائے داغ	سید علی حسن	۱/۸
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	عبد اللطیف اعظمی	۳/-
جنوبی ہند میں دو ہفتے	جگن ناتھ آزاد	۱/-
آرائشِ محفل	نولکشور پریس	۴/۸
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۴/۴
الف لیلہ مکمل	نولکشور پریس	۵/-
داستانِ امیر حمزہ	〃	۸/-
سیر کہسار (مکمل دو حصے)	رتن ناتھ سرشار	۱۰/-
اردوئے قدیم	شمس اللہ قادری	۲/۸
انوارِ سہیلی		۱/-
گل بکاؤلی		-/۱۲/-
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۸
امیر خسرو	ڈاکٹر وحید مرزا	۵/-
کبیر صاحب	منوہر لال زتشی	۳/-
اقبال کامل	عبد السلام ندوی	۶/۸
بزمِ تیموریہ	سید صباح الدین	۴/-
بزمِ مملوکیہ	〃	۵/۸
چند دکھنی پہیلیاں	محمد نعیم الرحمٰن	۱/۸
ایک نادر روزنامچہ	نور الحق ہاشمی	۲/۸
اکبر میری نظر میں	مولانا عبد الماجد دریابادی	۳/-
فلسفۂ اقبال	عبد القوی دریابادی	۲/۸
ادبی خطوطِ غالب	مرزا احسن عسکری	۳/۸
معرکۂ چکبست	نولکشور پریس	۳/-
ذوقِ ادب و شعور	احتشام حسین	۳/-

شمعہائے چراغ	احتشام حسین	۴/-
ہماری قومی زبان	سر تیج بہادر سپرو	۱۲/-
ادب الجاہلی	رضا انصاری	۷/-
کلیاتِ نادری مکمل	مرزا نظام شاہ	۴/-
کلیاتِ آفاقی	رئیس احمد جعفری	۳/-
جامع الکلیات مکمل	اختر شیرانی	۴/-
اخوان الصفا	مولوی اکرام علی	۱۲/-
طریقۂ خداوندی		۲/-
گلگشتِ محفل	شیر علی افسوس	۲/۸
کلاسیکی ادب	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۳/۸
اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبد العلیم	۱۲/-
آثارِ ابوالکلام آزاد	قاضی عبد الغفار	۴/-
یادگارِ غالب	مولانا حالی	۲/-
اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۰/-
شعر الہند مکمل	علامہ شبلی	۳/۸
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	۳/-
طرۂ امیر	〃	۱/-
عودِ ہندی	غالب	۱/۸
ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	۳/-
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	〃	۳/-
مکاتیبِ شبلی مکمل	مولانا شبلی	۲/۴
زبانِ داغ	رفیق مارہروی	۲/۸
ادب کا مقصد	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۲/۸
ذکرِ حافظ	سجاد ظہیر	۲/۴
بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲/۸
عربی زبان پر فارسی کا اثر	ڈاکٹر عبد الحق	۱۰/-

[illegible] سہیل [illegible] ۲/۸
[illegible] مجنوں گورکھپوری ۳/۸
[illegible] ابوالحسن ندوی ۳/۸
[illegible] سید [illegible] ۳/۸
[illegible] ۲/۴
[illegible] محمد حسین آزاد ۱/۸
اُردو کی کہانی سید احتشام حسین ۱/۸
ساحل اور سمندر " ۲/۸
ناول کیا ہے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۴
مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ۵/۸
[illegible] مہاتما گاندھی کے ادبی کارنامے ۲/۸
[illegible] سید مرتضیٰ حسین ۲/-
[illegible] ابرار حسین گنوری ۳/-
مطالعۂ غالب اثر لکھنوی ۱/۸
تحقیقی مطالعے ڈاکٹر نذیر احمد ۲/-
نقد الادب حامد اللہ افسر ۳/۸
اردو (مضمون نگاری) ڈاکٹر ظہیر الدین ۲/۸
اردو زبان کا ارتقاء ڈاکٹر شوکت سبزواری ۴/۸
معیار البلاغت ۱/-
بحر الفصاحت نجم الغنی ۱۰/-
اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست } نصیر الدین ہاشمی ۱۲/-

تنقید

تنقیدات عبدالحق مولانا عبدالحق ۲/۴
شعر العجم مکمل ۵ حصے علامہ شبلی ۱۴/۸
محاسن کلام غالب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ۱/۶
تحقیقات ڈاکٹر عندلیب شادانی ۵/۸
تنقید کیا ہے آل احمد سرور ۳/-
تنقیدی اشارے " ۳/-
اردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۴

[illegible] پروفیسر [illegible] ۳/۸
تنقیدی [illegible] ۱/۸
حسرت موہانی پروفیسر عبدالشکور ۳/-
تنقیدی اصول " ۳/-
فانی " ۳/۸
روحِ اقبال ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۶/-
[illegible] دو حصے اثر لکھنوی ۹/-
نکات الشعراء میر تقی میر ۱/۱۲
نقد حیات ممتاز حسین ۳/-
انیس کی مرثیہ نگاری اثر لکھنوی ۲/-
[illegible] " ۳/۸/-
[illegible] تنقیدی مضامین " ۳/۸
اقبال کی شاعری عبدالمالک آروی ۵/۸
نصرتی ڈاکٹر عبدالحق ۳/-
تحقیقی مقالے پروفیسر معین الدین ۲/۴
تنہائے گفتنی کلیم الدین احمد ۴/-
نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۳/-
ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۲/۸
چند تنقیدات عبدالحق -/۸/-
فن شاعری عزیز احمد ۱/۴
سودا شیخ چاند احمد ۲/۸
غالب نامہ محمد اکرام ۲/۸
فکر و فن خلیل الرحمٰن اعظمی ۳/-
جہانِ نو ڈاکٹر غلام جیلانی ۳/-
باقیاتِ فانی فانی ۲/۸
نکاتِ مجنوں مجنوں ۵/-
ادبی رجحانات اعجاز حسین ۲/۱۲
نئی لکیریں سید محمد طفیل ۱/۸
اردو ادب میں طنز و مزاح فرقت کاکوروی ۱۰/-
روایت اور بغاوت احتشام حسین ۲/-
ہندوستانی لسانیات کا خاکہ " ۲/۸

[illegible] کا تنقیدی مطالعہ [illegible] ۱/۸
اردو تنقید کا ارتقاء [illegible] ۳/-
تعبیر و تشریح و تنقید " ۳/-
تنقیدیں [illegible] احمد ادیب ۳/-
اقبال مجنوں ۱/۴
[illegible] شبلی [illegible] کاکوروی ۳/-
کتاب نورس ڈاکٹر نذیر احمد ۲/۸/-

مقالات:-

مقالات مولوی عبدالحق عبدالحق ۳/۸
فردوسی پر چار مقالے پروفیسر محمود شیرانی ۶/-
مقالات گارساں دتاسی مکمل دو حصے ۸/-
خطبات " " ۶/۸
مضامین عابد ڈاکٹر عابد حسین ۴/-
خطبات عبدالحق جلد دوم ۱/۸
خطبات شبلی ۱/۸
مقدمہ رقعاتِ عالمگیر پروفیسر نجیب اشرف ۵/-
رقعاتِ عالمگیر " ۳/-
مقالاتِ شبلی مکمل ۸ حصے ۲۴/۸
مکالماتِ برکلے ۱/۸
مکاتیب حالی شیخ محمد اسمٰعیل ۲/-
پطرس کے مضامین ۲/-
مضامین سرسید عزیز الدین اختر ۲/۴
انتخاب مضامین شرر ۱/۴

تذکرے و سوانح:-

گل رعنا مولانا عبدالحی مرحوم ۴/-
حیات شبلی سید سلیمان ندوی ۹/-
برکلے اور اس کا فلسفہ مولانا عبدالباری ۱/۴
ادبی اور قومی تذکرے حصہ اول و دوم ۱۱/-
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی پروفیسر خلیق احمد ۴/-

- جاں نثارانِ بہادر شاہ — ظ۔ انصاری ۳/۸
- یادِ رفتگاں — [illegible] ۴/۰
- شاعراتِ اردو — محمد جمیل احمد نقوی ۶/۰
- معرکۂ چکبست و شرر — عبدالشکور ۳/۰
- ہندی کے مسلمان شعراء ؍؍ -/۱۲/-
- چند ادیب ۲/۰
- تذکرہ ریختی گویاں — سید فتح علی حسینی -/۱۳/-
- چمنستانِ شعراء — لچھمی نرائن ۴/۱۲
- تذکرہ شعرائے اردو — میر حسن دہلوی ۱/۱۲
- رندِ پارسا تذکرہ — ریاض خیرآبادی ۴/۴
- ریاض الفصحاء — غلام ہمدانی ۲/۰
- گلزارِ ابراہیم — سید [illegible] الدین ۳/۰
- نکات الشعراء — میر تقی میر ۱/۱۲
- تلسی داس — جے کشن چودھری ۲/۸
- عقدِ ثریا ؍؍ -/۱۲/-
- مخزنِ نکات — قائم ۱/۴
- مہاراجہ رنجیت سنگھ — سیتا رام کوہلی ۶/۰
- سلطان محمود غزنوی — سید جمیل حسین ۱/۸
- میر کی آپ بیتی — نثار احمد فاروقی ۲/۸
- گلِ عجائب — اسد علی ۱/۲
- یادگارِ حالی — صالحہ عابد حسین ۴/۴
- حیاتِ اجمل — قاضی عبدالغفار ۸/۰
- حیاتِ سرسید — نور الرحمٰن ۲/۰
- باپو کے قدموں میں — ڈاکٹر راجندر پرشاد ۱۵/۰
- یادگارِ شعراء — طفیل احمد ۲/۸
- سوانح حیات — امیر خسرو -/۱۲/-
- ذکرِ غالب — مالک رام ۳/۰
- دبدبۂ امیری — سید محمد عبدالحکیم ۴/۸
- سوانح مولانا روم ۳/۰
- البیرونی — سید حسن برنی ۱/۸
- تلاشِ حق مکمل دو حصے — مہاتما گاندھی ۶/۰

- کیا خوب آدمی تھا — ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ ۱/۸
- جواہر لال کی کہانی ؍؍ ۵/۰
- سعادت حسن منٹو — کرشن چندر -/۱۵/-
- اسرار الحق مجاز — عصمت چغتائی -/۱۵/-
- دیوندر ستیارتھی — ساحر لدھیانوی -/۱۵/-
- مشاہیرِ چین — میر عابد علی خاں ۱/۸

ڈرامے

- انارکلی — امتیاز علی تاج ۲/۸
- دیا بجھ گیا — کرتار سنگھ دگل ۱/۴
- پردۂ غفلت — ڈاکٹر عابد حسین ۱/۰
- حبّہ خاتون — پروفیسر محمد مجیب -/۱۲/-
- کھیتی ؍؍ ۱/۸
- ہیروئن کی تلاش ؍؍ ۱/۴
- کربلا — منشی پریم چند ۲/۸
- ٹیگور کے ڈرامے — ٹیگور ۲/۴
- آگرہ بازار — حبیب تنویر ۱/۸
- شکنتلا — کشن چند زیبا ۱/۴
- لنگوٹی والا (گوتم بدھ) ؍؍ ۱/۸
- کایا پلٹ (اچھوت ادھار) ؍؍ ۱/۸
- بیوی اور بیسوا ؍؍ ۱/۴
- زخمی پنجاب ؍؍ ۲/۰
- گریجویٹ مزدور ؍؍ ۱/۸
- دان ویر کرن ؍؍ ۱/۸
- ادارے — (بیدر سیٹھ) ۲/۸
- ریڈیو ڈرامے — فضل حق قریشی ۲/۰
- پیسہ اور پرچھائیں — ڈاکٹر محمد حسن ۲/۸
- ناتن — مترجم نعیم الرحمٰن ۴/۰
- فریبِ گل — مترجم جگت موہن لال ۳/۰
- علیا حضرت — قدسیہ زیدی ۱/۸
- انصاف — مترجم دیانرائن نگم ۱/۸

- نقوشِ اثر — پروفیسر مشتاق حسین [illegible] ۱/۰
- نفرت کا بیج ؍؍ [illegible]
- خانہ جنگی — پروفیسر محمد مجیب ۱/۰
- دروازہ — کرشن چندر [illegible]
- مرزا جنگی — عظیم بیگ چغتائی [illegible]
- دوسری شام — پروفیسر محمد مجیب ۱/۱۲
- [illegible] برنارڈ شا — مترجمہ نور الحسن ہاشمی [illegible]
- دل سے قریب — انتصار حسین ۱/۸
- یہودی کی لڑکی — آغا حشر کاشمیری ۱/۸
- خوبصورت بلا ؍؍ ۱/۸
- اندر کی [illegible] — [illegible] ۳/۸
- روحانی شادی — پریم چند ۱/۴
- دکھیاری — ڈی۔ این کول ۱/۸
- آزادی ؍؍ ۱/۰
- دیوا بھیمنو — کشن چند زیبا ۳/۴
- سون کمار ؍؍ ۱/۴
- ستیہ وان ساوتری ؍؍ ۱/۸
- شہیدِ اعظم سردار بھگت سنگھ — بشن گپتا -/۱۲/-
- جلیانوالہ باغ ؍؍ -/۸/-
- قاتل — اوم پرکاش -/۱۲/-
- رضیہ سلطانہ — کلیم ہرنی ۵/۰

نظم

- جواہرِ سخن اول — مولوی مبین کیفی چڑیا کوٹی، شعراءِ دکن سے لیکر آج تک وغیرہ کے کلام کا انتخاب ۶/۸
- ؍؍ دوم ؍؍ ۳/۴
- ؍؍ سوم ؍؍ ۱۰/۰
- ؍؍ چہارم ؍؍ ۶/۰
- گلزارِ نظیر — مرتبہ سلیم جعفر ۲/۰
- کلامِ انشاء — مرزا محمد عسکری ۲/۰

[illegible]	ڈاکٹر اعجاز حسین	۲/۸
[illegible]	کلیم احمد قریشی	۲/-
[illegible]	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	۲/۸
[illegible]	محمد حسین آزاد	۲/-
[illegible]	جلال الدین احمد جعفری	۷/-
کلیات اکبر الہ آبادی	،	۵/-
دیوانِ حالی	،	۲/۴
دیوانِ غالب	آغا طاہر نبیرۂ آزاد	۱/۸
انتخاب کلامِ اکبر	کیفی [illegible]	۲/-
رباعیاتِ آسی	عبدالباری آسی	۱/۸
رباعیاتِ انیس	سید محمد عباس	۲/۸
مثنوی میر حسن	شمس بریلوی	۱/۱۲
گلزارِ نسیم		-/۱۲/-
کلیاتِ نظیر اکبرآبادی	نولکشور پریس	۱۲/-
نظمِ سعید (انتخاب)	جلال الدین احمد جعفری	۲/-
رباعیاتِ عمر خیام	نولکشور	-/۱۲/-
مرقعِ چغتائی	دیوانِ غالب مصور	۲۵/-
مکمل شرح دیوانِ غالب	آسی	۳/۸
شرحِ کلامِ غالب	جوش ملسیانی	۵/-
مرآۃ الغالب	بیخود دہلوی	۵/-
دیوانِ اکبر	عبدالحق	۱/۸
دیوانِ تاباں	،	۲/-
انتخابِ داغ	،	۱/۱۲
جذباتِ [illegible]	نسیم دہلوی	۱/۸
کلیاتِ ولی	ہاشمی	۴/۶
اس نظم میں	میراجی	۲/۸
میراجی کی نظمیں	،	۲/-
قومی نظمیں اور ترانے	،	۲/۸
مقدمۂ شعر و شاعری	حالی	۲/۸
مسدسِ حالی	،	[illegible]
بوستانِ روس	شفا دہلوی	۳/-

[illegible] نظمیں	[illegible]	۲/۸
جرس	[illegible]	۲/۸
[illegible]	سید [illegible] جعفری	۲/۸
نئی دنیا کو سلام	،	۲/-
[illegible]	،	۱/-
سرود و خروش	جوش ملیح آبادی	۶/-
سموم و صبا	،	۸/-
کلیاتِ اقبال	اقبال	۵/-
[illegible]	مخمور لکھنوی	۵/-
[illegible]	جاں نثار اختر	۳/۸
مقامات	احسان دانش	۳/-
نغیرِ فطرت	،	۲/۸
[illegible]	کمال احمد صدیقی	۱/۸
ارمغانِ اعظم	سید محمود	۲/۸
ترکش	محمد توقیر	۳/-
جوئے رواں	حامد اللہ افسر	۲/۸
کاروانِ سخن	چاند [illegible]	۳/۸
حرفِ تمنا	میکش اکبرآبادی	۳/-
دامِ خیال	ضیاء الاسلام	۳/-
ذوقِ جنوں	آل احمد سرور	۳/۸
محفلِ خوباں	توفیق فاروقی	۴/-
گلزارِ سخن	[illegible]	۲/-
جوئبار	[illegible] ظفر	۱/۸
نقشِ بہزاد	بہزاد	۱/۸
نغمۂ حبیب	،	۱/۱۲
وجد و حال	،	۲/۸
نورِ ظہور	،	۱/۸
کاروانِ منزل	آسی لکھنوی	۲/۸
کاغذی پیرہن	خلیل الرحمن اعظمی	۲/۱۲
انتخاب کلیاتِ نظیر اکبرآبادی	جلال الدین احمد جعفری	۵/-
اردو کے سو شعر	اکبر	-/۱۵/-

اردو کے سو شعر	فانی	-/۵/-
،	اکبر	-/۵/-
،	اقبال	-/۵/-
،	جگر	-/۵/-
،	درد	-/۵/-
،	ذوق	-/۵/-
،	حالی	-/۵/-
،	حسرت	-/۵/-
،	غالب	-/۵/-
،	میر	-/۵/-
،	مصحفی	-/۵/-
،	مومن	-/۵/-
صنم و حرم	شکیل بدایونی	۲/۴
[illegible]	،	۲/۸
آخرِ شب	کیفی اعظمی	۳/-
سہ رنگ	اختر الایمان	۱/۸
شکستِ زنداں	غلام ربانی تاباں	۳/-
سازِ لرزاں	،	۲/۸
فروزاں	جذبی	۳/-
آہنگ	مجاز	۳/-
تعمیرِ حیات	حافظ ولایت اللہ	۳/۸
شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	۵/-
نشاطِ روح	اصغر گونڈوی	۱/۱۲
سرودِ زندگی	،	۲/۴
بانگِ درا	اقبال	۲/۸
بالِ جبریل	،	۳/۸
ضربِ کلیم	،	۲/۸
ارمغانِ حجاز	،	۱/۱۲
شاہنامۂ اسلام مکمل چار حصے	حفیظ جالندھری	۲/-
[illegible]	،	۳/۸
روپ	فراق گورکھپوری	۳/۸

شاعری

رباعیات	فراق گورکھپوری	۳/-	نقش حیات	[illegible]	۲/-	[illegible]	کرشن چندر	۲/۸
مشعل	"	۲/۴	آہنگ سرمدی	"	۳/-	[illegible]	"	۲/۴
[illegible]	[illegible]	۵/-	خرابات	عدم	۴/-	[illegible]	"	۴/-
عروس غزل	روش صدیقی	۳/-	رم آہو	"	۳/۸	گدھے کی سرگزشت	"	۳/۸/۳
کاروان	"	۱/۴	جھومر	قتیل شفائی	۳/-	آسمان روشن ہے	"	۲/۸/۳
بادۂ مخمور	مخمور دہلوی	۳/-	سوز و گداز	[illegible]	۲/۴	[illegible]	"	۴/-
طلسم	ڈاکٹر مسعود حسین	۳/۴	**ناول :-**			ایمان	[illegible]	۳/-
مثنوی زہر عشق	شوق	-/۸/-				ثریا	"	۴/-
[illegible] کا شعری ادب		۱/۴	چوگان ہستی مکمل	منشی پریم چند	۱۱/-	نگار	"	۳/-
انتخاب کلام ظفر	شاہد علی خاں	۲/۴	گوشۂ عافیت حصہ اول و دوم	"	۷/-	[illegible]	مہندر ناتھ	۲/۱۲
انقلاب فانی	"	۲/۴	گئودان	"	۶/-	وعدہ	"	۴/۸
آتش و نم	نشور واحدی	۲/۸	میدان عمل	"	۵/-	شبانہ	نسیم انہونوی	۴/-
نوبہاراں	آثر لکھنوی	۲/۴	بازار حسن	"	۲/۸	تمنا	"	۴/-
[illegible]	صدیقی	۳/-	غبن	"	۵/-	نجم سحر	"	۴/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	۲/-	پردۂ مجاز	"	۴/-	مہ پارہ	"	۴/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۳/۸	نرملا	"	۲/۸	نشاط	"	۴/-
پرچھائیاں	"	۱/۴	بیوہ	"	۲/-	شگفتہ	"	۳/-
ساز و صدف	عدم	۲/۴	روٹھی رانی	"	۱/۸	شبنم	"	۳/-
قول و قرار	"	۲/۸	جلوۂ ایثار	"	۳/-	بانو	"	۴/۸
گلنار	"	۲/۴	طوفان	ٹیگور	۳/-	شوہر کا روگ	"	۱/۴
گردش جام	"	۲/۴	جیون پربھات	"	۳/-	کہکشاں	"	۴/-
بلبلے	"	۲/۴	چندر ناتھ	سرت چندر چٹرجی	۱/۸	سراب زندگی	"	۴/-
گجر	قتیل شفائی	۳/-	گھر کی آگ	"	۲/۸	طرز زندگی	"	۲/-
روزن	"	۳/-	حسرت	"	۳/-	نئی زندگی	خان محبوب طرزی	۲/۸
جلترنگ	"	۲/۴	سماج کا ڈر	"	۲/۴	انجمن	"	۳/-
شعلۂ حرف	کیف	۱/-	رادھا رانی	بنکم چٹرجی	۱/-	گلنار	"	۱/۴
گلہائے پریشاں	انتخاب الیاس احمد	۶/۸	چندر شیکھر	"	۲/-	شعلہ	"	۵/-
اعجاز نوح	نوح ناروی	۵/-	[illegible]	"	۲/-	رسی جل گئی	"	۳/-
سحاب	حسن شہیر	۳/-	زہر کا پودا	"	۳/-	لیلیٰ کا کتا	"	۲/۰۰

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی


سردیوں میں صحت حاصل کرکے
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
تمام سال چاق و چوبند رہیے!
سردی، صحت اور قوت حاصل کرنے کا بہترین زمانہ ہے
اور در حقیقت یہی موسم مدرالحم استعمال کرنے کا بھی ہے۔
ہمدرد کا مدرالحم دوآتشہ جاڑوں کے لیے ایک مکمل اور
موثر ٹانک ہے جو نئی توانائی بخشتا ہے اور پورے جسمانی
نظام کو چاق و چوبند کر دیتا ہے۔ صحت کی بحالی اور واپسی
کے لیے بہترین ٹانک ہے۔
مدرالحم دوآتشہ
معجون شباب آور
اعضائے رئیسہ میں چستی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ دماغ، اعصاب اور عضلات کو طاقت پہنچاتی ہے۔
مدرالحم اور معجون شباب آور کا جاڑوں میں متواتر استعمال کرنا نئی زندگی پانے کے برابر ہے!
ہمدرد